اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہِ پنجاب، لاہور

جلد نمبر ۹

(خمسہ ...... دھتورہ)

بارِ دوم
محرم ۱۴۲۵ھ / مارچ ۲۰۰۴ء

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ (پنجاب)	.... رئیس ادارہ
سید محمد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب)	.... سینئر ایڈیٹر
پروفیسر عبدالقیوم، ایم اے (پنجاب)	.... سینئر ایڈیٹر
عبدالمنان عمر، ایم اے (علیگ)	.... ایڈیٹر
ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ایم اے، (پنجاب)	.... معتمد ادارہ
خان محمد چاولہ، ایم اے (پنجاب)	.... ایڈیٹر ۱
پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی، ایم اے (پنجاب)	.... ایڈیٹر ۲
شیخ نذیر حسین، ایم اے (پنجاب)	.... ایڈیٹر ۳

۱۔ از ۱۹ دسمبر ۱۹۷۰ء تا ۳۰ ستمبر ۱۹۷۱ء   ۲۔ از ۱۱ فروری ۱۹۷۱ء   ۳۔ از ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء

مجلسِ انتظامیہ

۱۔ ڈاکٹر محمد اجمل، ایم اے، پی ایچ ڈی، قائم مقام وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب (صدر مجلس)

۲۔ جسٹس ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمٰن، ہلال پاکستان، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ، پاکستان، لاہور

۳۔ لیفٹیننٹ جنرل ناصر علی خاں، سابق صدر پبلک سروس کمیشن، مغربی پاکستان، لاہور

۴۔ جناب معز الدین احمد، سی۔ ایس۔ پی (ریٹائرڈ)، ۲۴۳۰۔ شارع طفیل، لاہور چھاؤنی

۵۔ جناب الطاف گوہر، سابق سی۔ ایس۔ پی، لاہور

۶۔ معتمد مالیات، حکومت پنجاب، لاہور

۷۔ سید یعقوب شاہ، ایم اے، سابق آڈیٹر جنرل، پاکستان و سابق وزیر مالیات، حکومت مغربی پاکستان، لاہور

۸۔ جناب عبدالرشید خاں، سابق کنٹرولر پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری، مغربی پاکستان، لاہور

۹۔ پروفیسر محمد علاء الدین صدیقی، ایم اے، ایل ایل بی، ستارۂ امتیاز، وائس چانسلر (رخصتی)، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۰۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر ایمریطس، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور

۱۱۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر ایمریطس، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور

۱۲۔ رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۳۔ خازن، دانش گاہ پنجاب، لاہور

طبع اول [illegible]

بار دوم ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء

اختصارات و رموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اور ان کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ = اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

آ آ، ت = اسلام انسائکلوپیدیسی (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع = دائرة المعارف الاسلامیہ (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن ۱ یا ۲ = Encyclopaedia of Islam (= انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، بار اوّل یا دوم، لائیڈن.

ابن الابار = کتاب تکملة الصلة، طبع کودیرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابار = تکملہ = M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez: Apendice a la adicion Codera de Tecmila، در Misc de estudios y textos arabes، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابار، جلد اوّل = ابن الابار: تکملة الصلة، Texte arabe d'apres un ms.de Fes, tome I, completant les deux vol. edites par F. Codera، طبع A. Bel و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ۱ یا ۲ یا ۳ = کتاب الکامل، طبع تورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فانیان = Annales du Maghreb et de l'Espagne، ترجمہ فانیان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال = کتاب الصلة فی اخبار ائمة الاندلس، طبع کودیرا F. Codera (Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II).

ابن بطوطہ = تحفة النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار (Voyages d' Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از C.Defremery و B.R.sanguinetti، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بردی = النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة، طبع W. Popper، برکلے و لائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ ببعد.

ابن حوقل، کریمرز - وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں.

ابن حوقل = کتاب صورة الارض، طبع J.H.Kramers، لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء، (BGA,II، بار دوم)، ۲ جلدیں.

ابن خرداذبہ = المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje)، لائیڈن ۱۸۸۹ء (BGA, VI).

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر، بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ = Prolegomenes d'Ebn Khaldoun، طبع E.Quatremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (Notices et Extruits, XVI-XVII).

ابن خلدون: روزنتھال = The Muqaddimah، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان = Les Prolegomenes d'Ibn Khaldun، ترجمہ و حواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء، (طبع دوم) ۱۹۳۴ء.

ابن خلکان = وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان، طبع وستنفلت (F.Wustenfeld)، گوٹنگن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء، (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیے گئے ہیں).

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol

دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء۔

ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII)۔

ابن رستہ، ویت: Les Atours precieux، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء۔

ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ تا ۱۹۴۰ء۔

ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) و لیوی پروونسال (E.Levi provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء۔

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ء (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیے گئے ہیں)۔

ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA, V)۔

ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۳ء۔

ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وستنفلت، گوٹنگن ۱۸۵۰ء۔

ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وستنفلت، گوٹنگن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء۔

ابو الفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء۔

ابو الفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite de l' arabe en franciaz، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء و ج ۲/۲، از St.Guyard، ۱۸۸۳ء۔

الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de Espagne، طبع دوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء۔

الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء۔

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸ء/۱۳۱۹ھ۔

الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وستنفلت، گوٹنگن ۱۸۵۴ء (اناستاتیک)۔

الاصابہ - ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء۔

الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA, I) و بار دوم (نقل بار اول) ۱۹۲۷ء۔

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابو الفرج الاصفہانی: الاغانی، بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ ببعد۔

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E. Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء۔

الانباری: نزہۃ = نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ۔

البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء۔

البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger و S.D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء۔

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔

البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء۔

بیہقی: تاریخ بیہق = ابو الحسن علی بن زید البیہقی. تاریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش۔

بیہقی. تتمہ = ابو الحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء۔

بیہقی، ابو الفضل = ابو الفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl. Indica.

ت ا = تکملہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس۔

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء۔

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء۔

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء۔

الثعالبی: یتیمہ = الثعالبی: یتیمۃ الدهر، دمشق ۱۳۰۴ھ.

الثعالبی: یتیمہ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء.

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۳۲ء.

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yaltkaya) و محمد رفعت بیلگہ الکلیسی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء.

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ.

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V. Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS, XI، سلسلہ جدید).

حمد اللہ مستوفی: نزہۃ = حمد اللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII).

خواند امیر: حبیب السیر، تہران ۱۲۷۱ھ، بمبئی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء.

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدرآباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ.

الدمیری = الدمیری: حیاۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء.

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۵ھ.

رحمان علی = رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء.

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ.

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن و حسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء.

زبیری، نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء.

الزرکلی، اعلام = خیر الدین الزرکلی: الاعلام قاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۰ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۴ تا ۱۹۵۹ء.

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ.

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء.

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX).

السمعانی، طبع حیدرآباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبد المعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدرآباد ۱۳۸۲ھ/۱۴۰۲ھ/۱۹۶۲ء-۱۹۸۲ء.

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ.

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء.

الضبی، الضبی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ربیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH, III).

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ.

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ تا ۱۹۰۱ء.

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ.

العقد الفرید = ابن عبد ربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ.

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیہ نک تاریخ و جغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/۱۸۹۵ تا ۱۸۹۹ء.

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء.

عیون الانباء = طبع ملر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.

غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۳ء.

غوثی مانڈوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ.

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، بمبئی ۱۸۳۲ء۔

فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ھ ش۔

فرہنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء۔

فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء۔

فلٹن و لنگز: Alexander S. Fulton، Martin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء۔

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء۔

(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء۔

الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد، بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء۔

الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء۔

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ۔

م آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔

مآثر الامراء = شاہنواز خان: مآثر الامراء، Bibl. Indica.

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش۔

مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۹ھ۔

مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ھ ش۔

المسعودی: مروج: مروج الذہب، طبع باربیہ دے مینارد (C. Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء۔

المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ذخویہ، لائیڈن ۱۸۹۴ء (*BGA*, VIII).

المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ذخویہ، لائیڈن ۱۸۷۷ء (*BGA*, VIII).

المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، *Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء۔

المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء۔

منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ۔

میرخواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء۔

نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۴۷ء ببعد۔

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پرووانسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء۔

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء۔

الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع مولر (D. H. Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء۔

یاقوت طبع وستنفلٹ: معجم البلدان، طبع وستنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع اناستاتیک ۱۹۲۴ء)۔

یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (*GMS*, VI)؛ معجم الادباء، (طبع اناستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء)۔

یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (W. Th. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۳ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء۔

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ذخویہ، لائیڈن ۱۸۹۲ء (*BGA*, VII).

یعقوبی، ترجمہ Wiet = *Yaqubi, Les pays*، ترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء۔

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed.,Leiden 1927.

Barkan: Kanunlar= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I. II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*, Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*, II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam*, *Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan ;*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Noldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergstrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57

Goldziher:*Muh.St.*=I.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher:Vorlesungen^2=2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

1835-43.

Hammer-Purgstall:*Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*,2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l'histoire des Seldjoucides*. Leiden 1886-1902.

Juynboll. Handbuch=Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*. Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding*= *Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2nd ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*. London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal:Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*. nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*. Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer:Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*. Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole*. Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*

Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in fruh-Islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed. Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart: *Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djambatan Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed.by A.U.Pope,Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner: *Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrslage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen*, *Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen: *Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbers.

Abh. G. W. Gott.-Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.

Abh. K.M.=Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.

Abh. Pr. AK. W.= Abhandlungen d. preuss. Akad. d. Wiss.

Afr. Fr.-Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.

Afr. Fr. RC=Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.

AIEO Alger=Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.

AIUON=Annali dell' Instituto Univ. Orient. di Napoli.

AM-Archives Marocaines.

And=Al-Andalus.

Anth=Anthropos.

Anz. wien=Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO=Acta Orientalia.

Arab.=Arabica

ArO=Archiv Orientalni

ARW=Archiv fur Religionswissenschaft.

ASI=Archaelogical Survey of India.

ASI, NIS=the same, New Imperial Series.

ASI, AR=the same, Annual Reports.

AUDTCFD=Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.

As. Fr. B= Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.

BAH=Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR=Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell=Turk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BEt. Or. = Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.

BGA=Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE=Bulletin de l' Instutut Egyptien.

BIFAO=Bulletin de l' Institut Francais d.' Archaeologie Orientale du Caire.

BIS=Bibliotheca Indica series.

BRAH=Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.

BSE=Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), 1st ed.

BSE^2=the Same, 2nd ed.

BSL(P)=Bulletin de la Societe de Linguistiq (de Paris).

BSO(A)S=Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV=Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).

BZ=Byzantinische Zeitschrift.

COC=Cahiers de l' Orient Contemporain.

CT=Cahiers deTunisie.

EI^1=Encyclopaedia of Islam, 1st edition.

EI^2=Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.

EIM=Epigraphia Indo-Moslemica.

ERE=Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA=Gottinger Gelehrte Anzeigen.

GJ=Geogra phical Journal.

GMS=Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph=Grundriss der Iranischen Philologie.

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.
Hesp.=Hesperis.
IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).
IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.
IC=Islamic Culture.
IFD=Ilahiyat Fakultesi.
IG=Indische Gids.
IHQ=Indian Historical Quarterly.
IQ=The Islamic Quarterly.
IRM=International Review of Missions.
Isl.=Der Islam.
JA=Journal Asiatique.
JAfr. S.=Journal of the African Society.
JAOS=Journal of the American Oriental Society.
JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.
JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.
JE.=Jewish Encyclopaedia.
JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.
JNES=Journal of Near Eastern Studies.
JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.
JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.
JQR=Jewish Quarterly Review.
JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.
J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.
J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.
JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.
JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.
JSS=Journal of Semetic studies.
KCA=Korosi Csoma Archivum.
KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).
KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).
LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).
Mash.=Al-Mashrik.
MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesellschaft.
MDVP=Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.
MEA=Middle Eastern Affairs.
MEJ=Middle East Journal.
MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.
MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.
MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.
MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissenschaft des Judentums.
MI=Mir Islama.
MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.
MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.
MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.
MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.
MMIA=Madjallat al-Madjmaal-Ilmi al Arabi Damascus.
MO=Le Monde oriental.
MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.
MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).
MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.
MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. für Oriental. Sprachen Afr. Studien.

MSOS As.= Mitteilungen des Sem. für Oriental Sprachen Westasiatische Studien

MTM=Mili Tuebbüler medjmuası.

MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch ägyptischen Gesellschaft.

MW=The Muslim World.

NC–Numismatic Chronicle.

NGW Gött.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Göttingen.

OA=Orientalisches Archiv.

OC=Oriens Christianus.

OCM–Oriental College Magazine. Lahore.

OCMD=Oriental College Magazine. Dunima. Lahore

OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.

OM=Oriente Moderno.

Or.=Oriens.

PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.

PELOV–Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.

Pet.Mitt.–Petermanns Mitteilungen.

PRGS–Proceedings of the R. Geographical Society.

QDAP–Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.

RAfr.=Revue Africaine

RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.

REI–Revue des Etudes Islamiques.

REJ–Revue des Etudes Juives.

Rend. Lin.–Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.

RHR=Revue de l' Histoire des Religions.

RI–Revue Indigene.

RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes

RMM=Revue du Monde Musulman

RO=Rocznik Orientalistyczny.

ROC=Revue de l' Orient Chretien

ROL–Revue de l' Orient Latin

RRAH=Rev. de la R. Academia de la Historia. Madrid.

RSO=Rivista degli Studi Orientali.

RT=Revue Tunisienne.

SBAK. Heid=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.

SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.

SBBayr. AK.–Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.

SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin. Sozietat in Erlangen.

SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin

SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).

SI=Studai Islamica.

SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).

Stud. Isl.= Studia Islamica.

S.Ya.–Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics)

SYB–The Statesman's Year Book.

TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.

TD=Tarih Dergisi.

TIE=Trudi instituta Etnografii (Works of the Institute of Ethnography).

TM–Turkiyat Mecmuasi

TOEM–Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmuası.

TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal. Land en Volkenkunde.

Verh. Ak. Amst.–Verhandelingen der Koninklijke

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI,NS=the same. New Series.

Wiss.Veroff.DOG=Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes

ZA=Zeitschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG=Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

※ مقالہ، ترجمہ از آ، لائیڈن

⊛ جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[ ] اضافہ، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

بعد = f.,ff.,sq.,sqq.

بذیل مادہ (یا کلمہ) = s. v.

دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے = see; s.

رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک باں (رجوع کنید باں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے = q.v.

بمواضع کثیرہ = passim.

کتاب مذکور = op.cit.

دیکھیے لغوی مفہوم (تقارب یا تقابل) = cf.

ق م (قبل مسیح) = B.C.

م (متوفی) = d.

محل مذکور = loc. cit.

کتاب مذکور = ibid.

وہی مصنف = idem.

ھ (سنہ ہجری) = A.H.

ء (سنہ عیسوی) = A.D.

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ (ـَ) = a

کسرہ (ـِ) = i

ضمہ (ـُ) = u

(ب)

Long Vowels

ا، آ = ā (آج کل: aj kal)

ی = ī (سیم: Sim)

و = ū (ہارون الرشید: Hārūn al-Rashid)

اے = ai (سیر: Sair)

(ج)

ـٖ = e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)

ـٗ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)

ـُ = ŭ کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (ترکیہ: Turkiya)

ـٗ = ō کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کول: kōl)

ـَ = ă کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اَرَجَب: ărădjăb: رَجَب radjab)

ـْ = علامت سکون یا جزم (بسمل: bismil)

متبادل اردو عربی حروف

ب	=	b	ح	=	ḥ	س	=	s	گ	=	g
بھ	=	bh	خ	=	K͟h	ش	=	s͟h، c͟h	گھ	=	gh
پ	=	p	د	=	d	ص	=	ṣ	ل	=	
پھ	=	ph	دھ	=	dh	ض	=	ḍ	لھ	=	lh
ت	=	t	ڈ	=	ḋ	ط	=	ṭ	م	=	m
تھ	=	th	ذ	=	dh	ظ	=	ẓ	مھ	=	mh
ٹ	=	t	ڈھ	=	dh	ع	=	،	ن	=	n
ٹھ	=	ṭh	ر	=	r	غ	=	g͟h	نھ	=	nh
ث	=	th	رھ	=	rh	ف	=	f	و	=	w
ج	=	dj	ڑ	=	ṛ	ق	=	ḳ	ہ	=	h
جھ	=	djh	ڑھ	=	ṛh	ک	=	k	ء	=	,
چ	=	č	ز	=	z	کھ	=	kh	ی	=	y
چھ	=	ch	ژ	=	ž, z͟h						

متداول اردو عربی حروف

b = ب
bh = بھ
p = پ
ph = پھ
t = ت
th = تھ
t = ٹ
ṭh = ٹھ
th = ث
dj = ج
djh = جھ
č = چ
ch = چھ

ḥ = ح
Kh = خ
d = د
dh = دھ
d̄ = ذ
dط = ڈ
dh = ڈھ
r = ر
rh = رھ
ṛ = ڑ
ṛh = ڑھ
z = ز
ž, zh = ژ

s = س
sh، ch = ش
ṣ = ص
ḍ = ض
ṭ = ط
ẓ = ظ
ʿ = ع
gh = غ
f = ف
ḳ = ق
k = ک
kh = کھ

g = گ
gh = گھ
l = ل
lh = لھ
m = م
mh = مھ
n = ن
nh = نھ
w = و
h = ہ
ʾ = ء
y = ی

* **خمسہ**: ترکی میں خمسہ۔ یہ وہ تلفظ ہے جو مشرقی عربوں اور ترکوں کے ہاں رائج ہے۔ خمسہ پانچ مثنویوں کے مجموعے کو کہا گیا ہے۔ سب سے زیادہ مشہور خمسۂ نظامی ہے جسے "پنج گنج" بھی کہتے ہیں یعنی، مخزن الاسرار (۵۵۹ھ/۱۱۶۳ء) خسرو و شیرین (۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء)، "لیلٰی و مجنون" (۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء) ہفت پیکر (۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء) سکندر نامہ (۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء)۔ امیر خسرو دہلوی کا خمسہ یعنی مطلع الانوار (۶۹۸ھ/۱۲۹۹ء)، شیرین و خسرو، مجنون و لیلٰی (اسی سال)، آئینۂ سکندری (۶۹۹ھ/۱۳۰۰ء) ہشت بہشت (۷۰۱ھ/۱۳۰۲ء)۔ خواجو کرمانی کا خمسہ یعنی روضۃ الانوار (۷۴۴ھ/۱۳۴۳ء میں مکمل ہوا) ہمای ہمایوں، کمال نامہ، گل و نوروز، جواہر نامہ۔ کاتبی کا خمسہ جو مکمل نہ ہو سکا۔ ہمارے پاس اس میں سے گلشن ابرار اور لیلٰی و مجنون تقریباً ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء کے ہیں۔ جامی کا خمسہ "ہفت اورنگ" یعنی تحفۃ الاحرار (۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء) سبحۃ الابرار، یوسف و زلیخا (۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء)، لیلٰی و مجنون (۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء)، خرد نامۂ سکندری۔ ہاتفی کا خمسہ غالباً مکمل نہ ہو سکا۔ اس میں لیلٰی و مجنون، ہفت منظر، شیرین و خسرو، تیمور نامہ (۹۱۷ھ/۱۵۱۰ء [بہ تصحیح ۱۵۱۱ء] اور ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء کے درمیان) شامل ہیں۔ فیضی کا خمسہ مرکز ادوار، سلیمان و بلقیس، نل دمن، ہفت کشور، اکبر نامہ (۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء) نامکمل۔ حسن بن سید فتح اللہ کا خمسہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کی شان میں ہے (۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء تا ۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء)۔ ملا طغرائی مشہدی کا خمسۂ ناقصہ گولکنڈہ دربار کے پانچ اشخاص کی ہجو میں ہے۔ مصنف کا انتقال اورنگ زیب کے عہد میں (تقریباً ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں) ہوا۔

ترکی شاعری میں بھی اس نوعیت کے خمسے موجود ہیں مثلاً حمد اللہ چلبی المعروف بہ حمدی بن شیخ آق شمس الدین م ۹۱۴ھ/۱۵۰۹ء کا خمسہ: یوسف و زلیخا، لیلٰی و مجنون، مولد نبیؐ، تحفۃ العشاق، محمدیہ۔ فضولی بغدادی (م ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کا خمسہ (جس کا لطیفی اور قنالی زادہ نے غالباً غلطی سے ذکر کیا ہے)۔ البانیہ کے یحیی دقاگین Dukagin کے بے (م ۹۸۳ھ/۱۵۷۶ء) کا خمسہ: شاہ و گدا، یوسف و زلیخا، کتاب اصول، گنجینۂ راز، گلشن انوار۔ قلقندلین Kalkandilen کے معیدی، ہم عصر باقی کا خمسہ۔ بہشتی (م ۹۷۹ھ/۱۵۷۲ء) کا خمسہ: وامق و عذرا، یوسف و زلیخا، حسن و نگار، سہیل و نوبہار، لیلٰی و مجنون؛ سنان بن سلیمان الملقب بہ اطاقی ولد نوائی (م ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء) کا خمسہ: (دراصل اس میں صرف چار مثنویاں شامل ہیں اور پانچواں شاعر کا دیوان ہے) صحبۃ الابکار، ہفت خوان، نفحۃ الازہار، ساقی نامہ۔ ریوقی باشندۂ ادرنہ (م ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء) کا "خمسۂ رومی" جس کا ذکر سہی نے بھی کیا ہے، غالباً کبھی وجود میں نہیں آیا۔ نرگسی کا خمسہ نثر میں ہے۔

میر علی شیر نوائی نے بھی اس عنوان کے تحت پانچ مثنویوں کا ایک مجموعہ مشرق ترکی میں مرتب کیا تھا (۱) *Catalogue Quaritch*، جنوری ۱۹۱۶ء، ص ۲۳؛ (۲) E. Blochet: *J.A.*، ۱۹۱۶ء، سلسلہ ۱۱، ج ۸، ص ۴۰۰)۔ جامی کی سوانح حیات کو جو پانچ حصوں میں ہے (برلن: *J.A.*، ۱۸۶۱ء سلسلہ ۵ ج ۱۷، ص ۳۰۳) خمسۃ المتحیرین کا نام دیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) Ch. Rieu: *Catalogue of Persian Mss. Brit. Mus.*، ص ۵۰۳، ۶۱۱، ۶۱۵، ۶۲۰، ۶۲۷، ۶۳۵، ۶۵۲، ۶۷۱، ۶۸۰؛ (۲) E.J.W. Gibb: *Ottoman Poetry*، ۱: ۱۳۵؛ ۲: ۸۰۔

(CL. HUART).

* **خمسہ**: (ولایات خمسہ، پانچ شہروں پر مشتمل)۔ ایران میں ایک صوبے کا نام، جس کا صدر مقام زنجان ہے؛ اس میں سلطانیہ بھی شامل ہے انتظامی

اعتبار سے یہ ایک مختصر حصۂ ملک تھا اور حال ہی میں عراق عجم کا ایک جداگانہ ضلع بن گیا ہے۔ یہ آذربائیجان اور قزوین کے صوبوں کے بیچ میں واقع ہے اس کی آبادی ۱۱,۴۸۰ ہے۔ بجٹ میں اس سے متعلق حسب ذیل اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔ نقد مالگذاری ۸۱۹,۸۸۰ قران۔ اناج کی شکل میں ۱۰,۵۴۰ خروار (۶۴۹۰ پاونڈ) بھوسے کی شکل میں ۹,۰۰۰ خروار۔ جنس میں ادائیگیوں کی مالیت ۹۷۸,۶۳۸ قران۔ مقامی اخراجات جن میں ٹیکس کی معافیاں شامل ہیں، ۱۹,۱۲۹ قران۔ وہ پانچ شہر جن کی وجہ سے اس ضلع کا نام خمسہ ہوا، یہ ہیں: ابہر، قرم، غیلب، ارسن خانہ، اور زرزین آباد۔ اس ضلع میں افشار کا خانہ بدوش قبیلہ آباد ہے۔

مآخذ: (۱) [E. Dupre] : *Voyage en perse*، ۲ : ۲۱۲ تا ۲۱۴؛ (۲) Jaubert : *Voyage en Arménie*، ص ۱۹۷؛ (۳) G. Curzon : *Persia*، ۱ : ۴۳۷، ۴۸۰۔

(Cl. HUART).

* **خُمَیْر :** (خُمَیر)، شمالی تونس کے باشندے۔ خمیریہ کی حدود یہ ہیں: شمالی سمت میں بحیرۂ روم، مغرب میں الجزائر کی سرحد، جنوب کی طرف دریاے غزالہ جو دریاے مجردہ کا ایک معاون ہے اور مشرق کی جانب نفزہ اور جیاهیا کا علاقہ۔ اس خطے کا رقبہ تقریباً ۳۵۰ مربع میل ہے۔ اس کی سطح بہت ناہموار ہے اور تمام علاقے میں پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو الجزائر تک پھیلا ہوا ہے۔ اوسط بلندی بمشکل تین ہزار فٹ سے زائد ہوگی لیکن ان پہاڑوں نے جن کو جگہ جگہ گہرے کھڈ اور ڈھلوان وادیاں کاٹتی ہیں: اس علاقے کا منظر بہت ناہموار بنا دیا ہے۔ وہاں کے باشندے خمیریہ کو ہی سب سے اہم پہاڑ (جبل الجبلیہ) تصور کرتے ہیں: ریتلے پتھر کی تہیں جو تقریباً ہر جگہ زیر زمین واقع ہیں، درختوں اور جھاڑیوں کی پیداوار کے لیے مفید ہیں چنانچہ کورک اوک اور زین اوک (شاہ بلوط کی دو قسموں) کے جنگل ایک لاکھ مربع ہیکٹر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس علاقے میں سال میں ۶۶ انچ تک بارش ہو جاتی ہے، پانی ریتلے پتھروں میں سے رستا ہوا جب غیر جاذب سخت پتھر (marl) کی تہ تک پہنچتا ہے تو دوبارہ سطح زمین کے اوپر چشموں کی شکل میں بہ نکلتا ہے اور وادی مجردہ اور خاص طور پر بحیرۂ روم کی طرف چلا جاتا ہے۔ طبرقہ کے دریا کے کنارے کے میدانوں کے علاوہ اور جگہ زراعت مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ریتلے ٹیلوں کا ایک سلسلہ ہر جگہ ساحل اور جنگل کے بیچ میں پھیلا ہوا ہے جو اندرون علاقے سے آنے والے پانی کا ایک حصہ روک لیتا ہے۔ جست، لوہے اور سیسے کی کانیں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔

خمیریہ کی آبادی تقریباً چھے ہزار پانچ سو افرا پر مشتمل ہے، اصلی باشندے جو خُمیر یا خُمَیر کہلاتے ہیں، چار قبیلوں میں منقسم ہیں: طبرقہ، اتقتہ، تارمک اور سلول کے خُمیر۔ مویشی یعنی بیل، بھیڑیں او بکریاں پالنا ان کا ذریعۂ معاش ہے۔ صرف وہ لوگ ج طبرقہ کے گرد و نواح میں رہتے ہیں، زراعت پیشہ ہیں عورتیں موٹا جھوٹا کپڑا بنتی اور مٹی کے برتن بناتی ہیں وہاں کے باشندوں کی ایک معتدبہ تعداد کو حکوم نے کورک اوک (شاہ بلوط کی ایک قسم) کے جنگلو میں کام پر لگا رکھا ہے۔ خُمیر لوگ کم و بیش بستیو میں آباد ہیں اور شاخوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں م رہتے ہیں جنھیں "جوربی" کہتے ہیں اور جو عام ط پر پہاڑوں کی ڈھلانوں یا کسی دریا کے قرب م بنائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض ابھی تک خیموں م رہتے ہیں، طبرقہ کے قریب زواوہ کی بھی ایک مخت سی نوآبادی ہے، یہ لوگ ضلع بوجی (Bougie) قبائل کی اولاد سے ہیں اور انھیں سترھویں صدی عیسوی میں بے حمودہ نے یہاں آباد کیا تھا۔ وہ ترکاریوں ا پھلوں کی کاشت کرتے ہیں، پتھروں کے بنے ہو

مکانوں میں رہتے ہیں اور دوسرے باشندوں کی نسبت زیادہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ یورپی لوگ، جو تعداد میں بہت کم ہیں، عین دِرْہم [رک بآن] اور طبرقہ کے مرکزی مقامات میں بسے ہوئے ہیں۔

خُمیر کو منہاجہ قبیلے کے لوگوں کی اولاد سمجھا جا سکتا ہے جو اسلامی فتح کے وقت تونس اور صوبۂ قسنطین (Constantine) کے شمالی ساحل پر آباد تھے ۔ یہ قدیم نسل دوسرے بربر عناصر سے مخلوط ہوگئی ہے جو ہلالی حملے کے بعد وسط ملک سے شمال کی طرف دھکیل دیے گئے اور آخرکار ان میں عربی خون کی بھی آمیزش ہو گئی ۔ بربر نسل سے ہونے کے باوجود خمیر بہت عرصے سے عربی طور طریقے اختیار کر چکے ہیں، انہوں نے بربر زبان کا استعمال ترک کر دیا ہے؛ اس کے کچھ آثار البتہ ان کی عام بولی میں باقی رہ گئے ہیں انہوں نے اپنا نسب بھی عربی بنا لیا ہے، چنانچہ وہ اپنا مورث خمر بن عمر نامی ایک شخص کو بتاتے ہیں جو عربی النسل تھا اور کہا جاتا ہے اس کی اولاد میں سے ایک شخص عبداللہ بن جمال نے عین دِرْہم کے قریب بود و باش اختیار کر لی تھی ۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ اس مورث اعلیٰ نے اپنے آپ کو خمر یا قبر قبیلے کے لوگوں کے ساتھ وابستہ کر لیا جو اسلامی فتح کے وقت عراق سے مغرب اقصی میں آ گئے تھے جہاں سے کچھ صدیوں کے بعد عبداللہ ہجرت کرکے تونس آ گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ خمر کے مختلف قبیلے سید عبداللہ کی اولاد سے ہیں جس کا "مربوط" (خانقاہ) اس زمانے میں بھی اس علاقے کا مذہبی مرکز ہے، سال میں دو مرتبہ یعنی موسم بہار اور موسم خزاں میں وہاں ایک "زردہ" (عرس) منایا جاتا ہے جس میں بہت لوگ شرکت کرتے ہیں ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خُمیر شبیّہ وفاق کے ماتحت بہت عرصے تک ریجنسی (Regency) کے جنوبی حصے میں آباد رہے اور سترھویں صدی عیسوی میں اس وفاق کے ٹوٹ جانے کے بعد وہ پناہ لینے کے لیے بھاگ کر شمالی پہاڑوں میں چلے گئے۔

جنگلوں اور پہاڑوں کی پناہ میں خُمیر کو انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک تقریباً مکمل آزادی حاصل رہی، ان کا سیاسی نظام بہت ابتدائی قسم کا تھا، ان کے یہاں قاضی نہیں ہوتے تھے، باہمی جھگڑے پنچایت (جماعت) کے سامنے پیش ہوتے تھے ۔ قبائل اکثر ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے، تاہم کبھی کبھی متحد بھی ہو جاتے تھے تاکہ وادی مجردہ کے لوگوں کا مقابلہ یا تونس کے بے (بای) حکمرانوں کے حملوں کی مدافعت کر سکیں، مؤخرالذکر جن کی سیادت کو خُمیر برائے نام تسلیم کرتے تھے، کبھی انہیں ٹیکس دینے پر مجبور نہ کر سکے ۔ تونس کے سپاہی اور سرکاری عمال طبرقہ میں مقیم رہتے تھے، انہیں اندرون ملک جانے کی اجازت نہ تھی ۔ زواوہ جنہیں بے حمودہ نے پہاڑی باشندوں کی لوٹ مار کو روکنے کے لیے ساحلی علاقے میں آباد کیا تھا، اطمینان سے اپنی مقررہ تنخواہ وصول کر لیتے تھے لیکن اپنے خطرناک ہمسایوں (خمر) سے جنگ کرنے سے گریز کرتے تھے ۔ دوسری طرف خمر زیادہ تر تونس کے یا سرحد کے الجزائری قبائل کو لوٹ کھسوٹ کر گزر اوقات کرتے تھے۔ تونس کے بے حکمران اس تاخت و تاراج کا سدباب نہیں کر سکتے تھے ۔ محمد الصادق کے زمانۂ حکومت میں اس قسم کی لوٹ مار بہت بڑھ گئی، اس لیے فرانسیسی حکومت نے مجرموں کو خود سزا دینے کا فیصلہ کیا ۔ تونس کی مہم کی (جس کا مقصد ایک فرانسیسی زیر حمایت علاقہ Protectorate قائم کرنا تھا) ابتدا اسی طرح ہوئی ۔ خمر کے خلاف جنگی کارروائیوں میں زیادہ دیر نہیں لگی، اپریل ۱۸۸۱ء کے آخر میں الجزائر سے ایک فوجی دستہ جنرل دلی بیک (Delebeaque) کی قیادت میں مغربی سمت سے خُمیریہ میں داخل ہوگیا اور فوج کا ایک حصہ طبرقہ میں جہازوں سے اترا ۔ آٹھ مئی کو فوجی دستے

نے سیدی عبداللہ بن جمال کے "مربوط" پر قبضہ کر لیا اور ۱۲ مئی کو عین دِزهم پر۔ اس مہینے کے خاتمے تک خمیر کی فتح مکمل ہو گئی اور عین دِزهم میں ایک فوجی چوکی بن جانے سے اس علاقے میں بالآخر امن و امان کی بحالی کا تیقن ہوگیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک مکمل حکومت کے امن و امان میں کوئی خلل نہیں پڑا اور آج کل خُمَیریہ تونس کا ایک ایسا صوبہ ہے جہاں چوری اور قتل و غارت کی واردات سب سے کم ہوتی ہیں.

مآخذ: (۱) Pelissier: *Descr. de la Régence de Tunis*، پیرس ۱۸۵۳ء، باب ۳؛ (۲) Moulin: *Notice sur le pays des Kroumirs. Bull. Soc. de géogr. de paris*، ۱۸۶۹ء؛ (۳) Play-fair: *Voyage au pays des Komaïr, Revue africaine*، ۱۸۷۷ء؛ (۴) E. Desfossés: *Etudes sur la Tunisie, Revue de Geogr.*، ۱۸۷۹ء؛ (۵) Quérard et Boutineau: *La Kroumirie et sa colonisation*، پیرس؛ (۶) de la Berge: *En Tunisie. Récit de l' expédition française*، پیرس ۱۸۸۱ء؛ (۷) A. Cherbonneau: *Détails ethnogr. sur les Kroumir et les Ouchetas, Revue de Géogr.*، ۱۸۸۱ء؛ (۸) Madame de Voisins: *Un Français chez les Kroumirs, Revue politique et littéraire*، ۱۸۸۱ء؛ (۹) Violard: *La Tunisie du Nord-Tunis*، ۱۹۰۶ء.

(G. Yver).

* **الخَمِیَه**: (Aljamía)، (ہسپانوی)، عربی لفظ العَجَمِیّه (= غیر عربی) کی ہسپانوی صورت۔ اس اصطلاحی لفظ کا اطلاق جزیرہ نمائے آئبیری (Iberian Peninsula) کے اندلسی مسلمان اپنے شمالی ہمسایوں کی مختلف لاطینی نژاد (Romance) بولیوں پر کرتے تھے۔ ان بولیوں پر جلد ہی عربیت کا رنگ چڑھ گیا۔ اس عربی عنصر کی سرایت کا موجب بالعموم وہ مستعرب (Mezarab) مہاجر تھے جو نویں صدی عیسوی سے قرطبہ کے ہمسایہ عیسائی ملکوں میں آباد ہو چکے تھے۔ ایک لاطینی نژاد زبان، جس کا رواج اندلسی آبادی کے تمام طبقوں میں عموماً اور دیہاتی طبقے میں خصوصاً ثابت ہے، اندلسی عربی کے ساتھ ساتھ جاری تھا، اسے بھی العَجَمِیّه کہتے تھے۔ قرون وسطٰی کے اواخر میں کہیں اس اصطلاح کی ہسپانوی صورت الخمیہ (Aljamía) کا استعمال ان خاص معنوں میں ہونے لگا جو آج کل اسے حاصل ہیں، یعنی ہسپانوی لاطینی نژاد زبان پرتگیزی ـ جِلیقی (Galician)، قشتالی (Castilian)، اَرغُونی (Aragonese) قیطلونی (Catalan) یہ علٰحدہ علٰحدہ نام باعتبار علاقہ اس زبان کو دیے گئے)، یہ لاطینی رسم الخط میں نہیں بلکہ عربی رسم الخط میں تحریر کی جاتی تھی جو ادب الخمیہ میں موجود و محفوظ ہے: وہ اسی زبان کی نسبت سے الخمیادہ (Aljamiada) کہلاتا ہے.

الخمیادہ ادب، جو چند مخطوطوں میں موجود ہے، خود ہسپانیہ میں بہت سے محققین کا موضوع مطالعہ بنا رہا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں اس پر خصوصیت سے توجہ دی گئی۔ اس میں منظوم کلام کے علاوہ عموماً مذہبی و قانونی تصانیف شامل ہیں، جو اکثر نصیحت آمیز پیرائے میں تحریر کی گئی ہیں؛ ان کے علاوہ نثر میں چند افسانے بھی ہیں۔ اس ادب پر غور کرتے وقت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کی دو قسم کی تصانیف میں تمیز کی جائے، پہلی قسم میں وہ تصنیفات شامل ہیں جو خاص اندلس میں تخلیق ہوئیں اور اس وقت سے پہلے کی ہیں جب شاہ فلپ ثالث نے ۱۶۰۹ء میں موروں کو اسپین سے خارج کر دیا تھا۔ دوسری قسم کی تصنیفات، جو تعداد میں زیادہ ہیں، خصوصیت سے ان موری جماعتوں کا نتیجۂ فکر ہیں جو سپین سے اخراج کے بعد تونس میں آباد ہو گئی تھیں۔ (دیکھیے موروسکو) پہلی قسم میں سب سے اہم تصنیف، جو چودھویں صدی عیسوی سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے

ایک گم نام شاعر کی نظم بعنوان "نغمۂ یوسف" (Poem of Yūsuf) ہے۔ R. Menêndez Pidal جس نے اس نظم کی تحقیق و تنقیح کی ہے اور شرح بھی لکھی ہے (Poema de Yuçuf materiales para su estudio در Revista de Archivos, Bibliotecas y Museos، جلد ۸، میڈرڈ ۱۹۰۲ء، طبع جدید، غرناطہ Granada ۱۹۵۲ء)، بیان کرتا ہے کہ یہ کسی ارغونی موریسکو کی تصنیف ہے۔ یہ نظم قرآن مجید کی بارھویں سورت (سورۂ یوسف) کا منظوم ہسپانوی ترجمہ ہے۔ اس میں "قصص الانبیاء" کی کتابوں سے اخذ کردہ مواد شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے گروہ میں بھی ایک ارغونی موریسکو محمد ربضان متوطن (قلعۂ) روطۂ شلون (Rueda de Jalon) کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔ یہ ۱۶۰۳ء کے قریب لکھی گئیں۔ ان میں ابوالحسن البصری کی روایت سے سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات کے متعلق چند بند لکھے گئے ہیں۔ اسی زمانے کے قریب (سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں) Puey Monzon کے ایک موریسکو نے، جو الحاج (Albichante) کہلاتا تھا، منظوم سفرنامہ لکھا۔ ایک اور نظم بھی قابل ذکر ہے، جو رد نصاریٰ میں ہے اور مناظرانہ انداز میں کہی گئی ہے، جسے ایک موریسکو یوآن پیریز Juan Pérez نے ۱۶۲۷ء میں تصنیف کیا، یہ شخص قلعۃ النہر (الکلادی ہینارس Alcalá de Henares) کا باشندہ تھا لیکن ہجرت کرکے تونس میں جا بسا تھا، اس کا اصلی نام ابراہیم تائبلی Taybili تھا۔

اسی دور میں الخَمِیَہ میں لکھی ہوئی مدافعانہ طرز کی کتابیں بھی ہیں جن میں مذہب اسلام کے معترضین کو جواب دیے گئے ہیں؛ مثلاً وہ کتاب جو ۱۶۱۵ء میں عبدالکریم بن علی پیریز (Pérez) نے تصنیف کی۔ اسی ادب میں افسانوی نثر کے رسالے بھی شامل ہیں، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم یا آپؐ کے کسی صحابی (مثلاً تمیم الداری) کے متعلق ہیں، بعض اور رسائل میں بائیبل کے قصے بیان ہوئے ہیں یا کم و بیش افسانوی نوعیت کے اشخاص کے سوانح حیات دیے ہیں (خصوصاً سکندر ذوالقرنین کے)۔

آخر میں ان نجی خطوط کی دریافت کی طرف بھی توجہ مبذول کرانی ضروری معلوم ہوتی ہے جو "الخَمِیَہ" میں لکھے گئے تھے۔ ان کی خصوصی صفات کی سب سے زیادہ حامل وہ تحریر ہے جو بقیاس غالب کیتھولک بادشاہوں کے غرناطہ کو (۱۴۹۲ء میں) فتح کرنے سے پہلے ہی لکھی گئی ہوگی، اس کا عکس حال ہی میں I. de Las Cagigas نے شائع کیا ہے (بعنوان *Una Carta aljamida granadina*، در *Arabica* ۱۹۵۴ء، ص ۲۷۱ تا ۲۷۵)۔

مآخذ: (الف) مخطوطات: منتشر مخطوطات پیرس، الجزائر، Aix-en-Provence، Uppsala، موزۂ بریطانیہ، کیمبرج اور ایسکوریال Escorial وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ طلیطلہ (Toledo) میں جو چند نسخے ہیں، ان کے لیے دیکھیے A. González Palencia: *Noticia y Extractos de Mss árabes y aljamiados de Estudios y Textos Árabes*، در *Miscelanea* میڈرڈ ۱۹۱۵ء؛ تین بڑے مجموعے حسب ذیل ہیں: (۱) Biblioteca Nacional کا مجموعہ، میڈرڈ (دیکھیے F. Guillén Robles: *Catálogo de Mss arabes* میڈرڈ ۱۸۸۹ء)؛ (۲) the "manuscritos de la Junta" جو اس وقت Escuela de Estudios Arabes، میڈرڈ میں ہے۔ یہ خاص دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ اس میں مخطوطات کا وہ بھاری ذخیرہ جوں کا توں محفوظ ہے، جو ۱۸۸۴ء میں بمقام المونا سد Almonacid [= مُرِیّہ] پایا گیا (دیکھیے J. Ribera اور Mr. Asin: *Manuscritos árabes y aljamiados de la Biblioteca de la Junta*، میڈرڈ ۱۹۱۲ء، جس میں سرقسطہ (Saragossa) کے مخطوطات کا حال بھی شامل ہے)؛ (۳) مجموعۂ Gayangos، جو Real Academia de la Historia، میڈرڈ میں محفوظ ہے، اس کا حال صرف E. Saavedra: *Indice de la Literatura Aljamiada*

میں بیان ہوا ہے، Memorias de la Real Academia
Española، ۶ : میڈرڈ ۱۸۷۸ء میں اس کی Discurso
تکملے کے طور پر درج ہے۔ یہ اس سلسلے کی ابھی تک
ایک اساسی تصنیف ہے، تاہم یہ الموناسد Almonicid کے
مخطوطات کی دریافت سے پہلے کی تصنیف ہے۔ (ب) متون
کی ہجاء کے لیے دیکھیے Old Spanish : G. D. M. Ford
Sibilants، بوسٹن ۱۹۰۰ء۔ (ج) الخمیہ میں شائع شدہ
تصانیف : (۱) P. Gil، J. Ribera اور M.M. Sánchez :
Colección de textos aljamiados، سرقسطہ Saragossa
۱۸۸۸ء؛ (۲) H. Morf : Poema de José، در
Gratulationsschrift der Universität Bern an die
Universität Zürich، لائپزگ ۱۸۸۳ء؛ (۳) K.V. Zet-
terstéen، در MO، ۱۹۲۱ء، ص ۱ تا ۱۷۴؛ (۴)
R. Menéndez Pidal اور I. de las Cagigas، دیکھیے
سطور بالا۔ (د) صحیح متبادل حروف میں : (۱) J. Cantineau،
در JA، ۱۹۲۷ء، ص ۹ تا ۱۷؛ (۲) J. N. Lincoln،
در American Geographical Riview، ۱۹۳۶ء، ص ۴۸۳
ببعد؛ (۳) وہی مصنف، در Publ. Mod. Lang. Assoc.،
۱۹۳۷ء، ص ۶۳۱ ببعد؛ (۴) A. R. Nykl : A Com-
pendium of Aljamiado Literature، در Revue His-
panique، شمارہ ۷۷؛ (۵) M.J. Müller، در SBBayr.
Ak.، ۱۸۶۰ء، ص ۲۰۱ ببعد؛ (۶) M. Schmitz،
در Romanische Forschungen، ۱۹۰۱ء، ص ۳۱۵ ببعد؛
(۷) D. Lopes : Textos em aljamia portuguesa،
لزبن ۱۸۹۷ء۔ (ہ) آزادانہ متبادل حروف میں : (۱)
F. Guillén Robles : Leyendas Moriscas، ۳ جلدیں،
میڈرڈ ۱۸۸۵ - ۱۸۸۶ء؛ (۲) وہی مصنف : Leyendas
de José y de Alejandro Magno، سرقسطہ ۱۸۸۸ء؛
(۳) Historia de los amores de Paris y Viana،
در Revista Historica، شمارہ ۲۲، بارسلونا ۱۸۷۹ء؛ (۴)
M. de Pano y Ruate : Las Coplas del Peregrino de
Puey Monçón، سرقسطہ ۱۸۹۷ء؛ (۵) P. Longás :
Vida Religiosa de los Moriscos، میڈرڈ ۱۹۱۵ء؛ (۶)
J. Sánchez Pérez : Partición de Herencias entre los
Musulmanes del Rito Malequí، میڈرڈ ۱۹۱۴ء۔ (و)
تصانیف بحروف لاطینی : (۱) عیسیٰ بن جابر : Suma de los
principales mandamientos، طبع P. de Gayangos،
در Memorial Histórico Español، ج ۵، میڈرڈ ۱۸۵۳ء؛
(۲) H. E. J. Stanley : The Poetry of Mohammad
Robadan، در JRAS، ۱۸۶۷ تا ۱۸۷۲ء۔ (ز) مطالعات :
(۱) J. Ribera : Disertaciones y opusculos، جلد ۱،
میڈرڈ ۱۹۲۸ء، ص ۳۴۳ ببعد؛ (۲) P. Gil، در Homenaje
Codera، سرقسطہ ۱۹۰۴ء، ص ۵۳۷ تا ۵۴۹؛ (۳)
R. Basset، در GSAI، ۱۸۹۳ء، ص ۳ تا ۸۱؛ (۴)
J. Oliver Asín : Un morisco de Túnez, admirador
de Lope، در And.، ۱۹۳۳ء، ص ۳۱۳ تا ۳۱۸؛ (۵)
J. Morgan : Mahometism fully explained، لنڈن
۱۷۲۳ تا ۱۷۲۵ء؛ (۶) A. González Palencia :
Hist. de la literatura arábigo-española، بار دوم،
بارسلونا ۱۹۴۵ء، ص ۳۰۳ تا ۳۰۹۔

(L.P. Harvey و E. Lévi-Provençal).

خَنْدَق : زمین کا وہ حصہ جو کسی شہر یا پڑاؤ کے ارد گرد حفاظت کی غرض سے کھودا جائے۔ یہ بعض شہروں کا نام بھی ہے (دیکھیے یاقوت : معجم البلدان اور البلاذری : فتوح البلدان کے اشاریے)۔ یہ ایک معرّب لفظ ہے جس کی اصل ہندی آریائی سمجھی جاتی ہے (دیکھیے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا جرمن مقالہ قدیم عربی میں فارسی دخیل الفاظ)، شاید اردو لفظ کھڈا اور فارسی لفظ کندہ کا تعلق اسی سے ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کی سریانی تصنیف "کتاب الحمیریین" (طبع موبرگ، صفحہ ۴۰) میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

تاریخ اسلام میں سب سے مشہور واقعہ جو غزوۂ خندق کے نام سے مشہور ہے، شوال [بقول البلاذری ذوالقعدہ (انساب الاشراف، ۱ : ۳۴۳)] ۵ھ کا محاصرۂ

مدینہ ہے جس میں مدافعت کے لیے مسلمانوں نے خندق کھودی تھی ۔ نیز قریش، یہودِ خیبر اور بہت سے گروہ ان میں جتھا بندی کرکے آئے تھے، اس لیے ان کے قرآنی نام "احزاب" سے بھی یہ معرکہ منسوب ہے ۔ ۳ھ کی جنگ احد کے بعد قریش یہ دعوٰی کر گئے تھے کہ شوال ۴ھ میں پھر لڑنے آئیں گے، مگر نہیں آئے اور یہ زمانہ امن سے گزر گیا، لیکن اس اثنا میں بنو النضیر مدینے سے نکالے گئے تو وہ خیبر میں جا بسے اور قریش کو مدینے پر پھر سے حملہ کرنے پر اکسایا اور اپنی طرف سے مدد کا بھی یقین دلایا ۔ ۴ھ کے اختتام پر ماہ نسی (لوند) کا اضافہ ہوا تھا اس لیے ۵ھ کا شوال ایک ماہ دیر سے آیا ۔ احد کے شوال میں کھیتیاں کھڑی تھیں تو خندق کے شوال میں فصلوں کو کٹے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا (الواقدی: مغازی) ۔ الواقدی ہی نے صراحت کی ہے کہ یہودیوں نے خیبر کی کھجوروں کی سال بھر کی فصل قبیلۂ غطفان کو دے کر اس پر آمادہ کیا تھا کہ قریش کے محاصرۂ مدینہ کے وقت یہ بھی اسلام کے خلاف جنگ میں شریک ہوں ۔ عرب کے اقصائے شمال (دومۃ الجندل) میں مدینے کو رسد لانے والے کاروانوں سے چھیڑ چھاڑ (المسعودی: التنبیہ والاشراف، ص ۲۴۸) بھی بداھۃً انھیں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی ۔ منشا یہ بھی تھا کہ آنحضرتؐ اس دور دراز علاقے کی طرف جائیں تو غطفان اور قریش دونوں مل کر مدینے کو لوٹ لیں اور پھر آنحضرتؐ کو اپنے مرکز سے دور گھیر لیں ۔ آنحضرتؐ واقعی دُومۃ الجندل روانہ ہوئے مگر (ابن ہشام، ۶۶۸) خلاف معمول آدھے راستے ہی سے مدینے لوٹ آئے ۔ ممکن ہے دوران سفر میں آپ کو دیار غطفان میں دشمن کی تیاریوں کا پتا چل گیا ہو ۔ ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ قبیلۂ خُزاعہ نے قریش کی تیاریوں کی اطلاع کے لیے ایسے تیز رفتار قاصد دوڑائے کہ وہ بارہ دن کے بجائے صرف چار دن میں مدینے پہنچ گئے، مگر آنحضرتؐ دُومہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے ۔ غالباً نائب مدینہ نے فوراً ہی یہ اطلاع آپ کو راستے میں بھجوا دی ہوگی ۔ معرکۂ خندق سے پہلے ابو سفیان نے آنحضرتؐ سے جو خط و کتابت کی (الواقدی و المقریزی)، اگر ان کا متن اصلی ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ خود قریش نے اشارۃً اپنے حملے سے خبردار کر دیا تھا ۔

دُومہ کے راستے سے مدینے آتے ہی آنحضرتؐ نے چند انصار و مہاجرین کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر کے مضافات کا چکر لگایا (الواقدی) اور خندق کھودنے اور پڑاؤ ڈالنے کی جگہ متعین کی ۔ السمہودی نے بحوالۂ ابن اسحٰق لکھا ہے کہ عہد نبویؐ میں مدینے کی ایک سمت کھلی تھی باقی تین اطراف میں مکان اور نخلستان تھے جن میں سے دشمن گزر نہ سکتا تھا ۔ ادھر کے تنگ راستوں میں چھوٹی سی جمعیت بھی دشمن کی بڑی سے بڑی قطاروں کو تیر اندازی سے بہ آسانی روک سکتی تھی ۔

عام روایت ہے کہ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان فارسی نے دیا تھا ۔ معرکۂ خندق کے دوران میں ابو سفیان نے مکرر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خط و کتابت کی (بحوالۂ الواقدی و المقریزی) اس میں طعنہ دیا کہ میدان میں آنے کے بجائے چھپ کر بیٹھ گئے اور حیرت ظاہر کی کہ خندقیں کھودنے کا نیا داؤ آپ کو کس نے سکھایا؟ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا کہ "خدا نے مجھے اس کا الہام کیا" ۔

رمضان میں مہم دُومہ سے واپسی پر آنحضرتؐ کو مشکل سے چند ہفتے ملے اور خندق کی کھدائی سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دشمن کے احزاب آ پہنچے ۔ آنحضرتؐ نے حسب معمول عورتوں اور بچوں کو آطام (گڑھیوں) میں بھجوا دیا ۔ کچھ دستے، ممکن ہے، جنوبی اور مشرقی گزرگاہوں پر مامور کیے گئے ہوں ۔ باقی پوری جمعیت جبل سَلع اور اس کے دامن میں خیمہ زن ہو کر شہر کی مدافعت کرنے لگی ۔ دشمن کی متعدد ٹولیاں (قریش، احابیش اور کنانہ) بئر رُومہ پر (مد

کے شمال مغرب میں وادی العقیق میں) مقیم ہوئیں اور شمالی ٹولیاں (غطفان، فزارہ اور بنو اسد) اس سے کسی قدر مشرق میں وادی النعمان کے پاس ذنب نقمی (نام مقام جو اب نامعروف ہے) سے جبل احد تک پھیل گئیں۔

یہود خیبر جو اصل بانی فساد تھے، اپنی غیر موجودگی کے باعث نمایاں تھے۔ صرف اِکا دُکا نظر آتے تھے، لیکن وہ بھی قریظہ کے یہودیوں کو، جو ابھی مدینے ہی میں تھے، اکسانے اور اندرون شہر سے وار کرنے پر آمادہ کرتے رہے، لیکن یہود خیبر کے نہ آنے کی شکایت قریش کو اس بنا پر نہیں تھی کہ ان کے ہاں سے رسد برابر چلی آ رہی تھی اور ایک مرتبہ حُیَی بن اخطب کے بھیجے ہوئے بیس اونٹ، جن پر جو، کھجوریں اور جانوروں کے لیے بھوسا لدا تھا، مسلمانوں کے ایک طلایہ گرد دستے کے ہاتھ پڑ گئے (سیرت شامی)۔

خندق کی حفاظتی تدابیر: ابن سعد وغیرہ کے مطابق دیار بنی حارثہ کے قلعہ راتج (اور بعض روایتوں میں آطام شیخین) سے جبل ذُباب تک کا حصہ مہاجرین کے سپرد ہوا اور وہاں سے جبل بنی عبید اور مذاد سے ہوتے ہوئے مسجد فتح تک انصار متعین کیے گئے۔ (آطام شیخین کی جانشین مسجد شیخین مجھے ۱۹۳۷ء میں جبل سلع اور جبل احد کے درمیان حرۂ شرقی کے مغربی کنارے پر نظر آئی اور شاید دو گڑھوں کی یادگار میں اس چھوٹی سی مسجد کی چھت پر برجیاں بنائی گئی ہیں؛ غالباً راتج اس کے پاس ہی ہوگا)۔ جبل ذباب پر آنحضرتؐ کھدائی کے وقت خیمہ زن تھے اس کی یادگار میں، وہاں "ذوباب" یعنی دروازے والی مسجد تعمیر ہوئی جو اب تک ذباب کے نام سے مشہور ہے اور جبل سلع میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ جبل بنی عبید کا پتا نہیں چل سکا۔ گمان ہوتا ہے کہ وہ حرۂ غربی میں مسجد قبلتین کے قریب دو پہاڑیوں میں سے مغربی پہاڑی ہوگی۔ جبل مذاد میری دانست میں جبل سلع کے مغرب کی ہلالی شکل کی پہاڑی یا اس سے ملے ہوئے ٹیکرے کا نام ہے۔ مسجد فتح وہ مقام ہے جہاں محاصرہ شروع ہونے پر آنحضرتؐ کا خیمہ منتقل ہوا۔ یہاں آنحضرتؐ نے خدا کی بارگاہ میں فتح کی دعا کی تھی۔ یہ ایک مشہور قدیمی زیارت گاہ ہے اور اب تک جبل سلع کی ایک مغربی چوٹی کے محفوظ مقام پر موجود ہے۔ ذُباب، بنی عبید، مذاد، اور مسجد فتح سے ایک مربع سا بن جاتا ہے۔ غالباً یہ آباد علاقہ تھا؛ یہاں اب بھی کچھ باغات موجود ہیں۔ عام فوج اس محفوظ علاقے میں خیمہ زن ہوگی۔ ذباب و شیخین کے بیچ کا رقبہ بھی آباد ہوگا کیونکہ ۱۹۳۴ء و مابعد میں یہاں ایک بڑے شفا خانے کی تعمیر کے لیے جگہ صاف کرائی گئی تو بیسیوں پرانے کنویں برآمد ہوئے تھے۔

الواقدی نے لکھا ہے کہ جب خندق کھودی گئی تو شہر کے جنوبی اور مغربی علاقوں کے بسنے والوں نے خندق کو اپنے طور پر عہد نبویؐ کی عیدگاہ (مصلّٰی، جہاں اب مسجد غمامہ ہے) کے قریب سے گزارا اور خاصی دور تک قبا کے رخ بڑھا دیا۔ المطری نے التعریف (تاریخ مدینہ) میں لکھا ہے کہ اب وادی بطحان سابقہ گزرگاہ کو بدل کر اس جگہ سے گزرتی ہے جہاں خندق کا یہ حصہ کھودا گیا تھا۔ اس سے وادی بطحان کی سابقہ گزرگاہ کے ایک حصے کا اگرچہ پتا نہیں چلتا، لیکن مذکورہ ذیلی خندق کے تعین میں موجودہ گزرگاہ سے معقول رہنمائی ہو سکتی ہے۔ الواقدی نے لکھا ہے کہ قبا میں بعض قبائل نے اپنے قلعوں (آطام) کے گرد بھی خندقیں کھود لی تھیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ خندق میں بعض جگہ دروازے (غیر کندہ یا عرض میں کم، خندق کی صورت میں) تھے، لیکن کس جگہ تھے؟ یہ خود الواقدی کو بھی معلوم نہ ہو سکا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس سے مراد ذباب، بنی عبید، مذاد وغیرہ کی وہ پہاڑیاں ہوں گی جن کو خندق کے زنجیرے کے متوازی بنایا گیا اور ان سے برج کا کام لیا جانے لگا؛ احتیاط کے ساتھ وہاں سے عبور و مرور بھی ممکن تھا۔

خندق کی کھدائی میں کچھ کدال پھاوڑے بنو قریظہ نے مستعار دیے (الواقدی) جو ایک معاہدے کے تحت بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کے پابند تھے۔ مسلمان رضاکاروں کی تعداد تین ہزار بیان کی گئی ہے اور ہر دس دس آدمیوں کی جماعت کو چالیس چالیس ذراع (ہاتھ) لمبی خندق کھودنے کا کام سپرد ہوا (الطبری)۔ ان تین سو ٹولیوں میں سے ہر ایک نے بیس بیس گز یعنی کل ۶ ہزار گز یا کوئی ساڑھے تین میل لمبی خندق کھودی۔ چوڑائی اور گہرائی کا مؤرخ ذکر نہیں کرتے، مگر گھوڑا پھلانگ نہ سکنے کی تصریح کی بنا پر شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دس گز چوڑی اور شاید پانچ گز گہری تھی۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے متعلق الواقدی نے لکھا ہے کہ قوی ہیکل تھے اس لیے تنہا انھیں پانچ ہاتھ لمبی اور پانچ ہاتھ گہری کھدائی کا کام سپرد ہوا (ہر جماعت ان کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے کوشش کرنے لگی تو آنحضرتؐ کو دخل دینا پڑا تھا کہ وہ کسی اور کے ساتھ نہیں بلکہ خاص میرے ساتھ ہوں گے (سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ)۔ وہ آنحضرتؐ کے آزاد کرائے ہوئے غلام تھے اور اسی لیے حسب رواج آزاد کرانے والے کے کنبے میں شامل سمجھے جاتے تھے۔ خندق کو ایک دو مرتبہ دشمن کے چند سواروں نے عبور کر لیا تھا۔ غالباً یہ پہاڑیوں کے واسطے (جہاں خندق کے دروازے تھے) آ گئے ہوں گے۔ واپسی پر ان کا ایک سوار خندق پھلانگنے کی کوشش میں گر کر مر گیا۔ دشمن نے لاش حاصل کرنے کے لیے رقم کی پیش کش کی، لیکن آنحضرتؐ نے ویسے ہی لاش ان کے سپرد کر دی۔

خندق کی کھدائی میں آنحضرتؐ خود بھی سب کے ساتھ حصہ لے کر شوق دلاتے رہے۔ اس وقت کسی کو بھی فراغت نہ تھی، لیکن محاصرے کے زمانے میں جب پہرا دینے کے لیے نوبتیں مقرر کی گئیں تو پہرے داروں کے علاوہ باقی لوگ فارغ رہتے تھے۔ جبل سلع کے بعض کنبے میری دانست میں اس زمانے کی یادگار ہیں (اس پر میرا مضمون در اسلامک کلچر، حیدرآباد اکتوبر ۱۹۳۹ء میں دیکھیے)۔

خندق کا پہرا دینے والوں میں پیدل جماعتوں کے ساتھ مسلمانوں کے تیس سوار بھی تھے۔ ایک مرتبہ رات کو دو مختلف سمتوں سے گشت کرنے والی اپنی ہی جماعتیں آپس میں گتھ گئیں، پھر عادتی شعار (پٹرول کا مقررہ لفظ) پکارا گیا تو ہتھیار رکے، مگر اس اثنا میں کچھ مارے گئے اور چند زخمی بھی ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے اپنوں ہی کے ہاتھوں مرنے والے کو بھی شہید فی سبیل اللہ اور مجروحوں کے زخموں کو جراحت فی سبیل اللہ قرار دے کر خون اور زخموں پر کوئی تاوان عائد نہ فرمایا۔ محاصرین کا زور نہ چل سکا تو یہود خیبر نے مدینے کے بنو قریظہ کو ننگ و ناموس کا واسطہ دے کر غداری پر آمادہ کر لیا اور وہ حملے کی تیاری کرنے لگے۔ ان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر قرآنی الفاظ میں مسلمانوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے [وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (۳۳ [الاحزاب]: ۱۰)]۔ خندق کے اس پار بارہ ہزار کا دشمن لشکر اب بنو قریظہ کے ڈیڑھ ہزار سے زائد قابل جنگ مردوں سے مل کر پورے دفاعی نظام کو خطرے میں ڈال رہا تھا۔ فوری تدبیر کے طور پر آنحضرتؐ نے کئی کئی سو آدمیوں کی دو جمعیتیں ان کی بستی کے دو جانب متعین کیں جو وقفے وقفے سے رات بھر نعرہ ہائے تکبیر لگاتے رہے۔ پھر غطفان و فزارہ کے قبائل کو دشمن سے توڑ لینے کی کوشش کی، مگر وہ بھاؤ بڑھانے لگے تو گفت و شنید ختم کی گئی۔ آخر آنحضرتؐ نے دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کا اہتمام کیا۔ ایک نو مسلم [نُعَیم بن مسعود الاشجعی الغطفانی] نے، جس کے اسلام لانے کی خبر ابھی پھیلی نہ تھی، پہلے بنو قریظہ کو سمجھایا کہ جنگی اقدام سے پہلے قریش سے یرغمال حاصل کر لو کہ وہ ادھوری جنگ چھوڑ کر چلے نہ جائیں، ورنہ تم تنہا محمدؐ کا مقابلہ نہ

کر سکو گے"۔ پھر قریش کے پڑاؤ میں جا کر مشہور کیا کہ بنو قریظہ نے آنحضرتؐ سے ساز باز کر لی ہے اور دوستی کا ثبوت دینے کے لیے وعدہ کیا ہے کہ قریش کے چند سرداروں کو پکڑ کر آنحضرتؐ کے سپرد کر دیں گے۔ پھر یہی خبر اسلامی لشکر میں پھیلائی اور کسی کے دریافت کرنے پر آنحضرتؐ نے فرمایا "لَعَلَّنَا اَمَرْنَا هُم بِذٰلِك" اور اس کی اطلاع بھی قریش کے پڑاؤ تک پہنچی تو دشمنوں میں باہمی غلط فہمیاں پختہ ہوگئیں اور بنو قریظہ و قریش کے تعاون کے امکانات ختم ہوگئے، [بلکہ ایک دوسرے کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھنے لگے]۔

اس اثنا میں دشمن کا سامان رسد ختم ہونے لگا [اور اللہ تعالیٰ نے قریش اور غطفان پر سخت آندھی بھیجی جس سے ان کی ہنڈیاں الٹ گئیں اور ان کے خیمے اکھڑ گئے]، سردی بڑھ گئی، شدید طوفانی ہوائیں چلنے لگیں، قریش اور ان کے ساتھی قبائل مایوسی کے عالم میں محاصرہ اٹھا کر واپس چل دیے اور مطلع صاف ہو گیا۔ اس طرح یہود خیبر کی عظیم سازش ناکام ہو گئی۔ اس کے دوسرے ہی دن بنو قریظہ کو اپنی غداری کا خمیازہ بھگتنے کا وقت آ گیا۔

جنگ خندق میں کل چھے مسلمان شہید ہوے اور آٹھ دشمن مارے گئے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ دشمن کا مدّ ختم ہو کر جزر شروع ہو گیا۔

[اس جنگ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے انصار مدینہ کے عزم و استقلال، جرأت و ہمت اور غیرت و حمیت کا پتا چلتا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ تمام عرب مسلمانوں پر چڑھ آئے ہیں تو آپ نے چاہا کہ حکمت عملی سے کام لے کر دشمنوں کے جتھے کو توڑ دیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر آپ نے غطفان کے دو سرداروں عُیینہ بن حِصن اور حارث بن عَوف سے نامہ و پیام شروع کیا اور ان سے اس شرط پر صلح کرنا چاہی کہ مدینے کی پیداوار (کھجوروں) کا ایک تہائی حصہ ان کو دے دیا جائے۔ ان سے گفتگو ہو رہی تھی کہ آپ نے انصار کے دو سرداروں سعد بن مُعاذؓ اور سعد بن عُبادہؓ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو سر تسلیم خم ہے؛ اگر یہ آپ کی اپنی پسند ہے تو بھی ہمیں آپ کی خاطر یہ قبول ہے؛ لیکن اگر یہ بات آپ ہمارے فائدے کے لیے کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہم اپنی عرضداشت پیش کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یہ بات آپ لوگوں کے فائدے کے لیے کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ تمام عرب متحد ہو کر تم پر چڑھ آئے ہیں۔ اس پر حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! جب ہم مشرک تھے اور بت پوجتے تھے تو اس زمانے میں یہ لوگ ایک کھجور بھی ہم سے نہیں لے سکتے تھے؛ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام سے مشرف کرکے ہدایت عطا کی اور آپ کی ذات گرامی سے عزت و قوت بخشی، کیا اس حالت میں ہم ان کو اپنا مال دیں؛ ہرگز نہیں؛ بخدا ان کے لیے ہمارے پاس تلوار کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران انصار کی اس رائے سے اتفاق کیا اور دشمنوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا (ابن حزم: جوامع السیرۃ، ۱۸۸).

اس جنگ میں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک معزز خاتون حضرت رُفَیدہؓ نے بھی اس معرکے میں شرکت کی۔ ان کے پاس دوائیں تھیں اور وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ حضرت سعد ابن معاذؓ جب زخمی ہو گئے تو یہی حضرت رفیدہؓ ان کے علاج کی نگران تھیں]۔

مآخذ: (۱) ابن ہشام، (نیز اردو ترجمہ)؛ (۲) طبقات ابن سعد، ۲/ ۱: ۴۷ ببعد، (نیز اردو ترجمہ)؛ (۳) الطبری (اردو ترجمہ)؛ (۴) الواقدی: مغازی، ۴۴۰؛ (۵) البلاذری: انساب الاشراف، ج ۱: ۳۴۳ ببعد (طبع حمید اللہ)؛ (۶)

البخاری، کتاب الجہاد، باب ۳۳۳، ۱ : ۱ ؛ (۷) مسلم، کتاب الجہاد، حدیث ۱۲۵ تا ۱۳۰ ؛ (۸) ابن حنبل : مسند ۱/۱۷۲ ؛ (۹) المطری : التعریف بما انست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ (مخطوطہ شیخ الاسلام، مدینۂ منورہ) ؛ (۱۰) السمہودی : وفاء الوفاء ؛ (۱۱) شبلی : سیرت النبی، ۱ : ۴۱۹ ببعد ؛ (۱۲) قاضی محمد سلیمان : رحمۃ للعالمین ؛ (۱۳) محمد حمید اللہ : عہد نبوی کے میدان جنگ ؛ (۱۴) وہی مصنف : الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ ؛ (۱۵) عبد الحی الکتانی : نظام الحکومت النبویہ المسمی : التراتیب الاداریہ، ۱ : ۲۹۸ و ببعد ؛ (۱۶) ابن حجر : الاصابۃ، عدد (۲۰۷۴) ؛ (۱۷) Caetani : *Annali Dell Islam*، ۲ : ۱۶۷ ؛ [(۱۸) محمد حمید اللہ : *Military Intelligence in the time of the Prophet* در *Islamic literature*)، لاہور ۱۹۴۹ء)] ؛ (۱۸) ابن خلدون : تاریخ، ۱ : ۲۴۷ تا ۲۵۱ (اردو ترجمہ از شیخ عنایت اللہ، لاہور ۱۹۶۰ء) ؛ (۱۹) ابن سید الناس : عیون الاثر، ۲ : ۵۴ ببعد ؛ (۲۰) ابن کثیر : البدایۃ والنہایۃ، ۴ : ۹۲ ببعد ؛ (۲۱) ابن القیم : زاد المعاد، ۲ : ۲۸۸ ببعد ؛ (۲۲) القسطلانی : المواہب اللدنیہ، ۱ : ۱۳۲ ببعد ؛ (۲۳) المقریزی : امتاع الاسماع : ۲۱۵ ببعد ؛ (۲۴) الدیار بکری : تاریخ الخمیس، ۱ : ۴۷۹ ببعد ؛ (۲۵) ابن حزم : جوامع السیرۃ، ۱۸۵ تا ۱۹۱ ؛ (۲۶) دویدار : صور من حیاۃ الرسول] ۔

(محمد حمید اللہ و [ادارہ])

⊛ **اَلْخَنْدَق** : اندلس میں متعدد مقامات کا نام : (۱) شَلْمَنْقَہ Salamanca کے قریب ایک مقام، جو اب تورہ الہندیکا Torre-Alhandiga کے نام سے مشہور ہے ۔ عیسائی مؤرخین کا بیان ہے کہ ۳۲۸ھ/۹۳۹ء میں یہاں خلیفہ عبدالرحمن ناصر کی فوجوں کو عیسائیوں کے مقابلے میں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی ۔ المقری کی رائے میں اس جنگل کا محل وقوع شہر سمورہ Zamora تھا ؛ (۲) خندق آش : یہ مقام موجودہ صوبۂ غرناطہ Granda میں فحص عبلہ اور وادی آش (Guadix) کے درمیان واقع تھا ؛ (۳) خندق فِیر : موجودہ صوبۂ المَرِیّہ Almaria میں عبلہ کے قریب واقع تھا ؛ (۴) الخنادق : یہ مقام قرطبہ Cardova سے ۲۵ میل مغرب میں واقع تھا ؛ (۵) الخندق الجنات : موجودہ صوبۂ مالقہ Malaga کا ایک مقام، جو غالباً ساحل سمندر کے قریب واقع ہوگا ۔ یہاں سے ۲۸۴ھ/۸۹۷ء میں امیر عبداللہ کی وہ فوج گزری تھی جسے ابن حفصون کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا ۔

آج کل اس نام کے صرف دو مقامات شمالی ہسپانیہ میں ملتے ہیں، یعنی تورہ الہندیکا Torre-Alhandiga اور فِرزنو الہندیکا Ferzno-Alhandiga ۔

مآخذ : (۱) Dozy : *Hist. Des Musulmans d' Espagne*، ۲ : ۶۶ ببعد ؛ (۲) الادریسی : المغرب، لائڈن ۱۸۶۶ء، بمدد اشاریہ ؛ (۳) المقری : نفح الطیب، لائڈن ۱۸۵۵ - ۱۸۶۱ء، بمدد اشاریہ ؛ (۴) وو، لائڈن، بار اول، بذیل مادۂ Albandega ؛ (۵) محمد عنایت اللہ : اندلس کا تاریخی جغرافیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۲۷ء، بذیل مادۂ الخندق و سمورہ ۔

[ادارہ]

* **خَنْسا** : (یا خِنْسا)؛ در رشید الدین : طبع Blochet، ص ۴۸۹ خِنکسائی؛ در وصاف؛ خنزائی : در طبع سنگی (بمبئی ۱۸۶۹ء) ص ۱۲ ببعد خنزای؛ در حمداللہ القزوینی : نزہۃ القلوب (طبع Le Strange، ص ۱۰۰، س ۷ اور ص ۲۶۱، س ۱۰) خنسای، جس کا تلفظ ابن بطوطہ نے خنسا دیا ہے (طبع Defrémery و Sanguinetti، ج ۴، ص ۲۸۴ ببعد، اور جس کا تعلق اس نے مشہور شاعرہ کے نام سے قائم کیا ہے (رک بہ الخنساء) ۔ چین کا ایک شہر جو سنگ Sung خاندان کی سلطنت کا دارالحکومت تھا جسے مغلوں نے ختم کر دیا ۔ اسے چینی زبان میں پہلے کنگ شا King Shew اور اب Hang-čow-fu کہتے ہیں (قب متذکرۂ بالا (گذشتہ) ج ۱، ص ۸۴۵ الف) ۔ اکثر اس شہر کا ذکر دور مغول میں آیا ہے اور

اسے اس زمانے کے مشہور بڑے بڑے تجارتی شہروں میں سے ایک بیان کیا گیا ہے۔ اسلامی اور عیسائی مآخذ اس امر پر متفق ہیں کہ وہاں مسلمان ۴۰ ہزار تک کی تعداد میں آباد تھے.

مآخذ: اسلامی مآخذ کو (۱) Quatremère نے *Histoire des mongols de la perse par Raschideldin* ' ص LXXXVI ببعد اور (۲) Ch. Schefer نے *Centenaire de l'Ecole des langues Orientales vivantes* ' میں ص ۱۹ ببعد اور ۳۲ ببعد میں جمع کر دیا ہے ' عیسائی مآخذ در (۳) I. Hellberg: L'Extrême Orient ' وغیرہ ' Göteborg ۱۹۰۶ء ' ص ۲۳۵ ببعد ' قب خاص طور پر (۴) "Quinsay" کا مکمل بیان در *Marco Polo* ' طبع 'Yule-Cordier ۲: ۱۸۵ تا ۲۱۵ - غیر ملکی نو آبادی کے بارے میں جو Hang-čow-fu میں ہے ' نیز دیکھیے (۵) Hirth اور Rotkhill: *Chao Fukua* ' سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۱ء ' ص ۱۶.

(W. BARTHOLD)

* **اَلْخَنْسَاء:** عرب کی مشہور ترین شاعرہ، اس کا اصلی نام تُماضِر بنت عمرو [بن الحارث] بن الشرید ہے وہ بنو سُلَیم میں سے تھی۔ الخنسا کا باپ بہت زیادہ شہرت اور دولت کا مالک رہا ہوگا کیونکہ المرزوقی: کتاب الازمنه (طبع حیدر آباد، ج ۲ ص ۱۶۸ ببعد) سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کا باپ اپنے دونوں بیٹوں معاویہ اور صخر کو لے کر عام الفیل کے بینتیسویں سال عکاظ کے میلے میں آیا اور کچھ اراضی جو وحیدہ مقام پر یثرب کے ضلع (مخلاف) میں تھی، جمیل شاعر کے دادا مَعْمَر ابن الحارث کو منتقل کر دی۔ الاصمعی کا بیان ہے کہ اس وقت جو دستاویز لکھی گئی تھی وہ ہارون الرشید کے زمانے تک معمر کے ورثاء کے پاس تھی۔ اگر اس دستاویز کو اصلی مان لیا جائے (جس میں مجھے شک ہے) تو الخنساء کے بھائی ہجرت سے ۱۵ سال قبل ۶۰۷ء میں اتنے بڑے ہوگئے تھے کہ وہ اپنے والد کے معاملات میں حصہ لیتے تھے۔

الخنساء کی زندگی کا سب سے پہلا واقعہ، جس کا ذکر اس کے سوانح نگار کرتے ہیں، ایک معمر شخص دُرَید بن الصِّمَّۃ کا پیام نکاح تھا۔ درید ۸ھ میں قتل ہوگیا۔ یہ الخنساء کے بھائی معاویہ کا گہرا دوست تھا اور دونوں نے عہد کیا تھا کہ جو بعد میں زندہ رہے گا وہ مرنے والے کی موت پر مرثیہ کہے گا۔ اس وقت الخنساء کم سن تھی اور چونکہ پیام نکاح اس کے بھائی کے ذریعے آیا، یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ اس زمانے کو دیکھتے ہوئے یہ بات بہت اہم ہے کہ لڑکی کو پیام نکاح پر غور کرنے کا موقع دیا گیا اور جب اس نے درید کو دیکھا تو ناپسندیدگی کا اظہار بلکہ اس کے خلاف کچھ اشعار بھی کہے جن میں اس پر اور اس کے قبیلے پر طنز کی اور ضمناً یہ بھی کہا کہ اس نے اس سے پہلے بھی بدر کے خاندان کے ایک فرد کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بدر کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کے بعد اس نے خود اپنے ہی قبیلے کے ایک فرد عبدالعُزّٰی (یا ابن قتیبہ کی روایت کے مطابق رواحة بن عبدالعزی) السُّلَمی سے شادی کی، جو اس کے بیٹے ابو شجرہ عبداللہ کا باپ تھا۔ غالباً عبدالعزی کا انتقال جلد ہی ہوگیا۔ پھر الخنساء نے اپنے قبیلے کے ایک دوسرے شخص مِرداس بن ابی عامر [السُّلَمی] سے شادی کی جس سے اس کے تین بیٹے زید، معاویہ، عمرو اور غالباً ایک بیٹی عمرہ بھی پیدا ہوئی جو اس کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ [بقول ابن حزم مرداس کے ان بیٹوں کے نام هُبَیرة، جَزْء اور معاویة تھے (جمهرة انساب العرب، ص ۲۶۲)]۔ تاریخ وار مواد کو مربوط کرنے میں بہت زیادہ دشواری پیش آتی ہے اور خود الخنسا کی اغلب تاریخ پیدائش کی تعیین بھی دشوار ہے، مگر چونکہ اس کے بیٹے ابو شجرہ نے رِدّہ [رک بآں] ۱۱ھ [۶۳۲ء] میں نمایاں حصہ لیا اور اس وقت وہ تیس

سال کا ہوگا اس لیے ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس وقت الخنساء کی عمر ۴۰ اور ۵۰ سال کے درمیان ہوگی، بلکہ غالباً اس سے بھی زیادہ ۔ العباس بن مرداس جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شعرا میں سے ہیں یقیناً الخنساء کے بطن سے نہ تھے بلکہ مرداس کی کسی پہلی بیوی سے تھے ۔ مرداس ایک بہت جانباز اور باہمت انسان تھے ۔ انھوں نے اپنے کچھ ساتھیوں کی ہمراہی میں ایک چشمے کے پاس دلدل والی زمین کو جوتنے کی کوشش کی وہاں رہنے والی ارواح نے انتقاماً ان کو آہستہ آہستہ مارنے کی ترکیب اختیار کی، یا یوں سمجھیے کہ غیر صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے کسی قسم کا بخار لاحق ہوگیا.

لیکن جس واقعے نے الخنساء کی زندگی کا رخ بدل دیا وہ اس کے دو بھائیوں معاویہ اور صخر کا انتقال تھا ۔ معاویہ عرب دستور کے مطابق ۱۸ ساتھیوں کی ہمراہی میں قبیلۂ مُرّہ پر حملہ کرنے گیا تھا ۔ اس کا اس قبیلے کے ایک فرد ہاشم بن حَرمَلَہ سے عُکاظ کے میلے میں جھگڑا ہوگیا تھا اور ایک ناکام کوشش کے بعد اس نے بنو مُرّہ کے علاقے پر پھر حملہ کیا جس میں وہ ہاشم کے بھائی دُرَید کے ہاتھوں قتل ہوگیا ۔ اب صخر پر اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کا قرض عائد ہوا اور اسے پہلے درید کو قتل کرنے میں کامیابی ہوئی جس نے کہ اس کے بھائی معاویہ کو قتل کیا تھا اور جو اس زخم سے جو (معاویہ کے ساتھ) مقابلے میں اسے لگا تھا آہستہ آہستہ اچھا ہوتا جا رہا تھا ۔ اسی اثنا میں ایک اور شُنَیمی نے اول الذکر (درید) کے بھائی ہاشم کو قتل کر دیا ۔ صخر اپنے بھائی کے اس دُہرے انتقام پر بھی مطمئن نہ ہوا اور برابر بنو مُرّہ پر حملے کرتا رہا یہاں تک کہ بنو مُرّہ کے حلیف بنو اسد میں سے ایک شخص قَقعَس نے اسے مہلک طور پر گھائل کر دیا ۔ صخر اپنے خیمے میں بہت دنوں تک نیم جان پڑا رہا اور بالآخر زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہوگیا ۔

یہ سب واقعات اسلام کے ظہور سے پہلے کے ہیں، لیکن الخنساء بہت دنوں تک زندہ رہی اور [مشرف باسلام ہوگئی ۔ اس کے چار بیٹوں نے جنگ قادسیہ (۱۶ھ) میں شرکت کی ۔ الخنساء نے اپنے بیٹوں کو بہادری اور ثابت قدمی سے لڑنے کی تلقین و تحریض کی ۔ وہ اتنی بے جگری سے لڑے کہ چاروں شہید ہوگئے ۔ الخنساء نے اپنے بیٹوں کی شہادت کو اپنے لیے شرف و فضیلت کا باعث سمجھا].

[الخنساء کے دیوان کے مخطوطے برلن، برل، پیٹرز برگ اور قاہرہ کے کتاب خانوں میں موجود ہیں ۔ دیوان کئی بار طبع ہو چکا ہے ۔ (دیکھیے براکلمان؛ معجم المطبوعات العربیہ) ۔ اس کے مرثیوں کو لوئس شیخو نے ریاض الادب فی شواعر العرب، (بیروت ۱۸۹۶ء) میں جمع کردیا ہے].

شاعرہ کی سوانح حیات اوراس کی شاعری کے محاسن کے بارے میں شیخو Gabrieli 'Cheikho اور Rhodokanakis نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے، چنانچہ اس کی زندگی اور کام کا پورے طور سے جائزہ ان مصنفین کی تحریروں سے لیا جاسکتا ہے ۔ یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ الخنساء نے مرثیوں میں کوئی نئی بات پیدا کی یا نہیں ؟ مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس کی شاعری نے بہت سے بعد میں آنے والے مرثیہ گویوں کو متأثر کیا جن میں خود اس کی لڑکی عمرہ بھی شامل ہے ۔ اگر ہم اس کے اشعار کا مقابلہ اس کے ہم عصر دوسرے مرثیہ گویوں سے کریں (میرے ذہن میں اس وقت مُتَمِّم [بن نُوَیرہ] اور ابو ذُؤَیب [الہُذَلی] ہیں تو ہم کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس کے اشعار میں وہ شاعرانہ خوبیاں نہیں ہیں جو دوسرے مرثیہ گویوں کے اشعار میں ہیں، مگر اس کے برخلاف اس کی نظموں میں، جو بہت مختصر بھی ہیں، حقیقی سوز و گداز ضرور ہے ۔ دوسری طرف ایک ہی قسم کے خیالات اور معانی کے اعادے سے ان میں ایک طرح کی یکسانیت پیدا

ہو گئی ہے ۔

مآخذ : (۱) Nöldeke : *Birttäge Zur Kenntnis der altarab Poesie*، Hanover ۱۸۶۴ء؛ (۲) دیوان: طبع شیخو، بیروت ۱۸۸۹ء؛ (۳) *Commentaire Sur le Diwān d'al-Khansā*، طبع شیخو، بیروت ۱۸۹۵ء؛ (۴) Gabrieli : *I tempi, la vita el il canzoniere della poetessa al-Hansā*، Firenze ۱۸۹۹ء؛ (۵) N. Rhodokanakiş : *al-Hansā und ihre Trauerlieder*، *S.B.Ak. wien* ۱۹۰۴ء؛ (۶) Coppier : *Le Diwān d' al-Khansā trad par le pere de Coppier*، بیروت ۱۸۸۹ء؛ (۷) الجمحی : طبقات، ص ۴۸ و ۵۱؛ (۸) کتاب الاغانی، ۱۳ : ۱۳۶ ببعد؛ (۹) الطبری، ۱ : ۱۹۰۵ ببعد؛ (۱۰) ابن قتیبہ : کتاب الشعر، طبع گخویہ، ص ۱۹۷ ببعد؛ ان کے علاوہ الخنساء کے اشعار و احوال تقریباً ان سب تصنیفات میں موجود ہیں جو قدیم عربی شاعری سے متعلق ہیں یعنی الحماسہ اور کتاب الاغانی سے لے کر آگے تک ۔ اور اس کی نظموں کا ترجمہ مشرقی شاعری کے کئی یورپی منتخب مجموعوں میں ملتا ہے جو شیخو کے مطبوعہ دیوان کے شائع ہونے سے پہلے کے ہیں؛ [(۱۱) السیوطی : شرح شواهد المغنی، ۹۸؛ (۱۲) البستانی : الروائع، عدد ۲۸، بیروت ۱۹۳۰ء؛ (۱۳) بشیر یموت : شاعرات العرب فی الجاهلیة والاسلام، بیروت ۱۹۳۴ء؛ (۱۴) براکلمان : تاریخ الادب العربی، ۱ : ۱۶۳ تا ۱۶۰ (تعریب)] ۔

(F. KRENKOW) [و اداره]

⊗ **خواجو کرمانی** : ایران کا نامور شاعر، متوطن کرمان ۔ نام کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ دولت شاہ سمرقندی نے اس کا نام محض خواجو کرمانی (ملک الفضلا) لکھا ہے (تذکرة الشعراء، طبع براؤن، ۱۹۰۰ء، ۲۳۹) ۔ ملا عبدالنبی اس کا نام افضل الدین خواجو بتاتا ہے ۔ (میخانہ، طبع لاہور ۱۹۲۶ء ص ۷۱) ۔ براؤن نے اس کا پورا نام، مع ولدیت، کمال الدین ابوالعطا محمود بن علی بن محمود لکھا ہے (*A Literary History of Persia*، ۳ : ۲۲۲) ۔ خواجو کے اشعار ذیل سے اس کا یہی نام ظاہر ہوتا ہے :

کمال الدین، سپہرِ فضل، خواجو
جہانِ علم و دریای معانی
پدر محمود کرد آن لحظه نامم
و لیکن من نمی دانم کدامم

اس کی تاریخ ولادت پر بھی تذکرہ نویس متفق نہیں ۔ البتہ خود اس نے اپنی مثنوی نو روز و گل کے خاتمے میں ہماری رہنمائی کی ہے اور تاریخ ولادت ۱۵ شوال ۶۷۹ھ (۷ فروری ۱۲۸۱ء) بتائی ہے ۔ خواجو کرمان کے ایک سربرآوردہ خاندان کا فرد تھا ۔ کرمان ہی میں اس نے تعلیم پائی ۔ فارسی کے علاوہ عربی اور دیگر علوم میں بھی دسترس حاصل کی ۔ ہوش سنبھالتے ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو تنگ دستی اور پریشان حالی سے سابقہ پڑا جس نے عالم شباب میں بھی اسے بے چین رکھا :

هرگز از روز جوانی نشدم یکدم شاد
مادرِ دهر ندانم بچه می زاد مرا

تحصیل علوم سے فارغ ہو کر خواجو نے سفر اختیار کیا جسے اس نے "چار حد ملک و مالک کی سیر" سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ شعر ذیل سے ظاہر ہے :

من که گل از باغ ملک چیده ام
چار حد ملک و ملک دیده ام

خواجو دوران مسافت رکن الملت والدین علاء الدولہ سمنانی (م ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء) کا مرید ہوا (تذکرة الشعراء، ص ۲۵۰) اور کچھ عرصہ خراسان کے شہر صوفی آباد میں گزارا [قب Ritter : *ErdKunde*، ۸ : ۳۹۶] ۔ مرشد کی مدح میں درج ذیل رباعی کہی ہے ۔

هر کو بره علی عمرانی شد
چون خضر بسر چشمه حیوانی شد

از وسوسۂ غارت شیطاں وارُست
مانند علاء دولہ سمنانی شد

صوفیۂ کرام سے اسے یوں بھی عقیدت تھی۔ شیخ ابو اسحٰق ابراہیم کازرونی (م ۴۲۶ھ/۱۰۳۴ء) اپنے زمانے کے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ان کے مزار کی زیارت کو گیا تو ان کی عقیدت میں مدحیہ اشعار کہے جو اس کی مثنوی کمال نامہ میں شامل ہیں۔ ایک اور بزرگ شیخ امین الدین محمد کازرونی (م ۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء) سے بھی اسے عقیدت تھی، ان کے فیضان صحبت کا بھی ذکر کیا ہے۔ وطن کی سیر و سیاحت کے بعد خواجو نے بغداد کا رخ کیا۔ بغداد جانے کا عزم شاید ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے کیا ہو، جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے:

برو ترکِ این محنت آباد کن
لب دجلہ و راہ بغداد کن
چو ایوب در بندِ کرمان مباش
چو یعقوب در بیتِ احزان مباش

تذکروں سے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ بغداد میں کتنا عرصہ رہا، بہرحال اشعار ذیل سے پتا چلتا ہے کہ کچھ مدت گزارنے کے بعد وہاں سے بھی بد دل ہو گیا:

زمن تاچہ آمد کہ چرخ بلند
کہ از خاک پاکم بغربت فگند
بہ بغداد بہرچہ سازم وطن
کہ ناید بجز دجلہ در چشم من

بغداد سے واپس ہوا تو اس نے مظفری خاندان کے حکمران، یزد مبارزالدین محمد (۷۱۳ھ/۱۳۱۴ء تا ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء) جو بالآخر تخت و تاج سے محروم ہو کر (۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء میں فوت ہوا) کے قصیدے کہے۔ اس کے بعد شیخ ابو اسحٰق انجو، جو حافظ شیراز کا مربی ہونے کی وجہ سے مشہور ہے، کے دربار سے وابستہ ہوا ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء۔ یہ تعلق ۷۵۴ھ/ ۱۳۵۳ء تک قائم رہا۔ اس کی شان میں متعدد قصیدے کہے۔ خواجو کے ممدوحین میں شمس الدین محمود صائن بھی تھا، جو پہلے امرائے چوپانی کی ملازمت سے منسلک رہا۔ پھر مبارزالدین کے دربار سے وابستہ ہوا بالآخر ابواسحٰق اینجو کا وزیر بنا۔ دربار ابواسحٰق میں خواجو کی حافظ شیراز سے بھی صحبت رہی۔ اس کا ایک ممدوح تاج الدین عراق عمائد کرمان سے تھا جس نے اس کا تعارف محمود صائن سے کرایا تھا۔ خواجو نے سلطان ابو سعید ایلخانی (۷۱۶ھ/ ۱۳۱۶ء تا ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء) اور اس کے وزیر غیاث الدین محمد جو اپنے والد رشیدالدین فضل اللہ کی طرح علما کی قدردانی کے لیے مشہور تھا، کے بھی قصیدے کہے۔ فارسی کے علاوہ خواجو کو عربی میں بھی دسترس تھی۔

خواجو کے بعض اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ موسیقی میں بھی اسے دستگاہ تھی۔ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیقی کے مختلف 'پردوں' اور مقاموں سے آشنا ہے اور ان کے محل استعمال سے بھی واقف ہے۔ اس قسم کی معلومات اس زمانے کے تہذیبی طبقے میں عام تھیں۔

گہی "قول" مطرب ھمی کرد گوش
گہی بادۂ لعل می کرد نوش
خوشنوایان چمن در پردۂ "عشاق" بین
نوبتِ ہر روز، ہر بانگِ ہزار آواز شد
بشنو نوای "عشاق" از پردۂ "سپاهان"
زان رو کہ از "عراق" است آن لعبت عراق

(قول، عشاق، سپاهان اور عراق پردوں اور سروں کے نام ہیں۔ غیاث اللغات، ص ۳۴۰۔ بہار عجم، ص ۱۹۶)۔

دولت شاہ سمرقندی نے خواجو کو "نخل بند شعرا" کہا ہے۔

"او را فاضلان و بزرگان دین در فصاحت و بلاغت بی نظیر می دارند و او را نخل بندِ شعرا می نامند" (تذکرۃ الشعرا، ص ۲۴۹)۔

آثار خواجو: خواجو نے مختلف اصناف سخن میں طبع

آزمائی کی۔ نظامی گنجوی کے خمسے کے طرز پر خمسہ لکھا۔ اس کے علاوہ دیوان اشعار بھی مرتب کیا۔ مثنویوں کا مختصر سا تعارف درج ذیل ہے۔

۱۔ ہمای و ہمایوں۔ خمسۂ خواجو کی یہ پہلی مثنوی ہے جو نظامی کی رزمیہ مثنوی سکندر نامہ کی بحر (متقارب) میں لکھی گئی ہے۔ شام کے بادشاہ منوشنگ قرطاس [قب ۱۵، لائڈن، بار اول : شاہ ہوشنگ؛ کرمانی ص ۳۳۰؛ لیکن خواجو کے اپنے اشعار سے (دیکھیے آگے) منوشنگ ہی درست معلوم ہوتا ہے] کے اکلوتے بیٹے ہمای اور بادشاہ چین کی شاہزادی ہمایوں کے معاشقے کی داستان ہے۔ مثنوی کا آغاز حمد و ثنا سے یوں ہوتا ہے:

بنام خداوند بالا و پست
که از هستش هست شد هرچه هست

خواجو نے شروع میں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ مثنوی امیر ابوالفتح محمد الدین محمود کے ایما پر لکھی گئی۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مثنوی کا مأخذ کوئی قدیم ایرانی قصہ ہے جو خواجو کو دیا گیا۔

فسونِ مغان بر مسلمان بخوان
چو زردشتیان زندِ رهبان بخوان

حمد و نعت اور مقربان الوہیت کی توصیف کے بعد خواجو نے اپنے ہم عصر حکمران سلطان ابو سعید ایلخانی (۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء تا ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء) اور اس کے وزیر خواجہ غیاث الدین کے قصیدے کہے ہیں؟ رومانی داستان کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے:

بر آرندهٔ دُر ز دریای راز
سر دُرج گوهر چنین کرد باز
که شاهنشهی بود در ملک شام
منوشنگ قرطاس بودش نام
نژادِ وی از نسلِ شاهانِ کی
سر او را مسخر همه روم و ری

مثنوی میں جگہ جگہ غزلیات بھی شامل کی ہیں؛ نوے اشعار کا ایک "ساقی نامہ" بھی ہے۔ درج ذیل اشعار میں خواجو نے مثنوی کا سال تصنیف ۷۳۲ھ/۱۳۳۱-۱۳۳۲ء بتایا ہے۔

من این نامور نامه از بهر نام
چو کردم بفال همایون تمام
کنم بذل بر هر که دارد هوس
که تاریخ این نامه "بذل" است و بس

اشعار کی تعداد ۳۲۰۳ ہے۔

یہ مثنوی بغداد میں لکھی گئی (تذکرۃ الشعرا، ص ۲۴۹)۔ اس کا قلمی نسخہ موزۂ بریطانیہ، لنڈن میں موجود ہے۔ اس نسخے کے ساتھ روضۃ الانوار اور کمال نامہ کے خطی نسخے بھی شامل ہیں (شمارہ ۱۸۱۱۳، Add)؛ ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتاب خانے میں ہے (شمارہ ۱۳۳۴)؛ پاکستان و ہند میں یہ مثنوی پہلی بار فخرالدولہ مرزا علاء الدین خان بہادر رئیس لوہارو کی تصحیح سے ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں طبع ہوئی (صفحات ۲۹۳)؛ دوسری مرتبہ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں بمبئی میں طبع ہوئی (صفحات ۲۹۵)۔

۲۔ نو روز و گل یہ بھی عشقیہ مثنوی ہے جو نظامی کی خسرو و شیریں کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی خراسان کے حکمران فیروز کے بیٹے نو روز اور قیصر روم کی شاہزادی گل کے معاشقے کی داستان ہے۔ ضمناً تین اور داستانیں بھی آئی ہیں جو شاہزادے کا غم غلط کرنے کے لیے اسے سنائی گئی تھیں۔ روانی اور جذبات نگاری کے اعتبار سے یہ مثنوی خواجو کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ آغاز اس شعر سے ہوا ہے:

بنام نقشبندِ صفحهٔ خاک
عذار افروزِ مهرویانِ افلاک

مثنوی تاج الدین عراقی کے نام منسوب ہے جو مظفری بادشاہ مبارز الدین کا وزیر ہوا تھا۔ سال تصنیف ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء ہے جیسا کہ خواجو نے خود لکھا ہے:

دو شش بر هفتصد و سی گشته افزون
بپایان آمد این نظم همایون

اشعار کی تعداد ۲۶۱۵ ہے۔ یہ مثنوی بغداد میں تکمیل پذیر ہوئی۔

۳۔ روضۃ الانوار، نظامی کی مخزن الاسرار کے طرز پر لکھی گئی۔ اس میں صوفیانہ مسائل بیان کیے گئے ہیں جو بیس مقامات پر مشتمل ہیں۔ ہر مقالے کے تحت عرفانی، دینی اور اخلاقی حکایات آئی ہیں۔ اس مثنوی میں شاعر کی پختگی خیال اور عظمت فکر نمایاں ہے جو اس کی انفرادیت کی مظہر ہے۔ مقالات کی ترتیب یہ ہے (۱) "حقیقت سخن"۔ نمونے کے طور پر اس کے تین شعر درج کیے جاتے ہیں:

عقل کہ اقلیمِ سعادت کشود
بر درِ دل چشمِ فراست کشود
شد بسخن تیغِ زبان دُر فشان
گشت سخن گوہرِ تیغِ زبان
جان نگر از دل بزبان آمدہ
و آبِ حیات از لبِ جان آمدہ

(۲) در مقامات اولیا و صفات آنان (۳) در کمال مراتب بشر و در بلندی مقام انسان: یہ خواجو کا خاص موضوع ہے:

ای بخِرَد فاطرِ نُہ بارگہ
وی بنظر مُشرفِ شش کامگہ
گلبنِ جان، بجوش نظرِ باغِ تو
لالۂ دل سوختۂ داغِ تو
ھیکلِ دل در برت افگندہ اند
شورِ خِرد در سرت افگندہ اند

(۴) در تنبیہ و تہدید (۵) در انقلاب امور (۶) دریافتن معنی انسان (۷) احوال نفس و اتحاد نفس با حق (۸) شرح آیت عشق (۹) اعراض از عالم ظاہر و رجوع بباطن (۱۰) در صفت پیری و غنیمت جوانی (۱۱) در مذمت بادہ پرستی (۱۲) در عقل و حیا (۱۳) در مذمّت کبر (۱۴) در صفت سخا و کرامت (۱۵) در صفت عالم وحدت (۱۶) در تصفیۂ باطنی (۱۷) در صفت غرور (۱۸) در صفت آفرینش۔ (۱۹) در صفت توحید (۲۰) در صفت انسان۔

مثنوی کی تکمیل کازرون میں شیخ ابواسحٰق ابراہیم کازرونی کی خانقاہ میں ہوئی۔ (خاتمۂ کتاب) سال تصنیف ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء ہے جو مصرع ذیل سے نکلتا ہے۔

"جیم" زیادت شدہ بر "میم" و "ذال"

یہ مثنوی خواجو نے شمس الدین محمود صائن وزیر ابواسحٰق اینجو کے نام معنون کی ہے۔

۵۔ کمال نامہ۔ یہ نظامی کی عشقیہ مثنوی ہفت پیکر کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ موضوع دین و عرفان اور اخلاقیات ہے۔

حمد کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نعت کہی ہے، اس کے بعد ابو اسحٰق ابراہیم کازرونی کو عقیدت پیش کی ہے، پھر اپنے بیٹے مجیرالدین ابوسعید علی سے خطاب کیا ہے اور اسے مزید تحصیل علم و ہنر کی تلقین کی ہے۔ بعد ازاں مذہب و اخلاقیات پر بارہ مقالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہر مقالے کے تحت عرفانی، دینی اور اخلاقی حکایات لکھی ہیں۔

خاتمے میں عالم رؤیا میں زیارت پیر کا ذکر کیا ہے۔ اسی حالت میں خواجو کو کلام سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے تو وہ اسی مثنوی کے اشعار پڑھتا ہے مثنوی کا نام کمال نامہ اسی عالم میں پیر و مرشد نے تجویز کیا۔

نام نظمم کمال نامہ نہاد
از کمالیّتم دری بکشاد
خرقہ داد و اجازتم فرمود
رہِ ملکِ حقیتم بنمود

دوسرے شعر سے واضح ہوتا ہے کہ خواجو کو عالم رؤیا میں مسند ارشاد کا بھی حق عطا ہوا۔ میخانۂ عبدالنّبی میں اس حق ارشاد پر یوں روشنی ڈالی ہے:

"بہ کرمان آمد و در آن جا خانقاہی ساخت۔ بقیۂ عمر در آن خانقاہ با درویشان بخدا پرستی مشغول بودہ

(میخانہ، : طبع لاہور، ۱۹۲۶ء، ص ۴۳)۔
مثنوی کمال نامہ ابواسحٰق اینجو کے نام معنون ہے۔ اختتام پر ایک پر زور قصیدہ اس کی شان میں کہا ہے۔ مثنوی کا سال تصنیف ذیل کے شعر کی رو سے ۷۴۴ھ/۱۳۴۳ء ہے۔

شد بتاریخ هفصد و چل و چار
کار این نقشِ آزری چو نگار

مثنوی کا قلمی نسخہ، جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، برٹش میوزیم لنڈن میں موجود ہے۔

۵۔ گوہر نامہ اخلاق و تصوف کے بیان میں ہے اور نظامی کی عشقیہ مثنوی خسرو و شیرین کی بحر میں لکھی گئی ہے، مصنف نے گوہر نامہ اور گہر نامہ دونوں طرح سے اس کا نام لیا ہے:

چو کردم گوہر افشان نوکِ خامہ
گہر نامہ نہادم نام نامہ
کہ گوہر نامہ ای را کر بہائی است
بہایش دُرِّ دُرج کبریائی است

مثنوی کا آغاز نعت و مناجات سے ہوا ہے۔ اس کے بعد مظفری خاندان کے بانی، مبارزالدین کی مدح کی ہے پھر خواجہ بہاءالدین (وزیر مبارزالدین)، اس کے آبا و اجداد اور اس کے جدّ اعلیٰ نظام الملک طوسی کے قصائد کہے ہیں۔ قصائد کے آغاز میں شاعر "دانش افروز" سے خواجہ بہاءالدین کے جدّ اعلیٰ کے متعلق سوال کرتا ہے۔ اسے جواب ملتا ہے:

گہر جویے چو او عالی گہر کیست؟
ہنر جویے چو او صاحب ہنر کیست؟
نظام الملک طوسش جدِّ اعلیٰ است
شود کارِ نظام الملک ازو راست

یہ قصائد نظام الملک کی چھے پشتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ خواجو جیسے شاعر سے یہ توقع تھی کہ وہ اس دور کے کچھ تاریخی واقعات بھی نظم کرتے کا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ قصائد محض تعریف و توصیف پر مبنی ہیں۔ مثنوی میں خواجو نے جگہ جگہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ آخر میں ایک غزل محبوب کو خطاب کرکے کہی ہے۔ گوہر نامہ کے اشعار کی تعداد بقول خواجو ۱۰۳۲ ہے:

چو این ابیات مطبوعت پسند است
اگر خواہی کہ بشماری کہ چند است
حسابی از نظام الملک بر ساز
۱۱۱۲
وزآن مجموع لام و نون بینداز
۳۰ ۵۰

گویا ۱۱۱۲ سے ۸۰ کم کرنے سے تعداد ۱۰۳۲ ہوتی ہے۔ مثنوی کا سال تصنیف ۷۴۶ھ/۱۳۴۵ء ہے:

مہ تیر و زمہ یک نیم رفتہ
زہجرت "ذال" و "واو" و "میم" رفتہ
۷۰۰ ۶ ۴۰

مثنوی گوہر نامہ کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔ ایک نسخہ برٹش میوزیم لنڈن میں بھی ہے۔ خمسہ کے علاوہ ایک اور مثنوی مفاتیح القلوب و مصابیح الغیوب بھی خواجو نے لکھی تھی (وو لانڈن شمارہ ۴۲، کرمانی، ص ۱۰۳۴) اس کا خطی نسخہ شاہ اودھ کے کتب خانے میں موجود ہے (دیکھیے شپرنگر اودھ کیٹلاگ، شمارہ ۳۴۲) یہ مثنوی ۲۸ ابواب پر مشتمل ہے جن میں مذہبی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

مثنویوں کے سلسلے میں خواجو کے ساقی نامہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ یوں تو ساقی نامہ کے چند اشعار نظامی کے ہاں بالخصوص سکندر نامہ کے ہر باب کے آخر میں آئے ہیں، جن میں ساقی کو خطاب کر کے اگلے باب کی طرف قارئین کو توجہ دلائی ہے لیکن خواجو نے ہمای و ہمایون میں ۹۰ اشعار پر مشتمل مستقل نظم کی صورت میں ساقی نامہ لکھا ہے اس میں وہ بے ثباتی دنیا کا مؤثر انداز میں ذکر کرتا ہے اور اس کے المیہ اثرات کو بھلانے کے لیے ساقی سے حیات آفرین جام طلب کرتا ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

بدہ ساقی آن عین آب حیات کہ دوران گیتی ندارد ثبات

دیوان خواجو ۔ خواجو کا دیوان قصائد، غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے ۔ دیوان کے اشعار کی تعداد دولت شاہ نے ۲۰ ہزار بتائی ہے! (نیز دیکھیے شپرنگر، اودھ کیٹلاگ ص ۳۷۲) قصائد جو شامل دیوان ہیں ان میں سے کچھ آل مظفر کے بانی مبارزالدین، ابو اسحق اینجو اور شروانشاہ بن منوچہر کی مدح سرائی کی ہے ۔ ایک منظوم مکتوب شماخی کے حکمران شروانشاہ کے نام ہے ۔ خواجو کا ایک ترجیع بند بھی ملتا ہے، ترجیعی شعر یہ ہے :

که جهان صورت است و معنی دوست
ور بمعنی نظر کنی همه اوست

براؤن نے خواجو کا ایک مستزاد بھی درج کیا ہے اس کے دو مصرعے یہ ہیں :

تاچند مخالف زنی ای مطرب خوشگو از پردۂ عشاق
بنواز زمانی من بی برگ و نوا را از بانگ نوائے

خواجو نے قصائد میں خاقانی اور انوری کی پیروی کی ہے ۔ خاقانی اور خواجو کے دو مطلعے بغرض تقابل درج ذیل ہیں :

خاقانی : صبحدم چون کله بندد آه دُود آسائے من
چون شفق درخون نشیند چشم شب پیمائے من

خواجو : دوش چون در جنبش آمد قلزم سودائے من
موج خون بر اوج زد چشم محیط آسائے من

مثنویاں اگرچہ خواجو نے نظامی گنجوی کی تقلید میں لکھیں لیکن ان کے مضامین میں خواجو کی انفرادیت بھی نظر آتی ہے ۔ غزل البتہ ایسی صنف ہے جس میں خواجو کی انفرادیت نسبةً زیادہ نمایاں ہے .

خواجو نے عشق و عاشقی کے جذبات کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی، وسعت مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا ہے ۔ اکثر پوری کی پوری غزلیں دنیا کی بے ثباتی پر کہی ہیں .

ایک غزل کے بعض اشعار درج ذیل ہیں :

پیش صاحب نظران ملک سلیمان باد است
بلکه آنست سلیمان که ز ملک آزاد است
آنکه گویند که بر آب نهاد است جهان
مشنو ای خواجه که تا در نگری بر باد است
خاک بغداد بخون خلفا می گرید
ورنه آن شط روان چیست که در بغداد است
حاصلے نیست بجز غم بجهان خواجو را
خرّم آنکس که بکلی ز جهان آزاد است

خواجو کی غزل گوئی کی یہی خصوصیت ہے جس پر حافظ نے اپنی شاعری کی بنیاد قائم کی اور اس کے اسلوب میں غزل سرائی کی ۔ چنانچہ وہ اس بات کے معترف بھی ہیں :

استاد غزل سعدی است پیش همه کس امّا
دارد سخن حافظ طرز و روش خواجو

شبلی نعمانی نے خواجو اور حافظ کی غزلیات کا موازنہ کیا ہے (شعرالعجم، ج ۲، ص ۲۱۲ تا ۲۱۶، طبع لاہور ۱۹۲۴ء)، جس سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حافظ نے خواجو کا اسلوب اختیار کیا، یہاں تک کہ جزئیات میں بھی اس کی پیروی کی ۔ دو غزلوں کے ایک ایک شعر درج ذیل ہیں :

خواجو : انا صبا خبری کن مرا ازان که تو دانی
بدان زمین گذری کن بدان زمان که تو دانی

حافظ : نسیم صبح سعادت برآن نشان که تو دانی
گذر بکوی فلان کن درآن زمان که تو دانی

خواجو : منزل از یار قرین است چه دوزخ چه بهشت
سجدۂ ای گر به نیاز است، چه مسجد چه کنشت

حافظ : همه کس طالب یاراند چه هشیار چه مست
همه جا خانۂ عشق است چه مسجد چه کنشت

تصوّف و عرفان خواجو کی مثنویات کے تو خاص موضوع ہیں لیکن بعض غزلیات میں بھی صوفیانہ رنگ نمایاں ہے.

خواجو کے سال وفات کے بارے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ دولت شاہ سمرقندی نے اس کا سال وفات ۷۴۲ھ/(۱۳۴۱-۱۳۴۲ء) لکھا ہے

(تذکرۃ الشعراء، ص ۲۵۱) عبدالنبی نے بھی میخانہ میں یہی سال وفات دیا ہے (ص ۷۲، ۷۴) لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ۷۴۴ھ/۱۳۴۳ء میں اس نے مثنوی کمال نامہ مکمل کی اور خود تاریخ بھی کہی، جیسا کہ اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ خزانۂ عامرہ میں اس کا سال وفات ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء دیا گیا ہے۔ براؤن بھی اس سے متفق ہیں (دیکھیے *A Literary History of Persia* : vol 3.، ص ۲۲۳ مزار 'تنگ اللہ اکبر' میں بیان کیا جاتا ہے لیکن اس پر کوئی کتبہ نصب نہیں۔

مآخذ : (۱) خمسۂ خواجو : ہمای و ہمایون، نوروز و گل، روضۃ الانوار، کمال نامہ، گوہر نامہ؛ (۲) دولت شاہ سمرقندی : تذکرۃ الشعرا، طبع براؤن، ۱۹۰۰ء؛ (۳) عبدالنبی : میخانہ، طبع محمد شفیع لاہوری؛ (۴) غلام علی آزاد بلگرامی : خزانۂ عامرہ؛ (۵) لطف علی بیگ آذر : آتشکدہ، بمبئی ۱۲۹۹؛ (۶) حمد اللہ المستوفی : تاریخ گزیدہ، طبع براؤن؛ (۷) Rieu : Cat. Persian MSS؛ (۸) Sprenger : *Oudh Catalogue*، (۹) Rosen : *Manuscr Persans de l' Instiut*؛ (۱۰) Cat. Persian Poets Bankipore، ;Firdausi to Hafiz؛ (۱۱) *Grundriss der Iran Phil II, 248*؛ (۱۲) E.G. Browne : *A Literary History of Persia*، ج ۳؛ (۱۳) شبلی نعمانی : شعرالعجم، ج ۲، طبع لاہور۔

(مقبول بیگ بدخشانی)

* ⊛ **خواجہ :** (ف)، جس کے اشتقاق کا صحیح علم نہیں [توران میں سادات کا لقب (محمد بادشاہ شاد: فرہنگ آنند راج، ج ۲، طبع کتابخانۂ خیام)] یہ عزت کا لقب ہے جو ممتاز شخصیتوں کے لیے مخصوص ہے۔ عام طور پر یہ لقب بادشاہ کے وزیروں کا ہوتا تھا۔ جو اہل دانش میں سے چنے جاتے تھے [مثلاً ملک زوزن را خواجہ بود کریم النفس و نیک محضر، الخ (سعدی : گلستان، ۱۴۵، طبع چاپخانۂ علی اکبر ۱۳۲۷ھ ش)]۔

چھٹی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی کے شروع میں یہ لفظ انوری کے ایک شعر میں ملتا ہے؛ اس سے مشتق اسم ذات 'خواجگی' جو سوداگر یا تاجر کے مفہوم میں ہے Meninski اور سسلی (صقلیہ) کی دستاویزوں میں ملتا ہے جنہیں Michele Amari نے شائع کیا (ص ۲۱۲، ۲)۔

[انہیں معنوں میں مولانا جلال الدین رومی کے ہاں بھی آیا ہے :

از سوی خانہ بیامد خواجہ اش
بر دکان بنشست فارغ خواجہ وش

(مثنوی معنوی چاپ امیر کبیر، ۱۳۳۶ھ ش۔ عدد ۲۵۱، انہیں کے ہاں خواجہ 'آقا' کے معنی میں بھی آیا ہے :

خواجہ چون بیلی بدست بندہ داد
بی زبان معلوم شد او را مراد (عدد ۹۳۲)

سعدی لکھتے ہیں :

من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم بندۂ بارگاہ سلطانیم

خواجہ بمعنی توانگر (مغرور) بھی آیا ہے۔ سعدی :

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلی
حاصل خواجہ بجز پندار نیست

صائب :

یوسف مصر وجودیم از عزیزیہا ولیک
ہر کہ با ما خواجگی از سر گذارد بندہ ایم

خواجہ 'عارف کامل' کے معنوں میں بھی آیا ہے؛ حضرت معین الدین چشتی سیّد تھے لیکن عشق الٰہی اور محبت رسولؐ کی بدولت جو انہیں عرفان حاصل ہوا، اس سے وہ خواجہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ خضر علیہ السلام کو بھی عرفان کی بدولت خواجہ خضر کہہ دیتے ہیں۔ خواجہ 'برگزیدہ' کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسے خواجہ حافظ شیرازی۔ معنوی مناسبت اور امتیاز کی غرض سے پاکستان و ہند میں خواجہ، (جو عزیزوں کا لقب ہے) کا الف حذف کرکے خوجہ لکھتے ہیں، یہاں تک کہ کشمیریوں کا لقب بھی الف کے بغیر ہی مستعمل ہے۔ (فرہنگ آنند راج، ۲)۔ اب تو کشمیری

برادری کے لیے خوجہ کے بجائے خواجہ ہی آتا ہے کبھی خواجہ کی تصغیر خواجو بھی لکھ دیتے ہیں۔ (دیکھیے Grundris der Iran. Phil., i/ii) جیسے خواجو کرمانی۔

عربی میں اس کا رواج خواجا اور خواجہ کی شکلوں میں ہوا۔ زمانۂ حال کے خواجہ (مشرقی زبانوں میں) کے معنی جناب، مسٹر اور موسیو کے ہیں۔ عثمانلی ترکی میں اس لفظ کو خوجہ [رک بآں] کی شکل میں مستعار لے لیا گیا اور یہاں یہ، کاتب، محرر، نقل کنندہ، اور ذاتی اتالیق کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ عربی کی مغربی بولیوں میں بھی پایا جاتا ہے جہاں اس لفظ کو اسی تلفظ اور معنی کے ساتھ لے لیا گیا ہے۔ یہ الف لیلہ و لیلہ میں بھی ملتا ہے (دیکھیے ڈوزی: ضمیمہ) خوجہ کا خطاب شیخ کی طرح، ترکستان میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی اولاد کو دیا جاتا ہے، جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا ان کی دوسری بیویوں سے ہیں۔

مآخذ: Defrémery : *Mémoires d' histoire 'Orientale*' ج ۲' ص ۳۰۷، عدد ۱: (۲) Malcolm : '*History of Persia*' لاہور' ۱۸۸۸ء ص ۸۶؛ (۳) سعدی: گلستان' کتاب فروشی و چاپخانۂ علی اکبر علمی' ۱۳۲۷ھ ش؛ (۴) جلال الدین رومی: مثنوی معنوی از انتشارات امیر کبیر' طبع ۱۳۳۶ھ ش تہران؛ (۵) محمد پادشاہ: فرہنگ آنندراج' از انتشارات کتابخانۂ خیام' طبع تہران ۱۳۳۶ھ ش؛ (۶) ٹیک چند بہار: بہار عجم' طبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۶ء؛ (۷) فرہنگ آصفیہ۔

(Cl. Huart [و ادارہ])

* **خواجہ اجمیری**: رک بہ چشتی۔

* ⊗ **خواجہ خِضَر**: (یا خِضْر) [خَضِر، قب لسان العرب: خِضْر و خَضِر، قب غیاث اللغات: خِضْر، خِضَر، قب فرہنگ آنندراج: ج ۲ [نیز رک بہ الخضر]۔

گر خِضَر در بحر کشتی را شکست
صد درستی در شکستِ خِضَر ہست

(مثنوی معنوی)، تہران، عدد ۲۳۶

غالب: کیا کیا خِضَر نے سکندر سے، الخ۔

اقبال: دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خِضَر، الخ بانگ درا، طبع لاہور، ۲۸۸-۲۸۹۔ وہ روایتیں اور قصے جو الخضر سے متعلق ہیں ان کا مبدأ وہ قرآنی کنایہ ہے جو سورہ ۱۸، آیات ۵۹-۸۱ میں موجود ہے [رک بہ الخضر] ہندوستان میں انھیں بہت سی جگھوں پر دریا کے دیوتا یا کنووں اور چشموں کی روح کا روپ سمجھا جاتا ہے۔ ان کا ذکر سکندر نامے میں ایسے بزرگ کی حیثیت سے آیا ہے جو چشمۂ حیات کے نگران تھے۔ یہ نام پاکستان و ہند میں اپنا لیا گیا ہے۔ ہندو مسلم سب ان کی عزت کرتے ہیں۔ دریائے سندھ کے آس پاس انھیں اکثر دریا کا اوتار سمجھا جاتا ہے اور کبھی کبھی وہ سبز لباس میں ملبوس ایک عمر رسیدہ شخص کی صورت میں دیکھنے میں بھی آتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی ڈوبنے سے بچ جائے تو کہا جاتا ہے، ایسے خواجہ خضر نے بچا لیا۔ (قب Temple : '*Legends of the Panjab*' ۱ : ۲۲۱)۔

[خضر کی روحانی فضیلت اور حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کے ہم سفر ہونے کا ذکر اکثر شعرا نے کیا ہے۔ اقبال:

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

علامہ اقبال نے اشعار ذیل میں خضر کو 'نگران بحر' اور 'رہنمائے جویائے اسرار' کے طور پر پیش کیا ہے:

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خِضَر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل

چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

"جواب خضر" نظم میں خضر کو صحرا نورد ظاہر کیا ہے اور ان کے 'تگاپوے دمادم' کو زندگی کی دلیل بتایا ہے:

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے
یہ تگاپوے دمادم زندگی کی ہے دلیل

بانگ درا، ص ۲۹۱].

ایک بلوچ شاعر کی نظم میں، جو دریاے سندھ کی ایک جنگ کے بارے میں ہے، ایک کشتی کے دریا میں چھوڑ دیے جانے کا بیان ہے تاکہ "وہ خواجہ خضر کی لہروں میں تیرے" اور یہ دعوٰی کیا گیا ہے کہ "خواجہ خضر خود اس جنگ کو یاد رکھیں گے" (بلوچوں کی عوام پسند شاعری = *Popular poetry of the Baloches*، ۱ : ۷۴) ایک اور شاعر نے خضر کا نام میکائیل کے نام کی جگہ بطور ایک بڑے فرشتے کے لیا ہے۔ ان کی خانقاہ (Shrine) سندھ کے ایک جزیرے میں بھکر کے پاس ہے جہاں ہر مذہب کے عقیدت مند زیارت کو جاتے ہیں (*Sind Revisited*، ۲ : ۲۲۶)۔ Manucci جو بھکر کے محاصرے (۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء) کے وقت موجود تھا، اس زیارت گاہ کا ذکر Coia Quitan کے نام سے کرتا ہے۔

نیز دیکھیے Burnes: *Travels into Bukhara*، لندن ۱۸۳۴ء۔

ان بزرگ کے بارے میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مچھلی پر سوار ہوتے ہیں۔ مچھلی کو اودھ کے بادشاہوں نے اپنا امتیازی نشان (crest) بنا لیا تھا جو ان کے سکوں پر بھی کندہ ہوا۔ مسلمانوں میں لڑکے کے عقیقے کے موقع پر خواجہ خضر کی فاتحہ دی جاتی ہے اور ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کشتی دریا میں ڈالی جاتی ہے؛ موسم برسات کے ختم ہونے پر بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے۔

مآخذ: (۱) جلال الدین رومی: مثنوی معنوی، طبع محمد علی علمی، تاریخ ندارد؛ (۲) اقبال: بانگ درا، طبع لاہور؛ (۳) Crooke: *Popular Religion and Folklore of N. India*، لندن ۱۸۹۶ء؛ (۴) Burton: *Sind revisited*، لندن ۱۸۷۷ء؛ (۵) Temple: *Legends of the Panjab*، ج ۱، بمبئی ۱۸۸۴ء؛ (۶) Longworth Dames: *Popular Poetry of the Baloches*، لندن ۱۹۰۷ء؛ (۷) W. Irvine: *Storia do Mogor (Manucci)*، لندن ۱۹۰۷ء؛ (۸) A. Burnes: *Travels into Bokhara*، لندن ۱۸۳۴ء؛ (۹) J. Wise: *Muhammadans of Eastern Bengal, Journ. As. Soc. Bengal*، ۱۸۹۴ء، شمارہ ۶۳، جز ۳، ص ۲۸ ببعد۔

(M. LONGWORTH DAMES [و ادارہ])

خوارزم: یا خیوہ، ایک ملک، جو آمو دریا [رک بآن] کی زیریں گزرگاہ پر واقع ہے۔ قیاس ہے کہ ایک زرخیز ڈیلٹا کے علاقے پر مشتمل ہونے کے باعث یہ ملک قدیم زمانے ہی سے وسط ایشیا کی تہذیب کے ارتقا میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہوگا۔ نولدکہ Nöldeke (در Z.D.M.G.، ۵۹ : ۴۳۴ ببعد) کے اعتراضات کے باوجود J. Marquart کی اس متنازع فیہ رائے کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کہ "خوارزم ہی 'ایریانم ویجو' (Airyanem-Waedgo) یعنی سرزمین اوستا تھا" (*Ērānšahr*، برلن ۱۹۰۱ء، ص ۱۵۵)۔ ہیروڈوٹس Herodotos (۳ : ۱۱۷) کے قول کے مطابق دریاے آکیس Akes کی وادی، جو بین الاقوامی اعتبار سے بہت اہم تھی، ایرانیوں کی حکومت سے پہلے خوارزمیوں کے قبضے میں تھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وسط ایشیا کی تاریخ میں اس وقت بھی قدیمی خوارزم خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ ہکاتایوس Hekataios (جز ۲، ۱۷۲ و ۱۷۳) کے بیان کی رو سے سرزمین خوارزمیان (Chorazmians) پارتھیا [موجودہ خراسان] کے مشرق میں واقع تھی اور دارالحکومت کا نام خوارزمیا Chorasmia (χορασμίη) تھا۔ بقول ہیروڈوٹس (۷ : ۶۶) خشیارشا (Xerxes [= اخشویرش]) کی فوج کا ایک حصہ اہل پارتھیا

اور خوارزمیوں پر مشتمل اور ایک ھی سپہ سالار کے ماتحت ھوا کرتا تھا، تاھم ھیروڈوٹس کا یہ بیان (۳: ۹۳) محل نظر ھے کہ نہ صرف خوارزمیہ اور پارتھیا کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا گیا بلکہ سغدیانہ [الصغد] اور اریہ Aria [=ھراة] کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔

سکندر اعظم کے زمانے میں خوارزم کے باشندے شاھنشاہ ایران کی رعایا نہیں رھے تھے بلکہ ان کا اپنا بادشاہ تھا؛ یہ معلوم نہیں ھو سکا کہ انہوں نے ایرانی حکومت کا جوا کب اور کیسے اتار پھینکا۔ بقول اریان Arrian (۴: ۱۵، س ۴ تا ۵) ۳۲۸ ق م کے موسم بہار میں سکندر نے شاہ خوارزمیان، فرسمانس Pharasmanes، کا باختر [= بلخ] میں استقبال کیا تھا، جو ڈیڑھ ھزار سواروں کے جلو میں وھاں پہنچا تھا۔ کہا جاتا ھے کہ فرسمانس کا دعوی تھا کہ اس کی حدود سلطنت مغرب میں بحیرۂ اسود کے ساحل پر کلخیس (Colchis) تک پھیلی ھوئی ھیں۔ کرتیوس (Curtius) (۸: ۱، س ۸) نے محض شاہ خوارزمیان کی بھیجی ھوئی ایک سفارت کا ذکر کیا ھے اور وہ اس بادشاہ کا نام فراتافرنیس (Phrataphernes) بتاتا ھے۔

اس کے بعد آٹھویں صدی عیسوی تک خوارزم کی سیاسی تاریخ کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ اسی طرح اس کا محل وقوع بھی غیر یقینی ھے۔ بقول بطلیموس (Ptolemy) خوارزمی دریائے جیحون [= آمو دریا] کے مشرقی کنارے پر آباد تھے اور ان کی جائے سکونت اور زمانۂ مابعد کے دارالسلطنت کاث [رک بآں] یا کات (شیخ عباس ولی کے موجودہ کھنڈروں) کی جائے وقوع ایک ھی تھی۔ اس کے خلاف خوارزم کے قدیم ترین چینی نام یوکین (Yue-Kien) سے (جو ھنوں (Hans) کی ابتدائی تاریخ میں مذکور ھے) یہ ظاھر ھوتا ھے کہ وہ شہر گرگانج (موجودہ کُنیہ۔ اُرگنج (Kunya-Urgenč ھے۔ البیرونی نے جو مقامی روایت بیان کی ھے، (آثار الباقیۃ، طبع Sachau ص ۳۵) اس کے مطابق فِیر یا فِیل، یعنی کاث کا قلعہ ۶۲۶ عہد سلوکسی (۳۰۴ء) تک نہیں بنا تھا۔ البیرونی کے بیانات اور بعد کے زمانے کی اطلاعات سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ متاخر مسلمان مصنفین (ابن الاثیر، طبع ٹورن برگ، ۹: ۲۶۷) کا یہ خیال واقعات کے مطابق نہیں کہ ایک قدیمی خوارزم بحیرۂ خزر کے قریب دریائے بلخان کے کنارے واقع تھا۔

خوارزم میں سلوکسی عہد کے آغاز سے ۹۸۰ سال قبل (۱۲۹۲ ق م) خوارزم میں تہذیب و تمدن کی ابتداء، سیاوش کی آمد اور بانوے سال بعد، یعنی ۱۲۰۰ ق م میں اس کے بیٹے کیخسرو کے قیام سلطنت اور حماسۂ ملّی کے اس بطل جلیل کی نسل سے ایک مقامی خانوادۂ شاھی کے ظہور کے بارے میں البیرونی نے جو کچھ بیان کیا ھے، وہ بڑی حد تک افسانوی روایات پر مشتمل ھے۔ اس خاندان کے نسب نامے کے بارے میں اس کے بیانات ۳۰۴ سے ۹۵۵ء تک کے دور پر حاوی ھیں۔ اس نے بتایا ھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں یہاں کون کونسے بادشاہ حکومت کرتے تھے، قُتیبۃ بن مسلم نے ۹۳ھ/ ۷۱۲ء کے قریب اس سرزمین کو فتح کرنے کے بعد کسے تخت پر بٹھایا تھا؟ اور یہ کہ مؤخرالذکر بادشاہ کا نام شاوُش فر تھا۔ خاندان تانگ Tang (تانگ شُو T'ang-shu) کے چینی وقائع میں ایک سفارت کا ذکر ملتا ھے جو خوارزم کے بادشاہ شاوشی فین Shao-she-fen نے ۷۵۱ء میں چین بھیجی تھی (E. Chavannes : *Documents sur les Turcs Occidentaux*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۴۵)۔ اس سے البیرونی کے بیان کی تصدیق تو ھو جاتی ھے لیکن اس کے برعکس البیرونی کا یہ بیان قرین قیاس نظر نہیں آتا کہ عالموں اور پروھتوں کا قتل عام کر دیا گیا اور کتابوں کو جلا دیا گیا تھا (وھی کتاب، ص ۴۶۰، س ۲ و ص ۴۸، س ۱۳)۔ خوارزم کی تقویم اور ان کے تہواروں کے بارے میں اس کے ھاں جو حوالے

ملتے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی تک خوارزم میں، اور گیارھویں صدی عیسوی تک زرتشتیوں کے یہاں ایک بہت قدیم ایرانی تہذیب کا وجود باقی تھا۔ یہ زرتشتی اس زمانے میں (یعنی ۱۰۰۰ء میں، جب آثار الباقیۃ تالیف ہوئی) اپنے مذہب کے پرجوش پیرو نہیں رہے تھے اور اس کے بارے میں ان کی معلومات محض چند ظاہری رسوم تک محدود تھیں۔ خوارزم میں زرتشتیوں کے علاوہ عیسائی بھی تھے، لیکن وہ ایران اور وسط ایشیا کے بیشتر عیسائیوں کی طرح نسطوری نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق راسخ العقیدہ یونانی کلیسا سے تھا (الملکائیون، قب البیرونی: کتاب مذکور، ص ۲۸۸ س ۱۵)۔ دوسرے مذاہب کے پیرووں، مثلاً یہودیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ مشہور فہرست امصار (دیکھیے Marquart: Grunder. d. Iran. Phil., ۲ : ۱۱۸؛ Eranšahr، ص ۷) میں خوارزم کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی بنیاد نرسیؔ (Narses) پسر یزدگرد اول (۳۹۹ تا ۴۲۰ء) اور اس کی یہودی بیوی نے رکھی تھی۔ اسی طرح K. Instrancev: Zurn. Min. Norodn. Prosveshc، ۱۹۱۱ء شمارہ ۲، ص ۲۹۳ ببعد) نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ الطبری ۲ : ۱۲۳۷، س ۱۷ نے جن احبار کا ذکر کیا ہے وہ یہودی تھے، لیکن اس قیاس کے متعلق کم از کم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ محل نظر ہے (قب اخبار النصارٰی، ۱ : ص ۳۸۰، س ۴)۔ خوارزم میں جو ایرانی بولی رائج تھی اس کے بارے میں ان الفاظ سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے جو البیرونی نے تقویم اور تہواروں کے ناموں وغیرہ کے ضمن میں استعمال کیے ہیں۔ چند اور الفاظ بعض دوسرے مآخذ میں بھی ملتے ہیں، مثلاً "غاو خوارہ"، بمعنی گائے کا چارا (الاصطخری، ص ۳۰۱)؛ پوبند، بمعنی روئی (یاقوت، ۲ : ۳۸۸، س ۱۵ ["بکند"، در یاقوت، طبع قاہرہ]، بحوالۂ ابن فضلان)۔ عربوں کے نزدیک خوارزمی زبان ایسی تھی جسے غیر ملکی سمجھنے سے قاصر تھے (الاصطخری، ص ۳۰۴ نیچے؛ المقدسی، ص ۳۳۵، س ۹)۔ اس زبان میں پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کی لکھی ہوئی دستاویزات اب تک موجود ہیں (البیہقی، طبع Morley ص ۸۳۲)۔

فتوحات اسلامی کی تاریخ میں مضبوط قلعہ بند دارالحکومتوں (البیرونی کی طرح الطبری نے بھی تین قلعوں کا ذکر کیا ہے) کے علاوہ شہر ہزاراسپ خُوسجِرد کا بھی ذکر ملتا ہے، مگر مؤخرالذکر نام بعد میں مذکور نہیں ہوا۔ یہاں بادشاہ کا ایک بھائی حکومت کرتا تھا۔ فتوحات کے بعد البیرونی کے قول کے مطابق صرف خطاب شاہی ("شاهیه") مقامی بادشاہوں کے پاس رہ گیا۔ اصل اقتدار ("ولایۃ") کبھی ان کے اور کبھی دوسروں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ۱۱۰ھ/۷۲۸ء میں کُردَر (نزد بحیرۂ ارال) کے باشندوں کی ایک بغاوت کا ذکر آتا ہے (الطبری، ۲ : ۱۵۲۵)۔ گُرگانج (عربی: جُرجانیہ) میں خوارزم شاہوں سے الگ ایک خود مختار ریاست قائم ہو گئی، لیکن یہاں کے فرمانرواؤں یا ان کی حکومت کی ابتدا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ابن فضلان کے بیان سے، جس کا مفہوم یاقوت (طبع وُسٹنفلٹ، ۲ : ۴۸۴، س ۱۳) نے غلط سمجھا ہے، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ گُرگانج ۹۲۲ء کے لگ بھگ خوارزم سے متعلق نہیں تھا۔ ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں گُرگانج کا حاکم مامون بن محمد پرانے خاندان کو ختم کرکے اس کے علاقے پر متصرف ہو گیا اور یوں خوارزم کو از سرنو سیاسی یک جہتی حاصل ہو گئی۔ خوارزم شاہ کا لقب والی گُرگانج نے اختیار کر لیا۔

۳۸۷/۹۹۷ء میں مامون کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے دو بیٹے، علی اور مامون ثانی، بادشاہ ہوئے۔ گُرگانج کے کھنڈروں میں مؤخرالذکر کا ایک عربی کتبہ ملتا ہے (جس میں کسی مینار کی

تعمیر کا ذکر ہے)۔ یہ کتبہ ۴۰۱ھ/ ۱۰۱۰-۱۰۱۱ء کا ہے (اسے N. Katanow: *Zapiski vost. otd. arkh. obshč*، ۱۵: ۱۰۵ ببعد، نے شائع کیا ہے)۔ اس بادشاہ نے جب سلطان محمود کے مطالبے پر اس کا نام خطبے میں شامل کیا تو اس کی فوج نے بغاوت کر دی اور اسے قتل کر ڈالا۔ اس پر محمود نے صفر ۴۰۸ھ/ جولائی ۱۰۱۷ء میں خوارزم پر قبضہ کر لیا۔ البیہقی (طبع Morley، ص ۸۳۸) نے ان سب واقعات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں اس نے البیرونی کی ایک گم شدہ تصنیف (قب Barthold: *Turkestan*، ۲: ۲۸۹ ببعد) کا تتبع کیا ہے۔ اب خوارزم کی حکومت اور خوارزم شاہ کا لقب سلطان محمود کے مقرر کردہ حاکم آلتون تاش کو ملا۔ ۴۳۲ھ/ ۱۰۴۱ء میں اس خاندان کے خاتمے تک آلتون تاش اور اس کے بیٹوں کے حالات کے لیے رک بہ آلتون تاش؛ اس خاندان کو جَنْد کے فرمانروا شاہ ملک نے مغلوب کیا تھا۔ دو سال بعد سلجوق (محمود کاشغری: دیوان لغات ترک، ۱: ۳۹۷ ببعد کی رو سے یہی تلفظ صحیح ہے؛ عربی املا سلجوق اصل ترکی تلفظ کے مطابق نہیں) بادشاہ چغری بیگ [رک بآں] نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ چند وقفوں سے قطع نظر سلطان سنجر [رک بآں] کے عہد، یعنی ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء تک خوارزم سلاجقہ کی سلطنت کا حصہ رہا.

گیارھویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں قطب الدین محمد [رک بآں] نے خوارزم میں ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس علاقے کا نظم و نسق اول والیِ خراسان نے اور بعد ازاں سلطان سنجر نے اس کے سپرد کیا تھا۔ اس خاندان کی حکومت کا اصل مؤسس چغری بیگ کا بیٹا آتسز تھا (اس کے حالات کے لیے رک بہ آتسز)، جو تادم مرگ سلطان سنجر کا باج گزار رہا اور قراختای [رک بآں] کو خراج بھی ادا کرتا رہا۔ اس کے بعد خوارزم پر یکے بعد دیگرے ایل آرسلان (۱۱۵۶ تا ۱۱۷۲ء)، تکش (۱۱۷۲ تا ۱۲۰۰ء) اور محمد (۱۲۰۰ تا ۱۲۲۰ء) نے حکومت کی اور ان کے عہد میں یہ ریاست بہت طاقتور ہو گئی۔ ۵۹۰ھ/ ۱۱۹۴ء میں ایران کا آخری سلجوق بادشاہ طغرل، تکش کے مقابلے میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اب خوارزم شاہ نہ صرف مغربی ایشیا کی سیادت کے سلسلے میں اپنے آپ کو سلاجقہ کا جانشین سمجھ سکتا تھا بلکہ خود خلیفہ کے مقابلے میں بھی وہ اسی قسم کا دعوٰی پیش کر سکتا تھا۔ ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء میں آخری گورخانی فرمانروا پر محمد کی فتح کے بعد قراختای حکومت کا جوا بھی اتر گیا۔ محمد کی سلطنت سیر دریا کے دائیں کنارے سے لے کر ان پہاڑی دروں تک پھیلی ہوئی تھی جو ایران اور وادی دجلہ کے درمیان واقع ہیں۔ جنوب میں اس کی سیادت جزیرہ نماے عرب میں (عمان میں) بھی تسلیم کی جاتی تھی۔ ان دنوں خوارزم کا شمار عالم مشرق کے شاندار شہروں میں ہوتا تھا۔ اس وقت تک یہ ملک غالبًا ترکی اثرات قبول کر چکا تھا، چنانچہ بعض جغرافیائی مقامات کے ترکی نام پائے جاتے ہیں، مثلاً صوقرا (ابن الاثیر، ۱۲: ۱۲۲) یا قراصو (طبقات ناصری، مترجمۂ Raverty، ص ۴۷۴).

اس ملک کی تاریخ میں خوارزم کو ایک اول درجے کی طاقت کی حیثیت سے پہلی اور آخری بار جو ترقی نصیب ہوئی وہ اس کے وسیع تجارتی تعلقات کی مرہون منت تھی، جن کا ذکر الاصطخری جیسے قدیم مصنف کے ہاں بھی ملتا ہے (*BGA*، ص ۳۰۴ ببعد)۔ محمد ان تجارتی روابط کو اپنے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں تھا۔ اسی باعث اس کی چنگیز خان [رک بآں] سے جنگ ہوئی اور اس کی سلطنت کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے خاندان کے تمام افراد گرگانج سے نکل گئے اور یہ شہر سخت مدافعت کے بعد صفر ۶۱۸ھ/ اپریل ۱۲۲۱ء میں دشمن کے قبضے میں آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی پوری

آبادی کو قتل یا آمو دریا میں غرق کر دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۴۰ برس تک خوارزم پر آلتون اردو کا قبضہ رہا؛ البتہ اس کے جنوبی حصے، جن میں کاث اور خیوہ شامل تھے، چغتائی سلطنت [رک بہ چغتای خانیہ] ماتحت رہے۔ گرگانج، جسے مغول اور ترک اُرگنج Urgenč کہتے تھے، کچھ سال بعد کسی اور مقام پر دوبارہ بسایا گیا (ابن الأثیر، طبع Tornberg، ۱۲ : ۳۲۲)۔ ۱۳۳۳ء میں ابن بطوطہ (طبع Defrémery و Sanguinetti، ۳ : ۱ ببعد) نے اور ۱۳۴۰ء میں Balducci Pegolotti (در H. Yule : *Cathay and the way Thither*، ۲ : ۲۷۹ ببعد) نے اسے ایک آباد اور پررونق تجارتی شہر بتایا ہے۔ مشرق یورپ اور مشرق ایشیا کے درمیان برّی راستے پر یہ غالبًا اہم ترین منڈی تھی۔ معاشی خوشحالی کے ساتھ ساتھ یہاں ادب اور فنون لطیفہ کو بڑی ترقی نصیب ہوئی، چنانچہ خوارزم کو ”مجمع اعیان جہان“ کہا جاتا تھا (عبدالرزاق سمرقندی : مطلع سعدین، مخطوطۂ جامعۂ سینٹ پیٹرزبرگ، عدد ۱۵۷، ورق ۱۷۳ - الف)۔ معتزلہ عقائد کی اشاعت یہاں پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں ہوئی (قب I. Goldziher در *Islam*، ۳ : ۲۲۰ ببعد)۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک یہاں معتزلہ عقائد کے پیرو موجود تھے، لیکن اس کے بعد مغربی ایشیا میں ان کا نام و نشان باقی نہ رہا (خوارزم میں معتزلہ تحریک کے بارے میں قب ابن بطوطہ، ۳ : ۸؛ ابن عرب شاہ، قاہرہ ۱۲۸۵ھ، ص ۱۸، جہاں خوارزم کے موسیقاروں کے کمال فن کا ذکر بھی موجود ہے)۔ قدیم ارگنج کے کھنڈروں میں اس صدی کی بنی ہوئی عمارتوں کے جو آثار باقی ہیں وہ وسط ایشیا کی بہترین تعمیرات میں شمار ہو سکتے ہیں۔ ان میں تُرا بیگ خانم کا مقبرہ بالخصوص قابل ذکر ہے (جس کے لیے دیکھیے ابن بطوطہ، ۳ : ۴ ص ۹ و ۱۴)۔ یہ خاتون یہاں کے والی قُتْلُغ تُمُر کی بیوی تھی۔ زمانۂ مابعد میں تیمور نے کاش [کذا] میں آق سرای کی تعمیر خوارزمی کاریگروں (”استادان خوارزمی“، در مطلع سعدین، ورق ۷۳ ب) سے کرائی تھی۔

۱۲۶۰ء کے تھوڑے ہی عرصے بعد خوارزم میں صوفی نام کا ایک خود مختار خانوادہ برسر اقتدار آیا، جس کا تعلق قُونغرات کے خاندان سے تھا۔ ان حکمرانوں نے طلائی سکّے ڈھلوائے، جن پر کسی کا نام نہیں، بلکہ محض ”الملک للہ“ درج تھا۔ اس قسم کے اولین سکّے ۷۶۵ھ/۱۳۶۳-۱۳۶۴ء کے ہیں۔ خوانین آلتون اردو (=اردوے مُطَلّا = Golden Horde) کے سکّے ۷۶۲ھ/۱۳۶۰-۱۳۶۱ء کے ملتے ہیں۔ اس خاندان کے بانی حسین صوفی نے چغتائیوں سے کاث اور خیوہ چھینے تو تیمور نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ متعدد معرکوں کے بعد ۱۳۷۹ء میں تیمور نے خوارزم فتح کر لیا۔ تیمور اور تُقْتَمِش کے مابین جنگوں میں خوارزمیوں نے مؤخرالذکر کا ساتھ دیا۔ خان مذکور کے نام کے سکّے ۷۸۵ھ/۱۳۸۳-۱۳۸۴ء ہی میں ڈھالے جا چکے تھے۔ ۱۳۸۸ء میں تیمور نے دوبارہ خوارزم فتح کیا، جہاں تُقْتَمِش نے اپنے گھرانے کے امیر اور مقامی خانوادے کے ایک نمائندے سلیمان صوفی کو متعین کر دیا تھا۔ دارالسلطنت ارگنج (جسے قبل ازیں کاث کی طرح ملک کے نام پر خوارزم کہتے تھے) بالکل تباہ ہو گیا اور اسے زمین کے برابر کرکے وہاں جَو بو دیے گئے۔ اس بربادی کے بعد خوارزم دوبارہ کبھی نہ پنپ سکا۔ ۱۳۹۱ء میں تیمور نے شہر خوارزم کے ایک حصے محلۂ قاآن کو (جو چغتائی خوانین کی ملکیت سمجھا جاتا تھا) دوبارہ تعمیر کرایا، مگر یہ شہر محض اسی محلے تک محدود رہا۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں خوارزم کچھ عرصے کے لیے خوانین آلتون اردو کے قبضے میں، پھر چند برس تک تیموری شہزادوں کے ماتحت رہا۔ ۸۶۸ھ / ۱۴۶۴ء میں مقامی خاندان کے

ایک رکن عثمان بن محمد صوفی کا ذکر خان مصطفی کے باجگزار کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس خان نے ارگنج کے جنوب میں وزیر کا شہر بسایا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ایشیا کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں خوارزم کسی اہمیت کا حامل نہیں رہا تھا۔ تیموری سلطان حسین کے ماتحت خوارزم کے والی کا نام چین صوفی بتایا گیا ہے۔ ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء میں یہ ملک شیبانی کے قبضے میں آیا، جو ماوراء النہر کی ازبک سلطنت کا بانی ہوا ہے (قب مادۂ بخارا)۔

۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء میں شیبانی کو جنگ مرو میں شکست ہوئی اور خوارزم کا کچھ عرصے کے لیے سلطنت ایران سے الحاق کر لیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہاں کے ایرانی والی کو شریف صوفی نے نکال باہر کیا، مگر مؤخر الذکر کو ازبک فاتح کے سامنے ٹھہرنے کی مجال نہ ہوئی۔ اب جوجی کے خاندان کی ایک الگ شاخ نے، جس کا فاتحین سمرقند و بخارا سے دور کا تعلق تھا، خوارزم میں اپنی حکومت قائم کرلی (ابوالغازی، طبع Desmaisons، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۱ - ۱۸۷۴ء، متن: ص ۱۹۷، کے مطابق سنة الشاة .: sheep year، یعنی ۱۵۱۱ء میں؛ اس میں جو سنہ ہجری درج ہے وہ یقیناً غلط ہے)۔ اس خاندان کی حکومت ۱۱۰۶ھ / ۱۶۹۴ - ۱۶۹۵ء تک قائم رہی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے بخارا کے صرف دو حکمرانوں نے تھوڑے عرصے کے لیے اسے اپنی سلطنت میں شامل کیا، یعنی عبیداللہ بن محمود نے ۱۵۳۸ء میں اور عبداللہ بن سکندر [رک بآن] نے ۱۵۹۳ء اور ۱۵۹۵ تا ۱۵۹۷ء میں۔ اس وقت خوارزم میں ازبکوں کے ہاں جو تہذیب پائی جاتی تھی اسے ماوراء النہر کی تہذیب سے کوئی نسبت نہ تھی۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ خان ابوالغازی (۱۶۴۵ تا ۱۶۱۳ء) کو اپنے ملک کی تاریخ خود لکھنی پڑی؛ کیونکہ اس کی رعایا میں کوئی بھی اس کام کے لیے ضروری علمی استعداد کا مالک نہ تھا (ابوالغازی، متن: ص ۲)۔ سلطنت کے اعلیٰ غیر فوجی عہدیداروں، مثلاً وزیر (بعد ازاں مہتر) اور قوش بیگی، کو بھی محض اتنی اجازت حاصل تھی کہ سرکاری تقریبات میں کھڑے رہ کر شامل ہوں، حالانکہ فوجی سرداروں اور شیوخ کے لیے باقاعدہ نشستیں ('اوروں') مخصوص ہوتی تھیں۔ تہذیب و تمدن کا یہ قدیم گہوارہ زامن و امان سے محروم ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وسط ایشیا کی کاروانی شاہراہ اپنی اہمیت سے محروم ہو گئی۔ اس کی تصدیق اس زمانے کے واحد یورپی سیاح جنکنسن Anthony Jenkinson کے بیان سے ہوتی ہے، جو ۱۵۵۸ء میں خوارزم گیا تھا۔ ملک کا نام تو پہلے ہی دارالسلطنت کو دے دیا گیا تھا (اول کاث اور بعدازاں ارگنج کو)، اب ملک کو عام طور سے دارالسلطنت کے نام پر پہلے ارگنج اور بعد میں خیوہ کہنے لگے۔

خیوہ (قدیم شکل خیوق؛ یاقوت نے اس کا تلفظ خیوہ لکھا ہے، جو چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے جغرافیہ دانوں کے دیے ہوئے تلفظ کے مطابق ہے) بھی غالباً کاث کی طرح عہد قبل از اسلام میں آباد تھا۔ یاقوت کے زمانے میں خیوہ کے لوگ شافعی مذہب کے پیرو تھے، حالانکہ خوارزم کے دوسرے مقامات کے باشندے بالعموم حنفی تھے۔ پہلوان عطا محمد (م ۷۲۲ھ / ۱۳۲۲ء) کو، جس کے مقبرے کا ذکر ابوالغازی (متن، ص ۲۶۰) نے کیا ہے، آج بھی خیوہ کے ولی کا درجہ حاصل ہے۔ عرب محمد (۱۶۰۳ تا ۱۶۲۳ء) کے عہد کے نصف آخر میں دارالسلطنت کے طور پر خیوہ کو پہلی بار شہرت ملی۔ قیاس ہے کہ دریا کا بایاں معاون خشک ہو گیا (قب مادۂ آمو دریا) تو رفتہ رفتہ ارگنج غیر آباد ہوتا چلا گیا۔ ۱۶۴۵ء میں، خیوہ سے تقریباً بیس میل شمال مشرق میں ایک نیا ارگنج بسایا گیا۔ پرانے تجارتی شہر کے باشندے وہاں جا کر آباد ہو گئے اور ان کے اخلاف نے ارگنج کو خیوہ کا اہم ترین تجارتی مرکز بنا دیا۔ بعد کے زمانے

میں وزیر کا نیا شہر دریا کے بہاؤ کی جانب اس کے بائیں کنارے ہی پر آباد ہوا۔ پرانے دارالسلطنت کاث کو بھی، جو دائیں کنارے پر واقع تھا، اس لیے ترک کرنا پڑا کہ اسے سیراب کرنے والی نہر سوکھ گئی تھی۔ خان اَنُوشہ (۱۶۶۳ تا ۱۶۸۷ء) نے موجودہ کاث (یا کات) کو جدید ارگنج سے بیس میل جانب جنوب دریا کے بائیں کنارے پر پھر سے تعمیر کرایا۔ ۱۰۹۲ھ/ ۱۶۸۱ء میں اسی خان کے حکم سے شاہ آباد کی نہر بنائی گئی (مشہد کی فتح کے بعد خان نے شاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا)۔ یہ جدید خیوہ کی اہم ترین نہر تھی۔ بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی میں خیوہ کے خان کی ریاست بالعموم پش قلعہ (= پانچ قلعے) کہلاتی تھی۔ یہ نام جن پانچ شہروں کے مجموعے کے باعث رکھا گیا تھا، ان کے ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ "جزیرہ" (ترکی: ارال، یعنی بحیرۂ ارال کا خاص ڈیلٹے کا علاقہ، جس کے نام سے یہ موسوم ہوا؛ قب مادۂ ارال) بھی سیاسی طور پر خیوہ سے علیحدہ تھا۔

اس خاندان کے خاتمے کے بعد تونغرت قبیلے کا اِیناق ([اِیناغ]، یعنی شیخِ قبیلہ اور فوجی سردار) ہی عام طور سے اصل حاکم ہوتا تھا۔ تخت پر چنگیزخان کے اخلاف بیٹھتے تھے، جنہیں گیاہستان (Steppes) سے بلایا گیا تھا، تاہم ان کی حکومت برائے نام تھی اور جلد ہی چند افراد کے علاوہ باقی سب کو ان کے وطن واپس بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ ایک اور امیر کو دے دی گئی۔ عبدالکریم بخاری (طبع Schefer، پیرس ۱۸۷۶ء، متن: ص ۷۹) نے اس رواج کے لیے "خان بازی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ پیٹر اعظم نے خیوہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ نادرشاہ نے ۱۷۴۰ء میں خیوہ کو فتح کر لیا، مگر اس نے وہاں جس خان کو گدی پر بٹھایا تھا، وہ متمکن نہ رہ سکا۔ اس زمانے سے ہمیں خیوہ کے بارے میں مغربی یورپ کے بہت سے افراد (Hanway: *An Account of the British Trade on the Caspian Sea*، لنڈن ۱۷۶۲ء، ۱: ۲۴۰، میں دیگر مصنفین کے ساتھ تھامپسن G. Thompson کا نام بھی ملتا ہے) کے علاوہ کئی روسیوں (Gladishew و Murawin، در *Geograf. Izv'yestiya*، ۱۸۴۹ - ۱۸۵۰ء) کے بیانات بھی ملتے ہیں۔ ۱۷۴۰ء میں ایک فوجی افسر نازیموف Nazimov نے شہر خیوہ کا ایک نقشہ تیار کیا (*Geogr. Izv.*، ۱۸۴۹ء، ص ۲۰۰)۔ ۱۸۴۲ء میں T. Fr. Basiner نے جدید شہر کی مساحت کی (*Naturwissenshaftliche Reise durch die Kirgisensteppe nach Chiwa*، بمطابق *Kenntnis des russ. Reiches*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۵: ۱۲۰)۔ ان دونوں نقشوں میں خاصا فرق ہے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۴۲ء کے قریب شہر کی ہیئت ایک صدی قبل کی بہ نسبت بہت مختلف تھی اور شاید اس کی جائے وقوع بھی بدل چکی تھی۔ Sawelyew (*Geogr. Izv.*، ۱۸۴۹ء، ص ۱۶۷ ببعد) نے اس کا سبب نادر شاہ کے ہاتھوں خیوہ کی مزعومہ تباہی کو قرار دیا ہے؛ تاہم یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ ۱۷۴۰ء کے بعد چند سال تک یہ شہر اپنی سابقہ جگہ ہی پر واقع تھا۔ ۱۷۴۷ء میں ایک مدرسے کا ذکر ملتا ہے، جسے خان عرب محمد نے قائم کیا تھا۔ اس کے برعکس ۱۷۷۰ء سے کچھ پہلے (یومُوت قبیلے کے) کے ترکمانوں کے متواتر حملوں سے خیوہ بالکل تباہ ہو گیا تھا اور یہاں صرف چالیس (اور ایک اور بیان کے مطابق پندرہ) خاندان باقی بچے تھے (مخطوطہ، در موزۂ ایشیائی (Asiatic Museum)، عدد ۵۹۰ ob.، ورق ۵۵ ب)۔ ۱۷۷۰ء میں ایناق محمد امین نے ترکمانوں پر فتح پا لی اور اس کی بدولت شہر اور ملک میں ایک بار پھر خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ قدیم خیوہ کی تباہی اور جدید خیوہ کی بنیاد غالباً اسی واقعے کی مرہون منت ہے۔

۱۸۰۴ء میں محمد امین کے پوتے ایناق اِلتُوزَر

Iltüzer نے خان کا لقب اختیار کر لیا۔ جب وہ ۱۸۰۶ء میں بخارا کے خلاف جنگ میں مارا گیا تو اس کے بھائی اور جانشین رحیم محمد (۱۸۰۶ تا ۱۸۲۵ء) نے پھر تھوڑے عرصے کے لیے ایک چنگیزی کو تخت پر بٹھا دیا، مگر پھر اسی سال خود خان کا لقب اختیار کر لیا۔ ۱۸۱۱ء میں علاقۂ ارال کی تسخیر کے بعد خوارزم کی سیاسی وحدت پھر بحال ہوگئی، جسے دوبارہ صرف تھوڑے سے عرصے کے لیے بغاوتوں نے صدمہ پہنچایا۔ ۱۸۲۲ء میں ترکمانوں نے مرو میں حکومت بخارا کے خلاف بغاوت کرکے خیوہ کے خان کی اطاعت قبول کر لی۔ محمد رحیم کے بیٹے اللہ قلی (۱۸۲۵ تا ۱۸۴۲ء) کے عہد میں خیوہ کی قلمرو کو بہت وسعت حاصل ہوئی۔ وہ بحیرۂ ارال (تقریباً ۴۶° عرض بلد شمالی) میں سیر دریا کے دہانے سے لے کر کُشک (۳۵°۳۰') کے قریب قلعۂ سور تک پھیل گئی تھی۔ اس دور میں قدیم ارگنج کو بھی دوبارہ بسایا گیا۔ ۱۸۳۹۔ ۱۸۴۰ء میں خیوہ کے خلاف روسیوں کی مہم ناکام رہی، مگر اس کے فوراً ہی بعد خان کو روسی حکومت کے سب مطالبات پورے کرنے پڑے، حالانکہ اس زمانے میں خیوہ نے انگلستان سے بھی گفت و شنید شروع کر دی تھی۔ خیوہ کی سرکاری تاریخ میں انگریزوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ روسی قوم کا ایک حصہ ہیں اور ان کا ملک سلطنت روس کے شمال میں واقع ہے (مخطوطۂ موزۂ ایشیائی، عدد ۵۹۰ ob، ورق ۳۶۹ب)۔ آگے چل کر خیوہ کو بخارا سے (۱۸۴۵ء تک) اور ترکمانوں سے بھی جنگ آزما ہونا پڑا۔ خان محمد امین (مد امین، ۱۸۴۶ تا ۱۸۵۵ء) ترکمانوں کے خلاف لڑتا ہوا ۱۸۵۵ء میں مارا گیا۔ اسی سال اس کے جانشین عبداللہ کا بھی یہی انجام ہوا۔ جدید خیوہ کی سب سے اہم عمارت محمد امین کے دور کی یادگار ہے۔ یہ 'نیلا مینار' ہے، جو ۱۶۰ فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے (تصویر کے لیے دیکھیے Fr. v. Schwarz: *Turkestan*، Freiburg ج ۱(ب)، ۱۹۰۰ء، ص ۲۰۵)۔ سید محمد رحیم خان کے عہد (۱۸۶۴ تا ۱۹۱۰ء) میں خیوہ کو روسیوں نے فتح کر لیا (۱۸۷۳ء)۔۔۔ خان کے پاس اس کے مقبوضات کا صرف ایک حصہ (آمو دریا کے مغرب میں) باقی رہ گیا اور یہاں بھی اسے اپنے آپ کو "روسیوں کے شاہنشاہ کا اطاعت گزار" تسلیم کرنا پڑا۔ خانِ خیوہ کو بعد میں "اعلیٰ حضرت" (His Highness) کا خطاب مل گیا، مگر اس کا منصب امیر بخارا کے مساوی کبھی نہ ہو سکا (رکّ بہ مادہ بخارا)۔ سید محمد رحیم اور اس کے جانشین خان اسفندیار (۱۹۱۰ تا ۱۹۱۸ء) نے کئی بار روسیوں سے ترکمانوں کے خلاف اعانت چاہی۔ مرو کے ترکمانوں اور روس کے مابین گفت و شنید (۱۸۸۱ تا ۱۸۸۴ء) میں خیوہ نے ثالثی کا فریضہ اس توقع پر انجام دیا کہ مرو کو براہ راست روس میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کے باجگذار خان خیوہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ دور انقلاب کی لڑائیوں میں بھی ترکمانوں نے کئی بار خیوہ کو تاخت و تاراج کیا۔ ترکمان سردار جنید خان نے خان اسفند یار کو حکومت سے معزول کرکے قتل کر ڈالا تو سید عبداللہ (۱۹۱۸ تا ۱۹۲۰ء) کو خان منتخب کر لیا گیا۔ پھر اس خان کی معزولی اور جنید کی جلا وطنی کے بعد جمہوریۂ خوارزم کا قیام عمل میں آیا، جو برائے نام روس سے وابستہ تھی۔

سولھویں اور سترھویں صدی کی طرح انیسویں صدی عیسوی میں بھی خیوہ ایک بار پھر فتنہ و فساد کا شکار ہو گیا تھا، مگر پھر بھی گزشتہ زمانے کے برعکس ثقافتی اور معاشرتی ترقی کے لیے یہاں بخارا کے مقابلے میں کہیں زیادہ کام ہوا۔ بڑی بڑی نہریں بنائی گئیں، جن سے ملکی ترقی میں مدد ملی۔ یہاں کی شاہراہوں پر جو پل تعمیر ہوئے ان کی تعداد ترکستان کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھی۔ خان سید محمد رحیم نے یہاں ایک شاندار کتاب خانہ

قائم کیا، جس سے استفادہ کرنے کی روسی طلبہ کو بھی اجازت تھی۔ روسی فتح سے قبل اس ملک کی جو تاریخ سرکاری طور پر مرتب کی گئی، وہ جامعیت اور استناد کے اعتبار سے بخارا یا خُوقند میں لکھی جانے والی تواریخ سے کہیں برتر تھی۔ روسیوں نے اس ملک کے آثار قدیمہ کے اکتشاف اور اس کی تاریخ اور موجودہ حالات کی تحقیق کے سلسلے میں بہت کم کام کیا ہے، حالانکہ یہاں ایسے آثار محفوظ ہیں جو ترکستان کے کسی اور حصے میں نہیں مل سکتے۔ ترکستان میں دستور ہے کہ زمیندار کا مکان گاؤں کے اندر کسی گلی میں ہوتا ہے، لیکن یہاں ترکستان کے قدیم تاجک باشندوں کی پیروی میں زمیندار کی حویلی اس کی اراضی کے وسط میں بنائی جاتی ہے۔ گاڑی بان (اربہ کش) کاشغر کے دستور کے مطابق گاڑی کے اندر بیٹھتا ہے اور تاشکنت اور خوقند کے لوگوں کی طرح گھوڑے پر سوار نہیں ہوتا۔ نہروں کو خیوہ میں ترکمانوں کی طرح ترکی بولی میں "آرْنا اور "یَپ" (بڑی اور چھوٹی نہر) کے نام دیے جاتے ہیں، جو ظاہر ہے، آریائی نام ہیں۔ قدیم ارگنج میں جو عمارتیں سلامت رہ گئی ہیں وہ ترکستان کی قدیم ترین اور حسین ترین عمارتیں ہیں، تاہم ان کے حالات ابھی تک بالتفصیل نہیں لکھے گئے۔

[اشتراکی انقلاب کے بعد ستمبر ۱۹۱۹ء تک پورا ترکستان سوویٹ روس کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں خان خیوہ کو معزول کرکے وہاں عوامی سوویٹ جمہوریۂ خوارزم قائم کی گئی۔ اگست ۱۹۲۰ء میں امیر بخارا کا بھی یہی حشر ہوا اور اسی طرح کی جمہوریۂ بخارا یہاں بھی قائم ہوئی۔ ۱۱ اپریل ۱۹۲۱ء کو ترکستان کی ریاست (governor generalship) کو جمہوریۂ شورائیۂ اشتراکیہ کی حیثیت دے دی گئی۔ ۱۹۲۴ء کے موسم بہار میں ترکستان، بخارا اور خیوہ کی جمہورتوں نے قومیت کے اساس پر اپنی ریاستوں کی نئے سرے سے حد بندی کرنے کا فیصلہ کیا، جو مئی ۱۹۲۵ء میں مکمل ہو گئی اور یوں ازبکستان، ترکمنستان اور تاجکستان کے علاوہ متعدد [داخلی طور پر] خود مختار ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ آمو دریا ترکمنستان اور ازبکستان کی حد بندی کرتا ہے۔ اب ارگنج، خیوہ اور بخارا کے شہر ازبکستان میں واقع ہیں اور مرو ترکمنستان میں ہے۔ اشتراکی حکومت قائم ہونے کے بعد اس علاقے نے تعلیمی اور معاشی اعتبار سے بہت ترقی کی ہے].

مآخذ: E. Sachau: *Zur geschichte und Chronologie von Khwārism*، ج ۱ و ۲، وی انا ۱۸۷۳ء *S. B. Ak. Wien*، phil-hist. kl.، ج ۷۳ بعد)؛ (۲) P. Lerch: *Khiwa oder Kharezm*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۳ء (از "*Russian Review*" ج ۲)؛ (۳) N. Weselowskiy: *Očerk istoriko-geografičeskikh Sryedyeniy o Khiwinskom Khanstve*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۷ء؛ (۴) M.J. de goeje: *Das alte Bett des Oxus*، لائڈن ۱۸۷۵ء؛ (۵) A. Kuhn، در *Materiali dlja statistiki Turkestanskago kraja*، ج (v:p) ۴، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۸ء (جس میں ص ۱۵۱ بعد کاث کے کھنڈروں کا اور ص ۲۱۳ بعد ارگنج کا بیان ہے)؛ (۶) K. A. Inostrancew: *O domusul'manskoi Kul'ture Khivinskago oazisa*، در *Žurn. Minist. Nar. Prosv.*، فروری ۱۹۱۱ء، ص ۲۸۴ بعد؛ (۷) A. Vinogradova: *Khorezmskaya Sovietskaya Narodnaya Respublika*، در *Žizn Nacionalnostei*، ۱۹۲۳ء، شمارہ ۱، ص ۱۸۱ بعد؛ (۸) W. Barthold: *Turkestan*، ج ۲، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۰ء، بالخصوص ص ۱۴۲ بعد، ۲۸۹ بعد، ۳۴۵ بعد؛ (۹) وہی مصنف: *Nachrichten über den Aral-See und den unteren Lauf des Amu-darja*، مترجمۂ H. von Foth (لائپزگ ۱۹۱۰ء)، در *Quellen und Forschungen zur Erd-und Kulturkunde*، طبع Dr. R. Stübe، ج ۲)؛ (۱۰) وہی مصنف: *K istorii oroshenija Turkestana*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء؛

(۱۱) وہی مصنف : *Sobitiya pered Khivinskim pokhodom 1873 ' goda razskazu Khivinskago 'istorika* در *'Kaufmanskiy Sbornik*' ماسکو ۱۹۱۰ء' ص ۱ ببعد' یہاں مذکورہ توایخ کے بارے میں (بالخصوص جو موزۂ ایشیائی Asiatic Museum کے مخطوطات' عدد ۵۹۰ ob و ۵۹۰ od' کے تتبع میں لکھی گئیں)' جنہیں اِلتوزر اور اس کے جانشینوں کے حکم سے قلمبند کیا گیا تھا' نیز دیکھیے : (۱۲) *Mélanges Asiatiques* ' ۱۰ : ۲۷۸' جہاں خطابات بھی درج ہیں' پہلی کتاب؛ (۱۳) فردوسِ اقبال تھی' جسے شیر محمد' المعروف بہ مؤنس نے اِلتوزر کے حکم سے شروع کیا تھا' مگر خان مذکور کی وفات کے باعث یہ سلسلۂ تصنیف ۱۸۰۶ء میں رک گیا۔ اس وقت تک مصنف نادر شاہ کے دربار میں نہیں پہنچا تھا۔ بعد ازاں محمد رحیم خان کے حکم سے اس کا سلسلہ ۱۸۱۲ء تک پہنچایا گیا۔ پھر مصنف کو (۱۴) میر خواند : روضۃ الصفا کا ترکی ترجمہ کرنے کا حکم ملا' لیکن اسے مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ء میں وفات پا گیا۔ تاریخ خیوہ دوبارہ شروع نہ ہو سکی تاآنکہ ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹-۱۸۴۰ء میں اللہ قلی نے مؤنس کے بھتیجے محمد رضا' المعروف بہ آگاہی' کو اسے مکمل کرنے کا حکم دیا۔ آگے چل کر اسی مؤلف نے اس ملک کی تاریخ ۱۸۷۲ء تک مختلف عنوانات کے تحت مرتب کی (ہر عہد حکومت کا بیان ایک الگ کتاب میں دیا گیا ہے)؛ [(۱۵) *The Statesman's year Book*' ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء' ص ۱۵۷ ببعد؛ (۱۶) *Encyclopaedia Britannica*' طبع ۱۹۵۰ء' ۱۳ : ۳۶۳ ببعد؛ (۱۷) *World Muslim Gazetteer*' طبع مؤتمر العالم الاسلامی' کراچی' ص ۵۳۶' ۵۵۰ تا ۵۵۲ و بمواضع کثیرہ]۔

(W. Barthold [و ادارہ])

* **خوارزم شاہ** : خوارزم [رک بآن] کے فرمانروا کا لقب، جو عربوں کی فتح کے وقت بھی رائج تھا (مثلاً دیکھیے الطبری، ۲ : ۱۲۳۷ ببعد)۔ اسلامی عہد میں اس ملک کے بیشتر بادشاہ اور والی اسی لقب سے ملقب تھے، گو وہاں کے آخری خاندان کے بانی اِلتوزر خان (۱۸۰۴ تا ۱۸۰۶ء) نے اپنے سکوں پر (جو کبھی جاری نہ ہوے) اپنے آپ کو صرف "وارثِ خوارزم شاہان" ظاہر کرنے ہی پر قناعت کی (عبدالکریم البخاری طبع Schefer ص ۸۰)۔ وسط ایشیا میں غالباً یہ واحد لقب ہے جس کا مفہوم زمانۂ ماقبل اسلام سے لے کر زمانۂ حال تک بحال رہا۔ اسلامی عہد سے پہلے زمانے کے خوارزم شاہوں کے شجرۂ نسب اور سلسلۂ جانشینی کے ایے واحد مآخذ البیرونی [رک بآن] کی آثار الباقیہ ہے۔ اس میں مشہور افسانوی شخصیت کیخسرو [رک بآن] کو اس خاندان کا بانی بتایا گیا ہے (آثار الباقیہ، طبع Sachau، ص ۳۵) اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے عہد حکومت کا آغاز اس وقت ہوا جب اس سر زمین کو پہلی بار آباد ہوے بانوے برس گزر چکے تھے۔ یہ آبادی سکندر اعظم سے ۹۸۰ سال قبل، یعنی سن سلوکی (یعنی ۱۲۹۲ ق م) سے بھی پہلے معرض وجود میں آئی تھی۔ انفرادی حکمرانوں کے ناموں اور موروثی جانشینی کے متعلق حوالے ۶۱۶ سکندری (/ ۳۰۴ء) سے لے کر ۳۸۵ھ/ ۹۹۵ء تک کے زمانے پر حاوی ہیں، جبکہ اس خاندان کا خاتمہ ہوا۔ ان حکمرانوں میں سے شاوُشفر، جو فاتح خوارزم مُسلم بن قتیبہ کے ہم عصر خوارزم شاہ کا بیٹا تھا یقیناً وہی بادشاہ ہے جس کا ذکر چینیوں نے شاؤ شی فِن کے نام سے کیا ہے اور جس نے ۷۵۱ء میں چین کو سفارت بھیجی تھی (E. Chavannes : *Documents sur les Tou-Kiue occid.*، ص ۱۴۵)۔ اس کے مقابلے میں ابن الأثیر (طبع Tornberg، ۸ : ۳۱۰) نے جس خوارزم شاہ عبداللہ بن اشکام کا ذکر بذیل ۳۳۲ھ/ ۹۴۳ - ۹۴۴ء کیا ہے اس کا نام البیرونی کے دیے ہوے شجرۂ نسب میں نہیں ملتا۔ اس خاندان کے آخری حکمران ابوعبداللہ محمد کے باپ خوارزم شاہ احمد بن محمد کے ۳۴۸ھ/ ۹۵۹-۹۶۰ء

اور ۳۶۶ھ/۹۷۶-۹۷۷ء کے سکّے دستیاب ہو چکے ہیں (دیکھیے A. Markow: *Inventarniy Katalog Musulm. monet. Imp. Ermitaza*، ص ۲۹۵ و ۹۷۵)۔

خوارزم کا شمالی حصہ، جس کا دارالسلطنت گرگانج [رک بان] تھا، سیاسی اعتبار سے سلطنت خوارزم شاہان سے الگ تھا؛ اس امر کا ذکر عرب جغرافیہ دانوں نے نہیں کیا، چنانچہ یاقوت کو بھی اس کا علم نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے متعلق ابن فضلان کے حوالوں کو نہ سمجھ سکا (یاقوت: معجم، ۲: ۴۸۴؛ نیز Baron Rosen، در *Zapiski*، ۱۵: ۵۹)۔ امیر گرگانج ابوالعباس مأمون بن محمد نے خوارزم کا جنوبی حصہ فتح کرنے کے بعد اپنے اور اپنے خاندان کے لیے خوارزم شاہ کا لقب اختیار کر لیا (۳۸۵ھ/۹۹۵ء)۔ اس طرح وہ خوارزم شاہوں کے دوسرے خاندان کا بانی ہوا۔ مأمون ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں فوت ہوا، پھر یکے بعد دیگرے اس کے دو بیٹے ابوالحسن علی اور ابوالعباس مأمون دوم اس کے جانشین ہوئے۔ ۴۰۱ھ/۱۰۱۰-۱۰۱۱ء کا ایک کتبہ (جو گرگانج [رک بان] کی ایک عمارت کی تکمیل سے متعلق ہے) مأمون دوم ہی کا ہے۔ اس میں اس نے اپنے آپ کو خوارزم شاہ کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ مأمون اور محمود غزنوی کی گفت و شنید [رک بہ غزنویہ] اور مأمون دوم کے اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل (چہار شنبہ [۱۸] شوال ۴۰۷ھ/۲۰ مارچ ۱۰۱۷ء) کے بارے میں دیکھیے W. Barthold: *Turkestan etc.*، ۲: ۲۸۹ ببعد، جو البیہقی، طبع Morley، ص ۸۳۸ ببعد، پر مبنی ہے۔ مأمون دوم کا نوجوان بھتیجا ابوالحارث محمد بن علی اس کا جانشین منتخب ہوا، لیکن صفر ۴۰۸ھ/جولائی ۱۰۱۷ء تک خوارزم کو محمود کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا [زین الاخبار، طبع برلن، ص ۷۳؛ البیہقی، ص ۸۳۸ س ۱۲؛ دیکھیے دیوان عنصری، طبع تہران، [illegible]؛ محمود بن ارسلان: تاریخ خوارزم، در بیہقی، ۴ : ۳۰۶] اور خوارزم شاہوں کے اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد خوارزم شاہ کا لقب امیر آلتون تاش کو منتقل ہوا، جسے محمود نے خوارزم کا والی مقرر کیا تھا اور اس طرح ایک قلیل مدت کے لیے (۱۰۴۱ء تک) ایک اور خاندان برسر اقتدار و حکومت آیا [آلتون تاش اور اس کے دو بیٹوں کے حالات کے لیے رک بہ آلتون تاش الحاجب]۔ اگرچہ آلتون تاش کی وفات ۱۰۳۲ء کے بعد خوارزم شاہ کا لقب سعید بن سلطا مسعود بن محمود کو منتقل ہو گیا اور ہارون آلتون تاش اس کے نمائندے (خلیفۃالدار) کی حیثیت ملک پر حکومت کرتا رہا (البیہقی، ص ۴۳۹)؛ تاہ اسی مؤرخ نے ایک اور مقام (ص ۴۴۹) پر ہارون خوارزم شاہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔

انچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسو کے اواخر میں پھر خوارزم کے ایک والی اِکِنْجی قوچقر کا ذکر خوارزم شاہ کے لقب کے ساتھ کیا ہے (دیکھیے Barthold: *Turkestan*، ۲: ۳۶؛ J. Marquart، در *Abh. Gött.*، سلسلۂ جدید، ۱۳/۱، ص ۴۸ ببعد)۔ ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء کے قریب یہی لقب کے جانشین اور خوارزم شاہوں کے چوتھے اور ترین خاندان کے بانی قطب الدین محمد بن انوشتگین لیے استعمال ہوا (ابن الاثیر، ۱۰: ۱۸۱؛ الجو تاریخ جہانگشای، طبع مرزا محمد، ۲: ۳)۔ اتس جس شان و شوکت سے اس خاندان کو استحکام اس کے لیے رک بہ اتسز۔ تکش (۱۱۷۲ تا ۱۲۰۰) اور محمد (۱۲۰۰ تا ۱۲۲۰ء) کے عہد میں اس نے ایران اور وسط ایشیا فتح کرنے کے بعد دول کی صف میں جگہ حاصل کر لی اور یہ ایسی بلند تھی کہ اب خوارزم شاہ کا لقب اس سے فروتر ہوتا تھا۔ تکش نے اپنے سکّوں پر اپنا لقب سلطا خوارزم شاہ اور محمد سلطان نے ابن السلطان ا

لیکن اس کی سلطنت سے باہر خود محمد کو بھی لوگ خوارزم شاہ ہی کہتے رہے (دیکھیے یاقوت : معجم، ۱ : ۹۴۴۲، ص ۱۲ [جہاں نسب نامۂ خوارزم شاہان میں دو غلطیاں ہیں]؛ ۳ : ۴۴۴۲، ص ۱۳! چنگیز خان کے ساتھ محمد کے تعلقات اور اس کے نتیجے کے طور پر اس کی سلطنت کی بربادی کے بارے میں قب مادۂ چنگیز خان، جلال الدین اور اس خاندان کے آخری زوال [۶۲۸ھ/ ۱۲۳۱ء] کے لیے رک بہ جلال الدین خوارزم شاہ).

مغول کے ماتحت خوارزم کے والی بظاہر اس لقب سے ملقب نہ تھے ۔ یہی بات صوفی خاندان کے امرا کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، جن کی خود مختار حکومت بہت قلیل مدت کے لیے (یعنی ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء تک) قائم رہی ۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اس خاندان کی بنیاد ۷۶۲ھ/ ۱۳۶۰ء سے قبل یا ۷۶۵ھ/۱۳۶۳-۱۳۶۴ء کے بعد رکھی گئی ہو! قب *Bull. de l' Acad*، ۱۹۲۱ء، ص ۲۱۲ - ۷۸۱ھ/ ۱۳۷۹ء میں تیمور نے خوارزم فتح کر لیا، لیکن بعد کے زمانے میں خوارزم کے اس گھرانے کے کئی والیوں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً جین صوفی، جس کے ماتحت اوزبکوں نے ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں ملک فتح کیا تھا اور شریف صوفی، جس نے بقول حیدر رازی [رک بہ حیدر بن علی حسینی رازی] خوارزم پر قلیل عرصے کے لیے حکومت کی (بارتولڈ : *Svedieniya ob Aral' skom*، *Morie*, etc.، ص ۷۸۹ جرمن ترجمے *Nachrichten über den Aral-See* etc.، ص ۵۸، پر متعلقہ بیان حذف کر دیا گیا ہے) ۔ اس کے مقابلے میں مجمل فصیحی (مخطوطہ، جو پہلے ادارۂ السنۂ شرقیہ (*Institute for Oriental Languages Collection*) کی ملکیت تھا [قب *Scientifiques*, etc.، ۳ : ۱۱۱ ببعد] اور اب موزۂ ایشیای (Asiatic Museum) میں ہے)، ص ۲۷۳ میں امیر شاہ ملک کو، جسے شاہ رخ بن تیمور نے خوارزم کا والی مقرر کیا تھا، اواخر ۸۲۵ھ/۱۴۱۳ء سے ۸۲۹ھ/۱۴۲۶ء میں اس کی وفات تک خوارزم شاہ کہا گیا ہے ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ناصرالدین سلطان ابراہیم خوارزم شاہ بنا [مطلع سعدین، ۲ : ۲۳۸، ۵۹۹]؛ جیسے ابوالخیر کی سرکردگی میں اوزبکوں نے ۸۳۴ھ/۱۴۳۱ء کے قریب دارالحکومت سے نکال دیا (رک بہ ابو الخیر؛ [نیز مطلع سعدین، ۲ : ۶۳۴]) .

تاریخی دستاویزات اور ادبی تصنیفات میں بعض اوقات خوارزم شاہ کا لقب خیوہ کے اوزبک حکمرانوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، گو بظاہر انھوں نے خود کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتایا ۔ ابوالغازی [رک بہ ابوالغازی بہادر خان] خوارزم شاہ کا لقب صرف اس خاندان کے لیے استعمال کرتا ہے جسے مغول نے تباہ کیا تھا (طبع Desmaisons، ص ۱۳۷) اس کے علاوہ وہ (ص ۲۷۷) خوارزم شاہ کا کلمہ صرف اپنے ایک بھائی کے لیے استعمال کرتا ہے اور وہ بھی اس کے ذاتی نام کے طور پر ۔ جب ابوالغازی کے بیٹے اور جانشین انوشہ (۱۶۶۳ - ۱۶۸۷ء) نے مشہد کی فتح کے بعد شاہ کا لقب اختیار کیا تو اس نے بھی اپنے لقب کے ساتھ خوارزم کے لفظ کا اضافہ نہ کیا .

مآخذ : (۱) میر خواند : [روضۃ الصفاء]، طبع Defrémery، بعنوان *Histoire des sultans du Kharezm*، پیرس ۱۸۴۲ء؛ (۲) الجوینی : تاریخ جہانگشای، ج ۲ (سلسلۂ یادگار گب، ۱۶/۲)؛ (۳) Barthold : *Turkestan* etc.، باب ۳ ؛ [(۴) البیرونی : کتاب الجماھر، حیدر آباد دکن ۱۳۵۵ء، ص ۸۷، ۱۶۳ (۲۰۵ ببعد، ۲۱۰، ۳۵۵)؛ (۵) وطواطہ : دیوان عربی، بتصحیح سخاء اللہ، در کتابخانۂ دانشگاہ پنجاب و دیوان فارسی (اقتباسات در دیباچۂ حدائق السحر)؛ (۶) بہاء الدین محمد بن مؤید بغدادی : التوسل الی الترسل، تہران ۱۳۱۵ ش].

(W. BARTHOLD)

* **الخوارزمی** : ابوعبداللہ محمد بن احمد بن یوسف (المقریزی : خطط، بولاق ۱۲۷۰ھ، ۱ : ۳۵۸ میں ایسے

البلخی کہتا ہے) [الکاتب، معجم] چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی میلادی کے نصف آخر میں گزرا ہے: [سنہ وفات ۳۸۷ھ/۹۹۷ء ہے] مسلمانوں کا قدیم ترین دائرۃ المعارف اس کی تصنیف ہے یعنی مفاتیح العلوم (=علوم کی کنجیاں مرتبۂ G. van Vloten، لائڈن ۱۸۹۵ء)، جسے اس نے سامانی بادشاہ نوح ثانی (۳۶۶ھ/۹۷۶ء تا ۳۸۷ھ/۹۹۷ء) کے وزیر ابوالحسن عبیداللہ بن [احمد] ابی العتبی کے نام سے معنون کیا تھا (نیشا پور میں وہ اسی کے دربار سے منسلک تھا)۔ الخوارزمی کی پیدائش غالباً بلخ میں ہوئی [اسی لیے اسے بلخی بھی لکھا جاتا ہے، الزرکلی، ۶ : ۲۰۳]۔ جیسا کہ خود اس کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے وہ حکومت کے کسی عہدے پر فائز تھا۔ خراسان میں قیام کی وجہ سے اسے مشرق کے حالات سے خوب واقفیت تھی۔ عرب اس کتاب کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ یوں بھی مختلف مباحث کے متعلق معلومات کے لیے یہ کتاب بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے اور مصنف نے ان پر بالاستیعاب قلم اٹھایا ہے۔ [المقریزی نے اسے 'جلیل القدر' کتاب قرار دیا ہے]۔

ریاضیات وغیرہ میں الخوارزمی [کی وسعتِ مطالعہ کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نے] بلاشبہ یونانی مصنفین مثلاً اقلیدس نکوما کوئی ہیرو اور فلو وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

یہ تصنیف دو مقالوں میں منقسم ہے۔ مقالۂ اوّل میں شریعت اور اس سے متعلق علوم، فقہ، کلام، عروض، تاریخ اور دوسرے میں فلسفہ، منطق، طب، حساب، ہندسہ، ہیئت، موسیقی، حیل (الحیل خاص ایجادات) اور الکیمیا سے بحث کی گئی ہے۔ [فان فلوتن نے اسے لائڈن سے ۱۸۹۵ء میں شائع کیا] ڈاکٹر نفیس احمد نے سائنسی جغرافیے کے تحت چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی میلادی کے بیان میں لکھا ہے کہ جغرافیہ وغیرہ علوم میں اتنی بلند پایہ ذہنی بیداری کا کوئی نشان اس عہد سے پہلے نہیں ملتا اور اس سلسلے میں الخوارزی کی مفاتیح العلوم کا ذکر کیا ہے (History of Muslim Philosophy، ۱ : ۱۲۵۹)]۔

مآخذ: (۱) براکلمان، ۱ : ۲۴۴؛ (۲) دوسرے مقالے کے حصوں میں سے طب پر: E. Seidel: *Die Medizin im Kitab Mafatih al-Ulūm*، در *S.B.P.M.S. Erlg.*، ۱۹۱۵ء، ۴۷ : ۱ تا ۷۹ بحث کی ہے؛ قب نیز (۳) E. Wiedemann: *Beiträge VI, Zur Mechanik u. Technik bei den Arabern*، در *S.B.P.M.S. Erlg.*، ۱۹۰۶ء، ۳۸ : ۱ تا ۵۶؛ (۴) *Beiträge X, Zur Technik bei den Arabern*، وہی مجلہ، ۱۹۰۶ء، ۳۸ : ۳۰۷ تا ۳۵۷؛ (۵) *Beiträge XIV, Über die geometrie u. Arithmetik nach den Mafātīḥ al-'Ulūm*، وہی مجلہ، ۱۹۰۸ء، ۴۰ : ۱ تا ۶۴؛ (۶) *Beiträge XVIII, Astrmomische Instrumente*، وہی مجلہ، ۱۹۰۹ء، ۴۱ : ۲۶ تا ۳۵؛ (۷) *Beiträge XXII, Stücke aus den Mafātīḥ al-'Ulūm*، وہی مجلہ، ۱۹۱۰ء، ۴۲ : ۳۰۳ تا ۳۲۲؛ (۸) *Beiträge XXIV Zur Chemie bei den Arabern*، وہی مجلہ، ۱۹۱۱ء، ۴۳ : ۷۲ تا ۱۱۳؛ (۹) *Beiträge XXVII Geographische stellen aus den Mafātīḥ al-'Ulūm*، وہی مجلہ، ۱۹۱۲ء، ۴۴ : ۳۷ تا ۴۰؛ (۱۰) *Beiträge XLVII Über die Astronomie nach den Mafātīḥ al-'Ulūm*، وہی مجلہ، ۱۹۱۵ء، ۴۷ : ۲۱۳ تا ۲۳۲؛ (۱۱) *Beiträge LXVII, Definitionen verschiedener Wissenschaften und Über diese verfasste werke*، وہی مجلہ، ۱۹۱۸-۱۹۱۹ء، ۱/۵۱ : ۱ تا ۲۲؛ (۱۲) *Beiträge LXVI, Zur geschichte der Musik*، وہی مجلہ، ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء، ۵۴/۵۵ : ۷ تا ۲۲؛ [(۱۳) الزرکلی، ۶ : ۲۰۳؛ (۱۴) کشف الظنون، ۱۷۵۶؛ (۱۵) المقریزی: الخطط، ۱ : ۲۵۸؛ (۱۶) معجم المطبوعات، ۱ : عمود ۸۳۹؛ (۱۷) *History of Muslim Philosophy*، طبع محمد شریف، ۱۹۶۳ء]۔

(E. WIEDEMANN)

* **الخوارزمی** : [ابو عبداللہ و ابو جعفر] محمد بن موسیٰ، الطبری میں (طبع ڈخویہ، ۳، ۱۳۶۳) الخوارزمی کو المجوسی (مجوسی کی اولاد) اور القطربلی دجلہ کے مغرب میں بغداد کے قریب ضلع قطربل کا باشندہ یا متوطن بھی لکھا گیا ہے [الفلکی، الریاضی، المؤرخ] ۔ اس کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور جو معلوم ہیں وہ بھی معتبر نہیں کیونکہ اکثر صورتوں میں پتا نہیں چلتا کہ ان کا تعلق اس سے ہے یا محمد بن موسیٰ ابن شاکر سے (قب H. Suter : *Nachträge zir "die Mathemathiker"* وغیرہ، در *Abhandl. Zur Gesch der math. Wissensch*، ۱۹۰۲ء، جلد ۱۴، اشارہ ۱۹: ص ۱۵۸) ۔ الخوارزمی کی تاریخ پیدائش بھی معلوم نہیں ۔ تاریخ وفات بھی غیر قطعی ہے ۔ سوٹر کی رائے میں اس کا انتقال ۲۲۰ھ / ۸۳۵ء اور ۲۳۰ھ / ۸۴۴ء کے درمیان ہوا اور نالینو کے نزدیک ۲۳۲ھ / ۸۴۶-۸۴۷ء کے بعد ۔ الخوارزمی نے مامون کے عہد میں فروغ پایا ۔ وہ اس کے ہیئت دانوں میں شامل تھا اور اس کے عہد خلافت میں جب زمین کے درجات کی پیمائش کی گئی تو اس میں شاید وہ بھی شریک تھا ۔ مطالعے کا بیشتر وقت مامون کے کتب خانے میں گزارتا تھا ۔ مامون نے اسے یونانی کتابوں کے جمع کرنے اور ان کے تراجم کروانے کا کام سپرد کیا تھا ۔ الخوارزمی نے ریاضیات، جغرافیہ، ہیئت اور تاریخ میں خوب خوب محنت کی اور کتاب التاریخ کے نام سے ایک تصنیف مکمل کی، جس کا ذکر المسعودی نے بطور ماخذ کیا ہے اور جس سے غالباً الطبری نے عہد مامونی ۲۱۰ھ / ۸۲۵-۸۲۶ء کے ایک واقعے کے متعلق اقتباس بھی لیا ہے (دیکھیے نالینو C. A. Nallino: *al-Huwârizmî* وغیرہ، ص ۱۲) ۔ الخوارزمی کی تصنیفات بڑی اہم اور خود اس کی ذاتی تحقیقات کا نتیجہ ہیں جو اس کی حکیمانہ طبیعت اور نبوغ علم کا ثبوت ہیں ۔

ان تصنیفات کا تعلق اس زمانے سے ہے جب ابھی یونانی علوم و فنون کے ترجموں کا دور دورہ شروع نہیں ہوا تھا ۔ یہ الگ بات ہے کہ الخوارزمی کی زندگی کا کچھ حصہ الحجاج کی معاصرت میں گذرا ۔ یہی وجہ ہے کہ جبر و مقابلہ میں اس نے جو خدمات سرانجام دیں ان میں زیادہ تر ہندوؤں، ایرانیوں اور مدرسۂ جندی شاپور کی تصنیفات سے کام لیا گیا ہے ۔ یونانی ماخذ کی حیثیت اس کے لیے ثانوی تھی ۔ البتہ ہیئت اور جغرافیے میں شاید صورت حالات قدرے مختلف ہے ۔ الخوارزمی کی تصنیفات کا ذکر یعقوب الندیم کی الفہرست (ص ۲۷۵) اور ابن القفطی (ص ۲۸۶) میں موجود ہے ۔ الفہرست میں الخوارزمی کے فوراً بعد سند بن علی کا ذکر آتا ہے ۔ لہٰذا کارپنسکی **Karpinski** (کتاب مذکور) کو یقین تھا اور الحساب الہندی، الجمع والتفریق اور الجبر والمقابلہ جنہیں سند سے منسوب کیا گیا، دراصل خوارزمی ہی کی تصانیف ہیں ۔

ریاضیات میں اس کی اہم ترین تصنیف، حساب الجبر والمقابلۃ (J. Ruska کی رو سے Processes of Calculation for Integration and Equation) ہے لیکن ان معنوں میں نہیں جو ہمارے نزدیک جبر و مقابلہ کے ہیں بلکہ اطلاقی (applied) حساب کا ایک مقدمہ، جس کی بنا متعدد حل شدہ مثالوں پر رکھی گئی ۔ علاوہ ازیں اس تصنیف میں طرح طرح کی معلومات شامل ہیں ۔ (ا) تکمیل (Integration) اور مساوات کا عمل، مساوات کی سادہ ترین شکلیں؛ (ب) پیمائش اور مساحت؛ (ج) ورثوں کی ازروئے وصیت تقسیم کے قواعد ۔ لاطینی میں اس کتاب کا ترجمہ G. of Cremona اور R. of Chester وغیرہ نے کیا (دیکھیے ماخذ Rosen اور Karpinski کے تحت) ۔ لیکن غلط فہمیوں کی وجہ سے اور الخوارزمی کے تلفظ کے بگڑنے کے سبب طرح طرح کے الفاظ وضع ہونے لگے جن کی انتہا بالآخر الگورزم "algorism" پر ہوئی یعنی حساب لگانے کا کوئی متوالی طریقہ جو رفتہ

رفتہ قاعدے کی صورت اختیار کرلے۔

جہاں تک شرحوں کا تعلق ہے سنان بن فتح (Suter، عدد ۱۴۹)، عبداللہ بن السید ثانی (Suter، عدد ۱۵۲)، ابوالوفاء (Suter، عدد ۱۶۷) کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ روزن Rosen نے ان کے علاوہ (کتاب مذکور، ص ۱۴) کسی المزیہفی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ الخوارزمی کی تصنیف سے نہایت گہرے اثرات مترتب ہوئے اور آگے چل کر ابوکامل شجاع بن اسلم (Suter، عدد ۱۸) نے صاف صاف لفظوں میں اس سے استفادہ کیا (لا^{2} + ۱۰ لا=۳۹ اور اس قسم کی مثالیں بار بار دہراتی جاتی ہیں مثلاً ابوکامل الکرخی، عمر الخیام اور عیسائی مصنفین لیونارڈ متوطن پیسا (Leonsrdo of Pisa) کی تصنیفات میں جو ظاہر ہے الخوارزمی سے متاثر ہوئے۔

حساب میں الخوارزمی کی ایک اور تصنیف ابھی تک محفوظ ہے مگر لاطینی ترجمے میں *Algoruimi de Numers Indosum* مرتبۂ Bald. Boncompagni، در *Pubbl. da B.B. Nowa Trattati d'aritmatica*، ۱۸۵۷ء، عدد ۱)؛ رسکہ J. Ruska کے نزدیک یہ کتاب الجمع و التفریق (غالباً ہمیں "بحساب الہند" کے الفاظ کا اضافہ کر دینا چاہیے یعنی "ہندی نہج پر جمع اور تفریق کی کتاب" یا "ہندی رقوم کے ساتھ ...." قب J. Ruska، کتاب مذکور ص ۱۸) کے بالکل مطابق ہے۔

محمد بن ابراہیم الفزاری نے سدھانتا کا ترجمہ عربی میں کیا تھا اور وہ سند ہند عظیم کے نام سے مشہور ہوئی (اور جس میں سدھانتا سے بحث کی گئی تھی قب ایچ سوٹر H. Suter: *Die astronmischen Tafeln* وغیرہ ص ۳۲)۔ الخوارزمی نے سند ہند کے دو نسخے تیار کیے بلکہ اس سے پہلے شاید اس کا ملخص بھی۔ فلکی جدولوں کی جو کتاب اس طرح مرتب ہوئی، اس کا نام، جیسا کہ ابن یونس کا قول ہے، الخوارزمی نے زیج رکھا (دیکھیے نالینو: *al-Battenii Opus*، ۱ : ۱۵۷)۔ زیجی تصنیفات کی طرح اس میں صرف جدولیں ہی موجود نہیں بلکہ فلکیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

ابن ابی اُصَیبِعہ (۲ : ۳۹) کا بیان ہے کہ جداول میں الخوارزمی کی اس زبردست تصنیف کو مسلمہ المجریطی نے از سر نو ترتیب دے کر پھر سے شائع کیا اور شاید یہی متن تھا جس کی اساس پر لاطینی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس تصنیف میں مثلثی جدولیں بھی موجود ہیں، جن میں لفظ جیب ہمیشہ gaib "djaib" کے لیے استعمال ہوا۔ حالانکہ ثابت بن قرّہ کے یہاں اس کا حوالہ کبھی کبھی ہی ملتا ہے (قب H. Burger اور C. Kohl: *Axel Bjrnobs, Thabits Wesk über den Transversalensatz*، در *Abhandl. zur Gesch. der Naturewiss ench und Medizin*، ۱۹۲۴ء، ۷ : ۵)۔ لہٰذا بہت ممکن ہے الخوارزمی میں اس لفظ کا استعمال مسلمہ ہی نے کیا ہو (قب نالینو: *Al-Batteenii opus*، ۱ : ۱۵۴)۔ الخوارزمی نے اپنی کسی دوسری تصنیف میں شاید رؤیت ہلال سے بھی بحث کی ہے (قب نالینو: کتاب مذکور، ۱ : ۲۶۹)۔ یاقوت نے (معجم، ۱ : ۱۶۱، سطر ۱۰) جسامت زمین کے متعلق ایک بیان کے سلسلے میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی کو صاحب الزیج (کتاب الجداول کا مصنف) کہا ہے لیکن زیج میں ایسا کوئی بیان نہیں ملتا۔

الخوارزمی نے دو کتابیں اصطرلاب کے بارے میں بھی مدوّن کیں: کتاب العمل بالاصطرلاب ("اصطرلاب کا طریقۂ استعمال") اور کتاب عمل الاصطرلاب ("اصطرلاب سازی کا فن") مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں نہ عربی میں اور نہ لاطینی میں۔ الفرغانی کی کتاب فی صنعۃ الاصطرلاب بالہندسۃ ("اصطرلاب سازی ہندسہ کی مدد سے") نسخۂ برلن، فہرست شمارہ ۵۷۹۰) میں کئی فلکی مسائل اصطرلاب کی مدد سے حل کیے گئے ہیں اور اس کا یہ حصہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "محمد بن موسیٰ الخوارزمی کہتا ہے ...." (قب J. Frank: *Die Varwendung des Astrolabs nach* al-Khwārizmi، در Abhandlungen zur Gesch. der Naturwiss. und Medizin، ۱۹۲۲ء، ۳ : ۱ تا ۳۲؛ نیز دیکھیے نالینو: کتاب مذکور، ۱ : xlix).

دھوپ گھڑیوں کے متعلق الخوارزمی کی کتاب الرخامۃ کے متعلق ہمیں اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ اس نے اس قسم کی ایک کتاب تصنیف کی۔

الخوارزمی نے نجوم کے بعض مسائل پر عملی پہلوؤں سے قلم اٹھایا، مثلاً ابو معشر کے بیان کردہ ایک قصے کے ماتحت اس نے اس امر کی تحقیق کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک کے وقت کواکب کے قرانات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آئندہ نبوت کے متعلق کہاں تک پتا چل سکتا تھا (حمزۃ الاصفہانی: تاریخ، طبع Gottwaldt، Lib.، ج ۷، باب ۴ (متن): ص ۱۵۳ ببعد، ترجمہ ص ۱۲۳).

المأمون کے ایما پر الخوارزمی نے، شاید بعض دوسرے علما سے مل کر، افلاک اور کرۂ ارض کے نقشوں کی ایک اٹلس بھی تیار کی تھی۔ کتاب صورۃ الارض، جس کا نسخہ سٹراس برگ Strassburg میں محفوظ ہے یا جیسا کہ ابوالفداء اسے کتاب رسم الربع المعمور (کرۂ ارض کے آباد حصص کے نقشوں کی کتاب) کہتا ہے، اسی سے تعلق رکھتی ہے اور نالینو یہ ثابت کر چکا ہے کہ یہی وہ متن ہے جو نقشوں کے ساتھ ملحق تھا۔ نقشوں (دونوں نسخوں) کی تیاری میں اگرچہ بطلمیوس کی *Geography* پیش نظر تھی مگر اس کی ترتیب اس نے اپنے انداز میں کی اور اس میں نئے اور مستقل اضافے بھی کیے۔

کتاب مذکور کا ایک نسخہ نالینو نے اطالوی زبان میں مرتب کیا اور اس کے جغرافیائی مواد کے متعلق، بالخصوص اسی مواد کے حوالے سے جو بطلمیوس میں ملتا ہے، بڑی تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ H. von Mzik نے بھی اس کتاب پر مکمل بحث کی ہے اور افریقہ سے متعلق حصے ترتیب دے کر اس کے ترجمے کے ساتھ تشریحات کا اضافہ بھی کر دیا ہے (*Mitt. d. K.-K. geogr. Gesellsch. in Wien*، ۱۹۱۵ء، ۳۸ : ۱۵۲ ببعد، اور *Denkschr Ak. Wien*، حصۂ فلسفہ، ۱۹۱۶ء، ج ۵۹، عدد ۴) اور الخوارزمی کے بیانات کے مطابق ایک نقشہ بھی تیار کیا ہے (قب J. Ruska: *Neue Bausteine zur Geschibhte der arabischen Geographie*، در *Geogr. Zeitschr*، ۱۹۱۸ء، ۲۴ : ۷۷ تا ۸۱).

مآخذ: (۱) ابن الندیم: الفہرست، ص ۲۷۴؛ (۲) ابن القفطی: تاریخ الحکماء، ص ۲۸۷؛ (۳) کشف الظنون، ص ۵۷۹؛ (۴) المسعودی: التنبیہ والاشراف، ص ۱۵۷، ۱۸۹؛ (۵) حمزۃ: تاریخ سنی ملوک الارض، ص ۱۲۱؛ (۶) الزرکلی، ۷ : ۳۴۷؛ (۷) معجم المطبوعات، عمود ۸۳۱؛ (۸) براکلمان: تکملہ، ۱ : ۳۸۱؛ (۹) H. Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*، عدد ۱۹، در *Zeitschrift für Mathematik und Physik*، ۱۹۰۰ء، ج ۱۰، عدد ۱۹، اور خصوصًا تکملہ: وہی کتاب، ۱۹۰۲ء، ۱۴ : ۱۵۸ تا ۱۶۰؛ (۱۰) M. Cantor: *Vorlesungen zur Geschichte der Mathematik*، بار سوم، ۱۹۰۷ء، ۱ : ۷۰۰ ببعد؛ اور تاریخ ریاضیات سے متلق دوسری تصانیف؛ (۱۱) *The Algebra of Mohammad ben Musa*، طبع و ترجمہ از Fr. Rosen، ۱۸۳۱ء، ج ۱۶، ترجمہ: ص ۲۰۸، متن، ص ۱۲۲؛ (۱۲) *Robert of Chester's Latin Translation of the Algebra of Al-Khowarizmi*، طبع L. Ch. Karpenski: *University of Michigan Studies*، Humanistic Series، نیویارک ۱۹۱۵ء، ج ۱۱؛ (۱۳) J. Ruska: *Zur ältesten arabischen Algebra u. Rechenkunst*، در *S.B. Ak. Heid*، ۱۹۱۷ء، عدد ۲؛ ص ۱۲۵، اور جائزہ از E. Wiedemann، در *Berliner Philologische Wochenschrift*، ۱۹۱۹ء، ۳۹ : ۴۸ تا

۵۴ : (۱۴) H. Suter : *Die astronomischen Tafeln des Muhammed ben Musa al-Khwārizmī* وغیرہ، کوپن ہیگن، ۱۹۱۴ء، در *Kgl. Danske Vidensk. Selsk. Skrifter*، سلسلہ ۷، Historisk of filosofisk Afd.، ۳ : ۱ : (۱۵) مثلثی جدولوں کو A.A. Bjrnbo : *Al-Chwarizmi's trigonometriske Tavler*، در *Festskrift til H.G. Zeuthen*، کوپن ہیگن ۱۹۰۹ء میں شائع کیا گیا : (۱۶) *Al-Huwārizmī e il suo rifacimento della geografia di Tolomeo*، در *Memorie della Classe di Science morali* وغیرہ، ۱۸۹۴ء، ۲ : ۱ الف : (۱۷) نالینو C. A. Nallino نے البتانی کی کتاب کے اپنے ایڈیشن میں الخوارزمی کے متعلق خاصی معلومات دی ہیں (قب اشاریہ).

(E. WIEDEMANN)

* **خواند امیر** : ایرانی مؤرخ، نام غیاث الدین؛ وہ خواجہ ہمام الدین بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ برہان الدین محمد شیرازی کا بیٹا تھا ۔ مؤرخ میر خواند [رک باں] اس کا نانا اور نظام الدین سلطان احمد صدر ماموں تھا ۔ اس کا باپ برسوں سمرقند کے سلطان محمود کا، جو بابر کا چچا تھا، وزیر رہا ۔ خواند امیر کی پیدائش تقریباً ۱۴۷۵ء میں ہوئی ہوگی اور غالباً ہرات میں، جہاں اس کے نانا رہا کرتے تھے ۔ ہفت اقلیم میں اس کا مولد بخارا بتایا گیا ہے ۔ اس کے نانا میر خواند کے بارے میں پتا چلتا ہے کہ وہ دراصل بلخ کے رہنے والے تھے ۔ خواند امیر سلطان حسین کے سب سے بڑے بیٹے بدیع الزمان کی ملازمت میں داخل ہوا، ۱۵۰۲ء میں وہ اس کے ساتھ پل چراغ میں تھا اور بدیع الزمان سے اس نے وہ واقعات سنے جو پانچ چھے سال پہلے بدیع الزمان کو خواند امیر کے والد سے شکست کھانے کے بعد پیش آئے تھے.

مئی ۱۵۰۶ء میں سلطان حسین کی وفات کے بعد خواند امیر بدیع الزمان کے ساتھ شمالی ایران میں مرل کے مقام پر تھا ۔ ۱۵۰۷ء کے موسم بہار میں، جب کہ خیال تھا کہ شیبانی کی یلغار کو روکا جائے، بدیع الزمان اور اس کے بھائی اور شریک بادشاہت مظفر نے خواند امیر کو ہدایت کی کہ وہ قندھار جائے اور شاہ بیگ ارغون کو ترغیب دے کہ وہ ان سے مل جائے ۔ صرف ہرات تک پہنچا تھا کہ بدیع الزمان کی بیٹی جوجک بیگم کی موت کی وجہ سے دیر ہو گئی اور خود شیبانی کے قریب آ جانے کی وجہ سے بھی وہ قندھار نہیں گیا ۔ ایک بار وہ ایک بے نتیجہ سفارت پر خسرو شاہ کے پاس کُنْدُز بھی گیا ۔ شیبانی کا مقابلہ کرنے کے لیے مرل کے مقام پر ایک کمزور سی کوشش کی گئی، مگر شہزادے بھاگ کھڑے ہوئے اور بہادر ذوالنون ارغون قتل کر دیا گیا ۔ مارچ ۱۵۰۷ء میں ہرات پر حملہ ہوا اور خواند امیر اور اس کے بھتیجے عثمان کو، جو شہر کا محتسب تھا، شہر کے باشندوں نے شیبانی سے اس کے پڑاؤ میں ملاقات کرنے اور ہتیار ڈال دینے کی شرائط معلوم کرنے کی خدمت سپرد کی ۔ عثمان شیبانی سے ملاقات کرنے میں کامیاب بھی ہوا، اگرچہ راستے میں اس کے کپڑے چھین لیے گئے اور اس کو لوٹ لیا گیا ۔ خواند امیر ہرات پر دشمن کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہیں رہا ۔ اس نے بہت دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے کہ کس طرح اس سے اور اس کے دوستوں سے ازبکوں نے زبردستی روپیہ وصول کیا ۔ وہ اس وقت بھی ہرات میں تھا جب کہ بادشاہ اسمٰعیل صفوی اوّل نے شیبانی کو شکست دی اور اسے قتل کرکے ۱۵۱۰ء میں شہر پر قبضہ کر لیا ۔ ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں ہم خواند امیر کو گرجستان کے بِشْت یا بَشْت نامی گاؤں میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے پاتے ہیں ۔ یہ مقام شمالی ایران میں ہے (نہ کہ گرجستان میں جیسا کہ Elliot نے لکھا ہے؛ قب de Sacy، بر گرجستان، در *Mines de l' Orient*، ۱ : ۳۲۱)، جہاں وہ تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہا ۔ پھر اس نے محمد زمان کی، جو اس کے پرانے آقا کا سب سے بڑا بیٹا تھا

ملازمت اختیار کی اور کچھ دنوں تک بلخ وغیرہ میں اس کا شریک حال رہا؛ مگر جب محمد زمان قندھار جانے کی تیاری کر رہا تھا اس وقت خواند امیر نے پشت واپس جانے کی اجازت چاہی ۔ وہ افغانستان میں بھی بہت عرصہ نہیں ٹھیرا اور مارچ ۱۵۲۸ء میں ہندوستان کا رخ کیا ۔ آگرے پہنچ کر ماہ ستمبر میں بابر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ۱۵۲۹ء میں، جب بابر بنگال گیا، وہ بھی ساتھ تھا ۔ تربہو ہنی یا سرجو اور گنگا کے سنگم پر بھی وہ بابر کے ہمراہ تھا (حبیب السیر، طبع سنگی، ۳ : ۸۴، جلد ۳ کے حصہ ۴ کا آخر) ۔ بابر ۱۵۳۰ء کے آخر میں فوت ہو گیا اور اس کے بعد خواند امیر نے ہمایوں کی ملازمت اختیار کی اور اس کی عمارتوں اور منصوبوں پر ایک مدحیہ قصیدہ لکھا، جس کا نام قانون ہمایونی یا ہمایون نامہ رکھا (اس کا ایک مخطوطہ موزۂ بریطانیہ میں محفوظ ہے)؛ اس کتاب کا حال کچھ اقتباسات کے ساتھ History of India : Elliot، ۵ : ۱۱۶ پر درج ہے ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خواند امیر کا انتقال ۹۴۱ھ/۱۵۳۴-۱۵۳۵ء میں ہمایوں کی مہم گجرات کے دوران میں ہوا، مگر فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی موت گجرات سے واپسی پر عارضۂ پیچش سے ہوئی ۔ یہ واقعہ ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء کا ہے ۔ اس سال خواند امیر زندہ تھا اور اس نے اپنے ایک دوست اور ہم سفر شہاب الدین چیستان گو کی تاریخ وفات کہی تھی (قب بداؤنی، ترجمۂ Ranking، ۱ : ۵۰۳) ۔ خواند امیر کا انتقال غالبا ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء یا ۹۴۳ھ/۳۷-۱۵۳۶ء میں ہوا ۔ اپنی وصیت کے مطابق وہ دہلی میں نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کی آخری آرام گاہوں کے قریب دفن ہوا ۔ اس وقت اس کی عمر غالبًا ساٹھ سال تھی ۔

خواند امیر پر نویس تھا ۔ اس کی پہلی تصنیف خلاصۃ الاخبار ہے، جو ۹۰۵ھ/۱۴۹۹-۱۵۰۰ء میں لکھی گئی اور علی شیر کے نام سے معنون ہوئی، جس کے کتاب خانے سے اس نے ضروری مواد فراہم کیا تھا ۔ یہ نوجوانی کی تصنیف ہے، اس لیے اس میں فطری طور پر بہت کم مواد ایسا ہے جو اس نے ذاتی معلومات کی بنا پر قلم بند کیا ۔ دراصل یہ حبیب السیر کا ابتدائی خاکہ ہے، مگر بعض مقامات پر مثلاً یادگار محمد کی گرفتاری اور اس کے قتل کا بیان بعد کی تصنیف یعنی حبیب السیر سے بھی زیادہ مفصل ہے ۔ خواند امیر کی گراں قدر تصنیف (اور صرف وہی شائع بھی ہوئی ہے) حبیب السیر ہے ۔ اس کی ابتدا ۱۵۲۱ء میں ہوئی اور اس کا بیشتر حصہ ۱۵۲۳-۱۵۲۴ء میں لکھا گیا اگرچہ اس نے ہندوستان آنے کے بعد اس میں کچھ اور اضافے کیے ۔ حبیب السیر، جسے یہ نام ایک دوسرے سرپرست حبیب اللہ کی نسبت سے دیا گیا ہے، عمومی تاریخ ہے، اس میں ابتدائے آفرینش سے اسمعیل صفوی اول کی زندگی کے اختتام [۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء] تک کے حالات درج ہیں؛ یہ تاریخ مصنف کے خود اپنے زمانے کے حالات کے لیے گراں قدر مأخذ ہے ۔ کتاب کے سب سے مفید حصے وہ ہیں جو ہرات کے سلطان حسین [بایقرا] اور اسمعیل اوّل کی زندگی کے حالات پر لکھے گئے ہیں ۔ ضمنی طور پر اس نے شیبانی اور بابر کے بارے میں بھی بہت اطلاعات بہم پہنچائی ہیں؛ مؤخرالذکر کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ بابر کی توزک کے دو بڑے خلاؤں کو پر کرنے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے ۔ وہ غیر جانب دار اور صاحب اصول مصنف ہے ۔ اس نے حبیب السیر کو مکمل کرنے سے پہلے اسے تین بار لکھا، اس نے جو کچھ لکھا، بہت صحت سے لکھا اور اکثر اپنے ذاتی علم کی بنا پر لکھا ۔ اس میں لفاظی اور صنائع و بدائع کا استعمال بہت ہے، جیسے کہ اس کے ہم عصر حسین واعظ کی انوار سہیلی میں ہے؛ اس میں جگہ جگہ اشعار بھی درج کیے گئے ہیں ۔ سلطان حسین اور اسمعیل صفوی کی وہ بہت تعریف کرتا ہے اور کہیں کہیں بے ضرورت پر گو اور

طوالت پسند ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ محمد زماں کی مہموں کی تھکا دینے والی تفصیلات لکھتا چلا جاتا ہے۔ حبیب السیر تہران اور بمبئی میں چاپ سنگی میں طبع ہوئی۔ خواند امیر روضة الصفا [مصنفۂ میر خواند] کی ساتویں جلد کا بھی مصنف ہے۔

مآخذ: (۱) Elliot: *History of India*، ج ۴ و ۵؛ (۲) H. Ferté: *Vie de Sultan Hossein Baikara, traduite de Khondémir* (پیرس ۱۸۹۸ء)؛ (۳) A.S. Beveridge: ترجمۂ تزک بابری Babur Nama؛ (۴) *Asiatic Miscellany*، ج ۱؛ (۵) F.B. Charmoy: *Mem de l' Academie imperiale de Saint-Petersbourg*، سلسلہ ۶، ج ۳ و ۸؛ (۶) Quatremere: *Journal des Savants*، ۱۸۴۳ء، ص ۳۸۹ تا ۳۹۴؛ (۷) Rieu: *Cat. of Persian Mss.*، ۱: ۹۸ ببعد۔

(H. BEVERIDGE)

* **خوتین** : (Chocim) بسربیا کے ایک ضلع کا صدر مقام، جو اس لیے تاریخی شہرت کا حامل ہے کہ یہاں سلطان عثمان ثانی نے ستمبر ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء میں پولستانیوں کی مضبوط لشکر گاہ پر شدید حملہ کیا تھا، جو ناکام رہا تھا۔ ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں خوتین کے نواح میں دوبارہ جنگ ہوئی۔ گو اس وقت ترکوں کو بظاہر کامیابی نہ ہوئی لیکن آخرکار ۱۶۷۴ء کے اوائل میں پولستانیوں نے یہ شہر ترکی افواج کے حوالے کر دیا۔ ۱۱۸۲-۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں بھی روسیوں نے شہر کا محاصرہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا، لیکن بعد میں پھر ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۷۸۸ء میں بھی یہی عمل دہرایا گیا۔ ۱۸۰۶ء میں انھوں نے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور ۱۸۱۲ء میں روس کو تفویض کر دیا۔

(ادارہ)

* **خوجہ** : (فارسی: خواجہ)، [برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا ایک فرقہ، جس کے اکثر افراد عقائد کے اعتبار سے اسمٰعیلیوں کی نزاری شاخ سے تعلق رکھتے ہیں اور آغا خان کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر مندرجۂ ذیل علاقوں میں آباد ہیں: (الف) پاکستان: پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، کشمیر، گلگت، ہنزہ، چترال، سندھ؛ (ب) بھارت: گجرات (کاٹھیاوار)، بمبئی اور مغربی ساحل۔ برصغیر کے خوجوں کی تاریخ خاصی طویل ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے رک بہ اسمٰعیلیہ؛ نیز W. Ivanow: *Brief Survey of the Evolution of Ismailism*، لائڈن ۱۹۵۲ء، ص ۱۹ ببعد۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے برصغیر میں ان کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب تھی]۔

پنجاب کے خوجے آغا خان کے پیرو نہیں اور ان کے مذہبی عقائد بمبئی کے خوجوں سے ملتے جلتے ہیں (*Census of India*، ۱۹۰۱ء، ۱۷: ۱۵۰ ببعد)۔ یہ بھی بمبئی کے خوجوں کی طرح ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں اور زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔ وہ اپنا حساب کتاب ہندی میں کرتے ہیں اور ہندوانہ رسم و رواج کے پابند ہیں۔ پراچے بھی انھیں کے ہم عقیدہ ہیں، جن کی تعداد پنجاب میں چار ہزار کے قریب ہے۔ ان کی ابتدا حاجی سید صدر الدین سے ہوئی، جو پندرھویں صدی میلادی میں اسمٰعیلی عقائد کی تبلیغ کے لیے خراسان سے آئے اور ریاست بہاولپور کی بیننازی گوٹھ چنی کے مقام ترنڈہ گورگیج میں مدفون ہیں۔ انھوں نے اپنے عقائد ہندوؤں کے سامنے ایسی شکل میں پیش کیے جو ان کی ہندوانہ روایات سے مناسبت رکھتے تھے۔ مشہور ہے کہ وہ دس اوتار کے مصنف تھے، جس میں وشنو کے اوتاروں کا سلسلہ اسلام سے اس طرح ملایا گیا ہے کہ پہلے نو اوتار تو ہندو تھے اور دسویں اوتار (سنسکرت: نِش کَلنک کا۔ بے داغ)، جن کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ اس کا ظہور کسی آئندہ زمانے میں ہوگا، اسمٰعیلیوں کے امام غائب ہیں۔ پنجابی خوجے، برصغیر میں آغا خان کے پیرو، نیز

مشرق افریقہ کے اسمٰعیلی آج تک دس اوتار اور صدر الدین کی مناجات دونوں کتابیں استعمال کرتے ہیں۔ عملی ہدایت کے لیے پنجابی خوجے قادریہ اور چشتیہ فرقوں کے درویشوں اور دوسرے پیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں، اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ اِن کے اور اُن کے عقائد یکساں ہوں.

صوبۂ بمبئی کے خوجوں اور مشرق افریقہ میں ان کی شاخوں کی تنظیم ایک فرقے کی حیثیت سے بہت بہتر ہے اور ان لوگوں کا آغا خاں سے براہ راست تعلق ہے۔ ان کے مذہبی خیالات دراصل وہی ہیں جو پنجاب کے خوجوں کے ہیں، لیکن ان کے درمیان امام وقت آغا خاں کی موجودگی نے انہیں مسلمانوں کے مذہبی سلسلوں کے اثر سے دور کر دیا ہے۔ وقتاً فوقتاً کچھ لوگ ان کی صفوں سے علٰحدگی اختیار کرتے رہے ہیں، لیکن خاص طور پر یہ بات انیسویں صدی عیسوی کے ساتویں عشرے میں وقوع میں آئی جبکہ ان کی ایک جماعت نے یہ کوشش کی کہ پوری برادری کے سنّی ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔ ۱۹۰۱ء میں ان کی ایک قلیل تعداد نے مغربی طریقے پر تعلیم یافتہ افراد کی قیادت میں اثنا عشری (رک بآں) شیعہ ہونے کا اعلان کیا۔ ان لوگوں نے بمبئی میں اپنی ایک الگ مسجد اور ایک علٰحدہ قبرستان (جو آرام باغ کہلاتا ہے) بنا لیا ہے، لیکن بمبئی کے خوجوں سے انھوں نے اپنا معاشرتی تعلق برقرار رکھا ہے.

خوجے زیادہ تر رواجی قانون کے پابند ہیں۔ بمبئی کی عدالت عالیہ کے ایک فیصلے (۱۸۴۷ء) کی رُو سے ان پر اسلامی قانون وراثت کا اطلاق نہیں ہوتا، چنانچہ ہندو قانون کی طرح ان کے یہاں بھی عورتیں پوری وراثت کے حق سے محروم ہیں (مقدمۂ مرجن میر علی: قب *Cases Illustrative* : Sir Erskine Perry *of Oriental Life and the Application of English Law to India*، لنڈن ۱۸۵۳ء، ص ۱۱۰).

بمبئی کے خوجوں کے یہاں پیر صدر الدین سے پہلے کے ایک مبلغ نورستگر یا پیرست گرنور کے متعلق یہ روایت چلی آتی ہے کہ وہ بارھویں یا تیرھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ ۱۵۹۳ء کے قریب ان کے امام آقا عبدالسلام نے ہندوستانی خوجوں کی ہدایت کے لیے فارسی زبان میں ایک کتاب پَنْد یادِ جوانمردی لکھی، جس کے قدیم سندھی نسخے کو چھبیسواں خوجے پیر یا ولی کا درجہ دے کر قابل تعظیم و تکریم سمجھا جاتا ہے.

بمبئی کے خوجوں کے یہاں شادی، طلاق اور تجہیز و تکفین کی رسوم عام اسلامی دستور اور شریعت سے مختلف ہیں۔ ان کی شادی کی رسوم پر قدیم ہندوانہ رنگ غالب ہے۔ نکاح کی مخصوص رسم زمانۂ حال تک سنی قاضی ادا کیا کرتے تھے۔ گجراتی زبان میں شادی کی ایک سند دی جاتی ہے، جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے فرشتوں، یعنی جبرائیل، اِسرافیل، عزرائیل اور میکائیل کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ جماعت کی اجازت کے بغیر طلاق نہیں دی جا سکتی، تاہم بالعموم پہلی بیوی کے گزارے کے لیے دو ہزار روپے جمع کر دینے پر اس کی اجازت مل جاتی ہے۔ ایک عجیب رسم، جو مرتے وقت ادا کی جاتی ہے، "سَمَر چھانٹنا" ہے، یعنی مقدس پانی کا چھڑکنا اور اس کے ساتھ کتاب دس اوتار کی تلاوت.

اس جماعت کی تنظیم میں مالی اعتبار سے آغا خاں کی مقدس ذات کو مرکزیت حاصل ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انتظامی امور میں کامل جماعتی آزادی حاصل ہے۔ ہر جماعت کا اپنا علٰحدہ "جماعت خانہ" ہوتا ہے، جو مجلس اور مسجد دونوں کا کام دیتا ہے۔ اس کے عہدیدار "مُکھی" (مُکھیا، خازن و صدر) اور "کامڑیہ" (معتمد، محاسب) کہلاتے ہیں۔ اکثر انہیں منتخب کیا جاتا ہے، لیکن بعض اوقات خود آغا خاں بھی انہیں نامزد کرتے ہیں۔ امام کے لیے نذریں الٰہی کی وساطت

سے جمع کی جاتی ہیں۔ یه نذریں دسوندھ (= عُشر) کے علاوہ ایسی رقوم پر مشتمل ہوتی ہیں جو ہر سال مقررہ اوقات پر، مثلاً نوجندی کے موقع پر اور بعض اوقات ولادت، نکاح اور تجہیز و تکفین کی رسوم کے موقعوں پر ادا کی جاتی ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں مومنوں کی جماعت سے علیحدگی دسوندھ کی ادائی کے سوال ہی پر ہوئی تھی۔

آغا خان کے جو پیرو ایران، وسط ہند یا شمال مغربی ہمالیه کی سرحد پر رہتے ہیں ان کی تنظیم کے بارے میں ہمیں بہت کم علم ہے۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے وہ اسمٰعیلیوں کی نزاری شاخ کے مذہب کے پابند ہیں (رک به اسمٰعیلیه)۔ عرب اور مصر کے مستعلیوں اور ہندوستانی بوہروں (جو انھیں کی نسل سے ہیں) کے عقائد ان سے مختلف ہیں۔

مآخذ: Gazetteer of the Bombay Presidency، بمبئی ۱۸۹۹ء، ۹/۲: ۳۶ تا ۵۰؛ (۲) Revue du Monde musulman، ۱: ۴۸ تا ۸۵ (اسے مذکورۂ بالا کتاب کا تکمله سمجھنا چاہیے۔ اس میں اسمٰعیلی فرقے کے علاوہ آغا خان کے آبا و اجداد کی مختصر تاریخ بھی ملتی ہے)، و اشاریه، در ج ۱ تا ۱۰، بذیل "خوجه" و "آغا خان"؛ (۳) جعفر رحمت اللہ: History of the Khojas، بمبئی ۱۹۰۵ء (بمبئی یونیورسٹی کے ایک فارغ التحصیل خوجے کی گجراتی زبان میں تصنیف، جس میں خوجه جماعت کے مشاہیر کے متعلق مفید معلومات درج ہیں)؛ (۴) Judgment by the Honourable Sir Joseph Arnould in the Khojah case delivered 12th November 1866، بمبئی ۱۸۶۶ء (اس میں اس وقت تک کی خوجوں کی تاریخ کا خلاصه ہے اور ایک اقلیتی جماعت کے اس دعوے کا رد ہے کہ خوجے سنّی ہیں)؛ (۵) Census of India، ج ۱۷: پنجاب، ص ۱۵۰ تا ۱۵۱، شمله ۱۹۰۲ء (پنجابی خوجوں کا حال)؛ (۶) J. Biddulph: Tribes of the Hindoo Koosh، کلکته ۱۸۹۸ء (سرحدی اسمٰعیلیوں کے سرسری حالات)؛ (۶) M. Dumasia: A brief History of the Aga Khan، بمبئی ۱۹۰۳ء (ایک پارسی کی غیر تنقیدی تصنیف)؛ (۷) S. Nandjiani: Khodja Vrittant، احمد آباد ۱۸۹۲ء (جدید تحقیقات کے منظر عام پر آنے سے قبل ایک خوجے کی تصنیف)؛ (۸) میرزا محسن فانی: دبستان مذاهب، کلکته، بدون تاریخ، ص ۳۸۸ ببعد (مترجمهٔ Anthony Troyer و D. Shea، پیرس ۱۸۴۳ء، ۲: ۳۹۷ تا ۴۵۱)۔

(عبداللہ یوسف علی)

* **خوجه افندی:** سعد الدین بن حسن جان بن حافظ محمد بن حافظ جمال الدین الاصفہانی، معروف به خوجه (سعد الدین) افندی، ایک مشہور ترکی مؤرخ اور شیخ الاسلام۔ اس کی ولادت ۹۴۳ھ/۱۵۳۶-۱۵۳۷ء میں استانبول میں ہوئی۔ اس کا والد حسن جان ایران سے نقل وطن کرکے یہاں آ گیا تھا اور اس نے سلطان سلیم اول کے عہد کے آخری سات سال میں اس کے حاجب کی حیثیت سے خدمات سر انجام دی تھیں۔ حسن جان نے اپنے بیٹے کو سلطان موصوف کی زندگی کے متعلق طرح طرح کی باتیں سنائی تھیں، جنھیں سعد الدین نے سلیم نامه کی صورت میں تالیف کیا اور پھر اسے اپنی مشہور تاریخ میں بطور ضمیمه شامل کر لیا (۲: ۳۲۱ تا ۴۰۱؛ قب Pertsch: Türk. Hss. Berlin، ص ۲۳۱، عدد ۲۱۳؛ Flügel: Die ... Hss. ... in Wien، ۲: ۲۱۰، عدد ۹۸۷؛ اس پر J. V. Hammer، در G O R، ۲: vi، ۱۰۰، ۶۳۴؛ ۹: ۳۰۲، ۵۹۰؛ نیز وہی مصنف: Lettere sui rast orientali، در Bibliotheca italiana، ج ۴۳ [۱۸۲۶ء]؛ سلیم نامه کا جرمن ترجمه [بلا مقدمه]، از H.F.V. Diez: Denkwürdigkeiten aus Asien، ۱: ۲۵۶ تا ۳۰۲، برلن ۱۸۱۱ء)۔ سعد الدین نے فقه کی تعلیم حاصل کی اور جلد ہی ممتاز علما میں شمار ہونے لگا۔ ۹۶۳ھ/۱۵۵۵-۱۵۵۶ء میں مشہور فقیه ابو السعود (رک بآن) کا ملازم ہوا۔ محرم ۹۸۱ھ/مئی ۱۵۷۳-۱۵۷۳ء میں وہ ولی عہد مراد کا، جو اس وقت مغنیسه کا والی تھا،

اتالیق (= خوجه، جس کی نسبت سے وہ اس نام سے موسوم ہوا) مقرر ہوا۔ دسمبر ۱۵۷۴ء میں مراد سوم کی تخت نشینی پر وہ اس کا معتمد مشیر رہا اور مراد کے جانشین محمد سوم کے عہد میں "خوجه سلطانی" یعنی سلطان کے اتالیق کے منصب پر برقرار رہا۔ شعبان ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۸-۱۵۹۹ء میں وہ شیخ الاسلام ہو گیا اور اس منصب پر متمکن ہونے کے دو سال بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۰۰۸ھ/۲ اکتوبر ۱۵۹۹ء کو، جب وہ جامع آیا صوفیا، استانبول، میں میلاد نبوی (مولود) منعقد کرنے کی تیاری میں مصروف تھا، اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے پانچ بیٹوں میں سے چار بیٹے اعلٰی مناصب تک پہنچے، یعنی محمد (قب سجل عثمانی، ۴ : ۱۴۴) اور محمد اسعد (قب وهی کتاب، ۱ : ۲۲۰ ببعد) کو مفتی کا منصب حاصل ہوا اور عبدالعزیز (قب وهی کتاب، ۳ : ۳۳۸) اور صالح (قب وهی کتاب، ۳ : ۲۰۰ ببعد) قاضی عسکر کے منصب پر فائز رہے۔ [پانچواں بیٹا] مسعود "محافظ" تھا اور اس کا انتقال کم عمری ہی میں ہوا (قب وهی کتاب ۳ : ۳۶۵ ببعد)۔ [خوجه افندی کے بیٹے] اس کے جنازے کو قبرستان ایوب میں لے گئے، جہاں اسے مدرسۂ حفظِ قرآن میں دفن کیا گیا۔

سعد الدین مشہور ترکی تاریخ تاج التواریخ کا مصنف تھا۔ اگرچہ یہ تاریخ شاہی حکم سے نہیں لکھی گئی تھی (سعدالدین باقاعدہ شاہی مؤرخ، یعنی واقعہ نویس نہیں تھا؛ قب *Mitt. zur osm. Gesch.*، ۱ : ۲۴۱)، تاہم اسے بالعموم اب تک عثمانی تاریخ کا ایک معتبر مأخذ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے یہ تاریخ مرتب کر کے نہ صرف اس خاندان کی تمام سابقہ تاریخوں کو، جو "تواریخ آل عثمان" کہلاتی تھیں، لوگوں کے ذہن سے فراموش کر دیا بلکہ انھیں ان کی نظروں سے گرا دیا (قب حاجی خلیفہ: کشف الظنون، ۲ : ۱۱۲، عدد ۲۱۵۸، نیز J. H. Mordtmann، در *Isl.*، ۱۰ : ۱۶۰)۔ اس کتاب میں آل عثمان کی تاریخ اس کی ابتدا سے لے کر سلیم اول کی وفات (۲۱ ستمبر ۱۵۲۰ء) تک بیان کی گئی ہے۔ اس تالیف میں اس نے اپنے سے پہلے کے مؤرخین سے بعض واقعات نقل کیے ہیں اور اکثر مقامات پر مبالغے اور اغراق سے کام لیا ہے۔ یہ تاریخ، جس کی تکمیل سلیم ثانی کے عہد (۱۵۶۶ تا ۱۵۷۴ء) میں ہوئی، دراصل مصلح الدین محمد اللاری (م ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء) کی فارسی تاریخ مرآة الادوار و مرقاة الاخبار (جس کا ترجمہ سعد الدین نے ترکی میں کیا تھا، مخطوطہ، در ویانا، قب Flügel، ۲ : ۸۰، عدد ۸۴۵) کے ضمیمے کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس کی نشر و اشاعت ہوتی رہی اور اس کے بہت سے مخطوطے لوگوں کے زیر مطالعہ رہے۔ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں اس کا ایک مطبوعہ ایڈیشن دو ضخیم جلدوں میں (جو علی الترتیب ۵۸۶ اور ۶۱۹ صفحات پر مشتمل ہیں؛ قب *JA*، ۱۸۶۳ء، ۲ : ۲۶۲) عام پڑھنے والوں کو مہیا ہو گیا۔ اس کتاب کے مخطوطے، جو اکثر خوبصورتی سے تیار کیے گئے تھے (مثلاً وہ نسخہ جو پوپ کے محل Vatican میں ہے) یورپی کتاب خانوں میں بالعموم موجود ہیں۔ ان میں سے جو مخطوطے آئندہ کسی تنقیدی اشاعت کے لیے اہم اور سب سے زیادہ کارآمد ہو سکتے ہیں، ان کا یہاں ذکر کر دینا مناسب ہوگا: برلن، عدد ۲۱۳؛ ڈریسڈن Dresdien، عدد ۳۸۶؛ لائڈن، *Cat.*، ۳ : ۲۷؛ لنڈن، Rieu: *Cat. Turk. Mss.*، ص ۵۱ ب ببعد؛ Mailand، Ambrosiana، عدد ۲۴۳؛ میونخ، عدد ۷۶ تا ۸۱؛ آوکسفرڈ یونیورسٹی، *Cat.*، عدد ۱، ۴؛ پیرس، عدد ۶۳ و ۷۰؛ سینٹ پیٹرز برگ، Univ.-Bibl.، عدد ۱، ۲؛ فہرست، از Von C. Salemann و V. v. Rosen، ص ۲۰۱؛ روم، ویٹیکن Vatican، ایک شاندار نسخہ، جو پہلے سویڈن کی ملکہ کرسٹینا Christina کے پاس تھا (قب J. v. Hammer، در *Bibl. ital.*، ۴۶ : ۳۵ و ۱۱۵؛ نیز P. Horn، در *ZDMG*، ۱۸۹۷ء،

۱۰۵ : ۵ و ببعد؛ اپسالا Uppsala، عدد ۳۰۵؛ وینس، Bibl. Naz. Marciana، عدد ۳۰، ۸۵، ۳۲، ۱۳۳؛ فہرست کتاب خانۂ ملّی، وی انا، از Flügel، ۲ : ۳۳۲؛ A. Krafft : Die . . . Hss. . Konsular-Akademie ed. or. Ak.، عدد ۲۶۳ ۔ اس کتاب نے شروع ہی سے یورپ کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا تھا اور اس کے بعض حصوں کا اکثر ترجمہ کیا جاتا رہا ہے : قب W. Seaman : The Reign of Sultan Orchan، لنڈن ۱۶۵۲ء؛ V. Bratutti : Chronica dell' origine e progressione della casa ottomana composta da Saidinos Turco، حصۂ اول، وی انا ۱۶۴۹ء و حصۂ دوم، میڈرڈ ۱۶۵۲ء (قب WI، ۲ [۱۹۱۹ء] : ۱۱۰؛ Isl.، ۱۲ [۱۹۲۲ء] : ۲۲۸ ببعد)؛ Saad ed-Dini Annales Turcici usque ad Muram I. Turcice et latine curá Fr. Kollar، وی انا ۱۷۵۵ء، ورق نامکمل، قب Pertsch : Türk. Hss. Berl، ص ۳۴۲، حاشیہ ؛ WI، ۷ (۱۹۱۹ء) : ۱۲۵ ببعد؛ بعض حصوں کا ترجمہ از J. H. Garcin de Tassy، در JA، م ۳ : ۳۲۷ و ۸ : ۲۰۶، ۳۰ و ۹ : ۱۵۳؛ The Capture of Constantinople، طبع E. J. W. Gibb (مع سوانح حیات سعد الدین)، لنڈن ۱۸۷۹ء۔

تاج التواریخ کے ایک فرانسیسی ترجمے کا مخطوطہ Antoine Galland نے ۱۷۱۰ء میں تیار کیا تھا؛ اس کی پہلی جلد، جو بظاہر تلف ہو گئی تھی، کتاب خانۂ ملّی، پیرس، میں بصورت مخطوطہ، عدد anc. fds. fr. ۶۰۷۳، محفوظ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سعدالدین کے بیٹے محمد اسعد افندی نے اپنے باپ کی لکھی ہوئی تاریخ کو آگے جاری رکھا؛ قب بروسلی محمد طاہر : عثمانلی مؤلفلری، ۲ : ۲۲ ببعد؛ علمیہ سالنامہ سی، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۶۳۴ ببعد۔

مآخذ : (۱) نعیما : تاریخ، ۱ : ۱۹۱؛ (۲) پیچوی : تاریخ، استانبول ۱۲۸۳ھ، ۲ : ۳۸۸؛ (۳) حاجی خلیفہ : فذلکہ، استانبول ۱۲۸۶ھ، ۱ : ۱۳۰؛ (۴) عطائی : ذیل الشقائق، استانبول ۱۲۶۸ھ، ص ۴۹۰ ببعد؛ (۵) قنالی زادہ حسن چلبی : تذکرۃ الشعراء (غیر مطبوعہ مخطوطۂ وی انا، عدد ۱۲۲۸ = فلوگل Flügel، ۲ : ۳۸۷؛ قب ZDMG، ۱۴ [۱۸۶۰ء] : ۳۳۵ ببعد؛ نیز دیکھیے قب فلوگل : کتاب مذکور، ۲ : ۳۸۸ و ببعد)؛ (۷) محمد ثریا : سجل عثمانی، ۳ : ۸ ببعد؛ (۸) J. V. Hammer : Geschichte der osman. Dichtkunst، ۳ : ۹۸؛ (۹) وہی مصنف، در GOR، ۴ : ۲۰۶؛ (۱۰) JA، سلسلہ ۳، ۲ : ۲۶۲ تا ۲۹۹؛ (۱۱) حاجی خلیفہ : کشف الظنون، ۲ : ۹۲، عدد ۲۰۵۰ و ۲ : ۱۱۲، عدد ۲۱۵۸ و ۲ : ۶۱۵، عدد ۳۳۷۲؛ (۱۲) علمیہ سالنامہ سی (سوانح حیات مفتی)، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۳۱۴ ببعد (مع سعد الدین کے مخطوطات اور پنجہ Pençe کے نمونوں کے؛ اس کے دو بیٹوں محمد اور محمد اسعد کے لیے دیکھیے وہی کتاب، علی الترتیب ص ۳۶۴ ببعد و ص ۳۶۶ ببعد)؛ (۱۳) تاج التواریخ، دیباچہ؛ نیز (۱۴) گب Gibb : History of Ottoman Poetry، ۱ : ۱۶۳، ۱۶۵، ۲۰۵ تا ۲۰۸؛ (۱۵) وہی مصنف : The Capture of Constantinople، لنڈن ۱۸۷۹ء، دیباچہ۔

(FRANZ BABINGER)

خوجہ ایلی : رک بہ توجہ ایلی۔

خورشید دوم : طبرستان کا اسپہبذ اور خاندانِ جیلان شاہ کا (جس کی حکومت اس صوبے میں ایک سو سولہ سال تک رہی) آخری امیر ۔ یہ دازمہر بن فرخان کا بیٹا تھا اور اس نے ارشواد مرزبان کا لقب اختیار کر لیا تھا ۔ ماں کی طرف سے وہ صول کے تہابدہ (ارمنی : نہاپت nahapot = رئیس و بزرگ قوم (Patrician) کی اولاد سے تھا اور ۱۲۲ھ / ۷۴۰ء تا ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء حکومت کرتا رہا ۔ اس کا چچا ساروبہ، جو نائب سلطنت تھا اس کے بالغ ہونے پر حکومت کے اختیارات اس کے سپرد کرنا چاہتا تھا، مگر

اپنے بیٹوں کی سازش سے وہ ایسا نہ کر سکا اور خورشید کو اس وقت تک حکومت کرنے کا موقع نہ ملا جب تک کہ اس نے اپنے چچا زاد بھائیوں پر تمیشہ اور ساری کے مابین قصر دادکان کے مقام پر فتح حاصل نہ کر لی۔ اس نے قلعۂ کیسہ کی مرمت کی اور سہ دلہ نام کا ایک اور قلعہ تعمیر کرایا (قب سدیر، نزد حیرہ)۔ مؤخرالذکر قلعے کے گرد اس نے ایک منڈی بنوائی اور ایک کاروان سرائے بھی تعمیر کرائی۔ ابومسلم کے قتل کے بعد سوباذ نے خلیفہ المنصور کے خلاف بغاوت کرتے وقت اپنا خزانہ خورشید کی حفاظت میں رکھوا دیا، کیونکہ اپنی شکست کے بعد وہ خورشید کے پاس پناہ گزیں ہونا چاہتا تھا، مگر راستے میں خورشید کے چچا زاد بھائیوں میں سے طوس نامی نے اپنی اہانت کا انتقام لینے کے لیے اسے قتل کر دیا۔ خلیفہ نے مطالبہ کیا کہ خزانہ اس کے حوالے کر دیا جائے، لیکن خورشید نے اس کی بات نہ مانی؛ تاہم وہ خراج دینے پر راضی ہو گیا۔ المنصور نے اس مال و دولت کا خیال کرتے ہوے جو اسے طبرستان سے حاصل ہو سکتا تھا اسے فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا، آمل کے شہر نے ہتھیار ڈال دیے؛ خورشید نے اپنی عورتوں اور بچوں کو "عائشہ کر گیلی دز" میں، جسے عرب "قلعة الطاق" کہتے تھے، چھوڑا اور خود سپاہی فراہم کرنے کے لیے گیلان اور دیلم پہنچا۔ وبا (طاعون) سے قلعہ گیر فوج کے بہت سے آدمی ہلاک ہوے تھے، انھوں نے اپنے آپ کو حملہ آوروں کے حوالے کر دیا اور خورشید نے مایوس ہو کر زہر کھا لیا اور طبرستان اسلام کے دائرۂ حکومت میں آ گیا۔ طبری اور ابن الأثیر نے (اس واقعے کی) جو تاریخ لکھی ہے درست نہیں معلوم ہوتی یعنی ۱۴۱ھ/۷۵۸ء، خورشید دوم کا آخری سکہ جس کا ہمیں علم ہے ۱۳۸ھ/۷۵۶ء کا ہے، جو طبرستان کے حساب سنوی (era) میں ۱۰۳ کے مطابق ہے۔

مآخذ: (۱) ابن اسفندیار: *History of Tabaristan*، مترجمۂ Browne، ص ۱۱۲ تا ۱۲۲؛ (۲) ظہیر الدین: تاریخ طبرستان، طبع B. Dorn، ص ۴۴ تا ۵۰؛ (۳) میر خواند: روضة الصفا، ۳: ۱۲۵؛ (۴) الطبری، ۳: ۱۲۰، ۱۳۶ و ۱۳۷؛ (۵) ابن الأثیر: الکامل، ۵: ۳۶۹، ۳۸۶، ۳۸۷؛ (۶) البلاذری، طبع ڈخویہ، ص ۳۳۶، ۳۳۷؛ (۷) تاریخ منجم باشی، ۲: ۳۹۳؛ (۸) A.D. Mordtmann: *Erklärung der Münzen*، در *ZDMG*، ۱۹: ۴۸۶، ۴۹۵ و ۳۳۳؛ ۱۱۰۔

(Cl. Huart)

* **الخَوَرْنَق:** عراق عرب [کوفے] میں ایک مقام، جو نجف [رک بآں] کے مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہلے یہاں إیاد قبیلہ آباد تھا۔ ۱۸۴ء کے بعد لخمی امیر نعمان نے یہاں اپنے ساسانی آقا کے لیے ایک محل تعمیر کیا جو خورنق ہی کے نام سے موسوم ہوا۔ اسی عمارت میں قیام کے دوران میں پرویز نے ذوقار کی شکست کی خبر سنی۔ شروع کے خلفا نے اس محل کی توسیع کی اور اسے اپنے کام میں لائے۔ عباسی سولھویں صدی میں وہ کھنڈر ہو چکا تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب شعرا اکثر الخورنق اور اس کے قریب واقع قلعۂ سدیر [شاید اُخَیضر رک بآں] کا تمثیلاً ذکر کرتے ہوے اسے دنیا کے تیس عجائبات میں شمار کرتے ہیں۔ الخورنق اس لیے بھی مشہور ہے کہ ایک ضرب المثل جَزاءُ سِنِمَّار (=سنمار کا صلہ) اس سے وابستہ ہے، کیونکہ سنمار اس یونانی معمار کا نام تھا جس نے یہ محل تعمیر کیا تھا اور جسے بعد میں نعمان نے مروا دیا تھا۔ نام "خورنق" کا ماخذ ایرانی معلوم ہوتا ہے (بقول Andreas هورنه *hu-verna* = خوبصورت چھت والا؛ یا بقول Vullers خورنر Khawarnar = جائے ضیافت)؛ اگرچہ ابن جنّی اس کا تعلق عربی لفظ خِرنِق (Khirniq) [یعنی چھوٹا خرگوش] سے سمجھتا ہے اور Nöldeke ایک ربّانی عبرانی لفظ (یعنی "نشیمن، کشت زار")

سے [بقول الاصمعی یہ لفظ خورنقاہ (=خورنگاہ بمعنی کھانے پینے کی جگہ) سے سَفَرجَل کے وزن پر بنا ہے (یاقوت)].

[یاقوت نے بتایا ہے کہ الخورنق کے نام سے دو شہر اور بھی تھے: ایک بلاد مغرب میں اور دوسرا بلخ میں].

مآخذ: (۱) R. Basset: *Les Alixares de Grenade et le chateau de Khouarnaq*، در *Revue Africaine*، ۱۹۰۶ء، عدد ۲۶۰، ص ۲۲ ببعد؛ (۲) L. Massignon: *Mission en Mésopotamie*، در *MIFAO*، ج ۲۸، ۱۹۱۰ء؛ ص ۳۶ تا ۳۷ و لوحه ۲۷، ج ۳۱، ۱۹۱۲ء؛ ص ۱۲۶؛ (۳) U. Meisner: *Eine Reise von Babylon nach den Ruinen von Ḥira und Huarnaq*، در *Sendschriften der Deutschen Orient-Gesellschaft*، ۱۹۰۱ء، عدد ۲، ص ۱۹؛ (۴) یاقوت: *معجم البلدان*، بذیل مادہ.

(LOUIS MASSIGNON)

⋆ **خُوریان مُوریان**، عرب کے مشرقی ساحل پر اسی نام کی خلیج میں جزیروں کے ایک مجموعے کا نام، جس میں حَلّانِیہ، قَرزَوِیت (قرزوت یا اقرزوت)، سُودا (=سویدیہ)، جَبلِیّہ اور حاسِکی کے جزیرے شامل ہیں۔ ان میں سے صرف پہلے جزیرے میں آبادی ہے، مگر اس کے باشندوں کی تعداد اب بہت کم ہو گئی ہے، حالانکہ سُودا کے سب باشندے ہجرت کر کے اس میں آ گئے تھے۔ حَلّانیہ میں نباتات کی کمی ہے، کہیں کہیں متفرق سمندری نباتات، جھاؤ کے درخت اور چھوئی موئی (نبات السنط، mimosas) کی جھاڑیاں روکھے پھیکے منظر میں رونق پیدا کر دیتی ہیں۔ جزیرے کے وسط میں ایک چوٹی سمندر کی سطح سے ایک ہزار پانچ سو دس فٹ بلند ہے۔ مغرب میں اس کے سامنے ایک اونچی سطح مرتفع ہے۔ یہاں کا پانی زیادہ تر کھاری ہے اور سب سے اچھا پانی انگریزی ملاحوں کے کھودے ہوے ایک کنویں میں پایا جاتا ہے۔ یہی حالت سُوَیدِیہ کی بھی ہے۔ جبلیہ میں ریگستان ہے۔ یہاں پانی نہیں ملتا اور جانداروں میں یہاں صرف سمندری پرندے پائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے سمندری پرندوں کی بیٹوں (guano) کے ڈھیر، جو کھاد کے طور پر کام آتے ہیں، دور دور تک پھیلے ہوے ہیں۔ جبلیہ میں کسی زمانے میں انسانی آبادی بھی تھی جیسا کہ ان چند قبروں سے ظاہر ہوتا ہے جو وہاں بنی ہوئی ہیں۔ ان جزائر میں سب سے زیادہ مغرب میں جزیرۂ حاسِقی [کذا، حاسکی؟] ہے جو ساحل سے صرف بیس میل کے فاصلے پر ہے اور جس میں سب سے زیادہ نمایاں چیز چار سو فٹ اونچی چوٹیاں ہیں۔ یہ جزیرہ بھی پانی اور نباتات سے خالی ہے مگر ہنسوں اور حواصلوں کے غول پائے جاتے ہیں۔

جزائر کا یہ مجموعہ، جس کے متعلق بہت پہلے زمانے میں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وہی ہے جسے زنوبیا کے "سات مسلسل جزیرے" کہتے ہیں، پارتھیا اور حضرموت کی مملکتوں میں حدّ فاصل بناتا تھا اور اس طرح پارتھیا کی سرحد کی جائے وقوع خلیج خوریان موریان کے اندرونی کونے میں سمجھنی چاہیے یعنی تقریباً ۵۶ درجے اور ۵۳ دقیقے طول البلد مشرق میں۔ زمین کے بنجر ہونے کی وجہ سے یہاں کے باشندے سمندر پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گئے اور قدرتی طور پر وہ ماہی گیروں کی ایک قوم بن گئے۔ الادریسی (م ۱۱۶۶ء) بھی اس بات سے واقف تھا کہ وہاں کے باشندے، جو ملکی حیثیت سے الشحر کے ماتحت تھے، موسم سرما میں بہت افلاس زدہ ہو جاتے تھے، اور جہاز رانی کے موسم میں کھینچ تان کر صرف معمولی طور پر گزر اوقات کر لیتے تھے۔ جہازوں میں بیٹھ کر وہ عمان، عدن اور یمن تک جایا کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کچھووں کے خول تھے، جن کی تجارت وہ اہل یمن سے کیا کرتے تھے اور کبھی

کبھی عمدہ عنبر بھی فروخت کرتے تھے جس کی انھیں بعض اوقات بہت بڑی قیمت مل جاتی تھی الادریسی اس خلیج کو جس میں یہ جزیرے واقع ہیں جون الحشیش (بوٹیوں کی خلیج) کہتا ہے۔ سب سے پہلے پرتگالیوں نے اہل یورپ کو ان جزائر کی طرف متوجہ کیا۔ Alfonso d' Albuquerque. نے ۱۵۰۳ء میں خوریان موریان کے جزائر کا پتا لگایا۔ کوریا موریا Curia-Moria جزائر کے نام سے پرتگالی ماخذ میں ان کا ذکر برابر آتا رہا ہے اور وہ سُویدیہ کا نام سُودیہ Sodie کی شکل میں، اور حاسکی کا نام آسکی Asquie کی شکل میں اور قرزویت Rodondo کی شکل میں آتا ہے۔ یہ جزیرے بعد میں سلطان مسقط کے قبضے میں آ گئے مگر اس نے ۱۴ جولائی ۱۸۵۴ء کو انھیں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

مآخذ: (۱) الادریسی: نزہۃ المشتاق، مترجمہ Jaubert، ۱: ۵۴؛ ۲: ۴۹؛ (۲) Fernão Lopes de Castanheda: *Historia do descobrimento e conquista da India pelos Portugueses*، Coimbra ۱۵۵۴ء، باب ۵۴؛ (۳) *Historia Oriental de las peregrinaciones de Fernan Mendez Pinto Portugues*، پرتگالی سے قشتالہ میں ترجمہ از Francisco de Herrera، میڈرڈ ۱۶۲۰ء، باب ۲؛ (۴) *Decada primeira da Asia de João de Barros*، لزبن ۱۶۲۸ء، ج ۷، باب ۴؛ ورق ۱۳۴؛ ج ۹، باب ۱؛ ورق ۱۷۲؛ (۵) Diego do Couto: *Decada sexta da Asia*، ج ۱۰، باب ۱۸؛ (۶) وہی مصنف: *Decada septima*، ج ۱، باب ۵؛ (۷) P. Manoel d' Almeyda: *Historia general de Ethiopia a alta*، از P. Balthasar Teltez Coimbra ۱۶۶۰ء، ج ۲، باب ۲؛ ج ۳، باب ۲۴؛ (۸) *L' Ambassade de Dom Garcias de Silva Figueroa en Perse*، پیرس ۱۶۶۷ء، ص ۵۹۸؛ (۹) C. Ritter: *Die Erdkunde von Asien*، برلن ۱۸۴۶ء، ۸: ۲۰۶، ۳۳۴ تا ۳۴۵؛ (۱۰) A. Sprenger: *Die Post-und Reiserouten des Orients*، در *Abhandl. d. Deutsch. Morgenl. Gesellsch.*، ج ۳/۳، لائپزگ ۱۸۶۴ء، ص ۱۳۵؛ (۱۱) وہی مصنف: *Die alte Geographie Arabiens*، Bern ۱۸۷۵ء، ص ۹۸ ببعد؛ (۱۲) E. Glaser: *Skizze der Geschichte und Geographie Arabiens*، برلن ۱۸۹۰ء، ۲: ۱۸۶ ببعد؛ (۱۳) F. Stuhlmann: *Der Kampf um Arabien, Hamburgische Forschungen*، Braunschweig ۱۹۱۶ء، ۱: ۱۳۴؛ (۱۴) A. Grohmann: *Südarabien als Wirtschaftsgebiet*، ج ۱، در *Osten und Orient*، ۱/۴، وی انا ۱۹۲۲ء؛ ۱۸۹؛ (۱۵) F. Hommel: *Grundriss der Geographie und Geschichte des alten Orients*، Munich ۱۹۲۶ء، ص ۲۲۷ ببعد۔

(Adolf Grohmann)

خُوزِستان: خوز کا ملک، جسے بطلیموس [رک بآں] نے Kossaioi لکھا ہے، ایران کا ایک صوبہ جو قدیم اقلیم سوسہ (سوسیانا) سے مطابقت رکھتا ہے اور جسے اب سرکاری طور پر عربستان یعنی عربوں کا ملک کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے صحرائی میدانوں میں بنو کعب (بدوی تلفظ چوب) اور بنو لام کے بدوی قبائل چھا گئے ہیں۔ اس صوبے کی موجودہ حدود یہ ہیں: شمال کی سمت میں سلسلہ جبال زاگروس Zagros، مغرب میں دریاے کَرخہ [رک بآں]، جنوب میں دریاے جَراحی یا طاب اور صحرا میں سے گزرتا ہوا ایک خط جو اس مقام سے کھینچا گیا ہے، جہاں دریاے کارون [رک بآں] اور دریاے کرخہ کا شط العرب [رک بآں] سے اتصال ہوتا ہے اور مشرق میں کردستان۔ اس اقلیم کے بڑے بڑے شہر یہ ہیں: شُشتر [رک بآں] (جسے عرب تستر کہتے ہیں) جو والی صوبہ کا صدر مقام ہے، دِزفُل، ہُویزہ (سوق الاہواز)، رام ہُرمُز، مُحمّرہ اور بہبہان۔ پہاڑیوں میں قبائل لوریہ، یعنی فیلی Feili، بختیاری کوہگلو اور ماہسنی، آباد ہیں۔

ساسانی بادشاہوں کے دور حکومت میں یہ صوبہ

جنوب (نیمروز) کے صوبوں میں شامل تھا؛ اور عیسائیوں کے آباد ہونے کی وجہ سے یہ ایک عیسائی صوبہ بن گیا تھا جو "بیت ہوزایی" کہلاتا تھا۔ دار الحکومت "بیت لاباط" تھا، جو بعد میں جندی شاپور [=جندیسابور] کے نام سے موسوم ہوا۔ ۱۹ھ/ ۶۴۰ء میں جب عربوں نے اسے فتح کیا تو اس کے بچاؤ کے لیے والی (مرزبان) صوبۂ ہُرمُزان نے جنگ کی تھی۔ لیکن سوق الاہواز (حمزہ اصفہانی: ھجستان۔ واجار) پر قبضہ ہو جانے اور عُتبہ کے ہاتھوں رام ہُرمز کے مقام پر شکست کھانے کے بعد وہ شُشتر میں چھپے سہمے محصور رہا اور بالآخر اس نے اپنے آپ کو خلیفہ حضرت عمرؓ کے حوالے کر دیا۔ معزالدّولہ احمد بن بویہ نے اس پر ۳۳۴ھ/ ۹۴۵ء میں، بغداد پر قبضہ کرنے سے پہلے، اپنا تسلّط جمایا اور ایل خان اباقا کے عہد میں اسے لرستان کے اتابک یوسف شاہ اوّل کو اس صلے میں بطور جاگیر عطا کیا گیا کہ اس نے خان مذکور کو دیلمیوں کے اچانک حملے سے بچایا تھا۔ کچھ عرصے کے لیے اس جنگ کے بعد، جس میں بغداد کے سامنے شاہ عباس اوّل کی فوجوں نے ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں شکست کھائی تھی، اس پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

عرب جغرافیہ نویسوں کے بیان کے مطابق خوزستان کی حدود یہ ہیں: مغرب کی سمت میں واسط کا ضلع اور سور الرّاسبی، جنوب کی طرف عبّادان سے لے کر سِہربان تک ساحل سمندر، مشرق کی طرف فارس اور عراق عجم (یہاں دریاے طاب حدّ فاصل بناتا ہے) اور شمال کی طرف دریاے کرخہ اور کوہستان لُور۔ یہاں کے اہم شہر یہ تھے: سُوق الاھواز (صدر مقام)، سُوس، جندی شاپور، تستر، عسکر مکرم، رام ہرمز، دَورق (بعد میں ان کے علاوہ: طِیب، قُرقُوب، جُبّی، حصنِ مہدی)۔ آب و ہوا گرم اور مضر صحت ہے، خاص طور پر غیر ملکوں کے لیے۔ دریا متعدد ہیں، زمین زرخیز اور پیداوار کھجوریں، گیہوں، جو، چاول اور نیشکر۔ یہاں کے لوگوں کی رنگت تانبے کی سی، بدن چھریرا، ڈاڑھی چھدری، اور سر کے بال گھنے ہیں۔ غالباً یہ لوگ ان حبشی النسل لوگوں کے بقیات ہیں جو بہت پہلے یہاں آباد تھے۔ عربوں کی فتح کے وقت تک بھی وہ ایک خاص طرح کی زبان (خوزی) بولتے تھے جو نہ تو ھندی یورپی تھی اور نہ سامی۔ شاید وہ انزانیوں (Anzanites) یا ایلامیوں (Elamites) کی بھی کبھی زبان تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس زبان کے کچھ آثار دِزفُل کی غیر شائستہ بولی میں موجود ہیں۔ اہل روم سے محاربات کے بعد عراق عرب (بین النہرین) کے لوگ شاپور اوّل کے عہد میں وہاں لے جا کر آباد کر دیے گئے۔ تستر کا عظیم الشان بند ان اسیران جنگ نے تعمیر کیا تھا جو شہنشاہ ولیرین Valerian کی تباہ کن ناکام مہم کے بعد گرفتار ہوئے تھے۔

اس ملک میں صنعت و حرفت کی نشو و نما ان کاریگروں کے اثر سے ہوئی جو بوزنطی علاقے سے پکڑ کر لائے گئے تھے۔ اب یہاں دریا پر ایک بہت بڑا بند باندھا گیا ہے، جس کی وجہ سے پورے علاقے میں آب پاشی ہونے لگی ہے۔

مآخذ: (۱) A.H. Layard: *Description of the province of Khuzistan* (*Journ. Roy. Geogr. Society*، ج ۱۶/۱: ص ۱ تا ۱۰۵)؛ (۲) Defrémery: *Mémoires d'histoire orientale*، ۱: ۳۷ تا ۳۹؛ (۳) P.M. Sykes: *History of Persia*، ۱: ۵۴، ۵۶؛ ۲: ۹۳، ۹۷، ۲۵۷؛ (۴) ابو الفداء: تقویم البلدان، ص ۳۱۱ ببعد؛ (۵) المقدسی: BGA، ۳: ۴۰۲ ببعد (اشاریہ میں مذکور نہیں)؛ (۶) اصطخری، *BGA*، ۱: ۸۸ ببعد، (اشاریہ میں نہیں ہے)؛ (۷) ابن حوقل: *BGA*، ۲: ۱۷۰ ببعد (اشاریہ میں نہیں ہے)؛ (۸) یاقوت: معجم، طبع وسٹنفلٹ Wüstenfeld، ۲: ۴۹۶؛ (۹) B. de Meynard: *Dict. de la Perse*، ص ۲۱۷؛ (۱۰) J. Marquart: *Eransahr*، ص ۲۷ و ۱۳۴

(Cl. Huart)

* **خُوسْت** : [اس نام کے تین مقامات ہیں، دو افغانستان میں اور تیسرا پاکستان کے صوبۂ بلوچستان میں] ۔ افغانستان میں اس نام کا ایک مقام بدخشان [رک بآں] کی سرحد پر اندراب [رک بآں] کے قریب آمو دریا [رک بآں] کے اس نشیبی علاقے میں واقع ہے جو آج کل "افغان ترکستان" کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ بلخ کے جنوب مشرق میں، ھیبک کے جنوب مشرق میں، کابل اور چاریکار سے شمال کی جانب کوہ ھندوکش کی پشت پر (یعنی اس کے شمال میں) واقع ہے ۔ یہ ایک گمنام سی جگہ ہے اور اکثر نقشوں میں نہیں دکھائی جاتی، مگر زمانۂ قدیم میں اسے خاص اھمیت حاصل تھی ۔ یاقوت اسے ایک زرخیز اور سرسبز قصبہ بتاتا ہے ۔ توزک بابری میں اس کا کئی جگہ ذکر آتا ہے؛ بابر اسے "خُوامْت" لکھتا ہے، جو القزوینی کے خوست اور دوسرے مصنفوں کے خاشت ھی کی ایک شکل معلوم ھوتی ہے ۔ توزک بابری کے ترجمے میں، جو سید زین نے کیا ہے، اسے "خوست بدخشاں" لکھا گیا ہے ۔ بابر کی دو بیٹیاں خوست ھی میں پیدا ھوئی تھیں، جن میں سے ایک بابر کی بڑی بیگم ماھم کے بطن سے تھی اور دوسری دلدار بیگم کے بطن سے ۔ ماھم کا خوست سے قریبی تعلق تھا: اس کا بھائی محمد علی طغای یہاں کا ایک میرزا زادہ تھا؛ بایزید بیات اپنی تاریخ میں، جو تاریخ ھمایوں کہلاتی ہے (مخطوطۂ انڈیا آفس، فہرست از Ethé، عدد ۲۲۳، ورق ۲۶ الف)، ذکر کرتا ہے کہ ھمایوں (جو ماھم کے بطن سے تھا) خوست میں اپنی ننھیال گیا تھا ۔ ھم یہ بھی دیکھتے ھیں کہ بابر ھندوستان سے تحائف بھیجتے وقت خوست کا خاص طور پر نام لیتا تھا (دیکھیے اس کے قاضی سید زین کی کتاب طبقات بابری، جس میں لکھا ہے کہ خوست کے باشندے بہت دیندار تھے) ۔ اس سے اشارہ ماھم کے خاندان کی طرف معلوم ھوتا ہے، کیونکہ وہ مشہور ولی اللہ احمد جام کی اولاد میں سے تھی ۔ یاقوت کا بیان ہے (معجم البلدان، ۲ : ۴۹۷ تا ۴۹۸، ترجمۂ Barbier de Meynard، ص ۲۶۹) کہ ایک قدیم محدث [ابو علی الحسن بن ابی علی بن الحسین الخوستی] کی نسبت اسی قصبے سے ہے ۔ ابن بطوطہ نے بھی ھندوکش میں بہت سے مذھبی زاویوں [= خانقاھوں] کا ذکر کیا ہے ۔ خوست غالبًا ترکمانوں اور ازبکوں کے ھاتھوں تباہ ھو گیا تھا ۔ خوست کے حوالوں کے لیے دیکھیے Guy Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۴۱۰، ۴۱۷؛ تاریخ رشیدی، ترجمہ، ص ۱۰۳ و حاشیہ؛ Vambéry : شیبانی نامہ، بند (canto) ۶۳، ص ۳۶۰؛ شاھی خان، ۱ : ۶۱۵، جوان خوست میں ازبکوں پر جگت سنگھ اور اس کے راجپوتوں کی فتح اور وھاں لکڑی کی فراوانی کی وجہ سے لکڑی کا ایک قلعہ تعمیر کرانے کا حال بھی درج ہے؛ نیز دیکھیے : بادشاہ نامہ، ۲ : ۳۶۳؛ یہ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء کا واقعہ ہے ۔

افغانستان کے جنوب جنوب مشرق میں ضلع پشاور [پاکستان] کی سرحد پر ایک وادی کا نام بھی خوست ہے ۔

خوست نام کا تیسرا مقام [پاکستان کے صوبۂ] بلوچستان میں کوئٹے سے پینتیس میل مشرق میں واقع ہے، جہاں کوئلے کی ایک کان ہے (*Imperial Gazetteer of India*، ۳ : ۱۳۸ و ۶ : ۳۰۶) ۔ فارسی میں "خواست" کے معنی جزیرے کے ھیں اور اس طرح اس کا وھی مفہوم ھو سکتا ہے جو اندراب کا ہے ۔

(H. BEVERIDGE)

☆ **خُوسِم** : رک بہ خوتین ۔

⊛ **خوشحال خان خٹک** : [ابن شہباز خان بن یحیی خان بن ملک آکوڑی]، پشتو کا عظیم شاعر، سپہ سالار اور پٹھانوں کے مشہور قبیلے خٹک کا سردار، [جو ضلع پشاور کی تحصیل نوشہرہ کے علاوہ مردان اور کوھاٹ کے اضلاع میں آباد ہے ۔ ۱۵۸۱ء میں جب اکبر (رک باں) نے مرزا حکیم کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کابل کا رخ کیا تو اٹک کے مقام پر ملک آکوڑی نے

اپنی خدمات پیش کیں، جس کے صلے میں شہنشاہ نے اسے اپنا منصبدار مقرر کرکے دیگر مراعات کے علاوہ اٹک اور پشاور کے درمیان شاہراہ کا محصول وصول کرنے کا اختیار بھی دیا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں اکوڑی کے بعد یکے بعد دیگرے اس کا بیٹا یحییٰ خان اور پوتا شہباز خان منصب دار مقرر ہوئے۔ وہ نہایت وفاداری سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور مغل شہنشاہ ان کے وظائف و مناصب میں اضافے کرتے رہے۔ ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں اکوڑہ کے مقام پر خوشحال خان پیدا ہوا۔ یہ جگہ دریائے اٹک سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر شاہراہ اعظم اور دریائے لنڈی (کابل) کے درمیان واقع ہے اور ملک اکوڑی کے نام سے موسوم ہے]۔ یکم شوال ۱۰۵۰ھ/۴ جنوری ۱۶۴۱ء کو شہباز خان قبائل کی باہمی جنگ میں مارا گیا، چنانچہ اٹھائیس برس کی عمر میں خوشحال خان اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ [شاہ جہاں اس کی وفاداری، علم و فضل اور تدبر و سیاست کے باعث اس کی قدر کرتا تھا۔ خود خوشحال خان نے اپنے اشعار میں جہانگیر اور شاہجہاں کی بہت تعریف کی ہے]۔ اسی زمانے میں کانگڑے کے راجہ جگت سنگھ سے جنگ ہوئی تو تاراگڑھ کا قلعہ اسی نے فتح کیا تھا (مارچ ۱۶۴۲ء)، جس پر اسے چار لاکھ روپیہ نقد اور ڈھائی لاکھ کی جاگیر لاہور میں عطا ہوئی۔ اسی طرح بدخشاں کی لڑائی (۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء) میں خوشحال خان نے اندراب اور ہندوکش کی حفاظت کی اور ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں بلخ و بدخشان کی فوجی مہم میں بھی وہ شہنشاہ کا ہم رکاب رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء تک وہ زیادہ تر ہندوستان ہی میں مقیم رہا۔

[۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب عالمگیر [رک بان] نے تخت سنبھالا تو خوشحال خان کو دربار شاہی میں پہلا سا اثر و رسوخ حاصل نہ رہا۔ شہنشاہ سے اس کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ اس کشیدگی کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں: (۱) خوشحال خان شاہجہاں کا وفادار منصب دار تھا اور اسے شاہجہاں کی نظر بندی اور معزولی پر سخت صدمہ پہنچا۔ دوسری طرف عالمگیر کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہیں وہ شاہجہاں کی حمایت میں کوئی شورش نہ برپا کر دے؛ (۲) پٹھانوں اور مغلوں کے دل کبھی ایک دوسرے سے صاف نہیں ہوئے تھے۔ پٹھان ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ مغلوں نے ہندوستان کی سلطنت ان سے چھینی ہے اور وہ اپنے علاقے میں کامل خود مختاری کے خواہاں رہتے تھے؛ (۳) اس میں شک نہیں کہ مغل منصب‌دار کی حیثیت سے خوشحال خان کو پٹھانوں کے خلاف بھی تلوار اٹھانی پڑی تھی، لیکن بعض واقعات سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی منصبداری کے دوران میں مغلوں کو پٹھان قبائل پر یورش کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا؛ چنانچہ جب ایک آدھ موقع پر مغل فوج کو پٹھانوں کے ہاتھوں نقصان اٹھانا پڑا تو عالمگیر کو اس کی وفاداری پر مزید شک ہو گیا؛ (۴) خوشحال خان مغلوں کا وفادار منصبدار رہنا چاہتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی یہ بھی تمنا تھی کہ پٹھانوں کی خود مختاری پر آنچ نہ آنے پائے اور ان کے معاملات میں اس کی مرضی کے بغیر لوگ دخل انداز نہ ہوں۔ گویا وہ ایک طرح سے پٹھانوں اور مغلوں کے درمیان ثالث کی حیثیت اختیار کرنا چاہتا تھا (خوشحال و اقبال، ص ۷۶ تا ۷۸، ۸۱)۔ ظاہر ہے یہ روش نہ تو کابل اور پشاور کے حاکموں کے لیے قابل قبول تھی، نہ خود شہنشاہ کے لیے، جو قدرتی طور پر اسے مرکزی سلطنت کے اتحاد اور سالمیت کے منافی سمجھتا تھا؛ چنانچہ ایسے افسوسناک حالات پیدا ہو گئے کہ مغل حکومت اور پٹھان ایک دوسرے کو کمزور کرنے کے درپے ہو گئے۔

جب تک مہابت خان اس علاقے کا گورنر رہا، عالمگیر اور خوشحال خان میں صلح صفائی کے امکانات

موجود تھے، لیکن ۱۶۶۴ء میں مہابت خان کو حیدرآباد دکن میں تبدیل کیا گیا اور اس کی جگہ سید امیر خان کابل کا گورنر مقرر ہوا۔ امیر خان اور مرزا عبدالرحیم، حاکم پشاور، سے خوشحال خان کی نہ نبھ سکی، چنانچہ انہوں نے پہلے تو دربار شاہی سے اس کا منصب اور تمام مراعات منسوخ کرائیں اور پھر اسے گرفتار کرکے دہلی بھیج دیا]۔

رمضان ۱۰۷۴ھ/اپریل ۱۶۶۴ء تک خوشحال خان دہلی اور غربی گوالیار کے قلعۂ رنتھنبور میں محبوس رہا۔ [اس کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہنشاہ کا مخالف بننا نہیں چاہتا تھا اور دشمنوں نے اس پر ناحق تہمت لگا کر قید کرا دیا تھا: "میں ناحق اورنگ زیب کی قید و بند میں پڑا ہوں۔ خدا شاہد ہے کہ میں محض تہمت اور بہتان کی بنا پر مورد عتاب ہوں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ کہتا ہوں کہ میں اپنا کوئی گناہ و خطا نہیں دیکھتا، لیکن لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ شاید میری ہنر مندی اور روشنی طبع ہی میرے لیے مصیبت بن رہی ہے۔ جس دیانتداری اور خلوص سے میں نے مغلوں کی خدمت کی ہے اس کی مثال کوئی دوسرا افغان پیش نہیں کر سکتا"]۔ قید سے رہائی پانے کے بعد بھی اس پر بلاقاعدہ دربار میں حاضر رہنے کی پابندی تھی۔ اس نے حبس نامہ کے عنوان سے دو سو بیس اشعار کی ایک نظم لکھی ہے (۴ رجب ۱۰۷۷ھ / یکم جنوری ۱۶۶۷ء)، جس میں وطن اور یاران وطن سے جدائی پر فریاد کی ہے۔ ۱۰۷۹ھ/ ۱۶۶۸ء میں خوشحال خان کی جلاوطنی ختم ہو گئی اور وہ وطن لوٹ گیا۔

[اس وقت یوسف زئی قبائل کی یورش (۱۶۶۷ء) فرو ہو چکی تھی اور مغل صوبیدار محمد امین خان کی سخت کارروائیوں نے کچھ عرصے کے لیے پٹھانوں کی سرگرمیاں سرد کر دی تھیں۔ ۱۶۷۲ء میں دفعۃً درۂ خیبر کے قبائل نے علم بغاوت بلند کر دیا اور افریدی سردار ایمل خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے مغلوں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ اس نے اس جنگ کو قومی جہاد کا نام دے کر پٹھانوں کی کثیر تعداد اپنے پرچم تلے جمع کر لی اور یکم مئی کو علی مسجد کے قریب مغل فوج کو شکست دے کر اسے بے حد نقصان پہنچایا۔ اب خوشحال خان بھی ایمل خان کے ساتھ آ ملا اور اس کی سیف و قلم نے پٹھانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نے ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء تک نوشہرہ، دوآبہ اور کڑپہ میں مغل فوج کا مقابلہ کیا۔ ۲ مارچ ۱۶۷۴ء کو کڑپہ کی لڑائی میں شاہی لشکر کو ایسی سخت ہزیمت اٹھانی پڑی کہ مغل سلطنت کے وقار کو بحال کرنے کے لیے عالمگیر کو خود میدان میں آنا پڑا۔ وہ ۲ جولائی ۱۶۷۴ء کو حسن ابدال پہنچا اور اس مہم کی نگرانی کے لیے تقریباً ایک سال تک وہاں مقیم رہا۔ اس کے ترک سپہ سالار اغر خان کو پے در پے کامیابیاں نصیب ہوئیں اور مہمندوں اور غلزئیوں کی بغاوت کو کچل کر رکھ دیا گیا، تاہم خوشحال خان بدستور برسرپیکار رہا اور اس نے ایک بار پھر] ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں خاپش اور بعد ازاں گنبت میں مغل فوج کو شکست دی۔ [بہرحال مجموعی طور پر صورت حال پر قابو پا لیا گیا تھا، چنانچہ دسمبر ۱۶۷۵ء میں مغل شہنشاہ نے دہلی کی طرف مراجعت کی۔ ۱۶۷۷ء میں امیر خان کابل کا صوبہ دار مقرر کیا گیا، جو اپنی وفات (۱۶۹۸ء) تک اس علاقے میں بڑی کامیابی سے نظم و نسق چلاتا رہا۔ بایں ہمہ خوشحال خان کا ولولہ سرد نہ ہوا اور اس نے پٹھانوں کی خود مختاری کی جنگ جاری رکھی]۔ جو لوگ شاہی دربار کی طرف سے مامور ہوئے تھے انہوں نے اس کے خاندان میں نفاق کا بیج بو دیا، حتٰی کہ خود اس کا بیٹا اشرف خان اس کی مخالفت پر اتر آیا۔ پھر ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں اس کے دوسرے بیٹے بہرام خان نے اس کے خلاف جنگ کی۔ رفتہ رفتہ خوشحال خان کی قوت گھٹتی گئی

اور آخر پیرانہ سالی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور بروز جمعہ ۲۸ ربیع الآخر ۱۱۰۰ھ/ ۱۹ فروری ۱۶۸۹ء کو اٹھتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ [اکوڑہ سے چار میل مغرب میں] اسوڑی کے مقام پر پہاڑ کے دامن میں اس کا مدفن ہے۔ اس کی آخری وصیت تھی کہ مجھے ایسی جگہ دفن کرنا جہاں مغل سواروں کے گھوڑوں کی گرد راہ نہ پہنچ سکے۔ [لوح مزار پر اس کا ایک شعر کندہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے: "میں نے افغان قوم کی عزت و ناموس کے لیے تلوار کمر سے باندھ لی ہے۔ میں ہوں زمانے کا غیور و جسور اور باحمیت خوشحال خان خٹک"]۔

خوشحال خان حنفی المذہب تھا۔ اس نے شیخ رحم کار عرف کاکا صاحب [رکہ بان] (م ۲۲ رجب ۱۰۶۳ھ) سے بیعت کی تھی۔ وہ ایک دلاور اور جنگجو سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک ممتاز عالم، شاعر اور صاحب تصنیف و تالیف بھی تھا۔ اسے باباے پشتو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے پشتو اور فارسی میں پینتالیس ہزار اشعار کہے ہیں، جن میں غزلیں، قصیدے، رباعیاں، قطعے، مسدس، مخمس، معشر اور ترکیب بند وغیرہ عروض پشتو کے مطابق شامل ہیں۔ فارسی میں بھی اس کی متعدد غزلیں ہیں، جن میں اس نے روہی اور کوہی تخلص کیا ہے۔ اس نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں پشتو اور اردو دونوں زبانوں کے کلمات ہیں۔

اس کے تمام اشعار میں عشق، اخلاق، تصوف اور اجتماعی مسائل کے مضامین ہیں۔ وطن دوستی اور رزمیہ اشعار بھی کافی دلچسپ ہیں۔ اس کے کلام میں بعض اوقات خوش طبعی بلکہ ہزل گوئی بھی پائی جاتی ہے۔ ادبیات کا استحضار رکھنے والے بعض مؤلفوں نے اس کی کتابوں کی تعداد دو سو سے زائد بتائی ہے، لیکن ان میں سے مشہور اور موجود حسب ذیل ہیں:

(۱) دیوان یا کلیات: اس میں تقریباً سولہ ہزار اشعار ہیں؛ (۲) بازنامہ: یہ کتاب پشتو نثر میں ہے اور اس میں شکار کا طریقہ اور شہباز کے امراض کا بیان ہے؛ (۳) صحت الابدان: ایک پشتو نظم، جس میں طب اور اصول صحت بیان کیے گئے ہیں؛ (۴) ترجمۂ ہدایہ: نثر کی یہ کتاب فقہ حنفی پر ہے؛ (۵) آئینہ: فقہ کی ایک عربی کتاب کا پشتو نثر میں ترجمہ ہے؛ (۶) فضل نامہ (۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء): بحر خفیف میں ایک پشتو مثنوی، جو فقہی مسائل پر ہے؛ (۷) سوات نامہ: پشتو کے چار سو اشعار پر مشتمل ایک نظم، جس میں سوات کے سفر کے حالات ہیں؛ (۸) فرخ نامہ: پشتو میں شمشیر و قلم کا مناظرہ؛ (۹) فراقنامہ [=حبس نامہ]: پشتو میں قید و بند کے حالات نظم کیے ہیں؛ (۱۰) دستار نامہ: پشتو نثر میں اخلاق، سیاست اور اجتماعیات پر ایک تالیف؛ (۱۱) بیاض: پشتو نثر میں تاریخی یادداشتیں؛ (۱۲) زنجیری: پشتو نثر کی کتاب، جس میں مختصر نویسی (short-hand) کے اصول بیان کیے گئے ہیں؛ (۱۳) ریاض الحقیقت۔

خوشحال خان نے اپنے پیچھے ایک بڑا خاندان چھوڑا۔ اس کے بیٹوں میں سے ساٹھ کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ ان میں سے بعض صاحب دیوان و تصانیف ہوئے مثلاً اشرف خان المتخلص بہ ہجری، سکندر خان، عبدالقادر خان، گوہر خان اور صدر خان۔ بیٹیاں اس کی بتیس تھیں، جن میں سے بی بی حلیمہ عالمہ اور شاعرہ تھی۔ خود اس کے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے علاوہ خوشحال خان کے اخلاف میں بڑے بڑے مؤلف، شاعر اور مؤرخ گزرے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت افضل خان نے پائی، جس نے تاریخ، رصیع وغیرہ کتابیں تالیف کیں۔ اسی طرح کاظم خان المتخلص بہ شیدا پشتو میں صاحب دیوان ہوا۔

مآخذ: (۱) دیوان خوشحال خان، طبع Hellew، پشاور ۱۸۶۹ء؛ (۲) دیوان خوشحال خان، ہوتی مردان ۱۹۲۹ء، قندھار؛ (۳) کلیات خوشحال خان، قندھار ۱۹۳۷ء؛

بالخصوص مقدمہ از عبدالحی حبیبی؛ (۴) کلیات خوشحال خان، پشاور ۱۹۵۲ء، مقدمہ: (۵) محمد زردار خان ناظر: صولت افغانی، مطبوعۂ نولکشور، ۱۸۷۶ء؛ (۶) گلشن روہ، طبع Raverty، لنڈن ۱۸۶۰ء؛ (۷) محمد حیات خان: حیات افغانی، لاہور ۱۸۷۳ء؛ (۸) ترانہائی ملی افغانی، طبع Darmesteter، پیرس ۱۸۸۸ء؛ (۹) کلید افغانی، طبع Hughes، لاہور ۱۸۹۳ء؛ (۱۰) شیر محمد گنڈا پور: خورشید جہان، لاہور ۱۸۹۴ء؛ (۱۱) خوشحال خان خٹک پر مختلف مضامین، از مربانی و جلالی، در مجلۂ کابل، ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۸ء؛ (۱۲) عبدالحی حبیبی: تاریخچۂ شعر پشتو، در طلوع افغان، قندھار ۱۹۳۵ء؛ (۱۳) وہی مصنف: پشتانہ شعرا، ج ۱، کابل ۱۹۴۰ء؛ (۱۴) وہی مصنف: پٹہ خزانہ، کابل ۱۹۴۴ء؛ (۱۵) وہی مصنف: مقدمۂ دیوان عبدالقادر خان خٹک، قندھار ۱۹۳۷ء؛ (۱۶) الفت: پشتو سندرے، کابل ۱۹۴۵ء؛ (۱۷) صدیق اللہ: رسالہ سہ خانوادۂ علمی، در سالنامۂ کابل، ۱۹۴۵ء؛ (۱۸) وہی مصنف: تاریخ ادب پشتو، کابل ۱۹۴۶ء؛ (۱۹) بینوا: خوشحال خان چہ می گوید، کابل ۱۹۵۰ء؛ (۲۰) تاریخ مرصع منتخب در گلشن روہ، مخطوطہ در ہوتی مردان؛ (۲۱) دوست محمد کامل: خوشحال خان خٹک، پشاور ۱۹۵۱ء؛ [(۲۲) میر عبدالصمد خان: خوشحال و اقبال، طبع پشاور]؛ (۲۳) Raverty: *Grammar of the Afghan Language*، کلکتہ ۱۸۶۷ء؛ (۲۴) Bidulph: *Afghan Poetry of the Seventh Century*، لنڈن ۱۸۹۰ء؛ [(۲۵) *The Cambridge History of India*، دہلی ۱۹۶۳ء، ۴: ۲۲۸ تا ۲۳۰].

(عبدالحی حبیبی [و ادارہ])

* **خوش قدم**: [عربی مصادر میں خُشْقَدَم] الملک الظاہر [ابو سعید] سیف الدین النّاصری (یہ نسبت اس کے پہلے آقا کے نام سے ہے)، مصر اور شام کا سلطان؛ اس نے ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء تا ۸۷۲ھ/۱۴۶۷ء) حکومت کی۔ وہ پہلا سلطان تھا جو (ایشیاے کوچک کی) سلطنت روم کا باشندہ تھا، اگرچہ بہت سے لوگ سلطان بیبرس ثانی [رک بآں] اور سلطان لاجین ۶۹۶ھ/۱۲۹۶ء تا ۶۹۸ھ/۱۲۹۸ء) کے متعلق بھی یہی بات کہتے ہیں۔ سلطان شیخ [رک بآں] نے اسے ایک غلام کے طور پر خریدا اور وہ جمداریہ [رک بہ جمدار] میں بھرتی کر لیا گیا۔ پھر وہ شیخ کے بیٹے احمد کے عہد میں، جس نے صرف چند مہینے حکومت کی، خاصّکی (باڈی گارڈ) ہو گیا۔ سلطان چقمق [رک بآں] کے عہد میں کہیں جا کر ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء میں وہ دس مملوکوں کا امیر اور "رأس نوبہ" [=رئیس نوبت] مقرر ہوا۔ ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں وہ ایک ہزار مملوکوں کا امیر [یک ہزاری امیر] اور ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء میں قاہرہ کا حاجب الحجّاب (فوجی عدالت کا صدر) مقرر ہوا۔ تین سال بعد سلطان اینال کے عہد حکومت میں وہ وزیر جنگ ہو گیا اور ۸۶۰ھ/۱۴۵۶ء میں اس نے قرمان کے امیر کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی اور اس کی فوج سے مڈھ بھیڑ ہوئے بغیر اس کے علاقے کو بہت بیدردی سے ویران کیا۔ اینال کے بیٹے احمد [رک بہ اینال] نے اسے اتابک [رک بآں؛ یعنی سپہ سالار فوج] مقرر کر دیا؛ مگر اشرفیہ (سلطان اشرف اینال کے ممالیک) سلطان احمد سے غیر مطمئن تھے اور انھوں نے اس کے خلاف سازش کرکے دمشق کے گورنر جانم کو تخت و تاج پیش کیا؛ تاہم ظاہریہ (سلطان ظاہر چقمق کے ممالیک) نے خوش قدم کو ترجیح دی، اس لیے انھوں نے بعجلت تمام اتابک خوش قدم کو جانم کے پہنچنے سے پہلے ہی سلطان بنا دیا اور احمد کو قید کرکے اسکندریہ بھیج دیا۔ بعد میں جانم قاہرہ کے قریب پہنچا تو اس کے لیے خوش قدم کو سلطان تسلیم کرنے اور دمشق واپس چلے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ دمشق میں وہ اپنے آپ کو دیر تک محفوظ نہیں سمجھتا تھا اس لیے اس نے آق قویونلو ترکمانوں کے سلطان حسن الطّویل کے پاس پناہ لی، جہاں وہ چند ہی روز بعد قتل کر دیا گیا۔ ظاہریہ کا

ایک اور بارسوخ امیر والی جدّہ جانی بے، [ابن ایاس کے ہاں: جانی بک] جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلطان کو سب کچھ اسی کے طفیل حاصل ہوا، اسی کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس نے مملوک فوج کو اس کے سرداروں سے محروم کر دیا اور ایک حصّۂ فوج کو دوسرے کے خلاف کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گیا؛ مملوک سردار قبرص کے خلاف ان مہمات کی وجہ سے بھی کمزور ہو گئے تھے جو اینال کی حکمت عملی کا نتیجہ تھیں۔ مؤخر الذکر نے شاہ جیمز (James) کو اس کی بہن شارلٹ (Charlotte) کے خلاف مدد دی جو خود رودوس (Rhodes) کے St. John کے فوجی سرداروں (Knights) کی امداد کی متوقع تھی۔ اینال نے اپنے عہد حکومت کے آخری دنوں میں طرابلس کے والی کو اس ملکہ کے خلاف ایک مہم سپرد کی، لیکن مصر کا بادشاہ بدل جانے کی وجہ سے وہ تھوڑے ہی عرصے اس مہم میں مصروف رہ سکا۔ وہ امرا جو شاہ جیمز کی امداد کے لیے دستۂ فوج کے ہمراہ قبرص بھیجے گئے تھے، جانی بے کے قتل کے بعد گڑبڑ پھیلنے کی وجہ سے واپس آ گئے، [illegible] مختصر سی فوج کے ساتھ صرف ایک امیر کو قبرص میں چھوڑ دیا گیا۔ دارالسلطنت فماگستا Famagusta میں جیمز کے سامنے ہتھیار ڈال دیے گئے اور وہ اب عملی طور پر پورے جزیرے کا مالک ہو گیا؛ اس لیے اسے مصریوں کی امداد کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ مصریوں سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے اس نے Famagusta کے باشندوں کو عقب سے مصریوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا اور بعد میں ان پر خود بھی ٹوٹ پڑا۔ سلطان کی جواب طلبی پر اس نے اس قتل عام کو سلطان کی اپنی رعایا کی شورش پر محمول کیا اور اپنے آپ کو اس سے بالکل بری الذمہ ظاہر کیا۔ ملکہ شارلٹ نے خوش قدم کی امداد حاصل کرنے کے لیے اسے صحیح واقعے سے آگاہ کر دیا نیز اس طرح بھی اس کی خوشنودی حاصل کی کہ ایک جہاز کو، جسے رودوس کے Knights نے پکڑ لیا تھا، تاوان دے کر چھڑا لیا، مگر سلطان خوش قدم چاہتا تھا کہ جب تک جیمز باقاعدگی سے خراج ادا کرتا رہے، اس سے الجھا نہ جائے۔ جیمز اپنے باجگذار آق قویونلو [ع: القطیع الابیض] کے سلطان حسن الطویل کا پکا حلیف تھا، کیونکہ مؤخر الذکر کو قراقویونلو [ع: القطیع الاسود] کے سلطان اور خاندان ذوالغادر کے والیان اَبُلُستین کے خلاف مسلسل جنگ و جدال کرنے کے لیے سلطان مصر کی امداد پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ بنابریں حسن، جس کے تعلقات عثمانی سلطان محمد ثانی سے بھی کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے، ان سب جنگوں اور سازشوں کے دوران میں خوش قدم کا وفادار رہا۔ سلطان محمد ثانی نے حسن کے رشتے دار طرابزون کے بوزنطی شہنشاہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا، اس کے جواب میں حسن نے خوش قدم کے ساتھ مل کر قرمان کے حاکم اسحٰق کی مدد کی، جو عثمانی ترکوں سے جنگ کر رہا تھا۔ اس نے اور سلطان نے اَبُلُستین کے والیوں بُداغ، اور رستم کو ان کے حریف شاہ سُوار کے خلاف، جو ترکوں کے ساتھ تھا، منصب ولایت حاصل کرنے میں مدد دی [رک بہ قایت بے]۔ اگرچہ ان دونوں سلطانوں کے درمیان کبھی جنگ کی نوبت تو نہیں آئی مگر وہ ایک دوسرے کے دشمن ہی تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ خوش قدم سلاطین کے ممالیک کو تو قابو میں رکھتا تھا، مگر اس کے اپنے ممالیک عوام پر مظالم ڈھاتے رہتے تھے۔ سلطان ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷ء میں بیمار پڑا اور دس دن [ابن ایاس کے نزدیک تقریباً چالیس روز] کی علالت کے بعد فوت ہو گیا۔ [سلطان خوش قدم ایک جلیل القدر حکمران تھا اور احوال مملکت سے خوب واقفیت رکھتا تھا (ابن ایاس، ۲: ۸۲)]۔ اس کے عہد میں مصر میں بڑا امن و امان رہا اور مصر [ہر قسم کے فتنہ و فساد اور] وباؤں سے بھی محفوظ رہا۔ وہ قدیم نظام مملکت کا حامی

[اور شریعت کا پابند (دیکھیے ابن ایاس، ۲ : ۸۳)] تھا اور قایت بے کے برعکس پرانے رسم و رواج کی بہت سختی سے پابندی کرتا تھا [خوش قدم علما و صلحا کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا؛ دیکھیے ابن ایاس، ۲ : ۸۳].

مآخذ : (۱) ابن ایاس، بولاق ۱۳۱۱ھ، ۲ : ۸۰ تا ۸۸؛ (۲) Weil : *Geschichte der Chalifen*، ۵ : ۳۰۰ تا ۳۱۵؛ (۳) Sir William Muir : *The Mamluke or Slave Dynasty of Egypt*، ص ۱۶۲ تا ۱۶۷۔

[M. SOBERNHEIM]

خُوقَنْد : (Khoḳand) عربی شکل : خُواقَند، جسے بعد میں خُقند لکھا جانے لگا (اس کی وجہ تسمیہ عام طور پر اس طرح بیان کی جاتی ہے : خوق (خوک) + کند، جنگلی سؤروں کا شہر)، فرغانہ کا ایک شہر قب اوبر، ۲ : ۶۳ تا ۶۶ جہاں اس نام کے دوسرے ہجے دیے گئے ہیں۔ اور بارھویں (اٹھارویں) صدی میں ایک خودمختار ازبک سلطنت کا بھی ذکر ہے، جس کا دارالحکومت خوقند تھا۔ پہلے حکمران شاہرخ کی تخت نشینی کے بعد وہاں ایک قلعہ تعمیر ہوا۔ اس کے بیٹے عبدالکریم (م ۔ ۱۷۴۶ء) نے ایک اور قلعہ بنوایا جو بعد میں "اِسکی اُردہ" "Eski Urda" کے نام سے مشہور ہوا۔ عبدالکریم اور اس کے بھتیجے اور جانشین اِیرداانابی کا ذکر کئی مرتبہ اتالیق محمد رحیم کی تاریخ میں آیا ہے جو بعد میں بخارا کا خان ہوا (م ۱۷۵۹ء، محمد وفا کرمینگی : تحفۃ الخانی، Asiat. Mus. کا مخطوطہ، ۵۸۱ ب، خصوصاً ورق ۳۳ ب ببعد، ۱۰۵ ب ببعد)۔ جب قلموق سلطنت تباہ ہو گئی اور سلطنت چین کی سرحد بڑھ کر فرغانہ تک پہنچ گئی (۱۷۵۸ء) تو ایردانا کو بھی مجبوراً چین کی سیادت تسلیم کرنی پڑی۔ اس کے متعلق چینی تذکروں کا حوالہ J. Klaproth نے *Magasin Asiatique*، ۱۸۲۸ء، ۱ : ۸۱ ببعد *Tai ts'ing yi t'ung ci.* سے دیا ہے۔ ایردانا بعد میں وسطی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں کے ایک وفاق کا رکن ہو گیا جس نے چین کے خلاف افغانستان کے فرمانروا احمد شاہ دُرّانی سے مدد کی درخواست کی۔ اس اتحاد کے کچھ مزید نتائج برآمد نہ ہوئے، اگرچہ ۱۷۶۳ء میں احمد شاہ فوج لے کر ترکستان میں وارد ہوا اور اس نے خوقند اور تاشقند کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا؛ اسی اثنا میں خوقند سے قرہ قرغز کے علاقے پر بھی حملہ کیا گیا (Klaproth : کتاب مذکور، ص ۸۳)، لیکن بعض اور اطراف میں مہمات درپیش ہونے کی وجہ سے اسے جلد ہی واپس جانا پڑا۔ عبدالکریم کا پوتا ناربوتہ بیگ بھی (عہد حکومت اغلباً ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ - ۱۷۷۵ء تا ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ - ۱۷۹۹ء؛ دیکھیے L. Zimin در *Protokoli Turk. Kruzka Lyub. Arkheologii*، ۱۸ : ۱۰۲؛ نیز Walidow : وہی کتاب، ۲۰ : ۱۱۲ ببعد) برای نام چین کے ماتحت تھا۔ اس عہد کے شروع کے برسوں سے روسی سارجنٹ Filipp Yefremow کی سیاحت وابستہ ہے جسے ۱۷۷۴ء میں اہل قرغز نے قید کر کے بخارا میں فروخت کر دیا تھا اور جو ۱۷۸۲ء میں ہندوستان اور انگلستان ہوتا ہوا روس واپس پہنچا۔ اس کے سفر نامے کے مطابق (F. Yefremow : *Stranstrovaniye v Bukharii, Khive, Persii w Indii*، بار دوم، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۷۹۴ء، ص ۵۹ ببعد)، ناربوتہ کو چینیوں نے پہلے ہی سے خان کا خطاب دے رکھا تھا؛ اس کا چین سے اتحاد تھا اور بخارا سے عناد۔ اس سفرنامے میں دارالسلطنت کی ممتاز عمارتوں کا کوئی ذکر نہیں (مدرسۂ میر ناربوتہ کے عہد میں تعمیر ہوا)؛ برعکس اس کے مرغینان کی منڈی میں واقع ایک بلند ستون (بظاہر مینار) کی کیفیت بیان کی گئی ہے، جو کہا جاتا ہے کہ ۱۸۰ فٹ بلند تھا۔ بقول Filipp Nazarow (دیکھیے نیچے) یہ مینار نحاس

versts (تیس میل سے زائد) فاصلے سے نظر آتا تھا۔

ناربوته کے دو بیٹے عالم اور عمر خوقند کی ریاست اور شہر کے بانی تھے۔ اس نام کے عہد حکومت کی سلسلہ وار تاریخیں (۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸-۱۷۹۹ء تا ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء) پورے وثوق سے معلوم نہیں ہوسکیں۔ یہاں تک کہ وہ سال بھی، جس میں عالم قتل ہوا اور عمر کو تخت سلطنت پر متمکن کیا گیا، ماخذ میں مختلف طور پر درج ہے۔ تاریخ شاهرخی (طبع Pantusow، ص ۱۰۶) کے مطابق عمر کی وفات ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱-۱۸۲۲ء میں ہوئی (حساب ادوار میں "سال اسپ" = ۱۸۲۲ء)۔ بقول Nalivkin (روسی متن، ص ۱۰۱؛ فرانسیسی ترجمہ، ص ۱۲۴)، جس نے یہاں ایک اور ماخذ (حکیم خان کی منتخب التواریخ) کی پیروی کی ہے: عالم ۱۲۳۲ھ (یعنی ۱۸۱۷ء نہ کہ ۱۸۱۶ء جیسا کہ Nalivkin نے لکھا ہے) کے موسم بہار تک قتل نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس خود Nalivkin ایک اور جگہ (روسی اصل متن، ص ۱۸۵؛ فرانسیسی ترجمہ، ص ۲۲۸) یہ کہتا ہے کہ خوقند کی بڑی مسجد عمر خان نے ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵-۱۸۱۶ء) میں بنوائی تھی۔ روسی ترجمان Filipp Nazarow جو ۱۸۱۳-۱۸۱۴ء کے موسم سرما میں خوقند میں تھا، وہاں کے فرمانروا کو امیر وَلِیّامی Walliami کہتا ہے (*Zapiski، o niekotorikh narodakh*، *Sredniey Azie*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۲۱ء، ص ۵۰ بعد)۔ غالباً یہ نام "ولی النّعمی" ہے نہ کہ "ولی بیگی" جیسا کہ Klaproth کی کتاب مذکور، ص ۴۵ میں ہے۔ اس وقت وہاں کے فرمانروا کی عمر صرف پچیس سال کی تھی۔ یہ بیان صرف عمر ہی پر صادق آسکتا ہے نہ کہ عالم پر، جو عمر میں اس سے کہیں بڑا تھا؛ عبدالکریم البخاری کے قول کے مطابق بھی (طبع Schefer، ص ۱۰۲) یہ سفارت اور اس کا سبب (یعنی ایک روسی فوجی سپاہی کے ہاتھوں Petropawlowsk میں خوقندی ایلچی کا قتل) دونوں عمر خان کے عہد حکومت میں واقع ہوئے۔ بقول عبدالکریم ص ۹۹، عالم ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء ہی میں قتل ہو چکا تھا، لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی ایک دستاویز ہمارے پاس موجود ہے جس کی تاریخ جمادی الاولی ۱۲۲۵ھ/جون ۱۸۱۰ء ہے (*Protokoll Turk krugka, Lyub. Arkh.*، ۳ : ۱۶۵ بعد)، اس لیے فرمانروا کی تبدیلی لازمی طور پر ۱۸۱۰ اور ۱۸۱۳ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔

عالم کے عہد کی قدیم ترین دستاویز مؤرخہ ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸-۱۷۹۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے آپ کو کسی غیر معلوم الاسم خان کا نمائندہ سمجھتا تھا؛ بعد میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے خان یا امیر کے لقب سے ملقّب ہو گیا تھا۔ تاشقند کی فتح کے بعد وہ قوت و اقتدار میں امیر بخارا کا ہم پلّہ ہو چکا تھا۔ عمر کے عہد حکومت میں ۱۸۱۶ء میں (Nazarow بھی یہی کہتا ہے، نہ کہ ۱۸۱۹ء میں، جیسا کہ Nalivkin روسی اصل متن ص ۱۱۰ بعد؛ فرانسیسی ترجمہ ص ۱۳۴ بعد میں مرقوم ہے) ترکستان کا شہر اور اس سے متعلق قرہ کز کے وسیع میدانوں کا ایک حصہ خوقند کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے فوراً بعد عُمر نے امیر المُسلمین "کا لقب اختیار کر لیا۔ عالم اور عُمر دونوں کے عہد حکومت میں اُورہ توبہ (Ura Tübe) پر قبضے کے لیے بخارا سے متعدد جنگیں ہوئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ روسی فتح کے وقت تک یہ شہر ان دونوں حکومتوں کے درمیان جھگڑے کا باعث بنا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ بچوں کے ایک کھیل "اُورہ توبہ میرا ہے"، میں اب تک ان جنگوں کی یاد باقی ہے (*Žizń Nacionalnostey*، ۱۹۱۳ء، ۱ : ۱۹۵)۔

عمر کی داخلی حکمت عملی اپنے پیشرو سے بالکل مختلف تھی۔ عالم نے اور بہت سے ایشیائی حکمرانوں کی طرح ازبک خاندانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کا

مصمم ارادہ کر لیا تھا اور اس مقصد سے اس نے اپنے گرد و پیش قراتگین اور دور دراز کے پہاڑی علاقوں اور دوسرے ملکوں سے اجیر سپاہی اکٹھے کر لیے تھے (تاریخ شاھرخی، ص ۲۳ ببعد) ۔ جیسا کہ اور حکمران بھی کرتے رہے ھیں عالم نے بھی امرا کے خلاف جنگ کے ساتھ ساتھ دینی پیشواؤں اور خصوصًا درویشی سلسلوں کے خلاف بھی جنگ شروع کر دی؛ اسی وجہ سے مؤرخین عالم کو "بے دین ظالم" لکھتے ھیں؛ اس کے برعکس وہ عمر کی دینداری اور منصف مزاجی کی تعریف کرتے ھیں، جسے عالم کے قاتلوں نے تخت پر بٹھایا تھا ۔ خوقند کی موجودہ بڑی مسجد عمر نے بنوائی تھی، جو ایک مدرسے کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ھے اور اس لیے "مدرسۂ جامع" کہلاتی ھے (تصویر در Fr. v. Schwarz : *Turkestan*، Freiburg ۱۹۰۰ء، ص ۲۲۳) ۔ عمر شاعری کا ذوق بھی رکھتا تھا اور اپنے اشعار میں امیر تخلص کرتا تھا ۔ خان مذکور کے اپنے اشعار اور اس کے امرا و ندما کے کلام کو M. Hartmann نے ایک جیدہ مجموعۂ اشعار کی شکل میں (جو بعد میں چھاپا گیا) "مجموعۃ الشعراء" کے نام سے جمع کر دیا (در *Mitt. des Seminars f. Orient. Sprachen*، Westas. Stud.، ۷ : ۸۲ ببعد) ۔ غالبًا عمر ھی نے شہر خان (اندیجان کے مغرب میں) کی بنیاد ڈالی؛ بڑی نہر جو قرہ دریا اور شہر خان سای سے یہاں لائی گئی تھی، اب تقریبًا پچھتر میل (۱۱۰ versts) لمبی ھے اور کم و بیش چھے ھزار مربع میل رقبے کو سیراب کرتی ھے ۔ فرغانہ کی آب پاشی کے طور طریقے اس نہر کے کھودے جانے سے بالکل بدل گئے ۔

عمر کا بیٹا اور جانشین مدلی (صحیح نام محمد علی) اپنی تخت نشینی کے وقت بارہ سال کا تھا (بعض مآخذ کی رو سے چودہ سال کا) ۔ اس کے عہد حکومت کے نصف اول میں خوقند کی سلطنت اپنی قوت اور وسعت کے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی؛ جنوب کی طرف قراتگین، درواز اور کولاب کے اضلاع، جو اب بخارا کے ماتحت تھے، سب کے سب فتح کر لیے گئے ۔ شمال مشرق میں قراقرغیز، قازق قبر تیز کراردوے اعظم اور اردوے اوسط کے ایک حصے پر خراج عائد کر دیا گیا، یہاں تک کہ خان کے نمائندے اردوے اعظم میں بھی وارد ھو گئے جو دریاے الی کے خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ کاشغر میں خواجہ جہانگیر کی بغاوت (۱۸۲۶ء)، جسے خوقند کی تائید حاصل تھی، ناکام رھی ۔ اس کے باوجود چینی حکومت نے خان کے حکام کو یہ اجازت دے دی کہ وہ چھے شہروں (التی شہر)، یعنی اقسو (اقصو)، اوش طرفان، کاشغر، ینگی شہر، یارقند اور ختن سے خراج وصول کریں ۔ خوقند کی طرح، جہاں کے بڑے مدرسوں میں سے ایک محمد علی خان کے نام پر ھے (تصویر در N. P. Ostroumow : *Islamovedienie*، تاشکنت ۱۹۱۴ء، ص ۱۸۵)، تاشکنت (ارک بان) نے بھی معتدبہ خوشحالی حاصل کر لی تھی ۔ ۱۸۳۵ء سے تاشکنت کے بیگلر بیگی کو سلطنت کے تمام شمالی صوبوں کا انتظام سپرد کر دیا گیا تھا ۔ اس زمانے کی ایک یادگار عالیشان مدرسۂ بیگلر بیگی ھے (تصویر در کتاب مذکور، ص ۱۸۸) ۔ تاشکنت کے علاقے کی بڑی نہر بھی، جس کا نام خان اوب ھے اسی عہد میں کھودی گئی (*Protokoli Turk. Kruzka Lyub. Arkh.*، ۳ : ۱۷۵) ۔

اتنی وسیع سلطنت کے باوجود خان کا اقتدار مستحکم نہ تھا ۔ اس کی بداطوار زندگی اور ظالمانہ حکومت نے ھر طرف لوگوں میں بد دلی پیدا کر دی تھی، چنانچہ کہا جاتا ھے کہ خوقند کے باشندوں نے نصراللہ امیر بخارا (رک بان) سے خود یہ درخواست کی کہ وہ اس سفاک اور بے دین ظالم کی حکومت کا خاتمہ کر دے ۔ خوقند کی فوج کو مکمل ھزیمت اٹھانی پڑی اور خود دارالسلطنت پر دشمن کا قبضہ ھو گیا (قیام سلطنت کے بعد سے پہلی مرتبہ)؛ مدلی بچ کر نکل جانے کی کوشش میں مارا گیا (۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء) ۔

بہرحال اسی سال کے دوران میں فاتحین دوبارہ نکال باہر کیے گئے اور شیر علی کو، جو عالم اور عمر کا ہم جد تھا تخت پر بٹھایا گیا؛ لیکن روسی فتح کے وقت تک اندرونی امن و امان زیادہ عرصے کے لیے کبھی بحال نہیں ہوا۔ شیر علی (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۵ء) اور اس کے بیٹے خدایار (۱۸۴۵ء تا ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۵ء تا ۱۸۷۵ء) اور ملّا (۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۲ء) اور ان کے علاوہ متعدد قصیر المدت حکمرانوں کے ادوارِ حکومت مسلسل انتشار اور خاص طور پر قپچاق کے ازبکوں اور سرتوں، یعنی مقامی باشندوں کی باہمی جنگ و جدال کا زمانہ تھے۔ خدایار کو، جو ابھی نابالغ تھا قپچاق کے سردار مسلمان قل نے مسندِ سلطنت پر متمکن کیا تھا۔ قپچاق نے دارالسلطنت کے سرتوں (Sarts) کو ان کے گھروں سے نکال دیا اور مالک کی نہروں پر قبضہ کر لیا؛ سرتوں کو صرف ایک مقررہ رقم ادا کرنے کی صورت میں اپنے کھیتوں کے لیے ضروری پانی لینے کی اجازت تھی۔ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں خدایار نے مسلمان قل کو قبیلے کی سرداری سے الگ کر کے قتل کرا دیا اور اس طرح یہ علاقہ دوبارہ سرتوں (sarts) کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے بعد ملّا نے قپچاق کی اعانت پر بھروسا کیا اور زمینیں، جو سرتوں نے ان سے چھین لی تھیں انھیں واپس دلا دیں۔ وطن سے نکالے ہوئے مدعیانِ سلطنت بالعموم بخارا میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں نصراللہ پیش قدمی کر کے خجندہ تک آ پہنچا اور اس کا جانشین مظفر ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں اور دوسری بار ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں خوقند پر قابض ہو گیا۔ وطن کے اندر اور وطن سے باہر دشمنوں کے خلاف لڑائی میں قرونِ وسطیٰ کی سی بے رحمی برتی جاتی تھی۔ مدلی کے خسر محمد شریف اتالیق کو، جو تاشکنت کا والی تھا، خان شیر علی کے حکم سے ایک گھوڑے کی دم سے باندھ کر بے آب و گیاہ میدانوں میں گھسیٹا گیا۔ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں اورا توبہ پر خدایار کے قبضے کے بعد مقتول دشمنوں کے سروں کا ایک مینار (کلّہ مینار) بنایا گیا۔

اس کے باوجود اس سلطنت نے روسی فتح تک اپنی سابقہ وسعت برقرار رکھی۔ روسی لشکر ۱۸۵۳ء میں دریاے سیحون کے بالائی حصے میں اس دریا کے دہانے سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر اور شمال مشرق میں ۱۸۶۰ء سے دریاے چو (رک بآن) اور ایلی کے درمیانی علاقے میں خان خوقند کی سپاہ کے مدمقابل تھے۔ یہ سب علاقے اب تک والیٔ تاشکنت کے ماتحت تھے، جس کا یہ بھی فرض منصبی تھا کہ وہ ان علاقوں میں زراعت کو برقرار رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ والی میرزا احمد (۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۸ء) نے ترکستان کے شہر وے سے دریاے چو کی وادی تک آب رسانی کے انتظامات کیے۔ ۱۸۶۵ء میں روسی فتح سے صرف کچھ عرصہ پہلے تاشکنت امیر بخارا کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۸۶۶ء سے خوقند کی سلطنت فرغانہ تک محدود ہو گئی اور اس علاقے کی حدود کے اندر ۱۸۶۸ء کے روسی معاہدے تک بھی خود مختار رہی۔ اسی زمانے میں اُلغ نہر کی کھدائی ہوئی (*Einblicke in das Ferghana-Thal* : Middendorf، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۱ء، ضمیمہ، ص ۲)، نیز متعدد عمارتیں (جیسے اوردہ یا قصرِ خان جس کی تصویر اکثر کتابوں میں ہے، مثلاً *Turkestan* : Fr. v. Schwarz، ص ۲۱۳؛ اور اس سے بہتر *Turkestanskiy Krai* : W. Masalskiy، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۳ء، ص ۷۰۱ اور ۷۰۳ میں؛ مدرسۂ حاکم ایبن اور مدرسۂ محمد سلطان مراد بیگ، جو خان کی والدہ اور بھائی نے قائم کیے ان کی تصویریں *Islamoviedieniye*, : M. Ostroumow، ص ۱۸۳ میں ہیں) اسی زمانے میں تعمیر کی گئیں۔

خان خدایار کی معزولی کے بعد، جو ایک عام بغاوت کا نتیجہ تھی اور جس کی وجہ سے نئی مشکلات پیدا ہو گئیں، باقی ماندہ سلطنت بھی ”علاقۂ فرغانہ“ کے نام سے روسی سلطنت میں شامل کر لی گئی۔ روسی

حکومت میں بھی خوقند کی حیثیت اس علاقے کے سب سے بڑے شہر (۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی ۱۱۲۳۶۳ تھی) اور اہم تجارتی مرکز کے طور پر برقرار رهی - جدید مرغیلان کا شہر، جو بعد میں Skobelew کہلایا اور اب فرغانه کے نام سے موسوم ہے، والی کا صدر مقام تھا - ۱۹۱۷ء میں خوقند نے آخری مرتبہ میدان سیاست میں اپنا کردار ادا کیا، اور وهاں ترکستان کی خود مختار حکومت کی تشکیل ہوئی؛ دوسرے سال سرخ فوج نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا.

مآخذ : (۱) W. Nalivkin: *Kratkaya Istoriya Kokandskago Khanstva*، قازان ۱۸۸۵ء؛ (۲) تبصرہ از N.V[eselowskiy]، در *Zapiski Vost. Otd. R. Arkh.*، ۱ : ۳۲۷ ببعد؛ (۳) V.P. Nalivkine: *Histoire du Khanat de Khokand*، مترجمهٔ A. Dozon، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۴) تبصرہ از V.R[osen]، در *Zapiski* وغیرہ، ۴ : ۳۲۹ ببعد - ماخذ کے متعلق نیز دیکھیے : (۵) V. Smirnow، در *Collections scientif. de l' Inst. des langues orient.*، وغیرہ، ج ۸، *Manuscrits turcs*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۷ء، ص ۱۵۰ ببعد؛ (۶) W. Barthold، در *Zapiski* وغیرہ، ۹ : ۱۰۵ ببعد، ۱۵ : ۲۱۸ ببعد، ۲۷۲ ببعد؛ (۷) A.Z. Walidow، کتاب مذکور، ۲۲ : ۲۰۳ ببعد، ۳۱۰ اور ۳۲۰ - ۱۸۶۵-۱۸۷۶ء کی جنگ کے لیے دیکھیے خصوصاً : (۸) A.I. Iryanow: *Na pasnyuï'o Fergante*، ۱۹۰۱ء، ص ۱۵ تا ۷۰ : (۹) N.P. Koritow: *Samozvanci Pulatkhan Ezegodnik Feganskoi Oblasti*، ج ۱، کتاب مذکور، ۱۹۰۲ء، ص ۱۹ ببعد) - ۱۹۱۷-۱۹۱۸ء کی لڑائی کے متعلق : (۱۰) N. Tyurykulow: *Kokandskaya Avtonomiya* (*Sbornik Statey v 4 godovshcinu sovietskoi vlasti v Turkestanie*، تاشکنت ۱۹۲۲ء) : نیز (۱۱) اخبار الفِ ترکستان، جو اس وقت خوقند میں شائع ہوتا تھا .

(W. BARTHOLD)

خُولان (۱) :

جنوبی عرب کے ایک قبیلے کا نام - جنوبی عرب کے قدیم کتبوں میں بھی اس قبیلے کا ذکر موجود ہے (Glaser، ص ۲۶، س ۱۸ ببعد اور Halevy، ص ۵۸۵، س ۱۱ ببعد (.....) - اس قبیلے کے علاقے کا حوالہ (.....) کتبهٔ Glaser، ص ۱۱۹، س ۵ میں موجود ہے اور اس نام کے ایک خاندان کا ذکر Glaser، ص ۳۰۲، س ۳ میں ملتا ہے - ان سب عبارتوں سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ قبیلۂ خولان ایک هزار قبل مسیح کے زمانے هی میں اس علاقے میں آباد ہو گیا تھا - یہاں قبیلۂ خولان یا کم از کم اس کا ایک حصہ آج بھی موجود ہے، یعنی اس سرزمین میں جو صنعاء اور مأرب کے درمیان واقع ہے اور جسے الهمدانی نے "خولان العالیه" لکھا ہے؛ یہ ذوجرہ سمیت یمن کے انتہائی زرخیز علاقوں میں سے تھا؛ یہاں بالعموم مکئی، باجرا، جو اور بالخصوص گیہوں کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے - قبیلۂ خولان اب قبیلۂ بکیل کُبرٰی کا ایک جزو ہے، جو تقریباً اسّی هزار مسلح آدمی میدان جنگ میں لا سکتا ہے - سیاح E. Glaser نے اس قبیلے کے علاقے کی ۱۸۸۵-۱۸۸۶ء میں چھان بین کی تھی - عرب ماهرین انساب خولان بن عمرو بن مالک بن الحارث بن مُرّة بن أدد بن زید بن [یشجب بن عُریب] بن زید بن کَہلان بن سبأ کو اس قبیلے کا جد امجد قرار دیتے هیں جس کے نام پر اس قبیلے کا نام رکھا گیا ہے - بعض کہتے هیں کہ خولان بن عمرو بن الحاف بن قضاعه اس کا مورث اعلٰی تھا، جس کے جد امجد کے نام پر یہ لوگ خولان قضاعه بھی کہلاتے هیں؛ تاهم خولان العالیه اور خولان قضاعه کے درمیان تفریق نسبی نہیں بلکہ جغرافیائی ہے، کیونکہ اول الذکر بھی، کم از کم نشوان کے قول کے مطابق، قضاعه هی سے تعلق رکھتے هیں - یہ تفریق دراصل اس طرح پیدا ہوئی کہ شروع میں تو خولان کا پورا قبیلہ مأرب اور صرواح کے درمیان آباد تھا لیکن مرور زمانه سے اس کا ایک حصہ نقل وطن کر کے ان بلند علاقوں میں چلا گیا جو صنعاء

کے مشرق میں واقع ہیں اور اس وجہ سے خولان العالیہ کہلانے لگا۔ اس اثنا میں باقی ماندہ قبیلہ مارب میں مقیم رہا اور کہیں بعد کے زمانے میں جا کر، جب ایک نئی ہجرت شروع ہوئی تو اس نے صعدہ کا رخ کیا، جو اب بھی خولان کے علاقے کا سب سے زیادہ اہم مقام ہے۔ نیبور C. Niebuhr کی سیاحت کے وقت بھی اس قبیلے کا علاقہ دو حصوں میں منقسم تھا، جن میں سے ہر ایک آج کل کی طرح ایک خود مختار شیخ کے زیر اقتدار تھا۔ ان میں سے شمالی حصے کے لوگ، Niebuhr کے بیان کے مطابق، زیدی عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کا علاقہ بقول E. Glaser صعدہ کے مغرب اور شمال مغرب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ حلی کی بندرگاہ سے، جو صنعاء اور مکے کے درمیان واقع ہے، صعدہ تک چار دن کی مسافت ہے۔ الہمدانی کا یہ بیان قابل توجہ ہے کہ اس حصے میں فصیح عربی صرف بلند علاقوں میں بولی جاتی تھی اور اس کے برخلاف وادی اور علاقۂ القدّ میں ایک غیر فصیح بولی رائج تھی۔ خاص اس علاقے میں اب تک خولان کا نام دو اور نمایاں چیزوں سے بھی وابستہ ہے: ان میں ایک تو "خولان کی چوٹی" (قُرّ خولان) ہے، یعنی ایک پہاڑی چوٹی جو جبل تُخلی سے دیکھی جا سکتی ہے اور دوسری چیز بیت خولان ہے، جو جبل حَضُور کی چوٹی کا نام ہے۔ خولان صعدہ میں نیبور Niebuhr نے صرف ان دیہات کا ذکر کیا ہے: عقبۃ المسلم، حیدان، ذهر d'ahhr اور سوق الجمعہ۔ بعض اور اسباب کے علاوہ قشعہ میں سونے کی ایک کان کی موجودگی سے، جو بنو سعد بن زُرارہ بن خولان کی ملکیت تھی، A. Sprenger کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خولان کا کچھ تعلق بائبل کے حویلہ سے ہے! اس سے پہلے Niebuhr نے بھی یہی نظریہ اختیار کیا تھا۔ خولان صنعاء میں Niebuhr نے مندرجۂ ذیل دیہات کا ذکر کیا ہے: بیت راجح، تنعیم، بیت الکبسی، بیت القوم، سیان، زُراجہ، براش۔ شعبان ۱۰ھ/ نومبر ۶۳۱ء میں خولان کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے اور اپنے قبیلے کے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انھیں اسلام کی تعلیم سے آگاہ کیا اور انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بت "عَمّ انس" کو توڑ دیں گے۔ اس کے بعد ان کی عزت افزائی کے طور پر انھیں ½ ۱۲ اوقیہ چاندی کا تحفہ دیا گیا اور وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد شروع میں وہ بھی ارتداد کی عام تحریک میں شریک ہو گئے، لیکن ۱۱ھ/۶۳۲ء میں یعلٰی بن مُنیّہ، جنھیں ابوبکر صدیقؓ نے کچھ تعزیری فوج دے کر بھیجا تھا انھیں دوبارہ دائرۂ اسلام میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ یمن کے دیگر قبائل کی بہ نسبت سیاسی حیثیت سے خولان کے تعلقات مدینے کی حکومت سے بہت قریبی تھے۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے تعلقات صنعاء کے ایرانی حکمرانوں سے بھی خوشگوار تھے۔ انھوں نے دو ایرانی شہزادوں جُشنَس اور فیروز کو پناہ دی، جو قیس بن عبد یغوث بن مَکشُوح کی قیادت میں عربوں کی بغاوت کی وجہ سے صنعاء سے نکلنے پر مجبور ہو گئے اور مدینے سے مدد پہنچنے تک ان کا ساتھ دیتے رہے۔

۲۱ھ یا ۲۲ھ میں یمن کی فتح کے بعد جب بالآخر خولان کے علاقوں میں اسلام پوری طرح پھیل گیا تو جنوبی عرب کے جن باشندوں نے مصر کی فتح میں حصہ لیا اور وہاں آباد ہو گئے ان میں قبیلۂ خولان کے بعض افراد بہت نمایاں تھے؛ چنانچہ آج کل بھی مصر میں اہم عہدوں پر اکثر خولانی متمکن نظر آتے ہیں۔ قاہرہ کے قدیم شہر (الفسطاط) میں ایک محلہ ان کے نام پر ہے اور بالعموم یہ نام (خولان) قراطیس بردی اور مزاروں کی لوحوں میں اکثر نظر آتا ہے۔

(۲) دمشق کے قریب ایک گاؤں کا نام، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مشہور صحابی ابو مسلم عبدالرحمٰن بن مشکم الخولانی مدفون ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن حوقل، BGA، ۲: ۳۲ و ۳۳؛ (۲)

الیعقوبی: کتاب البلدان، BGA، ۷: ۲۲۰؛ (۳) الہمدانی: صفة جزیرة العرب، طبع D.H. Müller، لائڈن ۱۸۸۴ - ۱۸۹۱ء، ص ۱۰۷ و ۱۱۳ تا ۱۱۵ و ۱۳۶، ۱۲۵ و ۱۹۲؛ (۴) وہی مصنف: الاکلیل، ج ۱۰، 4. Berol. Glaser؛ (۵) یاقوت: معجم، طبع ووسٹنفلٹ Wüstenfeld، ۲: ۶۰۰؛ ۳: ۱۸۷؛ (۶) مراصد الاطلاع، طبع T.G.J. Juynboll، لائڈن ۱۸۵۲ء، ۱: ۳۷۵؛ (۷) عظیم الدین احمد: *Die auf Südarabien bezüglichen Angaben Našwān's im Šams al-ʿUlūm*، GMS، ج ۲۴، لائڈن ۱۹۱۶ء، ص ۳۵ و ۶۱ و ۷۶؛ (۸) C. Niebuhr: *Beschreibung von Arabien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۱۸۲، ۲۷۰ و ۲۸۰ ببعد؛ (۹) C. Ritter: *Die Erdkunde von Asien*، ۸/۱، برلن ۱۸۴۶ء، ص ۷۱۲ و ۸۱۹ و ۸۴۳؛ (۱۰) A. Sprenger: *Die alte Geographie Arabiens*، برن ۱۸۷۵ء، ص ۵۱، ۵۳ ببعد، ۵۸، ۲۳۹ و ۲۸۶ ببعد؛ (۱۱) وہی مصنف: *Das Leben und die Lehre des Mohammed*، برلن ۱۸۶۹ء، ۳: ۳۵۷ ببعد؛ (۱۲) E. Glaser: *Meine Reise durch Arḥab und Häschid*، در *Petermanns Mitth.*، ۱۸۸۳ء، ۳۰: ۱۷۱؛ (۱۳) وہی مصنف: *Über meine Reisen in Arabien Mitth. d. Geo Ges. in Wien*، ۱۸۸۴ء، ۳۰: ۲۲؛ (۱۴) وہی مصنف: *Skizze der Geschichte und Ge[illegible]hte Arabiens*، برلن ۱۸۹۰ء، ۲: ۳۴، ۴۲، ۱۰۱؛ (۱۵) وہی مصنف: *Sammlung Eduard Glaser*، ج ۱: *E. Glaser's Reise nach Mārib*، طبع D.H.v. Müller و N. Rhodokanakis، وی انا ۱۹۱۳ء، ص ۵۵، ۱۲۵، حاشیہ ۱؛ (۱۶) M. Hartmann: *Der islamische Orient, Bericht und Forschungen*، ج ۲: *Die arabische Frage*، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ص ۳۳۵، ۳۹۰ تا ۳۹۲؛ (۱۷) C.H. Becker: *Beiträge zur Geschichte Ägyptens unter dem Islam*، سٹراس بورگ ۱۹۰۳ء، ۲: ۱۳۲، ۱۳۳؛ (۱۸) L. Caetani: *Annali dell Islām*، میلان ۱۹۰۷ء، ۲: ۳۲۰ ببعد، ۳۰۶، ۶۶۹ حاشیہ 8، ۸۰۰ حاشیہ ۸؛ (۱۹) J.V. Karabacek: *Zur orientalischen Altertumskunde*، ج ۵، *Wien S.B. Ak.*، ۱۹۱۵ء، ۱۸ـ ۵/۱۰، حاشیہ ۱۔

(Adolf Grohmann)

© **الخُونَجی**: افضل الدین محمد بن ناماور بن عبدالملک الشافعی المصری، ابوالفضائل، ابوعبداللہ، ۵۹۰ھ / ۱۱۹۳ - ۱۱۹۴ء میں پیدا ہوا اور ۵ رمضان ۶۴۶ھ / [۲۲] دسمبر ۱۲۴۸ء فوت ہوا۔ الخونجی کا شمار مشہور مسلمان حکما اور اطبا میں ہوتا تھا۔ علوم شرعیہ وغیرہ میں بھی اسے یدطولٰی حاصل تھا۔ ابن ابی اصیبعہ نے، جو ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ - ۱۲۳۵ء میں قاہرہ میں اس کی خدمت میں پہنچا، لکھا ہے کہ میں نے اسے سارے علوم میں کامل پایا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ الخونجی سے اس نے ابن سینا القانون کے جزء الکلیات کا کچھ حصہ پڑھا۔ تفکر و تدبر کی عادت کی وجہ سے یہ فاضل سوچ میں پڑ جاتا تو دیر تک اسی حالت میں مستغرق رہتا۔ وہ مدرسۂ صلاحیۂ قاہرہ اور دیگر مدرسوں میں درس بھی دیتا رہا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ مصر اور اعمال مصر کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوا۔ جب وہ فوت ہوا تو اسے جبل مقطم میں دفن کیا گیا اور شیخ عزالدین محمد بن حسن الضریر اربلی نے اس کا مرثیہ لکھا، جس کے چند اشعار عیون الانباء میں دیے ہیں۔

تالیفات: اس نے طب اور منطق پر متعدد کتابیں لکھیں: (۱) شرح ماقالہ الرئیس ابن سینا فی ا (عیون الانباء، ۲: ۱۲۱)؛ (۲) شرح الکلیات، اس کا نسخہ پیرس میں ہے، دیکھیے براکلمان، تکـ ۱: ۸۲۴ (نیچے سے دوسری سطر)؛ (۳) ادوار الحمیات (عیون الانباء، محل مذکور)؛ (۴) مقا فی الحدود والرسوم (عیون الانباء، محل مذکور)؛ (۵) کتاب الجُمَل فی علم المنطق (یا المختصر، دیکھیے کشف الظنون و براکلمان، بذیل الجمل؛ (۶)

كشف الاسرار عن غوامض الافکار فی المنطق، جس پر ابن البدیع البندیهی نے حواشی لکھے اور کاتبی قزوینی، صاحب الشمسیة (م ۶۹۳ھ/ ۱۲۹۴ء) نے اس کی شرح لکھی؛ اس کا نسخہ رامپور میں ہے (فہرست رامپور، ۱ : ۳۵۸)؛ (۷) کتاب الموجز فی المنطق: یہ مختصر رسالہ اس نے اپنے بعض اخوان کے لیے چند فصلوں میں مرتب کیا؛ اس کے اور اس کی شرح کے لیے دیکھیے براکلمان: تکملہ، ۱ : ۸۳۸؛ (۸) مختصر المطالب العلیة، دیکھیے براکلمان: تکملہ، ۱ : ۸۳۸۔

مآخذ: (۱) السبکی: طبقات، ۵ : ۲۳؛ (۲) ابن ابی اصیبعة: عیون الانباء، ۲ : ۱۲۰ ببعد؛ (۳) السیوطی: حسن المحاضرة، ۱ : ۲۳۱، ۳۱۲؛ (۵) سامی: قاموس الاعلام، ۳ : ۲۰۱۰؛ (۶) براکلمان، ۱ : ۴۶۳ و تکملہ، ۱ : ۸۳۸۔

[ادارہ]

خوی: (Khoi؛ عربی: خُوَیّ)، ایران کے صوبۂ آذربیجان کا ایک شہر، جو تبریز سے ۸۰ میل شمال مغرب میں سطح مرتفع پر واقع ہے۔ اس کی آبادی بیس سے تیس ہزار تک ہے۔ خوی کی اراضی کو ایک ندی سیراب کرتی ہے، جو سلماس کے پہاڑوں سے نکل کر ارس میں جا گرتی ہے۔ شہر کے گرد چاروں طرف باغات ہیں، جن میں دوسرے میووں کے علاوہ انجیر اور ایک عمدہ قسم کی ناشپاتی ہوتی ہے، جو "پیغمبری" کہلاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں شہر کے مضافات میں کپاس کی کاشت ہوتی ہے۔ گزشتہ دور میں یہاں ایک کپڑا بنا جاتا تھا، جو "خونجیہ" کہلاتا تھا۔ آج کل یہاں ہاتھ یا کرگھے سے بنی ہوئی اون سے جرابیں تیار کی جاتی ہیں۔ موجودہ دفاعی استحکامات مٹی کے بنے ہوئے ہیں، جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں جنرل گاردین Gardane کی صلاح اور فوج نے تعمیر کیے تھے۔ ۱۸۴۲ء کے زلزلے میں شہر کا ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ خوی کے قریب ہی شاہ اسمعیل اول صفوی کو سلطان سلیم اول نے جنگ چالدران (۹۲۰ھ/ ۱۵۱۴ء) میں شکست دی تھی۔

مآخذ: (۱) یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۲ : ۵۰۲؛ (۲) Barbier de Meynard: *Dict. de la Perse*، ص ۲۰۲؛ (۳) حمداللہ المستوفی: نزهة القلوب، طبع Browne، ص ۸۳؛ (۴) ابوالفداء: تقویم، طبع Reinaud، ص ۳۹۶؛ (۵) G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص [illegible]؛ (۶) E. G. Browne: *A Year amongst the Persians*، ص ۵۰ ببعد؛ (۷) J.P. Morier: *Second Journey*، ص ۳۰۳۔

(CL. HUART)

* **خیار**: (ع) عام طور پر کسی "اقرار" یا "اعلان" [یا سودے] کے واپس لے لینے کا اختیار، اصطلاح میں "خیار" کہلاتا ہے [لفظی معنی ہیں دو صورتوں میں سے بہتر صورت کا اختیار کرنا]۔ خاص طور پر اس کا اطلاق کسی یک طرفہ معاهدے کے فسخ (منسوخ کرنا) یا امضا اور اجازۃ (جاری کرنا) کے حق پر ہوتا ہے۔ یہ حق یا تو خود قانون دیتا ہے یا معاہدہ کرنے والے فریق آپس میں طے کر لیتے ہیں۔ [اس کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ بعد میں تخاصم و تنازع اور بغض و کینہ نہ پیدا ہو اور شر و فساد کا دروازہ بند ہو جائے]۔

نادرًا خیار اس وقت ہے جب کوئی چیز خریدنے یا کرائے پر دینے کے لیے پیش کی جائے اور خریدار یا کرایہ دار اسے دیکھے، یہ "خیار الرؤیة" کہلاتا ہے، یعنی دیکھتے وقت کا اختیار۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چیز عیب دار نکلے، اسے خیار العیب کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مال کے لیے جس قسم کی شرط تھی اس پر مال پورا نہ اترے یا کوئی خامی رہ گئی ہو؛ یہ خیار التقریر الفعلی ہے۔ یا دھوکا دیا گیا ہو؛ یہ خیار الغبن ہے۔

یہ خاص صورتیں ہیں جن میں کسی معاهدے کے بروئے کار لانے یا نہ لانے کا اختیار ہوتا ہے، لیکن اگر

کسی کاریگر کو اجرت پر ملازم رکھا جائے تو اس وقت خیار نہیں۔ عمومی حیثیت سے قانون کا منشا یہ نظر آتا ہے کہ معاہدے ایسی حالت میں فسخ کیے جا سکتے ہیں کہ نقائص نکلیں یا فریق ثانی معاہدے کی پابندی نہ کرے، اگرچہ ہر جگہ اسے خیار نہیں کہا جاتا۔ نکاح فسخ کرنے کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ اس کے لیے خیار کی اصطلاح مستعمل ہے.

حنفی مذہب کے مطابق اگر کسی عورت کا نکاح اس کے نا بالغ ہونے کے زمانے میں کسی غیر ولی نے کردیا ہو تو بالغ ہونے پر اسے یہ حق ہے کہ وہ اس نکاح کو فسخ کر دے۔ یہ خیار البلوغ ہے (قب نکاح)۔ اسی طرح قانونًا اس وقت بھی معاہدہ فسخ کرنے کا اختیار ہے جب معاہدہ کوئی ایسا شخص کرے جسے معاہدہ کرنے کا اختیار نہ دیا گیا ہو، یعنی فضولی.

چیز کو فروخت کرتے یا کرائے پر دیتے وقت فریقین میں سے ایک کو یا دونوں کو یا ان کے بجائے کسی تیسرے شخص کو ایک مدت معینہ کے اندر، جو لازمًا بہت تھوڑی ہوتی ہے، معاہدہ فسخ کرنے کا جو حق ہے وہ خیار الشّرط کہلاتا ہے؛ اس کے علاوہ خریدتے وقت خریدار کو حق ہوتا ہے کہ متعدد پیش کردہ چیزوں میں سے وہ اپنی پسند کی چیز لے لے، اسے خیار التّعین کہتے ہیں۔ پھر بیچنے والے کو مدت معیّنہ کے اندر رقم کی ادائی نہ ہونے پر بیع فسخ کرنے کا حق ہے، اسے خیار النقد کہا جاتا ہے۔ [ایک حدیث کے الفاظ میں البیّعان بالخیار مالم یتفرّقا یعنی بائع اور مشتری دونوں کو اسی وقت تک بیع کو فسخ کرنے کا اختیار ہے جب تک وہ الگ الگ نہ ہو جائیں۔ اس میں بعض فقہا جسمانی علیٰحدگی مراد لیتے ہیں اور بعض سودے اور گفتگو کا انقطاع.

آخر میں خیار عورت کے اس حق کو بھی کہتے ہیں جب اس کا خاوند اسے اختیار دے دے کہ وہ جب چاہے طلاق لینے کا فیصلہ کر سکتی ہے (تفویض الطلاق).

مآخذ : (۱) الشافعی : کتاب الاُمّ؛ (۲) امام مالک : الموطّا؛ (۳) ھدایۃ؛ (۴) مدونۃ الکبرٰی؛ (۵) المذاھب الاربعۃ، ان پانچوں کتابوں میں دیکھیے بذیل کتاب البیع) اور کتاب النکاح؛ (۶) Dimitroff : Asch-schaibānī (الشیبانی)، در MSOS، ج ۱۲، فصل ۲، ص ۶۰ ببعد؛ (۷) Hooper : The Civil Law of Palestine and Trans-Jordan، ۲ : ۱۱۳ ببعد؛ (۸) Dictionary of the Technical Terms used in the science of the Musalmans (Bibliotheca Indica)، ۱ : ۳۲۱؛ (۹) G. Bergsträsser : Grundzüge des Islamischen Rechts، برلن و لائپزگ ۱۹۳۵ء، بمدد اشاریہ؛ نیز (۱۰) قب مقالہ بیع.

([و ا] لائڈن (مختصر))

خیال : سیّد محمد تقی جعفری حسینی، ایک ضخیم فارسی داستان، بوستان خیال کے مصنف، احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے، مگر ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں بعہد محمد شاہ دہلی آ گئے تھے۔ اس داستان کی تالیف کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ خود خیال کے الفاظ میں اس کے تین محرکات تھے : (۱) یہ داستان انھوں نے اپنے وطن میں کسی نازنین کا تقرب حاصل کرنے کے لیے لکھی؛ (۲) دہلی میں بعض لوگوں کے طعن پر داستان امیر حمزہ کے جواب میں لکھی؛ (۳) نواب رشید خان کی ملازمت میں ان کی فرمائش پر لکھی۔ تین جلدیں مکمل کرنے پر محمد شاہ سے انعام بھی پایا۔ اس کے تاریخی نام فرمائش رشیدی سے سال ابتدا ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء برآمد ہوتا ہے۔ خاتمۂ کتاب میں مصنف نے بتایا ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد وہ مرشد آباد چلا گیا تھا، جہاں سراج الدولہ کے حکم سے یہ کتاب ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء میں مکمل ہوئی (لیکن سراج الدولہ کی مدح میں جو قطعہ درج ہے اس میں سال تکمیل ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء بتایا گیا ہے :

در ہزار و یک صد و ہفتاد [illegible]

یہ داستان طبع نہیں ہوئی، لیکن اس کے نامکمل مخطوطات کئی کتاب خانوں میں محفوظ ہیں مثلاً بودلین لائبریری، انڈیا آفس لائبریری اور موزہ بریطانیہ کے مخطوطے قابل ذکر ہیں (موزہ بریطانیہ کے مخطوطے کی جلد دوم میں نواب رشید خاں کو ناظم بنگالہ جعفر خان کا بیٹا بتایا گیا ہے، جو غلط ہے۔ بوستان خیال کی جلدوں کی تعداد کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا (سکسینہ: نو جلدیں؛ حامد حسن قادری: دس جلدیں، گیان چند: پندرہ جلدیں، وغیرہ)، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تقسیم بہت الجھی ہوئی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے Ethé: Cat. of Persian Mss. of the Bodlian Library، عدد ۵۸۰؛ گیان چند: اردو کی نثری داستانیں، ص ۶۰۲)۔ نیشنل لائبریری کلکتہ میں بوستان خیال کے ایک انتخاب کا قلمی نسخہ ملتا ہے۔ نواب کلب علی خان، والی رام پور، نے بھی اس کا ضخیم فارسی خلاصہ تیار کرایا تھا، جس کا مخطوطہ کتاب خانۂ رام پور میں محفوظ ہے۔

داستان امیر حمزہ کی طرح اس کا مرکزی کردار بھی ایک تاریخی شخصیت ہے، یعنی فاطمی خلیفہ شاہزادۂ معزالدین ابو تمیم۔ اس کے علاوہ کئی اور تاریخی شخصیتیں بھی (مثلاً جوہر، خلیفہ العاضد، وغیرہ) افسانوی کرداروں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔ اس ضمن داستان میں مذہبی کتابوں کے بیانات اور رائج الوقت قصے بھی شامل ہیں۔ واقعات کا انداز داستان امیر حمزہ سے مختلف نہیں، جس کی چھاپ جنات اور دیوزادوں سے لڑائی اور سحر و ساحری اور طلسمات کے بیان، غرض کہ ہر جگہ نظر آتی ہے؛ اسی لیے بوستان خیال میں کوئی تنوع اور جدت پیدا نہیں ہوسکی۔ مزید برآں اس کا کوئی معین پلاٹ نہیں اور متعدد بعید از قیاس قصوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بوستان خیال کے مختلف اجزا کے اردو میں متعدد تراجم ہوے، جن میں ممتاز ترین ترجمہ خواجہ امان دہلوی کا ہے۔

مآخذ: (۱) Ethé: *Cat. of Pers. Mss. of the Bodlian Library*، ۱: ۴۳۹ تا ۴۴۴؛ (۲) سکسینہ: *History of Urdu Lit.* (مترجمہ مرزا محمد عسکری: تاریخ ادب اردو، حصۂ نثر، ص ۱۰۰)؛ (۳) حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو، کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۵ ببعد؛ (۴) ڈاکٹر گیان چند: اردو کی نثری داستانیں، بار دوم، کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۵۹۸ ببعد۔

[ادارہ]

* **خَیالِ ظِلّ**: نیز ظِلّ خَیال، یعنی پرچھائیوں کا تماشا؛ پرچھائیوں کے ناٹک میں فن نقالی کے ڈانڈے موسیقی، مصوری اور شاعری سے جا ملتے ہیں۔ اس میں ایک سفید کپڑے کی چادر پر پیچھے سے روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس کے اوپر رنگین و منقش چمڑے کی بنی ہوئی شفاف پتلیوں کے ذریعے ایک ایسا خیالی منظر پیش کیا جاتا ہے جو استغراق پسند اہل مشرق کے لیے مغرب کے حقیقت پسندانہ، لیکن بھونڈے فن تمثیل کے مقابلے میں کہیں زیادہ پر معنی ثابت ہوتا ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، یہ فن مغربی ممالک میں بظاہر چین سے پہنچا تھا اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کا آغاز قدیم یونان یا روم سے ہرگز نہیں ہوا۔

اس کے بارے میں ہمیں جو قدیم ترین حوالہ ملتا ہے اس کا تعلق سرزمین ہند سے ہے، اگرچہ وہاں یہ تماشا اب معدوم ہو چکا ہے۔ بہرکیف جاوا کے وائنگ wayang سے، جس میں زیادہ تر ہندوستانی ساز و سامان سے کام لیا جاتا ہے، اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ پہلے ہندوستان میں موجود تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے اہلِ چین سے یہ فن مغول کی وساطت سے حاصل کیا۔ بہرصورت یہ محقق ہے کہ اسلامی ممالک کے لیے چینی خیال ظل سے متعارف ہونے کے مواقع موجود تھے۔

چین اور ہندوستان سے اسلامی ممالک کو جانے والی شاہراہ ایران سے ہو کر جاتی تھی، چنانچہ ایرانی شعرا کے کلام میں کئی جگہ خیالِ ظل کا ذکر تو آتا ہے، تاہم اس تماشے کے متعلق قطعی معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ ایرانِ جدید میں یہ تماشا "کچل پہلوان" کی شکل میں باقی ہے۔

عربی ثقافت کے حامی ممالک، بالخصوص مصر میں خیال ظل نے ابتدائی دور ہی میں خاصی ترقی پا لی تھی۔ قرونِ وسطٰی کی عربی ڈرامائی شاعری کی باقیات میں سے اب صرف محمد بن دانیال الطّبیب (م ۱۳۱۱ء) کی ظلّی تمثیلات محفوظ رہ گئی ہیں۔

ترکوں کے ہاں بھی ظلی تمثیل نے بہت ترقی اور مقبولیت حاصل کی۔ ترکی تماشا اگرچہ بہت سی باتوں میں مصری تماشے سے مشابہ ہے، لیکن محض اس بنا پر یہ فرض کر لینا صحیح نہ ہوگا کہ ترکوں نے اسے مصریوں سے اخذ کیا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اس سے بہت قبل تیرھویں صدی عیسوی ہی میں ظلی تمثیل کے لیے اپنی زبان میں ایک خاص "اصطلاح "قُبرچُق" وضع کر لی تھی (بشرطیکہ بقول ہوتسما Houtsma: Türkish-Arabisches Glossar، لائڈن ۱۸۹۴ء، ص ۴۳، ۸۷، "قُبَرچُق" کے معنی "چینی خیالِ ظل کی ایک پُتلی" واقعی صحیح ہوں؛ لیکن یہ بہت مشکوک ہے کیونکہ مشرقی ترکی میں جو لفظ "قاوُرجَق" یا "قوغُورجُق" اب تک باقی ہے اس کا ظل خیال سے کوئی تعلق نہیں۔

ترکستان وغیرہ میں خیال ظل اگر کسی زمانے میں رائج تھا بھی تو اب بظاہر معدوم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ پتلیوں کے تماشے نے لے لی ہے، جو "قول قُورچق" اور "چادِیر خیال" کہلاتا ہے۔

ترکانِ عثمانیہ اسے قَرہ گوز [ارک بان] کہتے ہیں اور زمانۂ حال میں بھی جب تک اسے سینما سے مسابقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، یہ تماشا ماہ رمضان میں نہ صرف عورتوں اور ادنٰی طبقے کے لوگوں میں مقبول ترین ذریعۂ تفریح بنا رہا بلکہ اعلٰی اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بھی بیشتر افراد کو، یہاں تک کہ بعض سلاطین کو بھی اس کا بہت شوق رہا۔ جہاں کہیں بھی ترک اتنی تعداد میں آباد ہوئے کہ تماشا گر ان سے تھوڑی بہت روزی حاصل کر سکتا، وہاں ظل خیال ضرور موجود ہوتا تھا۔

ترکیہ سے یہ تماشا غیر ترکی ممالک میں بھی پہنچ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یونان میں خاص طور پر اپنے قدم جما لیے تھے۔ یہ کیفیت زمانۂ حال تک (خصوصاً ایتھنز Athens، پرایوس Piraeus اور سالونیکا Salonika میں) قائم رہی۔ اسی طرح یہ اہل رومانیا کے ہر طبقے میں بھی بہت مقبول رہا۔

مآخذ: (۱) G. Jacob: *Geschichte des Schattentheaters*، بار دوم، ہینوور ۱۹۲۵ء، جہاں ان سب ماخذ کا ذکر ہے جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؛ (۲) نیز دیکھیے L. Roussel: *Karagheuz, ou un théâtre d'ombres à Athènes*، ایتھنز ۱۹۲۱ء؛ (۳) J. Kats: *Het Javansche Tooneel*، ج ۱: *Wajang Poerwa*، Weltevreden ۱۹۲۳ء؛ (۴) A. Samojlowič: *Kuklojnyj teatrw Turkestane*، در *Russkij Muzej. Etnograficeskij otdel*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۲۳ء، عدد ۱۔

(TH. MENZEL)

* **خیالی**: اصل نام محمد بے؛ وہ یکارسی بھی کہلاتا تھا؛ سلیمان اعظم (قانونی) کے عہد کا ایک اہم شاعر۔ شاعر اصولی کی طرح وہ بھی روم ایلی کے ایک چھوٹے سے شہر وردر ینیجہ سی کا رہنے والا تھا۔ شیخ غالب کی طرح کم سنی ہی میں اس کے ذہن میں پختگی آ گئی تھی اور اس کی شاعرانہ صلاحیت نے وقت سے پہلے ہی نشو و نما حاصل کر لی تھی۔ لڑکپن میں وہ ایک صوفی منش حیدری درویش بابا علی مست کی خدمت میں رہتا تھا۔ انھوں نے اسے تصوّف

سے روشناس کرایا، جس کی جھلک اس کی بہت سی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں گردی میں اپنے مرشد کا ساتھ دیتے ہوئے وہ قسطنطینیہ پہنچا، جہاں مقامی حکام کی مداخلت نے اسے اس درویش کے فیضان صحبت سے محروم کر دیا۔

اس کی شاعرانہ قابلیت کے باعث بالآخر دفتردار سکندر چلبی اور اس کے بعد فرنگ ابراہیم پاشا اس پر مہربان ہوگیا، جس نے اسے سلطان سلیمان کے حلقۂ شعرا میں لے جا کر بٹھا دیا۔ سلطان کا قرب و اعتماد حاصل ہونے کے بعد آخر وہ سلطان کے خاص ندیموں کے زمرے میں شامل ہو گیا اور یوں اس نے وہ بلند ترین اعزاز حاصل کر لیا جو کسی ترکی شاعر کو نصیب ہو سکتا تھا۔ اپنے سرپرست امیروں کے قتل کے بعد (سکندر کو ۱۵۳۵ء میں بغداد میں پھانسی دی گئی اور ابراہیم کو ۱۵۳۶ء میں محل شاہی میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا) ان کے منظور نظر شعرا، جو کسی وقت بڑے بااقتدار تھے، رفتہ رفتہ اپنے اثر و رسوخ سے محروم ہونے لگے۔ خیالی کو بھی برے دنوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اسے کبھی یہ سلیقہ نہ آیا کہ وہ ان تحائف اور مراحم خسروانہ کو سنبھال کر رکھتا جن کی اس پر بارش ہوتی رہی تھی؛ لیکن آخرکار سلطان نے اسے بیگ کا خطاب دے کر ایک سنجاق عطا کر دی۔ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶-۱۵۵۷ء میں اس نے شہر ادرنہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوا۔

خیالی پسندیدہ اطوار اور پرخلوص طبیعت کا حامل تھا۔ اس نے عمر بھر درویشانہ انکسار اور صاف دلی کو برقرار رکھا؛ چنانچہ اس نے حیدری حلقے کی رکنیت بھی ترک نہ کی۔ وہ اپنے زمانے کے چوٹی کے شعرا میں سے تھا۔ اس کے ہمعصروں میں سے کوئی بھی زور کلام اور حسن بیان میں اس سے بازی نہ لے جا سکا، تاہم اس کی زبان پرانے زمانے کی ہے؛ وہ صرف غزل اور قصیدے میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ جس طرح وہ دنیوی مال و متاع سے بے نیاز تھا، اسی طرح اسے اس کی بھی چنداں پروا نہ تھی کہ اس کے سرمایۂ کلام کا کیا حشر ہوگا؛ چنانچہ وہ اپنی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظموں کو بشکل دیوان مرتب کرنے کا کام دوسروں پر چھوڑ گیا۔ اس کا بیٹا عمر بیگ (م - ۱۰۱۰ھ) بھی شاعر تھا۔

مآخذ: (۱) لطیفی: تذکرہ، قسطنطینیہ ۱۳۱۴ھ، ص ۱۴۹؛ (۲) سہی: تذکرہ، قسطنطینیہ ۱۳۲۵ھ، ص ۱۲۶؛ (۳) معلم ناجی: مجموعہ، قسطنطینیہ ۱۳۰۵ھ، عدد ۳۶، ص ۱۳۱؛ (۴) وہی مصنف: اسامی، قسطنطینیہ ۱۳۰۸ھ، ص ۱۳۷؛ (۵) فائق: اسلاف، عدد ۲۴، در خزینۂ فنون، قسطنطینیہ ۱۳۱۱ھ، ۱: ۱۳۷؛ (۶) برسلی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، قسطنطینیہ ۱۳۳۸ھ، ۲: ۱۶ (طاہر نے اسے سلیم اول کے عہد کے خیالی سے ملتبس کر دیا ہے اور دونوں کو ایک شخص قرار دیا ہے اور متوخرالذکر کی لیلیٰ و مجنون کو اس سے منسوب کیا ہے)؛ (۷) سامی: قاموس الاعلام، ۳: ۲۰۷۱؛ (۸) ثریا: سجل عثمانی، قسطنطینیہ ۱۳۱۱ھ، ۲: ۳۱۳؛ (۹) Flügel: *Kat. der. Türk. Handschriften in Wien*، ۱۸۶۵ء، ۱: ۶۶۹ (ایک قلمی نسخہ، جسے مصنف نے اور خوش نویس ابراہیم چلبی نے لکھا ہے، لنڈن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانے میں ہے)؛ (۱۰) E. J. W. Gibb: *A. History of Ottoman Poetry*، ۳: ۵۸؛ (۱۱) V. Hammer: *G O R*، بار دوم، ۲: ۳۳۲۔

(TH. MENZEL)

خَیبر: ایک نخلستان، جو [سطح سمندر سے ⊙ ۲۸۰۰ فٹ بلند اور] مدینۂ منورہ سے ۱۸۴ کیلومیٹر (کچھ کم سوا سو میل) شمال میں بری راستے سے آنے والے حجاج کی شاہراہ پر واقع ہے۔ عہد نبوی ؐ میں غابہ، یعنی جبل احد کے مغرب سے گزرتے تھے؛ اب جدید ہوائی اڈے (مطار) سے اتصال کی خاطر مشرق سے گزرتے

ہیں۔ تقریباً ایک سو کیلومیٹر تک یہ راستہ تنگ اور پیچدار دروں میں سے ہوتا ہوا جاتا ہے، جس کے دونوں طرف بلند پہاڑ ہیں۔ اس ساری مسافت میں پتھر ہوں یا مٹی، حرہ یعنی آتش فشانی سے جلے ہوئے عناصر پر مشتمل ہیں۔ درخت اور پانی نام کو نہیں۔ اکا دکا بکریاں کہیں چرتی نظر آ جاتی ہیں جو بہت پست قد ہوتی ہیں۔ ان کے دودھ نہیں ہوتا، البتہ ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ مدینے سے خیبر تک مشکل سے دو آبادیاں ملتی ہیں۔ پہلی صلصال ہے، جو ۱۲۸ کیلومیٹر پر واقع ہے اور کافی سرسبز ہے۔ مقامی لوگوں کا بیان ہے کہ بستی کے نصف حصے میں کنووں کا پانی کڑوا ہے اور نصف حصے میں شیریں ہے! ممکن ہے فدک یہی ہو۔ اس سے آگے ایک دوسری چھوٹی اور ویران سی بستی ہے۔

خیبر بھی ایک حرہ [رک بآں] ہے۔ مدینے سے آئیں تو شہر کے پندرہ بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر سفید اور قابل کاشت لیکن افتادہ زمینیں ملتی ہیں، جو دس بارہ کیلومیٹر تک پھیلی ہوتی ہیں۔ بعد ازاں پھر حرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس حرّے میں شاہراہ کے دائیں جانب قدیم (یہودی) کھنڈر میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں، جن میں کچھ تالابوں کے منہدم سے بند نظر آتے ہیں۔ گرمی میں پانی خشک ہو جاتا ہے تو ان کی تہہ میں جمی ہوئی سہین مٹی دور دور تک نظر آتی ہے۔ امریکی انجینیر ٹویچل Twitchell نے سعودی عرب کی زرعی پیمائش کی رپورٹ میں یہاں سد الحَصید اور پانچ دیگر تالابوں کا ذکر کیا ہے۔ غزوۂ خیبر میں آتے اور جاتے دونوں وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سد الصہباء میں قیام فرمایا تھا؛ وہ بھی شاید یہیں کہیں ہو۔ اس کے آگے ایک پست اور وسیع وادی ہے، جس میں شہر خیبر آباد ہے۔ یہ نخلستانوں سے اس قدر پٹا ہوا ہے کہ کسی بلندی پر سے بھی شہر کے خط و خال بالکل نظر نہیں آتے۔ عہد نبوی ؐ میں محلہ الکَتِیبة میں کھجور کے چالیس ہزار پیڑ بیان کیے گئے ہیں (ابن الاثیر: (البدایة ۴ : ۲۰۲)۔ آج کل بھی شہر کے جنوب میں، ایک بلند پہاڑ کے دامن میں، کئی میل لمبا ایک گھنا نخلستان ہے۔

خیبر میں اب (۱۹۶۴ء میں) عَنیزہ قبیلے کے عرب آباد ہیں۔ کہتے ہیں کہ فصل کٹنے کے زمانے میں ہنگامی آبادی پچیس تیس ہزار تک ہو جاتی ہے، ورنہ مستقل آبادی پانچ ہزار کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ شہر میں کئی بلند ٹیلے اور پہاڑیاں ہیں، جن میں سب سے ممتاز وہ ہے جسے قصر مرحب کہا جاتا اور یہودی عہد کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ ترکی دور میں غالباً یہاں فوجی چھاؤنی تھی؛ اب اس میں سعودی گورنر رہتا ہے۔

بعض مؤلفوں کی رائے میں خیبر کے یہودیوں کی بولی میں "خیبر" کے معنی قلعے کے تھے۔ البکری نے سہل بن محمد الکاتب سے اور یاقوت نے الزجاجی سے روایت کی ہے کہ یہ اس بستی کے بانی خَیْبر بن قانیہ بن مہلائیل کے نام سے منسوب ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسباط یہود کے گم گشتہ قبائل نے یہاں اور پشاور سے آگے درۂ خیبر میں بھی اپنی نشاندہی کے لیے یہ نام دیا ہو؟

خیبر کا قدیم ترین ذکر بابل کے آخری کلدانی بادشاہ نبونعد [= نبونید] (۵۵۶ یا ۵۳۹ ق م) کے میخی کتبے میں، جو حرّان کی منہدم جامع مسجد کے فرش کے ایک پتھر پر ملا تھا (میونخ کی مؤتمر مستشرقین عالم کی روداد، ص ۱۳۲) لکھا ہے کہ جب اس بادشاہ نے تیماء میں اپنا ذیلی پائے تخت بسایا تو خیبر و فدک وغیرہ سے ہوتے ہوئے یثرب تک کی سیاحت کی۔ ایک دوسرا کتبہ بھی حران کے قریب لجہ میں دستیاب ہوا ہے، جو سیاق ہندسوں کے ساتھ عربی میں ہے کہ "میں نے، یعنی شرحیل بن ظلمو نے ذا المرطول کو سنہ ۴۶۳ میں خیبر کی تباہی (مفسد) کے ایک سال بعد تعمیر کرایا"۔ E. Littmann (R.S.O.، ۱۹۱۱ و ۱۹۱۲ء، ص ۱۹۳ ببعد) کے مطابق اس تاریخ سے مراد

۵۶۸ء ہے۔ ابن قتیبہ: کتاب المعارف، (ص ۳۱۳) کے مطابق غسّانی حکمران الحارث بن ابی شمر جبلہ (۵۲۸ تا ۵۷۰ء) نے اس رخ حملہ کیا تھا؛ یہ ممکن ہے کہ خیبر والوں نے ایرانیوں اور حیرہ کے حکمران سے کچھ سازش کی ہو اور اس پر بوزنطی قیصر روم نے اپنے ماتحت حکمران کو ادھر روانہ کیا تھا۔ معلوم نہیں اس وقت خیبر میں کون لوگ تھے، لیکن ساٹھ سال بعد جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف لائے تو یہاں صرف یہودی بستے تھے، جو بہت خوش حال تھے؛ چنانچہ مکے میں شادی بیاہ کے موقع پر یہیں سے دیگیں اور زیور کرائے پر لیے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ زیور کھو گئے تو اہل مکہ نے دس ہزار دینار کا ہرجانہ ادا کیا (ابن سعد، ۲/۱: ۸۱؛ السرخسی: شرح السیر الکبیر، ۱/۱۸۹)۔ بہت ممکن ہے کہ معاشی روابط نے شادی بیاہ تک نوبت پہنچا دی ہو اور یہاں کی یہودنیں بے جھجک عربوں سے نکاح کرتی ہوں: چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم اور ان کے بھائی المطّلب نے ایسا ہی کیا (ابن حبیب: المنمّق، مخطوطۂ لکھنؤ، ص ۳۲۵)۔ یہاں کھجوریں بہت ہوتی ہیں، لیکن زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگ یہاں کے ملیریا سے بہت گھبراتے تھے (بعض قصے القزوینی: الآثار، ۲: ۹۰ تا ۹۱ اور ابن قتیبہ: الانواء، ص ۳۰ تا ۳۱ میں ملیں گے)۔ یہود خیبر کے لباس میں طیلسان بہت مشہور ہے (صحیح البخاری، کتاب ۶۴، باب ۴۰، حدیث ۱۲)۔ عبدالمطلب نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوے تو وہ ایک کی قربانی دیں گے۔ قرعۂ فال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ پر پڑا۔ اس سلسلے میں جس کاہنہ سے مشورہ کیا گیا تھا وہ سال کا کچھ عرصہ مدینے میں اور کچھ خیبر میں رہتی تھی (ابن ہشام: السیرة، ص ۹۸ تا ۹۹)۔

یاقوت نے معجم البلدان میں مشاہیر خیبر میں سے ابن القاهر الخیبری اللخمی محدث کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، لیکن عہد اسلامی کے جغرافیہ نگاروں میں سے البکری (معجم، ص ۳۲۳ تا ۳۳۳) نے کتاب الشکونی کا جو اقتباس دیا ہے وہ واقف حال شخص کا بیان معلوم ہوتا ہے: "یہ مدینے سے آٹھ برید پر ہے۔ پیدل تین دن میں آسکتے ہیں۔ مدینے سے نکلو تو پہلے غابۂ عُلیا، پھر سُفلٰی کے بعد نقب بردوج آتا ہے، جہاں ایک مسجد نبویؐ ہے۔ پھر وادی الدُّومہ آتی ہے، جہاں کنوئیں ہیں۔ پھر جبل أشمذ، پھر حرّۃ الشّقّہ، پھر نُمار آتا ہے، جو خیبر سے آٹھ میل پر علاقۂ خیبر کی سرحد پر واقع ہے۔ اس سے آگے خیبر اور اس کے قلعے ہیں۔ خیبر کا بازار المرطلہ ہے، جسے حضرت عثمانؓ نے بسایا تھا۔ وہاں کے قلعے میں کچھ پرانے لوگ باقی ہیں، جو حضرت عمرؓ کی نسل سے ہیں۔ اس سے آگے حصن وَجدہ ہے، جس میں کھجور وغیرہ کے درخت ہیں۔ یہ صَرفِ خاصِ نبویؐ رہا ہے۔ پھر الشّلالم ہے، جس کا بڑا حصہ صرف خاص نبوی تھا۔ پھر جبل الأهْیل آتا ہے، جس میں یہودی بُرج (آطام) ہیں۔ پھر مزرعے اور باغات ہیں، جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور بنو المُطّلب کے روزینے مقرر تھے۔ اسی کو الوَطیح کہتے ہیں۔ وطیح سے متصل خُلص تک ایک وادی جاتی ہے، جسے الکُتیْبَہ کہتے ہیں۔ یہ سب کی سب صرف خاص نبوی رہی ہے۔ یہ کتیبہ خیبر کے قلعہ بند مقاموں میں سے ہے۔ یہیں الصہباء ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ ڈال کر رات گزاری تھی؛ یہ خیبر سے ایک برید کی مسافت پر ہے۔ خیبر کا سب سے بڑا قلعہ القَموص ہے، جسے حضرت علیؓ نے فتح کیا تھا؛ اسی کے دامن میں مسجد نبویؐ ہے۔ وہیں نَطاہ اور الشّقّ دو وادیاں ہیں۔ ان دونوں کے مابین جو رقبہ ہے اسے السَّبخة اور المَخاضة کہتے ہیں۔ یہ اس بڑی مسجد نبویؐ تک جاتا ہے جہاں خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام رہا۔ یہ مسجد عیسی بن موسٰی نے زر کثیر خرج کر کے بنوائی، اس کی بنا "طاقات معقودہ" پر ہوئی ہے۔ اس میں بڑے صحن بھی

ہیں۔ وہاں وہ چٹان بھی ہے جسے سُترہ [رک باں] بنا کر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے۔ آج کل یہاں عید کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ نطاۃ میں مرحب کا قلعہ اور قصر ہے۔ یہ قصر حضرت الزبیر بن العوامؓ کے حصے میں آیا تھا۔ الشق میں الحمۃ نامی چشمہ ہے، جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "قسمۃ الملائکۃ" کا نام دیا تھا۔ اس کا دو تہائی پانی ایک نالے میں جاتا ہے اور ایک تہائی دوسرے میں، حالانکہ نکلتا ایک ہی جگہ سے ہے۔ عہد نبویؐ سے لے کر اب تک یہ ایک اعجوبہ رہا ہے۔ اس چشمے میں تین کھجوریں یا لکڑی کے تین لکڑے ڈالو تو دو اس نالے میں چلے جاتے ہیں جس میں دو تہائی پانی جاتا ہے اور ایک دوسرے نالے میں۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس میں تہائی سے زیادہ پانی لایا جائے۔ اگر کوئی اس نالے میں کھڑا ہو جائے جس میں دو تہائی پانی جاتا ہے تاکہ اسے دوسرے نالے میں لایا جائے تو پانی اس پر غالب آ کر بہہ نکلتا ہے اور دوسرے نالے میں تہائی سے زیادہ پانی نہیں آ سکتا۔ رہا النطاۃ، وہاں کا بڑا چشمہ اللُّحَیحۃ کہلاتا ہے۔ خیبر میں سب سے پہلے داربنی قِمّۃ فتح ہوا، جو نطاۃ میں ہے اور اسی میں مرحب کا بھائی الیاس رہتا تھا۔ اسی کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ "دار بنی قمۃ کی فتح سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کی روٹی اور کھجور پیٹ بھر کر نہیں کھائی تھی"۔

قصر مرحب کے دامن میں آج کل ایک چھوٹی سی مسجد رہ گئی ہے۔ اس کے قریب جو چشمہ ہے وہ اب حضرت علیؓ سے منسوب ہے کہ مرحب پر وار کرنے میں ان کی تلوار زمین میں اتر گئی اور یہ چشمہ پھوٹ بہا۔ اس سے کچھ فاصلے پر دوسرا بڑا چشمہ بھی باقی ہے۔ دونوں سے نخلستانوں کی آب پاشی ہوتی ہے۔

تاریخ اسلام میں خیبر کی شہرت ۷ھ/۶۲۸ء کے غزوۂ نبویؐ کے باعث ہے۔ مدینے سے نکلے ہوئے بنو النضیر کے یہودی یہاں آ بسے تھے۔ محاصرۂ خندق [رک باں] انہیں کی انگیخت پر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی نئی مملکت کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گئے تھے۔ انہیں سے نبٹنے کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ [رک باں] میں قریش کی منہ مانگی شرطوں پر صلح کی تھی اور قریش سے صرف یہ خواہش کی تھی کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانب دار رہیں۔ اس معاہدے کی تکمیل کے بعد واپس آتے ہی آپؐ نے خیبر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ پندرہ سو کی جمعیت لے کر آپؐ مدینے سے روانہ ہوئے۔ جب الصُّہباء تک پہنچ گئے تو قبیلۂ غَطفان کے لوگ آپؐ کے راستے میں حائل ہوئے کیونکہ وہ خیبر کے یہودیوں کی امداد کرنا چاہتے تھے، لیکن جب آپؐ نے الصہباء سے وادی الرَّجیع (دیار غَطفان) کا رخ کیا تو وہ گھبرا کر فوراً اپنے مال و عیال کی حفاظت کے لیے خیبر سے واپس آ گئے اور پھر انہیں نقل و حرکت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تین دن الرَّجیع میں ٹھہر کر آپؐ خیبر آ گئے۔

اہل خیبر آپؐ کی پیشقدمی سے واقف اور مقابلے کے لیے تیار تھے۔ اس زمانے کی عربی بستیوں کی طرح خیبر بھی متعدد چھوٹے چھوٹے قبائلی محلّوں پر مشتمل تھا۔ ہر محلہ دوسرے سے کچھ فاصلے پر آباد تھا اور ہر ایک کا نظام معیشت، یعنی کھیت، چراگاہیں، قلعے اور گڑھیاں مستقل تھیں۔ جہاں تک دفاع کا تعلق ہے وہ ایک تو اپنے سات بڑے اور متعدد چھوٹے قلعوں میں محفوظ تھے، جن میں سے بعض میں منجنیقیں بھی نصب تھیں؛ دوسرے الیعقوبی کے مطابق خیبر میں بیس ہزار مقاتل (جنگجو سپاہی) تھے۔ المقریزی (الامتاع) کے مطابق دس ہزار کا مقابلہ پندرہ سو مسلمانوں کو کرنا تھا؛ تیسرے وہ اپنے مرکز اور گھر میں ہونے کی وجہ سے حربی فوقیت بھی رکھتے تھے۔ آزوقہ اور ساز و سامان بھی ان کے پاس بہت تھا۔ السرخسی (شرح السیر الکبیر،

ن خاسی، الرایات و الالویۃ) نے لکھا ہے کہ خیبر کے ہر قلعے کو آہنی تین فصیلوں سے اس طرح گھیرا گیا تھا کہ سوار و فوج ان کے سامنے بے بس تھی۔

پرانے نام اب بھلا دیے گئے ہیں، اس لیے معلوم نہیں قلعۂ ناعم کہاں تھا، جو مؤرخوں کے مطابق سب سے پہلے سر ہوا۔ پھر اندرون شہر کا قلعہ قموص فتح ہوا، جو خاندان ابوالحقیق (اور ام المؤمنین حضرت صفیہؓ) کا مسکن تھا۔ اس کی فتح میں حضرت علیؓ نے خاص کارگزاری دکھائی تھی۔ پھر حصن الشق اور حصن النطاۃ اور حصن الکتیبہ سر ہوئے۔ اس کے بعد حصن الوطیح اور حصن السلالم (دو آخری قلعے) کوئی دو ہفتوں کی کشمکش کے بعد فتح ہوئے۔ بظاہر انہیں آخری دو قلعوں میں سارے یہودی باشندے جمع ہو گئے تھے۔ اگر یہودیوں کے ساتھ انہیں کی توریت کے احکام کے مطابق برتاؤ کیا جاتا ۔ سارے بالغ مرد قتل اور عورتیں بچے غلام بنائے جا سکتے تھے، مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمدلی اور درگزر سے کام لیا؛ سب کی جان بخشی کی کہ مال چھوڑ کر جسم کے کپڑوں کے ساتھ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ سیرۃ الشامی کے مطابق مدینے میں بنو النضیر کے پاس ایک کنز تھا، یعنی "وہ مال جو وہ اتفاقی ضروریات (نوائب) کے لیے جمع کیا کرتے تھے"۔ شہر بدری پر نضیری یہ کنز خیبر میں ساتھ لائے تھے۔ حسب معاہدہ جب یہ مسلمانوں کے سپرد نہ ہوا تو آنحضرتؐ نے جواب طلبی کی تو صاحب الکنز نے بہانہ کیا کہ جنگ کی تیاری میں ختم ہو گیا ہے، لیکن رات کو اسے کھنڈروں میں ادھر ادھر پھرتے دیکھ کر شبہہ ہوا؛ چنانچہ وہاں کھدائی کی گئی تو خزانہ برآمد ہو گیا اور صاحب الکنز کو فریب کاری کی سزا بھگتنی پڑی۔

ابتدائی ناکامیوں ہی نے یہودیوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ سیرت نگار لکھتے ہیں کہ حصن الزبیر اپنے استحکام کے باعث اس لیے بآسانی فتح ہو گیا کہ پانی کے ذخیرے تک اس کا جو زمین دوز راستہ تھا اس کا پتا ایک مقامی یہودی ہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا۔

جب قبضہ مکمل ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرائط صلح میں مزید رعایت منظور فرمائی اور اجازت دی کہ وہ تا حکم ثانی خیبر ہی میں رہیں اور بٹائی پر کاشت کر کے نصف پیداوار لگان میں دیا کریں۔

یاقوت (معجم البلدان) نے صراحت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف علاقہ بحق حکومت محفوظ کر دیا اور اس میں کتیبہ اور سلالم داخل ہوئے؛ باقی فاتحوں میں بانٹ دیا اور شق و نطاۃ و متعلقات اس میں آئے (لشکر اسلام میں بارہ سو پیدل اور تین سو گھوڑ سوار تھے۔ سواروں کو چونکہ دگنی غنیمت ملتی ہے اس لیے سارا علاقہ چھتیس حصوں میں بانٹا گیا۔ آدھا حکومت کے لیے وقف رہا۔ باقی اٹھارہ حصوں میں سے ہر ایک حصہ سو پیدل سپاہیوں یا پچاس سواروں میں بانٹا گیا)۔ الزہری کا جو بیان ابن کثیر (البدایہ، ۴ : ۲۰۲) نے نقل کیا ہے کہ کچھ خیبر بزور شمشیر فتح ہوا اور کچھ بُرامن طور سے؛ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بغیر جنگ فتح شدہ علاقہ بحق حکومت وقف کر دیا گیا۔ لیکن عام مؤرخ یہ کہتے ہیں کہ زمین کو فاتحوں میں تقسیم کرتے ہوئے حسب معمول خُمس حکومت کے لیے لیا گیا اور یہ کتیبہ کا نخلستان تھا۔ یہاں کے لگان میں ہر سال جو کھجوریں وغیرہ آتی تھیں ان سے کچھ روزینے بھی مستقل طور پر مقرر ہوئے، جس کی ابن ہشام وغیرہ نے تفصیل دی ہے۔

یہودیوں کا بٹائی پر کام کرنا حضرت عمرؓ کی خلافت تک باقی رہا۔ پھر جب ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کے قتل کا اقدام کیا تو ان کو وہاں سے شام منتقل کر دیا گیا اور مسلمان کسان ہی یہاں کاشت کرنے لگے۔

بعد کے زمانے میں کچھ یہود کے خیبر میں آ بسنے کی داستان بالکل بے بنیاد ہے اور صلیبی جنگوں کے زمانے میں تُطَیلَه (= تُدَیله) کے بن یامین کا یہ بیان بعید از قیاس ہے: [وۂ]، بار اوّل، میں گرومان Grohmann (بذیل مادۂ خیبر) کو بھی یہ بیان غلط معلوم ہوا ہے۔ بہرحال یہ بن یامین (جو غالباً یہودی ہے) لکھتا ہے کہ ۱۱۷۳ء میں خیبر میں ۱۱۵۰ یہودیوں کی آبادی پائی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز پر سیاح برکھارٹ کو یہاں ایک بھی یہودی نظر نہ آیا.

ادبیات اسلام میں ایک مزعومہ مکتوب نبویؐ نقل ہوتا رہا ہے، جس میں یہود خیبر کے لیے بہت سی مراعات مذکور ہیں۔ ابن القیم: احکام اہل الذمّة، جلد اول (طبع دمشق)، میں اس کی اصلیت پر بیس تفصیلی اعتراض کیے گئے ہیں۔ ایک اور جعلی منشور نبویؐ میں خیبر اور اسی کے ساتھ مقنا کے لیے بھی (جو وہاں سے کچھ دور خلیج عقبہ میں واقع ہے) ایک ہی دستاویز میں بے شمار حقوق عطا کیے گئے ہیں۔ یہ دستاویز، جو عربی زبان لیکن عبرانی خط میں ملی ہے، غالباً فاطمی دور میں وضع کی گئی (متن کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب الوثائق السیاسیہ، عدد ۴، اور بحث کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب رسول اکرم کی سیاسی زندگی، نیز *Le Prophete de l' Islam, sa vie et son oeuvre* ج ۱، محل مذکور).

خیبر کے حصن مرحب کی تصویر سیاح ڈاؤٹی نے ہاتھ سے کھینچ کر اپنے سفرنامے میں دی ہے، جو خاصی صحیح ہے.

محاصرۂ خیبر کے زمانے میں حضرت مُحَیِّصہ انصاریؓ کی سرکردگی میں ایک دستہ فدک بھیجا گیا، جیسا کہ السرخسی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہاں کے یہودیوں نے مقابلہ کیے بغیر صلح کر لی اور سالانہ پچاس فی صد لگان آنحضرتؐ کو پیش کرنا منظور کر لیا۔ اس حسن کارگزاری پر حضرت مُحَیِّصہ کا مستقل روزینہ مقرر کیا گیا.

البیہقی نے لکھا ہے کہ مدینے میں بنو قینقاع کے کچھ یہودی باقی رہ گئے تھے (سنن کبرٰی، ۹ : ۶۳)۔ خیبر کی مہم میں انھوں نے رضاکارانہ شرکت کی تو انھیں مال غنیمت سے کچھ ”رَضْخ“ (انعام) دیا گیا، لیکن السرخسی کی روایت میں ان یہودیوں کو ”سہم“ یعنی مسلمانوں ہی کے برابر حصہ دیا گیا.

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ کسی خیبری یہودی کے ایک حبشی غلام نے، جو چرواہا تھا، اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ تقاضائے دیانت یہ ہے کہ ریوڑ کو مالک کے قلعے تک لے جا کر چھوڑ دو تاکہ وہ عادت کے مطابق خود ہی مالک کے گھر پہنچ جائے.

المقریزی نے الامتاع میں لکھا ہے کہ مال غنیمت میں توریت کے جو نسخے ملے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو واپس دلا دیے.

[اس جنگ میں یہودی سردار حُیَیّ بن اَخْطَب کی بیٹی صفیہ بھی جنگی قیدیوں میں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ آپؐ نے انھیں حضرت دِحْیہ کو بخش دیا، مگر پھر بعض صحابہ کے مشورے سے سات قیدیوں کے معاوضے میں انھیں واپس لے لیا اور عدت پوری ہونے تک حضرت ام سلمہؓ کے پاس رکھا۔ صفیہ مسلمان ہو گئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا]۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا مسلمان سپاہیوں کا برتاؤ اپنے نبیؐ کے سسرالوں سے نرم ہو گیا۔ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بھی نکاح سے یہی تھا۔ حضرت صفیہؓ اپنے غیر مسلم میکے والوں سے ہمیشہ عزیزانہ سلوک کرتی رہیں اور وفات پر وصیت کی کہ ان کے متروکے کا ایک تہائی، یعنی ایک لاکھ درہم، ان کے غیر مسلم بھانجے کو دے دیے جائیں۔ بعض مسلمانوں نے مخالفت کی تو حضرت عائشہؓ نے دخل دے کر وصیت کا نفاذ کرایا کہ اسلامی قانون ایسا ہی حکم دیتا

ہے (ابن سعد: طبقات، ۸: ۹۱ تا ۹۲).

صلح ہو جانے اور یہودیوں کو اپنے باغوں میں آ جانے کی اجازت ملنے کے بعد بھی مسلمان سپاہی وہاں جا کر پھل، ترکاری چھیننے لگے اور شکایت آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً روکا اور بتایا کہ اب وہ غیر کا مال ہے، جو بلا اجازت کھانا حرام ہے۔

[فتح خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت زینب بنت الحارث (زوجۂ اسلام بن مِشْکم) نے ایک بریان بکری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی اور اس میں زہر ملا دیا۔ آپ نے ایک لقمہ اٹھایا اور چبا کر تھوک دیا اور فرمایا کہ یہ زہرآلود ہے۔ آپؐ کے ساتھ حضرت بشیر بن البراء بن معرور نے زہرآلود گوشت کھا لیا، جس کے اثر سے وہ مر گئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی عورت کو بلا بھیجا۔ اس نے جرم کا اقرار کر لیا، مگر اسے آپؐ نے قتل نہ کیا۔ ایک اور روایت (الامتاع، ص ۳۲۲) میں آیا ہے کہ آنحضرتؐ نے اسے بشر کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا، جنھوں نے اسے قتل کر دیا].

مآخذ: (۱) ابن ہشام: سیرۃ؛ (۲) ابن سعد: الطبقات؛ (۳) الطبری (ان تینوں کا اردو ترجمہ، مطبوعۂ جامعۂ عثمانیہ، موجود ہے)؛ (۴) الواقدی: المغازی؛ (۵) البلاذری: انساب الاشراف، ج ۱ (طبع مصر)؛ (۶) ابن کثیر: البدایۃ، ج ۴؛ (۷) محمد بن یوسف الشامی: سیرۃ (مخطوطات استانبول وغیرہ)؛ (۸) محمد حمید اللہ: الوثائق السیاسیۃ، باب خیبر؛ (۹) وہی مصنف: رسول اکرم کی سیاسی زندگی؛ (۱۰) وہی مصنف: عہد نبوی کے میدان جنگ؛ (۱۱) سلسلۂ جغرافیہ ہاے عرب، عدد ۱، ص ۲۱؛ (۱۲) ابن حوقل، ص ۲۸؛ (۱۳) المقدسی، ص ۸۳؛ (۱۴) الہمدانی، ص ۱۲۳ و ۱۳۰؛ (۱۵) البکری: معجم [illegible]: ۳۴۱ تا ۳۴۳؛ (۱۶) یاقوت: معجم البلدان، بذیل مادہ؛ (۱۷) مراصد الاطلاع، ۱: ۶۷ تا ۷۲؛ (۱۸) السرخسی: شرح السیر الکبیر، بمواضع کثیرہ، نیز دیکھیے طبع جدید کا اشاریہ؛ (۱۹) السہیلی: الروض الانف، ج ۲، ذکر خیبر؛ (۲۰) L. Caetani: *Annali dell' Islam*، ۱/۲: ۸ تا ۲۳؛ (۲۱) N. Desverger: *Arabie*، ص ۱۷۷ تا ۱۸۰؛ (۲۲) Ch. M. Doughty: *Travels in Arabia Deserta*، لنڈن ۱۹۳۲ء، ۲: ۷۵، ۹۲، ۱۰۱، ۱۰۳ تا ۱۰۵، ۱۹۹؛ (۲۳) A. Sprenger: *Alte Geographie Arabiens*، ۱۸۷۵ء، ص ۱۵۳، ۲۰۳؛ (۲۴) K. S. Twitchell: *Agricultural Survey of Saudi Arabia*، جو عربی اور انگریزی دونوں میں چھپی ہے؛ [(۲۵) ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص ۲۱۱ ببعد؛ (۲۶) ابن القیم: زاد المعاد، ۲: ۳۲۳؛ (۲۷) ابن سید الناس: عیون الاثر، ۲: ۱۳۰؛ (۲۸) القسطلانی: المواہب، ۱: ۱۳۷؛ (۲۹) دیار بکری: تاریخ الخمیس، ۲: ۴۳؛ (۳۰) المقریزی: الامتاع، ص ۳۰۹].

([محمد حمید اللہ [و ادارہ]])

خَیبر، دَرّہ: مغربی پاکستان اور افغانستان ⊛ کے درمیان شمالی راستہ، جو کابل سے پشاور کو جاتا ہے اور تقریباً تینتیس میل لمبا ہے۔ اس کا وسطی حصہ ۳۴ درجے ۶ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۱ درجے ۵ دقیقے طول بلد مشرق پر واقع ہے۔ [تاریخی اور عسکری اہمیت کے اعتبار سے یہ دنیا کا اہم ترین درّہ ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد اقوام یہاں سے گزر کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں۔ یہ ایک پیچ و خم کھاتی ہوئی تنگ سی گھاٹی ہے، جس کے دونوں جانب ۶۰۰ سے ۱۰۰۰ فٹ بلند پہاڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پشاور سے دس میل کے فاصلے پر شروع ہو کر یہ درّہ تینتیس میل تک مسلسل چلا گیا ہے اور حدود افغانستان میں لوئی ڈکّہ کی وادی میں ختم ہو جاتا ہے۔ پشاور سے سات میل مغرب میں رنجیت سنگھ [رک بہ پنجاب] کے سپہ سالار ہری سنگھ نلوا نے قلعۂ جمرود تعمیر کرایا تھا، جس سے تین میل آگے دفعۃً چڑھائی شروع ہو جاتی ہے اور پھر قلعۂ علی مسجد تک سطح بتدریج بلند ہوتی گئی ہے۔ علی مسجد (۳۱۷۴ فٹ

بلند) سے پانچ میل تک بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک تنگ گھاٹی ہے، جس کی چوڑائی کہیں بھی دو سو گز سے زیادہ نہیں۔ موضع زنتارہ کے قریب ایک بڑا قلعہ موجود ہے، جس کی دیواریں کچی اور برج بلند ہیں۔ یہاں سے کم و بیش ایک میل تک وادی چوڑی ہوتی چلی گئی ہے اور دونوں طرف قلعے، دیہات اور زیر کاشت اراضی کے قطعات نظر آتے ہیں۔ علی مسجد سے دس میل کے فاصلے پر لنڈی کوتل (۳،۵۱۸ فٹ بلند) کا قلعہ اور چھاؤنی واقع ہے۔ یہ درے کا بلند ترین مقام اور ایک اہم منڈی ہے۔ یہاں موسم گرما میں درجۂ حرارت ۴۷ء۸ درجے سینٹی گریڈ (=۱۱۸ درجے فارن ہائیٹ) تک پہنچ جاتا ہے۔ لنڈی کوتل سے شنواریوں کے علاقے سے گزر کر لنڈی خانہ پہنچتے ہیں، جہاں سے ایک اور گھاٹی شروع ہوتی ہے۔ لنڈی کوتل سے ۶ میل دور طورخم کے مقام پر یہ درہ افغانستان کو جاتا ہے۔ خیبر اور اس کے گرد و نواح میں زیادہ تر افریدی (رکّ باں) آباد ہیں۔

پانچویں صدی ق م میں ایران کے شاہنشاہ داریوش اعظم نے کابل فتح کرنے کے بعد درۂ خیبر کے راستے ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ [دو صدی بعد سکندر اعظم کا حملہ ہوا]۔ سکندر خود تو دریائے کابل کو عبور کرکے وادی کنہار اور وہاں سے باجور اور سوات میں داخل ہوا، لیکن اس نے اپنی فوج کے ایک حصے کو ہفستیون Hephaestion اور پرڈیکس Perdiccas کی قیادت میں درۂ خیبر کے راستے روانہ کیا۔ [اشوک کے عہد میں موریا سلطنت کی عملداری میں افغانستان بھی شامل تھا، چنانچہ خیبر کے علاقے میں بھی بدھ مت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس مذہب کے کئی آثار آج بھی یہاں نظر آتے ہیں، مثلاً کافر کوٹ، شوپلا ستوپا (=خیبر ٹوپ) اور علی مسجد کے قریب ایک ستوپا۔ ایک دو صدی تک یہاں یونانی، باختری نسل کے لوگوں کی متعدد ریاستیں قائم رہیں۔ عہد اسلامی میں ہندوستان پر حملے کے لیے یہ راستہ کئی بار استعمال ہوا]۔ محمود غزنوی کا گزر اس درے سے صرف ایک بار ہوا، جب وہ جے پال سے مقابلہ کرنے کے لیے وادی پشاور میں آیا تھا۔ امیر تیمور ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کرتے وقت اور ۱۳۹۹ء میں واپس جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا۔ ۱۵۲۵ء میں بابر نے بھی اسی راستے سے ہندوستان پر یلغار کی۔ ہمایوں کابل پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی سلطنت کی بازیابی کی خاطر اسی درے سے ہندوستان واپس آیا تھا۔ اکبر اور اس کے جانشین پنجاب سے کابل جانے کے لیے برابر یہ راستہ استعمال کرتے رہے۔ جلال آباد کا قلعہ پہلی بار ہمایوں نے تعمیر کرایا، مگر اس کا نام [جلال الدین محمد] اکبر کے نام پر پڑا۔ اس درے پر عہد مغلیہ ہی سے افریدیوں کا قبضہ رہا ہے، جو فطرۃً آزادی پسند ہیں اور بیرونی مداخلت کو سخت نا پسند کرتے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں جب اس علاقے میں فرقۂ روشنیہ [رکّ باں] کو فروغ حاصل ہونے لگا تو افریدی، یوسف زئی اور دوسرے قبائل کے بعض لوگوں نے بھی روشنیہ عقائد اختیار کر لیے۔ اکبر کے چھوٹے بھائی اور کابل کے حاکم مرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد ۱۵۸۶ء میں راجا مان سنگھ نے شہنشاہ کی طرف سے کابل پر قبضہ کرنے کے لیے چڑھائی کی اور اسے بھی اسی درے سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک ایسی مہم تھی جو بڑی دشواری سے سر ہوئی اور فرقۂ روشنیہ کو دبانے اور قابو میں لانے کے لیے بہت خونریزی سے کام لینا پڑا، اس پر روپیہ بھی بہت صرف ہوا۔ ۱۶۷۲ء میں قبائل نے کابل کے صوبے دار محمد امین خان اورنگ زیبی پر درۂ خیبر میں حملہ کرکے اس کی چالیس ہزار فوج تباہ کر دی اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرنے کے علاوہ شاہی خزانے اور ہاتھیوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

نادر شاہ نے کابل کے مغل صوبے دار ناصر خان پر حملہ کرنے کے لیے اس درے سے گزرنا چاہا تو قبائلیوں نے اس کا مقابلہ کیا، مگر وہ اپنے

رسالے سمیت بازار پہنچ گیا اور ناصر خاں پر آناً فاناً حملہ کرکے اسے جمرود کے قریب شکست دی۔ نادر شاہ کے بعد پنجاب پر حملہ کرتے وقت احمد شاہ دُرّانی اور (اس کے پوتے) شاہ زمان نے بھی کئی بار اس درے کو عبور کیا۔ [انیسویں صدی کے اوائل میں رنجیت سنگھ کی حدودِ سلطنت جمرود تک پہنچ گئیں۔ دوست محمد خاں، امیر کابل، نے جمرود کے قریب سکھوں کو شکست بھی دی تھی۔ بہرحال اس علاقے کے قبائلیوں کو نظم و نسق کا پابند رکھنا ہمیشہ سے بڑا کٹھن مسئلہ رہا ہے].

برطانوی حکومت نے پہلی بار اس درے کو ۱۸۳۹ء میں استعمال کیا [جب کرنل کلاڈ ویڈ Claud Wade شہزادۂ تیمور کو پشاور کے راستے کابل لے کر گیا تھا، درۂ خیبر میں انگریزی فوج کو متعدد بار سخت تباہی اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ افغانستان کے خلاف پہلی جنگ میں قبائلیوں سے اس کی کئی بار جھڑپیں ہوئیں۔ ۱۸۷۸ء میں سرنیول چیمبرلین Naville Chamberlane کے سفارتی وفد کو علی مسجد کے قریب روک لیا گیا، جس کے شاخسانے میں دوسری جنگ افغانستان چھڑ گئی۔ اس کا خاتمہ صلح نامۂ گندمک (۱۸۷۹ء) پر ہوا، جس کی رو سے درے کی دیکھ بھال اور قبائلی علاقے کا نظم و نسق برطانوی حکومت کے سپرد ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں افریدیوں نے ایک بار پھر درے پر قبضہ کر لیا اور انگریزی فوج کئی ماہ کی جد و جہد کے بعد اپنے قدم دوبارہ جما سکی۔ اس کے بعد یہاں تجربہ کار پولیٹکل افسر مقرر کیے گئے اور ان کی مدد کے لیے خیبر رائفلز کے نام سے افریدیوں کی ایک فوج انگریز افسروں کی ماتحتی میں تشکیل ہوئی۔ تیسری جنگ افغانستان (۱۹۱۹ء) کے بعد یہ فوج توڑ دی گئی اور اس کی جگہ مقامی خاصہ داروں نے لے لی، جو حکومت سے تنخواہ پاتے تھے، لیکن اپنے لیے اسلحہ وغیرہ انھیں خود ھی مہیا کرنا پڑتا تھا۔ قبائلی علاقے (خیبر ایجنسی) کے نظم و نسق کا سربراہ پولیٹیکل ایجنٹ ہوتا تھا]۔ یہ انتظام بھی مکمل طور پر قابل اطمینان نہ رہا، تاہم سابقہ انتظامات سے بہرصورت بہتر تھا.

[۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد درۂ خیبر اور اس کے نواحی علاقے میں بڑی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ برطانوی حکومت نے یہاں جابجا چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں اور "فارورڈ پالیسی" (Forward Policy) کے پیش نظر وقتاً فوقتاً ان کے علاقوں میں جارحانہ اقدامات کرتی رہتی تھی۔ اس رویے کے باعث پٹھانوں نے ہمیشہ انگریزوں کو اپنا دشمن سمجھا؛ چنانچہ انھیں جب بھی موقع ملتا، ان کی چھاؤنیوں اور فوجی قافلوں پر حملہ آور ہوتے رہتے۔ آزادی کے بعد حکومت پاکستان نے ایک طرف تو قبائلیوں پر کلّی اعتماد کرکے انگریزی دور کی ان تمام فوجوں کو واپس بلا لیا جو قبائلیوں پر بندوقیں تانیں کھڑی رہتی تھیں، دوسری طرف قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان منتخب کرنے کے لیے انھیں حق رائے دہی دے کر پاکستان کے دوسرے شہریوں کے مساوی درجہ دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبائلیوں نے بھی نہ صرف پاکستانی علاقوں پر حملے کرنا ترک کر دیے، بلکہ پاکستان کی حفاظت پر کمربستہ ہو گئے۔ انھوں نے رضاکارانہ طور پر پاکستان سے اظہار وفاداری کیا اور اس کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھا، یہاں تک کہ وہ کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے سربکف ہو کر لڑے (۱۹۴۸ء) اور جب افغانستان نے یہاں شورش پیدا کرنا چاھی تو اس کی تخریبی کارروائیوں کا سدّ باب کرنے میں حکومت سے پورا تعاون کیا (۱۹۶۰ء).

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے خیبر ایجنسی کی آبادی ۳۰۱۳۱۹ اور اس کا رقبہ ۹۹۵ مربع میل ہے۔ اس علاقے میں صحت اور تعلیم کا معیار روز بروز بلند ہو رہا ہے اور تجارتی سرگرمیاں فروغ پا رہی

ہیں ۔ لنڈی کوتل کو اب ایک بڑی پُر رونق تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے]۔

مآخذ : (۱) الطبری، طبع ڈخویہ؛ (۲) میر خواند: روضۃ الصفا؛ (۳) منہاج سراج : طبقات ناصری، مترجمہ Raverty؛ (۴) شرف الدین یزدی : ظفر نامہ؛ (۵) بابر : بابر نامہ، طبع Beveridge، سلسلۂ یادگار گب، ج ۱، بمدد اشاریہ؛ (۶) ابوالفضل : اکبر نامہ؛ (۷) جہانگیر : تزوک جہانگیری، ترجمۂ Rogers، طبع Beveridge، لنڈن ۱۹۰۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۸) عبدالحمید لاہوری : پادشاہ نامہ؛ (۹) خافی (خوافی) خان : منتخب اللباب، طبع کبیرالدین احمد، نیز طبع T.W. Haig، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) N. Manucci : *Storia do Mogor*، مترجمۂ Irvine؛ (۱۱) *Imperial Gazetteer*؛ (۱۲) *The Cambridge History of India*، ج ۱؛ [(۱۳) *Encyclopaedia Britannica*، طبع ۱۹۶۹ء، ج ۱۰، بذیل مادّہ؛ (۱۴) *Pakistan Year Book 1969*، کراچی ۱۹۶۹ء؛ (۱۵) میر عبدالصمد خان : خوشحال و اقبال، طبع پشاور؛ (۱۶) سید ہاشمی فرید آبادی : تاریخ پاکستان و بھارت، مطبوعۂ کراچی]۔

(T.W. Haig [و ادارہ])

٭ **خیر آباد** : [بھارت میں اُتّر پردیش کے] ضلع سیتاپور کا ایک قصبہ ہے، جس کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۱۳،۷۷۴ تھی۔ پہلے اسے بہت اہمیت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے اسے خیرا نامی ایک پاسی نے گیارھویں صدی میں آباد کیا تھا، لیکن اغلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک پرانے شہر کو، جو اس جگہ واقع تھا، اس نام سے موسوم کیا ہو۔ قدیم شہر کا نام مساچھترا Masachchatra بتایا جاتا ہے۔ یہ قدیم زمانے کا ایک متبرک مقام تھا۔ یہاں بہت سے مندر اور مسجدیں پائی جاتی ہیں، جن میں سے بعض اکبر [رک بآں] کے زمانے کی ہیں۔ ۱۸۹۹ء سے یہاں میونسپلٹی قائم ہے۔ سیتاپور کی اہمیت بڑھ جانے سے یہاں کی تجارت کو نقصان پہنچا، مگر پھر بھی روزانہ منڈی لگتی رہی اور چھوٹے پیمانے پر سوتی کپڑے چھاپنے کی صنعت نے بھی فروغ پایا۔

اکبر کے زمانے میں خیر آباد کی سرکار میں ۲۲ محال یا پرگنے تھے، مگر اب ان میں سے بعض کھیری اور ہردوئی کے اضلاع میں شامل ہیں۔ اس پرگنے میں ملک کا جنوبی حصہ، جو گونڈ اور زریان ندیوں کے درمیان واقع ہے، شامل تھا۔ شمال میں اس کی حد بندی ہرگرام سے ہوتی ہے : مشرق میں لکڑپور اور بسوان سے، مغرب میں سیتاپور اور رام کوٹ سے، جنوب میں مجھریٹھا سے اور جنوب مشرق میں پیرنگر سے۔ پورا جنوبی نصف پرگنہ اونچی سطح زمین پر واقع ہے، جس کی مٹی زرخیز ہے۔ یہاں ندی نالوں کے ذریعے کھیتوں کی آبیاری ہوتی ہے، جس کی وجہ سے عمدہ قسم کے گیہوں کی فصل تیار ہوتی ہے۔ سڑک کے شمال میں سیتاپور سے خیر آباد تک اور خیر آباد سے بسوان تک زمین نشیبی ہے۔ مٹی زیادہ سخت ہے۔ بہت سی جھیلوں اور ندی نالوں کی وجہ سے وہاں سیلاب آ جاتا ہے۔ بہرحال عام طور پر کاشت کی حالت زیادہ اچھی نہیں، زیادہ تر کاشتکار کسانوں کے زیریں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے پاس خاصی بڑی اراضی ہے، لیکن مویشیوں کی حالت ابتر ہے۔ بہت سے زمیندار حد درجہ مقروض ہیں۔ آبپاشی کے باقاعدہ ذرائع کم ہیں۔

[خیر آباد عہد اسلامی میں علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کا مدرسۂ قدیمہ فرخ سیر کے عہد میں حاجی صفت اللہ محدث (م ۱۱۵۷ھ) نے قائم کیا تھا، جسے ان کے بعد ان کے بیٹے مولوی احمد اللہ نے جاری رکھا۔ علما کے ایک سلسلے کو خیر آباد سے نسبت حاصل ہے۔ اس کے مؤسس فرنگی محل کے نامور عالم ملّا کمال الدین کے مشہور شاگرد ملّا محمد اعظم فاروقی سندیلوی (م ۱۰۹۸ھ) تھے۔ اس سلسلے کی ایک ممتاز شخصیت مولانا فضل امام خیر آبادی (م ۱۲۴۴ھ)، صاحب آمد نامہ، دہلی کے صدرالصدور تھے۔ ان کے بیٹے مولانا فضل حق معقولات کے بڑے عالم تھے؛ انھوں نے فلسفے

میں ہدیۂ سعیدیہ اور شرح ہدایة الحکمة وغیرہ کتابیں تالیف کیں۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب میں انھیں گرفتار کرکے انڈمان [رک بآں] بھیج دیا گیا، جہاں ۱۲۷۸ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ ان کے تلامذہ میں سے: (۱) ان کے بیٹے مولانا عبدالحق نے رام پور میں (۲) مولانا برکات احمد نے ٹونک میں اور (۳) مولانا ہدایت اللہ نے جونپور کے مدرسۂ شیخ امام بخش میں علم و فضل کی مجلسیں آراستہ کیں۔ خیرآباد اپنی ادبی سرگرمیوں کے باعث بھی مشہور رہا ہے۔ یہاں کے ایک اردو شاعر ریاض خیرآبادی نے "خمریات" میں بہت ممتاز مقام پیدا کیا].

مآخذ: (۱) H.R. Nevill: *District Gazetteer of the United Provinces of Agra and Oudh*، ۳۰ : ۱۲۵ و ۱۲۶؛ (۲) Hunter: *Imperial Gazetteer*، ۱۵ : ۲۰۲؛ (۳) سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۲۲، ۲۳؛ (۴) انتظام اللہ شہابی: تاریخ ملت، ۱۱ : ۱۸۱، ۲۶۴؛ (۵) میر غلام علی آزاد بلگرامی: مآثرالکرام، ۱ : ۳۰۱].

(ہدایت حسین [و ادارہ])

* **خیرُ اللہ إفنَدی:** ایک اہم ترکی مؤرخ۔ قسطنطینیہ میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا، جو ۱۶۰ سال سے لگاتار سلاطین کی ملازمت سے وابستہ رہا تھا؛ باپ کا نام عبدالحق افندی (م ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳-۱۸۵۴ء) اپنے زمانے کا بہت مشہور شخص تھا۔ یہ (عبدالحق افندی) ایک عالم دین اور طبیب تھا؛ اسے تین بار رئیس الاطباء مقرر کیا گیا۔ ۱۲۶۹ھ سے اسے رئیس العلما کا اعزازی خطاب حاصل رہا۔ خیراللہ نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر ایک فقیہ کی زندگی اختیار کی۔ سب سے پہلے وہ سمرنا کا "مُلّا" (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں) مقرر ہوا، بعد میں اس نے سائنس، طب اور تعلیم کے محکموں کی طرف رجوع کیا۔ ۱۲۶۵ھ میں وہ مجلس تعلیم کا، پھر مجلس زراعت کا رکن اور "انجمن دانش" کا دوسرا صدر مقرر ہوا۔ اس کے بعد بہت سے علمی اداروں کا صدر مقرر ہوا اور نوتشکیل یافتہ وزارت تعلیم میں اعلٰی عہدوں پر فائز رہا۔ طب کے مدرسے کا بہت دنوں صدر رہا۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں اسے سفیر بنا کر تہران بھیجا گیا، جہاں وہ اچانک ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں انتقال کر گیا۔

اس کے بیٹوں کے نام عبدالحق حامد (جو ترکیۂ جدید کا بہت اہم شاعر اور ڈراما نویس ہے) اور عبدالخالق نصوحی ہیں۔ ان دونوں نے سفیر اور ایلچی کی حیثیت سے ملک کی خدمات سرانجام دی ہیں۔

خیراللہ نے متعدد تاریخی، جغرافیائی، طبی، سائنسی اور زراعت سے متعلق کتابیں تصنیف کیں؛ مؤخرالذکر زیادہ تر ترجموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے بعض طبع بھی ہوئیں، جیسے مسائل حکمت، بیت دہقانی، اوریہ سیاحت نامہ سی، یعنی یورپ کا سیاحت نامہ؛ مگر اس کی شہرت اور اہمیت تاریخ نویسی کی بدولت ہے۔ وقائع مصریہ کے علاوہ اس نے ایک تاریخ بھی لکھی، جس کے لیے اس نے بہت وسیع پیمانے پر اہتمام کیا۔ یہ دولت عثمانیہ کی تاریخ ہے، جس کا نام "دولت عالیۂ عثمانیۂ تاریخی" ہے۔ یہ اس زمانے میں لکھی گئی جب کہ ملک کے مؤرخ احمد جودت [رک بآں] نے ایک تاریخ بارہ جلدوں میں مرتب کی تھی، جس میں ۱۷۷۴ء سے ۱۸۲۶ء تک کا زمانہ آ جاتا ہے۔

خیر اللہ افندی کا مقصد بظاہر پوری تاریخ ترکیہ کو ایک مسلسل تصنیف کی صورت میں مرتب کرنا تھا۔ یہ پہلا ترکی مؤرخ ہے جس نے یہ امر پیش نظر رکھ کر کہ ترکیہ کی تاریخ کو دنیا کی تاریخ میں کیا حیثیت حاصل ہے، تحقیق کی اور ایک جامع تاریخ مرتب کر دی۔ یہ دوسرے عثمانی مؤرخین کی تاریخوں سے مختلف تھی جو اپنے آپ کو صرف ترکی ذرائع، حالات اور واقعات تک ہی محدود رکھتے تھے۔ گویا یہ پہلا شخص تھا جو کسی حد تک ایک تاریخ عمومی، یعنی تاریخ عالم لکھنے میں کامیاب ہوا۔ von Hammer-

Purgstall کی *Geschichte des osmanischen Reiches* کے سوا، اس نے جو مصادر استعمال کیے، وہ تقریباً سب فرانسیسی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ خارجی یا غیر ترکی ناموں کو اس طرح استعمال کرتا ہے جس طرح ان کا فرانسیسی زبان میں تلفظ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسے ترکی ماخذ بھی استعمال کرتا ہے جنھیں اس سے پہلے کسی اور نے استعمال نہیں کیا تھا.

اس تاریخ کا مقدمہ جامع ہے، جس میں سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی تاریخ دی ہے، جو عثمان اول کے زمانے سے پہلے کی ہے۔ اس کے بعد کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ ہر ایک سلطان کے عہد کے لیے ایک جلد مختص کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم عصر مسلمان اور عیسائی حکمرانوں کے حالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ دوسرے ابتدائی مؤرخین کے غیر سہل اسلوب کے مقابلے میں اس کی زبان سادہ اور قابل فہم ہے۔ اس کی تاریخ بھی اس کے پیش رو مؤرخین کے مقابلے میں قابل تعریف حد تک ممتاز ہے۔ خیراللہ کے ہاں بھی، دوسرے مسلم مؤرخین کی طرح تعصب بالکل نہیں پایا جاتا اور نہ مسلم اقوام کے تمدن اور حالات کے متعلق ہی کسی مذہبی نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس کی تاریخ کی کل پندرہ جلدیں ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء تا ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) شائع ہوئیں، جو عثمان اول کے عہد سے احمد اول (۱۶۰۳ - ۱۶۱۷ء) کے زمانے تک کے حالات سے متعلق ہیں۔ بعد کی تاریخ لکھنے کے لیے اسے زندگی نے مہلت نہ دی۔ پھر علی شوق نے جو "دیوان احکام عدلیہ" میں ناظر تھا، یہ تاریخ مکمل کرنے کی کوشش کی، جس کا بمشکل نصف حصہ ہی خیراللہ لکھ پایا تھا، مگر صرف تین مزید جلدیں ۱۶ تا ۱۸ (۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء تا ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء) شائع ہوئیں۔ ان سے یہ تاریخ سلطان ابراہیم (۱۶۳۹ء تا ۱۶۴۸ء) کے زمانے تک پہنچ گئی.

مآخذ: (۱) خود خیراللہ کی تاریخ، ۱: ۲ و ۱۶؛ ۳: (۲) احمد رفعت: الروضة العزيزية، قسطنطینیہ ۱۲۸۲ھ، ص ۱۸۱ و ۲۰۰؛ (۳) جمال الدین: عثمانلی تاریخ و مؤرخ لری، قسطنطینیہ ۱۳۱۳، ص ۲۰۵؛ (۴) سامی: قاموس الاعلام، ۳: ۲۰۴۲؛ (۵) ثریّا: سجل عثمانی، ۲: ۳۱۹؛ (۶) v. Hammer-Purgstall: *Bericht über die zu Konstantinopel in Druck erscheinende Geschichte des osmanischen Reiches von Chairullah Efendi*، در *S B. Ak. Wien*، Phil. hist Klasse، ۱۲: ۵۴۳؛ (۷) O. von Schlechta-Wssehrd: *Ausführl. Bericht über die in Konstantinopel erschienenen orientalischen Werke*، *S.B. Ak. Wien*، ۱۳: ۷۷، عدد ۲۹۹؛ ۱۷: ۱۹۹، عدد ۳۰۸؛ ۲۰: ۳۹۱، عدد ۳۰۹؛ ۲۶: ۳۴۳، عدد ۳۹۹.

(TH. MENZEL)

خَیرپُور : پاکستان کے صوبۂ سندھ کا ایک شہر اور اسی نام کی قسمت (رقبہ ۲،۲۹۳ مربع میل؛ آبادی ۱۹۶۱ء میں ۳۱۳۴۷۱۲) اور ضلع (رقبہ ۶،۰۱۸ مربع میل؛ آبادی ۱۹۶۱ء میں ۳۴۷۲۱۳۷) کا صدر مقام۔ مغربی پاکستان میں ریاستوں کے ادغام (رک بہ پاکستان) سے پہلے یہ خیرپور (میرس) کا دارالحکومت تھا۔ اس ریاست کی تاریخ کا آغاز ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء میں ہوتا ہے جب کلہوڑہ خاندان کے خاتمے کے بعد تالپور بر سر اقتدار آئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تالپور قبیلے کا مورث اعلٰی تالہ (طلحہ ؟) حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی اولاد میں سے تھا، جو دسویں صدی ہجری میں بلوچستان آیا اور سو ڈیڑھ سو برس میں اس قبیلے کے افراد نے وسط سندھ میں اپنی کئی بستیاں بسا لیں۔ ان کے تین سرداروں نے کلہوڑوں کی حکومت کا تختہ الٹ کر سندھ کو آپس میں تقسیم کر لیا اور میر فتح علی خان نے حیدرآباد (سندھ) میں، میر ٹھارا خان نے میرپور خاص میں اور میر سہراب خان نے خیرپور میں اپنا صدر مقام قائم کر لیا۔ یہ حکمران عصری تاریخوں

میں "میران سندھ" کے نام سے موسوم ہیں ۔ ریاست خیرپور کی حدود ابتدا میں خیرپور کے شہر اور اس کے مضافات پر مشتمل تھیں، لیکن سہراب خان نے انھیں شمال میں کاشمور، مشرق میں جیسلمیر اور مغرب میں گنداوا تک وسعت دی ۔

سندھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظر مدت سے لگی ہوئی تھی ۔ ۱۸۰۹ء میں میران سندھ نے کمپنی کو دریاے سندھ کے راستے اپنا مال تجارت گزارنے کی اجازت دی تھی، اور انگریزوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ سندھ میں کسی قسم کی فوجی کارروائی نہیں کریں گے، نہ یہاں فوجی ساز و سامان لائیں گے؛ پھر ۱۸۳۲ء میں ایک اور معاہدے کی رو سے قرار پایا تھا کہ فریقین ایک دوسرے کے علاقے پر لالچ کی نظر نہیں ڈالیں گے، لیکن اس قول و قرار کے باوجود ۱۸۳۸ء میں جب افغانستان پر فوج کشی ہوئی تو کمپنی کا انگریزی لشکر سندھ سے جبرًا گزرا اور کئی شہروں پر اس نے قبضہ کر لیا ۔ ۱۸۴۳ء میں وائسراے ایلن برا نے چارلس نیپئر کو مختار کار بنا کر سندھ بھیجا جس نے سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے میران سندھ کے سامنے نہایت ناواجب مطالبات پیش کر دیے ۔ حیدرآباد اور میرپور کے حکمرانوں نے اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے ہتیار اٹھا لیے، لیکن میر علی مراد، والی خیرپور انگریزوں کا معاون بن گیا ۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۳ء میں میانی اور دبو کے معرکوں میں دور مار توپوں کی مدد سے میروں کی فوج کو تہس نہس کر دیا گیا ۔ سندھ کو کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا گیا ۔ خیرپور کی ریاست حکومت بمبئی کے زیر حفاظت قائم رہی، تاہم اس کے کچھ علاقے چھانٹ لیے گئے ۔ ریاست خیرپور کا رقبہ ۵۸۸۹ سریع میل اور ۱۹۴۱ء میں اس کی آبادی ۳۰۵۷۸۷ تھی ۔

شہر خیرپور دریاے سندھ سے ۱۰ میل مشرق میں ایک نہر کے کنارے آباد ہے ۔ اس کا ریلوے سٹیشن کوٹری ہے جو روہڑی برانچ پر سکھر سے ۲۰ میل جنوب میں واقع ہے ۔ ۱۹۴۱ء میں اس کی آبادی ۱۸۵۱۰ تھی ۔ یہاں کی صنعتوں میں پارچہ بافی، قالین بافی، اسلحہ سازی اور زیورات سازی قابل ذکر ہیں ۔ یہ تیل کے بیج کی بڑی منڈی ہے ۔

مآخذ: (۱) E.A. Langley: *Narrative of a Resident at the Court of Mir Ali Murad*، لنڈن ۱۸۶۰ء؛ (۲) *Sind Gazetteer*، ۱۸۷۶ء؛ (۳) *Imperial Gazetteer of India*، ۱۹۰۸ تا ۱۹۰۹ء؛ (۳) سید ہاشمی فریدآبادی: تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، کراچی ۱۹۵۳ء، ۲: ۸۱ ببعد، ۲۵۱ ببعد؛ (۴) *Pakistan Year Book 1969*، کراچی ۱۹۶۹ء؛ (۵) وو، طبع لائڈن، بار اول، بذیل مادہ.

[ادارہ]

* **خیرالدین (بربروسہ)**: [=باربروس، باربروسہ]، مشہور ترکی امیر البحر اور الجیریا کا بیگلربیگی [رک بان] (=بیلربای، بیلربے) اور اوروج [رک بان] کا بھائی تھا ۔ ہائیڈو Haedo کے بیان کے خلاف یہ وہ شخص ہے جس کا ذکر بربروسہ، باربروسا Barberousse، Barbarossa، اور باربروس Aenobarbus کے لقب سے فرانسیسی دربار کی متعلقہ کارروائیوں اور کاغذات میں آیا ہے ۔ اس کی پیدائش متلین Metellin میں ۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء کے قریب ہوئی ۔ شروع میں اس نے اپنے بھائی کے ماتحت بحری مہموں میں شرکت کر کے بہادری اور ہوشمندی کے کارناموں میں بہت نام پیدا کیا ۔ جب اوروج نے تلمسان کے خلاف حملہ کیا تو اس نے اپنے بھائی کو الجزائر [رک بان] کا گورنر بنا دیا، جہاں اس نے تھوڑے ہی دن پہلے قبضہ کیا تھا ۔ جب اوروج کی موت کی خبر آئی تو خیرالدین کو اس کے ساتھیوں نے اتفاق راے سے اوروج کا جانشین چن لیا، مگر فوراً ہی ایسے سخت نازک صورتِ حال سے دو چار ہونا پڑا ۔ شرشال اور تنیس (Ténès) کے شہروں میں بغاوت ہو گئی ۔ کوکو (Koko)

کے بادشاہ ابن القاضی کے قبائل Kabyls نے ساتھ چھوڑ دیا۔ تلمسان کے حکمران ابو حمو نے شلف کی وادی پر حملہ کر دیا اور بالآخر الجزائر والوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اتنے مخالفین سے بیک وقت نپٹنا بربروسہ کی فوج کے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے اس نے قسطنطنیہ کے سلطان سلیم سے مدد طلب کی اور اس نے یہ وعدہ کیا کہ جو ملک اس کے بھائی نے فتح کیے ہیں، ان کی طرف سے سلطان کو عہد وفاداری یا حلف اطاعت پیش کیا جائے گا اور خراج بھی ادا کیا جائے گا۔ سلطان نے اسی زمانے (۱۵۱۷ء - ۱۵۱۸ء) میں مصر فتح کیا تھا اور اب اس نے اپنی حکومت کا حلقۂ اثر بحر روم کے ساحل تک پھیلانے کے لیے یہ موقع غنیمت سمجھا۔ اس نے خیرالدین کا حلف اطاعت (عہد وفاداری) قبول کیا اور اسے پاشا اور بیگلربیگی کے اعزاز سے نوازا [ترک بہ بیگ اور بیگلربیگی] اور الجزائر کی طرف دو ہزار فوج اور توپ خانہ بھیجا اور ایسے رضاکاروں کو بھرتی کرنے کی اجازت دی جن کو اس نے ینی چری [ترک بآں] جیسے حقوق اور رعایتیں عطا کیں۔ اس طرح سے بربروسہ کے ماتحت چار ہزار ترک (یا اہل الشرق) آ گئے اور یہ الجزائر کی فوج یا اوجق odjak کہلانے۔

اس کمک کے آنے سے خیرالدین کو ان خطروں کا مقابلہ کرنے کا موقع مل گیا جو اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ الجزائر والوں کی ایک سازش، جس میں انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ اہل قبائل کے ساتھ مل کر بحری بیڑے کو آگ لگا دیں گے اور ترکوں کو قتل کر ڈالیں گے، ختم کر دی گئی اور اس سازش کے سرغنوں کو قتل کر کے ان کے سر پاشا کے محل کے دروازوں پر لٹکا دیے گئے۔ ہسپانوی فوج جو اوگوڈی مون کیڈ Ugode Moncade کے ماتحت تھی، پسپا کر دی گئی۔ حرّش (الحرّاش) کے دہانے پر جو عیسائی اتر آئے تھے، انھوں نے کدیۃ الصابون کی بلندیوں پر اپنے قدم جما لیے اور شہر پر گولے برسانے لگے۔ بربروسہ نے انھیں کمین گاہوں سے باہر نکالنے کی غرض سے ان کے ساحل والے جہازوں پر حملہ کر کے مجبور کر دیا کہ وہ لنگر اٹھا لیں (۱۵۱۹ء)۔ اس کے برعکس مشرق میں قسمت نے اس کا بہت کم ساتھ دیا۔ ایک تونسی فوج الجزائر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بربروسہ نے ارض قبائل میں، جو فلِسّت اُمّلّیل Flissat Umellil کے علاقے میں تھا، ان کا مقابلہ کیا۔ جنگ کے دوران میں سلطان کوکو Kūko کو خفیہ طور پر حفصی سلطان نے ساتھ ملا لیا اور وہ ترکوں کا ساتھ چھوڑ کر ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا جس سے ترکوں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ بربروسہ کے لیے الجزائر واپس آنے کا راستہ مسدود تھا، اس لیے اس نے جیجل [ترک بآں] میں پناہ لی۔ اس اثنا میں قبائلیوں نے متیجہ کو تباہ کر کے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور ادھر شرشال اور تِنِس نے بھی بغاوت کر دی (۱۵۲۰ء)۔

جیجل میں پناہ لینے کے بعد خیرالدین فوج کو پھر سے ترتیب دینے لگا اور وسائل قوت جمع کرنا شروع کیے۔ ساتھ ہی بحری مہموں کا آغاز از سر نو کر دیا؛ اور ۱۵۲۰ سے ۱۵۲۵ء تک بحر روم کے مغربی ساحل کی آبادی پر ترکتازی کر کے بہت سی دولت حاصل کی۔ بہت سے مہم باز بھی اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس قابل ہو گیا کہ کولو (۱۵۲۱ء میں)، بونہ (۱۵۲۲ء میں) اور قسطنطینیہ پر قبضہ کر لے۔ اس نے قبائل صغرٰی کے باشندوں کی مدد بھی حاصل کر لی، جو بنو عباس کے سردار عبدالعزیز کی بدولت میسر آئی۔ یہ کوکو Kūko کے سلطان کا مدِّمقابل تھا۔ اس طرح ۱۵۲۵ء میں وہ القاضی کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے کے قابل ہو گیا۔ القاضی وادی بگدورا (بغدورہ) Wādi Bugdura میں شکست کھا کر اور پھر درۂ بنو عائشہ پر بھی شکست خوردہ ہو کر خود اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ متیجہ اور

الجزائر پر ترکوں نے پھر سے قبضہ کر لیا۔ تینس اور شرشال کے باغی سردار قتل کر دیے گئے اور قسنطینہ کے باشندوں کو، جنھوں نے ۱۵۲۰ء میں اپنے قائد کو شہر بدر کر دیا تھا اور ترکی قلعہ بند فوج کو قتل کر ڈالا تھا، بہت سخت سزائیں دی گئیں؛ بالآخر حسین نے، جو القاضی کا جانشین ہوا، اطاعت اختیار کر لی اور سالانہ خراج دینا منظور کر لیا (۱۵۲۸ء)۔

پنون Penon، جو ایک ہسپانوی قلعہ تھا اور الجزائر سے توپ کے گولے کی مار پر ایک چھوٹے سے جزیرے میں تعمیر ہوا تھا، اس پر قبضہ ہو جانے سے ترکی طاقت دوبارہ بحال ہو گئی۔ مئی ۱۵۲۹ء کے شروع میں بربروسہ نے اس قلعے پر بمباری شروع کی۔ قلعہ بند فوج کو ہسپانوی حکومت زیادہ مستحکم نہیں بنا سکی تھی؛ چنانچہ ۲۷ مئی کو اچانک حملہ کر کے اسے مسخر کر لیا گیا۔ اس کے اندر صرف پچیس غیرمجروح مدافعین باقی بچے تھے۔ خیرالدین نے محافظِ قلعہ ڈان مارٹن ڈی وارگاز Don Martin de Vargas کو قتل کرا دیا اور پنون کی بیرونی دیواروں کو گرا کر زمین کے برابر کرا دیا۔ اس کے ملبے سے ایک گودی بنا کر جزیرے کو سطح زمین سے ملا دیا گیا۔ اس گودی کے باعث مغربی ہواؤں سے حفاظت ہو گئی اور بحری مہموں پر جانے والوں کو موقع ملا کہ اپنے جہازوں کو محفوظ جگہ پر ٹھیرا سکیں؛ ورنہ اس سے پہلے خراب موسم میں ان کو اپنے جہازوں کو ساحل سمندر پر کھینچ کر لانا پڑتا تھا۔ اس سے الجزائر کی بندرگاہ بن گئی جو بربری کے بحری بیڑے کے لیے پشت پناہ بننے کا کام دیتی تھی۔ خیرالدین کی اس نئی کامیابی سے بوکھلا کر ہسپانویوں نے شرشال پر قبضے کے ذریعے ساحل پر اترنے کی جگہ حاصل کرنا چاہی، مگر اس حملے میں جو کہ اینڈریاز ڈوریا Andreas Doria نے کیا تھا، انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا (۱۵۳۱ء)۔

اب الجزائر میں قطعی طور پر قدم جمانے کے بعد بربروسہ نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے ینی چری کے ساتھ ساتھ، جن کی گستاخی اور حکم عدولی نے ان کو خطرناک بنا دیا تھا، ایسے سپاہی بھرتی کرنے کی کوشش کی، جو ذاتی طور پر اس سے عقیدت رکھتے ہوں اور اس کے زیر اثر بھی ہوں۔ اس نے پانسو نومسلموں کا ایک حفاظتی دستہ قائم کیا جو زیادہ تر ہسپانویوں پر مشتمل تھا۔ سات ہزار سے آٹھ ہزار کی تعداد تک یونانی اور البانی سپاہی بھرتی کیے۔ قبائلیوں کو بھی اس میں شامل کیا اور اس نئی فوج اور توپچیوں کی قیادت و کمان پرانے ساتھیوں کو سونپی، جو "رئیس" کہلاتے تھے۔ اس طرح اس نے اپنے لیے یہ موقع نکالا کہ تونس کے خلاف فوج کشی کر سکے جہاں کے باشندوں کے ساتھ وہ بہت دنوں سے خفیہ سازباز کر رہا تھا۔ اس شہر پر قبضہ کر کے وہ ہسپانویوں کی چالوں کو پہلے سے معلوم کرنا چاہتا تھا تاکہ افریقہ کے تمام مشرقی ساحلوں پر اقتدار حاصل کر سکے۔ بربروسہ نے اپنی ساری تدابیر سلطان کو بتا دی تھیں، چنانچہ اس نے بربروسہ کو ضروری اختیارات دے دیے اور امدادی فوج بھی روانہ کر دی۔ الجزائر میں حسن آغا کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے بربروسہ خود تونس میں داخل ہوا اور حلق الوادی La Goulette پر قبضہ کر لیا (۱۶ اگست ۱۵۳۴ء)، پھر یہاں سے آگے بڑھا۔ مولای حسن نے بربروسہ کو روکنے کی کوشش کی، مگر ایک جنگ میں جو الجزیرہ کے دروازے کے پاس ہوئی تھی اسے شکست کھا کر بھاگنا پڑا (۱۸ اگست)۔ ترکوں نے تونس میں داخل ہو کر شہر کو فتح کر لیا۔ باقی ملک نے بغیر کسی مزاحمت کے ہتیار ڈال دیے۔

بربروسہ کی یہ کامیابی بہت ہی تھوڑے دنوں تک رہی۔ جون ۱۵۳۵ء میں چارلس پنجم تونس کے ساحل پر نمودار ہوا۔ ۱۴ جولائی کو ہسپانویوں نے حلق الوادی La Goulette فتح کر لیا اور ۲۰ جولائی کو تونس کے مالک بن گئے۔ عیسائی غلام، جن کا قتل

عام کرنے سے خیرالدین نے انکار کر دیا تھا، اپنی زنجیریں توڑ کر حملہ‌آوروں میں شامل ہو گئے۔ دشمنوں کے ترغے سے بچنے کے لیے بیگریکی بونہ کی طرف بھاگ گیا، یہاں اسے اپنا وہ بحری بیڑا مل گیا جسے اس نے یہ خبر سن کر وہاں بھیج دیا تھا کہ ہسپانوی حملہ ہونے والا ہے۔ یہاں سے وہ جزائر بلیار کو چل دیا۔ اس نے ماھون کو تباہ کر دیا اور چھے ہزار نبدی اور بہت زیادہ مال غنیمت لے کر الجزائر واپس آیا۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد سلطان سلیمان کی طلبی پر خیرالدین کو قسطنطینیہ جانا پڑا۔ سلطان نے اسے ۱۵۳۳ء میں قپودان پاشا بنا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ چارلس پنجم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف جو بحری جنگ ہونے والی ہے، اس کا محاذ اس کے سپرد کر دے۔ وہ لوٹ کر الجزائر نہیں آیا۔ الجزائر میں اس کی طرف سے اس کے نائب (خلیفہ) کی حکومت تھی۔ قسطنطینیہ میں بربروسہ نئے کام میں بڑا منہمک رہا۔ اس نے ترکی بحری بیڑے کو پھر سے ترتیب دیا، اس میں اضافہ بھی کیا اور بحری جنگ میں خود ذاتی طور پر سرگرمی سے حصہ لیا۔ ۱۵۳۷ء میں اس نے اپولیا Apulia کے ساحلی علاقے کو تباہ کیا، پھر اچانک حملہ کرکے برنڈزی Brindisi (اٹلی) کو مسخر کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے کورفو Corfu کے محاصرے میں حصہ لیا، مگر اس پر قبضہ نہ کر سکا، البتہ اس نے بحر ایجہ میں مقبوضات بندقیہ کی طرف توجہ کی اور ڈوڈیکانیز Dodecanese کے جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ اگلے سال اس نے سکیاتوس Sciatos، سکیروس Scyros اور کرپاتوس Carpathos کے جزیروں کو مسخر کرکے مجمع الجزائر Archipelago (جزائر اَرْخَبِیل) کی فتح کو مکمل کیا اور پھر وہ جزیرۂ اِقریطش (Crete) میں اتر آیا، جہاں اس نے دو شہر اور اسّی گاؤں جلا دیے۔ بحر ایونی (Ionian Sea) میں اس نے اینڈریاز ڈوریا Andreas Doria کے مقابلے میں پریویزا Preveza اور سینٹ مورا St. Maura کے مقام پر دو کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۵۳۹ء میں اپنے دو قائدین حسن کرسو اور طرغوت کی مدد سے اس نے کیسٹل نوؤو Castelnuovo پر، جو خلیج کٹارو Cattaro میں واقع ہے، نیز ملوازیا Malvasia اور نوپلیا Navplia پر، جو مورہ Morea میں ہیں، پھر سے قبضہ کر لیا۔ اہل وینس (۔ اہل بندقیہ) نے ہتیار ڈال دیے اور "باب عالی" سے مصالحت کر لی۔

ان کامیابیوں کی وجہ سے بربروسہ کو قسطنطینیہ میں بہت عزت اور رسوخ حاصل ہو گیا۔ سلطان کی دوستی کا شرف حاصل ہونے کے بعد اس نے سلیمان کو یہ ترغیب دی کہ مغربی بحر روم میں جنگ جاری رکھیے؛ ساتھ ہی وہ قطعی طور پر فرانس سے اتحاد قائم کرنے کے حق میں تھا۔ ۱۵۳۴ء سے وہ فرانسس (۔فرنسو) اول سے خط و کتابت کر رہا تھا۔ بغداد کی صلح کے بعد وہ عیسائیت کے بہت بڑے حامی شاہ فرانس کے سفیروں کا رازدار ہو گیا تھا اور سلطان کے دربار میں فرانسیسی پارٹی کا لیڈر بھی بن گیا تھا۔ چارلس پنجم نے اسے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے ساتھ ملا لینے کی کوشش کی اور خفیہ طور پر یہ لالچ دیا کہ وہ اسے ایک مختصر سا خراج لینے کے بعد تمام شمالی افریقہ کا بادشاہ تسلیم کر لے گا۔ بربروسہ نے اگرچہ ظاہر یہ کیا کہ بادشاہ کی تجویز سے اسے اتفاق ہے اور وہ اس کا ساتھ دے گا، مگر فوراً ہی اس نے سلطان کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا۔ چارلس پنجم نے الجزائر میں جو مہم روانہ کی (۱۵۴۱ء) اس کے منحوس اور تباہ کن انجام نے خیرالدین کی عزت کو اور چار چاند لگا دیے۔ اگرچہ اس نے شہر کی مدافعت میں کوئی بھی حصہ نہیں لیا تھا۔

نیس Nice کی صلح (۱۵۳۸ء) کے بعد جنگ و جدل کی حالت، جو رک گئی تھی، پھر فرانسس اول اور چارلس پنجم کے درمیان شروع ہو گئی (۱۵۴۱ء)۔ بربروسہ کو ترکی بحری بیڑے کی قیادت مل گئی اور

اس بیڑے کو فرانسیسیوں (فرانسیسی فوج) سے تعاون کرنا تھا۔ ۱۵۴۳ء میں اس نے اطالوی ساحل پر حملے کیے۔ ریجیو Reggio پر قبضہ کر لیا۔ کلابریا Çalabria کے ساحلوں کو تباہ کیا اور پھر ڈک ڈی انغین Duc d'Enghien سے مارسیلز Marseilles میں جا ملنے کے بعد Nice کا محاصرہ کر لیا۔ ولے فرانچ Ville franche کا شہر، جہاں پر ترک اترے تھے، فتح کرکے اسے تباہ کر دیا گیا۔ Nice پر قبضہ ہو گیا، مگر اس کے قلعے پر قبضہ نہ ہو سکا۔ ڈوریا Doria کے بحری بیڑے کے آ جانے سے اور پھر Marquis del Vasto کی فوج کی مدد ملنے پر ترکوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ ان کے بحری بیڑے کے ایک حصے نے طولون Toulon میں موسم سرما گزارا اور بقیہ بیڑا قطالونیا Cataloniao کے ساحل کی طرف چلا گیا اور وہاں پالاموس Palamos اور روزاس Rosas کو غارت کیا۔ کرسپی Crespy کی صلح (۱۵۴۴ء) کے بعد جنگ ختم ہو گئی اور خیرالدین شرق Levant کو واپس آیا اور راستے میں اس نے تسکنی Tuscany کے جزیروں، ساحلی علاقوں اور نیپلس Naples کے ملک کو غارت کر دیا۔

اس مہم کے بعد بربروسہ قسطنطنیہ واپس جا کر خانہ نشین ہو گیا۔ اس شہر میں اس کی کثیر دولت جمع تھی اور باسفورس کے کنارے کئی محلات بھی اس کی ملکیت تھے۔

۴ جولائی ۱۵۴۶ء کو تریسٹھ برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس مسجد میں جو اس نے بیوک درہ Büyük Dere [رک بہ درہ] میں تعمیر کرائی تھی، سپرد خاک ہوا۔ اس کے وصیت نامے کے مطابق تمام ایسے غلاموں کو، جن کی عمر پندرہ برس سے کم تھی آزاد کر دیا گیا اور بقیہ آٹھ سو غلام اور تیس مسلح جنگی کشتیاں سلطان کو دے دی گئیں۔ اس کی بقیہ دولت اس کے بھتیجے اور بیٹے حسن کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ حسن کی والدہ مغربی عربوں میں سے تھی۔ اس نے تین مختلف موقعوں پر الجزائر کے گورنر کے فرائض انجام دیے تھے [رک بہ حسن پاشا]۔

بربروسہ نہ صرف کامیاب امیر البحر اور ممتاز سپاہی تھا، بلکہ اس میں ایک حد تک ایک مدبر کی صفات بھی موجود تھیں؛ وہ غیر متزلزل قوت ارادی رکھتا تھا، جس کی وجہ سے بڑی سے بڑی دشواری پر بھی قابو پا لیتا تھا جو بلاد بربر میں ایک مستقل حکومت قائم کرنے کے لیے ضروری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ترکی حکومت چونکہ صرف ساحل تک ہی محدود تھی اس لیے اس کا قیام غیر یقینی تھا۔ اس لیے اس نے اندرونی حصوں پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ اس کا حوصلہ اور امنگ یہ تھی کہ ایک بڑی سلطنت کے اندر تمام شمالی افریقہ شامل ہو جائے۔ اگرچہ حالات نے اسے اس منصوبے کے کامیاب ہونے میں مدد نہیں دی، تاہم اس نے اس کام کی تکمیل کر لی جسے اورُوج نے شروع کیا تھا۔ اس لیے اس کو ولایت الجزائر کا صحیح بانی کہا جا سکتا ہے۔

مآخذ: (۱) حاجی خلیفہ: تحفۃ الکبار فی اسفار البحار، قسطنطنیہ ۱۱۴۱ھ، اوراق ۱۵ تا ۲۷، کچھ حصے کا ترجمہ از J. Mitchell: *The History of the maritime Wars of the Turks*، لنڈن ۱۸۳۱ء، ص ۲۸ تا ۶۹؛ (۲) Haëdo: *Topographia e historia general de Argel*، Valladdid ۱۹۱۲ء، فرانسیسی ترجمہ از Berbrugger اور Monnereau، در *Rev. Africaine*، ج ۱۴ و ۱۵؛ (۳) وہی مصنف: *Epitome de los reyes de Argel*، فرانسیسی ترجمہ از H. de Grammont: *Hist. des Rois d' Alger*، در *Rev. Africaine*، ج ۲۴ و ۲۵؛ (۴) E. de la Primaudaie: *Documents inédits sur l'Histoire de l'occupation espagnole en Afrique*، در *Rev. Africaine*، ج ۱۹ و ۲۰ و ۲۱؛ (۵) Ph. de. Sandoval: *Historia de la vida y hechos del emperador Carlos V.*، Antwerp ۱۶۸۱ء؛ (۶)

Sander Rang اور F. Denis : *Fondation de la régence d' Alger, histoire des Barberousses, chronique du XV le Silcle*، پیرس ۱۸۳۷ء؛ غزوات الخیرالدین، عربی تصنیف۔ یہ تصنیف غلطی سے خیرالدین کی طرف منسوب ہے۔ Giovan Luidgi Alcomora نے اس کتاب کا ایک قدیم ہسپانوی زبان سے اطالوی زبان میں ۱۵۷۸ء میں ترجمہ کیا۔ اسے M. Pelaez نے بعنوان ذیل شائع کیا تھا، *La vita e la storia di Ariadino Barbarossa*، Palmermo ۱۸۸۷ء؛ (۷) Hammer : *Hist. de l'empire ottoman*، ج ۵؛ (۸) E. Charriére : *Nègociations de la France dans le Levant*، ج ۱، پیرس ۱۸۴۸ء؛ (۹) Lopez Gomara : *Cronica de los Barbarojas*، در *Memorial historico espan̄al*، ج ۶، میڈرڈ ۱۸۵۳ء؛ (۱۰) Berbrugger : *Le Pen̄on d'Alger*، الجزائر ۱۸۶۰ء؛ (۱۱) H. de Grammont : *Le R'azasuat est-il l'aeuvre de kheïr ed Dine*، Villeneuve sur Lot ۱۸۷۳ء؛ (۱۲) وہی مصنف : *Hist. d'Alger sous la domination turque*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۱۳) Jurien de la Graviéle : *Dorla et Barberoubusse*، پیرس ۱۸۸۶ء؛ (۱۴) G. Medina : *L'expédition de Charles Quint à Tunis. la lègende et la vèritè Rev. Tunisienne*، ج ۱۳؛ (۱۵) S. Lane- Poole : *The Barbary Corsairs*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۱۳ ببعد؛ نیز دیکھیے ماخذ مادۂ الجزائر اور تونس۔

(G. Yver)

* **خیرالدین** : سلطان ولی بایزید ثانی [ترک بان] کے زمانے [(۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء تا ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء)] کا ایک اہم ترکی ماہر فن تعمیر، ترک مؤرخ عام طور سے کسی عہد حکومت کے خدا ترس بانی، مادۂ تاریخ لکھنے والے ادیبوں اور خطّاطوں کا ذکر خوب کرتے ہیں، مگر کسی ماہر فن تعمیر کے سوانح حیات یا اس کے کسی شاہکار کے بارے میں شاذ ہی کچھ لکھتے ہیں؛ اسی وجہ سے خیرالدین کی سرگرمیاں اور اس کے کارنامے پردۂ خفا میں ہیں۔ یہ بات بہر حال یقینی ہے کہ وہ ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ کہا جاتا ہے، وہ فن تعمیر کے مشہور ماہر استاد مراد کا بیٹا ہے۔ اس کا شاہ کار قسطنطینیہ کی مسجد بایزید ہے (۱۵۰۱ اور ۱۵۰۷ء کے درمیان تعمیر ہوئی)، جو اعلٰی فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس کے بارے میں دیکھیے اولیا چلبی: سیاحت نامہ، استانبول ۱۳۱۴ھ، ۱ : ۱۳۲؛ سعد الدین: تاج التواریخ، استانبول ۱۲۷۹ھ، ۲ : ۲۱۱؛ von Hammet : *Constantinopolis undder Bosporos*، پسٹ Pest ۱۸۲۲ء، ۱ : ۳۰۲؛ Skarlatos Byzantios : *Konstantinupolis*، ایتھنز ۱۸۹۰ء، ۱ : ۳۲۱).

خیرالدین کو ترکی فن تعمیر کا اصل بانی سمجھا جاتا ہے؛ اس نے جو کمال حاصل کیا ہے اسے سنان [ترک بان] کے سوا نہ تو کوئی اس کا پیش رو (الیاس بن علی محمد المجنون، موسٰی وغیرہ) حاصل کر سکا اور نہ کوئی اس کے بعد میں آنے والا (م۔ قاسم، کمال الدین) ہی، اس وجہ سے خیرالدین کو عثمانی ترکیہ کا سب سے بڑا ماہر فن تعمیر اور دنیا کا عظیم ترین ماہر فن سمجھا جاتا ہے۔ اس کی اس عظمت کی تصدیق اس کے شاہ کار، یعنی مسجد بایزید سے ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دو نصف گنبدوں میں جو بڑا گنبد بنایا گیا ہے وہ آیا صوفیہ کے نمونے پر ہے، لیکن اس کے نقشے میں جدید اور عمدہ تصور غالب ہے۔ اس عمارت سے مقدس روایات وابستہ ہیں۔

خیرالدین کی بنوائی ہوئی ایک اور مسجد بھی ہے، جس کا نام اس کے نام پر ہے، اور جو بارسق تپسو میں واقع وزیر اعظم سنان پاشا کے مقبرے سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی قبر اس مقبرے کے سامنے ہے۔

مآخذ : (۱) حافظ حسین : حدیقۃ الجوامع، استانبول

۱۲۸۱ھ، ۱ : ۱۳، ۲۰۰ ؛ (۲) محمد ثریا : سجلِ عثمانی، ۲ : ۳۱۳ ؛ (۳) ساعی : تذکرۃ البنیان، استانبول ۱۳۱۵ھ، ص ۵ ؛ (۴) Surlitt : *Die Baukunst Konstantinopels*، برلن ۱۹۱۲ء، ص ۶۳ تا ۷۹ ؛ (۵) E. Diez : *Die Kunst der Islamischen Völker*، برلن ۱۹۱۵ء، ص ۱۳۳ ؛ (۶) Babinger : *Quellen zur Osmanischen Künstlergeschichte, Jahrbuch der Asiatischen Kunst*، لائپزگ ۱۹۲۳ء، ص ۳۸.

(TH. MENZEL)

* **خیرالدین پاشا :** سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانے کا ایک چرکسی الاصل مدبر، مگر اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال تونس [رک بآن] میں گزارے، جہاں وہ اپنی نمایاں قابلیت کی وجہ سے بہت سے اہم عہدوں پر فائز رہا اور بالآخر باش مدیر ہو گیا۔ اس کا بڑا مقصد ترکیہ سے تونس کے قریبی تعلقات پیدا کرنا تھا اور بالآخر سلطان عبدالعزیز کے ایک فرمان کے ذریعے اسے یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ والی تونس صادق پاشا سے جھگڑا ہونے کی وجہ سے، اس نے تونس میں ملازمت ترک کر دی اور پیرس جا کر گوشہ نشین ہو گیا۔ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں سلطان عبدالحمید ثانی نے اسے قسطنطینیہ بلایا اور اسے مجلس اصلاحات مالیہ کا صدر اور بعد میں مجلس مملکت (Council of State) کا صدر مقرر کیا۔ پھر انتہائی مشکلات کے دور میں ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں اسے وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

خیرالدین بہت آزاد خیال تھا اور اس وقت مختلف شعبوں، بالخصوص عدل و انصاف کے انتظامی معاملات میں اصلاحات کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اسے اس نے تقویت دی اور آگے بڑھایا اور وزیر اعظم کے اقتدار کو ممکن حد تک مضبوط کرنے کے لیے کوشش کی، اگرچہ یہ کوشش سلطان عبدالحمید کی مرضی کے خلاف تھی، جو وزیر اعظم کو یلدز کوشکی (قصر شاہی) سے جاری ہونے والے احکام و ہدایات کی تعمیل کے لیے صرف ایک آلۂ کار بنانا چاہتا تھا۔ صرف آٹھ مہینے وزیر اعظم رہنے کے بعد اسے معزول کر دیا گیا۔ وہ قسطنطینیہ میں ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں تقریباً ستّر سال کی عمر میں فوت ہوا اور (قبرستان) ایوب میں دفن ہوا۔ اس کی شہرت یہ تھی کہ وہ قابل اعتماد، نڈر، مستقل مزاج اور آزاد خیال تھا۔ اس نے عربی زبان میں اقوام المسالک فی معرفۃ احوال الممالک کے نام کی ایک کتاب لکھی، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے.

مآخذ : (۱) سامی : قاموس الاعلام، قسطنطینیہ ۱۳۰۸ھ، ۳ : ۲۰۷۳ ؛ (۲) ثریا : سجلّ عثمانی، قسطنطینیہ ۱۳۰۸ھ، ۲ : ۳۱۷ ؛ (۳) عثمان نوری : عبدالحمید ثانی دور سلطنتی، قسطنطینیہ ۱۳۲۷ھ، ۲ : ۵۹۸ ؛ (۴) Sax : *Machtverfall der Türkei*، وی انا ۱۹۰۸ء، ص ۴۸۱۔

(TH. MENZEL)

* **خیرالدین پاشا :** رک بہ چندرہ لی و جندرہ لی Čendereli .

خیوہ : رک بہ خوارزم.

* **الخیّاط :** یحیٰی بن غالب، ابو علی، ایک عرب منجم و ہیئت داں، ماشاءاللہ کا شاگرد، جس کا ذکر اکثر ازمنۂ وسطٰی کے عیسائی مصنفوں نے البوہلی Albohali کے نام سے کیا ہے۔ اس کی پیدائش اور وفات کی صحیح تاریخیں معلوم نہیں مگر وفات کی تاریخ ۲۱۰ھ/۸۲۵ء اور ۲۲۰ھ/۸۳۵ء کے درمیان بتائی جا سکتی ہے۔ اس کی تصنیفات میں سے جو باقی بچی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ کتاب سرّالعمل [الاعمال، الزرکلی] جس میں زیادہ تر ہیئت سے متعلق سوالات بنانے وغیرہ کا طریقہ لکھا ہے (برلن میں ہے)؛ کتاب الموالد [=احکام الموالید] (آکسفرڈ اور قاہرہ میں ہے) کتاب الموالد کا ترجمہ لاطینی زبان میں تیوولی کے رہنے والے افلاطون نے کیا (۱۱۳۶ء)؛ بعد میں جان ہسپالینیس John Hispalensis نے کیا (۱۱۵۳ء)۔

مؤخرالذکر ترجمہ نورن برگ Nürnberg ۱۵۴۶ء میں بعنوان *Albohali Arabis astrologi antiquissimi ac clarissimi de iudiciis nativitatum liber unus antehac non editus. Cum privilegio D. Ioanni Shonero concesso* طبع ہوا: [المسائل فی احکام النجوم فوائد الفلکیۃ]۔ البوہلی کی جگہ ہم مسودوں میں البوہالی الکیہاک Albohali Alghihac، البوآلی الجیت Alboali Alchait، البین ہیت Albenahait وغیرہ بھی پاتے ہیں۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۲۷۶؛ (۲) Steinschneider، در *Biblioth. Mathem.*، ۱۸۹۰ء، سلسلۂ دوم، ۴: ۹۶ تا ۹۷؛ (۳) وستنفلٹ: *Die Übersetzungen arabischer Werke in das latein. Seit dem II. Jahrh.*، ۱۸۷۷ء، ص ۳۱ تا ۳۲؛ (۴) H. Suter، در *Abhandl. Z. Gesch. der mathem. Wissensch.*، ۱۰: ۹ تا ۱۰؛ (۵) براکلمان، ۱: ۲۲۱؛ تکملہ، ۱: ۳۹۳۔

(H. SUTER)

د

⊛* د : (دال)، عربی حروف تہجی کا آٹھواں [فارسی کا دسواں، اردو کا سترھواں اور ھندی کا اٹھارھواں، فرھنگ آصفیہ] حرف، سُریانی (اور کنعانی) حساب جُمّل میں اس کی عددی قیمت چار ہے [دیکھیے ابجد] .

تعریف : "اسے دانتوں اور زبان کے مخرج سے دبا کر نکالا جاتا ہے" عربوں کی نحوی روایات کے مطابق یہ "شَدیدہ مجہورہ" ہے اور "مخرج" کی رو سے "نِطْعِیّہ" ۔ الخلیل کے قول کے مطابق (الزمخشری : مُفَصَّل، بار دوم، طبع J. P. Broch، ص ۱۹۱، س ۱) جو نطق کے نقطے کو "نِطْع" (یا نِطَع) یعنی تالو کے اگلے حصے پر یا اس کے کھلے ہوئے حصے پر رکھتا ہے (ابن یَعیش، ص ۱۳۶، سطر ۱۹) ۔ جدید بولیوں میں اس نطق کا اثر نمایاں نظر آتا ہے (لبنان، شام : M. Braomann : *Materialien*، ص ۹۹؛ H. Fleisch : *Zahl*، در *Musg*، ۲۷ : ۷۸) ۔ ایک دوسری روایت، جو سِیبَوَیْہ کی الکتاب (مطبوعۂ پیرس، ۲ : ۴۵۳، س ۱۳) پر مبنی ہے اور جسے عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس کا مخرج سامنے کے دانتوں کا وسطی حصہ ہے ۔ دال کی آواز کے صوتیاتی تقابلات کے لیے دیکھیے : J. Cantineau : "Esquisse" در *BSL*، (عدد ۱۲۶)، ص ۹۹، بارھواں؛ متضادات کے لیے دیکھیے کتاب، ۱۳۴ .

مختلف ہجے : شمالی مراکش کی پہاڑی بولیوں میں "د" حرف علت کے بعد "ذ" بن جاتا ہے؛ قدیم عربی اور جدید بولیوں میں "د" کے متعدد مشروط ہجے ہیں، دیکھیے J. Cantineau : *Cours*، ص ۳۷ تا ۳۸، ۴۱ تا ۴۲ .

مآخذ : متن میں اور بذیل مادّۂ حروف الہجاء .

(H. Fleisch)

(۲) عربی کے علاوہ جن دوسری زبانوں میں عربی رسم الخط استعمال ہوتا ہے ان میں دال میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اب ان کا ذکر کیا جاتا ہے .

ہند آریائی زبانوں میں دال جیسی آوازوں کے دو سلسلے ہیں، دندانی اور کوزی (جنھیں موردھنیا (Cerebral) یا قُبّی (Cacuminal) یا اس کے ضد کے طور پر لسانی بھی کہتے ہیں [یعنی د اور ڈ]) ۔ مؤخرالذکر کو زبان کی نوک کے نیچے کے حصے سے نکالا جاتا ہے، اس طرح کہ زبان کو الٹا کر کے اس کی نوک کو تالو کے اگلے حصے پر مارتے ہیں جس سے زبان کی مجوف بالائی سطح زبان کے خانے میں ایک اور صدا پیدا کرنے والا خانہ بناتی ہے ۔ مزید برآں ان دونوں آوازوں کے ساتھ سانس بھی شامل ہو سکتا ہے ۔ پشتو اور اردو میں "دندانی" دال کی نمائندگی اصلی "دال" کرتا ہے؛ کوزی کی (جسے انسائیکلوپیڈیا میں "d" لکھتے ہیں) "ڈ" نمائندگی کرتا ہے اور پشتو میں اس کی شکل بدل کر یوں ہو جاتی ہے کہ دال کے نیچے ایک چھوٹا سا دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے (ډ)، اردو میں اس کی شکل (ڈ) ہے، یعنی دال کے اوپر ط ڈالی جاتی ہے ۔ یہ اصل میں "د" تھی ۔ د اور ڈ کے بعد اس کی ایک آواز وہ ہے جو ہ کے ساتھ ملنے سے پیدا ہوتی ہے جیسے دُھول (غبار) اور ڈھول (طبل)۔ اس کے لیے ایسے دو چشمی ھ

کے ساتھ لکھنا چاہیے دھول اور ڈھول نہ کہ دہول اور ڈہول۔

سندھی میں کوزی "دال" کی ترجمانی ڊ کرتی ہے اور "دھ" [جیسے دھول] اور "ڈھ" [جیسے ڈھول] "ڍ" کی صورت میں لکھی جاتی ہے۔ سندھی زبان میں مغربی ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح حروف ساکن کا ایک سلسلہ بھی ہے (ٻ، ڄ، ڏ اور ڳ)؛ ڏ کی ترجمانی ڏ سے ہوتی ہے۔

مآخذ : (۱) *Linguistic Survey of India*، جلد ۱۰ (پشتو)، ۱/۸ (سندھی)، ۱/۹ (اردو)؛ (۲) D.N. Macknezie : *A Standard Pashto*، در *BSOAS*، ۲/۱۲ (۱۹۵۹ء): ۲۳۱ تا ۲۳۵؛ (۳) R.L. Turner : *Cerebralization in Sindhi*، در *JRAS*، ۱۹۲۴ء، ص ۵۵۵ تا ۵۸۴؛ (۴) وہی مصنف : "The Sidnhi recursives ..."، در *BSOS* ۲/۴ (۱۹۲۸ء): ۱۰۰ تا ۳۱۵؛ (۵) محی الدین قادری : *Hindustani Phonetics*، پیرس تاریخ ندارد (۱۹۳۱ء)؛ نیز مقالے پشتو، سندھی، اردو؛ (۶) A. Schaade : *Sibawaihi's Lautlehre*، فہرست؛ (۷) دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، مصر، جولائی ۱۹۶۲ء، ج ۹، بذیل مادہ؛ (۸) البستانی : دائرۃ المعارف، بیروت ۱۸۸۴ء، ۷ : ۵۴۲]۔

(J. BURTON PAGE [و ادارہ])

⊛ **دَابَّة** : (ع، جمع دَوَابّ) کا اشتقاق دب یدب سے ہے جس کے معنی ہیں چیونٹی اور دیگر حیوانات کا زمین پر رینگ کر چلنا، یا آہستہ آہستہ چلنا (لسان، بذیل مادۂ دبب)؛ دَابَّۃ، زمین پر چلنے والے ہر جاندار کو کہتے ہیں، قرآن کریم میں (۲۴ [النور] : ۴۵) ہے کہ اللہ تعالٰی نے ہر دَابَّۃ (زمین پر چلنے والے جاندار) کو پانی سے پیدا کیا ہے، ان میں سے کچھ تو پیٹ کے بل رینگتے ہیں، کچھ دو پاؤں پر چلتے ہیں اور کچھ چار پر۔ نیز فرمایا زمین پر جو بھی جاندار (دابّۃ) ہیں ان سب کا رزق اللہ کے ذمے ہے (۱۱ [ہود] : ۶)، (قب لسان، مادۂ دبب؛ مفردات، ۲ : ۱؛ النہایۃ، ۲ : ۱۰۰)۔ قرآن مجید (۲۷ [النمل] : ۸۲) میں فرمایا : وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ (= جب اللہ کا وعدہ ان لوگوں پر پورا ہونے کو ہوگا تو ہم زمین سے ان کے لیے ایک جانور نکال کھڑا کریں گے جو ان سے باتیں کرے گا، کیونکہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں رکھتے تھے)۔ شاہ عبدالقادر موضح القرآن میں لکھتے ہیں : "قیامت سے پہلے صفا پہاڑ مکّے کا پھٹے گا، اس میں سے ایک جانور نکلے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور سچے ایمان والوں کو اور چھپے منکروں کو نشان دے کر جدا کر دے گا"۔ ہو سکتا ہے کہ دابۃ الارض کے ذریعے یہ دکھلانا مقصود ہو کہ جس چیز کو کفار نے پیغمبروں کے ذریعے نہ مانا، اب ایک جانور کی زبانی ماننے کو تیار ہوں، لیکن اس وقت کی توبہ اور ایمان سودمند نہیں۔ اس سے مراد کافروں کو تنبیہ و توبیخ بھی ہے (المراغی)۔ دابّۃ الارض کا زبان حال یا زبان مقال سے کلام کرنا ان خوارق میں سے ہے جو قرب قیامت کا پتا دیں گے (فی ظلال القرآن)۔

عصر حاضر کے مشہور شامی مفسّر جمال الدین القاسمی نے اس سلسلے میں چند تاویلات پیش کی ہیں : (۱) اس سے مراد دنیا میں کافروں کے مقابلے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و کامرانی ہے۔ وہ کافر اسلام کی بات سننے اور دیکھنے کے لیے بہرے اور اندھے بن گئے ہیں، مسلمانوں کے لشکر جرار کو دیکھ کر اسلام کی حقانیت اور غلبے کا اعتراف کریں گے، ان کا کفر و انکار ان کے لیے عذاب کا باعث بن جائے گا، فلاح و کامرانی اور اصلاح ایمان کی دولت سے حاصل ہوتی ہے اور کفر سے ندامت و خفت اور ناکامی و نامرادی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا؛ (۲) قرب قیامت کے زمانے میں اللہ تعالٰی خاص نوع کا ایک جانور پیدا کرے گا جو کافر انسان کو

زجر و توبیخ کرے گا.

بہرحال دابة الارض کا خروج علامات قرب قیامت میں سے ہے، چونکہ یہ کوائف و احوال عالم غیب کے ہیں اس لیے اس بارے میں قطعی اور حتمی بات صرف خدا کو معلوم ہے] .

یہاں دابہ سے ایک خاص قسم کا جانور مراد ہے جو اس وقت ظاہر ہوگا جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بالکل چھوڑ دیں گے اور دنیا کی حالت اس قدر بگڑ چکی ہوگی کہ اس کے بعد اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی اور یہ قرب قیامت کا وقت ہوگا، اسی لیے حدیث میں دابہ کو قیامت کی دس علامات میں سے ایک علامت کہا گیا ہے (مسلم، ص ۲۲۲۶؛ الطبری، ۲۰ : ۹ ببعد؛ ابن کثیر، ۲۰ : ۹ ببعد؛ تفہیم القرآن، ۳ : ۶۳)، الزمخشری اسے الجسّاسة (=غور سے دیکھنے والا، ٹوہ لگانے والا) کا نام دیتا ہے (الکشاف، ۲ : ۲۸۳؛ نیز قب لسان و تاج بذیل مادۂ دبب؛ النووی : شرح مسلم، ۵ : ۳۲۰) ـ اس جانور کے خروج کی جگہ کے بارے میں مختلف روایات ہیں کہ وہ تہامہ سے نکلے گا یا طائف میں یا مکّے میں صفا و مروہ کے درمیان سے خروج کرے گا (تاج مادۂ دبب؛ روح المعانی، ۲۰ : ۲۳)؛ ابو داؤد (۲ : ۳۳۲ ببعد) کی روایت کے مطابق یہ جانور تین بار ظاہر ہوگا، دو بار تو دور دراز کے علاقوں میں ظاہر ہوگا؛ پہلی بار کے خروج سے اس کا ذکر شہر مکہ تک نہ پہنچ پائے گا، مگر دوسری بار اس کا قصہ لوگوں میں شہرت پا جائے گا اور اس کا ذکر مکے تک بھی پہنچ جائے گا، پھر جب کہ لوگ سب سے زیادہ حرمت والی مسجد (یعنی مسجد حرام) میں ہوں گے اس وقت اچانک دابة الارض لوگوں کو دکھائی دے گا (نیز قب ابن کثیر: تفسیر، ۲۰ : ۱۰).

اللہ تعالٰی اس جانور (دابة) کو اپنی حجت کے طور پر لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا ـ اس کے خروج کے بعد توبہ کا موقع کسی کو نہیں دیا جائے گا ـ مومن اور کافر کے درمیان پیشانیوں سے واضح طور پر امتیاز ہو سکے گا حتّٰی کہ مومن کافر سے کہے گا کہ اے کافر میرا حق ادا کر دے ! اسی طرح کافر بھی مومن کو واضح طور پر پہچان کر اس سے یہی بات کہے گا (لسان و تاج؛ نیز روح المعانی، ۲۰ : ۲۳؛ الکشاف، ۲ : ۳۸۳؛ القرطبی، ۱۳ : ۲۳۶؛ تفسیر ابن کثیر، ۲۰ : ۹ ببعد) ـ اس جانور کے حلیے کے بارے میں بھی مفسروں نے بہت کچھ بیان کیا ہے اور اس کی مختلف علامات کا تعین کیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے الکشاف، ۲ : ۳۸۳؛ روح المعانی، ۲۰ : ۲۳؛ القرطبی، ۱۳ : ۲۳۰) ـ امام ابن کثیر نے اس جانور کے خروج کو اللہ کی آخری حجت اور قیامت کی اولین علامات میں سے ایک علامت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب دابة الارض ظاہر ہوگا تو وہ لوگوں سے کلام کرے گا جسے سب سنیں گے، اور لوگ ان چیزوں کی کوشش کریں گے جو کبھی حاصل نہ ہو سکیں گی یا جن میں بنی آدم کے لیے کوئی فائدہ نہ ہوگا (تفسیر ابن کثیر، ۲۰ : ۹ ببعد؛ نیز دیکھیے روح المعانی، ۲۰ : ۲۱ ببعد) ـ اس قسم کے کسی جانور کا ظہور یا اس کا انسانی زبان میں کلام کرنا اللہ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے، وہ جو چاہے تخلیق کرتا ہے اور جس چیز کو چاہے گویائی کی قوت عطا فرما سکتا ہے، حتّی کہ جانور تو جانور، خدا تو انسان کی آنکھ، کان اور جسم کی کھال تک کو بولنے کی قوت دے گا (تفہیم القرآن، ۳ : ۶۰۵).

مآخذ : (۱) ابن منظور : لسان العرب بذیل مادۂ دبب؛ (۲) الزبیدی : تاج العروس، بذیل مادۂ دبب؛ (۳) ابن الاثیر : النہایة، قاہرہ ۱۳۰۶ھ؛ (۴) مسلم، قاہرہ ۱۹۵۵ء؛ (۵) ابو داؤد، لکھنؤ ۱۳۱۸ھ؛ (۶) القرطبی : الجامع لاحکام القرآن، قاہرہ ۱۹۳۳ء؛ (۷) ابن کثیر : تفسیر، مطبوعہ کراچی بلاتاریخ؛ (۸) الطبری: تفسیر، قاہرہ بلاتاریخ؛

(۹) الزمخشری : الکشاف، قاهره ۱۹۴۶ء؛ (۱۰) الآلوسی : روح المعانی، قاهره بلا تاریخ؛ (۱۱) مودودی : تفهیم القرآن، مطبوعه لاهور ۱۹۶۶ء؛ (۱۲) [مفتاح کنوز السُّنّة، بذیل مادّه]؛ (۱۳) مسلم : الجامع الصحیح، قاهره ۱۹۵۶ء؛ (۱۴) الکرمانی : شرح البخاری، قاهره ۱۹۳۷ء؛ (۱۵) النووی : شرح صحیح مسلم، ۵ : ۲۰۴ ببعد، قاهره بلا تاریخ؛ [(۱۶) المراغی : تفسیر المراغی، بذیل آیت ۸۲، سورة النحل؛ (۱۷) جمال الدین القاسمی : تفسیر القاسمی؛ (۱۸) سید قطب : فی ظلال القرآن؛ (۱۹) امیر علی : تفسیر مواهب الرحمن].

(ظهور احمد اظهر [و اداره])

* **دابِق** : شمالی شام کے علاقهٔ عَزاز میں ایک مقام جو مَنْبِج سے انطاکیه جانے والی سڑک پر (الطبری، ۳ : ۱۱۰۳) اور حلب سے اوپر کی جانب دریاے قُوَیق پر واقع هے۔ اشوریوں کے زمانے میں اس کا نام دیبِکُو Dabequ تها، جو یونانی Dabekon هو گیا۔ یه مقام مَرْج دابق کے اس وسیع میدان کے کنارے پر واقع هے جہاں، امویوں اور عبّاسیوں کے عهد میں، لڑائی برپا هو جانے سے پہلے وه لشکر پڑاؤ ڈالتا تها جو بوزنطی علاقے پر حمله کرنے کے لیے بهیجا جاتا تها۔ اموی خلیفه سلیمان بن عبدالملک کچھ مدت تک دابق میں [اس غرض سے مقیم] رها [که یا تو قُسطُنطینیه کو فتح کر لے یا وهاں کے باشندے جزیه ادا کرنے پر رضامند هو جائیں] صفر ۹۹ھ / ستمبر ۷۱۷ء میں وهیں فوت اور دفن هوا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفه مقرر کیا گیا۔ المسعودی کے بیان کے مطابق عباسیوں نے اس کی قبر کی تحقیر و تذلیل کی؛ لیکن الشابُشْتی کے بیان سے اس کی تردید هوتی هے (کتاب الدیارات، بغداد ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۹)۔

ایوبی عهد میں سیاحوں نے دابق کے قریب جبل بَرصایا پر ایک یادگار عمارت دیکهی، جو مقام داؤد کہلاتی تهی؛ یه مقام آج کل نبی داؤدؑ کے نام سے موسوم هے۔

دابق سب سے زیاده اس فیصله کن جنگ کی وجه سے مشهور هے جو ۱۵ [به تصحیح ۲۵] رجب ۹۲۲ھ / ۲۴ اگست ۱۵۱۶ء کو سلطان کَنصُوه (Kansuh) [به تصحیح قانصوه] الغُوری اور عثمانی سلطان سلیم اول کے درمیان هوئی۔ گوله باری میں عثمانی دشمن کے مقابلے میں برتر ثابت هوے، چنانچه جنگ میں مملوکوں کے سواروں کے رسالے کا بڑا حصه کام آیا اور خود کنصوه [قانصُوه] بهی قتل کر دیا گیا۔ عثمانیوں کی یه فتح ان کے شام اور مصر پر قبضے کا پیش خیمه ثابت هوئی۔

مآخذ : (۱) البلاذری : فتوح، ص ۱۷۱، ۱۸۹؛ (۲) الطبری، بمدد اشاریه؛ (۳) المسعودی : مروج، ۵ : ۲۹۷، ۴۷۱؛ (۴) هروی : کتاب الزیارات، طبع J. Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۶ (ترجمه، ص ۱۱)؛ (۵) ابن العدیم : زبدة، طبع S. Dahan، ۱، دمشق ۱۹۵۱ء : ۱۴، ۵۶، ۵۷، ۶۳، ۶۷؛ (۶) ابن شدّاد : La Description d' Alep، طبع D. Sourdel، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۲۹، ۱۳۸ تا ۱۳۹؛ (۷) یاقوت، ۲ : ۵۱۳؛ (۸) G. Le Strange : *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۶۱، ۴۲۶، ۵۰۳؛ (۹) R. Dussaud : *Topographie historique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۴۶۸، ۴۷۴؛ (۱۰) M. Canard : *Historire de H'amdânides, I*، الجزائر ۱۹۵۱ء، ص ۲۲۵؛ (۱۱) Wellhausen : *Das arabische Reich*، برلن ۱۹۰۲ء، ۱۶۵ ببعد؛ (۱۲) N. Gorga : *Geschichte des osmanischen Reiches*، ۲، گوتها Gotha ۱۹۰۹ء : ۳۳۶؛ (۱۳) D. Ayalon : *Gunpowder and firearms in the Mamluk Kingdom*، لنڈن ۱۹۵۶ء، بمدد اشاریه۔

(D. SOURDEL)

دابُوَیه : (دابوی) گیلان [رک باں] کے خاندان دابویه کا بانی۔ یه قبیله دابویه کے باپ گیل گاوباره (Gilgawbara) کے واسطے سے ساسانی النسل هونے کا

مدعی تھا۔ یہ لوگ قصبۂ فومان [رُکّ بآں] میں رہتے تھے اور عرصۂ دراز تک زردشتی مذہب کے پیرو رہے۔ انھوں نے عربوں سے بار بار مقابلہ کیا، بالآخر اس کے آخری فرمانروا خورشید دوم ۱۴۱ یا ۱۴۲ھ/۷۵۸-۷۶۰ء کو، عباسیوں کے طاقتور لشکر کے مقابلے کی تاب نہ لا کر، فرار ہونا پڑا اور دیلم میں آ کر اس نے خودکشی کر لی (الطبری، ۳: ۱۳۹ ببعد) اس کی ایک بیٹی، جس کا نام معلوم نہیں، کی شادی خلیفہ المنصور سے ہوئی۔

اس خاندان کے حکمرانوں کے نام حسب ذیل ہیں: دابویہ ۴۰ھ/۶۶۰-۶۶۱ء تا ۵۶ھ/۶۷۶ء؛ اس کا بھائی خورشید اول ۵۶ھ/۶۷۶ء تا ۹۰ھ/۷۰۹ء؛ اس کا بیٹا فرخان ۹۰ھ/۷۰۹ء تا ۱۰۳ھ/۷۲۱-۷۲۲ء، جس نے اسپہبذ [رُکّ بآں] ("قائد عسکر") کا لقب اختیار کیا اور ۷۱۷ء میں عربوں کو شکست دی؛ اس کا بیٹا داذ بُرز مہر (داذ مہر) ۱۰۳ھ/۷۲۱-۷۲۲ء تا ۱۱۶ھ/۷۳۴ء؛ اس کا بھائی سارویہ (ساروی) ۱۱۶ھ/۷۲۱-۷۲۲ء [بہ تصحیح ۷۳۴ء] میں چند مہینوں کے لیے؛ داذبُرز مہر کا لڑکا خورشید دوم ۱۱۶ھ/۷۳۴ء تا ۱۴۱ یا ۱۴۲ھ/۷۵۸-۷۶۰ء۔

دابویہ کے بھائی باذوسپان (لقب) سے ایک اور شاہی خاندان کا سلسلہ چلا، جس نے رویان [رُکّ بآں] اور اس کے آس پاس کے بعض علاقوں پر حکومت کی۔ ۱۴۵۳ء سے یہ خاندان دو شاخوں میں بٹ گیا؛ ایک کی حکومت ۱۵۶۷ء تک اور دوسری کی حکومت ۱۵۷۶ء تک برقرار رہی۔

مآخذ: (۱) ابن اسفندیار: تاریخ طبرستان، تہران ۱۹۴۲ء (بحوالہ E. G. Browne: *An abridged translation of the history of Tabaristan . . . by . . . Ibn-i-Isfandiyar . . .*، لائڈن اور لنڈن ۱۹۰۵ء، اشاریہ [GMS II]) میں ہو سکی؛ (۲) ظہیر الدین [= ظاہر الدین] المرعشی: *Geschichte von Tabaristan . . . .* طبع Bernhard Dorn، (*Mohammedanische Quellen . . .*، ج ۱)، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۰ء، ص ۳۱۹ ببعد؛ (۳) وہی مصنف، در *Mém. Ac. Imp. St. Pétersbourg*، ۲۳ (۱۸۷۷ء): ۱۰۳؛ (۴) G. Melgunof: *Das südliche Ufer des Kaspischen Meeres . . . .*، ترجمہ از J. Th. Zenker، لائپزگ ۱۸۶۸ء، ص ۳۸ ببعد، شجرہ ہاے خاندان؛ (۵) F. Justi: *Iranisches Namenbuch* (۱۸۹۵ء)، ص ۴۳۳/۴۳۵؛ (۶) E. de Zambaur: *Manuel de généalogie*، بار دوم، Pyrmont ۱۹۵۵ء، ص ۱۸۶ تا ۱۹۰ – سکّے؛ (۷) A. D. Mordtmann، در ZDMG، ۱۹ (۱۸۶۵ء): ۴۸۵؛ ۳۳ (۱۸۷۹ء): ۱۱۰۔

(B. SPULER)

⊛ **داتا گنج بخش:** نام شیخ علی ہُجویری* رحمۃ اللہ علیہ، کنیت ابوالحسن، والد کا نام عثمان ابن علی، یا "بوعلی" (بروے آئین اکبری، ۳: ۲۷۸؛ سفینۃ الاولیاء، ص ۱۶۵)، وطنی نسبت انھوں نے خود "الجُلّابی الغزنوی ثُمّ الہجویری" تحریر کی ہے۔ جلّاب شہر غزنین کا محلّہ اور ہجویر بظاہر بیرونی محلہ یا مضافاتی بستی تھی۔ تاریخ ولادت کسی مأخذ میں نہیں ملتی۔ قرائن نواح ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء کے حق میں ہیں۔ یہ سلطان محمود غزنوی کا عہد (۳۸۸ھ/۹۹۸ء تا ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء)، اور دار السلطنت غزنہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

داتا صاحبؒ کا خاندان علم و تقوٰی سے متّصف تھا۔ ان کے ماموں کا لقب "تاج الاولیاء" تھا۔ جس محلے میں ان کا مزار تھا وہ بھی اسی نام سے معروف ہوا۔ داتا صاحبؒ کے والدین کی آخری آرام گاہیں اسی قبرستان میں ہیں، جن کی زیارت گیارھویں صدی ہجری میں شہزادۂ دارا شکوہ (م ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء) نے کی تھی (سفینۃ، ص ۱۶۵)۔ ایک تازہ شہادت سے معلوم ہوا ہے کہ ان قبور کی اب بھی نشاندہی ہوتی ہے۔

(محمد شفیع لاہوری، مقالات، ص ۱۸۳، لاہور ۱۹۶۰ء)۔ داتا صاحبؒ کے حالات زندگی پانچویں، چھٹی اور ساتویں صدی ھجری کی کسی معلومہ تاریخ یا تذکرے میں نہیں ملتے۔ سب سے پہلے ان کا تذکرہ ہمیں شیخ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات میں ملتا ہے، جو امیر حسن سجزی دہلوی [رک باں] نے کتاب فوائد الفواد کی صورت میں قلمبند کیے تھے۔ پہلی بار ۲۹ ذوالقعدہ ۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء کی ایک مجلس میں مزارات لاہور کا تذکرہ ہوا۔ اسی میں شیخ نظام الدینؒ سے روایت کی گئی ہے کہ ھجویریؒ شیخ حسین زنجانیؒ کے پیر بھائی تھے اور اپنے پیر [ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی] کے حکم سے جس دن لاہور آنے والے تھے اسی دن زنجانی موصوف نے وفات پائی [جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، اس وقت ان کا سر میرے پہلو میں تھا ژوکوفسکی: کشف المحجوب، ص ۲۰۹] اسی حوالے سے یہ روایت ثمرات القدس (تالیف ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء) میں دہرائی گئی ہے، لیکن کچھ آگے حسین زنجانیؒ کو یعقوب زنجانی ملقب بہ صدر دیوان (م ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء) کا بھائی بتایا ہے۔ حسین زنجانی کا مقبرہ لاہور، عقب مصری شاہ میں ہے۔ ان کا سال وفات ۴۰۰ھ یا کچھ بعد بتایا گیا ہے (آئین اکبری، ۳: ۲۷۸)۔ خود داتا صاحبؒ نے اپنے کثیر ممتاز معاصرین میں اُن کا کہیں نام نہیں لیا۔ نفحات الانس اور سفینۃ الاولیاء میں بھی اس بات کا ذکر نہیں آیا۔ یہ روایت الحاق معلوم ہوتی ہے، اگرچہ زمانۂ حال کے تذکروں (مثلاً خزینۃ الاولیاء، ۲: ۲۵۰)، عام معتقدین اور مجاوروں کی زبان پر یہ روایت جاری ہے۔

فوائد الفواد کی ایک اور مجلس (۵ محرم ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) میں نظام الدین اولیاؒ سے روایت ہے کہ "شیخ علی ھجویریؒ نے کتاب کشف المحجوب لکھی۔ اس کے شروع میں اور آگے دو تین جگہ اپنا نام لائے۔ قبل ازیں عربی اشعار کہتے اور نام نہیں لاتے تھے، ایک "جوان مرد" (ن: "ناجوان مرد") نے وہ سب اشعار اپنے نام کر لیے اور مرتے وقت دنیا سے بے ایمان گیا۔ ایک اور قول دوسرے مجموعۂ ملفوظات درر نظامی، کے قلمی نسخے سے نقل کیا گیا ہے کہ "میں نے کشف المحجوب کا تمام و کمال مطالعہ کیا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ اگر کسی کو مرشد نہ ملے تو اسے پڑھنے سے مل جائے گا" (عبدالماجد دریا بادی: تصوّف اسلام، ص ۳۷)۔ ہمارے علم میں صوفیہ کا پہلا اور معتبر تذکرہ، جس میں داتا صاحبؒ کا باقاعدہ ذکر آیا ہے، مُلّا نورالدین جامی کا نفحات الانس ہے جو ۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء کی تالیف ہے۔ اس میں نام، کُنیت اور وطن تو لکھا ہے مگر ولادت اور وفات یا مدفن کا ذکر نہیں آیا۔ [ابوالفضل محمد بن الحسن] ختّلی سے مریدی اور متعدد مشائخ سے استفادہ کرنے کا حال بیان کیا ہے، نیز یہ کہ وہ "کشف المحجوب کے مصنف ہیں، جو تصوف کی مشہور اور معتبر کتابوں میں سے ہے"۔ پھر اسی کتاب سے داتا صاحبؒ کے پانچویں صدی ھجری کے دو واقعات درج کیے گئے ہیں۔ بظاہر جامیؒ کو بھی ان کے متعلق، بجز کشف المحجوب اور کوئی ذریعۂ معلومات نہیں مل سکا؛ دوسرا حوالہ آئین اکبری، ج ۳ میں آتا ہے جس میں پاکستان و ھند کے اڑتالیس منتخب اولیا کا ذکر کیا ہے، داتا صاحبؒ کا نام و نسب بتا کر، ان کے علم و عرفان اور تصنیف کشف المحجوب کی ستائش کی ہے، نیز ان کی خواب گاہ لاہور میں بیان کی ہے، آئین اکبری کے چار سال بعد لعل بیگ بخشی شہزادۂ مراد ابن اکبر بادشاہ نے ثمرات القدس تالیف کی، جس کی ایک منقولہ روایت اوپر بیان ہوئی۔ دیگر حالات نفحات یا کشف ہی سے لیے ہیں، مگر یہ بات کہ داتا صاحبؒ قیام لاہور کے زمانے میں اپنے علم و فضل کے باوجود، بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، نیز وفات کے متعلق دو افسانوی روایتیں مؤلف کا اضافہ ہیں؛ اسی صدی کے وسط

کا زیادہ مشہور تذکرہ سفینۃ الاولیاء ہے، جسے شہزادہ داراشکوہ نے جوان عمری یعنی ۱۰۴۹ھ/ [۱۶۳۹-۱۶۴۰ء] میں مرتب کیا تھا۔ وہ داتا صاحبؒ کے علم و تقوی، طولانی سیر و سیاحت اور ان کی تصانیف منجملہ کشف المحجوب کی تعریف کرتا ہے؛ کشف المحجوب کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ کامل ہدایت کی کتاب ہے، تصوف کی کتابوں میں ایسی گرانمایہ کتاب فارسی میں کبھی نہیں لکھی گئی۔ سفینۃ (ص ۱۶۵) کی یہ زائد روایت کہ داتا صاحبؒ نے غزنیں میں مسجد بنوائی اور اس کی سمت قبلہ پر اعتراض سن کر لوگوں کو ازرہ کرامت کعبۃ اللہ کا مشاہدہ کرا دیا، مقامی روایتوں میں لاہور سے منسوب کی جاتی ہے (خزینۃ الاصفیاء، ۲: ۲۳۹)۔ ان کے مزار کے متعلق داراشکوہ نے لکھا ہے کہ یہ لاہور شہر میں قلعے سے مغرب کی طرف ہے، سال وفات ۴۶۵ھ اور بروایت دیگر ۴۶۴ھ بیان کیا ہے۔ یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "ان کے خوارق و کرامات کی کوئی انتہا نہیں۔ لاہور میں اقامت گزیں ہوے تو شہر کے سبھی باشندے رفتہ رفتہ ان کے معتقد ہوتے گئے جو شب جمعہ کو اس نورانی مقبرے کی زیارت کو جاتے اور اپنی مرادیں پاتے، فقیر بھی ان کے روضۂ منورہ اور (غزنیں میں) ان کے ماموں اور والدین کے مقابر کی زیارت سے مشرف ہوا ہے"۔

متأخر تذکروں کے خاص مأخذ نفحات الانس اور سفینۃ الاولیاء ہی ہیں۔ ان دونوں میں سوانحی حالات بہت مختصر لکھے گئے۔ لامحالہ ہمیں اصل سرچشمے یعنی کشف المحجوب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ بے مثل کتاب غالباً مختلف اوقات میں لکھی گئی، جو متعدد موضوعات پر مشتمل ہے؛ بعض کا ذکر درج ذیل ہے: تمہید، تسمیہ، علم اور تصوف کی حقیقت؛ خلفاے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اولیاے سابقین کا تذکرہ؛ پھر دس ائمۂ صوفیۂ متاخرین، جن میں بعض کتاب کی تصنیف کے وقت زندہ تھے اور چھے وہ ہیں جن سے مصنفؒ خود مستفید ہوئے؛ کتاب کے اس حصے میں ایک طولانی باب (چہاردہم) اپنے عہد کے بارہ فرق صوفیہ پر قلم بند کیا ہے، جن میں دس مقبول اور دو "مردود" یعنی اسلامی عقائد سے ہٹے ہوے تھے؛ آگے چل کر ایک باب (سیزدہم) ممتاز معاصر صوفیہ پر ہے، جس میں علاقہ وار ہر بزرگ کا نام اور مختصر حال دیا ہے۔ ان کی تعداد چالیس ہے۔ ضمناً لکھتے ہیں: "سب کا حال تحریر کرنا ممکن نہیں، صرف خراسان میں تین سو بزرگوں سے ملا۔ ان میں سے ہر ایک صاحب مشرب تھا اور تنہا ساری دنیا کے لیے کافی ہوتا" (ص ۱۳۶)۔ آخری حصہ جو تقریباً ثلث کتاب پر محیط ہے، "کشف حجابات" کے زیر عنوان، گویا مصنفؒ کی اصل تعلیم پر مشتمل ہے۔ اس میں معرفت الٰہی، توحید، ایمان، ارکان اسلام (صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ) فلسفۂ ازدواج، مسئلۂ سماع اور ان کے فروغ پر بڑی عالمانہ بحثیں کی ہیں۔ ایک باب (سی و سوم) میں صوفیہ کی مصطلحات، ان کی اقسام و رموز کی شرح بیان کی گئی ہے؛ کتاب میں منقول عربی اشعار اور مشائخ کے اقوال کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ ایک سو چونتیس احادیث نبوی اور قریب تین چوتھائی قرآن حکیم کی سورتوں سے دو سو چونتیس آیات کریمہ استناداً لائی گئی ہیں (دیکھیے فہارس، مطبوعۂ لینن گراڈ) جو مصنفؒ کے حیرت انگیز، وسیع اور مستحضر علم کی شاہد عادل ہیں۔

کتاب میں اسلامی تصوف کا بہت بلند معیار پیش کیا گیا ہے۔ صوفی کا اشتقاق صفا سے اور اس کی اصل غیر اللہ سے دل کا انقطاع بتاتے اور اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ در حقیقت صوفی کامل ولی ہی کا نام ہے (ص ۲۶)۔ اس میں اولیاے عظام کی کرامات اور خوارق کا بھی ذکر ہے نیز ان کے بیسیوں حکیمانہ اقوال اور نصائح کے ساتھ اوصاف حسنہ، صبر و قناعت، ایثار و سخاوت، ہمت و استغنا، صداقت و اخلاص کی

وہ سچی تابناک مثالیں پیش کی ہیں جو ان بزرگوں کے فضل و شرف کی اصلی بُرھان اور اسلامی تہذیب و اخلاق کی عظمت کی دلیل ہیں۔ مزید برآں مصنف تحقیق پسند تھے اور تحقیق کا بھی بہت بلند مجتہدانہ معیار ان کے پیش نظر تھا۔ پہلے ہی باب میں، جو علم کے وجوب فضیلت پر ہے، زور دیتے ہیں کہ علم کے لیے عمل اور درایت یعنی فہم و تحقیق ضروری ہے اور حضرت اَنَس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استشہاد کرتے ہیں کہ "همّة العلماء الدراية، و همّة السفهاء الرواية"۔ تمثیلات میں اخلاق و الٰہیات کے معارف بکھرے پڑے ہیں، جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ اسی طرح جگہ جگہ نفس انسانی کی وہ کوتاہیاں بھی منظر عام پر لائے ہیں جن تک صرف بزرگان باعمل ہی کی نگاہ پہنچ سکتی ہے، مثلاً اپنے پیر کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ میں ایک بار ان کے ہمراہ آذربیجان کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ دو تین آدمیوں کو دیکھا کہ درویشانہ لباس میں گیہوں کے کھلیان کے قریب دامن پھیلائے کھڑے ہیں کہ زمیندار دانے ڈال دے۔ شیخ کی ان پر نظر پڑی تو یہ آیت کریمہ پڑھی "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى"—الآية (۲ [البقرة]: ۱۶)۔ میں نے کہا استادِ محترم! یہ لوگ اس بےحمیتی میں کس طرح مبتلا ہوئے؟ فرمایا ان کے پیروں کو حرص تھی کہ بہت سے مرید جمع کریں۔ اِن مریدوں کو دنیا جمع کرنے کی حرص ہوگئی۔ اور ایک حرص دوسری سے بہتر نہیں (ص ۴۱، بہ تصحیح، حسب طباعت لین گراڈ، ص ۶۴)۔

کتاب میں دوسرے سوانحی حالات بھی ضمناً آجاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے پہلا مجموعی تأثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصنفؒ کی عمر کا بڑا حصہ سیاحت و سفر میں گزرا، جس کا مقصد علم و معرفت حاصل کرنا تھا۔ محولہ مقامات کے ناموں سے عیاں ہے کہ وہ برصغیر پاکستان و ہند (کم از کم غزنوی مقبوضات، جو تقریباً موجودہ مغربی پاکستان کے برابر تھے)، کرمان، سیستان، شمال میں ترکستان و ماوراء النہر، مغرب میں ایران کے اکثر اقطاع (: خوزستان، طبرستان، آذربیجان، قہستان، فارس)، عراق، شام و فلسطین تک سفر کرتے رہے۔ حرمین شریفین کا ذکر بھی بالواسطہ آیا ہے۔ اس زمانے کی عام مشکلات سفر کے علاوہ، (معلوم ہوتا ہے کہ داتا صاحبؒ اکثر پیادہ سفر کرتے اور حسب ضرورت کسی مسجد یا خانقاہ میں ٹھہر جاتے تھے) ایک جگہ (ص ۲۹۹) لکھتے ہیں مجھے اپنی سیاحتوں میں سب سے زیادہ اذیت و رنج اس بات سے ہوتا تھا کہ جاہل خادم (خانقاہ سے) مجھے کبھی کسی زمیندار کے گھر لے جاتے تھے، کبھی اور کسی کے پاس ٹھہرا دیتے تھے۔ دل میں نیت کر لی تھی کہ کبھی خود مقیم ہوا تو مسافروں سے ایسا سلوک نہ کروں گا۔ "بے ادبوں کی صحبت سے فقط یہی فائدہ ہے کہ ان کی جو بات ناگوار ہو تو تم ویسا نہ کرو"۔ ایک خانقاہ میں پہنچے تو کپڑے پھٹے ہوئے، ہاتھ میں صرف لاٹھی اور چھاگل تھی۔ وہاں کے مقیم صوفیوں نے باسی، پھپھوندی لگی روٹی کھانے کو دی اور خربوزے کے چھلکے ان پر پھینکے (ص ۵۰)۔ ان مثالوں اور متعدد اشارات سے ان کے لباس اور فقر و فاقہ میں زندگی گزارنے کا پتا چلتا ہے۔ ان موضوعات پر کشف میں کئی باب لکھے ہیں، بلکہ فقیروں کی گدڑی اور پیوند لگے کپڑوں پر ایک مستقل کتاب اسرار الخِرق والمؤنات تصنیف کی تھی: ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب وہ عراق میں خوش حال اور مُسرف دنیا داروں کی طرح رہا کرتے تھے۔ لوگ دنیاوی چیزیں (: "حشویۂ دہر") مانگنے آتے اور یہ اُن کی فراہمی کی کوشش کرتے، اسی سلسلے میں قرض کے زیر بار بھی ہوئے، بالآخر کسی بزرگ کی تنبیہ سے آنکھ کھلی اور دل کو "فراغت" میسر آئی (ص ۲۷۱)۔ بظاہر انھوں نے ساری عمر تجرد میں بسر کی۔ کشف المحجوب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان

میں زہد و ترک کا میلان پایا جاتا تھا اور وہ اکثر مجاہدات و ریاضات شاقہ کیا کرتے تھے، جسے اس زمانے کے اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں کی عیش پرستی، حبِّ مال و جاہ، اسراف و تکلّفات کا شدید رد عمل کہا جا سکتا ہے۔

داتا صاحبؒ کا سلسلۂ طریقت تین واسطوں سے سیّد الطائفہ جُنیدؒ بغدادیؒ [رکّ بآں] تک پہنچتا ہے۔ ان کے پیر ابو الفضل محمد بن الحسن الخُتّلیؒ کا وطن دریاے جیحون کا بالائی علاقہ خُتّلان تھا، لیکن جبل لُکّام کے موضع بیت الجن میں جا بسے تھے، جو دمشق کے جنوب مغرب میں اس کے اور بانیاس کے درمیان واقع تھا۔ عارف کامل اور زاہد مرتاض تھے۔ ایک عمر خلوت میں گزاری۔ فقر و استغنا کا یہ حال تھا کہ مدت تک ایک ہی جُبّہ پہنا اور اسی میں پیوند پر پیوند لگاتے رہے (ص ۴۷)۔ ان کا قول تھا کہ الدنیا یومٌ ولنا فیہا صومٌ (دنیا ایک دن کی ہے اور اس میں ہمارا روزہ ہے)۔ ایسی فقیری کے باوصف، داتا صاحبؒ شاہد ہیں کہ ان جیسا با رعب شخص میں نے نہیں دیکھا۔ ان کے کشف و کرامت کے بارہا مشاہدات ہوتے تھے۔ انھیں میں ایک ذاتی واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک دن میں اُنھیں وضو کرا رہا تھا۔ خیال آیا کہ سب کام منشاے خداوندی سے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مردان آزاد کو حصول کرامت کی امید میں پیروں کا غلام کیوں بنا دیا؟ شیخؒ کشفاً میری قلبی واردات سے آگاہ ہو گئے اور فرمایا "اے فرزند! ہر حکم کے لیے سبب ہوا کرتا ہے؛ جب خدا چاہتا ہے کہ ایک عام سپاہی زادہ کو تاج مملکت عطا کرے تو اسے توبہ کرنے اور اپنے کسی مقبول بندے کی خدمت کرنے کی توفیق دیتا ہے کہ وہی خدمت عطاے تاج کا سبب بن جائے۔" معلوم ہوتا ہے بہت عرصہ داتا صاحب سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے اور انتقال (۴۶۰ھ/ ۱۰۶۸ء) کے وقت ان کا سر داتا صاحبؒ کے زانو پر تھا (ص ۱۳۱)۔ ان کے علاوہ بھی داتا صاحب نے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا، جن میں ابو القاسم الجرجانی، القُشیری اور ابو العباس الأشقانی کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ ظاہری علوم کے اساتذہ کا ذکر نہیں کیا، لیکن تفسیر و حدیث کی طرح فقہ اور معقولات میں یقیناً دسترس رکھتے تھے۔ ایک جگہ مسائل فقہ خود پڑھانے کا ذکر کیا ہے (ص ۲۴۵)۔ بعض علمی اور عقلی مناظروں کا بھی ذکر آیا ہے (مثلاً ص ۴۷، ۴۹)۔ ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ غزنین کے کسی مدعی علم و امامت نے لباس میں پیوند لگانے کو بدعت قرار دیا۔ داتا صاحبؒ نے فرمایا ریشم اور زری کے کپڑے جو ملوک جابر سے تم بالحاح مانگ کر لاتے ہو انھیں تو جائز سمجھتے ہو اور جامۂ حلال، جو جامے حلال اور زر حلال سے حاصل کیا گیا ہے، اُسے پہننا بدعت بتاتے ہو (ص ۱۱۵)۔

داتا صاحب اہل سنت اور حنفی تھے؛ ملاحدہ، قرامطہ، باطنیہ اور روافض کی مدلّل تکذیب کرتے تھے (ص ۱۲۱، ۲۰۵ وغیرہ)۔ شیخین رضی اللہ عنہما سے کمال عقیدت کے سلسلے میں یہ امر لائق ذکر ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کو طریقت یا ولایت کا امام مانتے ہیں (ص ۲۳)۔ موزوں طبیعت پائی تھی۔ بیسیوں منتخب عربی اشعار ان کے ذوق لطیف کے گواہ ہیں۔ خود (شاید جوانی میں) شعر کہے اور اپنا دیوان مرتب کیا، جو کوئی چرا کر لے گیا اور اسے اپنے نام سے مشہور کر دیا (ص ۱)۔ کشف المحجوب میں صراحۃً اپنا صرف ایک شعر نقل کیا ہے (ص ۱۹۱)۔ [بعض تذکروں میں ایک پوری غزل ان کے نام سے درج ہے۔] انشا پردازی کا بہترین ثبوت ان کی یہی کتاب ہے، جو نثر فارسی کے ابتدائی دور میں تصنیف ہوئی۔ اس کے علاوہ نو کتابیں تصنیف کیں، جن کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں: [(۱) دیوان؛ (۲) منہاج الدین؛ (۳) اہل صُفّہ؛ (۴) منصور حلاج؛ (۵) رسالۂ اسرار الخرق والمؤنات؛ (۶) کتاب فنا و بقا؛

(۷) کتاب البیان لاهل العیان؛ (۸) بحرالقلوب؛ (۹) الرعایة لحقوق اللہ (فہرست ۴، مطبوعۂ لیننگراڈ؛ مقالات، محمد شفیع لاهوری، ص ۱۸۷؛ سیّد هاشمی: مآثر لاهور، ص ۲، ۹۲)۔ کشف المحجوب کا سلامت رهنا بھی اس کی مقبولیت کی دلیل ہے؛ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے وقت سے اهل نظر اس کے مدّاح چلے آتے هیں۔ قلمی نسخوں میں سب سے قدیم اور نفیس نسخہ ساتویں صدی هجری کا لکھا هوا، محمد شفیع لاهوری کے ذاتی کتاب خانے میں ہے، جو اب لاهور سے طبع هو چکا ہے۔ ایک نسخہ پروفیسر ژوکوفسکی کی ناقدانہ تصحیح، فهارس و اشاریات کے ساتھ لیننگراڈ سے نسخ ثالثہ میں شائع هوا۔ [اسی متن کو مؤسسہ مطبوعاتی امیر کبیر نے تحقیق جدید کے ساتھ ۱۳۳۴ھ ش میں طبع کیا ہے]۔ اردو ترجموں کے علاوہ پروفیسر نکلسن نے کشف المحجوب کا انگریزی میں ترجمہ کیا (سلسلۂ مطبوعات گب، لنڈن ۱۹۱۱ء)، جس سے کتاب کی بین الاقوامی قدر و منزلت ثابت هوتی ہے۔ کشف المحجوب میں داتا صاحب نے وقت اور مقام تصنیف کی تصریح نہیں کی، اگرچہ ایک جملے سے قیاس هوتا ہے کہ لاهور میں تکمیل کی جا رهی تھی (ص ۲۷، دیکھیے ذیل میں)۔ اسی سے داتا صاحبؒ کے لاهور میں ورود اور قیام کا سوال سامنے آتا ہے۔ بعض قرائن سے پتا چلتا ہے کہ شاید وہ کئی بار لاهور آئے۔ آخری قیام اور سال وفات کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں هوتا۔ [جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے داراشکوہ نے ان کا سال وفات ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء لکھا ہے؛ غالباً ملک الشعرا بہار کا ماخذ بھی داراشکوہ کی سفینة الاولیاء ہے؛ نیز دیکھیے بہار: سبک شناسی، ۲، ص ۱۸۷، مطبوعۂ تہران؛ لیکن یہ سال وفات درست معلوم نہیں هوتا، کیونکہ هم جانتے هیں کہ داتا صاحب اپنے استاد امام القشیری (م ۴۶۵ھ) کے جوان معاصرین میں سے تھے (دیکھیے Ethe: *Neupersische Litteratur*، عدد ایس ۳۶۳، G. I. P.، ۱۸۹۶ء-۱۹۰۴ء، مطبوعۂ سٹراس برگ)]۔ کشف میں امام القشیری اور ابوالحسن سالبہ (م ۴۷۲ھ) کے لیے کے ساتھ رحمة اللہ علیہ کا اضافہ کیا گیا ہے، جس سے داتا صاحبؒ کے انتقال ۴۶۵ھ کی عام روایت باطل ٹھیرتی ہے (قب حبیبی: تاریخ وفات داتا گنج بخش۔۔۔، در اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۶۰ء)، [جس میں حبیبی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کشف المحجوب کی تکمیل ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے مابین هوئی، نیز یہ کہ داتا صاحب کی وفات ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے مابین هوئی (دیکھیے مقالات محمد شفیع لاهوری، ص ۱۹۳)۔ محمد شفیع لاهوری کے طبع شدہ نسخے پر بھی داتا صاحب کی تاریخ وفات ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے مابین دی گئی ہے]۔ واضح رہے کہ ۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء تا ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء سلطان ابراهیم ابن مسعود غزنوی کا عهد حکومت تھا۔ اس کے دو بیٹے سیف الدولہ محمود اور علاء الدولہ مسعود ۴۶۹ سے ۴۹۰ھ تک لاهور میں صوبہ دار رہے (مآثر لاهور، ص ۱، ضمیمہ)۔ ان دو ناموں سے بعد کی روایتوں میں بہت التباس هوا، تاهم یہ تسلیم کرنا ممکن ہے کہ داتا صاحبؒ کے مزار کی زیارت سے اولاً علاء الدولہ مسعود مشرف هوا (ضمیمۂ کشف المحجوب، از حبیب اللہ کاتب) اور مقبرہ سلطان ابراهیم نے تیار کرایا (دیکھیے محمد لطیف: *Antiquities of Lahore*، ص ۱۷۷)۔

داتا صاحبؒ کے اتباع یا خلفا کا کوئی سلسلہ آگے نہیں چلا۔ کشف میں شکایت کرتے هیں کہ میری کتابیں غزنین میں رہ گئیں اور میں ("دربلدہ لہانوُر کہ از مضافات ملتان است") ناجنسوں میں پھنسا هوا هوں (ص ۲۷؛ قب مطبوعۂ لیننگراڈ، ص ۱۰۱)۔ انھوں نے عُزلت و گمنامی میں زندگی گزار دی، لیکن ان کے فضل و کمال کا مسلسل اعتراف هوتے رهنا مسلّم ہے اور اهل علم و عرفان کے لیے ان کی یہ بلیغ و دلآویز کتاب ایک جاودانی عطیہ ہے۔ یہ سب اُن کی عظمت اور فیوض جاریہ کے بدیہی شواهد هیں۔

مآخذ: (۱) حسن سجزی دہلوی: فوائد الفواد،

لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۲) الذہبی: تاریخ دُوَل الاسلام، ج ۲، حیدرآباد ۱۳۳۷ھ؛ (۳) نور الدین جامی: نفحات الانس، نولکشور ۱۸۷۳ھ؛ (۴) ابوالفضل: آئین اکبری، ج ۳، نولکشور ۱۸۶۹ء؛ (۵) لعل بیگ، بخشی شہزادۂ مراد بن اکبر بادشاہ: ثمرات القدس (تالیف ۱۰۰۷ء)، قلمی نسخہ مملوکۂ ظفر حسن، کراچی؛ (۶) داراشکوہ بن شاہجہان: سفینۃ الاولیاء، کانپور ۱۸۷۲ء؛ (۷) غلام سرور: خزینۃ الاصفیا (تالیف ۱۲۸۰ھ)، نولکشور ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۳ء؛ (۸) نور احمد: تحقیقات چشتی، لاہور ۱۸۶۵ء؛ (۹) محمد لطیف: *History and antiquities of Lahore*، لاہور ۱۸۹۲ء؛ (۱۰) عبدالماجد: تصوف اسلام، اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ؛ (۱۱) ہاشمی فرید آبادی: مآثر لاہور، لاہور ۱۹۵۶ء؛ (۱۲) عبدالحی حبیبی: تاریخ وفات داتا گنج بخش علی ہجویری غزنوی، در اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۶۰ء؛ (۱۳) محمد شفیع لاہوری: مقالات، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) ظہیر احمد بداؤنی: ظہیر المطلوب، اردو ترجمہ کشف المحجوب، لاہور ۱۹۰۹ء؛ (۱۵) *Revelation of Hidden things*، انگریزی ترجمہ کشف المحجوب، از نکلسن، لندن ۱۹۱۱ء؛ (۱۶) کشف المحجوب، مطبوعہ گلزار ہند سٹیم پریس، لاہور ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء؛ (۱۷) کشف المحجوب، طبع ژوکوفسکی، لینن گراڈ ۱۹۲۶ء؛ (مقالے میں ہر جگہ صفحات کے نشان لاہور کے مذکورۂ بالا مطبوعہ نسخے سے اور بعض حوالے لینن گراڈ کی طباعت سے دیے گئے ہیں)۔

(ہاشمیؒ فرید آبادی)

اَلدَّاخِل: رک بہ عبدالرحمٰن الاول القرطبی۔

دار: (رہنے کی جگہ) گھر۔ "بیت" اور "دار" دونوں لفظوں کا استعمال "گھر" کے لیے بہت عام ہے، لیکن اپنے باریک معانی کی رو سے ان کے خاصے مختلف مفہوم ہیں۔ "بیت" دراصل ایک مسقّف جگہ ہے جہاں آدمی رات بسر کر سکتا ہے۔ "دار" (= بمعنی گھیرنا سے) ایسی کھلی جگہ کو کہتے ہیں جو دیواروں، عمارتوں یا بدویوں کے خیموں سے گھری ہوئی ہو جو کم و بیش ایک دائرے کی شکل میں نصب ہوں۔ "دارۃ" قبائلی پڑاؤ کو کہتے ہیں، جو شمالی افریقہ میں "دُوّار" کے نام سے معروف ہے۔ قدیم ترین زمانے سے مسلمانوں میں ایک مرکزی جگہ کے گرد مکان یا احاطہ بنانے کا رجحان رہا ہے، جہاں چرواہے کا ریوڑ دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہے یا جہاں حضری خاندان اجنبیوں کی مداخلت سے محفوظ رہ سکے۔ زمانہ اسلام کے اوائل میں بنایا ہوا سب سے پہلا قابل ذکر مکان خانۂ خدا ہے، جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے ہجرت کے بعد مدینۂ منورہ میں پہنچ کر تعمیر کیا۔ اس کے بعد وہ مکانات ہیں جو آنحضرتؐ نے اپنے اور اپنے خاندان کے رہنے اور مومنین کے اجتماع کے لیے بنائے۔ ان سب کا ضروری جزو دیواروں سے گھرا ہوا صحن ہے۔ دھوپ سے بچاؤ کا سائبان، جو اصحاب صُفّہ کو محفوظ رکھنے کے لیے بنایا گیا، ایک طرف دیوار کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ دوسرے پہلو کے ساتھ ساتھ حجرے بنائے گئے تھے۔ ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ازواج مطہراتؓ رہتی تھیں اور ان میں بعد میں مزید اضافہ کیا گیا تھا۔

ان حُجروں کے موضوع پر حدیث میں ہمیں دلچسپ تفصیل ملتی ہے۔ صحن میں جانے کے لیے ہر حجرے کے دروازے کے سامنے کھجور کی شاخوں کا ایک سائبان بنا ہوا تھا، جو ضرورت کے وقت اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے پردوں سے بند ہوسکتا تھا۔ حجرے کا یہ بیرونی حصہ، جو "رُواق" کی یاد دلاتا ہے (یعنی وہ اوٹ جو بدویوں کے خیمے کے سامنے لگائی اور ہٹائی جا سکتی تھی۔ اس کے ذریعے بیرونی دنیا سے گھر کا تعلق بھی قائم رہتا تھا اور یہ ڈیوڑھی کا کام بھی دیتی تھی)، مسلمانوں کے مکانات میں یہ طریقہ ہمیشہ برقرار رکھا گیا۔ قابل سکونت کمروں سے گھری ہوئی کھلی مرکزی جگہ کا یہ نظام عرب دنیا سے مختص نہیں بلکہ

یہی ہیئت قدیم رومی مکان کی تھی جس کے ساتھ ایک بڑا سا سائبان ہوتا تھا، اسی طرح کی بناوٹ یونانی مکان کی بھی ہوتی تھی، جو کھڑے پتھروں کے حلقے سے گھرا ہوتا تھا۔ یہ طرز قدیم زمانے میں بحیرۂ روم کے ملکوں نے ضرور اختیار کیا ہوگا، لیکن اس نوع کے گھر کی تعمیر مسلمانوں کی زندگی کا بہترین نقشہ پیش کرتی ہے۔ یہ نقشہ اس تصور سے، جس کی رو سے خاندان میں ایک بزرگ مرد کی حکومت ہو، بہت مطابقت رکھتا ہے اور نہ صرف اس خاندان کے لیے ایک احاطہ بند حلقہ فراہم کرتا ہے بلکہ حجاب کے ضروری وصف کو بھی جو مسلمان کی نجی زندگی میں لازمی ہے، بآسانی پورا کرتا ہے۔ عمارت کی ترتیب، اس کی ترکیب اور بلندی، دونوں میں یہی منشاء جھلکتا ہے۔ ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کی رُوکاروں کی خوش وضعی، زیبائی اور اس پر مزید تکلفات معمار کے لیے بہت قابل توجہ اور مالک مکان کے لیے امارت کی علامت ہوتی ہے۔ اس کے خلاف ایک مسلمان کا مکان، چاہے وہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو باہر سے نہایت متین اور سادہ نظر آتا ہے، یعنی صرف ایک چار دیواری جس میں بھاری بھرکم اور ہمیشہ بند رہنے والا دروازہ اور چند تنگ کھڑکیاں لگی ہوتی ہیں۔ گھر کی اس تعمیر میں سب سے زیادہ توجہ کے قابل گھر کے وسط میں کھلا صحن ہے، جو پورے مکان کا صدر حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہر طرف کی خوش منظر رُوکاریں تعمیر کرنے والے کے لیے بیش بہا اور گوناگوں جمالیاتی موضوع عمل ہیں، لیکن ایسا موضوع جس کی خوبصورتی فقط اس کے مکینوں کے لیے ہوتی ہے.

اگرچہ وہ رسم و رواج جن کی تشکیل اسلام نے کی ہے ان گھروں میں نسبۃً یکسانی کا باعث ہوئے، لیکن ان میں ایک حد تک ان موسمی حالات نے بھی یکسانی پیدا کی جو اکثر ممالک اسلامیہ پر اثر انداز ہیں۔ مسلمان عموماً، جیسا کہ معلوم ہے، ایک طویل مشرقی اور مغربی خطے میں اقامت گزین ہیں جہاں بارش بہت کم، دھوپ سخت تیز اور گرمی شدید ہوتی ہے۔ بارش کی قلت کے باعث ان خشک اور صحرائی علاقوں میں پانی، چاہے وہ جوہڑ کا ہو یا چشمے کا، بڑی قابل قدر چیز سمجھا جاتا ہے، جس کا محلات بلکہ معمولی مکانوں کی آسائش و آرائش میں بھی بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ سخت دھوپ اور شدید موسم گرما سے بچنے کے لیے ایسے تہ خانے تعمیر کیے جاتے ہیں جیسے عراق اور ایران کے "سرادیب" (واحد "سرداب")، یا ایسے کمرے جو خوب ہوادار ہوتے ہیں، لیکن جن میں روشنی مدھم رکھی جاتی ہے، جیسے "ایوان"؛ "ایوان" ایک ایسا کمرہ ہے جس کے تین طرف دیواریں ہوتی ہیں اور چوتھی طرف کا پورا ضلع باہر کے رُخ کھلا ہوتا ہے، جیسے ایک بہت بڑا کُشادہ چھجّا، جس کی سطح چپٹی اور چھت عام طور پر (نیم اُسطوانی) لداؤ کی ہوتی ہے۔ یہ صحن کی طرف اس طرح کُھلا ہوتا ہے کہ اس سے عربی خیمے کی "رواق" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ کمرۂ استقبال کا بھی کام دے سکتا ہے اور یونانی مکان کی ڈیوڑھی (Prostas) سے بھی مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود یہ شاید ایرانی ایجاد ہے۔ ھَتّرا (Hatra الحَضر، عراق) کے ایک پارتھی محل میں (دوسری صدی عیسوی) یہ ایوان اپنی پوری شان و شوکت سے نمایاں ہے۔ آگے چل کر یہ ساسانیوں کے فن تعمیر کا امتیازی جزو بنا۔ اس کی مشہور ترین مثال مدائن کا محل "طاق کسرٰی" ہے، جسے شاھنشاہ انوشیروان (۵۵۱ - ۵۷۹ء) نے تعمیر کرایا تھا۔ عراقی ماہرین تعمیر نے، جو بنو عبّاس کے لیے کام کرتے تھے، "ایوان" کو اپنی یادگار فنی تخلیقات کا ایک لازمی جزو بنا دیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدائن ہی کا محل دیکھ کر اس معمار کو تحریک ہوئی جس نے ۲۲۱ھ/۸۳۶ء میں سامرّا [رک بآں] کے مقام پر المعتصم کے محل کا بڑا "ایوان" بنایا۔ یہ ایک چھوٹے

پیمانے پر ۱۴۷ھ/۷۶۴ء میں بنے ہوئے اُخَیضِر کے محل میں پایا جاتا ہے۔ اس شاہی محل میں عمارات سے گھرے ہوئے آنگن نظر آتے ہیں۔ ایسے دو آنگنوں کے دو ”ایوان“ آمنے سامنے کھلتے ہوئے بنے ہیں اور دونوں کے بازو پر آنگن کے سارے عرض میں ایک برآمدہ بنا ہوا ہے۔ یہ موزوں نقشہ، جس میں ایک دوسرے کے رُوبرُو دو کُشادہ برآمدے، اور دور دیوار کی طرف کھلنے والے ”ایوان“ ہوتے، جو موسم کے مطابق، سرما یا گرما میں، استعمال ہوتے تھے، عراق جدید کے مکانوں میں ہمیشہ برقرار رکھا گیا ہے۔ برآمدہ یا کشادہ کمرہ، جو سہ درے کمانچے کے ذریعے آنگن کی طرف کھلتا ہے، قَرْمَہ کہلاتا ہے۔ ”ایوان“ کے دونوں جانب دو کوٹھریاں (= ”اُوْدَہ“) ہوتی ہیں، جن سے نقشے کی مستطیل شکل قائم رہتی ہے۔ بہر کیف، تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک اس تصور تعمیر نے (کُشادہ پیش دالان، گہرا ”ایوان“ مع بغلی کمروں کے جن کے دروازے پیش دالان میں کھلتے ہیں) مغرب کی طرف حرکت کی اور بحیرۂ روم کے ممالک میں پہنچنا شروع ہو گیا۔ الفُسْطاط (قدیم قاہرہ) کے بعض مکانوں میں، جنھیں عموماً طولونیوں سے منسوب کیا جاتا ہے، ”ایوان“ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آنگن کے گرد، جس کے کسی ایک گوشے سے داخلہ ہوتا ہے، چار دیواری ہوتی ہے اور چاروں اضلاع میں ”ایوان“ ہوتے ہیں، جن میں سے بعض زیادہ چوڑے اور بعض کم چوڑے بلکہ چپٹی سطح کے کشادہ سائبانوں کے مانند ہوتے ہیں۔ کسی ایک ضلع میں تین در کا پیش دالان ہوتا ہے اور اس کے سرے پر وسطی ”ایوان“ اور اس کے ایک جانب حجرے ہیں۔ اس کشادہ پیش دالان اور اس چوڑے ”ایوان“ کا نقشہ T کی شکل کا ہوتا ہے۔ یہ طولونی مکانات جو اُس عہد کی یادگار عمارات کے مانند، اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں، کئی منزلوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں تازہ پانی اندر لانے اور گندہ پانی نکالنے کی نالیوں کا باقاعدہ انتظام ہوتا تھا۔ ان کے آنگنوں کی آرائش حوضوں اور پردوں سے کی جاتی تھی۔ دو مکانوں کے ایک کمرے میں فوارہ بنا ہوا ہوتا تھا، جس کا پانی نہر کے ذریعے آنگن کے حوض میں آتا تھا۔ مستطیل کے چھوٹے پہلوؤں اور دروازے کے سامنے کی طویل دیواروں کے درمیان عموماً فرش زمین کے ہم سطح سائبان نکال دیے جاتے ہیں، جنھیں چھوٹا ایوان کہنا چاہیے۔ ان میں نشست کی چیزیں رکھی جا سکتی ہیں۔

اس سے پیشتر کہ گھریلو فن تعمیر کے ان عناصر کی، جن کے طولونی مکانات مظہر ہیں، مغرب کی جانب منتقلی کا مطالعہ کیا جائے، یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن اصلی میں کس طرح تبدیل ہو چکے ہیں اور ترکوں کے زیر اثر ہیئت بدل جانے کے بعد مصر کی جدید سکونت گاہوں میں اب ان کا کتنا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ ان سکونت گاہوں میں آنگن ابھی تک ایک اہم عنصر ہے، لیکن اب یہ عمارت کے مرکز میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے سامنے ہوتا ہے، جس میں ایک قوسی برآمدے سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ ملاقاتی کا اس جگہ ایک نیچے کمرے (”تخت بوش“) میں استقبال کیا جا سکتا ہے، جو نیچے کی منزل میں جانے کے لیے پوری طرح کھلا ہوتا ہے، یا اوپر کے رُخ اس کمانچے میں جاتا ہے جسے ”مقعد“ کہتے ہیں اور صحن اس کے زیر قدم ہوتا ہے۔ اگر ملاقاتی گھر کے اندر داخل ہو رہا ہے تو اس کا استقبال سلام لیک [=السلام علیکم] سے کیا جائے گا۔ اس کا صدر حصہ ایک بڑا دالان (”مَنْدَرہ“) ہوتا ہے، جس کے وسطی حصے کو، جو آنگن کا بدل ہے، پختہ بنا کر فوارے سے آراستہ کیا جاتا ہے اور اس کے ارد گرد دو یا تین ”ایوان“ یا جیسا کہ اب مقامی بولی میں کہنے لگے ہیں ”لیوان“ ہوتے ہیں۔ ان ”لیوانوں“ پر، جو فرش کی سطح سے بلند بنائے جاتے ہیں، قالین اور (دیوان) بچھائے جاتے ہیں۔ ”حریم“ تو ”سلام علیک“ سے قطعی طور پر جدا ہوتا ہے اور

اس میں ایک دروازے سے، جو انگن میں کھلتا ھے، اور سیڑھیوں سے، اندر جاتے ھیں۔ ”قاعة“، جو اس کا سب سے بڑا کمرہ ھوتا ھے، ”مندرہ“ سے مشابہت رکھتا ھے، اس لیے کہ یہاں بھی وسط میں جگہ چھوڑ دیتے ھیں اور بغلی توسیعات بھی ھوتی ھیں۔ پھر بھی یہ مختلف چیز ھے اور زیادہ واضح طور پر قدیم آنگن سے ماخوذ ھے، کیونکہ وہ دیواریں جو وسطی جگہ کو گھیرے ھوتی ھیں برآمدوں کی سطح تک اونچی ھوتی ھیں اور ان میں ایک قندیل ھوتی ھے جو اندرون خانہ کو روشن کرتی ھے۔

وسطی آنگن والے یہ مکان، ان خصوصیّات کے ساتھ جو ایرانی روایت سے ورثے میں ملیں اور جنھیں بوزنطیوں کی ضروریات خانہ داری کے مطابق ڈھال لیا گیا تھا، جلد ھی بحیرۂ روم کے مسلم ممالک میں رواج پا گئے۔ اس رواج کی شہادتیں قریبی زمانے کی اثری تحقیقات سے ملی ھیں۔ حال ھی میں صبرہ۔ منصوریّہ شہر کی کھدائیوں سے، جسے المنصور فاطمی نے ۳۳۵ھ/۹۴۷ء میں القیروان کے دروازوں کے قریب بسایا تھا، ایک محل برآمد ھوا ھے، جس کی دیواریں مٹی کی ھیں اور کسی زمانے میں گِلی مرصّع کاری سے اس کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ یہاں ھم ایک جوڑے پیش دالان، اور پہلو میں دو کمرے لیے ھوئے اندر کے عریض ایوان کا نقشہ دیکھتے ھیں۔ اس عہد میں (یا ممکن ھے کہ اس سے ذرا پہلے) صنہاجی امیر زیری کا آشیر میں محل، جس کی تاریخ تعمیر تقریباً ۳۲۴ھ/۹۳۵ء ھے، آنگنوں اور ان کمروں کے نہایت صحیح تناسب کی وجہ سے جو ان کے چاروں طرف بنے ھیں جاذب توجّہ ھے۔ اس کے پانچ کمروں میں مسطح بنیاد والے سائبان دروازے کے مقابل کی دیوار سے ملے ھوئے ھیں۔ ان اندرونی کمانچوں کے مقابل باھر کی طرف کے حصے سامنے سے مستطیل رکھے گئے ھیں۔

تقریباً ایک سو سال بعد بربر علاقے میں صنہاجہ کے مقام پر بنو حمّاد کے قلعے کے محل تیار ھوتے نظر آتے ھیں، جن میں سے تین کھود کر نکالے جا چکے ھیں۔ ”دارالبحر“، جو سب سے بڑا ھے، اور جس کا یہ تاریخی نام پانی کی اس وسیع چادر کی بدولت زبان زد ھوا جو سارے وسیع آنگن میں کُلّی طور پر پھیلی ھوئی تھی، اس عظیم تالاؤ کے کنارے پر سرکاری کمرے تھے۔ ایک دوسرے آنگن کے اردگرد عمارات تھیں، جو قیاساً گھریلو استعمال، جیسے گودام اور مہمانوں کے غسل خانے، کے لیے تھیں۔ مسطح بنیاد والے سائبان، جو غالباً ”ایوان“ سے اخذ کیے گئے تھے اور جن سے ساسانی ماھرین تعمیر یقیناً بہت پہلے سے بخوبی واقف تھے، کمروں کی داخلی بناوٹ میں بوقلمونی پیدا کرتے ھیں۔ بنو حمّاد کے ایک اور محل قصرالمنار (قلعۂ قنل) کی کھدائی سے پتا چلتا ھے کہ اس کے وسطی ایوان کی چھت کسی زمانے میں بلاشبہ قبہ نما ھوگی اور اس کے چاروں طرف سائبان ھوں گے یا دیواروں کے اندر کمانچے تعمیر کیے گئے ھوں گے۔ اس طرح کا ایک چلیپائی نقشہ ھم پلرمو میں زِزَہ کی کوشک میں دیکھتے ھیں، جسے نارمن بادشاھوں نے بارھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ ان سائبانوں میں سے ایک میں فوارہ بنا ھے، جس کا پانی کمرے میں سے گذرتی ھوئی ایک نہر میں بہتا ھے، جیسا کہ الفُسطاط کے طولونی مکانات میں، جن کا ذکر پہلے گزر چکا ھے۔

ایشیائی عناصر، جو شمالی افریقہ میں گھریلو فن تعمیر نے اپنا لیے گئے ھیں، آثار سدرتہ (Sedrata) میں دیکھے جا سکتے ھیں۔ یہ صحرا میں ایک شہر ھے، جس کی بنیاد خارجی بربروں نے اوارگلہ (Ouargla) کے جنوب میں رکھی تھی، اور یہ دسویں سے بارھویں صدی عیسوی تک آباد رھا۔ مکانات میں، جو ریت سے برآمد ھوئے ھیں، ایسے کمرے ھیں جو متعدد آنگنوں کے سامنے ھیں۔ ان عمارتوں کے علاوہ، جن میں چیزیں رکھنے

کے گودام ہوتے ہیں مکان میں سرکاری کمرے موجود ہیں، جن کی استرکاری پر کثرت سے نقش و نگار تراشے گئے تھے ۔ ان کی بعض چھتیں محرابی لداؤ کی ہیں، جو دو نیچی برجیوں سے جاملی ہیں ۔ برجیوں کے نیچے گھونگے کی وضع کے توڑے ہیں ۔ بعض کمروں کے آگے برآمدے ہیں، جن کی سہ دریاں الفسطاط کی طرح صحن میں کھلی ہوئی ہیں۔ کمرے کا نقشہ T کی شکل کا بنایا جاتا ہے، جو ایک کشادہ کم عرض کے کمرے اور دیوار کے ساتھ “اِیوان” پر مشتمل ہوتا ہے ۔ ایوان کا رُخ داخلے کی جانب رکھتے ہیں ۔ اس کشادہ کمرے کے دونوں سروں پر محرابی شہ نشین ہوتا ہے ۔

ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ اس قسم کا مکان اپنے ایرانی اور عراقی مرکب عناصر کے ساتھ کب اور کیسے اندلس اور المغرب میں پہنچا ۔ المغرب کے خلفا نے خاص کر تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں بغداد یا سامرّا سے ماخوذ بہت سی طرزیں درآمد کیں اور وہ اندلس میں معروف ہوگئیں ۔ شاید اس طریق سے ہم بعض ان تعمیری عناصر کی تشریح کر سکتے ہیں جن کا انکشاف مرسیہ Murcia کے قصر Castillejo میں ہوا اور جنھیں ابن مردنش (۵۴۱ھ/۱۱۴۷ء تا ۵۶۶ھ/۱۱۷۱ء) سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ اس جگہ ہم کشادہ کمرے دیکھتے ہیں، جن کے سرے پر ایک تنگ حجرہ پیشیں حصے کے عقب میں بنا ہوتا ہے ۔ الدر کا مستطیل صحن باغ کے طرز کا بنایا گیا ہے، جس میں دو روشیں ایک دوسرے کو وسط میں کاٹتی ہیں ۔ یہ ایرانی طرز کا پرتو ہے ۔ اس مستطیل کی چھوٹی سمتوں پر دو آگے کو نکلے ہوئے کوشک ہوتے ہیں، جو روشوں کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ اس قسم کی اقامت گاہ، جو اندلس میں مروج ہوئی، غرناطہ کے ملوک نصریہ کے محل الحمراء میں بے مثل حسن اور فراخی اختیار کر لیتی ہے ۔ یہ معلوم ہے کہ اس شاہی محل کی بڑی بڑی عمارات، جو یوسف اول (۷۳۵ھ/۱۳۳۵ء تا ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء) اور محمد پنجم (۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء تا ۷۹۳ھ/۱۹۳۱ء) کی فنّی تخلیقات ہیں، دو مستطیل صحنوں کے ارد گرد بنی ہوئی ہیں ۔ ان میں سے ایک Patio de los Leones دو روشوں میں، صلیب کی شکل میں، منقسم ہے، جن پر آگے کو نکلے ہوئے دو کوشک چھائے ہوئے ہیں ۔ یہ مستطیل کے چھوٹے پہلوؤں پر بنے ہوئے ہیں، جیسا کہ مرسیہ کے مذکورۂ بالا قصر میں ہے ۔ ان صحنوں کی آرائش میں بھی پانی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ یہ البرقہ (Alberca) کے حوض کو بھرتا اور مشہور “شیروں والے حوض” کے اُوپر سے بہتا ہوا گزرتا ہے ۔ برآمدے اور پیش دالان، جو آنگنوں میں کھلتے ہیں، ایوانات شاہی میں لے جاتے ہیں، مثلاً سفیروں کا شاندار کمرہ، جو برج قمار (Comeres) میں اس پورے احاطے کی خاص امتیازی چیز ہے ۔ کشادہ کمروں کے ہر سرے پر ایک کمالوجہ، ایک بغلی “ایوان” ہے جو آگے کو نکلی ہوئی محراب سے محصور ہے جیسا کہ سدرتہ Sedrata کے مکانوں میں ہے ۔

گلستانی صحنوں کا یہ نقشہ فواروں اور پیالائی روشوں کے ساتھ، جو یقینی طور پر مشرقی معلوم ہوتا ہے، مغرب میں ازمنۂ متوسطہ ہی میں آیا ہوگا ۔ یہ ابھی تک دلکش “ریاض”، پائیں باغ کی صورت میں، جو فاس اور مراکش میں پائے جاتے ہیں، باقی ہے ۔ الجزائری مکان، خصوصاً خاص شہر الجزائر میں، بالکل مختلف ہوتا ہے ۔ اس کا سقیفہ (یا ڈیوڑھی) بڑا لمبا اور اس کے کناروں پر نشستیں بنی ہوتی ہیں ۔ یہاں سے ایک بل کھاتے ہوئے برآمدے یا زینے کے ذریعے صحن میں جاتے ہیں ۔ صحن چار ستونوں پر استادہ نعل نما محرابوں والی غلام گردشوں سے گھرا ہوتا ہے ۔ وسط میں ایک فوارہ چلتا ہے ۔ سب سے زیریں منزل یا اوپر کی منزلوں میں غلام گردشوں کے پیچھے کے کمرے بہت کشادہ مگر ذرا پست ہوتے ہیں ۔ ان کی محدود بلندی چھت کے شہتیروں کے کمزور سہارے کی وجہ سے

ہوتی ہے۔ دروازے کے بالمقابل ایک کمانچہ ہوتا ہے، جس میں دیوان (صوفہ) ہوتا ہے۔ اس میں ہم "ایوان" کی بگڑی ہوئی صورت دیکھ سکتے ہیں، جس کی مثالیں ہمیں عراق میں ملتی ہیں۔ الجزائر میں اس متوسط کمانچے کا ایک اگلا حصہ ہوتا ہے، جسے روکار میں نصب شدہ کڑیوں کا زاویہ بنا کر اس پر ٹکا دیتے ہیں۔ یہ بغیر کسی شک و شبہہ کے مشرقی طرز ہے، جسے اس شہر کے ترک حکمرانوں نے درآمد کیا تھا۔ مضافاتی بنگلوں میں خالی جگہ اتنی محدود نہیں ہوتی، لہٰذا آگے کو نکلا ہوا حصہ غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس حصّے کا فرش سطح زمین کے برابر ہوتا ہے۔ اوپر کی منزل میں یہ ایک مختصر سی نشست گاہ یا جھروکا بن جاتا ہے، جس کے تین طرف دریچے ہوتے ہیں اور وہ اکثر داخلے کی ڈیوڑھی کے اوپر آ جاتا ہے۔ تونسی مکان ذرا مختلف ہوتا ہے۔ اس کے مستطیل صحن کے صرف دو چھوٹے ضلعوں میں غلام گردشیں ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے کمرے T کی شکل کے بنائے جاتے ہیں، جن میں کشادہ کمرہ ("بیت")، بلند ایوان ("قبّو") اور کنارے پر کوٹھریاں ("مقصورہ": جمع: "مقاصر") ہوتی ہیں۔

مآخذ: (۱) Caetani: *Annali dell' Islam*، ۱: ۳۲۹ ببعد، ۳۳۳ ببعد؛ (۲) Creswell: *Early Muslim architecture*، ۱: ۲ تا ۶ و ۲: ۵۲ ببعد؛ (۳) Lowthian Bell: *Palace and mosque of Ukhaidir*، آکسفرڈ ۱۹۱۴ء؛ (۴) Herzfeld: *Die Ausgrabungen von Samara*، برلن ۱۹۲۳ - ۱۹۴۸ء؛ (۵) Viollet: *Un palais musulman du IXe siècle* (*Mémoires de l'Académie des Incriptions*، ۱۹۱۱ء)؛ (۶) Watelin: *Sasanian building* در Pope: *Survey of Persian art*، ۱: ۵۸۵؛ (۷) A. Bahgat و A. Gabriel: *Fouilles d'Al-Foustat*، ۱۹۲۱ء؛ (۸) Pauty: *Les palais et les maisons de l'Egypte musulmane* (فرانسیسی ادارہ در قاہرہ)، ۱۹۳۳ء؛ (۹) مصطفی سلمان زبیس: *Comptes rendus de l' Académie des Inscriptions*، ۱۹۵۲ء، ص ۵۱۲؛ (۱۰) P. Blanchet: *Comptes rendus de l'Académie des Incriptions*، ۱۸۹۸ء، ص ۵۲۰؛ (۱۱) L. Golvin: *Le Maghreb central à l'époque des Sirides*، ۱۹۵۷ء، ص ۱۸۰ ببعد؛ (۱۲) Gallotti: *Le jardin et la maison arabe au Maroc*، ۲ جلدیں، ۱۹۲۶ء؛ (۱۳) Gavault: *Notice sur la bibliothèque-musée d'Alger*، در *RA*، ۱۸۹۴ء؛ (۱۴) G. Marçais: *L'architecture muslomane d'Occident*، ۱۹۵۴ء؛ (۱۵) وہی مصنف: *Salle, antisalle*، در *AIÉO Alger*، ۱۹۵۲ء۔

(G. Marçais)

① **دَارُالْاِسْلَام:** (ع) لفظی ترجمہ اسلام کا گھر یا وطن؛ لیکن فقہاے اسلام کی اصطلاح میں دارالاسلام سے مراد ایک ایسی باقاعدہ منظم ریاست یا ملک ہے جس کا سربراہ مسلمان ہو (جسے امام المسلمین، امام وقت یا صرف الامام بھی کہا جاتا ہے اور جس میں بقول الماوردی (: الاحکام السلطانیۃ، ص ۶ ببعد) سات شرائط یعنی عدالت، علم، سلامت حواس، سلامت اعضاء، اصابت رائے، شجاعت اور قرشیت پائی جائیں، صاحب الدر المختار (۲: ۵۳، ۲۸۶) اسے امامت کبرٰی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان شرائط کے علاوہ اشراف و اعیان کی بیعت اور رعب و دبدبے کے ساتھ رعیت پر احکام اسلام نافذ کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے)، جہاں اسلامی شریعت کے احکام عملی طور پر نافذ ہوں اور جہاں کی رعایا مسلمانوں اور ایسے غیر مسلموں پر مشتمل ہو جو اہل الکتاب یعنی یہود و نصارٰی وغیرہ میں سے ہوں اور بت پرست اور مشرک نہ ہوں (کشاف اصطلاحات الفنون، ۱: ۳۶۶؛ احکام اہل الذمۃ، ۱: ۵ ببعد، ۳۲۶)۔

دارالاسلام یا اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا نے اگر برضا و رغبت اسلامی ریاست کی تشکیل میں حصہ لیا ہو اور دارالاسلام کے دفاع کے لیے اپنے مسلمان

ہم وطنوں کے ساتھ بقائے باھمی کے اصول پر ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کا عہد و پیمان کیا ہو تو شہریت میں ان کے حقوق و فرائض مسلمانوں کے برابر ھوں گے جس طرح کہ عہد نبوت میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان میثاق مدینہ طے پایا تھا، جس کی رو سے مسلمان اور یہودی دارالاسلام (مدینۂ منورہ) کے سب سے پہلے شہری قرار پائے تھے (سیرۃ ابن ھشام، ۲ : ۳۴؛ حمید اللہ : *Muslim Conduct of State*، ص ۹۵؛ احکام اھل الذمۃ، ۱ : ۵، ۳۶۶؛ حمید اللہ : رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیاسی زندگی، ص ۳۲۵ ببعد)؛ لیکن اگر ایسی صورت نہ ھو اور غیر مسلم شوکت اسلام اور مسلمانوں کی عدل گستری سے متاثر ھو کر یا مفتوح قوم کی حیثیت سے اسلامی ریاست کی رعایا ھونا قبول کریں تو انھیں اَھْلُ الذِّمّہ یا ذِمّی [رک بآن] کہا جائے گا اور ان حقوق و فرائض میں اور عامۃ المسلمین کے حقوق و فرائض میں بجز اس کے کچھ فرق نہ ھوگا کہ ذمی شہریوں کے جان و مال کی حفاظت اسلامی ریاست کا فرض ھوگا، لیکن وہ اسلامی ریاست کے دفاع کے فریضے سے مستثنٰی ھوں گے اور اس کے بدلے میں ان کا فرض ھوگا کہ وہ جزیہ [رک بآن] کے ذریعے اسلامی ریاست کی مالی معاونت کریں؛ لیکن بنیادی شہری حقوق (آزادیٔ مذھب، آزادیٔ معاش، آزادیٔ رائے اور حق انصاف وغیرہ) میں ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا (*Muslim Conduct of State*، ص ۹۵؛ الاحکام السلطانیۃ، ص ۵۴).

علامہ ابن القیم نے لکھا ھے کہ جمہور فقہائے اسلام کے نزدیک دارالاسلام وہ جگہ ھے جہاں مسلمان آباد ھوں اور وھاں شریعت اسلامی کے احکام عملی طور پر نافذ ھوں، لیکن اگر احکام اسلام کا اجرا نہ ھو تو وہ جگہ دارالاسلام نہیں کہلائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد مبارک میں دارُالْھِجْرَۃ مدینۂ منورہ دارالاسلام تھا، لیکن جب دوسرے علاقوں کے لوگ اسلام لائے تو وہ بھی بلاد اسلام قرار پائے (احکام اَھل الذِّمّۃ، ۱ : ۵، ۳۶۶)؛ تھانوی (کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۳۶۶) نے فتاوی قاضی خان اور فتاوی عالمگیری وغیرہ کے حوالے سے لکھا ھے کہ جس ملک میں مسلمان رہتے ھوں اور آزاد ھوں اور اس میں اسلام کے احکام میں سے ایک حکم بھی نافذ ھو تو اسے دارالمسلمین کہا جائے، دارالکفر نہ کہا جائے، لیکن فقہا کی اکثریت کا اصرار ھے کہ دارالاسلام صرف احکام شریعت کو نافذ کرنے والی حکومت کی شرط پر قائم ھوتا ھے.

دارالاسلام کے داخلی استحکام اور بیرونی دفاع کے متعلق فقہائے اسلام نے تفصیل سے بحث کی ھے اور اَلسِّیَرُ وَالْجِہَادُ کے ضمن میں مختلف موضوعات پر قیمتی معلومات موجود ھیں؛ اس لیے دارالاسلام میں دشمن کو زیادہ دیر ٹھیرنے اور گھومنے کی اجازت نہیں دی گئی، مثلاً دارالحرب [رک بآن] کا کوئی باشندہ (حَرْبی) اگر اجازت سے اور امان لے کر داخل ھو تو اسے ایک ماہ یا دو ماہ سے زیادہ قیام کی اجازت نہیں، کیونکہ ھو سکتا ھے وہ داخلی حالات معلوم کر کے ملک کے لیے ضرر کا باعث بن جائے، اس لیے اگر ایسا باشندہ زیادہ مدت کے لیے قیام کرنا چاھے تو اسے امام وقت کی طرف سے کہا جائے گا کہ وہ جزیہ ادا کرے، اگر وہ یہ شرط خوشی سے قبول کر لے تو اسے ذمی کا درجہ حاصل ھو جائے گا اور دارالاسلام کے ذمی شہری کی حیثیت سے وہ جزیہ ادا کرے گا (الدُّرالمختار، ۲ : ۲۷۳)۔ دارالاسلام کے بر حق قانونی سربراہ کے خلاف اگر کوئی فرد یا گروہ خروج کرے یا شورش برپا کرے تو اطاعت کی دعوت دی جائے گی اور انکار کی صورت میں ان سے قتال (جنگ) واجب ھے، جس میں شریک ھونا جہاد فی سبیل اللہ کی طرح ھر مسلمان پر فرض ھے۔ برحق امام وقت کے خلاف بغاوت و خروج کرنے والے تین قسم کے لوگ ھو سکتے ھیں، یعنی قُطّاعُ الطَّرِیق (رھزن، ڈاکو)، باغی (جمع : بُغاۃ) اور خَوارِج (واحد : خارجی) [اور

اس طرح کے دوسرے لوگ جو برحق امام وقت کی حکومت کو تسلیم نہ کرتے ہوں]۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ احکام موجود ہیں (الدرّ المختار، ۲: ۲۸۶)۔

دارالاسلام کے امام وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انجام دے۔ شرک چونکہ سب برائیوں کی جڑ (اصل المناکیر) ہے اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس سے منع کرنے کے لیے عملی جہاد میں حصہ لے اور اس سلسلے میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بہترین عملی مثال (اسوۂ حسنہ) اور قرآنی تعلیمات پیش نظر رکھی جائیں۔ مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مال و دولت کی خواہش دل سے نکال کر محض اللہ کی رضا کی خاطر گھر سے نکلے (السرخسی : المبسوط، ۱۰ : ۲ تا ۵)۔

اگر مسلمانوں پر ظلم ہو یا دارالاسلام پر مشرکین اور کفار چڑھ دوڑیں تو اس صورت میں امام وقت اعلان جہاد کرے گا اور جہاد بالسیف فرض ہو جائے گا۔ اگر وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں تو صلح کرنے کا حکم ہے، اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ کفار و مشرکین فتنے کا باعث بن سکتے ہوں تو ان پر حملہ کرکے ان کی سرکوبی کر دینا ضروری ہے (السرخسی : المبسوط، ۱۰ : ۲ ببعد؛ الاحکام السلطانیۃ، ص ۵۳ ببعد)۔ الماوردی نے صراحت سے لکھا ہے کہ اگر داخلی طور پر دارالاسلام کو خطرہ ہو تو اس وقت بھی جہاد فرض ہے، مثلاً کوئی گروہ یا خطّہ دارالاسلام کی مرکزی قانونی حکومت کو چیلنج کرتے ہوئے فرائض اسلام یا بیت المال کے واجبات ادا کرنے سے انکار کرے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ اور مرتدین کے خلاف جہاد کا حکم دیا تھا (الاحکام السلطانیۃ، ص ۵۵ ببعد) تو اس صورت میں بھی جہاد فرض ہے۔ [اسلامی ممالک پر مغربی استعمار کے غلبے کے زمانے میں دارالاسلام اور دارالحرب کے غرض‌مندانہ تصورات پر بہت سا مواد موجود ہے، انیسویں عیسوی صدی میں اس سلسلے میں بہت سی تاویلیں استعماریوں کے مفاد کی تقویت کے لیے کی گئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اصلی روح کے مطابق دارالاسلام وہی ہے جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو اور اس میں اسلامی شریعت نافذ ہو]۔

مآخذ : (۱) الماوردی : الاحکام السلطانیۃ، قاہرہ ۱۹۶۶ء؛ (۲) ابو بکر السرخسی : کتاب المبسوط (جلد دہم فقط)، قاہرہ ۱۳۲۴ھ؛ (۳) وہی مصنف : شرح السیر الکبیر، حیدرآباد دکن ۱۳۵۵ھ؛ (۴) امام الشافعی : کتاب الامّ، قاہرہ ۱۹۶۱ء؛ (۵) یحیٰی بن آدم : کتاب الخراج، لائڈن ۱۸۹۶ء؛ (۶) ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ، قاہرہ ۱۹۳۸ء؛ (۷) تھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ : (۸) ڈاکٹر حمید اللہ : رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیاسی زندگی، کراچی ۱۳۶۲ھ؛ (۹) وہی مصنف : *Muslim Conduct of State*، حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء؛ (۱۰) وہی مصنف : عہد نبوی کے میدان جنگ، حیدر آباد دکن؛ (۱۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی : الجہاد فی الاسلام، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۱۲) ابن القیم : احکام أهل الذمّة، دمشق ۱۹۶۱ء۔

(ظہور احمد اظہر)

الدار البیضاء : کاسابلانکا Casablanca کا عربی نام، مراکش کا ایک بڑا شہر؛ مقامی لوگ دارالبیضاء بولتے ہیں۔ زمانۂ سابق میں أنفا [رک بآں] کہلاتا تھا۔

پندرھویں صدی عیسوی میں جب پرتگالیوں نے أنفا کو تباہ کر دیا تو یہ شہر کھنڈر بنا رہا۔ اس میں چند بدّو رہتے تھے اور گاہے گاہے اسے جہازوں کے پانی لینے کے مقام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ پرتگالیوں نے اس جگہ کا نام ایک سفید مکان کے نام پر Casabranca رکھ دیا، جہاں سے نیچے کی طرف کھنڈر نظر آتے تھے اور یہ مکان ان کے جہازوں کے لیے امتیازی نشان کا کام دیتا تھا۔ ہسپانویوں نے اس نام کو

بدل کر کاسابلانکا کر دیا، جو شہر کا موجودہ یورپی نام ہے ۔ الدارالبیضاء اس کا لفظی ترجمہ ہے ۔

علوی سلطان سیدی محمد بن عبداللہ نے اس شہر کو اٹھارھویں صدی عیسوی میں، غالباً پرتگالیوں کے ۱۷۶۹ء میں مازاگان Mazagan کو چھوڑ کر چلے جانے کے بعد، ازسرِ نو بنایا تھا ۔ اس ڈر سے کہ عیسائی کسی دن پھر حملہ کر دیں گے وہ رباط اور مازاگان کے درمیان دفاعی مورچوں میں جو خلا موجود تھا اسے پُر کر دینا چاہتا تھا ۔ وہ بُرج (سَقالہ)، جس پر توپوں کے لیے دمدمے بنے ہوے تھے، رباط [رک باں] اور لَراش (Larache) کے بُرج کی طرح تھا ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سلطان نے دو "اِدالے" [یا حصّے] کرکے شہر کو ازسرِ نو آباد کیا تھا ۔ ایک حصے میں تو حَنَحہ کے مُلَوَّح تھے (ایک بربر قبیلہ جو اغا دیر [رک باں] کے علاقے میں مَخزن کے زیر حکومت آ گیا تھا) اور دوسرے حصّے میں مکّنس (Meknès) کے بواخِر (اہل البخاری) ۔ آج تک شہر کی ایک قدیم ترین مسجد کا نام "جامع الشاوح" چلا آتا ہے ۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جو سیاح دارالبیضاء میں گئے انھوں نے اسے کھنڈروں کا ایک ڈھیر بتایا ہے، جو مستقل سکونت کے بجائے زیادہ تر پڑاؤ کے کام آتا تھا ۔ فِضالہ اور منصوریہ کی طرح یہ رباط اور مراکش کے درمیان سفر میں ایک منزل تھا ۔

اناج (جو دارالبیضاء کی سب سے بڑی برآمد تھی) کی تجارت کی اجازت ۱۷۸۲ء میں قادس (Cádiz) کی ایک ہسپانوی کمپنی کو اور ۱۷۸۹ء میں میڈرڈ Madrid کی Compañía de los Cinco Gremios Mayores کو دی گئی تھی ۔ لیکن جب شاویہ کے والی نے بغاوت کر دی اور اپنا مستقر دارالبیضاء میں بنا لیا تو سلطان مولای سلیمان نے ۱۷۹۴ء میں اس بندرگاہ کو تجارت کرنے والوں کے لیے بند کر دیا اور ان عیسائی سوداگروں کو واپس رباط بلا لیا جنھوں نے دارالبیضاء میں اپنی تجارت جما لی تھی ۔ دوبارہ اس بندرگاہ کو مولای عبدالرحمٰن بن ہشام نے کہیں ۱۸۳۰ء میں جا کر کھولا ۔

۱۸۴۰ء اور اس کے بعد سے یورپی تجّار یہاں واپس آنے لگے اور خاص کر ۱۸۵۲ء میں ان کی آمد بہت کثرت سے ہوئی ۔ ان میں سب سے پہلے لوڈیو Lodève کے فرانسیسی صنعت کاروں کے نمائندے تھے ۔ انھیں خام اون کی تلاش میں بھیجا گیا تھا تاکہ وہ برطانوی منڈی کی محتاجی سے آزادی حاصل کر سکیں ۔ ان کے پیچھے جبل الطارق سے انگریز تاجر، پھر جرمن، پرتگالی اور ہسپانوی آئے ۔ دارالبیضاء میں پہلا یورپی نائب قونصل ۱۸۵۷ء میں مقرر ہوا ۔ بعد ازاں یورپی اقتصادی بحران یا مقامی اسباب (مثلاً خشک سالیوں اور وباؤں) کی وجہ سے گاہے گاہے جمود طاری ہونے کے باوجود غیرملکیوں کی یہ چھوٹی سی نوآبادی مسلسل بڑھتی رہی ۔ جہازراں کمپنیوں (خصوصاً the French line Paquet) کے جہاز باقاعدہ دارالبیضاء میں آتے تھے ۔ تجارت بڑھتی رہی اور ۱۹۰۶ء میں بندرگاہ میں آمد و رفت طنجہ Tangier سے بھی بڑھ گئی (درآمدی اور برآمدی اشیا کی مجموعی مالیت ایک کروڑ چالیس لاکھ طلائی فرانک) ۔

۱۹۰۴ء کے قرضے اور ۱۹۰۶ء میں شہر الجزائر کی کانفرنس کے بعد، فرانسیسی سرکاری عہدے داروں نے دارالبیضاء کے محصول خانے کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور ایک فرانسیسی کمپنی نے بندرگاہ کی سہولتوں کو ترقی دینے کا بیڑا اٹھایا ۔ ارد گرد کے دیہاتی علاقوں میں آباد شاویہ قبیلے کو ان واقعات سے خطرہ لاحق ہو گیا اور ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء کو انھوں نے شہر کی چار دیواری کے باہر ایک پتھر کی کان میں چند یورپی کارکنوں پر حملہ کرکے انھیں مار ڈالا ۔ ایک فرانسیسی جنگی جہاز کی مداخلت شہر کی لوٹ مار کا سبب بن گئی، جس میں یہودی محلے کو خاص کر بہت نقصان پہنچا ۔ اس کے جواب میں فرانسیسیوں نے پانچ اگست کو بمباری کی اور دو دن بعد ایک

فرانسیسی بیڑے سے دو ہزار فوج جنرل درودے Drude کی سرکردگی میں ساحل پر اتاری گئی۔ سپین نے بھی حملہ آور فوج کا ایک دستہ بھیجا۔ فرانسیسی مہماتی فوج نے جنگجو قبائل کو پیچھے دھکیل کر بنو شاویۃ کے سارے علاقے پر بتدریج قبضہ کر لیا۔ ان واقعات کا سلسلہ ۱۹۱۲ء میں فرانسیسی حکومت قائم ہو جانے پر ختم ہوا۔

پہلے ریذیڈنٹ جنرل لیانتے Lyantey نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اسے مراکش کی سب سے بڑی بندرگاہ بنایا جائے تو نتیجۃً اس شہر کی بہت زیادہ توسیع کی گئی۔ اگر دارالبیضاء نے قبل ازیں زیادہ اقتصادی خوش حالی کا منہ نہ دیکھا ہوتا تو بلاشبہہ فیصلہ بہت مختلف ہوتا۔ یہ خوش حالی کچھ تو اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ وہاں اچھی خاصی یورپی نوآبادی بن گئی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مہماتی فوج کو سامان مہیا کرتے رہنے کی ضرورت پڑی۔ جدید بندرگاہ کلیۃً انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں ۴۸۷۰ میٹر گہرے پانی کے گھاٹ ہیں اور ۳۱۸۰ میٹر لمبا پشتہ کھلے سمندر سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں یہاں ۸،۵ لاکھ ٹن سامان اتارا یا لادا جاتا تھا۔

۱۹۵۲ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی چھے لاکھ اسّی ہزار تھی (قب ۱۹۰۷ء میں بیس ہزار): ۴۷۲۹۲۰ مسلم، ۷۴۸۳۷ یہودی (مراکش میں پوری یہودی آبادی کی ایک تہائی سے زیادہ) اور ۱۳۲۱۹۷ غیر ملکی (جن میں نو ہزار نو سو فرانسیسی تھے)۔

پرانا شہر تین محلوں پر مشتمل تھا: مدینہ (متوسط طبقہ)، تنکر (مزدور پیشہ لوگ، یہ پورا نہیں بنا تھا) اور ملّاح (یہودی)۔ موجودہ زمانے میں کل علاقہ، جس کی دیواریں جزوی طور پر اب تک صحیح سالم ہیں، پرانا مدینہ کہلاتا ہے اور مغرب اور جنوب مغرب میں یہ فصیل سے آگے تک پھیل گیا ہے۔ کل یہودی آبادی وہاں مسلمانوں کے ساتھ مل جل کے رہتی ہے۔ یورپی محلے پرانے مدینے کے ارد گرد، خصوصاً مشرق اور جنوب میں بنے ہیں اور مزید مسلم محلے ان کے آگے بھی تعمیر ہوئے ہیں۔ ان میں سے بڑے محلے کا علاقہ بہت وسیع ہے، جس میں دو لاکھ باشندے ہیں اور اسے نیا مدینہ کہتے ہیں۔ اس شہر کے مضافات میں جھونپڑیوں پر مشتمل بستیوں کی جگہ، جہاں دیہاتی لوگ مزدوری کی تلاش میں جوق در جوق آئے تھے، اب جا بجا مزدوروں کے مکانات سے محلے بن گئے ہیں، مثلاً مشرق میں محمدیہ (سابقہ پتھر کی مرکزی کانیں)، جنوب میں سیدی عثمان (سابقہ بن مسیک) اور جنوب مغرب میں حَسنیّہ شہر، جو پہلے درب جدید (=الدّرب الجدید) تھا۔ صنعت کا اہم ترین مرکز رباط کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ شمال مشرق میں ہے۔ اس میں ملک کی بہت سی چھوٹی دستکاریوں کے مراکز ہیں اور یہ مراکش میں بہت ہی اہم صنعتی علاقہ ہے۔

مآخذ: احمد بن خالد الناصری السلاوی: کتاب الاستقصاء، 4e partie, Chronique de la, dynastie alaouite du Maroc (۱۶۳۱ - ۱۸۹۴ء)، مترجمۂ E. Fumey، در Archives Marocaines، پیرس ۱۹۰۶ - ۱۹۰۷ء، ۱: ۲۲۲، ۲۵۹ و ۲: ۳ تا ۵؛ (۲) M. Rey: Souvenirs d'un voyage au Maroc، پیرس ۱۸۴۴ء، ص ۱۲ تا ۱۵؛ (۳) Georges Bourdon: Ce que j'ai vu au Maroc، در Les journées de Casablanca، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۴) Villes et tribus du Maroc. Casablanca et les Chaouiya، ج ۱، Mission scientifique au Maroc، پیرس ۱۹۱۵ء؛ (۵) Dr. F. Weisgerber: Casablanca et les Chaouiya en 1900، دارالبیضاء ۱۹۳۵ء؛ (۶) J. Célérier: Les Conditions geographiques du développement de Casablanca، در Revue de Géogr, Maroc، مئی ۱۹۳۹ء؛ (۷) F. Joly: Casablanca-Eléments pour une ètude de géographie urbaine ' در *Cahiers d' Outre-Mer* ' اپریل - جون ۱۹۴۸ء؛ (۸) E. Hugues و J. L. Miège : *Les Européens à Casablanca au XIX*ème *siècle (1856-1906)*' پیرس ۱۹۵۴ء .

(A. ADAM)

⊕ **دارُالتَّرجَمه** : [جامعهٔ عثمانیه، حیدرآباد (دکن) کے تحت ایک شعبه]؛ نظام حیدرآباد میر عثمان علی خان نے اپنے فرمان (مؤرخه ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء) کے ذریعے جامعهٔ عثمانیه کے قیام کی اجازت دیتے هوے اس کی خصوصیت یه قرار دی که جمله علوم کی تعلیم زبان اردو میں دی جائے گی اور اس کے ساتھ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم لازمی هوگی ـ [یه برصغیر پاک و هند کی پهلی اردو یونیورسٹی تھی، چنانچه اردو میں مختلف مضامین کی کتابوں کا مناسب ذخیره فراهم کرنے کے لیے عظیم الشان پیمانے پر سر رشتهٔ تالیف و ترجمه قائم هوا ـ اگست ۱۹۱۹ء میں اردو کے پهلے کالج، کلیهٔ جامعهٔ عثمانیه، کا افتتاح هوا تو دارالترجمه میں کام شروع هو چکا تھا] .

دارالترجمه میں پهلے صرف مغربی زبانوں هی کی کتابوں کے ترجمے کا انتظام کیا گیا ـ پھر ایجوکیشنل کانفرنس، حیدرآباد، کی تجویز پر علوم شرقیه، علی الخصوص عربی و فارسی کتب کے ترجمے کی طرف بھی توجه کی گئی ـ سر رشتهٔ تالیف و ترجمه کے پهلے ناظم مولوی عبدالحق مقرر هوے ـ حیدرآباد سے ان کے چلے جانے کے بعد یه منصب مولوی عنایت الله دهلوی کے سپرد هوا ـ [پھر یکے بعد دیگرے اس پر مولوی محمد الیاس برنی، ڈاکٹر نظام الدین اور مسٹر ٹوپا فائز هوے] .

دارالترجمه کا طریق کار یه تھا که جامعهٔ عثمانیه کی مختلف مجالس نصاب اپنی اپنی ضرورت کی کتابوں کا انتخاب کرتیں اور مجالس اعلٰی کی منظوری کے بعد انھیں دارالترجمه کے سپرد کر دیا جاتا، جهاں دو طرح کے مترجموں سے کام لیا جاتا : (۱) دارالترجمه کے تنخواه دار ارکان، جن سے زیاده تر فلسفه، سیاسیات، تاریخ، معاشیات، قانون، ریاضی اور طب وغیره، موضوعات کی کتابوں کے تراجم کرائے جاتے؛ (۲) بیرونی مترجمین، جو عموماً طبیعیات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات، انجینیری، وغیره موضوعات کی کتابوں کا ترجمه کرتے تھے .

ترجمے کے سلسلے میں مترجمین کو اصطلاحات کے کٹھن مرحلے سے بھی دو چار هونا پڑا ـ مترجمین، انگریزی اصطلاحات، مجلس وضع اصطلاحات میں بھیج دیتے، جهاں مختلف علوم و فنون کے ماهرین کے علاوه ایسے اصحاب بھی موجود هوتے جو عربی و فارسی میں کامل دستگاه اور اردو زبان کی ادبی و لسانی خصوصیات اور اس کے ذخیرۂ الفاظ سے پوری آگاهی رکھتے تھے ـ اصطلاح سازی کا مرحله بڑی ردّ و کد کے بعد طے هوتا ـ اس مجلس میں جن ماهرین زبان کی خدمات سے فائده اٹھایا گیا ان میں نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی، مولوی عبدالله العمادی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولوی عبدالباری ندوی، مرزا محمد هادی رسوا، مولوی وحیدالدین سلیم (مصنف وضع اصطلاحات علمیه)، چودھری برکت علی، سید شمس الله قادری اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نام قابل ذکر هیں ـ تکمیل ترجمه کے بعد مسودے پر کسی ماهر فن سے نظرثانی کرائی جاتی، [پھر مذهبی اور ادبی نقطهٔ نظر سے اس کا جائزه لیا جاتا] اور بالآخر کتاب دارالطبع، جامعهٔ عثمانیه، میں طباعت کے لیے بھیج دی جاتی ـ اس طرح دارالترجمه نے ان تمام علوم و فنون سے متعلق بهت سی کتابیں اردو میں تالیف و ترجمه کروا کے شائع کیں جن کی تعلیم جامعهٔ عثمانیه میں دی جاتی تھی .

[۱۹۴۷ء تک ۲۱۹ کتابیں شائع هو چکی تھیں، ۶۷ زیر طبع تھیں اور ۹۳ پر نظرثانی هو رهی تھی ـ ان کتابوں کی فهرست باعتبار مضمون درج ذیل هے :

فلسفه (مابعد الطبیعیات، نفسیات، منطق و

اخلاقیات) ـ ۹۵؛ جغرافیه و تاریخ (تاریخ اسلام، تاریخ ہند، تاریخ قدیم و تاریخ یورپ، وغیرہ) = ۱۱۸؛ عمرانیات، سیاسیات و معاشیات - ۹۲؛ قانون و دستور - ۳۲؛ ریاضی و سائنس (طبیعیات، کیمیا، حیوانیات) ۳۷؛ طب = ۳۰ اور انجنیئری = ۲۷.

دارالترجمه کے قیام سے پہلے ترجمه کرنے کے سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں (مثلاً فورٹ ولیم کالج کلکته اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں) وہ بہت چھوٹے پیمانے پر تھیں اور ان سے مقصود محض اردو دانوں کو جدید مغربی علوم سے روشناس کرانا تھا۔ نواب شمس الامراء اور ارباب دہلی کالج نے بھی نصابی اغراض سے ترجمے کرائے تھے، لیکن اعلٰی درجے کی تصانیف کی طرف توجه نہیں کی۔ دارالترجمه کا قیام ایک یونیورسٹی کی نصابی اور علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے عمل میں لایا گیا تھا اور اسے نظام کی ذاتی سرپرستی اور ہر طرح کے مواقع و وسائل حاصل تھے؛ چنانچه اردو کو علمی زبان بنانے کی یه پہلی باضابطه اجتماعی کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی۔ اگرچه اس کی ان مطبوعات میں جو مغربی زبانوں سے ترجمه کی گئی ہیں، الفاظ اور اصطلاحات کے علاوہ اسلوب بیان کی اجنبیت بھی پائی جاتی ہے، تاہم ان سے اردو میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی؛ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں روز بروز اضافه ہونے لگا؛ ایسے الفاظ رائج کیے گئے جن کے مشتقات آسانی سے بن سکتے ہیں اور جو دوسرے الفاظ کے ساتھ ملائے جا سکتے ہیں؛ جدید اور قدیم علمی و فنی الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم معین ہوا اور اردو زبان میں، جس کا ادب اس سے قبل زیادہ تر شاعری، قصص و افسانه اور تذکرہ نگاری تک محدود تھا، جدید علوم و فنون کا معقول ذخیره منتقل ہو گیا.

۱۹۴۹ء میں سقوط حیدرآباد کے بعد جامعۂ عثمانیه میں اگرچه اردو زبان لازمی ذریعۂ تعلیم نہیں رہی، تاہم دارالترجمه میں آج بھی کام جاری ہے۔

مآخذ: (۱) محی الدین قادری زور: عہد عثمانی میں اردو کی ترقی، مطبوعۂ ۱۹۳۴ء؛ (۲) میر حسن: مغربی تصانیف کے اردو تراجم، ۱۹۳۹ء، ص ۱۰۰ ببعد؛ [(۳) سکسینه: تاریخ ادب اردو (ترجمۂ مرزا محمد عسکری)، مطبوعۂ نولکشور، بار دوم، حصۂ نظم: ص ۳۴۹؛ (۴) نصیر الدین ہاشمی: دکن میں اردو، لاہور ۱۹۶۰ء، ص ۶۳۹ ببعد؛ (۵) فرحت شاہجہانپوری: نظم طباطبائی کے خود نوشت سوانح، در صحیفه (لاہور)، اکتوبر ۱۹۶۴ء، ص ۴۸ (حاشیه)].

(غلام حسین ذوالفقار [و ادارہ])

دارالجہاد: رک به جہاد؛ دارالحرب.

دارالحدیث: دارالحدیث کا اطلاق شروع میں ان اداروں پر ہوا جو چھٹی صدی ہجری میں حدیث شریف پڑھانے کے لیے مخصوص تھے۔ یه نتیجه نکالنا درست نہیں که اس عہد تک علم حدیث صرف سفر کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا (جسے "طَلَبُ العِلْم" کہتے تھے) اس غلط فہمی کی بنا یه بتائی جاتی ہے که علم حدیث کے لیے خاص مدارس نہیں بنے تھے (قب گولڈ تسیہر Goldziher: *Muh. Stud.*، ۲: ۱۸۶) یه ہمارے مطالعے کے نتائج سے ہم آہنگ نہیں ہے جس کا اب مواد میسر آیا ہے؛ لہٰذا حدیث سے متعلق دیگر امور کی طرح اس بات کی بھی تحقیق ہونی چاہیے که "طلب العلم" کے سفروں کی نوعیت اور مقصد کے متعلق جو غلط فہمی تھی، خود اس کے اثرات کیا ہوئے۔ (قب (۱) F. Sezgin: *Buhari'nin kaynaklari hakkinda araştirmalar*، ص ۳۲ تا ۳۶؛ (۲) وہی مصنف: *Islam Tetkikleri Enst. dergisi*، ۱۹۵۷ء، ۲/۱: ۳۳). الذہبی (م ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ - ۱۳۴۸ء) کے رساله الامصار ذوات الآثار (مخطوطۂ ولی الدین، ۳۶۴/۳، ورق ۹۰ ب تا ۹۳ الف) میں تعلیم الحدیث کے مرکزوں اور ساری اسلامی دنیا میں مختلف صدیوں میں ان کی تقسیم کے متعلق مفصل اور جامع معلومات ملتی ہیں۔

علم الحدیث سے شغف اور اس کا مطالعہ، وقفے کے بغیر صدیوں تک شام میں جاری رہا، جہاں سب سے پہلے دارالحدیث کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ بیت المقدس بھی (۹۰ سال کے وقفے کے ساتھ) علم حدیث کا مرکز رہا ہے (کتاب مذکور، ۹۳ ب)۔

جب تک حدیث کی تعلیم کے لیے خاص ادارے قائم نہیں ہوے تھے، دوسرے مذہبی علوم کی طرح اس کی تعلیم بھی مسجدوں میں ہوا کرتی تھی۔ محدثین چونکہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ ایسی تعلیم محدودے چند اشخاص کو صرف ذاتی مکانات میں دی جائے، لہٰذا وہ مساجد سے کام لینے کو ترجیح دیتے تھے۔ (قب، مثلاً الخطیب: تاریخ بغداد، ۲ : ۳۲)۔ [امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ/۷۹۵ء) مسجد نبوی میں درس حدیث دیا کرتے تھے اور سیکڑوں تلامذہ ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔ امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ/۸۷۰ء) نوجوانی کے عالم میں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اوائل میں بصرے آئے اور وہاں ایک مسجد میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، جس میں ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے (کتاب مذکور، ۲ : ۱۶ تا ۱۷)۔ قاہرہ میں امام شافعیؒ کا ایک شاگرد تیسری صدی ہجری میں مسجد ابن طولون میں حدیث کا درس دیا کرتا تھا (حسن المحاضرہ، قاہرہ ۱۲۹۹ء، ۱ : ۱۸۲)۔ جب بعد میں ایسے اداروں کی بنیاد پڑ گئی جنھیں دارالعلم یا مدرسہ کہتے تھے تو لوگ مسجدوں اور استادوں کے ذاتی مکانات کے بجائے اس طرف کھنچنے لگے، تاہم خاص حدیث کی تعلیم کے مدارس چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سے کھلنے شروع ہوے؛ چنانچہ مدرسة الحدیث میں، جو ابو علی الحسین (م ۳۹۳ھ/۱۰۰۳ء) کے لیے نیشاپور میں قائم ہوا تھا، تقریباً ایک ہزار طلبہ تھے اور ابن الفورک (م ۴۰۶ھ/۱۰۱۵-۱۰۱۶ء)، ابو القاسم القشیری (م ۴۶۵ھ/۱۰۷۲-۱۰۷۳ء) اور رکن الدین الاصفہانی (م ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء) کے لیے مدارس الحدیث بنوائے گئے تھے (قب Wüstenfeld : *Imam Schafi'i*، ۱ : ۱۵۶ و ۲ : ۲۲۹، ۳ : ۲۸۴)۔ قاہرہ کے دارالعلم میں، جس کی بنیاد الحاکم بامراللہ نے رکھی تھی (۴۰۰ھ/۱۰۰۹-۱۰۱۰ء) دو مالکی استادوں نے فقہ اور حدیث کے ماہروں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا (الذہبی: دُوَل الاسلام، مطبوعۂ حیدر آباد، ۱ : ۱۸۹)۔

پہلا ادارہ جو خاص طور پر دارالحدیث کہلایا، اس کی بنیاد اتابک نورالدین (م ۵۶۹ھ/۱۱۷۳-۱۱۷۴ء) نے رکھی تھی (النعیمی: الدارس فی تاریخ المدارس، دمشق ۱۹۴۸ء، ۱ : ۹۹؛ قب *Muh. Stud.*، ۲ : ۱۸۷)۔ نورالدین بذات خود حنفی تھا، لیکن اس نے اس مدرسے کو شافعیوں کے لیے مخصوص کر دیا (Wüstenfeld : *Die Akademien der Araber und ihre Lehrer*، ص ۶۹) اور مؤرخ و محدث عبداللہ بن عساکر (م ۵۷۱ھ/۱۱۷۵-۱۱۷۶ء) کو اس کا صدر مقرر کیا (النعیمی: کتاب مذکور، ۱ : ۱۰۰)۔ اس ادارے اور اس کے متعلقہ اشخاص کے لیے بہت سے اوقاف تھے (ابو شامہ: الروضتین، قاہرہ ۱۹۵۶ء، ۱ : ۲۳)۔ ابن عساکر کا جانشین اس کا بیٹا القاسم (م ۶۰۰ھ/۱۲۰۳-۱۲۰۴ء) ہوا (النعیمی: کتاب مذکور، ۱ : ۱۰۰)۔ النعیمی اس مدرسة الحدیث کے ناظموں کے نام ابن رافع (م ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء) تک دیتا ہے۔ اس پہلے دارالحدیث کے کھل جانے کے بعد اسی قسم کے متعدد اور ادارے قائم ہو گئے، جن کے ساتھ سربرآوردہ مؤرخین اور محدثین وابستہ تھے۔ پہلے پہل یہ زیادہ تر دمشق اور اس کے نواح میں (النعیمی نے ان میں سے سولہ کے نام قلم بند کیے ہیں) کھلے، لیکن پھر ایسے ادارے بہت جلد تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئے؛ چنانچہ عبداللطیف البغدادی (م ۶۲۹ھ/۱۲۳۱-۱۲۳۲ء) نے ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء میں موصل جاتے ہوے اسی قسم کا دارالحدیث ابن مہاجر کے مدرسے کی زیریں منزل میں دیکھا

(ابن ابی اُصَیْبِعَہ، ۲ : ۲۰۳) - ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء میں الملک الکامل ناصرالدین نے دارالحدیث النوریہ کے انداز پر قاہرہ میں ایک دارالحدیث کی تاسیس کی، اور ابوالخطاب بن دحیہ کو اس کا صدر مقرر کیا - المقریزی لکھتا ہے کہ ۸۰۶ھ/۱۴۰۳-۱۴۰۴ء میں یہ اس قدر انحطاط پذیر ہو گیا تھا کہ اس کا صدر محض ایک جاہل نوجوان بلکہ لڑکا تھا (الخطط، قاہرہ ۱۲۷۰ء، ۲ : ۳۵۷) - ابن دقماق (م ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ تا ۱۴۴۲ء) کے وقت میں قاہرہ کے تہتّر مدارس میں سے دو دارالحدیث تھے (انتصار، قاہرہ ۱۲۹۹ھ، ص ۹۹).

اوّلین دارالحدیث کے قیام کے بعد قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں کے پڑھانے کے لیے دارالقرآن والحدیث کے نام سے ادارے معرض ظہور میں آئے - اس قسم کی درس گاہ کا نمونہ سب سے پہلے سیف الدین الملک الناصر (م ۷۴۱ھ/۱۳۴۰-۱۳۴۱ء) نے قائم کیا (اس کے ایسے ہی دو اور مدرسوں کے لیے دیکھیے النعیمی: کتاب مذکور، ۱ : ۱۲۳ تا ۱۲۸).

دارالحدیث ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے یا مدرسے کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبے کی حیثیت سے اسلامی دنیا میں حالیہ زمانے تک موجود رہا؛ چنانچہ بقول مجیرالدین (م ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء)، بیت المقدس کے چالیس سے زائد مدارس میں سے ایک کو دارالقرآن اور دوسرے کو دارالحدیث کہتے تھے (Sauvaire : *Hist. de Jérus. et Hebr.*، ص ۳۹ [illegible]). عثمانی ترکوں کے عہد میں مسجد سلیمانیہ کے بالمقابل جو دارالحدیث تھا، اس کے لیے اساتذہ کا انتخاب بڑے بڑے اور مشہور اساتذہ میں سے ہوتا تھا - تاریخ جودت، بار اول، ۱۳۰۹ھ، ۱ : ۱۱۱) - گزشتہ دو تین صدیوں میں دیگر مدارس کی طرح دارالحدیث بھی علمی مراکز کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں.

(FUAT SEZGIN)

* **دارُالحَرْب** : لفظی معنی لڑائی کی جگہ یا سرزمین جنگ - فقہاے اسلام کی علمی اصطلاح میں دارالحرب سے مراد دشمنان اسلام کا وہ علاقہ یا ملک ہے جس کے باشندے دعوت اسلام کو مسترد کرکے اسلام [اور مسلمانوں] کے خلاف سرکشی اور عداوت کا اظہار کریں اور جہاں اہل اسلام اور اہل ذمہ کی عبادت گاہیں محفوظ نہ ہوں - اسی طرح دارالاسلام کا کوئی علاقہ دوبارہ کفار کے قبضے میں چلا جائے تو وہ بھی دارالحرب بن جاتا ہے، بشرطیکہ وہاں اسلامی شریعت کے بجائے کافرانہ قانون نافذ ہو جائیں اور وہ علاقہ دارالحرب کے متصل واقع ہو اور وہاں اہل اسلام اور ان کے اہل ذمہ کا جان و مال اور دین محفوظ نہ ہو - بعض علما تو اسلام کی عملداری سے نکل جانے والے علاقے کو اس وقت تک دارالحرب کہنے سے احتیاط برتتے ہیں جب تک اس میں اسلام کا ایک حکم بھی نافذ رہے (تھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۴۶۶ [illegible] احکام اہل الذمۃ، ۲ : ۵۱۷ ببعد؛ کتاب الام، ۴ : ۱ [illegible] ھ) [مگر اس سے یہ دارالاسلام نہیں بن جاتا].

[illegible] اسلام کی حقیقی روح چونکہ امن و سلامتی ہے اس لیے وہ دنیا کو اسلام کے دامن میں پناہ لینے کی دعوت دیتی ہے - یہ دعوت دو طریقے سے قبول کی جا سکتی ہے: حلقہ بگوش اسلام ہو کر، یا اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے تابع مسلمانوں کے ساتھ مشترک شہریت کی حیثیت قبول کرکے (یعنی اہل الذّمہ بن کر)؛ لیکن کفر و شرک کی جس سرزمین سے اس دعوت حق کے خلاف عناد کا اظہار ہو جائے اور وہاں کے لوگ سرکشی و فساد پر اتر آئیں تو ان کے خلاف طاقت کا استعمال واجب ہو جاتا ہے - یہیں سے جہاد کی فرضیت کا سرِّ حقیقی عیاں ہوتا ہے اور شرک و عناد کی سرزمین دارالحرب قرار پاتی ہے (اسلام کا نظریۂ جہاد، ص ۹۰ ببعد؛ اسلام کا نظام امن، ص ۱۵۲)؛ کفار کی سرزمین اس وقت تک دارالحرب نہیں بنتی جب تک اس کے لوگ دعوت اسلام کو مسترد کرکے دارالاسلام

کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہو جائیں، امام ابن قیّم نے لکھا ہے کہ دارالحرب پر بلاوجہ حملہ جائز نہیں، پہلے دعوت اسلام واجب ہے اور مسترد ہو جانے پر جہاد فرض ہوگا، لیکن اگر دارالحرب دارالاسلام پر حملہ آور ہو تو اس وقت دعوت اسلام کی شرط کے بغیر ہی جہاد فرض ہو جاتا ہے (احکام اھل الذمۃ، ۱ : ۵)؛ کفار کی سرزمین جب دارالحرب قرار پا جائے تو اس کے باشندے حَرْبی یا اَھْلُ الْحَرْب کہلائیں گے (شرح السیر الکبیر، ۱ : ۱۵۲ ببعد؛ المبسوط، ۱۰ : ۲۳ ببعد).

دارالاسلام کے امام وقت کے فرائض میں سے ایک، دعوت و تبلیغ اسلام کا انتظام بھی ہے ۔ وہ غلبۂ اسلام کے لیے یا تو خود جہاد پر نکلے یا اپنے نائب کی سرکردگی میں لشکر اسلام روانہ کرے ۔ دارالحرب میں مسلمانوں پر ظلم ہو یا مشرکین دارالحرب حملہ آور ہوں تو جہاد بالسیف فرض ہے ۔ اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ مشرکین فتنے کا باعث بن سکتے ہوں تو ان کی سرکوبی کے لیے جارحانہ حملہ بھی ضروری ہے (المبسوط، ۱۰ : ۲ تا ۴)۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم ہے ۔ آپؐ کو پہلے حکمت و موعظت کے ساتھ دعوت اسلام، احسن طریق سے دلائل پیش کرکے صداقت اسلام منوانے کا حکم ہوا (۱۶ [النحل] ۱۲۵)، پھر ظالموں کے خلاف جہاد کا حکم ہوا (۲۲ [الحج] : ۳۹)؛ دارالاسلام مدینۂ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد آپؐ نے قرب و جوار کے لوگوں کے علاوہ اس وقت کے بادشاہوں کو بھی قبول اسلام کی دعوت دی اور ان میں سے جس جس نے دعوت اسلام کو مسترد کیا اور سرکشی کی اس کا علاقہ یا ملک دارالحرب اور وہاں کا حکمران طاغی یعنی سرکش قرار پایا اور ان کے خلاف جہاد کا حکم ہوا (سیرۃ ابن ھشام، ۲ : ۳۷۳؛ ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۳ : ۴۹۴؛ صبح الاعشی، ۶ : ۱۵۱ ببعد؛ البخاری، ۶ : ۸ تا ۹).

بلاد اھل الحرب پر اگر لشکر اسلام بزورِ شمشیر قبضہ کر لے تو ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا، وہ اھل الذمّہ یا ذمّی کی حیثیت سے دارالاسلام کے شہری قرار پائیں گے ۔ اگر مغلوب ہونے سے قبل ہی اھل الحرب صلح کی پیش کش کر دیں تو صلح واجب ہو جائے گی اور صلح کی جو شرائط بھی طے پائیں گی، ان پر عمل واجب ہوگا ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اھل حرب مال کی جس مقدار پر صلح کریں وہ جزیے کی مقدار سے کم نہیں ہونی چاہیے (کتاب الاُمّ، ۱ : ۱۸۱ تا ۱۸۲؛ المبسوط، ۱۰ : ۲۷ ببعد) ۔ اھل ذمّہ میں سے کوئی شخص بھاگ کر دارالحرب میں چلا جائے تو وہ بھی حربی قرار پائے گا اور اس پر اھل الحرب کے قوانین کا اطلاق ہوگا، مثلاً جان و مال کی حفاظت کے حق سے محروم، گرفتاری کی صورت میں قتل یا غلامی کی سزا دی جا سکے گی (المغنی، ۹ : ۳۵۵)۔ اگر دارالحرب کا کوئی باشندہ مسلمان ہو جائے تو دارالحرب کے فتح ہونے پر اس کی جائداد مال غنیمت میں شامل نہیں ہوگی، بلکہ اس کی ملکیت میں رہے گی (المغنی، ۹ : ۳۵۷؛ شرح السیر الکبیر، ۲ : ۹۶ ببعد) ۔ اگر کوئی مسلمان امان کی صورت میں دارالحرب میں داخل ہو تو وہاں کسی کافر کا خون بہانا، مال لوٹنا یا کسی عورت سے تعرض کرنا حرام ہے (الدرالمختار، ۲ : ۲۷۳؛ شرح السیر الکبیر، ۲ : ۱۰۲) ۔ دارالحرب کے کسی باشندے کو عموماً تین ماہ سے زائد دارالاسلام میں قیام کی اجازت نہیں دی جائے گی کیونکہ جاسوسی وغیرہ سے دارالاسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اگر وہ اس سے زائد عرصہ دارالاسلام میں قیام کرنا چاہے تو ذمّی کی حیثیت سے رہے گا اور جزیہ ادا کرے گا (حوالۂ سابق) ۔ دارالحرب کے خلاف میدان قتال میں مسلمان پر شرعی حد قائم نہیں کی جا سکتی (المغنی، ۹ : ۳۴۸).

مآخذ : (۱) ابن قدامہ : المغنی، قاہرہ، بلا تاریخ؛ (۲) مفتی علاء الدین : الدرالمختار، لکھنؤ ۱۲۹۴ھ؛ (۳)

تہانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ ۱۸۶۲ء؛ (۴) امام شافعی: کتاب الأم، قاہرہ ۱۹۶۱ء؛ (۵) ابن القیم: احکام اهل الذمة، دمشق ۱۹۶۱ء؛ (۶) السرخسی: المبسوط، قاہرہ ۱۳۲۴ھ؛ (۷) وهی مصنف: شرح السیر الکبیر، حیدرآباد دکن ۱۳۳۵ھ؛ (۸) ابن ہشام: السیرة النبویة، قاہرہ ۱۹۳۴ء؛ (۹) محمد ظفر الدین: اسلام کا نظام امن، اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء؛ (۱۰) حیدر زماں صدیقی: اسلام کا نظریۂ جہاد، لاہور ۱۹۴۹ء۔

(ظہور احمد اظہر)

* **دارالحکمة**: عام طور پر علمی اداروں کے لیے استعمال ہوتا ہے، بالخصوص اس ادارے کے لیے جس کی بنیاد فاطمی خلیفہ الحاکم نے ۳۹۵ھ/۱۰۰۵ء میں قاہرہ میں رکھی تھی۔ المامون کے "بیت الحکمة" [رک بآں] کے بعد عراق و ایران میں متعدد کتاب خانے قائم کیے گئے جو نہ صرف علم حدیث کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے تھے بلکہ "علوم الأوائل" یعنی قدیم علوم کا بھی تعارف کراتے تھے [رک بہ دارالعلم]۔

ایسے ادارے فاطمیوں کے تحت مصر میں بڑے کامیاب ہوئے جہاں شیعی عقائد نے یونانی علوم کی ترقی کے لیے سازگار ماحول مہیا کر دیا۔ قاہرہ کے محل میں جلد ہی ایک ذخیرۂ کتب جمع ہو گیا جس کا ایک مہتمم مصنف الشابشتی (م ۳۸۸ھ/۹۹۸ء) تھا۔ العزیز کا وزیر یعقوب بن کلّس (م ۳۸۰ھ/۹۹۰ء) اپنے گھر میں ادباء، فقہا اور علمائے دین کے باقاعدہ جلسے کراتا اور انھیں مالی وظائف دیا کرتا تھا، لیکن اس کی یہ جدّت جلد ہی "دارالحکمة" (= "دارالعلم") کے سامنے ماند پڑ گئی، جسے الحاکم نے مغربی محل کے شمال مغربی حصے میں جگہ دی۔ اس میں ایک کتاب خانہ اور دارالمطالعہ تھا اور یہ محدّثین، فقہا، نحویوں، عالموں، ہیئت دانوں، منطقیوں اور ریاضی دانوں کے مل بیٹھنے کی جگہ کا کام دیتا تھا۔ قاہرہ کے دارالحکمة کا انتظام "داعی الدعاة" کے ہاتھوں میں تھا جو اہل علم کو ہفتے میں دو بار وہاں جمع ہونے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ اسمٰعیلی عقائد کی تبلیغ و تعلیم کا کام داعی الدعاة کے سپرد تھا، جو المعزّ کے عہد سے "حکمة" بھی کہلانے لگے تھے (دیکھیے القاضی النعمان: کتاب المجالس، حسب بیان Dachraoui در *Arabica*، ۱۹۶۰ء)۔ ۴۳۵ھ/ [بہ تصحیح] ۱۰۴۴ء میں ایک نئی فہرست کتب مرتب کی گئی۔ اس میں کم از کم ۶۵۰۰ جلدیں علم نجوم، فن تعمیر اور فلسفے پر تھیں۔ یہ ادارہ وزیر الافضل نے پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بند کر دیا تھا، لیکن وزیر ابن المامون نے ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء میں اسے ایک دوسری عمارت میں پھر سے کھلوایا جو مشرقی محل کے جنوب میں تھی۔ اسے المستنصر کے عہد حکومت میں خانہ جنگیوں کے دوران میں لوٹ لیا گیا تھا اور جب فاطمی خاندان کا خاتمہ ہو گیا (۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء) تو کتاب خانے کو ایک دفعہ پھر بند کر دیا گیا۔ انقلاب زمانہ سے جب اس محل کے خزائن فروخت ہوئے تو یہ کتابیں القاضی الفاضل ایسے علم دوست اور روشن خیال لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں۔

مآخذ: (۱) المقریزی: الخطط (مطبوعۂ بولاق)، ۱: ۴۰۸ تا ۴۰۹، ۴۴۵، ۴۵۸ تا ۴۶۰ و ۲: ۳۳۲، ۳۶۳، ۳۸۱؛ (مطبوعۂ قاہرہ) ۲: ۲۵۳ تا ۲۵۵، ۳۱۳، ۳۳۴ تا ۳۳۷ و ۴: ۱۵۸، ۱۹۲، ۳۷۷؛ (۲) الکندی، ص ۶۰۰، ۶۴۰؛ (۳) القفطی، ص ۴۴۰؛ (۴) ابن خلّکان (مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۴۹ء)، ۶: ۲۸؛ (۵) O. Pinto: *Le biblioteche degli Arabi*، فلورنس ۱۹۲۸ء، ص ۱۶، ۲۵، ۲۶؛ (۶) Mez: *Renaissance*، ص ۱۶۹ تا ۱۷۰؛ (۷) M. Canard: *Le cérémonial fatimite . . .* در *Byzantion*، ۲۱ (۱۹۵۱ء): ص ۳۶۴۔

(D. SOURDEL)

دارالسّلام: "امن کی جگہ"؛ اولاً قرآن

حکیم (۶ [الانعام]: ۱۲۷؛ ۱۰ [یونس]: ۲۵) میں اسے جنت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ بقول امام البیضاوی وہ زوال سے محفوظ ("سلامۃ"=) سلامتی کی جگہ ہے یا اس لیے کہ لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں تو خدا اور ملائکہ ان پر سلام بھیجتے ہیں ("سلّم")۔ اسی لیے المنصور نے شہر بغداد کو یہ نام نیز مدینۃ السلام کا نام دیا [قب بغداد نیز یاقوت: معجم البلدان، شروع میں]۔ ٹانگانیکا کے دارالحکومت کے لیے [رک بہ دارالسلام]۔

(T.H. Weir)

* **دارالسّلام**: مزیمہ Mzizima ("سواحلی" زبان میں صحت افزا اور خوشگوار شہر)، سب سے پہلے سترھویں صدی عیسوی میں ویروہ Wabarawa نے آباد کیا، جو Mogadishu کے جنوب میں Barawa کی عرب سواحلی نسل سے تھا۔ موجودہ نام جو بندر السلام (سلامتی کی لنگر گاہ) کا مخفف ہے، اس کی ابتدا کم از کم ۱۸۶۲ء سے ہوئی ہے، جب زنجبار کے سلطان سید مجید نے وہاں ایک محل اور دیگر عمارتیں تعمیر کرائیں، جن میں سے چند ایک باقی رہ گئی ہیں۔ اس کی بڑی گلی، "برہ رستہ" (اردو "بڑا راستہ") کی بھی، جو اب "Acacia Avenue" (=خیابان ببول) ہو گیا ہے، یہی تاریخ ہے۔ اس کی حالیہ خوشحالی کا آغاز ۱۸۸۸ء سے ہوتا ہے جب یہ جرمن ایسٹ افریقہ کمپنی کا ایک سٹیشن اور ۱۸۹۱ء میں جرمن شاہی حکومت (Imperial Goverment) کا دارالحکومت بن گیا۔ ۱۹۱۶ء میں پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں اس پر برطانوی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۹۵۷ء میں اس کی آبادی، ۹۲۳۶۳ افریقیوں، ۲۵۴۵ عربوں، ۹۷۴۴ یورپینوں، ۲۴۶۰ گوآوبوں، ۲۳۲۶۳ ہندوستانیوں، ۱۷۱۸ پاکستانیوں، ۱۱ صومالیوں اور ۹۰۳ دوسرے لوگوں پر مشتمل تھی۔ غالباً تقریباً ۸۵۰۰۰ افریقی، ۱۲۵۰۰ ہندوستانی اور پاکستانی، نیز عربوں کی اکثریت اور تمام صومالی مسلمان ہیں۔ [یہ ۶ درجے ۹۴ ثانیے عرض بلد جنوب اور ۳۹ درجے ۶۱ ثانیے طول بلد مشرق واقع ہے]۔

دارالسلام جو شروع میں اگرچہ شاندار مگر خاموش سا دارالحکومت تھا، اب ایک بارونق تجارتی بندرگاہ ہے۔ ایک ریلوے لائن، جو تابورہ Tabora کے مقام پر دو شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہے، اسے جھیل ٹانگانیکا اور جھیل وکٹوریہ سے ملاتی ہے۔ علاوہ ازیں ملک کے تمام حصوں میں سڑکیں جاتی ہیں جن میں سے بعض پکی ہیں۔ سرکاری عمارات کی تعمیر تو جاری ہے۔ اکثر و بیشتر عمارات جدید طرز کی ہیں اور اگرچہ افریقی آبادی کا اپنا روایتی طرز برقرار ہے تاہم مجموعی لحاظ سے یہ شہر مغربی نظر آتا ہے۔

بقیہ ساحلی علاقے اور اندرون ملک کے بہت سے شہروں کی طرح اکثریت کا مذہب اسلام ہے۔ "سواحلی" میں، جو بنتو Bantu زبان ہے، پچیس فی صد [سے زیادہ] عربی کے الفاظ ہیں۔ یہ ساحلی زبان ہے۔ Mogadishu کے قریب سے Rovuma اور دور دور تک اندرونی علاقے میں بیلجمی کانگو کے اندر یہی مشترکہ زبان کا کام دیتی ہے۔ معدودے چند احمدیوں کے سوا، جنھوں نے قرآن حکیم کا سواحلی زبان میں ترجمہ شائع کیا ہے، مشرقی افریقہ کے مسلمان شافعی المذہب ہیں۔ ان کے لیے شرعی فیصلے دارالسلام میں ایک "Liwali" کے ذریعے ہوتے ہیں جن کی اپیل دیوانی عدالتوں میں ہو سکتی ہے۔ پہلی صدی میلادی سے ہی پہلے عربوں کی نقل مکانی یہاں کے ساحل پر برابر ہوتی رہی ہے اور اسلام شاید ساتویں صدی میں یہاں پہنچ گیا تھا۔ جب ابن بطوطہ نے ۷۳۱ھ/۱۳۳۱ء میں ساحلی علاقے کی سیاحت کی تھی تو وہاں شافعی مذہب کے لوگ پہلے سے موجود تھے۔ موجودہ عربوں میں سے بیشتر شحر سے آئے ہوے ہیں، لیکن بعض کی آمد حضرموت اور مسقط کے دیگر حصوں سے ہوئی ہے اور یہ [خوارج]

اراضی ہیں۔ چند ایک جزائر کمورو Comoros سے ہیں۔ دارالسلام کے سب سے دولت مند باشندے ہندوستانی اور پاکستانی ہیں جن میں سے غالباً نصف مسلمان ہیں۔ خوجے (نزاری شاخ کے اسمٰعیلی) بھاری کثرت میں ہیں اور ان کے امام آغا خاں چہارم کی وہاں ۱۹۵۷ء میں بڑی شان و شوکت سے مسند نشینی ہوئی تھی۔ دوسرے شیعہ اثنا عشری اور بوہرے ہیں۔ میمنوں کی ایک مختصر سی جماعت اور پاکستانی سنی بھی ہیں۔ مسجدیں بکثرت ہیں۔ افریقی مسلمان کوئی تیس کے قریب قرآنی مدرسے چلا رہے ہیں۔ آغا خاں کے پیرو اپنے غیر مذہبی مدارس جن میں ایک ثانوی درجے کا ہے اور کچھ خیراتی ادارے چلا رہے ہیں۔ انفرادی تعلیم کے علاوہ وہاں اعلٰی پیمانے کی اسلامی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

مآخذ: (۱) C. H. Becker، در آآ، لائڈن، بار اول؛ (۲) *Materialien zur Kenntnis des Islam in Deutsch Ost-Afrika*، *Isl.*، ۲ : ۱ ببعد؛ (۳) C. Velten: *Prosa und Poesie der Suaheli*، برلن ۱۹۰۷ء؛ (۴) B. Krumm: *Words of oriental origin in Swahili*، ۱۹۴۰ء؛ (۵) E. C. Baker: *Dar-es-Salaam 1860 to 1940*، در *Tanganyika Notes and Records*، عدد ۲۰، ۱۹۴۵ء؛ (۶) ۱۹۵۷ء کی مردم شماری کی روداد، سرکاری مطبع دارالسلام۔

(G.S.P. FREEMAN-GRENVILLE)

دارالشفاء: رک به بیمارستان۔

⊛ **دارُالصُّلح:** یعنی صلح کا علاقہ یا سرزمین؛ فقہاے اسلام کی علمی اصطلاح میں، دارُالصُّلح سے مراد وہ علاقے یا ممالک ہیں جن کے باشندے دارالاسلام [رک باں] کے امام وقت یا اس کے نائب کے ساتھ بعض شرائط پر صلح کر لیں۔ یہ شرائط ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو یک طرفہ ہوں، مثلاً دارُالصُّلح کے باشندے اپنے اوپر بعض مالی ذمے داریاں یا پابندیاں قبول کر لیں یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ شرطیں طرفین یعنی امام وقت یا اس کے نائبین کے ذمے بھی ہوں اور اہل دارالصلح کے ذمے بھی ہوں، مثلاً اہل دارالصلح بعض مالی ذمے داریاں اور پابندیاں قبول کر لیں اور امام وقت بعض صورتوں میں ان کی حفاظت اور معاونت کی ذمے داری قبول کر لے (کتاب الاُمّ، ۴ : ۱۸۱؛ الاحکام السلطانیة، ص ۳۳ ببعد؛ فتوح البلدان، ۱ : ۴، ۳۳، ۶۶)۔ جب تک دارالصلح کے باشندے مقررہ شرائط کی پابندی کرتے رہیں اس وقت تک ان سے کسی قسم کا تعرض جائز نہیں، لیکن جب وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کریں یا دارالاسلام کے خلاف دارالحرب [رک باں] سے تعاون کریں تو اس وقت ان کا ملک دارالصلح نہیں رہے گا، بلکہ دارالحرب بن جائے گا اور ان سے کیا ہوا معاہدۂ صلح ختم ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ [رک باں] کے موقع پر اہل مکہ اور ان کے حلیف قبائل سے بعض شرائط پر صلح کی تھی اور اس وقت تک اس کی پابندی فرمائی جب تک کفار مکہ یا ان کے حلیفوں کی طرف سے شرائط صلح کی علانیہ خلاف ورزی نہ ہوئی؛ اسی طرح مدینے کے قرب و جوار کی یہودی آبادیوں سے بھی بعض شرائط پر صلح طے کی تھی اور اپنی طرف سے ان کی پوری پوری پابندی فرمائی تا آنکہ خود قبائل یہود نے صلح کی خلاف ورزیاں شروع کر دی تھیں، جس کے بعد ان سے کیے ہوئے صلح کے معاہدے ختم ہو گئے (فتوح البلدان، ۱ : ۳۳، ۴؛ سیرة ابن ہشام، ۳ : ۴۲۵)، [نیز رک به البراءة (سورہ)]۔

صلح حدیبیہ کے علاوہ دارالصلح کی کئی ایک تاریخی مثالیں ملتی ہیں، پہلی مثال خود عہد رسالتؐ کی ہے۔ خیبر سے واپسی پر آپؐ نے حضرت مُحَیِّصہ بن مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کو اہل فدک کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا، مگر اہل فدک نے یُوشع بن نون یہودی کی قیادت میں اپنی اراضی اور کھجوروں

کے باغات میں سے نصف پر صلح کر لی (فتوح البلدان، ۱ : ۳۴ ببعد)؛ اسی طرح عہد رسالت میں نجران کے یہود و نصاریٰ نے بھی صلح قبول کی: نجران کے دو مذہبی پیشوا مدینۂ منورہ میں حاضر ہوے تو آپ نے انہیں دعوت اسلام دی، پھر دعوت مباہلہ دی، لیکن بالآخر وہ صلح پر راضی ہو گئے اور دربار نبوت سے صلح کا عہد نامہ لے کر واپس چلے گئے (فتوح البلدان، ۱ : ۶۶)۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فتح مصر کے موقع پر اپنے بھائی نافع بن العاص کی قیادت میں بلاد نوبہ پر حملے کا حکم دیا، مگر مسلمانوں کو فتح حاصل نہ ہو سکی اور کسی نہ کسی شکل میں لڑائی کا سلسلہ قائم رہا حتّٰی کہ حضرت عبداللہ بن سَعْد بن ابی سَرْح مصر کے والی بن کر آئے تو اہل نوبہ نے بعض شرائط پر صلح قبول کر لی، جن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اہل نوبہ ہر سال سو غلام بطور بَقْط [رک بآن] ارسال کیا کریں گے اور مسلمان انہیں اسی اندازے کے مطابق کھانے پینے کی بعض اشیا دیا کریں گے۔ صلح کا یہ معاہدہ بعض تبدیلیوں کے ساتھ عباسی خلفا مہدی اور متوکل کے عہد تک قائم رہا (فتوح البلدان، ۱ : ۲۸۰ ببعد)۔ اسی طرح عہد عثمانی میں الرُّہا اور ارمینیہ کے باشندوں نے بھی حضرت عیاض بن غنم سے کچھ گندم اور ایک دینار فی آدمی دینے پر صلح کی تھی (فتوح البلدان، ۱ : ۲۰۵)۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعد کے حنفی فقہاے دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان دارالصلح یا دارالعہد [رک بآن] کو ایک مستقل قسم کے طور پر قبول نہیں کرتے، لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعد کے شافعی فقہا اسے تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ دارالصلح اور دارالعہد میں کوئی فرق نہیں بیان کرتے، تاہم امام شافعیؒ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دارالعہد کو عام معنی میں لیتے ہیں لیکن ان کے نزدیک دارالصلح اس کی ایک خاص صورت ہے، یعنی دارالعہد تو ہر وہ زمین ہے جس کے باشندے دارالاسلام سے کوئی باہمی معاہدہ کر لیں، لیکن دارالصلح وہ زمین ہے جس پر لشکر اسلام حملہ آور ہو اور مغلوب ہونے سے قبل ہی وہاں کے باشندے بعض شرائط پر صلح کر لیں (کتاب الاُمّ، ۴ : ۱۸۱ تا ۱۸۲)۔ الماوردی نے دارالاسلام کے زیر اقتدار آنے والے تین قسم کے ممالک میں سے تیسری قسم (یعنی جو کسی عہد نامے کی رو سے مسلمانوں کے زیر اقتدار آئے) کی دو صورتیں بیان کی ہیں: وہاں کی اراضی یا تو عام مسلمانوں کے قبضۂ ملکیت میں آ جائیں، یا وہ اصلی مالکوں کے قبضے میں رہیں۔ پہلی صورت میں وہاں کے اصلی باشندے ذمّی کی حیثیت سے خراج ادا کرکے ان زمینوں کو کاشت کر سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ زمینوں کو بطورِ مستاجر اپنی ملکیت میں رکھ سکتے ہیں اور پیداوار کی ایک مقررہ مقدار جو جزیے کی مقدار سے کسی طرح کم نہ ہو ادا کرتے رہیں گے اور ان کی زمین کو دارالصلح یا دارالعہد کی حیثیت حاصل ہوگی (الاحکام السلطانیۃ، ص ۳۵ ببعد؛ ۱۳۱ ببعد؛ کتاب الاُمّ، ۴ : ۱۸۲)۔

مآخذ: (۱) البلاذری: فتوح البلدان، بیروت ۱۹۵۶ء؛ (۲) الماوردی: الاحکام السلطانیۃ، قاہرہ ۱۹۶۶ء؛ (۳) امام شافعی: الاُمّ، قاہرہ ۱۹۶۱ء؛ (۴) السرخسی: المبسوط، قاہرہ ۱۳۲۴ھ؛ (۵) وہی مصنف: شرح السیر الکبیر، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۵ھ؛ (۶) ابن القیم: احکام اہل الذمۃ، دمشق ۱۹۶۱ء؛ (۷) مفتی علاءالدین: الدر المختار، لکھنؤ ۱۲۲۴ھ؛ (۸) تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ ۱۸۶۲ء؛ (۹) ابو محمد عبداللہ بن قُدامہ: المُغْنی، طبع قاہرہ، بلا تاریخ؛ (۱۰) محمد ظفیرالدین مفتاحی: اسلام کا نظام امن، اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء؛ (۱۱) مودودی: الجہاد فی الاسلام، لاہور ۱۹۶۶ء؛ (۱۲) حیدر زمان صدیقی: اسلام کا نظریۂ جہاد، لاہور ۱۹۴۹ء؛ (۱۳) یحیی بن آدم: کتاب الخراج، لائڈن

۱۸۹۶ء؛ (۱۴) المقریزی: اَلخطط، قاہرہ ۱۳۲۴ھ؛ (۱۵) ابن عبدالحکم: فتوح مصر، قاہرہ، بلا تاریخ؛ (۱۶) حمید اللہ: *Muslim conduct of State*، لاہور ۱۹۵۴ء۔

(ظہور احمد اظہر)

* **دارالصِناعة**: (نیز دارالصَّنعة مگر بہت شاذ)، اشتقاق کے لحاظ سے اس ترکیب کا ترجمہ "صنعت و حرفت کی جگہ یا کارخانہ" کیا جا سکتا ہے، لیکن فی الواقع اس کا اطلاق ہمیشہ حکومت کے کارخانے پر ہوا ہے، مثلاً بنوامیہ کے عہد میں ہسپانیہ میں سرکاری استعمال کے لیے سونے چاندی کی مصنوعات یا اسلحہ بنانے اور ان کے ذخیرہ کرنے کے کارخانے، لیکن اس کا سب سے زیادہ وسیع استعمال جنگی جہازوں کی ساخت اور تیاری کے کارخانے کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی "دارالصناعة لِاِنْشاء السُّفُن"، جسے کبھی کبھی فقط "دارالانشاء" بھی کہا گیا ہے۔ اس میں وہ سلاح خانے شامل نہیں ہیں جن سے ہم نے آگے چل کر بحث کی ہے، نیز نجی تجارتی جہازوں کی بابت اس میں ذکر نہیں کیا جائے گا؛ اس کے لیے دیکھیے، بحریہ، ملاحة، سفینہ، اسطول۔

عربی مرکبات دارالصناعة اور دارالصنعة ہی سے بحرروم کی (یورپی) زبانوں میں "arsenal" اور "wet-dock" کے لیے لفظ بنائے گئے ہیں: (ہسپانیہ کی) قشتالی میں darsena, arsenal, ataruzana؛ قیطلونی میں drasena، darsanale؛ اور اطالوی میں darsena، arsenale؛ مالطی میں tarzna، tarznar۔ گمان غالب ہے کہ کسی اطالوی بولی ہی سے عثمانی ترکوں نے لفظ ترسانہ (tersane) لیا ہے (جس پر بعض اوقات توپ خانہ ("جنگی توپوں کا کارخانہ") کے وزن پر "ترس خانہ" کہہ کر ترکی رنگ چڑھا دیا جاتا ہے)۔ سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی دور میں یہ لفظ کئی زبانوں میں رواج پا گیا۔ جدید یونانی میں τερσανάς، شامی عربی میں ترس خانہ، مصری عربی میں ترسانة اور ترس خانہ۔

بحر روم شرقی: یہ طبعی امر تھا کہ مسلمانوں کی خدمات انجام دینے کے لیے پہلے بحر روم کے شرقی علاقے میں سلاح خانے قائم ہوئے، جن میں سے کچھ انھیں رومی بوزنطی سلطنت سے ترکے میں ملے تھے۔ خشکی میں فتح یاب ہونے کے باوجود عرب سمندر کی طرف سے انتقامی حملوں کی زد میں تھے۔ ان کے انسداد کے لیے انھوں نے ملک کے اصلی باشندوں کے تجربے سے کام لیا۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ خود دوسروں پر بحری حملہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ حضرت معاویہؓ جو اس وقت تک صرف شام کے والی تھے، پہلے شخص ہیں جنھوں نے عکّا میں قبرص کی مہم کے لیے ۲۸ھ/۶۴۹ء میں اسلحہ کا کارخانہ قائم کیا۔ بعد میں یہ کارخانہ صور (Tyre) میں منتقل کر دیا گیا، جہاں اس کے ساتھ ایک مورچہ بند گودی بنائی گئی، جو رات کو ایک زنجیر سے بند کر دی جاتی تھی اور اس میں جنگی جہاز آ کر پناہ لیتے تھے۔ پھر بھی المتوکل نے مناسب سمجھا کہ سلاح خانہ دوبارہ عکا ہی میں قائم کیا جائے۔ اس سلاح خانے کو ابن طولون نے، جب اسے اس کا مہتمم بنایا گیا، (المقدسی جغرافیہ دان کے دادا کے انتظام سے) صور کے کارخانے کے نمونے پر مورچہ بند کرا دیا۔ یہ ممکن ہے کہ وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے سلاح خانے طرابلس اور لاذقیہ میں بھی بنائے گئے ہوں؛ لیکن سمندر سے علحدہ ہونے کی وجہ سے ان کی رونق طَرَسُوس کے کارخانے کے آگے ماند پڑ گئی، جو انتہائی شمالی علاقے میں دریا کے کنارے بنایا گیا تھا۔ طرسوس بحری اور بری دونوں قسم کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں تک کہ ایک بغاوت کے نتیجے میں خلیفہ المعتضد نے ۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں جنگی بیڑا جلوا دیا اور پچاس سال بعد بوزنطیوں نے اس شہر پر از سر نو قبضہ کر لیا۔ صلیبی جنگوں نے آخر ان کارخانوں کو بالکل ختم کر دیا، جو غالباً شورشوں اور

سیاسی تفرقوں کی وجہ سے پہلے ھی کمزور ہو چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد مملوکوں نے بھی ان کی، حتّٰی کہ بیروت میں بھی، جو اس ساحلی علاقے کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا، تجدید نہیں کی۔

مصر: یہ بھی حضرت معاویہؓ ہی تھے جنھوں نے اپنی خلافت کے زمانے میں مصر کے سلاح خانے دوبارہ کھولے۔ ان سلاح خانوں کو تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے بعد سے مصر کے خود مختار فرمانرواؤں نے نہایت شاندار اور دیرپا ترقی دی۔ جن کارخانوں نے سب سے پہلے کام شروع کیا ان کے مالک بوزنطی تھے۔ ان میں سے ایک قلزم (Clysma) میں اور ایک اسکندریہ میں تھا۔ قلزم کی جگہ بعد میں سویز نے لے لی اور خوش قسمتی سے سویز کو نہر کے ذریعے دوبارہ دریائے نیل سے ملا دینے کی بدولت یہ کارخانہ بحر احمر اور بحر روم دونوں کے لیے کارآمد ثابت ہوا۔ آگے چل کر دوسرے بحری مرکز (رشید Rosetta)، دُمیاط اور تِنّیس میں نیل کے دھانوں پر بنائے گئے اور انھیں بوزنطی حملوں سے بچانے کے لیے عباسی خلفا (خصوصاً المتوکّل) نے مستحکم کر دیا اور ان کے لیے ایسی احاطہ بند لنگرگاھیں بنا دیں جیسی شام میں تھیں۔ متعدد بردی تحریرات اس کی شاھد ہیں کہ ان سلاح خانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کاریگر اور ضروری سامان بنوامیہ کے عہد سے لے کر آگے تک سرکاری طور پر منگوایا جاتا رہا۔ پھر بھی سب سے زیادہ محفوظ اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ سلاح خانہ وہ تھا جو نیل کے کنارے الفسطاط (جو بعد میں قاہرہ کہلایا) کے قریب قائم کیا گیا تھا اور پہلے ۵۴ھ/۶۷۴ء میں یہ جزیرہ روضہ میں بنایا گیا تھا۔ جب مروان الثانی نے جہازوں کو اس لیے جلوا دیا کہ عباسی اس کا تعاقب نہ کر سکیں (۱۳۲ھ/۷۵۰ء) تو غالباً اسے نقصان پہنچا۔ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں بوزنطیوں سے بحری جنگوں کے دوران میں المتوکّل (۲۳۸ھ/۸۵۳ء) نے اسے دوبارہ منظم کیا؛ چنانچہ اس زمانے میں جزیرۂ روضہ کو جزیرۃ الصناعۃ کہتے تھے،، بوزنطیوں (= بابلیون) کے زمانے میں یہاں جو مورچے بنے ہوئے تھے اور عربوں کی فتوحات سے شکستہ اور مرمت طلب ہو گئے تھے انھیں ابن طولون نے پھر بحال کیا۔ اس نے جنگی بیڑے کو دوبارہ بنانے کا کام بھی کیا، مگر اس کی پوری طرح سے کامیاب کوشش آئندہ صدی میں اخشیدیوں نے فاطمیوں کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کی۔ اس وجہ سے کہ سلاح خانہ جزیرے میں واقع تھا، اس زمانے میں اس کی حفاظت ناممکن تھی، اس لیے ابن طغج نے جزیرے کو باغ بنا دیا اور فسطاط میں دریا کے کنارے اس مقام پر جو اس وقت دار بنت الفتح کہلاتا تھا ایک نیا سلاح خانہ قائم کرنے کا حکم دیا۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاطمیوں کے عہد میں دونوں سلاح خانوں میں باری باری سے یا بیک وقت کام ہوتا رہا۔ ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء میں وزیر المأمون البطائحی نے جہازسازی کی صنعت کو معقول بنانے کی اس طرح کوشش کی کہ مصر (فسطاط) کے سلاح خانے کو، جو اب بہت بڑھ گیا تھا، "شَوانی" اور سرکاری جہاز بنانے اور جزیرے کے سلاح خانے کو "شاندیات" اور "حربیات" بنانے کے لیے مخصوص کر دیا۔ فاطمیوں کے ابتدائی عہد میں ایک تیسرا سلاح خانہ بھی شہر کی شمالی جانب محلۃ المَقْس میں کام کر رہا تھا؛ لیکن اس کے متعلق اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ۳۸۶ھ/۹۹۶ء میں یہاں جنگی جہازوں کا ایک بیڑا جو بوزنطیوں سے مقابلے کے لیے تیار کیا گیا تھا جل گیا۔ صلیبی جنگوں کے حوادث اور وہ مصیبتیں جو اس خاندان کے خاتمے کے قریب پڑیں اس بیڑے کے لیے تباہ کن ثابت ہوئیں اور انھیں میں قاہرہ کے سلاح خانے جل کر نابود ہو گئے۔ سلطان صلاح الدین نے کوشش کی کہ اسکندریہ میں جہاز سازی کا کام دوبارہ جاری کرے اور ممالیک کے عہد میں ہم پھر

سنتے ہیں کہ قبرص پر حملے کے زمانے میں ایک بیڑا تیار کیا گیا، لیکن یہ خال خال اور لمبے وقفوں کے بعد ہونے والی کوششیں تھیں۔ اگرچہ جہاز سازی کی صنعت میں اس سے پہلے ہی ناگہانی نشیب و فراز آئے، لیکن یہ کہنا احتیاط کے خلاف نہ ہوگا کہ مصری سلاح خانے ختم اس وقت ہوئے جب بحر روم پر اطالویوں کا تسلط ہو گیا۔

تیسری۔ چوتھی صدی ہجری / نویں۔ دسویں صدی عیسوی میں جزیرۂ اِقْرِیْطِش [رک باں] کے مسلمانوں کا خندق کے مقام پر ایک آزاد بحری مرکز تھا۔

مغرب : مغرب میں سب سے پرانے سلاح خانے لازمی طور پر مشرقی سلاح خانوں کے مقابلے میں جدید تر تھے، مگر ان میں سے بعض شاید، ان کی بہ نسبت زیادہ مدت تک قائم رہے اور مشرق نے وقتاً فوقتاً ان سے جنگی ساز و سامان کے ذخیروں کے طور پر کام لینے کی بھی کوشش کی۔

افریقیہ : مغرب کا قدیم ترین سلاح خانہ تونس [رک باں] میں تھا۔ اس کی بنیاد تقریباً ۷۵ھ/۶۹۴ء میں مشرق کے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے حکم سے وہاں کے والی حسان بن النعمان نے رکھی۔ وہاں ایک جنگی بیڑا، افریقیہ کے ساحل کی حفاظت اور خاص طور پر صقلیہ کے فتح کرنے کی غرض سے تیار اور مسلّح کرنے کے لیے مصر سے ایک ہزار قبطی مع اہل و عیال لائے گئے۔

دیگر بحری سلاح خانوں کے المہدیہ، سُوسَہ اور بِجایہ میں موجود ہونے کے تحریری شواہد محفوظ ہیں۔

الاندلس : چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں جا کر امویوں نے ہسپانیہ میں سلاح خانے تعمیر کیے۔ انھیں جنگی بیڑوں کی ضرورت، در حقیقت اس لیے تھی کہ نارمن حملوں کا مقابلہ کریں اور بعد میں اس لیے بھی کہ فاطمیوں کے خلاف شمالی افریقہ میں اپنی دخل اندازی کی حکمت عملی کو تقویت دیں۔ سب سے اہم سلاح خانہ المریّۃ Almeria میں تھا۔ اس کے علاوہ ان مقامات میں بھی ان کے موجود ہونے کا پتا ملتا ہے : طَرطُوشہ (Tortosa)، دانیہ (Denia)، المُنَکَّب (Almuñecar)، مالقہ (Málaga)، جبل الطارق، شَلْطِیش (Saltés)، شَنْتَمَرِیّہ (Santa Maria de Algarve)، شِلْب (Silves)، القصر (Alcacer do Sal)۔ غالباً ایک سلاح خانہ قادس (Cadiz) میں بھی تھا جو بنو میمون کی جاگیر تھا۔ اس خاندان نے کئی قائد المرابطون کے جنگی بیڑے کے لیے نیز جزائر بلیارق (Baleanics) میں مہیا کیے۔

غربی مغرب : دو سب سے قدیم سلاح خانے وہ ہیں جو آبنائے جبل الطارق پر سَبْتہ (Ceuta) اور طنجہ (Tangier) میں واقع تھے اور جو پہلے پہل تجارتی جہاز بنانے کی غرض سے قائم کیے گئے تھے۔

بربر : مراکش کے تین بڑے شاہی خاندانوں —— المرابطون، الموحدون، بنو مرین —— کے زمانے میں یہ سلاح خانے فوجی ادارے بن گئے۔ یہ جنگی جہاز اور حمل و نقل کے سفینے تیار کرتے تھے، جن سے آبنائے پر اقتدار قائم رکھنا اور اسلامی ہسپانیہ کی حفاظت کے لیے اس کے پار فوجیں اتارنا ممکن ہو گیا۔

قرون وسطی میں دوسرے بڑے سلاح خانے جن کا علم ہوا ہے یہ ہیں: الجزائر (جسے آگے چل کر عثمانی ترکوں کے دور حکومت میں خاص طور پر ترقی دی جانے والی تھی) اور اوران، ھنین، بادِس، المعمورہ (جو اب سبُو ندی کے دہانے پر المہدیہ ہے)، سلا (Salé) اور انفا (جو اب کاسا بلانکا یا دارالبیضاء ہے) کے سلاح خانے۔

صِقِلّیہ : ہم کچھ کہہ نہیں سکتے کہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں اس جزیرے کے یا ملک اطالیہ کے جن مقامات پر مسلمانوں نے قبضہ کیا وہاں سلاح خانے قائم کیے یا نہیں۔ غالب گمان یہ

ہے کہ صقلیہ میں پلرمو (Palermo) اور میسینا (Messina) میں چند سلاح خانے تھے۔

بحر ہند اور آس پاس کے سمندر: عام طور پر بحر ہند اور اس کی شاخیں، بحر احمر اور خلیج فارس جو مسلمانوں کے سمندر تھے، بہ نسبت بحر روم کے امن و امان کے علاقے تھے۔ بحری ڈاکو تو یہاں بکثرت موجود تھے، لیکن بحری قوت رکھنے والا کوئی دشمن نہ تھا۔ اس وجہ سے یہاں پاسبانی کے دستے کافی ثابت ہوتے تھے، اور غالب گمان یہ ہے کہ وہ تجارتی جہازوں سے، (جو معلوم ہے کہ بغیر کیلوں کے بنائے جاتے تھے) اکثر کام لیتے تھے۔ یہاں بحر روم کے نمونے کا اصلی سلاح خانہ کوئی نہ تھا۔ تاہم بحر قلزم کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، یہ یقینی امر ہے کہ فاطمیوں نے ایک بیڑا بنا رکھا تھا جو بحر احمر میں حجاج اور یمن جانے والے سوداگروں کی حفاظت کے کام آتا تھا اور اس کا مرکزی مقام عیذاب تھا۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ مشرق کی بڑی بڑی تجارتی بندرگاہوں میں جہاز سازی کا کام ہوتا تھا: عدن، اس سے پہلے زمانے میں بصرہ (یا یوں کہیے کہ اس کی بیرونی لنگر گاہ اور پیش رو اُبلّہ)، سیراف جس کی جگہ بعد میں کیش نے سنبھالی، صُحار اور اس کے بعد عمان میں مسقط، اور شاید مغربی ہند اور مشرق افریقہ کے ساحلوں پر آباد مسلمانوں کے شہروں میں بھی جہاز بنتے تھے۔ بہ استثنائے اُبلّہ، ان کے مرتبے اور سیاسی حیثیت کی بابت کوئی یقینی بات کہنا مشکل ہے۔ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے بعد تو، جب کہ بصرے اور سیراف کی بحری سرگرمیاں بہت کچھ ماند پڑ گئی تھیں اُبلّہ کی گودیاں بھی کام کرنے کے قابل نہ رہی تھیں۔

جہازی لکڑی کی فراہمی: قدرتی طور پر سلاح خانے ان مقامات میں قائم کیے جاتے تھے جو یا تو جہاز سازی کی لکڑی (صنوبر اور دیودار، مصر میں بلُوط، ببُول کی قسمیں لَبخ یا سنط، جمیز (مصری توت اور کسی حد تک کھجور اور انجیر) پیدا کرنے والے علاقوں کے قریب ہوتے یا پھر ان مقامات میں جہاں یہ آسانی کے ساتھ اطالوی، ہندی (ساج یا ناریل) اور مشرق افریقہ کے سوداگروں کے ذریعے درآمد کیا جا سکتا تھا، آناطولی کے ساحلوں پر لوٹ مار کرنے والوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے بعد جہاز سازی کی صنعت میں جو زوال آیا اس کے مختلف اسباب میں لکڑی کی روز افزوں کمیابی کو بھی ایک سبب شمار کیا جا سکتا ہے۔

مآخذ: (۱) A.H. Fahmy: *Muslim sea-power in the Eastern Mediterranean, 7th-10th century*، ۱۹۵۰ء؛ (۲) Ekk. Eickhoff: *Seekrieg und See-politik zwischen Islam und Abendland (650-1040)*، یونیورسٹی سارلینڈ (Saarland) ۱۹۵۴ء؛ (۳) M. Lombard: *Arsenaux et bois de marine dans la Méditerranée musulmane (7e-11e siècles)*، در "*Le Navire*" وغیرہ (Travaux du 2e Colloque d'histoire maritime, 1957)، Bibl. Gén. Éc. Htes. Ét., VIe sect.؛ (۴) W. Hoenerbach: *Araber und Mittelmeer, Anfänge und Probleme arabischer Seegeschichte*، در ارمغان زکی ولیدی طوغان ۱۹۵۵ء؛ (۵) G. Wiet، در *CIA Egypte*، ۲: ۱۶۵ تا ۱۶۹ (Mémoires publ. Inst. Franc. archéol. or. 52)؛ (۶) E. Lévi-Provençal: *L'Espagne musulmane au Xe s.*، ص ۱۵۲؛ (۷) وہی مصنف: *Hist. Esp. Mus.*، ۱: ۲۲۳، ۳۶۷؛ (۸) وہی مصنف: *La péninsule ibérique au Moyen Age*، ص ۲۷۱؛ (۹) R. Brunschwig: *Deux récits de voyage inédits en Afrique du Nord*، ص ۱۸۹؛ (۱۰) وہی مصنف: *La Berbérie orientale sous les Ḥafṣides*، ۱: ۳۵۷، ۳۸۲؛ (۱۱) H. Terrasse: *Les portes de l'arsenal de Salé*، *Hesp.*، ۱۹۲۲ء، ص ۳۵۷؛ (۱۲) G. S. Colin:

'Fès Port de mer' در Bull. de l'Ens. Public du 'Maroc' عدد ۱۸۳ (۱۹۳۵ء)؛ (۱۲) G. F. Hourani: 'Arab sea-faring in the Indian Ocean'، ۱۹۵۱ء؛ ایک پروانہ جس میں ایک سمندری شہر پر، جس میں ایک سلاح خانہ تھا، حاکم مقرر کرنے کا حکم ہے، قدامہ: کتاب الخراج، مخطوطہ، استانبول ۲۷ ب، بعد (مخطوطہ پیرس ۱۷۷ ب، بعد) میں شامل ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے لیے جس سے مقالے میں بحث نہیں کی گئی ہے، دیکھیے اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: عثمانلی دولتنن مرکز و بحریہ تشکیلاتی، ۱۹۳۷ء۔

(Cl. Cahen و G.S. Colin)

* **دارالصَّنْعة** : رک بہ دارالصناعة۔

* **دارُالضَّرب** : ٹکسال مشرق اوسط میں قرون متوسطہ کے نظام معیشت کا نہایت ضروری ادارہ تھا، کیونکہ معاشی ترقی کی وجہ سے مسکوکات کا بہت عمل دخل ہو چکا تھا، خصوصاً مسلمانوں کی فتح کی ابتدائی صدیوں میں۔ ٹکسال کا اوّلین فریضہ حکومت اور عوام کی مالی ضروریات کے لیے سکّے مہیا کرنا تھا۔ مالی اصلاحات کے زمانے میں ٹکسال اس ادارے کا بھی کام دیتی تھی جہاں سے گھسے ہوئے سکّوں کے عوض نئے سکّے تبدیل کرائے جا سکتے تھے۔ ٹکسالوں میں چاندی سونا بھی بہت بڑی مقدار میں محفوظ رکھا جاتا تھا، لہٰذا ٹکسالیں ذیلی خزانوں کا بھی کام دیتی تھیں۔

مشرق اوسط کی فتوحات کے فوراً بعد عرب حکمران ٹکسالوں سے کام لینے لگے تھے جو انہیں سابق بوزنطی اور ساسانی حکومتوں سے ورثے میں ملی تھیں۔ بنو امیّہ کے عہد میں خلافت اسلامی نے ٹکسالوں کی تنظیم میں ذاتی طور پر بھی دلچسپی لینی شروع کی۔ یہ امر، الحجّاج کی قائم کردہ نئی ٹکسالوں (مثلاً کوفے اور واسط میں) سے، جو عبدالملک کی مشہور "اصلاحات ضرب سکّہ" [دیکھیے "دینار"] کے تحت قائم کی گئیں، نیز ہشام کے اقدامات سے، جس نے مرکزیت کو مؤثر بنانے کے لیے سختی کے ساتھ ٹکسالوں کی تعداد کم کر دی، واضح ہو جاتا ہے۔ ہشام کی حکمت عملی پر، جو صریحاً بوزنطی حکومت کی ٹکسالوں کی روایات سے متأثر تھی، خلافت عباسیہ زیادہ عرصے تک عمل درآمد نہ کر سکی۔ ہارون الرشید کے عہد میں "ناظرالسکّة" کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اگرچہ اس اقدام سے خلافت اپنے ذاتی اختیارات سے ایک ماتحت ادارے کے حق میں دست بردار ہو گئی، لیکن اس پر بھی وہ ٹکسالی نظام کے اصول مرکزیت کی حمایت کرتی رہی۔ عباسیوں کے سیاسی اور انتظامی اختیارات کم ہو جانے کے ساتھ ناظرالسکّہ کا عہدہ بھی ختم ہو گیا۔ اب تیزی سے پھیلتی ہوئی تجارت، اور صنعتی سرگرمیوں کی وجہ سے ٹکسالوں کی تعداد میں اضافہ اور ان کے منصب کار میں توسیع ہوئی، نیز چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے برسر اقتدار آنے کے باعث، جو ٹکسالوں پر اپنا تسلّط جمانا چاہتے تھے، ٹکسالوں کے نظام میں مرکزیت قائم نہ رہی۔ یہ صورت حال بہت کچھ ساسانیوں کے عہد کے حالات کے مماثل تھی۔

ٹکسالوں پر حکمرانوں کا تسلّط ان کی آزاد حکومت کے دعوے کی ایک دلیل ہوا کرتا تھا۔ یہ دعوی ٹکسالوں کے جاری کردہ سکّوں پر ان کے ناموں کے اندراج سے اشارۃً ظاہر ہوتا تھا، حالانکہ قبل ازیں یہ حق بلا استثنا صرف خلفا کو حاصل تھا۔ بہرحال اس طریقے سے یہ نئے خود مختار حکمران اپنے سکّوں کی قدر و قیمت کا ذمے دار اپنے آپ کو ٹھیراتے تھے۔ سکّوں کے کھرے ہونے اور عوام النّاس کے مفادات کی حفاظت کی غرض سے ٹکسالیں حکام عدلیہ (مثلاً فاطمی مصر اور شام میں قاضی القضاۃ اور گیارھویں صدی کے بغداد میں قاضی) کی تحویل میں دے دی گئیں، جن کے عمال خود سکّہ ضرب کرانے کے کاموں میں مدد دیتے تھے۔ اس نظام کے باوجود ان حکمرانوں نے، جو اپنے صرف زر کے امتیازی حقوق سے ناجائز

فائدہ اٹھاتے تھے، سکوں میں ناجائز ردّ و بدل کرکے عامۃ النّاس کا اعتماد کھو دیا۔

ٹکسال کا عملہ منشیوں اور کاریگروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اوّل الذّکر حسابات اور ٹکسال کی داخلی حفاظت کے ذمے دار تھے۔ کاریگر، مثلاً "سبّاکون" (پگھلانے والے) اور ضرّابون (سکّے ڈھالنے والے) سکّہ سازی کا کام کرتے تھے۔ ان کاریگروں میں "نقّاش" (ٹھپّے ساز) کو خصوصی حیثیت حاصل تھی، جس کا کام فقط نقش کندہ کرنے تک محدود ہوتا تھا۔

مسلمانوں کی ٹکسالوں سے جاری شدہ سکّے سونے، چاندی اور تانبے کے ہوتے تھے [دیکھیے "دینار"، "درہم"، فلس"]۔ سکّے ڈھالنے کے لیے قیمتی دھاتیں سونے چاندی کی سلاخوں کی صورت میں ہوتی تھیں، جو سرکاری حکام نیز عام کاروباری لوگ مہیا کرتے تھے۔ مؤخرالذکر لوگ گھسے ہوئے سکّے اور غیر ملکی سکّے بھی، جن کی مقامی منڈی میں ممانعت ہوتی تھی، ٹکسال کو دیتے تھے، جو سکّے یا دھات کی ایک مقررہ شرح بطور ٹیکس سکّہ سازی خود رکھ لیتی تھی۔ گاہکوں سے جو نقد روپیہ وصول کیا جاتا، اسے ٹکسال کے عملے اور سکّہ سازی کے کاموں پر صرف کیا جاتا تھا، نیز سرکاری ٹیکس کی ادائی بھی اس سے ہوتی تھی۔ جن دنوں تجارتی سرگرمیاں بڑھ جاتی تھیں، سکّہ سازی کا کام بھی زوروں پر ہوتا تھا۔ ٹکسال سے جو کچھ حاصل ہوتا اس سے حکومت کو معتدبہ آمدنی ہوتی تھی۔ لیکن قرون متوسطہ کے اواخر میں اقتصادی بدحالی نے سکّے کی مانگ کو بری طرح کم کیا، اس سے ٹکسالوں کی صورت حال اور ان سے حاصل ہونے والے نفع پر بہت مضر اثرات پڑے۔ بعد ازاں ٹکسالوں کو اجارے پر دینا مناسب سمجھا گیا۔ یہ وہ مفید تدبیر تھی جس پر مثال کے طور پر مصر کے مملوک حکمرانوں نے عمل کیا تھا۔

مآخذ: (۱) ابوالحسن علی بن یوسف الحکیم: الدوحۃ المشتبکۃ فی ضوابط دارالسکّۃ، طبع ایچ۔ مونس، میڈرڈ ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء؛ (۲) ابن خلدون: المقدّمۃ، مترجمۂ F. Rosenthal، نیویارک ۱۹۵۸ء، ۱ : ۳۶۴، و بمواضع کثیرہ؛ (۳) النابلسی: لمع القوانین المضیّۃ فی دواوین الدیار المصریّہ، در C. A. Owen : *Scandal in the Egyptian Treasury*، *JNES*، ۱۴، ج ۲، ۱۹۵۵ء، ص ۵۷ تا ۷۶؛ (۴) ابن بعرہ: کشف الاسرار العلمیّۃ بدارالضرب المصریّۃ (نیز دیکھیے A. S. Ehrenkreutz : *Extracts from the Technical Manual on the Ayyūbid Mint in Cairo*، در *BSOAS*، ج ۱۵، ۱۹۵۳ء، ص ۴۲۳ تا ۴۴۷)؛ (۵) A. S. Ehrenkreutz : *Contribution to the knowledge of the fiscal administration of Egypt in the Middle Ages*، در *BSOAS*، ج ۲۶، ۱۹۵۳ء، ص ۵۰۲ تا ۵۱۳؛ اس میں اسلامی ٹکسالوں کے موضوع پر مزید مآخذ دیے ہوئے ہیں؛ (۶) وہی مصنف: *Studies in the monetary history of the Near East in the Middle Ages*، در *JESHO*، ج ۲، (۱۹۵۹ء)، ص ۱۲۸ تا ۱۶۱)۔

(A. S. EHRENKREUTZ)

عثمانی عہد: عثمانی ٹکسال کو عام طور پر "ضرب خانۂ عامرہ"، "ضرّاب خانہ" اور "دارالضرب" کہتے ہیں۔ عثمانی دارالضرب کا پہلا سکّہ "اقچہ" [رک بآں] تھا، جو برسہ میں غالباً ۷۲۷ھ/۱۳۲۶-۱۳۲۷ء میں ڈھالا گیا (قب اوزون چارشیلی: Belleten، ۳۴: ص ۲۰۷ تا ۲۲۱)۔ مراد اوّل اور بایزید اوّل کے "اقچے" اور "منغیر" نامی تانبے کے سکّوں پر جگہ کا نام نہیں ملتا (H. Edhem : مسکوکات عثمانیہ، استانبول ۱۳۳۴ھ، عدد ۱ تا ۵۸)، لیکن یہ ہمیں معلوم ہے کہ اس کے بیٹوں کے عہد میں برسہ، اَماسیہ، ادرنہ، سرز اور آیا سلوغ، افسوس (Ephesos) میں ٹکسالیں قائم تھیں (دیکھیے ایچ۔ ادہم، عدد ۵۹ تا ۱۲۸)۔

پہلا عثمانی طلائی سکّہ استانبول میں ۸۸۲ھ/

۱۴۷۸ – ۱۴۷۹ء میں ضرب ہوا تھا (I. Artuk: Fatih Sultan Mehmed namına kesilmiş bir sikke، در Ist. Arkeoloji Müzesi Yıllığı، عدد ۷)؛ لیکن اس سے پہلے ۸۷۸ھ/ ۱۴۷۳ء اور اس سے بھی پیشتر عثمانی ٹکسالوں نے ضرور وینس کے ڈوکٹ (طلائی سکّے) بنائے ہوں گے، جنھیں "فرنگی فلوری" یا "الفلوری" کہتے تھے (Fr. Babinger، Zur Frage der osmanischen Goldprägungen im 15. Jahrhundert، در Südost-Forschungen، ج ۱۵، ۱۹۵۶ء، ص ۵۵۷)۔ ایک ضابطے (R. Anhegger-H. Inalcık، Kānūnnāme-i Sultanī ber mūceb-i 'örf-i 'Osmanī، انقرہ ۱۹۵۶ء، عدد ۱ و ۵۸) سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فرنگی فلوری محمد ثانی کے عہد میں استانبول، ادرنہ اور سیرز (Serres) کی ٹکسالوں میں ضرب ہوا تھا۔

عثمانی ترکوں نے اپنی وسعت پذیر سلطنت میں تجارتی اور انتظامی لحاظ سے اہم شہروں میں اور سونے، چاندی کی کانوں کے مراکز میں نئی ٹکسالیں قائم کیں، چنانچہ بایزید ثانی کے زمانے میں انقرہ، قرہ توودہ، قسطمونی اور گیلی پولی میں نئی ٹکسالیں قائم ہوئیں؛ یہ ان ٹکسالوں کے علاوہ تھیں جو استانبول، برسہ، ادرنہ، سیرز، آیا سلوغ، نوویردہ (Novaberda، Novobrdo)، اسکپ (Skoplje)، اماسیہ، تیرہ اور قونیہ میں محمد ثانی کے زمانے سے پہلے موجود تھیں۔ سلیمان اوّل کے عہد میں حلب، دمشق، مصر (قاہرہ)، آمد، بغداد اور الجزائر میں اس کے نام کے طلائی سکّے مضروب ہوئے۔ شعبان ۹۶۲ھ/ اکتوبر ۱۵۵۵ء میں 'وزنجان' کے شمال میں ایک چھوٹے سے قصبے جنجہ کے مقام پر چاندی اور سونے سے معمور کانیں دریافت ہوئیں تو وہاں ایک نئی ٹکسال قائم کی گئی۔ Morava (Gilan)، Novaberda، Sidrekapsa اور Srebrenica (Srebrnica) میں ٹکسالوں کا قیام بھی چاندی اور سونے سے معمور کانوں کی وجہ سے ہوا (دیکھیے R. Anhegger، Beiträge zur Geschichte des Bergbaus im osmanischen Reich، استانبول ۱۹۴۳ء، ص ۱۳۱ تا ۲۱۲)۔ عثمانی قوانین کی رو سے ضروری تھا کہ تمام سونا، جو ملک سے حاصل ہوتا یا باہر سے درآمد کیا گیا ہو، سکّہ سازی کے لیے براہِ راست "ضرب خانوں" (ٹکسالوں) میں لایا جائے۔ نئے "اقچے" [ترک: اَقچہ] جاری ہونے پر جن کے پاس پرانے "اقچے" ہوتے، انھیں ٹکسال میں لانا پڑتا تھا۔ "یسق قلّس" یعنی خاص گماشتے اس بات کے مجاز تھے کہ غیر مسکوک سونے یا پرانے "اقچے" کے لیے کسی شخص کے سامان کی تلاشی کریں (دیکھیے Belleten، ۴۴ : ۶۹۷، ۲ اور Anhegger—Inalcık : قانون نامہ، عدد ۲، ۵، ۵۸) اور اس سونے یا چاندی پر، جسے کسی بیرونی ملک کے باشندے نے درآمد کیا ہو، محصول معاف تھا۔ حکومت اس چاندی پر ۱/۵ محصول عائد کرتی تھی جس کے سکّے "ٹکسال" میں ڈھالے جاتے تھے اور یہ محصول "اقچے" کی اصلی اور سرکاری قیمتوں میں فرق کے برابر ہوتا تھا (Belleten، ۴۴ : ۶۹۷ اور Anhegger-Inalcık، عدد ۵۸)۔

بطور "مقاطعہ" [رک بان] محصول کی وصولی کا اختیار عموماً نیلام میں سب سے اونچی بولی دینے والے کو اجارے پر دیا جاتا تھا۔ اجارہ دار بولی کی رقم باقاعدہ اقساط میں حکومت کے خزانے میں داخل کرتا تھا (دیکھیے Anhegger—Inalcık، عدد ۱۵)۔ Spandugino (طبع Ch. Schefer، پیرس ۱۸۹۶ء، ص ۷۵) ہمیں بتاتا ہے کہ محمد ثانی کے عہد میں "اقچے" کے ہر نئے اجرا کے موقع پر آٹھ ہزار ڈوکٹ (یاڈرفی) آمدنی ہوتی۔ صرف برسہ کے لیے "اقچے" کا اجارہ ۸۹۲ھ/ ۱۴۸۷ء میں چھے ہزار ڈوکٹ میں دیا گیا (دیکھیے Belleten، ۴۴ : ۵۶)۔ جتنی بھی ٹکسالیں ملک میں تھیں ان سب کا واحد "مقاطعہ" کے طور پر اجارہ دیا جا سکتا تھا (Anhegger-Inalcık، عدد ۱۵)؛ لیکن ایک "عامل" خود اپنی ذمے داری پر مقامی

ٹکسالوں کو بھی اجارے پر دے سکتا تھا۔ "عامل" اپنی مدد کے لیے "امین" اور "وکیل" ملازم رکھتا تھا، اگرچہ ٹکسال کے محصول کا وہ خود ذمے دار ہوتا تھا، لیکن اس کاروبار کا چلانا اور نظم و ضبط قائم رکھنا حکومت کے مقرر کیے ہوئے ملازمین سے متعلق ہوتا تھا، یعنی علاوہ "امین" یا "ناظر" کے، جو ٹکسال کی نگرانی کرتا تھا (Anhegger-Inalcık، عدد ۱۲)، ایک "صاحب عیار" یا ناظم، بھی ہوتا تھا اور اس حیثیت میں تمام فنی اور قانونی ضروریات کی ذمے داری اس پر عائد ہوتی تھی (Anhegger-Inalcık، عدد ۱۴، اور اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۱ : ۱۳۵)۔ سکہ ڈھالنے کی عملی کارروائیوں کا ناظم ("استاد" یا "استا") ہوتا تھا۔ اس کے ماتحت کئی کاریگر اور مزدور گروہوں میں منقسم تھے، یعنی "قالبجیاں" [= قالبجی] جو دھات کو پگھلا کر معیاری ڈلے تیار کرتے تھے؛ "کپلدان" یا "کپلدار" دھات کی تختیاں بناتے تھے، جن سے سکے تیار کیے جاتے تھے اور "سکہ زن" یا "سکہ کن" جو کڑی نگرانی کے تحت ٹھپے کے سانچے تیار کرتے تھے۔ ٹکسال کے لیے "دیدبان" (چوکیدار)، "خزینہ دار" (خزانچی) اور کاتب (منشی) وغیرہ بھی مقرر کیے جاتے تھے۔

سکے باری باری (بربنائے نوبت) ڈھالے جاتے تھے۔ ہر باری میں ۱۲۰۶۵ درہم [رک بان] وزنی چاندی دارالسلطنت سے بھیجی جاتی تھی، جس میں سے ۲۰۰۰ درہم کی چاندی خزانے میں رکھی جاتی، ۱۰۰۰۰ درہم ناظم ٹکسال کو سکے ڈھالنے کے لیے دی جاتی اور ۶۵ درہم وزنی چاندی جائز نقصان کے کھاتے میں شمار کی جاتی۔

ٹکسال اور اس کے حساب کتاب کی عام نگرانی کی ذمے داری ایک مقامی قاضی کو سونپی جاتی تھی جو وہاں خود اپنا "امین" مقرر کرتا تھا (Anhegger-Inalcık، عدد ۱۲)۔ قاضی کا فرض تھا کہ وہ مقررہ اوقات پر حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرے اور مرکزی حکومت کو ٹکسال کے محاسبات بھیجے (دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے نصف اول کے "محاسبات ضرب خانۂ بروسہ" کا ایک دفتر یعنی بہی کھاتا بلدیہ Kütüphanesi، استانبول میں موجود ہے، Cevdet yazm. عدد 0.59)۔ ان "براتوں" یعنی تقرر کے فرمانوں میں، جو "عاملوں" اور "امینوں" کو دیے جاتے تھے، یہ بات واضح کر دی جاتی تھی کہ خرید کردہ سونے کے عوض انہیں کتنی رقم ادا کرنا ہوگی اور اس کے ہر سو درہم سے کتنے سکے ڈھالنے ہوں گے۔ ان سب چیزوں سے اجرائے زر کی سرکاری حکمت عملی مترشح ہوتی تھی۔

۸۶۵ھ/۱۴۶۰ء تک چاندی کے ہر سو درہموں سے ۲۶۵ یا ۲۷۸ "اقچے" مضروب ہوتے تھے، لیکن محمد ثانی کے زمانے میں ۳۵۵ یا ۴۰۰، سلیمان اول کے عہد میں ۵۰۰ اور ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء میں ۱۰۰۰ "اقچے" مضروب ہونے لگے۔ عثمانلیوں کا قدیم نظام زر جو "اقچے" پر مبنی تھا اس زمانے سے درہم برہم ہوتا چلا گیا (اسباب کے لیے دیکھیے Belleten، ۹۰ : ۶۵۶ تا ۶۸۳)۔ گھسے ہوئے اور کھوٹے اقچے "زیوف" اور "جرک" منڈی میں بکثرت آ گئے۔ اقچے کی نوعیت اور قدر و قیمت کو استوار کرنے، یعنی "تصحیح سکہ" کی جو بار بار کوششیں کی گئیں، ناکام رہیں (دیکھیے M. Belin، *Essais sur l'his. économique de la Turquie*، پیرس ۱۸۶۵ء، ص ۱۱۸ ببعد (۲) آئی۔ غالب: تقویم مسکوکات عثمانیہ، استانبول ۱۳۰۷ھ، ص ۲۲۰ تا ۲۲۹)۔ ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں گھسے ہوئے اور پرانے اقچوں کا استعمال ایک بار پھر ممنوع قرار دے دیا گیا اور "نسغ" (یعنی کھرے) "اقچے" کی شرح فی اشرفی ۱۲۰ "اقچے" قرار دی گئی۔ اشرفی کا وزن ایک درہم ۱$\frac{1}{2}$ قراط [رک بان] مقرر تھا۔ زمانۂ مابعد میں عثمانی ٹکسالوں نے بہت کم سرگرمی دکھائی اور ان میں بہت سی بند بھی ہو گئیں۔ گیارھویں صدی ہجری/

سترھویں صدی عیسوی میں صرف استانبول، قاہرہ، بغداد، طرابلس، تونس اور الجزائر کی ٹکسالیں مستقل طور پر کام کرتی تھیں۔ اس صورت حال کا بنیادی سبب یورپی اقوام تھیں، جنھوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ چاندی کی قیمت میں فرق کے باعث بہت نفع اٹھایا جا سکتا ہے، اپنے ہاں کے نقرئی سکوں کو روز افزوں تعداد میں ترکی علاقوں میں درآمد کرنا شروع کر دیا (صرف ۱۶۶۴ء ہی میں تنہا فرانسیسیوں نے ۷۰ لاکھ ایکو écu درآمد کیے)۔ پہلے "ریالوں" (=ہسپانوی Reales) نے، پھر گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں "ارسلانی" "اسدی" یا "ابوکلب گُرش" نے، بعد میں ہالینڈ کے Loewen rikendaler و "قرہ گُرش" اور جرمنی thalers نے بحر روم کے عثمانی ممالک کی منڈیوں پر ہلّہ بول دیا۔ ان سکوں کی درآمد محصول سے آزاد تھی، لیکن آزادانہ اجرا کے لیے شرط یہ تھی کہ ان پر عثمانی ٹکسالوں میں "صحّ" کا نشان مرتسم کرایا جائے، وجہ یہ تھی کہ یورپی اقوام ترک علاقوں کے لیے خاص طور پر جعلی سکّے بنوا کر روز افزوں تعداد میں درآمد کر رہی تھیں۔ ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء میں ایک طلائی سکّے کی سرکاری شرح ۳۰۰ اور ایک "گُرش" (piastre) کی ۱۶۰ "اقچے" تھی (Basvekâlet Arsivi, Fekete tasnifi، عدد ۳۰۴۳)۔ انجام کار "گُرش" کو بنیادی عثمانی سکہ مان لیا گیا، کیونکہ اقچہ کھوٹ، قیمت میں تخفیف اور تجارتی چاندی کی افراط و ارزانی کے باعث قیمت میں بہت کم رہ گیا تھا۔ چھے درہم چاندی کا پہلا عثمانی گُرش جرمنی کے thaler کے نمونے ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء میں مضروب ہوا (دیکھیے آئی۔ غالب، ۲۳۷، ۲۵۴)۔ اس کی شرح ۴۰ "پرہ" (پارے) کے برابر رکھی گئی جو پہلی مرتبہ مراد چہارم کے عہد میں مضروب ہوا تھا۔ نصف گُرش "نصفیہ" اور چوتھائی گُرش "ربعیہ" سکّے بھی مضروب ہوئے۔

اس نئے نظام سے عثمانی سکّے کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ "اقچہ" بنیادی اکائی نہ رہا، گو یہ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء تک مضروب ہوتا رہا۔ پھر مضروب سکّوں کی نوعیت کی اصلاح کی طرف خصوصی توجّہ دی گئی (دیکھیے آئی۔ غالب، ص ۳۰۲)۔ سونے کے سکّوں کے لیے نئی ٹکسالیں ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء میں ادرنہ، ازمیر (سمرنا) اور ارز روم میں قائم کی گئیں اور تانبے کے سکّوں کے لیے استانبول میں توشن تشی کے مقام پر اور بوسنہ سرائے میں سکّہ سازی کے لیے جدید آلات و اسلوب اختیار کیے گئے (راشد: تاریخ، استانبول ۱۲۸۲ھ، ۲: ۲۸۳، ۲۹۳)۔ ۱۳ جمادی الاولٰی ۱۱۳۹ھ/۶ جنوری ۱۷۲۷ء کو سب سے بڑی ٹکسال اپنی پرانی جگہ "سیم کش خانہ" سے نئی عمارات میں، جو توپ قپی سرائے کے پہلے احاطے میں ہے، منتقل ہوئی (کُچک چلبی زادہ عاصم: تاریخ، استانبول ۱۲۸۲ھ، ۲: ۴۴۳)۔ اسی عہد میں صوبائی ٹکسالیں کسی بہتر انتظام کی خاطر پھر بند کر دی گئیں۔ ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں جو نقرئی سکّے مضروب ہوئے ان میں "گُرش" کا وزن ۸ درہم ۲ قراط، "زولوتا" کا وزن ۶ درہم ۴ قراط، "پارے" کا وزن ۲ تا ۲ ۱/۳ قراط اور "اقچے" کا وزن ۳/۴ تا ۱ ۳/۴ قراط تھا۔ "گُرش" اور "زولوتا" میں ۵۰ فی صد خالص چاندی ہوتی تھی (آئی۔ غالب، ص ۲۸۰)۔

عثمانی حکومت مالی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سکّہ سازی کو ہمیشہ محصول کا ایک ذریعہ خیال کرتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے سکّوں میں کھوٹ کی آمیزش ہونے لگی اور اصلاح سکّہ کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں (آئی۔ غالب، ص ۳۰۲، ۳۲۷، ۳۰۷؛ احمد جودت: تاریخ، ج ۴، استانبول ۱۲۷۵ھ، ص ۱۲۳؛ ج ۵، اوّل، ۱۲۷۸ھ، ص ۲۸۹)۔ محمود ثانی کے زمانے میں صورت حال خراب تر ہو گئی۔ انجام کار عبدالمجید کے عہد میں "فرمان" مؤرخہ ۲۶ صفر ۱۲۵۶ھ/۲۹ اپریل ۱۸۴۰ء کے ذریعے اجرائے

زر کے مغربی اصولوں کو رہنمائی کے لیے قبول کر لیا گیا (دیکھیے متن در ایس ۔ سودی: اصول مسکوکات عثمانیه و اجنبیه، استانبول ۱۳۱۱ھ، ص ۶۷ تا ۱۰۴)۔ "ضرب خانۂ عامرہ" میں نئی عمارات کا اضافہ کیا گیا اور ایسے مشینوں اور انگلستان سے بلائے ہوے ماہرین کی مدد سے بالکل جدید طرز پر منظم کیا گیا (دیکھیے H. Ferid: نقد و اعتبار مالی، مسکوکات، استانبول ۱۳۳۳ھ، ص ۲۱۵ تا ۲۲۲)۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں نئے طلائی اور نقرئی سکے "مجیدی" کے نام سے مضروب ہوے (دیکھیے آئی ۔ غالب، ص ۴۲۲ تا ۴۴۵).

مآخذ: متن کے حوالوں کے علاوہ (۱) S. Lane-Poole: *The Coins of the Turks in the British Museum*، قسم ۶، موزۂ بریطانیه میں مشرق سکوں کی فہرست، ج ۸، لنڈن ۱۸۸۳ء؛ (۲) E. von Zambaur: *Contributions à la numismatique orientale, Numismatische Zeitschrift*، ۳۶ : ۳۳ تا ۱۲۲؛ ۳۷ : ۱۱۳ تا ۹۸؛ (۳) ایم ۔ کاظم: *Darbkhanenin ahwal-i dākhiliyyesi*، در *TOEM*، ۱ : ۵۵۱ تا ۵۵۷؛ (۴) A. Refik: *Onaltinci asirda Istanbul hayati*، استانبول ۱۹۳۵ء، ص ۶۸ تا ۷۰؛ (۵) اولیا چلبی: سیاحت نامه، ج ۱، استانبول ۱۳۱۴ھ، ص ۵۶۵ تا ۵۷۶؛ ج ۱۰، استانبول ۱۹۳۸ء، ص ۱۲۵؛ (۶) P. Masson: *Hist. du commerce français dans le Levant au XVII^e siècle*، پیرس ۱۸۹۶ء، ۳۲ تا ۳۳؛ ۹۳ تا ۹۵؛ (۷) I. Artuk: *Fatih'in sikke ve madalyalari*، استانبول ۱۹۴۶ء؛ (۸) او ۔ ن ۔ توری [Ergin]: مجلۂ امور بلدیه، ج ۱، استانبول ۱۹۲۲ء۔

(HALIL İNALCIK)

پاکستان و ہند: پہلی صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ کی قدیم عرب حکومت کے غیر اہم سکوں سے قطع نظر، مسلم حکمرانوں کے قدیمی سکے جو اس بر صغیر میں جاری ہوے، دو زبانوں کے "تنکے" تھے، جنھیں محمود غزنوی نے ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء اور ۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء میں لاہور میں ضرب کرایا۔ جب لاہور غزنوی حکمرانوں کا دارالامارت بنا تو یہاں مختلف دھاتوں کی آمیزش والے چھوٹے چھوٹے سکے وقتاً فوقتاً مضروب ہوے، لیکن جن ٹکسالوں میں یہ سکے مضروب ہوے، ان کا کچھ حال معلوم نہیں [سلطان فرخ زاد ابن مسعود کے عہد (۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء) کے سکے جو "لاہور" میں ضرب ہوے، لاہور کے عجائب خانے میں موجود ہیں ۔ س ۔ ہ]۔ معز الدین محمد بن سام نے لاہور، دہلی، پشاور اور غزنی میں سکہ ضرب کرایا، نیز قنوج [رک بآں] میں بھی جب اسے ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں سر کر لیا گیا۔ اوزان کے نظام اور ساخت کے اعتبار سے یہ سکے اور شمالی ہند کے مروجہ سکے یکساں قرار دے دیے گئے؛ ان میں سونے کے سکے بھی شامل تھے۔ محمد بن سام کے نائب یلدز نے اپنے اور اپنے آقا کے مشترکہ ناموں کا سکہ مضروب کرایا: چھوٹے (بہ تصحیح) "دہلی وال" سکے جو مقامی رائج الوقت سکوں میں ضم کرنے کے لیے پہلے کرمان میں، جن میں طلائی اور نقرئی سکے بھی شامل تھے، اور بعد میں دہلی میں، جو فقط کم قیمت دھات کے تھے، ضرب کرائے گئے، بدستور قائم رہا۔ محمد بن سام کی وفات تک ہندوستان میں کوئی سونے یا چاندی کا سکہ، بجز قنوج کی اشرفیوں کے، مضروب نہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے چاندی کا سکہ سب سے پہلے شمس الدین التتمش نے مضروب کرایا تھا جس کا اصلی وزن [illegible] گرام تھا۔ اس عہد میں سکہ سازی کا واضح تجرباتی دور شروع ہوا، کیونکہ اس کے ابتدائی سکوں کے اوزان اور اوضاع متنوع نظر آتے ہیں، تا آنکہ بظاہر ۶۳۲ھ/۱۲۳۴-۱۲۳۵ء تک اس کے نقرئی سکوں کے لیے ایک مستقل وضع نکل آئی، جس سے آئندہ اس کے طلائی سکوں کے لیے بھی نمونے کا کام لیا گیا۔ ملی جلی کم قیمت دھات کے سکے بہرحال زیادہ تر رائج رہے،

ان میں تانبے کے چھوٹے سکّے کا بھی اضافہ ہوا۔ چاندی، جو اب تک مضروب ہوتی رہی تھی، اس میں بہت کھوٹ ہوتی تھی۔ شمسی ٹکسالیں ملتان اور ناگور میں بھی قائم کی گئیں، التمش کے جانشینوں نے ان ٹکسالوں میں سکّہ سازی کا یہی نظام جاری رکھا۔ اس سلسلے میں غزنی کا ذکر بار بار آتا ہے اور بروان کا بھی، جس کے قریب چاندی کی کانیں تھیں۔ سلطانہ رضیہ (۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء تا ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء) کے عہد تک ٹکسالیں مشرق میں بنگال تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وقت کے چاندی کے "تنکوں" پر "دارالضرب لکھنوتی" کا نام کندہ نظر آتا ہے۔ اس عہد کے دہلی میں ڈھلے ہوئے سکّوں کی جانچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہزار سکّوں میں ۹۹۰ سے ۹۹۶ گرین تک چاندی ہوتی تھی، مگر بنگال کے سکوں میں اس سے کم، یعنی ۹۸۹ بلکہ ۹۶۲ گرین تک۔ غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء تا ۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء) کے عہد تک بنگال کا سکّہ دہلی سے آزاد ہو چکا تھا اور وہاں مستقل حکومت کے دور میں دارالضرب کے انتظامات بھی درست اور استوار ہونے کی صورت نکل آئی تھی۔ بلبن کا عہد حکومت باقاعدہ طلائی سکّوں کے رواج کے لیے ممتاز ہے۔ طلائی سکّے چاندی کے سکّوں کے نمونے کے مطابق ڈھالے جاتے تھے۔

علاء الدین محمد شاہ (۶۹۵ تا ۷۱۵ھ/۱۲۹۵ تا ۱۳۱۵ء) نے فوج کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے نقرئی "تنکوں" کو ۱۰٫۷۵ سے ۱۰٫۳ گرام تک کم کرا دیا لیکن طلائی سکّے ۱۰٫۷۵ گرام ہی کے رہے، جو اکثر بھونڈے طریقے سے مضروب ہوتے تھے۔ اس کی جنوبی فتوحات کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے طلائی سکوں "ہون" عارضی فوجی ضروریات کے پیش نظر دوبارہ مضروب کرائے گئے تھے، لیکن انھیں شمالی ٹکسالوں کے معیار پر لانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان کے خالص ہونے کی اوسط شرح آئین اکبری ۱: ۵ میں ۱۲ میں ۸٫۵ حصے بیان کی گئی ہے، حالانکہ علاء الدین کے دہلی کے سکّے میں یہ اوسط شرح ۱۲ میں ۱۰٫۵ حصے ہوتی تھی۔ دیوگری میں ٹکسال قائم ہوئی تو وہاں سے ایک طلائی سکّہ ۷۱۴ھ/۱۳۱۴-۱۳۱۵ء میں جاری ہوا۔ علاء الدین کے جانشین قطب الدین مبارک شاہ ۷۱۶ تا ۷۲۰ھ/۱۳۱۶ تا ۱۳۲۰ء نے "قطب آباد" (=دہلی؟) میں نئے چوکور طلائی اور نقرئی معیاری وزن کے سکّے، نیز ۶۶ اور ۳۳ گرام کے تانبے کے سکّے بھی مضروب کرائے۔

غیاث الدین تغلق نے دہلی کے ٹکسالی نظام کو جاری رکھا اور ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء میں بنگال پر فوج کشی کے وقت ایک سکّہ اس نے خود بھی مضروب کرایا۔ اس کے بیٹے محمد بن تغلق کے سکّوں کی وضع میں ندرت اور اوزان میں تنوع ہے اور وہ کمال فن کے مظہر بھی ہیں۔ طلائی سکہ دیوگری میں، جو بعد میں دولت آباد [رگ بان] کے نام سے موسوم ہوا، اور سلطان پور (=ورنگل) میں ۲۰۰ گرام کے "دینار" تک کا سکّہ مضروب ہوا۔ دہلی کا سکّہ متعدد چھوٹے چھوٹے حصّوں میں منقسم تھا۔ ایک "تنکہ" ۴۸ "کانیوں" کا ہوتا تھا۔ ۱، ۲، ۶، ۸، ۱۲، ۱۶ اور پوری ۶۴ "کانیوں" کے سکّے ہمارے علم میں ہیں۔ "کانی" تانبے کے چار "فلسوں" کی تھی۔ اس نظام کے علاوہ جزوی طور پر ۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ کانیوں کا اعشاری نظام بھی تھا۔ ۵۰ کانیوں کے سکّے کو "عدلی" کہتے تھے، ۱۴۰ گرام چاندی کے اس سکّے نے سابقہ سب سے بڑے سکّے یعنی نقرئی تنکہ کی جگہ لے لی۔ نئے دینار کا تبادلہ ۸ پرانے نقرئی تنکوں یا ۱۰ "عدلیوں" سے ہونے لگا۔ یہ شرح سونے اور چاندی کی اضافی قیمتوں کے حساب سے مصنوعی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سکّوں کا مکمل نظام بعد ازاں چاندی اور تانبے کو حسب خواہش تناسبات سے ملانے کے لیے خلط ملط کر دیا گیا تاکہ اصلی قیمت میں مختلف مگر قامت میں یکساں سکّوں کو ڈھالا جا سکے۔ اس سے "سیاہ تنکہ" کا رواج شروع

ہوا، جس میں فقط ۱ء۶۳ گرام چاندی ہوتی تھی اور اس کی قیمت پرانے نقرئی "تنکہ" کے $\frac{1}{8}$ کے برابر تھی۔ بقول ابوالفضل (آئین اکبری، ۱: ۷ بذیل مادّہ "ضرّاب") دمات کو گول ڈلوں میں ڈھال کر کاٹ لیا جاتا تھا۔ چونکہ سیاہ تنکہ جسامت میں نقرئی تنکے جتنا تھا اور ایک ہی سانچے دونوں کے لیے استعمال ہو سکتے تھے بلکہ ہوتے تھے، اس طرح ٹکسال کے کارکنوں کا کام آسان اور رفتار تیز تر ہو جاتی تھی۔ سانچوں کی ایک ہی جیسی چھوٹی جسامت کی وجہ سے سکوں کو مضروب کرنے کے لیے نسبۃً کم محنت کی ضرورت پڑتی تھی اور نتیجۃً ٹکسال کی کارکردگی بڑھ جاتی تھی۔

۷۳۱ تا ۷۳۲ھ/۱۳۳۰ تا ۱۳۳۲ء میں محمد بن تغلق کا مصنوعی سکہ نکلا، یعنی پیتل کا علامتی سکّہ جس کی سرکاری قیمت ایک "عدلی" مقرر کی گئی تھی۔ یہ تجربہ ناکام ہوگیا کیونکہ جعلسازی کی پوری طرح روک تھام نہیں کی گئی تھی۔ مقامی کاریگروں نے ہزاروں کی تعداد میں علامتی سکّے بنا لیے، لیکن تین برس کے بعد یہ سب منسوخ کر دیے گئے؛ اس طرح ان سکوں کی تمام رقوم عملی طور پر سلطان کی رعایا کا عارضی قرضہ بن گئیں، جسے سود کی بہت بڑی شرح کے ساتھ ادا کرنا پڑا۔ اس کے بعد رائج الوقت سکّے معمول کے مطابق بننے لگے، بجز ۷۴۱ تا ۷۴۳ھ/ ۱۳۴۰ تا ۱۳۴۲ء کے سونے اور چاندی کے سکّوں کے جو خلفاے مصر کے نام پر مضروب ہوئے۔

فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ تا ۷۹۰ھ/۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ء) نے ۱۷۵ گرام کا طلائی "سکّہ" جاری رکھا، لیکن اس کے نقرئی تکمیلی جز کو ضرب نہیں کرایا۔ طلائی سکّے کی جب خوب کثرت ہوگئی تو اس نے چاندی کو اس کی ماسبق ذمے داری سے سبکدوش کر دیا اور ٹکسالوں کی توجّہ ریزگاری بنانے پر مرتکز ہوگئی، جس میں چاندی اور تانبے سے مرکب چھوٹے سکّے بھی تھے۔ ۱۴۰ گرام کے سکّوں کی پرکھ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ۱۲، ۱۸ یا ۳۲ گرام خالص چاندی ہوتی تھی۔ مابعد کے تغلق سلاطین اور جونپور کے شرقی سلاطین فیروز شاہ کی روایت کی پیروی کرتے رہے۔

تیمور کے ہاتھوں دہلی کے تباہ ہو جانے سے ٹکسالوں کو زوال آ گیا۔ تیمور کی لوٹ مار کے باعث سونا بڑی حد تک ناپید ہوگیا اور سیّد خضر خاں نے فیروز اور اپنے دیگر پیشروؤں کے نام کے سکّے اصل سانچوں کو استعمال کرتے ہوئے مضروب کرائے (لیکن تیمور کے نام کے نہیں جیسا کہ فرشتہ نے دعوی کیا ہے)۔

دکن میں ٹکسالیں پہلے پہل بہمنیوں [رکّ بآں] کے عہد میں قائم کی گئیں۔ احسن آباد، گلبرگہ، اور دوسرے مقامات پر ان کے قائم ہونے سے پہلے سناروں اور سونے کے تاجروں کو شاہی مہر کے حوالے کے بغیر رائج الوقت سکّہ بنانے کی اجازت تھی اور سکّوں کی حفاظت اہل حرفہ کی برادری کرتی تھی۔ بعد کے دکنی سکّوں میں نقرئی "لارین" (مچھلی کے کانٹے کی طرح کا سکّہ) بہت دلچسپ تھا، جسے علی ثانی بیجاپوری نے مضروب کرایا اور جو دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی بحری تجارت کا معیاری سکّہ بن گیا (دیکھیے G. P. Taylor : *On the Bijapur* *'Lari or Larin'* در *JASB*، NS جلد ۶، ۱۹۱۰ء، ص ۶۸۷ تا ۶۹۰)۔

سلاطین مغلیہ، بابر (۹۳۲ تا ۹۳۷ھ/۱۵۲۶ تا ۱۵۳۰ء) اور ہمایوں کے عہد میں جو سکّے مضروب ہوئے ان میں وسط ایشیا کے نمونوں اور وہیں کے نظام زر کی پیروی کی گئی تھی۔ غالبًا باہر سے لائے ہوئے کاریگروں پر انحصار کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں بادشاہوں نے نقرئی "شاہ رخیاں" آگرہ، لاہور، دہلی اور کابل میں مضروب کرائیں۔ بابر نے ٹکسال کے مقام کو "اُردو" (لشکر) کا نام دیا۔ ہمایوں کے بہت سے طلائی سکّے ٹکسالی نہیں اور اس کے تانبے کے

سکّوں پر کوئی نام کندہ نہیں ہے۔

دخیل حکمران شیر شاہ ۹۴۵ تا ۹۵۲ھ/۱۵۳۸ تا ۱۵۴۸ء نے، جو مقامی حالات کا گہرا عملی تجربہ رکھتا تھا، سکّوں کی اصلاح کرنی شروع کی۔ اسے بعد میں اکبر نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا؛ یعنی ایک نیا ۱۷۸ گرام کا معیار چاندی کے روپے کے لیے اور ۳۲۴ گرام کا تانبے کے لیے مقرر کیا، ان کی تقسیم چھوٹے اجزاء میں ایک دوسرے کے تناسب سے کی؛ مخلوط دھات کے چھوٹے سکّے موقوف کر دیے اور ٹکسالوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ (۲۵ سے اوپر) کیا۔ بہت سے چاندی اور تانبے کے سکّوں پر ٹکسال کا نام نہیں۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹھپا زیادہ بڑا تھا، اور سکّوں کی گولائی کم تھی جس کی وجہ سے نام ٹھپّے میں نہ آسکا۔

ہمایوں نے اپنی حکومت کے دوسرے مختصر دور میں سوری کے نظام کو جوں کا توں رہنے دیا۔ اکبر نے اگرچہ اس نظام کو اصولاً تو برقرار رکھا، لیکن انواع سکّہ کی تعداد میں بڑی توسیع کی۔ ابوالفضل (آئین اکبری، ۱: ۱۰) ان کی تعداد ۳۰ سے زائد بتاتا ہے اور یہ تعداد بھی آخری نہیں ہے (قب Hodivala : *Studies*، جلد ۳)۔ آئین اکبری میں ٹکسال کے طریق کار کا تفصیل سے ذکر آیا ہے: اس کا سربراہ یا ناظم ”داروغہ“ ہے جس کی معاونت ”امین“ کرتا ہے۔ ”صیرفی“ سونے چاندی کے کھرے رکھنے کا ذمے دار ہے۔ ”مشرف“ کے پاس اخراجات کا بہی کھاتا ہوتا ہے۔ سوداگر، تولنے، پگھلانے والے اور دھات کے ڈلے بنانے والے کارکن، کاریگروں کے علاوہ ہیں۔ جب دھات کے ڈلوں کو صاف اور خالص کر لیتے، پگھلا لیتے اور نئے سانچہ میں ڈھال لیتے ہیں تو ”ضراب“ انھیں کاٹتا اور ”سکّچی“ ان پر سانچوں سے مہریں لگاتا ہے، جسے کندہ کار نے کندہ کیا ہے۔ ”سکّچی“ کا عہدہ یوزباش کے برابر ہوتا ہے۔ دھاتوں کو نکالنے اور انہیں الگ کرنے، چاندی اور سونے کو نتھارنے اور پرکھنے کے طریقے مفصّل بیان کیے گئے ہیں (آئین اکبری، ۱: ۴ تا ۹)۔ آئین اکبری، ۱: ۱۲ کے اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہے کہ ہر فرد سونے کو ٹکسال میں لے جا سکتا تھا، جہاں اسے صاف اور خالص کرنے کے بعد سکّے میں تبدیل کر دیا جاتا اور ٹکسال کے اخراجات نیز ۵½ فی صد بطور حق سکّۂ حکومت وصول کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل اس بات کا بھی خاص طور پر ذکر کرتا ہے کہ سکّے کے گھس جانے پر اس کی سرکاری قیمت میں تخفیف کی اجازت تھی، مثلاً سونے کی ”مہر“ جب مضروب ہوتی، تو اس کی قیمت ۴۰۰ ”دام“ ہوتی تھی، گو نسبۃً چھوٹی مہریں ۳۶۰ ”دام“ کی بھی مروّج تھیں۔ جب تک وزن میں تین چاول سے زیادہ کمی نہ ہوتی، کوئی رعایت نہ دی جاتی تھی، لیکن جب اس میں چار سے چھے چاول تک کمی ہو جاتی تو اس کی قیمت ۳۵۵ دام رہ جاتی؛ اگر اس کا وزن مزید کم ہو جاتا تو اسے قبول نہ کیا جاتا اور اسے غیر مسکوک سونا شمار کیا جاتا۔ دھوکا دھی کو روکنے کے لیے کہ کہیں پورے سکّوں کو اجازت شدہ قانونی تخفیف تک کم نہ کر دیا جائے، بادشاہ نے حکم دیا کہ ٹکسال میں سرکاری اوزان (باٹ) بنائے جائیں اور لگان وصول کرنے والے رقم کی وصولی کسی خاص سکّے میں کرنے کا مطالبہ نہ کریں۔ ابوالفضل یہ بھی لکھتا ہے کہ سونے کے سکّے مضروب کرنے کے لیے چار ٹکسالیں تھیں؛ دس اور بھی تھیں جہاں چاندی اور تانبے کے سکّے مضروب ہوتے تھے؛ ان کے علاوہ ۲۸ صرف تانبے کے سکّوں کے لیے تھیں۔ اس عہد حکومت میں سونا ۲۱ ٹکسالوں میں، چاندی ۴۵ ٹکسالوں میں اور تانبا ۶۴ ٹکسالوں میں مضروب ہوتا تھا۔ مکمل نظام سکّہ سازی کے لیے [رک باں] ”سکّہ“۔

جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں نظام سکّہ سازی ویسا ہی رہا، بجز بہت بڑے سکّوں کے جو وزن

میں ایک ہزار تولے تک کے تھے (۱ تولہ=۱۸۵٫۵ گرام) اور جو صرف ممتاز شخصیتوں کو عطیہ دینے کے لیے استعمال ہوتے یا سونے کے ذخیرے کے طور پر جمع کیے جاتے تھے؛ ان کے علاوہ سونے یا چاندی کے "نثار" بھی مضروب ہوے، جو تقریباً ۴۰ گرام کے ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں جزیہ (رک باں) لگایا تو اس نے مراع نقرئی "درہم شرعی" مضروب کرایا تاکہ شرعی شرح پر ادائی آسان ہو جائے۔ فرخ سیر نے بھی ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۷ء میں اس عمل کو دہرایا۔ اس نے ٹکسالوں کو اجارے پر دینے کی حکمت عملی اختیار کی، جس کے باعث متعدد آزاد سرداروں اور ریاستوں کو مغل شہنشاہوں کے نام پر خود اپنے سکے مضروب کرانے کا موقع ملا۔ ایسا ہی فی الواقع برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا اور شاہ عالم کے سکوں پر گلاب کے بار، گھاس (آئرلینڈ کی) اور گوکھرو (سکاٹ لینڈ کا قومی نشان) جو لارڈ لیک Lord Lake کے ۱۸۰۳ء میں دہلی میں داخلے کی یادگار تھے، برطانیہ کی "شاہی" ٹکسال میں خارجی اثر و نفوذ پر دلالت کرتے ہیں۔

مغلیہ دور کے متنوع سکوں کی ٹکسالوں کی عمومی تعداد کا اندازہ دو سو سے زائد لگایا گیا ہے — نیز یہ بھی کہ نئے نئے سکے ضرب کرانے کی برابر کوشش ہوتی رہی۔ سکوں کے لیے سال کے ہر مہینے کے کتبے الگ الگ بھی ہوتے تھے۔ چند سال تک جہانگیر ہر مہینے مدوّر اور چوکور روپے باری باری ضرب کراتا رہا، بعد ازاں مہینوں کے ناموں کے بجاے آسمانی بروج کی شکلیں بھی نقش کرائیں۔ ہمایوں کے عہد ہی سے سکوں پر خاص خاص علامات بننے لگی تھیں۔ بعض دفعہ یہ علامات ٹکسال کے مہتمم کی تبدیلی کو ظاہر کرتی تھیں؛ بعض اوقات یہ ٹکسال کا کوئی واضح نشان ہوتی تھیں۔ یہ بات، کہ بعد کی مغلیہ ٹکسالیں بنیادی طور پر اسی طرح عمل کرتی تھیں جیسا کہ ابوالفضل نے بیان کیا ہے، ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴-۱۷۱۵ء کی ہدایت القواعد سے مترشح ہے، جس میں ٹکسال کے مروجہ قواعد مندرج ہیں (حوالہ از W. Irvine: *Mint rules in 1126 A. H.*، در *Proc. ASB*، ۱۸۹۸ء، ص ۱۴۹ تا ۱۵۲)۔

مآخذ: سلاطین دہلی کے عہد میں ٹکسال کی تاریخ کی شہادت فقط سکوں ہی سے ملتی ہے؛ نیز دیکھیے: (۱) E. Thomas: *The chronicles of the Pathan kings of Dehli*، لندن ۱۸۷۱ء؛ (۲) H. Nevill: *Mint towns of the Dehli Sultans*، *JASB*، NS ج ۱۷، ۱۹۲۱ء، ص ۱۱۶ تا ۱۳۰؛ (۳) وہی مصنف: *The currency of the Pathan Sultans*، مجلۂ مذکور، ص ۱۲ تا ۳۰ (اس سے تھامس کی بیان کردہ جزئیات کے متعدد نکات کی تصحیح ہوتی ہے)؛ (۴) R. Burn: *Muhammad Tughluq's forced coinage*، *JASB*، NS ۲۹، ۱۹۳۳ء، شمارہ ۵ تا ۶؛ (۵) H.N. Wright: *The Sultans of Delhi: their coinage and metrology*، دہلی ۱۹۳۶ء؛ (۶) S. H. Hodivala: *Historical Studies in Mughal Numismatics*، کلکتہ ۱۹۲۳ء؛ (۷) C. R. Singhal: *Mint-towns of the Mughal emperors of India* (Memoir iv, NSI)، بمبئی ۱۹۵۳ء؛ (۸) وہی مصنف: *Bibliography of Indian Numismatics*، ج ۲ *(Muhammadan and later Series)*، بمبئی ۱۹۵۲ء۔

[J. BURTON-PAGE]

* **دَارالطِّرَاز** : رک بہ طراز۔

* **دَارالعِلْم** : یہ نام متعدد کتاب خانوں یا علمی اداروں کو دیا گیا جو مشرق بلاد اسلامیہ میں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں قائم ہوے۔ المامون کے بیت الحکمۃ [رک باں] کے ناپید ہو جانے کے بعد ایک ادیب علی بن یحیی المنجم (م ۲۷۵ھ/۸۸۸ء) نے، جو المتوکل اور بعد میں المعتمد کا دوست تھا، اپنے خرچ سے اپنی قیام گاہ (بمقام کرکر، نزد بغداد)

میں ایک کتاب خانہ قائم کیا ۔ اسے [= خزانۃ الحکمۃ (یاقوت)] "خزانۃ الکتب" کہتے تھے اور وہ تمام مسالک کے علما کے لیے کھلا تھا (یاقوت: ارشاد، ۵ : ۴۵۹، ۴۹۷)۔ ایک اور مصنف اور شاعر، شافعی فقیہ جعفر بن محمد ابن ہمدانی الموصلی (م ۳۲۳ھ / ۹۳۴ء) نے موصل میں "دارالعلم" نامی ایک ادارے کی تاسیس کی ۔ اس میں ایک کتاب خانہ بھی تھا [جس میں تمام علوم سے متعلق کتابیں تھیں اور] جو ہر ایک کے لیے کھلا تھا (یاقوت: ارشاد، ۲ : ۴۲۰)۔ آل بویہ کے عہد اقتدار میں مزید کتاب خانے دوسرے شہروں میں کھل گئے اور انھوں نے شیعی عقاید کی اشاعت میں بڑا حصّہ لیا ۔ ان میں سے وہ کتاب خانہ جو شیراز میں تھا اسے عضدالدولہ نے قائم کیا تھا اور یہاں جغرافیہ دان المقدسی (۳۴۹ھ) اکثر آتا تھا ۔ البصرہ اور رام ہرمز میں دیگر کتاب خانے ایک شخص ابن سوّار نامی نے قائم کیے ۔ ان کا تعلق مذہب معتزلہ سے تھا ۔ رے کا کتاب خانہ (المقدسی، ص ۳۹۱، ۴۱۳؛ یاقوت: ارشاد، ۲ : ۳۱۵؛ ابن الجوزی: المنتظم، ۹ : ۵۳) الحاد و زندقہ کا مرکز ہونے کی بنا پر سلطان محمود غزنی کے حکم سے بعد میں ختم کر دیا گیا تھا ۔

سب سے اہم ادارہ وہ "دارالعلم" تھا جس کی بنیاد وزیر ابو نصر سابور بن اردشیر نے بہاء الدولہ کے عہد حکومت میں بغداد میں رکھی تھی ۔ یہ الکرخ محلے کی ایک عمارت میں ۳۸۱ھ/۹۹۱ء یا ۳۸۳ھ/۹۹۳ء میں قائم ہوا تھا ۔ اس میں تمام علمی موضوعات پر دس ہزار سے زائد کتابیں تھیں، جن میں سے بعض خطاطی کا شاہکار تھیں ۔ اس کا انتظام دو "شریفوں" اور ایک "قاضی" کے سپرد تھا ۔ سابور کے انتقال کے بعد خیال کیا جاتا ہے کہ شیعی شاعر الشریف المرتضٰی نے اس کتاب خانے کی باگ ڈور سنبھال لی تھی ۔ ہمیں ان اشخاص میں سے بعض کے نام بھی معلوم ہیں جو مہتمم کتاب خانہ مقرر کیے گئے، مثلاً ابو احمد عبدالسلام النحوی، جسے الواجکا (م ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء) بھی کہتے ہیں (اور جو ابوالعلاء المعری کا دوست تھا) اور معتمد حکومت ابو منصور محمد بن علی (۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء)۔ سابور کے کتاب خانے سے بہت سے علما نے استفادہ کیا، خصوصاً ابوالعلاء المعرّی نے بغداد میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں (۳۹۹ - ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ - ۱۰۱۰ء)؛ نیز اس میں ہمعصر مصنفین کی کتابیں بھی موصول ہوتی تھیں، مثلاً فاطمی معتمد حکومت احمد بن علی بن خیران (م ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء) کی ۔ آخر میں جب سلجوق ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ - ۱۰۵۶ء میں بغداد میں وارد ہوئے تو اسے جلا ڈالا گیا ۔ وزیر عمید الملک الکُندری فقط چند کتابوں کو تباہی سے بچا سکا ۔

خیال کیا جاتا ہے کہ فاطمی خلیفہ الحاکم نے ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء میں ایک سنّی دارالعلم فسطاط میں قائم کیا تھا ۔ اس کا انتظام دو مالکی علما کرتے تھے، لیکن تین برس کے بعد کسی وجہ سے کتاب خانہ ضبط کر لیا گیا ۔

مآخذ : (۱) تاریخ بغداد، ۳ : ۹۳؛ (۲) ابن الجوزی: المنتظم، ۷ : ۱۷۲، ۲۷۳، ۸ : ۲۰۵؛ (۳) ابن الاثیر، ۹ : ۱۷، ۲۳۶ تا ۲۷۴، ۱۰ : ۵؛ (۴) یاقوت [: معجم البلدان]، ۱ : ۷۹۹؛ (۵) وہی مصنف: ارشاد، ۱ : ۲۳۲؛ (۶) ابن خلکان، قاہرہ ۱۹۴۹ء، ۲ : ۱۰۰؛ (۷) البنداری، طبع ہوتسما Houtsma، ص ۱۸؛ (۸) ابن العماد: شذرات، ۳ : ۱۰۴، بذیل سنہ ۳۸۳ھ؛ (۹) ابوالعلاء المعرّی: رسالۃ الغفران، طبع الیازجی، ص ۴۳، ۱۸۳؛ (۱۰) سقط الزّند، قاہرہ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء، ص ۱۰۳، ۱۲۷؛ (۱۱) Mez: *Renaissance*، ص ۱۶۷ تا ۱۶۹؛ (۱۲) O. Pinto: *Le bibliotecht degli Arabi*، فلورنس ۱۹۲۸ء، ص ۸ تا ۹، ۱۳ تا ۱۵، ۲۳؛ (۱۳) کے ۔ عوّاد: خزائن کتب العراق العامّۃ، در *Sumer*، ۱۹۳۹ء، طبع دوم، ص ۲۱۸ تا ۲۲۳ (بزبان عربی)؛ (۱۴) H. Laoust: *La vie et la philosophie d'Abou-l-'Alā*، در *BEO*، ج ۱۰، ۱۹۴۳ء ۔

۱۹۳۳ء، ص ۱۲۲ تا ۱۲۹؛ (۱۵) وهی مصنف: La profession de foi d'Ibn Baṭṭa، دمشق ۱۹۵۸ء، ص xxii تا xxiii؛ (۱۶) G. Makdisi: The Topography of eleventh century Baghdād، در Arabica، ج ۶ (۱۹۵۹ء)، ص ۱۹۵ تا ۱۹۹؛ [ابوالحسنات: اسلامی مدارس].

(D. SOURDEL)

⊛ * **دارالعلوم**: [ع]: بمعنی مدرسه و مکتب، بالخصوص اعلٰی تعلیم کے لیے۔ برصغیر پاک و هند میں دینی علوم کی درسگاهوں کے لیے عموماً دارالعلوم استعمال کیا جاتا هے، مثلاً دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم سهارنپور، دارالعلوم فرنگی محل، لکھنؤ وغیره۔ سر سید احمد خان نے مغربی علوم کی ترویج و تدریس کے لیے علی گڑھ میں جو کالج قائم کیا اس کا نام بھی دارالعلوم علی گڑھ رکھا۔ پاکستان و بھارت میں دینی تعلیم کے لیے اعلٰی و ادنٰی قسم کے هزاروں دارالعلوم قائم هیں، جهاں قرآن و حدیث کے علاوہ دیگر متعلقه علوم پڑھائے جاتے هیں۔ اب بعض حلقوں میں دارالعلوم کی جگه "جامعه" کا لفظ بھی مدارس و مکاتب کے لیے رواج پا گیا هے۔ بعض اوقات معمولی مدارس کے لیے بھی دارالعلوم استعمال کر لیا جاتا هے].

(الف) وہ اونچے درجے کی درس گاه جو علی پاشا مبارک [رک بآں] نے ۱۸۷۲ء میں قائم کی۔ اس کا مقصد یه تھا که الازهر [رک بآں] کے طلبه کی معین تعداد کو علوم کے جدید شعبوں سے متعارف کرایا جائے اور ان کے لیے ۵ سال مدت تعلیم مقرر کی جائے تاکه وہ نئے سکول میں تعلیم دینے کے قابل هو جائیں، مگر چونکه قاهره میں سائنس کی تعلیم کے لیے اور مرکز قائم هو چکے تھے اس لیے هوا یه که اس کے نصاب تعلیم میں کئی بار ترمیم کی گئی اور علوم صحیحه (یا تجربیه) کو پیچھے ڈال دیا گیا اور مدت تعلیم گھٹا کر چار سال کر دی گئی۔ گو اس کا الحاق ایک خاص شعبے کی حیثیت سے قاهره (سابقاً فؤاد) یونیورسٹی کے ساتھ ۱۹۴۶ء سے چلا آتا هے، مگر یه دارالعلوم عربی حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش بھی کرتا هے۔ اسے مصر کے مسلم اساتذه کی بهت بڑی تربیت گاه هونے کا فخر حاصل هے اور اس کا اثر ان استادوں اور ناظرین تعلیم کے ذریعے جنھوں نے یهاں تعلیم پائی، ملک میں پھیلا هوا هے۔ یهاں کے طلبه چند جماعتوں میں منقسم هیں، چار عربی زبان کی اور تین علوم اسلامیه کی۔ نصاب پورا کرنے کے بعد جو سند ملتی هے وہ بی۔ اے کے برابر هوتی هے اور اس کے بعد ایم۔ اے یا ڈاکٹریٹ کا امتحان دیا جا سکتا هے۔ الازهر کے طلبه کے علاوہ ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء سے وہ طلبه بھی اس میں داخل کیے جا رهے هیں جنھوں نے سرکاری ثانوی مدارس سے توجیه (Baccalauréat) کا امتحان پاس کیا هو اور ۱۹۵۳-۱۹۵۴ء سے خواتین کی مخصوص تعداد بھی داخل هونے لگی هے۔ پهلے تو جامعة الازهر کی طرح یهاں بھی تعلیم مفت تھی اور طلبه کو معمولی سا ماهوار وظیفه دیا جاتا تھا، لیکن اب تعلیم کی فیس لی جاتی هے۔ البته جو طلبه تعلیم و تدریس کا پیشه اختیار کرنے کا اراده رکھتے هوں ان کو خاص مراعات دی جاتی هیں۔ ۱۹۵۷-۱۹۵۸ء میں یهاں کے طلبه کی تعداد ۱۲۱۵ تھی۔ مزید برآں کچھ طلبه کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں تکمیل تعلیم کے لیے وظیفے بھی دیے جا رهے تھے۔

مآخذ: (۱) محمد عبدالجواد: تقویم دارالعلوم، العدد الماسی (۱۸۷۲ تا ۱۹۴۷ء)، قاهره ۱۹۵۲ء؛ (۲) وهی مصنف: ملحق العدد الماسی (۱۹۴۹-۱۹۵۹ء) قاهره ۱۹۵۹ء؛ [(۳) مناظر احسن: اسلامی نظام تعلیم و تربیت].

(J. JOMIER [و اداره])

(ب) دیوبند [رک بآں] کی مذهبی درس گاه۔

(ج) فرنگی محل: ملا نظام الدین نے لکھنؤ کے ایک مکان فرنگی محل میں، جو اورنگ زیب نے ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں ان کے گھرانے کو جائداد کے اس نقصان کی تلافی میں عطا کیا تھا جو نظام کے والد کے قتل

ہو جانے کے بعد انہیں پہنچا تھا [اورنگ زیب نے صرف زمین بطور معافی دی تھی۔ اس پر وہ یورپی طرز کا نیا مکان بہت بعد میں تعمیر ہوا جسے فرنگی محل کہنے لگے تھے۔ اس مقالے کے ماخذ مثلاً رود کوثر (ص ۴۴) وغیرہ میں یہ صراحت موجود ہے]۔ ملا نظام الدین نے دو سال بعد ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا نام دارالعلوم فرنگی محل مشہور ہوا۔ ملا نظام الدین کی شہرت زیادہ تر اس نصاب کی وجہ سے ہے جو انہوں نے دینی تعلیم کے لیے تیار کیا اور جو "درس نظامیہ" کہلاتا ہے۔ یہ اس نصاب کو ترقی دے کر بنایا گیا تھا جس کی بابت کہا گیا ہے کہ اسے پہلے پہل دربار اکبری کے ایک مشہور فاضل فتح اللہ شیرازی نے تیار کیا تھا۔ اس نصاب میں زیادہ زور عربی کے قواعد صرف و نحو، منطق اور فلسفہ پر دیا گیا ہے اور تجربی علوم کی جانب عملاً کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ [یہ نصاب ملک بھر میں مروج ہو گیا، لیکن قیام پاکستان کے بعد درس نظامیہ میں تبدیلیاں ہونے لگیں اور بعض قدیم علوم کو مختصر کر دیا گیا، یا بالکل نظر انداز کرکے جدید علوم کو شامل کیا گیا]۔ جب دیوبند میں دارالعلوم قائم ہوا تو فرنگی محل کی درسگاہ کا وہ تفوق جو اورنگ زیب کے زمانے سے چلا آتا تھا، برقرار نہ رہ سکا اور وہ شہرت میں بہت پیچھے رہ گیا۔ زمانۂ حال میں [دیگر درس گاہوں کی طرح] اس نے بھی سیاسی میدان میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے کے ابتدائی سنین میں علمائے فرنگی محل خلافت عثمانیہ کی حمایت میں پیش پیش تھے اور ۱۹۳۰ء کے عشرے میں مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی تحریک میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔

مآخذ: (۱) ولی اللہ فرنگی محلی: الاغصان الاربعہ للشجرات الطیبۃ در احوال علماء فرنگی محل ۔۔۔، لکھنؤ ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء؛ (۲) الطاف الرحمٰن: احوال علماء فرنگی محل، لکھنؤ (؟) ۱۹۰۷ء؛ (۳) عبدالباری: آثار الاُوَل (جو راقم کو نہ مل سکی)؛ (۴) محمد اکرام: رود کوثر، کراچی، بدون تاریخ، ص ۵۸۲ تا ۵۹۲؛ (۵) عنایت اللہ: تذکرۂ علمائے فرنگی محل؛ (۶) شبلی نعمانی: مقالات شبلی، ج ۳، اعظم گڑھ ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء، ص ۱۰۲ تا ۱۰۵؛ (۷) عبدالاعلیٰ: رسالۂ قطبیہ (مخطوطہ)؛ (۸) ولی اللہ فرنگی محلی: عمدۃ الوسائل (مخطوطہ)؛ (۹) رضی الدین محمود انصاری: اغصان الانساب (مخطوطہ)۔

(د) ندوۃ العلماء، لکھنؤ: اسے ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں جدّت کے حامی علما کی ایک جماعت نے قائم کیا۔ مولوی سید محمد علی کانپوری اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ اعلان کردہ مقصد یہ تھا کہ دینی تعلیم کے مروج نظام کو بہتر بنایا جائے اور ایک اسلامی دارالعلوم قائم کرکے علما کے متفرق گروہوں میں یکجہتی پیدا کی جائے۔ اس دارالعلوم میں خالص دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم ہی کی تعلیم نہ دی جائے بلکہ ساتھ ہی پیشہ ورانہ تربیت کا انتظام بھی کیا جائے۔ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء میں ابتدائی جماعتیں کھول دی گئیں اور ایک سال بعد اس کا کتاب خانہ قائم کیا گیا۔ [اسی کے اصول پر آگے چل کر "دارالمصنفین" اعظم گڑھ کی بنیاد پڑی۔ یہ ایک اسلامی علمی تحقیقی ادارہ ہے، جس کا اپنا ماہوار رسالہ معارف بھی شائع ہوتا ہے]۔ ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء میں شبلی نعمانی [رک بآں] ندوۃ العلماء میں بحیثیت اس کے سیکرٹری کے شریک ہوئے۔ ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء میں موجودہ نئی عمارت کا افتتاح ہوا۔ درسگاہ کا ہفتہ وار مجلہ الندوۃ پہلے پہل ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا اور شبلی اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ شبلی کی قیادت میں ندوہ ہندوستان کی پہلی تعلیم گاہ تھی جس میں جدید تنقیدی تحقیقات علمی کا طریقہ رائج کیا گیا۔ یہ دیوبند اور علی گڑھ کے طرز فکر کا ایک مرکب مجموعہ تھا، مگر یہ نہ تو دیوبند کی راسخ الاعتقادی کو، جو اس کی خصوصیت ہے، جذب کر سکا اور نہ

علی گڑھ کے خالص عقلیت پسند رجحان کو پوری طرح اختیار کر سکا۔ ندوہ کے سب سے ممتاز تعلیم یافتہ فاضل سید سلیمان تھے، بایں ہمہ قدرے آزاد خیالی کے باعث ندوۃ کو مذہبی حلقوں میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

مآخذ : (۱) سیّد سلیمان ندوی : حیات شبلی، اعظم گڑھ ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء، ص ۱۰۳ تا ۳۰۹، ۳۰۲، ۳۹۶ ببعد، ۴۱۲ تا ۴۵۹، ۵۲۱؛ (۲) محمد اکرام : موج کوثر، کراچی، بدون تاریخ، ص ۲۰۶ تا ۲۱۸؛ (۳) معارف (سلیمان نمبر)، اعظم گڑھ، رمضان ۱۳۷۴ھ/مئی ۱۹۵۵ء، ۲۵۲ تا ۲۸۳؛ (۴) W. Cantwell Smith : *Modern Islam in India*، لنڈن ۱۹۴۶ء، ص ۲۹۰، ۲۹۶؛ [(۵) ابو الکلام : الہلال، دور اول]۔

(بزمی انصاری)

⊛ **دَارُالْعَہْد :** (ع)، لفظی ترجمہ 'معاہدے کی سرزمین'۔ فقہاے اسلام کی علمی اصطلاح میں دارالعہد سے مراد ایسا علاقہ یا ملک ہے جو دارالاسلام کے امام وقت یا اس کے نائب کے ساتھ بعض شرائط پر امن اور صلح کا معاہدہ طے کرے، ایسے علاقے یا ملک کو ایک مقررہ رقم بطور خراج ادا کرنا ہوتی ہے؛ امام شافعیؒ کے نزدیک رقم کی مقدار جزیہ [رک بآں] کی مقدار سے کسی طرح کم نہیں ہونی چاہیے (کتاب الأمّ، ۴ : ۱۰۸ ببعد؛ کتاب الخراج، ص ۵۸؛ الاحکام السلطانیۃ، ص ۵۴ ببعد)۔

طے شدہ شرائط کے مطابق جب معاہدہ ہو جائے تو دارالعہد کے خلاف کسی قسم کی جنگی کارروائی جائز نہیں، کیونکہ قرآن کریم میں ایسے مشرکین سے بھی عہد نباہنے کا حکم دیا گیا ہے جو بد عہدی نہ کریں (۹ [التوبۃ]: ۴)، حتّٰی کہ اگر امام وقت کو عہد شکنی کا خدشہ بھی ہو مگر واضح ثبوت اور شواہد نہ ہوں تو امام وقت کو توقف کرنا چاہیے (کتاب الأمّ، ۴ : ۱۸۵)۔ امام محمدؒ کا قول ہے کہ اگر دارالعہد کے حاکم کی طرف سے کوئی قاصد سربمہر خط لے کر آئے اور اس میں معاہدہ ختم کرنے کا اعلان ہو تو ایسے قابل اعتماد شہادت سمجھا جائے گا اور معاہدہ ختم ہو جائے گا (شرح السیر الکبیر، ۱ : ۲۸۲ ببعد)۔ عہد شکن قوم کے بارے میں اللہ کا حکم ہے کہ اس کے عہد کا پاس نہ کیا جائے اور خائن قوم کو اس کے جرم کی سزا دی جائے (۹ [التوبۃ]: ۱۲)۔ معاہدہ ٹوٹنے کی صورت میں دارالعہد باقی نہیں رہے گا اور ایسے علاقے یا ملک کو دارالحرب [رک بآں] کی حیثیت حاصل ہو جائے گی (المبسوط، ۱۰ : ۴۳ ببعد؛ کتاب الأمّ، ۴ : ۱۸۵؛ شرح السیر الکبیر، ۱ : ۲۸۳ ببعد)۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ چونکہ دارالاسلام اور دارالحرب کے سوا کسی اور علاقے یا سرزمین کے قائل نہیں، اس لیے دارالعہد اور دارالصلح کو دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان ایک مستقل قسم سمجھنے کے بجائے دارالاسلام کا حصہ قرار دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حنفی فقہا اہل العہد اور اہل الصلح کو اہل الذمہ یا ذمی [رک بآں] شمار کرتے ہیں، اس لیے صلح یا عہد کی سرزمین پر اگر اہل الحرب حملہ کریں اور بعض اہل صلح یا اہل عہد کو گرفتار کر لیں، پھر مسلمان دارالحرب پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کریں تو ایسے گرفتار ہونے والے اہل صلح یا اہل عہد کو غلام نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ وہ اہل الذمہ کی حیثیت سے دارالاسلام کے آزاد شہری ہیں (المبسوط، ۱۰ : ۵۲ ببعد؛ شرح السیر الکبیر، ۱ : ۴۴ ببعد؛ الدرالمختار، ۲ : ۲۷۲)۔

بعد کے مسلمان حکمرانوں نے بھی دارالعہد کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر ہمیشہ عمل کیا اور اہل عہد کے ساتھ جن شرائط پر معاہدہ ہوا ان کی پوری طرح پابندی کی گئی۔ سلطان سبکتگین غزنوی اور اس کے بیٹے محمود غزنوی نے راجا جے پال سے جن شرائط پر معاہدۂ صلح کیا ان کی پوری طرح پابندی کی (اسلام کا نظام امن، ص ۱۷۴ ببعد)؛ اسی طرح عثمانی سلاطین نے بھی عیسائی بادشاہوں سے کیے ہوے

معاہدوں کی ہمیشہ پابندی کی۔ عثمانی سلاطین جب کسی عیسائی بادشاہ کو امان دیتے تو اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جاتا، جس کی رُو سے عیسائی بادشاہ اطاعت اور سالانہ باجگزاری کا عہد کرتا اور عثمانی سلطان اس کی حفاظت کے علاوہ ملک کے مذہب اور دیگر رسوم کے احترام کرنے کا عہد کرتا تھا (حمید اللہ: *Muslim Conduct of State*، ص ۷۵ ببعد؛ منشآت السلاطین، ۲: ۳۵۳ ببعد)۔

مآخذ: (۱) محمد ظفیر الدین مفتاحی: اسلام کا نظام امن، اعظم گڑھ ۱۹۶۹ء؛ (۲) الشافعی: کتاب الام، قاہرہ ۱۹۶۱ء؛ (۳) الماوردی: الاحکام السلطانیۃ، قاہرہ ۱۹۶۶ء؛ (۴) علاء الدین: الدر المختار، لکھنؤ ۱۲۹۹ھ؛ (۵) ابن القیم: احکام اہل الذمۃ، دمشق ۱۹۶۱ء؛ (۶) البلاذری: فتوح البلدان، بیروت ۱۹۵۶ء؛ (۷) یحیی بن آدم: کتاب الخراج، لائڈن ۱۸۹۶ء؛ (۸) السرخسی: المبسوط، قاہرہ ۱۳۲۴ھ؛ (۹) وہی مصنف: شرح السیر الکبیر، حیدرآباد دکن ۱۳۳۵ھ؛ (۱۰) فریدون بے: منشآت السلاطین، استانبول ۱۲۶۵ھ؛ (۱۱) حمید اللہ: *Muslim Conduct of State*، لاہور ۱۹۵۳ء۔

(ظہور احمد اظہر)

⊛ **دارالفنون**: رک بہ جامعہ۔

* **دارالمحفوظات العمومیة**: حکومت مصر کا سرکاری محافظ خانہ جس میں مصر کی حکومتوں کی سولھویں صدی عیسوی سے لے کر آج تک کی سرکاری دستاویزیں محفوظ ہیں۔ انھیں قاہرہ کے القلعہ اور قصر عابدین میں محفوظ کیا گیا ہے۔ عثمانی خزانے اور انتظامیہ کی دستاویزات، جو ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء میں سلیم اوّل کی فتح مصر کے وقت سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کے خود مختار ہو جانے تک کے زمانے کی ہیں، مصر میں ابھی تک سلامت ہیں اور اب القلعہ کے محافظ خانوں میں محفوظ ہیں، جنھیں محمد علی نے ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء میں اس لیے تعمیر کروایا تھا کہ وہ اس سامان کو، جو ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء کی تباہ کن آتش زدگی سے بچ گیا تھا، محفوظ کر سکے۔ سابق مملوک عہد کے آخر زمانے کی معدودے چند دستاویزات اور رجسٹر نیز انیسویں صدی عیسوی کی کمتر اہمیت کی انتظامی مسلیں اور مصر میں پیدائش و وفات کے تمام رجسٹر بھی القلعہ میں رکھے ہوئے ہیں، لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کی مصری حکومت کی دستاویزوں کا بیشتر حصہ قاہرہ میں قصر عابدین میں موجود ہے۔

عثمانی حکومت کے زمانے کی جو دستاویزیں بچ گئی ہیں ان کی بڑی بڑی دو قسمیں ہیں۔ دفاتر (رجسٹر) اور جداگانہ مسلیں ("اوراق")۔ عثمانی انتظامی رجسٹروں کے بنیادی نمونے دو ہیں، ایک وہ جو احکام و فرامین کی نقلوں کے حامل ہیں اور "دیوانی" رسم الخط میں مرقوم ہیں، دوسرے وہ جو مالیاتی اعداد و رقوم پر مشتمل ہیں اور "سیاقت" (رسم الخط) میں لکھے ہوئے ہیں۔ عثمانی احکام و فرامین کے بیشتر رجسٹر، جو مصر میں محفوظ تھے، ۱۸۲۰ء کی آتش زدگی میں تباہ ہو گئے اور یہ مواد فقط فریدون اور حیرت افندی (دیکھیے مآخذ) کے مطبوعہ مجموعوں میں اور مصر کے اہم رجسٹروں سے دستیاب ہو سکتا ہے جو استانبول میں باش وکالت ارشوی Besvekalet Arsivi میں موجود ہیں۔ وہ مواد جو القلعہ کے محافظ خانوں میں باقی رہ گیا ہے وہ زیادہ تر مالیاتی رجسٹروں اور چند جداگانہ دستاویزوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں ان محافظ خانوں میں متعدد نجی مجموعے بھی ہیں جن کے مالکوں کی وفات کے بعد حکومت نے اپنے تصرف میں لے لیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی تاریخی دستاویزات، جو قصر عابدین میں ہیں، زیادہ جامع اور مکمل ہیں: ان میں وہ نقلیں بھی شامل ہیں جنھیں زمانۂ حال میں مصر سے متعلق مواد سے، جو یورپ کے بڑے بڑے محافظ خانوں میں دستیاب ہوا، تیار کرایا گیا ہے۔

دور عثمانی کے مصر کے "دیوان" کے مذاکرات

کی رودادیں اور عدالتی دستاویزیں، جو مملوکوں کے زمانے کی ہیں، قاہرہ کی مذہبی عدالتوں (المحکمة الاحوال الشخصیة) میں موجود ہیں۔

مآخذ: (۱) S. J. Shaw: *Cairo's Archives and the History of Ottoman Egypt*، در *Report on Current Research*، ۱۹۵۶ء، Middle East Institute، واشنگٹن ڈی - سی، ۱۹۵۶ء، ص ۵۹ تا ۷۲؛ (۲) J. Deny: *Sommaire des Archives Turques du Caire*، قاہرہ ۱۹۳۰ء؛ (۳) محمد احمد حسین: الوثائق التاریخیة، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ص ۹۳ تا ۹۴؛ (۴) B. Lewis: *The Ottoman Archives as a source of History for the Arab Lands*، در *JRAS* (۱۹۵۱ء)، ص ۱۳۹ تا ۱۵۵؛ (۵) Michaud اور Poujoulat: *Correspondance d' Orient*، ۱۸۳۰ - ۱۸۳۱ء، ج ۶، پیرس ۱۸۳۵ء، ص ۲۹۲ تا ۲۹۳۔ عثمانی مصر کے محافظ خانوں کی دستاویزات کے بعض مطبوعہ مجموعوں کے لیے دیکھیے: (۶) *Recueil de Firmans Impériaux Ottomans adressés aux valis et aux Khedives d' Egypte, 1006 A.H. 1322 A.H.*، قاہرہ ۱۹۳۴ء؛ (۷) مصطفی حیرت افندی السیواسی: انشاے حیرت افندی، بولاق ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء؛ (۸) فریدون بے: منشآت السلاطین، ۲ جلد، استانبول ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء؛ (۹) G. Talamas Bey: *Recueil de la correspondance de Mohamed Ali Khédive d' Egypte*، قاہرہ ۱۹۱۳ء۔ کتبہ خوانی اور دیگر عثمانی انتظامی مواد کے لیے جو بین الاقوامی تعلقات سے متعلق ہے، دیکھیے Diplomatic.

(S. J. Shaw)

* **دارالمصنفین**: [مسلمانان ہند کا ایک علمی و تحقیقی ادارہ، جو اعظم گڑھ (ہندوستان، اب بھارت) میں ۱۹۱۵ء سے قائم ہے۔ شبلی نعمانی [رک باں] کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ (۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتدبہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے؛ (۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفۂ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں۔ پھر ان مسائل کو رد کر دیا جائے یا تطبیق دی جائے؛ (۳) تاریخ، اسماء الرّجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب وغیرہ میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں اور انھیں مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کیے ہیں۔ موازنہ کرکے بتانا چاہیے کہ دونوں کی مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کس کو کس پر ترجیح ہے؛ (۴) خالص اسلامی علوم، مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر تنقید لکھی جائے، یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس زمانے میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوتی گئیں اور کن کن اسباب سے ہوئیں، ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے اور کس قدر اصلاح کا محتاج ہے؛ (۵) فارسی، عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے؛ (۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جا رہے ہیں، اردو زبان میں ترجمے کے ذریعے سے منتقل کیے جائیں؛ (۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخی مضامین لکھے جائیں، مثلاً انتظام عدالت، انتظام محاصل، مفاد عامّہ کے محکمے، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم و نسق، معاشرت غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مؤرخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس مد میں کیا اضافہ ہوا (افادات مہدی، ص ۲۷۳ تا ۲۷۵)]۔

ان مقاصد کی تکمیل محض ایک دو افراد کے ہاتھوں نہیں ہو سکتی تھی بلکہ یہ مصنفین کی ایک ایسی جماعت کا کام تھا جو اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے؛ چنانچہ علی گڑھ سے سبکدوشی کے بعد شبلی نعمانی اپنے تخیل کو عملی صورت میں لانے کی تدبیریں سوچتے رہے۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوة العلماء کے اجلاس میں انھوں نے ایک عظیم قومی کتب خانے کی تجویز پیش کرتے ہوئے ایک تصنیفی ادارے کے

قیام کا ذکر کیا۔ پھر ندوۃ العلماء سے علحدگی کے بعد وہ سیرت النبی کی تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تو دارالمصنفین کی تأسیس کا خیال بار بار ان کے ذہن میں آتا رہا۔ ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء کو انھوں نے مجلۂ الہلال میں اس کا مجوزہ خاکہ شائع کیا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں انھوں نے اعظم گڑھ کے پر سکون ماحول کو دارالمصنفین کے قیام کے لیے منتخب کیا اور اپنا موروثی مکان اور باغ اس کے لیے وقف کر دیا۔ بدقسمتی سے وہ اپنی زندگی میں اس کی بنیاد نہ رکھ سکے، تاہم ان کی وفات کے تین روز بعد ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کے احباب اور تلامذہ نے دارالمصنفین کے قیام کا فیصلہ کیا۔ سید سلیمان ندوی پونا کالج کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے اور مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون اور عبدالسلام ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اس ادارے کے اغراض و مقاصد یہ قرار دیے گئے: (۱) ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا؛ (۲) بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ کرنا؛ (۳) علمی کتابوں کے طبع و اشاعت کا سامان کرنا [صباح الدین، در مقالات یوم شبلی]۔

۱۹۱۵ء میں سید سلیمان ندوی کی تصنیف ارض القرآن، جلد اول، کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا ہوئی۔ [اس ادارے نے بہت جلد تالیف و تصنیف کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا جس سے اردو کے تمام سنجیدہ مصنفین اور اہل قلم متأثر ہو کر اس کی تقلید کرنے لگے]۔

دارالمصنفین کے کارکنوں کی تین اقسام ہیں: (۱) رفقائے اعزازی: وہ مشاہیر اہل قلم اور ارباب علم جو دارالمصنفین کو اپنے علمی مشوروں اور قلمی اعانتوں سے مستفید کرتے ہیں؛ (۲) رفیق: وہ اصحابِ ذوق جو تکمیل علم کے بعد فن تصنیف کے سیکھنے کی غرض سے دارالمصنفین میں مقیم ہوں؛ (۳) مصنفین: وہ رفیق جو پانچ سال کی تربیت حاصل کر چکے ہوں۔ مصنفین اور رفقا مستقل طور پر دارالمصنفین کے احاطے میں رہتے ہیں اور ان کے وظائف ان کی ضروریات کے مطابق مقرر ہوتے ہیں۔ ایثار و قربانی اور بے لوث خدمت کا جذبہ دارالمصنفین کے کارکنوں کی اہم خصوصیت ہے۔ اس کے پہلے ناظم سید سلیمان ندوی بتیس سال تک یہاں کام کرتے رہے اور ان کا زیادہ سے زیادہ وظیفہ اڑھائی سو روپے ماہوار تھا۔ اس طرح عبدالسلام ندوی نے وہاں چالیس برس صرف کیے اور آخر وقت میں ان کا وظیفہ ۱۲۰ روپے تھا۔

[دارالمصنفین نے گزشتہ پچاس پچپن سال کے دوران میں بڑا وقیع علمی، تحقیقی، تاریخی اور دینی ادب پیش کیا ہے اور مختلف علوم و فنون میں ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھوا کر شائع کی ہیں مثلاً:

(۱) سیرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم: شبلی نے سیرت النبیؐ کی پہلی جلد مکمل کر لی تھی، مگر ان کی زندگی میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی۔ ان کی آخری وصیت کے مطابق سید سلیمان ندوی نے مزید پانچ جلدیں تالیف کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ چھے جلدیں بالترتیب ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۴ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئیں۔ یہ دارالمصنفین کی مقبول ترین کتاب ہے، جسے برصغیر پاکستان و ہند کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی چند جلدوں کا ترجمہ ترکی اور فارسی میں ہو چکا ہے۔

(۲) سیرت صحابہؓ و تابعینؒ وغیرہم: سیرت صحابہؓ کے سلسلے میں بارہ کتابیں ہیں: جلد اول (خلفائے راشدینؓ)، جلد دوم و سوم (مہاجرینؓ)، جلد ششم (امام حسنؓ، امام حسینؓ، امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) اور جلد ہفتم (مختلف صحابۂ کرامؓ)، از شاہ معین الدین احمد ندوی؛ جلد چہارم و پنجم (انصارؓ) اور جلد ہشتم (صحابیاتؓ)، از

سعید انصاری؛ جلد نہم و دہم (اسوۂ صحابہؓ) اور جلد یازدہم (اسوۂ صحابیاتؓ)، از عبدالسلام ندوی اور جلد دوازدہم (اہل کتاب صحابہؓ) از حافظ مجیب اللہ ندوی؛ ان کے علاوہ تابعینؒ، از شاہ معین الدین احمد اور تبع تابعین، از حافظ مجیب اللہ، کا شمار بھی اسی ضمن میں کیا جا سکتا ہے۔ اس سے قبل کوئی جامع کتاب موجود نہ تھی۔ اس سلسلۂ تصنیف نے ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دیا۔

(۳) سوانح: بعض مشاہیر اسلام کی نہایت قابل قدر سوانح عمریاں شائع ہوئی ہیں، مثلاً شبلی نعمانی: الفاروقؓ؛ الغزالیؒ؛ المامون؛ سلیمان ندوی: سیرت عائشہؓ؛ خیام؛ حیات شبلی؛ عبدالسلام ندوی: سیرت عمرؓ بن عبدالعزیز؛ امام رازیؒ؛ ابن خلدون (ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب کا ترجمہ)۔

(۴) ادبیات: شبلی نعمانی: شعرالعجم (پانچ حصے)، فارسی شاعری کی تاریخ؛ عبدالسلام ندوی: شعر الہند (دو حصے)، اردو شعرا اور اصناف سخن کا تذکرہ اور اقبال کامل، اقبال کی زندگی اور شاعری پر سیر حاصل بحث؛ عبدالحی: گل رعنا، اردو شاعری کا تذکرہ؛ کلیات شبلی؛ مکاتیب شبلی (دو جلد)، خطبات شبلی اور مقالات شبلی (آٹھ جلدوں میں شبلی نعمانی کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی، فلسفیانہ اور قومی مضامین کا مجموعہ)، مرتبۂ سید سلیمان ندوی۔

(۵) تاریخ اسلام: چار جلدوں میں، از شاہ معین الدین احمد: جلد اوّل میں عہد رسالت و خلافت راشدہ، جلد دوم میں عہد بنوامیہ اور جلد سوم و چہارم میں خلافت عباسیہ کی تاریخ درج ہے۔

(۶) تاریخ علوم و فنون: ارض القرآن، از سید سلیمان ندوی، جس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے؛ عبدالسلام ندوی: تاریخ فقہ اسلامی، جو محمد خضری: التشریع الاسلامی کا اردو ترجمہ ہے۔

(۷) اسلامی ممالک کی تاریخ و تمدن: اس سلسلے کی قابل ذکر کتابیں یہ ہیں: محمد عزیز مرزا: تاریخ دولت عثمانیہ (دو جلدیں)؛ سید ریاست علی ندوی: تاریخ اندلس اور تاریخ صقلیہ؛ شاہ معین الدین احمد: اسلام اور عربی تمدن، جو محمد کرد علی: الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا ترجمہ ہے؛ سید ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت و عزیمت (دو جلدیں، یعنی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ)؛ محمد اسحٰق سندیلوی: اسلام کا سیاسی نظام؛ سلیمان ندوی: عربوں کی جہازرانی؛ ابوالحسنات ندوی: ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں۔

(۸) تاریخ ہند: رقعات عالمگیر؛ سید نجیب اشرف: مقدمۂ رقعات عالمگیر؛ سید ابوظفر: مختصر تاریخ ہند اور تاریخ سندھ؛ سید صباح الدین عبدالرحمٰن: بزم تیموریہ (مغل بادشاہوں کی علمی سرپرستی اور ان کے دربار کے علما و فضلا کا تذکرہ)؛ بزم صوفیہ (عہد تیموری سے قبل کے صاحب تصنیف صوفیہ کا تذکرہ)؛ بزم مملوکیہ؛ ہندوستان کے ازمنۂ وسطی کی ایک جھلک؛ ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام؛ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے؛ ہندوستان عربوں کی نظر میں (دو جلد، ہندوستان کے بارے میں عرب مصنفین، جغرافیہ نگاروں، سیاحوں اور مؤرخوں کے اقتباسات اور ان کا اردو ترجمہ)؛ ابو ظفر ندوی: گجرات کی تمدنی تاریخ۔

(۹) فلسفہ: عبدالباری ندوی: برکلے اور اس کا فلسفہ؛ اسی مصنف نے مبادی علم انسانی کے نام سے برکلے Berkley : *Principles of Human Knowledge* اور فہم انسانی کے عنوان سے ہیوم David Hume : *Human Understanding* کا ترجمہ کیا؛ افکار عصریہ؛ عبدالماجد دریا بادی: مکالمات (برکلے: *Dialogue* کا ترجمہ)؛ ظفر حسین خاں: طبقات الامم (جو صاعد الاندلسی کی کتاب کا ترجمہ ہے)؛ عبدالسلام ندوی: انقلاب الامم

(لیبان le Bon کی کتاب کے عربی ترجمے کا ترجمہ)]۔

دارالمصنفین کا ایک بڑا کارنامہ ماہنامہ معارف کا اجرا ہے۔ یہ رمضان ۱۳۳۴ھ/جولائی ۱۹۱۶ء سے سید سلیمان ندوی کے زیر ادارت شائع ہونے لگا اور اب تک باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ [ادبی تحقیقی اور علمی مضامین اور متین و پروقار اسلوب کے اعتبار سے اسے اردو کے بہترین جرائد میں شمار کیا جا سکتا ہے]۔

دارالمصنفین کے ممتاز مصنفین و محققین میں دارالمصنفین کے بانی اور پہلے ناظم، سید سلیمان ندوی (ولادت ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء؛ م ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء بمقام کراچی)، عبدالسلام ندوی (ولادت ۱۶ فروری ۱۸۸۳ء؛ م ۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء بمقام اعظم گڑھ)، شاہ معین الدین احمد ندوی، سعید انصاری (م ۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء، بمقام لاہور)، سید نجیب اشرف (م ۱۹۶۸ء)، سید ریاست علی ندوی، ابو ظفر ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ عبدالباری ندوی، عبدالماجد دریا بادی اور ابوالحسنات ندوی بھی دارالمصنفین سے منسلک رہے ہیں۔

[برصغیر پاک و ہند میں دارالمصنفین اس لحاظ سے ایک منفرد ادارہ ہے کہ اس کے اپنے کل وقتی مصنفین ہیں، اپنا مطبع ہے، اپنا کتاب خانہ اور اپنا دارالاشاعت ہے اور اپنی سب عمارتیں ہیں۔ ۲۰-۲۱ فروری ۱۹۶۵ء کو اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کا پچاس سالہ جشن منایا گیا تھا، جس میں بھارت و پاکستان کے علاوہ کئی دوسرے ملکوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے]۔

مآخذ: (۱) سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۶۸۸ تا ۶۹۹؛ (۲) رام بابو سکسینہ: *A History of Urdu Literature*، مترجمۂ مرزا محمد عسکری: تاریخ ادب اردو، مطبوعہ نولکشور، بار دوم، حصۂ نثر: ص ۷۰، ۷۱، ۱۶۲؛ (۳) سید صباح الدین: دارالمصنفین اور اس کی خدمات، در مقالات یوم شبلی، مطبوعہ اردو مرکز، لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۱۷۷ تا ۱۸۳؛ [(۴) مہدی الافادی: افادات مہدی، بار چہارم، لاہور ۱۹۴۹ء؛ (۵) پروین خواجہ: دارالمصنفین، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے، در کتاب خانۂ جامعۂ پنجاب، لاہور]۔

(غلام حسین ذوالفقار [و ادارہ])

دارالنَّدوہ: سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مکّہ معظمہ میں ایک قسم کی شہری جلسہ گاہ۔ اس کی عمارت کعبہ شریف کے شمال میں اس چوک کے دوسری جانب تھی جس میں طواف ہوا کرتا تھا۔ یہ معززین اور شرفا کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ کہتے ہیں کہ دارالندوہ کو قریش کے جدامجد قُصَیّ (رک باں) نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کے بعد دارالندوہ عبدالدار کی پھر عبد مناف اور اس کے بیٹے ہاشم اور ہاشم کی اولاد کی وراثت میں آیا۔ کہتے ہیں کہ ظہور اسلام سے قبل قریش کے تمام اہم کام، مثلاً شادی بیاہ، جنگی مجالس، امور عامہ پر مشاورت، شادی کے قابل لڑکیوں کی پوشاک کا انتظام، لڑکوں کا ختنہ ("اعذار")، لڑائی کے علم کی تفویض یہیں سرانجام دیے جاتے رہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس مقام سے یا اس کے سامنے کے چوک سے تمام تجارتی قافلے روانہ ہوتے اور واپسی پر وہیں آ کر رکتے تھے (ابن سعد، ۱/۱: ۳۹)۔ ہنری لامنز Henri Lammens مارتن هارٹ من Martin Hartmann کے خیال کے مطابق، نیز دیگر قرائن سے، اس بات کی حجت لایا ہے کہ عہد قدیم میں دارالندوہ محض دنیاداروں کی (غیر مذہبی) جگہ نہ تھی بلکہ ایک مقدس عمارت تھی جو مذہبی نوعیت کی معاشرتی رسوم وضع کرنے کا کام دیتی تھی (*Les sanctuaires préislamites*، ص ۲۷ تا ۳۳؛ قب مادہ قصی، از G. Levi Della Vida)؛ مگر یہ محض قیاس معلوم ہوتا ہے، اس کے پیش کردہ ثبوت کی کوئی قوی بنیاد نہیں ملتی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ دارالندوہ ظہور اسلام

کے بعد بھی باقی رہا ۔ امیر معاویہؓ نے اسے خرید لیا اور بعد ازاں یہ حج کے دوران میں خلفاے بنو امیّہ اور بنو عباس کے پہلے خلفا کی اقامت گاہ کا کام دیتا رہا ۔ ھارون الرشید نے ایک مختلف عمارت میں توسیع کر کے اسے اپنی اقامت گاہ ("دارالعمارۃ") بنایا تھا ۔ بعد ازاں دارالندوہ کو زوال آتا چلا گیا ۔ تیسری صدی ھجری/ نویں صدی عیسوی کے اواخر میں، خلیفہ المعتضد کے عہد میں اس میں ستونوں، محرابی دالانوں اور غلام گردشوں کا اضافہ کیا گیا اور ذیلی عمارت کے طور پر اسے مسجد الحرام میں شامل کر لیا گیا ۔

مآخذ : (۱) ابن ہشام، ص ۸۰، ۸۲، ۳۲۳ ببعد، ۴۸۹؛ (۲) ابن سعد، ۱/۱، ص ۳۹ ببعد؛ (۳) Wüstenfeld: *Die Chroniken der Stadt Mekka*، ج ۱ (۱۸۵۸ء)، ص ۶۵ تا ۷۶ (الازرقی) و ج ۳ (۱۸۶۱ء)، بمواضع کثیرہ؛ (۴) الطبری، ۱ : ۱۰۹۸ ببعد؛ (۵) الفاسی : شفاءالغرام، ج ۱ (مکہ ۱۹۵۶ء)، ص ۲۲۶ ببعد، ۲۳۴ تا ۲۳۶؛ (۶) Caussin de Perceval : *Essai sur l'histoire des Arabes avant l'Islamisme*، ج ۱ (۱۸۴۷ء)، ص ۲۳۷، ۱۵۰ ببعد؛ (۷) Caetani : *Annali*، ج ۱ (۱۹۰۵ء)، مقدمہ، فصل ۷۸؛ (۸) Snouck Hurgronje : *Mekka*، ج ۱ (۱۸۸۸ء)، ص ۱۲؛ (۹) Gaudefroy-Demombynes: *Le Pèlerinage a la Mekke* (۱۹۲۳ء)، ص ۱۵۱ ببعد؛ (۱۰) H. Lammens : *La Mecque à la veille de l' Hègire* (MFOB، ۹ : ۳، بیروت ۱۹۲۴ء)، ص ۷۲ تا ۷۴، ۲۲۶، ۲۰۱؛ (۱۱) وہی مصنف : *Les sanctuaires préislamites dans l' Arabie occidentale* (مجلۂ مذکور، ۹ : ۲، ۱۹۲۶ء)، ص ۳۹ تا ۱۴۳؛ نیز رک بہ قُصی ۔

(R. PARET)

* **دارفُور** : "فُور کی سرزمین"، جمہوریۂ سوڈان کا ایک صوبہ جو پہلے ایک اسلامی سلطنت تھا ۔

جغرافیہ اور باشندے : دارفور "بلادالسودان" پر مشتمل ریاستوں کے زنجیرے کی ایک کڑی تھا ۔ اس کا مشرقی ھمسایہ کُردفان تھا، جس سے ریت کے ٹیلوں کی ایک پٹی اسے جدا کرتی تھی ۔ مغرب میں ودّائی واقع تھا ۔ صحراے لیبیا نے شمال کی قدرتی سرحد بنا دی تھی اور بحرالغزال [رک بآں] کی دلدلیں اس کی جنوبی سرحد تھیں ۔ دارفور تین بڑے علاقوں پر مشتمل ہے ۔ شمالی علاقہ، صحرا کا گیاہی کنارہ ہے، جو شتربان قبیلوں کے لیے چارا تو مہیا کرتا ہے مگر اس میں زراعت بہت کم ہوتی ہے ۔ وسطی علاقہ (۱۴ درجے ۳۰ ثانیہ شمال سے ۱۲ درجے شمال تک)، جہاں (پہاڑوں میں) بارہ سے پچیس انچ تک بارش ہوتی ہے، مستقل زراعت کرنے والوں کا علاقہ ہے ۔ کثیر بارشوں (پچیس تا پینتیس انچ) والا جنوبی علاقہ مویشی رکھنے والے خانہ بدوشوں، "بقّارہ" [رک بآں] سے آباد ہے ۔ وسطی علاقے میں جبل مرّہ کے بلند پہاڑوں کا سلسلہ ۳۰۲۴ میٹر کی بلندی تک پہنچ کر شمال سے جنوب کی طرف چلا گیا ہے ۔ دارفور کے شمالی اور جنوبی علاقوں کو مقامی زبان میں "دارالریح" اور "دارالصعید" کہا جاتا ہے ۔

وسطی علاقہ مختلف راستوں کا مقام اتصال ہے ۔ درب الاربعین [رک بآں] (=چالیس دن کا راستہ) اسیوط سے خارجہ اور سلیمہ ہوتا ہوا کوبیہ (Cobbé، بحوالۂ Browne) کو جاتا ہے، جہاں ایک چھوٹا سا تجارتی شہر نشو و نما پا گیا ۔ ایک اور راستہ دارفور کو طرابلس اور سیرانیکا سے ملاتا ہے ۔ کبکابیہ، جبل مرّہ کے مغرب میں وڈّای اور مغربی بلاد السودان کے راستے پر ایک تجارتی مرکز تھا ۔ کردفان اور مشرق کو جانے والا راستہ حاجیوں کی گزرگاہ تھا، اگرچہ بعض حجّاج مصر سے ہو کر جانے والے لمبے راستے کو ترجیح دیتے تھے ۔ ھاتھی دانت اور شتر مرغ کے پروں ایسی چیزوں کے علاوہ دارفور سے غلام بھی برآمد ہوتے تھے، جنھیں وہ جنوب کی جنگلی قوموں سے حاصل کرتے

تھے۔ ان میں بہت سے "درب الاربعین" کے ذریعے مصر جاتے تھے۔ کردفان کی ریلوے، جو الابیض (El Obeid) کو خرطوم اور بندر سوڈان سے ملاتی ہے، اس کی تعمیر ۱۹۱۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ۱۹۱۶ء میں اسے دارفور سے بھی ملا دیا گیا، نتیجۃً شمال کو جانے والے راستوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ دارالحکومت بالآخر موجودہ مقام الفاشر [رک باں] میں ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء میں قائم ہوا۔ "فاشر" یا سلطان کی اقامت گاہ پہلے ہر عہد حکومت میں بدلتی رہتی تھی؛ قدیم ترین سلاطین کا صدر مقام جبل مرّہ تھا۔

دارفور کے باشندے مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فور (دیکھیے A.C. Beaton : *The Fur*، در *Sudan, notes and records*، ۲۹/۱، ۱۹۴۸ء، ص ۱ تا ۳۹) حبشی نژاد قوم ہے۔ شروع سے ان کی بود و باش جبل مرّہ میں تھی، پھر اطراف کے قبیلوں پر اپنی قیادت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کنجارہ سے، جو فور کے تین قبیلوں میں سے ایک ہے، کیرہ کے شاہی خاندان کا ظہور ہوا اور بروے روایت مسبّعات کا بھی، جنھوں نے کردفان میں اپنی سلطنت قائم کی۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس علاقے میں فور سے پہلے تنجر قوم کو غلبہ حاصل تھا اور اس سے پہلے داجو کو۔ ان دونوں کے اخلاف ابھی تک دارفور میں موجود ہیں۔ عربوں کی آمد نے نسلی قسم کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے۔ قبائلی گروہ، جو قوم جہینہ کی آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کی بہت بڑی یلغار میں ان کے ساتھ مشرقی بلادالسودان میں وارد ہوئے تھے، ان کی نمائندگی اب شمالی علاقے کے شتربان عرب اور جنوب کے بقارہ کرتے ہیں۔ "فزارہ" نام کا اطلاق، جو کبھی شتربان عربوں کے ایک گروہ پر مشترکہ طور پر ہوتا تھا، اب متروک ہو گیا ہے۔ بقاری قبائل میں رزیقات اور تعایشہ قابل ذکر ہیں۔ انفرادی طور پر وادی نیل کے سوڈان کے جو عربی نژاد اہل نوبہ، برابرہ [رک باں]، دناقلہ (دیکھیے دنقلی)، اور جعلیّین [رک باں] آئے، انھوں نے دارفور میں اسلامی ثقافت اور تجارت کی ترقی میں اہم حصہ لیا ہے۔ اس صوبے کی موجودہ آبادی ۱۳۲۸۵۵۹ ہے (*Sudan Almanac*، ۱۹۵۹ء)۔

تاریخی ترتیب: اس خاندان کا تاریخی سلسلہ آٹھویں سلطان عبدالرحمٰن الرشید سے پہلے غیر یقینی ہے۔ براؤن Browne کا خیال ہے کہ سلیمان سلُنگ اس کے زمانے سے تقریباً ۱۳۰-۱۵۰ سال پہلے یعنی تقریباً ۱۶۴۰ تا ۱۶۶۰ء میں حکومت کرتا تھا۔ التونسی، جو دارفور کی تاسیس کو ودّای اور کردفان کی تاسیس کے ہم زمان سمجھتا ہے، یقین دلاتا ہے کہ یہ واقعہ دو سو سال، یعنی تقریباً ۱۶۴۰ء سے پہلے وقوع پذیر نہیں ہوا (تونسی: *Ouaday*، ص ۵۷)۔ شُقَیر کا تاریخی سلسلہ، جو سلیمان سلنگ کے ساتھ چند جامد ناموں کو شامل کر کے نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے وسط تک لے جاتا ہے، بعد کی روایت ہے اور صاف طور پر جعلی ہے۔ Nachtigal سلیمان سلنگ کے عہد حکومت کا آغاز ۱۵۹۶ء بتاتا ہے، جو اصل زمانے سے قدیم تر دکھائی دیتا ہے۔

سلاطین کے نام اور تخت نشینی کی تاریخیں:
(۱) سلیمان سلنگ، تقریباً ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء؛ (۲) موسیٰ بن سلیمان؛ (۳) احمد بکر بن موسیٰ؛ (۴) محمد دورہ بن احمد بکر؛ (۵) عمر بن محمد دورہ، تقریباً ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳-۱۷۴۴ء؛ (۶) ابوالقاسم بن احمد بکر، تقریباً ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹-۱۷۵۰ء؛ (۷) محمد تیراب بن احمد بکر، تقریباً ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶-۱۷۵۷ء؛ (۸) عبدالرحمٰن الرشید بن احمد بکر، ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء؛ (۹) محمد فضل بن عبدالرحمٰن، ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰-۱۸۰۱ء؛ (۱۰) محمد حسین بن محمد فضل، ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸-۱۸۳۹ء؛ (۱۱) ابراہیم بن محمد حسین، ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء (مصری سوڈان کے ساتھ دار فور کا الحاق ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء)۔ خدیوی اور

مہدی کے عہدِ اقتدار کے برائے نام سلاطین: (۱۲) حَسَب اللہ بن محمد فضل؛ (۱۳) بوش بن محمد فضل؛ (۱۴) ہارون بن سیف الدین بن محمد فضل؛ (۱۵) عبداللہ دوُد بَنجہ بن بکر بن مح فضل؛ (۱۶) یوسف بن ابراہیم؛ (۱۷) ابو الم ابن ابراہیم۔

احیاء شدہ سلطنت: (۱۸) علی دینار بن زکریا ابن محمد فضل، ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء (دارفور کا الحاق انگریزی۔ مصری سوڈان کے ساتھ، ۱۹۱۶ء)۔

سلطنت کے متعلق روایات: مقامی وقائع کے فقدان کے سبب ہم معلومات کے لیے بیرونی مبصروں پر انحصار کرتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین تونسی عرب محمد بن عُمر التونسی ہے، جس کی ہشت سالہ سیاحت کا آغاز ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں ہوا۔ دوسرا، جرمن Gustar Nachtigal، جو ۱۸۷۴ء میں دار فور میں تھا، پھر آسٹروی Rudolf v. Slatin (گورنر ۱۸۸۱ تا ۱۸۸۳ء) اور لبنانی نَعُوم شُقَیر مشترک حکومت کے محکمہ سراغ رسانی کا ایک ملازم، جس کا سب سے بڑا خبر رساں شیخ الطیب (م ۱۹۰۲ء) تھا، جو پہلے سلطان ابراہیم کا "امام" تھا۔

کیرہ کے سلسلۂ نسب سے متعلق جو تناقضات ہیں ان پر التونسی، Nachtigal اور شُقَیر کی نظر پڑی تھی۔ یہ نسب نامے عوامی روایات کے سورماؤں کو، جن میں سے بڑے بڑے احمد المعقور، دالی اور سلیمان سُلّن (العرب) تھے، بہ تکلف ایک رشتے میں منسلک کرنے کی کوششیں ہیں۔ اس روایت کے اختلافات کی تفصیل یہاں نہیں دی جا سکتی۔ احمد المعقور تونسی عرب کو، جو ہلالی یا عباسی اصل سے تھا، ان تنجری حکمرانوں کے جدّ امجد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو کیرہ خاندان سے پہلے ہوئے؛ یا تنجر اور کیرہ خاندانوں کی (ازدواجی رشتوں کے ذریعے) درمیانی کڑی تھے۔ اس کا بیٹا (یا زیادہ دور کی اولاد میں) دالی کو ریاست فوراوی کا ناظم اور آئین ساز بتایا گیا ہے۔ دالی کی اولاد میں سلیمان سُلّن ہوا، جو ایک عرب خاتون کا بیٹا تھا اور دین اسلام کو رواج دینے کا سہرا اسی کے سر باندھا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلا تاریخی حکمران ہے۔ ممکن ہے احمد المعقور عربوں کے تنجروں (یا فوروں) کے ساتھ خلط ملط ہو جانے کی تاریخی حقیقت کی یاد دلاتا ہو، یا یہ عربوں کی آمد کی تاریخ کو اور قدیم بنانے کے لیے ایک بعد کی گھڑی ہوئی روایت ہو۔ لقب "المعقور" (لنگڑا) عربی لفظ ہے۔ اس کی تشریح Slatin اور شقیر نے ایک صریحی افسانوی روایت کے ذریعے کی ہے۔ دالی (یا دلیل بحر) ایک تاریخی فرد ہو سکتا ہے یا ممکن ہے قبل از اسلام کیرہ کے حکمرانوں کی روایتوں کا مجسّم نمائندہ ہو۔ سلیمان سُلّن، جو ایک مجاہد اور منتظم گزرا ہے، دالی کا مسلمان متنی تھا، جس کی سوانح میں شاید بعض وہ روایات بھی شامل ہو گئی ہیں جو اصل میں دالی سے منسوب تھیں۔ غالبًا سلیمان خاندان کیرہ کا بانی نہ تھا بلکہ محض پہلا مسلمان حکمران تھا۔ یہ دعوے کہ شاہی خاندان بنو ہلال یا عباسیوں کی اولاد سے ہے بناوٹی ہیں اور علی الترتیب شمالی افریقہ کے اور وادیٔ نیل کے سوڈانی اثر و نفوذ کا آئینہ دار ہے۔ زیادہ قرین قیاس یہ روایت معلوم ہوتی ہے کہ کیرہ خاندان مسبعات اور ودائی کے حکمران گھرانے سمیت فزارہ کی اولاد سے تھا۔ یہ بات اس روایت سے مطابقت رکھتی ہے کہ سلیمان کی فتوحات خانہ بدوش عربوں کو حلیف بنانے سے حاصل ہوئی تھیں۔

ہو سکتا ہے کہ دارفور میں اشاعت اسلام کا آغاز سلیمان نے کیا ہو، لیکن اس حصے میں پوری طرح اسلام پھیل جانے میں دیر لگی۔ انیسویں اور بیسویں صدیِ عیسوی تک یہاں غیر اسلامی رسوم کا برابر رواج رہا، جیسے تمام مبصروں نے ملاحظہ کیا ہے۔ دین کی تعلیم دینے والے ("فَکی") اجانب

"فقیہ" اور اس کی جمع بالعموم "فقہا" یہاں استعمال ہوتی ہے) زیادہ تر مغربی "بلاد السودان" سے اور دریاے نیل کے خطّے سے آئے ۔ یہ دونوں خطّے ایسے ہیں جہاں مالکی مذہب کا غلبہ ہے ۔ سلیمان کے فوراً بعد جو سلاطین ہوے ان کے متعلق تحریری حالات بہت کم ملتے ہیں ۔ اس کا دوسرا جانشین احمد بکر صرف اس لیے قابل ذکر ہے کہ وہ متعدد بیٹوں کا باپ تھا، جن میں سے پانچ اس کے بعد سلطان بنے ۔ دار فور اور ودائی دونوں کی روایتوں میں اس بات کی یاد محفوظ ہے کہ ان دو سلطنتوں کے درمیان مسلسل جنگیں ہوتی رہیں، ان کا آغاز احمد بکر کے عہد میں ہوا، اور اس وقت تک جاری رہیں جب تک کہ محمد تیراب نے اپنے عہد حکومت کے اوائل میں ودائی کے سلطان جَوْدہ سے صلح نہ کرلی ۔ کہا جاتا ہے کہ عمر اور ابوالقاسم دونوں سلطان انھیں جنگوں میں مارے گئے جن میں ودائیوں کا پلّہ عموماً بھاری رہا ۔

سلطنت مابعد : محمد تیراب کے عہد حکومت کے ساتھ مفصّل روایات کا آغاز ہوتا ہے ۔ وہ التونسی کی سیاحت کے صرف سولہ برس پہلے فوت ہوا ۔ اسے ایک عیش پسند اور مدبّر شخص کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن اس کے عہد حکومت کا اختتام کردفان کے مسبعاوی حکمران سلطان ہاشم کے ساتھ لڑائی میں ہوا ۔ مخاصمانہ کارروائیوں کا بہانہ یہ کیا گیا تھا کہ ہاشم دارفور کی مشرقی سرحد پر دست درازی کر رہا ہے ۔ لیکن التونسی کا خیال ہے کہ تیراب کی اصلی نیت یہ تھی کہ وہ احمد بکر کے بیٹوں کے بجائے اپنے بیٹے اسحٰق کی آئندہ جانشینی کو محفوظ کر لے ۔ اس جنگ میں اسحٰق الملقب بہ "الخلیفہ" (=جانشین) بطور نائب السلطنت دارالحکومت میں رہا اور سلطان کے بھائی اور وزرا سلطان کی معیت میں مہم پر گئے ۔ ہاشم کو کردفان سے نکال دیا گیا اور اس نے سنّار کے فنجی سلطان کے ہاں پناہ لی، اور فوراوی فوج نے اس کے علاقوں پر قبضہ جما لیا ۔ اس افسانے کا کہ تیراب نے اُمّ دُرمان Omdurman تک چڑھائی کی اور عبدالّلابی فوج کو شکست دی، التونسی یا Nachtigal نے ذکر نہیں کیا اور یہ بعد کا، غالباً مہدی کے عہد کا، اضافہ ہے ۔ تیراب کردفان میں بارہ کے مقام پر فوت ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس کے امراء نے اسے زہر دیا تھا ۔

تیراب کی موت کے بعد اسحٰق اور احمد بکر کے بیٹوں کے حامیوں میں جانشینی کی جنگ چھڑ گئی ۔ مؤخرالذکر فریق نے انجام کار احمد بکر کے بیٹے عبدالرحمٰن الرشید کو اپنا سلطان منتخب کر لیا، وہ باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا اور ایک پرہیزگار علم دوست نوجوان تھا ۔ یہ انتخاب محمد کُرّہ کی کوشش سے ہوا، جو مرحوم سلطان کا خواجہ سرا تھا ۔ اسے عبدالرحمٰن نے اپنا وزیر اعظم مقرر کیا ۔ کُرّہ نے بعد میں کُردفان پر ایک اور چڑھائی کی اور وہاں چند برس حکومت کی ۔ عبدالرحمٰن کے عہد حکومت میں تجارت اور اشاعت دین دونوں کی ترقی ہوئی ۔ اس عہد میں یہ ترقی اہل نوبہ کے دارفور میں ورود سے منسوب کی جاسکتی ہے، جو وادی نیل کے سوڈانی علاقے میں فنجی قوت کے زوال کے باعث آئے تھے ۔ عبدالرحمٰن اور عثمانی سلطان کے درمیان تحائف کے تبادلے، ایک انگریز سیّاح W.G. Browne کی ۱۷۹۳ - ۱۷۹۶ء میں آمد اور ۱۷۹۹ء میں بوناپارٹ Bonaparte کے ساتھ خط و کتابت اس بات کی دلیل ہیں کہ مصر کے ساتھ تجارت کے ذریعے دارفور کے بیرونی دنیا سے روابط بڑھے (فرانسیسی متن در *Pieces diverses et correspondance relatives aux opérations de l' armée d'orient en Egypte*، پیرس IX AN، ص ۱۸۷، ۲۱۶ تا ۲۱۷) ۔ ایک مملوک پناہ گزین کو، جو بونا پارٹ کے ہاتھوں سے بچ کر آیا تھا، دارفور میں پناہ دی گئی، لیکن پھر سلطان کے خلاف سازش کرنے کی پاداش میں اسے ہلاک کر دیا گیا ۔

عبدالرحمٰن کے چھوٹے بیٹے محمد فضل کو محمد کرّہ نے ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰-۱۸۰۱ء میں سلطان بنا دیا، لیکن حکمران اور اس کے وزیر کے درمیان ناچاقی پیدا ہو گئی اور کرّہ رجب ۱۲۱۹ھ/اکتوبر - نومبر ۱۸۰۴ء میں ہلاک کر دیا گیا ۔ فضل کا طویل عہد حکومت زوال پذیری کا زمانہ تھا ۔ مصر کے محمد علی پاشا نے اپنے داماد محمد بے خسرو "دفتر دار" کی قیادت میں ایک مہم بھیجی، جس نے کردفان کے فوراوی والی "مقدوم" مسلّم کو ۱۸۲۱ء میں بارہ کے مقام پر شکست دی اور صوبے کا الحاق کر لیا ۔ لیکن وادی نیل میں بغاوت ہو جانے کے باعث "دفتر دار" دارفور کی فتح سے باز رہا ۔ محمد عبدالکریم صابون، سلطان وداؤ نے دار تامہ کو، جو دارفور کی باج گزار ریاست تھی، تہ و بالا کر دیا اور اس سے خراج وصول کیا ۔ فضل نے صابون کی موت کے بعد اس کے ایک بھائی کو حصول تخت کے سلسلے میں مدد دی، لیکن وہاں اپنے زیر سیادت حکومت قائم کرانے میں ناکام رہا ۔ بقارہ، خصوصا رزیقات بھی اس عہد میں حکومت کو بہت پریشان کرتے رہے ۔

فضل کے جانشین محمد حسین کو ایک مدعی محمد ابو مدیَن بن سلطان عبدالرحمٰن سے خطرہ لاحق ہو گیا ۔ محمد علی پاشا سلطان عبدالمجید کے ایک فرمان (۱۳ فروری ۱۸۴۱ء، دیکھیے J.C. Hurewitz : *Diplomacy in the Near and Middle East*، نیویارک ۱۹۵۶ء، ۱ : ۱۲۰) کی رو سے دارفور کا دعویدار تھا، اس نے ابو مدین کی حمایت کی اور مصر سے بھیجنے کے لیے فوج تیار کی گئی، لیکن اس مہم کو مصری سوڈان کے اولوالعزم "حکمدار" احمد پاشا ابو ودان کے رمضان ۱۲۵۹ھ/ستمبر-اکتوبر ۱۸۴۳ء میں انتقال کر جانے پر ترک کر دیا گیا ۔ حسین اور بعد کے خدیو سعید اور اسمٰعیل کے درمیان تعلقات دوستانہ رہے ۔ حکومت کے آخری برسوں میں حسین کی بصارت جاتی رہی اور امور سلطنت کو اس کی بہن "ایا بسی" زمزم سر انجام دیتی تھی ۔

اس کا جانشین سلطان ابراہیم جلد ہی رزیقات کے مسئلے میں سوڈانی ملک التجار الزبیر رحمہ منصور کے ساتھ لڑائی جھگڑوں میں الجھ گیا، جس کی نگرانی میں مغربی بحرالغزال کا نظم و نسق آ گیا تھا ۔ الزبیر نے "حکمدار" اسمٰعیل پاشا ایوب کے ساتھ (جو مشرق سے فوج لایا تھا) ساز باز کرکے، دارفور پر جنوب سے حملہ کیا ۔ ابراہیم کو الزبیر کے ہاتھوں شکست ہوئی اور وہ منواشی کی جنگ میں ۲۴ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو مارا گیا ۔ دار فور کا الحاق مصری سوڈان کے ساتھ ہو گیا ۔

عہد خدیویّہ و عہد مہدویّہ: فوراوی لوگ جبل مرّہ میں ٹھکانا بنا کر نام نہاد سلطانوں کے ایک سلسلے کے تحت اپنی بقا کے لیے مقاومت کرتے رہے ۔ پہلے حسب اللہ بن محمد فضل نے الزبیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اسے فوراوی شہزادوں اور اکابر کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مصر بھیج دیا گیا ۔ اس کے بھائی اور جانشین بوش نے ایک خطرناک بغاوت کی، لیکن وہ الزبیر کے بیٹے سلیمان کے ہاتھوں مارا گیا ۔ ۱۸۷۷ء میں نیا محصول عائد ہونے پر ایک اور بغاوت ہوئی، جس کی قیادت محمد فضل کے پوتے ہارون نے کی ۔ اس نے صوبائی دارالحکومت الفاشر کا محاصرہ کیا، لیکن اسے جبل مرّہ کی طرف واپس دھکیل دیا گیا اور وہ ۱۸۸۰ء میں النور بیگ محمد عنقرہ کے ہاتھوں مارا گیا، جسے بعد میں ایک مہدوی سردار کی حیثیت حاصل ہوئی ۔ اس کے بعد محمد فضل کے ایک اور پوتے عبداللہ دُوْدْ بنجہ نے جبل مرّہ میں سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ۔

۱۸۸۱ء میں مہدوی انقلاب برپا ہو جانے سے دارفور میں نازک صورت حال پیدا ہو گئی، کیونکہ فوج اور انتظامیہ کے متعدّد عمّال کی ہمدردیاں مہدی کے ساتھ تھیں، جو انھیں کی طرح سوڈان کے ساحلی

علاقے کا باشندہ تھا ۔ دوسری طرف فور اور رزیقات دونوں بھی خدیو کی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتے تھے ۔ مہدی کے العُبید پر قبضہ کر لینے اور Hicks کی مہم کے ناکام ہو جانے کے بعد (جنوری اور نومبر ۱۸۸۳ء) مصر کے آسٹروی گورنر Slatin کا سلسلۂ مواصلات منقطع ہو گیا اور اس نے دسمبر میں محمد بیگ خالد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، جو دارہ کا سابق نائب والی تھا اور جسے مہدی نے دارفور میں اپنا نائب مقرر کیا تھا ۔

۱۸۸۴ء میں، مہدی کی ایک فوج نے دُودبنجہ کو گرفتار کر لیا، جو بعد میں مہدی فوج میں بطور سردار شامل ہو گیا ۔ ۱۸۸۵ء میں مہدی کی وفات کے بعد محمد خالد نے اشراف (یعنی مہدی کے رشتے داروں) کے ساتھ مل کر نئے حکمران خلیفہ عبداللہ بن محمد [رک بآں] کو بے دخل کر دینے کی سازش کی ۔ اس نے فوج کی اچھی خاصی تعداد لے کر ام درمان پر چڑھائی کی، لیکن اس کا راستہ روک لیا گیا اور بارہ کے مقام پر اسے گرفتار کر لیا گیا (اپریل ۱۸۸۶ء) ۔ اس نے دارفور کی حکومت سلطان ابراہیم کے ایک بیٹے یوسف کے سپرد کی تھی، جس نے ۱۸۸۷ء میں سلطنت کو بحال کیا ۔ والی کردفان عثمان آدم کی قیادت میں ایک لشکر نے ۱۸۸۸ء کے اوائل میں یوسف کو شکست دی اور مار ڈالا ۔ اب عثمان نے دارفور کی حکومت بھی سنبھال لی ۔

چند ماہ بعد دارفور میں حکومت مہدیہ کا شیرازہ بکھر گیا ۔ یہ ایک بغاوت کا نتیجہ تھا جو مسیح موعود کے ایک داعی "فقی" ابو جُمَیزہ کے تحت دار قامہ میں شروع ہوئی ۔ فور کا برائے نام سلطان ابوالخیرات (برادر یوسف بن ابراہیم) اپنے حامیوں سمیت ابو جمیزہ سے مل گیا ۔ افواج مہدیہ کو دو لڑائیوں میں زبردست شکستیں ہوئیں ۔ اسی اثنا میں ابوجمیزہ کا چیچک کی بیماری سے انتقال ہو گیا اور اس کے پیرو الفاشر کے باہر شکست کھا کر فرار ہوئے (فروری ۱۸۸۹ء) ۔ ابو الخیرات جبل مرّہ کی طرف بھاگ گیا، جہاں وہ ۱۸۹۱ء میں اپنے غلاموں کے ہاتھوں مارا گیا ۔ عثمان آدم نے اس صوبے میں دوبارہ اپنی حکومت قائم کی، خصوصاً بقارہ پر، جنھوں نے خدیوی حکومت کے خلاف تو مہدیہ کی حمایت کی تھی، لیکن اب مہدوی تسلط سے ناراض تھے ۔ خلیفہ کی قبائلی حکمت عملی، جس پر عثمان آدم نے عمل درآمد کیا، تین بنیادوں پر قائم تھی: موروثی رئیسوں کے بجائے نئے رئیس نامزد کرنا؛ امُّدرمان کی طرف قبائل کو دھکیلنا اور قبائلی رقابتوں سے فائدہ اٹھانا ۔ خود خلیفہ کے قبیلے التعایشہ کی بڑی ہجرت عثمان آدم کے ہاتھوں ۱۸۸۸ء میں شروع ہوئی اور اس سے حکومت مہدیہ کے لیے اہم عواقب ظہور پذیر ہوئے ۔

۱۸۹۱ء میں عثمان آدم کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ محمود احمد والی دارفور بنا، جو آدم کی طرح خلیفہ کا رشتے دار تھا ۔ ۱۸۹۴ء میں کانگو سے بلجیم کی ایک مہم صوبے کے جنوبی کنارے تک پہنچ گئی اور انھوں نے فروق قبیلے کے سردار کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا، لیکن بعد ازاں جلد ہی یہ لوگ واپس ہو گئے (دیکھیے A. Abel: *Traduction de documents arabes concernant le Bahr-el-Ghazal*، در *Bull. de l'Academie royale des sciences coloniales*، برسلز ۱۹۵۴ء، ۵/۲۵: ۱۳۸۵ تا ۱۴۰۹) ۔ ۱۸۹۶ء میں، محمود کو امّدرمان واپس بلا لیا گیا تا کہ وہ انگریزی مصری حملے کے خلاف مہدوی فوجوں کی قیادت کرے ۔

علی دینار کا عہد حکومت اور تاریخ مابعد: جب ۱۸۹۸ء میں حکومت مہدیہ کا خاتمہ ہو گیا تو محمد فضل کے ایک پوتے علی دینار نے، جس کی مہدیہ میں بوقلموں زندگی گزری تھی (دیکھیے *A fragment from Ali Dinar*، در *Sudan notes and records*، ۳۴/۱، ۱۹۵۳ء: ص ۱۱۴ تا ۱۱۶)، الفاشر پر قبضہ کر کے

خود سلطان بن گیا۔ اگرچہ وہ خرطوم کی انگریزی۔ مصری مشترکہ حکومت کا رسمی طور پر مطیع و منقاد تھا لیکن بہت عرصے تک خلیفہ کی اس حکمت عملی پر کامیابی سے عمل پیرا رہا کہ اپنے مقبوضات میں سے فرنگیوں کو نکال باہر کرے۔ حکومت مہدیہ کا ایک باقی ماندہ فرد سنین حسین، جو عثمان آدم کے وقت سے کبکابیہ کا حاکم تھا، علی دینار کے مقابلے میں آیا اور اب اس نے حکومت مشترکہ کی حمایت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ سنین کو حتمی شکست ۱۹۰۸ء سے پہلے نہ ہو سکی۔ علی دینار کو اپنے پیش رووں کی طرح ایک طرف بقّارہ پر اور دوسری جانب دارفور اور وڈّائی کی درمیانی (Buffer) ریاستوں پر اپنا اقتدار جمانے میں مشکل پیش آئی، جب فرانس نے ۱۹۰۹ء میں وڈّائی پر قبضہ کر لیا تو مغربی سرحد کا مسئلہ زیادہ سنگین ہو گیا۔ فرانسیسیوں نے دارفور پر برطانوی اثر و رسوخ کو تو تسلیم کر لیا، لیکن وہ درمیانی ریاستوں پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ اگرچہ انگریزوں نے (سوڈان کی) مشترک حکومت کے وسیلے سے فوراوی دعووں کی شدّ و مد سے حمایت کی مگر سلطان خاصا عرصہ لڑتے رہنے کے بعد فقط دارالمسالیت کو قبضے میں رکھ سکا۔ ایک طرف فرانس کے روز افزوں اقتدار کا دباؤ تھا اور دوسری طرف مشترک حکومت کے خلاف پے در پے مقامی لوگوں کی شکایات آ رہی تویں، جن سے تنگ آ کر علی دینار پہلی عالم گیر جنگ میں عثمانی ترکوں کی طرف مائل ہوا۔ تب یہ بہانہ کر کے کہ دارفور کی طرف سے حملہ ہونے والا ہے، مشترک حکومت نے اس کے خلاف لشکر کشی کی۔ سلطان کی فوج کو الفاشر کے نزدیک ۲۲ جولائی ۱۹۱۶ء کو شکست ہوئی اور وہ خود بھی ۶ نومبر کو مارا گیا۔

علی دینار کا کانٹا نکل جانے کے بعد مغربی سرحد کا فرانسیسیوں سے تصفیہ ہو گیا۔ آخری سمجھوتا ۱۹۱۹ء میں ہوا، جس کی رو سے دارفور، دار قمر، نیز دارالمسالیت کا دو تہائی حصہ اپنے قبضے میں رکھنے کا مجاز ہو گیا، جس کے ایک حصے کو وہاں کے حکمران نے ۱۹۲۲ء میں فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ سرحد کی حد بندی کا کام ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوا۔ اگرچہ مہدی کے ایک داعی کے تحت نیالہ کے مقام پر ۱۹۲۱ء میں بعد از وقت شورش بپا ہوئی لیکن اس کے باوجود دارفور میں امن بحال کرنے کا کام مشکل نہیں تھا۔ البتہ دارفور کے الحاق میں جو تاخیر ہوئی اس کے باعث اسے انگریزی۔ مصری سوڈان کی ترقی کے ابتدائی مرحلے میں کوئی حصہ نہیں ملا بلکہ مشترک حکومت کے آخری سنین تک وہ دوسرے علاقوں سے الگ تھلگ اور پس ماندہ صوبہ رہا۔ ۱۹۳۷ء سے ہوائی مواصلات کے اجرا، مدارس کی ترقی اور جنوبی کرد فان میں سے نیالہ تک ریلوے لائن کی تعمیر (جو اپریل ۱۹۵۹ء میں مکمل ہوئی) اس پر دلالت کرتے ہیں کہ دارفور اب جدید سوڈان سے کامل طور پر متحد ہو گیا ہے۔

نظم و نسق کی تاریخ: کَیرہ سلاطین کے تحت انتظامیہ کے قواعد و ضوابط کو التونسی نے، اور زیادہ باقاعدگی سے Nathigal نے بیان کیا ہے۔ اس میں اسلامی خصوصیات بہت کم تھیں، تقریباً تمام عہدوں کے نام فوراوی تھے، عربی نہیں تھے۔ اس میں سب سے بڑا استثنا سلطان کے ذاتی نمائندے ("مقدوم"، جمع: "مقادیم") تھے، جن کا تقرر عموماً چند سال کے لیے ہوتا تھا اور وہ اپنے اپنے صوبوں میں کامل اختیارات استعمال کرتے تھے۔ شاہی بیگمات باوقار مقام رکھتی تھیں۔ مادر ملکہ کا سلطنت میں دوسرا درجہ ہوتا تھا، لیکن اس سے بھی زیادہ حقیقی قوت کی حامل "ایابسی" تھی، جو عام طور پر سلطان کی بہن ہوتی تھی۔ غلام اور خواجہ سرا اہم کردار ادا کرتے تھے۔ وزیراعظم، جو بلحاظ عہدہ مشرقی صوبے کا والی بھی تھا، ایک خواجہ سرا تھا۔ اس عہدے دار

کے اختیارات بادشاہ گر محمد کُرّہ کی وفات کے بعد کم کر دیے گئے۔ ایک روایت، کہ ابوالقاسم کے رشتے دار جنگ میں اس کا ساتھ اس بنا پر چھوڑ گئے تھے کہ اس کا رجحان حبشیوں کی طرف تھا، غالبًا اس بات کی علامت ہے کہ آزاد قبائلیوں کو نظر انداز کرکے محل سرا کے غلاموں کو فوج میں زیادہ بار مل گیا تھا۔ سلطان محمد حسین نے غلام فوج کی از سرنو تنظیم کی۔ اسی نے اپنے لشکر کو آتشیں ہتیاروں سے مسلح کیا تھا۔ غلام سپاہیوں کے علاوہ فوج میں وہ جنگجو بھی شامل ہوتے تھے جنھیں بوقت ضرورت صوبائی حکام بلا لیتے تھے۔ اسلامی اثرات زیادہ تر شاہی دفتر کے طور طریقوں اور مالکی مذھب کے مطابق قانون شریعت کی قبولیت میں نظر آتے ھیں۔ تاھم قدیم رواجی قانون بالکل متروک نہیں ھوا۔ کتاب دالی، جس میں، کہا جاتا ھے کہ اس قانون کی تدوین کی گئی تھی، غالبًا فرضی روایت ھے یا ممکن ھے یہ نام رواجی قانون کے معرض تحریر میں لانے کی کوششوں کے لیے استعمال کیا گیا ھو، (دیکھیے *The History of Darfur* : A.J. Arkell، ۱۲۰۰ تا ۱۷۰۰ء، ج ۳، در *Sudan notes and records*، ۱/۳۳، ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۵ تا ۱۳۶)۔

الزبیر کی فتح کے بعد، جہاں تک حالات نے اجازت دی، نظم و نسق کو مصری سوڈان کے دیگر حصوں کے مماثل بنا دیا گیا۔ "مدیر عموم دار فور" (والی یا صوبے دار) کا صدر مقام الفاشر تھا، جبکہ "مدیر" (نائب والی) الفاشر، شکّا (خطّۂ رزیقات پر نگرانی رکھنے کے لیے)، دارہ (جنوب سے دارالحکومت کی طرف جانے والے راستے پر) اور کبکابیّۃ (وَدّائی کی گزرگاہ پر) میں مقیم ہوتے تھے۔ ان والیوں کے ناموں کی فہرست R.L. Hill نے *Rulers of the Sudan*، ۱۸۲۰ تا ۱۸۸۵ء، در *Sudan notes and records*، ۱/۳۲، ۱۹۵۱ء، ص ۸۵ تا ۹۵، میں مرتب کی ھے۔

حکومت مہدیّہ کو اس کی پیشرو حکومت کے مسائل اور انتظامیہ کا ڈھانچہ ورثے میں ملا تھا۔ دارفور پر، جو بعد میں "عمالت الغرب" کے صوبے میں کردفان سے ملا دیا گیا تھا، ایک فوجی حاکم (شروع میں "امیر عموم" بعد میں "عامل عموم" دارفور) حکومت کرتا تھا۔ "اولاد العرب" (قبائلی دستے) اور "جہادیہ" (زنگیوں کی فوج) اس کے زیر قیادت ھوتی تھی۔ جہادیّہ میں نیز فوجی اور شہری عمّال میں بیشتر ایسے تھے جو سابقہ خدیوی حکومت کے تحت رہ چکے تھے۔ والی کی امّ درمان سے برابر مراسلت رہتی تھی، لیکن اس کا اپنا صوبائی "بیت المال" ھوتا تھا۔

علی دینار کے تحت بحال شدہ سلطنت نے خلیفہ کے مرکزی نظام کی بہت سی خصوصیات کو دوبارہ تازہ کیا۔ اصل میں یہ ایک مطلق العنان عسکری حکومت تھی، جس کے تحت قدیم فوراوی محکمے، نیز مقدوموں کا نظام متروک ھوگیا، اور "منادیب" (واحد: "مندوب"۔ خصوصی نائب) محصول وصول کرتے اور صوبوں میں سلطان کی نمائندگی کرتے تھے۔ مقربین اور غلاموں کا مرکز میں بڑا اثر و رسوخ ھوگیا تھا۔ مہدوی نظام کے اثرات قاضیوں کی خود مختارانہ تنظیم اور محصولات کے نظام میں دیکھے جا سکتے ھیں، جو خلیفہ کے زمانے کے نظام سے گہری مشابہت رکھتے ھیں۔

۱۹۱۶ء میں دارفور کے الحاق کے بعد صوبے کا انتظام ایک برطانوی گورنر اور ضلعی کمشنروں کے ھاتھ میں رھا، جو پہلے فوج کے عہدےدار تھے۔ ملکی نظم و نسق کے تجربات سے بعض مفید تبدیلیاں ظہور میں آئیں: خصوصًا عدالتی فرائض مقامی عمائد کو منتقل کرنے سے، لیکن انھیں تجربوں کی وجہ سے یہ کوشش بھی ھوئی کہ مقامی حاکموں کو بہت سے نئے اختیارات دیے جائیں یا سابقہ اختیارات بحال کیے جائیں حالانکہ یہ صورت حالات زمانے کے مطابق نہ تھی۔ ایسی حکمت عملی کی طرف جس پر سابقہ سلاطین اور صوبے دار یکے بعد دیگرے عمل کرتے رہے تھے، پھر

رجوع کرنا، اب اس قدر مصنوعی بات تھی کہ عام طور پر کامیاب نہ ہو سکتی تھی ۔ مشترک حکومت کے آخری دس برسوں میں دارفور کو بھی آئینی تبدیلیوں میں حصہ ملا، جو بہت تیزی سے واقع ہوئیں ۔ مقامی سرکاری کونسلوں کی تشکیل کی گئی اور غور و بحث کرنے والی متعدد مرکزی جماعتوں میں نمائندے بھیجے گئے ۔ پہلی جنوری ۱۹۵۶ء کو ملکی آزادی حاصل ہونے سے انتظامیہ کے ڈھانچے پر کوئی اثر نہ پڑا ۔ اس میں سوڈانی حکام پہلے ہی سے ان اعلٰی عہدوں پر مامور ہو چکے تھے جن پر اس سے پیشتر برطانوی مقرر تھے ۔ نومبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب نے بھی براہ راست صوبائی انتظامیہ پر کوئی اثر نہیں ڈالا، لیکن مقامی سرکاری کونسلوں کا آئندہ اسی طرح چلتے رہنا غیریقینی ہو گیا ۔ علی دینار اور مشترک حکومت کے تحت انتظامیہ کے لیے دیکھیے: G. D. Lampen: *History of Darfur*، در *Sudan notes and records*، ۳۱/۲ (۱۹۵۰ء): ۲۰۳ تا ۲۰۸ ۔

مآخذ: (۱) W. G. Browne: *Travels in Africa, Egypt, and Syria*، لنڈن ۱۷۹۹ء، ص ۱۸۰ تا ۲۵۰؛ (۲) محمد بن عمر التونسی: تشحیذ الاذہان بسیرۃ بلاد العرب والسودان، چاپ سنگ پیرس ۱۸۵۰ء، مترجمہ Perron: *Voyage au Darfour par le cheykh Mohammed Ebn-Omar El-Tounsy*، پیرس ۱۸۴۵ء؛ (۲) التونسی، مترجمہ Perron: *Voyage au Ouadây*، پیرس ۱۸۵۱ء؛ (۳) G. Nachtigal: *Sahara und Sudan*، ج ۳، لائپزگ ۱۸۸۹ء، ص ۳۵۵ تا ۴۶۳؛ (۴) R. C. [von] Slatin: *Fire and Sword in the Sudan*، لنڈن ۱۸۹۶ء، ص ۳۰ تا ۲۷۸؛ (۵) نعوم شقیر: تاریخ السودان، قاہرہ ۱۹۰۳ء، ۲: ۱۱۱ تا ۱۳۸؛ ۳: ۶۸ تا ۸۴، ۹۳ تا ۹۶، ۱۸۵ تا ۱۹۲، ۳۵۱ تا ۳۵۵، ۳۵۸ تا ۳۶۵، ۵۳۳ تا ۵۳۴، ۶۳۵ تا ۵۴۹، ۶۷۲؛ (۶) H.A. MacMichael: *A history of the Arabs in the Sudan*، کیمبرج ۱۹۲۲ء، ۱: ۵۲ تا ۱۲۸؛ (۷) وہی مصنف: *The Anglo-Egyptian Sudan*، لنڈن ۱۹۳۴ء، ص ۱۲۵ تا ۱۴۷؛ (۸) R. [L.] Hill: *A biographical dictionary of the Anglo-Egyptian Sudan*، آوکسفرڈ ۱۹۵۱ء، متعدد ملاحظات؛ (۹) P. M. Holt: *The Mahdist state in the Sudan*، آوکسفرڈ ۱۹۵۸ء، ص ۶۶ تا ۶۸، ۱۲۷ تا ۱۳۰، ۱۳۲ تا ۱۴۶؛ (۱۰) متعدد مقالات، در *Sudan notes and records*، خرطوم ۱۹۱۸ء؛ (۱۱) معلومات جو A.B. Theobald نے بہم پہنچائی تھیں جس کا مقالہ *Darfur and its neighbours under Sultan 'Ali Dinar*، شائع ہونے والا ہے، در *Sudan notes and records*، خرطوم کے سرکاری دفترخانوں میں مہدیہ، علی دینار کے عہد حکومت اور مشترک عہد حکومت کے مواد کا خاصا ذخیرہ موجود ہے ۔

(P. M. Holt)

* **الدار قُطنی**: ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی [الشافعی]، ایک نامور محدّث، جنہیں "امیر المؤمنین فی الحدیث" کا لقب دیا گیا، ۳۰۶ھ/۹۱۸ء میں بغداد [کے ایک محلے قطن] میں پیدا ہوئے [اور اسی کی نسبت سے الدار قطنی مشہور ہوئے] ۔ اپنے زمانے کے مشاہیر محدّثین سے حدیث کی تعلیم کے لیے سفر کیا اور اس سلسلے میں بصرے، کوفے، واسط، شام اور مصر پہنچے ۔ قُرآن مجید کی قراءت کا درس ابن مجاہد (م ۳۲۴ھ/۹۳۵ء)، محمد بن الحسن النقّاش (م ۳۵۱ھ/۹۶۲ء) اور دیگر اساتذہ سے لیا (ابن خلّکان) اور فقہ کی تعلیم ابوسعید الاصطخری (م ۳۲۸ھ/۹۳۹-۹۴۰ء) سے حاصل کی ۔ الدار قطنی نے ادبیات کا بھی مطالعہ کیا، مثلاً دیوان الحمیری انہیں از بر تھا اور اسی وجہ سے ان پر یہ شبہہ کیا گیا ہے کہ وہ شیعیت کی طرف مائل تھے ۔ ان کے شاگردوں میں الحاکم النیشا پوری (م ۴۰۵ھ/۱۰۱۴-۱۰۱۵ء)، ابو حامد الاسفرائنی (م ۴۰۶ھ/۱۰۱۵-۱۰۱۶ء)، القاضی ابوالطیّب الطبری

(م ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء) اور ابو نعیم الاصفہانی (م ۴۳۰ھ/ ۱۰۳۸-۱۰۳۹ء) مصنف حلیۃ الاولیاء ہیں ۔ دار قطنی اسی برس کی عمر میں بروز چہار شنبہ ۸ ذوالقعدہ ۳۸۵ھ/۴ دسمبر ۹۹۵ء کو فوت ہوے اور قبرستان باب الدیر میں معروف الکرخیؒ کے قریب دفن ہوے ۔ جنازے کی نماز ان کے شاگرد الاسفرائینی نے پڑھائی ۔

دار قطنی ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے احادیث کے انتقادی مطالعے کو آگے بڑھانے میں بہت حصہ لیا ۔ ان کی اکثر و بیشتر تصانیف علوم الحدیث سے متعلق ہیں، مگر افسوس کہ وہ تمام تر ہم تک نہیں پہنچ سکیں :

(۱) السنن (دہلی ۱۳۱۰ھ)، اس کتاب میں احادیث عموماً ان کی مختلف اسناد اور اختلاف روایات کے ساتھ ابواب کی ترتیب سے شامل کی گئی ہیں اور دوسری صحاح یا "جوامع" کے خلاف اس میں فقط وہ حدیثیں دی گئی ہیں جن کا تعلق فقہ سے ہے ۔ الخطیب (ص ۳۵، س ۳) لکھتا ہے کہ ایسی کتاب فقط وہی شخص لکھ سکتا ہے جو مسائل فقہ میں آئمہ کے اختلاف آرا سے گہری واقفیت رکھتا ہو ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دار قطنی نے ابن حنزابہ کو، جو [مصر میں] اخشیدیوں کا وزیر تھا، ایک مسند کی تالیف میں مدد دی اور اس مدد کے صلے میں انھیں وافر انعام ملا (ابن خلکان؛ یاقوت : ارشاد، ۲ : ۴۰۸)، لیکن یافعی کو اس میں بہت کچھ شبہہ ہے اور یاقوت (ارشاد، ۲ : ۴۰۶، س ۱۳) لکھتا ہے کہ یہ مسند خود الدارقطنی کی اپنی تالیف ہے [کتاب السنن کی ایک مفید اور عالمانہ شرح مولینا شمس الحق عظیم آبادی نے عربی زبان میں بعنوان تعلیق المغنی کے نام سے لکھی، جو ۱۹۱۰ء میں دہلی سے شائع ہوئی ۔ حال ہی میں اس کی ایک عکسی طبع بیروت سے شائع ہوئی ہے] ۔ (۲) کتاب علل الحدیث [یا العلل الواردۃ فی الاحادیث النبویہ] : یہ کتاب انھوں نے اپنے حافظے سے لکھوائی ۔ اس کی ان کے شاگرد [ابوبکر احمد بن محمد] البرقانی (م ۴۲۵ھ] نے بشکل مسند ترتیب اور اشاعت کی (الخطیب، ص ۴۷، س ۴۱ ببعد) ۔ اس کتاب کی دوسری، تیسری اور پانچویں جلد ہم تک پہنچی ہے ۔ [اس کے مخطوطات قاہرہ، بانکی پور، آصفیہ اور پٹنے میں موجود ہیں] ۔ النووی نے اپنی کتاب تقریب میں اس کتاب کے مطالعے کی سفارش کی ہے (ترجمہ از Marçais، در JA، سلسلہ ۹، ۱۸ [۱۹۰۱ء] : ۹۴) ۔ (۳) الالزامات علی الصحیحین : قابل وثوق احادیث کا مجموعہ ہے، جو بخاری و مسلم کے شروط کے مطابق ہیں، لیکن ان کی کتابوں میں درج نہیں ہیں (حاجی خلیفہ، عدد ۱۱۳۲) [اس کا مخطوطہ آصفیہ میں موجود ہے] ؛ (۴) الاستدراکات والتتبع، بخاری اور مسلم کی ایسی دو سو حدیثوں کی فہرست جو الدارقطنی کے نزدیک ضعیف ہیں (حاجی خلیفہ، ۲: ۵۴۵ اور عدد ۹۹۵۶)؛ (۵) کتاب الاربعین (حاجی خلیفہ : عدد ۴۰۶)؛ (۶) کتاب الافراد، آحاد احادیث پر (السیوطی؛ حاجی خلیفہ : عدد ۹۸۷۴)؛ (۷) کتاب الامالی، (السیوطی)؛ (۸) کتاب المستجاد (حاجی خلیفہ، ۱۰۴۸۸، ۱۱۹۲۳)؛ (۹) کتاب الرؤیا، پانچ حصوں میں (حاجی خلیفہ، عدد ۱۰۱۵۰)؛ (۱۰) کتاب التصحیف، اغلاط کتب حدیث پر (النووی : کتاب مذکور، ص ۱۱۵، حاجی خلیفہ : ۹۹۷۵)؛ (۱۱) کتاب المدبج، ان احادیث پر جو ہمعصر محدثوں نے ایک دوسرے سے لیں (ابن حجر العسقلانی : نخبۃ الفکر، طبع Nassau Lees، ص ۵۱، س ۱۱؛ اس لفظ کو یاقوت نے ارشاد الاریب، ۲ : ۴۰۶ میں غلطی سے 'مُذبج'، الذھبی نے 'مدلج' اور السیوطی نے 'مدبع' لکھا ہے لیکن صحیح تلفظ مدبج ہے)؛ (۱۲) غریب الحدیث (حاجی خلیفہ، عدد ۸۶۲۰) [مخطوطہ رامپور میں موجود ہے]؛ (۱۳) کتاب المختلف والمؤتلف فی اسماء الرجال (ابن خلکان؛ حاجی خلیفہ،

عدد ۷۰۸)؛ (۱۴) کتاب الضعفاء [والمتروکین] (النووی: کتاب مذکور، ص ۱۳۲)۔ اس کا ایک مخطوطہ [الظاہریہ میں اور ایک] استانبول میں محفوظ ہے۔ Spies : *Beiträge zur arabischen Literatur geschichte*، ص ۱۰۵؛ (۱۵) کتاب القراءات، (الفہرست، ص ۳۵؛ حاجی خلیفہ: عدد ۱۰۳۸۷)۔ یہ ایک مختصر درسی رسالہ ہے جس میں مصنف نے سب سے پہلے قراءت قرآن کے اصول درج کیے ہیں (الخطیب، ص ۳۴، سطر ۱۲)؛ حاجی خلیفہ (عدد ۲۴۱۳) نے ان کی ایک کتاب بنام معرفۃ مذاہب الفقہاء کا نام بھی لیا ہے۔ یہ مؤلف کتاب کی خطا ہے جیسا کہ الخطیب ص ۳۵، سطر ۲ سے اور اس کے نساخ کے ساتھ مقابلہ کرنے سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ یہ عبارت اصل مقالے میں نہیں ہے؛ (۱۶) کتاب الأسخیاء والأجواد ایک ادبی قسم کی کتاب ہے جو سوانح نویسوں کو معلوم نہ تھی، وجاہت حسین کو ایک نایاب قلمی مخطوطے کی شکل میں کتب خانۂ پٹنہ سے دستیاب ہوئی ہے اور *JA* میں شائع بھی ہو چکی ہے، *S.B*، سلسلۂ جدید ۳ (۱۹۳۴ء): ۳۶ تا ۴۱۔ اس کی کتاب کا اصلی ہونا اس بات سے ثابت ہے کہ اس کے اقتباس یاقوت: ارشاد اور ابن حجر: الاصابہ میں ملتے ہیں۔

مآخذ: (۱) الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، قاہرہ ۱۹۳۱ء، ۱۲: ۳۴ تا ۴۰؛ (۲) السمعانی: الانساب، در *GMS*، ج ۲۰، ورق ۲۱۷ (مأخذ: الخطیب)؛ (۳) یاقوت: معجم، طبع وُسٹنفلٹ، ۲: ۵۲۳؛ (۴) ابن خلکان: وفیات، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۱: ۳۳۱ [بولاق، ۱: ۴۷۰]؛ (۵) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد بدون تاریخ، ۳: ۱۹۹ تا ۲۰۳؛ (۶) السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبری، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۲: ۳۱۰ تا ۳۱۲؛ (۷) الیافعی: مرآۃ الجنان، حیدرآباد ۱۳۳۸ھ، ۲: ۴۲۴ تا ۴۲۶؛ (۸) السیوطی: طبقات الحفاظ، طبع وُسٹنفلٹ، گوٹنگن ۱۸۳۳ء، ۲: ۱۱۲ (اقتباس، جس میں الذہبی سے اضافہ کیا گیا ہے)؛ (۹) وُسٹنفلٹ: *Der Imam el Schâfi'i*، گوٹنگن، ۱۸۹۰ء، عدد ۲۳۵؛ (۱۰) ۱۹۲۲ء، ص ۱۸۴؛ (۱۱) براکلمان، ۱: ۱۶۵، ۱۵۳، ۲۷۵؛ [تاریخ الادب العربی (تعریب)، ۳: ۲۱۰ تا ۲۱۲]؛ (۱۲) یاقوت: معجم الادباء [= ارشاد الاریب]، ۲: ۴۰۶ تا ۶؛ ۸؛ (۱۳) حاجی خلیفہ: طبع فلوگل، بمدد اشاریہ؛ (۱۴) ابن الجزری: غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء، ۱: ۵۵۸، عدد ۲۲۸۱؛ (۱۵) ابن الصلاح: علوم الحدیث، حلب ۱۳۵۰ھ، ۲۱۳، ۲۳۱؛ (۱۶) سرکیس، ص ۲۵۶؛ (۱۷) شاہ عبدالعزیز: بستان المحدثین؛ (۱۸) الرسالۃ المستطرفۃ؛ (۱۹) طاش کبری زادہ: مفتاح السعادۃ، ۲: ۱۳]۔

(HEFFENING [و ادارہ])

دارا: (=داراب)، یہ اس ہخامنشی بادشاہ کے نام کی ایرانی صورتیں ہیں (عرب مصنفین نے بھی انہیں کو اختیار کیا ہے)، جو (یورپ میں) عام طور پر اپنی یونانی شکل داریوش Dareios (Darius) ہی میں لکھا جاتا ہے۔ داراب اور اس کا مخفف دارا براہ راست قدیم فارسی کے داریوہش سے لیے گئے ہیں (Bartholomae: *Altiranisches Wörterbuch*، ص ۷۳۸؛ مختلف نحوی صورتیں فارسی کتبوں کے ذریعے جانچی گئی ہیں در Tolman: *Ancient Persian Lexicon and Texts*، ۱۹۰۸ء، بذیل مادۂ دارَیَوُش darayavau؛ ان بادشاہوں کے قدیم مؤرخوں کے لیے دیکھیے *Gr. I. Ph.*، ج ۲، بمدد اشاریہ بذیل مادۂ Dareios)۔

داریوش نام کے بادشاہوں کے حالات سے متعلق جو مآخذ عربی اور فارسی مصنفوں نے جمع کیے ہیں، وہ بہ نسبت تاریخی ہونے کے افسانوی زیادہ ہیں (قب مقدمہ از J. Mohl: *Livre des Rois*، طبع ۱۲، ج ۵، ۱۸۷۷ء)۔ فارسی شاعر فردوسی (کتاب مذکور، ج ۵) انہیں کے بیانات سے متأثر ہوا، خاص طور پر عہد اسکندر کی بابت، پھر ان کے بیانات کو اس نے قدیم ایرانی داستانوں کے اجزا کے ساتھ مخلوط کر دیا۔ فردوسی کے بیانات سے اگر شاعرانہ مبالغات الگ بھی کر دیے

جائیں پھر بھی اس کا مواد عرب مؤرخوں کے بیانات سے کہیں زیادہ ہے؛ یہاں تک کہ الطبری سے بھی، جسے بلحاظ زمانہ سب پر تقدم حاصل ہے۔ ذیل میں ان بادشاہوں کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں (داراب اور دارا سے علی الترتیب داریوش [دارا] دوم اور داریوش سوم مراد ہیں)۔

شاہ ایران گشتاسپ (وِشْتاسپا، یونانیوں کے نزدیک ہستاسپ Hystaspe) نے اپنے پوتے بہمن کو اپنا جانشین نامزد کیا، جو اِسفندیار کا فرزند تھا (بہمن - وہُمَن جو اوستا کے وَہُومَناہ، "نیک خیال" سے مشتق ہے) اور جو اَرْتَخْشَتْرا (Artaxerxes Longhand) کے نام سے معروف ہے۔ خَتک دس Khetuk-das (kvaetvadaθa) کی رسم کے مطابق بہمن نے خود اپنی دُختر ھُمای سے شادی کی [کسی اور ذریعے سے اس کی تائید نہیں ہوتی قب براؤن، ج ۱ : ۱۱۷ بہمن سے شادی کی]، (ھُمای کو عوامی افسانوں میں پری ستی Parysatis کہا گیا ہے جو بقول J. Mohl تاریخی اعتبار سے داریوش دوم کی بیوی تھی)۔ بہمن سے ھُمای حاملہ ہوئی۔ بہمن نے اپنی وفات سے پہلے ھمای کو ملکۂ ایران نامزد کیا اور اس کا جانشین اس بچے کو مقرر کیا جو اس کے بطن سے پیدا ہو۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس کی ماں نے اسے ایک دایہ کے سپرد کر دیا، جس نے خفیہ طور پر اس کی پرورش کی۔ بچہ جب آٹھ ماہ کا ہو گیا تو ملکہ نے ایک صندوق کو زر و جواہر سے بھر کر اس میں بچے کو ڈال دیا اور دریائے فرات میں بہا دیا۔ دو جاسوس جو ملکہ نے صندوق کی نگرانی کے لیے مقرر کیے تھے، خبر لائے کہ ایک دھوبی نے صندوق میں سے بچہ نکال لیا ہے۔ دھوبی اور اس کی بیوی نے، جن کا اپنا بچہ ضائع ہو چکا تھا، اس کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اس کا نام داراب رکھا (فارسی "درآب"، "یعنی پانی کے اندر" عوام کے نزدیک اصل نام یہی ہے)۔ بچہ بڑا ہوا تو اس نے اپنے اصلی والدین کی بابت پوچھ گچھ کی۔ اس زمانے میں ایک لڑائی چھڑ گئی؛ داراب نے اس میں حصہ لیا، جس کی خبر ملکہ کو پہنچ گئی، داراب نے اس لڑائی میں بڑی شہرت حاصل کی۔ ایرانی سپہ سالار اعظم نے اسے ملکہ کے سامنے پیش کیا۔ ملکہ نے اس قیمتی نگ کو پہچان لیا جو اس نے اپنے بچے کے بازو پر باندھ دیا تھا۔ بالآخر ملکہ نے اس کے بادشاہ ایران ہونے کا اعلان کر دیا۔ داراب نے شہر داراب گرد بسایا اور پہلے عربوں کو اور پھر شاہ فیلقوس (مقدونیہ کا فلپ) کو شکست دی۔ فیلقوس کو اس نے خراج ادا کرنے پر مجبور کیا اور اس کی دختر سے شادی بھی کر لی۔ لیکن اس یونانی لڑکی کی بوسے دہن کے باعث داراب کو اس سے نفرت ہو گئی اور اسے واپس مقدونیہ بھیج دیا۔ اس وقت وہ حاملہ تھی۔ باپ کے گھر جا کر اس کے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے ایک پودے اسکندر iskandarus یونانی σκόρδον کے نام پر اسکندر رکھا، جس کے استعمال سے اسے بوسے دہن سے نجات ہوئی تھی۔ فیلقوس نے اسکندر کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ ادھر داراب کا ایک اور بیوی سے بھی بیٹا پیدا ہوا تھا، جس کا نام دارا تھا۔ آگے چل کر یہ دونوں شہزادے بادشاہ بنے۔ [اسکندر مقدونیہ (یونان) کا اور دارا ایران کا]۔ اسکندر نے نہ صرف دارا کو خراج دینے سے انکار کیا بلکہ مصر کو فتح کر کے اس امید پر ایران پر چڑھائی کر دی کہ وہ اسے (ایران کو) اپنے سوتیلے بھائی سے چھین لے گا۔ اسکندر سفیر کے بھیس میں دارا کی لشکرگاہ میں آیا، جہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا، لیکن وہاں اسے پہچان لیا گیا اس لیے وہ وہاں سے نکل بھاگا۔ اس کے بعد اسکندر نے دارا کو چار مرتبہ شکست دی۔ بالآخر دارا پر خود اس کے اپنے وزیروں نے قاتلانہ حملہ کیا اور اسکندر کو اس کی اطلاع کر دی۔ اسکندر کو یہ خبر سن کر سخت صدمہ ہوا۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی کے پاس دوڑا ہوا آیا تو دیکھا کہ وہ زندہ تو ہے لیکن بستر مرگ پر پڑا ہے۔ دارا نے خدا کے قادر مطلق ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اسکندر سے آخری درخواست

کی کہ اس کی دختر روشنک (رخسانہ Roxane) سے شادی کر لے اور ایرانیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ اسکندر ایران کا بادشاہ ہو گیا اور اس کے بعد اس نے کئی اور ملک فتح کیے (اسکندر کے کارہاے نمایاں کے بیان میں فارسی شعراء نظامی، امیر خسرو اور جامی نے سکندر نامے لکھے ہیں مگر ان میں فقط دارا کو شکست دینے تک کا بیان ہے؛ البتہ تقدیر کی نیرنگی پر اخلاق پند و نصائح کا اضافہ کیا گیا ہے)۔

عرب مؤرخوں اور فردوسی کے بیانات میں صرف جزئیات کا اختلاف ہے۔ الطبری کے وقائع نامہ [تاریخ الطبری] (نسخۂ فارسی ترجمہ از Zotenberg، ۱ : ۵۰۸ ببعد) میں آیا ہے کہ کم سن داراب کو ایک آسیابان نے دریا میں سے نکال کر بچایا۔ ہمای کو جب یہ خبر ملی تو اس نے بچے کو آسیابان ہی کے حوالے کر دیا اور اس سے فارسی میں کہا "دار" (یعنی اس کی خبرگیری کرنا) اور اسی بنا پر اس کا نام دارا پڑ گیا (یہ اس کے نام کی دوسری عوامی توجیہ ہے)؛ "یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کو داراب اس لیے کہنے لگے کہ وہ پانی کے اندر سے ملا تھا" (درآب)۔ جب وہ بیس سال کا ہو گیا تو ہمای نے اسے خود اس کی پیدائش کے راز سے آگاہ کیا۔ آخر اسکندر نے جب دارا کو خراج دینے سے انکار کر دیا تو دارا نے اسے علامتی طور پر تحفۃً کچھ چیزیں بھیجیں (چوگان، گیند اور تلوں کا ایک تھیلا)۔ یہ چیزیں ان سے بہت مشابہ ہیں جو ستھین (Scythians) نے داراے اول کو بھیجی تھیں (ہیروڈوٹس Herodotus، ۴ : ۱۳۱ تا ۱۳۲؛ نیز E Doblhofer : *Le déchiffrement des écritures*، فرانسیسی ترجمہ ۱۹۵۹ء، ص ۲۴)۔ دارا کے کردار کی وجہ سے جو بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی فوج نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ خود اس کے دو حاجبوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ خود اسکندر اس قتل کی سازش میں شریک تھا اور پھر محض دکھاوے کے لیے منافقانہ طور پر دارا کے بستر مرگ پر پہنچا اور اس کے قاتلوں کو سزا دی۔ حمزہ الاصفہانی نے اس سلسلے میں بہت اختصار سے کام لیا ہے (Annals طبع و ترجمہ Gottwaldt، ص ۲۸ تا ۲۹)، ایسے ہی المسعودی (مروج، ۲ : ۱۲۷) کا بیان بھی مختصر ہے۔ اس نے داریوش دوم اور داریوش سوم دونوں کو ایک ہی نام (دارا) سے یاد کیا ہے۔ الثعالبی : *History of the Kings of the Persians* (طبع و ترجمہ از Zotenberg، ص ۳۹۳ ببعد) میں بھی اسم داراب کے اشتقاق کی ایسی ہی خیالی وجوہ درج ہیں۔ اس کا بیان الطبری کے بیان سے مماثل ہے اور اس میں بھی دارا کے کردار اور اسکندر کی منافقت کو وثوق سے بیان کیا گیا ہے۔ یہی بیان المقدسی : *Book of the Creation* (طبع و ترجمہ از Cl. Huart، ۳ : ۱۵۴، ۱۵۹) میں نظر آتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اسکندر نے اداے خراج سے انکار کرنے کے بعد اپنے فیصلے پر نظرثانی کی اور بہتر طرز عمل اختیار کرتے ہوئے خراج ادا کر دیا اور ساتھ ہی معذرت نامہ بھیجا۔ اس پر دارا نے خیراندیشی کے طور پر اپنی لڑکی کی اس سے شادی کر دی۔ جس طرح [یونانی مصنف] **Pseudo-Callisthenes** نے اسکندر کو شاہان مصر کا وارث قرار دیا تھا، بالکل اسی طرح ایران کی افسانوی تاریخ نے اسکندر کو داریوش (دارا) سوم کا سوتیلا بھائی بنا دیا، جس سے اسکندر نے تخت ایران کے لیے جھگڑا کیا (ممکن ہے کہ یہ قصہ کوروش (Cyrus) کی روایت سے ملتبس کر دیا گیا ہو جس نے اپنے بڑے بھائی **Artaxerxes** دوم کے خلاف ۴۰۱ ق م میں بغاوت کی تھی۔

دارا (یا Daras-Anastasiopolis) ایک قلعے کا نام بھی ہے جو ماردین اور نصیبین کے درمیان واقع ہے، جسے خسرو اول نے اپنی ۵۴۰ء کی مہم میں یونانیوں سے چھینا تھا (Nöldeke : *Gesch. der Perser ... zur Zeit der Sasaniden*، ص ۲۳۹ اور A. Christensen : *L'Iran sous les Sasanides*، طبع دوم، ص ۳۷۲ اور ۴۴۵)۔

مآخذ: مقالے میں جو حوالے دیے گئے ہیں، ان کے علاوہ: فردوسی: شاھنامہ، طبع و ترجمہ از J. Mohl در ج ۵ اور ترجمہ در ج ۱۲ طبع تہران ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ء (اشاعت Beroukhim) ج ۶: الطبری، اشاریہ.

(B. CARRA DE VAUX-[H. MASSÉ])

* **دارابجرد:** (جدید داراب)، صوبۂ فارس کے ضلع فسا کا ایک شہر جو شیراز کے مشرق میں ۲۸۰ کیلومیٹر کے فاصلے اور ۱۱۸۸ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ۶۳۰۰ (۱۹۵۰ء) ہے۔ ایرانی افسانوی روایت میں اس شہر کی تأسیس داریوش سوم Darius III Codomannus کے باپ داراب سے منسوب کی جاتی ہے۔ ساسانی حکمران اردشیر نے جو پہلے دارابجرد میں فوج کا سپہ سالار تھا، بغاوت کر کے حکومت حاصل کی تھی۔ موجودہ دارابجرد کے جنوب مغرب میں ۸ کیلومیٹر کے فاصلے پر ساسانی دارابجرد کے آثار ہیں، جو سنگریزوں میں اٹے پڑے ہیں، قلعے کی دیواروں کے نشان بھی باقی ہیں اور ایک ویران آتش کدہ بھی نظر آتا ہے جو اس جگہ کے وسط میں متعین کیا گیا ہے۔ دارابجرد کے جدید گاؤں سے چھے کیلومیٹر دور جنوب مشرق میں چٹان پر تراشا ہوا ابھرواں کتبہ ہے، جو "نقش رستم" یا "نقش شاپور" کے نام سے معروف ہے۔ اس کے قریب ہی ایک وسیع دالان ہے، جو پہاڑی کو تراش کر تعمیر کیا گیا اور "مسجد سنگی" کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس میں اب سن ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء کے کتبے بھی کندہ نظر آتے ہیں اور سلطان ابوبکر کا نام بھی درج ہے، لیکن دالان غالباً اسی زمانے کا ہے، جب کتبہ نقش رستم تیار کیا گیا تھا۔

مآخذ: (۱) فرصت حسینی شیرازی: آثار عجم، بمبئی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء، ص ۹۲ تا ۹۹، لوحہ ۷ تا ۹؛ (۲) ل سٹرینج Le Strange، ص ۲۸۸ ببعد؛ (۳) A. Christensen: L'Iran sous les Sassanides، کوپن ہیگن ۱۹۴۴ء، ص ۸۶ تا ۸۷؛ (۴) فرہنگ جغرافیۂ ایران، تہران ۱۳۳۰ھ/۱۹۵۱ء، ۷: ۹۵.

(D.N. WILBER)

* **دارا بخت:** رک بہ بہادر شاہ ثانی.

⊛* **دارا شکوہ:** شاہجہان اور ممتاز محل کا سب سے بڑا بیٹا تھا؛ وہ اجمیر کے قریب ۱۹ صفر ۱۰۲۴ھ/۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو پیدا ہوا۔ اسے بارہ ہزار "ذات" چھے ہزار "سوار" کا پہلا منصب [رک بآں] ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۳ء میں ملا، نیز حصار کی سرکار تفویض ہوئی اور اس کی ولی عہدی کا اعلان بھی ہوا؛ ساتھ ہی فیروزہ کی جاگیر بھی ملی، جسے ولیعہد کا تمغہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ اسی سال اسے اس لشکر کی برائے نام سپہ سالاری بھی تفویض ہوئی جسے قندھار کی مدافعت کے لیے بھیجا گیا تھا، کیونکہ قندھار کو ایرانیوں سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ جب یہ خطرہ ایک بار پھر لاحق ہوا تو اسے ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں پھر سپہ سالار بنایا گیا مگر حملہ نہ ہوا۔ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں اسے صوبۂ الٰہ آباد کی صوبیداری عطا ہوئی، پھر ان میں صوبۂ پنجاب کا ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں، صوبۂ گجرات کا ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں [اور ملتان اور بہار کا ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء] میں اضافہ ہوا۔ صوبوں کی حکومت اس کے نائبوں کے سپرد تھی اور خود وہ دربار سے وابستہ تھا۔ لاہور سے دارا شکوہ کو بہت دلچسپی تھی؛ یہاں اس نے متعدد عمارات اور تجارتی منڈیاں تعمیر کرائیں [عمارات میں "آئینہ محل" خاص طور سے قابل ذکر ہے]۔ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء تک اسے تیس ہزار ذات اور ۲۰ هزار سوار کا منصب مل چکا تھا۔ (ضمناً بتا دینا چاہیے کہ یہ وہی بلند ترین منصب تھا جو تخت نشینی سے پہلے شاہجہان کو ملا تھا)۔

جب قندھار کو ایرانیوں سے (جنھوں نے ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں اس پر قبضہ کر لیا تھا) واپس لینے کی دو کوششیں ناکام ہو گئیں تو دارا نے اسے واپس لینے کے لیے ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء میں اپنی خدمات پیش کیں۔

اور پوری پوری جنگی تیاریوں کے بعد وہ ۱۱ فروری ۱۶۵۳ء کو قندھار روانہ ہوا۔ اگرچہ قندھار کا محاصرہ بڑی شد و مد سے کیا گیا اور زمین داور میں قلعوں پر قبضہ بھی کر لیا گیا، لیکن قندھار مسخر نہ ہو سکا۔ مہم کی ناکامی سے، جو دارا کے لشکر میں نااتفاقی نیز اس کے تجربے کی کمی کے سبب ہوئی، اس کی شہرت کو بحیثیت ایک سیاسی اور فوجی رہنما کے نقصان پہنچا۔

اس کی واپسی پر شاہجہاں نے اسے پہلے سے زیادہ امور سلطنت میں اپنا شریک بنایا اور ساٹھ ہزاری اور چالیس ہزاری کا اعلیٰ منصب عطا کیا (۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء)۔ اسی زمانے میں جب شاہجہاں بیمار پڑا تو اس کی صحت روز بروز گرنے لگی۔ اورنگ زیب نے باپ سے ملاقات کرنی چاہی تاکہ ملکی مصالح کے پیش نظر صورت حال سے آگاہ کرے، لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی [داراشکوہ ولی عہد سلطنت تو تھا لیکن اورنگ زیب اس وجہ سے اسے تخت و تاج کا اہل نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں سیاسی بصیرت اور عسکری مہارت کا فقدان تھا، نیز وہ ہندو علوم کے مطالعے کے بعد ویدانت سے متأثر ہو چکا تھا اور ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے میل جول کی وجہ سے ہندوؤں کی طرف زیادہ مائل تھا۔ یہ خطرہ بھی واضح تھا کہ اس کے حکومت سنبھالتے ہی دین کی نئی نئی تاویلیں ہوں گی۔ شریعت اسلام میں رخنے پڑیں گے اور مسلمانوں کے اعتقادات میں فرق آئے گا۔ آخر تخت نشینی کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ دھرمات کے مقام پر اورنگ زیب اور مراد کی متحدہ فوج کا شاہی لشکر سے آمنا سامنا ہوا، جس میں انہیں فتح ہوئی۔ اہم ترین جنگ آگرے سے آٹھ میل کے فاصلے پر سامو گڑھ میں ہوئی (۹ رمضان ۱۰۶۸ھ/ ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء)، جس میں داراشکوہ پورے وسائل بروئے کار لایا، لیکن یہ دن اس کے لیے نہ صرف شکست کا بلکہ تخت و تاج سے محرومی کا پیغام لایا۔ یہ جنگ بہت بڑی تاریخی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس سے درحقیقت ہندوستان کی بادشاہت کا فیصلہ اورنگ زیب کے حق میں ہو گیا]۔ اجمیر کے قریب دیورائی کے مقام پر آخری مرتبہ داراشکوہ نے قسمت آزمائی کرنی چاہی، لیکن یہاں بھی اسے شکست ہوئی (۲۸ جمادی الآخرہ ۱۰۶۹ھ/۲۳ مارچ ۱۶۵۹ء)۔ [داراشکوہ کو اب رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ ہمایوں کی طرح ایران پہنچ کر صفوی حکومت سے مدد حاصل کرے، چنانچہ اس نے اپنے ایلچی بھیج کر شاہ عباس دوم سے ایران آنے کی اجازت مانگی۔ شاہ نے نہ صرف اجازت دی بلکہ حکام اور والیوں کے نام فرمان جاری کیا کہ جہاں جہاں شاہزادہ پہنچے، اس کا پرتپاک خیرمقدم کیا جائے (سکینۃ الاولیا، طبع ڈاکٹر تارا چند و سید محمد رضا جلالی نائینی، مقدمہ ص شالزدہ)؛ چنانچہ داراشکوہ نے ایران جانے کے ارادے سے قندھار کا رخ کیا۔ راستے میں وہ ڈھاڈر کے افغان سردار ملک جیون کے ہاں ٹھیرا، جس نے حکومت وقت سے وفاداری کرتے ہوئے داراشکوہ، اس کے بیٹے سپہر شکوہ اور دو بیٹیوں کو اسیر کرکے دہلی بھجوا دیا۔ یہاں داراشکوہ پر الحاد و بے دینی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ ۳۰ اگست کی رات علما کے فتوے سے قتل ہوا اور مقبرۂ ہمایوں کے احاطے میں اسے دفن کیا گیا]۔

اگرچہ دارا میں سیاسی بصیرت اور عسکری مہارت مفقود تھی، تاہم وہ اپنے عہد کی ممتاز شخصیتوں میں سے ضرور تھا۔ وہ تصوف سے خاص دلچسپی رکھتا تھا اور ہندو فلسفے کے زیر اثر تھا۔ اس نے مسلمان صوفیہ اور ہندو سنیاسیوں سے گہرے تعلقات قائم کر لیے تھے: ان میں مشہور یہ ہیں: میاں میر[۲] (م ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء) اور ملّا شاہ [بدخشی][۳] (م ۱۰۷۱ھ/ ۱۶۶۱ء)، جو سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے (وہ مؤخر الذکر کا ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء میں مرید ہوا)، شاہ محب اللہ الہ آبادی، شاہ دلربا، سرمد، مشہور آزاد مشرب وجودی اور

بابا لال داس بیراگی، کبیر کا پیرو۔ اس کے عہد کی تصاویر، جن میں دارا کو صوفیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں دکھایا گیا ہے، محفوظ ہیں۔

ذیل کی تصانیف اس کی یادگار ہیں: (۱) سفینۃ الاولیاء (۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) [آگرہ ۱۸۵۲ء، لکھنؤ ۱۸۷۲ء، کانپور ۱۸۸۴ء، تہران طبع سید محمد رضا جلالی نائینی]؛ (۲) سکینۃ الاولیاء (۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء)، یہ کتاب سلسلۂ قادریہ، حضرت میاں میرؒ اور ان کے خلفا من جملہ ملا شاہ بدخشی کے احوال و فضائل پر مشتمل ہے [طبع ڈاکٹر تارا چند و سید محمد رضا جلالی نائینی ۱۳۴۴ھ ش/ ۱۹۶۵ء، تہران]؛ (۳) رسالۂ حق نما (۱۰۵۶ھ/ ۱۶۴۶ء) [لکھنؤ ۱۸۸۱ء اور ۱۹۱۰ء، تہران مع مجمع البحرین اور اپنشد مندک، طبع سید محمد رضا جلالی نائینی]؛ (۴) حسنات العارفین (۱۰۶۲ھ/ ۱۶۵۲ء)، جس میں مختلف سلسلوں کے اولیا کے اقوال ہیں، دہلی ۱۸۹۲ء؛ (۵) مکالمۂ بابا لال و داراشکوہ، جسے منشی چندر بھان برہمن نے مرتب کیا؛ (۶) مجمع البحرین (۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵ء)، ویدانت اور تصوف کی مصطلحات کا تقابلی مطالعہ [کلکتہ، طبع و ترجمہ از محفوظ الحق ۱۹۲۹ء، تہران، طبع سید محمد رضا جلالی نائینی ۱۳۳۵ھ ش]؛ اور (۷) سرِ اکبر (۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء) یہ پچاس اپنشدوں کا ترجمہ ہے، جسے اس نے فاضل پنڈتوں اور سنیاسیوں کی مدد سے چھے ماہ میں مکمل کیا تھا [طبع ڈاکٹر تارا چند و سید محمد رضا جلالی نائینی، تہران ۱۳۴۰ھ ش/ ۱۹۶۲ء]۔ اس کے علاوہ دارا کی سرپرستی اور امداد سے ہندوؤں کی متعدد مذہبی کتابوں کے تراجم فارسی میں کیے گئے، مثلاً یوگ وشسٹ گیتا اور متصوفانہ تمثیل پربودھ چندرودیہ۔ دارا خوش نویس بھی تھا اور علوم و فنون کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس نے خوش نویسی کے نمونوں اور مغلوں کی مختصر تصاویر کا ایک مرقع اپنی بیوی نادرہ بیگم (بنت شہزادہ پرویز) کو ۱۰۵۱ھ/ ۱۶۴۱-۱۶۴۲ء میں اپنے رقم کردہ دیباچے کے ساتھ پیش کیا تھا۔

دارا کی بعض متاخر تصانیف سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ نظریۂ وحدت الوجود کا پیرو تھا۔ وہ ہندو فلسفے اور صنمیات سے متأثر تھا، جس کی وجہ سے وہ متعدد ایسے ملحدانہ خیالات کی طرف مائل ہو گیا جن کے واضح مماثل ہندو فلسفے میں پائے جاتے ہیں اور جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، مثلاً مادے میں روح کی تنزیل (یعنی تنزلات)، تاہم وہ جسمانی مشقت اور اذیت کے طریقوں کا مخالف تھا، جس کی "یوگا" کے داعی، ضرورت بتاتے ہیں دلیل یہ دیتا تھا کہ خدا سزا نہیں دینا چاہتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ محبت کے ذریعے اس کا قرب حاصل کریں۔ دارا اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ویدانت اور تصوف، جن کے ذریعے "حق" کا ادراک کرنا چاہیے، وہ باہم مخالف نہیں؛ فرق صرف لفظوں کا ہے۔ اپنشدوں کے ترجمے میں، جسے وہ "وحدت کا سرچشمہ" بیان کرتا تھا، دارا نے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندو مت کے پیرووں کے مشترکہ نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، نیز اس نے یہ چاہا کہ ہندوؤں کے اعتقادات سے مسلمانوں کو شناسا کرائے۔

مآخذ: (۱) سرکار J. N. Sarkar: *History of Aurangzeb*، بار دوم، ج ۱، ۲، کلکتہ ۱۹۲۵ء؛ (۲) K.R. Qanungo: *Dara Shukoh*، بار دوم، کلکتہ ۱۹۵۲ء؛ (۳) بکرما جیت حسرت: *Dara Shikoh: Life and Works*، وشوا بھارتی ۱۹۵۳ء (اس میں دارا کی تصانیف کی تمام تصنیفات اور مخطوطات کی مکمل فہرست دی ہوئی ہے)؛ (۴) رسالۂ حق نما، مجمع البحرین و اپنشد مندک (طبع محمد رضا جلالی نائینی مع مقدمہ از تارا چند)، تہران ۱۹۵۷ء؛ (۵) تارا چند: *Dara Shikoh and the Upanishads*، در *IC* ۱۹۴۳ء؛ (۶) S. K. Rahman: *Sarmad and* his Quatrains، در Calcutta Review، ۱۹۰۳ء؛ (۷) C. B. Tripathi: Mirza Raja Jai Singh (غیر مطبوعہ مقالہ)، الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۵۳ء؛ (۸) آئی۔ اے۔ غوری: *Responsibility of the Ulema for the Execution of Dara Shikoh*، در *J. Pak. H. S.*، ۱۹۵۹ء؛ (۹) ایم۔ اطہر علی: *Religious Issue in the War of Succession 1658-59*، در *Ind. Hist. Cong. Proc 1960*.

(ستیش چندر [و ادارہ])

* **دارم**: رک بہ تمیم.

* **الدارمی**ؒ: ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن ابن الفضل بن بہرام بن عبدالصمد التمیمی السمرقندی، تمیم کی ایک شاخ بنو دارم بن مالک سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے احادیث کی تلاش میں سفر کیے اور انھیں عراق، شام اور مصر کے متعدد مستند علما سے حاصل کیا۔ ان لوگوں میں جنھوں نے ان کی سند پر احادیث روایت کیں، مُسلم بن الحجاج اور ابو عیسٰی الترمذی تھے۔ الدارمی سادگی اور تقوٰی کی زندگی بسر کرتے تھے، جو مطالعے کے لیے وقف تھی۔ وہ اپنے علم حدیث، ثقاہت، صداقت اور اصابت رائے کی وجہ سے مشہور تھے۔ انھیں سمرقند میں قاضی کے عہدے کی پیش کش کی گئی مگر انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سلطان کے اصرار پر یہ عہدہ قبول تو کر لیا، لیکن ایک ہی فیصلہ دینے کے بعد معذرت کی، جسے قبول کر لیا گیا۔ وہ ۱۸۱ھ/۷۹۷ء میں پیدا ہوے اور ۲۵۵ھ/۸۶۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تحریریں زیادہ تر حدیث سے متعلق تھیں، لیکن تفسیر قرآن لکھنے کا بھی انھیں امتیاز حاصل ہوا۔ الخطیب البغدادی کہتا ہے کہ دارمی نے المسند اور الجامع تالیف کیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی کتاب کے مترادف نام ہوں۔ [براکلمان نے المسند الجامع لکھا ہے (تعریب: ۳: ۲۰۰)]۔ دارمی کے مجموعۂ احادیث کو عام طور پر المُسْنَد کہتے ہیں (طبع کانپور ۱۲۹۳ھ، حیدر آباد ۱۳۰۹ھ، دہلی ۱۳۳۷ھ، دمشق ۱۳۴۹ھ)، لیکن یہ نام فقط اسی صورت میں موزوں ہو سکتا ہے جب اسے اس وسیع مفہوم میں لیا جائے، جو قدیم زمانے میں رائج تھا ورنہ اسے السنن کہنا چاہیے [اور عام طور پر سنن الدارمی کے نام سے مشہور بھی ہے] کیونکہ اس میں احادیث کو موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے [نہ کہ رواۃ کے ناموں کے اعتبار سے۔ مطبوعہ نسخوں کا ذکر کرتے ہوے سرکیس نے معجم المطبوعات میں اس کا نام الجامع الصحیح . . . فی السنن تحریر کیا ہے]۔ اس تالیف کو صحاح ستّہ کے برابر کی حیثیت نہیں دی گئی، لیکن ابن حجر العسقلانی نے اسے ابن ماجہ کی سُنَن سے افضل قرار دیا ہے۔ یہ صحاح ستہ کی ہر کتاب سے کہیں چھوٹی ہے۔ حاجی خلیفہ دیگر تین تصنیفات کا ذکر کرتا ہے؛ ان میں سے دو الدارمی کی مُسند کے اقتباسات ہیں، لیکن وہ محفوظ نہیں رہے۔

مآخذ: (۱) ابن ابی حاتم: کتاب الجرح والتعدیل، حیدر آباد ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء، ۲: ۲: ۹۹؛ (۲) تاریخ بغداد، ۱۰: ۲۹ تا ۳۲؛ (۳) السمعانی، ص ۲۱۸ الف - ب؛ (۴) الذہبی: تذکرة الحفاظ، ۲: ۱۰۵ ببعد؛ (۵) ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۵: ۲۹۳ تا ۲۹۶؛ (۶) ابن الصّلاح: علوم الحدیث، حلب ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء، ص ۴۲؛ (۷) ابن العماد: شذرات، ۲: ۱۳۰؛ (۸) حاجی خلیفہ، طبع فلوگل Flügel، ۴: ۴۹۲، ۳: ۶۲۸، ۵: ۱۰۹ ببعد، ۵۳۰، ۵۳۹ ببعد؛ سرکیس: [معجم المطبوعات]، قاہرہ ۱۹۲۸ - ۱۹۳۰ء، ص ۸۵۷ ببعد؛ (۱۰) Goldziher: *Muh. St.*، ۲: ۲۵۸ تا ۲۶۰؛ (۱۱) M. Weisweiler: *Istanbuler Handschriften Zur ara-bischen Traditionsliteratur*، (*Bibl. Islam*، ج ۱۰، ۱۹۳۷ء)، عدد ۵۰؛ براکلمان، ۱: ۱۷۱ ببعد، تکملہ، ص ۲۷۰۔

(J. Robson)

* **داروغه**: یہ لفظ مغولی جزو ترکیبی "درو"

(dru-) سے بنایا گیا ہے، جس کے معنی "دبانا، مہر لگانا" ہیں اور اس کا اطلاق مغول سلاطین کے جاگیرداری نظام میں ایک سردار پر کیا جاتا تھا (K. H. Menges : *Glosser zu den Volkskundlichen Texten aus Ost. Turkistan*، ج ۲، Wiesbaden، ۱۹۵۵ء، ۷۱۴؛ بذیل مادۂ dorya؛ B. Vladimirtsov : *Le régime social des Mongols*، پیرس ۱۹۴۸ء، ص ۱۸۱، ۲۰۹، ۲۱۴؛ P. Pelliot : *Notes sur l'histoire de la Horde d'or*، پیرس ۱۹۵۰ء، ص ۷۲)۔ ۶۱۷ - ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں المالیغ (Almaligh) کے مقام پر مقامی حاکم کے علاوہ فرمانروائے سلطنت کا نمائندہ ایک مغول داروغچی (darrakhačī) بھی ہوتا تھا۔ اس پر جو فرائض عائد کیے گئے تھے، ان میں ذیل کے فرائض شامل ہیں: باشندوں کی مردم شماری کرنا، مقامی فوج بھرتی کرنا، ڈاک کا سلسلہ قائم کرنا محصولات وصول کرنا اور خراج کی رقم دربار کو ارسال کرنا (W. Barthold : *Turkestan* بار دوم، ص ۴۰۱)۔ ایران میں اس لقب کا استعمال پہلی مرتبہ ہم ایلخانیوں کے زمانے میں دیکھتے ہیں۔ تیموریوں کا زمانہ آتے آتے تو یہ عملی طور پر شحنہ کی جگہ لے لیتا ہے کیونکہ داروغہ کے عموماً وہی فرائض تھے جو شحنہ کے ہوا کرتے تھے۔ اپنے خاص اختیارات میں وہ فوجی انتظام سے متعلق تھا۔ صفویوں کے زمانے میں داروغہ کے فرائض کبھی کبھی وہی ہوتے تھے جو حاکم (عامل) شہر کے ہوا کرتے ہیں (Olearius : *The Voyages and Travels* ......، لنڈن ۱۶۶۹ء، ص ۴۰۴؛ Chardin : *Voyages*، طبع Langlès، پیرس ۱۸۱۱ء، ۵: ۲۹۰)۔ مگر عام طور پر وہ ایک طرح کا پولیس کا عہدے دار ہوتا تھا، جو عموماً دیوان بیگی کے تحت کام کرتا تھا۔ اس کے فرائض یہ تھے کہ بدعنوانی، ظلم و زیادتی، جھگڑے فساد اور شریعت کی خلاف ورزی، جیسے عصمت فروشی، شراب نوشی اور قماربازی کی روک تھام کرے (تذکرة الملوک، فارسی متن کی نقل مطابق اصل، مع ترجمہ و شرح از V. Minorsky لنڈن اور لائڈن ۱۹۴۳ء، ص ۷۷ ب ببعد؛ Tavernier : *Collections of Travels* ....، ص ۲۲۲، ۲۲۳)۔ اسے مجرموں کو سزا دینے اور جرمانہ کرنے کے اختیارات حاصل تھے اور بذات خود وہ مال مسروقہ کی بازیابی کا ذمے دار تھا (تذکرة الملوک، حوالۂ مذکور)۔ اسے صلۂ خدمت دینے کے لیے لوگوں پر فیس عائد کی جاتی تھی، جسے "داروغہ" کہتے تھے (تذکرة الملوک، ص ۹۰ ب، Du Mans : *Estat de la Perse en 1660*، پیرس ۱۸۹۰ء، ص ۴۹)۔ بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی اور تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں ایران میں داروغہ کے فرائض وہی رہے جو حاکم شہر کے ماتحت پولیس کے عہدے دار کے ہوتے ہیں۔ وہ قیمتوں، باٹوں اور پیمانوں کو منضبط کرتا؛ شہر اور بازاروں میں امن قائم رکھتا اور لوگوں کے اخلاق کی نگرانی کرتا تھا۔ اس کے اختیار کا دائرہ بازاروں تک محدود ہوجانے کی وجہ سے وہ اب محتسب کے فرائض میں دخل اندازی بھی کرتا تھا بلکہ بعض صورتوں میں خود اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ شاہی خدمات انجام دینے والے بعض کاریگروں کی فہرستیں بھی دارالسلطنت میں اس کے پاس رہتی تھیں (قب P. A. Jaubert : *Voyage en Arménie et en Perse*، پیرس ۱۸۲۱ء، ص ۴۴۲)۔ دستوری عہد کے شروع تک بھی داروغہ کا منصب باقی تھا (دیکھیے E. Aubin : *La perse d' aujourd' hui*، پیرس ۱۹۰۸ء، ۴۷، ۱۰۶؛ *De Téhéran à Ispahan*، در *RMM*، جون - جولائی ۱۹۰۷ء، ص ۴۵۹ اور *Le Chisme et la nationalité Persane*، در *RMM*، ۱۹۰۸ء، ص ۴۸۲)۔ لیکن حکومت کے نئے طریق کار میں یہ منصب بے مصرف ہو کر رہ گیا کیونکہ داروغہ کے سابقہ منصبی فرائض اس وقت بلدیات اور پولیس کے محکمے نے سنبھال لیے۔

داروغہ کی اصطلاح کا خاتمۃً اطلاق اس شخص

پر نہیں ہوتا تھا جس کے فرائض عامل شہر یا پولیس کے ہوں۔ ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ داروغہ کا تقرر ایک قبائلی گروہ کی نگرانی کے لیے ہوا اور اس کے فرائض شہر کے داروغہ یا بازار کے د[illegible] سے صریحًا مختلف تھے، مثلاً عبدالرزاق کا بیان [illegible] کبھی کبھی ایک داروغہ اور ایک محصّل ہرات کے ہزارہ قبائل سے واجب الوصول لگان وصول کرنے کے لیے بھیجا کرتا تھا (مطلع سعدین، طبع محمد شفیع، ۲: ۱۲۹۷)۔ صفوی عہد میں ترکمانوں کا ایک داروغہ استراباد میں بھی تھا (قب حسن روملو: احسن التواریخ، طبع و ترجمہ سدن C.N. Seddon بڑودہ ۱۹۳۱ تا ۱۹۳۴ء، ص ۳۴۶-۳۴۷)۔ خاندان قاچار کے زمانے میں مختلف ترکمان قبائل سے محصولات ایک داروغہ وصول کرتا نظر آتا ہے (قب روزنامۂ دولت علیۂ ایران، ۲ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ، ۲۹ محرم ۱۲۸۲ھ) اور مثالیں ایسی بھی موجود ہیں کہ آبادی کے خاص خاص حصوں کے لیے داروغہ مقرر کیا گیا؛ چنانچہ یزد کے مجوسیوں کے داروغہ کا تقریبًا ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۴ء میں ذکر آتا ہے (محمد مفید: جامعۂ مفیدی، B.M. Or. 210، ورق ۳۶۳ b)۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس کے فرائض کیا تھے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ زرتشتی فرقے سے واجب الوصول محصول حاصل کرتا ہو نیز اس فرقے سے متعلق مخصوص قوانین نافذ کرتا ہو۔

صفوی عہد میں داروغہ کی اصطلاح ایک قسم کے صدر محرر کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی، جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ بڑے بڑے سرکاری محکموں کے عملے کی نگرانی کرے۔ داروغۂ فراش خانہ اور داروغۂ دفتر خانہ اسی قبیل کے داروغہ تھے (تذکرة الملوک، ورق 91a-91b، ۱۳۱؛ Tavernier، ۲۲۲)۔ قاچاروں کے زمانے میں بھی داروغہ کی اصطلاح انھیں معنوں میں استعمال ہوتی رہی۔

ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں داروغہ شاہی اصطبل کے ایک عہدے دار کو کہتے تھے (ابوالفضل: آئین اکبری، ترجمہ Blochmann، ج ۱، ۵۳)۔ برطانوی ہند میں یہ عہدہ مختلف محکموں کے مقامی سربراہوں کا ہوتا تھا اور ۱۷۹۳ء سے ۱۸۶۲-۱۸۶۳ء تک پولیس کے مقامی افسر (= تھانے دار) کو بھی داروغہ کہتے تھے (H. C. Burnell اور H. Yule: Hobson Jobson، لندن ۱۹۰۳ء، ۲۹۷-۲۹۸)۔ صفوی عہد میں گرجستان (Georgia) میں داروغہ پولیس کا ایک افسر ہوتا تھا، جو موروی (= کانسٹیبل) اور ملک (ارمنیا کے بلدیے کا سردار) اور کدخدا کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا (دیکھیے فرامین کا جائزہ از M. F. Brosset، در *Histoire de la georgie*)۔

مآخذ: دیکھیے متن بالا اور (۱) G. Le Strange: *Clavijo's Embassy to Tamerlane 1403-1406*، لندن ۱۹۲۸ء، ص ۳۰۳؛ (۲) وہی مصنف: *Don Juan of Persia*، لندن ۱۹۲۶ء، ص ۴۶؛ (۳) J. Fryer: *Travels*، لندن ۱۶۹۸ء، ص ۲۲۹؛ (۴) W. Francklin: *Observations on Tour from Bengal to Persia*، ص ۱۳۰ تا ۱۳۱، ۱۳۶ تا ۱۳۷؛ (۵) Krushinsky: *The History of the Revolution in Persia*، ڈبلن ۱۷۲۹ء، ص ۸۰؛ (۸) E. S. Waring: *A Tour to Sheeraz by the Route of Kazroon and Feerozabad*، لندن ۱۸۰۷ء، ص ۶۷؛ (۹) Sir J. Malcolm: *History of Persia*، لندن ۱۸۲۹ء، ۲: ۳۲۳؛ (۱۰) M. Tancoigne: *A Narrative of a Journey in the Persia*، لندن ۱۸۲۰ء، ص ۲۲۸ تا ۲۲۹؛ (۱۱) J. B. Fraser: *Travels and Adventures in the Persian Provinces on the Southern Banks of the Caspian Sea*، لندن ۱۸۲۶ء، ص ۱۳۹؛ (۱۲) R.B.M. Binning: *A Journal of two years travel in Persia, Ceylon, etc.*، لندن ۱۸۵۷ء، ۱: ۳۴۷ تا ۳۴۹؛ (۱۳) A.K.S. Lambton: *The Evolution of the office of Dārūgha*، در مردم شناسی، تہران (شمارہ ۱ تا ۳)، ۱۳۳۸ھ ش/۱۹۵۹ تا ۱۹۶۰ء

(A.K.S. LAMBTON)

* **الدّاروم**: فلسطین میں ساحل بحر کے قریب ایک مسطح میدان کا نام اور آگے چل کر صلیبی محاربات کے زمانے میں خاص طور پر ایک قلعے کا نام۔ عرب مصنفوں کی کتابوں میں یہ لفظ ان دونوں معنی میں پایا جاتا ہے۔ عبرانی لفظ dārom جس سے داروم ماخوذ ہے اور توراۃ کی کتاب استثناء (۳۴: ۳) کے عربی ترجمے میں dārom کی جگہ داروم ہی استعمال کیا گیا ہے۔ عہد نامۂ عتیق کی چند عبارتوں میں یہ سمت جنوب کے معنی میں استعمال ہوا ہے نیز کسی ملک کے لیے جو جنوبی سمت میں واقع ہو (F.M. Abel) اور بعد کے زمانے میں اس کا اطلاق خاص طور پر اس علاقے پر کیا جاتا تھا جو یہودیہ (Juda) کے جنوب مغرب میں ایک نشیبی علاقہ (Sephela = سفلہ) (جو اس کے متصل شمال میں ہے) اور جنوبی جانب کا صحرائی خطہ (Negeb) دونوں سے الگ اور متمایز تھا۔ بوزنطی نام دروماس Daromas، جو اس قدیم لفظ Darom سے مطابقت رکھتا ہے، کا اطلاق الیوتھرو پولس Eleutheropolis کے وسیع ضلع کے جنوب مغربی حصے پر بھی ہوتا تھا (دیکھیے بیت جبرین) لیکن خود شہر مذکور کو اس میں شامل نہیں کرتے تھے۔ البتہ عربوں کے زمانے میں یہ امتیاز باقی نہ رہا اور المقدّسی کے قول کے مطابق الداروم میں بیت جبرین کے ارد گرد کے سارے علاقے کو شامل کیا جانے لگا اور جب خلافت حضرت ابوبکرؓ میں بیت جبرین فتح ہوا تو یہ سارا علاقہ اس کی تاریخ کا جزو بنا۔

فلسطینی قلعہ الداروم، جسے صلیبی جنگجو Darom کہتے تھے، اس سڑک پر واقع تھا جو غازہ Gaza سے مصر کو جاتی ہے اور اس کی جائے وقوع وہی ہے جس کی نشاندہی آج کل دیرالبلح کے کھنڈر کرتے ہیں۔ یہ قلعہ اس جانب سے یروشلم کی لاطینی حکومت کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے اس قلعے پر خاص طور سے حملہ کیا اور اس کے بعد ۵۸۳ھ/ ۱۱۸۷ء میں فلسطین کے بڑے حصے پر دوبارہ قبضہ کرنے کے سلسلے میں اسے فتح کر لیا۔ آگے چل کر شاہ رچرڈ "شیر دل" اور تیسری صلیبی جنگ کے فرانکوں نے ۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء میں اس کا محاصرہ کرکے اسے مسخر کر لیا اور اس کے مورچے تڑوا دیے لیکن مملوک عہد تک بھی اس کا شمار ان دفاعی قلعوں میں ہوتا رہا جو براہ راست ضلع غازہ کے نائب کے زیر اقتدار صوبۂ دمشق کی ساحلی سرحد پر تھے۔

مآخذ: (۱) F.M. Abel: *Géographie de la Palestine*، پیرس ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۸ء، خصوصاً ۱: ۳۲۰ تا ۳۲۲؛ (۲) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۴۳۷؛ (۳) A. S. Marmardji: *Textes Geographiques*، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۱۷ تا ۷۲؛ (۴) Caetani: *Annali*، بمدد اشاریہ (۲: ۱۲۹۱)؛ (۵) الطبری، بمدد اشاریہ؛ (۶) *BGA*، بمدد اشاریہ؛ (۷) یاقوت، ۲: ۵۲۵؛ (۸) ابن الاثیر، خصوصاً ۱۱: ۳۲۶، ۳۶۱ اور ۱۲: ۵۲ تا ۵۳؛ (۹) *Hist. Or. Cr.*، ج ۱ تا ۵، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) ابن شداد: جنوبی شام، مخطوطۂ لائڈن ۸۰۰، ورق ۱۳۹ ب؛ (۱۱) Grousset: *Hist. des Croisades*، پیرس ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶ء، بمدد اشاریہ خصوصاً ۲: ۵۵۹ تا ۵۶۰ اور ۳: ۸۵ تا ۸۷؛ (۱۲) M. Gaudefroy-Demombynes: *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، خاص طور پر ص ۱۳ اور ۵۰۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

* **داعی**: (داعیہ) "وہ شخص جو (کسی مسلک کی طرف) بلاتا ہے"۔ یہ لقب سواد اعظم سے الگ دعوت دینے والے فرقوں نے اپنے بڑے بڑے مبلّغین کو دیا۔ بہ ظاہر سب سے پہلے یہ لقب متقدمین معتزلہ [رک بآں] نے استعمال کیا، لیکن زیادہ غالی شیعیوں میں یہ نام خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ خراسان میں عبّاسیوں کے حامیوں میں بھی

مستعمل ہوا نیز بعض موقعوں پر اسے زیدیوں نے بھی استعمال کیا ۔ ابوالخطّاب کے متبعین کو بھی یہ لقب دیا گیا تھا ۔ اسمٰعیلیوں اور ان کے ساتھ کی تحریکوں میں اسے خاص اہمیت دی گئی (ان تحریکات کا نام "دعوٰی" رکھا گیا تھا) جہاں یہ لقب ہر اس عہدیدار کو دیا جاتا تھا جو "امام" کا منظور کردہ نمائندہ ہوتا تھا ۔

جب اسمٰعیلی تحریک اپنے عروج پر تھی تو اسمٰعیلیوں میں "دعاۃ" (داعیوں) کی تنظیم مذہبی عہدے داروں کے طور پر کی گئی (انھیں عیسائی اسقفوں کے مماثل بیان کیا گیا ہے) ۔ مختلف عہدے داروں کو ان کے درجے کے مطابق جو لقب دیے جاتے تھے وہ موقع محل کے لحاظ سے کئی قسم کے ہوتے تھے (اور غالباً درجہ مقرر کرنے کے طریقے کی پابندی سختی کے ساتھ نہیں کی جاتی تھی) ۔ داعیوں کا سردار، جو امام کی طرف سے بولنے کا مجاز ہوتا تھا باب [رک بآں] یا داعی الدّعاۃ کہلاتا تھا ۔ بڑے بڑے داعیوں کو [رسماً کم سے کم بارہ چوٹی کے داعیوں کو] "حُجّة" یعنی صداقت کی دلیل اور شاید ابتدائی زمانے میں "نقیب" لقب ملتا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے ان میں سے ایک کے تحت ایک ضلع (جزیرہ) ہوتا تھا جہاں "دعوے" کی تبلیغ کی جاتی تھی ۔ بعض تصانیف میں حُجّة کو "لاحق" اور "داعی" کو "جناح" کہا گیا ہے، دیکھیے W. Ivanow : *Studies in Early Persian Ismailism* لائڈن ۱۹۴۸ء، بار دوم بمبئی ۱۹۵۵ء، باب ۲) ۔ بظاہر داعی کے لیے ایک علاقہ مخصوص کر دیا جاتا تھا ۔ جہاں اسے ایمان لانے والوں پر مکمل اختیار ہوتا تھا ۔ وہ نئے لوگوں کو اپنے سلسلے میں داخل کرتا اور رفتہ رفتہ باطنیہ [رک بآں] کی تعلیم کی طرف ان کی رہنمائی کرتا تھا ۔ اس کی مدد کے لیے اس کے ماتحت کچھ عہدے دار بھی ہوتے تھے، جنھیں "ماذون" (وعظ کہنے کا اذن یافتہ) اور مُکلّبر (ترغیب دینے والا) کے لقب دیے گئے تھے ۔

اس جگہ کے علاوہ جہاں امام کی حیثیت با اختیار خلیفہ کی ہوتی تھی، باقی مقامات پر دعوے کی تلقین پوشیدہ طور پر خفیہ تحریک کے ذریعے کی جاتی تھی ۔ اس لیے اس علاقے میں جو اسمٰعیلیوں کے تسلط میں ہوتا داعی کا درجہ بلند ہوتا تھا (داعی الدعاۃ تمام سرکاری مذہبی امور کے محکمے کا سربراہ ہوتا تھا اور بظاہر اس کا مرتبہ وزیر کے برابر ہوتا تھا، بشرطیکہ داعی الدعاۃ اور وزیر کا عہدہ ایک ہی شخص کے پاس نہ ہو) ۔ اس کے علاوہ دوسرے علاقوں میں داعیوں کی زندگی خطرے سے خالی نہیں تھی اور کبھی کبھی انھیں قتل بھی کر دیا جاتا ۔ بعض داعی فوجی قائد کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، خاص کر فاطمیوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے (مثلاً قرمطی قائدین ابو عبداللہ الشیعی، جس نے بربر قبائل کو اس بغاوت پر آمادہ کیا تھا جس سے مغرب میں المہدی کا اقتدار قائم ہوا) ۔ آگے چل کر بھی داعیوں کو سیاسی ساز باز میں مہارت رکھنی پڑتی تھی؛ چنانچہ بعض نے اس کی کوشش بھی کی کہ مقامی دربار سلطنت کے سربرآوردہ لوگوں بلکہ خود امیر کو بھی اپنے فرقے میں داخل کریں ۔ بویہی دربار میں المؤیّد فی الدین الشیرازی کی آمد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی ۔ وہ محض واعظ ہی نہ تھے بلکہ فاطمی حکومت کے کارندے بھی تھے ۔ اس کے باوجود داعی عموماً آزاد علما ہوتے تھے، اور باہم بڑے زور دار مذہبی اور فلسفیانہ مجادلے اور مناظرے کرتے رہتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیلیوں کی بڑی بڑی کتابیں ان کے داعیوں ہی نے لکھی ہیں اور نسبةً زیادہ اہم کتابیں ان داعیوں کی لکھی ہوئی ہیں جو ایران کے مخاصمانہ ماحول میں تحریک کے لیے جد و جہد کر رہے تھے ۔ اسمٰعیلی "حدود" میں مذہبی مراتب اور کائناتی نظام کے "واحد حقیقی" کی طرف سے ظہور کے اصول کا تقابل کرتے وقت، داعی کو بعض اوقات، "زمان" یا خیال کے ساتھ منسلک کیا جاتا تھا ۔ ایسے مقاصد کے لیے "حجة" کا داعی اور

امام کے مابین ایک علیحدہ مرتبہ قرار دیا گیا۔ جس طرح کہ باب [رک بآں] نے کیا۔ کلاسیکی فاطمی اسمٰعیلیوں میں جو مختلف فرقے پیدا ہوے، ان سب میں داعی کا مفہوم مختلف رہا ہے۔ شروع شروع کے دروزیوں میں داعی ایک ہی قسم کے فرائض انجام دیتے تھے، اور ان کا درجہ "حدود عظمٰی" کی پانچویں حد "تالی" (بہاء الدین) سے براہ راست تعلق رکھتا تھا۔ کائناتی نظام کے لحاظ سے وہ "جدّ" (کوشش) کا جسمانی مظہر تھا۔ آگے چل کر ان کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ایران کے عہد سلجوقیہ میں "نزاری" (حشیشین) اسمٰعیلی نظام کے وارث ہوے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام داعی اصفہان کے تحت تھا۔ داعی اس فرقے کے بڑے سردار کا معمولی لقب ہو گیا، جس کا صدر مقام حسن صبّاح کے زمانے سے الموت ہوا۔ یہاں تک کہ ۵۵۹ھ/۱۱۶۴ء میں اس وقت کے داعی نے اپنے اصلی امام ہونے کا اعلان کر دیا (حسن صبّاح کو بھی ایک خاص مفہوم میں "حجّۃ" تسلیم کیا جاتا تھا)۔ یمن کا طیبی "دعوٰی" سرکاری فاطمی نظام سے علیحدہ ہو کر ایک الگ نظام کی صورت میں قائم ہوا اور داعی مطلق کے تحت جو اپنے آپ کو ان اصلی اماموں، کا نمائندہ کہتا تھا، جو اب نظروں سے غائب ہیں، ایک علیحدہ فرقہ وجود میں آیا۔ یہ داعی بوری برادری پر مکمّل اختیار رکھتا تھا اور طیّبیوں میں اس کے شخصی طور پر متعین کرنے کے سلسلے میں بارہا اختلاف پیدا ہوے۔ بیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں دو بڑے داعی پیدا ہو گئے جو آپس میں رقابت رکھتے تھے۔ ایک تو مقررہ رسم کی بنا پر یمن میں مقیم ہے (سلیمانی) اور دوسرا بمبئی میں رہتا ہے (داؤدی).

مآخذ کے لیے دیکھیے اسمٰعیلی.

(M.G.S. HODGSON)

* **داعی** : احمد بن ابراہیم، آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر اور نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل کا ترکی شاعر۔ اس کی زندگی کے متعلق جو تھوڑی بہت معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں، وہ منتشر صورت میں اس کی تصانیف اور بعض تذکروں میں ملتی ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے وہ قاضی تھا۔ شاعر کی حیثیت سے اس کی شہرت کا آغاز کوتاھیہ کے دربار جرمیان میں شہزادۂ سلیمان اور یعقوب دوم کی سرپرستی میں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے اس نے اناطولیہ اور بلقان کی خوب سیاحت کی۔ جنگ انقرہ (۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء) کے بعد بدنظمی کے چند برسوں میں جب بایزید اوّل کے بیٹوں میں باہم جنگ و جدل کا بازار گرم رہا، داعی ان میں سے امیر سلیمان کی ملازمت سے وابستہ ہوا، جو اس وقت ادرنہ میں تھا۔ اس کے دربار میں متعدد نامور فضلاے زمانہ مثلاً احمدی، اس کا بھائی حمزوی اور سلیمان چلبی جمع تھے۔ داعی محمد اوّل کے زمانے (۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء تا ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) میں دربار سے وابستہ رہا اور اس کے فرزند مراد دوم کا اتالیق مقرر ہو گیا۔ مآخذ اس کی تاریخ وفات کے سلسلے میں متفق نہیں۔ حاجی خلیفہ نے اس کی وفات کی تاریخ ۸۲۰ھ/۱۴۲۷ء بتاتی ہے لیکن ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ مراد دوم (۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء تا ۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء) کے عہد کے ابتدائی برسوں میں زندہ تھا (I. H. Uzunçarşılı : *Kütahya şehri*، استانبول ۱۹۳۲ء، ۲۱۳)۔ سیہی Sehi (تذکرہ، ص ۵۶) نے اس کی تعریف میں ایک مختصر مگر مدحیہ عبارت لکھی ہے۔ عثمانی عہد نیز دور جدید کے علما نے تھوڑا ہی عرصہ پہلے تک داعی کو ایک معمولی درجے کا شاعر سمجھا تھا، اس لیے کہ اس کی بہت کم تصانیف ان تک پہنچی تھیں لیکن بعد میں اس کی متعدد تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ خصوصاً اس کے دیوان کا ایک نامکمل نسخہ اور ایک گرانقدر مثنوی جنگ نامہ (Ahmed Ateş : *Türk Dili ve Edebiyatı Dergisi*، ۳ : ۴، ۱۲۷ - ۱۷۴) ان سے پتا چلتا ہے کہ داعی اپنے زمانے کا ایک نامور شاعر ہوا

ہے اور بلاشبہہ شاعرانہ وجدان، انفرادیت، فنی مہارت اور بیان کی روانی میں اپنے بہت سے ہم‌عصروں سے بڑھا ہوا ہے .

متفرق مذہبی رسائل (Ahmad-I : I. H. Ertayla ، DAÏ ، استانبول ۱۹۵۲ء) کے علاوہ داعی مندرجۂ ذیل کتب کا مصنف ہے: (۱) دیوان، اس کا صرف ایک نسخہ معلوم ہوا ہے، جو Burdur Wakf Library، میں موجود ہے (عدد ۷۳۵) ۔ یہ دیوان نامکمل ہے اور حروف تہجّی کے مطابق مرتب نہیں ہوا ۔ اس میں چھے قصیدوں کے علاوہ جن میں سے دو محمد اول کی تعریف میں ہیں، ۱۹۹ غزلیں شامل ہیں؛ (۲) چنگ نامہ، جس کو غلط طور پر بعض مآخذ (Ottoman Poetry : Gibb ، ۱ : ۲۵۶) میں جنگ نامہ کہا گیا ہے اور بعض مآخذ (علی: کنہ الاخبار؛ بروسلی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفری، بذیل مادّہ) نے اسے شیخ اوغلو کے فرح نامہ (خورشید نامہ) کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے ۔ اس مثنوی میں ۱۳۰۰ سے زائد ابیات ہیں ۔ اسے مصنف نے ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں امیر سلیمان کے نام معنون کیا تھا ۔ اس تمثیلی مثنوی میں روح انسانی کو عود (ایک ساز موسیقی) سے تشبیہ دی گئی ہے، جس کے آسمانی نغمے اس بات کی علامت ہیں کہ اس کی اصل عالم قدس سے ہے اور وہ صوفیانہ طریقت سے اپنی اصل (واجب الوجود) کے ساتھ جا کر مل جانا چاہتی ہے ۔ شاعر ایک خوش و خرم مجمع کے اندر، جو موسم بہار میں پھولوں سے بھرے ہوے تختۂ گل میں داد عیش دے رہا ہے، عود سے پوچھتا ہے کہ وہ اس قدر افسردہ کیوں ہے ۔ اس کے باوجود اتنے میٹھے اور خوشی سے بھرے ہوے سُر کیسے نکالتا ہے؟ اس کے جواب میں عود کے چاروں اجزا اسے اپنی اپنی روئداد یوں سناتے ہیں، ریشم ان کیڑوں سے حاصل ہوا، جو شہتوت کے درختوں کے پتے کھانے سے پہلے حضرت ایوب کے جسم کا گوشت کھا کھا کر پلے: اس کے ڈھانچے کی لکڑیاں اس سے پہلے ایک خوب صورت سرو کا حصہ تھیں؛ لکڑیوں پر جو جھلّی بندھی ہے، وہ ایک نرم دل غزال کی کھال ہے، جسے شکاریوں نے بے دردی سے مارا اور اس کی کلید سے بندھے ہوے بال ایک شاندار گھوڑے کی دُم کے ہیں، جسے تاتاریوں نے قتل کیا ۔ یہ مثنوی، جو حسن بیان اور مرقع نگاری کا اعلٰی نمونہ ہے اور جس کے رنگین اور مؤثر اسلوب میں انتہا درجے کی روانی ہے، اپنے عہد ہی کی نہیں بلکہ کلاسیکی عہد کی بھی بہترین بیانیہ نظموں کی ہم پلّہ ہے؛ (۳) ترسّل، فن مراسلہ نگاری میں ایک رسالہ ہے، جس کا شمار کلاسیکی تصانیف میں ہوتا ہے اور وہ ایک مقبول عام روزمرہ کے استعمال کی کتاب بن گئی ہے سیہی: تذکرہ، ص ۵۶)؛ (۴) مطائبات، ایک چھوٹی سی کتاب ہے، جس میں بارہ ہلکی پھلکی نظمیں ہیں؛ (۵) وصیت نوشیروان عادل، ایک مختصر اخلاقی مثنوی ہے جو غالباً فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے؛ (۶) عقود الجواہر، فارسی کے ہم قافیہ الفاظ کا ایک مختصر مجموعہ ہے جسے اس نے اپنے شاگرد شہزادے کے لیے، جو آگے چل کر مراد ثانی ہوا، مرتب کیا؛ (۷) دیوان فارسی، خود نوشت نسخہ، جو ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء میں لکھا گیا ۔ برسہ کے کتاب خانۂ اورخان میں موجود ہے (عدد ۶۶) ۔ یہ خیرالدین حاجی خلیل بے کے نام معنون ہے؛ (۸) تفسیر، ابواللیث السمرقندی کی تفسیر القرآن کا ترجمہ، جس کے ساتھ ایک منظوم مقدمہ ہے ۔ دونوں کی زبان سیدھی سادی اور انداز بے تکلف ہے ۔ یہ عمر بے بن تیمور تاش کے نام معنون ہے (Universite Library T.Y. ، عدد ۸۲۴۲)؛ (۹) عطار کے تذکرۃ الاولیاء کا ترجمہ بھی، جو مسلم صوفیۂ کرام کی سیرتوں اور اقوال کی ایک مشہور کتاب ہے، داعی کی طرف منسوب کیا گیا ہے .

مآخذ: (۱) سہی، لطیفی اور قینالی زادہ حسن چلبی کے تذکرے اور عالی کی کنہ الاخبار کا باب السیر، بذیل مادّہ؛ (۲) Gesch. d. Osm. : Hammer-Purgstall Dichtkunst ، ۱ : ۷۲ ؛ (۳) Ottoman Poetry : Gibb ،

۱ : ۲۵۶ ببعد ؛ (۴) I. H. Ertaylan : *'Ahmad-i Dā'i*، استانبول ۱۹۵۵ء، ایک ضخیم مجموعہ، جس میں ہو بہو نقل کیے ہوئے ترکی دیوان اور جنگ نامہ کے نسخے نیز دیگر تصانیف کے اقتباسات یکجا کر دے ہیں؛ (۵) A. Bombaci : *Storia della letteratura turca*، میلان ۱۹۵۶ء، ص ۲۹۷ تا ۲۹۹۔

(FAHIR Iz.)

* **داغ** : نواب میرزا خاں (اصل نام ابراہیم، دیکھیے آئینۂ داغ) کا تخلص، جن کا شمار عصر جدید کے ممتاز ترین اردو شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ نواب شمس الدین خاں والی فیروزپور جھرکا اور وزیر بیگم (عرف چھوٹی بیگم) کے بیٹے تھے۔ نواب میرزا چاندنی چوک، دہلی، میں بتاریخ ۱۲ ذوالحجہ ۱۲۴۶ھ/۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو پیدا ہوئے (قب زائچہ، در جلوۂ داغ، ص ۹)۔ جب ان کے والد نے مسٹر ولیم فریزر، ریزیڈنٹ دہلی، کے قتل میں شرکت کے الزام میں پھانسی پائی (۱۸۳۵ء) تو نواب میرزا خاں کی پرورش کی ذمے داری ان کی خالہ عمدہ خانم نے سنبھالی، جو نواب یوسف علی خاں کے حرم میں تھیں۔ ۱۸۴۰ء میں وہ اپنی خالہ کے ہمراہ رام پور چلے گئے، جہاں انھوں نے مولوی غیاث الدین، مؤلف غیاث اللغات، سے فارسی پڑھی۔ ۱۸۴۴ء میں ان کی والدہ سے ابو ظفر بہادر شاہ کے بیٹے اور ولی عہد میرزا محمد سلطان فخرالملک (میرزا فخرو) نے عقد کر لیا۔ نواب میرزا، جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی، قلعۂ دہلی میں چلے آئے اور وہیں انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے مروجہ فارسی کتابیں پڑھیں اور سید محمد میر پنجہ کش (م - ۱۸۵۷ء) اور مرزا عباداللہ بیگ سے خوشنویسی سیکھی (غلام محمد : تذکرۂ خوش نویسان، کلکتہ ۱۹۱۰ء، ص ۷۱ ببعد)۔ علاوہ ازیں انھوں نے شہسواری اور مختلف ہتیاروں کے استعمال میں بھی مہارت حاصل کی، لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ قلعے میں سکونت کے باعث وہ اپنے زمانے کے مشہور شعرا سے متعارف ہو گئے، جو قلعۂ معلٰی کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس ماحول میں ان کے فطری میلان شاعری نے جلا پائی اور وہ اوائل عمر ہی میں اردو میں غزلیں کہنے لگے۔ جب شیخ محمد ابراہیم ذوق نے انھیں اپنی شاگردی میں لے لیا تو ان کی شعری صلاحیت پوری طرح چمک اٹھی۔ ذوق سے تلمذ کا سلسلہ ۱۸۴۴ سے ۱۸۵۴ء تک جاری رہا اور اس دوران میں داغ قلعے اور شہر کے مشاعروں میں حصہ لیتے رہے۔ فخرالملک کی وفات (۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء) کے بعد وہ قلعے کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے کوئی دس ماہ بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا، جس کے بعد داغ اپنے اہل و عیال سمیت ایک بار پھر رام پور پہنچ گئے، جہاں نواب یوسف علی خاں نے انھیں بطور مہمان رکھا۔ نواب یوسف علی خاں (م - ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء) کی جگہ کلب علی خاں والی رام پور ہوئے [تو مؤخرالذکر نے بھی ان سے برادرانہ سلوک کیا اور ان کی اپنی درخواست پر ۱۸۶۶ء میں بعد مصاحبت ستر روپے ماہوار پر داروغۂ اصطبل و فراش خانہ کے عہدے پر مامور کر دیا]۔ اس سال کے آخر میں انھیں نواب صاحب کی رفاقت میں کلکتے جانے اور چند برس بعد (۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲-۱۸۷۳ء) ان کے ملازمین میں شریک ہو کر فریضۂ حج ادا کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اس زمانے میں رام پور میں کئی ممتاز شعرا، مثلاً امیر، جلال وغیرہ، جمع تھے (دیکھیے نگار، ص ۶۴) اور داغ کو ان کی صحبت میں چمکنے کا خوب موقع ملا۔ [داغ کے قیام رام پور کا ایک اہم واقعہ منی بائی حجاب سے ان کی محبت کا ہے، جس کا ذکر انھوں نے اپنی مثنوی فریاد داغ (۱۸۸۰ء) میں کیا ہے]۔ نواب کلب علی خاں کی وفات (۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء) پر محفل شعر و سخن درہم برہم ہو گئی اور ارباب علم و فن رام پور سے رخصت ہونے لگے۔ داغ بھی اپنی ملازمت سے مستعفی ہو گئے (جولائی ۱۸۸۷ء) اور چند

ماہ بعد (دسمبر ۱۸۸۷ء) تقریباً بائیس برس تک ریاست کی ملازمت کرنے کے بعد رام پور سے دہلی چلے آئے۔ یہاں سے وہ حیدرآباد دکن پہنچے (اپریل ۱۸۸۸ء)۔ چند برس بعد (۲۲ جمادی الآخرۃ ۱۳۰۸ھ / ۶ فروری ۱۸۹۱ء) وہ نظام (محبوب علی خان) کے استاد مقرر ہوے (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء) اور حیدرآباد آنے کی تاریخ سے لے کر ۴۵۰ روپے ماہانہ (سکہ ریاستی) تنخواہ مقرر ہو گئی، جو ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں بڑھا کر ایک ہزار روپیہ کر دی گئی اور مزید انعام و اکرام بھی عطا ہوے۔

۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں نظام کی طرف سے انھیں بلبل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک نواب میرزا خاں داغ، کے خطابات ملے (معلوم ہوتا ہے کہ وہ دستخط میں اپنا نام صرف "فصیح الملک داغ دہلوی" لکھا کرتے تھے، دیکھیے نوری، مقابل ص ۱۲)۔

داغ کے اکلوتے بیٹے کا انتقال رام پور ہی میں ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک لڑکی لاڈلی بیگم کو اپنی بیٹی بنا لیا، جن کی شادی پہلے لوہارو کے ممتاز الدین خاں سے اور ان کی وفات پر سراج الدین خاں سائل سے ہوئی۔ [بیگم سائل نے ۱۹۶۳ء میں بمقام لاہور وفات پائی]۔

[۱۸۹۷ء میں داغ کی بیگم کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی صحت روز بروز بگڑتی گئی]۔ ۹ ذوالحجہ ۱۳۲۲ھ/۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو انھوں نے بعارضۂ فالج وفات پائی اور عید کے دن حیدرآباد میں مدفون ہوے۔ "نواب میرزا داغ" [اور "فصیح الملک داغ"] سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ داغ لمبے قد کے آدمی تھے، چہرے پر کسی قدر چیچک کے داغ تھے، رنگ سانولا تھا اور ڈاڑھی رکھتے تھے۔ آپ ایک باوقار اور شگفتہ شخصیت کے مالک تھے۔ مزاح کا احساس لطیف رکھتے تھے، عادات و اطوار نوابانہ تھے اور موسیقی سے انتہائی شغف تھا۔

تصانیف: داغ نے چار یا پانچ دیوان مرتب کیے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا دیوان، جو ۱۸۵۷ء تک ان کے قیام دہلی کے دور کی غزلیات پر مشتمل تھا، ضائع ہو گیا، لیکن بعد ازاں داغ نے حافظے کی مدد سے اسے جزوی طور پر دوبارہ لکھا (نوری، ص ۸۹)۔ بعض دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ یہ دیوان مسودے کی صورت میں ان کے پاس تھا اور اس کے حواشی پر ذوق کی اصلاحات درج تھیں۔ دوسرے دیوان یہ ہیں: گلزار داغ، رامپور ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸-۱۸۷۹ء؛ آفتاب داغ، لکھنؤ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء؛ مہتاب داغ، حیدر آباد دکن ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء؛ یادگار داغ، جو ۱۳۱۰ھ سے لے کر ان کے سال وفات ۱۳۲۲ھ تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مؤخر الذکر دیوان کھو گیا تھا اور شائع نہیں ہوا (وقائع دہلی، ۲: ۴۵۱ ببعد)۔ داغ کے شاگرد احسن مارہروی نے جو کچھ دستیاب ہو سکا جمع کرکے ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء میں یادگار داغ شائع کیا (کاظمی، ص ۲۰۸) اور اس کا ایک ضمیمہ لالہ سری رام (مؤلف خمخانۂ جاوید) نے لاہور میں چھپوا کر دہلی سے شائع کیا۔ مندرجۂ بالا پانچ دواوین میں ۱۴۸۰۰ اشعار ہیں، جو بیشتر غزل کی صورت میں ہیں، تاہم ان میں قصائد و رباعیات وغیرہ بھی شامل ہیں (کاظمی، ص ۲۱۰)۔ داغ نے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں ایک مثنوی معروف بہ فریاد داغ بھی شائع کی تھی۔ انھوں نے ایک دیوان محاورات (ایک ہزار سے زیادہ اشعار) بھی مرتب کیا تھا، جسے ان کے اعزہ نے آصف جاہ ششم کی نذر کر دیا۔

نثر داغ: (۱) انشائے داغ، ان کے مکتوبات، طبع احسن مارہروی، دہلی ۱۹۴۱ء؛ (۲) فرمان داغ، ان کے ذاتی خطوط، طبع رفیق بن احسن مارہروی، لکھنؤ ۱۹۵۶ء۔ اس سلسلے میں (۳) بزم داغ، لکھنؤ ۱۹۵۶ء، کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک روزنامچہ ہے، جسے احسن مارہروی اور افتخار عالم

مارہروی نے، جو ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء سے لے کر تقریبًا چار برس تک داغ کے ساتھ مقیم رہے، مرتب کیا ہے۔ ان تصانیف کے مستند ہونے کے بارے میں شبہات کا اظہار بھی کیا جاتا رہا ہے (دیکھیے تمکین کاظمی: داغ، ص ۱۶۲ ببعد)۔

کلام داغ کے کئی انتخابات بھی منظر عام پر آ چکے ہیں، مثلاً منتخب داغ، الٰہ آباد ۱۹۳۹ء؛ بہار داغ، لاہور ۱۹۳۰ء؛ کمال داغ، مطبوعۂ آگرہ اور دیوان داغ یا انتخاب داغ، مطبوعۂ لکھنؤ۔

داغ کا فن: داغ اپنی زبان کی پاکیزگی اور دلفریبی، کلام کی روانی اور بےساختگی اور اسلوب کی سادگی و نفاست کے لیے مشہور ہیں اور یہ سب صفات غزل کے لیے بالخصوص موزوں ہیں۔ واردات حسن و عشق اور دیگر تجربات زندگی کا وہ جس فنکارانہ اور حقیقت پسندانہ انداز سے اظہار کرتے تھے اس کا اثر سامعین پر براہ راست اور بڑا گہرا ہوتا تھا۔ زبان پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ محاورات اور امثال کا وہ اکثر نہایت برمحل استعمال کرتے تھے۔ انہیں استادی کا درجہ حاصل تھا (قب ولی محمد خان: محاورات داغ، دہلی ۱۹۳۳ء، جس میں مؤلف نے ۳۳۶۳ محاورات جمع کر کے انہیں باعتبار حروف تہجی ترتیب دیا ہے اور ان کی مجمل تشریح اور اشعار داغ سے ان کی سند پیش کی ہے۔ اس سے قبل فصیح اللغات میں انہیں خطوط پر احسن مارہروی کی کوشش نامکمل رہی اور صرف چند ایک محاورات ہی مجلۂ فصیح الملک کے بعض شماروں میں شائع ہو پائے)۔ داغ نے اردو شاعری بالخصوص غزل پر بڑا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ غزل کو انہوں نے ایک بار پھر بنیادی طور پر اظہار جذبات کا ذریعہ بنا دیا اور اس میں ایسی آسان اور سادہ زبان اختیار کی جو عربی و فارسی کے ان غیر مانوس اور سماعت پر گراں گزرنے والے الفاظ سے پاک تھی جنہیں ناسخ و آتش کے دبستان سخن نے فروغ دیا تھا (قب نگار، ص ۱۹) حقیقت یہ ہے کہ ان کے نزدیک اردو ایک ایسی زبان تھی جو فارسیت سے پاک ہو (اچھی اردو شاعری کے بارے میں داغ کے تصور کے لیے دیکھیے نوری، ص ۶۵، ۱۲۰؛ قب جلوۂ داغ، ص ۱۳۲)۔ ان کی ادبی زندگی کے تین ادوار میں سے قدیم ترین دور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ ان کے کلام کی بعض ممتاز خصوصیات اس دور کے کلام ہی میں جھلکنے لگی تھیں، یعنی پر وقار، واضح، سادہ، شگفتہ اور پر زور انداز بیان اور بیباکی خیال۔ دور ثانی یا دور رامپور میں یہ خصوصیات اور زیادہ ترقی پذیر ہوئیں اور یہی ان کا بہترین دور ہے۔ ان کا طرز بیان ایسا شیریں اور دلکش ہے کہ اس کی مثال اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ وہ اپنے خیالات و جذبات کو جس انوکھے، ڈرامائی اور بےباکانہ انداز سے جامۂ الفاظ پہناتے تھے اس کی نظیر دوسرے شعرا کے ہاں شاذ و نادر ہی ملتی ہے (کمال داغ، ص ۵۰ ببعد)۔ کلام داغ کے یہ امتیازی محاسن گلزار داغ اور آفتاب داغ میں پوری طرح موجود ہیں۔ ان کے تیسرے اور آخری دور کا تعلق ان کے قیام حیدر آباد دکن سے ہے، جسے ان کا دور انحطاط کہنا چاہیے، اگرچہ زبان ویسی ہی صحیح، ویسی ہی غیرمبہم اور ویسی ہی ہموار ہے اور عبارت آرائی بھی استادانہ ہے، لیکن اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ آخری ایام میں انہیں اپنے اشعار میں محاورات استعمال کرنے کا ضرورت سے زیادہ شوق ہو گیا تھا۔ اس دور کی خصوصیات یادگار داغ میں نمایاں ہیں۔ عشقیہ شاعری میں داغ کا نصب العین (کسی حد تک) عامیانہ اور مبتذل تھا، جس کی بعض لوگوں نے سخت مذمت کی ہے (قب چکبست: مضامین چکبست، الٰہ آباد ۱۹۳۶ء، ص ۶۹ ببعد)، لیکن دراصل ان کی شاعری زیادہ تر ان کے زمانے کے فرسودہ معاشرے کے عام رجحانات کی آئینہ دار ہے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں ان کے بے شمار

شاگرد پھیلے ہوئے تھے (جلوۂ داغ، ص ۱۲۵ ؛ نگار، ص ۲۵، ۱۳۱)، جس سے ان کے اسلوب کی انتہائی مقبولیت کا پتا چلتا ہے (لیکن دیکھیے مرآۃ الشعراء، ۲ : ۳۶).

مآخذ : (۱) میرزا قادر بخش صابر دہلوی، گلستان سخن (تصنیف ۱۲۷۰ - ۱۲۷۱ھ)، دہلی ۱۲۷۱ھ، ص ۲۲۰؛ (۲) عبدالغفور خان نسّاخ : سخن شعراء (مرتبۂ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء تا ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء)، نولکشور پریس ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء، ص ۱۵۷ ؛ (۳) امیر احمد مینائی : انتخاب یادگار (مرتبۂ ۱۲۸۹-۱۲۹۰ھ/۱۸۷۲ - ۱۸۷۳ء)، چاپ سنگ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء، ۲ : ۱۲۸ ؛ (۴) سید نورالحسن : طور کلیم (مرتبۂ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء)، آگرہ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء، ۱ : ۳۱ ؛ (۵) سید علی حسن : بزم سخن (مرتبۂ ۱۲۹۷ھ)، آگرہ ۱۲۹۸ھ، ص ۴۶ ؛ (۶) علی نجف رامپوری : غنچۂ ارم (مرتبۂ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ - ۱۸۸۲ء)، کلکتہ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳-۱۸۸۴ء، ص ۸۸ ؛ (۷) صفیر بلگرامی : تذکرۂ جلوۂ خضر، آرہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء، ۱ : ۲۶۶ ؛ (۸) علی احسن مارہروی : جلوۂ داغ (مؤلفۂ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء)، حیدرآباد ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء ؛ (۸) نثار علی شہرت دہلوی : آئینۂ داغ، لاہور ۱۹۰۵ء ؛ (۹) عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری : محبوب الزمن (تذکرۂ شعرائے دکن، مرتبۂ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)، حیدرآباد دکن ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء، ۱ : ۴۱۷ ؛ (۱۰) سری رام دہلوی : خمخانۂ جاوید (مرتبۂ ۱۹۱۵ء - ۱۹۱۶ء)، دہلی ۱۹۱۷ء، ۲ : ۱۰۳ تا ۱۳۶ ؛ (۱۱) راس مسعود : انتخاب زرین (مرتبۂ ۱۹۱۲ء)، مطبوعۂ بدایوں، ص ۱۷۵ ؛ (۱۲) طالب الٰہ آبادی، در اردو (سہ ماہی)، اورنگ آباد، اپریل - جولائی ۱۹۳۱ء ؛ (۱۳) جمیل احمد : اردو شاعری، نولکشور پریس ۱۹۳۱ء، ص ۱۶۱ تا ۱۶۵ ؛ (۱۴) عبدالحی : گل رعنا (مرتبۂ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ - ۱۹۲۲ء)، اعظم گڑھ ۱۳۴۷ھ، ص ۴۱۷ ؛ (۱۵) عبدالسلام ندوی : شعر الہند، مطبوعۂ اعظم گڑھ، ۱ : ۳۰۱ تا ۳۲۳ ؛ (۱۶) رام بابو سکسینہ : *A History of Urdu Literature*، الٰہ آباد ۱۹۴۰ء (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری : تاریخ ادب اردو، مطبوعۂ نولکشور، ص ۲۲۴ تا ۴۴)؛ (۱۷) جلال الدین احمد جعفری : تاریخ مثنویات اردو، مطبوعۂ الٰہ آباد، ص ۲۱۸ تا ۲۲۰ ؛ (۱۸) حامد حسن قادری : کمال داغ، آگرہ ۱۹۳۵ء ؛ (۱۹) عبدالشکور شیدا حیدرآبادی : بیاض سخن (مرتبۂ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء)، حیدرآباد ۱۹۳۶ء، ص ۱۶۲ ؛ (۲۰) نور اللہ محمد نوری : داغ، حیدرآباد ۱۳۵۵ھ ؛ (۲۱) سیماب اکبر آبادی : حیات داغ ؛ (۲۲) عبدالقادر سروری : اردو مثنوی کا ارتقا، (مرتبۂ ۱۳۵۸ھ/۱۹۴۰ء)، حیدرآباد، ص ۱۲۳ ؛ (۲۳) شیخ عبدالقادر : *Famous Urdu Poets and Writers*، لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۸۸ تا ۱۰۶ ؛ (۲۴) بشیر الدین احمد دہلوی : واقعات دارالحکومت دہلی، ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء، ۲ : ۴۴۳ تا ۴۵۹ ؛ (۲۵) محمد یحیٰی تنہا : مرآۃ الشعراء، لاہور ۱۹۵۰ء، ۲ : ۳۳ تا ۳۵ ؛ (۲۶) ماہنامۂ نگار، "داغ نمبر"، مرتبۂ نیاز فتح پوری، لکھنؤ ۱۹۵۳ء ؛ (۲۷) رفیق مارہروی : بزم داغ، لکھنؤ ۱۹۵۶ء ؛ (۲۸) آفتاب احمد صدیقی : گلہائے داغ، ڈھاکہ ۱۹۵۸ء ؛ (۲۹) مولانا عرشی رامپوری : کچھ داغ کے متعلق (۱۹۵۸ء، مخطوطہ) ؛ (۳۰) وحید قریشی : داغ (۱۹۵۸ء، مخطوطہ) ؛ (۳۱) تمکین کاظمی : داغ، لاہور ۱۹۶۰ء ؛ (۳۲) سید ظہیر نیازی : بہار داغ، لاہور ۱۹۴۶ء ؛ (۳۳) نزہت ناھید : داغ، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے (اردو)، مخطوطہ، در کتاب خانۂ جامعۂ پنجاب، لاہور).

(محمد شفیع)

داغستان : "پہاڑوں کی سرزمین"، یہ نام ایک غیرمعمولی لغوی نوعیت کا حامل ہے، کیونکہ یہ ترکی لفظ داغ [=طاغ] بمعنی پہاڑ اور ایک ایسے لاحقے کا مجموعہ ہے جو فارسی زبان میں ملکوں کے ناموں کو متمیز کرتا ہے۔ بظاہر یہ نام دسویں/سولھویں صدی میں پہلی مرتبہ وجود میں آیا تھا۔ اب اس کا نام خود مختار سوویٹ سوشلسٹ جمہوریۂ داغستان (R.S.F.S.R.) ہے، جس کا رقبہ انیس ہزار پانچ سو مربع میل ہے۔ ۱۹۵۶ء میں اس کی آبادی نو لاکھ

اٹھاون ہزار تھی [جو ١٩٦٦ء میں سوا تیرہ لاکھ ہو گئی] ۔ یہ جمہوریت دو بالکل علحدہ حصوں سے مل کر بنی ہے : (١) قفقاز کا پہاڑی سلسلہ اور (٢) بحیرۂ خزر کے اس طرف کے وسیع میدان جو شمال میں دریاے ترک Terek اور دریاے کما Kuma سے محدود ہیں اور جنوب میں ایک طرف دریاے سمّر اور دوسری طرف دریاے گرا Kura کے ایک معاون دریا (اَلزَن Alazan) سے ۔

روسی فتح سے پہلے داغستان کا پہاڑی حصہ اور بحر خزر کے قریب کا میدانی علاقہ کبھی بھی زیادہ عرصے کے لیے کسی ایک قوم یا حکمران خاندان کے زیر اقتدار متحد نہیں ہوے تھے ۔ خود ساحلی میدان درۂ دربند سے دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے، جو صرف دو کیلومیٹر چوڑا ہے ۔ اس کا جنوبی حصہ زیادہ تر ایشیاے کوچک کی تہذیب یافتہ ریاستوں کے قبضے میں رہا، بحالیکہ شمالی حصہ جنوبی روس کی خانہ بدوش قوموں کے قبضے میں تھا ۔ تاریخی زمانے کے آغاز سے اس پہاڑی خطے کی آبادی کی نسلی خصوصیات پر نہ تو جنوب کے لوگوں نے کوئی اہم اثر ڈالا ہے، نہ شمال کے باشندوں نے ۔ روسی اقتدار کے قائم ہونے سے پہلے کوئی فاتح اس علاقے کے باشندوں کو مستقل طور پر زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوا تھا ۔ وقتاً فوقتاً یہ لوگ ساحلی میدان کے مختلف حصوں پر قابض ہوتے رہے، لیکن ہر مرتبہ ان فاتحین نے جلد ہی اپنے ان ہم قوموں سے جو پہاڑوں میں رہ گئے تھے، ہر قسم کا سیاسی تعلق منقطع کر لیا ۔

ساحلی میدان کا جنوبی حصہ دربند تک قدیم زمانے میں البانیا کے پاس تھا ۔ اس خطے کے شمال میں غالباً پہاڑوں کے درمیان بعض چھوٹے چھوٹے قبیلے رہتے تھے، جنھیں Strabo (باب ٣ - د) نے Δηγαι یا Ιηγαι لکھا ہے ۔ اہل روم اور بعد ازاں اہل ایران کو، جو چوتھی صدی عیسوی میں ان کے جانشین ہوے، خانہ بدوش قبائل کے خلاف درۂ دربند کی محافظت کرنی پڑی ۔ عرب فاتحین نے ان علاقوں کو جس حالت میں پایا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ساسانی سلطنت کی ثقافت اور شاید مزدکی مذہب نے بھی آس پاس کے پہاڑی باشندوں پر کچھ اثر ڈالا تھا ۔ ان ممالک کے بعض امرا ایرانی القاب سے ملقب تھے، مثلاً طبرسران شاہ، جو دربند کے مغرب میں ایک ضلع کا حاکم تھا ۔ طبرسران میں مشہور زرہ ساز موسوم بہ زِرِہ گران (فارسی لفظ زرِہ، بمعنی چار آئینہ، سے) بھی رہتے تھے، جن کی رسوم تجہیز و تکفین کو عبد الحمید الاندلسی (تحفۃ الالباب، طبع A. Ferrand، در JA، عدد ٢٠٧ (١٩٢٥ء)، ص ٨٢ - ٨٣؛ نیز متن، در Barthold : Zapiski Vostoč Otdel. Arkheol Obshčestva، ٣ : ١٠٢) اور بعض دوسرے لوگوں نے بیان کیا ہے ۔ ان رسوم کی ابتدا بظاہر ایران کے مذہبی اثرات کا نتیجہ تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت البانیا میں چوتھی اور پانچویں صدی میں پھیلنی شروع ہوئی اور وہاں سے داغستان کے میدانوں میں اور پہاڑی قبائل تک پہنچی ۔

داغستان کے شمال میں عرب افواج کی کامیابی کے باوجود، بالخصوص جب خلیفۂ ہشام (١٠٥ھ/٧٢٤ء تا ١٢٥ھ/٧٤٣ء) کے عہد میں مَسْلَمَہ بن عبدالملک نے پہلی مرتبہ دربند میں ایک حد تک عرب اقتدار قائم کیا ۔ اس شہر نے ساسانیوں کے دور کی طرح عربوں کے زمانے میں بھی ایک سرحدی قلعے کے طور پر اپنی اہمیت بہرصورت قائم رکھی ۔ دوسرے مقامات کی طرح وہاں بھی عربوں کی فتح کے بعد ہمسایہ قبائل کے ساتھ تعلقات میں مزید گہرائی پیدا ہو گئی ۔ بایں ہمہ باہمی روابط کے اس احیا سے جن لوگوں نے سب سے پہلے فائدہ اٹھایا وہ عیسائی اور یہودی تھے؛ مسلمانوں کی باری بعد میں آئی ۔ قبیلۂ خزر کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ارمن بطریق ساہک Sahak سوم (٦٧٧ تا ٧٠٣ء) کے زمانے میں

عیسائیت قبول کی ۔ ہارون الرشید (۱۷۰ھ/۷۸۶ء تا ۱۹۳ھ/۸۰۹ء) کے عہد میں یہودی اس قبیلے کے حاکم اور رؤسا کو اپنے مذہب کا پیرو بنانے میں کامیاب ہو گئے ۔

قومیت یا نسل کے اعتبار سے داغستان کی تقسیم اور اس ملک میں تینوں مذاہب کی اشاعت کے بارے میں چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے جغرافیہ‌نویس ہمیں صحیح معلومات مہیا کرتے ہیں ۔ اس وقت عرب دربند کے علاوہ آس پاس کے قلعوں پر بھی قابض تھے، جو بقول المسعودی (۲ : ۴۰) شہر سے صرف ایک فرسخ یا تین میل کے فاصلے پر واقع تھے ۔ ایک مسلمان، جو دربند کے امیر عبدالملک کا خواہر زادہ تھا، طبرسران پر حکمران تھا ۔ ابن رستہ (طبع ڈخویہ، ص ۱۴۷ ببعد) بیان کرتا ہے کہ ہمسایہ سلطنت خَیزان کا فرمانروا بیک وقت تینوں مذاہب کا پابند تھا : وہ جمعے کے دن مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا، ہفتے کے دن یہودیوں کی عبادت میں شرکت کرتا اور اتوار کے دن عبادت میں عیسائیوں کا ساتھ دیتا تھا ۔ المسعودی (مروج، ۲ : ۳۹) نے اس امیر کو مسلمان بتایا ہے ۔ اس کے متعلق یہاں تک کہا جاتا تھا کہ اس نے ایک شجرۂ نسب بنوایا تھا، جس سے اس کا تعلق عرب نسل سے ظاہر ہوتا تھا، تاہم وہ اپنے ملک میں تنہا ایسا شخص تھا جو مشرّف بہ اسلام ہوا ، البتہ شمال کی طرف اور آگے ایک مسلم بَرزبان (کذا، مرزبان؟) قبیلۂ گرج کے امیر کی حیثیت سے حکمران تھا . . . .

بظاہر عربوں نے جنوبی داغستان کے لوگوں کو لکز (Lezgians) کے نام سے موسوم کیا ہے، جن کی جغرافیائی سکونت کہیں بھی انہوں نے یقین سے ظاہر نہیں کی ۔ بقول البلاذری (طبع ڈخویہ D. Goeje، ص ۲۰۸) قبیلۂ لکز کا علاقہ اس میدان میں واقع تھا جو سمّورہ سے لے کر موجودہ داغستان کے جنوب میں شابران تک پھیلا ہوا تھا ۔ اس کے برعکس بقول المسعودی (مروج، ۲ : ۵) قبیلۂ لکز کے افراد اس خطے کے بلند ترین پہاڑوں میں رہتے تھے ۔ ان میں وہ "کافر" بھی شامل تھے جو شروان کے امیر کے ماتحت نہیں تھے ۔ ابتدا میں روسیوں نے لکزوں کا نام شمالی علاقوں یا تاولی (از ترکی تاو، بمعنی پہاڑ) کے کوہستانیوں کے مقابلے میں صرف جنوبی داغستان کے قبائل کے لیے استعمال کیا ۔

آئندہ صدیوں میں اسلام کی ترقی کی رفتار داغستان میں بظاہر دھیمی رہی ۔ ۳۵۴ھ/۹۶۵ء میں روسیوں نے الخزر کے اقتدار کو درہم برہم کر دیا ۔ پھر خود اس ریاست کے جنوبی حصے کو جنگ کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑا[1] ۔ بظاہر عیسائی الان Alans ایسے لوگ تھے جنہوں نے اس ہیجان سے فائدہ اٹھایا کیونکہ ان کی قلمرو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے مقابلے میں مغول فتح کے وقت مشرق کی طرف بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ بقول ابن الأثیر (۱۲ : ۲۵۲) ان ممالک میں مغول کی پہلی تاخت کے دوران ان کا مقابلہ دربند کے شمال میں سب سے پہلے قبیلۂ لکز کے افراد سے ہوا، جن میں اس وقت "مسلمان" اور غیر مسلم دونوں شامل تھے، پھر شمال ہی میں اور آگے بعض دوسرے نیم مسلم قبائل سے ہوا جو آوَر (Avars) قبائل کے آبا و اجداد تھے اور آخر میں وہ الان قبائل سے دو چار ہوئے ۔ William of Rubruk کے بیان کے مطابق، جس نے نومبر ۱۲۵۴ء میں ان ممالک کی سیاحت کی تھی، یہاں کے پہاڑوں میں عیسائی الان آباد تھے اور "پہاڑوں اور سمندروں کے درمیان" عرب لکزی (Saracen Lezgians) یعنی مسلمان رہتے تھے، تاہم خود Rubruk نے دربند کے شمال میں صرف ایک دن کی مسافت پر واقع ایک قلعے کو الان کا قا- (Castellum Alanarum) کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ اس وقت تک مغول ان قبائل کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے ۔

ابھی یہ ضروری تھا کہ ان دڑوں کی حفاظت فوج کے مخصوص دستوں کے سپرد کی جائے جن سے پہاڑوں میں سے میدان میں اترنے کا راستہ جاتا تھا تاکہ وسیع سبزہ زاروں میں چرنے والے مویشیوں کے ریوڑ کوہستانیوں کی تاخت سے محفوظ رہیں (قب Fr. M. Schmidt: *Rubruk's Reise*، برلن ١٨٨٥ء، ص ٨٤ ببعد).

تیرھویں اور چودھویں صدی میں دڑۂ دربند تک پھیلے ہوئے خطے کے علاوہ اس شہر کے جنوب میں واقع علاقوں کا ایک حصہ بھی آلتون اردو کی سلطنت کا ایک جزو تھا۔ تیمور کی مہمات (٧٩٧ھ/١٣٩٥ء، ٧٩٨ھ/١٣٩٦ء) کی تاریخ میں داغستان کے دو بڑے قبیلوں، یعنی قبیلۂ قیتاق (یا تیناغ) اور قبیلۂ قازی قوموق (اب لکز) کے نام پہلی مرتبہ اپنی موجود شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ قیتاق کا علاقہ، جو دڑۂ دربند سے ملا ہوا تھا، تختمش کی سلطنت میں شامل تھا۔ شرف الدین یزدی (ظفر نامہ، مطبوعۂ ہند، ١ : ٧٤٢ ببعد) تیتاق کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ لوگ لا مذہب یا بد کیش (اوہام پرست) ہیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بقول باربرو Barbaro (Ramusio: *Viaggi*، ٢ : ١٠٩ الف) پندرھویں صدی عیسوی تک بھی قیتاق میں بہت سے یونانی ارمن یا رومن کیتھولک عیسائی تھے۔ اس کے برعکس قیتاق کا امیر خلیل بیگ، جس کا ذکر Afanasid Nikitin نے اپنی سیاحت (١٤٦٦ء) کی سرگزشت میں کیا ہے، ایک اسلامی نام سے موسوم تھا.

قازی قوموق قبیلے کے لوگ مسلمان تھے اور انہیں ان کے گرد و پیش کے بیدین لوگوں کے خلاف اسلام کا علمبردار تصور کیا جاتا تھا۔ ان کا امیر شوکل کہلاتا تھا۔ قازی قوموق کے علاقے کے شمال میں اشکوجہ (موجودہ دڑغین) رہتے تھے، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ تیمور کی مہمات کے بیان میں شہر ترقی کا ذکر بھی آیا ہے۔ قازی قوموق اور قیتاق کے درمیان، یعنی موجودہ علاقہ کوبچی (Kabeci) میں زرہ گران آباد تھے، جنھوں نے آہنگروں کے طور پر اپنی قدیم شہرت برقرار رکھی تھی اور اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے زرہ بکتر فاتح کی نذر کیے تھے.

تیموری فتح اور عثمانی تسلط (از ٨٦٥ھ/١٤٦١ء تا ١٠١٥ھ/١٦٠٦ء) کے زمانے میں داغستان میں اسلام کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے داغستان کی بے دین آبادیاں مشرف بہ اسلام ہو گئیں۔ اسی دور میں دڑغنہ (اشکوجہ) کے لوگوں اور قیتاق کے قبیلے کے علاوہ بتدریج نمزو آور نے اسلام قبول کر لیا: لیکن پندرھویں صدی کے پورے عرصے میں ان کے درمیان عیسائیت کا وجود بھی باقی رہا، بحالیکہ انڈی (Andis) اور ددو Didos قبیلے لامذہب ہی رہے۔ بیشتر زریہ گران (Kubacis) پندرھویں صدی میں مسلمان ہوئے تھے، لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اٹھارھویں صدی کے اختتام تک عیسائیت ہی کے پیرو رہے۔ تیموری دور کے بعد لکزوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ قبول اسلام اس زمانے میں داغستان کے تاریخی ارتقا کا واحد پہلو نہیں تھا بلکہ اس میں ہمیں جاگیرداری پر مبنی ریاستوں کی تشکیل کو بھی شامل کرنا چاہیے، جس نے داغستان کو ایک ایسا سیاسی نظام مہیا کر دیا جو انیسویں صدی عیسوی تک قائم رہا.

جاگیردارانہ ریاستیں، جو اس وقت ظہور میں آئیں یا جن کی نشو و نما اس زمانے میں ہوئی، دعوٰی کرتی رہی ہیں کہ ان کی ابتدا عربوں کی فتح سے ہوئی، لیکن ایسے دعاوی آج کل شدت سے معرض بحث میں ہیں.

تیمور کی مہمات کے بیان سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ عثمانی ترکوں نے اپنے مختصر تسلط کے دوران داغستان کو جس حالت میں پایا اس کا آغاز

نویں دسویں صدی ہجری/پندرھویں سولھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے ۔ مسلمان قبائل سب کے سب یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ انہیں ابومسلم نے مشرف بہ اسلام کیا تھا اور ان کے امیروں کا یہ دعوٰی ہے کہ وہ ان والیوں کی اولاد ہیں جن کا تقرر اس نے داغستان میں کیا تھا ۔ "معصوم" کا لقب ، جو طبرسران کے امیر نے اختیار کیا ، عربی کا معروف لفظ معصم ہے اور اس طرح قیتاق اوسمی ("نامور" از اسم = نام) اور قازی قُومُوق کے شامخال کے لیے عربی اشتقاقات وضع کر لیے گئے ۔ شامخال کے لفظ کے بارے میں دعوٰی کیا گیا کہ یہ شام (ملک شام) سے ماخوذ ہے ۔ اس لفظ کے لیے ایک اور اصل بھی دریافت کرلی گئی ، یعنی شاہ بعل ۔ یہ چیز غیر ممکن نہیں ہے کہ اس قسم کے اشتقاقات نے بھی زیر بحث القاب کے تلفظ پر کچھ اثر ڈالا ہو ۔ بظاہر یہ امر محض اتفاق کا نتیجہ نہیں کہ قازی قُومُوق کے امیر کا لقب قدیم ترین روسی دستاویزوں میں بھی اس شکل (شیوقل یا شَوقَل) میں پایا جاتا ہے جو شرف الدین یزدی (ظفر نامہ) میں موجود ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایرانیوں اور روسیوں نے ایک دوسرے کی تقلید کے بغیر شامخال کو بگاڑ کر شَوقَل نہیں بنایا ہوگا ۔ اس سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس لقب کی موجودہ شکل مذکورۂ بالا اشتقاق کے اثر سے وجود میں آئی ۔ شامخال کی رعایا، یعنی قازی قوموق، یہ دعوٰی کرتے تھے کہ ابومسلم کے زمانے میں وہ حامیان دین کے طور پر ممتاز تھے اور انہوں نے عربوں سے "غازی" یا فاتحین کا لقب حاصل کر لیا تھا ۔

تین بڑی جاگیری ریاستیں ، یعنی قازی قُومُوق کی شامخالت، قیتاق کی اوسمیت، اور طبرسران کی معصومت ، نویں ۔ دسویں صدی ہجری / پندرھویں ۔ سولھویں صدی عیسوی میں داغستان پر حاوی تھیں ۔

پہلا تاریخی قیتاق امیر، جس نے اوسمی کا لقب اختیار کیا، بظاہر احمد خان تھا ۔ اس کی وفات ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۷ - ۱۸۸۸ء میں ہوئی ۔ اس کی بابت مشہور ہے کہ اس نے مجالیس نامی گاؤں کی تأسیس کی جہاں عوام کے نمائندے اپنے معاملات کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے ۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے رائج العام قانون کے قواعد و ضوابط کو ایک دستور کی شکل میں یکجا کرنے کا حکم دیا جس کی پابندی کرنا ججوں یا قاضیوں کے لیے لازمی تھا ۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جسے آثار داغستان کے مصنف میرزا حسن آفندی نے ایک ("جسارت عظیمہ") تصور کیا ہے ۔

گیارھویں صدی کے وسط کے قریب (۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰) قیتاق قبیلے کے کچھ لوگ اپنے ہم قوموں سے علٰحدہ ہو گئے اور جنوبی علاقوں کی طرف چلے گئے ۔ ان تارکین وطن کا سربراہ حسین خان سالیان اور کوبہ میں ایک نئی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ ترکی سیاح اولیا چلبی (سیاحت نامہ، ۲ : ۲۹۱ ببعد) نے ان تارکین وطن سے ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں شکی (موجودہ نُخَہ) اور شماخی کے درمیان ملاقات کی تھی ۔ اولیا چلبی کی مرتبہ فرہنگ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج کل کی طرح قَیتاق اس وقت لگزی (Lezgian) بلکہ مغول زبان بولتے تھے ۔

قبیلۂ قازی قُومُوق (موجودہ قبیلۂ لَگز) کے شامخال امیروں نے رفتہ رفتہ اپنی حکومت شمال مشرق کے پہاڑوں سے آگے ترکی علاقے (قمیق) کے اندر ساحل تک پھیلا دی ۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں یہ امیر معمولاً جاڑے کا موسم ساحلی میدان کے ایک گاؤں بیوناق (Būnāk) میں اور موسم گرما ایک پہاڑی مقام کمخ میں بسر کرتے تھے ۔ ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء میں شامخال چوبان نے بیوناق میں وفات پائی ، جس پر اس کے مقبوضات اس کے بیٹوں میں تقسیم ہو گئے ۔ قدرتی طور پر اس تقسیم سے خاندان کے اقتدار میں کمزوری پیدا ہوگئی ۔ قازی قوموں کے لوگوں نے،

جو پہاڑوں میں رہتے تھے، بتدریج اپنے آپ کو حکمران خاندان سے مکمل طور پر آزاد کرنا شروع کر دیا۔ ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹-۱۶۴۰ء میں شامخال سرخائی میرزا کی وفات کے بعد شامخال امیر اپنے مستقر بیوناق یا تارخوف (ترقی) سے صرف ساحلی خطے پر حکومت کرتے تھے۔ بعد کے شامخال حکمرانوں میں سے کوئی بھی کمخ واپس نہیں آیا، جہاں شروع کے امیروں کے مزار اب بھی نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے میں روسیوں نے استراخان پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی قفقاز کے ممالک کو، جن میں داغستان بھی شامل تھا، اپنے تصرف میں لانے کی از سر نو کوشش کی۔ روسی فوج کا ایک دستہ شہزادہ خوف وستینی (Khuvovos tini) کی سرکردگی میں تارخوف پر قبضہ کرنے اور قوی صو یا سلق ندی پر ایک قلعہ تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ روسیوں کو شامخال کے بیٹوں نے شکست دے دی اور وہ دریائے سلق کے پار ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۶۰۴ء میں Buturlin اور Pleshceev کی رہنمائی میں تارخوف کے خلاف ایک نیا حملہ پہلے سے بھی زیادہ ناکام رہا۔

عثمانی تصرف اور روسی فتح کے درمیان کے دور کا امتیازی پہلو داغستان میں عربی ثقافت کی نشو و نما ہے، جو شامل کے عہد میں اپنے نصف النہار کو پہنچ گئی۔ سترھویں صدی عیسوی کے دوران داغستانی ممتاز دانشور شیخ صالح الیمنی (ولادت ۱۶۳۷ء، وفات بمقام مکہ ۱۶۹۶ء) کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ اس کا سب سے نامور شاگرد کُدتلی کا محمد موسی تھا، جس نے داغستان میں اس کی تعلیمات کی اشاعت کی اور جو ۱۷۰۸ء میں حلب میں فوت ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں داغستانی طلبہ کی جماعتیں عربی زبان اور شریعت اسلامی سیکھنے کے لیے دمشق اور حلب گئیں۔ ثقافتی احیا کا یہ دور قانونی تنظیم کا دور بھی تھا، جس میں آور قبیلے کے اُمہ خان کا ضابطہ اور قیتاق کے اوسمی خان کے قوانین مرتب ہوئے۔

عربی زبان میں اسلامی ثقافت کے پھلنے پھولنے کے اس زمانے میں سیاسی سطح پر ایک لاقانونی انتشار بھی رونما ہو گیا، جبکہ داغستان بہت سے قبیلوں اور ایک دوسرے کی مدمقابل ریاستوں میں تقسیم ہو کر ترکی اور ایرانی اثر و رسوخ کے درمیان تذبذب کی حالت میں تھا اور باری باری کبھی ایک اور کبھی دوسرے کی طرف مائل ہوتا رہا۔ اس سیاسی انتشار نے داغستان کی کمزوری کو اور محکم کر دیا اور یہ صورت حال لامحالہ کسی بیرونی فاتح کے لیے ترغیب کا باعث بنی۔

سولھویں صدی سے لے کر تین طاقتیں، یعنی ایران، ترکی اور روس، داغستان پر تصرف کی دعویدار رہیں۔ مقامی امیر ان تینوں میں سے کبھی ایک اور کبھی دوسری سے اتحاد کر لیتے تھے۔ اس طرح کبھی انیسویں صدی میں جا کر بالآخر اس کشمکش کا اختتام روس کے حق میں ہوا۔

۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء کے بعد طبرسران کے امیر نے شامخال اور اُوسمی کی طرح سلطان ترکیہ کی اطاعت قبول کر لی۔ پھر جب ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء میں شاہ عباس نے ان علاقوں میں ایرانی اقتدار کو بحال کر دیا تو اوسمی اس سے مل گیا، بحالیکہ شامخال ترکوں کا وفادار رہا۔ ۱۰۲۱ء میں جو صلحنامہ طے ہوا اس کی ایک شرط یہ تھی کہ شامخال اور باب عالی کے دیگر وفادار امرا ایران کی جانب سے کسی انتقامی کاروائی کا شکار نہ بنائے جائیں گے۔ ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں اُوسمی رستم خان کے ترکوں سے جا ملا تو اس کے رقیب شامخال نے شاہ ایران کا التفات حاصل کر لیا، جس نے اس کے اعزازات کی توثیق کر دی۔ اسی قسم کے اعزاز و مناصب وہ اس سے قبل زار میکائل (Michael) سے حاصل کر چکا تھا (آثار داغستان، ص ۸۱)۔

جب شاہ حسین کی کمزور حکومت کے باعث صفوی سلطنت رُو بہ انحطاط ہو گئی تو داغستان خود ایرانی اقتدار

کے خلاف ایک تحریک کا مرکز بن گیا۔ اس تحریک کا سربراہ چُلاق سُور خامئی خان تھا، جس نے اسی عرصے میں ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ اُوسمی اور مدرّس حاجی داؤد سے، جو ایک عوامی تحریک کا رہنما تھا، اتحاد کرکے ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء میں شماخی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر ان اتحادیوں نے ایک سفارتی وفد قسطنطینیہ بھیجا، جس نے ان کے لیے سلطان سے خلعت اور خطابات و اسناد کے علاوہ باب عالی کی رعایا میں شمار کیے جانے کی مخصوص عنایت حاصل کر لی۔ اسی زمانے میں روس کی مداخلت نے واقعات کا رخ بدل دیا۔ ہوا یہ کہ روس نے ایران کے خلاف ایک مہم روانہ کی اور ۱۷۲۲ء میں دربند پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جلد ہی ان دوسرے صوبوں کو جو بحر خزر کے مغربی ساحل پر واقع تھے خود روس کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ ۱۷۲۴ء کے معاہدۂ تقسیم کی رو سے اس ساحل پر روسی حقوق کو باب عالی نے بھی تسلیم کر لیا۔

اس وقت کا روسی تصرف کچھ زیادہ دیرپا نہ رہا۔ نادر شاہ ایرانی سلطنت کی وحدت بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا اور ۱۷۳۲ء کے معاہدے کی رو سے روس نے اپنے دریائے کرہ Kura کے جنوب میں واقع تمام ممالک اور ۱۷۳۵ء کے معاہدے کے تحت دریائے کرہ اور دریائے سلق کے درمیان کا علاقہ بھی واپس کر دیا؛ پھر جب روسی اس مہم کو ناکام بنانے میں کامیاب ہوگئے جو کریمیا کے تاتاریوں نے داغستان میں بھیجی تھی تو باب عالی نے بھی اپنے دعاوی ترک کر دیے۔ ۱۷۱۸ء میں شامخال عادل گرامی نے پیٹر اعظم سے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا اور ۱۷۲۲ء کی مہم میں اس کی مدد کی تھی، تاہم بعد میں چونکہ اس نے روسیوں کے خلاف اقدام کیا اس لیے ۱۷۲۵ء میں اسے لیپ لینڈ Lapland میں جلا وطن کر دیا گیا اور شامخال کی امارت ختم کر دی گئی۔ نادر شاہ نے اس امارت کو بحال کیا اور اسے عادل گرامی کے بیٹے خاص پولاد خان کو دے دیا۔ پہاڑوں کے باشندے ادھر ادھر کے مسلسل حملوں، خصوصاً ۱۷۴۲ء اور ۱۷۴۳ء کے حملوں میں بھی آزاد رہے۔

۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد نصف صدی تک ایران میں کوئی ایسی مضبوط حکومت نہ تھی جو اس سرحدی خطے میں اقتدار قائم رکھ سکے۔ خود سلطنت کے صوبوں کو داغستان کے امیروں کی تاخت و تاراج سے نہیں بچایا جا سکتا تھا ... پھر روسی ۱۷۳۵ء کے معاہدے کے باوجود داغستان میں دوبارہ اپنا اثر قائم کرنے لگے۔ سیاح Gomelin کو اوسمی کے علاقے میں گرفتار کیا گیا اور ۱۷۷۴ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور ۱۷۷۵ء میں مادم Madem کے زیر کمان روسی فوج کا ایک دستہ آ پہنچا اور اس نے اس علاقے کو ویران کر دیا۔ ۱۷۸۴ء میں شامخال مرتضی علی دوبارہ روس سے جا ملا۔ ۱۷۸۵ء میں والی قفقاز کا عہدہ قائم ہو جانے سے ان ممالک پر روسی اقتدار مستحکم ہوگیا۔ ایک مذہبی تحریک، جو ترک کے ایما سے وجود میں آئی تھی اور جس کی رہنمائی شیخ منصور کر رہا تھا، داغستان پر محض سطحی اثر ڈال سکی۔ بیشتر امیروں نے اس کی تائید کرنے سے انکار کر دیا۔

جب قاچار خاندان کے حکمران نے ایران کے صوبوں کو ازسرنو ایک سلطنت کے اندر متحد کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تو انھوں نے دوبارہ قفقاز کے علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس مرتبہ روس اپنے دعاوی سے بغیر مقابلے کے دست بردار ہونے پر تیار نہ تھا، جیسا کہ اس نے نادر شاہ کے مقابلے میں کیا تھا۔ جنگ کا آغاز کیتھرین دوم کے عہد حکومت کے آخری سال یعنی ۱۷۹۶ء میں ہوا۔ دربند پر روسی قابض ہو گئے، لیکن اس کے بعد جلد ہی شہنشاہ پال Paul کے حکم سے اسے خالی کر دیا گیا۔ ۱۸۰۶ء میں روسیوں نے اس شہر پر

دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس طرح داغستان میں ایرانی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

روسیوں کے خلاف امیروں اور بالخصوص ان کی رعیت کی مزاحمت اس کے بعد بھی جاری رہی۔ ۱۸۱۸ء میں شامخال کے ماسوا داغستان کے تقریباً سب امیروں نے روسیوں کے خلاف اتحاد کر لیا اور اس بغاوت کو گورنر Yermolov بمشکل فرو کر سکا۔ قبیلۂ قیتاق کے اوسمی کا لقب ۱۸۱۹ء میں اور طبرسران کے معصوم کا لقب ۱۸۲۸ء میں منسوخ کر دیا گیا۔ ۱۸۳۰ء کے بعد جن امیروں کو باقی رہنے دیا گیا انھوں نے اپنے ساتھ روسی مشیروں کی موجودگی منظور کر لی۔ عوام، جنھیں ان کے مذہبی رہنماؤں نے کفار کے خلاف جہاد کے لیے ابھارا تھا، مزاحمت میں اپنے حکمرانوں کی نسبت زیادہ ثابت قدم رہے۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام سے نقشبندیہ جماعت کے لوگوں نے داغستان میں نفوذ حاصل کر لیا تھا اور وہاں انھوں نے کامیابی سے اپنی تعلیمات کی اشاعت کی۔ ۱۸۳۰ء کے قریب اس جماعت کے رہنماؤں نے آور قبیلے کے لوگوں میں ایک عام تحریک پیدا کر دی تھی، جس کا مقصد بیک وقت حکمران خاندان کی مخالفت، کفار کی مداخلت کا سدباب اور رسم و رواج کے مقابلے میں شریعت کی بحالی کی موافقت کرنا تھا۔ تحریک کا بڑا رہنما غازی محمد [رک بآں] تھا، جسے روسی کازی مُلّا کہتے تھے اور جس کی تعریف و توصیف اس کے شاگرد علوم عربیہ کے ایک بڑے ماہر کے طور پر کرتے تھے۔

۱۷ تا ۲۹ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو روسی فوج کے ایک دستے نے غازی محمد کو گمری کے گاؤں میں گھیر کر ہلاک کر دیا۔ اس کا جانشین حمزہ بیگ [رک بآں] بھی ۱۸۳۴ء میں خُونزاق کے قریب فوت ہو گیا۔ تحریک کا تیسرا رہنما شامل [رک بآں] زیادہ خوش قسمت رہا۔ اپنے پیشرو حضرات سے علمیت میں کمتر ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی انتظامی اور قائدانہ صفات کی بنا پر ان پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس نے بیس سال تک پہاڑوں میں روسیوں کے خلاف جد و جہد جاری رکھی۔ ۱۸۴۳ اور ۱۸۴۴ء میں اس نے اپنی بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں، جن کے نتیجے میں روسیوں کا تسلط صرف ساحل اور جنوبی علاقوں میں باقی رہ گیا۔ پہاڑوں کے اندر بہت سے روسی قلعے کوہستانیوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ ۱۸۴۹ء کے بعد شامل کا اقتدار دوبارہ پہاڑی خطے کے مغربی حصے تک محدود ہو گیا، لیکن اس نے مزید دس سال تک اپنی جد و جہد جاری رکھی۔

شامل کی معزولی کے بعد، جس نے ۲۵ اگست (۹ ستمبر) ۱۸۵۹ء کو شہزادہ بریاتنسکی Baryatinsky کی اطاعت قبول کر لی۔ روسیوں نے کچھ عرصے کے لیے اور امرا کا اقتدار بحال کر دیا، کیونکہ اس وقت انھیں یہی مناسب نظر آیا کہ امیروں اور اونچے طبقے کے لوگوں کا اقتدار مستحکم کر دیا جائے تاکہ ان کی مدد سے مذہبی رہنماؤں کے اثر و رسوخ کو محو کیا جا سکے؛ لیکن روسی حکام نے جلد ہی اس حکمت عملی کو ترک کر دیا، قبیلۂ آور کے شاہی خاندان کو ۱۸۶۲ء میں بے دخل کر دیا گیا اور اس کے بعد جلد ہی دوسرے امیروں کو بھی یکے بعد دیگرے اپنی برائے نام حکمرانی سے دست بردار ہونا پڑا، جو ابھی تک انھیں میسر تھی۔ پھر داغستان میں وہ نظام قائم کر دیا گیا جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب تک وہاں موجود تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جنگ روس و ترکیہ کے دوران میں یہاں کے لوگوں نے دوبارہ لڑائی شروع کر دی۔ ۸ (۲۰) ستمبر کو اس نئی تحریک والے کمخ کے قلعے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ قیتاق اور طبرسران میں پرانے حکمران خاندانوں کے اختلاف نے اوسمی اور معصوم کے لقب دوبارہ اختیار کر لیے، لیکن اس اثنا میں جنگ کا رخ روسیوں کے موافق ہو گیا اور انھوں نے جلد ہی اس

ھنگامے کو فرو کر دیا۔

داغستان میں شدید خانہ جنگی کے بعد (۱۹۱۷ تا ۱۹۲۰ء)۔ ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں سوویٹ حکومت قائم ہوئی ۔ ۱۳ نومبر کو خود مختار سوویٹ اشتراکی جمہوریۂ داغستان کا اعلان کر دیا گیا، جس کا صدر مقام مخچ قلا قرار پایا۔

اس جمہوریہ کی آبادی اب مسلم اکثریت اور غیرمسلم نوآبادکاروں کی اقلیت پر مشتمل ہے، جس میں روسی، یوکرینی، یہودی، قدیم باشندے (داغ چُفُت) اور بعض نووارد (Ashkenazim) شامل ہیں۔

مسلم آبادی میں تین بڑے لسانی گروہ شامل ہیں:

۱۔ آئبیری قفقازی (Ibero-Caucasians)، یہ تین چھوٹے گروھوں میں منقسم ہیں، جو ایک دوسرے سے مختلف زبانیں بولتے ہیں:

اَوار، آندی، دِدو Avaro-Ando-Dido (قب اَوار، آندی، ددو اور ارچی)۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی آبادی پہاڑی داغستان کے شمالی حصے میں دو لاکھ اڑسٹھ ہزار تھی۔ اس میں اَوار (یا خُونزاق) لوگ، آٹھ چھوٹے آندی قبیلے (اندی خاص، اَخوخ، بگولَل، بوتلخ، گوڈوبری (Godoberis)، چملَل (Čamalals)، کَرَتہ (Karatas)، اوار تندی (Tindis)، جو اندی کے دریا قویصو (Kuysu) کی بلند وادی میں آباد ہیں، پانچ چھوٹے ددو Dido قبیلے (ددو خاص یا Khwarshis ، Ginukhs ، Tzezes ، Bezeta اور Khunzals) اور ارچی قبیلے کے لوگ شامل ہیں۔

اَوار نے، جن کی زبان کو ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہے، بعض دوسری قوموں کو اپنے گروہ میں شامل کر لیا ہے جن کی زبانیں احاطۂ تحریر میں نہیں آئی تھیں اور ان کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک واحد اَوار "قوم" کی شکل اختیار کر لی ہے۔

(ب) دارغین، لاق (Darghino-Lak) گروہ (قب دارغین، لاق، قیتاق، کُباچی)، جس کی تعداد ۱۹۵۹ء میں کوھستانی داغستان کے مغربی وسطی حصے میں دو لاکھ بائیس ہزار تھی، اور جس میں دارغن (سابق زمانے میں اَشکُوجہ)، لاق (سابقہ قاضی قُومُوخ) اور دو چھوٹے قبیلے قیتاق اور کُباچی (سابقہ زریہ گران) شامل ہیں۔ دارغین اور لاق قبیلے کی زبانوں کو ادبی حیثیت حاصل ہے۔ قیتاق اور کُباچی قبیلے کو ایسی زبانیں میسّر نہیں، آخر وہ دارغین قوم میں ضم ہوگئے۔

(ج) سَموری (Samurinn) گروہ، جنوبی داغستان (قب لزگ، رُتُل، طَبَرسَران، اور شاہ داغ قبائل) تعداد دو لاکھ اناسی ہزار (۱۹۵۹ء میں)۔ اس گروہ میں دو قومیں شامل ہیں جن کی زبان ادبی ہے، یعنی لزگی (دو لاکھ تیئیس ہزار) اور طَبَرسَران (پینتیس ہزار)؛ نیز تین چھوٹے قبیلے بھی جو لگز قوم میں ضم ہوتے جا رہے ہیں۔ اَگُل (Agul، آٹھ ہزار)، رُتُل (Rutul، سات ہزار)، اور زَخر (Tzakhur، چھے ہزار)۔ اس گروہ سے شاہ داغ کے پانچ قبیلے بھی منسلک ہیں (تعداد تقریباً پندرہ ہزار)، جن کا مسکن شمالی آذربیجان ہے (Budukh ، Djek ، Kriz ، Khaputz اور Khinalug)۔ ان پر ترکی کا بہت اثر پڑا ہے اور یہ آذری قوم میں ضم ہوتے جا رہے ہیں۔

۲۔ داغستان میں ترکوں کی نمائندگی آذری قبیلے کے لوگ کرتے ہیں، جو دربند کے ارد گرد کے میدان اور دریاے سَمُور کی نشیبی وادی میں آباد ہیں، نیز قومیق [رک بآں] قبیلے کے لوگ، جن کی تعداد ۱۹۵۹ء میں ایک لاکھ پینتیس ہزار تھی بحر خزر کے اس طرف کے میدانوں میں جو دربند کے شمال سے لے کر دریاے ترک Terek تک پھیلے ہوے ہیں۔ نیز نوگای Nogay [رک بآں] قبیلے کے لوگ (تعداد اکتالیس ہزار، ۱۹۵۹ء میں)، جو دریاے ترک اور دریاے کوما Kuma کے درمیان آباد ہیں۔ آذری قبیلے کی طرح قُومیق اور اور نوگای قبیلے کے لوگوں کی بھی ادبی زبانیں ہیں۔

۳۔ ایرانی زبان بولنے والوں کی نمائندگی تات [رک بآں] قبیلے کے لوگ کرتے ہیں جن کی تعداد در

کے گرد و نواح میں کئی ہزار تھی، نیز میدانی گانووں میں رہنے والے پہاڑی یہودی یا داغ چُفُت (تقریبًا بارہ ہزار)، جو مذہبًا یہودی ہیں لیکن تاتی زبان بولتے ہیں۔

داغستان ایک ایسی جمہوریہ ہے جس میں بہت سی قوموں کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ سوویٹ وفاقیہ میں یہی ایک ایسی جمہوریہ ہے جو کسی ایک قوم، ایک غالب قومیت (narodnost) پر مبنی نہیں ہے۔ دستور کی شرائط (دفعہ ۷۸) کے مطابق اس جمہوریہ میں سرکاری طور پر منظور شدہ دس زبانیں ہیں: یعنی، آوارہ، دارغین، لاق، لزگی، طَبَرسَران، قُومیق، نوگای، آذری، تاتی (جسے یہودی اس کی یہودی شکل میں استعمال کرتے ہیں) اور روسی۔ یہ زبانیں ابتدائی مدارس میں ذریعۂ تعلیم ہیں۔ قدیم باشندوں کی زبانوں میں صرف آوارہ، دارغین، لاق اور قُومیق میں اخبار نکلتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی چار قومیں آگے چل کر مرکز کشش بن جائیں گی اور یہ کہ بالآخر وہ دوسرے گروہوں کو جذب کر لیں گی۔

مآخذ: قفقاز پر عام تصانیف کے علاوہ روسی زبان میں داغستان سے متعلق بہت سی کتابیں موجود ہیں، ماٰخذ کی ایک فہرست (کتابوں اور مقالات کے ۱۳۳ (نام) H. Carrère d' Encausse اور A. Bennigsen: *Une République soviétique musulmane : le Daghistan, aperçu démographique'* در *REI*، ۱۹۵۵ء، ص ۷ تا ۵۸ میں ملے گی۔ اس سے ایک زیادہ مکمل شکل روسی تصنیف *Narodi Dagestana'* ماسکو Acad. Sc. ۱۹۵۵ء کے ساتھ ملحق ہے (۱۲۷ نام، جن میں سے اناسی انقلاب سے پہلے کی تصانیف کے اور اٹھاون ۱۹۱۸ء کے بعد کی تصانیف کے ہیں)۔ ترکی ماخذ کے لیے دیکھیے *IA* بذیل مادّہ (از مرزا بالا)۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ان لوگوں سے متعلق مقالوں کے ماخذ، جن کا متن میں ذکر ہے۔

(A. BENNIGSEN و W. BARTHOLD)

* **دام**: رک بہ سکہ۔

* **داماد**: فارسی لفظ، بمعنی بیٹی کا شوہر؛ جسے عثمانی سلاطین کی شہزادیوں کے شوہر بطور لقب استعمال کرتے تھے۔ ابتدائی سلاطین کے عہد میں حکمران خاندان کی شہزادیوں کی شادی وقتًا فوقتًا ایشیاے کوچک کے باجگزار سلطانوں (مثلاً قرمان اوغلو) کے ساتھ اور بعض صورتوں میں سلطان کے وزیروں اور سپہ سالاروں کے ساتھ ہوتی تھی۔ بُرسہ کے ایک بزرگ امیر سلطان کا معاملہ، جس نے بایزید اوّل کی ایک بیٹی سے شادی کی، نہ صرف اس زمانے کے لحاظ سے بلکہ بعد کے زمانوں کو دیکھتے ہوئے بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ آگے چل کر وزیر اعظم، قپودان پاشا، ینی چری کے آغا بستانجی باشی اور دوسرے اعلٰی عہدے دار بھی سلاطین کے داماد بنے۔ ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں: ابراہیم پاشا، سلیمان اوّل کا منظور نظر، رستم پاشا (مہر ماہ کا شوہر) صُقُلّو محمد پاشا (اسماء خان کا شوہر)، ابراہیم پاشا (محمد ثانی کا داماد) وغیرہ (دیکھیے، Hammer : *GOR*، اشاریہ، بذیل مادّہ "سلطانین")۔ ان میں سے بعض کو ان کے ہمعصروں اور مؤرخوں نے "داماد" کا لقب دیا ہے۔ یہ سلسلہ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے تک جاری رہا (مثلاً داماد محمود پاشا، داماد فرید پاشا [رَکّ بآں] وغیرہ)۔

شادی کی تقریبات بڑے تزک و احتشام سے منائی جاتی تھیں؛ ان کا ذکر عثمانی وقایع میں، نیز مغربی سیاحوں کے سیاحت ناموں میں بڑی تفصیل سے آیا ہے (دیکھیے Hammer : *GOR*، اشاریہ، بذیل مادّہ *Hochzeit und Vermählung*)۔ سلیمان اوّل نے جہیز کی رقم ایک لاکھ طلائی سکے (دکات)، اور خاصہ (شہزادیوں کا نان نفقہ) ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار نقرئی سکّے (اسپر) یومیہ مقرر کیا تھا (۱۶۰۸ء کا وینسی *Relazione*، در Barozzi-Berchet، ص ۷۲؛ Hammer، ۸ : ۱۱ ۳)۔ مزید برآں شہزادیوں کو ایک وسیع محل بھی جہیز

میں دیا جاتا تھا۔ سلیمان اوّل کے عہد تک دامادوں کو عموماً صوبوں کا والی بنا کر بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہ باب عالی کے معاملات میں ذاتی طور پر کوئی دخل نہ دے سکیں (Kočibey، طبع ۱۳۰۳ھ، ص ۹۴، ۹۷)۔ پابندی یہ تھی کہ داماد کی اگر پہلی بیویاں ہوں تو انہیں طلاق دے دے اور پھر کوئی اور شادی نہ کرے (دیکھیے مذکورۂ بالا وینسی *Relazione*، ص ۱۰۳ ببعد اور Hammer، ۴ : ۱۰۳)۔ داماد کی حیثیت بیوی کے غلام کی سی ہوتی اور ان کے تعلقات کی یہ نوعیت ان کے باہمی انداز تخاطب سے ظاہر ہوتی تھی (دیکھیے مذکورۂ بالا بیانات، ص ۷۲، ۱۰۳؛ de la mottraye : *Voyages*، ص ۳۳۸ ببعد؛ Hammer : *Staatsverfassung*، ۱ : ۴۷۶ تا ۴۸۴=*GOR*، ۸ : ۲۱۱ تا ۲۱۳؛ C. White : *Three Years in Constantinople*، ۳ : ۱۸۰ ببعد)۔ یہ روایت کہ ایسی شادیوں سے جو بچے پیدا ہوتے تھے انہیں پیدائش کے وقت مار دیا جاتا تھا (Eton : *Survey of the Turkish Empire*، طبع سوم، ص ۱۰۶؛ Hammer : *GOR*، ۴ : ۴۶۳) درست نہیں، قب جودت، ۶ : ۱۹۶ ببعد، *Relazioni*، موضع مذکور، ص ۱۸۱، ۳۷۲)؛ البتہ یہ بات درست ہے کہ قدیم زمانے میں انہیں تمام سرکاری عہدوں سے محروم رکھا جاتا تھا (*Relazioni*، ص ۱۸۱)۔

مآخذ : ان کے علاوہ جو مقالے میں مذکور ہیں : (۱) اسمٰعیل حقی اُوزُون چارشیلی : عثمانلی دولتنن سرای تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۴۵ء؛ (۲) A. D. Alderson : *The Structure of the Ottoman Dynasty*، آوکسفرڈ ۱۹۵۶ء، ص ۹۷ تا ۹۸۔ مغول حکمرانوں کے دامادوں کا لقب "کُرگن" (Küregen) تھا، اس کے لیے دیکھیے (۳) Djuwayni-Boyle، ص ۱۰۴، حاشیہ ۱۱؛ (۴) Cleaves و Mostaert : *Trois Documents Mongols*، در *HJAS*، ۱۹۵۲ء، ص ۴۷۴؛ اور (۵) مقالہ "گور خان"۔

(J. H. MORDTMANN)

* **الداماد** : داماد، ایک فخریہ لقب، جو میر محمد باقر بن شمس الدین الحسینی استرآبادی کو دیا گیا۔ بعض لوگ اسے امام فن مانتے ہیں اور المعلّم الثالث کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ معلّم ثانی الفارابی [رک بآں] کا لقب تھا۔ بہرحال اس نے مختلف علوم کو مدون و منظم کیا۔ داماد کا لقب اصل میں اس کے والد شمس الدین کو دیا گیا تھا، جو مشہور و معروف شیعہ عالم علی بن الحسین بن عبدالعلی کرکی :، جو "محقّق ثانی" کے لقب سے مشہور تھا، داماد تھا (براکلمان: تکملہ، ۲ : ۵۷۴)۔ اس کے بعد اس کے فرزند کا بھی یہی لقب مشہور ہو گیا، جسے دامادی یا ابن الدّاماد کہتے ہیں، اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

میر داماد استرآباد میں پیدا ہوا۔ بچپن کا زمانہ طوس میں گزارا۔ اس کے بعد، غالباً ابتدائی تعلیم کے لیے اصفہان گیا، پھر وہاں سے مشہد پہنچا اور تمام عقلی و نقلی علوم حاصل کیے۔ اس کے مشہور اساتذہ میں سے اس کے ماموں شیخ عبدالعلی بن علی (مجتہد) اور شیخ عزالدین حسین بن عبدالصمد عاملی، پدر شیخ بہائی، جو بعد میں میر داماد کا گہرا دوست بن گیا اور فخرالدین سماکی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد میر داماد نے فقہ، کلام، حکمت اور علوم طبیعی و غریبہ میں تبحر حاصل کیا اور اپنے ہمعصر علما پر سبقت لے گیا۔

میر داماد کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ اس نے فلسفے کو دین کے ساتھ تطبیق دی ہے، اگرچہ کلام، فقہ اور تفسیر میں بھی اس نے بڑی وقیع تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اس نے علوم عقلیہ خصوصاً فلسفے کی تحصیل کو دوبارہ رونق بخشی۔ ابن سینا کے فلسفے کو اشراقی رنگ دے کر اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ مرتبط کرکے (شیعی نقطۂ نظر کے تحت) اسے نئی زندگی عطا کی۔ فلسفے، کلام اور فقہ میں اس کی کتابوں سے علوم قدیمہ کے طلبہ ہمیشہ استفادہ کرتے رہے ہیں، گو

ایران میں مُلّا صدرا کی کتابوں کے آگے وہ ماند پڑ گئی ہیں اور مُلّا صدرا کی تصانیف طلبہ کے لیے درسی کتابیں ہوگئی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مدارس میں میر داماد کی الافق المبین اور السبع الشّداد (متن میں چار جگہ مصنف نے اس کتاب کا نام السیرۃ المستقیم بھی لکھا ہے) پڑھائی جاتی ہیں۔ ۹۸۴ تا ۱۰۲۵ھ/ ۱۵۷۶ تا ۱۶۱۶ء، جو تقریباً چالیس سال کی مدت ہوتی ہے، میر داماد اصفہان میں تدریس و تالیف، فلسفہ و علم الکلام کے مباحثوں اور مذہبی مناظروں میں مشغول رہا، اور عہد صفوی کے مشہور علما میں شمار ہوا۔ اسے قرآن مجید کی قراءت کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔ وہ اپنے اوقات زیادہ تر عبادت، تالیف اور تدریس میں گزارتا تھا۔

میر داماد ایک صاحب ذوق شاعر بھی تھا۔ تخلص اشراق کرتا تھا؛ اشعار کا خاصا مجموعہ اس نے اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ اس کے بعض اشعار مجمع الفصحا، ریاض العارفین اور آتش کدہ میں درج ہیں۔ ایک دیوان بھی اس کی یادگار ہے، جس میں اس کے عربی اور فارسی اشعار درج ہیں اور اس کا نام مشرق الانوار ہے۔

تاریخ عالم آرائے عباسی میں، جو ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں، میر داماد کی (۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰ء میں) وفات سے پندرہ سال پہلے لکھی گئی تھی، میر داماد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ تمام علوم و فنون، خصوصاً فلسفے، علوم ادبیہ، ریاضیات، طب، فقہ تفسیر اور حدیث میں ایک عالم متبحر ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بارہ کتابوں کے نام مذکور ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس تاریخ کے لکھے جانے سے بہت پہلے میر داماد کا نام حکیم، عالم، مصنف کی حیثیت سے مسلّم ہو چکا تھا اور علم و فن میں اس کی شہرت پھیل چکی تھی۔

شاہ عباس اول (۹۹۶ تا ۱۰۳۸ھ/ ۱۵۸۷ تا ۱۶۲۹ء) اور اس کے جانشین شاہ صفی اول کے دربار میں میر داماد کو خاص احترام، رسوخ اور مرتبہ حاصل تھا۔ اس حالت میں وہ اپنے بعض ہمعصر علما اور درباریوں کی رقابت اور حسد سے دور رہتا تھا۔ اپنے دو مشہور ہمعصر دانشمند اور حکیم میر فندرسکی اور شیخ بہائی سے میل جول، رفاقت اور دوستی رکھتا تھا، خصوصاً شیخ بہاء الدین عاملی سے اُسے خاص محبت تھی۔ ایسی دوستی دو بزرگ عالموں کے درمیان بہت کم دیکھی گئی ہے جس کا ذکر ہر خاص و عام کی زبان پر ہو۔ میر نے بہت سے شاگردوں کو اپنی تربیت سے بہرہ مند کیا، جن میں سے بہت زیادہ مشہور یہ ہیں: صدر الدین شیرازی، جو متاخرین میں سب سے بڑا حکیم گزرا ہے اور کتاب اسفار کا مصنف ہے؛ [illegible] احمد علوی، جس نے کتاب شفا اور میر داماد کی چند تصنیفات کی شرح لکھی؛ مُلّا خلیل قزوینی، شارح اصول کافی؛ قطب الدین شکوری، جو فلسفے کی ایک مفصّل تاریخ اور چند دیگر رسائل حکمت کا مؤلف ہے؛ اور مشہور و معروف شاعر زلالی، جس نے مثنوی خیالی محمود و ایاز اور نظامی اور جامی کے نمونہ پر ہفت مثنوی لکھی۔

ایک لمبی عمر بسر کرنے کے بعد جو علم، حکمت اور دین کی خدمت میں صرف ہوئی، میر داماد نے ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰ء میں وفات پائی۔ اس وقت وہ عراق کے متبرک مقامات کی زیارت کے لیے نکلا ہوا تھا۔ نجف اور کربلا کے درمیان جان بحق ہوا اور نجف میں دفن کیا گیا۔

میر کی یادگار کتابوں کی ایک اچھی خاصی تعداد باقی ہے، جن میں سے اکثر عربی میں اور کچھ فارسی میں ہیں۔ ان کی عبارت کی ساخت بہت پیچیدہ ہے، جس سے اس کا نام مشکل نویسی میں مشہور ہو گیا ہے؛ چنانچہ اس کی ایک کتاب الصراط المستقیم کے بارے میں ایک ایرانی شاعر کہتا ہے:

صراط المستقیم میر داماد
مسلمان نشنود کافر نبیناد

(ے میر داماد کی صراط المستقیم کو (خدا کرے) نہ کوئی مسلمان سنے نہ کوئی کافر دیکھے) ۔ براکلمان کی کتاب میں اس کی تالیفات کی ایک فہرست درج ہے اور ریحانۃ الادب میں اس کی اڑتالیس کتابیں ذکر کی گئی ہیں، لیکن پوری تحقیق کے باوجود اس کی تالیفات کی صحیح فہرست جو قابل وثوق ہو ہاتھ نہیں لگ سکی ۔ میر داماد کی قابل توجہ کتابوں میں سے ایک الافق المبین ہے، جس میں وجود، زمان، حدوث و قدم کی بحث ہے؛ اس کی شرحیں بار بار لکھی گئیں اور ایران اور برصغیر پاکستان و ہند میں طالبان علم کی توجہ اس کی طرف بہت مبذول رہی ہے ۔ برصغیر پاکستان و ہند کے مشہور متکلم مولوی فضل حق خیرآبادی کو اس کے پڑھانے کا خاص ملکہ حاصل تھا اور بحرالعلوم نے اس پر حواشی لکھے ہیں ۔ حکمت میں اس کی دوسری کتابوں میں سے، جو اس فن میں اس کی اہم ترین یادگار ہے، قبسات ہے ۔ اس کتاب میں زیادہ تر زمان اور حدوث عالم کے مسئلوں سے بحث کی گئی ہے اور اس کا سال تالیف ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ - ۱۶۲۵ء ہے ۔ اس کتاب کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور سید احمد علوی کی ہے ۔ اس کی ایک اور شرح محمد بن علی رضا بن آقا جانی کی ہے، جو بہت مفصل ہے اور اسلامی کتب حکمت کی سب سے زیادہ طویل کتاب سمجھی جاتی ہے ۔ میر داماد کی دیگر یادگار کتابیں حکمت اور علم کلام میں الحبل المتین، تقدیسات، شرح شفاء بوعلی سینا، شرح الاستبصار خواجہ نصیر، تقویم الایمان اور جذوات ہیں ۔ یہ آخری کتاب فارسی زبان میں ہے اور میر داماد نے اسے خاص طور پر شاہ عباس کے لیے تالیف کیا تھا ۔ اس میں بارہ جذوات کے اندر حکمت الٰہی کے دورے کی مبدہ (شروع) سے لے کر معاد (آخر) تک کی تشریح ہے ۔ خاص کر قرآن مجید کی سورتوں کے شروع مقطعات کی تشریح کی گئی ہے اور قرآن مجید اور دین کے بعض باریک مسئلوں کی طرف توجہ دی گئی ہے ۔

میر داماد نے قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر لکھی ہے جس کا نام امانت الٰہی ہے؛ ایک اور تفسیر فارسی زبان میں سدرۃ المنتہٰی نام کی بھی اس کی طرف منسوب ہے؛ ممکن ہے کہ وہ اس کے شاگرد اور داماد سید احمد علوی نے لکھی ہو ۔ اس نے کچھ کتابیں احادیث اور روایات میں بھی چھوڑی ہیں، جیسے الکافی پر حواشی، الفقیہ، الصحیفۃ اور الرواشح السماویۃ، جو احادیث امامیہ کی شرح ہے ۔ احکام فقہ میں بھی میر داماد نے اچھی خاصی تعداد میں رسالے لکھے ہیں، مثلاً شارع النجاۃ، فقہ اور اصول فقہ پر فارسی زبان میں، جس میں ایک مقدمہ، پانچ باب اور ایک خاتمہ ہے ۔ ایسے ہی اور کتابیں اور رسالے ہیں جن میں خاص خاص مسائل نکاح و مہر وغیرہ کے احکام بیان کیے گئے ہیں ۔

میر داماد خواجہ نصیرالدین طوسی اور ملا صدرا کے درمیانی زمانے کا بہت بڑا اسلامی حکیم (فلسفی) ہے اور حقیقت میں ملا صدرا کے فلسفے کے لیے زمین میر داماد ہی نے ہموار کی ہے ۔ میر داماد نے بوعلی سینا کے فلسفے پر اپنا رنگ چڑھایا اور بعض اشراق اصولوں سے اس فلسفے کی تعبیر کی ۔ بہت سے مشکل اور باریک مسائل کے سمجھنے کے لیے تاویل کے قاعدے پر عمل کیا، اور اس کے ذریعے دین اور فلسفے کے حقائق کے درمیان تطبیق دی ۔ میر کے نزدیک باقی حکمائے اشراقیہ کی طرح فلسفہ فقط نظری اور ذہنی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے جو انجام کار حکیم کو حقائق باطنی کا مشاہدہ کرا دیتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میر داماد کا استدلالی اور منطقی فکر آخرکار باطنی تجربوں، اور اشراق مشاہدوں اور ملکوتی حالات کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جن میں سے بعض کا ذکر اس کی بعض تحریرات مثلاً رسالہ الخلعیۃ میں آ گیا ہے ۔

میر داماد نے حکمت میں جو روش اختیار کی ہے

اس میں دو نکتے بہت نمایاں ہیں اور انہیں سے اس طرز فکر کی تعیین کی جا سکتی ہے ۔ ان میں سے پہلا نکتہ مضامین فلسفیہ کی ترتیب بندی ہے ۔ اکثر اسلامی کتب فلسفہ خواہ متقدمین کی ہوں یا متاخرین کی، شروع میں مسائل منطقیہ سے بحث کرتی ہیں، اس کے بعد طبیعیات کی باری آتی ہے پھر ریاضیات کی اور آخر میں الٰہیات پر کتاب ختم ہوتی ہے ۔ میر داماد نے اس مقررہ طریقے سے انحراف کیا اور اپنا الگ طریقہ نکالا اور مسائلِ فلسفیہ کے درمیان میں کوئی معین طریقہ اختیار نہیں کیا مثلاً کتاب قبسات میں، جو اس کی سب سے زیادہ مشہور حکمت و فلسفے کی کتاب ہے، دس قبس مندرجۂ ذیل ترتیب کے ساتھ ہیں :-

۱۔ حدوث کی انواع اور وجود کی قسمیں
۲۔ سبق ذاتی کی تین نوع
۳۔ "بعدیہ انفکاکیہ" دو نوع کی ہے
۴۔ کتاب الٰہی سے شواہد
۵۔ "طبائع مرسلہ" کس طرح وجود میں آئیں
۶۔ زمانے کا حرکت کے ساتھ اتصال
۷۔ "احتجاجات اقتضائیہ" کی تنقید
۸۔ اللہ سبحانہ کی قدرت کی تحقیق
۹۔ "جواہر عقلیہ" کے ثبوت کی دلائل
۱۰۔ قضا و قدر کے اسرار کے بارے میں قول فیصل

اس نمونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مباحث کی ترتیب حکمت کی مشہور کتابوں مثلاً ابن سینا کی الشفاء اور ملا صدرا کی اسفار سے بالکل جداگانہ ہے اور یہی نکتہ ہے جس کی وجہ سے میر داماد کی تصانیف حکمت کی درسی کتابوں میں شامل نہ کی گئیں ۔

دوسرا نکتہ جس سے میر داماد کی فلسفیانہ روش متعین ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ مسئلۂ زمان ، پیدائش مخلوقات کی کیفیت اور حدوث عالم کی طرف خاص توجہ دیتا ہے، یہاں تک کہ اپنے ہر رسالے اور کتاب میں ان کی طرف اشارہ کر جاتا ہے اور ان کے بارے میں دقیق بحثیں کرتا ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ عالم کے حادث ہونے کا نظریہ درست اور صحیح ہے ۔ اگرچہ اس نظریے کی طرف بعض اس سے پہلے فلسفیوں نے اشارہ کیا ہے لیکن میر داماد نے اسے کمال کو پہنچایا اور وہ اسی کے نام سے مشہور ہو گیا ۔

میر داماد حقیقت (واقعیت) کو تین مرحلوں میں تقسیم کرتا ہے : (۱) ذات باری تعالٰی کہ دراصل تمام حقائق کو محیط ہے ؛ (۲) اسما و صفات اور مثل افلاطونی یا ارباب الانواع ؛ (۳) عالم طبیعی یا موجودات جن کی حالت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے ۔

ذات باری تعالٰی اور اس کے اسما و صفات میں، جو ہر لحاظ سے غیر متغیر اور ہمیشہ ایک حالت میں ہیں ، ربط کا نام میر داماد "سرمد" رکھتا ہے ۔ مثل افلاطونی ، (ارباب الانواع) اور اس موجودات عالم کے درمیان کہ ہر ایک اپنے اپنے رب النوع کا نقل (صنم) اور نقل (طلسم) ہے، رابطے کو کہ ان میں سے ایک ثابت اور دوسرا متغیر ہے، دہر کہتا ہے اور آخر میں موجودات متغیر کے باہم علاقے کو زمان کے نام سے موسوم کرتا ہے ۔

چونکہ یہ عالم (خارجی) عالم مجردات اور مثل کے واسطے سے موجود ہوا ہے اس لیے اس کا حدوث دہری ہے زمانی نہیں ۔ یہ جہان کسی زمانے میں نہیں پیدا ہوا جو جہان سے پہلے موجود ہو، بلکہ اس سے پہلے دہری تھا جو طویل اور مستد سلسلہ ہے جو اس کے عالم کے باہر اور اس سے بلند تر ہے ۔ لہٰذا مخلوقات عالم کا ظہور حدوث دہری، ابداع اور اختراع ہے، حدوث زمانی، وضع اور تکوین نہیں ۔ عالم زمانی اگرچہ اپنے مرتبے میں حقیقت کا حامل ہے، عدم کے اعتبار سے دہری سے پیچھے ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ موجودات زمانی اگرچہ زمانے کے اندر متحقق اور

موجود ہیں، لیکن اگر موجودات دہریہ سے ان کا تعلق نہ ہو تو ان میں وجود کا پتا بھی نہ ہو۔ عالم مجردات میں یہ وجود سے بے بہرہ ہیں؛ اسی طرح عالم دہری باعتبار سرمد عدم سے پیچھے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم سرمد، دہری کی علت اور دہری زمانے کی علت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سرمد تمام موجودات کی علة العلل ہے۔

میر داماد زیادہ تر تو مشائین کے عقائد کی پیروی کرتا ہے لیکن بہت سے مسائل میں اشراقیوں کا ہم خیال بھی ہے؛ مثلاً یہ اعتقاد کہ عقول کی تعداد دس پر منحصر نہیں؛ اور یہ کہ عالم ہورقلیا مجردات اور طبیعی اجسام کے درمیان برزخ ہے۔ اس نے اشراقیوں سے بعض اصطلاحات بھی اخذ کی ہیں، مثلاً نور اسپہبد [= نفس ناطقہ]۔ اصل یہ ہے کہ میر داماد نے حکمت مشائی و اشراق اور دین اسلام میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور ملا صدرا کے مکتب فکر کے پیدا ہونے کی داغ بیل اسی نے ڈالی ہے، جس نے شرع، معرفت اور استدلال کے درمیان کامل اتفاق اور ہم آہنگی کا دعوٰی کیا ہے۔

مآخذ: یورپ کی زبانوں میں: (۱) براکلمان: تکملہ، ۲: ۵۷۹ تا ۵۸۰؛ (۲) E.G. Brown: *A Literary History of Persia*، کیمبرج، ۱۹۲۸ء، ۴: ۲۵۶ تا ۲۵۷، ۴۰۶ تا ۴۰۷، ۴۲۶ تا ۴۲۹؛ (۳) H. Corbin: "*Confessions Entratigaes*" *de Mir Dāmād* در *Mélanges Louis Massignon*، *Institut Français de Damas*، ۱۹۵۶ء، ص ۳۳۱ تا ۳۴۸؛ (۴) H. Corbin: "*Mir Dāmād et l'école théologigue d' Ispahan au XVIIe Siècle*" در *Etudes Carmélitaines*، ۱۹۶۰ء، ص ۵۳ تا ۷۱؛ (۵) S.H. Nasr: "*The School of Ispahan*" در *History of Muslim Philosophy*، طبع ایم۔ ایم شریف، Wiesbaden، ۲: ۹۰۴ تا ۹۳۲؛ (۶) Rieu: *Catalogue of Persian Mss. in British Museum*، ۲: ۸۳۵؛ کتب و مقالات عربی و فارسی: (۷) ابن معصوم: سلافة العصر، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ص ۴۸۵ تا ۴۸۷؛ (۸) اسکندر بیگ منشی: تاریخ عالم آرائے عباسی، تہران ۱۳۱۳ - ۱۳۳۴ھش، ص ۱۴۶ تا ۱۴۸؛ (۹) محمد باقر الخوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۶۷ھش، ۱: ۱۱۴ تا ۱۱۶؛ (۱۰) فضل اللہ المحبّی: خلاصة الاثر، قاہرہ ۱۲۸۴ھ، ۳: ۳۰۱ تا ۳۰۲؛ (۱۱) محمد بن صادق: نجوم السماء، لولکشور ۱۳۰۳ھ، ص ۴۶؛ (۱۲) اعجاز حسین الکنتوری: کشف الحجب والاستار عن اسماء الکتب والاسفار، کلکتہ ۱۳۳۰ھ (فہرست بنام محمد باقر بن محمد الحسینی الداماد)؛ (۱۳) فہرست کتابخانہ اہدائی آقای مشکوة محمد تقی دانش پژوہ، تہران ۱۳۳۲ھش، ۳: ۱۵۲؛ (۱۴) محمد بن سلیمان تنکابنی: قصص العلماء، تہران ۱۳۰۴ھش، ص ۱۳۵، ۲۲۸ تا ۲۳۰؛ (۱۵) عبد العزیز جواہر الکلام: رسالہ در قضیات العلم و العلماء (مخطوطہ)؛ (۱۶) رضا قلی خان ہدایت: مجمع الفصحاء، تہران ۱۲۹۵ھش، ۷: ۲؛ (۱۷) لطف علی خان آذر: آتشکدہ، ۱۲۹۹ھش، ص ۱۵۹؛ (۱۸) رضا قلی خان ہدایت: ریاض العارفین، تہران ۱۳۰۵ھش، ص ۱۶۶ تا ۱۶۷؛ (۱۹) عباس قمی: الکنی و الالقاب، نجف ۱۳۷۶ھ، ۲: ۲۰۶ تا ۲۰۷؛ (۲۰) بخت آور خان: مرآة العالم (مخطوطہ)؛ (۲۱) محمد رضا [illegible]: زینت التواریخ، ورق ۵۵۳؛ (۲۲) احمد علی: ہفت آسمان، کلکتہ ۱۸۷۳ء؛ (۲۳) محمد محسن آغا بزرگ: الذریعة، نجف ۱۳۵۵ھ، ۲: ۲۶۱ و تحت اسامی کتب میر داماد۔

(سید حسین نصر)

* **داماد فرید پاشا**: اصل نام محمد فرید بن حسن عزت تھا؛ یہ سلطنت عثمانیہ کے آخری وزرائے اعظم میں سے تھا اور "شورائے دولت" کا رکن تھا۔ ۱۸۵۳ء میں استانبول میں پیدا ہوا، کئی ادنٰی درجے کے سفارتی عہدوں پر بھی کام کیا۔ ۱۸۸۲ء میں عبدالحمید ثانی کی ہمشیرہ مدیحہ کے ساتھ شادی ہو جانے پر اسے "شورائے دولت" کا رکن اور عضو مجلس سنا (senator) مقرر کیا گیا، نیز پاشا کا لقب عطا ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں "حریت و ائتلاف فرقسی" کا مؤسس مشترک ہونے کے

علاوہ وہ اس کا صدر بھی تھا۔ عثمانیوں کی شکست کے بعد وہ اپنے برادر نسبتی محمد ششم کا وزیر اعظم مقرر ہوا (۴ مارچ تا ۲ اکتوبر ۱۹۱۹ء اور ۵ اپریل تا ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔ اس کی یہ حکمت عملی کہ فاتح طاقتوں کے ساتھ مصالحانہ رویہ رکھا جائے تاکہ ان سے صلح کی نرم شرائط حاصل کی جا سکیں ایسی ہی ناکام ثابت ہوئی جیسی کہ کمال (اتاترک) کے تحت آناطولی میں قومی تحریک مزاحمت کو دبانے میں اس کی کوششیں ناکام رہیں۔ قومی دباؤ کی وجہ سے اسے اکتوبر ۱۹۱۹ء میں استعفٰی دینا پڑا، لیکن اتحادیوں کی کمک سے استانبول پر قبضہ ہوا تو وہ پھر اس عہدے پر بحال ہو گیا۔ قوم پرستوں کے خلاف مشہور فتوی (جس پر "شیخ الاسلام" دُرّی زادہ عبداللہ کے دستخط تھے) شائع کرنے کی ذمے داری اس کی حکومت پر تھی۔ اس نے آناطولی میں قوم پرستوں کے خلاف فوج بھی بھیجی۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو اس کی مجلس وزرا نے معروف Sèvres کے صلح نامے پر دستخط کر دیے، لیکن قوم پرستوں کی روز افزوں قوت نے جلد ہی اسے برخاست کرا دیا۔ ستمبر ۱۹۲۲ء میں وہ استانبول چھوڑ کر نیس Nice چلا گیا، جہاں ۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

مآخذ: محمود کمال اینال: *Osmanli devrinde son sadriazamlar*، استانبول ۱۹۴۰–۱۹۵۳ء، ص ۲۰۲۹ تا ۲۰۹۴؛ (۲) ملّی نوسال، ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء، ص ۲۵۲؛ (۳) Tarik Z. Tunaya: *Türkiyede siyasi partiler*، ۱۹۵۲ء، ص ۴۱۵، ۴۵۱ تا ۴۵۵؛ (۴) Ali Fuat Türkgeldi: *Görüp işittiklerim*، بار دوم، ۱۹۵۱ء؛ (۵) *WI*، ۱۹۲۸–۱۹۲۹ء، ص ۱ تا ۱۵۴؛ (۶) کمال (اتاترک): *Nutuk* (دیکھیے ۱۹۳۴ء کے ایڈیشن کا اشاریہ)؛ (۷) ابراہیم علاءالدین گوسا: ترک مشہورلری انسائیکلوپیدیسی، ۱۹۴۶ء، ص ۱۳۶۔

(D.A. RUSTOW)

دامغان: تہران اور مشہد کو ملانے والی شاہراہ اعظم پر ایک شہر، جو تہران سے تقریباً تین سو چوالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر مشرق کی جانب واقع ہے۔ یہ تہران اور مشہد کے درمیان ریل کا سٹیشن بھی ہے؛ بلندی ۱۱۵۵ میٹر اور آبادی (۱۹۵۰ء میں) ۹۹۰۰ تھی۔ اس شہر سے ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر جنوب کی طرف ایک اونچا ٹیلا ہے جو تپہ حصار کہلاتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں پنسلوانیا Pennsylvania کی یونیورسٹی کے زیر اہتمام یہاں کھدائی ہوئی تو زمانۂ قبل تاریخ کی چیزوں کے علاوہ ساسانیوں کے ایک عہد کی عمارت بھی برآمد ہوئی، جس کے بچے کھچے حصے پر پلستر کیا ہوا تھا۔ یہاں مسلمانوں کے عہد کی قدیم ترین عمارت تاری خانہ ہے، جس کی تعمیر کی تاریخ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی بتائی جاتی ہے۔ قیاس ہے کہ ایران کی باقی رہ جانے والی قدیم ترین مسجد یہی ہو۔ اس کے ملحق ایک مینار بھی ہے، جو پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کی تعمیر ہے۔ سلجوقی عہد کے چند مقبروں کے گنبد بھی موجود ہیں؛ مثلاً پیر علمدار مورخہ ۴۱۷ھ / ۱۰۲۶ء، چہل دختران، مورخہ ۴۴۶ھ / ۱۰۵۴ء اور امام زادہ جعفر۔ جامع مسجد کے مینار پر تاریخ ۵۰۰ھ/۱۱۰۶–۱۱۰۷ء مرقوم ہے۔

مآخذ: (۱) اقبال یغمائی: جغرافیای تاریخی دامغان، تہران ۱۳۲۶ھ/۱۹۴۷ء، ص ۳۶ ببعد؛ (۲) رهنمای ایران، تہران ۱۳۳۰ھ/۱۹۵۱ء، ص ۹۲؛ (۳) فرهنگ جغرافیای ایران، تہران ۱۳۳۰ھ/۱۹۵۱ء، ۳: ۱۱۶؛ [(۴) دائرة المعارف الاسلامیة، مصر، ۹: ۱۱۲ ببعد؛ (۵) الإصطخری، ص ۲۱۰، ۲۱۱؛ (۶) ابن حوقل، ص ۲۷۱؛ (۷) المقدسی، ص ۳۵۵؛ (۸) Ferrier: *Voyages*، ۱: ۱۳۳؛ (۹) Khanikof: *Ethnography*، ص ۴۳؛ (۱۰) ناصرالدین شاه: رحلة فی خراسان، ص ۲۷ ببعد؛ (۱۱) Quatremère: *Histoire des Mongols*، ۱: ۲۲۳ ببعد؛

۱ : ۲۷۸؛ (۱۲) Barbier de Meynard : *Dictionnaire*
de la Perse، ص ۲۲۲؛ (۱۳) G. Le Strange : *The*
Lands of the Eastern Caliphate، ص ۳۶ ببعد؛ (۱۴)
البستانی : دائرۃ المعارف، بیروت ۱۸۸۳ء، ۷ : ۵۵۹]۔

(O.N. WITTEK)

* **دانشگاہ** : رکّ بہ جامعہ۔

* **دانشمندیہ** : ترکمانوں کا ایک خانوادہ، جس نے شمالی قاپادوکیہ (Cappadocia) میں پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے آخری ربع سے ۵۷۳ھ/۱۱۷۷-۱۱۷۸ء تک حکومت کی۔ بانی خاندان امیر دانشمند قاپادوکیہ (جنوب مغربی ایشیائے کوچک) میں اس بد نظمی کے عہد میں نمودار ہوا جو ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء میں سلیمان بن قُتُلمش سلجوق کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوا اور پھر پہلی صلیبی جنگ میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا۔ جب پہلی صلیبی جنگ کے سلسلے میں دانشمند کا ذکر پہلی بار آیا ہے وہ اس وقت سیسطیہ Sebastea، وادی یشیل ایرماق (قدیم نام اریس Iris valley) مع توقات Eudoxias، توقانہ، آماسیہ، قیصریہ جدیدہ Neocaesarea، اور کنغری Cangra پر قابض ہو چکا تھا۔ انقرہ سے قیصریہ کو جانے والے راستے پر اس کا قبضہ تھا۔ مشرق بحر اسود Pontic کے ساحلی شہر اسے خراج دیتے تھے اور اس کے فوجی دستے دور تک بحر اسود کے ساحلی علاقوں کو تاراج کرکے جارجیا اور ارمینیہ میں یورشیں کر رہے تھے۔ اس کا ارادہ مَلَطْیَہ Melitene بھی فتح کرنے کا تھا۔ اس وقت سلطان قلج ارسلان بن سلیمان نے مَلَطْیَہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور اس کی مدافعت ارمنی گورنر گیبریل Gabriel کر رہا تھا۔ اس موقع پر دانشمند وہاں آیا اور فریقین جنگ میں صلح کرا دی۔ پھر صلیبی نبرد آزماؤں نے ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء میں نکائیہ (Nicaea) پر قبضہ کر لیا تو اس کی کوششوں میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس سال کے موسم گرما میں دانشمند نے دوسرے ترک امیروں کے ساتھ مل کر صلیبی نبرد آزماؤں پر حملوں میں حصہ لیا۔ رمضان ۴۹۳ھ/جولائی ۱۱۰۰ء میں صلیبیوں کا ایک قائد یعنی انطاکیہ کا بوھموند Bohemund ملطیہ کی مدد کے لیے، جسے اب دانشمند نے محصور کر لیا تھا، روانہ ہوا لیکن وہ خود امیر کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور قیصریۂ جدیدہ کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ دوسرے سال فرینکو لمبارڈ صلیبی فوج بوھموند کو چھڑانے قاپادوکیہ کے راستے جا رہی تھی کہ اسے بھی دانشمند نے شکست دی؛ اور اسی سال کے ماہ ستمبر میں اس نے صلیبیوں کے آخری لشکر کے قتل عام میں حصہ لیا یہ لشکر آکوی تانہ Aquitaine اور بویریا کی امدادی افواج پر مشتمل تھا، جس کا قاپادوکیہ میں ہراقلیہ (Heraclea) کے مقام پر صفایا کر دیا گیا۔ آئندہ سال دانشمند تین سال کے محاصرے کے بعد ملطیہ میں داخل ہوا اور اپنی کمال فیاضی کی بدولت یہاں کی مختلف النسل آبادی سے تحسین حاصل کی۔ شعبان ۴۹۶ھ/مئی ۱۱۰۳ء میں دانشمند نے بوھموند کو، رہا کر دیا اور اس سے اپنے مشترکہ دشمنوں یعنی بوزنطیوں اور سلجوقیوں کے خلاف اتحاد کے عہد و پیمان کیے، لیکن دانشمند کی وفات نے، جو ۴۹۷ھ/۱۱۰۴ء میں ہوئی، بوھموند کو اس معاہدے سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا اور قلج ارسلان کو موقع مل گیا کہ اپنے متوفی حریف کے علاقے کے ایک حصے اور شہر ملطیہ پر قبضہ جما لے۔ دانشمند کا سب سے بڑا لڑکا امیر غازی اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ ۵۰۰ھ/۱۱۰۷ء میں قلج ارسلان فوت ہو گیا تو خاندانی مناقشات نے اس کے بیٹوں میں تفرقہ ڈال دیا۔ ان جھگڑوں میں غازی نے بھی حصہ لیا اور اپنے داماد مسعود کو ۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء میں قونیہ پر قبضہ کر لینے میں مدد دی۔ بعد ازاں اس نے طغرل ارسلان اور والی ملطیہ اور اس کے اتابک بلک کے ساتھ مل کر ۵۱۴ھ/۱۱۲۰ء میں امیر ارزنجان، ابن منگجک اور

اس کے حریف طربزون کے ڈیوک کو شکست دی، لیکن اس نے اپنے قیدی بنگچک کو، جو اس کا داماد بھی تھا، رہا کر دیا، جو اتحادیوں میں پھوٹ ڈالنے کا موجب ہوا۔ ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء میں بلک کے انتقال پر امیر غازی نے ملطیہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ مسعود اور اس کے بھائی ملک عرب، والی انقرہ قسطمونی کے مابین اس وقت لڑائی ہو رہی تھی۔ غازی نے اس میں مداخلت کی اور مؤخرالذکر کو شکست دی۔ اور ۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء میں اس سے قیصریہ اور انقرہ چھین لیے۔ ملک عرب نے بوزنطی سے امداد کی درخواست کی، لیکن امیر غازی نے گنغری اور قسطمونی بھی فتح کیے اور قاپادوکیہ میں اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ۵۲۳ھ/۱۱۲۹ء میں ارمنی بادشاہ تھوروس Thoros کی موت پر امیر غازی نے کیلیکیا Cilicia میں مداخلت کی اور انطاکیہ کے رئیس بوہموند ثانی کو شکست دی، نیز ارمنی بادشاہ لیون Leon کو مطیع بنا لیا اور ادیسہ Edessa کے کاؤنٹ کے علاقوں کو تاراج کر دیا۔ پھر اس نے جون کومی نوس John Comenus کی طرف رجوع کیا، جس نے ۵۲۷ھ/۱۱۳۲-۱۱۳۳ء میں اس سے قسطمونی چھین لیا تھا۔ امیر غازی، جس نے Isaac Comnenus کو پناہ دی تھی، اب اپنے بھائی کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی سال مذکورۂ بالا شہر پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ امیر غازی کی فتوحات کے صلے میں خلیفہ المسترشد اور سلطان سنجر نے اسے "ملک" کا خطاب دیا؛ لیکن سفیر مطلبہ پہنچے ہی تھے کہ امیر فوت ہو گیا اور یہ اعزاز اس کے بیٹے محمد کو ۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء میں ملا۔ جون کومی نوس نے پھر جنگ چھیڑ دی اور ۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء میں قسطمونی اور گنغری کو دوبارہ حاصل کر لیا، لیکن جونہی وہ وہاں سے ہٹا، یہ دونوں شہر ایک بار پھر ترکوں کے قبضے میں آ گئے۔ ملک محمد کے عہد حکومت کے نمایاں واقعات یہ ہیں کہ قیصر جون کومی نوس بار بار کیلیکیا اور بحر اسود کے ساحلی خطے میں ان قلعوں کو پھر سے چھین لینے کی کوششیں کرتا اور ناکام ہوتا رہا، جو خاندان دانشمندیہ کے قبضے میں تھے؛ دوسرے ملک محمد کی وہ تاختیں جو اس نے مرعش کے کاؤنٹ کے علاقوں میں کیں۔ ۵۳۶ھ/۱۱۴۱-۱۱۴۲ء میں ملک محمد کا قیصریہ میں انتقال ہوا۔ اب اس کے بھائی یاغی ارسلان والی سبسطیہ نے اپنے بھتیجے ذوالنون کی حق تلفی کر کے خود امیر ہونے کا اعلان کر دیا اور متوفی بھائی کی بیوہ سے شادی کر لی۔ حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لینے سے اس نئے امیر نے خاندان دانشمندیہ کی "امارت" کو کمزور کر دیا جو آگے چل کر اس خانوادے کے خاتمے کا باعث ہوئی؛ کیونکہ ایک طرف تو ذوالنون نے قیصریہ پر قبضہ کر لیا اور دوسری طرف یاغی ارسلان کا بھائی عین الدولہ پہلے البستان پھر ملطیہ کا مالک بن بیٹھا۔ اس طرح ایک ریاست کی اب تین حریف شاخیں ہو گئیں، جن کے حقوق کی بعض اوقات سلجوقی حمایت کرتے اور بعض اوقات مخالفت۔ بہر کیف، جب تک یاغی ارسلان زندہ رہا، اس خانوادے کا نام قائم رہا۔ اس امر کے باوجود کہ وہ اپنے خسر مسعود اور بعد ازاں اپنے برادر نسبتی قلج ارسلان ثانی سے مسلسل لڑتا رہا۔ قیصر Manuel، جس نے پہلے سلجوقیوں سے اتحاد کر لیا تھا، تاکہ دانشمندیوں کی بوزنطی علاقوں میں تاختوں کے روکنے کی راہ نکل آئے، اب اس نے قلج ارسلان ثانی کے خلاف ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء میں یاغی ارسلان کی حمایت کی اور ذوالنون پر اپنا تسلط جما لیا۔ دوسرے سال کے نمایاں واقعات یہ ہیں کہ ایک طرف تو قلج ارسلان اور Manuel کے درمیان جنگی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور دوسری طرف بیک وقت حریف خاندانوں میں جنگ چھڑ گئی۔ ۵۵۹ھ/۱۱۶۴ء میں یاغی ارسلان کی وفات سے اس گھرانے کے باہمی تنازعات زور پکڑ گئے، جن سے قلج ارسلان کو اس امارت کے تباہ کر دینے کا موقع ہاتھ آیا،

یاغی ارسلان کی بیوہ نے ذوالنون کے بھتیجے اسمٰعیل بن ابراہیم سے، جس کی عمر سولہ برس کی تھی، شادی کر لی، یہ دونوں ۵۶۷ھ/۱۱۷۲ء میں ایک انقلاب میں ہلاک ہو گئے اور ذوالنون کو سبسطیہ سے بلا کر امیر بنا دیا گیا۔ اب قلج ارسلان نے فوراً ہی اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن ذوالنون کے خسر نورالدین اتابک دمشق کی مداخلت سے قلج ارسلان نے مجبور ہو کر ذوالنون سے چھینے ہوئے علاقے واپس کر دیے۔ لیکن ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں نورالدین کی وفات پر قلج ارسلان نے فوراً ہی سبسطیہ، وادی یشیل ایرماق، توقات، قومانہ اور آماسیہ پر قبضہ کر لیا اور قیصریۂ جدیدہ کو محاصرے میں لینے کے لیے آگے بڑھا۔ ذوالنون کو شکست ہوئی اور سلجوقیوں نے قیصریۂ جدیدہ پر قبضہ کر لیا . . . ۔ ذوالنون کو ۵۷۰ھ/۱۱۷۵ء میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔

رہی ملطیہ کی دانشمندیہ شاخ، جو ابھی تک بچی ہوئی تھی، تو وہاں ذوالقرنین بن عین الدولہ کی وفات (۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء) پر اس کے تین بیٹوں کے درمیان نااتفاق کا دور دورہ رہا۔ سب سے بڑے بھائی نصرالدین محمد کو ۵۶۵ھ/۱۱۷۰ء میں معزول کرکے اس کے بھائی فخرالدین قاسم کو تخت نشین کیا گیا، لیکن وہ ابھی بمشکل پندرہ سال کا ہوگا کہ اپنی شادی کے دن اسپ سواری کے ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ اس کا جانشین تیسرا بھائی افریدون ہوا، مگر نصرالدین محمد نے ۵۷۰ھ/۱۱۷۵ء میں اس سے پھر شہر واپس لے لیا اور قلج ارسلان کی سیادت تسلیم کرکے تین سال تک حکومت کرتا رہا؛ لیکن ۵۷۳ھ/۱۱۷۷-۱۱۷۸ء میں سلجوقیوں نے ملطیہ پر قبضہ کر لیا اور اس طرح خاندان دانشمندیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

مآخذ: ادیسہ کا Matthew: *Chronicle*، مترجمہ E. Dulaurier، پیرس ۱۸۵۸ء؛ (۲) مائیکل شامی Michael the Syrian: *Chronicle*، مترجمہ J.B. Chabot، جلد ۳؛ (۳) Anna Comnena، طبع B. Leib، ۳: ۱۸، ۲۹، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۱۰؛ (۴) Niketas Choniates، طبع بون Bonn، ص ۲۸، ۲۹، ۳۶، ۱۵۲، ۱۵۹؛ (۵) Kinnamos، طبع بون، ص ۱۳، ۱۵، ۲۰۶؛ (۶) صور کا William: *Recueil Hist. Crois. Hist. Occ. I*، ۹: ۲۹۶ تا ۲۹۷؛ (۷) Aix کا Albert: *Rec. Hist. Crois. Hist. occ.*، ۴: ۵۲۳، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۴۳، ۵۴۶، ۵۸۱، ۶۱۱ تا ۶۱۳؛ (۸) ابن الاثیر (طبع ٹورن برگ)، ۱۰: ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۲۶ و ۱۱: ۹، ۵۲، ۲۰۳ تا ۲۰۴، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۲۷، ۲۵۷ تا ۲۵۸؛ (۹) J. Laurent، *Sur les Emir Danichmendites jusqu'en 1104*، در *Mélanges Iorga*، پیرس ۱۹۳۳ء، ص ۴۹۹ تا ۵۰۹؛ (۱۰) Mükr. Halil Yinanç، مقالہ *Danişmendliler*، در [آ ت]؛ نیز (۱۱) *Selçuklular Devri Türkiye Tarihi*، استانبول ۱۹۴۴ء، ص ۹۸ تا ۱۰۳؛ (۱۲) I. Mélikoff، *La Geste de Melik Dānişmend*، جلد ۱، پیرس ۱۹۶۰ء (دیکھیے ماخذ)؛ (۱۳) البستانی: دائرۃ المعارف، بیروت ۱۸۸۳ء، ۷: ۵۶۱ ببعد؛ (۱۴) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مصر، ۹: ۱۱۲ ببعد؛ (۱۵) A.D. Mordtmann، در *Zetischr. d. Deusch Morgenl ges*، ۳۰: ۴۶۷ تا ۴۸۶؛ (۱۶) P. Casanova، در *Revue Numatique Francaise*، ۱۸۹۴ء]۔

(I. MÉLIKOFF)

دانق: یا (دانق) دیکھیے سکّہ۔

الدّانی: ابو عمرو عثمان بن سعید بن عمر الاموی، مالکی فقیہ اور سب سے بڑھ کر قاری قرآن؛ ۳۷۱ھ/۹۸۱-۹۸۲ء میں قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ حج کرنے کے بعد انہوں نے ۳۹۷ھ/۱۰۰۶-۱۰۰۷ء اور ۳۹۹ھ/۱۰۰۸-۱۰۰۹ء کے درمیان کا زمانہ قاہرہ میں گزارا۔ اس کے بعد وہ قرطبہ واپس گئے، لیکن بہت جلد انہیں وہاں سے جانا پڑا۔ پہلے وہ المریہ گئے اور بعد میں دانیہ، جہاں سے ان کا نسبی نام بنا پہنچے؛ نہیں

بود و باش اختیار کر لی اور ۴۴۴ھ/۱۰۵۳ء میں یہیں وفات پائی.

ان کی ایک سو بیس تصانیف میں سے، جن کے نام انھوں نے ارجوزہ میں گنوائے ہیں، صرف دس موجود ہیں (دیکھیے براکلمان، ۱ : ۴۰۷؛ تکملہ، ص ۷۱۹)؛ ان میں سے دو مسائل نحویہ سے بحث کرتی ہیں اور باقی قراءت کے فن سے تعلق رکھتی ہیں، جس میں الدانی نے خاص طور سے شہرت حاصل کی۔ ان کی زیادہ مشہور تصانیف یہ ہیں: کتاب المقنع فی معرفۃ رسم مصاحف الامصار (دیکھیے S. de Sacy: *Notices et Extraits*، ۸ : ۲۹۰) اور التیسیر فی القراءات السبع (طبع O. Pretzl، استانبول ۱۹۳۰ء)، جس کا ابن خلدون کے بیان کے مطابق، بڑی کثرت سے مطالعہ کیا جاتا تھا، مقدمہ، ۲ : ۳۵۶)؛ المحکم فی نقط المصاحف، حال ہی میں عزت حسن نے دمشق سے طبع کی ہے (۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء).

مآخذ: (۱) ووٓ، ت، طبع اول، بذیل مادۂ الدانی، از محمد بن شنب؛ (۲) الضبی: عدد ۱۱۸۵؛ (۳) ابن بشکوال، عدد ۸۷۴؛ (۴) ابن خیر: فہرسۃ، بمدد اشاریہ؛ (۵) المقری: نفح الطیب، ۱ : ۵۵۰؛ (۶) یاقوت، ۲ : ۵۰۴؛ (۷) ابن فرحون: الدیباج، فاس ۱۳۱۶ھ، ص ۱۹۱؛ (۸) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۳ : ۳۱۶؛ (۹) السیوطی: طبقات الحفاظ، ۱۴ : ۱۵؛ (۱۰) Freytag: *Einleitung*، ص ۳۸۶؛ (۱۱) Wüstenfeld: *Geschichtsschreiber*، ص ۱۹۷؛ (۱۲) Amari: *Bibl. Ar. Sic*، ۲ : ۵۷۹؛ (۱۳) Pons Boygues: *Ensayo*، عدد ۹۱؛ (۱۴) Nöldeke: *Gesch. des Qorâns*، ۳ : ۲۱۴ ببعد وغیرہ؛ [(۱۵) ابو المحاسن ابن تغری بردی: النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر و القاہرۃ، ۵ : ۵۴؛ (۱۶) غایۃ النہایۃ، ۱ : ۵۰۳؛ (۱۷) طاش کبری زادہ: مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ، ۱ : ۳۸۶؛ (۱۸) براکلمان، ۱ : ۵۱۶، و تکملہ، ۱ : ۷۱۹؛ (۱۹) مرتضی زبیدی: تاج العروس، بذیل مادۃ؛ (۲۰) Cl. Huart: *Littérature Arabe*، پیرس ۱۹۰۲ء، ص ۲۵۸ ببعد؛ (۲۴) ووٓ، ع، ۹ : ۱۱۶ ببعد؛ (۲۵) الزرکلی: الاعلام، ۳ : ۳۶۶ ببعد].

(ووٓ، لائڈن بار دوم [و ادارہ])

⊗ **دانیالؑ** : [اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت دانیالؑ ان کے چار اکابر انبیا میں شمار ہوتے ہیں اور صحیفۂ دانیال عہد نامۂ قدیم کے صحیفوں میں شامل ہے۔ قرآن و حدیث میں کہیں ان کا بالصراحت ذکر نہیں آیا، البتہ عربی [تاریخی] روایات میں تورات کے دانیال نام کی دو شخصیتوں کے متعلق کچھ غیر مکمل بیان محفوظ ہے۔ ان میں سے ایک دانیال تو وہ عہد قدیم کا مرد دانا ہے جس کا صحیفہ حزقیل کے صحیفے کے بعد ہے۔ اور دوسرا دانیال وہ صاحب کشف و تعبیر جو بنی اسرائیل کی اسیری کے زمانے میں بابل میں رہتا تھا [ایک ہی شخصیت کے مختلف ادوار حیات تسلیم کرنے میں کوئی علمی استحالہ بظاہر نظر نہیں آتا].

دانیال نے کچھ مکاشفات دیکھے تھے، کیونکہ روایات سے مترشح ہوتا ہے کہ ایک کتاب جس میں اس قسم کی پیشگوئیاں مندرج تھیں اس تابوت سے دستیاب ہوئیں جس کے متعلق فرض کیا جاتا ہے کہ اس میں دانیال کی نعش تھی۔ [بقول البلاذری (: فتوح البلدان، ص ۳۷۸) حضرت ابو موسی الاشعری رضی اللہ عنہ کو فتح سوس کے بعد وہاں کے قلعے سے دانیال نبی کی نعش ملی تو انھوں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ خلیفۂ ثانی کے حکم سے نئے کفن کے بعد دریا کا پانی بند کر کے اسے وسط دریا میں دفن کر دیا اور پھر پانی جاری کر دیا۔ اسی سلسلے میں البلاذری نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ بخت نصر حضرت دانیال کو قید کر کے بابل لے آیا تھا اور وہ وہیں فوت ہوئے تھے۔ اہل سوس کے ہاں قحط پڑا تو انھوں نے اہل بابل سے

دانیال کی نعش عاریۃً مانگ لی تاکہ ان کے ذریعے بارش حاصل کر سکیں۔ اس طرح ان کی نعش اہل سوس کے پاس پہنچ گئی۔

بنو اسرائیل کے مستقبل کے بارے میں رمزیہ خواب اور بعض خوابوں کی تعبیریں انھوں نے بیان کی ہیں (دیکھیے محمد جمیل احمد: انبیاً قرآن، ۳: ۵۲۹ تا ۵۳۰؛ البستانی: دائرۃ المعارف، ۷: ۵۷۰)]۔

تاریخی روایات میں دانیال میں بیان کیے ہوئے ضمنی قصے قدرے مختلف صورت میں محفوظ ہیں۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی، ص ۷۰؛ (۲) الطبری، ۱: ۶۴۷، ۶۵۲ تا ۶۵۴، ۶۶۵ تا ۶۶۸، ۷۱۷؛ (۳) المسعودی: مروج، ۱: ۱۱۷، ۱۲۰ و ۲: ۱۱۵، ۱۲۸؛ (۴) منسوب بہ البلخی: البدء و التاریخ، ۲: ۱۵۶ ببعد، ۱۴۴، ۱۶۵/۱۵۰ ببعد و ۳: ۱۱۴ ببعد، ۱۱۸ ببعد اور قب اشاریہ؛ (۵) الثعلبی: عرائس المجالس، ص ۱۹۸ تا ۲۰۲؛ (۶) البیرونی: الآثار، ص ۱۵ تا ۱۷/۱۸ تا ۲۰، ۳۰۲/۳۰۰۔ دانیال کے مقبرے اور تابوت کے لیے نیز دیکھیے: (۷) المقدسی، ص ۴۱۷ (قب C. Cahen، در *Arabica*، ۱۹۵۹ء، ص ۲۸)؛ (۸) الھروی: کتاب الزیارات، طبع J. Sourdel-Thomine، ص ۹۶/ترجمہ: *Guide des lieux de pelerinage*، ص ۲۱۵، حاشیہ ۴، (قب M. Schreiner، در *ZDMG*، ۵۳: ۵۸ ببعد) اور (۹) وو لائڈن، بار اول، مقالہ سوسن: تتمات دانیال، قب C. Levi Dellavida: *Elenco*، ص ۹۸؛ نیز دیکھیے: (۱۰) R. Basset: *Mille et un Contes*، ۳: ۱۲۵ تا ۱۲۸ (B. Heller کے تبصرے در *RE*، ۸۵: ۱۳۴ ببعد) اور B. Heller: *Encyclopaedia Judaica*، ۵: ۷۷۴ ببعد؛ [(۱۱) ؤ لاع، مصر، ۹: ۱۱۸ ببعد؛ (۱۲) الثعلبی: قصص الانبیاء، قاہرہ ۱۳۲۵ھ، ص ۳۱۲ ببعد؛ (۱۳) البستانی: دائرۃ المعارف، بیروت ۱۸۸۳ء، ۷: ۵۶۹ ببعد؛ (۱۴) *Jewish Encyclopaedia*، ۴: ۴۲۰]۔

(C. Vajda [و ادارہ])

* **دانیال:** مغل شہزادہ، تاریخوں میں اسے سلطان دانیال کہا گیا ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر کا سب سے چھوٹا اور چہیتا بیٹا؛ اجمیر میں ۲ جمادی الاولٰی ۹۷۹ھ/۲۲ ستمبر ۱۵۷۱ء کو پیدا ہوا۔ ۱۰۰۸ء/۱۵۹۹ء میں اسے دکن کا فوجی صوبے دار مقرر کیا گیا اور اس کے شہر احمد نگر کو (۱۰۰۹ھ/۱۶۰۱ء میں) فتح کر لینے کے بعد اکبر نے اسے اعزاز بخشا اور خاندیش کا صوبہ عطا کیا، جسے اس کے نام پر "داندیش" موسوم کیا۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مضبوط جسم کا خوبصورت آدمی تھا، گھوڑوں کا شائق اور ہندوستانی نظمیں لکھنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ ابوالفضل نے اکابر سلطنت کی فہرست (آئین اکبری، ۱: ۳) میں اسے ہفت ہزاری دکھایا ہے۔ اس نے ہذیان خمری کے مرض سے برہان پور میں ۹ ذوالحجہ ۱۰۱۳ھ/۲۸ اپریل ۱۶۰۵ء کو انتقال کیا۔

مآخذ: مقالۂ اکبر کے مآخذ۔

(J. Burton-Page)

* **دانیہ:** ہسپانوی میں دینیہ Denia، صوبہ القنت Alicante کے شمال مشرق ضلع کا صدر مقام؛ یہ زمانۂ حال کے تین صوبوں میں، جو کبھی بلنسیہ کی قدیم سلطنت کے اجزا تھے (قشتاون، بلنسیہ، القنت) سب سے زیادہ جنوبی صوبہ ہے۔ یہ شہر اپنے پچاس ہزار باشندوں کے ساتھ خلیج بلنسیہ (Sinus Sucronensis) کے جنوب مشرقی سرے پر، جبل قاعون (Mongo) کے شمال میں، جو دو ہزار ایک سو نوے فٹ بلند ہے، واقع ہے۔ قدیم راس آرت میزیم Promontorium Artemesium اور فراریم Ferrarium یا تنبریم (Tenebrium)، موجودہ نام انتونیو Cabo de S. Antonio (de la Nao یا S. Martin) کے شمال میں دانیہ لنگر انداز ہونے کی اچھی جگہ تھی، لہٰذا چھٹی صدی قبل مسیح میں مسالیہ/مارسیلز یا منڈی امپوریاس (Emporium Ampurias) کے توسعہ والوں نے یہاں کی پرانی بستی بسائی، جیسے

شروع میں (سٹرابو Strabo) τὸ Ἡμεροσκοπεῖον، Hemeroscopium یعنی "دن کا پہرے دار" کہتے تھے۔ پھر افیوس Ephesus کو ارتمس دیوی کا مشہور معبد بالا حصار کی پہاڑی پر بنا تو اسے ارتمیزیم Artemisium کہنے لگے۔ اہل روما کے عہد میں دی آنه دیوی سے منسوب کرکے دی آنیم Dianium (دی آنه کا شہر) موسوم کیا گیا اور اس نے عربی میں دانیه (اماله کے ساتھ) کی صورت اختیار کی اور آخر میں هسپانوی میں "دینیه" Denia بن گیا۔ اگرچه اس کا اتحاد اہلِ روما سے تھا، لیکن چونکه یه ایک یونانی نوآبادی تھی، اس لیے قرطاجنه والوں نے اس سے تعرض نه کیا۔ رومن سپه سالار کیٹو Cato نے اس شہر کے نواح میں اہل هسپانیه پر ۱۹۵ ق م سے پہلے فتح حاصل کی تھی۔ هسپانیه کو فتح کرنے والے سرٹوریس Sertorius کو اسی جگه اپنا آخری ماوٰی اور ایک طاقتور بحری اڈا ملا تھا۔ ایک بہت هی قرین قیاس شہادت کے مطابق یہی جگه تھی جہاں اسے ۷۳ق م میں قتل کیا گیا۔ سیزر نے اس شہر کو سزا دی، کیونکه اس نے پومپی کا ساتھ دیا تھا۔ بایں همه (Dianium Stipendiarium) یه شہر سلطنت روما کے ماتحت نہایت خوش حال بلدیه بن گیا، جیسا که ان کھدائیوں سے ظاهر ہے جو وهاں هوئی هیں۔ یه جلد هی عیسائی بن گیا اور ساتویں صدی عیسوی میں وهاں اسقفی (bishapric) بنا دی گئی، جہاں کے چار بڑے راهب طلیطله کی مجالس کلیسیا میں حصه لیتے تھے۔ اس میں Severina کے قدیم عیسائی پچی کاری کیے هوے مقبرے کا ایک ٹوٹا هوا ٹکڑا اور اس سے بھی زیادہ پرانے آثار موجود هیں، جو اس کے نئے دین کی تصدیق کرتے هیں۔ لیکن جب طارق نے ۹۳ھ/۷۱۲ء میں ملک فتح کیا تو درحقیقت عربوں کے عہد حکومت میں یه شہر اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچا (آبادی پچاس هزار۔ جتنی که اب ہے)۔ اس کے برعکس هم عربوں سے قبل اس کی آبادی سے ترک وطن اور قوطوں Goths کے عہد کے متعلق گویا کچھ نہیں جانتے۔ دانیه نے عبدالرحمٰن اوّل کے خلاف بغاوتوں میں کچھ نه کچھ حصه لینا شروع کیا تھا، لیکن ۴۰۳ھ/۱۰۱۲-۱۰۱۳ء میں سقوط خلافت کے بعد یه حصه خاصا زیادہ هوگیا؛ جب که خانوادۂ عامریه کے ابوالجیش مجاهد کا زمانه آیا۔ یه مجاهد عبدالرحمٰن ابن المنصور (جسے مغربی مآخذ میں Musett یا Mugeto کہتے هیں)، کا آزاد کیا هوا غلام تھا۔ شروع میں اس نے اور مشہور عالم خلیفه المعَیطی (۴۰۵ھ/۱۰۱۵ء تا ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کی مدد سے دانیه اور بلیاره بارکی (Balearic) جزیروں [رک به میورقه] (۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء تا ۴۳۶ھ/۱۰۴۵ء) پر قبضه کر لیا اور دوسرے ملوک الطوائف پر علم و فضل اور دولت کے لحاظ سے سبقت لے گیا۔ اس نے اپنے ارد گرد علما جمع کیے۔ وه خود ایک ممتاز مفسر قرآن تھا۔ اس زمانے میں دانیه صوبۂ Levante اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کا اهم ترین شہر تھا، جہاں قریب قریب بلا فصل سال کے هر موسم میں کاشت هوتی تھی اور وه بہت دولت مند هو گیا تھا۔ دانیه کی بادشاهی ریاست نیم جزیرتی تھی؛ لہٰذا بحری مستقر کے طور پر بھی اس نے بہت اهم کردار ادا کیا۔ اس کی جہازی گودی هی میں اس بیڑے کا زیاده حصه تعمیر هوا تھا جس سے مجاهد بحری تاخت کا کام لیتا تھا۔ جزائر بالیاره پر قبضه کر لینے کے بعد ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء میں اس نے سارڈینیه پر چڑھائی کی تھی جو بہت مشہور هوئی؛ کیونکه ادھر تو اس کا بیٹا علی المعروف به اقبال الدوله جرمنوں کے هاتھوں گرفتار هوا اور ادھر اس وقت عیسائی اتحادیوں نے مجاهد کو شکست دی، اس کا پیچھا کیا اور جزیره دوباره چھین لیا۔ کئی برس کی قید کے بعد اقبال الدوله تاوان دے کر رها هوا اور ۴۳۶ھ/۱۰۴۴ء میں اپنے باپ کا جانشین بنا۔ اس نے ۴۶۸ھ/۱۰۷۶ء تک بتیس برس حکومت کی۔ اس کی ماں

عیسائی تھی۔ اس کی تربیت قید میں ہوئی تھی۔ وہ مسلمان تھا۔ اس نے ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء تا ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء میں اناج سے بھرا ہوا ایک جہاز مصر بھیجا، جہاں سخت قحط پھیلا ہوا تھا۔ جب اس کے برادر نسبتی المقتدر نے دانیہ کی طرف اپنی سرحدوں کو وسیع کرنا چاہا تو علی اس کی مزاحمت کرنے کے ناقابل تھا؛ اس کی رعایا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور شہر کو المقتدر کے حوالے کر دیا، جس نے علی کو سرقسطہ بھیج دیا، جہاں ۴۷۴ھ/۱۰۸۱ - ۱۰۸۲ء میں وہ انتقال کر گیا۔ المنذر دانیہ کی مملکت میں اپنے باپ المقتدر کا جانشین ہوا اور اس کا بیٹا سلیمان بنو ہیر کے زیر سیادت ۴۸۳ھ/۱۰۹۱ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس سال المرابطون نے المریہ پر قبضہ کیا تھا۔ اسی کے ساتھ مرسیہ، جاتوا اور دانیہ چھین لیے اور یہ سارے کے سارے آگے چل کر الموحدون کے زیرِ نگیں آ گئے۔ ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء کے موسم بہار میں الموحدون نے دانیہ کی بندرگاہ میں جنگی جہازوں کا ایک طاقتور دستہ اور بری فوج جمع کر لی۔ یہ فوج میورقہ کے بنو غانیہ پر حملہ کرنے کے لیے راہ میں ابزہ میں ٹھہر گئی اور اسی سال کے ستمبر میں اس نے پلمہ چھین لیا۔ دانیہ پر اس وقت محمد بن اسحٰق حکومت کرتا تھا، جو اپنے باپ اسحٰق بن غانیہ کے بعد میورقہ کے تخت پر بیٹھا تھا، لیکن جسے اس کے بھائیوں نے اس بنا پر تخت سے اتار دیا تھا کہ وہ الموحدون سے ملا ہوا ہے۔ الموحد سلطان المنصور نے اپنی وصیت میں اس کی پر زور سفارش کی تھی۔ ۶۴۱ھ/۱۲۴۴ء میں دانیہ آخر کار ارغون کے جیمز اول نے مسلمانوں سے لے لیا اور اس کے سرداروں میں سے ایک جرمن سردار کاروز Carroz نے اس کے علاقوں کی دوبارہ تقسیم کا بیڑا اٹھایا۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں اسے شہزادۂ پڈرو (Infaonte Don Pedro) کو دے دیا گیا، جس کی نسل کے لوگ گندیا Gandia کے شاہی ڈیوک تھے، جنھوں نے ۱۳۵۹ء سے اس وقت تک یہاں حکومت کی جب کیتھولک بادشاہوں نے اسے ایک "مارکوئیسی" (یا نوابی ریاست) بنا دیا۔ ۱۶۱۰ء میں فلپ سوم نے جب مسیحی موروں کو جلا وطن کر دیا تو اس کی بھی بہت سی آبادی گھٹ گئی اور اس زمانے سے اس کی اہمیت جاتی رہی۔ پھر بھی ہسپانیہ کی جنگ تخت نشینی میں دانیہ، جس کی بندرگاہ قلعہ بند تھی، آرچ ڈیوک کی طرف سے بڑی بے جگری سے لڑا۔ اسے تین مرتبہ فلپ پنجم نے محاصرے میں لیا اور ۱۷۰۸ء میں فتح ہوا۔ ۱۸۱۲-۱۸۱۳ء میں اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ دانیہ کا سب سے مشہور عرب عالم عظیم مفسر قرآن [اور ماہر قرأت] الدانی [رک بآن] ابو عمر عثمان بن سعید الاموی گزرا ہے۔

مآخذ: (۱) Roque Chabas: *Historia de la Ciudad de Denia*، ۲ جلدیں، دانیہ ۱۸۷۴ - ۱۸۷۶ء؛ (۲) Madoz: *Dicc. geog-estadistico-histor.*، ۷ : ۳۷ تا ۴۸؛ (۳) الادریسی: *Desc. de l'Afrique et de l'Espagne*، ص ۱۹۲؛ (۴) یاقوت: معجم البلدان، ۲ : ۵۵۰ (اس میں بندرگاہ دانیہ کو الشّان کہا گیا ہے)؛ (۵) البستانی: دائرۃ المعارف، ۷ : ۵۲۷؛ (۶) مراصد الاطلاع، ۱ : ۴۲۶؛ (۷) ابن الخطیب: اعمال الاعلام، ص ۲۵۰ تا ۲۵۴؛ (۸) *Les "Mémoires" du Roi Ziride Abd Allah*، در *al-And*، ۴/۱ : ۲۴۳ تا ۴۴؛ (۹) عفیف ترک: *El-Reino de Zaragoza en el Siglo XI (V de la hégira)*، تحقیقی مقالہ، ص ۱۳۹ تا ۱۵۹؛ (۱۰) الحُلَل الموشیّۃ، ص ۲۲؛ (۱۱) F. Codera: *Tratado de Numismática arábigo-española*، میڈرڈ ۱۸۷۹ء، ص ۱۴۳ تا ۱۸۱؛ (۱۲) F. Caballero Infante: *Estudio sobre las Monedas Arabes de Denia*، در *EL Archivo*، ج ۳، دانیه ۱۸۸۹ء؛ (۱۳) A. Vives y Escudero: *Monedas de las dinastías arábigo españolas*، میڈرڈ ۱۸۹۳ء، ص ۲۱۲ تا ۲۲۱؛ [(۱۴) Dozy: *Histoire des Musulmans d'Espagne*، ۳ : ۳۸، ۲۰۳؛ (۱۵)

ابن خلدون، مطبوعہ بولاق، ۴ : ۳۶۱]؛ نیز رک بہ مجاہد.

(A. Huici Miranda و C.F. Seybold)

⊗ **داؤد علیہ السلام** : اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبر، جو بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوے اور جن کا ذکر قرآن کریم میں سولہ مقامات پر نو سورتوں میں وارد ہوا ہے (قصص النجار، ص ۳۰۳ و سیوہاروی، ۲ : ۱۵۵)؛ آپ کا سلسلۂ نسب گیارہ پشتوں سے حضرت ابراہیمؑ سے جا ملتا ہے (البدایة والنہایة، ۲ : ۹؛ النجار، ص ۳۰۳ و سیوہاروی، ۲ : ۱۵۴).

بنو اسرائیل کا جو لشکر طالوت کی قیادت میں جالوت کے خلاف برسر پیکار تھا اس میں ایک نوجوان بھی تھا، جو اصل میں باپ کی طرف سے اپنے بھائیوں کی خبرگیری کے لیے آیا تھا مگر جب اس نے جالوت کے مقابلے میں اسرائیلیوں کی پس و پیش کو دیکھا تو طالوت کی اجازت سے اس کے مقابلے میں کود پڑا اور جالوت کو قتل کر ڈالا (۲ [البقرة] : ۲۴۷ تا ۲۵۱؛ نیز قصص النجار، ص ۳۰۵؛ الثعلبی، ص ۲۰۷)۔ یہ جری اور باہمت نوجوان حضرت داؤدؑ ہی تھے۔ بنو اسرائیل میں یہ رسم چلی آتی تھی کہ یہود کے خاندان (سبط) سے نبوت اور افرائیم کے خاندان (سبط) سے سلطنت مختص تھی مگر قتل جالوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو شہرت و عظمت کے ساتھ سلطنت اور حکمت (نبوت) بھی عطا کر دی (۲ [البقرة] : ۲۵۱؛ البدایة والنہایة، ۲ تا ۱۰).

حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو خاص فضل اور انعام فرمایا تھا قرآن مجید نے اس کا خصوصی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا (۳۴ [سبا] : ۱۰) یعنی ہم نے اپنی جانب سے داؤد کو خاص فضیلت دی؛ ان انعامات خاصہ کی قرآن کریم نے تفصیل بھی بیان کی ہے : (۱) اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو ان کا مطیع بنا دیا تھا، جو صبح و شام ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے تھے (۳۴ [سبا] : ۱۰؛ ۳۸ [صٓ] : ۱۷ تا ۱۹)۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولیوں (مَنْطِقَ الطَّیْر) کی تعلیم اور فہم عطا کیا تھا (۲۷ [النمل] : ۱۶)۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے لوہے کو ان کے لیے موم کی طرح نرم کر دیا تھا اور وہ اسے جس طرح چاہتے موڑ لیتے تھے (۳۴ [سبا] : ۱۰؛ البدایة والنہایة، ۲ : ۱۱؛ النجار، ص ۳۰۱)۔ (۴) اللہ تعالیٰ نے انھیں زرہ سازی کا فن عطا کیا جس سے وہ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے تھے، چنانچہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ "انسان کا بہترین رزق وہ ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے اور اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنی روزی کماتے تھے (۲۱ [الانبیاء] : ۸۰؛ ۳۴ [سبا] : ۱۰، البدایة والنہایة، ۲ : ۱۱؛ البخاری، ۲ : ۵)۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر ایک نعمت و احسان کے طور پر یہ ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ "ہم نے انھیں (داؤد کو) تمھارا ایسا لباس تیار کرنے کا فن سکھایا جو تمھیں شدت جنگ کے وقت محفوظ رکھتا ہے (۲۱ [الانبیاء] : ۸۰؛ الکشاف، ۳ : ۱۲۸)۔ اللہ تعالیٰ نے سلطنت داؤدی کی تعریف کرتے ہوے فرمایا ہے : وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ (۳۸ [صٓ] : ۱۹) یعنی ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں خلافت ارضی عطا کر کے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا (۳۸ [صٓ] : ۲۵)؛ چنانچہ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا نے ساری اقوام کے تمام خطوں کی حکومت عطا کی تھی جس میں شام، عراق، فلسطین اور جزیرۂ عرب کے بعض حصے بھی شامل تھے (البدایة والنہایة، ۲ : ۱۲؛ الثعلبی، ص ۲۱۲؛ سیوہاروی، ۲ : ۱۵۷)۔ (۶) خدا نے انھیں حکمت اور فصل الخطاب یعنی منصب نبوت اور خطابت کی فصاحت اور صحیح فیصلے کی قوت بخشی تھی (۳۸ [صٓ] : ۱۹)۔ (۷)

قرآن کریم نے جن کتب سماویہ کا ذکر کیا ہے ان میں زبور بھی ہے، جو اللہ تعالٰی نے داؤد علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی (۴ [النساء] : ۱۶۳ ؛ ۱۷ [بنی اسرآئیل] : ۵۷) اور اسی زبور میں اللہ تعالٰی نے ذکر کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث اس کے نیک بندے ہوں گے (۲۱ [الانبیاء] : ۱۰۵) اور ایک روایت کی رو سے زبور، جو مواعظ و حِکَم کا مجموعہ تھا، رمضان میں نازل ہوئی تھی (البدایۃ والنہایۃ، ۲ : ۱۲)۔ (۸) زہد و عبادت میں اللہ تعالٰی نے انہیں انہماک بخشا تھا، جو انسانیت کے لیے ایک نمونہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ وہ نصف شب تک آرام کرتے، تہائی رات عبادت میں بسر کرتے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے؛ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کے نزدیک پسندیدہ نماز داؤد کی نماز ہے اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ روزہ داؤد کا روزہ ہے (البدایۃ والنہایۃ، ۲ : ۱۰ ؛ الثعلبی، ص ۲۰۲)۔ (۹) حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالٰی نے خوش گلو بنایا تھا، چنانچہ لحن داؤدی ضرب المثل بن چکا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ابو موسٰی اشعری کی شیریں آواز کو سنتے تو فرماتے کہ ابو موسٰی کو اللہ تعالٰی نے لحن داؤدی عطا فرمایا ہے (البدایۃ والنہایۃ، ۲ : ۱۱ ؛ الثعلبی، ص ۲۰۰ ؛ النجار، ص ۳۱۱)۔

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک آزمائش کا بھی ذکر ہے (۳۸ [ص] : ۲۱ تا ۲۶)، جس کے مطابق دو شخص مقدمہ لے کر آئے ایک کی ننانوے دنبیاں تھیں اور دوسرے کی ایک دنبی تھی اور ننانوے والا وہ ایک بھی لینا چاہتا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے مدعی کی بات سنتے ہی فیصلہ سنا دیا اور اس راہبری پر اللہ تعالٰی کے حضور سجدۂ شکر بجا لائے۔ اس سلسلے میں اسرائیلی خرافات کے زیر اثر عورت کا قصہ بیان ہوا ہے، لیکن وہ بہتان ہے؛ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے قائلین کے لیے حد قذف کا اعلان فرمایا تھا (النجار، ص ۳۱۳ ؛ البدایۃ والنہایۃ، ۲ : ۱۳ ببعد ؛ الثعلبی، ص ۲۰۳ ببعد)۔ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی کا ایک سبق آموز واقعہ یوں ذکر کیا ہے کہ ایک روز حضرت داؤدؑ فیصلہ کرنے کے لیے عدالت میں تشریف فرما تھے اور آپؑ کے فرزند حضرت سلیمٰنؑ بھی ان کے پاس موجود تھے، مقدمہ یہ در پیش تھا کہ کسی ریوڑ والے کی بھیڑوں نے رات کو کسی کی پکی ہوئی فصل کھا لی، حضرت داؤدؑ نے فیصلہ دیا کہ کھیت والے کا زبردست نقصان ہوا ہے اس لیے بھیڑیں بطور تاوان اس کے سپرد کر دی جائیں، مگر گیارہ سالہ سلیمٰنؑ نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے فیصلے میں دونوں فریقوں کا خیال رکھیے۔ اس پر داؤدؑ نے کہا کہ تم فیصلہ دو، حضرت سلیمٰنؑ نے کہا کہ بھیڑیں کھیت والے کو دے دی جائیں وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور کھیت بھیڑوں والے کو دیا جائے جو اس پر محنت کر کے اس حالت پر لے آئے جو برباد ہونے کے وقت تھی؛ چنانچہ حضرت داؤدؑ نے اس فیصلے سے اتفاق فرمایا (۲۱ [الانبیاء] : ۷۹)۔ مفسروں نے اس واقعے سے مقدمات پر نظرثانی اور قاضیوں کے آداب کے سلسلے میں کئی ایک مسائل استنباط کیے ہیں (ابن العربی المالکی الاندلسی : احکام القرآن، ص ۱۲۵۴ ؛ الکشاف، ۳ : ۱۲۸ ببعد)۔

مآخذ : (۱) البخاری ؛ (۲) الطبری : تفسیر، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۱ : ۵۵۴ ببعد ؛ (۳) آلوسی : روح المعانی ؛ (۴) الثعلبی : العرائس، قاہرہ ۱۲۹۲ھ ؛ (۵) النجار : قصص الانبیاء، قاہرہ ۱۹۶۸ء ؛ (۶) سیوہاروی : قصص القرآن، دہلی ۱۳۶۲ھ ؛ (۷) نعمۃ اللہ الجزائری : قصص الانبیاء، نجف ۱۹۶۰ء ؛ (۸) المسعودی : مروج الذہب، پیرس ۱۸۶۱ء ؛ (۹) ابن کثیر الدمشقی : البدایۃ والنہایۃ، قاہرہ ۱۹۳۲ء ؛ (۱۰) الزمخشری :

الکشاف، قاہرہ ۱۹۳۶ء؛ (۱۱) ابن العربی المالکی الاندلسی: احکام القرآن، قاہرہ ۱۹۵۸ء؛ (۱۲) مفتاح کنوز السنة، بذیل مادہ؛ (۱۳) القرطبی: الجامع الاحکام القرآن، قاہرہ ۱۹۳۵ء؛ (۱۴) ابوبکر الجصاص: احکام القرآن، قاہرہ ۱۳۳۵ھ۔

(ظہور احمد اظہر)

* **داؤد بن عبداللہ:** بن ادریس الفطانی یا الفطّانی (پٹنی [رک بآں] سے نسبت، جو جزیرہ نمائے ملایا کے شمال مشرق ساحل پر واقع ہے)، ایک ملایاوی مصنف جو تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں مکے میں رہتا تھا۔ یہ سلسلۂ شطاریہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی عوامی کتابیں لکھیں نیز شافعی فقہ، دینیات اور ملفی تصوّف پر مبسوط کتابیں لکھیں۔ یہ تمام تصنیفات عربی سے ملایاوی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور یہ تراجم عبدالصمد الپلمبانی [رک بآں] کے تراجم کی نسبت زیادہ لفظی ہیں، کیونکہ ان کا مقصد ان عوام الناس کو تعلیم دینا ہے جو سہولت اور روانی سے عربی نہیں پڑھ سکتے، مگر عربی زبان کے طرز بیان سے کسی حد تک واقف ہیں۔ اس کی سب سے پہلی تصنیف جس پر تاریخ درج ہے ۱۲۲۴ھ/۱۸۱۰ء میں اور آخری کتاب ۱۸۴۳ء میں مکمل ہوئی۔ اکثر تصنیفات مختلف عربی کتابوں سے مواد اکٹھا کرکے لکھی گئی ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ ایک ہی کتاب کا تتبع کرتا تھا، مثلاً اپنے الغزالی کی منہاج العابدین الی جنة رب العالمین اور البھجة الوردیة فی عقائد اہل الجماعة السنیة، کے ترجمے میں؛ مؤخر الذکر عبدالرحمٰن بن عبدالسلام الصفوری کی شرح بر احمد بن عبدالرحمٰن الجزائری: المنظومة فی التوحید (مکہ ۱۳۳۱ھ؛ اس المنظومة کے سرورق پر غلطی سے اسے ابن الوردی سے منسوب کیا گیا ہے؛ المنظومة کا عربی متن تمام و کمال اس نسخے کے اندر آ گیا ہے) کا ملایاوی ترجمہ ہے۔ دوسری قابل ذکر کتاب کنز المنن علی حکم ابی مدین ہے، جو ابومدین شعیب بن الحسین الاندلسی کے حکیمانہ اقوال کی ایک شرح (مکہ ۱۳۲۸ھ؛ اقوال عربی میں نقل کیے گئے ہیں) کا ترجمہ ہے۔ قانون نکاح پر داؤد پٹنی کا ایک مقبول عام رسالہ سنگاپور میں ۱۲۸۷ھ میں پتھر پر چھاپا گیا اور چند سال بعد اس کے کچھ اور رسالے بمبئی میں چھاپے گئے۔ اس کی بڑی بڑی تصانیف مکے میں ۱۳۰۲ھ کے قریب قریب طبع ہو چکی تھیں اور ۱۳۲۸ھ سے آگے تک اس کے اخلاف نے، جو اس مقدس شہر میں ابھی تک آباد ہیں اس کی کچھ تصانیف دوبارہ طبع کیں اور بعض پہلی مرتبہ چھاپیں۔ داؤد پٹنی کی ملایاوی کتابوں کے مخطوطات کیمبرج (سکاٹ کا ذخیرہ)، جکارتا، لائڈن اور لنڈن (R. A. S) میں موجود ہیں، لیکن ان میں سے کوئی غیر مطبوعہ نہیں ہے۔

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje: *Mekka*، ۲: ۳۸۶؛ (۲) H.H. Juynboll: *Catalogus v. d. Mal. en Sund. hss. der Leidsche Univ. Bibl.*، ص ۲۷۶؛ (۳) Ph. S. van Ronkel: *Catalogus der Mal. hss. in het Museum v. h. Bat. Gen. v. K. en W.*، ص ۳۷۴، ۳۷۸، ۳۸۲، ۳۸۵، ۴۰۱؛ (۴) C.O. Blagden: *List of Malay books*، در *JRAS*، ۱۸۹۹ء، ص ۱۲۵، عدد ۵۰؛ (۵) R. O. Winstedt: *A history of Malay literature*، در *JSBRAS*، ۱۷/۳، ۱۹۴۰ء: ۱۰۴۔

(P. VOORHOEVE)

* **داؤد بن علی بن خلف:** الاصفہانی، ابوسلیمان، فرقۂ ظاہریہ [رک بآں]، جسے داؤدیہ بھی کہا جاتا ہے) کا امام فقہ۔ یہ اس گروہ کا انتہا پسند نمائندہ ہے جو عقل و استدلال کو بالکل چھوڑ کر فقط ظاہر قرآن مجید اور حدیث پر اعتماد کرتا ہے۔ داؤد نے ذاتی رائے ہی کا انکار نہیں کیا، جیسے الشافعی [رک بآں] نے کیا تھا، بلکہ جہاں تک اس کا بس چلا، باقاعدہ تمثیلی استدلال (قیاس) کو بھی، جسے الشافعی نے قبول کیا تھا اور

اس کے قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی تھی، رد کر دیا اور اپنا مسلک یہ مقرر کیا کہ قرآن حکیم اور حدیث کے صرف ظاہری یا لغوی معنی لینے چاہییں؛ اس نے اجماع کے تصور کو بھی صحابہؓ کے اتفاق رائے تک محدود کر دیا اور کسی ایک ہی امام کی تقلید کو بھی، جو دیگر مذاہب فقہ میں ان دنوں عام ہو گئی تھی، رد کر دیا۔ ان تمام امور میں اس کا مسلک امام الشافعی اور ان کے مذہب فقہ کے صرف ایک پہلو کو اتمام و اکمال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

داؤد کا گھرانا اصفہان کے قریب کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتا تھا؛ وہ ۲۰۰-۲۰۲ھ/۸۱۵-۸۱۸ء میں کوفے میں پیدا ہوا۔ اس نے بصرے، بغداد اور نیشاپور کے مشہور اساتذہ سے حدیث پڑھی اور اس کے بعد بغداد میں سکونت اختیار کر لی، جہاں معلّم اور مفتی کی حیثیت سے اس کی بڑی قدر کی جانے لگی۔ اس کے تذکرہ نویس اس کے زہد و تقوٰی اور عجز و انکسار کی بڑی مدح کرتے ہیں، خاص فقہ میں اس کے اساتذہ کے نام معلوم نہیں۔ اس کا باپ حنفی تھا اور خود اسے امام الشافعیؒ کا ایک "متعصب" مقلّد قرار دیا گیا ہے اور یہ تعریف اس کے اپنے مسلک کی ابتدا اور اس کے بعد کے ارتقا دونوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ مذہب شافعی کے علما کے تذکروں میں اسے ایک معزز مقام حاصل ہے۔

دینیات میں اس کی یہ رائے بیان کی جاتی ہے کہ قرآن مجید، جو لوح محفوظ کے اندر موجود ہے، غیر مخلوق ہے باستثنا ان نقول کے جو وقتاً فوقتاً معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ امام احمدؒ بن حنبل نے اسی بنا پر اس سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔

داؤد متعدد رسائل کا مصنف ہے (اس کی تصنیفات کی کم و بیش ہم عصر فہرست کتاب الفہرست میں دیکھیے)، جن میں سے بعض تو بہت ہی طویل تھے (جن کے ورق تین ہزار تک ہیں)۔ ان میں اصول شرح اور قانون موضوع کے تمام شعبے (فروع) درج ہیں۔ ان میں سے کوئی کتاب باقی نہیں رہی۔ اب ان کے عقیدے کی تفصیلی توضیحات ہمیں صرف متاخرین کی تصنیفات ہی میں مل سکتی ہیں (مثلاً السبکی اور خصوصیت کے ساتھ امام ابن حزم [رک باں] اور "اختلاف" پر لکھی گئی بعض کتب میں)، لیکن یہ مصنفین داود اور اس کے اتباع کی رائے میں ہر جگہ امتیاز نہیں کرتے۔ ایک حنبلی مصنف محمد الشطّی (۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹-۱۸۹۰ء) نے دمشق کے مفتی محمود بن حمزہ الافندی الحمزاوی [م ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷-۱۸۸۸ء] کے ایما پر ان میں سے بہت سی آرا کو ایک جگہ جمع کیا اور ان کا موازنہ مشابہ حنبلی عقائد کے ساتھ کیا ہے (رسالة فی مسائل الامام داؤد الظاهری، دمشق ۱۳۳۰ھ)۔ مرور زمانہ سے ظاہریہ مکتب فکر نابود ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ اجماع علما تعین کا کرتے وقت ظاہریہ فرقے اور ان کے امام داؤد کی آرا کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا، اگرچہ بعض علمائے شافعیہ، کم از کم نظریاتی اعتبار سے، ان کی بابت زیادہ مصالحانہ رائے رکھتے ہیں (دیکھیے النووی اور زیادہ تفصیل کے لیے السبکی)۔ داؤد کا انتقال بغداد میں ۲۷۰ھ/۸۸۴ء میں ہوا اور وہیں اسے دفن کیا گیا۔ اس کا بیٹا محمد بن داؤد [رک باں] ایک مشہور ادیب تھا۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ۱ : ۲۱۶ ببعد؛ (۲) تاریخ بغداد، ج ۸، عدد ۴۴۷۳؛ (۳) السمعانی، بذیل مادۂ الظاهری؛ (۴) ابن الجوزی: المنتظم، ۵/۲، عدد ۱۶۴؛ (۵) النووی: *Biographical Dictionary*، طبع وسٹنفیلٹ، ص ۲۳۶ ببعد؛ (۶) ابن خلّکان، بذیل مادّہ؛ (۷) الیافعی: مرآة الجنان، ۲ : ۱۸۴ ببعد؛ (۸) السبکی: طبقات الشافعیة، ۲ : ۴۲ ببعد؛ (۹) وسٹنفیلٹ: *Der Imām el. Schāfi'i*، عدد ۶۴؛ (۱۰) ابن کثیر: البداية و النهاية، ۱۱ : ۴۷

بعد (سال ۲۷۰)؛ (۱۱) ابن العماد: شذرات الذہب، ۲: ۱۵۸ ببعد؛ (۱۲) ابن تغری بردی، قاہرہ، ۳: ۴۷ ببعد (سال ۲۷۰)؛ (۱۳) Goldziher: *Die Zâhiriten*، ص ۲۷ ببعد اور بمواضع کثیرہ (بنیادی تصنیف)؛ (۱۴) براکلمان، ۱: ۱۹۳ ببعد؛ (۱۵) وہی مصنف: تکملہ، ۱: ۳۱۲؛ (۱۶) Schacht: *Esquisse*، ص ۶۵ ببعد.

(J. Schacht)

* **داؤد انطاکی**: رک بہ الانطاکی.

* **داؤد پاشا**: (۱۱۸۱ھ/۱۷۶۷ء تا ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء)، ترکی عراق کا آخری مملوک حکمران؛ سلیمان پاشا (اعظم) نے بغداد میں ایک گرجستانی غلام لڑکے کی حیثیت میں حاصل کیا۔ سلیمان پاشا کی بیٹی سے اس کی شادی، نیز اس کے حسن و جمال، علم و فضل اور نمائشی اتقا نے اس کے سرپرست کے تحت سرکاری ملازمت میں معتمد صیغۂ راز، خزانہ دار، دفتر دار اور انجام کار "کہیہ" کی حیثیت سے اس کی ترقی درجات میں مدد دی۔ زمانہ سازی، تشدد اور مختلف قوتوں، کردوں، مملوکوں، دربار، عوام اور قبائل میں ماہرانہ توازن کے قیام سے پچاس سالہ داؤد نے ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں منصب پاشائی کو اپنے لیے حاصل کر لیا اور اسے اپنے پیشرو (سعید پاشا) کے قتل اور بروقت فیاضی سے یقینی بنا لیا۔ اس نے پندرہ برس حکومت کی۔ اس نے ایک مضبوط قبائلی حکمت عملی اختیار کی، اچھا خاصا نظم و ضبط قائم رکھا، بدنام فتنہ پرور یزیدیوں اور صحرائی عنزہ کی گوشمالی کی، کرد رؤسا کے لامتناہی مناقشات اور دھمکیوں پر نظر رکھی اور ایک خطرناک ایرانی حملے (۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) کو روکنے کی تدبیر کی۔ اس نے استانبول کے احکام کے تحت بغداد میں ینی چری سپاہ کو توڑ دیا اور نئی قسم کی رجمنٹیں بنائیں، انھیں مسلح کیا، اور وقفوں وقفوں پر بہت چوکسی سے بڑی آزادی سے تجارت اور بیوپار میں یورپ کے طریقوں کو نمایاں طور پر ابھرنے کا موقع دیا۔ اس نے رفاہ عامّہ کی بہت سی تعمیرات کرائیں اور دربار و مصاحبین کو بڑے تزک و احتشام سے رکھا۔ حکومت ترکیہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کا زوال (۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء) ناگزیر تھا۔ اس کا زوال فوری طور پر اس لیے ہوا کہ اس نے حکام استانبول کی پے بہ پے حکم عدولی کی۔ ان کا قاصد (جو والی کی حیثیت سے اس کا جانشین ہوا)، بغداد میں ایک تباہ کن سیلاب کے آنے اور لرزہ خیز طاعون کے پھوٹ پڑنے سے اسے بے دخل کرنے اور اس کی جگہ لینے میں کامیاب ہوا۔ داؤد کے گرفتار اور اسیر ہو جانے کے باوجود اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ اسے یورپ اور ایشیا دونوں میں دوبارہ ترقی دے کر اہم عہدوں پر مامور کیا گیا۔ وہ سلطان کا بہت منظور نظر ہو گیا اور ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں مدینۂ منورہ میں روضۃ المبارک کا محافظ مقرر ہوا۔ وہ غیر معمولی نشیب و فراز کی زندگی گزارنے کے بعد ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء میں انتقال کر گیا۔

مآخذ: (۱) S H. Lougrigg: *Four Centuries of Modern Iraq*، آکسفرڈ ۱۹۲۵ء، ص ۲۲۳ تا ۲۴۷، ماخذ پر اضافیہ (۳۲۵ ببعد) عربی اور ترکی ماخذ (جزوی طور پر بشکل مخطوطہ) اور یورپی سیاحوں کے لیے مخصوص ہے؛ (۲) C. Huart: *Histoire de Bagdad dans les Temps Modernes*، پیرس ۱۹۰۱ء۔

(S. H. Longrigg)

* **داؤد پاشا**: کوہ لبنان کا پہلا عثمانی "متصرف" (گورنر) (۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۸ء)۔ وہ ارمنی کیتھولک تھا۔ مارچ ۱۸۱۶ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال ایک فرانسیسی خاندان کے ساتھ غلطہ Galata میں گزارے۔ بعد میں اس نے ایک انگریز خاتون سے شادی کر لی، لیکن "متصرف" ہونے سے پہلے اسے چھوڑ دیا۔ اس کی عوامی زندگی کا

آغاز برلن کے عثمانی سفارت خانے سے وابستہ ہونے سے ہوا، اس کے بعد اس نے وی انا میں عثمانی قونصل جنرل کی حیثیت سے کام کیا۔ جب اسے پھر قسطنطینیہ میں تبدیل کر دیا گیا تو وہ وزارت داخلہ میں مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ سرکاری مطبوعات کا نگران اور اگلے ہی سال دفتر ٹیلیگراف کا مہتمم مقرر ہوا، جہاں اس نے متعدد اصلاحات کیں۔ اسی سال اس نے وزیر خارجہ فواد پاشا کی غیر ملکی قرضے کے لیے درخواست گزاری میں مدد کی۔ آخر میں باب عالی نے دول یورپ کی رضامندی سے اُسے کوہ لبنان کا متصرّف مقرر کیا۔ آسے بیروت میں وزارت کے منصب پر بھیجا گیا۔ اس نے اپنا صدر مقام دیرالقمر کو بنایا، اور نئے نظم و نسق کی اس انداز سے تنظیم کی جو تمام متعلقہ گروہوں کے لیے قابل اطمینان تھا۔ دیگر امور کے علاوہ اس نے کوہ لبنان کے جندارمہ کی تنظیم کی، سڑکیں اور پُل بنوائے، متعدد مدارس قائم کیے اور اس کی دانشمندانہ حکومت نے جلد ہی لبنان میں امن و امان، نظم و ضبط اور خیر سگالی کو بحال کر دیا۔ پہلے وہ تین برس کے لیے گورنر مقرر ہوا تھا، لیکن بعد میں اس کی میعاد میں مزید پانچ برس کی توسیع کی گئی۔ تاہم اپنے عہدے کی دوسری میعاد میں اسے کوہستانی علاقے کے بعض روایتی رہنماؤں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، جس کی بنا پر اسے ۱۸۶۸ء میں اپنی میعاد سے قبل مستعفی ہونے کا مشورہ دیا گیا۔ بعد ازاں اس نے تعمیرات عامّہ کے وزیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں اور اسے قرضے کی گفت و شنید کے لیے یورپ بھیجا گیا۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر باب عالی اس سے ناراض ہو گیا اور اس نے یورپ ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ اس کا ۹ نومبر ۱۸۷۳ء، یا سجل عثمانی کی رو سے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں بمقام بائیارٹیس Biarritz انتقال ہوا۔

داؤد پاشا کے متعلق اس کے ایک معصر نے لکھا ہے کہ وہ ایک قابل مدبر اور منتظم، ایک اچھا ماہر لسانیات اور علم کا دلدادہ تھا؛ اس کے علاوہ وہ برلن کی سائنس اکادمی کا بھی رکن تھا۔

مآخذ: (۱) بطرس البستانی: کتاب دائرة المعارف، ج ۷، بیروت ۱۸۸۳ء، ص ۵۲۶ تا ۵۲۷؛ (۲) شیخ سامی فرشری: قاموس الاعلام، ج ۳، استانبول ۱۳۰۸ھ، ص ۲۱۱۱؛ (۳) سجل عثمانی، ۲: ۳۷۸؛ (۴) Jouplain: *La Question du Liban*، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۳۸۳؛ (۵) G. Vapereau: *Dictionnaire universel des contemporains*، پیرس ۱۸۸۰ء، ص ۵۰۷۔

(K.S. SALIBI)

داؤد پاشا: قوجہ، درویش، متوفی ۹۰۳ھ/۱۴۹۸ء عثمانی صدر اعظم۔ وہ البانیہ کا باشندہ تھا۔ دیوشرمہ کے ذریعے محلاتی مدرسے میں آیا۔ ۸۷۶ھ/۱۴۷۲ء میں، اندلو کے بیلربے کی حیثیت سے وہ شہزادہ مصطفی والی قونیہ کے تحت آق قویونلو یوسف مرزا کے خلاف لڑا۔ ۸۷۸ھ/۱۴۷۳ء میں اتلک بلی Otluk-beli کے مقام پر اوزون حسن [رک بان] کے خلاف لڑائی میں ہراول دستے کی کمان اس کے ہاتھ تھی۔ اس نے ۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء کی مہم بغدان Boghdan میں اور البانیہ میں فوجی کارروائیوں میں، نیز اشکدرہ Ishkodra کے محاصرے (۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء) میں روم ایلی کے بیلربے کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ بایزید دوم کی تخت نشینی کے بعد وہ وزیر مقرر ہوا اور کچھ عرصے کے بعد ۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء میں صدر اعظم اسحٰق پاشا کا جانشین ہوا اور پندرہ برس تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس دوران میں وہ صرف دو مہموں پر گیا: ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں مملوکوں کے خلاف فوجی کارروائیوں میں، اس نے ادانہ Adana اور ترسوس Tarsus پر دوبارہ قبضہ کر لیا، وارساقوں کو مطیع کیا؛ اور ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء کی مہم البانیہ میں Tepedelen کو سر کیا اور البانیہ کی

فوجوں کو شکست دی (گو ایک مأخذ کی رو سے وہ شمال کی جانب سے ھنگری والوں کے اگلے حملے کے خلاف حفاظت کی خاطر اُسکُب Üsküb ھی میں رھا)۔ اسے ۴ رجب ۹۰۲ھ/ ۸ مارچ ۱۴۹۷ء کو صدارت عظمٰی سے برطرف کیا گیا اور دِیمیتقه میں رہنے کا حکم دیا گیا (اس کا سالانه وظیفه ۴ لاکھ اقچه مقرر ھوا)۔ اس کی معزولی کی وجه یه تھی که محمد دوم کے پوتے اق قویونلو گودہ احمد بیے کے تبریز کی طرف فرار کو داؤد پاشا کی غفلت پر محمول کیا گیا۔ ۲ سال بعد ۴ ربیع الاول ۹۰۴ھ/ ۲۰ اکتوبر ۱۴۹۸ء کو اس کا انتقال ھوا اور اسے استانبول میں اس کی بنائی ھوئی مسجد کی محراب کے سامنے "تربة" میں دفن کیا گیا۔

بیان کیا جاتا ھے که وہ ایک قابل اور راست باز، مدبّر اور علم کا مربّی تھا۔ خارجی حکمت عملی میں وہ وینس کی حمایت کرتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے متموّل ترین مدبّروں میں سے تھا: "رسم قسمت" جو اس کی جاگیر پر "قاضی عسکر" کو واجب الادا تھی، ۲۰ لاکھ اقچه سے کم نه تھی۔ اس نے ایک محلّے میں، جو اس کے نام پر ھے، ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ یه اب تک موجود ھے، اس کے ساتھ اس نے ایک عمارت، ایک چشمه، ایک مکتب اور ایک مدرسه بھی بنوایا تھا۔ اس کے نام کا ایک "اِسکِلِ" اور ایک قصر بھی ھے۔ داؤد پاشا صحراسی، جس پر اب داؤد پاشا کی بارکیں کھڑی ھیں، صدیوں تک عثمانی فوج کا ایک مشہور پڑاؤ رھا۔ اس کے بیٹوں مصطفٰی پاشا اور محمد بیگ کا ذکر مأخذ میں کیا گیا ھے۔

مآخذ: (۱) IA، بذیل مادّہ (از I.H. Uzunçarşılı)؛ (۲) Hammer-Purgstall، GOR، ۲: ۳۰۹ ببعد و اشاریه؛ (۳) Leunclavius: Hist.، ص ۶۳۴ ببعد؛ (۴) Kantemir: Gesch. d. Osm. Reiches، ص ۳۲۸؛ (۵) الشقائق النعمانیه، حدیقة الوزراء، حدیقة الجوامع (بذیل مادہ ھا)؛ (۶) اس کے اوقاف کے لیے T. Gökbilgin: *Edirne ve Pasa Livasi*، استانبول ۱۹۵۲ء، بمدد اشاریه۔

(M. Tayyib Gökbilgin)

* داؤد پاشا، قرا (؟ — ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء)

عثمانی صدر اعظم۔ اس کا سال پیدائش غیر یقینی ھے، لیکن ۱۶۱۲ء میں حاکمیه کو جو "کیفیت نامه" پیش کیا گیا، اس میں Simone Contarini نے، جو استانبول میں وینس کا سیاسی وکیل رہ چکا تھا، ایک داؤد پاشا کا ذکر کیا ھے۔ اسے وہ کروئیشیائی Croat نسل کا بتاتا ھے، نیز یه که اس وقت اس کی عمر تقریباً ۴۶ برس تھی۔ لیکن عثمانی مأخذوں کے مطابق قرا داؤد پاشا بوزنیائی Bosnian نسل سے تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت محلّاتی مدارس میں ھوئی تھی، فارغ التحصیل ھو کر عہدۂ "چقدار" (چُوقدار) پر فائز ھوا تھا۔ سلطان محمد سوم (۱۰۰۳ تا ۱۰۱۲ھ/ ۱۵۹۵ تا ۱۶۰۳ء) کے عہد حکومت میں قپیجی باشی مقرر ھوا اور بعد ازاں سلطان احمد (۱۰۱۲ تا ۱۰۲۶ھ/ ۱۶۰۳ تا ۱۶۱۷ء) کے عہد میں وہ ۱۰۱۳ھ/ ۱۶۰۴ء میں رومؔ ایلی کا بیگلر بیگ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد داؤد پاشا نے ایشیائے کوچک میں جلالی [رک بآں] باغیوں کے خلاف، نیز ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء میں ایران کے صفویوں کے خلاف اریوان کی مہم میں خدمات سرانجام دیں۔ اس نے سلطان مصطفٰی اول (۱۰۲۶ تا ۱۰۲۷ھ/ ۱۶۱۷ تا ۱۶۱۸ء) کے پہلے دور حکومت میں تھوڑے سے عرصے کے لیے قپودان پاشا [رک بآں] کا عہدہ سنبھالا اور ۱۰۳۰ھ/ ۱۶۲۱ء میں پولستانیوں کے خلاف Choczim (خوتین) کی مہم میں وہ سلطان دوم (۱۰۲۷ تا ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۱۸ تا ۱۶۲۲ء) کا ھم رکاب رھا۔ داؤد پاشا کی شادی سلطان مصطفٰی کی سگی بہن سے ھوئی۔ ماہ پیکر والدۂ سلطان (یعنی مصطفٰی اول کی والدہ) نے جب اس کا بیٹا مصطفٰی دوسری مرتبه سلطان بنا (۱۰۳۱ تا ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۲ تا ۱۶۲۳ء)، اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر داؤد پاشا کو بتاریخ ۹ رجب ۱۰۳۱ھ/ ۲۰ مئی ۱۶۲۲ء صدارت عظمٰی کے

بلند رتبے پر پہنچا دیا۔ داؤد پاشا نے سلطان عثمان دوم کو، جو اسی وقت تخت سے معزول ہوا تھا، فوراً قتل کرا دیا۔ ۴ شعبان ۱۰۳۱ھ/۱۳ جون ۱۶۲۲ء کو داؤد پاشا صدر اعظم کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ باب عالی میں سیاسی دھڑوں کی مناقشت کی وجہ سے آخرکار خود اسے ربیع الاول ۱۰۳۲ھ/جنوری ۱۶۲۳ء میں موت کی سزا دی گئی اور وہ استانبول میں مسجد مراد پاشا میں دفن ہوا۔

مآخذ: (۱) پچوی: تاریخ، ج ۲، استانبول ۱۲۸۳ھ، ص ۳۸۶ ببعد بمواضع کثیرہ؛ (۲) حاجی خلیفہ: فذلکہ، ج ۲، استانبول ۱۲۸۷ھ، ص ۱۹ ببعد، بمواضع کثیرہ، ص ۳۲ تا ۳۴، ۳۶؛ (۳) نعیما: تاریخ، ج ۲، استانبول ۱۲۸۳ھ، ص ۲۲۳ ببعد، بمواضع کثیرہ، ۲۳۵ ببعد، بمواضع کثیرہ، ۲۳۸ تا ۲۵۲؛ (۴) *Ambassade en Turquie de Jean de Gontaut Biron, Baron de Salignac 1605-1610. Correspondance Diplomatique et Documents Inédits*، طبع Comte Théodore de Gontaut Biron، در *Archives Historiques de la Gascogne*، کراسہ ۱۹، پیرس ۱۸۸۹ء، ص ۹، ۱۱، ۱۸۶؛ (۵) R. Knolles: *The Generall Historie of the Turkes ---- Together with the Lives and Conquests of the Othoman Kings and Emperours*، لنڈن ۱۶۳۹ء؛ *A Continuation of the Turkish History from ---- 1620 until --- 1628. Collected out of the Papers and Dispatches of sir Thomas Rowe*، ص ۱۴۰۸، ۱۴۱۲، ۱۴۱۷ تا ۱۴۱۸؛ (۶) S. Purchas: *Purchas His Pilgrimes*، ج ۸، گلاسگو ۱۹۰۵ء، ص ۳۳۳ تا ۳۵۹، بمواضع کثیرہ ("The Death of Sultan Osman")؛ (۷) *The Negotiations of Sir Thomas Rowe in his Embassy to the Ottoman Porte from the Year 1621 to 1628 inclusive*، طبع رچرڈسن (S. Richardson)، لنڈن ۱۷۴۰ء، ص ۳۲، ۳۷، ۵۱، ۱۲۵ تا ۱۲۶؛ (۸) A. Galland: *La Mort du Sultan Osman, ou le Retablissement de Mustapha sur le Throsne, traduit d'un Manuscrit Turc ----*، پیرس ۱۶۷۸ء، ص ۱۰۳ تا ۱۳۵، ۱۶۶، ۱۶۹، ۱۷۱ تا ۱۷۲، ۱۹۳ تا ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۹، ۲۰۱ تا ۲۰۲؛ (۹) M. Steinschneider: *Die Geschichtsliteratur der Juden*، ج ۱، فرانکفرٹ ۱۹۰۵ء، فصل ۱۰۹؛ (۱۰) M.A. Danon: *Contributions à l'histoire des Sultans Osman II et Mouçtafâ I*، در *JA*، onz. sér، ج ۱۳، پیرس ۱۹۱۹ء، ص ۹۹ ببعد و ۲۴۳ ببعد، بمواضع کثیرہ؛ (۱۱) *Le Relazioni degli Stati Europei lette al Senato dagli Ambasciatori Veneziani nel secolo decimosettimo*، طبع N. Barozzi و G. Berchet، سلسلہ V: *Turchia*، ج ۱، وینس ۱۸۶۶ء، ص ۱۳۲ (*Relazione di Simon Contarini ...*، ۱۶۱۲) و ۲۹۳ (Relazione ... del Bailo Cristoforo Valier، ۱۶۱۶)؛ (۱۲) E. de Hurmuzaki: *Documente privitōre la Istoria Românilor*، تکملہ ۱/۱، بخارسٹ ۱۸۸۶ء، ص ۱۹۷ ببعد و ۲۰۰ ببعد؛ (۱۳) Hammer Purgstall، ۳: ۵۳۹، ۵۵۱ ببعد، ۵۵۸ تا ۵۵۹، ۵۷۱ ببعد؛ (۱۴) Zinkeisen، ۳: ۷۳۹، ۷۵۰، ۷۵۳، ۷۶۰؛ (۱۵) N. Jorga: *Geschichte des osmanischen Reiches*، ج ۳، Gotha ۱۹۱۰ء، ص ۳۳۵ ببعد؛ (۱۶) I. H. Uzunçarşılı: عثمانلی تاریخی، ۳/۲، انقرہ ۱۹۵۴ء، ص ۳۷۵ تا ۳۷۹؛ (۱۷) عثمان زادہ احمد تائب: حدیقة الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۶۷ ببعد؛ (۱۸) حسین بن اسمعیل: حدیقة الجوامع، استانبول ۱۲۸۱ھ، ۱: ۲۰۳؛ (۱۹) قاموس الاعلام، ج ۳، استانبول ۱۳۰۸ھ، ص ۲۱۱۰ تا ۲۱۱۱؛ (۲۰) سجل عثمانی، ۲: ۳۲۵؛ (۲۱) *IA*، بذیل مادۂ داؤد پاشا.

(V. J. PARRY)

داؤد پوترے: اس قبیلے کی ایک حریف شاخ ہیں جس سے کلھوڑے بھی، جو کسی وقت سابق

سندھ کے حکمران تھے، تعلق رکھتے ہیں۔ داؤد پوترے اور کلہوڑے دونوں اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ ابوالفضل العبّاس بن عبدالمطلّب کی نسل سے ہیں۔ بہاول پور کی سابق ریاست، جو اب مغربی پاکستان میں مدغم ہو گئی ہے، کے حکمران داؤد پوتروں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے ہم جد کلہوڑوں کے برعکس اپنے آپ کو عباسی کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ نجابت اور عالی نسبی کے متعلق ان کا دعوی معتبر ماخذوں سے حاصل شدہ ناقابل تردید معلومات کے بجائے محض روایت پر مبنی معلوم ہوتا ہے، جس کو حکمرانی اور اقتدار کی طویل مدت سے تقویت حاصل ہوئی ہے۔

وہ شجرہ ہائے نسب جو بعض مقامی فارسی تاریخوں مثلاً مرآۃ دولت عباسیہ اور جواہر عباسیہ میں مندرج ہیں، ناقص ہیں اور ان کے بغور معائنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی احکام پر عجلت سے تالیف کیے گئے ہیں۔ تاہم مآثر الامراء (۱ : ۸۲۵) ایسی زیادہ قدیم اور مستند تصانیف میں بعض حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ داؤد پوترے اور کلہوڑے دونوں عام طور پر العبّاس [رکّ بآں] کی نسل سمجھے جاتے تھے۔

کلہوڑوں اور داؤد پوتروں کا مشترک جد امجد، جس کے متعلق تاریخ کو کچھ علم ہے، محمد چنّے خان خیال کیا جاتا ہے (اس کی مختلف شکلیں یہ ہیں، چینے خان، چینا خان، چنّی خان، چیہنہ عرف چینہ خان)۔ اس کے باپ قائم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ غزنویوں کی برّصغیر پاک و ہند میں آمد سے بہت پہلے ۲۵۹ھ/۸۷۳ء کے قریب ایران سے کچھ مکران کے راستے سندھ میں ہجرت کر آیا تھا۔ لیکن یہ سنہ مشکوک بھی ہے اور غیر اغلب بھی۔ بیشتر تصانیف میں قائم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کے بجائے میاں اُڈہالا نامی ایک شخص کا ذکر ملتا ہے جس کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس نے ایک شیخ کی زندگی گزاری اور اس کے بہت مرید تھے۔ اس کی پانچویں پشت میں کوئی تھل خان (فتح اللہ خان؟) تھا، جس کا لڑکا بھلاّ خان (بہاء اللہ خان) چنّے خان کا باپ تھا۔ چنّے خان کے بعد اس کے بیٹے محمد مہدی اور داؤد خان اس کی جگہ قبیلے کے سردار بنے۔ مؤخرالذکر کو قرآن مجید کا ایک نسخہ، تسبیح اور مصلّٰی، جو اس کے باپ کی ملکیت تھا، ورثے میں ملا اور خاندانی تلوار اور باپ کا عمامہ محمد مہدی کے حصے میں آیا۔ محمد مہدی کی اولاد اس کے بیٹے ابراہیم عرف کلہوڑے خان کے نام پر کلہوڑا کہلانے لگی۔

خاندانی مناقشات کا نتیجہ یہ ہوا کہ داؤد خان اوّل اس جگہ کو خیر باد کہنے اور دوسری جگہ منتقل ہونے پر مجبور ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس نے شہر وانجی، جس کے آثار اب نہیں ملتے، ایک نئی بستی بسائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمود خان اور پوتا محمد خان قبیلے کے سردار ہوئے۔ جب محمد خان کے بیٹے داؤد خان ثانی کی سرداری کے زمانے میں قبیلے کی تعداد بہت بڑھ گئی تو وہ اپنے علاقے کو وسیع کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ اس داؤد خان ثانی کی اولاد اور متعلّقین کو داؤد پوترا کہنے لگے، بلا لحاظ اس امر کے کہ آیا وہ اس کی نسل سے تھے یا اس سے محض روحانی یا دنیوی تعلق رکھتے تھے۔ اس سے اس امر کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کیوں خالص سندھی اصل کے بعض خاندان جو زیادہ تر کپڑا بننے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور مغربی پاکستان کے اضلاع شکارپور اور داؤد میں رہتے ہیں، ابھی تک فخر سے اپنے آپ کو داؤد پوترا کہتے ہیں۔ بعض غیر ملکی مصنفین (مثلاً *A History of Scinde* : R. F. Burton، لنڈن ۱۸۵۰ء، ص ۴۱۰) کو، جو داؤد پوتروں کے حسب نسب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے تھے، یہ یقین ہو گیا کہ داؤد پوترے بحیثیت قبیلہ مقامی اصل کے اور پیشے کے لحاظ سے جلاہے تھے۔ جو لوگ داؤد خان ثانی کے

خاندان یا برادری سے تعلق نہیں رکھتے تھے، انھیں برابر کے افراد تسلیم کرکے داؤد پوتروں نے خاندان یا برادری میں آزاد شدہ غلاموں (موالی) کو شامل کر لینے کے دیرینہ عرب رواج کو از سر نو زندہ کیا ۔ چونکہ ان میں عربوں کے اس رواج کا عام ہونا بھی اُن کے عرب نسل و نژاد سے تعلق رکھنے کے دعوے کی تائید کرتا ہے ۔

داؤد خان ثانی کے جانشین آٹھ سردار ہوئے، جن میں سے فقط بہادر خان ثانی قابل ذکر ہے ۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ۱۰۲۹ھ/۱۶۱۷ء میں شہر شکار پور کی بنیاد رکھی تھی ۔ ان تمام داؤد پوترا سرداروں کی تاریخہائے ولادت و وفات جو بانی خانوادۂ بہاولپور صادق محمد خان اول (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء تا ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء) ، [رک باں] کے پیش رو تھے، عملاً نا معلوم ہیں، ان میں سے کوئی بھی اتنا اہم نہ تھا کہ تاریخ میں اس کا حال قلمبند کیا جاتا ۔

ایک داؤد پوترا سردار مبارک خان اول نے مغل شہزادہ معزالدین کی، جو اورنگ زیب عالم گیر کا پوتا اور اس وقت ملتان [رک باں] اور لاہور [رک باں] کا صوبے دار تھا، ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں ڈیرہ غازی خان کے ایک طاقتور بلوچ قبیلے میرانی کی بغاوت کو کچلنے میں مدد کی ۔ اس عسکری امداد کے صلے میں شکار پور، بختیار پور اور خان پور کے شہر اُسے جاگیر میں عطا ہوئے ۔ اس کے بعد شکار پور کا شہر اس کے خانوادے کا صدر مقام قرار پایا ۔ اس کا بیشتر وقت اپنے حریف کلہوڑا سردار یار محمد خان عرف خدا یار خان کے خلاف برادر کُشی کی لڑائیوں میں گزرا ۔ ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں فریقین کا بھاری نقصان ہوا ۔ اُس زمانے کے احوال سے ظاہر ہے کہ داؤد پوتروں کا شدید نقصان ہوا اور انہیں صلح کی درخواست کرنی پڑی ۔ یہ محض دھڑا بندی اور ایک خاندانی چپقلش تھی جس نے واقعات کی آئندہ راہ کو متعین کیا ۔ ان حریف گروہوں کے درمیان بعد کے تصادمات سے اس لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کے جداگانہ حلقہ‌ہائے اثر و اختیار میں علٰحدگی اور حد بندی عمل میں آئی ۔

داؤد پوترے آخری مرحلے میں کامیاب رہے، کیونکہ وہ بڑی دشواری سے فتح کیے ہوئے مقبوضات کو محفوظ اور منظم و مستحکم بنانے کے اہل تھے، جبکہ ان کے حریف کلہوڑوں کو تالپوروں نے باہر نکال دیا جو خود انگریزوں کے مطیع ہو گئے، جب مؤخرالذکر نے ۱۸۴۳ء میں پنجاب کے الحاق اور چند روزہ سکھ حکومت کے سقوط سے سات برس پہلے سندھ پر قبضہ کیا ۔ مبارک خان اول ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء میں اپنے بیٹے صادق محمد خان عبّاسی اوّل کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا اور تین برس بعد ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا ۔ صادق محمد خان ایک اولوالعزم حکمران تھا، چنانچہ اس نے سب سے پہلے اُچ [رک باں] کا اور اس کے بعد مغل صوبۂ ملتان کے ایک حصے اور قلعہ ڈیراور کا الحاق کیا ۔ یہ قلعہ اس نے جیسلمیر کے راول اکھی (؟) سنگھ سے چھینا تھا، جس کے اجداد اس پر مدتوں قابض رہ چکے تھے ۔ ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ افشار نے ہندوستان پر حملہ کیا تو صادق محمد خان اول ڈیرہ غازی خان جا کر اس کی خدمت میں باریاب ہوا اور نواب کا خطاب حاصل کیا ۔ ان مقبوضات کے علاوہ جو اس نے بزور شمشیر حاصل کیے تھے، اسے سیوستان اور لاڑکانہ کے پرگنے عطا کیے گئے ۔

۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں شکار پور پر، جو اس کا آبائی وطن تھا، اس کے حریف کلہوڑا سردار خدا یار خان نے حملہ کیا ۔ صادق محمد خان کو مقابلے میں جان سے ہاتھ دھونے پڑے اور محمد بہاول خان اول اس کا جانشین ہوا ۔ اس نے اگلے ہی سال بہاول پور سمیت کئی شہروں کی بنیاد رکھی ۔ اس شہر سے آخرکار یہ ریاست

موسوم ہوئی۔ بہاول خان اول ہی کے عہد میں ریاست عزت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی اور اس کے سیاسی مرتبے میں اضافہ ہوا۔ اس نے آبپاشی کے لیے جو نہریں کھدوائیں، ان سے ریاست بہاول پور کے خشک علاقوں میں خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس اثنا میں داؤد پوتروں کی قوت بدستور بڑھتی چلی گئی۔ ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۴۹ء میں بہاول خان اول کی وفات پر محمد مبارک خان ثانی کو داؤد پوتروں نے متفقہ طور پر اس کا جانشین منتخب کیا۔ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں درّانی افواج کے سالار اعلیٰ جہان خان پوپلزئی نے ڈیرہ غازی خان کے پٹہ دار علی محمد خان خاکوانی کے ایما پر پہلے اُچ پر حملہ کیا پھر بہاول پور پر چڑھ آیا۔ خان پور کے قریب گھمسان کا رن پڑا جس میں اس نے شکست کھائی، چنانچہ بہاول پور میں مزید وسعت ہوئی۔ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں جیسلمیر کے راول رائے سنگھ کو سرحدی قلعہ ڈیرلور واپس کرنا پڑا جو پہلے امیر بہاول پور سے چھن گیا تھا۔ دو سال بعد غلام شاہ کلہوڑا نے، جو سندھ کا حکمران تھا اور ماضی میں کئی مرتبہ حکمران بہاول پور سے مدد لے چکا تھا، عین اس وقت ریاست پر حملہ بول دیا، جب احمد شاہ ابدالی [رک بہ آں] نے لشکر کشی کی۔ اس نے اس افراتفری پر تکیہ کیا جو افغان بادشاہ کے حملے سے پھیلنے والی تھی۔ غلام شاہ کی رضا جوئی کے لیے اس کے بھائی عطر خان کو، جس نے اس کے خلاف ایک ناکام کوشش کے بعد بہاول پور میں پناہ لے رکھی تھی، اس کے حوالے کر دیا گیا۔

۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء میں محمد مبارک خان ثانی کے انتقال پر اس کا بھتیجا محمد جعفر خان اس کا جانشین ہوا، جس نے ۲۰ برس کی عمر میں تخت نشینی کے وقت بہاول خان ثانی کا لقب اختیار کیا۔ ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں ملتان سکھوں نے چھین لیا۔ بہوال خان کو ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء میں شہنشاہ دہلی شلہ عالم ثانی نے خلعت سے سرفراز کیا اور رکن الدولہ، نصرت جنگ اور حافظ الملک کے خطابات عطا کیے۔ ۱۲۰۱ھ/ [بہ تصحیح ۱۷۸۶ء] تیمور شاہ درّانی نے نواب کی قلمرو پر حملہ کیا اور شہر بہاول پور پر قبضہ کر لیا، اسے تاخت و تاراج کیا اور بعد میں جلا کر تباہ کر دیا۔ دیراوڑ کا قلعہ بھی سر ہو گیا اور اس میں درانی لشکر متعین کر دیا گیا۔ تیمور شاہ نواب کے بیٹے شہزادہ مبارک خان عباسی کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا اور پھر بہاول خان ثانی کو عملاً معزول کر کے مبارک خان کو حکمران بنا دیا۔ تیمور شاہ سزا دینے میں اس قدر سخت تھا کہ وہ ان توپوں کو بھی کابل لے گیا جو بہاول پور میں اس کے ہاتھ لگی تھیں۔ ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء تک بہاول خان ثانی درانیوں کا صفایا کرنے کی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ اس سے پہلے وہ شہزادہ مبارک خان کو بہاول پور واپس آنے پر نظر بند کر چکا تھا۔

جب اس کے مقبوضات پر درّانی حملے کا خطرہ جاتا رہا تو وہ جارحانہ کارروائیوں پر اتر آیا اور نواحی علاقوں کا الحاق کرنے لگا۔ اس کی ہوسِ ملک گیری نے اُچ کے مخدوم حامد گنج بخش (جو مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاری [رک بآں] کی اولاد سے تھا) کے دل میں شبہات پیدا کر دیے۔ اس نے ہمسایہ سرداروں کی کامل اعانت سے نواب کے خلاف ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں بغاوت کی اور اپنی گرفتاری کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس نے بیکانیر کے حکمران کو بھی ریاست پر حملے کے لیے اُکسایا، شہزادہ مبارک خان کو رہا کرایا اور اس کی نوابی کا اعلان کیا۔ باغیوں اور ان کے حلیفوں سے چند سخت مقابلوں کے بعد شہزادہ عبداللہ خان (جو بعد میں نواب صادق محمد خان ثانی کے نام سے معروف ہوا) کے تحت ریاستی فوجیں امن بحال کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ آزردہ خاطر مخدوم نے، جس کا ریاست میں بڑا اثر و رسوخ تھا، کابل کے شاہ شجاع الملک کے ایما پر ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں

پھر بغاوت کر دی ۔ یہ کوشش بھی ناکام ہوئی اور دو برس بعد نواب نے برطانوی حکومت سے دوستانہ معاہدہ کر لیا ۔ اس کے بعد ریاست میں کامل امن و امان رہا ۔ لاہور ، دہلی ، ڈیرہ غازی خان اور ملتان وغیرہ کے لوگ جو سکھوں کی حکومت میں اور ہندوستان میں بدامنی کی وجہ سے خطرہ محسوس کرتے تھے ، نقل مکانی کرکے بہاول پور چلے آئے ۔

۱۸۰۵ء میں بہاول خان کی وفات پر ، اس کا بیٹا عبداللہ خان اپنے بڑے بھائی شہزادہ واحد بخش پر غلبہ حاصل کرکے باپ کا جانشین ہوا اور واحد بخش ہلاک کر دیا گیا ۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا ، عبداللہ خان نے تخت نشینی کے وقت صادق محمد خان ثانی کا لقب اختیار کیا ۔ اس کے پندرہ سالہ دور حکومت کا بیشتر حصہ (اس کا انتقال ۱۸۲۵ء میں ہوا) یا تو امیران سندھ کے حملوں کو پسپا کرنے یا خود اپنے امرا کی بغاوتوں کو فرو کرنے یا اپنے مفتوحہ علاقوں کی مدافعت میں صرف ہوا ۔ اس کے عہد حکومت کے دیگر قابل ذکر واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں شاہ شجاع نے خود امیر کی مہیا کردہ فوجی امداد سے ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کر لیا مگر دوسرے ہی سال لاہور کے حکمران رنجیت سنگھ نے اس سے یہ علاقہ چھین لیا لیکن بعد میں رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازی خان [دیکھیے ڈیرہ جات] اڑھائی لاکھ روپے کی سالانہ رقم کے عوض پور امیر بہاول پور کے حوالے کر دیا ۔ اس کے جانشین رحیم یار خان الملقب بہ محمد بہاول خان ثالث (۱۸۲۵ تا ۱۸۵۲ء) کے عہد حکومت میں ڈیرہ غازی خان ، مظفر گڑھ اور ملتان ہمیشہ کے لیے بہاول پور کے تسلط سے نکل گئے ۔ کیونکہ یہ سب علاقہ ایک فرانسیسی فوجی طالع آزما جنرل وانتورا (Ventura) نے ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں اپنے سکھ آقا رنجیت سنگھ کے لیے فتح کر لیا ۔ نواب نے انتقام لینے کے لیے انگریزوں کو ، ملتان فتح کرنے کی غرض سے ، ۲۳۰۰۰ کا لشکر فراہم کیا جسے ہربرٹ ایڈورڈز نے ، جو ہنوں کا باقی تھا ، ۱۸۴۸ء میں سر کر لیا اور اس کا الحاق ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات سے ہو گیا ۔

۱۸۵۲ء میں اس کے انتقال پر سعادت یار خان ، الملقب بہ صادق محمد خان ثالث اس کا جانشین ہوا ۔ مؤخرالذکر کی رسم تاجپوشی مخدوم اُچ نے ادا کی ، جو حکمران خاندان اور ریاست کے سب سے طاقتور روحانی گروہ کے درمیان مصالحت کا خوشگوار نتیجہ تھا ۔ نواب کا رویہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بہت سخت تھا ، جس کی وجہ سے سب سے بڑے بھائی شہزادہ حاجی خان نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ۔ آخرکار صادق محمد خان کو معزول کرکے قلعہ دراوڑ کے ایک اناج کے گودام میں قید کر دیا گیا ۔ بعد میں اس کے لیے ایک قلیل سی رقم بطور وظیفہ مقرر کی گئی اور اسے لاہور جلا وطن کر دیا گیا جہاں وہ مدفون ہے ۔ حاجی خان نے فتح خان کا لقب اختیار کیا ، لیکن جلد ہی داؤد پوتروں کی تائید سے محروم ہو گیا جو اس کے خلاف مسلسل ناکام سازشوں میں مصروف رہے ۔ اس نے پانچ سال کی حکومت کے بعد ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا ۔ اس کا جانشین رحیم یار خان الملقب بہ محمد بہاول خان چہارم (۱۸۵۸ تا ۱۸۶۶ء) ہوا ، جس کے عہد میں یوں تو کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا ، البتہ الدرونی فتنہ انگیزی اور خلفشار جاری رہا ؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا ۔ اس کے بعد اس کا خورد سال بیٹا صادق محمد خان چہارم تخت نشین ہوا ۔ جب وہ ۱۸۷۹ء میں بالغ ہو گیا تو برطانوی ہند کی حکومت نے اُسے حکمرانی کے اختیارات باضابطہ تفویض کر دیے ، کیونکہ یہ ریاست الحاق پنجاب کے وقت ۱۸۴۹ء میں برطانوی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر چکی تھی ۔ اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد داؤد پوتروں نے بغاوت کر دی ، جو بہرحال

سختی سے کچل دی گئی اور اس کے سرغنہ کو موت کی سزا دی گئی ۔

اس حکمران کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کا انتظام چیف پولیٹکل افسر اور ایجنٹ لفٹیننٹ گورنر پنجاب برائے امور بہاولپور کے ہاتھوں میں رہا ۔ وہ بہت ہی ہر دلعزیز حکمران تھا اور اسے ”صبح صادق“ کہتے تھے ۔ خانوادۂ بہلول پور کے اس ”شاہجہان“ نے متعدد خوبصورت محل تعمیر کرائے ، جن کی تعمیر میں غیر ملکی اور مقامی معمار لگائے گئے ۔ ان میں سے دو، صادق گڑھ محل اور نور محل ، قابل ذکر ہیں ۔

۱۸۹۹ء میں مبارک خان الملقب بہ محمد بہاول خان پنجم اس کا جانشین ہوا جو سولہ برس کا تھا اور بہاول پور کا پہلا شہزادہ تھا جس نے ایچیسن کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی ۔ وہ حج کے بعد مکۂ [معظمہ] سے واپس آ رہا تھا کہ عنفوان شباب میں عدن کے مقام پر ۱۹۰۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا ۔

اس کا جانشین اس کا چھوٹا بیٹا صادق محمد خان پنجم (۱۹۰۷ تا ۱۹۵۶ء) ہوا ، جو اس وقت صرف تین سال کا تھا ۔ اس کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کے امور کونسل آف ریجنسی سرانجام دیتی رہی ، جس کا صدر مولوی سر رحیم بخش تھا ۔ وہ انبالے کے نزدیک ٹھسکا میرانجی (گراهم) کا باشندہ تھا ۔ اس کے عمدہ انتظام اور فلاح عامہ کی فکر کی وجہ سے ، جس میں پرہیز گاری اور فیاضی بھی شامل تھی ، اس کی بہت قدر کی جاتی تھی ۔ ۱۹۴۷ء میں بہاول پور پاکستان میں شامل ہو گیا اور اس نے خاص طور پر خانماں برباد مہاجرین کو بسانے میں جو ان دنوں ہندوستان سے دھڑا دھڑ آ رہے تھے ، نئی مملکت کی بہت مفید خدمت سرانجام دی ۔ ۱۹۵۶ء میں جب وحدت کی تشکیل ہوئی تو یہ ریاست مغربی پاکستان میں مدغم ہو گئی اور اس کی جداگانہ حیثیت باقی نہ رہی ۔

مآخذ : (۱) دولت رائے : مرآۃ دولت عباسی، دہلی ۱۸۵۰ء (موزۂ بریطانیہ کے مخطوطے سے بلحاظ مواد مختلف ہے ، Rieu ، ۲ : ۹۵۱ الف) ؛ (۲) محمد اعظم ہاشمی : جواہر عباسیہ (مخطوطہ) ؛ (۳) جان محمد خان معروفانی : تاریخ بہاول خان، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری؛ (۴) اعظم ہاشمی : اقبال نامۂ سعادت آیات (مخطوطہ)؛ (۵) گمنام مصنف : خلاصۂ تواریخ عباسیہ (سید نوراللہ کی ایک تصنیف کا خلاصہ جو مجھے دستیاب نہ ہو سکا) ؛ (۶) شہامت علی : *The History of Bahawalpur* (پیر ابراہیم خان خویشگی قصوری ، برطانوی ایجنٹ بہاول پور ۱۸۳۰ تا ۱۸۵۶ء کی ایک فارسی تالیف کا مختصر انگریزی ترجمہ) ؛ (۷) *Gazetteer of the Bahawalpur State* ، لاہور ۱۹۰۸ء ؛ (۸) ایچ ۔ بی ایڈورڈز H. B. Edwards : *A year on the Punjab frontier in 1848 - 9* ، لنڈن ۱۸۵۱ء ؛ ۲ : ۳۱۲، ۳۱۹ ۳۴۴، ۳۷۷ ؛ (۹) غلام رسول مہر : تاریخ سندھ (عہد کلہوڑا) ، کراچی ۱۹۵۸ء ، ۲ : ۳۲ ، ۳۸ تا ۶۰ ، ۱۰۰ تا ۱۱۹ و مواضع کثیرہ ؛ (۱۰) سید مراد شاہ : تاریخ مراد (مخطوطہ) ؛ (۱۱) نذیر علی شاہ : صادق نامہ ، لاہور ۱۹۵۹ء ؛ (۱۲) عطا محمد شکاری : تازہ نوائے معارک ، کراچی ۱۹۶۰ء ، اشاریہ ؛ (۱۳) ہتورام : تاریخ ڈیرہ غازی خان، لاہور ۱۸۷۵ء ؛ (۱۴) وہی مصنف : تاریخ بلوچستان ؛ (۱۵) حفیظ الرحمن : تاریخ بہاولپور ؛ (۱۶) عزیز الرحمن : صبح صادق ، طبع دوم ، بہاولپور ۱۹۴۳ء ؛ (۱۷) F. G. Goldsmid : *A Memoir on Shikarpur* ، دستاویزات حکومت بمبئی؛ (۱۸) نیز دیکھیے مقالۂ بہاولپور، اور سی یو ایچیسن C. U. Aitchison : *A Collection of Treaties, Engagements and Sanads relating to India* ، ج ۹ ، کلکتہ ۱۸۹۲ء۔

(بزمی انصاری)

داؤد خان کرّانی : شیر شاہ کے ماتحت والیِ بنگال سلیمان کرّانی کا چھوٹا بیٹا تھا، جو بعد میں مطلق العنان ہو گیا؛ ۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء میں افغان امرا

نے اسے بنگال کے تخت پر بٹھایا۔ انھوں نے اس کے بڑے بھائی بایزید کو معزول کر دیا تھا۔ اس نے نشۂ قوت میں سرشار ہو کر مغل شہنشاہ اکبر سے سرتابی کی اور ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں غازی پور کی شاهی چوکی پر حمله بول دیا۔ منعم خان [رک بآں، لائڈن طبع ۲] اس کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا، جس نے اس کے دارالحکومت ٹانڈا پر قبضه کر کے اسے اڑیسه میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ داؤد خان نے تکاروئی [رک بآں] (= مغل ماڑی) کی مشہور لڑائی میں جوابی حمله کیا، لیکن مغلوں کی کمک پہنچ جانے پر اس نے صلح کی درخواست کی اور اکبر کو خراج ادا کیا، چنانچه اسے اڑیسه کا صوبه اپنے پاس رکھنے کی اجازت مل گئی۔ ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں منعم خان کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد جو ابتری پھیلی تو داؤد خان نے حمله کر کے پھر بنگال پر قبضه کر لیا۔ ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں خان جہان اور ٹوڈرمل نے مغلوں کی طرف سے دوباره حمله کیا؛ داؤد خان گرفتار ہو کر قتل ہوا اور بنگال بالآخر مغلوں کے هاتھ آ گیا۔

مآخذ : (۱) ابوالفضل علامی : اکبر نامه، ۳ : ۲۲، ۷۰ تا ۷۳، ۹۳ ببعد، ۱۱۸ ببعد، ۱۷۷ تا ۱۷۸؛ ترجمه از بیورج (Beveridge)، ۳ : ۳۰ ببعد، ۹۷ ببعد، ۱۲۰ ببعد، ۱۶۹ ببعد، ۲۴۸ ببعد : (۲) وهی مصنف : آئین اکبری، ترجمه از براکمان، بار دوم، ص ۳۳۳، ۳۵۰، ۴۰۴، ۴۰۷، ۴۱۳۔

(J. BURTON-PAGE)

* **داوَر** : رک به زمین داور، در ۱۹، لائڈن، بار ۴۔

* **داهومی** : (Dahomey) : ٹوگولینڈ اور نائجیریا کے مابین ایک ۴۱۸ میل لمبا تنگ خطه، خلیج گنی پر واقع قدیم ترین معروف ممالک میں سے ہے۔

اس کا ساحلی علاقه، جو نشیب میں واقع ہے، سمندری پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں سے گھرا هوا ہے، بحالیکه اس کا وسطی حصه ایک سطح مرتفع اور ایک دوسرے سے جدا پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ شمالی حصه نسبةً بلند ہے۔ اس کے آر پار آٹا کورا (Atacora) پہاڑوں کی ڈھلانیں هیں، جن کی بلندی تقریباً آٹھ سو فیٹ تک ہے۔ جنوب میں خاص طور سے رطوبت زیاده ہے اور یہاں کا درجۂ حرارت تقریباً یکساں رہتا ہے۔ اگرچه یہاں دو موسم بارش کے اور دو خشکی کے ہوتے هیں۔

داهومی کی آبادی جو تقریباً دو ملین (بیس لاکھ) نفوس کی ہے، بیشتر ذیل کے قبائل پر مشتمل ہے۔ فون (Fon) (مرکزی خطه)، گون (Goun) اور Yoruba (جنوب مشرقی خطه)، اجه (Adja) (جنوب مغرب)، بریبه (Bariba)، سومبا (Somba) اور فلانی (Fulani) (شمالی علاقه)۔

یہاں کا بڑا شہر کوٹونو (Cotonou) ہے (ستاسی هزار باشندے)، اگرچه پورٹونووو (Porto-Novo) همیشه سے حکومت کا صدر مقام رہا ہے۔

سترهویں صدی عیسوی میں یورپ کے لوگوں سے واسطه پڑنے پر داهومی برده فروشی سے بالخصوص متأثر هوا، جو اس کی بعض سلطنتوں اور نمایاں طور پر ابومی (Abomey) کی دولت مندی کو فروغ دینے میں ممد هوئی۔ یه آخرالذکر هی وه سلطنت ہے جس نے فرانسیسی نفوذ (۱۸۹۲ء) کے خلاف سب سے زیاده طویل اور شدید مزاحمت کا مظاهره کیا۔

۱۸۹۹ء میں فرانسیسی مغربی افریقه کے وفاق میں داخل ہو کر داهومی نے اس کی ترقی میں بڑا حصه لیا۔ یه خدمت اس نے اپنے منتخب افراد کے ذریعے انجام دی جو نقل وطن کر کے دوسرے مختلف علاقوں میں جا بسے تھے۔ سینیگال (Senegal) کی معیت میں یه بھی ان ممالک میں سے ہے جنھوں نے سب سے پہلے سیاسی تحریکوں کی تشکیل کی جن کی قوت کا اظہار دوسری عالمگیر جنگ سے خاصا پہلے ہو گیا تھا۔

اپنے ان بیشتر همسایه ملکوں کی طرح جو خلیج

گنی پر واقع میں اور بینن (Benin) تمدن کی خصوصیات سے متاثر ہوئے ہیں، داھومی نے بھی ارواح پرستی (animism) کے راسخ عقیدے کو برقرار رکھا ہے جس پر اس کی تہذیب کی بقا کا دار و مدار ہے۔

اس ملک کی معاشرتی و مذھبی تنظیم، جہاں ارواح پرستی سرکاری مذھب تھا، کسی بیرونی عقیدے کے درآنے میں حائل رھی، اور صرف ابومی (Abomey) سلطنت کے سقوط کے بعد عیسائیت کی اشاعت کا آغاز ہو سکا۔

اسلام کی اس ملک میں اشاعت آھستہ آھستہ ہوئی اور لوگ شروع میں زیادہ تعداد میں اس میں شامل نہ ہوئے کیونکہ یہاں کے سردار اور کمتر درجے کے مقامی حکمران انیسویں صدی عیسوی کے اختتام سے پہلے کبھی اپنے عقائد کو ترک کرنے پر تیار نہیں ہوئے، نہ تو شمال مغربی داھومی کے قدیم قبائلی معاشروں، موسوم بہ سومبا (Somba) میں، اور نہ شمال مشرقی علاقے کے جاگیردارانہ نظام رکھنے والے بریبا (Bariba) معاشروں میں، باوجودیکہ وہ کاروانی راستے، جہاں اسلامی کاروان سرائیں اب تک موجود ہیں، اسی ملک سے گزرتے تھے، اور نہ جنوب کی سلطنتوں ھی میں جو مطلق العنان بادشاھتیں تھیں، جن میں بادشاہ ان موروثی روایات کا مختار کل مخزن تھا، جنھیں وہ اپنے آبا و اجداد کے اعزاز میں ہر سال تازہ کرتا رھتا تھا۔

مسلمانوں کے نفوذ کا آغاز غالباً شمال مشرق سے ہوا ۔ تیرھویں صدی میں مالی (= ملی Mali) سلطنت کی ایک چھوٹی سی تجارتی نو آبادی اس علاقے میں قائم کی گئی، جسے آج کل سوکوٹو (Sokoto) کہتے ہیں ۔ اس زمانے کے مؤرخ اسے گوان گرا (Guangara) کہتے تھے ۔ وھیں سے کاروانوں کے سلسلے کولا (kola) کے درختوں کی سرزمین غانہ [= گھانا] کے لیے روانہ ہوتے تھے ۔ نمک، غلام، اور بعض مصنوعات شمالی علاقے سے، یہاں تک کہ لیبیا (Lybia) سے جنوب مغرب تک پہنچتی تھیں، اور کولا کے اخروٹ تو شمالی داھومی کے راستے سے نائیجریا اور ھوزہ (Housa) کے علاقوں تک پہنچ جاتے تھے ۔ اس طرح جلد ھی چھوٹی چھوٹی سی مسلم نو آبادیاں موسوم بہ وانگرہ (Wangara) یا مارو Maro (داھومی میں) قائم ہو گئیں جو کچھ ھی عرصے کے بعد بڑھ کر اہم مرکز بن گئیں، جیسے کہ پراکو (Parakou)، جوگو (Djougou) یا کانڈی (Kandi)۔

یہ غیر ملکی آبادیاں ان سرداروں کے زیر سایہ سکونت پذیر تھیں جن کے علاقوں میں سے کاروانی راستے گزرتے تھے ۔ ان بستیوں سے متعدد خاندانوں کی بنیاد پڑی اور اس طرح وہ یہاں اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بن گئیں جو مقامی باشندوں سے شادیوں کے سہل طریقے کی بدولت بتدریج فروغ حاصل کرتا گیا۔

بعد ازاں جب اھل مراکش نے سترھویں صدی عیسوی میں سونگھائی (Songhi) کی سلطنت کو فتح کر لیا تو سونگھائی مسلمانوں کا ایک گروہ جو دینڈی کہلاتے تھے، دریاے نائجر (Niger) کی طرف ھٹ گیا ۔ یہ لوگ غالباً موجودہ داھومی کے انتہائی شمالی حصے میں جا کر آباد ہو گئے اور انھوں نے اسلامی اثر و نفوذ کی دوسری لہر کی تشکیل کی ۔ تیسری لہر تقریباً اس وقت چلی جب فلانی چرواھے ملک میں داخل ہوئے اور اٹھارھویں صدی کے دوران میں داھومی کے تمام شمالی نصف حصے میں پھیل گئے ۔ اگرچہ ان کے مذھب میں ابھی تک ارواح پرستی کے اثرات کا رنگ موجود تھا، تاھم انھوں نے اسلامی مرکز قائم کر لیا جس نے بہت سے سابق غلاموں کو جو گندو (Gando) کہلاتے تھے اور جن سے ان لوگوں کے مستقل تعلقات تھے، اپنا پیرو بنا لیا۔

آخرکار اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں اسلام نے جنوب مشرق کے لوگوں کو بھی متاثر کیا اور داھومی کے موجودہ دارالسلطنت پورٹونووو

(Porto-Novo) میں کچھ مسلم یوروبہ (Yoruba) تاجر آباد ہو گئے جو ایلوکن (Hokin) اور موجودہ نائیجریا کے مغرب سے آئے تھے۔ ان کی تعداد بسرعت بڑھتی گئی۔ انھوں نے داہومی کے بعض یوروبہ خاندان کو مشرف بہ اسلام کر لیا، اور بعض ان غلاموں کے اخلاف کو بھی، جو برازیل سے واپس آ گئے تھے اور جن کے نام پرتگالی تھے۔

اگرچہ صحیح اعداد و شمار مرتب کرنا دشوار ہے، تاہم یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ داہومی کے کل اٹھارہ لاکھ باشندوں کی آبادی میں سے دو لاکھ تیس ہزار اور دو لاکھ چالیس ہزار کے درمیان مسلمان ہیں جن میں سے عملی طور پر صرف ایک لاکھ دیندار ہیں۔

ان لوگوں میں سے بیشتر تیجانی ہیں؛ نسبۃً معمر آدمیوں میں سے بالخصوص بعض سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شمال میں کچھ لوگ ہمّلی ہیں، مذہب میں اس قریبی یگانگت کے باوجود عقیدے کے ذرا سے فرق نے بعض ان مسلمانوں کو جو یوروبہ اصل کے تھے، شمالی علاقوں کے باشندوں (ہوزہ، زوما، فلانی، دندی) کا مخالف بنا دیا جو اپنے مذہب پر زیادہ راسخ عقیدے کے ساتھ کاربند ہونے کے مدعی تھے۔ مسلم داہومی کے یہ دو پہلو زیادہ تر پورٹونووو (مسلم یوروبہ)، [= جنوبی نائیجریا کے مغربی صوبے کا علاقہ] اور پراکو (مسلم شمالی حصے) میں پائے جاتے ہیں اور یہی دو مقام جلد ہی اسلام کے دو بڑے مرکز بن گئے، کیونکہ جوگو (Djougou) کی جگہ رفتہ رفتہ پراکو (Parakou) نے لے لی، جہاں کچھ تبلیغی تحریکیں پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں، اور جہاں قرآن کے ایسے عالم اساتذہ جاگزین رہ چکے تھے جو اپنے دین کا جدید اور زیادہ حرکی تصور رکھتے تھے۔

اس کا قوی امکان ہے کہ آئندہ برسوں میں مذہبی پیشوا اور امام زیادہ تر تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ لوگوں میں سے منتخب کیے جایا کریں گے نہ کہ باعتبار وراثت ان خاندانوں میں سے، جن کا تعلق ارواح پرست سرداروں سے ہے۔ اس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کیوں شمالی داہومی میں بالخصوص قرآنی مدارس قائم ہوئے ہیں، جہاں مذہبی علم و فضل کی ہمیشہ قدر و منزلت رہی ہے۔

مآخذ: (۱) Akindele و Aguessy: *Le Dahomey*، پیرس ۱۹۶۵ء؛ (۲) وہی مصنفین: *Contribution à l'étude de l'histoire de l'ancien royaume de Porto-Novo*، در *Mémoires IFAN*، ج ۲۵؛ (۳) d. Albeca: *Les établissements français du golfe du Benin*، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۴) S. Berbain: *Le comptoir français de Juda au XVIII^e siècle*، در *Mémoires IFAN*، ج ۳؛ (۵) G. Brasseur و Brasseur Marion: *Porto Novo et sa palmeraie*، در *Memoires IFAN*، ج ۳۲؛ (۶) Brunet و Giethlen: *Dahomey et dépendances*، پیرس ۱۹۰۰ء؛ (۷) A. Burton: *A mission to Gelele, King of Dahomey*، لنڈن ۱۸۶۴ء؛ (۸) Desanti: *Du Dahomey au Benin Nigre*، پیرس ۱۹۴۵ء؛ (۹) Ed. Dunglas: *Contribution à l'Histoire du Moyen-Dahomey*، ۳ جلدیں (*Études Dahoméennes*، ج ۱۹، ۲۰، ۲۱)، پورٹونوو؛ (۱۰) Ed. Foa: *Le Dahomey*، پیرس ۱۸۹۵ء؛ (۱۱) R. Grivot: *Réactions dahoméennes*، پیرس ۱۹۴۵ء؛ (۱۲) P. Hazoume: *Le pacte de sang au Dahomey*، پیرس ۱۹۳۷ء؛ (۱۳) وہی مصنف: *Doguicimi*، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۱۴) M.J. Herskovits: *Dahomé -an Ancient West African Kingdom*، نیویارک ۱۹۳۸ء؛ (۱۵) M. Hubert: *Mission Scientifique au Dahomey*، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۱۶) H. Le Herisse: *L'ancien royaume du Dahomey*، پیرس ۱۹۱۱ء؛ (۱۷) J. Lombard: *Cotonou, ville africaine*، (*Études*

Dahoméennes، ج ۱۰)؛ (۱۸) B. Maupoil: La géomancie à l'ancienne Côte des Esclaves، پیرس ۱۹۴۳ء؛ (۱۹) P. Mercier: Carte ethno-démographique de l'Afrique Occidentale، ج ۵، IFAN ڈکر Dakar؛ (۲۰) M. Quenum: Au pays des Fons، پیرس ۱۹۳۸؛ (۲۱) Skertchly: Dahomé as it is، لنڈن ۱۸۷۴ء؛ (۲۲) Cl. Tardits: Porto-Novo، لنڈن ۱۹۵۸ء؛ (۲۳) P. Verger: Dieux d'Afrique، پیرس؛ (۲۴) وہی مصنف: Notes sur le culte des Oricha et Vodoun، در Mémoires IFAN، ج ۵؛ (۲۵) R. Cornevin: Histoire des peuples de l'Afrique noire، پیرس Vodoun، ۱۹۶۰ء، بمدد اشاریہ۔

(J. Lombard)

دایی: (Dayi) ایک ترکی لفظ بمعنی ماموں؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری عہدوں کے ظاہر کرنے کے لیے اس کا استعمال صرف الجزائر اور تونس کے سلطانی نائبوں کے لیے ہوا۔ غالباً شروع میں یہ ایک قسم کا اعزازی لقب تھا (اسے لفظ "الپ" کے مماثل کہہ سکتے ہیں، جو قدیم ترک استعمال کرتے تھے) اور اس کا حاصل کرنا ضرور ایک مشکل کام رہا ہوگا، کیونکہ اس لقب کے پانے والے کو خطۂ بحیرۂ روم میں خشکی اور تری میں اپنی شجاعت و قوت کا ثبوت دینا پڑتا تھا (Pakalin، ۱: ۴۰۷ - ۴۰۸)؛ مگر ان معنی میں اس لفظ کا رواج اس اساطیری کہانی سے تضاد رکھتا ہے جس میں مان لیا گیا ہے کہ بربروسہ بھائیوں کے والد نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ خیر الدین (رک باں) کی اطاعت کریں کیونکہ "وہ تمہارا دایی" ہوگا (Venture de Paradis: Alger au XVIIIᵉ siècle، در RA، ۱۸۹۶ء، ص ۲۵۷)۔

اس اعزازی لقب کا ایک اور استعمال ینی چری رضا کار فوج کے زیریں درجے کو ظاہر کرنے کے لیے کیا جاتا تھا؛ تونس میں دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں یہ لقب اس فوج کے چالیس صفوں کے سرداروں کو حاصل تھا۔ ۱۵۹۱ء میں ان دایوں نے اپنے افراد میں سے ایک شخص کو فوج کا سپہ سالار منتخب کیا۔ یہ صدر "دایی" کم سے کم ۱۵۹۴ء سے ولایت تونس میں نیابت سلطانی کے تمام اختیارات کا مالک ہوگیا۔ اس کی اجازت سے بلربکی پاشا (یعنی اصل والی) اپنے عہدے پر قائم رہا، مگر اس کے اختیارات برائے نام رہ گئے (Pierre Dan: Histoire de la Barbarie et de ses Corsaires، پیرس ۱۶۳۷ء، ص ۱۴۴ تا ۱۴۵)۔ جب ۱۶۴۰ء میں حمودہ بن مراد برسر اقتدار آیا تو اس نے دایی کے لقب کو بدستور رہنے دیا، لیکن جس کو یہ لقب عطا ہوا وہ علاقے کی حکومت کا صدر نہ رہا تھا، گو اس کے بلند ترین افسروں میں سے اس کا شمار ہوتا ہو۔

۱۷۰۵ء میں دایی کا لفظ ان القاب میں نہیں ملتا جو حسینی سلاطین عطا کیا کرتے تھے؛ تاہم تونس کے سرکاری حکام میں نویں درجے کا لقب مانا جاتا تھا، جیسا کہ محمد بیرام الخامس التونسی نے کہا ہے (صفوۃ الاعتبار، قاہرہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء، ۲: ۲ تا ۳)؛ یہ اٹھارھویں صدی کی متعدد مغاربی دستاویزات میں بھی پایا جاتا ہے، خصوصاً ان معاہدوں میں، جو تونس کے نائب سلطان اور فرانس کے درمیان ۱۶ دسمبر ۱۷۷۰ء، ۹ نومبر ۱۷۴۲ء اور ۴ Ventôse سال ۱۰ کو تحریر ہوئے۔ اس وقت یہ لقب محکمۂ قضا کے ایک اعلٰی عدالتی حاکم کے معنی میں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لقب انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔

الجزائر میں ۱۶۷۱ء کے بعد جب "بربروسہ برادران" (جنھیں اہل فرنگ بحری قزاق کہتے ہیں) نے آغاؤں کے اختیارات پر قبضہ جما لیا (دیکھیے مقالہ الجزائر، ۳: ۸۷ ببعد) تو دایی کا لقب سلطانی ولایت کے صدر حاکم کو حاصل تھا۔ سترھویں صدی کے شروع تک بھی جب Pierre Dan الجزائر میں تھا، تو صورت حال اس

وقت بہ نہ تھی۔

پہلے پہل تربروسہ برادران کے طائفے ۔ دایی کا انتخاب کیا؛ ۱۶۸۹ء کے بعد فوجی سردار بھی دایی کا انتخاب کرنے لگے۔ ۱۶۷۱ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان تیس دایی یکے بعد دیگرے صاحب اقتدار ہوے۔ ضابطے کی رو سے تو ان کے اختیارات رضا کار فوج کے "دیوان" کے زیر نگرانی محدود تھے، مگر واقع میں اگر کوئی دایی طاقتور شخصیت والا ہوتا تو وہ اقتدار مطلق کا مالک ہو جاتا تھا۔

دایی الجزائر میں سکونت رکھتا تھا ، ابتداءً قصر جِنینہ میں ، جو اسی جگہ تھا جہاں اب اسقف اعظم (archbishop) کا محل واقع ہے۔ ۱۸۱۶ء کے بعد وہ اس قلعے میں رہنے لگا جو "قصبہ" کہلاتا ہے اور مسلم شہر پر سایہ فگن ہے۔ حکمران دایی کی نجی زندگی قاعدے کی سختی کے ساتھ پابند تھی: وہ اپنے گھر کے لوگوں سے الگ رہتا تھا، لیکن جمعرات کے دن کا پچھلا حصہ اور جمعرات اور جمعے کی درمیانی شب ذاتی مکان میں گزار سکتا تھا۔ اس کے محل میں عورتوں کا داخلہ ممنوع تھا اور کوئی عورت صرف سرکاری ہی طور پر باریاب ہو سکتی تھی۔ وہ اشیاے خور و نوش اور اس تنخواہ کا حقدار تھا جو سب سے زیادہ کسی ینی چری کو مل سکتی تھی البتہ اسے کثیر تعداد میں تحائف ملتے رہتے تھے، اور اس سے بعض دایوں نے خاصی دولت جمع کر لی تھی۔ ان میں سے چودہ دایی غیر طبعی موت مارے گئے۔

مآخذ : دایی کے فرائض سے خصوصی تعلق رکھنے والے مقالات و کتب کا فقدان ہے؛ بعض متفرق معلومات ان مآخذ یا مطالعات سے دستیاب ہو سکتی ہیں جن کا تعلق الجزائر اور تیونس کی ترکی ولایتوں سے ہے۔

(R. LE TOURNEAU)

* **اَلدُّب** : رک بہ علم نجوم۔

* **اَلدَّبْدَبہ** : شمال مشرق عرب میں ایک وسیع کنکر [illegible] ن ، جو مشرق جانب میں قریب قریب سارا [illegible] نشیب سے گھرا ہوا ہے (یہ نشیب سعودی [illegible] اور کویت کے درمیان غیر جانبدار علاقے کی [illegible] حد ہے)۔ اس کے غربی جانب الباطن کی وادی ہے اور جنوب میں الوریعہ کی کنکریلی پہاڑی ہے۔ یہ میدان شمال کی جانب علاقۂ سعودی عرب سے شروع ہو کر شیخ کویت کی ریاست کے اندر تقریباً ۲۰ کیلومیٹر کے فاصلے تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۳۰۰۰ مربع کیلومیٹر ہے اور اپنی مضبوط اور تقریباً ہموار اور سپاٹ سطح کے اعتبار سے قابل ذکر ہے ، جس میں کہیں کہیں چونے کے کنکر ، سنگ مردہ اور آتشیں پتھر ملتے ہیں؛ جنھیں طبقات الارض کے جدید ترین دور میں وادی الرُّمّۃ الباطن سے نکلنے والی نہروں نے وسطی اور مغربی عرب سے لا کر یہاں ڈال دیا ہے۔ خود الدبدبہ کا پانی باہر نہیں جاتا بلکہ اُتھلے گڑھوں میں ، جن کی تہہ میں گاد جمی ہوئی ہے، جمع ہو جاتا ہے (یہ گڑھے "خباری" کہلاتے ہیں، جس کا مفرد "خبراء" ہے)۔ الدبدبہ قدیم "دیرہ" مُطَیر کا ایک حصہ ہے اور آج کل موسم سرما میں متعدد شمال مشرق قبائل کی پسندیدہ چراگاہ ہو گیا ہے۔ یہ میدان کبھی ہرن کے شکار کے لیے مشہور تھا۔ بعض بدوی "دِبْدِبہ" (جمع "دبادب") کے لفظ کا ہر چپٹی اور پختہ سطح والے علاقے پر اطلاق کرتے ہیں۔ اس لفظ کا تعلق قدیم ادبی لفظ "دَبْدَبہ" سے ہے جو سخت زمین پر گھوڑوں کے ٹاپ کی نقارے کی سی آواز کے لیے آتا تھا۔

نقشے : (امریکی شعبۂ مساحت ارضیات (U.S. Geological Survey) اور عرب امریکی آئل کمپنی نے وزارت مال و معاشیات قومی ، مملکت سعودی عرب اور امریکہ کے محکمۂ خارجہ کے مشترکہ انتظام کے تحت نقشوں کا ایک سلسلہ تیار کیا ہے: پیمانہ ۱ : ۵۰۰،۰۰۰ (جغرافیائی)؛ وادی الباطن ،

نقشہ I-203 B (۱۹۵۹ء) شمالی طُوبِق، نقشہ I - 207 B (۱۹۵۷ء).

(J. MANDAVILLE)

* دُبْدُو: (جدید املا دِبْدُو Debdou: عام تلفظ دبدو Dabdu؛ نسلی اعتبار سے دبدوبی dabdubi، جمع: دُبادُبہ)، مشرقی مراکش کا ایک چھوٹا سا قصبہ، جو گیارہ سو میٹر کی بلندی پر، واد دبدو کی ”وادی کے دائیں کنارے کے دامن میں“ واقع ہے۔ یہ دریا اس وادی سے اسّی میٹر کی بلندی پر ایک عُمُودی چٹان میں سے نکلتا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک سطح مرتفع پر ایک قلعہ (قَصْبہ، قَصَبہ) ہے، جس کی حفاظت کے لیے پہاڑ کے رُخ ایک کھائی موجود ہے۔ وادی کے بائیں جانب مُصلاّ نامی ایک نواحی گاؤں واقع ہے۔ یہ شہر وجدہ Oujda کے عَمالہ (یعنی علاقۂ مذکور میں فرانسیسی زیر حمایت حکومت کے نظم و نسق) کے ماتحت ہے اور قبیلۂ اہل دُبْدُو (جن کی تعداد ۱۹۳٦ء میں ٦۵۹۹ تھی) کا مرکز؛ لیکن اس کی اصل آبادی متعرب بربروں، عربوں اور ان یہودیوں پر مشتمل ہے جنھیں تعداد میں روز بروز کم ہونے کے باوجود ابھی تک اکثریت حاصل ہے (۱۹۳٦ء میں ۱۷۵۱ نفوس پر مشتمل آبادی میں ان کی تعداد ۷۱۹ تھی)۔ شہر کے وسطی محلّے (مَلّاح Mallah) میں جو یہودی رہتے ہیں، ان میں سے بعض بربری الاصل ہیں اور بعض اُن اندلسی یہودیوں کی نسل سے ہیں جو اندلس پر عیسائیوں کے دوبارہ قبضے کے زمانے میں وہاں سے نقل مکانی کر کے چلے آئے تھے۔ فرانسیسی زیرحمایت ریاست کے قیام کے بعد، یہودی تاجروں اور صنعت کاروں کا (جن میں زراعت پیشہ لوگوں کا شمار نہیں ہے) طبقہ کم ہو گیا ہے، کیونکہ ان کے افراد بڑی تعداد میں مشرقی مراکش کے نوزائیدہ مراکز (خاص طور پر مِسُّور Missour) کی طرف چلے گئے، تاہم انھوں نے اپنے آبائی شہر سے بڑے مستحکم روابط قائم رکھے ہیں۔

تازہ Taza کو جانے والے راستے میں واقع ہونے اور سہرن Saharan قبائل کے قبضے میں آ جانے سے دبدو (جہاں ہر جمعرات کو بازار لگتا ہے) ہمیشہ سے خاصا اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔ اس کے نواحی اضلاع کی زرخیزی (انگور، ثمردار درختوں، گندم، جو وغیرہ) نے اسے زرعی مرکز بھی بنا دیا ہے۔

دبدو یقیناً بہت قدیم زمانے میں بسایا گیا ہوگا۔ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی سے مراکش کی تاریخ میں اس کی اہمیت برابر برقرار رہی ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ فاس اور تلمسان کے درمیان ہونے کے باعث فوجی اعتبار سے اس کا محل وقوع بڑا اہم ہے اور اسی لیے یہ مختلف خانوادوں میں ایک مستقل وجہ نزاع بھی بنا رہا ہے۔ عبدالحق (۵۹۲ تا ٦۱۴ھ/۱۱۹٦ تا ۱۲۱۸ء) کے ہاتھوں مرینی قبائل کے درمیان بٹوارے کے وقت یہ علاقہ بربر قبیلہ بنوارتجن کے حصے میں آیا، جنھیں تلمسان کے بنو عبدالواد [رک بآن] کی ریشہ دوانیوں کے خلاف فاس کے دفاع کا فرض سپرد ہوا تو انھوں نے اسے اپنی جاگیر کا صدر مقام بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۷٦٦ھ/۱۳٦۴ - ۱۳٦۵ء میں اسے شاہ تلمسان نے تاخت و تاراج کیا۔ بہر حال ۸۳۳ھ/۱۴۳۰ء کے قریب بنوارتجن کا ایک سردار دبدو میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں کے حکمران بنو وطّاسہ سے بالکل آزاد و خود مختار رہے، بلکہ انھوں نے ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء میں تازہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بھی تیار کر لیا۔ دبدو کی یہ چھوٹی سی ریاست بنو سعد کے دوسرے فرمانروا الغالب باللہ کے دور حکومت میں کہیں جا کر نیست و نابود ہوئی، جس نے ۹۷۰ھ/۱۵٦۳ء میں اپنا علاقہ پاشا کے حلقۂ اختیار میں دے دیا۔ اس امر سے اس شہر کی تاریخ، جو کچھ مبہم سی ہے، عربوں اور بربروں کے مابین مقامی جھگڑوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بایں ہمہ الیسوبی

صدی عیسوی میں دبدو میں ایک خود مختار انتظامیہ قائم تھی۔ مسلمان آبادی عامل تازہ کے زیر فرمان تھی، جو ہر سال ٹیکس وصول کرنے کے لیے اپنا نائب یہاں بھیجتا تھا؛ اس کے برعکس یہاں کے یہودی اپنے واجبات فاس الجدید کے پاشا کو ارسال کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے خاتمے پر مولای عبدالعزیز کے برسر اقتدار (۱۸۹۴ء) آنے کے بعد اور مدعی حکومت بوحمارۃ [رک باں] کی بغاوت کے دوران میں بوحصیرہ نامی ایک بربر نے خود مختار ہونے کی کوشش کی، لیکن ۱۹۰۴ء میں دودو بن حیدہ نامی ایک یہودی کے اکسانے پر اس قصبے اور ضلع نے بوحمارۃ کی حمایت کی؛ یہودی مذکور نے جو دبدو کا قائد مقرر کیا گیا تھا، اپنے دشمنوں، یعنی اندلسی الاصل یہودیوں سے انتقام لینے کے لیے اپنے منصب سے فائدہ اٹھایا۔ فرانسیسی قبضہ ہونے پر یہاں کا امن و امان بر قرار ہو گیا۔ اس قبضے کا فیصلہ ایک فرانسیسی کے قتل کے سلسلے میں ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔

گزشتہ صدیوں کے دوران عرب اثر اور عربی زبان یہاں اس حد تک چھا گئی کہ بربر زبان اب نواحی پہاڑوں کے سوا کہیں بھی نہیں بولی جاتی۔ یہودیوں کی بولی میں بعض دلچسپ خصوصیات نظر آتی ہیں (دیکھیے Ch. Pellat : Nemrod et Abraham, dans le parler arabe des Juifs de Debdou، در Hespéris، ۱۹۵۲ء، ص ۱ تا ۲۵)۔

مآخذ : (۱) ابن خلدون : العبر، مترجمۂ de Slane، بمدد اشاریہ؛ (۲) یحیٰی ابن خلدون : بغیة الرُّواد، طبع و ترجمہ از A. Bel، الجزائر ۱۹۰۳ تا ۱۹۱۳ء، بمدد اشاریہ؛ (۳) Leo Africanus، ترجمہ Épaulard، ۱ : ۲۹۹ تا ۳۰۲؛ (۴) Ch. de Foucauld : Reconnaissance au Maroc، ص ۲۳۸ ببعد؛ (۵) Marmol : L'Afrique، ۲ : ۲۹۶؛ (۶) L. Massignon : Le Maroc dans les Premières années du XVIème siècle، الجزائر ۱۹۰۶ء، بمواضع کثیرہ؛ (۷) La Martinière و Lacroix : Documents pour servir à l'étude du Nord-ouest africain، ۱ : ۱۲۲؛ (۸) A. Bernard : Les Confins algéro-marocains، ص ۲۸ ببعد؛ (۹) Nehlil : Notice sur les tribus de la région de Debdou؛ (۱۰) N. Slousch : Les Juifs de Debdou، در RMM، جلد ۲۲ (۱۹۱۳ء)، ص ۲۲۱ تا ۲۶۹؛ (۱۱) L. Gentil : L'amalat d'Oudjda، در La Géographie، ۱۹۱۱ء، ص ۱ تا ۲۸؛ (۱۲) Célérier و Desnottes : La vallée de Debdou، در مجلۂ مذکور، ۱۹۲۸ء، ص ۳۴۷ تا ۳۵۷؛ (۱۳) L. Voinot : De Taourirt à la Moulouya et à Debdou، در مجلۂ مذکور ۱۹۱۲ء، ص ۲۱ تا ۳۳؛ (۱۴) وہی مصنف : Pèlerinages judéo-musulmans du Maroc، پیرس ۱۹۴۸ء، ص ۹، ۱۰، ۲۲ تا ۳۴، ۷۶، ۹۳، ۹۷؛ (۱۵) لا ۱، بار اول، مقالہ از A. Cour (جس کی خاص تلخیص کر دی گئی ہے)؛ [(۱۶) ۱۱، ع، مصر، ۹ : ۱۳۲ تا ۱۳۷]۔

(اداره)

دبرونق : رک بہ رغوسہ۔

دبستان مذاہب : فارسی کی ایک کتاب کا نام، جس میں مختلف مذہبوں کا بیان ہے اور خاص طور پر گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی مذہبی حالت بیان کی گئی ہے۔ بیان الادیان (چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی) کے بعد مذہبوں کے متعلق فارسی میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں یہ سب سے زیادہ مکمل ہے۔ بیان الادیان میں واقعات تو صحیح ہیں لیکن مختصر بہت ہیں۔ تبصرة العوام بھی دبستان مذاہب سے پہلے کی ہے (ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی) اور شیعی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ دبستان مذاہب کے ماخذ جزئی طور پر مختلف مذاہب کے معتقدات کی مقدس کتابیں

ہیں، لیکن بعض معلومات کی بنیاد وہ باتیں ہیں جو مصنف کو زبانی بتائی گئیں اور بعض خود مصنف کے اپنے مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ بہت سے ابواب میں مصنف نے ان عربی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں سب سے پہلے پارسیوں کے مذہب کا پوری طرح جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہندو مذہب کا بیان ہے۔ پھر تبتیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے ابواب کے بعد مصنف اسلام اور اس کے فرقوں سے بحث کرتا ہے۔ سب سے آخر میں کچھ ابواب فلسفیوں (مشائین اور نو افلاطونیوں) اور صوفیہ سے متعلق ہیں۔ ایک مدت تک غلطی سے یہ سمجھا جاتا رہا کہ دبستان مذاہب کا مصنف محسن فانی ہے؛ بعض مخطوطات میں [illegible] صرف ایک رباعی کا مصنف بتایا گیا ہے، جس کا حوالہ دیا گیا ہے (دیکھیے ترجمہ از Shea-Troyer، ۱ : ۲)؛ دبستان کا مصنف یقیناً پارسی مذہب کا روشن خیال پیرو تھا اور ہمیں غالباً ان مخطوطات کو معتبر ماننا پڑے گا جو سراج الدین محمد آرزو (اس کے تذکرے کی ایک عبارت) کے خیال سے متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مؤلف موبد شاہ یا ملاّ موبد ہے (نیز تب Ouseley: *Notices*، ص ۱۸۲)۔ اتنی بات تو خود کتاب ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا مصنف ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء سے کچھ پہلے ہندوستان میں پیدا ہوا اور جوانی ہی میں آگرے جا پہنچا؛ کچھ سال کشمیر اور لاہور میں گزارے؛ ایران (مشہد) بھی گیا اور مغربی اور جنوبی ہند سے کچھ واقفیت حاصل کی۔ یہ یقینی بات ہے کہ دبستان ۱۰۶۳ اور ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۳-۱۶۵۷ء کے درمیان لکھی گئی۔

مآخذ: (۱) دبستان مذاہب (کلکتہ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء): اس کتاب کے دیگر ایڈیشن تہران، بمبئی، لکھنؤ کے ہیں؛ (۲) *The Dabistan or school of manners*، مترجم David Shea و Anthony Troyer، پیرس، ۱۸۴۳ء، ۳ جلد (ہر جگہ پر صحیح نہیں ہیں)؛ (۳) *JA*، ۶ (۱۸۴۵ء): ۲۰۶ تا ۲۱۱؛ (۴) Rieu: *Cat. Persian Mss. of the British Museum*، ۱ : ۱۴۱ و ۳ : ۱۰۸۱ (مخطوطات کی دیگر فہرستوں کے علاوہ علاحدہ ابواب کے قدیم تراجم کے مفید حوالجات دیے گئے ہیں)؛ (۵) Ethé: *Cat. of the Persian Mss. of the India Office Library*، جلد ۱، عدد ۱۲۶۹، (مخطوطات کی دیگر فہرستوں کے مفید حوالے)؛ [(۶) وآ، ع، مصر، ۹ : ۱۳۱]۔

(H. MASSÉ و J. HOROVITZ)

دبیر: مرزا سلامت علی، لکھنوی، ایک اردو شاعر، جنھوں نے اپنی ساری زندگی شہدائے کربلا کی شہادت پر انتہائی عقیدت مندانہ مرثیہ گوئی اور [illegible] کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ مرزا غلام حسین کے بیٹے تھے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ملا ہاشم شیرازی (برادر مشہور اہلی شیرازی، م ۹۳۴ھ/۱۵۲۷-۱۵۲۸ء) کے پوتے تھے۔ سلامت علی محلۂ بلی ماران، دہلی میں ۱۰ جمادی الاولی ۱۲۱۸ھ/۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں باپ کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور وہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ شہر کے مشہور علما سے انہوں نے دینی و غیر دینی علوم (منقول و معقول) کی تمام متداولہ فارسی و عربی کتب بصاب پڑھیں: اٹھارہ برس کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ شعر کہنے کا آغاز انہوں نے ابتدائی عمر (تقریباً ۱۲۳۰ھ یا ۱۲۳۲ھ) میں کر دیا تھا اور تحصیل علم کے ساتھ ساتھ میر مظفر حسین ضمیر کی نگرانی میں اسے جاری رکھا۔ انھیں بہت جلد شہرت حاصل ہو گئی اور نوابان اودھ، ان کے خاندان کے افراد اور دربار کے امرا دبیر کو عزت و تحسین کی نظر سے دیکھنے لگے۔ کم و بیش ساٹھ برس انہوں نے مرثیہ گوئی کی۔ آخری دنوں میں وہ بصارت سے قریب قریب محروم ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں واجد علی شاہ کلکتے میں اپنی جلا وطنی کے ایام بسر کر رہے تھے؛ چنانچہ ان کے ایما پر مرزا علاج کے لیے غالباً ذوالحجہ

۱۲۹۰ھ/ جنوری ۱۸۷۴ء کے آخر میں کلکتے پہنچ گئے (حیات دبیر، ۱ : ۹۹ ج) ۔ (اودھ اخبار میں دبیر کے انتقال پر جو سلسلۂ مضامین نکلا تھا، اس میں لکھا ہے کہ کلکتے میں ۱۲۹۱ھ میں گئے تھے ۔ دیکھیے معاصر، حصۂ اول، ص ۱۳۲، مقالہ بعنوان "مرگ دبیر" از قاضی عبدالودود) ۔ امراض چشم کے ایک ماہر جرمن معالج نے جو کلکتے میں واجد علی شاہ کے ہاں مقیم تھا، ان کی آنکھوں کا کامیاب آپریشن کیا جس سے ان کی بصارت عود کر آئی ۔ بعد ازاں وہ لکھنؤ واپس آ گئے اور اپنی عمر کے بیشتر حصے کی طرح یہ زمانہ بھی یہیں بسر کیا ۔ صرف ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں وہ کچھ عرصے کے لیے سیتا پور میں منتقل ہو گئے تھے ۔ ۱۸۵۸ء میں وہ کانپور اور ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد گئے ۔ آخرالذکر شہر میں وہ دوبارہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں گئے ۔ وہاں سے انجام کار لکھنؤ واپس چلے آئے اور وہیں ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ/ ۸ مارچ ۱۸۷۵ء کو انتقال کر گئے ۔ انھیں ان کے اپنے مکان میں دفن کیا گیا ۔ یہ مکان اس گلی میں واقع ہے جو اب ان کے نام پر کوچۂ دبیر کہلاتی ہے ۔ اسی کبرسنی میں انھوں نے محرومیِ بصارت اور جوان بیٹے اور بھائی کی موت سے صدمات اٹھائے.

بیان کیا جاتا ہے کہ دبیر ایک پرہیزگار، متقی، کریم النفس، مہمان نواز اور سنجیدہ و متین بزرگ تھے ۔ بحیثیت شاعر وہ بہت پُرگو تھے اور اچھے اشعار بڑی تیزی سے کہہ لیتے تھے ۔ ان کا کلام بیشتر مراثی، سلام (ان کے لیے دیکھیے المیزان، ص ۴۸۵) اور رباعیات پر مشتمل ہے (حیات دبیر، ۱ : ۲۷۲) ۔ شاعری کے اس میدان میں ان کے حریف ان کے معاصر میر انیس تھے، جن کا لکھنؤ میں نام چمکنے سے بہت عرصہ پیشتر دبیر شہرت کے جھنڈے گاڑ چکے تھے ۔ ان کی رقابت کی وجہ سے مداحین بھی دو حریف گروہوں میں بٹ گئے، جو "دبیریے" اور "انیسیے" کہلائے ۔ ایسا ادب خاصی مقدار میں منظر عام پر آیا جس میں ان دونوں کا موازنہ کر کے ان کے کلام کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی گئی تھی، مثلاً دیکھیے (۱) شبلی نعمانی : موازنۂ انیس و دبیر (آگرہ ۱۹۰۷ء)؛ (۲) سید نظیر الحسن فوق رضوی : المیزان (علی گڑھ، بدون تاریخ)؛ مظفر حسن ملک : مرزا دبیر مقالۂ ڈکتوری ؛ (۳) مرزا محمد رضا معجز : تطہیر الاوساخ ؛ (۴) میر افضل علی ضو : ردّ الموازنہ، وغیرہ وغیرہ.

جہاں جہاں انیس کی تعریف ان کی زبان کی سادگی، کلام کی روانی اور فصاحتِ بیان کے باعث کی جاتی ہے وہاں دبیر کو ایجاز، تازگیِ مضامین، صنائع و بدائع کے کثیر استعمال اور بینوں کے سبب سے سراہا جاتا ہے ۔ عربی و فارسی کے عالم ہونے کی وجہ سے دبیر ان زبانوں کے ادب سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں قرآن، حدیث، اور مقاتل وغیرہ کے متعلق تصانیف سے مواد لے کر شامل کیا ۔ حیات دبیر، ۱ : ۲۹۰ میں دونوں شعرا کا یوں موازنہ کیا گیا ہے کہ "میر فصیح و شیرین ہیں اور مرزا دقیق و نمکین" ۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ انھیں دو شعرا کی کوششوں سے مرثیے کو اردو شاعری میں ایسا اہم مقام حاصل ہوا.

تصنیفات :

دبیر کی اکثر منظومات لتھو میں طبع ہو چکی ہیں، گو ابھی چند ایک غیر مطبوعہ ہیں ۔ ان ایڈیشنوں میں سے جو الحاقات و اضافات کے باعث ناقص ہو چکے ہیں، مفصلۂ ذیل بھی ہیں : مثلاً (۱) دو جلدوں میں مراثی کا ایک ایڈیشن مطبع نول کشور میں چھپا (حیات دبیر، ۱ : ۶۲۴)؛ (۲) دفتر ماتم، لکھنؤ ۱۸۹۷ء؛ ۲۰ جلد : مندرجات کے تجزیے کے لیے دیکھیے حیات دبیر ۱ : ۲۷۶ بیعد یہ مراثی ۱۸۵۷ء اور مابعد کے فسادات میں گم ہو گئے تھے اور آگے چل کر دوبارہ جمع کیے گئے ؛ (۳) مراثی دبیر، طبع اودھ اخبار پریس، ۲ جلد ؛ وہی کتاب، ۱ : ۴۹۰ ؛ (۴) مرثیۂ مرزا دبیر، ۲ جلد،

لکھنؤ ۱۸۷۵-۱۸۷۶ء، کانپور ۱۸۹۰-۱۸۹۹ء (آئندہ برسوں میں کئی ایڈیشن شائع ہوے)؛ (۵) مرثیہ‌ہاے مرزا دبیر، لکھنؤ ۱۸۸۲ء (آئندہ برسوں میں کئی ایڈیشن شائع ہوے)؛ (۶) اس کی یہ تصانیف بھی ہیں: ابواب المصائب، نثر میں ایک تصنیف، جو حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے سے متعلق ہے؛ اس کا مقابلہ شہید کربلا کی سرگزشت سے کیا گیا ہے، طبع یوسفی پریس دہلی (حیات دبیر، ۱: ۲۸۰)؛ (۷) رباعیات مرزا دبیر، لکھنؤ، بدون تاریخ، ۷۹۱ رباعیات۔ ان کا ایک نسبۃً مختصر مجموعہ بھی رباعیات انیس کے ساتھ آگرے سے شائع ہوا تھا۔

ابتداے عمر میں مرزا نے غزلیات کے بھی تین دیوان مرتب کیے تھے، لیکن بعد ازاں یا تو ضائع ہو گئے یا گم ہو گئے یا شاید شاعر نے انھیں اپنے کلام سے خارج کر دیا۔

مآخذ: متن میں مندرجہ حوالوں کے علاوہ: (۱) میر محسن علی: سراپا سخن، لکھنؤ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء، ص ۱۰۸؛ (۲) میر صفدر حسین: شمس الضحی، لکھنؤ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰-۱۸۸۱ء؛ (۳) علی حسن خان: بزم سخن، آگرہ ۱۲۹۸ھ، ص ۴۸؛ (۴) سید افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی: حیات دبیر، لاہور، ج ۱، ۱۹۱۳ء، ج ۲، ۱۹۱۵ء؛ (۵) محمد حسین آزاد: آب حیات، لاہور ۱۸۸۳ء، ص ۵۵۰ تا ۵۶۲؛ (۶) رام بابو سکسینہ: *A History of Urdu Literature*، الہ آباد ۱۹۲۷ء، ص ۱۲۱ ببعد (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری، لکھنؤ ۱۹۵۲ء، ص ۲۴۸ ببعد)؛ (۷) ابواللیث: لکھنؤ کا دبستان شاعری، لاہور، تقریباً ۱۹۵۵ء، ص ۶۹۰ ببعد؛ (۸) J. F. Blumhardt: *Cat. of Hind. Printed Books in the Br. Mus.*، لندن ۱۸۸۹ء، عمود ۷، ۶، ۳۰۸، تکملہ، لندن ۱۹۰۹ء، عمود ۱۳۴؛ (۹) المعاصر، پٹنہ ۱۹۵۱ء، حصہ اول، ص ۱۳۲؛ (۱۰) عبدالحی: گل رعنا، اعظم گڑھ ۱۳۶۴ء، ۱۹۴۴ء۔

(محمد شفیع لاہوری)

دبیس: رک بہ مزیدی (خاندان) *

دبیق: (دبقہ اور دبقو اس کی دوسری صورتیں ہیں) دمیاط کے بیرونی نواح میں ایک مقام، جو اعلی قسم کے بنے ہوے کپڑوں کے لیے مشہور تھا، جو یہاں سے تمام اسلامی سلطنت میں برآمد کیے جاتے تھے۔ دبیق کا محل وقوع اس سے زیادہ صحیح طور پر معین نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا نام ان شہروں کے نام کے ساتھ ملتا ہے جو ناپید ہو چکے ہیں، جیسے شطا، تنّیس یا تونہ جو غالباً جھیل منزالہ (Lake Menzaleh) کے جزیروں میں واقع تھے۔ *

دبیق میں سونے کی منبت کاری کے باریک کپڑے بنتے تھے اور فاطمیوں کے عہد میں یہاں بوقلموں کتان کے عمامے تیار ہوتے تھے، یہاں کے بنے ہوے کپڑے ایسے نفیس ہوتے تھے کہ ''دبیقی'' کا لفظ یہاں کے کپڑے کے لیے استعمال ہونے لگا اور اس کی شہرت اتنی بڑھی کہ ایک خاص وضع کا کپڑا دبیقی کہلانے لگا۔ دبیقی کم و بیش ہر جگہ مثلاً تنیس، دمیاط، مثلث دہانہ (the Delta)، اسیوط، بالائی مصر، یہاں تک کہ ایران اور کازرون میں بھی تیار ہونے لگا۔ دبیق میں تیار ہونے والے کپڑے کی نفاست آگے چل کر یقیناً کم ہو گئی ہوگی، اس لیے کہ ادریسی لکھتا ہے: اگرچہ یہ کپڑے بہت نفیس تھے، لیکن تنیس اور دمیاط کے کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی نتیجہ اس سے پہلے ہی جدے کے چنگی خانہ کے حساب سے نکالا جا سکتا ہے جو المقدسی نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔

اس وقت کپڑے کے تین ٹکڑے پائے جاتے ہیں: ایک عباسیوں کے دور کا اور دو فاطمیوں کے عہد کے، جن کی چھاپوں پر دبیق کا نام موجود ہے۔

ابن مماتی نے جگہ کا نام نہیں دیا ہے، دبیقی کپڑے کا ذکر البتہ اس کے یہاں موجود ہے۔

ابن دُقماق (۵: ۸۹) اور ابن جیعان (ص ۷۶؛ عبداللطیف: *Relation de l'Egypte*، ۶۳۸) صوبۂ غربیہ

میں ایک جگہ کا ذکر کرتے ہیں ، جس کا نام دبیق ہے ، لیکن یہ وہ شہر نہیں ہو سکتا جو دمیاط کے قرب و جوار میں واقع تھا اور جس کا ان دونوں مصنفوں نے علحدہ علحدہ ذکر کیا ہے (ابن دقماق ، ۵ : ۸۷ ؛ ابن جیعان ، ص ۶۲ اور عبداللطیف ، ص ۶۲۰) .

محض فاصلے ھی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ ھم قدیم دبیق اور آج کل کے دبیج کو ایک کہہ سکیں ، جو سنبلاوین کے جنوب میں بارہ کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور جو ھو سکتا ہے کہ وھی دیق ھو جس کا ذکر ابن دقماق اور ابن جیعان نے کیا ہے .

مآخذ : (۱) Ya'Kūbī-Wiet، ص ۱۹۴ تا ۱۹۵؛ (۲) ابن خُرّداذبہ، ص ۸۳؛ (۳) الادریسی: مغرب، ص ۱۸۶ تا ۱۸۷؛ (۴) ناصر خسرو، ص ۱۰۱؛ (۵) اَلمقدّسی، ص ۵۴، ۱۰۳، ۱۹۳، ۲۳۳؛ (۶) ابن دقماق، ص ۸۱؛ (۷) المقریزی، طبع Weit، ۲ : ۸۴؛ ۳ : ۲۰۰، ۲۱۵؛ ۴ : ۸۲ (مع ماخذ کی ایک طویل فہرست کے)، ۲۳۷؛ (۸) لسٹرینج Le Strange، ص ۲۹۳؛ (۹) Salmon : *Introduction d l'histoire de Bagdadh*، ص ۱۲۹، ۱۳۸، ۱۴۰؛ (۱۰) J. Maspero و Weit : *Matériaux pour servir à la géographie de l'Egypte*، ص ۱۷۸؛ (۱۱) R.B. Serjeant : *Islamic Textiles*، در *Ars Islamica*، ۱۳ : ۸۹، ۹۴، ۹۷، ۹۸، ۱۰۰؛ ۱۵ : ۷۶؛ (۱۲) Weit : *Tissus et Tapisseries*، در *Syria*، ۱۶ : ۲۸۲ تا ۲۸۳؛ (۱۳) Kühnel : *Dated Tiraz Fabrics*، ص ۱۰۷؛ (۱۴) *RCEA*، ۳ : ۹۰۲؛ ۶ : ۲۰۳۳، ۲۱۷۵؛ [(۱۵) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مصر، ۹ : ۱۳۲] .

(G. Wiet)

* **دَیبل** : رک بہ دُوِین .

* **دُبَی** : (جسے عام طور پر دُبَئی لکھا جاتا ہے)، ایک بندرگاہ (۲۵ درجے ۱۶ دقیقے شمالی اور ۵۵ درجے ۱۸ دقیقے شرقی) اور ریاست بھی ، جس پر ایک شیخ کی حکومت ہے ۔ یہ عرب کے اس ساحل پر واقع ہے جس کی حد بندی عارضی صلح نامے کی رو سے عرب کی عارضی صلح کے ساحل (Trucial Coast) تک کی گئی تھی ، دبی کا شہر ایک بل کھاتی ھوئی کھاڑی (خَور) کے کنارے آباد ہے جو خشکی کے اندر تقریباً آٹھ میل تک چلی گئی ہے ۔ شمال مشرق کنارے پر واقع کاروباری علاقے دیرہ اور جنوب مغربی کنارے پر آباد الشندغه اور دُبَی خاص کے محلوں کے درمیان کشتیوں کے ذریعے آمد و رفت ھوتی ہے ۔ شہر کی سینتالیس ھزار نفوس کی آبادی میں غالب اکثریت عربوں کی ہے ، لیکن اس میں کچھ ایرانی ، ھندوستانی اور بلوچی بھی ھیں (Hay ، ص ۱۰۴) اس ریاست کے عرب السودان ، الدرر ، المزّارین ، آل بُومُہیر ، الہوامل ، القُمزان ، المحاربة ، السبایس اور آل بوفلاح قبائل پر مشتمل ھیں ۔ ان قبائلی گروھوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ علاقۂ خلیج فارس کے بنی یاس اور العناصر (دراصل ایک بدوی قبیلہ) کے افراد کا مجموعہ ھیں ۔ حکمران خاندان ، یعنی آل بوفلاسا ، قبیلۂ الرواشد سے تعلق رکھتا ہے اور یہاں کی اکثریت کی طرح مالکی مذھب کا پیرو ہے .

ریاستِ شیخ کی سرحدیں مکمل طور پر متعین نہیں کی گئی ھیں ، جبل العالی (جسے بعض اوقات الجُبَیل کہا جاتا ہے) اور خَور غناضة کے درمیان واقع آخری ساحلی مقام ، دبی اور ابو ظبی کے شیوخ کی ریاستوں کے درمیان خشکی کی سرحد ہے ۔ دُبی اور الشارقه کے شیوخ کی ریاستوں کے درمیان خشکی کی سرحد دَیرہ کے عین شمال مشرق میں ختم ھو جاتی ہے : دو چھوٹے ساحلی گاؤں ام السُّقَیم اور جُمیرة اور ان سے بڑا گاؤں حجرین پر ، جو وادی حتا کے پچاس میل اندر اور ریاست کے باقی علاقوں سے الگ تھلگ واقع ہے ، فرمان روائے دُبی کے زیر سیادت ہے ۔ یہاں کھجوروں

کے درخت اگائے جاتے ہیں ، لیکن پانی کی شدید قلت ہے۔

۱۲۱۳ - ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء سے قبل دبّی کے متعلق بہت کم معلومات میسر ہیں۔ دستیاب شدہ مآخذ [Lorimer] میں پہلی مرتبہ اس کا ذکر اسی سنہ کے ذیل میں ملتا ہے۔ انیسویں صدی کے پہلے تہائی حصے کے دوران میں دبّی ابو ظبی کے ماتحت سمجھا جاتا تھا ، البتہ اس میں سے ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء کے بعد کئی سال کی وہ مدت مستثنیٰ ہے جب القواسم کے شیخ سلطان ابن صقر ، حاکم الشارقۃ ، نے یہاں کے عامل محمد بن ھزل بن زعل کی بہن سے شادی کرکے دبی تک اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا (Selections : India، ۲۴ : ۳۱۷).

۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں جب آل بوفلاسا کے تقریباً آٹھ سو ارکان نے مکتوم بن بطی بن سہیل کی قیادت میں ابو ظبی کو چھوڑ کر دبّی کی نو آبادی کا انتظام سنبھالا ، (السالمی ، ص ۳۱) تو اسے ایک خود مختار ریاست کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس ریاست کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لینے کی خاطر پوری انیسویں صدی میں بلکہ بیسویں صدی کے آغاز تک القواسم اور بنی یاس کے درمیان کشمکش جاری رہی لیکن دبّی نے کبھی الشارقہ ، کبھی ابو ظبی اور بعض موقعوں پر عجمان اور ام القیّوین کی چھوٹی چھوٹی شیوخ کی ریاستوں سے معاہدے کرکے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ دبّی کی آبادی اور خوشحالی میں معتدبہ اضافہ ہوا جو زیادہ تر موتی نکالنے کے کاروبار اور درآمدی و برآمدی تجارت کا مرہون منت تھا.

دوسری عارضی صلح کی پابند ریاستوں (Trucial States) کی طرح دبّی نے ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء میں برطانیہ کے ساتھ معاہدۂ صلح اور ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں عارضی بحری معاہدے (جو بعد میں مستقل ہو گیا) پر دستخط کیے (دیکھیے مادّۂ ابو ظبی) ، ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں دبّی کا حکمران اس بات پر رضا مند ہو گیا کہ وہ برطانیہ کی منظوری کے بغیر برطانیہ کے سوا کسی بیرونی ملک سے تعلقات استوار نہیں کرے گا اور ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء میں اس نے یہ بات مان لی کہ وہ اپنے علاقے میں دریافت شدہ تیل کے حقوق حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ آدمی کے سوا کسی دوسرے کو نہیں دے گا۔ بیرون ساحل مراعات کے منافع میں برطانوی کمپنی British Petroleum Exploration (سابقہ D'Arcy Exploration Co. Ltd.) کا دو تہائی حصہ ہے اور فرانسیسی کمپنی Compagnei Francaise des Petroles کا ایک تہائی۔ عراق پٹرولیم کمپنی سے ایک ملحقہ ادارے Petroleum Development (Trucial Coast) Ltd. کو اندرون ساحل تیل کی مراعات حاصل ہیں۔ یہاں ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء تک تیل دریافت نہیں ہوا تھا.

خورالشارقہ میں ریت بھر جانے اور لنگہ Linga [رک بآں] کے زوال کے باعث دبّی کو حالیہ خوشحالی نصیب ہوئی ہے۔ یہاں موتی [اب ایک روبہ زوال صنعت] اور خشک مچھلی کی برآمد ہوتی ہے اور سامان خوراک ، کپڑا اور ہلکی مشینری درآمد کی جاتی ہے۔ ایک ساحلی سڑک دبّی کو شمال میں دو میل کے فاصلے پر واقع الشارقہ اور جنوب میں ۸۰ میل دور قصبۂ ابوظبی سے ملاتی ہے۔ اندرون ملک البُریمی اور مسقط کو ریگستانی پگڈنڈیاں جاتی ہیں.

حال ہی میں اس ریاست کے انتظامی اداروں کو وسعت دی گئی ہے۔ اب ان میں مجلس بلدیہ (Municipal Council) ، انتظامیۂ گمرک (Custom Administration) ، عدلیہ اور تعلیم ، صحت ، تسجیل اراضی (Land Registration) اور آب رسانی کے محکموں کا اضافہ ہوا ہے۔ شہر میں ایک ہسپتال ، لڑکوں کے لیے چار اور لڑکیوں کے لیے دو مدرسے ، سلسلہ تار و ٹیلیفون اور باقاعدہ ڈاک کا انتظام اور ایک چھوٹا سا ہوائی اڈا ہے۔ ابوظبی کے سوا باقی تمام عارضی صلح کی پابند ریاستوں کے برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کے صدر دفاتر ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء میں الشارقۃ سے دبّی میں منتقل

ہو گئے تھے آج کل (۱۹۶۲ء) شیخ راشد بن سعید بن مکتوم دبی کا فرمانروا ہے .

مآخذ : (۱) مجلۃ العربی، عدد ۲۲، کویت، بابت ستمبر ۱۹۶۰ء : (۲) محمد السالمی : نہضۃ الأعیان بحریۃ عمان، قاہرہ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء : (۳) Admiralty : *A handbook of Arabia*، لنڈن ۱۹۱۶ - ۱۹۱۷ء : (۴) *A collection of Treaties, engagements and sanads*، طبع C. Aitchison، ج ۱۱، دہلی ۱۹۳۳ء : (۵) India : *Selections from the records of the Bombay government*، n.s.، ج ۲۴، بمبئی ۱۸۵۶ء : (۶) Rupert Hay : *The Persian Gulf states*، واشنگٹن ۱۹۵۹ء : (۷) J. Larimer : *Gazetteer of the Persian Gulf, Oman and Central Arabia*، کلکتہ ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۵ء : (۸) سعودی عرب : *Memorial of the government of Saudi Arabia* [البریمی کا ثالثی فیصلہ]، ۱۹۵۵ء : (۹) *The Arab states of the Persian Gulf and south-east Arabia*، نشر شعبۂ حوالہ جات، مرکزی دفتر اطلاعات، لنڈن ۱۹۵۹ء : (۱۰) *Arbitration concerning Buraimi and the common frontier between Abu Dhabi and Saudi Arabia*، مطبوعۂ حکومت برطانیہ، ۱۹۵۵ء .

(PHEBE MARR)

* **دپلوماسیاً :** رک بہ ایلچی، سفیر، معاہدہ .

* **دَثِینَہ :** (قتبانی کتبوں میں [illegible])، جنوبی عرب کا ایک ضلع، جس کے شمال مغرب میں عوذلہ (رک بہ مقالہ عَوَذَلی) اور مشرق میں عوالک (رک بہ مقالہ عوالق) کے اقطاع ہیں اور یہ ان کے درمیان واقع ہے . یہ ضلع مغربی عدن کی حکومت کے اندر ہے اور اس کی آبادی تقریبا آٹھ ہزار ہے ۔ الھمدانی نے اس حصہ ملک کو "غائط" (=گیاہی صحرا) لکھا ہے اور اس کے بڑے حصے پر یہی لقب اب بھی صادق آتا ہے ۔ آب و ہوا خشک ہے اور صرف شمال مشرقی حصے میں پیداوار ہوتی ہے، جو تمباکو، گندم اور جوار ہے ۔ دَثِینہ میں دو بڑے قبیلے آباد ہیں : اہل إِسْمَیدی (=السمیدی) اور عُلَہ (العُلَہ : عُلَہ الکُور اور عُلَہ البَحْر) ۔ بڑا بازار الحَافَہ ہے (جسے سوق اہل إِسْمَیدی بھی کہتے ہیں)، زیادہ وسیع مفہوم میں دَثِینہ میں مَیاسر اور حَسَنہ قبائل کے ضلع بھی شامل ہیں : یہیں شہر مُودِیَہ بھی ہے (ام اودیہ =وادیاں)، جو ۱۹۴۴ - ۱۹۴۵ء سے حکومت کا صدر مقام ہے .

دَثِینہ بہت قدیم ملک ہے جس کا ذکر کتبات میں آتا ہے الھمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب میں اس کے بہت سے تفصیلی حالات لکھے ہیں ۔ اس زمانے میں اس کے اندر غالباً وہ علاقہ بھی شامل تھا جو آج کل عَوذِلہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہاں بنو اَوْد سکونت پذیر تھے، جو بہت اچھی عربی بولتے تھے ۔ بڑی وادیاں یہ ہیں : مغربی دَثِینہ، الحار، تاران، الغَمر، الحُمَیْراء، المُعَوران، مُعْصِب، عُرقَان، مَرّان، عزّان اور ضرا ۔ کثیر بستیوں کے ناموں میں ان کا ذکر آیا ہے : آثِرہ، الخُبَینہ، المُوَشّح (جو کبھی دثینہ میں سب سے بڑا قصبہ تھا) وغیرہ ۔ بڑا پہاڑ الکور (کَور عَوذِلہ) ایک زمانے میں دَثِینہ میں شامل تھا : چھوٹی پہاڑیاں جبل اَسْود اور رائش ہیں .

کچھ اور جگہیں بھی ہیں جو دَثِینَہ یا دَفِینہ کہلاتی ہیں ۔ جغرافیہ نویس ایک قریے کا ذکر کرتے ہیں جو بصرے اور مکۂ معظمہ کے درمیان تھا اور جس کا نام عموماً الدفینہ قلم بند کیا گیا ہے .

مآخذ : (۱) Ryckmans : *Les noms Propres*، ۱ : ۳۳۰ : (۲) الھمدانی : جزیرہ (طبع Müller)، ص ۸۰، ۹۱ ببعد، ۹۶، ۱۲۵، ۱۳۴ : (trad. Forrer)، ۱۰۲، ۱۲۶، ۱۳۱ ببعد، ۱۵۳ ببعد : (۳) یاقوت : المعجم، ۲ : ۵۵۰ : (۴) Sprenger : *Die alte Geographie Arabiens*، Berne ۱۸۷۵، ص ۸۱، ۱۸۲، ۲۷۵ ببعد : (۵) H. v. Maltzan : *Reise nach Südarabien*، Brunswick ۱۸۷۳ء، ص ۲۶۹ تا ۲۷۴ : (۶) C. Landberg، در *Arabica*، ۱۸۹۷ء، ۴ : ۹ تا ۲۵ : (۷) وہی مصنف : *Études sur les dialectes de l'Arabie méridionale*

دثینہ، ۲ : ۱ تا ۶ (۱۹۰۵ تا ۱۹۱۳ء)، بمواضع کثیرہ؛ (۸) وہی مصنف: *Glossaire Datinois*، ج ۱ تا ۳ (۱۹۲۰ - ۱۹۳۲ء)، بمواضع کثیرہ؛ (۹) Doreen Ingrams: *A Survey of social and economic conditions in the Aden Protectorate*، Eritrea ۱۹۴۹ء، ص ۲۷ تا ۳۳؛ (۱۰) v. Wissmann و Höfner: *Beiträge zur hist. Geographie de vorislam. Südarabien*، Wiesbaden ۱۹۵۳ء، ص ۶۰ ببعد، بمواضع کثیرہ۔ نقشہ: جنوبی عرب؛ عدن محمیہ، لوح ۱، از v. Wissmann، ۱۹۵۷ء؛ پیمانہ ۱ : ۵۰۰٬۰۰۰ (مع دثینہ کے خاص خریطے کے ۱ : ۲۵۰٬۰۰۰)؛ [(۱۱) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مصر، ۹ : ۱۳۲؛ (۱۲) المکتبۃ الجغرافیۃ العربیۃ، طبع دخویہ، ۳ : ۸۹ و ۵ : ۲۶ و ۶ : ۱۳۶، ۱۹۰]۔

(O. LÖFGREN)

* **دَجَاجَۃ** : [(ع) : واحد]، بمعنی گھریلو مرغی، اس کا اطلاق عرب لغات نویسوں کے قول کے مطابق نر اور مادہ دونوں پر کیا جا سکتا ہے۔ متبادل تلفظ دِجاجۃ اور دُجاجہ ہیں۔ زیادہ زمانۂ حال کے مقامی استعمال میں (قَبّ Iayakar اور مَعْلُوف) دجاجۃ البحر اور دِجاجۃ القُبّہ مچھلی کی بعض اقسام کو ظاہر کرتے ہیں [جمع : دِجاج، دَجاج، دُجُج، دَجائِج دَجَاجات]۔

اس جانور سے، جس کا ذکر عبرانی بائبل میں موجود نہیں، اہل عرب قبل اسلام کے زمانے سے واقف تھے۔ الجاحظ: (۲ : ۲۷۷ ببعد) کا بیان ہے کہ اسے بطور انعام شعرا کو ان کے ادبی کارناموں کے صلے میں دیا جاتا تھا۔ اسلامی شریعت میں اسے انسانی خوراک کے طور پر جائز قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ دیکھا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھاتے تھے۔

مرغی اور اس کے انڈوں کے بارے میں علم حیوانات سے متعلق عربی تحریروں میں جو مفصل معلومات درج ہیں ان کا ماخذ جزوی طور پر ارسطو کی *Historia Animalium* کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ مرغی شکاری جانوروں سے نہیں ڈرتی، بجز گیدڑ کے، کیونکہ ان دونوں کے درمیان ایک جبلّی مخاصمت پائی جاتی ہے۔ اسے رات کے وقت ڈر لگتا ہے، اور اس لیے وہ سونے کے لیے کوئی بلند جگہ تلاش کر لیتی ہے۔ اس میں شکار کرنے والے اور دانہ چگنے والے دونوں قسم کے پرندوں کے خواص یکساں طور پر پائے جاتے ہیں، کیونکہ وہ گوشت بھی کھاتی ہے اور اناج بھی۔ جاڑے کے دو مہینوں کے سوا سال بھر کے دوران میں مرغی زیادہ تر ایک انڈا روزانہ دیتی ہے (بقول النُّوَیری مصر میں پورے سال بغیر وقفے کے)۔ اگر وہ دن میں دو مرتبہ انڈا دے تو یہ اس کی عنقریب ہلاکت کی علامت ہوتی ہے۔ انڈے کی سفیدی سے چوزہ پیدا ہوتا ہے، بحالیکہ زردی جنین کے لیے غذا مہیا کرتی ہے۔ لمبوترے انڈوں سے مادہ چوزے پیدا ہوتے ہیں اور گول انڈوں سے نر۔ دہری زردی کے انڈوں سے دو چوزے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انڈوں پر بیٹھی ہوئی مرغی بادل کی گرج سن لے تو انڈے خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ بوڑھی اور کمزور ہو تو انڈوں میں زردی نہیں ہوتی اور ان سے بچے نہیں نکلتے۔ وہ مُرغ سے جفت ہوئے بغیر بھی [محض خوراک کے سہارے] انڈے دیتی ہے، لیکن اس قسم کے انڈوں سے بچے نہیں نکلتے۔ جب مرغیاں موٹی ہو جاتی ہیں تو وہ انڈے دینا موقوف کر دیتی ہیں۔

[عربی] ماخذ کئی قسم کی مرغیوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی کیفیت بیان کرتے ہیں، جن میں سے بعض جسامت میں بطخ کے برابر ہو جاتی ہیں۔ حیوانات اور ادویہ کے عرب ماہرین نے مرغی کے انڈوں، چربی، پتے، پوٹے، بیٹ وغیرہ کے بہت سے طبی استعمال بیان کیے ہیں، جن میں سے بعض کے مآخذ قدیم یونانی تحریریں ہیں۔ مرغی کے گوشت کو صحت مند خوراک

سمجھا جاتا ہے، اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا مسلسل استعمال نقرس اور بواسیر پیدا کرتا ہے؛ نیم پخت انڈے قوت باہ کو بڑھانے کے لیے خاص طور پر کارآمد سمجھے جاتے ہیں۔ مرغی کو خواب میں دیکھنے کی تعبیر پر متعلقہ کتب میں بحث کی گئی ہے۔ عرب ہیئت دان ستاروں کے ایک مجموعے کو الدجاجہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جسے الطائر بھی کہا جاتا ہے۔

مآخذ: (۱) عبدالغنی النابلسی: تعطیر الانام، قاہرہ ۱۳۵۴ھ، ۱ : ۲۲۰ ببعد؛ (۲) الدمیری، بذیل مادہ (ترجمہ Jayakar، ۱ : ۶۶۷ ببعد؛ (۳) داؤد الانطاکی: تذکرہ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۱ : ۱۳۹؛ (۴) الجاحظ: الحیوان، طبع دوم، اشاریہ؛ (۵) ابن العوام: فلاحۃ (ترجمہ Clément-Mullet)، ۲ ب : ۲۴۲ ببعد؛ (۶) ابن قتیبہ: عیون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۵ء- ۱۹۳۰ء، ۲ : ۷۱، ۹۲ (ترجمہ Kopf، ص ۴۴، ۶۸)؛ (۷) الابشیہی: المستطرف، باب ۶۲، بذیل مادہ؛ (۸) القزوینی (Wüstenfeld)، ۱ : ۳۲، ۴۱۳ ببعد؛ (۹) المستوفی القزوینی (Stephenson)، ص ۷۰ ببعد؛ (۱۰) النویری: نہایۃ الارب، ۱۰ : ۲۱۴ ببعد؛ (۱۱) امین معلوف: معجم الحیوان، قاہرہ ۱۹۳۲ء، اشاریہ؛ (۱۲) وو آ، ع، ۹ : ۴۴۰ ببعد؛ (۱۳) البستانی: دائرۃ المعارف، بیروت ۱۸۸۴ء بذیل مادہ]۔

(L. Kopf)

⊕ **الدّجّال:** (ع) مادہ دجل، صیغۂ مبالغہ، بمعنی حقیقت کو چھپانے والا، سب سے بڑا دھوکے باز اور چالباز (لسان العرب، زیر مادۂ دجل، اور ابن الاثیر، ۲ : ۱۴)۔ مادۂ دجل کے اصل معنی ہیں: (۱) خلط (یعنی خلط ملط کر دینا)؛ (۲) تلبیس (شیطانی چالوں سے دوسروں کو دھوکے اور التباس میں ڈالنا)؛ (۳) تمویہ (ملمع سازی کرنا، حقیقت کو چھپانا)؛ (۴) کذب (جھوٹ بولنا اور غلط بیانی کرنا)؛ گویا دجّال میں یہ تمام اوصاف بد پائے جاتے ہیں۔ دجّال کی جمع دجّالون اور دجاجلہ آتی ہے (لسان العرب، مادۂ دجل؛ الفائق ۱ : ۳۸۶، ابن الاثیر، ۲ : ۱۴)۔

اسلامی اصطلاح میں دجال سے مراد جھوٹا مسیح (اَلْمَسِیْحُ الدَّجّال) ہے اور اس کا دجل اس کی جادوگری اور کذب و فریب ہے (لسان العرب، مادہ دجل)۔ بقول ابن الاثیر (۲/۱۴) دجال وہ ہے جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا اور الوہیت کا دعوٰی کرے گا۔ ابن خالویہ کے نزدیک دجال کے مفہوم کی بہترین تشریح وہ ہے جو ابو عمرو نے کی ہے یعنی اَلْمُمَوِّہُ الْکَذّاب (حقیقت کو چھپانے والا سب سے بڑا جھوٹا انسان)۔ قب لسان العرب، مادہ دجل و ابن الاثیر ۲/۱۴ والفائق ۱/۳۸۶)۔

بقول ابن سینہ مسیح دجال ایک یہودی ہوگا (لسان العرب، مادۂ دجل) اور شاہ رفیع الدین (ص ۸ ببعد) کے بیان کے مطابق دجال کا خروج و ظہور علامات قیامت میں سے ہے۔ [احادیث میں بھی ایسا ہی مرقوم ہے (البخاری و مسلم)] اور زمانے کے لحاظ سے یہ امام مہدی کے ظہور کے بعد ظاہر ہوگا اور ان سے اس کا مقابلہ ہوگا۔ مکان کے لحاظ سے دجال کا ظہور اوّلاً عراق و شام کے درمیان ہوگا اور وہ نبوت کا دعوٰی کرے گا پھر وہ اصفہان کی طرف جائے گا جہاں وہ خدائی کا دعوٰی کرے گا اور ستر ہزار یہودی اس کی پیروی کریں گے (شاہ رفیع الدین، ص ۹ ببعد، و صحیح مسلم، ص ۲۲۵۲ ف ۲۲۶۶)۔ دجال کا ظہور مشرق کے کسی علاقے سے ظاہر ہوگا (سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب ۳۳) جن میں خراسان اور اصفہان کا نام بھی آتا ہے (مسند احمد ۱ : ۴ تا ۷، ۳ : ۲۲۴، ۶ : ۷۵) اور اس کے ظہور سے پہلے بڑی قحط سالی ہوگی اور لوگوں کو سختی کا سامنا ہوگا (مسند احمد ۶ : ۱۲۵، ۳۵۳ ببعد)۔

دجال کی علامات بھی احادیث میں بیان ہوئی ہیں مثلاً وہ کانا ہوگا اور اس کی آنکھ بھی پھولی ہوگی، جو سبز رنگ کے شیشے کی بنی ہوئی معلوم ہوگی، اس

کے بال حبشیوں کی طرح گھنگریالے ہوں گے اور گلا چوڑا چکلا ہوگا اور اس کی پیشانی پر "کافر" لکھا ہوگا (شاہ رفیع الدین، ص ۸؛ البخاری، کتاب الانبیاء، باب ۳، ۸، کتاب اللباس باب ۶۸، کتاب الفتن باب ۲۶، ۲۷؛ صحیح مسلم، ص ۲۲۴۸ ببعد؛ ابو داؤد طیالسی؛ مسند، حدیث نمبر ۵۴۳، ۲۵۳۳)۔ دجال کے پاس ایک باغ ہوگا جسے وہ جنت کہے گا، اور آگ ہوگی جسے دوزخ کا نام دیا جائے گا، اور اس کے ہاتھ سے خرق عادات ظاہر ہوں گے، جیسے آسمان سے مینہ برسانا، درختوں کو پھل لگانا، شیاطین کو لوگوں کے مردہ ماں باپ کی شکل میں زمین کے اندر سے نکالنا، اور یوں تیزی سے دنیا میں ادھر سے ادھر جانا جس طرح ہوا پر بادل تیرتے جاتے ہیں، وغیرہ (شاہ رفیع الدین، ص ۹ ببعد؛ صحیح مسلم، ص ۲۲۵۲ ببعد)۔

دجال کی فتنہ پردازی کی مدت چالیس دن ہوگی؛ پہلا دن ہمارے عام سال کے برابر ہوگا، دوسرا دن ایک ماہ کے برابر، تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر، اور باقی دن عام دنوں کی مانند ہوں گے (صحیح مسلم، ص ۲۲۵۲؛ شاہ رفیع الدین، ص ۹)۔ دجال تمام دنیا پر فتح پا لے گا مگر مکے اور مدینے میں داخل نہیں ہو سکے گا (حوالۂ سابق)۔ دجال کی فوج جب مدینے کے قریب آئے گی تو شہر میں تین مرتبہ زلزلہ آئے گا جس کے باعث بد عقیدہ اور منافق لوگ خائف ہو کر نکلیں گے اور دجال کے پھندے میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس وقت مدینے میں ایک بزرگ ہوں گے جو دجال کے مناظرے کے لیے نکلیں گے اور اسے دیکھتے ہی کہیں گے کہ یہی وہ دجال ملعون ہے جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ دجال کے حکم سے انھیں آرے سے چیر دیا جائے گا۔ پھر دجال اپنی شعبدہ بازی سے ان کے ٹکڑوں کو جوڑ کر زندہ کرے گا تو پھر وہ کہیں گے کہ اب تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ یقین ہو گیا ہے کہ تو وہی دجّال ہے۔ دجّال انھیں پھر قتل کرانے کی کوشش کرے گا مگر ناکام ہوگا۔ یہ بزرگ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے (صحیح مسلم، ص ۲۲۵۶؛ شاہ رفیع الدین، ص ۱۰)۔

دجال کے پیرو کاروں میں زیادہ تر یہودی، بد عقیدہ، منافق، کافر اور عورتیں ہوں گی (صحیح مسلم، ص ۲۲۶۶؛ مسند احمد، ۲/ ۶۷، ۲۳۸، ۳/ ۲۲۴، ۲۹۲، ۶/ ۷۵؛ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب ۳۳؛ شاہ رفیع الدین، ص ۱۰ ببعد)۔

احادیث کی رو سے دجال کا دور حکومت اور فتنہ پردازی کا عرصہ چالیس دن یا چالیس برس ہوگا (سنن ابو داؤد، کتاب الملاحم، باب ۱۴؛ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب ۳۳؛ مسند احمد، ۲: ۱۶۶؛ شاہ رفیع الدین، ص ۱۱)، اور اس کے بعد حضرت عیسی علیہ السلام دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی منارے پر نازل ہوں گے جہاں امام مہدی اپنی فوج کے ساتھ موجود ہوں گے جن کی اقتدا میں حضرت عیسیؑ نماز پڑھیں گے اور ان کی قیادت میں شریک لشکر ہو کر لُدّ کے مقام پر اپنے ہاتھوں سے دجال کو قتل کر دیں گے (لُدّ بیت المقدس کے قریب ایک شہر ہے)۔ اس کے بعد اس کے متبعین، جو اکثر یہودی ہوں گے، ادھر ادھر پناہ کی تلاش میں بھاگیں گے مگر انھیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ دجال کے پیروکاروں میں اکثریت عورتوں کی ہوگی (مسند احمد، ۶: ۶۷)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنۂ مسیح دجال سے بچنے کے لیے دعا بھی سکھائی ہے: اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں فتنۂ دجال سے پناہ مانگا کرتے تھے (البخاری، کتاب الفتن، باب ۲۶)۔

مآخذ: (۱) لسان العرب زیر مادۂ دجل؛ (۲) ابن الاثیر: النہایۃ، ۲: ۱۳، طبع المکتبۃ الخیریۃ قاہرہ؛ (۳) الزمخشری: الفائق، ۱: ۳۸۶ طبع قاہرۃ ۱۹۴۵ء؛ (۴) مسلم: الجامع الصحیح، ج ۴، [کتاب الفتن، باب ذکر الدجال] طبع محمد فؤاد عبدالباقی، قاہرۃ ۱۹۵۵ء؛ (۵) ابوداؤد:

سنن ابی داؤد ؛ (۶) ابن ماجہ ، سنن ؛ (۷) البستانی : دائرۃ المعارف ، ۷ : ۳۰۲ ببعد ، بیروت ۱۸۸۳ء ؛ (۸) المسعودی : مروج الذہب ، ۴ : ۲۸ ؛ (۹) شاہ رفیع الدین : علامات قیامت ، کراچی ۱۹۶۳ء ؛ (۱۰) محمد احمد قادری : علامات قیامت ، مطبوعۂ لاہور ؛ (۱۱) البخاری : الجامع الصحیح ، کتاب الفتن ، باب ۲۶ (ذکر الدجال) ، و باب ۲۷ (لایدخل الدجال المدینۃ) ؛ (۱۲) مفتاح کنوز السنۃ بذیل مادہ) ۔

(ظہور احمد اظہر)

* **دِجْلَہ** : عراق کے "دو دریاؤں" میں سے مشرقی دریا کا نام (جسے ہمیشہ ال کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے)، دجلہ ہماری رسم الخط کے دِگلت کی جدید اور معرب شکل ہے ۔ تورات کی کتاب پیدائش میں اسی کو حِدّقل لکھا گیا ہے ۔

یہ دریا (جدید ترکی میں دِقل نہری) سلسلۂ طارس Taurus کی جنوبی ڈھلانوں سے نکلتا ہے ۔ جھیل گُلچوک کے جنوب اور جنوب مشرق میں اس کی بالائی شاخ ان سب معاونوں کے ساتھ جن سے اس کی ترکیب ہوئی دامن کوہ اور میدان کے ایک وسیع علاقے کے بیکار پانی کو بہا کر لے جاتی ہے ۔ عہد عباسیہ کے صوبۂ جزیرہ کا شمالی حصہ اسی علاقے پر مشتمل ہے جس میں عمید (جدید دیارِ بکر)، میا فارقین اور بہت سے دوسرے شہر آباد تھے ۔ اس کے دوسرے معاونوں میں جغرافیہ نگار (ابن سراپیون، مقدسی، یاقوت)، نہرالکلاب (متبادل طور پر نہرالذئب)، وادی صلب، وادی ساتیدما اور وادی السّربَط کا نام بھی لیتے ہیں؛ لیکن جنھیں اب موجودہ معاونوں سے (ان کے ترکی ناموں کی شکل) بالخصوص ذوالقرنین سیو، امبرچے، ہُمک چے، بتمن سیو اور گرزن سیو میں یقینی طور پر متمائز نہیں کیا جا سکتا ۔ پھر جہاں یہ دریا مشرق سے جنوب کی طرف مڑ گیا ہے یعنی موجودہ تِل یا تِلّی (قرون وسطی میں تلّ فافان) کے مقام پر بُہتن چی مشرق سے بہتا ہوا اس میں آ ملا ہے اور جس سے دریاے دجلہ میں پانی کی مقدار کم از کم دوگنی ہو جاتی ہے ۔ یہ دریا ، جسے عرب جغرافیہ نگاروں نے وادی الزّرم کہا ہے ، ان اونچے اونچے پہاڑوں کے فالتو پانی کو جو جھیل وان کے جنوب میں واقع ہیں بہا لاتا ہے اور جن میں بِدلیس (موجودہ بتلیس) اور سِعِرد (جدید سیرت) کے خطے بھی شامل ہیں ۔ ان کے مقام اتصال سے اوپر پچاس میل مغرب کی جانب حصن کیفا (موجودہ حسن کیف) کا اہم شہر آباد ہے ۔

عرب جغرافیہ نگاروں نے بہتن چی اور الزاب الاعظم کے دہانوں کے درمیان نہر بزّنا، نہر باثنانا (یا باسانفا یا سفّان)، دریاے بُوبار اور وادی دُوشہ کا ذکر بھی بطور اس کے معاونوں کے کیا ہے ، جنہیں موجودہ پہاڑی نالوں میں شناخت کرنا غیر یقینی ہے ۔ آج کل یہ دریا خابور الحسنیہ (موجودہ خابور) اور اس کے معاون اطیزِل سو ہیں، جن کے ساتھ ساتھ ترکی عراق سرحد واقع ہے ۔ حسنیہ کے شہر (غالباً موجودہ زخو) میں کبھی ایک مشہور پل تھا ۔ دریاے ابو مریا (موجودہ وادی المُر جو دجلہ سے اسکی موصل ، سابق بلد میں آ ملا ہے) یا بائیں کنارے کے متعدد سیلابی نالوں کے سوا، خان پور کے جنوب میں الزاب الاعظم تک کوئی بڑا معاون اس میں نہیں ملتا، یعنی موصل (الموصل) ایسے بڑے شہر سے تیس میل اور آگے جو بجاے خود ایک ساسانی شہر تھا اور جسے بنی امیہ کے ماتحت خوب خوب ترقی ہوئی ۔

دریاے الزاب الاعظم سے، جو کچھ تو کوہ ہاے حکّاری اور کچھ ان پہاڑوں سے نکلتا ہے جن سے ایرانی عراق سرحد کی تشکیل ہوتی ہے، دریاے دجلہ کے پانی میں بہت بڑا اضافہ ہو جاتا ہے ۔ یہی کچھ ہم الزاب الاصغر کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، جو ایران و عراق کے سرحدی خطے میں ایک وسیع قطعے کے فالتو پانی کو بہا کر، اس دریا سے کوئی ساٹھ میل دور جنوب

میں، اس سے جا ملتا ہے ۔ الزاب الاعظم کے سنگھم کی تعیین قرون وسطٰی میں حدیثہ کے شہر سے ہوتی تھی اور الزاب الاصغر کی سِن سے، لیکن ان میں اب کوئی بھی باقی نہیں ۔ ان کے درمیانی علاقے میں اور کوئی معاون نہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ جبل سِنْجار کی کسی ندی یا ندیوں میں جب بعض موقعوں پر سیلاب آتا ہے تو ان کا پانی قلعہ شَرْقَط کے قریب اس دریا میں مل جاتا ہو۔

پھر جہاں یہ دریا جبل حَمْرِیْن کو الفتحہ کے مقام پر کاٹ کر اپنا رستہ بناتا ہے اس سے آگے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تَکْرِیْت یا اس سے کچھ پہلے وادی ثَرْثار (جس میں ہو سکتا ہے سیلاب کے بعض موسموں میں (مغربی) خابور کے آبی رقبے کا، جس کا تعلق قدرتی طور پر زیادہ تر دریاے فرات سے ہے، پانی بہ آتا ہو) الحضر سے گذرتے ہوئے اس میں آ گرتا ہے ۔ یاقوت نے تو اس علاقے میں ایک ایسی ندی کا بھی ذکر کیا جس سے فرات اور دجلہ میں باہم کشتی رانی بھی ہوتی تھی ۔ پھر وہ علاقے جن کا پانی تکریت سے اوپر دجلہ میں آ ملتا ہے سارا سال بارش ہی سے سیراب ہوتے ہیں، لہٰذا وہاں خشک سالی کا خطرہ تو ہے سیلابوں کا نہیں؛ البتہ چرسوں (ڈولوں) کے ذریعے چونکہ پانی کو باہر کھینچنے کے لیے طرح طرح کی ترکیبوں (موجودہ کرد) سے کام لیا جاتا تھا لہٰذا دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ فصلوں کی کاشت یقینی ہو گئی تھی ۔ رہا وہ سلسلۂ انہار جس کا تعلق قرون وسطٰی (اور جزوًا اس سے بھی زیادہ قدیم زمانے) سے ہے سو اس کی ابتدا تکریت سے آگے چل کر ہوتی تھی ۔ نہر الاسحاق، جو بلا شبہ چشموں کے پانی کی سیلابی ندی تھی اور جزوی طور پر اس پر قابو پایا ہوا تھا، اس کے دائیں کنارے سے نکلتی تھی ۔ اس کا وہ پانی جو آبپاشی سے بچ رہتا ہے سامرا سے آگے پھر اس میں جا ملتا تھا ۔ نہر دُجَیل بھی سامرا کے جنوب میں دجلے کے دائیں کنارے سے نکالی گئی تھی اور (کہا جاتا ہے کہ) کبھی کبھی دریاے فرات کی نہروں کے آخری حصوں کا پانی بھی اس میں شامل ہو جاتا تھا ۔ یہ نہر عُکْبَرا کے جنوب میں مختلف مقامات پر دجلے سے آ ملتی تھی ۔ عہد عباسیہ میں اس دریا کا راستہ اس کی موجودہ گزرگاہ سے کوئی پانچ سے بارہ میل مغرب کی طرف واقع تھا؛ سامرا سے جنوب میں ایک مقام سے لے کر بغداد سے کچھ دور شمال تک (یعنی تقریبًا ستر میل تک) جب قادسیّہ، العَلْث، عُکْبَرا اور رشیدیہ کے شہر اس کے ساتھ ساتھ آباد تھے آب پاشی کی کئی ایک سیلابی ندیاں بھی دریا کے اسی حصے سے نکالی گئی تھیں جنھیں آگے چل کر جب ایک حد تک یا پورے طور پر نظر انداز کر دیا گیا تو (شاید ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں) اس کا نام شُطَیْط ہو گیا، یعنی ننھا دریا۔

قاطُوْل ۔ تامَرّا ۔ نہروان کی عظیم آبی گذرگاہ کی ابتداء، جس کا تعلق اس دریا کے بائیں کنارے سے ہے، شاید ساسانی عہد میں ہوئی اور ترقی شروع عباسی عہد میں، اصل دریا سے 'دُور' کے قریب (سامرا سے پندرہ میل اوپر) نکالی گئی تھی؛ یہ زیادہ سے زیادہ تیس میل تک اور تقریبًا اس کے متوازی بہتے ہوئے (موجودہ) کوت العمارۃ (از منۂ متوسطہ کے ماذرایا) کے قریب پھر دجلے میں آ ملتی ہے، مگر اس سے پہلے عُزَیم اور دِیالا کا پانی بھی، جن کا خصوصاً دِیالا کا شمار آج کل دجلے کے اہم ترین معاونوں میں ہوتا ہے (رک بہ نہروان اور دِیالا)، بائیں جانب سے اس میں داخل ہو کر کسی نہ کسی طرح صرف بھی ہو جاتا ہے ۔ سلسلۂ نہروان کی دائیں جانب سے جو اہم نہریں نکلتی تھیں ان میں ایک "خالص" (جو ابھی تک اس نام سے موجود ہے، لیکن جس کا رخ بدل گیا ہے) تھی، دوسری "بِیْن" تھی ۔ یہی نہریں تھیں جن کے پانی سے بغداد کے شمالی علاقے میں گھنی کاشت ہوتی تھی،

بلکہ ایک حد تک خود شہر کے لیے پانی بھی مہیا ہو جاتا تھا۔

دریاے فرات کے اس علاقے (کم از کم بیس میل) اور وسطی عراق کے ذرا نشیب کے قرب کی وجہ سے متعدد بڑی نہریں اس کا پانی لاتی ہوئی اس دریا سے نکلتی تھیں اور ان کا بچا کچھا پانی شہر بغداد اور ماذرایا کے درمیان کئی مقامات پر دجلے میں گراتی تھیں۔ ان نہروں کی تفصیل یہ ہے: نہر العیسٰی (تخمیناً نہ کہ بعینہ صقلاویہ)، صَرصار اور مَلک (آج کل کی ابو غُریب اور رِضْوانیہ سے مشابہ)، کُوثا اور نِیل؛ آخری نہر حِلّہ (اور آثار بابل) سے کچھ پہلے نکلتی اور (موجودہ) کُوت سے قدرے شمال میں دجلے سے جا ملتی تھی۔ قرون وسطٰی میں ان نہروں، دریا کی اصل گزرگاہ اور اس کے متوازی سلسلۂ نہروان میں آبادی نسبۃً گنجان تھی اور بہتے ہوے پانی سے یا پانی کو باہر کھینچ کر کاشت کرتی تھی۔

ماذرایا اس مقام کی نشاندہی کرتا تھا جہاں سے بہاؤ کی جانب اس دریا کی قرون وسطٰی اور زمانۂ حال کی گزرگاہوں میں زیادہ سے زیادہ فرق نمایاں تھا۔ عہد عباسیہ میں اس کی موجودہ گزرگاہ کو، جس کا راستہ آج کل کے عَلِی الغربی، قلعۂ صالح اور عَمارہ کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے، کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی یا (تا آنکہ اس میں سیلاب نہ آتا) یا یوں کہیے کہ اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اصل دریا (موجودہ) دریاے حیّی یا غَرّاف کی گذرگاہ کے نیچے یا اس کے محاذ میں قرون وسطٰی کے عظیم، لیکن اب ناپید، شہر واسط اور جہاں آج کل حَیّی، قلعۂ سِکْر اور شَطْرہ آباد ہیں ان سے ہٹ کر بہتا تھا۔ دریاے دجلہ کی موجودہ گزرگاہ میں تبدیلی (جو غالباً زمانۂ قبل از اسلام میں بھی ہوتی رہتی تھی)، جس سے غَرّاف کو اگرچہ نسبۃً بہت کم، بایں ہمہ پانی کی اچھی خاصی مقدار مل جاتی تھی، عہد عباسیہ اور اس کے بعد سے بتدریج ہوتی رہی اور (جیسا کہ یورپی سیاحوں کا بیان ہے) دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ عباسیوں کے عہد میں فرات کی طرح دجلے کا پانی بھی واسط سے تقریباً ساٹھ میل نیچے (البطائح کی) دلدلوں میں جتنا کچھ بھی آب پاشی سے بچ رہتا جا گرتا تھا۔ یہ ایک عظیم آبی رقبہ ہے، موجودہ جھیل حمار کے مماثل، لیکن وسعت میں کہیں بڑا۔ عراق کے ان دونوں بڑے بڑے دریاؤں میں سیلاب آتا ہے تو اس کا سارا پانی یہیں بہ آتا ہے اور پھر ایک ہی آبی گذرگاہ کے ذریعے، جسے قرون وسطٰی میں دجلۃ العَوْراء (یک چشم دجلہ) اور عصر حاضر میں شَطّ العرب کہا جاتا ہے، خلیج فارس میں جا گرتا ہے۔ چنانچہ قُرنہ، البطائح کے منبع سے کچھ آگے شط العوراء ہی پر واقع تھا، جس کے بعد شہروں اور دیہات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ خشک زمین جو ان دو دریاؤں اور دریاے کارُون کی جمع شدہ گاد سے بنی تھی عہد عباسیہ کے اوائل میں (موجودہ) آبادان تک چلی گئی تھی، مگر پھر جب اس کا سلسلہ اور آگے بڑھا تو اس بندرگاہ کا وجود ختم ہو گیا۔ آب پاشی کی متعدد نہریں (بشمول ان کے جو بصرے تک گئی تھیں، مثلاً مَعْقِل اور اُبُلّہ) اسی علاقے میں جو آج وسیع نخلستانوں اور دیہات سے پٹا پڑا ہے، دجلۃ العوراء سے نکالی گئی تھیں۔ خلفا کے بحری جہاز اسی دلدل کے ذریعے واسط سے بھی کسی قدر آگے دجلے میں چلے آتے تھے۔

پھر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، دریاے دجلہ نے اگرچہ قرون وسطٰی سے اب تک ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنی گزرگاہ تبدیل کی ہے، اور گو ہم اس کے نظام انہار کا تصور بھی کر سکتے ہیں، کچھ اس عہد کے جغرافیہ نویسوں اور کچھ اس کے آثار کی بدولت، بایں ہمہ اس میں دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی اور ساتویں صدی ہجری/تیرھویں

صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں مستقل تبدیلیاں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ مؤخرالذکر کے وسط میں وہ مغول کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ پانی کے رخ اور بہاؤ، اس کی بندش اور نہروں میں اس کے اخراج کا معاملہ ہر صدی بدلتا رہا۔ ان میں بیشتر موسمی سیلابی ندیاں تھیں بغیر کسی سر آبہ گاہ کے، اور معلوم ہوتا ہے ہر سال جو تباہ کن سیلاب آتے ان کی روک تھام کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ تاہم دجلے کی آب پاشی اور شمال کی بارانی فصلوں سے بلا شبہ اتنی آبادی کو خوراک مہیا ہو جاتی تھی جو آج کل کی آبادی سے شاید تین گناہ زیادہ تھی، اور جو شہروں اور دیہات کے جم غفیر میں رہتی تھی، جو اب فراموش ہو چکے ہیں۔ ہولاگو خان (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) کی لائی ہوئی تباہی کے بعد صدیوں کی بد نظمی، آلام و مصائب اور جمود سے حالات جس طرح بد سے بدتر ہوتے گئے ان میں یہ سارا دریائی نظام بگڑ کر سر تا سر بے قابو ہو گیا۔ چنانچہ پھر اس مسئلے پر سنجیدگی سے چودھویں صدی ہجری/بیسویں صدی عیسوی میں غور ہوا۔

جدید عراقی حکومتوں کی مساعی صرف اس نظام آبپاشی پر مرکوز ہیں جن سے مقصد یہ ہے کہ دریا کی گزرگاہ مستقلاً ایک جگہ قائم رہے، اور اردگرد کا علاقہ، حتّٰی کہ ایک حد تک بغداد بھی سال کے سال آنے والے اور حد درجہ تباہ کن سیلابوں سے محفوظ رہے، مزید یہ کہ گرمیوں میں آب پاشی کے لیے پانی کا ذخیرہ کر لیا جائے اس لیے کہ وسطی اور جنوبی عراق میں بجز ربیع کی فصل کے، ساری کاشت کا دار و مدار انھیں نہروں پر ہے۔ اس سلسلے میں کئی ایک بند آب تعمیر کیے گئے ہیں، بالخصوص کُوت کا بند ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں، جس سے دریاے حیّ (غرّاف) میں پانی کی مناسب رسد پہنچائی جاتی ہے۔ اسی طرح کئی اور بند، نیز طغیانی کے اخراج کے لیے متعدد انتظامات بڑے پیمانے پر کیے جا رہے ہیں، یا زیر تجویز ہیں، مثلاً الزاب الاکبر پر، نیز وادی ثرثار کو کام میں لاتے ہوئے۔ البتہ اس دریا کی بلند اور نشیبی سطح میں پانی کے اخراج میں جو بہت زیادہ فرق ہے اور جو بغداد میں چھے ہزار سے سو مکعب میٹر فی سیکنڈ، بدلتا رہتا ہے اور جس کی وجہ شمال میں برف کا موسمی پگھلاؤ اور سرما و گرما کی بارشیں ہیں، اور دریا کے طاس میں سیلاب کی عدم گنجائش کے باعث اس سے دجلے کو قابو میں رکھنا اور استعمال میں لانا خاص طور پر مشکل ہو گیا ہے۔ رہی دجلے سے میکانکی پمپ کے ذریعے آبپاشی کی مزید اور اپنی جگہ پر اہم توسیع، سوہ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء سے اس عہد کا نمایاں کارنامہ ہے۔

دجلے میں معمولی یا ادنٰی قسم کی مچھلیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

موجودہ زمانے میں از منۂ قدیم اور قرونِ وسطٰی کی طرح، ہر طرح کی کشتیاں جیسی کہ ماضی سے آ رہی ہیں، مثلاً منڈھے ہوئے بیڑے جو موصل یا زاب اکبر و اصغر سے پانی کے بہاؤ کی سمت چلتے ہیں، رال سے لپی ہوئی لٹ بند ناویں، بادبانی کشتیاں اور ہر جسامت کے چپو سے چلنے والے ڈونگے استعمال میں آ رہے ہیں؛ جن میں ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء سے اب تک بغداد اور بصرہ (اور کبھی کبھی اور خطرناک طور پر بغداد اور موصل) کے درمیان دخانی جہازوں، موٹر کشتیوں اور ناؤوں کا متواتر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ پھر عام مسافروں اور مال برداری کے لیے جہازوں کی آمد و رفت کے علاوہ، دخانی دریائی بیڑوں نے دونوں عالمگیر جنگوں میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ بایں ہمہ اس دریا میں کشتی رانی کا معاملہ نہایت کٹھن ہے۔ ریل کا سلسلہ، جس کا ابتدائی حصہ (بغداد تا سامرّا) جرمنوں نے تیار کیا تھا اور جو ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں آمد و رفت کے لیے کھولا گیا تھا، اب دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ بغداد سے موصل تک

چلا گیا ہے اور موصل سے شمال کی جانب اس کی ایک شاخ مغرب کی طرف مڑتے ہوے ترکی ریلوے سے مل جاتی ہے ۔ بڑی بڑی سڑکیں، جو عہد عتیق کی پگڈنڈیوں کی جگہ بنی ہیں، دریا کے ساتھ ساتھ متعدد علاقوں میں چلی گئی ہیں ۔ یہ دریا ترکی میں دیار بکر، سیرت، اور ماردین کے صوبوں سے گذرتا ہے اور عراق میں موصل ، اربیل، بغداد ، کُوت العَمارہ ، اور بصرے کے صوبوں سے ۔

مآخذ : (۱) الاصطخری، ۱ : ۷۴ تا ۷۷ ، ۹۰ : (۲) ابن حوقل ، ص ۱۳۸ ، ۱۶۲ : (۳) المقدسی ، ص ۲۰ ، ۱۲۳ ، ۱۳۶ ، ۱۴۴ : (۴) ابن خرداذبہ ، ص ۱۷۵ : (۵) *BGA* ، ۷ : ۹۴ ، ۹۶ : (۶) المسعودی : التنبیہ ، ص ۵۲ ببعد : (۷) ابن سراپیون ، در *JRAS* ۱۸۹۵ء، ص ۱ تا ۷۶ ، ۲۵۵ تا ۳۱۵ : (۸) المسعودی : مروج ، ۱ : ۲۲۳ تا ۲۳۰ : (۹) یاقوت، ۲ : ۵۵۱ ببعد، و مواضع کثیرہ : (۱۰) ابوالفداء : تقویم ، ص ۵۳ تا ۵۵ : (۱۱) الدمشقی (طبع Mehren)، ص ۹۵ تا ۹۸ : (۱۲) القزوینی (طبع وُسٹنفلٹ) ، ۱ : ۱۷۸ : (۱۳) Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate* ، ص ۲۳ تا ۱۱۳ : (۱۴) M. Streck : *Die alte Landschaft Babylonien* ، لائڈن ۱۹۰۰ء : (۱۵) E. Herzfeld : *Memnon* ، ۱ : ۸۹ تا ۱۳۳ ، ۲۱۷ تا ۲۲۸ : (۱۶) W. Willcocks : *The Irrigation of Mesopotamia* ، قاہرہ ۱۹۰۵ء : (۱۷) A. Sousa و J. D. Atkinson : *Iraq Irrigation handbook* ، بغداد ۱۹۴۴ - ۱۹۴۶ء : (۱۸) M. Ionides : *The regime of the rivers Euphrates and Tigris* ، لنڈن ۱۹۳۷ء : (۱۹) S. H. Longrigg : *Iraq 1900 to 1950* ، لنڈن ۱۹۵۳ء : [(۲۰) دائرۃ المعارف الاسلامیۃ ، مصر ، ۹ : ۱۳۸ : (۲۱) Willcocks : *The Restoration of the Ancient Irrigation works on the Tigris* ، قاہرہ ۱۹۰۱ء : (۲۲) البستانی : دائرۃ المعارف ، بیروت ۱۸۸۳ء ، ۷ : ۶۴۳ : (۲۳) Hommel : *Geogr. v. Gesch. des alten Orients* ، ص ۲۹۳ تا ۲۹۸ : (۲۴) Ritter : *Erdkunde* ، ج ۹ تا ۱۱ : (۲۵) Chesney : *The Exped. for the survey of the Revers Euphr. and Tigris* ، ۱ : ۱۳ تا ۲۶ : (۲۶) Rich ، در *Records of the Bombay Government* ، ج ۴۳ ، ۱۸۵۷ء : (۲۷) M. Von Oppenheim : *Vom Mittelmeer Zum Persischen Golf* ، ۲ : ۱۹۲ تا ۲۳۵ ، ۲۵۲ ببعد ، ۲۸۲ تا ۳۱۹ : (۲۸) Sachan : *Am Euphrat V. Tigris* : (۲۹) Müller Simonis et Hynernat : *L' Armenie, le Kurdistan et la Mesopotamie* ، ص ۲۲۳ تا ۳۸۹ : (۳۰) Lehmann Houpt : *Armenien* ، ۱ : ۳۲۷ تا ۳۳۲ : (۳۱) Sarre v. Hevzfeld : *Archäol. Reise im Euphrate-v. Tigris-Gebiet* ، ج ۱ ۔]

([S. H. L. Ongrigg و] R. Hartmann)

* **دُجَیل** : رک بہ کارون ۔

* **دَھشُور** : صوبۂ جیزہ میں ایک مقام، جو قاہرہ سے تقریباً چالیس کیلو میٹر جنوب کی طرف، دریاے نیل کی مغربی جانب صحرا کے کنارے پر واقع ہے ۔ قدیم سلطنت کے ابتدائی خاندانوں کے زمانے کے بنے ہوے کچھ اہرام اور ایک قبرستان موجود ہے ۔ فراعنہ کے عہد کے آثار قدیمہ کے یہاں موجود ہونے کا ذکر الہروی اور المقریزی نے کیا ہے، لیکن ان کی صحیح تفصیل بیان نہیں کی ۔ ابو صالح نے لکھا ہے کہ یہاں ایک کلیسا اور اہم عیسائی خانقاہ بھی ہے ۔ آج کل یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو کوئی اہمیت نہیں رکھتا؛ اس کا نام محض اس کے اہرام کی وجہ سے مشہور ہے ۔

مآخذ : (۱) ابن مَمّاتی ، ص ۱۳۸ : (۲) الہَرَوی : زیارات ، ص ۳۴ و ۴۰ : (۳) ابو صالح ، ورق ۵۴ : (۴) یاقوت ، ۲ : ۶۳۳ : (۵) المقریزی : خطط ، طبع Wiet ، ۲ : ۱۲۰ و ۳ : ۳۹ و ۳ : ۱۲۲ : (۶) علی پاشا ، ۱۱ : ۹۴ : (۷) Maspero و Wiet : *Matériaux pour servir à la géographie de l'Egypte* ، ص ۹۳ ۔

(G. Wiet)

* **دحلان:** سید احمد بن زینی جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع کے قریب مکۂ معظمہ میں پیدا ہوئے، ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء سے اپنے آبائی شہر میں شافعی جماعت کے مفتی اور شیخ العلما (مجلس علما کے صدر لہٰذا معلمین حرم کے سرگروہ) رہے۔ جب شریف اعظم عون الرفیق، ترکی نائب عثمان پاشا سے کسی مخالفت کی بنا پر مکۂ معظمہ کو چھوڑ کر مدینۂ منورہ چلے گئے تو دحلان نے بھی اس اقدام میں ان کی تقلید کی، لیکن اس کے بعد جلد ہی سفر کی تھکن سے ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ - ۱۸۸۷ء میں وہ انتقال کر گئے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں دحلان نے ایک مصنف کے طور پر خصوصیت سے بہت سرگرمی دکھائی۔ انھوں نے نہ صرف ان روایتی اسلامی علوم کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا جن کا مطالعہ ان کے زمانے میں مکۂ معظمہ میں کیا جاتا تھا، بلکہ بعض وقتی طور پر زیر بحث مسائل پر بھی متعدد رسائل لکھے، اور مکۂ معظمہ میں انیسویں صدی عیسوی میں تاریخ نویسی کے واحد نمائندہ بن گئے۔ روایتی موضوعات پر ان کی سب سے کامیاب تصانیف شرح الآجرومیة اور السیرة النبویة [=السیرة الدحلانیة یا السیرة الزینیة] تھیں، یہ دونوں متعدد بار طبع ہوتی رہیں۔ ان کی تصنیف الدرر السنیة فی الرد علی الوہابیة وہابیوں کے موافق و مخالف جوابی تصنیفوں اور ان تصنیفوں کے جوابات کے ایک سلسلے کی محرک بن گئی۔ سلیمن آفندی کی مخالفت میں ان کے مناظرات، جو مکۂ معظمہ کے ان دو ترکی مد مقابل شیخوں میں سے ایک تھے جن کا انڈونیشیا کے نقشبندیوں کی قیادت کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ تھا، اور اسی طرح مکۂ معظمہ کے صاحب علم و فضل شیخ محمد حسب اللہ کی مخالفت میں جو دانشوری میں شہرت کے اعتبار سے ان کے ہم پلہ تھے، ذاتی اغراض سے خالی نہ تھے۔ تاریخ پر ان کی تصانیف میں الفتوحات الاسلامیة جو مصنف کے زمانے تک کی مسلم فتوحات کی تاریخ ہے، سوڈان میں ہم عصر مہدوی خروج کے بارے میں مصنف کے نظریے پر روشنی ڈالنے کی بنا پر قابل ذکر ہے، اور ان کی تاریخ مکہ، خلاصة الکلام فی بیان امراء البلد الحرام، جو ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء تک السنجاری کی تاریخ (براکلمان، ۲: ۵۰۲) سے ایک مختصر اقتباس ہے، آئندہ دو صدیوں میں مکۂ معظمہ کے واقعات کے لیے ایک بہت قیمتی مأخذ ہے، جن میں وہابیوں کا عروج، حجاز پر ان کی پہلی حکومت، ان کے خلاف "اشراف" کی جنگ، محمد علی پاشا کا ترکی حکومت کو بحال کرنا اور ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں جدے کے فسادات شامل ہیں۔ برسر حکومت اشراف کے خاندان سے دوستی کی بنا پر دحلان کو بہترین تحریری و زبانی معلومات تک رسائی حاصل تھی۔ فتووں کا دینا بھی بلا شبہہ ان کے فرائض منصبی کا ایک اہم حصہ تھا اور ان کے بعض فیصلے شافعی مذہب کے مروّجہ نصاب میں شامل کر لیے گئے؛ تاہم اپنے آخری برسوں میں انھوں نے روزمرہ کا یہ کام ایک نائب یا امین الفتوٰی سید محمد سعید بابصیل کے سپرد کر دیا تھا (براکلمان، ۲: ۵۰۰؛ تکملہ، ص ۸۱۱)۔ Snouck Hurgronje نے ان کا ایک مفصل خاکہ پیش کیا ہے جو ان کی شخصیت اور پس منظر سے قریبی واقفیت پر مبنی ہے۔

مآخذ: (۱) Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*، ۳: ۶۵ تا ۱۲۲ (مع دو عدد اقتباس از خلاصة الکلام)؛ (۲) براکلمان، ۲: ۴۹۹ ببعد؛ تکملہ، ۲: ۸۱۱ ببعد؛ (۳) عبدالحیّ الکتانی: فہرس الفہارس، ۱: ۲۹۰ تا ۲۹۲؛ (۴) سرکیس: معجم المطبوعات، ص ۹۹۰ تا ۹۹۲؛ [(۵) *Bijdr. t. d. Taal land en Volkenkunde van Neder L. Indie*، ۲: ۳۴۴ تا ۴۰۵؛ (۶) دائرة المعارف الاسلامیة، مصر، ۹: ۱۷۱ ببعد؛ (۷) خیر الدین الزرکلی: الاعلام، ۱: ۱۲۵؛ (۸) نظم الدرر، مخطوطہ؛ (۹) جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغة العربیة، ۴: ۲۸۸]۔

(J. SCHACHT)

* ⊛ **دِحیہ** : بن خَلیفہ [بن فَرْوَہ] الکلبی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور مالدار تاجر تھے ۔ ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑے حسین و جمیل تھے اور مدینۂ منورہ میں ان کے حسن و جمال کے چرچے تھے ۔ حضرت جبریل علیہ السلام ان کی صورت اختیار کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتے تھے ۔

[کئی غزوات میں شرکت کی] غزوۂ یرموک میں فوج کے ایک چھوٹے دستے کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی ۔ ۵ھ میں انھیں ہرقل کے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی پہنچانے کا کام سپرد کیا گیا تھا، جس میں ہرقل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی ۔ [اس وفد کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت دحیہ الکلبی نے اپنا منصب بیان کرنے کے لیے اپنے آپ کو اللہ کے رسول کا پیغامبر اور ایلچی (رسولُ رسولِ اللہ) قرار دیا ۔ یہ خط بعض دوسرے خطوں کے ساتھ اب تک موجود ہے اور اس کی نقول بصورت فوٹو دستیاب ہیں اور اس کا مضمون بعینہ وہ ہے جو صحیح بخاری میں درج ہے ۔ خط کا آغاز مِن محمدٍ رسولِ اللہ سے کیا گیا تھا جو قیصر روم کے دربار میں ناپسند کیا گیا ۔ البتہ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ شاہ روم ہرقل نے حسب دستور پادری (اُسْقُف) کو اپنے دربار میں طلب کر کے اسے خط سنایا تو پادری خط سن کر کہنے لگا کہ بخدا یہ اللہ کا وہی رسول ہے جس کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ نے پیشگوئی کی تھی ۔ بایں ہمہ شاہ روم نے آپؐ کی رسالت کو تسلیم نہ کیا، کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ اس کی حکومت چھن جائے گی اور رومی اسے قتل کر دیں گے (الذہبی : سیر اعلام النبلاء، ۲ : ۳۹۷)]۔

[آپ سے تین حدیثیں مروی ہیں (دیکھیے ابن حزم : اسماء الصحابة الرواة، در جوامع السیرة، ص ۲۹۲)]۔

مآخذ : (۱) الجاحظ : حیوان، ۱ : ۲۹۹ و ۶ : ۲۲۱ ؛ (۲) محمد بن حبیب : المُحَبَّر، ص ۶۵، ۷۵، ۹۰، ۹۳، ۱۲۱ ؛ (۳) ابن قُتَیبہ : المعارف، ص ۱۱۴ ؛ (۴) ابن سعد : الطبقات، ۳/۱ : ۱۷۳ و ۲/۳ : ۵۲ و ۴/۲ : ۱۸۳ تا ۱۸۵ و ۸ : ۶۳، ۱۱۴، ۱۱۵ ؛ (۵) الطبری، ص ۱۷۵۱ ببعد، ۱۷۴۱، ۲۰۹۳، ۲۱۵۴ و ۲ : ۱۸۲۶ و ۳ : ۲۳۴۹ ؛ (۶) ابن حنبل : المسند، ۱ : ۲۶۲ و ۲ : ۱۰۷ ؛ (۷) ابن ہشام سیرة بمدد اشاریہ ؛ (۸) ابن عبدالبّر : الاستیعاب، بذیل مادہ ؛ (۹) البکری : المعجم، ص ۵۳۰ ؛ (۱۰) الاغانی، ۶ : ۹۵ ؛ (۱۱) النووی : التہذیب، ص ۲۳۹ تا ۲۴۰ ؛ (۱۲) ابن حجر : الاصابہ، عدد ۲۳۹۰ ؛ (۱۳) Caetani : *Annali*، s.a. ۹ ؛ (۱۴) I. Goldziher : *Zähiriten*، ۱۷۸ تا ۱۷۹ ؛ (۱۵) Buhl : *Das Leben Muhammeds*، ص ۲۳۵ ؛ (۱۶) *Gesch des Qor.*، ۱ : ۲۲ تا ۲۴، ۱۸۶ ؛ (۱۷) H. Lammens : *Moavia* 1er، ص ۲۹۲ تا ۲۹۳ ؛ (۱۸) Gaudefroy-Demombynes : *Mahomet*، پیرس ۱۹۵۷ء، ص ۷۴، ۱۸۰ ؛ (۱۹) محمد حمید اللہ *Le Prophète de l'Islam*، پیرس ۱۹۵۹ء، ۲ جلدیں، اشاریہ (مع امدادی مآخذ) ؛ [(۲۰) البلاذری : انساب الاشراف، در مخطوطۂ پیرس، ص ۳۰۰، [مطبوعۂ مصر، جلد ۱، بمدد اشاریہ] ؛ (۲۱) السمعانی : الانساب، در مخطوطۂ پیرس، ص ۸۵ ؛ (۲۲) دائرة المعارف الاسلامیة، مصر، ۶ : ۱۷۰ ببعد ؛ (۲۳) الذہبی : سیر اعلام النبلاء، مصر ۱۹۵۷ء، ۲ : ۳۹۶ تا ۳۹۹، (۱۰۵، ۱۹۹ و ۳ : ۲۲۸) ؛ (۲۴) تہذیب ابن عساکر، ۵ : ۲۲۸ ؛ (۲۵) خیرالدین الزرکلی : الاعلام، ۳ : ۱۲ ؛ (۲۶) ابن حزم : جمہرة انساب العرب، مصر ۱۹۶۲ء، ص ۴۵۷ ؛ (۲۷) وہی مصنف : سیر اعلام النبلاء، ص ۲۹۲] ۔

(H. LAMMENS و H. PELLAT [و ادارہ])

* **دُخان** : رک بہ تُتُن .

* **اَلدُّخان** : (ع جمع : اَدْخِنَة اور دَوَاخِن) ، قرآن کریم کی ایک مکّی سورت کا نام ، مگر آیت ۱۵ کے بارے میں بعض اہلِ علم کا قول ہے کہ یہ مدینے میں نازل ہوئی (روح المعانی ، ۲۵ : ۱۱۶ :

البحر المحیط، ۸ : ۳۰؛ فتح البیان، ۸ : ۳۳۶؛ التفسیر المظھری، ۸ : ۳۶۷)۔ [عددِ تلاوت ۴۴، عدد نزول ۶۴ ہے]۔ یہ سورۃ الزُّخْرُف [رک بآں] کے بعد اور سورۃ الجاثیۃ سے قبل نازل ہوئی (محمد بن شہاب الزھری: تنزیل القرآن، ص ۲۷؛ الکشاف، ۳ : ۲۶۹)۔ سورۃ الدُّخان سات حوامیم (رک بہ حٰمٓ) سورتوں میں سے پانچویں سورت ہے اور اس میں ۵۹ آیات اور تین رکوع ہیں (حوالۂ سابق؛ نیز روح المعانی، ۲۵ : ۱۱۶)۔ اس کا نام آیت ۱۰ (فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ = (اس دن کا انتظار کیجیے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو) سے ماخوذ ہے۔ مفسرین نے اس دخان سے مراد وھی دھواں لیا ہے جو حدیث نبوی کی رو سے قیامت کی دس علامات میں سے پہلی علامت ہے؛ ابن قتیبہ وغیرہ علمائے غریب القرآن سے منقول ہے کہ دخان شدت خوف اور قحط سالی کو بھی کہتے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر المراغی ۲۵ : ۱۲۱؛ فتح البیان، ۸ : ۳۳۶؛ روح المعانی، ۲۵ : ۱۱۶؛ التفسیر المظھری، ۸ : ۳۶۹؛ تفسیر البحر المحیط، ۸ : ۳۰).

[صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جب اہل مکہ شرارت میں بہت بڑھ گئے تو نبیؐ اکرم نے بد دعا فرمائی کہ الٰہی ان پر یوسفؑ کے عہد کی طرح کا قحط مسلط کر۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور قریش مکہ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے۔ اہل مکہ کے لیے یہ زمانۂ قحط بڑی تکلیف اور مصیبت کا تھا، انھوں نے اس دوران میں ھڈیاں، اور مردار تک کھائے۔ حالت یہ تھی کہ کوئی شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے اسے فضا میں ایک دھواں سا دکھائی دیتا تھا۔ آخر اہل مکہ کی طرف سے ابوسفیان مدینے میں نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور التجا کی کہ ہم لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کیجیے، ہم ہلاک ہوگئے ہیں۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ الدخان کی آیات عدد دس سے ۱۵ تک تلاوت فرما کر دعا کی، تب بارش ہوئی اور قحط ختم ہوا۔ یہ قحط اس وقت شروع ہوا تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکے ہی میں تھے اور آپ کے مدنی دور میں ختم ہوا.]

سورۃ الدخان کے مضامین اجمالاً یہ ہیں کہ سب سے پہلے نزول قرآن کا ذکر ہے کہ یہ کتاب ہدایت و رحمت بابرکت رات (= لیلۃ القدر) میں نازل ہونا شروع ہوئی]۔ پھر کفار کو دُخان مبین سے ڈرایا گیا ہے اور ساتھ ہی مسلسل مصائب کے باوجود کفار کے عدم ایمان کا ذکر ہے؛ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصّہ بیان کرکے کفار کو عبرت دلائی گئی ہے کہ اہل ایمان ہمیشہ نجات پاتے ہیں اور کافر ہمیشہ ہلاکت سے دو چار ہوتے رہے ہیں، پھر مشرکین کے انکار بعث کا ذکر کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت پر دلیل پیش کی گئی ہے اور سب سے آخر میں گنہگاروں و مجرموں کے لیے عذاب و مصائب اور متقی لوگوں کے لیے انعام و اعزاز کا ذکر کرکے ایک دفعہ پھر قرآن کریم کی حکمت بالغہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر المراغی، ۲۵ : ۱۲۹؛ فی ظلال القرآن، ۲۵ : ۱۰۶؛ [تفسیر مواھب الرحمٰن، جلد ۲۵]).

ابوبکر ابن العربی الاندلسی نے احکام القرآن (۴ : ۱۶۷۸) میں بیان کیا ہے کہ سورۃ الدخان میں چار آیات (۲، ۲۳، ۴۳، ۴۴) ایسی ہیں جن سے آٹھ قسم کے مختلف شرعی احکام اور فقہی مسائل مستنبط ہوتے ہیں.

اس سورت کے فضائل کے بارے میں کئی ایک اور احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے رات

کے وقت سورہ "حٰمٓ الدخان" کی تلاوت کی۔ اس کے لیے ستر ہزار فرشتے دعاے مغفرت میں مشغول رہیں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس نے جمعرات کو اس سورت کی تلاوت کی اللہ تعالٰی اس کے لیے جنت میں ایک گھر تعمیر کرے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو نماز میں پڑھا کرتے تھے (الکشاف، ۴: ۲۸۳؛ روح المعانی، ۲۵: ۱۱۰؛ فتح البیان، ۸: ۱۴۴).

مآخذ : (۱) ابن منظور : لسان العرب، بذیل مادہ دخن؛ (۲) الزھری : تنزیل القرآن، بیروت ۱۹۶۳ء؛ (۳) ابو حیان الغرناطی: تفسیر البحر المحیط، ریاض، بلا تاریخ؛ (۴) ابن العربی : احکام القرآن، قاہرہ ۱۹۵۸ء؛ (۵) ثناء اللہ پانی پتی : التفسیر المظہری، دکن، بلا تاریخ؛ (۶) الزمخشری : الکشاف، بیروت بلا تاریخ؛ (۷) البیضاوی : تفسیر؛ (۸) محمود الآلوسی : روح المعانی، قاہرہ بلا تاریخ؛ (۹) المراغی : تفسیر المراغی، قاہرہ ۱۹۳۶ء؛ (۱۰) صدیق حسن خان : فتح البیان، قاہرہ بلا تاریخ؛ (۱۱) سید قطب : فی ظلال القرآن، بیروت ۱۹۶۸ء؛ (۱۲) [جمال الدین القاسمی : تفسیر القاسمی؛ (۱۳) سید امیر علی: مواهب الرحمٰن، ج ۲۵، نولکشور].

(ظہور اظہر [و ادارہ])

* **دَخِیْل** : لغات (لسان العرب، تاج العروس وغیرہ) میں اس کے ایک تو عام معنی ہیں : "اندرونی، داخل، قریبی"، اور دو مخصوص معنی : (۱) مہمان، جسے حفاظت کا یقین دلایا جائے، (۲) اجنبی، راہی، مسافر، دوسری نسل کا آدمی۔ مخصوص معنی میں سے پہلا تو عام صحرائی قانون کے دستور سے تعلق رکھتا ہے، جس کی رو سے ہر پناہ مانگنے والے شخص کو روایتی طریقوں کے مطابق پناہ کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ گو یہ تصور ہر زمانے میں موجود رہا ہے لیکن اسے کبھی اسلامی شریعت میں داخل نہیں کیا گیا، جہاں اس مفہوم کو ادا کرنے والی کوئی اصطلاح موجود نہیں۔ جب اس کا اطلاق عملی طور سے کیا جائے تو یہ دستور عملی مہمان نوازی کے پیچیدہ نظام کے عناصر پر مشتمل نظر آتا ہے، جس میں بہ یک وقت راے عامہ کے نقطۂ نظر سے "دخیل" کے حقوق اور گھروں میں پناہ گزینی کے ایک بہت قدیم قانون کا امتزاج موجود ہے، جس کی توثیق تمام سامی دنیا کے رواج کی بنا پر ہوتی ہے [رک بہ جوار]۔ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ دیکھیے مفصل تجزیہ از A. Jaussen: *Coutumes des Arabes au pays de Moab*، پیرس ۱۹۴۸ء، ص ۲۰۲ تا ۲۲۰، اور اسی موضوع پر Burckhardt کی یادداشت در *Notes on the Bedouins*، لنڈن ۱۸۳۱ء، ۱: ۳۲۹ تا ۳۳۸؛ نیز دیکھیے Layard: *Narrative of a second expedition to Assyria*، لنڈن ۱۸۶۷ء، باب ۶، ص ۱۳۹ تا ۱۶۲، *apud*: Caskel اور Oppenheim: *Die Beduinen*، لائپزگ ۱۹۳۹ء، ۱: ۲۹۰.

اس آخری معنی سے لسانیات کی ایک فنی اصطلاح کے طور پر کئی معنوں کا اشتقاق کیا گیا ہے، جنھیں ماہرین لغت متروک خیال کرتے ہیں : ان میں سے خاص خاص معنی یہ ہیں : (۱) کسی غیر زبان کا لفظ جسے عربی نے مستعار لے لیا ہو، جیسے "درہم"، اور (۲) علم عروض کی اصطلاح میں قافیے کے حرفوں میں سے وہ حرف متحرک جو 'روی' [رک بہ عروض] اور حرف تأسیس یعنی الف ساکن کے درمیان واقع ہو، جیسے 'صابر' اور 'شاکر' میں 'ب' اور 'ک'؛ دخیل کی پابندی لازم نہیں۔ چنانچہ 'مائل' کا قافیہ 'دل' ہو سکتا ہے [رک بہ قافیہ].

(J. LECERF)

* **دَدَل اَوغلُو** : عاشق موسٰی اوغلو ولی، انیسویں صدی کا ترکی لوک گیت لکھنے والا شاعر (۱۷۹۰ء؟ تا ۱۸۷۰ء؟) افشار قبیلے سے تھا، جس کی جاے سکونت جنوبی آناطولی میں واقع کوہ طاوروس (= طوروس) میں تھی۔ اس کا باپ بھی شاعر تھا اور اس نے بھی اپنا مخلص (تخلص) اپنے خاندان کے نام ہی سے اخذ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصے تک ددل اوغلو

نے دیہات میں امام کی حیثیت سے اور قبائلی سرداروں کے منشی کے طور پر کام کیا۔ اس کے قبیلے کے خلاف، جس نے جبری بھرتی یا لگان برداشت کرنے پر رضامند نہ ہونے کی وجہ سے بغاوت کر دی تھی، حکومت کی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے دیگر افشاریوں کے ساتھ سیواس کے صوبے میں عزیزیہ کے قریب واقع سندل نام گاؤں میں منتقل کر دیا گیا (۱۸۶۶-۱۸۶۸ء)۔ اس بات کی تعیین دشوار ہے کہ یہ بیان کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے کہ آخر عمر میں وہ چقور اووہ کے علاقے میں واپس آ گیا تھا، اور ادنہ کے بازاروں میں اپنی نظمیں سنایا کرتا تھا۔ اس کی نظمیں اس کی زندگی میں یکجا نہیں کی گئیں۔ ان میں لوک شاعری کی سب بڑی اقسام موجود ہیں: مثلاً تُرکو türkü، کوشمہ koshma، سِمَئی semai، ورسغی varsaghi اور دستان destan۔ اس نے گنج عثمان کے قصے کو متعدد نظموں میں مقامی رنگ دے کر آراستہ و پیراستہ کیا اور اس کی دلکشی کو دوبالا کر دیا۔ اس کی شاعری کا اسلوب تند و تیز اور جذباتی ہے، اور اس سے ایک بے دھڑک، منچلے راست باز اور حساس قبائلی کے پاکیزہ اور مخلصانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی نظموں کی عبارات سے اس معاشرے کی جنگجو ذہنیت اور بدویت کا اندازہ ہو سکتا ہے، جس میں وہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ ترکی رزمیہ، غزلیہ اور دیہاتی (pastoral) لوک شاعری اور داستان گوئی کے آخری زوردار نمائندوں میں سے تھا، جو دہ قورقد Dede Korkud کی تصنیف کے وقت سے برابر چلی آ رہی تھی اور جس کی نمایاں مثالیں قوراوغلو Köroghlu اور قراجہ اوغلان Karadja oghlan ہیں۔

مآخذ: (۱) جودت پاشا: تذاکیر (تذکرہ، ص ۲۶ تا ۳۰)، استانبول انقلاب کتبخانہ سی، بخط مصنّف؛ (۲) وہی مصنف: معروضات، در TOEM، ص ۸۷ تا ۹۳، ۱۹۲۵ء؛ (۳) اسعد شکری: ددل اوغلو، خلق بلگیسی مجموعہ سی، ج ۱، ۱۹۲۸ء؛ (۴) کوپرولوزادہ محمد فؤاد: اون یدنجی عصر سازشاعرلرندن قایقجی قل مصطفی وگنج عثمان حکایہ سی، استانبول ۱۹۳۰ء؛ (۵) خالد بایری: خلق بلگیسی خبرلری، ۱۹۳۳ء؛ (۶) علی رضا: جنوب دہ ترکمان اویماقلری، انقرہ ۱۹۳۳ء؛ (۷) سعد الدین نزہت ارغون: ترک خلق ادبیاتی انتولوژی سی؛ (۸) طٰہٰ طوروس: ددل اوغلو، ادنہ ۱۹۳۰ء؛ (۹) جاہد اوزتلّی: قور اوغلو و ددل اوغلو، Varlik Yayinlari، استانبول ۱۹۵۳ء؛ (۱۰) خالدہ ہوشگور: خلق ادبیاتندہ قہرمانلک تورکولری، استانبول یونیورسٹی لائبریری، امتحانی مقالہ ۱۱۲۸ (غیر مطبوعہ)؛ (۱۱) سمیحہ قراجہ بے: ددل اوغلو، استانبول یونیورسٹی لائبریری، امتحانی مقالہ ۱۷۵۲ (غیر مطبوعہ)۔

(A. Karahan)

* **دِدْو:** (=دیدو)، ایک قوم جو پانچ چھوٹی چھوٹی آئبیری قفقازی مسلمان قوموں پر مشتمل ہے اور جس کی مجموعی آبادی ۱۹۵۵ء کے تخمینے کی رو سے اٹھارہ ہزار کے قریب ہے۔ نسلی اعتبار سے وہ آَلدی [رکَ باں] اور اَوار [رکَ باں] قوموں سے ملتے جلتے ہیں اور گرجستان کی سرحد کے قریب وسطی داغستان کے اونچے اونچے اور دشوار گزار خطوں میں رہتے ہیں۔

ان میں امتیاز کرنا ضروری ہے:

۱۔ اصلی ددو (تسز تسنّتہ)، جن کی تعداد ۷۲۰۰ کے لگ بھگ ہے اور اوری۔ تسکاس کی بالائی حدود کے ساتھ ساتھ چھتیس اولوں awls میں منقسم ہیں۔

۲۔ بزتہ (کپچی، کپچوئی، بشنے، خونال)، ددو قوم کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ لوگ (۱۹۲۶ء میں ۲۵۰۰ اور ۱۹۳۳ء میں ۲۵۸۰)، جو ضلع تارتہ میں بزتہ، خوجر۔ خوتہ اور تلدل میں آباد ہیں۔

۳۔ خورشی (کَوَن)، ۱۹۲۰ء میں ۱۵۶۱ اور ۱۹۳۳ء میں ۱۶۱۳۔ اوری تسکاس کی بالائی حدود میں پانچ اولوں میں آباد ہیں۔

۴ـ خُنزل (گُنزل، تَکنَہد، اِنزلی، اِنسبه، گُنزب)، ۱۹۲۰ء میں ۹۹ء: ۱۹۲۳ء میں ۶۱۶! ضلع قلرتہ کے چار اولوں اور اوار قوی صَو کی بالائی حدود میں تھے.

۵ـ گِنُخ، ان کی تعداد صرف چند سو ہے.

دِدو لوگ آوار کی دعوت پر مسلمان ہوئے اور ان کی طرح شافعی المذہب سنی ہیں ـ ہر دِدو نسل کی اپنی زبان ہے ـ وہ لکھی نہیں جاتی، اس کا تعلق آلیری قفقازی زبانوں کی داغستانی شاخ کے 'آوار ـ اندو ـ دِدو' گروہ سے ہے، لیکن عمومی لحاظ سے دِدو قوم میں دو زبانیں بولی جاتی ہیں البتہ آوار ان کی ثقافتی زبان ہے.

دِدو قوم کی جغرافیائی حدود نے اسے بیرونی اثرات سے محفوظ رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اندی کی نسبت آبائی رسم و رواج اور اسلامی روایات کے زیادہ پابند ہیں، چنانچہ ان کے یہاں اوار کا اثر و رسوخ بھی بجز یزتہ کے، اس سے بہت کم ہے جتنا اندی قوم میں ـ لہٰذا آوار قوم سے ان کا رابطہ بہت کم ہے ـ روس کا لسانی اثر بھی مشکل ہی سے نظر آتا ہے.

دِدو کی معیشت بھی وہی ہے جو شروع سے چلی آ رہی تھی: ان کی گزر اوقات خشک غذا کی پیداوار (مکئی، آلو) مرغزاروں کی بدلتی ہوئی زمین، بُز پروری پر اور ڈھلان در ڈھلان باغبانی پر ہے ـ وہ دستکاری کے لیے مشہور ہیں: سنار کا کام دِدو اور بزتہ کے افراد کرتے ہیں اور چمڑے کا کام خُنزل کے افراد.

مآخذ: (۱) A. Bennigsen و H. Carrère d' Encausse: '*Une République soviétique musulmane*' در '*REI*'، ۱۹۵۶ء؛ (۲) A.A. Bokarev: *Kratkie Svedeniya o yazikak Dagestana*، مخچ قلعہ Makhač-kal'a ۱۹۴۹ء؛ (۳) A. Dirr: *Materiali dlya izučeniya yazikov i narečiy andodidoyskoy gruppi*، در *Sbornik materialov dlya opisaniya mestnostey i plemen Kavkaza*، جلد ۴۰، تفلس ۱۹۰۹ء؛ (۴) I. V. Megelidze: *Zvukovoy sostav tseskogo (didoyskogo) yazika*، در *Yazik i mishlenie*، جلد ۹، ۷، ماسکو ۱۹۲۶ء ـ نیز دیکھیے داغستان، اوار اور لندی کے مآخذ.

(CH. QUELQUEJAY)

* **دِدِه**: لفظی معنی "دادا" "جدِّ امجد"، ایک تعظیمی اصطلاح جو درویش فرقوں کے سربراہ کے لیے "آتا" اور "بابا" کے بجائے مستعمل ہے ـ غز قوم میں اس کے معنی "باپ" کے بھی تھے، جس کی تصدیق قدیم دیوان لغات الترک سے ہوتی ہے (قب براکلمان C. Brockelmann: *Mitteltürkischer Wortschatz*، بودا پست و لائپزگ ۱۹۲۸ء بذیل dädä) ـ مغربی ترکی زبان کی شجاعت کی داستانوں میں یہ اصطلاح رجزخوانوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے (یہاں بھی "آتا" کے مترادف کے طور پر) جیسے قورقوت آتا یا دِدہ قورقوت [رک بآں] ـ قدیم آناطولی میں اسم معرفہ کے پہلے اس کے استعمال کے متعلق قب اسمعیل حقی اوزون چارشیلی: *Osmanli teşkilâtına methal*، استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۱۷۳ (جرمیان کی ایک بنائے عمارت کی دستاویز میں "دده بالی").

مولویہ درویش حلقوں میں اصل نام کے بعد "دِدِہ" کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور اظہار ادب کے لیے استانبول اور آناطولی میں متعدد صاحب کرامت بزرگوں کے واسطے بولا جاتا ہے، جیسا کہ اولیا چلبی نے اطلاع دی ہے (قب اولیا افندی: *Travels*، ترجمہ از Hammer، ۱ : ۲، ۲۱، ۲۵؛ ۲ : ۹۷، ۲۱۳).

ان معنوں کے ساتھ دِدِہ فارسی زبان میں بھی پہنچ گیا ہے (دده جمع ددگان) (مقابلہ کیجیے F. Steingass: *Persian-English Dictionary*، لنڈن ۱۸۳۰ء، بذیل مادّہ) ـ صفوی "طریقہ" کی اصطلاح میں "دَدہ" خدّام کی ایک چھوٹی سی جماعت پر دلالت کرتا تھا جو ہمیشہ مرشد کی خدمت میں حاضر رہتے تھے (قب، تذکرۃ الملوک، ۱۲۵، حاشیہ ۴).

مآخذ: ان تصانیف کے علاوہ جو مقالے میں

مذکور ہیں : (۱) J.T. Zenker : *Türkisch-Arabisch-Persisches Handwörterbuch* ، لائپزگ ۱۸۹۶ء ، بذیل مادّہ ؛ (۲) حسین قادری : *Türk lügati* ، استانبول ۱۹۲۸ء ؛ (۳) Şeyh Süleyman Buhari : لغت چغتائی و ترکی عثمانی ، استانبول ۱۹۲۸ء ؛ (۴) ابوحیّان : کتاب الادراک للسان الاتراک ، طبع A. Caferoğlu ؛ (۵) [اِ اِ ت ، ۳ : ۵۰۶ (Mecdud Mansuroğlu)] ؛ (۶) أولیاء افندی : رحلات ، ترجمہ Hammer ، ۱ : ۲ ، ۲۱ ، ۲۵ و ۲ : ۹۵ ، ۲۱۳].

(FR. TAESCHNER)

* **دِدہ آغاج :** (دِدہ آغاج) ، جسے اب الیگزنڈروپولس Alexandropolis کہتے ہیں ، تھریس کے بحرِ ایجہ کے ساحل کا شہر ، جس کی بنیاد ۱۸۷۱ء میں بڑی روم ایلی ریلوے لائن کی شاخ کی تعمیر کے بعد ڈالی گئی۔ اس نے سمندر کے عقبی علاقے کی پیداوار کے نکاس کا راستہ ہونے کی وجہ سے سرعت سے ترقی کی ، یہاں تک کہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں اس نے ولایت ادرنہ کے ایک "سنجاق" ("متصرّفلق") کے صدر مقام کی حیثیت سے دیمتوقہ کی جگہ لے لی۔ ۱۸۹۳ء میں دِدہ آغاج کا "سنجاق" دِدہ آغاج ، اِنز (Inos) اور سفرولو کی "قضایا" پر مشتمل تھا۔ دِدہ آغاج کی قضا میں تین ناحیے : قرہ چک ، مکری اور سیادرک اور اکتالیس گاؤں تھے۔ یہ صورت حال ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان تک رہی ، جس کے نتیجے میں یہ علاقہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ شہر میں دو مسجدیں تعمیر ہوئیں ، ایک ۱۸۷۷ء میں محلۂ مصلح الدین میں اور دوسری عربی طرز پر ، ۱۸۹۰ء میں محلۂ حمیدیہ میں ، جس کے صحن میں متصرّف طرب زونلی حسین رُشدی پاشا دفن ہے۔ ۱۸۹۳ء میں دِدہ آغاج میں کوئی پندرہ سو مکانات تھے۔ موضع فِرَایلیجلری میں غازی اورنُوس بیگ اور (قوجہ) داؤد پاشا [رک بآں] کی بنائی ہوئی عمارات تھیں۔

مآخذ : *Edirne Sālnāmesi* ، برائے ۱۳۱۰ اور ۱۳۱۷ھ ؛ (۲) علی جواد : ممالک عثمانیّہ نک تاریخ و جغرافیہ لغاتی ، جلد ۱ ، استانبول ۱۳۱۳ھ ؛ (۳) بادی احمد : ریاض بلدۂ ادرنہ ، جلد ۳ (بایزید لائبریری ، استانبول)۔

(M. TAYYIB GÖKBILGIN)

* **دِدہ سلطان :** ایک بڑے مذہبی متشدد شخص کا لقب ، جس کا نام بورکلوجہ مصطفٰی تھا ، اور جو سلطان محمد اول کے وقت میں آناطولی میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا (مزید معلومات کے لیے رک بہ بدرالدین ابن قاضی سماونہ)۔

(FR. TAESCHNER)

* **دِدہ قورقوت :** نثر کی بارہ کہانیوں کا ترکی مجموعہ ، جس کے بیچ میں اشعار کے قطعات بھی ملے جلے ہیں۔ یہ غُز رزمیہ داستان کا قدیم ترین نمونہ ہے جو اب تک سلامت رہا ہے اور ترکی زبان کی ممتاز ترین یادگاروں میں سے ایک ہے۔ یہ کہانیاں ایک مرد دانا کے نام سے موسوم ہیں ، جو ایک افسانوی کردار ہے اور ہر کہانی میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ شعر گو مطرب ہے جو ہر ایک قصّے کو دوبارہ نظم کرتا اور گاتا ہے اور سب کو اپنی نیک دعائیں دیتا ہے۔ وہ بڑے زور سے شمنی عہد کے سخن گو ساحروں کی یاد دلاتا ہے۔ اس کتاب کا فقط ایک ہی مخطوطہ موجود ہے اور وہ ڈریسڈن Dresden میں ہے (H. O. Fleischer : *Catalogus codicum man. orientalium* ، عدد ۸۶) ، جس کی نقل J. H. von Diez نے برلن لائبریری کے لیے کی تھی (A. Pertsch : *Die Hand. Verzeichnisse* . . . ، جلد ۶ ، عدد ۲۰۳)۔ von Diez کی تصانیف (*Denkwürdigkeiten von Asien* ، جلد ۱ ، برلن ـ ہالے ۱۸۱۵ء ، ص ۳۹۹ تا ۴۵۷) اور بارتولڈ کی مصنفات (*Zapiski Vostočnago Otdeleniya, Imp. Russ. Arkh. Obshčestva* ، جلد ۸ ، ۱۸۹۳ء ، ص ۲۰۳ تا ۲۱۸ ، نیز جلد ۹ ، ۱۸۹۵ء ، جلد ۱۱ ، ۱۸۹۸ء ، جلد ۱۲ ، ۱۸۹۹ء ، جلد ۱۵ ، ۱۹۰۳ء ؛ جلد ۱۹ ، ۱۹۱۰ء)

اور کلیسلی معلم رفعت کے نسخے کی پہلی طباعت (کتاب دده قورقوت علی لسانِ طائفِ اغوزان، استانبول ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۶ء) برلن کے منقول نسخے پر مبنی ہے، جو ڈریسڈن کے نسخے سے براہ راست نقل لے کر پہلی دفعہ طبع ہوئی، اس پر Orhan Şaik Gökyay نے تاریخی ماخذ سے متعلق طویل مقدمہ بھی لکھا ہے (دیکھیے ماخذ) اور اس میں ڈریسڈن کے نسخے کی بعض تصحیحات کے ساتھ برلن کے نسخے سے بھی کام لیا گیا ہے۔

۱۹۵۰ء میں Ettore Rossi نے کتاب خانۂ ویٹیکن Vatican میں ایک دوسرا نا مکمل نسخہ دریافت کیا (*Un nuovo manoscritto del "Kitab-i Dede Qorqut"*، در *RSO*، ۲۵ (۱۹۵۰ء): ۳۴ تا ۴۳)، جس کا چربہ اس نے پوری کتاب کے اطالوی ترجمے اور پچاتوے صفحے کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ ۱۹۵۸ء میں Muharrem Ergin نے کامل متن کی ایک نئی نقل اصلی مخطوطوں، چربوں اور مقدمۂ کتاب کے ساتھ شائع کی ہے۔ اس کی دوسری موعودہ جلد میں اشاریہ، شرحِ لغات اور حواشی ہوں گے۔ اس تصنیف نے آذربیجان میں بھی دلچسپی پیدا کر دی (نظریاتی بنیادوں پر تنقید کے لیے دیکھیے *Ost. Probleme*، جلد ۳، عدد ۳۵، ۱۹۵۱ء)۔ متن کتاب کی ایک طباعت باکو میں ۱۹۳۹ء میں ہوئی اور ایک روسی ترجمہ بھی ۱۹۵۰ء میں چھپا، جو بارٹولڈ کے مخطوطے پر مبنی ہے۔

۱۹۱۶ء میں کتاب کا مکمل متن شائع ہوا تو اس سے دده قورقوت کے مطالعے کو زبردست تحریک ہوئی اور اس وقت سے روز افزوں تعداد میں اہلِ علم اس تصنیف کے تاریخی، علمی، لسانی، نسلیاتی اور عوامی رسم و روایات کے متعلق بہت سے مسائل کی تشریح میں منہمک ہیں۔ مذکورۂ بالا مصنفین اور دیگر علما کی شاندار خدمات کے باوجود (جن میں M. F. Köprülü، A. Inan، P. N. Boratov، Faruk Sümer، Walter Ruben، Hamid Arash، M. F. Kirzioğlu وغیرہ شامل ہیں) بعض مسائل ابھی متنازع فیہ چلے آتے ہیں اور اب تک تاریخِ تالیف، اس کے مصنف، موجودہ متن کی اصل، اس کے سورماؤں اور مقامات کے ناموں وغیرہ کی حقیقت کے متعلق اختلافِ رائے ہے۔ جہاں تک موجودہ تحقیق پہنچی ہے اس کی بنا پر ہم محتاط رہ کر اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ ان کہانیوں کو ایک نا معلوم مصنف نے غالباً نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں سنی سنائی روایات سے فراہم کیا اور انھیں جلا دے کر مجموعہ مرتب کر دیا۔ اس کی کہانیاں زیادہ تر اوغز ترکوں کے مآثر پر مبنی دکھائی دیتی ہیں، جو وسط ایشیا میں ان کے اصلی وطن کی زندگی کے متعلق مشہور تھے؛ لیکن موجودہ متن میں یہ قصے شمال مشرقی آناطولی کے اوغز ترکی قبائل کی زندگی، ان کے شہزادے بیندر خان اور ان کے سردار سلُورقازان بیگ، اس کی بیگم بورلہ خاتون، اس کے لڑکے اُرُز اور اس کے رفقا کے کارناموں اور دوسرے ترک قبائل اور بحر اسود کے یونانیوں اور گرجستانیوں کے خلاف محاربات کا حال بیان کرتے ہیں۔ ان میں اسلامی ثقافت کا اثر کم اور سطحی سا ہے؛ اسلام سے پہلے کے عناصر بیان، اسلوب اور موضوعات میں آناطولی اور وسطی ایشیا کے عوامی ادب کے ساتھ گہری مشترکہ خصوصیات رکھتے ہیں۔ بعض کہانیاں (مثلاً بیرک) خفیف سی تبدیل شدہ صورت میں ترکی عوامی کہانیوں میں ابھی تک زندہ ہیں، اور دو کہانیاں (دیپہ گوز اور دلی دُمرل) یونانی اساطیری کہانیوں (Cyclops اور Admetus) سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں (قب C. S. Mundy: *Polyphemus and Tepegöz*، در *BSOAS*، ۱۸ (۱۹۵۶ء): ۲۷۹ تا ۳۰۲)۔

مآخذ: مندرجۂ ذیل تصانیف میں کتابیات کی مفصل فہرست دی گئی ہے: (۱) Orhan Saik Gökyay: Dede Korkut، استانبول ۱۹۳۸ء؛ (۲) Ettore Rossi: Il Kitab-i-Dede Qorqut، Vatican ۱۹۵۲ء؛ (۳) P.N. Boratav: Korkut Ata، در ززآت: (۴) وہی مصنف: Dede Korkut hikâyelerindeki tarihî olaylar ve Kitabın telif tarihi، در TM، ۱۳ (۱۹۵۸ء): ۳۰ تا ۹۲؛ (۵) Muharrem Ergin: Dede Korkut Kitabı، ج ۱: Giriş-Metin-Facsimile، انقرہ ۱۹۵۸ء؛ اس تصنیف کی زبان کے حالیہ مطالعے کے لیے دیکھیے (۶) E.M. Demirçizade: Kitabı Dede Korkud dastanlarının dili، باکو ۱۹۵۹ء (اس کتاب کا جرمن زبان میں شائع شدہ ترجمہ از J. Hein: Das Buch des Dede Korkut، Zurich ۱۹۵۸ء).

(FAHIR ÎZ)

* دَر: فارسی لفظ، بمعنی دروازہ یا پھاٹک، بہت سی ایرانی اور ترکی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ عربی کے "باب" کا مترادف ہے اور اسی طرح استعمال ہوتا ہے، مثلاً "درِ عالیہ"، "درِ دولت" اور ہندوستان میں "دربار"۔ "در" خاص مفہوم میں دربار شاہی کے لیے، یا وسعت دے کر سرکاری محکمے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قبل از اسلام ایران میں اس سے یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ پہلوی میں اس کی بے قاعدہ املا "بَبّا" تھی [فرہنگ آنندراج، بذیل بَبا].

[مآخذ: (۱) فرہنگ آنندراج، بذیل مادّہ؛ (۲) Gibb: History of Ottoman Poetry، ۲: ۲۱۳؛ (۳) Dozy: Supplement aux Dictionn. Arbes، ۱: ۱۲۳؛ (۴) Lane: Arabic-English lexicon، ۱: ۲۷۲، ۱۲۵].

(R.N. FRYE)

* در آهنین: فارسی، بمعنی "لوہے کا دروازہ"؛ اسے "درِ بند آهنین" بھی کہتے ہیں۔ عربی شکل "باب الحدید" ہے، جیسے پرانی ترکی میں تامر قپی کہتے تھے۔ یہ نام مشرق اسلامی دنیا میں کئی دروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سب سے مشہور درہ، جسے در آهنین کہتے ہیں، ماوراء النہر کا ہے، جو بیسُنتو کے پہاڑوں میں دربند کے موجودہ گاؤں کے قریب، سمرقند اور ترمذ کو ملانے والی قدیمی سڑک پر واقع ہے۔

شاید اس "درِ آهنین" کا قدیم ترین ذکر چینی سیاح ہیون سانگ Hsüan Tsang کے بیان میں ملتا ہے، جو ۶۳۰ء میں اس درے سے گزرا تھا۔ اس نے مجمل طور پر اس کا حال بیان کیا ہے۔ فارسی نام کے تحت اس درے کا سب سے پہلا ذکر الیعقوبی: البلدان، ص ۲۹۰، ۲۹۵، میں ملتا ہے۔ ازمنۂ مابعد میں اس درے کو ماوراء النہر اور بلخ کے تابع علاقوں کے درمیان سرحد خیال کیا جاتا تھا۔ اسلامی ادب میں اس درے کا ذکر کثرت سے آتا ہے، لیکن پہلا یورپی باشندہ، جس نے اس جگہ کو دیکھا، کلاویجو Clavijo تھا، جو یہاں سے ۱۴۰۴ء میں گزرا تھا۔ وہ ایک محصول خانے کا ذکر کرتا ہے، جہاں سے امیر تیمور محصول وصول کرتا تھا۔ اس درے کا ذکر شرف الدین یزدی: ظفر نامہ، طبع محمد الٰہ داد، کلکتہ ۱۸۸۷ء، ۱: ۳۹ اور بابر نامہ، طبع بیوریج Beveridge، ص ۱۲۳، میں منگولی نام قَہلغہ (عربی رسم الخط قہلغہ) کے تحت ملتا ہے۔ بعد میں اس درے کا نام بزغالہ خانہ پڑ گیا، جس کا ذکر سب سے پہلے محمد وفا کرمینگی نے تحفۃ الخانی (مخطوطہ در سابق موزۂ ایشیائی، لینن گراڈ، ورق ۸۳ ب، جس کا فہرست میں اندراج نہیں) میں محمد رحیم خان کی ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ - ۱۷۵۸ء کی مہم کے بیان میں کیا ہے۔ آج کل ایک سڑک اس درے میں سے ہو کر گزرتی ہے، تاہم اب اس درے کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

مآخذ: (۱) T. Watters: On Yuan Chwang's

Travels in India، لنڈن ۱۹۰۴ء، ۱ : ۱۰۰ تا ۱۰۲ ؛ (۲) الیعقوبی، طبع Wiet، ص ۱۰۵ ؛ (۳) نظام الدین شامی: ظفرنامہ، طبع F. Tauer، پراگ ۱۹۵۶ء، ۲: ۲۵۲ (بذیل مادۃ "قہلغہ") ؛ (۴) Ruy Gonçalez de Clavijo : *Narrative of the Embassy to the Court of Timur*، مترجمۂ C. R. Markham، لنڈن ۱۸۵۹ء، ص ۱۲۲ ؛ [(۵) اُردو، بذیل مادۂ باب الحدید].

(R. N. FRYE)

* **دَرا** : رک بہ دَرعَہ .

* **دَراج** : یا دَراج Drač، نیز دِیرِچ Dirač و دُورَج Durač: قدیم دیراخیوم Dyrrhachiam (ازمنۂ وسطی کی لاطینی زبان میں Duracium، اطالوی Durazzo اور البانوی Durrës) کا سلاوی اور لہٰذا عثمانی نام : جدید البانیہ کی سب سے بڑی بندرگاہ (۴۱ درجے ۱۸ دقیقے شمالی، ۱۹ درجے ۲۶ دقیقے مشرق) ۔ قدیم شہر کی بنیاد اپی دامنوس Epidamnus کے نام سے ایک تنگ پتھریلے جزیرہ نما (کسی زمانے میں جزیرہ) کے جنوبی سرے پر رکھی گئی تھی (نواح ۶۲۵ ق م) ۔ یہ جزیرہ نما اس ساحلی میدان کے متوازی پھیلا ہوا ہے، جس کے ساتھ قدیم زمانے میں یہ شمال میں ایک ریتلے ٹیلے اور جنوب میں ایک پل کے ذریعے ملا ہوا تھا ۔ اس طرح گھری ہوئی یہ ساحلی جھیل گزشتہ صدیوں کے دوران میں بتدریج تنگ ہوتی چلی گئی ہے ۔ رومیوں کے دور میں اس جزیرے کی، جو اب (غالباً الیری زبان میں جزیرہ نما کے نام کی رعایت سے) دیراخیوم Dyrrhachium [یا دوراخیوم] کے نام سے معروف ہے، تجارتی خوشحالی کے ساتھ ساتھ فوجی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا، کیونکہ یہ جزیرہ شاہراہ ایغناتیوس (Agnatia) کا نقطۂ آغاز تھا، جسے دراصل برینڈیسی Brundisium سے ایک مختصر اور سہل سی بحری مسافت کے بعد شاہراہ آپیا (Appia) ہی کا مزید سلسلہ کہنا چاہیے اور جو اطالیہ اور بلاد مشرق کے درمیان اہم ترین فوجی راستہ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ بوزنطی دور میں بھی سلطنت کے مغربی دروازے کی حیثیت سے دیراخیوم کی بڑی مضبوط قلعہ بندی کی گئی تھی .

۱۲۰۵ء کی تقسیم میں جب دیراخیوم وینس کے حصے میں آیا تو اس کے بعد حکمران بہت جلد بدلتے رہے، تا آنکہ ۱۳۹۲ء میں اسے یہاں کے مقامی خاندان تھوپیا نے وینس کے سپرد کر دیا کیونکہ عثمانیوں کے مقابلے میں وہ اب اس کا مزید دفاع کرنے کے قابل نہ رہا تھا، اہل وینس نے اس کا احاطہ تنگ کرکے نئے سرے سے فصیلیں تعمیر کیں ۔ علاوہ ازیں انھوں نے ساحلی جھیل کو صاف کرنے کی بڑی شد و مد سے کوشش کی تاکہ بندرگاہ میں بیٹھ جانے والی ریت اور ملیریا کا سدّباب کیا جائے، لیکن اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی ۔ ۱۴۶۷ء میں محمد ثانی کی البانوی مہم کے دوران دوراچو Durazzo، جسے یہاں کے دہشت زدہ باشندے قریب قریب خالی کر گئے تھے، ایک یقینی حملے کا شکار ہونے سے بچ گیا (دیکھیے F. Babinger : *Mahomet II le conquérant et son temps*، پیرس ۱۹۵۴ء، ص ۳۱۱ تا ۳۱۳) ۔ اس کا خاتمہ کہیں ۱۵۰۱ء میں ہو سکا جب کہ یہاں کے گورنر کی عارضی غیر موجودگی میں قریبی علاقہ ایلبصان Elbasan کے سنجاق بے عیسٰی بیگ اوغلو محمد بیگ نے ۱۷ اگست کو اس پر شبخون مارا (سعد الدین، ۲ : ۱۱۳، ۱۱۴، جس نے ادریس بدلیسی کے معاصرانہ بیانات کا تتبع کیا ہے) ۔ اس کے بعد دوراچو کا نظم و نسق ایلبصان کی ایک قضا کی حیثیت سے انجام پاتا رہا ۔ پرانے شہر کے جنوب مشرق میں اس کا رقبہ اور بھی کم کرکے (۶۰۰ × ۲۵۰ کیلومیٹر میں) اس کی فصیلیں دوبارہ تعمیر کی گئیں اور قدیم بالا حصار اس چار دیواری سے باہر رہ گیا.

آل عثمان کے زیر حکومت دوراچو کی گزشتہ اہمیت عملاً بالکل ختم ہو گئی اولیا [چلبی] (۱۶۷۰ء) کے بیان کے مطابق یہ ڈیڑھ سو گھروں پر مشتمل

ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جس میں صرف ایک مسجد تھی؛ تاہم ازمنۂ وسطی کی طرح یہاں نمک سازی کی صنعت خاصے اچھے پیمانے پر جاری تھی۔ تجارتی سرگرمیاں بھی قابل اعتنا تھیں اور ایک ویودہ لق voyvodalik کی حیثیت سے اس شہر کا انتظام ایک امین کے سپرد تھا، جو ایک قاضی کے ساتھ یہاں سے جنوب مشرق میں بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک نسبۃً صحت افزا مقام قوئیہ میں سکونت پذیر تھا.

دوراچو کی موجودہ خوشحالی کا آغاز دوسری جنگ عظیم سے ذرا قبل ہوا تھا۔ اٹلی نے یہاں ایک اول درجے کی بندرگاہ تعمیر کی۔ آج کل یہ ریل کے ذریعے تیرانہ اور ایلبصان سے ملا ہوا ہے۔ بندرگاہ اور تعطیلات گزارنے کی تفریح گاہ کی حیثیت سے یہ کافی ترقی کر گیا ہے (آبادی : تیس ہزار)۔

مآخذ : (۱) Pauly-Wissowa، بذیل مادۃ Dyrrhachion (طبع Philippson)؛ (۲) K. Jireček: *Die Lage und vergangeneit der Stadt Durazzo in Albanien*، در *Illyrisch-Albanische Forschungen*، ۱ (۱۹۱۶ء) : ۵۲ تا ۱۵۷؛ (۳) L. Heuzey: *Mission archiologique de Macédoine*، پیرس ۱۸۷۶ء، ص ۳۳۱ تا ۳۹۲ و مخا کہ؛ (۴) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۸ : ۷۰۱ تا ۷۱۲ = ملخص ترجمہ و حواشی از F. Babinger، در *MSOS*، ۳۳ (۱۹۳۰ء) : ۱۶۶ (مع مزید حوالہ جات)؛ (۵) H. Hecquard: *Histoire et description de la Haute Albanie ou Guégarie*، پیرس ۱۸۵۸ء، ص ۲۵۸ تا ۲۶۳؛ (۶) Baedeker's *Dalmatien und die Adria*، ۱۹۲۹ء، ص ۲۳۵ تا ۲۳۶ (از F. Babinger)؛ (۷) *Enc. It.*، بذیل مادہ Durazzo؛ (۸) Albania، طبع S. Skendi، لنڈن ۱۹۵۷ء؛ (۹) (Albturist) *Guide d' Albanie*، تیرانہ ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۶ تا ۱۷۳.

(V. L. MÉNAGE)

* **دَرْب :** رک بہ المدینہ و باب.

* **دَرْبُ الْاَرْبعین :** بلاد السودان کو شمال سے ملانے والے بڑے بڑے راستوں میں سے ایک راستہ؛ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسے طے کرنے میں چالیس دن سفر کرنا ہوتا ہے۔ براؤن W.G. Browne ہی ایک ایسا یورپی باشندہ ہے جس نے (۱۷۹۳ء میں) کی راستہ طے کیا تھا؛ اس نے اسیوط سے منتہائے جنوب کے قریب السُّوینہ Sweini تک اٹھاون دن سفر میں لگائے تھے۔ محمد عمر التونسی نے ۱۸۰۳ء میں اسی فاصلے کو ساٹھ دن میں طے کیا تھا۔ اسیوط سے شروع ہو کر یہ راستہ نخلستان "خارجہ" تک جاتا تھا، جو عثمانی حکومت کی ایک بیرونی چوکی تھی۔ وہاں سے صحرا کو پار کرکے راستہ الشّب تک پہنچتا تھا، جو ایک گھاٹ ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہے اس میں (شبّ) پھٹکڑی پائی جاتی ہے۔ اگلے نخلستان سلیمہ سے ایک شاخ، جو نوبیہ کے علاقے میں دریائے نیل کی طرف مڑ گئی ہے، "تیسرے آبشار" کے ذرا اوپر موشو کے مقام پر دریا تک پہنچ جاتی ہے، جو فنج کے علاقے کی سرحدی چوکی ہے۔ اس راستے پر ۱۶۹۸ء میں Ch. J. Poncet نے سفر کیا تھا (دیکھیے اس کا مقالہ *Voyage to Aethiopia*، طبع ولیم فاسٹر، در *The Red Sea and adjacent countries at the close of the seventeenth century*، مطبوعۂ *Hak. Soc.*، سلسلہ ۲، عددسی، لنڈن ۱۹۴۹ء)۔ سلیمہ سے درب الاربعین کی اصل شاہراہ برابر صحرا صحرا چلتی ہوئی دار فور کی سرحدی چوکی سُوینہ تک جاتی تھی، جہاں سلطان کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کاروانوں کو روک لیا جاتا تھا۔ پھر یہ شاہراہ کُبیہ (*Cobbé*، Browne) کے مقام پر ختم ہو جاتی تھی، جو سلطان کی اقامت گاہ الفاشر کے شمال مغرب میں تقریباً پینتیس میل پر واقع تھا۔ کُبیہ، جو اب ویران ہو چکا ہے، اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک اہم

شہر تھا، جس میں زیادہ تر سوداگر آباد تھے، جن کی اکثریت نوبیہ سے نقل وطن کرکے آئی تھی۔ دَرْب الاربعین مصر جانے کے لیے قافلۃ السُّودان کا راستہ تھا، جو غلام، اونٹ، عاج، شتر مرغ کے پر اور گوند لاتا تھا اور دھات کی مصنوعات اور کپڑا لے کر لوٹتا تھا۔ انیسویں صدی کے دوران میں مشرقی بلاد السودان میں سیاسی تبدیلیوں اور تجارتِ غلاماں میں انحطاط آ جانے کے نتیجے میں دَرْب الاربعین کی اہمیت جاتی رہی اور اب فقط اس کے بعض حصّے ہی گاہے گاہے استعمال ہوتے ہیں.

مآخذ : (۱) W. G. Browne : Travels in Africa, Egypt and Syria ، لنڈن ۱۷۹۹ء ؛ (۲) محمد عمر التونسی : تشحیذ الاذہان بسیرت بلاد العرب و السودان ، طبع سنگی ، پیرس ۱۸۵۰ء ، ص ۳۹ تا ۱۰۵ ؛ ترجمہ Perron : Voyage au Darfour par le ckeykh Mohammed Ebn-Omar El-Tounsi ، پیرس ۱۸۴۵ء ؛ (۳) W. B. K. Shaw : Darb El Arba'in در Sudan Notes and Records ، ۱/۱۲ ، ۱۹۲۹ء : ۶۳ تا ۷۱ (مع عکسی تصاویر).

(P. M. Holt)

* **دَرَبُکَّۃ** : گلدان کی شکل کا ڈھول، جس کا زیادہ چوڑا منہ جھلّی سے منڈھا ہوتا ہے اور نیچے کا منہ کھلا ہوتا ہے ۔ اس کا پیٹا عموماً منقّش یا کُھدے ہوئے ظروف گلی کا ہوتا ہے ، لیکن اس میں کندہ کاری اور چوبی یا دھات کی پچی کاری بھی ہوتی ہے ۔ بجانے کے وقت اسے بازو کے نیچے سیدھا رکھتے اور انگلیوں سے بجاتے ہیں ۔ اس نام کی مختلف علاقائی شکلیں ہیں : "دَرَابُکّہ" (یا ضَرَابُکَّۃ)، "دِرَابُکّی" اور "دَرْبوکہ" ۔ ڈوزی Dozy اور براکلمان Brockelmann اس لفظ کو سُریانی زبان کے "اَرْدَبْکا" سے ماخوذ سمجھتے ہیں، لیکن فارسی کا "دُنْبَک" اور "تُنْبَک" زیادہ قرین قیاس ہے، گو لغت نویس غلطی سے مؤخر الذکر کو اِبن بتاتے ہیں ۔ دَرَبُکّہ کا نام اور اس کی مختلف شکلیں بالکل جدید ہیں ، گو "دربلۃ" (جو کاتب کی غلطی سے دربکۃ کے بجائے تحریر ہوا ہے) الف لیلۃ و لیلۃ میں مذکور ہے ۔ اس کی ایک قسم قدیم مصر میں بھی پائی جاتی ہے ۔ "دِرِّیج"، کا ذکر المُفَضَّل بن سَلَمہ (م ۳۱۸ھ / ۹۳۰ء) نے کیا ہے ۔ گو اس نے غلطی سے یہ خیال کیا کہ وہ ایک قسم کا طنبور تھا ، جیسا کہ بہت سے عربی لغت نویسوں کا خیال تھا ، لیکن ہم المَیدانی (م ۵۱۸ھ / ۱۱۲۴ء) کی وجہ سے جانتے ہیں کہ وہ ایک ڈھول تھا ۔ ابن مکرّم (م ۷۱۰ھ / ۱۳۱۱ء) کہتا ہے کہ اس کا صحیح تلفظ "دُرّیج" ہے اور یہ لفظ اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ مغرب میں پایا جاتا ہے ۔ "کریج" اور "کربیج" جو المقّری میں آئے ہیں، وہ بلا شبہ "دریج" کی غلط خوانی ہے ۔ الشَقُندی (م ۶۲۸ھ / ۱۲۳۱ء) اس ڈھول کے لیے بربری نام "اگوال" استعمال کرتا ہے اور ابھی تک یہی نام مغرب میں مستعمل ہے، گو Höst اسے "اکوال" کہتا ہے، جبکہ یہ الجزائر میں "گلّال" ہے ۔ طرابلس میں "تَبَدّبہ" کے نام کا استعمال عام ہے اور مصر میں "طَبلہ" کا.

مآخذ : (۱) دوزی، لائڈن بار اول، تکملہ، بذیل مادۂ طبل، ص ۲۱۵ تا ۲۱۶ ؛ (۲) J. Robson : Collection of Oriental writers on music ، ۳ : ۱۳ ، Bearsden ۱۹۳۸ء ؛ (۳) Farmer : Studies in Oriental musical instruments ، سلسلۂ اول، ص ۸۶ تا ۸۷ ، لنڈن ۱۹۳۱ء ؛ (۴) G. A. Villoteau : Description de l' Égypte. État moderne ، ۱ : ۹۹۶ ، پیرس ۱۸۱۳ء ؛ (۵) E. W. Lane : Modern Egyptians ، ص ۳۶۶ تا ۳۶۷ ، لنڈن ۱۸۶۰ء ؛ (۶) A. Lavignac : Encyclopédie de la Musique ، ۵ : ۲۷۹۳ ، ۲۹۳۲ ، ۳۰۲۶ ، پیرس ۱۹۲۲ء ؛ (۷) Delphin et Guin : Notes sur la poésie et la musique arabes ، ص ۳۳ تا ۴۴ ، پیرس ۱۸۸۶ء ؛ (۸)

المقّری: Analectes، ۱: ۱۳۳، لائڈن ۱۸۵۵ء - ۱۸۶۱ء؛ (۵) Höst: Nachrichten von Marokos und Fes، ص ۲۶۲، جدول (tab) ۱۳، ص ۹، کوپن ہیگن ۱۷۸۱ء؛ (۱۰) H. Hickmann: La Darabukkah، در BIE، ۳۳: ۲۰۹ تا ۲۳۵، قاہرۃ ۱۹۵۲ء۔ اس کے نمونے نیویارک (Crosby Brown، عدد ۳۲۵، ۳۳۵)، برسلز (Conservatoire، عدد ۲۱۱، ۳۳۰ تا ۳۳۴، ۶۸۰) اور پیرس (Conservatoire، عدد ۹۵۳ تا ۹۵۷؛ ۱۳۵۷) میں دکھائے جاتے ہیں؛ [(۱۱) اغ، مصر، ۹: ۱۷۷ ببعد؛ (۱۲) Bel: La Population Musulmane de Tlemcen، ص ۹۳]۔

(H. G. FARMER)

* **دربند**: داغستان [رک بآں] کا ایک شہر، جسے عرب قرون وسطیٰ میں باب الابواب [رک بآں] کہتے تھے۔ اس عنوان کے تحت اس کے فقط زمانۂ حال کے واقعات قلمبند کیے جائیں گے۔

۱۷۲۲ سے ۱۷۳۵ء تک روس کے تحت رہنے کے بعد دربند پھر ایرانیوں کے قبضے میں آ گیا اور نادر شاہ نے کوشش کی کہ اس میں پچھلی سی شان و شوکت پھر پیدا ہو جائے، لیکن اس کی وفات کے بعد دربند قُوبہ کے خان، فتح علی کے ہاتھ چلا گیا۔ ۱۷۹۵ - ۱۷۹۶ء میں روس نے اس پر دوبارہ قبضہ کر کے جلدی ہی خالی کر دیا اور بالآخر ۲۱ جون / ۳ جولائی ۱۸۰۶ء کو پھر اس پر قبضہ کر لیا۔

روس کے قبضے میں آنے کے بعد اس شہر کی قدیم جنگی اہمیت ختم ہو گئی۔ تاہم ماضی میں ایک مستحکم شہر کی حیثیت سے اس کی جو شان تھی اس کے آثار کو بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ ان دو دیواروں میں سے جن سے شہر اور قلعہ گھرا ہوا تھا جنوبی دیوار کو زیادہ نقصان پہنچا ہے، جس کے آثار میں اب صرف چار دروازے اور تین برج باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شمالی دیوار، جس میں آٹھ دروازے اور تیس برج ہیں، تقریباً پوری کی پوری قائم ہے۔

شہر کے شمال کی جانب عربوں کے زمانے کا قرقلار کا مقبرہ واقع ہے، جو آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ قدیم جامع مسجد، سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کی کچھ مسجدیں اور کچھ پرانی کاروان سرائیں اب بھی تقریباً اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ شہر میں قدیم نظام آبپاشی کے جو آثار موجود ہیں وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ اس شہر کی تہذیب بلحاظ تکنیک بہت ترقی یافتہ تھی۔

قدیم مستحکم شہر نے اقتصادی حیثیت سے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ شہر کی زمین بہت زرخیز ہے (جس میں انگور اور دوسرے پھل بکثرت ہوتے ہیں)۔ زمین کی نشیبی تہ میں پیڑولیم اور قدرتی گیس کثرت سے موجود ہے؛ سمندر کے قُرب کی وجہ سے یہ مچھلی کے شکار کی ایک اہم بندرگاہ بن گیا ہے اور ان باتوں کے علاوہ باکو - مخچ - قلعہ ریلوے یہاں سے ہو کر گذرتی ہے اور اس سے تجارتی سامان کے لانے لے جانے میں سہولت ہوتی ہے، نیز شہر میں غذائی صنعتوں کی کثرت ہے، جن میں مقامی پیداوار کی چیزوں سے کام لیا جاتا ہے۔

اس صدی کے شروع میں آبادی کے ستاون فی صد مسلمان تھے، اٹھارہ فی صد روسی، سولہ فی صد یہودی اور سات فی صد آرمینی۔ اس زمانے میں ایک طرف تو تفلیس اور باکو کی بالشویک (بلشفی) منظم انجمنوں کے زیر اثر اور دوسری طرف I. V. Maligine اور بعض دوسرے جلا وطنوں کے زیر اثر اشتراکی خیالات پھیل رہے تھے۔ دربند میں جن لوگوں نے سب سے پہلے شورش پھیلائی وہ روسی ریلوے کے کارکن تھے، جن کی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں واضح طور پر سامنے آئیں۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں اس شہر میں

سوویت اقتدار قائم ہوا اور فروری کے انقلاب کے وقت کارکنوں اور سپاہ کی سوویت تنظیم کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ جولائی ۱۹۱۸ء سے مارچ ۱۹۲۰ء تک یہ شہر خانہ جنگی میں مبتلا رہا؛ طاقت مقامی قوم پرستوں کے ہاتھ میں تھی، جو بالشویکوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ بالآخر بالشویکوں کو سرخ فوج سے درخواست کرنا پڑی کہ وہ وہاں اپنا تسلط جما لے۔ جب سے داغستان کی حکومت جمہوریہ قائم ہوئی دربند اپنے ضلع کا صدر مقام ہو گیا ہے اور اہمیت کے لحاظ سے وہ جمہوریہ کا دوسرے درجے کا شہر ہے۔ ۱۹۵۶ء میں اس کی آبادی اکتالیس ہزار آٹھ سو تھی،

مآخذ: (۱) W. Barthold، در Zapiski vost. otd. Imp. Russkago Arkh. Obshč، xix، xi بعد، ۵۲۳ بعد؛ xxi، iv بعد؛ (۲) وہی مصنف: Derbend، در وا، بار اول؛ (۳) F. I. Kazubskiy: Istoriya goroda Derbenta، ۱۸۰۶-۱۹۰۶ء، تمیر خان شُرا Temir Khan Shura، ۱۹۰۶ء؛ (۴) عباس قلی آغا: گلستان ارم، باکو ۱۹۲۶ء؛ (۵) M. I. Artamonov: Nastoyashčiy Derbent، در Archeologie soviétique ۱۹۳۶ء؛ (۶) N. B. Baklanov: Pamyatniki Dagestana، ۸: ۱، لینن گراڈ ۱۹۵۵ء؛ نیز دیکھیے باب الابواب کے ماخذ؛ (۷) البستانی: دائرة المعارف، بیروت ۱۸۸۵ء، ۷: ۶۵۲؛ (۸) دائرة المعارف الاسلامیة، مصر، ۹: ۱۲۸ تا ۱۹۰؛ (۹) Th. S. Bayeri: Opuscula، طبع Klotzuis، ہال ۱۷۷۰ء؛ (۱۰) E. Eichwald: Reise auf dem caspischen Meere، دو جلدوں میں؛ (۱۱) Berezin: Pute Shestive Po Dagestanui Zakawkaryu وغیرہ؛ (۱۲) B. Dorn: Bericht Wissenschaftliche Reise in den Kauhasus; Beiträge Zur Geschichte der Koukasichen länder Vnd Vülker aus morgenländischen shriftstellern, betre ·· das Kaspische Meer Und angrenzende länder, Caspia؛ (۱۳) G. Le Strange: The Lands of the Eastern Caliphate، ص ۱۸۰].

(H. Carrère D'Encausse)

* **الدَّرْجِینی**: ابوالعباس احمد بن سعید بن سُلیمٰن بن علی بن اِیخلَف، ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کا ایک اِباضی فقیہ، شاعر، مورخ اور اباضیوں کے متعلق تواریخی اور سوانحی تالیف طبقات المشائخ کا مؤلف ہے۔ وہ علما کے ایک بربر اِباضی خاندان سے تعلق رکھتا تھا؛ یہ خاندان طرابلس الغرب (Tripolitania) میں جبل نفوسہ کے ایک مقام تِمِجّار کا رہنے والا تھا۔ الدرجینی کا جدّ الحاج اِیخلَف بن اِیخلَف النفوسی التمِجّاری، جو ایک ممتاز فقیہ تھا، جرید [رک بآں] میں نِفطہ کے قرب و جوار میں رہتا تھا۔ اِیخلَف کا بیٹا علی، جو چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں گزرا ہے، سوڈان کے ساتھ تجارت سے بسر اوقات کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ۵۷۵ھ/۱۱۷۹-۱۱۸۰ء میں اپنے ایک تجارتی سفر کے دوران میں مغربی سوڈان کی ریاست مالی کے کافر بادشاہ کو اِباضی مذہب کا حلقہ بگوش بنا لیا، لیکن یہ محض ایک اساطیری روایت ہے (قب J. Schacht، در Travaux de l'Institut de Recherches Sahariennes، ۱۱، ۱۹۵۴ء: ۲۱ ببعد)۔ علی کا فرزند مشہور فقیہ سلیمٰن تھا، جو ابوالعباس کا دادا ہے۔ وہ جرید میں کَنُّومہ کے مقام پر رہتا تھا؛ اسے ولی اللہ خیال کیا جاتا تھا۔ ابوالعباس کے باپ سعید نے، جو ایک ممتاز محدث تھا، نفطہ کے قریب دَرْجِین السُّفلٰی الجدید میں سکونت اختیار کر لی۔

ہم الدَّرجینی کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ وہ یقیناً نو عمر ہی ہوگا جب ۶۱۶ھ/۱۲۱۹-۱۲۲۰ء میں اوارگلہ Ouargla گیا اور اس شہر کے اِباضی مشائخ سے تعلیم حاصل کرنے میں دو برس گزارے۔ بعد ازاں وہ جرید واپس چلا گیا، جہاں ہم اسے ۶۳۳ھ/۱۲۳۵-۱۲۳۶ء میں توزر Tozeur کے

مقام پر تاریخی تحقیقات کرنے میں مصروف دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ جزیرۂ جربہ میں رہا، جہاں "عزّابہ" (= اِباضی علما) اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انھیں کی درخواست پر اُسے طبقات المشائخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

اس کتاب کے اسباب تالیف کے متعلق ابوالقاسم البرادی [رک بآں] کی کتاب الجواہر المُنتقاۃ کچھ معلومات بہم پہنچاتی ہے۔

البرادی لکھتا ہے: "یہ ہیں وہ حالات جن کے تحت ابوالعباس نے اپنی کتاب تحریر کی۔ الحاج عیسی بن زکریا اپنے ساتھ کئی تصانیف لے کر اِنھیں دنوں عمان سے پہنچا تھا ... مشرق میں اس کے اِباضی بھائیوں نے اس سے کوئی ایسی کتاب بھیجنے کو کہا تھا جس میں سب سے پہلے اِباضیوں کی سوانح عمریاں اور مغربی اسلاف کے اوصاف مذکور ہوں۔ الحاج عیسی نے فاضل "عزّابہ" سے مشورہ لیا، جو اس وقت جربہ میں پائے جاتے تھے اور انھیں ان کے مشرقی ہم مذہبوں کی خواہش سے آگاہ کیا۔ انھیں پہلے ابوزکریا کی کتاب کا خیال آیا، لیکن وہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ کتاب ہر حیثیت سے مکمل نہیں ہے اور اس کے مصنف کا طرز، جو بربر زبان کا عادی تھا، اور اس لیے عربی نحو کے قواعد اور اس کی اصطلاحات و محاورات کا پوری صحت سے استعمال نہیں کرتا تھا، اکثر جگہ ناقص ہے۔ پھر انھیں دولت رستمیہ کی تاریخ اور قدیم علما کے فضائل پر ایک نئی کتاب تالیف کرانے کی سوجھی۔ ابوالعباس سے زیادہ کوئی شخص اس کام کو احسن طریق سے انجام دینے کے لیے موزوں نہ تھا اور یہ کام اسی کو سونپا گیا۔

کتاب طبقات المشائخ کے فقط کچھ خطی نسخے ہی ملتے ہیں (چند Mzab میں اور ایک Z. Smogorzewski کے ذخیرے میں)۔ یہ بالکل جدا دو حصوں پر مشتمل ہے، جن میں سے پہلا حصہ تو کتاب السیرۃ و اخبار الائمۃ (مؤلفۂ ابوزکریا یحیی بن ابی بکر الورجلانی) کی یا کہنا چاہیے کہ اس کی تاریخ کے پہلے حصے کی بلفظہ نقل ہے۔ اس میں اباضیوں کے شمالی افریقہ میں نفوذ کرنے کی، اباضی امامت کے قیام کی اور خاندان بنو رستم کے اماموں کی تاریخ، نیز اخیر میں مغربی نسل کے اباضیہ علما کی چند سوانح عمریاں مندرج ہیں۔ دوسرا حصہ، جو الدرجینی کا تخلیقی کام ہے، علما اور دیگر مشہور اباضیوں کے تذکروں کا مجموعہ ہے، جو رواج کے مطابق بارہ طبقات میں منقسم ہے اور ہر طبقہ پچاس سالہ عہد پر حاوی ہے۔ اس تصنیف کے پہلے چار طبقات پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی اور دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے مشرقی اباضی علما کے تذکروں پر مشتمل ہیں۔ مصنف نے اس جگہ مغرب کی مشہور شخصیتوں کے تذکرے درج کرنا لاحاصل خیال کیا اور صرف ابوزکریا کی تالیف کے متعلقہ حصے کو نقل کر دیا۔ گاہے گاہے ان مشرقی علما کی سوانح عمریوں کے بہت قدیم مآخذ کا ذکر ہے۔ دوسری طرف جو اس کے بعد آٹھ طبقات آتے ہیں وہ مغربی نسل کے اباضی مشائخ کی سوانح عمریوں تک محدود ہیں۔ آخری چار طبقات میں اوارگلہ Ouargla اوئیدریغ Oued Righ اوئیدسوف Oued Souf، جرید اور جزیرۂ جربہ ہی کے اشخاص کا ذکر ہے، لہذا ان کی اہمیت مقامی سے زیادہ نہیں۔

الدرجینی نے اپنی کتاب کے دوسرے حصے میں مآخذ کی بہت بڑی تعداد استعمال کی ہے، جس میں دیگر مآخذ کے علاوہ محبوب ابن الرحیل العبدی (دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی) اور ابوالربیع سلیمن بن عبدالسلام الوسیانی چھٹی ہجری/بارھویں عیسوی کی تاریخ و رجال سے متعلق تصانیف ہیں۔ اس نے اپنی کتاب میں بعض عجیب عبارات شامل کی ہیں، جو اباضی تاریخ کے طالب علموں کے لیے گرانقدر ہیں، مثلاً "حلقہ" کی

تشکیل کے متعلق قاعدے، جو اباضی علامہ ابو عبداللہ محمد بن بکرالنفوسی (پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی) نے وضع کیے تھے اور وہ خطبہ جو مشہور اباضی سردار ابوحمزۃ الشاری (دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی) نے مدینے میں دیا تھا۔ کتاب طبقات المشائخ کی نفیس زبان شمالی افریقہ کی دوسری اباضی تصانیف سے فصاحت میں کہیں سبقت لے گئی ہے اور مصنف نے اپنے مغربی مآخذ کے اسالیب کی تصحیح کی ہے، جیسا کہ ابو زکریا کی تاریخ کے اصلی متن کا مقابلہ کرنے سے واضح ہو سکتا ہے۔

الدرجینی ایک "دیوان" اور منظوم خطوط کا بھی مصنف ہے؛ بحیثیت ایک فقیہ کے اس نے تقسیم وراثت کے متعدد مسائل کا تصفیہ کیا، جنھیں بعد ازاں الجیطالی [رک بآں] نے یکجا مرتب کیا۔

اس کی وفات کی تاریخ نامعلوم ہے، لیکن وہ بلاشبہہ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں ہوئی۔

مآخذ : (۱) ابوالفضل ابو القاسم بن ابراہیم البرّادی : کتاب الجواہر المنتقات، طبع سنگی، قاہرہ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ - ۱۸۸۵ء، ۲ : ۲۱۵ ببعد، ۲۱۹؛ (۲) ابوالعباس احمد بن سعید الشمّاخی : کتاب السیر، طبع سنگی، قاہرہ ۱۳۵۱ھ/۱۸۸۳ - ۱۸۸۴ء، ص ۱۶۳، ۱۷۸، ۴۵۳ تا ۴۹۶ و بمواضع کثیرہ؛ (۳) A. de C. Motylinski : *Bibliographie du Mzab. Les livres de la secte abadhite*، در *Bulletin de Correspondance Africaine*، ۳ (۱۸۸۵ء) : ۲۹، ۳۸ تا ۴۳؛ (۴) براکلمان، ۱ : ۳۴۶ و تکملہ، ۱ : ۵۷۵؛ (۵) T. Lewicki : *Notice sur la chronique ibāḍite d'ad-Dargini*، در *RO*، ۱۳ (۱۹۳۶ء) : ۱۴۶ تا ۱۷۲؛ (۶) J. Schacht : *Bibliothèques et manuscrits abadites*، در *RA*، C (۱۹۵۶ء) : ۳۹۷۔

(T. Lewicki)

⊛ **درد** : (اردو کے مشہور صوفی شاعر) میر خواجہ میر بن خواجہ محمد ناصر عندلیب کا تخلص (فہرست بانکی پور مخطوطات فارسی، ۱۶ : ۸۵؛ پورا نام : نورالناصر خواجہ میر محمدی)؛ سلسلۂ نسب خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے ہو کر امام حسن عسکری تک پہنچتا ہے۔ درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب بھی صوفی باعمل اور فارسی کے مصنف اور شاعر تھے۔ نالۂ عندلیب انھیں کی تصنیف ہے، جو ۱۱۵۳ھ میں ختم ہوئی۔ اس میں قصے کے پیرائے میں معارف بلند اور مطالب عالیہ بیان ہوئے ہیں۔ درد بمقام دہلی ۱۱۳۲ - ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے (فہرست بانکی پور میں ۱۱۳۷ھ درج ہے، مگر یہ غلط ہے)؛ انتقال ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو بعمر ۶۸ سال ہوا اور اپنے خاندانی مدفن باغیچۂ خواجہ میر درد میں دفن ہوئے۔ تفسیر، حدیث، تصوف اور دوسرے علوم رسمی کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفل سماع منعقد ہوتی تھی، جس میں اکثر علما و مشائخ و امرا شرکت کرتے تھے۔ ان کے یہاں ایک مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوا کرتی تھی (دیکھیے نکات الشعرا، بذیل میر تقی میر)۔

اٹھائیس برس کی عمر میں لباس فقر پہن لیا؛ انتالیس برس کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد مسند نشین ارشاد ہوئے۔ سلطنت دہلی کی تباہی اور قتل و غارت کے زمانے میں، جب دہلی کے اکثر بڑے بڑے شاعر اور اہل کمال گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تھے، خواجہ میر درد ثابت قدمی سے اپنے تکیے میں بیٹھے رہے۔ ان کے اس ثبات نفس، توکل علی اللہ اور حوصلہ‌مندی سے (جو ان کی شخصیت کے اوصاف خاص ہیں) ان کی شاعری کی روح بھی متاثر ہوئی۔ تصانیف میں اردو اور فارسی دواوین کے علاوہ تصوف کی چند کتابیں شامل ہیں : اسرارالصلوٰۃ، نماز کے

اسرار و برکات پر ایک رسالہ، جو پندرہ سال کی عمر میں تصنیف ہوا۔ واردات (۱۱۷۲ھ)، جس میں ایک سو گیارہ عنوانوں میں تصوف کے رموز و معاملات بیان ہوئے ہیں؛ ان واردات میں سے ہر ایک میں درد کی ایک یا دو رباعیات بھی ہیں، جن کی شرح کی گئی ہے۔ ان کی تصنیف علم الکتاب (۱۱۷۹ھ / ۱۱۸۱ھ) واردات کی شرح ہے۔ اس کے علاوہ آہ سرد، نالۂ درد اور شمع محفل ہے (۱۱۹۹ھ)؛ ایک اور رسالہ درد دل بھی ہے۔ غنا کی بحث میں بھی ایک کتاب لکھی (عبدالحی: گل رعنا، ص ۲۰۲)۔ ان کا دیوان فارسی نواب نورالحسن خان بن نواب صدیق حسن خان نے چھپوا دیا تھا۔

خواجہ میر درد اردو کے ممتاز غزل گوؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا دیوان مختصر ہے، مگر رطب و یابس سے پاک ہے (''دیوانش اگرچہ مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب''، رک بہ تذکرۂ میر حسن)۔ ان کی غزل عموماً سات شعر یا نو شعر کی ہوتی ہے۔ بحریں عام طور سے چھوٹی اور جیسا کہ آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ خواجہ میر درد کی شاعری کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ بقول آزاد ''تصوف جیسا انھوں نے لکھا، اردو میں ۔ تک کسی سے نہ ہوا'' (آب حیات، بذیل درد)؛ مگر ان کی غزل کا خالص عاشقانہ اور مجازی رنگ بھی اپنے دور کے بڑے شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی شاعری میں خلوص اور درد مندی کے علاوہ ت و حکمت کے اعلیٰ اسباق ملتے ہیں۔ ''درد کا دیوان اعلیٰ واردات قلب اور روحانی ارتقا کا ایک سچا چربہ ہے'' (مضامین عظمت، ص ۹۱)۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے برترین حقیقت کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اشعار سچے جذبۂ محبت اور اثر و تاثیر سے لبریز ہیں۔ ان کے اشعار میں شکستہ دلی اور لطیف افسردگی ہے، مگر حیات بخش افسردگی، جس سے دل غم سے مغلوب نہیں ہو جاتا، کیونکہ ان کے اشعار مایوسی کی جگہ دلوں میں تمنا اور آرزو کا جذبہ بیدار کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں صوفیانہ خیالات کے علاوہ مجازی عشق کے مضامین بھی موجود ہیں، مگر انھوں نے پیرایۂ بیان ایسا رکھا ہے کہ اکثر غزلوں میں مجاز اور حقیقت دونوں طرح کے مفہوم شعر میں قائم رہتے ہیں۔ مجاز و حقیقت کا یہ پیوند ان کی غزل کے انفرادی لب و لہجہ کی تعیین کرتا ہے، چنانچہ ان کے استعارات و کنایات بھی اسی قسم کے ہیں (اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سید عبداللہ: بحث و نظر، بذیل ''درد کی شاعری کا صوفیانہ لب و لہجہ'')۔

درد کی فارسی شاعری کی روح مضمون کے لحاظ سے ان کی اُردو شاعری کے قریب ہے، مگر اس کا درجہ ان کی اُردو شاعری سے کم تر ہے۔ البتہ فارسی میں ان کی رباعیات پُر تاثیر ہیں۔

خواجہ میر درد کے شاگردوں میں بعض اچھے غزل گو شاعر شامل ہیں، مثلاً قائم چاند پوری (مصنف مخزن نکات)، ہدایت اللہ ہدایت، حکیم ثناءاللہ فراق، میر اثر (برادر خرد درد)، میر محمدی بیدار وغیرہ۔ ان میں میر اثر مختصر بحروں میں بہت اچھی غزل لکھ لیتے تھے، مگر ان کی شہرت زیادہ تر ان کی مثنوی خواب و خیال کی وجہ سے ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا درد نے کی تھی، مگر چند سو شعر کہہ کر لکھنا بند کر دیا۔ میر اثر نے ان اشعار پر بنیاد رکھ کر مثنوی کو مکمل کر دیا۔

مآخذ: (۱) شعرائے اردو کے عام تذکرے، مثلاً میر تقی: نکات الشعرا؛ (۲) قائم: مخزن نکات؛ (۳) میر حسن: تذکرۂ شعرائے اردو؛ ادب اور شاعری کی تاریخیں، مثلاً (۴) آزاد: آب حیات؛ (۵) عبدالحی: گل رعنا؛ (۶) عبدالسلام: شعر الہند؛ (۷) یحیی تنہا: مرآۃ الشعراء، جلد اول؛ (۸) سری رام: خمخانۂ جاوید؛ (۹) رام بابو سکسینہ:

تاریخ ادب اردو؛ (۱۰) کلیم الدین احمد: اردو شاعری پر ایک نظر؛ مقالات میں قابل ذکر (۱۱) حبیب الرحمٰن خان شروانی: مقدمۂ دیوان درد، سلسلۂ آصفیہ شمارہ ۳: (۱۲) مضامین عظمت اللہ خان (مضمون خواجہ میر درد)؛ (۱۳) سید هاشمی فرید آبادی: خواجہ میر درد کے زمانے کی سیاسیات، در رسالۂ اردو، اپریل ۱۹۳۵ء؛ (۱۴) ا ۔ د ۔ نسیم: مقالہ ”درد“ (جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے).

(سیّد محمد عبداللہ)

* **دردانیال**: رکّ بہ چناق قلعہ بوغازی.

* **دَرْدِستان**: کوہ هندوکش اور کاغان کے درمیان اس علاقے کا نام جو ۳۷ درجے عرض بلد شمالی، ۷۳ درجے طول بلد مشرق اور ۳۵ درجے عرض بلد شمالی، ۷۴ درجے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے ۔ یہ هندو دیو مالا کی "دَرْد" قوم کا علاقہ ہے ۔ زیادہ محدود معنی میں یہ علاقہ "شینا" بولنے والے علاقوں یعنی گلگت، استور، گُریز، چلاس، ھُودر، دَرِیل، تَنگر وغیرہ پر مشتمل ہے، یا اس علاقے پر جو اب یاغستان کہلاتا ہے ۔ زیادہ وسیع مفہوم میں ھُنزہ، ناگر اور چترال [رکّ بان] (اس حصے کے بشمول جو یاسین کہلاتا ہے) کی ریاستیں، جو اب پاکستان کے شمالی خطّوں کی تشکیل کرتی ہیں، دَردِستان پر مشتمل ہیں: وسیع ترین مفہوم میں یہ ان علاقوں پر مشتمل ہے جو بہت قریبی زمانے میں کافرستان کہلاتے تھے ۔ هرودوتس Herodotus (۳: ۱۰۲ تا ۱۰۵) پہلا مصنف ہے جو دردوں کے ملک کا حوالہ دیتا ہے اور ”موجودہ افغانستان کے قریب کشمیر کی سرحد پر اس کا مقام“ بتاتا ہے، مگر وہ اس ملک کے ذکر میں ”درد“ کا نام استعمال نہیں کرتا ! البتہ Strabo (ج ۱۵) اور Pliny (*Natural History*، ج ۱۱) اس خطے کے باشندوں کو “Derdae” یا "Dardae" کہتا ہے ۔ سنسکرت مصنفین کے نزدیک درد ”دَرَدہ“ ہیں: یہ وہ خطہ ہے جہاں بدھ نے اپنے مبلغ اور بھکشو بھیجے ۔ کسی زمانے میں یہ خطے بدھ مت کا گڑھ تھے آج تک وھاں بدھ کے بہت سے آثار اور باقیات موجود ہیں ۔ درد ”ایک آزاد قوم ہے، جس نے چند برس ہوئے دَرس Dras کو تاراج کیا ۔ ان کا وطن تین یا چار دن کی مسافت پر پہاڑوں میں ہے اور وہ ”پختو“ یا دَرْدی زبان بولتے ہیں ۔ جن لوگوں کو وہ اپنے حوالے میں قید کر لیتے ہیں انہیں غلام بنا کر فروخت کر دیتے ہیں“ (*Voyage par Mir ‘Izzetulla in 1812*‘ در Klaproth: *Magasin Asiatique*، ۲: ۳ تا ۵).

یہ عجیب بات ہے کہ دردوں کا کوئی مشترک نام نہیں ہے؛ ہر قبیلے کا، جو الگ وادی میں رہتا ہے، مختلف نام ہے اور وہ زیادہ تر ان علاقوں سے ماخوذ ہوتا ہے جہاں وہ بستے ہیں ۔

دردستان کا جو نام کل ملک کو لیٹنر Dr. G. W. Leitner نے اپنی سیاحت کے بعد ۱۸۶۶ء میں دیا تھا اس کی تاریخ اس کے مشمولہ علاقوں، یعنی ھنزہ، ناگر، چترال، بلتستان کے حصّے، لَداخ، گلگت وغیرہ [رکّ بآنہا] کی تاریخ ہے ۔ دردوں کا، جو بذاتِ خود امن پسند قوم ہے، سب سے بڑا دشمن اپنے پہلے حکمران گلاب سنگھ کے زمانے کی کشمیر کی ڈوگرا ریاست تھی ۔ اس نے دردوں کے خلاف کئی مہموں کی قیادت کی ۔ ۱۸۵۰ء میں سکھوں کا ایک بڑا لشکر چلاس کے خلاف بھیجا گیا، جسے ذلت آمیز شکست ہوئی ۔ اگلے سال بخشی هری سنگھ اور دیوان هری چند نے [illegible] دس هزار کا لشکر قلعۂ چلاس کو تباہ کرنے اور کوهستانی قبائل کو، جو چلاسیوں کی مدد کے لیے آئے تھے، منتشر کرنے میں کامیاب ہو گیا.

ھُنزہ اور ناگر کی دُور افتادہ ریاستوں کے متعلق یہ اس بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے کشمیر کی کبھی اطاعت قبول نہیں کی، اس کے سوا کہ کبھی کبھار مٹھی بھر سونے کا برادہ مہاراجا کو بھیج دیا کرتے تھے اور اس کے عوض میں قیمتی تحائف

حاصل کر لیے تھے۔ جب کبھی کشمیر نے ان پر دست درازی کی کوشش کی ان دو ریاستوں نے کشمیر کو ایک سے زیادہ بار سزا دی ہے، لیکن خود وہ ڈوگرا ریاست کی دشمن نہیں رہیں۔

سارے دردستان کا مروّجہ مذہب اسلام ہے؛ ہنزہ، نگر اور چترال کے حصوں میں شیعہ مذہب کی ایک شکل ملتی ہے، گو چترال میں سنّی اکثریت میں ہیں۔ مولائی، جیسا کہ وہ اپنے آپ کو کہتے ہیں، اچھے مسلمان (یعنی مومن) ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں، اگرچہ ان کا میلان ساتویں شیعی امام کی طرف بہت زیادہ ہے۔ بہر کیف وہ آغا خان کی بیعت میں ہیں۔ مولائی (مزید رک بہ اسمعیلیہ) کتاب [illegible] پیر کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، جو فارسی زبان میں ہے اور جس کا ایک ایڈیشن Ivanow نے (بمبئی ۱۹۳۵ء) شائع کیا تھا۔

جب "مجاہدین" یعنی سیّد احمد بریلوی [رک بآں] کے متبعین کو لاہور کے سردار رنجیت سنگھ کے بیٹے کنور شیر سنگھ کی زیر سرکردگی سکھ فوج کے ہاتھوں ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰-۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ پر شکست ہوئی اور وہ تتر بتر ہوگئے تو باغستان میں چمر قند باقی ماندہ "مجاہدین" کا مرکز رہا۔ ان "مجاہدین" اور ان کی اولاد کی اقامت اور [بعض دیگر] کارروائیوں کی بنا پر برطانوی [illegible] بعد ازآں پاکستان سے باغستان میں داخلے کا انتظام "اجازت ناموں" کے ذریعے کر دیا گیا تھا، تاہم حکومت پاکستان نے یہ قاعدہ ۱۹۵۹ء میں منسوخ کر دیا۔

مآخذ: (۱) G. W. Leitner: Dardistan in 1866-1886 and 1893، ووکنگ، بدون تاریخ؛ (۲) وہی مصنف: The Hunza and Nagyr Hand-Book، کلکتہ ۱۸۸۹ و ۱۸۹۳ء؛ (۳) وہی مصنف: The Languages and races of Dardistan (اس کتاب کے دوسرے حصے میں دردستان کی نباتات، دریاؤں، پہاڑوں، لوگوں کے پہناووں، ضمیروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے)؛ (۴) وہی مصنف: مقالہ در Asiatic Quarterly Review، جنوری ۱۸۹۲ء؛ نیز رک بہ چترال، ہنزہ اور نگر؛ (۵) محمد علی قصوری: مشاہدات کابل و باغستان، کراچی، بدون تاریخ۔

(بزمی انصاری)

درذلی: ابراہیم، ترکی عوامی شاعر (۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء تا ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء)۔ وہ بولی کے صوبے میں جنگلی علاقے کے ایک گاؤں شاہنظر میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے استانبول چلا گیا، لیکن بہت جلد اسے اپنے علاقے میں واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے دس سال مصر میں گزارے اور آناطولی کے تمام علاقوں میں خوب سیاحت کی۔ وہ اپنے عہد کے چوٹی کے مغنّی شاعروں میں شمار ہوا۔ اس کے بعد محمود ثانی کے عہد میں وہ دوبارہ استانبول پہنچا اور ان قہوہ خانوں کی جو عوامی شاعروں کا مرکز تھے، ہر دلعزیز شخصیت بن گیا۔ یہاں اس نے ترکی ٹوپی (Fez) پر اپنا ایک مشہور قصیدہ لکھا اور اس جدید ٹوپی کی، جو اس وقت نئی نئی رائج ہوئی تھی، بے حد تعریف کی۔ کچھ مدت تک وہ دربار کی [illegible] سے فیض یاب رہا، لیکن بعد میں شاہی التفات سے محروم ہو کر آناطولی چلا گیا۔ کچھ عرصہ آوارہ گردی میں گزارا اور خودکُشی کی کوشش میں ناکام رہ کر بالآخر انقرہ میں فوت ہوا۔

اس نے جن نظموں میں عروض کی پابندی اور ایسے صاحب دیوان شاعروں خصوصاً فضُولی [رک بآں] کی پیروی کی ہے، جن کی زبان درشت اور کھُردری ہے، وہاں اس کی حیثیت ایک ناکام مقلد کی ہے، لیکن جو نظمیں اس نے قدیم مروّج لے میں لکھی ہیں وہ اگرچہ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے ناقص ہیں تاہم اس کے آزادانہ اور لاابالی مزاج کی پُرخلوص صدائے بازگشت ہیں۔ یہ نظمیں اس کے دائمی اور لاانتہا مصائب کا

عکس ہیں، جن سے اسے اپنی پر آشوب زندگی میں برابر سابقہ رہا۔

مآخذ: (۱) دیوان، طبع سنگی، ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء]؛ (۲) احمد طلعت: Aşik Derdli, Hayatı- Diwanı، بولی Bolu ۱۹۲۸ء؛ (۳) M. F. Köprülü: Türk sazşairleri Antolojisi، ج ۱۲، استانبول ۱۹۳۰ء؛ (۴) Cahit Öztelli: Derdli ve Seyranı، استانبول ۱۹۵۳ء۔

(FAHIR IZ)

* **دِرْدَوَہ** ۔ مشرق حبشہ میں برّی (سڑک اور ریل) اور ہوائی مواصلات کا مرکز اور تجارتی شہر ہے ۔ ہَرَر [رک بآں] کے شمال مغربی جانب ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع ہونے کے باعث دِرْدَوَہ مملکتِ حبشہ کے اس بڑے مسلّم شہر کے حلقۂ ثقافت میں ہے ۔ گمانِ غالب ہے کہ یہ نام صومالی لفظ دِر ضبو Dir-ḍabo ”بمعنی دِر کی حد“ سے مأخوذ ہے (دِر صومالی قبائل کے اس وفاق کا نام ہے جو دِرْدَوَہ اور جِبوتی کے درمیان وسیع خشک علاقے میں آباد ہیں)، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ امہری (حبشہ کی قدیم درباری اور امرا کی) زبان کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نام کی یہ شکل اصل میں ایک عوامی اشتقاق پر دلالت کرتی ہو، جو امہری کلمہ دِرْدَوَہ = ”غیر مزروعہ علاقے کی پہاڑی“) سے مأخوذ ہے ۔ دِرْدَوَہ کی موجودہ حیثیت اور اہمیت ادیس ابابا۔۔جبوتی ریلوے کی مرہونِ منت ہے، جو دَنْکَلی کے ویران میدان سے بلند ہوتی ہوئی دِرْدَوَہ میں پہنچتی ہے ۔ یہ مقیم آبادی کا پہلا مرکز ہے اور بازوے کوہ کے کنارے پر چار ہزار فٹ سے ذرا کم ارتفاع پر واقع ہے ۔ اس کی کُل آبادی میں (جو ایک اندازے کے مطابق تیس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان ہے) گلّس (Gallas)، صومالی، اطالوی، فرانسیسی، یونانی، بھارتی، پاکستانی اور عرب شامل ہیں ۔ شہنشاہ لِج اِیاسو Lidj Iyasu نے پہلی عالمگیر جنگ کے دوران دِرْدَوَہ میں ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران حبشہ کے دوبارہ فتح ہو جانے کے بعد یہ شہر برطانوی محروسہ علاقوں کی انتظامیہ کا صدر مقام بن گیا ۔ اس کے عقبی میدانی علاقے کی مسلمان آبادی کے رسم و رواج میں بوقلمونی پائی جاتی ہے اور شافعی مذہب کو عموماً زیادہ مقبولیت حاصل ہے ۔

مآخذ: (۱) Guida dell' Africa Orientale Italiana، Milan ۱۹۳۸ء، ص ۴۳۲ ببعد: (نقشہ شارع عام، ص ۵۳۴ و نقشہ رقبہ، ص ۴۴۸)؛ (۲) Società Geografica Italiana: L' Africa Orientale، Bologna ۱۹۳۶ء (اشاریہ بذیل Dire Dawa)؛ (۳) Chamber of Commerce: Guide Book of Ethiopia، ادیس ابابا ۱۹۵۴ء (اشاریہ، بذیل Dire Dawa)؛ (۴) Lord Rennell of Rodd: British Military administration of occupied territories in Africa 1941-1947، مطبوعۂ H. M. Stationery Office، ۱۹۴۸ء (اشاریہ، بذیل Dire Dawa)؛ (۵) J. S. Trimingham: Islam in Ethiopia، آوکسفرڈ ۱۹۵۲ء (اس علاقے میں اسلام کی عام خصوصیات کے لیے)۔

(E. ULLENDORFF)

* **دردی اور کافری زبانیں**: یہ نام ان متعدد زبانوں اور بولیوں کے لیے اب عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی بہت سی خصوصیات میں انتہائی قدیم ہیں اور افغانستان، پاکستان اور کشمیر میں ہند آریائی لسانیاتی علاقے کے شمال مغربی کوہستانی گوشے میں بولی جاتی ہیں ۔ کشمیری زبان کے سوا یہ بولیاں بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے غیر اہم ہیں اور ان کی ایسی تحریریں بھی موجود نہیں جن سے ان کی دستاویزی تاریخ مرتب کی جا سکے ۔

کشمیری کے علاوہ باقی دوسری زبانوں اور بولیوں کی معلومات ہمیں صرف چھوٹی بڑی فرہنگوں اور صرف و نحو کے مختصر رسالوں وغیرہ سے حاصل

ہوتی ہیں؛ جن میں سب سے پرانی تحریر، تقریباً ۱۳۸۰ء، کی ہے۔ ان زبانوں اور بولیوں کے لیے ایسی کتب صرف و نحو، فرہنگوں اور نظم و نثر کے مجموعوں کی جو تمام ضروریات کو پورا کر سکیں بہت کمی ہے۔

ذیل کے بیان میں دائرۃ المعارف کی عام املائی روایات سے ہٹ کر دو علامتیں استعمال کی گئی ہیں: ṣ جو صاد کے لیے نہیں بلکہ مہموس قسم کے سخت 'س' کے لیے اختیار کی گئی ہے، جو تالو کے وسط سے ادا ہوتا ہے؛ یعنی سخت کامی یا حنجری (retroflex) ہے؛ دوسری علامت ṇ ہے جو حنجری نون بالغنّہ کے لیے ہے۔

دردی اور کافری زبانوں کی مکمل تقریبی طبقہ بندی ذیل کے طریقے پر کی جا سکتی ہے:

۱۔ کافری لسانی طبقہ: (ا) کتی (بشگلی) زبان، جس کی دو خاص بولیاں ہیں اور جو شمالی نورستان (کافرستان) میں رمگل، کلم، کتوی اور بشگل کی وادیوں میں بولی جاتی ہیں؛ (ب) پرسن (وسی ـ ویری؛ ویرن)، جس کا تکلمی علاقہ وادی کتوی کے کئی لوگوں اور بشگل والوں کے درمیان واقع ایک چھوٹی سی وادی میں ہے؛ (ج) اشکون بولی (اور اس کے ساتھ واماتی بولی)، جو وادی کتی کے جنوب میں النگر اور پیچ Peč دریاؤں کے درمیانی علاقے کی بولی ہے؛ (د) وَے گلی بولی (وَے الا)، پرسن کے جنوب مشرق میں وادی وے گل میں ایک اور ذرا مختلف بولی، جو خاصی قابل توجہ ہے اور خاص طور سے گمبیری بولی، جو وَے گل کے مشرق میں کنڑ کی طرف وادی ترے گم میں بولی جاتی ہے۔ یہ بولی عام وے گلی بولی سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے۔ کافری زبانیں یقیناً بہت قدیم زمانے سے الگ الگ وادیوں میں رائج رہی ہیں۔ ان میں سے مذکورہ (ج) و (د) بمقابلۂ (ا) و (ب) بولیوں کے بیرونی اثرات کی زد میں زیادہ رہی ہیں اور مؤخرالذکر زبان میں ایسے زبردست صوتی تغیرات واقع ہوئے ہیں کہ وہ نزدیک ترین ہمسایوں کے لیے قابل فہم نہیں رہی۔

۲۔ دردی زبانوں کا طبقہ: (ہ) کَلَشہ، جس کی دو بولیاں ہیں، جنھیں کلاش قبیلے کے لوگ بولتے ہیں، جو ابھی تک زیادہ تر بت پرست ہیں۔ ان بولیوں کا تکلمی علاقہ جنوبی چترال، خاص طور پر مغربی جانب کی وادیاں ہیں؛ کلشہ سے قریبی رشتہ رکھنے والی بولی (و) خووار ہے، جو چترال کی سب سے بڑی زبان ہے اور خو (رک بہ چترال، ۲) قبیلے میں بہت کم لسانی اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ خووار میں وخی زبان سے اور ان ایرانی زبانوں سے جو ایرانی لسانیات کے وسطی مرحلے کی ہیں، یعنی پہلوی وغیرہ سے (دیکھیے *BSOS*، ۸: ۲۹۴)، بہت سے الفاظ دخیل الفاظ کے طور پر لیے گئے ہیں۔ یہ دو زبانیں ہندو کش کے علاقے میں ہند آریائی نفوذ کے اولین حملے کی نشان دہی کرتی ہیں۔

۳۔ (ز) دَمیلی بولی چترال کی مشرق سمت بیرخانی اور ارندو کے درمیان واقع وادی کے ایک گاؤں میں بولی جاتی ہے؛ اس میں کافری الفاظ بہت آ گئے ہیں اور اس کا (ح) بولی یعنی اس گوَرباتی (نرساتی) بولی سے جو چترالی افغان سرحد کے دونوں طرف کنڑ دریا کے کنارے واقع چند دیہات میں بولی جاتی ہے ایک جغرافیائی قرب کے سوا کوئی اور تعلق نہیں۔ عوامی روایت ہے کہ یہ بولی کئی سو برس پہلے سوات سے یہاں آئی تھی؛ (ط) کچھ اسی قسم کی بولیاں، جن کے باقی ماندہ آثار ذرا اور آگے جنوب میں پائے جاتے ہیں، یعنی دریاے پیچ کے کنارے ننگلام میں (یہ بولی اب تقریباً معدوم ہو چکی ہے) اور شُماشت میں، جو شمال مشرق پشّئی علاقے میں بولی جاتی ہے۔

(۴) (ی) پشئی زبان، جس کی متعدد بولیاں ہیں جو ایک دوسری سے بہت مختلف ہیں اور مشرق میں دریاے کنڑ کے زیریں علاقے سے شروع ہو کر لغمان سے ہوتے ہوئے دریاے پنجشیر کے کنارے گل بہار

تک کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے بولنے والوں کی تعداد کا تخمینہ گریئرسن Grierson کی *Linguistic Survey of India* میں ایک لاکھ درج کیا گیا ہے۔ پشئی زبان نگراہارا، لمپاکا اور کپشا کے ہندو اور بدھ تمدن کی قدیم زبانوں سے نکلی ہے اور اس زبان کی مشرقی اور مغربی بولیوں کے درمیان الفاظ کے لحاظ سے نمایاں فرق ہے۔ پشئی سلسلے کی بولیوں کے چند اسماے عدد البیرونی کی تحقیق ماللہند میں آئے ہیں۔

(۵) (ک) بشکریک (گاوری/گروی): دیر کے اوپر کی طرف بالائی پنج کورہ وادی میں اور وادی سوات کے دریاؤں کے ابتدائی بالائی علاقے میں تین دیہات کی بولی؛ (ل) توروالی: بشک کے نیچے واقع وادی سوات کے بالائی علاقے کی؛ (م) میّا، جس کے ساتھ کئی متعلقہ بولیاں شریک ہیں (کنیا والی، دیمّری، چلیس، گورو وغیرہ)، وادی سندھ کے علاقے میں بولی جاتی ہے جو شنا زبان اور پشتو زبان کے علاقوں کے درمیان واقع ہے۔ میّا کو کوہستانی بھی کہتے ہیں، لیکن یہ نام مذکورہ بولیوں (ک) اور (ل) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بعض باتوں میں یہ زبان بولی (ع) کے قریب ہے؛ (ن) ووتاپوری (تقریباً معدوم) اور کتارقلاتی، دریاے پیچ کے ساحلی اور قریبی علاقوں میں دریاے کنڑ کے زیریں جانب چغہ سرائی کے اوپر کی طرف جو (ک) اور (ل) سے مربوط، لیکن ایک زیادہ عام لہندا بولی کی قسم کی ہے؛ (س) تراہی، جو جلال آباد کے جنوب مشرق میں چند دیہات میں بولی جاتی ہے۔ اس بولی کو آفریدیوں نے تراہ سے خارج کر دیا تھا اور شاید یہ بولیوں کے ایک ایسے سلسلے کی یادگار ہے جو کسی زمانے میں وہاں سے شروع ہو کر پشاور کے ضلع سے ہوتے ہوئے سوات اور دیر کے اندر تک پھیلا ہوا تھا۔

(۶) (ع) شنا زبان: اس کی کئی بولیاں ہیں، جو گلگت اور چلاس وغیرہ میں بولی جاتی ہیں اور جنوب کی طرف کشمیر میں گریز تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کا سلسلہ مشرق کی طرف بلتستان میں دراس اور داہ ہنو میں جا کر محدود اور منقطع ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ سلسلہ لیہ سے آگے تک بھی جا پہنچا تھا؛ (ف) پھلورا بولی، مذکورہ (ع) بولی کی ایک قدیم شاخ ہے، جو چترال کے جنوب مشرقی علاقے میں چند دیہات میں بولی جاتی ہے۔ اس کی ایک ہم رشتہ ساوی بولی گورباتی کے جنوب میں بولی جاتی ہے؛ (ص) ڈماکی، ہنزہ کی ڈوم اقوام کی بولی (یعنی گانے بجانے والوں اور لہاروں کی)، جو بروشسکی بولتی ہیں، اس پر مذکورہ بولی (ف) کا اثر پڑا ہے، لیکن ذرا آگے کے جنوبی علاقے کی زبانوں کے ساتھ اس بولی کے مخلوط قسم کے رشتے ہیں۔

(۷) (ق) کشمیری: وادی کشمیر کی زبان؛ اس کی ایک بولی کشتواڑی ہے، جسے صحیح معنی میں ایک بولی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ دوسری بولیاں بھی ہیں، جن پر ڈوگری وغیرہ کا بہت زیادہ اثر ہے۔

ان زبانوں کے تسمیے اور ان کی طبقہ بندی پر محققین نے بہت بحثیں کی ہیں۔ ای۔ کوہن E. Kuhn نے ایک اہم مقالے میں جو *Album Kern* (۱۸۸۲ء) میں شائع ہوا تھا، ان زبانوں اور بولیوں کو ایک محتاط جغرافیائی عنوان "ہندوکش کی بولیاں" کے تحت رکھا ہے۔ پشل Pischel نے *Grammatik der Prakrit-Sprachen*، ص ۲۸، پر انہیں "دردو اور کافری بولیاں" کہا ہے اور اس عنوان میں لفظ درد ان وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے جو لسانیات میں اس وقت سے مقبول رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بولیاں پراکرت کی نام نہاد پساچا بولی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس نظریے کو گریئرسن Grierson نے مطبوعات کے ایک سلسلے میں آگے بڑھایا، لیکن اس کی تائید میں معقول لسانیاتی دلائل پیش نہیں کی گئیں۔ گریئرسن کا عقیدہ ہے کہ دردی (یا "جدید پساچا") زبانیں ہند آریائی نہیں، بلکہ ان میں متعدد ایرانی خصوصیات موجود ہیں اور یہ کہ ان بولیوں سے

ہند ایرانی سلسلے کی ایک تیسری شاخ کی تشکیل ہوتی ہے۔ گریئرسن دردی اور کافری زبانوں کی تقسیم اس طرح کرتا ہے: (ا) کافری لسانی طبقہ (= ۱، ۲، ۳، ۴ + (ہ) و (س)؛ (ب) خووار (= (و))؛ (ج) دردی طبقہ (۵، ۶، ۷)۔ اس کی یہ طبقہ بندی تازہ تالیفات میں مجموعی طور پر تسلیم کرلی گئی ہے، مثلاً *Les langues du monde* کی طبع دوم، ۱۹۵۲ء، میں اسے مانا اور سراہا گیا ہے، اور محمد شہید اللہ کے مقالے *Indian Lingustics* میں بھی، جو *Turner Jubliee volume* (۱۹۵۹ء، ۲: ۱۱۷) میں شائع ہوا ہے۔ لیکن دوسری طرف سٹین کونوف Sten Konow نے *JRAS*، ۱۹۱۱ء، ص ۱ ببعد، میں بشگلی (کتی) کی بعض ایسی خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے جو بلاشبہہ غیرہندی ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ زبان ایرانی الاصل ہے۔ اس نے گریئرسن سے اس بات میں اتفاق کیا ہے کہ اس پورے لسانی طبقے کو ہند آریائی سے الگ سمجھنا چاہیے۔ آخر میں سکولڈ Skold (*ZDMG*، lxxiv، ۸۱) نے بحث کو یہاں تک پہنچایا ہے کہ حقیقی کافری لسانی طبقہ (۱) ہند ایرانی بھی قطعاً نہیں ہے، بلکہ ہند یورپی لسانی خاندان کی ایک الگ شاخ ہے۔

خلط مبحث سے بچنے کے لیے کافری لسانی طبقہ (۱) اور باقی بولیوں (دردی، ۲ تا ۷) کے درمیان امتیاز قائم کرنا ضروری ہے۔ مؤخّرالذّکر زبانیں مذکورہ بولی (ز) میں کافری زبان کے اختلاط کی بعض صورتوں کو چھوڑ کر اور مذکورہ بولیوں (ہ) اور (ح) میں چند شاذ حالتوں کے سوا ایسی صفات کی حامل قطعاً نہیں جن کا اخذ و اشتقاق قدیم ہند آریائی سے ثابت نہ کیا جا سکے۔ ان بولیوں میں متعدد قدیم خصوصیات، جو بہت نمایاں ہیں، محفوظ رہی ہیں اور یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اکثر پراکرت بولیوں میں بہت پہلے سے معدوم ہو چکی تھیں، مثلاً سہ صوتی س، معمولی ش اور سقی یا سخت کامی ش (ṣ) کا باہمی امتیاز، یا مثلاً مغربی بولیوں میں قدیم ست اور شت کا تحفّظ۔ مجہور حروف صامت میں ہائے مخلوط کی خفیف سی کیفیت کا بعض دردی بولیوں میں محفوظ نہ رہنا بعد کی چیز ہے اور ان بولیوں میں سے اکثر میں اس ہائے مخلوط کی کم از کم ایک خفیف سی کیفیت محفوظ رہی ہے۔ کوئی ایک مشترک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو دردی زبان کو مجموعی طور پر باقی ہند آریائی زبانوں سے ممیز قرار دیتی ہو اور خود دردی لسانی علاقے میں لسانیاتی جغرافیائی خطوط کا جو جال بچھا ہوا ہے وہ اکثر صورتوں میں، تاریخی دلچسپی کی چیز ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم مواصلاتی خطوط اور ساتھ ہی مواصلاتی موانع کیا تھے۔ دردی ایک عام سا نام ہے جس سے متفرق ہند آریائی پہاڑی زبانوں کے ایک پورے گروہ کی بآسانی نشان دہی ہو جاتی ہے، حالانکہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہی ہیں اور اس طرح منقطع رہنے کی یہ کیفیت بہت سی صورتوں میں پٹھان قبائل کے حملے سے اور بھی بڑھتی رہی ہے، چنانچہ یہ زبانیں ہند آریائی "مدھیا دیش" کے نئے تصرف کی بڑھتی ہوئی اثر اندازی سے کم و بیش محفوظ رہ کر اپنے ذاتی ارتقا میں آزاد رہی ہیں۔

کافری لسانی سلسلے (۱) میں صورت حال بالکل مختلف رہی ہے، اگرچہ اس سلسلے کی زبانیں ہند آریائی (دردی) الفاظ اور ان کی ہیئتوں سے بہت زیادہ گرانبار رہی ہیں۔ پھر بھی ان بولیوں میں کئی خصوصیات، جو مسلّم طور پر غیر ہندی ہیں، محفوظ چلی آئی ہیں۔ ان بولیوں میں مہموس اور مجہور حروف صامت میں ہائے مخلوط کی کیفیت کا کامل طور پر معدوم ہو جانا (جیسے کتی کا لفظ 'گر' (= خر)؛ 'ڈیوم' (= دھواں)؛ جنوبی کلشہ میں 'خار'، 'دھوم') ایک نہایت قدیم دور کی چیز قرار پائے گی، اس لیے کہ ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جیسے کتی میں زِم (= برف)؛

جار "مار ڈالنا"؟ دیکھیے سنسکرت: ھما؛ ھن؛ کتی (۱) زائی "جاننا"؟ جی "زِہ کمان" یہ آخری دونوں لفظ سنسکرت میں ج سے ھیں جس کے ساتھ ھای مخلوط نہیں ہے۔ اس خصوصیت میں کافری زبان ایرانی زبان کی پیروی کرتی ہے بمقابلہ ھند آریائی کے، یعنی ھای مخلوط کی اصوات اور اُن اصوات کے درمیان جن میں اختلاط نہیں ہے، کافری زبان کوئی تمیز نہیں رکھتی، البتہ قدیم ھند یورپی کامی حروف صامت اور نرم کامی حروف صامت کے درمیان جو سخت کامی حروف بنا لیے گئے ھیں، امتیاز قائم رکھتی ہے لیکن دوسری نوعیت کی اکثر خصوصیات میں جیسے س کا تحفّظ کافری زبان ھند آریائی کے مطابق ہے؛ کافری ج (= تس) سنسکرت س کے مطابق، اوستائی س (جیسے کتی میں ڈج بمعنی "دس") ایک قدیم خصوصیت ہے اور اس سے بھی بڑھ کر دندانی س کا تحفّظ ہے جب کہ وہ 'او' آواز کے بعد آئے جیسے موسا بمعنی چوھا (فارسی موش)۔ کافری زبان کے لغوی ذخیرے میں بہت سے الفاظ ایسے ھیں جن کا سراغ ھند آریائی سے نہیں ملتا؛ ان میں سے بعض ایرانی زبان میں بھی نظر آتے ھیں، جیسے کَن وغیرہ "ھنسنا" (رک بہ فارسی خند)؛ وَشپیک وغیرہ 'انگریزی 'waap' رک ایرانی پامیری بولی یدغا میں وفشیو؛ پرسَن یسے "پیٹھ" رک اوستائی پاہ وغیرہ اس طرح کے دوسرے الفاظ صرف کافری میں ملتے ھیں اور ان کی چند مثالیں بعض ھمسایہ دردی بولیوں میں بھی ھیں۔

اس لیے ھمیں یہ فرض کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ ھند ایرانی کی ایک تیسری شاخ کا وجود بھی ہے جو مجموعی طور پر ھند آریائی سے ملتی جلتی ہے، لیکن ان لسانیاتی حدبندی خطوط (isoglosses) کی ایرانی سمت میں واقع ہے جو مجموعی طور پر ھند آریائی اور ایرانی کے درمیان حد فاصل قائم کرتے ھیں۔ اس شاخ میں اس کی اپنی قدیم خصوصیات بھی محفوظ رھی تھیں؛ یہ شاخ دوسری شاخوں سے کسی بہت قدیم زمانے میں الگ ھوئی ھوگی۔ آج کل کی کافری زبانیں اس اصل عمارت کے مٹے ھوے آثار کی گویا نمائندگی کرتی ھیں، اور اس عمارت کی تعمیر و تجدید خارجی (ھند آریائی) مسالے سے بڑی حد تک عمل میں آئی ہے، اس طرح کہ اس تعمیر و تجدید کے وقت قدیم اصل عمارت کا نقشہ ابھی نظر کے سامنے موجود تھا۔

مآخذ: (مقالۂ چترال بھی دیکھیے)؛ نیز (۱) G. Buddruss : *Beitr. Zur Kenntnis der Pašai-Dialekte*، Wiesbaden ۱۹۵۹ء؛ (۲) وھی مصنف: *Kanya-wali, Proben eines Maiyā Dialektes*، Munich ۱۹۵۹ء؛ (۳) وھی مصنف: *Diesprache von Woṭapūr und Kaṭarqala*، بون ۱۹۶۰ء؛ (۴) T. Grahame Bailey : *Grammar of the Shina language*، لنڈن ۱۹۲۴ء؛ (۵) G.A. Grierson : *Linguistic Survey of India*، (اس کا حوالہ مقالۂ بالا میں *LSI* سے دیا گیا ہے)، ج ۸/۲، ۱۹۱۹ء تک کے مآخذ سمیت؛ (۶) وھی مصنف: وھی کتاب، ۱/۱ (تراھی)؛ (۷) وھی مصنف: *A Dictionary of the Kashmiri Language*، کلکتہ ۱۹۳۲ء؛ (۸) D.L.R. Lorimer : *Phonetics of the Gilgit dialect of Shina*، در *JRAS*، ۱۹۲۴ء؛ (۹) وھی مصنف: *The forms and nature of the transitive verb in Shina*، در *BSOS*، ج ۳؛ (۱۰) وھی مصنف: *The Conjugation of the transitive verb in the principal dialects of Shina*، *JRAS*، ۱۹۲۷ء؛ (۱۱) وھی مصنف: *The Dumāki language*، Nijmegen ۱۹۳۹ء؛ (۱۲) G. Morgenstierne، در *Norsk Tidsskrift for Sprogvidnkapes*، Aškun (ج ۲ اور ۷)؛ (۱۴) Dameli : وھی مجلہ، ج ۲؛ (۱۵) Shumashti، وھی مجلہ، ج ۱۲؛ (۱۶) Khowar، وھی مجلہ، ج ۱۴؛ (۱۷) Prasun : ۱۵؛ (۱۸) Wamai، Gambiri، Woṭapūri، ج ۱۶؛ (۱۹) Waigali، ج ۱۷؛ (۲۰) S. E. Dardic (= کوھستانی) (مع F. Barth)، ج ۱۸؛ (۲۱) وھی مصنف:

Ac، ج ۸ (Torwali): (۲۲) تروالی (وهی کتاب، ج ۱۲): (۲۳) بشکریک Bashkarik ج ۸، ۱: (۲۴) وهی مصنف: Det Norske Videnskaps-Akademi i Oslo, Skrifter, Phalura, Hist. Filos. Klasse (۱۹۴۰ء، ج ۵): (۲۵) Gawar-Bati (۱۹۵۰ء، ج ۱): (۲۶) وهی مصنف: *Indo-Iranian Frontier Languages: Pashai texts and vocabulary*، ۳: ۲، ۳ ۔

(G. MORGENSTIERNE)

٭ **ذردیریّه**: سلسلهٔ خلوتیّه کی مصری شاخ کا نام نیز [رک به طریقه] ۔

٭ **الدُّر**: موتی ۔ اس کی اصل کے بارے میں اساطیری افسانے ارسطو کی *Petrology* کے علاوه بهت سے عرب مصنفین کے هاں ملتے هیں (دیکھیے مآخذ) ۔ ۔ ۔ ان حکایات میں بعض حقائق بھی نظر آتے هیں، مثلاً یه که سیپ کا بالائی حصه اگرچه کھردرا اور ناصاف هوتا هے، تاهم اندر سے یه هموار اور چمکدار هوتا هے اور موتی اسی مادّے سے بنتا هے جس کی تهه اس کے اندرونی حصّے پر بچھی هوتی هے، یا یه که موتی میں ایک کیڑا هوتا هے (اب یه بات ثابت هو چکی هے که سیپ میں موتی اسی وقت بنتا هے جب وهاں طفیلی کیڑے موجود هوں) ۔

المسعودی پهلا مصنف هے جس نے بحر هند کے مختلف مقامات میں موتیوں کی موجودگی کا ذکر کیا هے ۔ اس نے خلیج فارس سے موتی نکالنے کا حال بھی قلمبند کیا هے ۔ اس سلسلے میں اس نے مروج میں اپنی ایک سابق تصنیف کا حواله دیا هے، جس کے مندرجات التفاشی سے مقتبس کتاب الاحجار، از یحیی بن ماسویه، سے مأخوذ معلوم هوتے هیں ۔ المسعودی کی رو سے موتی فقط بحیرهٔ حبش کے ساحل پر خارک سے، خلیج فارس میں، نیز قطر، عمان اور سرندیپ سے نکالے جاتے تھے ۔ اس نے بڑی تفصیل سے بیان کیا هے که که غوطه خور کس طرح موتی نکالا کرتے تھے ۔ اسی نوع کے بیانات ابن بطوطه کے هاں بھی نظر آتے هیں، جو اس کے ذاتی مشاهدات پر مبنی هیں ۔

جواهرات میں موتی کو بڑا اونچا مقام دیا جاتا هے اور اس کا امتیازی وصف یه هے که یه حیوانی هے، ترابی نهیں ۔ التفاشی نے موتیوں کے محاسن اور نقائص کا مفصل ذکر کیا هے ۔ الدمشقی بتاتا هے که سیپ گھونگے کی ان تہوں میں سے کیسے حاصل کیا جاتا هے جن سے اس کی ساخت هوتی هے ۔

موتی کے بعض نهایت سودمند طبی خواص بھی بیان کیے گئے هیں ۔ یه اختلاج قلب اور مالیخولیا میں مفید هے، اعصاب کو مضبوط کرتا هے، درد سر کو رفع کرتا هے اور ایسے پانی میں حل کر کے لگانے سے جذام بھی دور هو جاتا هے ۔ عرق لیموں اور سرکے کی مدد سے انهیں حل کیا جا سکتا هے ۔

مسلمان فرمانروا نه صرف اس کی قیمت کی وجه سے ان کی بهت قدر کرتے تھے (اکبر کے خزانے کے موتیوں کی اقسام اور ان کی قیمتوں کے بارے میں دیکھیے آئین اکبری، ج ۱، آئین اول) بلکه اس لیے بھی که موتی پاکیزگی کی علامت هے ۔ اسلامی هند میں خالص سنگ مرمر یا روغنی پتھر سے بنی هوئی مسجد کو موتی مسجد کهتے تھے ۔ قدیم هندوؤں کے هاں موتی کی پیدائش کے بارے میں یه روایت ملتی هے که ماه اکتوبر میں جب آفتاب سماک الرامح (Arcturus، سنسکرت: سواتی) میں هوتا هے تو اس وقت اگر بارش کے کچھ قطرے سیپیوں کے اندر جا پڑیں تو ان سے موتی بن جاتے هیں ۔ [انهیں کی نقل میں] یه روایت هندوستانی مسلمانوں کی تصانیف میں بھی دیکھنے میں آتی هیں ۔

مآخذ: (۱) *Das Steinbuch des Aristoteles*، طبع Ruska، ص ۶۸، ۹۶، ۱۳۰: (۲) رسائل اخوان الصفا، مطبوعهٔ بمبئی، ۲: ۵۷: (۳) المسعودی: مروج، ۱: ۳۲۸: (۴) الادریسی، طبع Jaubert، ۱: ۱۵۷، ۳۷۷: (۵) ابن بطوطه، ۲: ۲۴۴ ببعد: (۶) القزوینی:

عجائب المخلوقات، طبع Wüstenfeld، ۱ : ۱۱۵، ۲۲۳؛ (۷) الدمشقی : Kosmographie، طبع Mehren، ص ۷۷ وغیرہ؛ (۸) التفاشی : أزهار الأفكار، مترجمهٔ Baineri Biscia، ص ۶؛ (۹) ابن البیطار، در Leclerc : Notices et extr.، ۱/۲۶ : ۲۸۳؛ (۱۰) Clément-Mullet : Essai sur la min. arabe، در JA، سلسلهٔ ششم، ۱۱ (۱۸۶۸ء) : ۱۶؛ (۱۱) M. Mokri : La pêche des perles dans le golfe Persique، در JA، ۲۴۸/۲ (۱۹۶۰ء) : ۲۸۱ تا ۲۹۷، جس میں مآخذ بھی دیے ہوے ہیں؛ (۱۲) وہی مصنف : Le symbole de la perle dans le folklore persan، در کتاب مذکور، کراسہ ۴ : ص ۳۶۳ تا ۳۸۱؛ موتیوں کی تجارت کے لیے رک بہ تجارة.

(J. Ruska)

* **دُرّانی** : ایک افغان قبیلہ، جس کا نام پہلے ابدالی تھا، پھر احمد شاہ دُرّانی نے اسے بدل کر دُرّانی کر دیا (دیکھیے ابدالی، احمد شاہ، افغانستان) اس قبیلے کے لوگوں کو ہرات سے نادر شاہ نے منتقل کیا اور قندھار کے علاقے میں انھیں زمینیں عنایت کیں۔ اس زمانے میں یہ خانہ بدوش چرواہے تھے، مگر بارھویں صدی ہجری/ اٹھارھویں صدی عیسوی میں انھوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ ان کے وسیع مالی اور اقتصادی حقوق احمد شاہ اور تیمور شاہ کی حکومت میں بدستور قائم رہے بلکہ اور بھی بڑھا دیے گئے جب کہ دُرّانی قبیلہ شاہی حکومت کا سب سے بڑا حامی اور معاون بن گیا، اس زمانے میں انھوں نے اپنے زرعی مقبوضات ان اضلاع میں بھی بڑھا لیے جو قندھار سے زیادہ فاصلے پر تھے، مثلاً زمین داور، تیِشی، تِرین، اور اصل مزارعوں (تاجیک، پارسیوان، بلوچی، کاکڑ وغیرہ) کو زبردستی مستاجر یا اجیر بنا کر ان سے کام لیا، جس طرح کہ یہ لوگ قندھار سے قریب تر علاقوں میں کرتے رہے تھے لیکن اٹھارھویں صدی کے آخری حصے میں، اور بالخصوص جب کہ دارالسلطنت قندھار سے کابل منتقل کر دیا گیا اور افغانوں کا دور دور پھیلنا بند ہو گیا، مرکزی حکومت نے دُرّانی سرداروں کی طاقت گھٹانی شروع کر دی اور آمدنی بڑھانے کے لیے دُرّانیوں کو حکومت کی مالگزاری ادا کرنے میں حیلہ بہانہ کرنے سے روک دیا گیا۔ دُرّانیوں نے حکومت کے اس طرز عمل کے خلاف سخت احتجاج کیا اور یہی مقاومت اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر اور انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں خانہ جنگیوں کا ایک باعث بنی، جس میں دُرّانیوں کا بڑا نقصان ہوا۔ قندھار کے بارک زئی سرداروں کے عروج کے وقت (۱۲۳۳-۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء تا ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء اور ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء تا ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء) دُرّانی سرداروں کی طاقت اور بھی گھٹ گئی کیونکہ انھیں انتظامیہ اور فوجی عہدوں سے محروم کر دیا گیا، نیز آبپاشی کے لگان اور اس پر حکومت کے اختیارات بتدریج بڑھتے چلے گئے۔ یہی طرز عمل اس وقت بھی جاری رہا جب قندھار کو کابل کے علاقوں میں شامل کر دیا گیا۔ قندھار سے فاصلہ جتنا زیادہ ہوتا جاتا، اتنا ہی یہ طرز عمل کم کامیاب نظر آتا تھا۔

دُرّانی قبیلے کی شاخوں کی تقسیم کی بابت حال کی کوئی اطلاع نہیں ہے، اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ نو آبادیوں کے اندر مدغم ہوتی چلی گئیں۔ انیسویں صدی کے وسط تک جو وقیع زمانہ گزرا ہے اس کی بابت معلومات موجود ہیں۔ الفنسٹن Elphinstone کے کہنے کے مطابق یہ قبیلہ برائے نام دو شعبوں میں بٹا ہوا تھا (زِیرک اور پنج پاؤ)۔ اگرچہ قدیم زمانے ہی سے اس تقسیم کی کچھ اہمیت نہ تھی، اس کے سوا کہ نسل یا خاندان کو ظاہر کرے، شاخ زیرک کے لوگ زیادہ مقتدر اور مالدار تھے۔ اس میں تین باوقعت خاندان تھے: پوپلزئی، علیکو زئی اور بارک زئی۔ کوئٹہ۔ پشین کے ضلع میں سلسلۂ کوہ خواجہ اَمران

کی شمالی ڈھلانوں پر جو ایک زئی بستے ہیں وہ بارک زئی کی ایک شاخ ہیں جس کی بابت فرض کر لیا گیا ہے کہ اسے احمد شاہ نے الگ کیا تھا۔ الفنسٹن کے بیان کے مطابق پنج پاو کے خاندان نور زئی، علی زئی، اسحٰق زئی، خگانی اور مکو تھے ان میں سے آخری دو کی بابت کچھ یونہی سی اطلاع ہے اگرچہ قندھار کے ۱۸۵۷ء تک کے لگان کے اندراجات میں بھی ان کی الگ اور ممتاز ہستیاں نظر آتی ہیں۔ پنج پاو کے دوسرے خاندان زیادہ تر اور بھی آگے کے مغربی خطوں میں رہتے تھے۔ علی زئی زمینداور کے حاصل خیز صوبے میں تھے جہاں وہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں آ کر بس گئے تھے، اسحٰق زئی گرم سیر میں جو زیریں تر ہلمند کے اوپر ہے اور نور زئی جو دیگر قبیلوں سے زیادہ مدت تک خانہ بدوش زندگی بسر کرتے رہے، قندھار کے مختلف شمالی خطوں (لبش، ترین) میں گرم سیر کے اندر اور مغرب کی جانب فراہ اور ہرات میں بود و باش رکھتے تھے۔ زیرک کے خاندان قندھار کے زیادہ قریب تھے، اگرچہ ان کا میلان دوسرے خطوں کے اندر پھیل جانے کی طرف بھی تھا، مثلاً بارک زئی، جو در اصل وادی ارغسان میں، جو قندھار کے جنوب میں ہے، بستے تھے، ہلمند میں بھی آباد تھے اور پوپلزئی جو ترنک اور ارغسان کی زیریں تر وادی میں رہتے تھے، رفتہ رفتہ ترین اور قندھار کے شمال کے دیگر پہاڑی علاقوں میں بھی پہنچ گئے تھے۔ علیکو زئی وادی ترنک میں جلدک تک، جو غلزئیوں کے علاقے کی سرحدوں پر ہے، رہتے تھے اور مغرب میں ہلمند تک آباد تھے، یہ متفرق خاندان آگے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں، جو ان کے ماتحت تھے، بٹے ہوئے تھے۔ پوپلزئیوں میں سدو زئی کا شاہی خاندان شامل تھا اور ممکن ہے کہ بامہ زئی بھی ان میں شامل ہو۔ یہ اندرونی گروہ خود بعض خاندانوں کی طرح کبھی مٹ بھی جاتے تھے یا ایک دوسرے میں مدغم ہو کر نئے گروہ بنا لیتے تھے۔

مآخذ : (۱) دیکھیے مقالۂ افغانستان، نیز واقعات درانی، کانپور ۱۲۹۲ھ؛ (۲) M. Elphinstone: 'Caubool، لنڈن ۱۸۳۹ء؛ (۳) B. Dorn: 'History of the Afghans، لنڈن ۱۸۲۹ء، ۱۸۳۶ء؛ (۴) C. M. Macgregor: 'Central Asia، ج ۲، 'Afghanistan'، کلکتہ ۱۸۷۱ء، بالخصوص ضمیمہ، ص ۳؛ (۵) H. Rawlinson: Report on the Dooranees....؛ (۶) Yu. V. Gankovski: Imperiya Durrani، ماسکو ۱۹۵۸ء۔

(M. E. YAPP)

درۂ خیبر : رک بہ خیبر، درہ۔

دری زادہ : اٹھارھویں/انیسویں صدی عیسوی کے عثمانی علما کے ایک گھرانے کا خاندانی نام، جس کے پانچ افراد نے شیخ الاسلام [رک باں] کا عہدہ کم از کم نو مختلف موقعوں پر ۱۷۳۴ء اور ۱۸۱۵ء کے درمیانی برسوں میں سنبھالا۔ ان میں سے پانچ مؤخر الذکر کا حال یہاں بیان کیا جا سکتا ہے جو حسب معمول قاضی استانبول، اناطولو کے قاضی عسکر اور روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدوں سے رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے ملتا تھا۔

(۱) دری محمد افندی، یہ ایک شخص مسمی بہ الیاس کا بیٹا تھا، اس کی تاریخ اور مقام ولادت معلوم نہیں (سجل عثمانی میں جو بیان کیا گیا ہے کہ وہ انقرہ کا باشندہ تھا غالباً "دوحہ" (Dewha) کو غلط پڑھنے کا نتیجہ ہے)۔ جب وہ دوسری دفعہ روم ایلی کا قاضی عسکر تھا تو اس وقت ۳ جمادی الآخرہ ۱۱۴۷ھ/۳۱ اکتوبر ۱۷۳۴ء کو پہلے عہدے دار اسحٰق افندی کی وفات کے بعد اسے شیخ الاسلام مقرر کیا گیا۔ شوال ۱۱۴۸ھ/فروری۔ مارچ ۱۷۳۶ء میں اس پر سکتے کا دورہ پڑا اور وہ ملازمت سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو گیا، چنانچہ اسی سال

ذوالحجہ/اپریل مئی میں وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوگیا ۔ ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶-۱۷۳۷ء میں اپنے گھر پر بمقام اُسکُودار اس نے وفات پائی اور قرَاجہ احمد کے مقبرے میں دفن کیا گیا (صُبحی، ورق ۹۳ ب، ۱۷ ب)۔

(۲) دُرّی زادہ مصطفٰی افندی: مذکورۂ بالا دُرّی کا فرزند تھا، جس کی ماں سابق قاضی عسکر عبدالقادر افندی کی دختر تھی۔ وہ ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲-۱۷۰۳ء میں پیدا ہوا ۔ پہلے دو مرتبہ روم ایلی کا قاضی عسکر ہوا، پھر ۲۱ شوال ۱۱۶۹ھ/۱۹ جولائی ۱۷۵۶ء کو شیخ الاسلام مقرر کیا گیا، مگر دوسرے ہی سال ۲۸ جمادی الاولٰی (۱۸ فروری ۱۷۵۷ء) کو اسے اس عہدے سے معزول کر کے گیلی پولی میں جلاوطن کر دیا گیا ۔ دوسری بار اس عہدے پر اس کا تقرر ۵ شوال ۱۱۷۵ھ/۲۹ اپریل ۱۷۶۲ء سے ۲۴ ذوالقعدہ ۱۱۸۰ھ/۲۳ اپریل ۱۷۶۷ء تک رہا؛ ۱۵ ذوالحجہ ۱۱۸۷ھ/۲۷ فروری ۱۷۷۴ء کو وہ تیسری بار پھر شیخ الاسلام مقرر کیا گیا ۔ بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو کر ۲۲ رجب ۱۱۸۸ھ/۲۸ ستمبر ۱۷۷۴ء کو اس نے کام چھوڑ دیا اور اسی سال ۷ ذوالحجہ/۸ فروری ۱۷۷۵ء کو وفات پائی ۔ اس کی شادی سابق شیخ الاسلام پشماقچی زادہ عبداللہ افندی کی دختر سے ہوئی تھی، جو اولاد رسول میں سے ہونے کا مدعی تھا ۔ اس بیوی کے بطن سے جو اولاد ہوئی وہ سید کے لقب سے سرفراز کی گئی ۔ ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵-۱۷۶۶ء میں اس نے ینی قپی کی مسجد کو بحال کیا (حدیقة الجوامع، ۱: ۲۳۷) اور بظاہر اس نے ادرنہ قپی سی کے باہر لعلی زادہ کے فوارے کے قریب ایک خاندانی مقبرے کی بھی بنیاد رکھی ۔ فقہ کی ایک کتاب دُرَّۃ بیضاء بھی اس کی طرف منسوب کی گئی ہے (عثمانلی مؤلفلری، ۱: ۳۰۸) اور ایک عربی رسالے کا اس کا کیا ہوا ترجمہ طوپ قپی امانت خزینہ سی کے مجموعۂ مخطوطات میں پایا جاتا ہے (عدد ۱۳۰۸؛ واصف، ۱: ۸۳ الف، ۹۱ الف، ۲۱۰ ب، ۲۹۰ الف و ۲: ۲۸۵ الف؛ جودت، ۱: ۷۲، ۷۸).

(۳) دُرّی زادہ سید محمد عطاء اللہ افندی: مذکورۂ بالا دُرّی زادہ کا دوسرا فرزند ۔ وہ ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹-۱۷۳۰ء میں پیدا ہوا ۔ روم ایلی کے قاضی عسکر کا عہدہ دوبارہ سنبھالنے کے بعد ۱۷ جمادی الآخرہ ۱۱۹۷ھ/۲۰ مئی ۱۷۸۳ء کو وہ شیخ الاسلام مقرر کیا گیا اور ۲۰ جمادی الاولٰی ۱۱۹۹ھ/۳۱ مارچ ۱۷۸۵ء تک اس عہدے پر فائز رہا ۔ اس وقت اس پر خلیل حامد پاشا کے ساتھ ساز باز رکھنے کا شبہہ کیا گیا ۔ یہ وزیر اس سازش میں شریک تھا جو سلطان عبدالحمید اول کو تخت سے اتارنے کے لیے کی گئی تھی: اس بنا پر اسے اس کے عہدے سے برطرف کر کے گیلی پولی بھیج دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی حکم جاری کیا گیا کہ وہ حج کو چلا جائے ۔ بہرحال وہ گیلی پولی پہنچ کر تھوڑے ہی دن بعد کسی قسم کے استسقا کے عارضے میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا ۔ اس کی وفات کی خبر استانبول میں ۶ رجب ۱۱۹۹ھ/۱۵ مئی ۱۷۸۵ء کو پہنچی (جودت: ۲: ۱۷، ۳۰۹، ۳۱۷؛ اسمٰعیل حقی اوزون چار شبلی، در *TM*، ۵ (۱۹۳۵ء): ۲۵۱، نے ایک افواہ کا ذکر کیا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا).

(۴) دُرّی زادہ سید محمد عارف افندی: مذکورۂ بالا دُرّی زادہ کا چھوٹا بھائی ۔ وہ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰-۱۷۴۱ء میں پیدا ہوا اور ۲۳ رمضان ۱۱۹۸ھ/۱۳ اگست ۱۷۸۴ء کو روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدے پر پہنچ گیا ۔ ۱۷ شوال ۱۱۹۹ھ/۲۳ اگست ۱۷۸۵ء کو اسے شیخ الاسلام مقرر کیا گیا، مگر ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۰۰ھ/۱۰ فروری ۱۷۸۶ء کو اسے اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا، کیونکہ وہ سیاسی کارروائیوں میں حصہ لیتا تھا ۔ اس کے لیے حکم ہوا

کہ حج کو چلا جائے۔ اس کے بعد اسے کوتاھیہ میں جلاوطن کر کے زبردستی وھیں رکھا گیا۔ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰-۱۷۹۱ء میں اسے واپس استانبول آنے کی اجازت مل گئی، جب کہ اس کے مخالف شیخ الاسلام حمیدی زادہ مصطفیٰ افندی کو اس کے عہدے سے معزول کیا گیا اور ۲۲ ذوالقعدہ ۱۲۰۶ھ/۱۲ جولائی ۱۷۹۲ء کو اسے پھر مسند مشیخت پر بٹھا دیا گیا۔ جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو عارف افندی کو مصر کی جنگی تیاری میں کوتاھی کا ذمے دار قرار دے کر معزول کر دیا گیا اور اس کے عہدے پر ۱۸ ربیع الاول ۱۲۱۳ھ/ ۳۰ اگست ۱۷۹۸ء کو کسی اور کو مقرر کر دیا گیا۔ بورسہ میں چند ماہ جلا وطن رہنے کے بعد وہ استانبول واپس آیا اور وھیں ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۱۵ھ/ ۹ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو وفات پائی اور اگری قپی میں دفن کیا گیا۔ اس کا ایک مجموعۂ فتاوی، طوپ قپی سرای، ینی لر، عدد ۴۴۰۳، میں موجود ھے: اور اسی کتب خانے میں اس کی ایک یاد داشت (عدد ۴۷۸۳) بھی ھے، جس میں اس نے ۱۲۰۹-۱۲۱۳ھ کے درمیان کے ان علما کی فہرست دی ھے جنھیں اس نے مقرر یا معزول کیا (جودت، ۲: ۲۹۲، ۳۳۱، ۳۳۷ و ۴: ۳۵۶ و ۵: ۱۸۱ و ۷: ۵۷، ۶۸، ۱۷۴)۔

(۵) دُرّی زادہ سید عبداللہ افندی: مذکورۂ بالا کا فرزند۔ اس کی تاریخ پیدائش قلمبند نہیں کی گئی۔ ابھی وہ نقیب الشریف اور روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدے کے لیے نامزد ھی ھوا تھا کہ ۴ شوال ۱۲۲۳ھ/ ۲۲ نومبر ۱۸۰۸ء کو اسے شیخ الاسلام مقرر کر دیا گیا اور وہ اس عہدے پر ۲۲ شعبان ۱۲۲۵ھ/ ۲۲ ستمبر ۱۸۱۰ء تک فائز رہا۔ اسی عہدے پر اس کا دوسرا دور ۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۷ھ/ ۱۲ جون ۱۸۱۲ء سے شروع ھو کر ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۳۰ھ/ ۲۲ مارچ ۱۸۱۵ء تک رہا۔ ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۴ھ/ ۱۱ نومبر ۱۸۲۸ء اس نے وفات پائی اور قراجہ احمد کے مقبرے میں اپنے پردادا کے قریب دفن کیا گیا (شانی زادہ، ۱: ۱۴۳، ۳۹۹ و ۲: ۱۱۴، ۲۳۹؛ لطفی افندی، ۴: ۱۵۳؛ خضر الیاس، ص ۸).

مآخذ: اس خاندان کے تقریباً چالیس ارکان نے علمی مناصب (اشغال) میں مختلف مراتب کے عہدے سنبھالے؛ تفصیلی حالات سجلّ عثمانی کے ذیل کے حوالوں میں سے ڈھونڈ کر نکالے جا سکتے ھیں، اگرچہ اتنی احتیاط کے لیے اشارہ کر دینا یہاں ضروری ھے کہ کسی تفصیل کو اور خصوصاً تاریخوں کو قبول نہ کرنا چاھیے جب تک کہ اس کی تائید کسی اور ماخذ سے نہ ھو جائے: ۱: ۳۳۶، ۳۹۹ و ۲: ۳۳۸ و ۳۹۶ و ۳: ۱۳۶، ۲۴۲، ۲۶۷، ۳۶۳، ۳۹۶، ۴۷۶ و ۴: ۷۵، ۴۴۴، ۵۸۶ (نور اللہ افندی)، ۹۲۷؛ (۲) مستقیم زادہ سلیمان سعد الدین افندی (مع تکملہ جات منیب افندی اور رفعت افندی): دوحۃ المشائخ، طبع سنگی، استانبول، بدون تاریخ، ص ۹۹ (متن پُر از اغلاط)، ۱۰۰، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۲۲۔ ان کے فتاوی کے نمونے، جن کا ذکر اس مقالے میں کیا گیا ھے، علمیہ سالنامہ سی، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۵۱۵، ۵۲۹، ۵۵۱، ۵۵۳، ۵۷۵، میں مل سکتے ھیں: (۳) I. H. Danişmend: *Izahli Osmanli tarihi Kronolojisi*، ج ۴، استانبول ۱۹۶۱ء، بمدد اشاریہ: (۴) اسمعیل حقی اوزون چارشیلی: عثمانلی تاریخی، ۴/۲، انقرہ ۱۹۵۹ء: ص ۴۷۲، ۴۸۰، ۵۰۱، ۵۰۲: (۵) F.E. Karatay: *Topkapi Sarayi Müzesi Kütüphanesi Türkçe yazmaler Kataloğu*، ۲ جلدیں، استانبول ۱۹۶۱ء۔ جن تصانیف کا مقالے میں ذکر کیا گیا ھے وہ یہ ھیں: (۶) محمد صُبحی افندی: تاریخ، استانبول ۱۱۹۸ھ؛ (۷) احمد واصف افندی: تاریخ، ۲ جلدیں، استانبول ۱۲۱۹ھ؛ (۸) احمد جودت پاشا: تاریخ، ۱۲ جلدیں، استانبول ۱۲۷۰ تا ۱۳۰۱ھ؛ (۹) دیوان سرالی حافظ حسین افندی:

حدیقة الجوامع، ۲ جلدیں، استانبول ۱۲۸۱ھ: (۱۰) محمد عطاء اللہ شانی زادہ: تاریخ، ۳ جلدیں، استانبول ۱۲۹۰ - ۱۲۹۱ھ: (۱۱) احمد لطفی افندی: تاریخ، ۸ جلدیں، استانبول ۱۲۹۰ تا ۱۲۰۶ھ: (۱۲) خضر الیاس افندی: وقائع لطائف اندرون، استانبول ۱۲۷۶ھ۔

(J. R. Walsh)

* **دُرّی زادہ: عبداللہ بے یا افندی** (۱۸۶۹ تا ۱۹۲۳ء)، مملکت عثمانیہ کے آخری شیوخ الاسلام میں سے ایک، جو اپنے ان فتاوی کی وجہ سے مشہور ہے جن میں اس نے اس ترکی قومی تحریک کو جو مصطفی کمال (اتا ترک) کی قیادت میں جاری ہوئی تھی ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ ایک دولتمند خاندان میں پیدا ہوا، جو سیّد ہونے کا مدعی تھا۔ اس خاندان کے بہت سے نرینہ افراد "علمیّہ" گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے پانچ پہلے شیخ الاسلام کے عہدے سنبھال چکے تھے [دیکھیے اس سے پہلا مقالہ]: ان میں سے عبداللہ کا، جس کا ذکر سب سے آخر میں ہوا، فرزند پیر زادہ محمد افندی تھا جو ترقی کرکے روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ یہی اس عبداللہ کا باپ ہے جس کا ذکر اس مقالے میں کیا گیا ہے۔

عبداللہ نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم غیر مذہبی مدارس میں حاصل کی اور پھر مدرسۂ فاتح میں پڑھنے لگا اور وہاں اِگنلی خوجہ ابراہیم حقّی افندی (م ۱۸۹۳ء) سے، جو اس وقت مشیخت کا نائب (مستشار) تھا، اجازہ (ڈپلوما) حاصل کیا۔ اوّلاً اسے ۱۸۸۳ء میں مدرس (ابتداے خارج) کا عہدہ ملا اور ۱۸۸۶ء میں وہ مشیخت سے منسلک ہو گیا، جہاں اس نے سلیمانیہ کے مدرس کا عہدہ حاصل کیا۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے "علمیہ" خدمت چھوڑ دی، لیکن ۱۹۰۱ء میں وہ پھر شرعی تحقیقات کی مجلس ("مجلس تدقیقات شرعیہ") میں بحیثیت رکن داخل ہو گیا اور آگے چل کر آناطولی کا قاضی عسکر مقرر ہوا۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد اسے اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور وہ تحریک "اتحاد و ترقی" [رَکَ بان] کا مخالف بن گیا اور ہمہ تن شہری مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ اسی وقت سے وہ "بے" کے لقب سے مشہور ہوا۔ ۱۹۱۸ء کی عارضی صلح کے بعد وہ اس مجلس کا نگران مقرر ہوا جو مذہبی کتابوں کی اشاعت کی نگرانی کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ یکم فروری ۱۹۲۰ء کو وہ "مشیخت" کا نائب معتمد (مستشار) بنایا گیا اور ۳ اپریل کو داماد فرید [رَکَ بان] کی کابینہ میں شیخ الاسلام ہو گیا۔ اس وقت "اتحادیوں" کو استانبول پر مزید طاقت کے ساتھ قبضہ کیے ہوئے تین ہفتے سے کچھ کم ہوئے تھے۔ شیخ الاسلام کی حیثیت سے ۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء کو اس نے چار فتووں پر دستخط کیے: ان میں سب سے بڑا فتوٰی وہ تھا جس میں کمال کے معاونین کی بابت کہا گیا تھا کہ "کچھ شہری لوگ ہیں جو اکٹھا کرکے اکٹھے ہو گئے ہیں اور جنھوں نے اپنے قائد (رہنما) خود چن لیے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ فریب دے کر ۔ ۔ ۔ ۔ وفادار شاہی رعایا کو ۔ ۔ ۔ ۔ دھوکا دے رہے ہیں اور بلا پروانۂ شاہی عوام میں سے سپاہی بھرتی کر رہے ہیں: اور اس مقصد کے لیے قانون شرعی اور اعلٰی حکام کی مخالفت کرتے ہوئے، کچھ مالی مطالبات اور محصول (ٹیکس) لوگوں پر عائد کر رہے ہیں، بظاہر اس بہانے سے کہ ان سپاہیوں کی خوراک اور پوشاک کا بندوبست کرنا ہے، لیکن در حقیقت متاع دنیا کی حرص کی وجہ سے ۔ ۔ ۔ ۔"۔ دیگر خاص الزامات میں سے ان لوگوں کے خلاف "غدر" اور "سلطنت سے بغاوت" کا الزام بھی تھا اور انھیں باغی (بغاۃ، باغیلر) قرار دیا گیا تھا، جن کی سزا قانون شرعی کے مطابق یہ تھی کہ انھیں تتر بتر کر دیا جائے ایک ایک کرکے یا گروہ کے گروہ (قتل و قتالِلری مشروع و فرض اُولنور)۔ اس فتوے کے تحت چھوٹے فتووں نے مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا کہ سلطانی فرمان کی

رو سے انھیں باغیوں کے خلاف ہتیار بند ہو کر کھڑا ہو جانا ضروری ہے، اور اس کے خلاف کرنے والوں فوج سے نکل کر بھاگ جانے والوں کو (آخرت کے) عذاب دائمی سے ڈرایا گیا تھا اور کہا تھا کہ اس فرمان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جو باغیوں سے لڑنے سے انکار کر دیں دنیا میں بھی سخت سزا دی جائے گی۔

تھوڑی مدت کے لیے عبداللہ قائم مقام وزیر تعلیم بھی ہوا اور جب داماد فرید پاشا پیرس کی مجلس صلح میں شریک ہونے کے لیے گیا تو اس نے قائم مقام وزیر اعلٰی (صدر اعظم وکیلی) کی حیثیت سے اس کا کام بھی سنبھال لیا، لیکن ۳۰ جولائی ۱۹۲۰ء کو جب نئی کابینہ بنی تو اس کا نام اس میں سے نکال دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۲۲ء میں قوم کے حامیوں کی قطعی فتح ہو گئی تو وہ ترکی کو چھوڑ کر رودس Rhodes چلا گیا اور پھر وہاں سے اٹلی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو وہ مکۂ معظمہ روانہ ہوا اور ۳۰ اپریل کو خانۂ کعبہ میں مناسک حج ادا کرتے ہوے وفات پائی۔ اگرچہ اس کی وفات صلحنامۂ لوزان پر دستخط کیے جانے سے پہلے ہی ہو چکی تھی، پھر بھی اس کا نام ان ڈیڑھ سو آدمیوں (Yüzellilikler) کی فہرست میں شامل تھا جنھیں عفو عام کی رعایات سے محروم کر دیا گیا تھا۔

مآخذ: (۱) سِجِلِّ عثمانی، ۴: ۶۹۱؛ (۲) محمد ذکی پَکَلن، در *İslam Türk ansiklopedisi*، ۲: ۲۲۶ تا ۲۲۷ و در سِجِلِّ عثمانی ذیل (Türk Tarih Kurumu کے مجموعۂ مخطوطات میں)؛ (۳) اسمٰعیل حامی دانشمند: *İzahlı Osmanlı kronolojisi*، ۴ (۱۹۵۵ء)، ۵۳۶ ببعد؛ (۴) Galip Kemali Söylemezoğlu: *Başimiza gelenler*، استانبول ۱۹۳۹ء، ص ۲۱۹ ببعد؛ (۵) فتاوی کے اصل متون کے لیے دیکھیے: تقویم وقائع، عدد ۳۸۳۳، مورخۂ ۱۱ اپریل ۱۳۳۶ھ۔

(DANKWART A. RUSTOW و FAIK REŞIT UNAT)

* **دَرزَو**: رک بہ دراج Drač

* **اَلدَّرزی**: [= الدُّرزی]، [ابو عبداللہ] محمد بن اسمٰعیل، ان لوگوں کے حلقے کا ایک فرد جنھوں نے فرقۂ دُرُوز [رک بآں] کی بنیاد رکھی۔ وہ عرب نہیں تھا اور دُروز کی مذہبی کتابوں میں اس کا نام نَشتَگین لکھا ہے۔ بقول النُّویری (جو اسے انُوش تکین کہتا ہے) وہ مخلوط ترکی نسل کا تھا اور بخارا سے آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۴۰۷ - ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ - ۱۰۱۸ء میں مصر آیا اور اسمٰعیلی "داعی" تھا [رک بہ داعی؛ اسمٰعیلیہ]۔ وہ خلیفہ الحاکم کا بہت ہی منظور نظر تھا، یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ اعلٰی عہدیداروں کو بھی اس کی نظر عنایت کا طلبگار ہونا پڑتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹکسال میں ملازم رہا ہو۔ حمزہ الزام دیتا ہے کہ اس نے سکوں میں بدعنوانیاں کیں۔ [اَلدَّرزی، بمعنی خَیّاط، درزی، نیز درزیوں کی اولاد (تاج العروس)]۔

اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے برملا الحاکم کی الوہیّت کا اعلان کیا۔ اس پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے (جس طرح دوسرے زندیقوں پر) کہ وہ عقیدۂ تناسخ اور شراب خوری اور نکاح محرّمات کی بابت "اباحت" (antinomianism) کی تعلیم دیتا تھا، گو مؤخرالذکر کا بہت ہی کم امکان ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اسمٰعیلی عقیدے کو مقبول عام بنانے کے لیے اسے ایسی صورت دیتا ہو جس کے خلاف داعی ہمیشہ خبردار کرتے رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے کلیدی رسالے کی تعلیم یہ تھی کہ (اللہ کی) روح، جو حضرت آدمؑ میں حلول کر گئی تھی، [حضرت] علیؓ میں اور پھر (اماموں کے ذریعے) الحاکم میں منتقل ہوئی ہے۔ ظاہر ہے یہ اسمٰعیلیت کے راسخ عقیدے کے خلاف ہے کہ (حضرت) علیؓ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور امامت کو رسالت پر فوقیت دی جائے اور پھر

خفیہ "تاویل" کو منظر عام پر لایا جائے اور غالباً "تنزیل" کی صحت برابر قائم رہنے سے انکار کر دیا جائے۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ حمزہ کے خطوط کا شارح اس کے پیروؤں کو "تاویلی" کہتا ہے، جن پر دروز یہ الزام دھرتے ہیں کہ انھوں نے "تنزیل" کو بالکل مسترد کر دیا تھا۔ حمزہ نے بذات خود الدّرزی کو یہ بات جتانا ضروری خیال کیا کہ باطنی صداقت اور اس کی ظاہری صورت ہمیشہ اکٹھی باقی جاتی ہیں۔ وہ اُسے یہ الزام بھی دیتا ہے کہ اس نے الحاکم کی فقط انسانیت کو تو پہچانا ہے لیکن [نعوذ باللہ] اس کی الوھیّت کو نہیں، جو حمزہ کی نظر میں الحاکم کو [حضرت علیؓ کا] عین سمجھنے کا نتیجہ ہوگی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الدّرزی نے الحاکم کے مدّاحوں میں سے، بظاہر خود الحاکم کی رضامندی سے، اپنے متعدد پیرو بنا لیے تھے۔ حمزہ، جو کھلم کھلا الحاکم کی درگاہ میں افضلیت کا دعویدار تھا، الدّرزی کو نافرمان اور اپنی مرضی سے بے سوچے سمجھے کام کرنے والا خیال کرتا تھا: مثلاً (دَرزی کا) صحابہ پر برسر عام تبرّا کہنا، اگرچہ اسے اس کے خلاف تنبیہ کی جا چکی تھی۔ حمزہ نے اسے اپنی عقائد کی تصانیف دکھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے الدّرزی کے پہلے لقب "سیف الدین" پر اس کے رمزی معنی کی بنا پر اعتراض کیا اور جب الدّرزی نے اس کے بجائے "سیّدالھادیین" کا لقب اختیار کیا تو وہ اس سے اور بھی زیادہ برہم ہوا کیونکہ وہ حمزہ کے اپنے لقب "الھادی" سے بڑا تھا۔ اس کا دعوٰی ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب الدّرزی کے متبعین نے اس تحریک (: دروزیت) میں حمزہ کے دعاوی قیادت کو تسلیم کیا تھا، اور خود الدّرزی نے بھی ایسا کیا تھا، یعنی اس وقت جب حمزہ کے ایک کارکن علی بن احمد الحبّال نے اسے اپنے مذہب کا معتقد بنا لیا تھا، مگر بعد میں الحبّال نے الدّرزی کی حمایت کی۔ de Sacy کا خیال ہے کہ حمزہ اسے اپنی "ضد" یعنی بحیثیت امام کے اپنا حریف خیال کرتا تھا، کیونکہ اسے خود ہی بطور امام آفاق کردار ادا کرنا مقصود تھا، لیکن الدّرزی کے بہت سے متبعین نے، جن میں ممتاز ترین "داعی" البرذعی ہے، شروع ہی سے حمزہ کو اس بنا پر مسترد کر دیا تھا کہ وہ الحاکم کا اجازت یافتہ نہیں تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الدّرزی نے غالباً ۴۰۸ھ/ ۱۰۱۷-۱۰۱۸ء میں الحاکم کی خفیہ (نہ کہ علانیہ) رضامندی سے، الحاکم کی الوھیّت پر ایمان لانے کا علی الاعلان مطالبہ کیا۔ بقول سبط ابن الجَوزی یہ مطالبہ اس نے قاہرہ کی بڑی مسجد جامع میں اپنا رسالہ پڑھنے کے ذریعے کیا۔ اس سے متعدد بلوے ہوگئے، جنھوں نے حمزہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بظاہر اس پوری تحریک کو لوگوں کی نظروں سے گرا دیا۔ غالباً یہی بات تھی جس نے حمزہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تبلیغ کو ۴۰۹ھ کے دوران میں ملتوی کر دے۔ دروزی بیانات رمزی ہیں اور دیگر بیانات میں کئی واقعات کو بظاہر خلط ملط کر دیا گیا ہے اور ان میں بلووں اور الدّرزی کی موت کو مبہم چھوڑ دیا ہے۔ حمزہ کے خطوط، بابت ۴۱۰ھ/ ۱۰۱۹-۱۰۲۰ء، میں اس کی موت کسی گزشتہ واقعے کے طور پر مذکور معلوم ہوتی ہے۔ دروزی شارح اسے ۴۱۰ھ میں بتاتا ہے۔ اور بین السّطور اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ خود حمزہ تھا جس نے الدّرزی اور دوسروں کو الحاکم کے سامنے مجرم قرار دیا اور الحاکم کے حکم سے اُسے مروا ڈالا۔ اس کے بعد حمزہ نے اس کے مریدوں کو اپنا مرید بنانے کی کوشش کی اور وعدہ کیا کہ وہ بعض ان لوگوں کے لیے جو قید میں تھے الحاکم سے سفارش کرے گا۔

سبط ابن الجَوزی کے نزدیک الدّرزی الحاکم کے حکم سے چپکے سے شام چلا گیا تھا تاکہ وہاں تبلیغ

کرے، کیونکہ وہاں کے لوگ نئی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں ۔ یہ قول دُروزی فرقے کے ملک شام میں جگہ بنا لینے کی ایک بعد از وقت توجیہ معلوم ہوتا ہے، پھر اسی الدّرزی کا نام "دُرزی" (بہ ضمۂ اوّل) کی صورت میں پورے "دُروزی" فرقے پر عائد کر دیا گیا: غالبًا اس لیے نہیں کہ اسی نے سب سے پہلے ان اہل شام کا مذہب تبدیل کروایا (واقعہ یہ ہے کہ مقامی روایت اس کام کو دوسروں کی طرف منسوب کرتی ہے)، بلکہ اس لیے کہ پوری تحریک شروع میں عوام کے دلوں میں اسی کے نام سے وابستہ تھی ۔ اسی وجہ سے الانطاکی "دَرَزِیّہ" کے نام کا اطلاق خود حمزہ کے متبعین پر کرتا ہے ۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو مخرب اخلاق تعلیمات یا بدکاریاں مابعد کے دُروز میں رائج تھیں، ان کی ابتدا کا سراغ الدّرزی تک پہنچتا ہے، مگر اس کی تائید نہیں ہوتی.

مآخذ: [(۱) کمال الغزی: نہر الذهب، ۱: ۳۱۲، حلب ۱۹۲۶ء؛ (۲) ابن تغری بردی: النجوم الزاهرۃ، ۴: ۱۸۳؛ (۳) المحبّی: خلاصۃ الاثر، ۳: ۲۶۸؛ (۴) ابراهیم الاسود: تنویر الاذهان، ۲: ۱۱۰ تا ۱۲۶، بیروت ۱۹۲۵ء؛ (۵) بندلی جوزی: تاریخ الحرکات الفکریۃ فی الاسلام، ۱: ۸۹ تا ۱۲۱؛ (۶) کرد علی: خطط الشام، ۶: ۲۶۸ تا ۲۷۳]؛ حمزہ کے خطوط میں بہ خصوصیت قابل لحاظ یہ ہیں: (۷) الغایۃ و النصیحۃ؛ (۸) الرضا و التسلیم؛ (۹) الصبحۃ الکائنۃ؛ (۱۰) Silvestre de Sacy: *Religion des Druzes*، میں بڑے بڑے حوالے ۱: ccclxxxiii تا cccxci، ۹۹ تا ۱۱۳ و ۲: ۱۵۷ تا ۱۹۰ (و تصحیحات) میں ہیں؛ نیز دیکھیے (۱۱) یحیٰی الانطاکی بسلسلۂ Eutychius در *Scriptores Arabici*، متن، سلسلہ ۳، ج ۷، حصۂ دوم، طبع L. Cheikho، B. Carra de Vaux و ایچ ۔ زیّات، بیروت ۱۹۰۹ء، ص ۲۲۰ تا ۲۲۳؛ نیز رک بہ دروز، مع مآخذ.

(M. G. S. Hodgson)

* **درسم**: مشرق آناطولی کا ایک علاقہ، جس کے شمال میں منظور طاغ (۳۱۸۸ میٹر) اور مرکن طاغ کے پہاڑی سلسلے، مغرب میں دریاے فرات کا شمالی منبع (قرہ صُو)، جنوب میں فرات کا جنوبی منبع (مراد صُو) اور مشرق، میں اس کا معاون دریا پیری صو واقع ہے ۔ یہ علاقہ زیادہ تر کوھستانی ہے اور اس کے باشندے (دیہاتی ضلعوں میں) کرد ہیں ۔ ایک زمانے میں درسم کا نام چمش کزک تھا (جو اس وقت دارالسلطنت تھا) اور یہ ایالت دیار بکر کی ایک لِوا تھی ۔ انیسویں صدی عیسوی میں دَرسِم کچھ مدت کے لیے ایک ولایت بن گیا، لیکن ۱۸۸۸ء میں اسے معمورۃ العزیز (خرپوت) کے تحت سنجاق بنا دیا گیا اور اس کا صدر مقام خوزات ہوا اور اووہ جق، چمش کزک چار سنجاق، مازگرد، پرتک، قوزیجان، قزل کلیسا اور پاخ کی قضائیں اس میں شامل کر دی گئیں ۔ جمہوریۂ ترکیہ کی تنظیم نو کے زمانے میں درسم پھر ایک ولایت بن گیا اور اس کا نام تونجه‌لی [رک بان] رکھ دیا گیا.

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں دَرسِم کی سنجاق کے باشندوں کی تعداد ۹۳۳۳۰ تھی، جن میں ۴۵۳۶۰، سنّی ترک، ۱۲۰۰۰، کُرد، ۲۷۸۰۰ قزلباش (شیعی)، ۷۵۶۰ گرجی اور ۶۱۰ پروٹسٹنٹ امریکی تھے.

مآخذ: (۱) کاتب چلبی: جہان نما، ص ۴۲۹؛ (۲) V. Cuinet: *La Turquie d'Asie*، پیرس ۱۸۹۲ء، ۲: ۳۸۳ ببعد؛ (۳) سامی: قاموس الاعلام (*Dictionnaire Universelle d'Histoire et de Géographie*)، ج ۳، استانبول ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء، ص ۲۱۲۱ ببعد؛ (۴) Nasit Hakki Uluğ: *Derebeyi ve Dersim*، انقرہ ۱۹۳۲ء.

(Fr. Taeschner)

* **دَرْشن**: (نیز نسبۃً کم صحیح درشّن)، سنسکرت لفظ دَرْشَنا (مادّہ "درش" = "دیکھنا") بہ معنی

دکھانا، جلوہ نما ہونا، سے ماخوذ ہے۔ اسی وجہ سے بادشاہ کے رسمی طور پر اپنی رعیت کے سامنے آنے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے اس رواج کو مغل شہنشاہ اکبر نے اختیار کر لیا تھا (آئین اکبری، ۱ : ۲۷) اور اس کے بعد اس کے قریبی جانشین بھی اس پر عمل کرتے رہے۔ انگریز سیاح کوریت Coryat لکھتا ہے کہ آگرے میں جہانگیر دن میں تین مرتبہ لوگوں کو اپنی شکل دکھانے کے لیے جھروکے میں بیٹھا کرتا تھا۔ ۱۰۶۷ھ/ ستمبر ۱۶۵۷ء کے اواخر میں شاھجہان اپنی بیماری کے زمانے میں جھروکے میں لوگوں کے سامنے نہ آ سکا تو اس کی موت کی افواہ پھیل گئی۔ عالمگیر نے بھی درشن کی رسم کی شروع میں پیروی کی، مگر ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۸ء میں اس میں بت پرستی کا شائبہ خیال کر کے اسے ترک کر دیا۔

(J. Burton Page)

* **دَرْعه** : (شہر) رک بہ اَذْرِعات۔

* **دَرْعه** : یہ جنوبی مراکش کے ایک دریا کا نام ہے، جو اطلس کبری کی جنوبی ڈھلانوں سے نکلتا اور جبل بانی کے جنوب میں بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے۔ اسی نام کا مراکش کا ایک صوبہ بھی ہے، جو دریاے مذکور کی گزرگاہ کے دونوں مزروعہ کناروں کے ساتھ ساتھ مقام آگدز Agdz سے دریا کے موڑ تک کوئی ۱۲۰ میل تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ صوبہ آٹھ اضلاع میں منقسم ہے۔ شمال سے جنوب کی طرف ان اضلاع کے نام حسب ذیل ہیں: مِزْگِتَّة، اَیْت سَدْرت، اَیْت زَرّی، تِنْزِلِین، تِرناتہ، فِزْواتہ، قَتاوۃ اور مُحَمَّد۔

اس علاقے میں عموماً بربر زبان بولنے والے قبائل اور سیاہ فام لوگ آباد ہیں۔ انھیں "عبید" (= صحرا اور زنگیوں کے ممالک سے لائے ہوئے غلام) اور "حَراتین" میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مؤخرالذکر کی جلد تو سیاہ ہے، لیکن ان کا ناک نقشہ حبشیوں جیسا نہیں ہے۔ ان کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس علاقے کے سب سے قدیم باشندے ہیں۔ یہاں کچھ یہودی بھی ہیں، جو بظاہر بربر نسل کے ہیں۔ کل آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ یہ مقیم لوگ کم از کم ۱۹۳۲ء تک عربوں اور زیادہ تر بربروں کے، جو نواحی پہاڑوں کے خانہ بدوش قبائل تھے، مطیع رہے تاآنکہ درعه فرانسیسیوں کے زیر حمایت حکومت کے تسلط میں آ گیا۔

درعه قدیم زمانے سے آباد ہے۔ اس کی تاریخ یقیناً معرکہ خیز رہی ہوگی، کیونکہ یہی ان علاقوں کے درمیان ایک زرخیز خطہ ہے جو تقریباً صحرائی ہیں۔ اسلام کی اشاعت یہاں بانی فاس کی اولاد میں سے ایک شخص کے ہاتھوں تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہوئی۔ بعد ازآں چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں درعه پر مَغْراوہ کا (جو زناتہ سے تعلق رکھتے تھے) تسلط ہوگیا۔ مغراوہ سِجِلْماسَہ میں آباد ہوگئے تھے۔

دَرْعه حقیقۃً المرابطون کے زمانے میں تاریخی اہمیت کا حامل بنا، کیونکہ اس نے ان کے اوقیانوسی مراکش میں داخلے کے لیے ایک اگلی چوکی کا کام دیا۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی سے بعد تک درعه اس مراکشی سلطنت کا ایک حصہ رہا جسے المرابطون نے اور پھر المُوَحِّدون اور بنومرین نے قائم کیا تھا۔ مَعْقِل عربوں کا عمل دخل وہاں ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا اور ان کا وہاں بہت قوی اثر پڑا۔

دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں یہ صوبہ بنوسَعْد کے پہلے خانوادۂ شرفاء کے زیر تسلط آیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے سلطان احمد المنصور نے سوڈان کے خلاف (۱۵۹۱ء میں)

اپنی مہم کا آغاز کیا۔ گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب گاؤ (Gao) اور ٹمبکٹو سے اس کی تجارت شروع ہوئی تو اس کی وجہ سے اس خطے کو کچھ عرصے کے لیے خوشحالی نصیب ہو گئی۔

ذرعہ پر علوی سلاطین کا پورا یا ادھورا قبضہ رہا اور وہ ایک اہم مذہبی برادری ناصریین کا مرکز بن گیا، جو گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں "زاویۂ تمگروت" کے نواح میں وسیع پیمانے پر پھیل گئی۔ اس خطے پر فرانسیسی فوجوں نے ۱۹۳۰ اور ۱۹۳۲ء کے درمیان قریب قریب بغیر لڑائی کے قبضہ کر لیا۔

آج کل یہ علاقہ، جس کی آبادی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی اور مفلوک الحال ہے، دارالبیضا اور دیگر کئی شہروں کو بھاری تعداد میں مزدور مہیا کرتا ہے، کیونکہ اس کی اپنی زراعت جوں کی توں ہے اور روز افزوں آبادی کی کفالت نہیں کر سکتی۔ نقل مکانی عام طور پر عارضی ہوتی ہے اور اس کا تعلق یہاں کے موسم کے تغیر و تبدل اور زراعتی پیداوار کی کمی بیشی کے ساتھ ہوتا ہے (*Naissance du prolétariat marocain*، پیرس بدون تاریخ، ص ۶ تا ۹۹).

مآخذ : (۱) البکری : کتاب المسالک والممالک، مترجمۂ دیسلان 'Descr. de l'Afrique sept.'، ص ۲۸۸ تا ۲۹۳؛ (۲) الادریسی، ص ۵۷ تا ۶۱؛ (۳) الحسن الوزان [الزیاتی] Leo Africanus، مترجمۂ Épaulard، ۲ : ۲۰۲ تا ۲۰۴؛ (۴) Marmol : *De l'Afrique*، مترجمۂ Perrot d'Ablancourt، پیرس ۱۶۶۷ء، ج ۳، باب ۹ ببعد؛ (۵) Rohlfs : *Mein erster Aufenthalt in Marokko*، Norden ۱۸۷۳ء؛ (۶) Ch. de Foucauld : *Reconnaissance au Maroc*، پیرس ۱۸۸۸ء، ص ۲۰۸ تا ۲۱۱، ۲۸۵ تا ۲۹۵؛ (۷) H. de Castries : *Notice sur la région de l'oued Draa*، در *Bull. Soc. Géogr.*، پیرس، دسمبر ۱۸۸۰ء؛ (۸) de Segonzac : *Au coeur de l'Atlas*، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۹) Dj. Jacques-Meunié : *La nécropole de Foum le-Rjam, tumuli du Maroc présaharien*، در *Hesp.*، ۴۵ (۱۹۵۸ء) : ۹۵ تا ۱۴۲؛ (۱۰) J. Meunié و Ch. Allain : *La forteresse almoravide de Zagora*، در *Hesp.*، ۴۳ (۱۹۵۶ء) : ۳۰۵ تا ۳۲۳؛ (۱۱) *Villes et tribus de Maroc*، ج ۹ : *Tribus berbères*، ج ۲ : *Districts et tribus de la haute vallée du Drac*، از G. Spillmann، پیرس ۱۹۳۱ء، ص ۱ تا ۲۰۱؛ (۱۲) G. Spillmann : *La zaouia de Tamgrout et les Nasiriyine*، در *Afr. Fr.*، [illegible] ستمبر ۱۹۳۸ء؛ و *Les Ait Atta du Sahara et la pacification du Haut dra*، رباط ۱۹۳۶ء؛ (۱۳) F. de la Chapelle : *Une cité de l'oued Dra sous le protectorat des nomades*، در *Hesp.*، ج ۹ (۱۹۲۹ء)، ص ۲۹ تا ۴۲؛ (۱۴) Dj. Jacques-Meunié : *Les oasis des Laktaoua et des Mehamid*، در *Hesp.*، ۳۴ (۱۹۴۷ء) : ۳۹۷ تا ۴۲۹؛ و *Hiérarchie sociale au Maroc présaharien*، در *Hesp.*، ۴۵ (۱۹۵۸ء) : ۲۳۹ تا ۲۶۹.

(R. LE TOURNEAU)

اَلدِّرْعِیَّة : (یا اَلدَّرْعِیَّة)، نجد میں ایک نخلستان، جو سعودی عرب کے دارالحکومت الریاض سے ۲۰ کیلومیٹر شمال مغرب میں واقع ہے اور ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء تک آل سعود [رک بآن] کا صدر مقام رہا۔ حَنِیفَة نام کی ایک ندی اس کے بالائی حصے میں سے گزر کر جنوب مشرق کی طرف بہتی ہے اور پھر بڑی آبادیوں کے پاس سے گزرتی ہوئی مشرق کی جانب مڑ جاتی ہے۔ اس کے اوپر کی طرف العِلْب اور لعُوْدَة کی آبادیاں کھجور کے درختوں کے درمیان واقع ہیں۔ ان سے نیچے حنیفة کی معاون ندی البُلَیْدَة کے بالمقابل غصیبة ہے، جواب بالکل

ویران ہے ۔ حنیفہ جہاں مشرق جانب مڑتی ہے وہاں اس کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ آبادیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ انھیں میں البُجیری ہے، جو شیخ محمد بن عبدالوہاب اور آل الشیخ کا وطن ہے ۔ جس مقام پر شیخ عبادت کیا کرتے تھے وہاں اب ایک مسجد ہے اور اس کے قریب ہی ان کی قبر ہے ۔ ندی کے دائیں کنارے پر البجیری کے مقابل الطُّرَیف کے ٹیکرے پر ان پرشکوہ عمارتوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں جہاں ایک زمانے میں شاہان آل سعود رہا کرتے تھے اور جو فلبی Philby کے الفاظ میں "ساری وہابی سرزمین میں سب سے عظیم الشان آثار ہیں"۔ یہ عمارتیں گارے سے بنی ہیں، مگر ستون پتھر کے ہیں، جن پر ایسے خوشنما اور نازک نقش و نگار بنے ہیں جن کی مثال پورے نجد میں نہیں ملتی ۔ الطُّرَیف کی بلند ترین عمارت الدُّوَیشہ کا قلعہ ہے ۔ نخلستان سے جو سڑک قلعے کی جانب آتی ہے وہ فیصل بن سعود کے نام پر درب فیصل کہلاتی ہے ۔ شمالی چوٹی پر ایک محل مقصورہ عمر بھی ابھی تک سلامت ہے اور اس کے قریب الطریف کی جامع مسجد ہے، جس کے اندر ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں امام عبدالعزیز کو قتل کر دیا گیا تھا ۔ امتداد زمانہ نیز الطریف کے دامن میں ایک نئی آبادی کے بسنے کے باعث یہ کھنڈر آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں ۔

نجد کے وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ الدرعیہ کو ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں مانع بن ربیعہ المریدی نے بسایا تھا جسے یہ علاقہ اس کے ایک رشتے دار ابن درع، رئیس حجر الیمامہ، نے عطا کیا تھا ۔ شروع شروع میں مانع اور اس کے اخلاف کا مرکز غصیبہ رہا، جو نسبۃً زیادہ مستحکم اور محفوظ مقام تھا ۔ ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں یہاں محمد ابن سعود آل مُقرِن حکمران تھا، جو براہِ راست مانع کی اولاد میں سے تھا ۔ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں شیخ محمد ابن عبدالوہابؒ اپنے آبائی وطن العُیَینہ سے الدرعیہ چلے آئے ۔ شیخ اور محمد بن سعود نے عہد کیا کہ پورے عرب میں اسلام کو اس کی اصل صورت میں پھیلانے کے لیے مل کر کام کریں گے ۔ شیخ کی روحانی قوت اور محمد بن سعود اور اس کے بیٹے عبدالعزیز اور پوتے سعود کی عسکری مہارت کے باعث تیرھویں صدی ہجری/ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں عملاً سارا عرب الدرعیہ کے زیر اثر آ گیا ۔ ابن بشر اور ولندیزی سیاح J. L. Reinaud (۱۷۹۹ء) نے اس زمانے میں الدرعیہ کے مفصل حالات بیان کیے ہیں ۔

۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں عبداللہ بن سعود تخت نشین ہوا ۔ اس کے عہد میں ابراہیم پاشا نے مصر سے آ کر الدرعیہ کا محاصرہ کر لیا، جو چھے ماہ تک جاری رہا ۔ اس دوران میں گرد و نواح کے علاقے کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا ۔ ذوالقعدہ ۱۲۳۳ھ/ستمبر ۱۸۱۸ء میں ابراہیم کا الدرعیہ پر قبضہ ہوگیا، جسے وہ تباہ و برباد کرکے واپس چلا گیا ۔ آل سعود کے بہت سے افراد یا تو جنگ میں ہلاک ہوگئے یا گرفتار کرکے قاہرہ پہنچا دیے گئے ۔ ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء میں مشاری بن سعود نے الدرعیہ کی حکومت سنبھال لی ۔ العیینہ کے رئیس ابن معمر نے بھی اس کی بیعت کر لی، لیکن بہت جلد وہ اس سے منحرف ہوگیا ۔ اس زمانے میں سعود اعظم کا ایک بھتیجا تُرکی بن عبداللہ ابراہیم پاشا کے پھندے سے نکل کر نجد میں آ گیا اور مشاری بن سعود کی حمایت کا اعلان کر دیا ۔ مشاری کو مصری فوجوں نے گرفتار کر لیا اور ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں وہ بحالت اسیری وفات پا گیا ۔ ترکی نے انتقاماً ابن معمر کو مار ڈالا اور الدَّرْعِیَّہ پر قبضہ کرکے الریاض میں بھی قدم جما لیے، تاہم مصری افواج نے اسے بہت جلد وہاں سے نکال دیا ۔ ۱۸۲۱ء میں مصر کے نئے سپہ سالار حسین بے نے الدرعیہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں ترکی نے ایک بار پھر قوت حاصل کر لی ۔ اس نے الریاض پر حملہ کرکے مصری فوج کو شکست دی اور اسے اپنا نیا دارالحکومت قرار دیا ۔

۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ء میں خلیج فارس کا انگریز گورنر کرنل پیلی Pelly الریاض جاتے ہوے الدرعیہ سے گزرا تو اسے یہ جگہ بالکل ویران اور بے چراغ نظر آئی۔

مآخذ: (۱) حسین بن غنّام: رَوضة الافکار، بمبئی، بدون تاریخ؛ (۲) عثمان بن بشر: عنوان المجد، قاہرہ ۱۳۷۳ھ؛ (۳) von Zachs *Monatliche Correspondenz*، ۱۸۰۵ء [Reinaud کا سفر]؛ (۴) J.B.L.J. Rousseau: *Description du pachalik de Bagdad*، پیرس ۱۸۰۹ء؛ (۵) L. A. Corancez: *Histoire des Wahabis*، پیرس ۱۸۱۰ء؛ (۶) F. Mengin: *Histoire de l'Égypte*، پیرس ۱۸۲۳ء؛ (۷) G. Sadlier [Sadleir]: *Diary of a journey across Arabia*، بمبئی ۱۸۶۶ء؛ (۸) L. Pelly: *Report on a journey to the Wahabee capital of Riyadh*، بمبئی ۱۸۶۶ء؛ (۹) H. St. J. B. Philby: *The heart of arabia*، لنڈن ۱۹۲۲ء۔

(G. Rentz [تلخیص از ادارہ])

* **دَرغِن**: داغستان میں ایک مسلم آیبیری کاکیشیائی (Ibero-Caucasion) قوم، جو پہلے ماوراے بحر خزر کے میدانوں میں سکونت پذیر تھی پھر بارھویں صدی عیسوی میں اسے قُمیقوں نے، جو شمال سے آئے تھے، پہاڑوں کی جانب دھکیل دیا۔ ۱۹۲۶ء کی روسی مردم شماری کے مطابق دَرغنوں کی تعداد ۱۲۶۲۷۳ تھی جو ۱۹۵۴ء میں بڑھ کر ۱۵۸۰۰۰ ہوگئی۔ درغنی وسطی داغستان کے علاقوں میں دامن کوہ اور وسطِ کوہ کے علاقوں میں مجتمع ملتے ہیں اور سِرگو قلعہ، آکوشہ اور دَخدیو Dakhdaev کے اضلاع میں آبادی کا بڑا حصہ وہی ہیں۔ وہ Levashi اور Tzudakhar کے اضلاع میں آوار (Avars) اور لَکّ قوم (Laks) کے ساتھ اور قیتاق (مجالیس) کے اضلاع میں قُمیقوں اور قیتاقوں کے ساتھ ملے جلے بھی رہتے ہیں۔ وہ قرہ بدخکنت (گیدن اور گُربکی کے awls)، Buinaksk (قدر، قرمخی اور جنگری کے awls)، اُگلی (اُسغ اور جرخ کے awls اور گُبّیب Miamugi کے awls میں وہ منفرد جماعتوں کی حیثیت سے آباد ہیں۔ آخر میں متعدد درغن Awls یا قبائل، ۱۹۴۴ء میں، ترک وطن کر کے شمالی داغستان کے ضلع شُرگت کے نیم صحرائی علاقے میں منتقل ہوگئے۔

درغنوں کے متعلق قدیم ترین معلومات چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے عرب مؤرخوں نے دربند نامہ میں دی تھیں۔ فتح عرب کے بعد قیتاقوں کی اُسمی باجگذار ریاست درغنی علاقے کے جنوب مغربی حصے میں قائم ہوگئی، جس کا صدر مقام قلعۂ قریش موجودہ قبیلۂ قُبچی کے [علاقے کے] قریب تھا، جب کہ دیگر درغنی قبیلے قزّی قمّی قوم کی لَک شمخالت کی محکوم ریاست میں پائے جاتے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اختتام کے بعد شمخالت دَرغن کا علاقہ قیتاق کی ریاست اُسمی کے، جو سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی، اور آزاد خیلوں ("جماعة") کے درمیان منقسم ہوگیا۔ جو متحدہ جماعتوں یا وفاق ریاستوں کی شکل میں متحد ہوگئے تھے ان کی تعداد اصلاً چار تھی: اَکُوشا، اَسلاتَین، مَخلاتَین، خورکِلی تَبن! ان میں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں چھے مزید خیلوں کو بزورِ شمشیر شامل کرلیا گیا تھا۔ وہ یہ تھے: کَیا دَرگواہ، کَتّکلا، سرگلاتَین، اُسمی دَرگو، وَکَن دَرگو اور چرخ۔ ان وفاق قبائل کا نظم و نسق آخر میں اَکُوشا کے قاضی کو سونپ دیا گیا تھا۔ یہ قبائلی نظام انیسویں صدی عیسوی میں روسی فتح تک ان میں برقرار رہا۔

درغنی زبان تین بولیوں میں منقسم ہے: اُرخی (یا خُورکِلی)، جسے سطح مرتفع کے گلّہ بان بولتے ہیں؛ تَزدَجر، جسے میدانوں میں رہنے والے اہل حرفہ اور تاجر بولتے ہیں، اور اَکُوشا [یا اکوسا] جو دوسری دونوں بولیوں سے واضح طور پر متمیز ہے اور ادبی زبان کی بنیاد کا کام دیتی ہے، نیز اسے کَبّچی اور قیتاق

بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ترکی (قمیق، آذری) اور روسی زبانوں کا اثر و نفوذ خاصا ہے اور درغنوں کی اکثریت دو زبانیں بولتی ہے۔ ابتدائی سکولوں میں تعلیم دَرغِن میں دی جاتی ہے اور ثانوی مدارس میں صرف روسی زبان ہی ذریعۂ تعلیم ہے۔ دَرغنی ادب حال ہی کی تخلیق ہے؛ چنانچہ قدیم ترین تصنیفات انیسویں صدی عیسوی سے پہلے کی نہیں ہیں۔ سوویٹ ادب کی ترجمانی فقط معدودے چند انشاء پرداز ہی کرتے ہیں؛ ان میں سے معروف ترین رشید رشیدوف Rashidov شاعر ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں درغنی ادبی زبان عربی حروف میں لکھی جانے لگی۔ ۱۹۲۰ء میں ایک ترمیم شدہ عربی ابجد (جسے نیا "آجم" کہتے تھے اور جس میں تینتالیس حروف تھے) رائج کی گئی۔ ۱۹۲۸ء میں اس کی جگہ لاطینی ابجد نے لے لی اور پھر اس کی جگہ ۱۹۳۸ء میں سریلی (Cyrillic=روسی) رسم الخط رائج کر دیا گیا۔

۱۹۵۸ء میں آٹھ درغنی اخبارات شائع ہوتے تھے: ایک جمہوری جریدہ مَخچ قلعہ سے اور سات مفصل سے نکلتے تھے۔

درغن شافعی مذہب کے سنی مسلمان ہیں، کُرُش اور مِسکِنجی کے دوقبیلوں (awls) کے علاقے مستثنے ہیں، جن کے باشندے انقلاب کے وقت تک اثنا عشری شیعہ تھے۔ ان میں اشاعت اسلام، جس کی ابتدا گیارھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی، سولھویں صدی عیسوی میں جا کر تکمیلی مراحل میں داخل ہو گئی، جب کہ یہودیت اور عیسائیت کے آخری نشانات ناپید ہو گئے۔ پندرھویں صدی عیسوی تک بھی کم از کم کچھ دَرغنی غیر مسلم تھے، کیونکہ ظفر نامہ کا مصنف (۱: ۷۷۷ ببعد) داغستان کے کافر قبائل میں، جنھوں نے امیر تیمور کا مقابلہ کیا تھا، "آشکجا" کا ذکر کرتا ہے (جسے اول اکوشا کا مرادف خیال کیا جا سکتا ہے)۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب تک دَرغنوں کے معاشرتی نظام کی شکل اصولاً یہ تھی کہ وہ تُخُم [تخوم] یعنی برادریوں میں منقسم تھے اور برادریاں جِنس یعنی جدّی خاندانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ گو انیسویں صدی عیسوی ہی میں تُخُم میں کوئی مالی یا معاشی اہمیت باقی نہیں رہی تاہم جو رسم و رواج اس کی بنا پر چلے آتے تھے آہستہ آہستہ مٹتے چلے گئے۔

درغنوں میں تعددازدواج کی رسم ہمیشہ سے شاذ تھی اور خاندان ہی میں شادی کرنے کی رسم بھی انیسویں صدی عیسوی سے رو بہ انحطاط ہو گئی۔ شادی کی رسوم قدیم روایات کے مطابق قائم رہیں، اگرچہ غیرمسلموں کے ساتھ شادی کرنا ایک مدت تک ناممکن تھا، لیکن ۱۹۱۷ء کے بعد سے روسیوں کے ساتھ شادی بیاہ نسبتاً عام ہو گیا۔ پہلے زمانے میں اکثر دُلہن کو بھگا لے جانے کا بھی طریقہ تھا، خصوصاً ان لوگوں میں جو کَلِیم یعنی واجب الادا زر مہر ادا نہیں کر سکتے تھے، لیکن کلیم ابھی تک موجود ہے۔

روسیوں نے جب دَرغِنوں کو پہلے پہل ۱۸۱۹ء میں مغلوب کیا (فتح اکوشا) اور پھر دوسری بار پہلے پہل ۱۸۴۴ء میں ان پر غالب آئے تو انقلاب سے پہلے انھیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ اواروں اور قمیقوں دونوں میں بیک وقت جذب ہو جائیں گے۔ سوویٹ حکام اس خیال سے ان کی قومیت کے تحفظ کا پختہ انتظام کرنا چاہتے تھے کہ وہ ایک یگانہ قوم تھے اور اپنی ادبی زبان رکھتے تھے۔ انھوں نے اس بات کو پسند کیا کہ درغنوں کو دو چھوٹی چھوٹی ہمسایہ قوموں کے ساتھ مجتمع کر دیا جائے۔ یہ ہمسایہ قومیں قیتاق اور اور کبچ تھیں جنھیں خود معدوم ہو جانے کا خطرہ در پیش تھا۔

دَرغِن میدانوں میں کاشتکاری اور پہاڑوں کے دامن میں باغبانی کرتے ہیں اور اپنی بھیڑوں، مویشیوں اور گھوڑوں کے گلوں کو پہاڑوں کے گرمائی مرغزاروں

میں لے جاتے ہیں۔ کبجا جڑاؤ زیورات اور زرگری جیسی مقامی دستکاریوں کے لیے اور سَاپوکَنْت Sulevkent کوزہ گری کے لیے مشہور ہیں۔ صنعت و حرفت میں کوئی ترقی نمایاں نہیں۔ اکوشا، لیوشی اور تُرْدَخر میں پھلوں کو محفوظ کرنے کے کارخانے ہیں۔

مآخذ: (۱) C. N. Abdoullaev: *Russko-darginskiy slovar'*، مخچ قلعہ ۱۹۵۰ء؛ (۲) A. Bennigsen اور H. Carrère d' Encausse: *Une république sovlétique: le Daghestan*، در *REI*، ۱۹۵۵ء، ص ۱ تا ۵۶؛ (۳) A. A. Bokarev: *Kratkie svedeniya o yazikakh Dagestana*، مخچ قلعہ ۱۹۴۹ء؛ (۴) E.I. Kozubskiy: *Pamyatnaya Knižka Dagestanskoy oblasti*، تمرخان شُورا ۱۸۹۵ء؛ (۵) Meshčaninov اور G. P. Serdučenko: *Yaziki Severnogo Kavkaza i Dagestana*، ماسکو - لینن گراڈ ۱۹۴۹ء؛ (۶) Z. A. Nikol' skaya: *Etnografičeskoe opisanie darginskogo Kolkhoza "Krasniy Partizan"*، در *Sov. Etn.*، ج ۲ (۱۹۵۰ء)؛ (۷) L. Žirkov: *Grammatika darginskogo yazika*، ماسکو ۱۹۲۶ء، ص ۱۰۳؛ نیز رک بہ اور "داغستان"، دربند۔

(CH. QUELQUEJAY)

* **دَرْقاوہ:** درقاوی نسبت کی جمع، ایک دینی برادری، جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک ادریسی شریف مولای العربی الدّرْقاوی نے شمالی مراکش میں قائم کی۔ درقاوی کی وجہ تسمیہ کی بابت یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کے اجداد میں ایک شخص ابودرقہ کہلاتا تھا، جس کے معنی ہیں چمڑے کی ڈھال والا۔ یہ ادریسی ایک اور ادریسی شریف علی بن عبدالرحمٰن الجمال کا فاس میں شاگرد رہا تھا جو صوفیہ کے سلسلۂ شاذلیہ [رک بآن] کا مستند پیر تھا اور جس کے انتقال کے بعد ادریسی نے اسی کی تعلیم سے متاثر ہو کر یہ برادری قائم کی۔ شروع میں اس کا مرکز زاویۂ بُوبَرِیح تھا، جو قبیلۂ بنو زَرْوال [کے علاقے] میں اود ورغہ Oued Wargha ندی کے داہنے کنارے پر واقع تھا۔ پھر ۱۸۶۳ء کے بعد یہ مرکز زاویۂ اَمْجوط Amadjdjut میں منتقل ہوگیا، جہاں وہ آج تک موجود ہے اور جہاں ہر سال ستمبر کے آخر میں اس برادری کے افراد سالانہ عرس ("موسم") مناتے ہیں۔ اس موقع پر یہاں بہت سے زائرین آتے ہیں۔

درقاوہ برادری سب سے زیادہ مراکش کے شمالی اور مشرقی حصے میں اور الجزائر کے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔ مراکش میں خاص طور پر معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ اِس کے ارادت مندوں میں موجود ہیں، جن میں شاہی شریفی خاندان بھی شامل ہے؛ چنانچہ سلطان مولاے عبدالرحمٰن (۱۸۲۲ تا ۱۸۵۹ء) اور مولاے یوسف (۱۹۱۲ تا ۱۹۲۷ء) اسی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں الجزائر میں درقاوہ کی تعداد کا اندازہ ساڑھے چودہ ہزار لگایا گیا تھا اور مراکش میں یہ ۱۹۳۹ء میں تقریباً چونتیس ہزار کی تعداد میں تھے۔

درقاوہ عقائد میں کلیتاً راسخ الاعتقاد سنّی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ زور اس پر دیتے کہ آدمی جہاں تک ہو سکے اپنی توجہ ذات باری تعالٰے کی طرف مرکوز کر دے اور اللہ عزّ و جل کے ساتھ باطنی تواصل حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ اس مقصد کے لیے لازم ہے کہ سالک بقدر امکان بہ کثرت ذکر کرے اور نماز پڑھے، بالخصوص مجالس ذکر کے دوران جو سلسلے کے مقررہ مقامات پر باقاعدہ منعقد ہوتی رہتی ہیں ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔ یہ وقتی اجتماعات اس لیے ہوتے ہیں کہ اوراد و اذکار نیز صوفیانہ اشعار کے سننے اور رقص سے وجد کی کیفیت طاری ہو جائے۔ ان مجالس کا بہت عمدہ بیان E. Dermenghem کے مقالے *Essai sur la* *mystique musulmane* میں ملے گا، جو اس نے ابن الفارض کے قصیدۂ خمریه کے ترجمے (پیرس ۱۹۳۱ء، ص ۴۲، تعلیقه ۱) کے مقدمے کے طور پر لکھا ہے۔ اپنے آپ کو دنیا سے پوری طرح بے تعلق کرنے کے لیے بعض سالکانِ طریقت خانه بدوشوں کی طرح جگه جگه گھومتے پھرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک عصا ہوتا ہے۔ میلا کچیلا پھٹا پرانا لباس پہنتے ہیں اور سو دانوں کی تسبیح ان کے گلے میں ہوتی ہے۔ تاہم ان کی اکثریت اس پر اکتفا کرتی ہے که جہاں تک ہو سکے دنیوی اشغال کی طرف کم سے کم توجه کریں اور عوامی زندگی کی کسی شکل میں کوئی حصه نه لیں۔

اس کے باوجود چند مواقع پر درقاوه نے سیاسیات میں کچھ نه کچھ حصه لیا، چنانچه ان میں سے ایک ابن الشریف نے اوران Oran کے ترکی صوبے میں اچھی خاصی شورش برپا کی، جو کئی برس جاری رہی (۱۸۰۳ تا ۱۸۰۹ء)۔ اگر مولاے سلیمان (۱۷۹۲ تا ۱۸۲۲ء) اعتدال پسند نه ہوتا تو ممکن ہے که اس شورش کا انجام یه ہوتا که مغربی الجزائر کا مراکش کے ساتھ الحاق ہو جاتا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد درقاوه کے متفرق گروہوں نے مولاے سلیمان کی حکومت کے آخری برسوں میں بربر قبائل کی بغاوت میں سرگرمی سے حصه لیا۔ اس سلسلے کے سرگروه کو کچھ روز کے لیے قید بھی کر دیا گیا تھا۔ مولاے سلیمان کی وفات کے بعد درقاوه نے مراکش کی سیاسیات میں بمشکل ہی کوئی حصه لیا، یہاں تک که بیسویں صدی کے شروع کے پر آشوب زمانے میں بھی وه الگ تھلگ رہے۔ دوسری جانب، فرانس کی الجزائر کی فتح کے پہلے چند برسوں میں انھوں نے کسی قدر سیاسیات میں حصه لیا، یعنی امیر عبدالقادر کی مخالفت کی، جس پر یه الزام قائم کیا گیا که وه ڈیسیشلز Desmichels (۱۸۳۴ء) اور تفنه Tafna (۱۸۳۷ء) کے عہد ناموں کے بعد فرانس سے مل گیا تھا۔

مآخذ: (۱) مولاي العربي الدرقاوي: رسائل، طبع سنگ، فاس ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ - ۱۹۰۱ء؛ (۲) محمد بن جعفر الکتّانی: سلوة الانفاس، طبع سنگ، فاس ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ - ۱۸۹۹ء، بمواضع کثیره اور بالخصوص ۱: ۱۴۶، ۲۶۷، ۳۵۸؛ (۳) ناصری: کتاب الاستقصاء، قاهره ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ - ۱۸۹۵ء، ۴: ۱۳؛ (۴) زیّانی: ترجمان المعرب، طبع Houdas، پیرس ۱۸۸۶ء، ص ۱۰۰ تا ۱۰۲؛ (۵) L. Rinn: *Marabouts et Khouan*، الجزائر ۱۸۸۴ء، ص ۲۳۱ تا ۲۶۳؛ (۶) O. Depont اور X. Coppolani: *Les Confréries Musulmanes*، الجزائر ۱۸۹۷ء، ص ۵۰۳؛ (۷) A. Joly: *Étude sur les Chadeliias*، الجزائر ۱۹۰۷ء؛ (۸) G. Drague: *Esquisse d' Histoire Religieuse du Maroc*، پیرس، بدون تاریخ، ص ۲۵۱ تا ۲۷۳۔

(R. LE TOURNEAU)

* **دُرکانی:** گُرچانی قبیلے کا ایک بلوچی خانواده۔ دُرکانی ڈوڈائیوں کی نسل سے ہیں، جو راجپوتوں کا ایک قبیله تھا اور قدیم زمانے ہی میں بلوچیوں کی جتھے بندی میں شامل ہو گیا تھا۔ دُرکانیوں کی نسل پہاڑی ہے اور وه سلسلۂ کوه سلیمان کے ایک پہاڑ دراغل میں آباد ہیں۔ ان کی زبان بلوچی ہے۔

(M. LONGWORTH DAMES)

* **دَرگاه:** فارسی میں لغوی معنی "دروازے کی جگه" ہے [رَکَ به در] ایران میں عموماً شاہی دربار یا محل کے معنی میں مستعمل ہے [پاکستان و] ہند میں اس کا ایک مزید مخصوص مفہوم کسی پیر کے مزار یا مقبرے کا بھی ہے۔

* **دِرِن:** رَکَ به اطلس۔

* **درنه:** جدید تلفظ دِرْنه: برقه (Cyrenaica) کے شمالی ساحل پر ایک شہر، جو آج کل اس علاقے

میں بن غازی کے بعد سب سے اہم ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے میدان میں واقع ہے، جو اسی نام کی ندی کے کناروں کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ اس کے جنوب میں الجبل الأخضر کی سطح مرتفع ہے اور مشرق اور مغرب کی جانب سمندر ہے۔ سدا رواں چشموں کی بدولت یہاں کھجوروں، (آٹھ ہزار) نارنگیوں اور دیگر میوہ دار درختوں کی خوب کثرت ہے۔ درنہ کی بنیاد یونانیوں نے رکھی تھی، جنھوں نے اپنی ایک بستی اس نواح میں بسائی تھی لیکن یہ تجارتی منڈی، جو دُرنِس Darnis کہلاتی تھی، "پولِس" (Polis = شہر) نہ بن سکی: چنانچہ اس کا شمار ان پانچ شہروں میں نہ تھا جو سکندر اعظم کے زمانے میں باہم حلیف بن گئے تھے اور جن کی وجہ سے اس علاقے کا نام Pentapolis (= پنج شہری) پڑا۔ اس شہر کی ترقی غالبًا مصر کے بطلیموسی بادشاہوں (Ptolemies) کے زمانے میں ہوئی۔ ۹۶ ق م میں "پنج شہری" کی طرح درنہ پر بھی اہل روم کا قبضہ ہو گیا۔ یہ قبضہ Ptolemy Apion کی وصیت کی رو سے ہوا تھا۔ اس نے Ptolemy Physcon کے فیصلے کی تجدید کی تھی، جو ۱۵۵ ق - م میں موجود تھا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے Romanelli : *Cirenaica*، ص ۱ تا ۴۲)۔ مسلمانوں کے ہاتھوں پنج شہری (Pantapolis) کی فتح کے لیے رک بہ برقہ۔ یاقوت کا بیان ہے کہ ۷۶ھ/ ۶۹۵ء (یا ۷۳ھ/ ۶۹۳ء؟) میں جب یونانی اس علاقے پر دوبارہ قبضہ کرنے کے خیال سے اس جگہ اترے تو یہاں کا عامل ابو شداد زہیر بن قیس البلوی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیزی سے روانہ ہوا، لیکن شہید ہو گیا۔ یاقوت کا بیان ہے کہ اس کا مزار اور شہدا کی قبریں مشہور ہیں۔ عربوں کے عہد میں درنہ ترقی نہ کر سکا، چنانچہ عرب جغرافیہ نگاروں کے ہاں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ دراصل اس کی خوشحالی کا دار و مدار زراعت پر رہا تھا۔ اس کی بندرگاہ برقہ کی دوسری بندرگاہوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور عرب نوجون، تجارتی قافلوں اور زائرین کے عام راستے سے تقریباً نوے کیلومیٹر کے فاصلے پر (عین الغزالہ، التیمی اور مخیلی کے) جنوب میں واقع تھی۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب شمالی افریقہ کے مختلف مقامات سے اندلسی پناہ گزین یہاں آ کر آباد ہونے لگے تو درنہ کے بھی دن پھرے، کیونکہ ان میں سے بیشتر کاشتکار تھے۔ سترھویں صدی عیسوی میں قاسم پاشا نے طرابلس سے قسطنطنیہ واپس آتے ہوئے درنہ کے علاقے کی زرخیزی دیکھی تو باب عالی کی اجازت سے وہیں اہل اندلس کے درمیان سکونت اختیار کر لی۔ کچھ دن بعد اس کے نائب کی درخواست پر تونس کے بے نے آٹھ سو مزید اندلسیوں کو تونس سے درنہ بھیج دیا (۱۶۳۸ء)۔ العیّاشی (م ۱۰۹۱ھ / [۱۶۸۰ء]) اور ابن ناصر الدّرعی (م ۱۱۲۹ھ/ ۱۷۱۷ء) کے سفرناموں سے پتا چلتا ہے کہ اندلسی ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۱ء کے قریب درنہ میں آ کر آباد ہوئے تھے اور قبل ازیں یہ شہر مدتوں ویران پڑا رہا تھا۔ اس کی رونق بحال ہونا شروع ہوئی تھی کہ طرابلس کے دای (والی) محمد (۱۰۴۱ / ۱۶۳۲ء - ۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء) نے بن غازی (۱۶۳۸ء) اور اَوجلہ پر (۱۶۴۰ء) فوج کشی کر دی، کیونکہ وہ صحرا پار کی تجارت پر قابض رہنا چاہتا تھا اور طرابلس میں بیرونی اشخاص کا عمل دخل اسے پسند نہ تھا۔ مزید براں فزان اور بورنو سے بحرۂ روم کے ساحل پر جانے والے بعض تجارتی قافلے بھی اسی نخلستان کے راستے گذرا کرتے تھے۔ ۱۶۵۶ء میں یہ شہر محمد کے جانشین دای عثمان کے حملے سے ایک بار پھر ویران ہو گیا، کیونکہ باشندوں کی بہت بڑی تعداد ماری گئی اور بہت سے لوگ جلا وطن ہو گئے؛ تاہم یہ شہر بہت جلد دوبارہ رونق پکڑ گیا۔ محمد بن محمود کو، جسے طرابلس کے پاشا نے یہاں کا عامل مقرر کیا تھا، آج بھی بہت احترام سے یاد کیا

جاتا ہے، کیونکہ اس نے سترھویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب آبپاشی کے نظام کی طرف توجہ کی اور بہت سے دوسرے رفاہ عام کے کام کیے (خصوصاً یہاں کی مسجد جامع تعمیر کی)۔ درنہ کے لوگ اپنی جرأت اور سخت کوشی کے باعث ہر حکومت کے لیے پریشانی کا باعث ثابت ہوئے، حتٰی کہ قرہ مانلی والیوں کے لیے بھی وہ درد سر بنے رہے۔ ۱۷۱۵ء میں احمد اول نے کوشش کی کہ بن غازی اور درنہ کو ہمیشہ کے لیے مطیع کر لیا جائے۔ ورثیلانی، جس نے ۱۱۶۹ھ / ۱۷۶۵ء تا ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء میں یہاں کا سفر کیا تھا، اپنے رِحْلۃ (سفر نامے) میں بتاتا ہے کہ درنہ اور مصراتہ کے باشندوں میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی اور صرف ایک بار قحط سالی کے باعث ان کی باہمی کشمکش ملتوی ہو گئی تھی۔ ڈیلا سیلا Della Cella نے بھی ایک وبائی طاعون کا ذکر کیا ہے، جس سے ۱۸۱۶ء میں آبادی سات ہزار گھٹ کر صرف پانچ سو رہ گئی تھی۔ ۱۸۰۵ء میں درنہ کو ایک اچانک حملے سے سابقہ پڑا۔ چار سو نفوس پر مشتمل بے قاعدہ فوج نے، جس کی مدد تین امریکی جہاز کر رہے تھے، اس پر بمباری کر کے قبضہ کر لیا۔ قصہ یہ تھا کہ طرابلس کے پاشا یوسف قرہ مانلی کے چھاپہ مار جہازوں نے امریکی جہازوں پر حملہ کیا تھا اور جب امریکی جنگی بیڑے کا طرابلس پر براہ راست حملہ ناکام رہا تو بربر میں امریکہ کے بحری نمائندے ولیم ایٹن William Eaton نے پاشا کے بڑے بھائی احمد کو ساتھ ملا کر کوشش کی کہ مصر سے برقہ کے راستے طرابلس پر چڑھائی کی جائے۔ بے قاعدہ فوج کا یہ دستہ ابھی درنہ سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھا تھا کہ یوسف پاشا کے ساتھ صلح ہو گئی اور اس عجیب و غریب فوجی مہم کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک طویل مدت تک قرہ مانلی [رَک بآن] حکومت کے ماتحت رہنے کے بعد ۱۸۳۵ء میں برقہ ایک بار پھر براہ راست حکومت قسطنطینیہ کے زیر تسلط آ گیا اور آہستہ آہستہ یہ قبضہ مستحکم ہوتا چلا گیا۔ حکومت ترکیہ کی یہ انتہائی کوشش رہی کہ مرسہ، سوسہ اور درنہ کے درمیانی علاقے کو آباد کیا جائے۔ لیبیا (طرابلس) پر قبضہ کرنے کی غرض سے جب اٹلی نے ترکیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا (۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء) تو سب سے پہلے درنہ کو بم باری کا نشانہ بنایا (۳۰ ستمبر) اور اس پر قبضہ کر لیا (۱۹ اکتوبر)۔ اس وقت اس شہر کی آبادی ساڑھے نو ہزار کے قریب تھی۔ پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں یہ اٹلی ہی کے قبضے میں رہا، لیکن دوسری عالمگیر جنگ میں انجام کار انگریز اس پر قابض ہو گئے (جنوری ۱۹۴۳ء)۔

[آج کل درنہ جمہوریۂ لیبیا میں شامل ہے۔]

یہاں سنوسیہ کا صرف ایک زاویہ ہے، حالانکہ دوسرے طریقوں کے چودہ زاویے موجود ہیں اور ان میں سے بعض ڈیڑھ سو سال کی طویل مدت سے قائم ہیں۔ یہاں کے گورستان میں سیدی بو منصور الفارسی کا مقبرہ ہے۔ وہ ان ستّر غازیوں میں شامل تھے جو مذکورۂ بالا زہیر البلوی کی معیت میں شہید ہوئے تھے۔ دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ شہر کا جو حصہ پھیلا ہوا ہے وہ انھیں کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔ [اس کی موجودہ آبادی چوراسی ہزار سے متجاوز ہے]۔

مآخذ: زمانۂ قدیم کے لیے دیکھیے (۱) J.P. Thrige: *Res Cyrenensium*، کوپن ہیگن ۱۸۲۸ء، بار دوم، Verbania ۱۹۳۰ء (اطالوی ترجمہ، Verbania ۱۹۳۰ء): (۲) P. Romanelli: *La Cirenaica Romana*، Verbania ۱۹۴۳ء (یہ مجلدات *Storia della Libia* میں شائع کی گئیں)؛ عرب جغرافیہ نویسوں میں دیکھیے: (۳) یاقوت: معجم، بذیل مادہ؛ عہد بربر کے واقعات کے لیے: (۴) C. Bergna: *Tripoli dal 1510 al 1850*، طرابلس ۱۹۲۵ء، ص ۱۲۳ ببعد، ۱۰۹؛ (۵) Ch. L. Feraud: *Annales Tripolitaines*، تونس ۱۹۲۷ء، ص ۱۰۰ تا

۱۰۳، ۱۰۹ تا ۱۱۱، ۱۳۹، ۳۱۹ ببعد؛ (۶) E. Rossi: *La Cronaca araba tripolina di Ibn Galbun (sec. XVIII) tradotta e annotata*، Bologna ۱۹۳۶ء، ص ۱۰۱، ۱۱۶ ببعد، ۱۵۰؛ (۷) العیّاشی: الرحلة العیاشیّة، فاس ۱۳۱۶ھ، ۱: ۱۰۸ ببعد (منقول در ورثیلانی، ص ۳۲۲)؛ (۸) ابن ناصر الدرعی: الرحلة الناصریة، فاس ۱۳۲۰ھ (منقول در ورثیلانی، ص ۶-۹)؛ (۹) ورثیلانی: نزهة الانظار فی فضل علم التاریخ و الاخبار = الرحلة الورثیلانیه، الجزائر ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء، ص ۲۰۸ ببعد؛ ۱۸۰۵ء میں درنه پر امریکی قبضے کے لیے دیکھیے (۱۰) E. Dupuy: *Americains et Barbaresques (1776-1824)*، پیرس ۱۹۱۰ء، ص ۲۳۱ تا ۲۴۷؛ (۱۱) *Encyclopaedia Britannica*، بذیل William Eaton؛ (۱۲) V.H. Serruno: *Libya, the New Arab Kingdom*، Ithaca ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۷ تا ۱۳۱؛ اٹھارھویں صدی عیسوی کے دورِیں سیاحوں کے لیے (۱۳) *Enciclopedia Italiana*، بذیل Cirenaica و Esplorazioni؛ (۱۴) A. Cervelli کے روزنامچۂ سیاحت سے اقتباس، در *Recueil de Voyages et Mémoires de la Société de Géographie de Paris*، ج ۲، ۱۸۲۵ء؛ (۱۵) P. Della Cella: *Viaggio da Tripoli di Barberia alle frontiere occidentali dell' Egitto fatto nel 1817*، میلان ۱۸۲۶ء (بار اول جنیوا ۱۸۱۷ء)، ص ۱۶۵ تا ۱۷۰؛ ترکی تسلط کے زمانے کے اواخر کے لیے: (۱۶) Fr. Coro: *Settantasei anni di dominazione turca in Libia*، ۱۹۳۷ء، ص ۱۰۲؛ اطالوی عہد کے مآخذ کے لیے بھی دیکھیے *Enciclopedia Italiana*، بذیل مادہ Cirenaica؛ جدید دور کے لیے (۱۷) E. E. Evans-Pritchard: *The Sanusi of Cyrenaica*، اوکسفرڈ ۱۹۴۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۸) N.A. Ziadeh: *Sanusiyah, a study of a revivalist movement in Islam*، لائیڈن ۱۹۵۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۹) وہی مصنف: برقه الدولة العربیة الثامنة، بیروت ۱۹۵۰ء، ص ۸، ببعد، ۱۸ ببعد؛ (۲۰) I.S. O. Playfair: *History of the Second World War, The Mediterranean and the Middle East*، ج ۱، لندن ۱۹۵۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۲۱) E. Rossi: *Il Regno Unito della Libia*، در *OM*، ۳۱ (۱۹۵۱ء)، ۱۵۷ تا ۱۷۷؛ نیز کتاب مذکور، مآخذ، ص ۱۶۲ (۱)؛ (۲۲) درنه کے علاقے کی سڑکوں کا نقشہ (۱ : ۳۰۰۰۰۰)، در *Bollettino geografico del Governo della Cirenaica, Servizio Studi*، عدد ۹؛ (۲۳) *Guida d' Italia del Touring Club Italiano, possedimenti e colonie*، میلان ۱۹۲۹ء، ص ۳۸۳ تا ۳۸۷۔

(L. Veccia Vaglieri)

* **اَلدُّرُوز:** واحد الدُّرزی [اور الدَّرَزی]، [رک بآن] شامی نسل کے لوگ، جو باطنی مذہب کے پیرو ہیں، جو اسمٰعیلیہ [رک بآن] عقائد پر مبنی ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مُوَحِّدون (ایک (خدا) کے ماننے والے) کہتے ہیں۔ ان کی تعداد (بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں) دو لاکھ تھی۔ یہ سُوریہ (شام) کے متفرق حصوں میں رہتے ہیں، بالخصوص جبال لبنان غربی، جبال شرق اور حوران میں؛ ان میں سے زیادہ تر زراعت پیشہ اور زمیندار لوگ ہیں۔

ان کے مذہب کا آغاز مصر کے فاطمی خلیفہ (۳۸۶/۹۹۶ تا ۴۱۱ھ/۱۰۲۱ء) الحاکم [رک بآن] کے عہد سلطنت کے آخری برسوں میں ہوا۔ اسمٰعیلی شیعی عقیدہ کے مطابق، جو اس وقت مصر میں باقاعدہ حکومت کا مذہب قرار پایا تھا، الحاکم، بحیثیت امام، اسلام کا اللہ کی طرف سے مقرر شدہ با اختیار قیّم (حارس) تھا، اور انسانوں میں اس کا مقام وہ تھا جو اصول کائناتی میں عقل الفعّال کا ہے اور وہ اسمٰعیلی مذہب کے پیشواؤں کا مسلّمہ سردار تھا۔ الحاکم اپنی ذاتی زندگی اور مذہبی حکمت عملی دونوں میں ایک متلوّن مزاج فرمانروا ثابت ہوا، اور یکے بعد

دیگرے اسمٰعیلیوں اور سنیوں دونوں کے جذبات کو یکساں مجروح کرتا تھا۔ اپنے آخری سالوں میں اس کی یہ خواہش تھی کہ اسے ایک لاھوتی شخصیت مانا جائے جس کا مرتبہ ان سب مرتبوں سے بلند تر ہو جو رسمی اسمٰعیلت اسے دے سکتی ہے۔ اسمٰعیلیوں کی ایک خاصی تعداد فی الحقیقت اسے ایسا ہی سمجھتی تھی، اور بظاھر اس کی خفیہ رضامندی سے یہ لوگ اس ڈھن میں لگ گئے کہ اس کے مریدوں کی خاص جماعت تیار کی جائے۔ اُنھیں یہ توقع تھی کہ اس کا یہ مرتبہ عام طور پر مان لیا جائے گا۔

ان لوگوں میں سے پہلا شخص جس پر عوام کی نظر پڑی الدَّرَزی [رک بآن] تھا۔ یہ عجمی النسل تھا (جیسے کہ اُن کے کئی اور قائدین تھے)؛ اسی وجہ سے اس پوری تحریک کا نام الدَّرَزِیّہ (یا الدُّرزیّة) پڑ گیا۔ معلوم ھوتا ہے کہ اس نے الحاکم کے معتقدین کے رجحان کی ترجمانی اس قاعدے کے مطابق کی جو اسمٰعیلی الحاد کا متواتر موقف رھا ہے۔ یہ قاعدہ "تاویل" (باطنی حقیقت) اور اس کے نمائندے یعنی امام، کو "تنزیل" (نص ظاھر) اور اس کے مبلّغ، یعنی رسول پر ترجیح دیتا ہے۔ اس قاعدے کے مطابق اُس نے اس وقت کے امام الحاکم کو ایک مافوق الطبیعی درجہ دے دیا، یعنی عقل کلّی کا اوتار، جو نظام کونیہ میں سب سے بلند عقل ہے؛ لیکن اس کی عوامی سرگرمیوں سے فسادات برپا ھونے لگے (۴۰۸ھ/۱۰۱۷-۱۰۱۸ء) جس کی وجہ سے الحاکم زیادہ محتاط رھنے پر مجبور ھو گیا۔ ۴۱۰ھ میں الحاکم نے ایک اور قائد حمزہ بن علی [رک بآن] کو، جو ایران کے مقام سوزن کا رھنے والا تھا، اپنی تائید سے سرفراز کیا اور اس نے حاکم کے مذھب کی دروزی شکل مکمل طور پر معیّن کی۔

حمزہ نے اپنی تبلیغ ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء میں شروع کر دی تھی (اور یہی دروزی سنہ کا پہلا سال تھا۔ اس کا دوسرا سال ۴۱۰ھ تھا، جب کہ عام تبلیغ از سرِ نو شروع کی گئی)۔ اس نے دعوے کیا کہ وہ شروع ھی سے الحاکم کا مقرر کردہ اور مجاز واحد خطیب (نائب اسلام) ہے۔ ۴۱۰ھ میں الدَّرَزی کی وفات کے بعد اس نے کوشش کی کہ ساری تحریک کو اپنے ھی حیطۂ اقتدار میں لے آئے۔ بیّن طور پر اس کا عقیدہ الدَّرَزی سے کہیں زیادہ اچھوتا تھا۔ عام اسمٰعیلی عقیدے کی طرح اس کا نظریہ بھی یہی تھا کہ کائنات کا صدور واحد سے ہے اور پھر اس کا مرجع بھی انسان کے باطنی علم کے راستے واحد ھی کی طرف ہے، لیکن اس کی نرالی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کائنات کے اندر اس واحد کو بلا واسطہ حاضر مانتا تھا اور بنا بریں وہ ثانوی صادرات کو نسبتاً کم اھمیت دیتا تھا۔ اسی وجہ سے حمزہ نے اپنے پیرؤوں کا لقب کامل ترین "موحدین" رکھا تھا۔

حمزہ کے نزدیک حاکم اب محض امام نہ تھا، خواہ امام کے مفہوم کو کتنا ھی ارفع سمجھا جائے۔ اب خود حمزہ امام تھا، یعنی انسانی رھنما، اور اسی وجہ سے وہ العقل الکُلّی یعنی کائنات کا اولین مبدأ تھا اور حاکم خود وحدۂ قصویٰ یعنی خالق اکبر کا جس نے عقل کو پیدا کیا، اوتار تھا، اور اسی وجہ سے خود کسی نام یا عہدے سے ماورا تھا۔ یہاں تک کہ خیر و شر کے دائرے سے بھی باھر تھا۔ اس کے مقابلے میں علی اور اسمٰعیلی امام بحیثیت امام ثانوی درجے کے افراد تھے (لیکن چونکہ واحد (حقیقی) ھمیشہ حاضر رھتا ہے، خواہ ظاھر نہ بھی ھو، اس لیے بعض آخری امام مع بعض متقدم گمنام اشخاص کے بھی اپنے اپنے وقت میں واحد (حقیقی) کے اوتار تھے)۔ الحاکم کے اندر واحد حقیقی شانِ یکتائی سے تاریخ (دائرہ زمان) میں موجود تھا۔ اس کی زندگی کی متناقض حرکات قادر مطلق کے افعال کا مظہر تھیں، جس کے کسی فعل میں چون و چرا کی گنجایش نہیں، اگرچہ اس کے ھر فعل کا مفہوم اس کے امام یعنی عقل یا

عقل کائنات حمزہ پر واضح تھا ۔ الحاکم خالق مطلق کا "مقام" حاضر تھا ؛ اس لیے انسان اس کی معرفت کی بدولت متقی اور مطہر ہو سکتے تھے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حمزہ کی تعلیم صحیح معنوں میں اسمٰعیلیت کی غالی صورت نہ تھی گو اس میں غالی اسمٰعیلیت کے تصورات اور اصطلاحات سے کام لیا گیا تھا ۔ اس تعلیم کا تو یہ دعوے تھا کہ وہ ایک مستقل مذہب ہے جو سُنّی "تنزیل" اور اسمٰعیلی "تاویل" دونوں سے بالاتر ہے ۔

بظاہر حمزہ یہ توقع رکھتا تھا کہ الحاکم کی خلافت سے تاریخ کے مسیحی عروج کا زمانہ پلٹ آئے گا اور تمام لوگوں کو قدیم الہامی ادیان کے شعائر سے، جن میں دین اسلام بھی شامل ہے، روگردانی پر مجبور کر دے گا اور انھیں محض اس (خداوند) واحد کی بندگی پر لے آئے گا جو الحاکم کے روپ میں صاف طور پر ظاہر ہو گیا ہے ۔ الحاکم کے فیصلہ کن اقدام کے اہتمام کے طور پر حمزہ نے امام کی حیثیت سے الحاکم کے معتقدین کے حلقوں میں اس سچے اور صحیح عقیدے کی ترویج کے لیے خود اپنی جماعت منظم کرنی شروع کر دی ۔ الحاکم اور خود حمزہ کی طرح اس جماعت کے اعضاء اصول کائنات کے اوتار (مجسمے) تھے ۔ ان میں پانچ بڑے کائناتی منصب یا حدود [= اَلْحُدُود الخَمْسَة] تھے، جو اسمٰعیلی علوم سے کسی قدر ترمیم شدہ شکل میں اخذ کیے گئے تھے: (۱) العَقْل (= حمزہ [بن علی بن احمد])، شُطْنِیل کا مثیل، جو موجودہ تاریخی دور کے اندر "حقیقی آدم" ہے؛ جس میں "الواحد" کا نام البار مقرر ہے)، [دروزی کتب عقائد میں حمزہ کو "العقل الکلی"، "قائم الزمان"، "الامام"، "آیۃ التوحید"، "آدم الکلی" وغیرہ القاب سے یاد کیا گیا ہے] ؛ (۲) النَّفس الکلیّہ، روح کائنات (= اسمٰعیل بن محمد التمیمی)؛ (۳) الکلمۃ (= محمد بن وہب القرشی)؛ (۴) السّابق یا جناح اَلْاَیْمَن، اسمٰعیلی مذہب میں اسے عقل کا ہم معنی مانا گیا تھا لیکن یہاں اس کا مرتبہ گرا دیا ہے (= سلامۃ بن عبدالوہاب) ؛ اور (۵) جناح اَیْسَر یا التّالی (= تابع)، اسمٰعیلی مذہب میں یہ "نفس" کا ہم پلہ ہے (= ابوالحسن علی بن احمد السَّمُوقی جسے بہاء الدین المُقْتَنٰی کہتے ہیں) ۔ ان پانچ بڑے عہدے داروں کے تحت کام کرنے والے یہ تھے: داعیوں اور مبلّغوں کی ایک تعداد ؛ ماذون، جنھیں وعظ کہنے کی اجازت دی جاتی تھی، اور المُکاسِر، ترغیب دینے والے، جن کے اندر کائناتی الجدّ (کوشش)، الفتح (کھولنا) اور الخیال شامل تھے [قب البستانی : دائرۃ المعارف، بذیل مادہ الدروز؛ الزِرِکلی نے الاعلام، بذیل مادہ حمزہ بن علی (م ۴۳۳ھ / ۱۰۴۰ء) میں الحدود الخمسۃ کے بعد الحدود الثلاثہ یعنی الجدّ (= ایوب بن علی)، الفتح (= رفاعۃ بن عبدالوارث) ؛ اور الخیال (= محسن بن علی) کا ذکر کیا ہے ۔ اس کے بعد الدُّعاۃ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مراتب حسب ذیل ترتیب سے بیان کیے ہیں: (۱) الامام، (۲) الحُجّۃ، (۳) الداعی، جس کی یہ اقسام بیان کی ہیں: داعی الدعاۃ، الداعی الماذون اور المکاسر] ۔ ان سب کے نیچے عام معتقدین تھے ۔ (ان تمام درجوں میں کسی فرد کی شخصیت اور جسمیت کا اعتبار نہ ہوتا تھا، بلکہ اس کے اندر پوشیدہ غیر فانی قاعدہ اصل سمجھا جاتا تھا جس کے اوپر جسم محض ایک عارضی خول ہوتا تھا ؛ معمولی شخص کے اندر اس کا مطلب ہمیشہ ایک نیا جسم قبول کرتے رہنے والا نفس تھا) ۔ ان عہدے داروں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ بہت سے ایسے لقب یا تصوّرات منسوب کر دیے جاتے تھے جو پیچیدہ اسمٰعیلی نظام میں متشکل ہو چکے تھے ۔ تاہم ان درجات اور مراتب کے باوجود "الواحد" کا بلا واسطہ ہر جگہ موجود ہونا سب سے پہلی چیز مانا جاتا تھا اور بعد کے دروزی مذہب میں یہی خیال قائم رہا ۔

ان سچی (اصلی) 'حدود' کے خلاف اور انھیں کی طرح الحاکم کی، بحیثیت الواحد الاقصٰی کے،

پیدا کردہ اشیا میں کاذب (جھوٹی) حدود کا ایک منظم سلسلہ تھا اور اصلی حدود کی طرح وہ بھی الحاکم کے زمانے کے آدمیوں میں جسمانی شکل میں موجود تھا ، مثلاً الحاکم کے اسمٰعیلی مأمورین کے اندر ، قدیم مذاهب کے گمراہ کن اصول سکھانے والے مُعلّم ۔ حشر نشر کے منظر کا مطلب دو فریقوں کے درمیان میدان جنگ کا برپا ہونا لیا جاتا تھا ، جس میں ایک فریق حمزہ بحیثیت "قائم الزمان" (=وقت کا مالک) اور اس کے ساتھ صادق (سچی) حدود ، جن کی تائید آخرکار الحاکم کھلم کھلا کرے گا ، اور دوسرا اس کے مقابل فریق کے جھوٹے معلّمین ، جنھیں الحاکم علانیہ معزول قرار دے گا۔ الحاکم کے نظام دینی کے پیروؤں کو، خواہ دَرزی کے تحت یا حمزہ کے تحت بظاهر یہ فکر تھی کہ حوادث جلد سے جلد واقع ہوں اور اس غرض کے لیے وہ کھلم کھلا اعلان کرتے پھرتے تھے کہ قدیم مذاهب ، سارے کے سارے جن میں اسلام کا قانون شریعت اور اس کی اسمٰعیلی باطنی تاویل شامل ہیں ، باطل ہو چکے ہیں ۔ اگرچہ حمزہ اوروں سے زیادہ محتاط تھا مگر رائج الوقت مذهب کی توهین و تحقیر علی الاعلان کی جاتی تھی ۔ الحاکم کی خفیہ تائید اس (فتنے) کو حاصل تھی اور اسی بنا بر فسادات برپا ہوتے تھے۔ جدید مذهب کے پیرووں کے خلاف، جو خود کو شریعت سے آزاد سمجھتے تھے ، ہر قسم کی بڑی بڑی بدکاریوں کے الزامات عائد کیے جاتے تھے۔ الحاکم کا دینی مسلک اس روز افزوں سیاسی بحران کا بہت بڑا سبب معلوم ہوتا ہے جو الحاکمؒ کے آخری ایام میں رونما ہوا ۔

جب ۴۱۱ھ / ۱۰۲۱ء کے اواخر میں الحاکم غائب ہو گیا تو حمزہ نے اعلان کیا کہ اس کا غائب ہونا اس غرض سے ہے کہ اپنے متّبعین کی آزمائش کرے اور وہ بہت جلد واپس آ کر اپنی پوری قوت کا اظہار کرے گا اور فتح کی تلوار خود حمزہ کے ہاتھوں میں دے دے گا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۴۱۱ھ کے اواخر میں ، حمزہ بھی یہ کہہ کر غائب ہو گیا کہ وہ الحاکم کے ساتھ ہی واپس آئے گا۔ اس کے بعد یہ مذهب زمانے کے اس دور میں داخل ہو گیا جو اثنا عشریوں کے اس دور سے ملتا جلتا ہے جسے الغَیبۃ الصغریٰ کہتے ہیں۔ اس زمانے میں فقط "تالی" بہاء الدین المُقتَنیٰ رہ گیا جو غائب حمزہ اور اس کے وفادار پیرووں کے درمیان کڑی کا کام دیتا تھا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ الحاکم کے غائب ہونے کے بعد حاکم کے مذهب کی سرگرمیاں مصر میں رفتہ رفتہ گھٹتی گئیں، لیکن اس نے شام میں کاشتکاروں کی مسلسل بغاوتوں کے لیے ایک منظم نظریۂ حیات مہیا کر دیا ۔ مبلّغین کی ایک خاصی تعداد نے وہاں اس مذهب میں لوگوں کو داخل کرنے کے لیے سرگرمی سے کام شروع کر دیا جن میں سے بعض کے نام لکھے ہوئے موجود ہیں ؛ اس تحریک نے بعض پہاڑی علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور کہا جاتا ہے کہ اس کے پیرووں نے وہاں کی مسجدیں منہدم کر دیں اور اپنا نیا نظام قانون قائم کر دیا ، اور احتمال ہے کہ انھوں نے قدیم زمینداروں کو بے دخل کر کے آزاد کاشتکاروں کو ان کی جگہ بٹھا دیا۔ ۴۲۳ھ / ۱۰۳۲ء میں امیر انطاکیہ نے امیر حلب کی مدد سے جبل السُّمّاق میں ایک گروہ کی سرکوبی کی ، جس میں حلب کے قرب و جوار کے کاشتکار جو وہاں جمع ہو گئے تھے ، شامل تھے ۔

اس هیجان کے زمانے میں المقتنیٰ نے اسکندریہ میں (المقتنیٰ کو ۴۱۱ھ کے صرف آخری لمحے میں " تالی" مقرر کر دیا گیا تھا) کوشش کی کہ اُس کا اور حمزہ کا اقتدار قائم رہے ۔ ظاهر ہے کہ وہ مستور حمزہ کے ساتھ ملا ہوا تھا اور یمن سے اس کے اچانک ظاہر ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے جبل السُّمّاق کے شکست خوردہ باغیوں کی همت بڑھائی۔ اپنے مسلک کی تبلیغ کے سلسلے میں بہت سے خطوط لکھے ، جن میں سے بعض میں شام میں بسنے والوں کے علاوہ اسمٰعیلی مذهب

کے تمام ماننے والوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو سندھ تک کے دور دراز علاقوں میں مخاطب کیا گیا تھا۔ ان خطوط کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ دُروز کے صحیح اور مستند عقائد کی بنیاد قائم ہو گئی۔ ایسے ایک سے زیادہ مدعیان قیادت کے خلاف جد و جہد کرنا پڑی، جن میں سے ابن الکُردی، جس کی کمک پر سُکّین نام ایک شخص تھا، سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان مدعیوں میں سے بعض نے بہت وسیع پیمانے پر اخلاقی آزادی دے رکھی تھی، جسے وہ (المقتنی) خود بنظر حقارت دیکھتا تھا۔ بہرحال جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا تحریک کمزور ہوتی چلی گئی، اور معلوم ہوتا ہے کہ شام کے کاشتکاروں کی بغاوت باہمی پھوٹ کی وجہ سے انتشار و ناکامی کی شکار ہو گئی۔ آخرکار المقتنی نے تمام داعیوں کو برطرف کر دیا اور ٤٢٥ھ / ١٠٣٤ء کے کچھ عرصہ بعد خود بھی اپنے وفادار مریدوں سے اسی طرح کنارہ کش ہو گیا جیسے حمزہ ہوا تھا؛ پھر بھی ٤٣٤ھ / ١٠٤٢ - ١٠٤٣ء کی طویل مدت تک وہ ہر طرف خطوط ارسال کرتا رہا۔

المقتنی کے ہمت ہار دینے کے باوجود یہ تحریک جس حالت میں بھی آئندہ زندہ رہی اس کی بنیاد اسی کی کارگزاری تھی۔ بعد کے آنے والے دُروز نے یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ وہ المقتنی ہی تھا جس نے ایک سو گیارہ خطوط کا مجموعہ تالیف کیا۔ ان میں سے بہت سے خطوط اس کے لکھے ہوئے تھے، کچھ حمزہ کے اور کچھ اسمٰعیل التمیمی کے اور کچھ اجزاء الحاکم کی تصنیف تھے۔ اس نے ان سب خطوط کو یکجا کر کے ایک مستند مذہبی کتاب کی شکل دے دی جو اسی وقت سے دُروز کی مقدس کتاب مانی گئی ہے اور رسائل الحکمۃ کے نام سے موسوم ہے۔ المقتنی کی کنارہ کشی کے وقت سے شامی دُروز میں حمزہ اور الحاکم کی آمد کے انتظار کا دور شروع ہوا، جو اب تک قائم ہے اور جو اثنا عشریہ کی الغیبۃ الکبریٰ سے مطابقت رکھتا ہے۔ حمزہ کے مذہبی پیشواؤں کا مقرر کردہ نظام، جس میں "داعیان" اور اس سے کمتر عہدے دار شامل تھے، متروک ہو گیا اور "حدود" کی عدم موجودگی میں "کتاب قانون مقدس" رہنمائی کا کام دینے لگی۔ اگرچہ المقتنی نے اپنے مذہب کی تبلیغ کو حتی الامکان جاری رکھنے پر بڑا زور دیا تھا، لیکن اس کی گوشہ نشینی کے بعد مزید تبلیغ کا سلسلہ بند ہو گیا اور اس بات کی تعلیم دی جانے لگی کہ اس وقت سے کسی نئے آدمی کو "وحدانیت کی حقانیت" میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے (اس ممانعت کی چند مستثنیات بھی ہیں)۔ اس کے بعد دُروز ایک "در بند" فرقہ ہو گیا جس کے افراد اپنے قواعد و ضوابط کو صیغۂ راز میں رکھنے لگے، جماعت سے باہر شادی کے رشتے کرنے پر ناک بھوں چڑھانے لگے، مذہب کے قبول اور رد کی اجازت مسدود کر دی گئی اور تا حدِّ امکان اپنی خود مختار حکومت ان کوہستانی معاقل (محفوظ مقامات) میں قائم کر دی جس پر انھوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ان محفوظ مقامات میں سے وادی تَیم اللہ مشہور ہے، جو کوہ حرمون کے قریب ہے۔ شام کے ان نو مذہب فلاحین نے جن کی قیادت حسب روایت قدیم عربی قبائل کے بعض خاندان کرتے تھے، آگے چل کر ایک ہم جنس قوم کی بنا ڈالی، جن کے جسمانی خد و خال اور معاشری طریقے اوروں سے بالکل الگ تھے اور ان کے اپنے طبقۂ اشراف کے خاندان ان پر حکمران تھے۔ اشراف کے یہ خاندان اپنی بے قید غارتگری، اپنی بے حد مہمان نوازی اور اپنے سخت اخلاقی نظم و ضبط کے لیے یکساں مشہور ہیں۔ اخلاقی ضوابط ہی کے باعث وہ لوٹ مار میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کی عصمت پر دست درازی نہیں کرتے اور بد چلنی کی صورت میں دُروزی عورتوں کے لیے رحم و کرم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مغربی لوگوں کے وہ طول طویل قیاسات بالکل بے بنیاد ہیں جن میں دُروز کو کسی غیر ملکی اصل، مثلاً فرانس

یا ایران، سے منسوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

اس خود مختار جماعتی اور محدود زندگی کی طویل مدت کے دوران میں ایک نیا مذہبی طریق عمل پیدا ہو گیا جو پیشوایان مذہب کی اس حکومت سے بہت مختلف تھا جو اب ختم ہو چکی تھی ۔ ہمیں ایسے مصنفین کی خاصی تعداد معلوم ہے جنھوں نے عرفانی نظام کائنات اور مقدس دروزی تاریخ پر جو پہلے ہی سے حمزہ کی تحریروں میں کنایۃً موجود تھی؛ قلم اٹھایا ہے اور اسی طرح شارحین "کتاب قانون مقدس" بھی ہمارے پیش نظر ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس نئے طریقے نے اپنی مکمل شکل کب اختیار کی، اگرچہ غالب گمان یہ ہے کہ ایسا کم سے کم دُرُوزی معلم اخلاق عبداللہ التَّنوخی کے زمانے تک ہو چکا ہوگا (جس کے مزار کی دُرُوز اور مسیحی دونوں تعظیم کرتے ہیں) ۔ عبداللہ التَّنوخی کی وفات ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰ء میں ہوئی ۔ اس نئے طریقے کی رو سے دُرُوز دو گروہوں میں منقسم ہو گئے: (۱) عُقّال (مفرد: عاقل بمعنی دانشمند)، جن کو مذہب کے حقائق سے آگاہ کر دیا گیا تھا؛ (۲) جُہّال (مفرد: جاہل؛ ناواقف)، جو جماعت میں شامل تھے لیکن حقائق مذہب سے متعارف نہ کیے گئے تھے ۔ (اشراف کے وہ مشاہیر جنھیں ابھی حقائق سے واقف نہیں کیا گیا تھا، بحیثیت "امیر" وہ معمولی "جُہّال" سے ممتاز تھے) ۔ ہر ایک عاقل بالغ دُرُوزی (مرد ہو یا عورت) واقف راز ہو سکتا تھا بشرطیکہ وہ متعدد آزمائشوں کے بعد اس کا اہل ثابت ہو چکا ہو، لیکن اس کے بعد اس کے لیے ضروری ہے کہ سنجیدہ مذہبی زندگی بسر کرے، باقاعدہ وظائف کا روزانہ ورد رکھے، تمام نشہ آور چیزوں سے پرہیز کرے، جھوٹ سے، چوری سے اور انتقام لینے سے (جس میں باہمی جھگڑوں کی وجہ سے حملے کرنا داخل ہے) بچے اور ایسے ہی اور بُرے کاموں سے دور رہے ۔ عُقّال کا دوسروں سے الگ اپنا ایک خاص لباس ہوتا ہے جس میں سفید عمامہ شامل ہے ۔ جب تک کوئی شخص "جاہل" رہے، وہ اپنی نفسانی خواہشات کھول کر پوری کرنے کا مجاز ہے لیکن دُرُوز قوم کے اخلاق قانون کی حدود کے اندر کر، تاہم وہ روحانی مدراج کی امید نہیں رکھ سکتا ۔ بہرحال اگر وہ اپنی موجودہ زندگی کے اندر باطنی حلقے میں بار نہ پا سکا تو بھی یہ امید کر سکتا ہے کہ اسے کسی دوسرے جنم میں اس کا ایک نیا موقع مل جائے گا ۔

عُقّال میں سے جو زیادہ پرہیزگار یا فاضل ہو، اُسے قوم میں شیخ بنا کر خصوصی اختیارات دے دیے جاتے ہیں ۔ معمولی "عُقّال" سے جن اخلاق کا مطالبہ کیا جاتا ہے ان کے علاوہ شیوخ کو اخلاقی حیثیت سے اور بھی زیادہ محتاط رہنا ضروری ہے ۔ وہ کسی ایسی چیز کا استعمال نہیں کر سکتے جس کو مشتبہ طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، روزمرہ کے برتاؤ میں اُنھیں ہر قسم کی زیادتی سے بچنا چاہیے، سب کے ساتھ صلح اور میل جول سے رہنا چاہیے اور جہاں کہیں کوئی جھگڑا ہو اس کا تصفیہ کرانے کے لیے انھیں تیار رہنا چاہیے ۔ دُرُوز کے ہر ضلعے میں ان شیوخ میں سے ایک شیخ جو کسی مخصوص خاندان سے چُنا جاتا ہے، سب سے بڑا مذہبی مقتدا مانا جاتا ہے اور رئیس متصوّر ہوتا ہے ۔ شیوخ کی تعلیم و تربیت ایک خاص مدرسے میں ہوتی ہے؛ وہ اپنا بہت سا وقت مذہبی تصانیف کے نقل کرنے میں صرف کرتے ہیں بالخصوص "کتاب قانون مقدس" کی نقل میں؛ زیادہ دیندار شیوخ عموماً سب سے علیحدہ ہو کر "خلوتوں" میں جا بیٹھتے ہیں ۔ یہ خلوت گاہیں لوگوں کی گذرگاہوں سے دُور مقامات میں بنائی گئی ہیں؛ کچھ ایسے بھی ہیں جو اسی گوشۂ تنہائی میں اپنی ساری زندگی بسر کر دیتے ہیں ۔ "عاقل" کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی محنت سے گذر اوقات کرے، لیکن شیوخ "جُہّال" کی زکٰوۃ و صدقات کے صحیح حقدار ہیں ۔ ان سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے "جاہل" پڑوسیوں کو روحانی ہدایت کرتے رہیں، اور شادی

اور موت کے موقع پر ان کی راہنمائی کریں ۔

ہر شب جمعہ کو انتہائی سادہ معبدوں میں منعقد ہونے والی مجلسوں میں سے بعض مجالس میں سارے عُقّال کا حاضر ہونا ضروری ہے ؛ لیکن "جُہّال" کو ان میں سے صرف ان مجلسوں کے اندر آنے کی اجازت ہے جن میں راز کی باتوں پر کم سے کم بحث ہوتی ہے اور جہاں صرف اخلاقی مواعظ قدیم عربی زبان میں لکھے ہوئے پڑھ کر سنائے جاتے ہیں ۔ پر اسرار دینی کتابوں کے پڑھنے کی صرف عُقّال کو اجازت ہے اور صرف وہی خفیہ مذہبی رسموں میں حصہ بھی لے سکتے ہیں، بلکہ ان کا علم بھی صرف انہیں کو ہوتا ہے ۔ بیرونی دنیا کا یہ قیاس ہے کہ دُرُوز کی خفیہ رسوم میں کسی نہ کسی طرح دھات کا بنا ہوا بچھڑے کا ایک بت شامل ہوتا ہے جو یا تو "الحاکم" کی انسانی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے یا ممکن ہے حمزہ کے دشمنوں کی بہیمیت کا ۔ (دُرُوز کے ہمسایوں نے ان پر اپنی خفیہ مجالس میں بلا روک ٹوک رنگ رلیاں منانے کا الزام عائد کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے) ۔

حمزہ اور المقتنی نے اسلام کے ارکان خمسہ کی جگہ سات احکام مقرر کیے ہیں، اور یہی سات احکام ہیں جو عُقّال کی اخلاقی تربیت کے اصول بن گئے ہیں اور کسی حد تک باقی دُرُوز کے لیے بھی یہی احکام سبعہ اصول تربیت مانے جاتے ہیں ۔ سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ جماعت کے افراد آپس میں ہمیشہ سچ بولیں (یا کم از کم خاموشی اختیار کریں، مگر کبھی خلاف واقعہ بات نہ کہیں) ۔ اس حکم میں سچ کے وہ معنی مراد ہیں جو "عدم کلام" میں لیے جاتے ہیں ؛ لیکن اپنے بچاؤ یا اپنے مذہب کی خاطر منکرین عقیدہ سے جھوٹ بولنا جائز ہے ۔ اس پہلے "حکم" میں ایسے اعمال مثلاً چوری، بھی شامل ہیں جن میں جھوٹ ہی بولنا پڑتا ہے ۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ ایک دوسرے کا بچاؤ اور ایک دوسرے کی مدد کریں ۔ اس میں یہ بھی مضمر ہے کہ اس مقصد کے لیے ہتیار اپنے ساتھ رکھیں ۔ دیگر احکام یہ ہیں : تمام ادیان سابقہ کو ترک کر دیں ؛ منکروں سے کوئی میل جول نہ رکھیں ؛ اپنے "مولانا" (مولانا الحاکم کا بحیثیت الواحد عام لقب ہے) کی یکتائی کو ہر زمانے میں تسلیم کریں ؛ جو کچھ وہ کرے اس پر قانع رہیں ؛ اس کے تمام احکام برضا و رغبت بجا لائیں، خصوصاً وہ احکام جو "حدود" کی معرفت پہنچائے گئے ہیں ۔ حمزہ نے اس کے علاوہ "شریعۃ"، عدل و انصاف اور شخصی حیثیت سے متعلق خاص احکام نافذ کیے ہیں ۔ ان احکام میں خاص طور پر زوجین کے درمیان شادی کے بعد مساویانہ سلوک پر زور دیا گیا ہے ۔ بنا بریں زوجین میں سے کسی کی طرف سے طلاق کو جرم قرار دیا گیا ہے جب تک کہ اس کی کوئی معقول وجہ نہ ہو ۔

عام طور پر "جُہّال" کے عقائد کو "عُقّال" کی ہدایات کے تحت رکھا گیا ہے، لیکن اس پر مذہبی تقیے کے قاعدے کا بہت بڑا اثر پڑا ہے، یعنی اپنے مذہب کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لیے ایک دروزی ظاہری طور پر ان لوگوں کا مذہب اختیار کر سکتا ہے جو اس وقت صاحب اقتدار ہوں ؛ دوسرے الفاظ میں وہ عموماً سُنّی اسلام کا پیرو نظر آتا ہے ۔ دروز نے حنفی فقہ کو اختیار کیا ہے گو کسی قدر ترمیم کے ساتھ، مثلاً وصیت کے بارے میں غیر محدود اجازت دی گئی ہے اور طلاق پر کچھ قیدیں لگا دی گئی ہیں ۔ دروز عید تو مناتے ہیں لیکن حج نہیں کرتے اور نہ رمضان کے روزے رکھتے ہیں ۔ بہت سے گھرانے ختنے کے رواجاً پابند ہیں، لیکن اسے مذہبی اہمیت نہیں دیتے ۔ نماز جنازہ میں وہ اسلامی رسوم کی پابندی کر سکتے ہیں، لیکن اس کا اصلی رکن تبریک شیوخ ہے ۔ دیگر عقائد رکھنے والے شامیوں کی طرح وہ خضر [رک بآں] کے مقبرے اور دوسرے انبیا اور اولیا کے مزاروں کی زیارت کے لیے جاتے ہیں ۔ ان سب باتوں

کے باوجود جہّال تک بھی اپنے عقیدۂ توحید سے واقف ہیں اور آزادی کے ساتھ اس کی بابت گفتگو کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس خلق اور حشر و نشر کی بابت ایک ترقی یافتہ عقیدہ موجود ہے جس کی بنیاد عقّال کی تعلیم پر ہے۔ عرصۂ وجود میں ارواح کی تعداد معیّن ہے، اور موت کے بعد ہر روح ایک نیا جسم اختیار کر لیتی ہے (بشرطیکہ وہ کمال حاصل کرکے ستاروں کی دنیا میں نہ پہنچ جائے)؛ جو لوگ حمزہ کے زمانے میں ایمان لا چکے تھے ان کا دوسرا جنم دروز ہی کی شکل میں ہوگا، خواہ وہ شام میں ہو یا چین کی مفروضہ جماعت دروز میں۔ مختلف جنموں میں سے گزرنے سے ہر روح کی مکمل اخلاقی آزمائش ہو جاتی ہے (بعض جہّال یقین رکھتے ہیں کہ شریر لوگ گھٹیا جانوروں کا جنم لیتے ہیں)۔ انجام کار جب الحاکم اور حمزہ دوبارہ ظاہر ہوں گے اور تمام دنیا کو فتح کرکے اس میں عدل و انصاف کا دور قائم کریں گے تو وہ دروز جنھوں نے اپنا رویہ درست رکھا ہے سارے بنی نوع انسان پر فرمانروا ہوں گے۔ پھر جو سب سے اچھے ہوں گے، وہ خدا سے نزدیک ترین جگہ میں سکونت پذیر ہوں گے۔ یہ وہ خیال ہے جس کو عقّال، بہت سے اور خیالوں کی طرح، روحانی مفہوم میں لیتے ہیں۔

مآخذ: قانون دروز یورپ، امریکہ اور شام کے متعدد کتب خانوں میں مل سکتا ہے، اسی طرح دروز کی دیگر تصنیفات بھی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ "قانون" کا کچھ بیان اور اس کا کچھ ترجمہ (۱) Silvestre de Sacy کی اساسی تصنیف: *Exposé de la religion des Druzes*، ۲ جلدیں، پیرس ۱۸۳۸ء میں موجود ہے (کچھ اجزا کا ترجمہ از Philipp Wolff: *Die Drusen und ihre Vorläufer*، لائپزگ ۱۸۴۵ء)؛ نیز دیکھیے (۲) وہی مصنف: *Mémoire sur l'origine du culte que les Druzes rendent à la figure d'un veau*، در *Mémoires de l'institut royal, classe d'histoire*، ج ۳، ۱۸۱۸ء، ص ۷۴ ببعد؛ دروز کے کچھ اجزا اور ان پر حواشی: (۳) Silvestre de Sacy: *Chrestomathie arabe*، ج ۲، پیرس ۱۸۲۶ء میں موجود ہیں۔ دروز کی دیگر تصنیفات ذیل کی کتابوں میں طبع کی گئی ہیں: (۴) Christian Seybold: *Die Drusenschrift*: کتاب النقط والدوائر؛ (۵) N. L. Kirchhain: *Das Buch der Punkte und Kreise*، لائپزگ ۱۹۰۲ء؛ (۶) Henri Guys: *Théogonie des Druzes*، پیرس ۱۸۶۳ء؛ (۷) Martin Sprengling: *The Berlin Druze lexicon*، در *American Journal of Semitic Languages*، ۵۶ (۱۹۳۹ء): ۳۸۸ تا ۴۱۴ و ۵۷ (۱۹۴۰ء)، ۷۵ ببعد (جس میں دروز کے فلسفۂ کائنات کا بہت اچھا مطالعہ شامل ہے)؛ (۸) Rudolph Strothmann: *Drusen-Antwort auf Nuṣairī Angriff*، در *Isl*، ۲۵ (۱۹۳۹ء): ۲۶۹ تا ۲۸۱؛ (۹) Ernst von Döbeln: *Ein Traktat aus den Scriften der Drusen*، در *Monde Oriental*، ۳ (۱۹۰۹ء): ۸۹ تا ۱۲۶؛ (۱۰) J. Khalil و L. Ronzevalle: الرسالة القسطنطينية، *MFOB*، بیروت ۱۹۰۹ء، ۳: ۳۹۳ تا ۵۲۴۔ دروز کا عام طریقۂ تعلیم مع سوال و جواب مختلف صورتوں میں طبع اور ترجمہ کیا گیا ہے، دیکھیے (۱۱) Eichhorn: *Repertorium für morgenländische und biblische Literatur*، ج ۱۲ (۱۷۸۳ء)؛ (۱۲) Regnault: *Catéchisme à l'usage des Druses djahels*، در *Bull. de la Société de Géographie*، پیرس ۱۸۲۷ء، ۷: ۲۲ تا ۳۰۔ مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ذیل کی کتاب سب سے اہم عام مطالعہ ہے: (۱۳) Narcisse Bouron: *Les Druzes, histoire du Liban et de la Montagne haouranaise*، پیرس ۱۹۳۰ء۔ نیز کی کتاب بھی مفید ہے (۱۴) حنّا ابو راشد: جبل الدروز، قاہرہ ۱۹۲۵ء؛ (۱۵) Henri Guys: *La Nation druze, son histoire, sa religion, ses moeurs, et son état politique*، پیرس ۱۸۶۳ء، [illegible] ہے۔

سیاحوں میں سے جنھوں نے الدروز کی بابت لکھا ہے سب سے
بہتر (۱۶) Max von Oppenheim : *Vom Mittelmeer*
zum Persischen Golf، برلن ۱۸۹۹ء، ۱ : ۱۱۰ ببعد؛
ذیل کی کتاب بھی بڑی دلچسپ ہے (۱۷) W.B. Seabrook :
Adventures in Arabia، نیویارک ۱۹۲۷ء، باب ۹؛
دُرُوز کے جدید قانونی موقف کے لیے دیکھیے (۱۸) F. van
den Steen de Jehay : *De la situation légale des*
sujets ottomans non-musulmans، برسلز ۱۹۰۶ء؛
(۱۹) J. N. D. Anderson : *Personal law of the*
Druze community، در *WI*، ۱۹۵۲ء، ص ۱ ببعد،
۸۳ ببعد؛ مخطوطات کے اندراجات کے لیے خاص طور پر
دیکھیے (۲۰) Hans Wehr : *Zu den Schriften Hamzas*
im Drusenkanon، در *ZDMG*، ۹۶ (۱۹۴۲ء):
۱۸۷ تا ۲۰۷؛ نیز (۲۱) A.F.L. Beeston : *An ancient*
Druze manuscript، در *Bodleian Library Record*،
۵/۶ (اکتوبر ۱۹۵۶ء)؛ دیگر حوالوں کے لیے، بالخصوص
سیاحوں کی تحقیقات کے لیے، دیکھیے مآخذ، در Bourron
اور حواشی؛ در Philip K. Hitti : *The origins of the*
Druze People and religion، نیویارک ۱۹۲۸ء (جس میں
کچھ مترجم عبارات بھی شامل ہیں)؛ ان دونوں میں سے جو
معلوف نہیں وہ یہ ہیں (۲۲) F. Tournebize : *Les Druzes*،
در *Etudes des pères de la Compagnie de Jésus*،
۵ اکتوبر ۱۸۹۷ء؛ (۲۳) B. J. Taylor : *La Syrie, la*
Palestine, et la Judée، پیرس ۱۸۵۵ء، ص ۲۵ تا ۳۰؛
۷۶ تا ۸۳؛ (۲۴) Henri Aucapitaine : *Etude sur*
les Druzes، در *Nouvelles Annales des Voyages*، ج ۶،
فروری ۱۸۶۲ء؛ *Magasin pittoresque*، ۱۸۳۱ء،
ص ۳۶۷، و ۱۸۶۱ء، ص ۲۲۶؛ قدیم ترین زمانہ کے وقائع
نگاروں کے لیے دیکھیے (۲۵) Silvestre de Sacy : *Exposé*
(النّویری: نہایۃ الأرب)؛ (۲۶) محمد جعفری : النہج الطرائق؛
(۲۷) اَشمونین کا Severus : *Life of Patriarch*
Zechariah؛ (۲۸) ابن تغری بردی : النجوم الزاہرۃ (جس کی
بنیاد سبط ابن الجوزی کی مرآۃ الزمان پر ہے)؛ (۲۹) جرجس
المکین : تاریخ المسلمین ۔ مؤخر الذکر کی بنیاد یحیی الانطاکی
کے تکملہ Eutychius : *Scriptores Arabici* متن سلسلۂ سوم
۷/۲، طبع L. Cheikho و B. Carra de Vaux و H. Zayyat
بیروت ۱۹۰۹ء، ص ۲۲۰ ببعد پر ہے؛ نیز دیکھیے (۳۰)
ابن العَدیم : تاریخ حلب، ص ۳۲۳؛ (۳۱) M.G.S. Hodgson :
Al-Darazī and Hamza in the origin of the Druze
religion، در *JAOS*، ۸۲ (۱۹۶۲ء): ۵ تا ۲۰۔

(M. G. S. HODGSON)

(۲) عہد عثمانی

جب عثمانی اور مملوکی فوجیں ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں مَرج دابق پر صف آرا ہوئیں تو دروز دونوں جانب سے اس میں شریک ہوئے۔ ملک کے جنوبی حصے کے بُحتری مملوکوں کی طرف سے لڑے اور شُوف کے مَعْنی دمشق کے نائب غزالی کے ساتھ مل کر ترکوں کے مددگار بن گئے۔ ترکوں کے تحت دروز پر حکومت مقامی خاندانوں کے ذریعے عمل میں آتی تھی، جن میں سے آل تنوخ، مَعْنی (= بنو مَعْن)، بنو شہاب بالخصوص دونوں مؤخر الذکر، (جن کے شجرۂ نسب کے لیے دیکھیے Zambaur : ۱ : ۱۰۸ ببعد) سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ مَرج دابق کی جنگ میں بنو مَعْن کی قیادت امیر فخر الدین اوّل [ترک بان] کے ہاتھ میں تھی جس نے عین نازک وقت پر پہلو بدلا اور مملوکوں کے قانصُوہ الغوری سے دغا کر کے دمشق میں سلطان سلیم اول سے مل گیا۔ سلطان نے انعام میں اُسے جبل لبنان کے امیروں پر سردار اعلٰی بنا دیا اور آل تنوخ کی سیادت کو صَیدا اور صُور تک محدود کر دیا (Blau : *Zur Geschichte Syriens*، در *ZDMG*، ج ۸ (۱۸۵۴ء)، ص ۴۸۰ ببعد)۔ ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء میں بنو معن کی حکومت فخر الدین کے فرزند قور قماس کے ہاتھ آئی۔ ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں دُروز نے جب ترکوں پر حملے کیے تو قُور قماس

کی سرزنش کے لیے والی مصر ابراہیم پاشا فوج لے کر گیا۔ قُورقماز کے بیٹے امیر فخرالدین دوم [رک باں] نے سیف اُوغلو یوسف پاشا، والی طرابلس، کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ابتدا میں اُسے کچھ کامیابی نصیب ہوئی، مگر آخرکار اُسے الجبل کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا اور یہ اس وقت ہوا جب باغیوں کو ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں اس لڑائی میں جو قویوجی مراد پاشا اور جانبُلاط اُوغلو [رک بہ جانبلاط] کے درمیان ہوئی، شکست دے دی گئی۔ جانبُلاط اُوغلو کے خاندان کی اہمیت دروز میں اسی وقت سے شروع ہوئی۔ ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء اور ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء کے درمیان جب والی دمشق حافظ پاشا نے خشکی کی طرف سے اور قپودان پاشا اوکوز محمد پاشا نے سمندر کی جانب سے حملہ بول دیا تو دروز اتحاد ختم ہو گیا۔ فخرالدین نے ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء میں فلورنس کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور پھر ۳۰ رجب ۱۰۲۲ھ/ ۱۵ ستمبر ۱۶۱۳ء کو اس معاہدے کے تحت مدد لینے کے لیے وہ اٹلی گیا اور ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۸ء میں الجبل واپس پہنچا۔ اس کی غیر حاضری میں مَعْنی حکومت کو برقرار رکھا گیا، بالخصوص اس وجہ سے کہ اس کے جاسوس جو استانبول اور دمشق میں تھے، اسے عثمانی ترکوں کی جنگی کارروائیوں کے خطرے سے فوراً آگاہ کر دیتے تھے تاکہ ان کے مقابلے کے لیے تیاری کر لی جائے۔ اگرچہ ترک سلطان نے ایک فرمان کے مطابق، جو ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۵ء میں جاری کیا گیا، فخرالدین کو حلب سے، یروشلم تک دروز کا امیر تسلیم کر لیا تھا (حیدر، ۱ : ۷۱۵)، پھر بھی کوچک احمد پاشا، جسے مراد رابع نے دمشق کا والی بنا دیا تھا، فخرالدین کو ہمیشہ تنگ کرتا رہتا تھا۔ ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں دروز کو مغارۃ جَزِّیْن پر فیصلہ کن شکست دی گئی۔ امیر اور اس کے بچوں میں سے تین کو گرفتار کر کے استانبول روانہ کر دیا گیا جہاں حسین بے کے سوا سب قتل کر دیے گئے۔

فخرالدین کی موت پر مَعْنیوں کے عروج کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد قیسی یمنی تنازع شروع ہوا۔ فخرالدین، مَعْنیوں کے عروج سے پہلے کے آل تنوخ کے حکمران خاندان کی طرح ایک یمنی قبیلے کا فرد تھا (جو ترکوں میں اقلی (سفید) کے لقب سے مشہور تھا، بحالیکہ قیسی قزلی (سُرخ) کہلاتے تھے؛ قب فندقلیلی محمد آغا: تاریخ، استانبول ۱۹۲۸ء، ۱ : ۲۱۵؛ C. F. Volney؛ ۱ : ۳۴۳، حاشیہ ۱)۔ امیر مَلحم، جو ۱۰۴۵ھ/۱۶۲۵ء میں اس کا جانشین ہوا، قیسی قبیلے سے تھا اور اس کا مخالف امیر علی عَلَم الدین تھا، جو یمنیوں کا نمائندہ تھا۔ آپس کے تنازعات نے ترکیہ کو دخل اندازی کا موقع دیا؛ چنانچہ ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء میں حسن پاشا والی طرابلس نے ایسا ہی کیا۔ ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں امیر ملحم نے والی دمشق سے اتفاق کر کے اپنی حکومت صَفَد تک بڑھا لی۔ مَلحم نے ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں وفات پائی اور الجبل میں اس کا جانشین اس کا لڑکا امیر احمد ہوا، جو مَعْنیوں کا آخری فرمانروا تھا۔ اس کی وفات ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۷ء میں ہوئی۔ اس کے جانشین شہابی ہوئے، جو قیسی قبیلے کے تھے۔ شہابیوں کو امیر احمد نے پناہ دی تھی اور انھیں ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء میں کوپرولو فاضل احمد پاشا والی دمشق کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بنا پر والی دمشق نے طرابلس کے والی کی مدد سے مَعْنیوں اور شہابیوں کی متحدہ فوجوں کو کَسْرُوان پر شکست دی۔ بعد میں مَعْنی اور شہابی آپس میں لڑ بیٹھے اور مَعْنیوں نے ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں الفَلْفَل کے مقام پر فتح پائی جو دیرپا ثابت نہ ہوئی (ابن سَباطہ، صالح بن یحییٰ، ضمیمہ۔ ص ۲۳۷) بہر حال امیر احمد کی وفات کے بعد الجبل کا جو سردار اعلیٰ ترک حکام کی رضامندی سے چنا گیا، وہ راشیا کا شہابی امیر بشیر بن حسین تھا۔ یمنیوں نے قیسی خاندان کو ہٹانے کی ناکام کوشش کی، مثلاً فخرالدین ثانی کے بیٹے حسین نے دربار استانبول سے

اس بات کا انتظام کرا لیا کہ بشیر کو حَصْبَیا کے امیروں کے خاندان کے لڑکے حیدر کا جو بارہ سال کا تھا، قائم مقام امیر مقرر کر دیا جائے۔ آگے چل کر اس کے مقامی حمائتیوں نے بشیر کو زہر دے دیا۔ لیکن جب حیدر اپنے حق کی بنا پر امیر ہوا تو اس نے عین دارا کی لڑائی میں یمنیوں کو شکست فاش دی، جس سے الجبل کے جاگیرداری نظام کی ساری شکل بدل گئی۔ اس کے بعد شہابیوں کی سیادت میں، جنھوں نے کوشش کر کے دروزوں اور مارونیوں کی باہمی کشمکش کی روک تھام کی، جانْبلاط کی حکومت شُوف پر قائم ہوئی، ابواللَّمع نے مَتْن لے لیا اور شُوَیْفات میں یمنی قبیلے کے ارسلان خاندان کو تَنُّوق یمنیوں کے ساتھ شریک ہو کر حکومت کرنا پڑی۔ الجبل کو باہم ملائے رکھنے کے لیے شہابیوں کو ترک والیوں کی مدد کا سہارا لینا پڑا، جن کی دخل اندازی مقامی شیوخ کی تعداد میں اضافے کا باعث بنی؛ چنانچہ شیوخ کو امیر پر دباؤ ڈالنے کا موقع مل گیا۔ شیوخ خراج تو امیر ہی کو ادا کرتے تھے لیکن مجلس میں اس بات کا فیصلہ انھیں کے ہاتھ میں تھا کہ امن و امان برقرار رکھا جائے یا جنگ شروع کی جائے۔ امیر حیدر نے ۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۲ء میں شہابی دارالحکومت دَیرالقمر میں وفات پائی۔ اس سے پہلے ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۹ء میں وہ اپنے بیٹے مُلْحَم کو تخت پر بٹھا کر خود سلطنت سے دست بردار ہو چکا تھا۔ مُلْحَم کی حکومت ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء تک برقرار رہی۔ اس کے عہد حکومت میں بیروت کی بندرگاہ کو وہی اہمیت پھر حاصل ہو گئی جو فخرالدین کے وقت میں تھی اور وہ دَیرالقمر کے بعد شہابیوں کا دوسرا دارالحکومت بن گیا۔ الجبل میں عیسائیت کا عموماً غلبہ ہو گیا اور مُلْحَم کے بہت سے بچے رومن کیتھولک مذہب کے پیرو بنا لیے گئے۔ ملحم اور اس کے جانشین عموماً اس کوشش میں رہے کہ مقامی مسلمانوں اور عیسائیوں میں توازن قائم رہے، چنانچہ جب ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء میں یونانی بحری قزاقوں نے روسی جھنڈا لہراتے ہوئے بیروت پر حملہ کر دیا اور اس کا بدلہ لینے کے لیے مسلمانوں نے فرانسسکی خانقاہ پر حملہ کیا تو امیر کے حکم سے مسلمانوں کے دو سرغنے پھانسی دیے گئے۔

مُلْحَم کے بعد اس کے جانشین اس کے بھائی احمد (مؤرخ احمد الشہابی کا باپ) اور منصور ہوئے۔ اگرچہ صَیْدا کے ترک والی نعمان پاشا نے امارت کے لیے قاسم بن عمر کو نامزد کیا تھا، لیکن اسے اس رقبے پر قناعت کرنا پڑی جو جَزِین کے اردگرد تھا۔ قاسم نے ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء میں عیسائی ہو کر وفات پائی اور اس کا لڑکا بشیر بھی علانیہ عیسائی ہو گیا (Blau : کتاب مذکور، ص ۴۹۹؛ Lammens : La Syrie، بیروت ۱۹۲۱ء، ۲ : ۱۰۰ ببعد)۔ بہرحال مذہب کی یہ انفرادی تبدیلیاں دروز کی اکثریت کو اپنا مذہب برقرار رکھنے میں تو مانع نہ ہوئیں، البتہ یہ ایسا واقعہ تھا جس نے آئندہ کے لیے مشکلات کا بیج بو دیا۔ منصور کو درویش پاشا والی صیدا نے ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء میں معزول کر دیا اور اس کی جگہ امیر یوسف کو مامور کیا۔ ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں جب روسی بیڑے کو، جو Alexei Orlov کی زیر قیادت تھا، صَفَد اور عکّہ کے باغی حاکم ظاہر العمر نے اُکسایا کہ بیروت پر گولہ باری کرے تو منصور نے یہ کوشش کی کہ پچیس ہزار پیاسٹر دے کر صلح کر لے۔ اُدھر امیر یوسف نے ترکیہ سے کمک طلب کی، جس پر عثمان پاشا والی دمشق نے جزّار احمد پاشا کو روانہ کیا اور اس نے امیر یوسف کے نام پر بیروت پر قبضہ کر لیا۔ امیر یوسف اس ناپسندیدہ نائب حکمران کا چار ماہ تک محاصرہ کرنے کے بعد ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء میں اسے بیروت سے نکال دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں اس نے روسی بیڑے کو قبرص سے بلا کر اس سے مدد حاصل کی۔ بہرحال جزّار احمد صَیْدا اور عکّہ میں بیٹھے بیٹھے الجبل کے شہابیوں پر برابر اپنا دباؤ ڈالتا رہا۔ خراج کی ادائیگی اور مصر سے نپولین کے حملے کے

مقابلے میں ترکوں کی حکومت کے ساتھ وفاداری بھی بشیر ثانی کو اس دباؤ سے نجات نہ دلا سکی۔ اگرچہ یوسف ضیاء پاشا نے، جو نپولین کے خلاف لڑنے والی ترک افواج کا سپہ سالار تھا، بشیر کو الجبل کا حاکم تسلیم کر لیا تھا، پھر بھی جزّار احمد نے اس کو ان افواج کے ذریعے نکال دیا جن کے قائد امیر یوسف کے بیٹے حسین اور سعد الدین تھے اور جنھیں وہ بشیر کی جگہ تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ بشیر نے برطانیہ کے امیر البحر سڈنی سمتھ کی پناہ لی اور وہ اسے اپنے عَلَم بردار جہاز میں بٹھا کر العریش لے گیا اور کچھ دن بعد الجبل واپس لے آیا۔ جزّار احمد نے اس وقت اسی پر اکتفا کیا کہ بشیر کے بیٹوں کو بطور یرغمال اپنے پاس رکھے۔ ۱۸۰۴ء میں جزّار پاشا کے انتقال کے بعد دُروز پر دباؤ کم ہوگیا۔ ۱۸۱۰ء میں جب وہابی دمشق پر چڑھائی کرنے والے تھے تو وہاں کے والی یوسف پاشا نے سلیمان پاشا کی، جو عکّہ کا سنجاق بیگ تھا، مدد طلب کی۔ اس نے موقع ملتے ہی دروز کو دمشق بلا لیا۔ دروز نے یوسف کو وہاں سے نکال دینے پر اپنا زور صرف کیا اور پھر سلیمان پاشا کے جانشین عبداللہ پاشا نے انھیں بڑی مشکل سے وہاں سے ہٹا کر حوران میں دھکیلا۔ لیکن الجبل سے بشیر کی غیر حاضری نے اس قدر ناراضگی پھیلائی کہ عبداللہ پاشا اور والیِ دمشق شیوخ کو اُسے واپس لبنان واپس بلا لینے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد عبداللہ پاشا نے جب عکّہ میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی، تو بشیر اس کا حامی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر (عبداللہ پاشا) کے حریف شیخ جانبلاط نے عباس الشہابی کے امیر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب بشیر اور اس کے بیٹوں کو مصر کے محمد علی کی پناہ لینا پڑی۔ بہت دن نہ گزرنے پائے تھے کہ بشیر پھر واپس آیا اور ۱۸۲۵ء میں جانبلاط کو مختارہ کی لڑائی میں شکست دی اور اس کو قتل کر دیا۔ اگلے سال یونانی باغیوں کے جنگی بیڑے نے بیروت پر حملہ کر دیا، جس کی وجہ سے مقامی عیسائیوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کے دوران میں بہت سے عیسائی وطن چھوڑ کر الجبل چلے آئے۔ بشیر کے خلاف مسلمانوں کے جذبات اس پر اور بھی بھڑک اُٹھے کہ اس نے ملکی عیسائیوں کو الجبل میں بس جانے کی اجازت دی۔ ۱۸۲۰ء میں بشیر نے عبداللہ پاشا کی پھر مدد کی اور یہ اس لیے کہ نابلوس میں جو بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی تھی اُسے دبایا جائے۔ اس کے بعد اس نے ترکوں کے خلاف محمد علی کا ساتھ دیا اور ابراہیم پاشا کی فتوحات میں مدد دی۔

(C. M. Ṣhihabeddin Tekendağ)

۱۸۳۳ء کے معاہدۂ کُوتاھیہ کے بعد بشیر نے مصریوں کی مدد کرنے میں مقدور بھر کوشش کی اور اس کے بدلے میں لبنان کے لیے وسیع خود مختارانہ حکومت حاصل کر لی۔ مصری حکومت پہلے پہل تو خوب پسند کی گئی، بالخصوص اس وجہ سے کہ غیر مسلموں پر سے بعض ٹیکس اٹھا دیے گئے، لیکن جب ابراہیم پاشا نے آتشی اسلحہ کے ضبط کرنے کی کوشش کی اور دُروز کو فوجی خدمت کے لیے بلا لیا تو مشکلات رونما ہوئیں۔ ۱۸۳۵ء میں ابراہیم پاشا نے دَیرالقمر میں فوج متعین کر دی اور مقامی عیسائیوں سے ہتیار چھین کر جمع کرنا شروع کر دیے، مگر بعد میں اس کارروائی سے دروز کو مستثنی کر دیا۔ پھر ۱۸۳۷ء میں جب دُروز کو حَوران میں طلب کرنے کی کوشش شروع ہوئی تو دُروز نے بغاوت کر دی اور انتقاماً ابراہیم پاشا کے پیغام رسانوں کو قتل کر دیا۔ حکومت ترکیہ نے دُروز کو بھڑکانے کی کوشش کی اور ان کے لیے ہتیار بھجوائے۔ ابراہیم نے اس کا یہ بدلہ لیا کہ کُردوں کو اُکسایا اور ترکی جہازوں کے لیے شام کی بندرگاہیں بند کر دیں۔ لَجَا میں دُروزوں کی بغاوت پھوٹ پڑی، مگر بشیر نے اپنے بیت الدّین کے محل سے جہاں سے وہ مارونیوں پر اپنا گہرا اثر قائم رکھتا

تھا، کوشش کی کہ بغاوت حَوران سے لبنان تک نہ پھیلنے پائے، جس میں وہ کامیاب ہوا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ مصر کا مددگار فرانس ہے اور آخرکار مصریوں کی فتح ہو کر رہے گی۔ اُدھر جب ابراھیم پاشا نے پھر کوشش شروع کی کہ ہتیار ضبط کیے جائیں اور بیروت کی مصری فوجوں نے دیکھا کہ ان کا رسل و رسائل کا سلسلہ بند ہو گیا ہے تو لبنان میں عام بغاوت پھوٹ پڑی۔ اب کے اس میں ماروِنی بھی شامل تھے۔ ۱۴ اگست ۱۸۴۰ء کو برطانوی بحری افسر سر چارلس نیپیر Sir Charles Napier نے باغیوں کے ساتھ ربط و ضبط قائم کیا اور جب اس سے اگلے ماہ برطانیہ، آسٹریا اور ترکیہ کے جہاز باہم مل کر بیروت پر گولہ باری کر چکے تو اس کے بعد باغیوں کے لیے ہتیار مہیا کیے گئے۔ ابراھیم پاشا سے مدد پہنچنے کے انتظار میں بشیر دیرُالقمر میں ٹھہرا رہا، مگر مدد نہ پہنچی۔ آخر بشیر نے سلطان کی اطاعت منظور کر لی؛ سلطان کی فوجیں اس وقت شام کو دوبارہ فتح کرنے کی تیاری کر رہی تھیں اور یہ لنڈن کے معاھدہ کا نتیجہ تھا۔ بشیر کے ذاتی تحفظ کی ضمانت دی گئی، تاہم اسے حکومت سے علیحدہ کر کے اس کی جگہ اس کے ایک رشتہ دار بشیر قاسم مُلحَم کو بٹھا دیا گیا۔ مصر کے الجبل پر قابض ہو جانے سے ایک طرف تو وھاں کا جاگیرداری نظام درھم برھم ہو گیا اور دوسری جانب دروزوں اور مارونیوں کے درمیان مخالفت زور پکڑ گئی۔ بشیر قاسم کی حکومت کوئی ایک سال رھی۔ اسے صَیدا کے مشیر سلیم پاشا سے دب کر رھنا پڑا، جس کا دارالحکومت بدل کر بیروت کر دیا گیا تھا اور جس نے امیر کو صلاح مشورہ دینے کے لیے مختلف فرقوں کی ایک مجلس شوریٰ بنا دی تھی۔ ٹیکس کی اصلاح (مصریوں نے الجبل میں ٹیکس ۳۶۵۰ سے ۶۵۰۰ کیسوں (purses) تک بڑھا دیے اور پھر گھٹا کر ۳۵۰۰ کر دیے) اور معاوضے کے مسئلے پر فرقہ دارانہ ناچاقی پیدا ہو گئی۔ پہلا فساد بعقلین میں ہوا، جس کے بعد دیرُالقمر میں بہت سے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ کسی قدر امن اس وقت بحال ہوا جب دروزی بخت آزما شہاب اُلعریان کو، جو والی دمشق کی خدمت میں تھا، زبردستی زَحلہ سے دیرُالقمر بھیجا گیا۔ ان واقعات سے باھر بڑی چینی پھیل گئی اور غیر ممالک میں ترکی انتظام حکومت کی بابت بہت سی شکائتیں پیدا ہو گئیں۔ حکومت ترکیہ نے اس پر بشیر قاسم کو حکومت سے برطرف کر دیا اور الجبل کا انتظام براہ راست سر عسکر نُوری پاشا کے ھاتھ میں دے دیا، جس نے اپنی پیادہ فوج کے افسروں میں سے ایک افسر میر لِوا عمر پاشا کو امارت کی گدی پر بٹھا دیا۔ بیرونی ممالک کی پیہم ناراضگیوں نے مجبور کیا کہ کوئی قدم اٹھایا جائے۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء میں سلیم بے کو حالات کی چھان بین کے لیے بیروت بھیجا گیا، مگر اس نے یہ اطلاع بھیجی کہ حالت اطمینان بخش ہے اور یہ کہ یہاں کوئی دروز یا مارونی امیر مقرر کرنا ناممکن ہے۔ اس اطلاع پر باب عالی کے غیر ملکی سفیروں نے یقین نہیں کیا۔ اس دوران میں نئے حوادث کی اطلاع پہنچی، جس کے بعد اَسْعد مُخلص پاشا کو صَیدا کا مشیر مقرر کیا گیا اور اس کے بیروت پہنچ جانے کے بعد سر عسکر کے نصب العین کے پورے ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اسعد پاشا نے دو قائم مقام مقرر کیے: ایک بیت ابی اللّمع سے حیدر مارونی اور ایک بیت ارسلان سے میر احمد دروزی؛ علاوہ ازیں جُبَیل کے شمالی اضلاع کو الجبل سے الگ کر کے طرابلس میں شامل کر دیا۔ ۱۸۴۵ء میں اس سے بھی زیادہ شورشیں ہوئیں جب اسعد پاشا کی جگہ والیِ حلب وجیہی پاشا کو مقرر کیا گیا۔ ان خونریز حوادث میں وہ حملہ شامل تھا جو مارونیوں نے متن کے دُروز پر کیا اور وہ حملے بھی جو دُروز نے آبی اور سلیما کی خانقاھوں پر کیے، جنھیں آگ لگا دی گئی۔ اس کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر ان حوادث کے الزامات

لگائے جانے لگے ۔ فرانسیسیوں نے وجیہی پاشا پر الزام لگایا کہ وہ دروز کا طرفدار ہے ۔ خود فرانسیسیوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے مارونیوں کو بھڑکایا تھا۔ اس کے بعد ایک اور وفد وزیر خارجہ شکیب افندی کے تحت تحقیق حال کے لیے روانہ ہوا۔ شکیب افندی نے سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا کہ سارے ہتیار حکومت کے سپرد کر دیے جائیں ۔ اس حکم کی مخالفت کی گئی اور اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں ۔ جنوری ۱۸۴۶ء میں "فریق" (ڈویژنل جنرل) امین پاشا کو سفیر بنا کر بھیجا گیا ۔ اس نے جدید انتظام قائم کرنے میں شکیب افندی کی مدد کی اور جون ۱۸۴۶ء میں اس کے ساتھ ہی واپس چلا آیا۔ شکیب افندی کی اصلاحات میں قائم مقاموں کو رہنے دیا گیا جنھیں ایک مخلوط مجلس شوریٰ صلاح و مشورہ دیتی تھی اور جن گانووں میں ملی جلی آبادی تھی وہاں سے خاص نمایندے (وکیل) منتخب کیے گئے ۔ دونوں قائم مقاموں کا مشاہرہ ساڑھے بارہ ہزار پیاسٹر مقرر ہوا۔ ان کا تقرر اور برطرفی براہ راست سلطان کے ہاتھ میں تھی؛ نیز قرار پایا کہ سلطان اس ضمن میں صیدا کے مشیر کے مشورے سے فرمان صادر کرے گا۔ مجالس حکومت کو قضاء انتظامیہ اور مالیات کے اختیارات تفویض کیے گئے۔ اس طرح ۱۸۴۷ء کے اوائل میں انتظام کو پائیداری نصیب ہوئی، اگرچہ بعض شورہ پشت دروز سرداروں کو مملکت سے نکالنے میں ناکامی کی وجہ سے کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ دونوں فریقوں میں ٹیکسوں کو حصہ رسدی بانٹ دیا گیا : مارونیوں سے ۱۹۹۴ کیسے (purses) اور دروز سے ۱۵۰۶ کیسے ادا کرنے کو کہا گیا ۔

یہ امن و امان ۱۸۵۶ء تک قائم رہا ۔ ۱۸۵۶ء کے "خط ھمایوں" کی وجہ سے، جس میں غیرمسلم رعایا کے ساتھ مراعات کا وعدہ کیا گیا تھا، مسلمانوں اور عیسائیوں میں رقابت عام ہو گئی ۔ خرابیوں کی پہلی علامتیں ۱۸۵۹ء میں رونما ہوئیں ۔ دوسرے ھی سال دروز اور مارونی کھلم کھلا ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے ۔ اس پر خورشید پاشا نے دونوں قضاؤں کی درمیانی سرحد پر فوجیں متعین کر دیں، لیکن اس اقدام سے بھی ۱۸۶۰ء کا بڑا فساد نہ رک سکا ۔ ماہ مئی میں دروز نے متن کے چند گانووں پر حملہ کر دیا اور ان میں آگ لگا دی؛ جون میں ان کے ساتھ حوران کے دروز بھی آملے، جن کا قائد اسمعیل اطرش تھا (الجبل کے دروز کی قیادت بالخصوص سعید جانبلاط اور خطار احمد کے ہاتھ میں تھی)۔ صوبے کی مجلس عمومی نے فوج بھیجنے کے بارے میں والی کی تجویز مسترد کر دی۔ ادھر دروز نے حاصبیا کے قصر حکومت کے مدافعین کو مغلوب کر کے مقامی عیسائیوں کا قتل عام کر دیا۔ اسی نوع کی زیادتیوں کی اطلاع راشیا، بعلبک (جہاں آل حرفوش نے مقامی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا)، زحلہ اور دیرالقمر سے موصول ہوئی ۔ ان شورشوں کو دبانے کے لیے حکومت عثمانیہ نے وزیر خارجہ فواد پاشا کو روانہ کیا اور اس کو بوقت ضرورت مکمل اختیارات استعمال کرنے کی اجازت دی ۔ [اس کے پہنچتے ھی دمشق میں مقامی باشندوں اور عیسائیوں کے درمیان خونریز فسادات شروع ہو گئے، جن میں دروز اور بدویوں نے مقامی عوام کی مدد کی]۔ اس اثنا میں خورشید پاشا نے دروز اور مارونیوں کے درمیان عارضی طور پر لڑائی بند کرا دی تھی، جسے فواد پاشا نے پسند نہ کیا، اس وجہ سے کہ اس سے محکمہ قضا کی کارروائیوں میں خلل واقع ہوتا تھا، تاہم وہ اسے کھلم کھلا رد بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ خوف تھا کہ خونریزی پھر شروع ہو جائے گی ۔ اس موقع پر فرانس نے براہ راست دخل دیا اور پانچ ہزار فوج خشکی پر اتار دی اور رائے ظاہر کی کہ دروز کو الجبل سے بالکل نکال دیا جائے ۔ فواد پاشا نے کامیابی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور وہ اس طرح کہ دروز کے مجرم سرغنوں کے خلاف سختی کے ساتھ قدم اٹھایا، ان کا

پیچھا کر کے انھیں گرفتار کر لیا اور ان پر مختارہ میں فوجی عدالت کے سامنے مقدمہ چلا کر ان میں سے بعض کو سزاے موت کا حکم سنا دیا گیا ۔ اس نے دمشق میں بھی سخت تادیبی کارروائی کی اور وہاں کے والی احمد پاشا کو گرفتار کر کے استانبول بھیج دیا تاکہ اس کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے، اور خورشید پاشا کو بھی بیروت سے نکال دیا ۔ ان تدابیر کی بدولت اس کا امکان پیدا ہوگیا کہ الجبل سے فرانس کی فوجوں کو واپس بلا لیا جائے گا ۔ ۹ جون ۱۸۶۱ء کو ایک عہد نامے پر دستخط ہوے، جس کی رو سے الجبل کو بیروت اور دمشق کی ولایتوں سے مکمل طور پر الگ کر کے عیسائی "متصرف" کے تحت رکھ دیا گیا، مگر اس ایک عیسائی کے لیے ضلع سے باہر کا ہونا لازمی تھا ۔ اس متصرف کو مشورہ دینے کے لیے دونوں فرقوں میں سے ایک ایک وکیل لیا گیا ۔ مرکز میں ایک انتظامی مجلس مقرر کی گئی اور جدید قضاؤں میں بھی ایک ایک انتظامی مجلس بنا دی گئی؛ مخلوط پولیس کا ایک دستہ بھی مرتب کیا گیا ۔ غیرملکی سفارتوں کے اشارے سے ایک ارمن کیتھولک داؤد پاشا کو متصرف مقرر کیا گیا، جس نے یہ عہدہ پانچ سال تک سنبھالے رکھا ۔ اس کے بعد اس کی جگہ ایک عرب عیسائی فرانکو پاشا مقرر ہوا ۔ داؤد پاشا نے دُروز کے لیے بہت سے مدرسے کھولے ۔ اسی طرح ہی مارونی دیہات میں بھی مدارس جاری کیے ۔ دُروز اس کے جانشین کے عہد میں برابر ترقی کرتے رہے، لیکن حوران کے دُروز میں بدامنی جاری رہی؛ ان کے ساتھ لبنان سے بھاگے ہوئے لوگ بھی آ کر مل گئے اور اب جبل حوران کا نام جبل دُروز پڑ گیا ۔ یہاں دُروز پر خاندان اَطْرَش نے اقتدار حاصل کر لیا، اس لیے کہ ۱۸۶۰ء کے حوادث میں اسمٰعیل اَطْرَش نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ ۱۸۷۹ء میں اسمٰعیل کے فرزند ابراہیم نے سُوَیْداء پر حملہ کر دیا، جو جبل حوران کا دارالحکومت تھا ۔ جب دمشق کا والی اس کے خلاف تادیبی حملہ کرنے اٹھا تو دُروز نے بڑی سختی سے اس کا مقابلہ کیا؛ آخر ۱۸۸۰ء میں فریقین کے مابین ایک عارضی صلح نامہ طے ہو گیا ۔ جب ابراہیم کے فرزند شبلی کو عثمانی عہدے داروں نے دَرْعہ میں قید کر دیا، جس کا سبب بڑی حد تک اقتصادی اور معاشرتی ہنگاموں کا برپا ہونا تھا، تو ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا ۔ دُروز پھر کمر بستہ ہو گئے اور مجبوراً شبلی کو قید سے رہا کر دیا گیا ۔ شبلی کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، لیکن ۱۸۹۳ء میں دُروز نے شورش کر کے پھر اسے چھڑا لیا، اس سال وہ بنو فُخَر سے ساز باز کر کے اپنے پیرو کاروں کو قُبَیلہ رواله پر چڑھا لے گیا تھا ۔ ان آفتوں کے دوران بہت سے دروز خاندان جلاوطن کر کے آناطولی بھیج دیے گئے، لیکن بعد میں انھیں پھر وطن واپس آنے کی اجازت مل گئی اور اس کے ساتھ ہی دُروز کو فوجی خدمات کے لیے بھرتی کرنے کی تجاویز ترک کر دی گئیں ۔

اس تمام مدت کے دوران لبنان کے دُروز امن کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے، یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے شکایت کی کہ مارونیوں کی چیرہ دستی مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہے اور مطالبہ کیا کہ اگر مارونی اس بات میں کامیاب ہو جائیں کہ شوف کی قضا سے، جو تنہا بسنم قضا تھی، چار ناحیوں کو الگ کر دیا جائے تو مَتْن کے دس ہزار دُروز کے لیے ایک جداگانہ قضا بنا دی جائے ۔ ۱۹۰۸ء میں ترک نوجوانوں کے انقلاب کے بعد دُروز کے خلاف کارروائی سامی پاشا کے سپرد کر دی گئی ۔ سامی پاشا نے فوجی حکومت کے نفاذ کا اعلان کر دیا اور پھر دروز کے سرداروں کو دمشق بلا بھیجا، جہاں ان میں سے بہت سے قتل کر دیے گئے ۔ بایں ہمہ دروز کی مقاومت ۱۹۱۱ء تک جاری رہی ۔ جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو تمام معاہدات ختم ہو گئے،

ساتھ ھی لبنان کی خود مختاری بھی جاتی رھی اور اسمٰعیل حقی بے کو خود مختار "متصرف" بنا دیا گیا۔ اس کے بعد دُروز کے مطالبات بے محل ھو گئے۔ دوران جنگ میں جمال پاشا نے کچھ دُروز سرداروں کو بیت المقدس میں بطور "مہمان" رکھا۔ اسی جنگ کے زمانے میں دروز کا سردار یحیٰی الاطرش، جس پر جمال پاشا نے فرانسیسیوں کے ساتھ سازباز رکھنے کا الزام لگایا تھا (خاطرات، استانبول ۱۳۳۹ھ، ص ۱۷۹)، فوت ھو گیا اور اس کا فرزند سلیم اس کا جانشین ھوا۔ جمال پاشا نے اطرش خاندان کے دو افراد نسیب اور عبدالغفار کی خدمات کو سراھا، لیکن اس کا ایک تیسرا فرد سلطان، جس کے باپ کو سامی پاشا نے قتل کرا دیا تھا، ترکوں کا مخالف ھو گیا اور وہ پہلا دروز سردار تھا جو ۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو اتحادی فوجوں کے ساتھ دمشق میں داخل ھوا۔

(M. Tayyib Gökbilgin)

* **اَلدُّرُوع** : (= دِرعی)، ایک بڑا غافری قبیلہ، جس کے افراد زیادہ تر خانہ بدوش اِباضی [خوارج] ھیں، جو عُمان اور جنوب مشرقی عرب کے چٹیل میدان اور دامن کوہ میں بودوباش رکھتے ھیں۔ ان کا "دِیرَہ" وادی الصَّفا، نیز نَعیم میں آل بوشامس غافری اور الظّاھرہ میں بنو قَتَب کی اراضی سے شروع ھو کر میدانِ سیح الدروع کے آر پار جنوب مشرق کی طرف وادی حَلْفِین اور آل وَھِیْبَہ کے قبیلۂ ھناوی کے علاقے تک پھیلتا چلا گیا ھے۔ یہ علاقہ حمراء الدُّرُوع اور اندرون عُمان کے کوھستان سے منفصل حصّوں (جن میں عِزّ اور اِدَم کے گرد مرتکز غافری الجَنَبَہ کا شمال مغربی (گھرا ھوا علاقہ پایا جاتا ھے) سے لے کر جنوب میں العُقَف (الحِقف) کے ناھموار ضلع اور "جِدّۃ الحراسیس" کے چٹیل میدان تک اور جنوب مغرب میں الرُّبع الخالی [رَکَ بآن] کے صحرا تک پھیلا ھوا ھے؛ مؤخرالذکر کے زیریں سرحدی علاقے (العُوطاء) میں اُم السمیم کے سبخہ اور رملات (quicksands) شامل ھیں۔

قبیلے کا بڑا مرکز عِبری کے جنوب میں تقریبًا پندرہ کیلومیٹر کے فاصلے پر تَنْعم کا گاؤں ھے۔ یہ شیخ کے تحت قبیلہ المحامِید اور المقارِدہ کا "مقیز" (= موسم گرما گزارنے کا مقام؛ جمع مقایز) ھے جن کے تقریبًا ایک سو مستقل بسنے والے آدمی کھجوروں کے باغوں کی دیکھ بھال کرتے ھیں۔ المحامید اور الذّبنہ کے نخلستان، السُّلیف میں بھی ھیں، جو تنعم کے شمال مشرق اور عِبری کے جنوب مشرق میں ھے۔ علاوہ ازیں آل حامِد کے باغات عِبری میں بھی ھیں۔ دوسرے گروہ اپنے باغوں کے گرد گرما گزارتے ھیں جو المَعْمُور (الدروع کا معمور)، الحَیّ، قِل، مَلبری، بساہ، یَبرین، طَیِّبہ اور ادم میں ھیں۔

گو الدُّرُوع کا بڑا تجارتی مرکز عِبری ھے، مگر وہ دیگر اندرونی منڈیوں میں بھی آتے جاتے ھیں، جن میں نَزْوٰی، بَہلاء اور اَدَم کی منڈیاں شامل ھیں۔ کبھی کبھی وہ دُبَیّ تک نکل جاتے ھیں، جو خلیج فارس میں ھے بلکہ الخابُور اور مسقط تک بھی، جو خلیج عُمان میں ھیں، جا پہنچتے ھیں۔ ان کی خاص قابل فروخت چیزیں حسب ذیل ھیں: مویشی: اونٹ، بکریاں اور بھیڑیں؛ دستی مصنوعات: رسیاں، جہاز کی رسیاں، چٹائیاں (سِمَۃ، جمع سِمیم)، ٹوکرے وغیرہ، جو چھوٹی کھجور (palmetto) کی طرح کے سَعَف (پتوں؛ عمان میں اسے غضف کہتے ھیں) سے بنائے جاتے ھیں اور بھیڑ کی اُون کے قالین، جن کی نفاست میں الدُّرُوع کا آل حکمان سے مقابلہ رھتا ھے؛ چوبی پیداوار: لکڑی کا کوئلہ (سخام)، جو سَمُر اور غاف کو سلگا کر بنایا جاتا ھے۔ یہ درخت ان متعدد ندیوں کے ساتھ ساتھ اُگتے ھیں جو اس چٹیل میدان کو جنوب مغرب کی طرف قطع کرتی ھیں؛ معدنیات: گندھک، قارۃ الکِبریت سے نکلی ھوئی، جو جانوروں کی کھجلی دور کرنے اور بارود بنانے کے کام آتی ھے؛ نمک، جو قارۃ الکبریت، قارۃ المِلح اور نمک کی کانوں، جو اُم السُّمیم کے مشرق

کنارے پر واقع سبخہ سے حاصل ہوتا ہے۔

مشہور عمانی اونٹوں میں سے الدُّروع تین امتیازی نسلوں کی پرورش کرتا ہے: بنات عُصَیفر، بنات خَبار اور بنات حَمرہ۔ نمک کی کانوں میں شیوخ کی عام نگرانی میں کام ہوتا ہے، لیکن وہ ان کی ملکیت نہیں ہیں۔ بہترین نمک قارۃ الکبریت سے حاصل ہوتا ہے، جسے قارۃ العُرَیشہ بھی کہتے ہیں۔ ام السَّمیم کی سرحد پر کمتر خالص نمک کی کانوں میں سے (جہاں کھدائی زیادہ محفوظ ہے اور ان میں وہ مُہلک حوادث نہیں واقع ہوتے جو دونوں قاروں میں ہوتے ہیں) نمک کی سِلّیاں کاٹی جاتی ہیں، جو چار مل کر ایک اونٹ کا بار بنتی ہیں، اور جن سے حاصل شدہ منافع ایک سے لے کر دو ماریا تھیریسا Maria Theresa ڈالر کے درمیان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ قیمت گرمیوں میں زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس موسم میں کان کی کھدائی گرمی اور پانی سے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لیے قریب ترین دریا، مُوَیہ الرّاکہ اور الْعُبَیاہ اونٹوں کے ذریعے ایک دن سے زیادہ کی مسافت پر واقع ہے۔

چونکہ الدُّروع عام طور پر "الرّبع الخالی" کے وسیع ریتلے میدان سے بچتے ہیں، بنا بریں کوئی معقول وجہ نہیں کہ وہ ام السَّمیم سے گزر کر سفر کریں جس کی ریگ رواں میں، عوام کے بیانات کے مطابق، بے خبر مسافر، چرواہے اور لٹیرے اور ان کے جانور دھنس کر غائب ہو جاتے ہیں۔ "عیال خَرّمس" اور "المحامید" کے افراد کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے محفوظ راستوں سے واقف ہیں جو اس کے اندرونی مہلک میدان سے گزر کر شمال سے جنوب کی طرف جاتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ خود شاذ و نادر ہی اس کو قطع کرنے کی ہمت کرتے ہیں۔

قدرت نے انہیں جو ذرائع عطا کیے ہیں، ان سے تجارتی منافع کمانے کے باوجود الدّروع میں کوئی پیشہ ور سوداگر نہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک خانہ بدوش قبیلہ ہے۔ وہ دور دور تک دلیرانہ چھاپے مارنے میں مشہور ہیں اور قبائلی جنگوں میں حصہ لینے میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔

الدّروع کی اکثریت اباضی ہے، لیکن المقارنہ کا بڑا حصہ اور المحامید کے چھوٹے مگر حکمران گھرانے کے بیشتر لوگ سُنّی ہیں۔ اس قبیلے کی اصل معلوم نہیں۔ ان کے نام کی آل دِرع کے نام سے مماثلت، جو آل سعود کے رشتہ دار ہیں اور پہلے وادی حنیفہ میں رہتے تھے اور جن کے نام پر آل سعود کے پہلے دارالسلطنت کا نام الدرعیّہ رکھا گیا تھا، غالباً کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جنوبی عرب کی ایک مشہور عام روایت یہ ہے کہ الدّروع کی وہی اصل ہے جو قبیلہ المناھیل کی ہے، یعنی وہ بھی بنی (یا اہل) الظّنّہ سے ہیں۔ ان کے ناموں میں ماؤں کے نام کا ذکر پایا جاتا ہے، یعنی فلاں بن فُلانۃ؛ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے جنوبی الاصل ہونے کی علامت ہو۔

الدُّروع کے علاقے میں رہنے والے دیگر گروہوں میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ گروہ ہے جو العِفار (رَک بان) کے تقریباً چالیس افراد سے مل کر بنا ہے۔ قبیلۂ العِفار اصل میں مغربی ظُفار کے علاقۂ حَبرُوت سے آیا ہے اور وہیں ان کے اکثر لوگ اب تک رہتے ہیں۔ العِفار سُنّی اور ھناوی ہیں، مگر انہیں درعی اور دیگر غافری علاقوں میں اجنبیوں کی حفاظت اور رہنمائی کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔ ان کے سرداروں کی بہت قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ آل (یا عِیال) خُمَیس کو، جو وادی سَیفَم میں گھومتے رہتے ہیں اور حمراء الدّروع اور الجبل الاخضر کی وادیوں کے پڑوس میں رہتے ہیں اور جن کے مردوں کی تعداد کئی سو تک پہنچتی ہے، درعی الاصل بتایا جاتا ہے، مگر آج کل انہیں ایک جداگانہ قبیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ دیگر گروہ جو الدّروع سے نکلے ہیں، الشرقیہ اور باطنہ میں بود و باش رکھتے ہیں۔

سب سے بڑے شیخ کو التیمہ کہتے ہیں۔ اُن گروہوں یا فرقوں کے جو المعامید کے علاوہ ہیں سرداروں کو شیخ کا لقب دیا جاتا ہے، مگر ان کا عام طور پر لقب رشید (جمع رُشَداء) ہے۔

مآخذ: (۱) J. G. Lorimer: *Gazetteer of the Persian Gulf, 'Omān, and Central Arabia*، ج ۱، کلکتہ ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء؛ (۲) Admiralty: *A Handbook of Arabia*، ج ۱، لنڈن ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء؛ (۳) S.B. Miles: *The Countries and Tribes of the Persian Gulf*، ج ۲، لنڈن ۱۹۱۹ء؛ (۴) Wilfred Thesiger: *Across the Empty Quarter*، در GJ، ۱۱۱: ۱ تا ۳ شائع شدہ جولائی ۱۹۴۸ء، ص ۱ تا ۲۱؛ (۵) وہی مصنف: *Desert Borderlands of Oman*، در GJ، ۱۱۶: ۳ تا ۶، ۱۹۵۰ء، ۱۳۷ تا ۱۷۱؛ (۶) وہی مصنف: *Arabian Sands*، لنڈن اور نیویارک ۱۹۵۹ء؛ (۷) Arabian American Oil Company, Relations Department, Research Division: *Oman and the southern shore of the Persian Gulf*، قاہرہ ۱۹۵۲ء (انگریزی اور عربی میں)۔

(C. D. MATTHEWS)

⊛ **دَرْوِیش:** [(ف)۔ اس لفظ کی اصل کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک دَر + وش یا واش یا وش = گداگر: دروازوں پر جانے والا؛ بھیک مانگنے والا۔ بعض اسے دَر آویز قرار دے کر مخفف دَرویز اور پھر مبدل بہ درویش بمعنی دریوزہ گر کہتے ہیں۔ فرہنگ انند راج کی رو سے درویش دَریوش کا جزوی قلب ہے جو دریوز (= گدائی) میں مبدل ہوا۔ غیاث اللغات کی رو سے دُرْوِش م موتی کی طرح کا = خدا رسیدہ آدمی، لیکن اس توجیہ کی کوئی سند نہیں دی۔

بہرحال درویش کی اصل کچھ بھی ہو، کسی وجہ سے درویش میں با خدا آدمی ہونے اور بے نیاز یا بے برگ و نوا ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کا اطلاق وضع و عادات پر بھی ہوتا ہے۔ سعدی نے لکھا ہے:

حاجت بہ کلاہ برکی داشتنت نیست
درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

یہ لفظ فارسی کے علاوہ ترکی اور اردو میں بھی تقریبًا انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے مگر تاریخ کے ایک خاص مرحلے میں درویش اور گدا ہم معنی الفاظ ہو کر رہ جاتے ہیں، جس طرح عربی لفظ فقیر (ج فقرا) گداگر اور بے نوا کے معنوں میں عام طور سے استعمال ہو رہا ہے۔

عمومًا درویش کسی سلسلۂ طریقت سے متعلق کسی ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے جو کسی شیخ کے زیر تربیت، کسی خانقاہ یا تکیے سے متوسل ہو۔ الجزائر اور مراکش میں اسی وسیع تر مفہوم میں "اخوان" استعمال ہوتا ہے۔ اس کے لیے مزید معلومات کے لیے رک بہ تصوف، طریقہ، فقر۔

مآخذ: متن میں آ گئے ہیں۔ نیز مقالہ درویش در لائڈن جدید۔

[ادارہ]

* **درویش پاشا:** (۱۰۱۲ھ/۱۹۰۳ء؟)، جس کا ذکر مؤرخ پیچوی نے درویش حسن پاشا کے نام سے کیا ہے (۲: ۱۳۲)، ہرزیگووینا کے موضع موسٹر Mostar میں پیدا ہوا اور ترک سلطان سلیم ثانی (۹۷۴ھ تا ۹۸۲ھ/۱۵۶۶ تا ۱۵۷۴ء) کے زمانے میں قصر شاہی کی ملازمت میں داخل ہوا اور وہاں دوران تعلیم میں ادب و شعر سے اس کے شغف اور لیاقت کا اظہار ہوا۔ سلطان مراد ثالث کے عہد (۹۸۲ تا ۱۰۰۳ھ/۱۵۷۴ تا ۱۵۹۵ء) میں وہ شاہی بازدار (طوغانجی) مقرر ہوا اور اس نے سلطان کی خدمت میں قصیدے اور غزلیں پیش کر کے اس کا قرب حاصل کیا۔ مراد ثالث ہی کے حکم سے اس نے شاعر بنائی کے شاھنامہ کا فارسی نظم سے ترکی نظم میں ترجمہ کیا اور اس کا نام مراد نامہ رکھا۔ درویش آغا ترقی پا کر طوغانجی باشی

بن گیا، اور پیچوی کے بیان کے مطابق (۲ : ۱۳۲) سلطان کے قپو کتخدا کے طور پر خدمات انجام دیں۔ پیچوی (موضع مذکور) اسے ایک پختہ کار شاعر (شاعر متین) کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ اسے ذاتی اوصاف حمیدہ اور علم میں بڑے سے بڑے عالم کا ہم پلہ کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ محمد ثالث کے عہد (۱۰۰۳ تا ۱۰۱۲ھ/۱۵۹۵ تا ۱۶۰۳ء) تک محل شاہی کی خدمت میں رہا ہو۔ ۱۰۰۱ تا ۱۰۱۵ھ/۱۵۹۳ تا ۱۶۰۶ء کے دوران میں جب آسٹریا کے ہیپس برگز (Hapsburgs) اور ترکوں میں جنگ ہو رہی تھی، درویش پاشا کو ۱۰۰۷ھ/ ۱۵۹۹ء میں ہنگری کے قلعہ استونی بلگراڈ Istoni Belgrad (Stuhlweissenburg) کے بچاؤ کا حکم دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں وہ بوسنہ کا بیگلر بیگ تھا۔ درویش پاشا نے بوسنہ کے بیگلر بیگ ہی کی حیثیت سے ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۲ء میں قلعہ استونی بلگراڈ کے دوبارہ فتح کرنے میں ترکوں کی مدد کی، جسے شاہی فوجوں نے ایک سال پہلے ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۱ء میں فتح کر لیا تھا۔ ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۲ء میں اسے بوسنہ کی بیگلر بیگی سے علیحدہ کر دیا اور یہ عہدہ دلی حسن پاشا کو دے دیا گیا جو اس وقت تک ایشیاے کوچک میں جلالی باغیوں کا ایک قائد تھا۔ درویش پاشا ہنگری کے محاذ پر متعین رہا اور ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء کی جنگ میں لڑا، لیکن ۴ صفر ۱۰۱۲ھ/۱۴ جولائی ۱۶۰۳ء کو پسٹ (Pest) کے قریب لڑائی میں مارا گیا۔

مآخذ : (۱) پیچوی : تاریخ، استانبول ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۳ھ، ۲ : ۱۳۲، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۷۱ بعد؛ (۲) حاجی خلیفہ : فذلکہ، استانبول ۱۲۸۶ تا ۱۲۸۷ھ، ۱ : ۱۲۶، ۱۲۹، ۱۹۸؛ (۳) نعیما : تاریخ، استانبول ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۳ھ، ۱ : ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۹۸، ۳۳۰، ۳۳۱؛ (۴) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ج ۶، استانبول ۱۳۱۸ھ، ص ۱۱۲ بعد؛ (۵) ہیمر پرگشٹال Hammer-Purgstall : *Histoire*، ۷ : ۵۵۷ و ۸ : ۳۵؛ (۶) *Wissenschaftliche Mittheilungen aus Bosnien und der Hercegovina*، ج ۱، ویانا ۱۸۹۳ء، ص ۵۱۱؛ (۷) سجلِ عثمانی، ۲ : ۳۲۹؛ (۸) سعد الدین نزہت ارگون Sâdeddin Nüzhet Ergun : *Türk Şâirleri*، ۳ : ۱۱۷۲ بعد؛ (۹) *İA*، بذیل مادّہ درویش پاشا (M. Cavid Baysun).

(V. J. Parry)

درویش پاشا : (۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ء؟) ترکی

وزیر اعظم، جو بوسنہ کا رہنے والا تھا۔ وہ بستانجیوں کی فوجی پلٹن میں ملازم رہا اور اس پلٹن کا کتخدا ہوا اور پھر والدہ سلطان کی توجہ سے ۱۰۱۳ھ/ ۱۶۰۴ء میں بستانجی باشی بنا دیا گیا۔ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں جب احمد اول بورسہ گیا تو درویش پاشا کو استانبول کا نظم ونسق درویش پاشا کے سپرد کر گیا۔ رمضان ۱۰۱۴ھ/جنوری ۱۶۰۶ء میں اسے وزیر کا درجہ دے کر قپودان پاشا بنا دیا گیا، اور صفر ۱۰۱۵ھ/جون ۱۶۰۶ء میں وہ وزیر اعظم ہو گیا۔ لیکن وہ اس عہدے پر بہت کم مدت رہ سکا، اس لیے کہ اتنی تیزی سے وزیر اعظم کے منصب تک پہنچنے کے دوران میں اس نے جن بہت سے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا انھوں نے سلطان کو اس کی طرف سے اس قدر بد گمان کر دیا کہ اس نے شعبان ۱۰۱۵ھ/دسمبر ۱۶۰۶ء میں اسے قتل کروا دیا۔ ترکی وقائع نگار درویش پاشا کو تند مزاج، بے انصاف اور نا اہل شخص بتاتے ہیں، لیکن استانبول کا انگریزی سفیر للّو Lello اس کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ اُن تمام وزراے اعظم میں جن سے میں واقف ہوں سب سے "زیادہ صاحب عزم اور ماہر سیاست" تھا۔

مآخذ : (۱) پیچوی Peçewi : تاریخ، استانبول ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۳ھ، ۲ : ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۱۶، ۳۱۹، ۳۲۲، ۳۲۴ تا ۳۲۹، ۳۵۴؛ (۲) حاجی خلیفہ : فذلکہ، استانبول ۱۲۸۶ - ۱۲۸۷ھ، ۱ : ۲۵۱، ۲۷۱، ۲۷۵ تا ۲۸۲، ۲۸۸؛

(۳) نعیما: تاریخ، استانبول ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۳ھ، ۱ : ۳۰۷، ۳۳۴، ۳۴۱ تا ۳۵۴ بمواضع کثیرہ اور ۲ : ۱۵۷؛ (۴) The Report of Lello, Third English Ambassador to the Sublime Porte، طبع O. Burian (Ankara Üniversites Dil ve Tarih-Coğrafya Fakültesi Yayinlari عدد ۸۳)، انقرہ ۱۹۵۲ء، ص ۲۳ تا ۲۷، ۲۹ تا ۳۲؛ (۵) *Ambassade de Jean de Gontaut Biron. Correspondance Diplomatique et Documents Inédits 1605-1616*، طبع Comte Thédore de Gontaut Biron، در *Archives historiques de la Gascogne*، کراسہ ۱۹، پیرس ۱۸۸۹ء، ص ۶، ۷، ۲۱، ۲۵ تا ۲۸، ۳۳، ۵۰، ۵۱، ۵۵، ۵۷، ۶۰، ۶۳، ۶۶، ۷۱، ۷۸ تا ۸۳، بمواضع کثیرہ، ۸۸، ۹۰، ۹۲ تا ۱۱۰ بمواضع کثیرہ، ۱۲۷؛ (۶) Hammer-Purgstall: *Histoire*، ۸ : ۶۸، ۹۳، ۹۵ تا ۱۰۳، بمواضع کثیرہ، ۱۸۲؛ (۷) آئی - ایچ - اوزون چارشیلی: *Osmanlı Tarihi* (Türk Tarih Kurumu Yayınlarından، سلسلہ شمارہ ۱۶/۲)، ج ۱۳، ج ۳، لوحہ ۲، ص ۳۶۲ تا ۳۶۳؛ (۸) عثمان زادہ تائب: حدیقۃ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۵۳ ببعد؛ (۹) سجل عثمانی، ۲ : ۳۲۹؛ (۱۰) سامی: قاموس الاعلام، ج ۳، استانبول ۱۳۰۸ھ، ص ۲۱۲۶؛ (۱۱) *IA*، بذیل مادۂ درویش پاشا (M. Cavid Baysun).

(V. J. PARRY)

* **درویش محمد پاشا**: (تقریباً ۹۹۳؟ تا ۱۰۶۵ھ/۱۵۸۵؟ تا ۱۶۵۵ء)، ترکی وزیراعظم جو اصل کے اعتبار سے چرکس (Citcassian) تھا۔ سلطان مراد رابع (۱۰۳۲ تا ۱۰۴۹ھ/۱۶۲۳ تا ۱۶۴۰ء) کے وزیراعظم طبانی یسّی محمد پاشا (۱۰۴۱ تا ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۲ تا ۱۶۳۷ء) کے کتخدا کی حیثیت سے اس نے ۱۰۴۴-۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں اریوان کی جنگی مہم میں، جو ایران کے صفویوں کے خلاف تھی، حصہ لیا اور اس کے بعد شام کا بیگلر بیگ ہو گیا، اور ابن جمعہ کے بیان کے مطابق ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ - ۱۶۳۷ء تک اس منصب پر فائز رہا۔ جب مراد رابع نے ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں بغداد پر چڑھائی کی تو وہ دیار بکر کا بیگلر بیگ تھا، لیکن ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں بغداد کا بیگلر بیگ ہو گیا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد وزیر بنا دیا گیا۔ درویش محمد پاشا بغداد میں تین سال رہا۔ اس کے بعد کے زمانے میں وہ حلب، آندلو [آناطولی]، سلیستریا اور بوسنہ کا بیگلر بیگ رہا۔ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں جب درویش پاشا کو دوسری بار سلیستریا میں تعینات کیا گیا تو ایک اور خدمت بھی اس کے سپرد کی گئی، یعنی اسے چناق قلعۂ بوغازی (درۂ دانیال) کی بڑی مدافعانہ فوج کا افسر اعلی بنا دیا گیا تاکہ وہ وینس کی بحری فوج کو بوغاز سے ہٹا دے، جس نے ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں شروع ہونے والی کریٹ [اقریطش] کی جنگ میں اس وقت تک درۂ دانیال کو بند کر رکھا تھا۔ درویش محمد پاشا نے یہ مہم جمادی الاولی/مئی ۱۶۴۹ء میں کامیابی کے ساتھ سر کی۔ اس کے بعد ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء میں وہ دوبارہ اندلو کا بیگلر بیگ مقرر ہوا اور اس وقت بورسہ کی حفاظت کا کام بھی اس کے سپرد ہوا جسے ایشیائے کوچک کے جلالی باغیوں کی تاخت کا خطرہ درپیش تھا۔ دورویش محمد پاشا ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء میں قپودان پاشا بنایا گیا اور پھر ربیع الاول ۱۰۶۳ھ/مارچ ۱۶۵۳ء میں وزیر اعظم مقرر ہوا اور ذوالحجہ ۱۰۶۴ھ/اکتوبر ۱۶۵۴ء تک اس منصب پر فائز رہا، اور اسی سال فالج میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے اس عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ درویش محمد پاشا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام ترک اکابر میں سب سے زیادہ دولتمند تھا۔ اس نے ۵ ربیع الاول ۱۰۶۵ھ/۱۳ جنوری ۱۶۵۵ء کو وفات پائی اور استانبول میں چنبرلی طاش کے مقام پر عتیق علی پاشا کی مسجد سے ملحقہ مقبرے میں دفن ہوا۔

مآخذ: (۱) پیچوی: تاریخ، استانبول ۱۲۸۱ تا

۱۲۸۸ھ، ص ۲۰۷؛ (۲) عبدالعزیز قراچہ لبی زادہ: روضۃ الابرار، استانبول ۱۲۴۸ھ، ص ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۳؛ (۳) حاجی خلیفہ: فذلکہ، استانبول ۱۲۸۶ - ۱۲۸۷ھ، ۲: ۱۶۷، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۷ تا ۲۰۱ و بمواضع کثیرہ، ۲۰۵، ۲۱۵ تا ۲۱۸ بمواضع کثیرہ، ۳۳۵، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۸۱، ۳۸۵ تا ۳۹۷؛ (۴) نعیما: تاریخ، استانبول ۱۲۸۱ تا ۱۲۸۳ھ، ۳: ۲۳۳، ۲۹۲، ۲۹۵، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۶۰، ۲۶۷، ۲۸۰، ۳۲۰، ۳۲۹، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳ تا ۳۳۴، ۴: ۱۱، ۴۳، ۱۰۸، ۲۲۴، ۲۲۶، ۳۸۰، ۳۸۵، ۳۸۹، ۳۹۰، ۵: ۱۵۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۲۰۸، ۲۵۵، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۸۳ و بعد، بمواضع کثیرہ، ۳۰۳، ۳۱۳، ۳۲۵، ۳۹۶ و بعد، ۴۳۱ تا ۴۴۴؛ اور ۶: ۲۲ تا ۲۹؛ (۵) Hammer-Purgstall، *Histoire*، ۹: ۲۲۳، ۲۱۵، ۲۵۶، ۲۵۹، ۳۶۲، اور ۱۰: ۳۳، ۱۳۱، ۲۱۴، ۲۱۸، ۳۰۳، ۳۰۵، ۳۲۲ تا ۳۳۳ بمواضع کثیرہ، ۳۴۱، ۳۴۷ تا ۳۵۲ بمواضع کثیرہ، ۳۵۷، ۳۹۰، ۳۹۱؛ (۶) S. H. Longrigg: *Four centuries of modern Iraq*، اوکسفرڈ ۱۹۲۵ء، ص ۸۲، ۱۰۹؛ (۷) H. Laoust: *Les Gouverneurs de Damas sous les Mamlouks et les premiers Ottomans (658-1156/1260-1744). Traduction des Annales d'Ibn Ṭūlūn et d'Ibn Ǧum'a* (Institut Français de Damas)، دمشق ۱۹۵۲ء، ص ۲۰۶؛ (۸) آئی۔ ایچ۔ اوزون چارشیلی I.H. Uzunçarşılı: *Osmanlı Tarihi* (Türk Tarih Kurumu Yayınlarından، سلسلہ ۱۳، عدد ۱۶)، ۴/۲، انقرہ ۱۹۵۶ء، ص ۶۰۳ تا ۶۰۸؛ (۹) عثمان زادہ تائب: حدیقۃ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۹۸ و بعد؛ (۱۰) سجل عثمانی، ۲: ۳۳۱؛ (۱۱) سامی: قاموس الاعلام، ج ۳، استانبول ۱۳۰۸ھ، ص ۲۱۲۸؛ (۱۲) *İA*، بذیل مادہ درویش محمد پاشا (M. Cavid Baysun).

(V. J. PARRY)

*** درویش محمد پاشا :** (۱۱۳۲ تا ۱۱۹۱ھ/۱۷۲۰ تا ۱۷۷۷ء)، ترکی وزیراعظم، باغچجی (روغنی کپڑے کا سوداگر) قدری آغا کا فرزند، ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں استانبول میں پیدا ہوا (یہ کہنا کہ وہ ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳-۱۷۳۴ء میں پیدا ہوا، غالباً صحیح نہیں)۔ درویش محمد افندی سرکاری ملازمت میں دفتر دار (خزانچی) بہجت افندی کے معاون مہر بردار کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اس کے بعد وہ علی الترتیب نائلی عبداللہ پاشا، سلاحدار علی پاشا اور معید محمد پاشا کا دوات دار (سیکرٹری یا مہتمم اخراجات) رہا۔ پھر ترقی پا کر دفتر دار کیسہ داری (خزانے کی نقدی کا ذمے دار) ہوا اور پھر ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ء کی فوجی مہم کے دوران میں محرر مالیہ (مالیہ تذکرہ جیسی) ہو گیا۔ ۲۲ ذوالقعدہ ۱۱۸۵ھ/۲۹ فروری ۱۷۷۲ء کو جب فوج نے شمنو (Shumen) میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا تو اسے فوج کے پہلے ڈویژن (شق) کا دفتر دار مقرر کیا گیا۔ اگرچہ جب فوج استانبول واپس آئی، وہ اس عہدے سے دست بردار ہو گیا، لیکن ۹ رمضان ۱۱۸۸ھ/۲۵ نومبر ۱۷۷۴ء کو اسے پھر اسی عہدے پر متعین کر دیا گیا۔ ۳ صفر ۱۱۸۹ھ/ ۵ اپریل ۱۷۷۵ء کو وہ وزیراعظم کا مہتمم خرچ (کتخدا) مقرر ہوا اور بالآخر ۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۹ھ/ ۶ جولائی ۱۷۷۵ء کو اسے وزیراعظم بنا دیا گیا۔

کوچوک قینارجہ کے صلح نامے کے بعد جو زمانہ آیا، اس میں اس نے وہ سب اقتدار حاصل کر لیا جو [سلطان] عبدالحمید اوّل اپنے وزراے اعظم کو دینے کا عادی تھا اور بجاے اس نقصان کی تلافی کی کوشش کرنے کے، جو سلطنت کو جنگ کے زمانے میں پہنچا تھا اپنے ذاتی عیش اور آسایش کے حصول میں مصروف ہو گیا۔ مملکت کے معاملات کی طرف سے اس کی بے توجہی اور اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسے ۸ ذوالقعدہ ۱۱۹۰ھ/۱۹ دسمبر ۱۷۷۶ء کو وزیراعظم کے عہدے سے معزول کر دیا گیا اور جلاوطن کر کے گیلی پولی بھیج دیا گیا، لیکن ۲ محرم ۱۱۹۱ھ/

۱۰ فروری ۱۷۷۷ء کو اُسے خانیۂ Canea (در اقریطش) کا والی مقرر کر دیا گیا، مگر وہ اپنے بحری سفر کے دوران میں بیمار پڑ گیا اور اس نے ساقز (Chios) میں وفات پائی اور ابراهیم پاشا کی مسجد میں دفن کر دیا گیا ۔ درویش محمد پاشا خاموش طبیعت کا آدمی تھا اور گو اس کی ملکی خدمات ایسی نہیں کہ انھیں قابل اعتنا سمجھا جائے تاهم اس نے استانبول (اضلاع ایوب اور اسکودار)، بُرسہ اور مصر میں کچھ دینی عمارتیں تعمیر کرائیں یا ان کی مرمت کرائی ۔ اس بات سے کہ یہ سب عمارتیں تکیے (خانقاهیں) هیں یہ ظاهر هوتا هے کہ اس کا میلان صوفیوں کی طرف تھا .

مآخذ : (۱) واصف: تاریخ (استانبول ۱۲۱۹ھ)، ۲: ۱۹۷ ببعد؛ (۲) جودت پاشا: تاریخ (استانبول ۱۳۰۹ھ)، ۲: ۱۱، ۲۳، ۹۳ ببعد، ۷۰ و ۳: ۲۴۶؛ (۳) احمد جاوید: ملحقات حدیقة الوزراء (جو حدیقة الوزراء کے ساتھ طبع کی گئی)، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۲۷ ببعد .

(زز، ترکی)

* **درویش محمد پاشا :** (۱۱۷۸ھ/۱۷۶۵ء تا ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) ترکی وزیراعظم، رستم آغا کا فرزند، جو موره (Peloponesus) کے موضع اناپولی (Nauplion) کا رهنے والا تھا ۔ اس نے وزیراعظم احمد پاشا کے (جو در اصل خود بھی موره هی کا باشندہ تھا) مُهردار کی حیثیت سے تربیت پائی اور پھر اس کی توجہ سے میر میران (پاشا درجہ دوم) اور سنجاق بای مقرر هوا ۔ آگے چل کر وہ حمید کی لواء کا محصّل اور ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں خداوندگار، ایکی شِہر اور قوجہ ایلی کا مُتصرّف (وزیر یا پاشا کے منصب کے ساتھ) مقرر هوا ۔ مملکت کا سب سے زیادہ با اثر عہدیدار حالت افندی اس وقت یہ چاهتا تھا کہ وزیراعظم کوئی کمزور شخص هو۔ اس نے سلطان محمود ثانی کو مشورہ دیا کہ درویش محمد پاشا کو وزیراعظم بنا دے، چنانچہ ۲۷ صفر ۱۲۳۳ھ/۶ جنوری ۱۸۱۸ء کو اُسے وزیراعظم مقرر کر دیا گیا ۔ دو سال تک وہ اس عہدے پر فائز رها، لیکن اس مدت میں وہ کوئی اثر و اقتدار قائم نہ کر سکا، یہاں تک کہ استانبول میں امن و امان قائم کرنے میں بھی ناکام رها، اس لیے کہ وہ مُفسد سرغنوں کے ساتھ سختی کرنے کی بجائے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رها ۔ اگرچہ اس کا یہ طرز عمل اعلی عہدے داروں اور خصوصاً حالت افندی کے منشا کے عین مطابق تھا، لیکن سلطان نے اس کی کمزوری کا اندازہ لگا لیا ۔ بایں همہ عہدے کا وقار برقرار رکھنے کے لیے اُسے کچھ دن تک اس کے منصب پر برقرار رکھا گیا، لیکن بالآخر ۱۹ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ/۵ جنوری ۱۸۲۰ء کو اُسے معزول کرکے گیلی پولی میں جلاوطن کر دیا گیا ۔ اس کے باوجود ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۳۶ھ/۱۶ جنوری ۱۸۲۱ء کو اسے دمشق کا والی مقرر کیا گیا اور نابلس کی لواء کے انتظام کے ساتھ ساتھ امیرالحج کے فرائض بھی اس کے سپرد کر دیے گئے ۔ اسی حیثیت سے اس نے صیدا (Sidon) کے والی عبداللہ پاشا سے جنگ کی اور باب عالی کے حکم سے اُسے عکّہ (Acre) میں محصور کر لیا، لیکن اس کے بعد جب عبداللہ پاشا کو معاف کر دیا گیا تو درویش محمد پاشا کو بدل کر آناطولی کی ایالت (صوبے) میں بھیج دیا گیا، جہاں اس کے داماد حمدی بے کے ظالمانہ طرز عمل کی وجہ سے کوتاهیہ (Cotyleaum) کے لوگوں کو شکایات پیدا هو گئیں ۔ اس پر درویش محمد پاشا کو معزول کر دیا گیا اور اس سے وزیر کا عہدہ چھین کر اُسے افیون قرہ حصار میں جلاوطن کر دیا گیا، جہاں سے اس کی درخواست پر اُسے بُرسہ بھیج دیا گیا ۔ ربیع الاول ۱۲۵۳ھ/ جون ۱۸۳۷ء میں اُسے شیخ الحرم (والی مدینہ) مقرر کیا گیا، لیکن وهاں جاتے هوے اسی سال رمضان/دسمبر میں ینبُع مقام پر اس نے وفات پائی .

درویش محمد پاشا کمزور اور نرم دل آدمی تھا اور ترکی وزراے اعظم میں اُسے [illegible] اثر وزیراعظم

بتایا جاتا ہے۔ برسہ اور استانبول میں بعض دینی کام اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔

مآخذ : (۱) شانی زادہ عطا اللہ افندی : تاریخ (استانبول ۱۲۹۰ - ۱۲۹۱ھ)، ۲ : ۳۰۳، ۳۳۱، ۳۵۶ ببعد و ۳ : ۸۸ ببعد، ۹۴۱ ؛ (۲) جودت پاشا : تاریخ (استانبول ۱۳۰۱ھ)، ۱۱ : ۳۸، ۴۲، ۸۰ و ۱۲ : ۲۳، ۸۳ ببعد، ۱۲۵ ؛ (۳) لطفی افندی : تاریخ (استانبول ۱۳۰۲ھ)، ۵ : ۸۸ ببعد؛ (۴) رفعت افندی : وردالحدائق (طبع سنگی)، استانبول ص ۱۵۔

(M. Cavid Baysun)

* **درہ بیگی** : (= درہ بے)، ترکی لقب، جو عام طور سے ایشیاے کوچک کے ان حکمرانوں کو دیا جاتا تھا جنھوں نے بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی میں اپنے آپ کو استانبول کی مرکزی حکومت ترکیہ سے تقریباً آزاد کر لیا تھا۔ ترک مؤرخ انھیں عموماً متغلّبہ (= غاصبین) کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جہاں کہیں نرم الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو انھیں "خاندان" (= بڑے گھرانے) کہتے ہیں۔ درہ بے بالآخر ایسے باجگزار فرمانروا بن گئے جو خود مختار اور موروثی ریاستوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ جنگ کے دنوں میں وہ اپنی فوجیں لے کر، عثمانی لشکر میں، جو بڑی حد تک انھیں جاگیرداروں اور رئیسوں کی فوجوں سے مرکب ہوتا تھا، شامل ہو جاتے تھے۔ اگرچہ بظاہر یہ دکھانے کے لیے کہ وہ سرکاری عاملوں کے نمائندے ہیں، انھیں مُحصّل اور مُتسلّم جیسے خطابات دے دیے جاتے تھے، لیکن حقیقت میں وہ اپنے اپنے علاقوں کے مستقل اور آزاد حاکم تھے۔ آناطولی کے یہ درہ بے اُن غاصب پاشاؤں سے مختلف تھے جنھوں نے دوسرے صوبوں میں ایسی ہی خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ ان کی جڑیں مقامی طور پر بہت گہری اور مضبوط تھیں اور وہ مقامی باشندوں کی وفاداری پر پورا اعتماد کر سکتے تھے۔ پاشاؤں کی طرح انھیں یہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے اقتدار کے مختصر زمانے میں زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کر لیں، چنانچہ وہ ایسی تعمیری حکمت عملی پر کاربند تھے جو رعایا کے لیے (جس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا) فلاح و تحفظ اور تجارتی ترقی کا ذریعہ بن سکے۔ سیاح ان کی حکومتوں کی اچھائی کی گواہی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رعایا اُنھیں بہت عزیز رکھتی تھی۔ باب عالی کسی نہ کسی حد تک ان کے اقتدار کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا اور ان کے خلاف تادیبی کارروائی صرف اس وقت کی جاتی تھی جب وہ کھلم کھلا بغاوت کر دیں۔ جنگ روس و ترکیہ (۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء تا ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء) میں درہ بیوں کو کئی مواقع حاصل ہوئے اور اُن کے نظام کو آناطولی کے بہت بڑے حصے میں پھیلنے میں مدد ملی۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے شروع میں صرف قرہ مان اور آنادولو کی دو ایالتیں ایسی تھیں جو براہ راست استانبول کے مقرر کردہ گورنروں کے ماتحت تھیں۔ سلیم ثالث کے عہد میں درہ بے اپنی قوت کے انتہائی عروج پر پہنچ گئے، یہاں تک کہ شاہی دربار اور دارالسلطنت سے متعلق امور میں بھی ان کا عمل دخل خاصا بڑھ گیا۔ ان میں سے بعض نے، جن میں قرہ عثمان اُوغلو اور چپان اُوغلو زیادہ پیش پیش تھے، سلیم ثالث کی اصلاحات کی حمایت کی، لیکن ان کے مدِّ مقابل جانیکلی نے بڑی شد و مد سے ان کی مخالفت کی۔ ایک طرف* تو اصلاح پسندوں اور ان کے مخالفوں کی کشمکش کو باج گذار سرداروں کی باہمی رقابت سمجھ لیا گیا اور دوسری طرف مرکزی اور مشرقی آناطولی میں چپان اوغلو اور جانیکلی کے باہمی تصادم نے بظاہر سلطان کے نئے فرمان [ترک: نظام جدید] سے پیدا ہونے والی مخالفت کی صورت اختیار کر لی۔ درہ بیوں نے اپنے

علاقوں میں جہاں نئے فرمان کو جاری کیا بظاہر اپنی اغراض اور اپنے نفع کے پیش نظر کیا اور حکومت کے روپے کو اپنی مسلّح فوج کو مضبوط بنانے پر صرف کیا (درہ بیوں کے نظام جدید کے غلط استعمال اور اس کے اندر غلط کاریوں کے لیے دیکھیے: عاصم، ۱ : ۱۱۱ تا ۱۱۳؛ قبہ آق چورہ، Akçura ص ۱۴۰؛ Miller، ص ۱۰۰ تا ۱۰۱).

بڑے بڑے درہ بیوں نے ۱۸۰۷ تا ۱۸۰۸ء کی سیاسی کشمکش میں خاصا اہم کردار ادا کیا اور بیرق دار مصطفی پاشا کی فتح نے ان کی قوت کو اور مستحکم بنادیا۔ وزیر اعظم ہونے کے بعد اس نے جو کام کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے استانبول میں ایک بڑا دربار منعقد کیا اور اس میں اس نے مملکت بھر کے مختلف قسم کے اکابر کو شرکت کی دعوت دی۔ آناطولی سے بڑے بڑے درہ بیوں نے اپنے اپنے مسلّح ماتحتوں کی بھاری فوجوں کے ساتھ شرکت کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے دربار کی کارروائی میں نمایاں حصہ لیا۔ ایک "سندِ اتفاق" کے ذریعے پہلی مرتبہ ان کے حقوق، مراعات اور خود مختاری کی توضیح و تصدیق ہوئی (شانی زادہ، ۱: ۶۶ تا ۷۳؛ جودت: تاریخ، بار دوم، ۹ : ۳ تا ۷، ۲۷۸ تا ۲۸۳؛ اوزون چارشیلی: Alemadar، ص ۱۳۸ تا ۱۴۴؛ Miller، ص ۲۸۳ تا ۲۹۱؛ ۔ "سند اتفاق" کے متعلق مزید دیکھیے A. Selçuk Özçelik، در Istanbul Univ-Hukuk Fak Mec، ۲۴ (۱۹۵۹ء): ۱ تا ۱۲).

سلطان محمود ثانی نے، جسے اُنیسویں صدی عیسوی کے شروع میں، اس معاہدے کی رو سے باج گذار سرداروں کے حقوق و مراعات تسلیم کرنے پڑے تھے، انھیں ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا؛ انیسویں صدی عیسوی میں اس کے لیے اس طرح کے موقع مہیا ہو گئے۔ جب ۱۸۱۲ء میں روس کی جنگ ختم ہوئی تو وہ صوبوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوا اور پے در پے متعدد سیاسی، فوجی اور انتظامی اقدامات کے ذریعے اس نے باغی پاشاؤں اور خود مختار درہ بیوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور ان کی جگہ استانبول سے سرکاری عہدے دار مقرر کر کے بھیج دیے (ایک ہم عصر مغربی مبصر کے تاثرات کے لیے دیکھیے: A. Slade : *Record of travels in Turkey, Greece etc*، لنڈن ۱۸۳۲ء، ۱ : ۲۱۵ ببعد)۔ مرکزی اقتدار کو بڑھانے کا کام اس کے جانشینوں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ اس سلسلے کی سب سے آخری فوجی کارروائی ۱۵۶۶ء کی مہم تھی، جو ضلع چقور اووہ کے باقی ماندہ درہ بیوں، مثلاً منمنجی اوغلو، کوکیلی اوغلو اور توزان کے قوزان اوغلو کو مطیع کرنے کے لیے روانہ کی گئی (جودت: معروضات، در *TTEM*، ۱۴، ۱۹۲۶ء/ ۹۱ : ۱۱۷ بعید)۔ اگرچہ درہ بیوں کی خود مختار ریاستوں کا خاتمہ ہو گیا، لیکن درہ بے کا لفظ ترکی سیاست کی ایک اصطلاح بن گیا، جو بڑے پیمانے کے موروثی زمینداروں کے لیے مخصوص ہو گئی، بالخصوص جنوبی اور مشرق ترکیہ میں، جو اپنے کاشتکاروں پر نیم باج گذاری اقتدار رکھتے تھے (مثال کے طور پر دیکھیے K.H. Karpat کے ملاحظات در *Social themes in contemporary Turkish literature*، در *MEJ*، ۱۹۶۰ء، ص ۳۳ تا ۳۵).

درہ بیوں کے زیادہ مشہور گھرانے حسب ذیل تھے

(۱) آیدین، منیسا اور برغمہ کے قرہ عثمان اوغلو: یہ صارو خان اور آیدین کی سنجاقوں پر حکومت کرتے تھے اور ان کا اقتدار دریائے مندرس بیوک سے لے کر بحیرۂ مرمرہ کے ساحل تک پھیلا ہوا تھا [رک بہ قرہ عثمان اوغلو]۔

(۲) بوزوق کے چپان (چپار، جبّار) اوغلو: جو نسلاً ترکمانی تھے اور عملاً قرہ عثمان اوغلو کے

معمصر تھے، ان کی حکومت بوزوق یوزغاد، قیصری، اماسیہ، انقرہ، اور نیگدہ کی سنجاقوں پر تھی اور اپنے اقتدار کے عروج کے زمانے میں وہ طرسوس پر بھی حکومت کرتے تھے۔ ان کے خاندان کا پہلا شخص، جس کا نام معلوم ہے، احمد پاشا ہے، جو بوزوق کا متصرف تھا۔ اسے ۱۱۷۸ھ/ ۱۷۶۴-۱۷۶۵ء میں مرکزی حکومت کے حکم سے معزول کیا گیا (واصف، ۱ : ۲۳۳ ببعد، ۲۶۸)۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مصطفیٰ اس کا جانشین ہوا، جسے اس کے حفاظتی دستے نے ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۱ء میں قتل کر دیا (جودت : تاریخ، ۲ : ۱۷۱ تا ۱۷۲)۔ اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان بے اس کا جانشین ہوا، جو چپان اوغلو کی سب سے طاقتور شخصیت ہے اور جس نے سلیم ثالث، مصطفیٰ رابع اور محمود ثانی کے عہد میں کچھ اہم کام انجام دیے۔ ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۳ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا علاقہ مرکزی حکومت کے قبضے میں آ گیا۔ اس خاندان کے لوگ سلاطین کے عہد میں گورنر اور فوجی جرنیل ایسے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ان میں سے ایک چپان زادہ آغا افندی (۱۸۳۲ تا ۱۸۸۵ء) تھا، جس نے ترکی صحافت کی ترقی میں ایک قائدانہ کردار ادا کیا [رک بہ جریدہ]۔ اس خاندان کا ایک اور شخص جنگ آزادی کے زمانے میں حزب ملی کے مخالف گروہ کا قائد تھا۔ ان کا نام ایک ترکی کہاوت میں مشہور چلا آتا ہے، جس کا مفہوم ہے پوشیدہ اور غیر متوقع رکاوٹ [یہ کہاوت یوں ہے کہ : "ایشی قوریالمہ آلتی طرفی بر چپان اوغلو چیقار" = "کسی کام کو کریدا جائے تو نیچے سے چپان اوغلو نکل آتا ہے"، مطلب یہ ہے کہ کوئی غیر متوقع دشواری پیش آ جاتی ہے].

(۳) طربزون اور اس کے قرب و جوار میں جانیک کے علی پاشا کا خاندان : اس خاندان کے بانی جانیکلی [حاجی] علی پاشا [رک بان] کے جانشین اس کے دو بیٹے بقداد احمد پاشا (جسے ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱-۱۷۹۲ء میں پھانسی دی گئی) اور حسین بطال پاشا (م ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۱ء) ہوئے۔ بطال پہلے قپوجی باشی، والی حلب اور والی دمشق کے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۲۰۲ھ/ ۱۷۸۷-۱۷۸۸ء میں طربزون کا گورنر ہوا۔ ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ء میں اس نے روس کے خلاف ترک فوجوں کی قیادت کی، لیکن ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء میں شکست کھا کر اسیر ہوا۔ بطال پاشنسک کا شہر اس کے نام کی یادگار ہے۔ ایک عرصے تک معتوب رہنے کے بعد ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸-۱۷۹۹ء میں، روس کی سفارش پر اسے پھر سرکاری ملازمت مل گئی۔ اس کے بڑے بیٹے خیرالدین راغب پاشا کو، جو افیون قرہ حصار کا گورنر تھا، ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱-۱۷۹۲ء میں معزول کرکے پھانسی دے دی گئی اور اس کے ساتھ ہی جانیکلیوں کا خود مختارانہ سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔ یہ خاندان سلیم ثالث کی فوجی اصلاحات کا مخالف تھا، جن کی ان کے حریف خاندانوں چپان اوغلو اور قرہ عثمان اوغلو نے حمایت کی تھی۔ حسین بطال کا چھوٹا لڑکا ان اصلاحات کی مخالفت میں زور شور سے سرگرم رہا تھا اور ۱۸۰۵ سے ۱۸۰۷ء تک وہ روس میں جلا وطن رہا۔ ۱۸۰۷ء میں وہ پھر ترکی واپس آیا اور مصطفیٰ رابع کی مختصر رجعت پسندانہ حکومت کے دوران میں وزیراعظم کے قائم مقام کے عہدے پر فائز رہا۔ چند ماہ کے بعد محمود ثانی نے اسے عہدے سے برطرف کرکے قتل کرا دیا.

یہ تین خاندان درہ بیوں کے سب سے زیادہ اہم خاندان تھے، جنھوں نے علی الترتیب مغربی، وسطی اور مشرقی آناطولی پر حکومت کی۔ ان سے کم اہم خاندانوں میں ذیل کے خاندانوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے : قوش آطہ سی (اسقالہ نووہ Scala Nuova،

لزد افسوس (= ایاس، Ephesus) کا الیاس اوغلو، جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں منتشا کی سنجاق بودروم کی جنوبی سرحد تک حکومت کرتا تھا؛ کوچک علی اوغلو، جو پیاس میں حکومت کرتا تھا اور تھوڑے دن تک ادنه [رک بآن] پر بھی حاکم رہا، اور پیلالی اوغلو، جو اسپارته اور اگردیر میں اور انطالیه کے علاقے میں تھا .

مآخذ : عثمانی وقائع نویسوں نے دره بیوں کی طرف کچھ توجه کی ہے، لیکن ان کا رجحان یه ہے که ان کی خود مختارانه روش پر اچٹتی سی نظر ڈالیں اور انھیں ترکیه کی مرکزی حکومت (= باب عالی) کا اہل کار ظاہر کریں۔ ان کی بابت زیاده حقیقی اطلاعات مغربی مآخذ میں، خاص طور پر سیاسی امور اور سفارتی معاملات کے وقائع ناموں میں، نیز سیاحوں اور ماہرین آثار قدیمه کے ہاں ملیں گی۔ ان کی کمی، بالخصوص ناموں اور تاریخوں کے متعلق، متعدد مقامی کتبوں سے پوری کی جا سکتی ہے ۔ حال کی ترکی تصانیف میں دره بیوں کی طرف کچھ توجه نظر آتی ہے (جیسے M. Çagatay Uluçay کے Manisa پر اہم مطالعات)، پھر بھی یه موضوع ابھی تک تفصیلی جانچ پڑتال کا محتاج ہے .

قره عثمان اوغلو کے لیے دیکھیے (۱) Kgl. Museum : *Altertümer von Pergamon*، برلن ۱۸۸۵ء، ۱ : ۸۴ تا ۹۱؛ (۲) F. W. Hasluck : *Christianity and Islam under the Sultans*، آکسفرڈ ۱۹۲۹ء، ۲ : ۵۹۷ تا ۶۰۳؛ (۳) Ç. Uluçay : *Karaosmanoğul-larına ait bazi Vesikalar*، در *Tarih Vesiklari*، ۱۹۴۲-۱۹۴۳ء، ۲ : ۱۹۳ تا ۲۰۷، ۳۰۰ تا ۳۰۸، ۴۲۴ تا ۴۳۰؛ (۴) وہی مصنف : *Manisa Ünlüleri*، Manisa ۱۹۴۶ء، ص ۵۴ تا ۶۲؛ چپان اوغلو کے لیے دیکھیے (۵) J. Macdonald Kinneir : *Journey through Asia Minor ...*، لنڈن ۱۸۱۸ء، ص ۸۴ بعد؛ (۶) Georges Perrot : *Souvenirs d'un voyage en Asie Mineure*، پیرس ۱۸۶۴ء، ص ۳۸۹ بعد؛ جانیکلی پر دیکھیے (۷) جودت : تاریخ، بار دوم، ۳ : ۱۴۴ بعد و ۴ : ۹۲ بعد و ۵ : ۱۳۳ بعد، ۴۵۲ بعد؛ الیاس اوغلو پر دیکھیے (۸) P. Wittek : *Das Fürstentum Mentesche*، استانبول ۱۹۳۴ء، ص ۱۰۹ تا ۱۱۰؛ عمومی معلومات کے لیے دیکھیے (۹) Yusuf Akçura : *Osmanli Develetinin Dağilma Devri*، استانبول ۱۹۴۰ء؛ (۱۰) اسمٰعیل حقی اوزون چار شیلی : علمدار مصطفیٰ پاشا، استانبول ۱۹۴۲ء؛ (۱۱) وہی مصنف : عثمانلی تاریخی، انقره ۱۹۵۶ء، ۴/۱ : ۲۱۸ تا ۲۱۹، ۴۲۶ تا ۴۳۷، ۶۱۲ تا ۶۱۵؛ (۱۲) A.F. Miller : *Mustafa Pasha Bayraktar*، ماسکو ۱۹۴۷ء؛ (۱۳) Gibb-Bowen، ۱/۱ : ۱۹۳ بعد؛ (۱۴) B. Lewis : *The Emergence of Modern Turkey*، لنڈن ۱۹۶۱ء، ص ۳۸، ۴۷، ۱۴۴ تا ۲۴۴ .

(B. LEWIS و J. H. MORDTMANN)

* **دِرْهَم** : وزن کے ایک پیمانے کا نام، جو یونانی لفظ δραχμή سے ماخوذ ہے ۔ روایتی طور پر درہم کَیْل یا شرعی کا وزن متوسط حجم کے ۵۰ یا ۶۰ چھلکے والے شعیره [= جو] یا حبّه [= دانه] کے برابر ہوتا تھا اور نظری طور پر چھے دانق پر منقسم تھا؛ دانق مختلف طور پر ۸ یا ۱۰ شعیره کے برابر شمار ہوتا تھا ۔ عالم اسلام کے مختلف حصوں میں اور مختلف زمانوں میں درہم کے وزن اور عربوں کے دیگر اوزان سے اس کی نسبت کی روایات اتنی کثیر اور متضاد ہیں که یہاں ان کا خلاصه نہیں دیا جا سکتا ۔ اس کے لیے قارئین کو اس قسم کی تصانیف دیکھنے کا مشوره دیا جاتا ہے، جیسے Sauvaire : *Matériaux* اور Grohmann : *Einführung* (دیکھیے مآخذ، بذیل دینار) ۔ روایتی درہم کے وزن کو جدید اعشاری نظام کے گراموں کے مطابق متعین کرنے کی کوششیں مختلف اعداد کی صورت میں انجام پذیر ہوئی ہیں، جن میں سے اکثر غالباً غلط ہیں، دیکھیے W. Hinz : *Islamische Masse u. Gewichte*، در *Hand-buch der Orientalistik, Ergänzungsband I*، جلد اول، لائڈن

۱۹۵۵ء، ص ۲ ببعد)، جہاں انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی مختلف ممالک میں [درہم کی] قانونی تعریفیں بھی ملیں گی۔ اگرچہ اکثر مسلم ممالک نے اعشاری نظام سرکاری طور پر اختیار کر لیا ہے، پھر بھی درہم اور دوسرے روایتی پیمانے مختلف کاروباروں میں بے قاعدگی سے ابھی تک استعمال کیے جاتے ہیں۔ موجودہ مصر میں درہم کا وزن ۳٫۱۲ گرام متعین کیا گیا ہے! سنار کے ۱۹۵۳ء کے دو اصلی پیتل کے درہم علی الترتیب ۳٫۳۲۲ اور ۳٫۳۳۵ گرام ہیں۔

(۲) عربوں کے مالی نظام کا چاندی کا سکہ، جو ابتدائے اسلام سے مغلیہ عہد تک رائج رہا۔

قدیم ترین عربی درہم (بَغْلی) یزدجرد ثالث، ہُرمُز رابع اور (زیادہ تر) خسرو ثانی کے [عہد کے] ساسانی درہم کی نقل ہوتے تھے۔ ساسانی شبیہیں رہنے دی گئیں، لیکن حاشیے پر کوفی خط میں کلمۂ طیبہ کا اضافہ کر دیا گیا؛ چند سکّوں پر خلیفہ (معاویہ اور عبدالملک) کا نام اور اکثر پر والی صوبہ کا نام، ٹکسال کا مختصر نام اور ہجری اور اس کے مطابق یزدجردی یا مابعد یزدجردی سال (سب کے سب پہلوی حروف میں) کندہ ہوتے تھے۔ تقریباً ۷۲ھ/۶۹۱-۶۹۲ء میں (American Numismatics Society Museum Notes، ۱۹۵۷ء، ۷: ۱۹۱)۔ اور اس کے چند سال بعد تک قدیم ٹھپے میں آزمائشی طور پر کچھ تغیرات کیے گئے، جن میں مزید کوفی خط کے کلمات کا مزید استعمال اور شبیہوں میں جدّت شامل ہے، جو اسلامی مذاق سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی، لیکن ۷۹ھ/۶۹۸-۶۹۹ء میں عبدالملک کی مالی اصلاحات نے درہم کی کایا پلٹ دی، جو اس وقت سے دینار کی طرح (سوا چند مستثنیات کے) بالکل لوحی ہو گیا تھا۔ اس اصلاح کے بعد پہلے پہل تو درہم پر کسی کا نام نہیں ہوتا تھا، مگر آگے چل کر دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران میں والیوں، ولیعہدوں، خلفا وغیرہ کے ناموں کا اضافہ کیا جانے لگا۔ ٹکسال کے نام اور سکّے کی تاریخ کا ہمیشہ الفاظ میں اندراج ہوتا تھا۔ اموی عہد میں درہم کی خاص ٹکسالیں سابقہ ساسانی شہروں یا انتظامی مرکزوں میں تھیں، لیکن چاندی کے سکّے دمشق، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں بھی ضرب کیے جاتے تھے۔ واسط، جس کی بنیاد ۸۴ھ/۷۰۳-۷۰۴ء میں رکھی گئی، اموی ٹکسالوں میں سب سے کثیر درہم بنانے والی ٹکسال معلوم ہوتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ چاندی کے سکّے ڈھالنے کے سرکاری انتظام کا صدر مقام اسی شہر میں ہو اور درہم کے ٹھپے بھی یہیں بنائے جاتے ہوں۔

مختلف خود مختار خاندانوں کی حکومتوں میں چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے اختتام تک درہم کی عام شکل و صورت میں زیادہ تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اتنا ضرور ہوا کہ فاطمی سکّوں پر رسمی کتبے متحد المرکز دائروں میں لکھے جاتے تھے۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ مشرقی ممالک میں چاندی کا کال پڑ گیا۔ اس زمانے میں چاندی کے سکّے نسبۃً بہت ہی معمولی تعداد میں مضروب ہوئے (دیکھیے R.P.Blake، در *Harvard Journal of Asiatic Studies*، ۱۹۳۷ء، ص ۲۹۱، جہاں اس کا تذکرہ تو کیا گیا ہے مگر کما حقہٗ اس کی تحقیق نہیں کی گئی)۔ پھر جب ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے درمیان مغول کی طاقت کو عروج حاصل ہوا تو درہم اور اس سے دہری تہری قیمت کے سکّے بہت بڑی مقدار میں بننے شروع ہو گئے، جن کی شکل صورت قدیم سکّوں سے مختلف تھی۔ متأخر فاطمیوں کے "درہم ورق"، ایوبیوں کے "درہم ناصری" اور "کاملی" اور سلوکوں کے درہموں کے لیے دیکھیے P. Balog، در *BIE*، ج ۳۳، ۱۹۵۰ تا ۱۹۵۱ء اور v. Schrötter، بذیل مادۂ درہم۔ المغرب میں ہسپانیہ کی اموی سلطنت کے زوال کے ساتھ درہم کی قدر گھٹ گئی۔ مرابطون کے زمانے میں درہم کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں بحال ہوا اور موحّدون کے زمانہ

میں اس کے طرز اور وزن میں پورا پورا تغیر واقع ہو گیا ۔ وہ ایک چوکور (مربع) درہم بن گیا، جس کی عیسائیوں نے بھی فرانس میں (*millares* کے نام سے) نقل کی ۔ درہم کی بناوٹ اور مآخذ کی معلومات کے لیے دیکھیے **H. W. Hazard** : *The numismatic history of late medieval North Africa* ، نیویارک ۱۹۵۲ء.

کلاسیکی (قدیم) عربی درہم کے وزن کے بارے میں (غیر مطبوعہ) بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ خسرو ثانی کے زمانے کے زیادہ چلنے والے ساسانی درہم کا وزن ۴ء۱ اور ۴ء۱۵ گرام کے درمیان تھا۔ عربی ساسانی درہم یقیناً اس سے ہلکا تھا اور اس کا وزن تقریباً ۳ء۹۸ گرام تھا ۔ ۷۹ھ کی اصلاحات کے بعد بالکل ایک جدید معیار قائم کیا گیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد سے لے کر تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک ، جب کہ اوزان نہایت مغالطہ آمیز ہونے لگتے تھے ، درہم کا زیادہ سے زیادہ وزن برابر ۲ء۹۱ اور ۲ء۹۵ کے درمیان رہا (A.N.S. *Museum Notes*، ج ۹ ، ۱۹۶۰ء، دیکھیے مآخذ) ۔ تصیح شدہ رقم کے گھٹنے کا خیال رکھتے ہوئے ۲ء۹۷ تھی اور یہ بالکل اس نظری رقم کے برابر ہے، جس کی بنا (قدیم معیاری) عربی ضابطہ پر تھی، جس میں درہم کا وزن مثقال (دینار) کا ۷/۱۰ مقرر ہے ، یعنی ۷/۱۰ × ۴ء۲۵ = ۲ء۹۷ (رک بہ دینار) ۔ درہم کے زجاجی اوزان اس وزن سے تھوڑے سے کم ہیں اور ان کی ایک خاص قسم سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر میں ۱۲ "خروبہ" وزن کے بھی درہم تھے، جن کا وزن اس سے بھی کم تھا .

دینار اور درہم کی شرح تبادلہ مختلف زمانوں اور مملکت کے مختلف حصوں میں بہت زیادہ فرق کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی ۔ فقہا ذکر کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں ایک دینار کے ۱۰ (یا ۱۲) درہم ملتے تھے ۔ اس کے بعد اس بات کی بکثرت شہادت ملتی ہے کہ کبھی کبھی درہم اتنا گر جاتا تھا کہ دینار کے ۱۵ ، ۲۰ ، ۳۰ یہاں تک کہ ۵۰ درہم تک مل جاتے تھے (دیکھیے کثیر التعداد متون کے اقتباسات، جو Lane Poole نے *NC*، ۱۸۸۴ء میں اور Grohmann نے *Einführung* ، وغیرہ میں دیے ہیں ۔ **P. Grierson** (کتاب مذکور ، بذیل دینار) نے سونے چاندی کے ٹکسالی اور بازاری نرخ کے تناسب کی اقتصادی بنیادوں کو بوزنطیوں اور عربوں کے باہمی تعلقات کو خاص طور پر ملحوظ رکھ کر واضح کرنے کی کوشش کی ہے .

طرز نقش اور اقتصاد دونوں لحاظ سے درہم نے بوزنطیہ اور مغرب پر بڑا قوی اثر ڈالا تھا ۔ آٹھویں صدی عیسوی کے دوسرے ربع میں بوزنطی "miliaresion" ایک زمانۂ دراز کے بعد، جس کے دوران میں قسطنطنیہ میں کوئی چاندی کا سکہ ضرب نہیں ہوا ، جاری کیا گیا ۔ یہ صاف طور پر درہم کو دیکھ کر ہی جاری ہوا تھا اور آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے بہت سے 'miliaresia' تو فی الواقع عرب درہم کے قالب ہی میں ڈھالے گئے تھے ۔ اس بات پر یقین کرنے کی بھی وجہ ہے کہ خانوادۂ Carolingian کے denier یا دینار کی وضع قطع بھی درہم ہی کے اثر سے متعین ہوئی ہو گی ۔ مشرق خلافت کے تحت ممالک اور روس ، مشرق یورپ ، سکنڈے نیویا اور بالٹک کے علاقوں کے درمیان ہونے والی تجارت میں عرب کی چاندی جس عظیم اہمیت کی حامل تھی وہ ان بے شمار درہموں اور ان کے ٹکڑوں سے بخوبی ثابت ہو چکی ہے جو ان علاقوں میں ڈھیر کے ڈھیر دستیاب ہوئے ہیں اور جن پر ۷۸۰ء اور ۱۱۰۰ء کے درمیان کی تاریخیں چار واضح ادوار دکھاتی ہیں (جامع اختصارات اور مآخذ کی پوری فہرست U.S.L. Welin ، در *Kulturhistorisk Leksikon* for nordisk middelalder، ج ۱، کوپن ہیگن ۱۹۵۶ء، بذیل مادہ Arabisk mynt، میں موجود ہے)۔ ان علاقوں سے کثیر تعداد میں انگلستان اور فرانس میں بھی درہم پائے گئے ہیں (دیکھیے J. Duplessy، در *Rev. Numismatique*، ۱۹۵۶ء، ص ۱۰۱)۔

پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز سے کھوٹی چاندی (billon) اور تانبے کے سکے مختلف حکمران خاندانوں نے ضرب کرنے شروع کر دیے (متاخر بویہی، ارتقی، خوارزم شاہ وغیرہ)۔ بنو ارتق کے تانبے کے بڑے بڑے موٹے درہم (سکوں کی فہرست میں "Urtukids") اور ایسے ہی زنگیوں اور ایوبیوں کے سکے موجود ہیں، جن کے منقش نمونے قدیم یونانی، روما کے صوبائی، بوزنطی اور دیگر سکوں کے مشابہ ہیں اور جن پر کبھی کبھی قدیم اسلامی نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ ایک بہت ہی غیر معمولی اور عجیب بات ہے جس کی ابھی تک کوئی خاطر خواہ تشریح نہیں ہوئی اور جو مزید مطالعے کا مستحق ہے (سب سے بہتر تصاویر موزۂ بریطانیہ اور استانبول کی فہرستوں میں، نیز S. Lane Poole: *Coins of the Urtuki Turkumans*، لنڈن ۱۸۷۵ء میں ملیں گی؛ نیز دیکھیے J. Karabacek، در *Num. Zeitschr*، ۱۸۶۹ء، ص ۲۶۵)۔

مآخذ: علاوہ ان مآخذ کے جو دینار کے ذیل میں دیے گئے ہیں اور ان کے جن کا اس مقالہ میں ذکر کیا گیا، دیکھیے: (۱) R. Vasmer، در F. v. Schrötter: *Wörterbuch der Münzkunde*، برلن و لائپزگ ۱۹۳۰ء، بذیل مادہ Dirhem (جس میں مآخذ کی قابل قدر فہرست دی گئی ہے)؛ (۲) J. Walker: *A Catalogue of the Arab-Sassanian Coins. A Cat. of the Muhammadan Coins in the British Museum*، ج ۱، لنڈن ۱۹۴۱ء؛ (۳) U. S. L. Welin، در *Kulturhistorisk Leksikon for nordisk middelalder*، ج ۳ (کوپن ہیگن ۱۹۵۹ء)، بذیل مادہ Dirhem؛ (۴) G. C. Miles: *Byzantine miliaresion and Arab dirhem: Some notes on their relationship*، در *American Numismatic Society Museum Notes*، (۱۹۶۰ء): ۱۸۹ تا ۲۱۸؛ (۵) وہی مصنف: *The Iconography of Umayyad Coinage*، در *Ars Orientalis*، ج ۳ (۱۹۵۹ء) (جدید فہرست مآخذ)؛ (۶) وہی مصنف: "*Trésor de dirhems du IXe siècle*"، در *Mémoires de la Mission Archéologique en Iran*، ۳۷ (۱۹۶۰ء): ۶۷ تا ۱۴۵ (شوشہ سے دریافت شدہ درہموں کے ایک بڑے ڈھیر کا بالتفصیل مطالعہ)؛ (۷) J. Karabaček: *Über Mohammedanische Vicariatsmünzen und Kupfer-drachmen*، در *Wiener Num. Zeitschr*، ۱۸۶۹ء؛ (۸) E. Zambaur: *Münzen in Nord- und Osteuropa*، در *Num. Ges. Wien Monatsblatt*، ۱۹۰۲ء؛ (۹) J. A. Decourdemanche: *Étude métrologique et numismatique sur les Misqâls et Derhems Arabes*، ۱۹۰۸ء؛ (۱۰) [ژ، ع، بذیل مادہ]۔

(G. C. MILES)

دَری: فارسی زبان کا لفظ بمعنی درباری (زبان)، مشتق از "در" [رک بآں]۔ عرب مصنفین مثلاً المقدسی (ص ۳۳۵)، یاقوت (۲: ۵۲۹) اور [ابن ندیم:] الفہرست (ص ۱۹) کے ہاں دری زبان (نیز "فارسی دری") کو (ساسانی) دربار کی بول چال اور خط و کتابت کی زبان بتایا گیا ہے۔ یہ سرکاری اور ادبی زبان بھی تھی۔ اسلامی حکومت کے تین سو برس بعد اسے ایران میں عربی رسم الخط میں لکھا جانے لگا اور وہ "فارسی" یا "پارسی نو" کہلانے لگی۔ اس واقعے نے کہ نئے فارسی ادب نے سیاسی وجوہ کی بنا پر ایران میں طاہریوں، صفاریوں اور سامانیوں کی حکومتیں قائم ہونے سے خراسان اور ماوراء النہر میں جنم لیا اور ترقی کی، کچھ مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ [نثر دری جیسا کہ ایبار

کا خیال ہے قرن سوم کے اواخر میں مروج تھی اور مکاتبات و رسائل اس زبان میں موجود تھے، جو سوءِ اتفاق سے ہم تک نہیں پہنچے ۔ فارسی' دری کی قدیم ترین کتابیں جو دستیاب ہیں، وہ چوتھی صدی سے اوپر کی نہیں (دیکھیے بہار : سبک شناسی، ج ۲، ص ج طبع امیر کبیر، ۱۳۳۷ ش) ۔ حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے کہ عربی کی قدیم کتابوں مثلاً الطبری، عیون الاخبار، الاغانی اور کتب جاحظ وغیرہ میں بلہجہ دری فارسی کے جملے ضبط کیے گئے ہیں جو قرن سوم سے اوپر کے زمانے کے ہیں] ۔

یہ زبان بنیادی طور پر مغربی ایران کی بولی تھی، اسی لیے صوبہ' فارس کے نام پر، اس کا نام فارسی پڑا ۔ اگر پہلے سے نہیں تو اسلامی عہد میں یقیناً شستہ دری زبان، پہلوی کتابوں کی دقیق لفاظی سے، جسے زیادہ تر زردشتی موبد زندہ رکھے ہوئے تھے، دور ہوتی چلی گئی ۔ مغول کی فتح ایران کے زمانے تک دری کی اصطلاح متروک ہو چکی تھی ۔

مآخذ : (۱) E. Bertels : 'Persidskiy dari-tadzikskiy' SE، جلد ۳، ۱۹۵۰ء، ص ۵۵ تا ۶۶؛ (۲) R. N. Frye : Die Wiedergeburt Persiens um die Jahrtausendwende، در Isl.، جلد ۳۵، ۱۹۶۰ء، ص ۳۳؛ مزید لٹریچر کے لیے : (۳) Cl. Huart : Jour As، سلسلہ ۸، ج ۱۱، ۱۸۸۸ء، ص ۲۹۸ ببعد؛ (۴) Zeitschr d. Deutsch Morgenl. Ges، جلد ۵۱ (۱۸۹۸ء)، ص ۱۹۶؛ (۵) F. Justi : Zeitschr. d. Deutsch. Morgenl. Ges.، ج ۳۵، ۱۸۸۱ء، ص ۳۲۷؛ (۶) Anquetil-Duperron : Mémoires de l' Academie des Inscriptions، ج ۳۱، ۱۸۶۸ء، ص ۱۰۳؛ (۷) E.G. Browne : A year amongst the Persians، ص ۱۸۷؛ (۸) وہی مصنف : Literary History of Persia، ۱ : ۲۶؛ (۹) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، قاہرہ، بذیل مادہ؛ (۹) بہار : سبک شناسی، ج ۲، دیباچہ ص ج] .

(R. N. FRYE)

دریا بیگی : دریا بای یعنی افسر بحریہ، ایک خطاب جو مملکت عثمانیہ میں بحری بیڑے کے بعض سرداروں کو دیا جاتا تھا ۔ نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی میں دریا بای یا "دِنِزْ گلیبولی" (deniz-beye) کا خطاب کبھی کبھی گلیبولی کے افسر جنگ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا [رک بہ gelebolu] جس کو سنجاق بای کا درجہ حاصل تھا اور وہی اس وقت تک اعلیٰ امیر بحریہ بھی ہوتا تھا، جب تک قپودان پاشا [رک بآن] کا عہدہ قائم نہیں ہوا تھا ۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں قپودان پاشا امیر البحر ہونے کے علاوہ اس ایالت (صوبہ) کا والی بھی ہوتا تھا جو بندرگاہوں اور جزیروں کے ایک مجموعہ سے مل کر قائم کی گئی تھی [رک بہ جزائر بحر سفید] ۔ یہ صوبہ بھی اور صوبوں کی طرح سنجاقوں میں منقسم تھا جن کے حاکم بجائے سنجاق بای کے دریا بای کہلاتے تھے ۔ ان کے اور ان کے ماتحت عمّال نیز فوجی سرداروں کے پاس زمینیں اور جاگیریں ہوتی تھیں ۔ سنجاق کے ان بحری حاکموں کا فرض تھا کہ بیڑے کی خدمات انجام دیں اور اپنے اپنے سنجاق کی اہمیت کے مطابق ایک، دو، یا تین جہاز، ان کا عملہ، اور ساز و سامان مہیا کریں ۔ ان کی جاگیروں کا انتظام ایک محکمے کے سپرد تھا جو "دریا قلمی" یعنی بحری محکمہ کہلاتا تھا، اور منسوخات [رک بآن] کے معاملات بھی یہی طے کرتا تھا ۔ دریا بای کا تقرر عموماً مدۃ العمر کے لیے ہوتا تھا جو وراثۃً ان کے فرزندوں کو منتقل ہو جاتا تھا ۔ ان کے جہاز اصل (شاہی) بیڑے کے معاون ہوتے تھے ۔

مآخذ : (۱) Marsigli : Etat militaire de l' Empire Ottoman، ج ۱، The Hague، ۱۷۳۲ء، ص ۱۴۳ تا ۱۴۵؛ (۲) M. D'Ohsson : Tableau général de l'Empire othoman، ج ۷، پیرس ۱۸۲۴ء، ص ۴۲۳؛ (۳) Hammer-Purgstall : Staatsverfassung، ۲ : ۲۵۲ تا ۲۵۳؛ (۴) اسمٰعیل حقی ازون چارشیلی : Osmanli *devletinin merkez ve bahriye teşkilâtı*، انقرہ ۱۹۳۸ء، ص ۳۲۱، ۳۲۴، ۳۲۳؛ (۵) Gibb-Bowen، ۱/۱: ۱۰۲.

(B. Lewis)

* **دریائی شاہی** : رک بہ اوڑیا.

* **دُرَید بن الصِّمَّۃ** : ایک قدیم عربی شاعر اور بنو جُشَم بن معاویہ کا سردار، تقریبا ۵۳۰ء میں پیدا ہوا ۔ قدیم عرب کی ایک نمایاں شخصیت ہے ۔

اس کا باپ معاویہ بن الحارث تھا جو الصِّمَّہ کہلاتا تھا اور بنو جُشَم بن معاویہ کا قائد تھا جو قبیلۂ ہوازن [بن منصور بن عکرمہ بن خصفۃ] سے تعلق رکھتے تھے اور مکے اور طائف کے درمیان رہتے تھے ۔ مذہبی یگانگت اور باہمی اقتصادی اور معاشرتی تعلقات کے باوجود مکے اور طائف کے لوگوں میں قدیم رقابت اور مزاحمت چلی آتی تھی جو ان بدوی قبائل میں بھی سرایت کر گئی تھی جو مکے اور طائف کے بیچ میں رہتے تھے ۔ اس مخالفت کے باعث اکثر باہم جنگ ہوتی رہتی تھی؛ ان جنگوں کا سلسلہ حروب الفجار کے نام سے موسوم ہے ۔

دُرَید بن الصِّمَّہ نے ان لڑائیوں میں حصہ نہیں لیا ۔ اس کی کچھ ذاتی وجوہ تھیں جن کی بنیاد قبائل کنانہ سے اس کے تعلقات پر تھی ، اگرچہ اس سے پہلے وہ خود کنانہ کے خلاف لڑ چکا تھا اور اس کے باپ نے حرب الفجار میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا ۔

لیکن دوسری طرف اس نے ہوازن اور غطفان کی لڑائیوں میں بڑا اہم حصہ لیا اور اس کے دو بھائی عبدیغوث اور عبداللہ انھیں جنگوں میں مارے گئے؛ بخاص طور پر عبداللہ کے مارے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنی اور لڑائیاں نئے سرے سے جاری ہو گئیں اور ان میں بنو جُشَم کے قبیلے نے پھر نمایاں حصہ لیا ، درید بن الصِّمَّہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ بھائی کے قتل کا بدلہ لے؛ چنانچہ اس نے یہ فرض غطفان پر متعدد حملے کرنے کی صورت میں ادا کیا ۔

دُرَید کے ساتھ بنو سُلَیم کے دوستانہ تعلقات تھے، اس نے نوجوان شاعرہ الخنساء [رک باں] سے شادی کرنے کی درخواست کی ، لیکن الخنساء نے انکار کر دیا کیونکہ درید عمر رسیدہ ہو چکا تھا؛ اگرچہ اس کے رشتے دار چاہتے تھے کہ ایسے با اثر سردار کی دوستی ان کے ساتھ قائم رہے ۔ بہر حال الخنساء کے انکار سے اس کے بھائیوں معاویہ اور صخر کے ساتھ دُرَید کے دوستانہ تعلقات میں کوئی خلل نہ آیا ۔

فتح مکہ کے بعد جب ہوازن ، ثقیف اور ان کا حلیف قبیلہ نصر (جن کا سردار مالک بن عوف تھا) اہل اسلام کے خلاف لڑنے اٹھ کھڑے ہوئے تو بوڑھے دُرَید بن الصِّمَّہ کو پالکی میں ڈال کر لائے تاکہ وہ اپنے جنگی تجربات سے ان قبائل کو فائدہ پہنچائے ۔ لڑائی شروع ہونے ہی والی تھی کہ اس نے مالک بن عوف سے اس بات پر بحث کی کہ قبیلے کی عورتوں ، بچوں اور مویشیوں کو کہاں ٹھکانا دیا جائے گا ، کیونکہ وہ ان سب کو لڑائی کے میدان سے دور رکھنا چاہتا تھا ۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہوازن سے جنگ کرنے روانہ ہوئے ، دونوں لشکروں کے مابین حُنین میں مقابلہ ہوا ۔ شروع میں قبائل نے اچانک یلغار کر کے مسلمانوں کو پریشان کیا ، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت و پامردی اور ہمت و استقلال کے باعث مسلمان سنبھل گئے اور اس بہادری سے لڑے کہ بدوی شکست کھا کر تتر بتر ہو گئے ۔] بہت سا مال غنیمت مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگا ۔ دُرَید بن الصِّمَّہ لڑائی کے دوران میں رَبیعہ بن رُفَیع السُّلَمی کے ہاتھ سے مارا گیا ۔ جب وہ مرا تو بہت سن رسیدہ ہو چکا تھا اور اس کی عمر سو سال کے لگ بھگ پہنچ چکی تھی ۔

الاغانی (۹ : ۲) میں دُرَید بن الصِّمَّہ کو

بہادر شہسوار اور صف اول کا شاعر (= شاعر فحل) تسلیم کیا گیا ہے۔ محمد بن سَلّام الجُمَحی نے اسے عرب کے چوٹی کے شعرا میں اول مرتبہ دیا ہے۔ عربوں کے نزدیک وہ سب سے بڑا شہسوار شاعر تھا۔ الاَصْمَعی بھی اسے بڑا شخص سمجھتا ہے (فحولۃ الشعراء در *ZDMG*، ۶۵ : ۲۹۸، سطر ۲۰)۔

اس کے قصائد میں، جو بدویّت کا نمونہ ہیں، لڑائی کا بیان، محبت اور دوستی کا اظہار، مرثیہ اور مدح سب کچھ ملتا ہے؛ اس شخص میں وہ سب خوبیاں اور نقائص موجود تھے جو عربوں کے خصائص میں سے ہیں۔

[اس نے عروض کی بحروں میں سے زیادہ تر وافر اور طویل استعمال کی ہیں۔ نیز بسیط، متقارب رجز، کامل اور رمل بھی اس کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ ابن منظور نے لسان العرب میں تقریباً پینتیس جگہ دُرَید کے اشعار سے استشہاد کیا ہے (دیکھیے عبدالقیوم: فہارس لسان العرب، ۱ : ۳۹)]۔

مآخذ: (۱) الاغانی، ۹ : ۲ تا ۲۰؛ نیز دیکھیے *Tables*، ص ۲۲۳؛ (۲) ابن قتیبہ: کتاب الشعر: ص ۱۹۷، ۲۱۹، ۳۷۰ تا ۳۷۳؛ (۳) خزانۃ الادب، ۱ : ۱۲۵ و ۲ : ۱۲۱، ۲۲۴ و ۳ : ۱۶۶ و ۴ : ۱۲۸، ۳۳۳ تا ۳۳۷، ۵۱۳، ۵۱۶؛ اس کے کچھ قصائد البکری: مُعجم؛ سیرۃ عنتر؛ العقد؛ الاصمعیّات؛ الکامل؛ حماسۃ البحتری؛ حماسۃ ابی تمام، لسان العرب، تاج العروس اور دیگر مجموعوں میں بھی پائے جاتے ہیں؛ (۴) R. Růžička: *Duraid ben As-simma, obraz středního Hidžázu na úsvitě islámu*، پریگ Prague ۱۹۲۵ء - ۱۹۳۰ء، حصہ ۳، ج ۲، در *Rozpravy České akademie a umění věd*، جلد ۳، عدد ۲۶، ۷۹، مضامین دیکھیے *Aro*، ۱۹، ۱۹۵۱ء، عدد ۱ تا ۲، ص ۹۹ تا ۱۰۰؛ [(۵) البستانی: دائرۃ المعارف، بیروت ۱۸۸۳ء، ۷ : ۶۸۳ بعد؛ (۶) الروض الانف، ص ۲۸۷؛ (۷) السیوطی: شرح الشواہد، ص ۸۰ بعد؛ (۸) التبریزی، ۲ : ۱۵۹؛ (۹) ابن حبیب: المُحَبَّر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء، ص ۲۹۸ تا ۲۹۹؛ (۱۰) الطبری، ۱ : ۱۲۵۵ تا ۱۲۵۷؛ (۱۱) Caussin de Perceval: *Essai*، ۲ : ۵۳۹ بعد و ۵۹۳ بعد؛ (۱۲) خیرالدین الزرکلی: الاعلام، ۳ : ۱۹ بعد؛ (۱۳) المرزبانی: معجم الشعراء، ۱۹۶۰ء، ص ۲۱۲ بعد؛ (۱۴) براکلمان: تکملہ، ۱ : ۳۸؛ (۱۵) عمر فرّوخ: تاریخ الجاہلیۃ، بیروت ۱۹۶۴ء، ص ۳۶؛ (۱۶) ابن حزم الاندلسی: جمہرۃ انساب العرب، مصر ۱۹۶۲ء، ص ۲۷۰؛ (۱۷) شیخو: الشعراء النصرانیۃ، بیروت ۱۸۹۰ء، ۵ : ۷۵۲ بعد؛ (۱۸) ابو حاتم السجستانی: المعمرون، ص ۲۱ تا ۲۲؛ (۱۹) ابن دُرید: الاشتقاق، ص ۱۷۷ بعد؛ (۲۰) ابو عبیدالبکری: اللآلی، ص ۹۳ بعد؛ (۲۱) الآمدی: المؤتلف و المختلف، ص ۱۱۳؛ (۲۲) النووی: تہذیب الاسماء و اللغات، الطباعۃ المنیریۃ، ۱/۱ : ۱۸۵؛ (۲۳) احمد امین: فجر الاسلام، قاہرہ ۱۹۶۵ء، ص ۸۶؛ (۲۵) المرزوقی: شرح دیوان الحماسۃ، قاہرہ ۱۹۵۱ء، ۲ : ۸۱۲ بعد؛ (۲۶) سیرت ابن ہشام ص ۸۴۱ تا ۸۴۳، گوٹنگن]۔

(K. PETRÁČEK)

* **دَزّا**: رک بہ تُبُّو (= تُوبُو)۔

* **دِزْفُول**: اسی نام کے ایک ضلعے (شہرستان) کا صدر مقام، ایران کے چھٹے اُستان (= خوزستان) میں ۳۲ درجے، ۲۳ ثانیے شمالی عرض بلد اور ۴۸ درجے، ۲۴ ثانیے مشرق طول بلد (گرین وچ) میں آبِ دِز یا دِزْفُول رُوْد کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ یہ ندی جو بُروجِرْد کے نواح سے نکلتی ہے، بندِ قیر (عسکر مکرم، [رک بآن]) کے مقام پر قارون [رک بآں] میں جا ملتی ہے۔ یہ شہر، جو سطح سمندر سے دو سو میٹر اونچا ہے اور مرکب چٹانوں کے اوپر آباد ہے؛ اس کے بہت سے باشندوں نے اس پتھریلی ٹیکرے میں اپنے مکانوں کے نیچے تہ خانے ("سرداب") بنا لیے ہیں، جن میں وہ موسم گرما میں گرمی سے بچنے

کے لیے اقامت اختیار کرتے ہیں۔ دِزْفُول (فارسی میں "دِزْپُول" = حصاری پل) کا نام اس حصار کے نام پر پڑا ہے جو وہاں ندی کے مشہور پل کی حفاظت کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ اس پل کے پائے شُوشتر [رَک باں] کے زیادہ مشہور پل کی طرح بلاشبہہ ساسانی عہد کے ہیں، محرابیں اور بالائی عمارت بعد کے زمانے کی ہے۔ ان کی مرمت بار بار ہوئی ہے۔ بقول المُسْتَوفی (۷۴۰ھ/ ۱۳۳۹ - ۱۳۴۰ء) اس پل کی ۴۲ محرابیں تھیں، جب کہ علی یَزْدی (۸۲۸ھ/۱۴۲۴ - ۱۴۲۵ء) نے لکھا ہے کہ اس کی ۲۸ بڑی اور ۲۷ چھوٹی محرابیں تھیں، یعنی کل ۵۵۔ (ان مصنفوں نے بلاشبہہ پایوں کے اوپر امدادی طاقچوں کو محرابیں خیال کیا، جنھیں پل کے ڈھانچے پر سخت طغیانی کے وقت دباؤ کم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا)۔

دِزفول کا نام چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی سے پہلے مستعمل نہیں تھا۔ اس سے پہلے اسے اَنْدَل مِشْک یا اَنْدا مِشْک کہتے تھے۔ (اب یہ نام ایک قصبے کا ہے جو ٹرانس ایرانین ریلوے پر دِزْفول کے شمال میں گیارہ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے)۔ قدیم تر عرب جغرافیہ نویسوں نے اس قصبے کو کئی ناموں سے موسوم کیا ہے، مثلاً قَصْرُ الرُّوناش؛ قَنْطَرة الروم (رومی پل)، قنطرة الرُّوْد (دریا کا پل) اور قنطرة الزاب۔ زاب بار بار دریا کے نام کے طور پر آتا ہے، یہ سامی زبانوں میں זוב (بمعنی بہنا) استعمال ہوتا ہے۔

پروکوپی اس Procopius نے اپنی تصنیف Caesareensis (کتاب اول، ۵: ۷ تا ۹، ۲۸ و ۲۹) میں ایک "گمنام قلعے" (τὸ τῆς Λήθης φρουρίου) کا دلچسپ حال بیان کیا ہے، جو ایران میں کسی پوشیدہ جگہ پر واقع تھا، جہاں اونچے درجے کے لوگوں کو قید کیا جاتا تھا: اس کے متعلق بات کرنے کی سزا موت تھی۔ Procopius، عرب اور ایرانی مصنفین میں سے جس جس نے اس قلعے کا ذکر کیا ہے، اس کا صحیح محل وقوع بیان نہیں کیا، لیکن ارمنی ماخذ کی رو سے یہ اَنْدِمِشْن میں تھا، جسے H. Hubschmann نے اپنی Armenische Grammatik، لائپزگ ۱۸۹۷ء، ص ۱۹۱)، میں اَندا مِشک یعنی دِزْفول ہی میں متعین کیا ہے۔

شوشتر کی طرح دِزْفول بھی اپنے ہمسایہ شہر جُنْدِیشاپور [رَک باں] کے سامنے ایک طویل عرصے تک ماند پڑا رہا۔ بعد ازاں جب جندیشاپور ویران ہوا تو دِزْفول زیادہ خوشحال ہو گیا، لیکن جب ساسانیوں کا حیرت انگیز نظامِ آبپاشی مرمت نہ ہونے کے باعث خراب ہو گیا تو اسے اور اس کے نواحی ضلعے کو نقصان پہنچا۔ گو دِزْفول مغول کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچ گیا تھا لیکن بعد ازاں یہ ایلخانوں کی حکومت کا مطیع ہو گیا۔ ۱۳۹۳ء میں اس نے تیمور کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور کی اطاعت قبول کرنے کے تھوڑے دن بعد ہی اَرْدَبِیل کے شیخ صفی [رَک باں] کا پوتا خواجہ علی دِزْفول آیا اور اس نے اپنی کرامت سے آبِ دِز کی روانی کو عارضی طور پر بند کر کے اس کے باشندوں کو شیعہ بنا لیا۔ نادر شاہ [رَک باں] کئی موقعوں پر دِزْفول آیا، اس نے اسے لُرُوں (Lurs) سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک قلعہ تعمیر کیا، جسے دِزِ شاہ کہتے تھے اور وہ شمال مشرقی جانب چند میل پر تھا۔

فتح علی شاہ [رَک باں] کے ایک بیٹے محمد علی میرزا نے اس مشہور پل کو انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مرمت کیا تھا، لیکن ۱۸۳۲ء کے غیر معمولی شدید سیلاب اس کے ان حصوں کو بہا لے گئے جنھیں بڑی احتیاط سے دوبارہ بنایا گیا تھا۔ یہی زمانہ تھا جب نیل کی کاشت قرب و جوار میں وسیع پیمانے پر شروع کی گئی۔ نیل افراط سے تیار ہونے لگا، یہاں تک کہ بیرونی رنگوں کی درآمد نے

اس صنعت کو غیر منفعت بخش بنا دیا۔ دزفول ترسل کے قلموں کے لیے بھی مشہور تھا، جنھیں مدت دراز تک مشرق میں بہترین خیال کیا جاتا تھا اور وہ دور دراز ملکوں تک بھیجے جاتے تھے۔ اس صنعت کے لیے خام مال نام نہاد البطیحہ [زرک باں] یعنی دریاے دجلہ اور فرات کے نشیبی حصوں کی دلدلوں میں ترسل کے غیر مختتم نیستان مہیا کرتے تھے۔

۱۸۳۱ء اور بعد کے سال میں شوشتر میں طاعون اور ہیضہ کی شدید وباؤں کے پھوٹ پڑنے سے اس کی جگہ دزفول تھوڑے عرصے کے لیے خوزستان کا صدر مقام بن گیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب Loftus نے دزفول کی آبادی کا تخمینہ پندرہ اور اٹھارہ ہزار کے قریب لگایا تھا، جو تمام کے تمام مسلمان تھے، بجز تیس کے قریب مندی (Mandaean) خاندانوں کے۔ Wells نے ۱۸۸۳ء میں اس کی مجموعی آبادی بیس ہزار بتائی ہے اور Herzfeld نے ۱۹۰۷ء میں اس کا اندازہ فقط پندرہ ہزار لگایا، جس میں ایرانی، کرد، لر اور عرب شامل تھے۔ آج کل (۱۹۶۲ء میں) یہ آبادی تقریباً پچاس ہزار ہے۔ اس کے بیشتر باشندے شوشتر کے باشندوں کی طرح سید ہیں۔ شہر میں کوئی پینتیس مسجدیں اور کثیر تعداد میں اولیا کے مزار ہیں۔ رودبند کے مضافات میں سلطان حسین کا روضہ ہے، جو سوس میں نبی دانیال^۳ کے روضے سے گہری مشابہت رکھتا ہے۔

حال ہی میں آب دز کے پل کی وسیع پیمانے پر مرمت کی گئی ہے، اس کام کے سلسلے میں متعدد پرانی محرابوں کی جگہ پورے عرض کی تین جدید محرابیں بنائی گئی ہیں۔

جب آب دز کے پار ایک بڑا بند، جو ۱۹۵۹ء تک شہر کے شمال مشرق میں بارہ میل دور ایک گھاٹی میں زیر تعمیر تھا، پایۂ تکمیل کو پہنچے گا تو اس سے دزفول اور نواحی علاقے کو بلاشبہہ بڑا فائدہ ہوگا، کیوں کہ یہ نہ صرف ایک وسیع رقبے کی آبپاشی کے لیے کافی پانی فراہم کرے گا، بلکہ شمالی اور وسطی خوزستان کو وسیع پیمانے پر بجلی بھی مہیا کرے گا۔

مآخذ: (۱) BGA، مواضع کثیرہ؛ (۲) یاقوت، ۱:
۲۷۴ (بذیل مادہ اندامش)، ۴: ۱۱۱ [بذیل مادہ قصر رونافش]؛
(۳) Sir W. Ouseley: *Travels in the various coun-*
tries of the East، لنڈن ۱۸۱۹ء، ۱: ۳۵۸ ببعد؛ (۴)
Sir A. H. Layard: *Description of the province of*
Khuzistan، در *JRGS*، لنڈن ۱۸۴۶ء، ص ۵۶ تا ۶۴؛
(۵) W. K. Loftus: *Travels and researches in*
Chaldaea and Susiana، لنڈن ۱۸۵۷ء، ص ۳۱۰ تا
۳۱۴، لنڈن ۱۸۴۶ء، ص ۵۶ تا ۶۴؛ (۶) وہی مصنف:
Early adventures in Persia, Susiana and Baby-
lonia، لنڈن ۱۸۸۷ء، ۲: ۲۹۳؛ (۷) Sir A. H.:
Houtum-Schindler، در *ZGErdk. Berl.*، ۱۸۷۹ء،
ص ۳۸ ببعد؛ (۸) H. L. Wells: *Surveying tours in*
Southern Persia، در *Proceedings of the Roy.*
Geograph. Society، ۱۸۸۳ء؛ (۹) J. Dieulafoy:
La Perse, la Chaldée et la Susiane، پیرس ۱۸۸۷ء،
ص ۶۴۷ تا ۶۵۲؛ (۱۰) E. Herzfeld، در Petermann's:
Geograph Mitteil.، ۱۹۰۷ء، ص ۷۳ تا ۷۵؛ (۱۱)
رزمارا و نوتاش: فرہنگ جغرافیائی ایران، ۶: ۱۶۱؛ (۱۲)
L. Lockhart: *Persian Cities*، لنڈن ۱۹۶۰ء، باب ۲؛
[(۱۳) دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، قاہرہ، بذیل مادہ؛ (۱۴)
G. Le Strange: *The lands of the Eastern Cali-*
phate، ۱۹۰۵ء، ص ۲۳۳، ۲۳۸ تا ۲۳۹؛ (۱۵)
Djihan numa Geographia Orient، لاطینی ترجمہ از
M. Norberg، ۱۸۱۸ء، ۱: ۳۲۲؛ (۱۶) Ritter:
Erdkunde، ۸: ۹ و ۳۹، ۱۶۳، ۱۷۰، ۱۹۳ تا ۱۹۵،
۳۲۲؛ (۱۷) Spiegel: *Eranische Altertumskunde*،
۱، ۱۸۷۱ء: ص ۱۱۰، ۷۵؛ (۱۸) de Morgan:

Mission Scientif en Perse. Etud. Geogr ، ۲ : ۲۷۴ تا ۲۷۵ ، ۳۱٦ ؛ (۱۹) البستانی : دائرۃ المعارف ، بیروت ۱۸۸۴ء ، ۷ : ۶۸۲]).

(L. Lockhart)

⊛ **دساسی** : بیرن ساوستر دساسی Baron silvestre de sacy ، فرانس کا ایک مشہور اور ممتاز مستشرق ، عربی اور فارسی زبانوں میں اچھی دستگاہ حاصل کی اور عہد حاضر میں فرانس کے عربی دبستان کی بنیاد ڈالی۔ ۱۷۵۸ء میں پیرس میں پیدا ہوا اور اس کی عمر ابھی سات سال کی تھی کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا۔ بے سروسامانی کے باوجود دساسی نے مشرقی زبانوں، خصوصاً عربی اور فارسی کی تحصیل کی اور مشرقی علوم میں ایسا غیر معمولی تبحّر حاصل کیا کہ اپنے ہم عصروں میں امام المستشرقین تسلیم کیا گیا۔

۱۷۷۸ء میں فرانس کے شاہ لوئی ہژدہم نے اہل علما کی ایک کمیٹی مقرر کی اور شاہی کتب خانے میں مشرقی زبانوں کے جو مخطوطات محفوظ تھے انھیں ان کی اشاعت پر مامور کیا۔ اس کمیٹی کا ایک رکن دساسی بھی تھا۔ ۱۷۹۵ء میں فرانس کی انقلابی حکومت نے پیرس میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جو Ecole des Langues Orientale کے نام سے آج تک جاری ہے۔ دساسی اس مدرسے میں عربی کا پہلا استاد مقرر ہوا اور جب اس نے عربی کا درس شروع کیا اور موزوں درسی کتابوں کی کمی محسوس کی تو اس نے طلبہ کے لیے عربی زبان کی مستند کتابوں کے اقتباسات کا ایک مجموعہ التحفۃ السنیۃ فی علم العربیۃ کے نام سے دو جلدوں میں ۱۷۹۹ء میں شائع کیا، جو درسی اغراض کے لیے اس قدر مفید اور مقبول ثابت ہوا کہ ترمیم و اضافہ کے بعد ۱۸۰۴ء میں دوبارہ طبع ہوا اور دیگر مغربی ملکوں میں بھی مرّوج ہوا۔ عربی صرف و نحو کی تعلیم کے لیے بھی دساسی نے اسی قسم کا ایک اور مجموعہ الانیس المفید للطالب المستفید کے نام سے مرتب کیا۔ ان درسی کتابوں کے علاوہ اس نے مقامات حریری، کلیلۃ و دمنۃ اور الفیۃ ابن مالک کو بھی شائع کیا۔ ان کتابوں کی اشاعت سے فرانس میں عربی زبان کے درس و مطالعہ نے بڑا فروغ پایا۔ اور ۱۸۱۳ء میں فرانس کی حکومت نے دساسی کو اس کی نمایاں علمی خدمات کے صلے میں بیرن Baron کا خطاب عطا کیا۔

دساسی نے ۱۸۱۹ء میں شیخ فریدالدین عطار کا پند نامہ فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کیا اور اس کی ابتدا میں فارسی زبان میں ایک مقدمہ بھی لکھا۔ اس مقدمے کی فصیح و بلیغ عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ دساسی کو عربی کے علاوہ فارسی پر بھی خوب عبور حاصل تھا۔

اپنے احباب اور تلامذہ کی شرکت سے دساسی نے ۱۸۲۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی Société Asiatique کی بنیاد ڈالی اور دساسی ہی کو اس سوسائٹی کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ اس سوسائٹی نے ایک علمی مجلّہ بھی جاری کیا جو آج تک *Journal Asiatique* کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ دساسی کے بہت سے مضامین اور مقالات اسی رسالہ میں طبع ہوئے۔ یورپ میں بَرْدِیات (Papyri) کے مطالعے کا آغاز بھی دساسی ہی کی بدولت ہوا۔ اس نے جو قرطاس شائع کیے وہ ۱۸۲۵ء میں مصر میں سقارہ کے قریب دیر ابو ہرمیس سے دستیاب ہوئے تھے۔

بیرن دساسی نے اپنی تعلیم و تدریس، تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف سے فرانس میں عربی علوم کے موجودہ دبستان کی بنیاد ڈالی۔ اس کے حلقہ درس سے بہت سے نامور مستشرقین مثلاً Flügel, Freytag, Ahlwardt, Quatremere, Tornberg, Kosegarten, De Slane, Fleischer اور Reinaud پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے مرکزوں میں اپنے نامور استاد کی علمی

روایت کو جاری رکھا ۔ علم و فضل کی بنا پر دساسی کو ملک بھر میں بہت عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی قوم نے دساسی کو بہت سے اعزاز بخشے ، دساسی کی قدر و منزلت وطن تک ہی محدود نہ تھی ؛ جرمنی اور روس کے شہنشاہ بھی مشرق علوم کی تنظیم و ترویج کے بارے میں اس سے مشورہ لیتے تھے ؛ چنانچہ دساسی کے ایما پر یورپ کے متعدد ملکوں میں مشرق زبانوں کی تعلیم اور مشرق علوم کی تحقیق کے لیے ادارے قائم ہوے اور اس کے مشورے سے وہاں لائق اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا ۔

بیرن دساسی نے ۲۱ فروری ۱۸۳۸ء کو پیرس میں اسّی سال کی عمر میں وفات پائی ۔

مآخذ : (۱) ابوالقاسم سحاب: فرہنگ خاور شناسان، ص ۳۰۳ تا ۳۱۲، تہران ؛ (۲) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۱ : ۱۲۹ تا ۱۸۲، قاہرہ ۱۹۶۴ء ؛ (۳) M. Réinaud : *Notice sur M. le Baron silvestre de Sacy*، در *lue a la séance de la société Asiatique le 25 Juin 1938*، پیرس ۱۸۳۸ء ؛ (۴) Fück : *J. Arabischen Studien in Europa*، ص ۱۳۰ تا ۱۵۷، لائپزگ ۱۹۵۵ء ؛ (۵) عنایت اللہ ؛ در *Islamic Culture*، ۱۲ (۱۹۳۸ء) : ۲۳۱ تا ۲۴۲ .

(شیخ عنایت اللہ)

* **دَسْتان :** رَکّ بہ حماسہ

* **دستاویزات :** سیاسی (Diplomatic) تحریرات دست آویز (ف) ، عربی میں وثیقہ جمع وثائق .

۱ - قدیم عربی

(۱) عربی دستاویزات پر نسبۃً کم کام ہوا ہے ۔ کام کا مواد بہت بکھرا ہوا ہے اور ابھی صحیح معنوں میں مرتّب و مدوّن نہیں ہوا ۔ تاہم کچھ عرصے سے عربی دستاویزات سے اعتنا ہونے لگا ہے ۔ متعدد دستاویزات شائع ہو چکی ہیں اور عہد اسلام کی ابتدائی صدیوں کے بردی مخطوطات کی ترتیب و طباعت سے ہماری معلومات میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے ۔ لہٰذا اسے محض حسن اتفاق نہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک ماہر بردیات گروہمن Grohmann نے عربی دستاویزات نویسی کو منظم کرنے کے سلسلے میں خاصا بنیادی کام کر لیا ہے اور اب توقع کی جا سکتی ہے کہ مزید مخطوطات کی طباعت سے اس کام کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی ۔ یہ بات خاص طور سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ہمارے پاس اتنے قدیم زمانے کی دستاویزات کے اصل نسخے موجود ہیں ؛ بالخصوص اس صورت میں کہ بعد کی صدیوں کی عربی دستاویزات اتنی تعداد میں نہیں ملتیں ۔ ابھی ماضی قریب میں [دستاویزات کے] چند مجموعے منظر عام پر آئے ہیں اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس طرح کا مزید مواد دستیاب ہو جائے گا ۔ مجموعہ ہائے جنزہ (Geniza) اور کوہ سینا پر صومعہ سینٹ کیتھرائن میں متعدد اہم عربی دستاویزات ملی ہیں ، اور عہد ممالیک کی دستاویزیں اطالیہ اور ہسپانیہ کے دفتر خانوں میں محفوظ ہیں .

دبیروں کے لیے لکھے ہوے عربی دستور العمل بھی، جو خاصی بڑی تعداد میں محفوظ ہیں، اس مواد میں شامل ہیں، جس پر عربی دستاویز نویسی کے باقاعدہ علم کی بنیاد رکھی گئی ہے ۔ یہ دستورالعمل کچھ تو وہ نظری توضیحات و ہدایات ہیں جو کاتبوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور بعض کی حیثیت متن میں عملی نمونوں کی ہے ، جن میں بالعموم نہ کوئی نام آتا ہے نہ تاریخ ۔ بظاہر اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ متون کس حد تک مستند ہیں یا یوں کہیے کہ یہ کس حد تک اعلیٰ دستاویزات پر مبنی ہیں ۔ اس قسم کے دستورالعمل رفتہ رفتہ تہذیب و تکمیل کی منزلوں سے گزرتے گئے تا آنکہ عہد ممالیک میں انھوں نے دائرہ معارف کی حیثیت اختیار

کر لی ، جیسا کہ القلقشندی : صبح الاعشٰی سے معلوم ہوتا ہے ۔ اس جلیل القدر تصنیف کو مطالعہ دستاویزات کے سلسلے میں ایک بنیادی مآخذ کا درجہ حاصل ہے اور اسی لیے اس کے مصنف کو عربی وثائق نویسی کے ممتاز ترین متقدمین میں سے تصور کرنا چاہیے ، گو یہ بتانا مشکل ہے کہ القلقشندی نے جو عبارتیں درج کی ہیں ان کی اصل کس حد تک اس کی نظر سے گزری تھی ۔ البتہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس کی رسائی دفترخانوں تک تھی اور اس زمانے میں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ متون محفوظ تھے ۔ قدیم تر متون کے بارے میں ہم زیادہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ ثانیاً القلقشندی نے اپنی کتاب کی بنیاد زیادہ تر ادبی مآخذ پر رکھی تھی ، جن میں سے بعض کے نام بھی اس نے دیے ہیں ، لیکن ہمیں یہ توقع ہرگز نہیں کرنی چاہیے کہ اس نے انھیں خاص تنقیدی نظر سے دیکھا ہو گا ۔

Bresslau کی ترتیب و تقسیم کی بنیاد پر ذیل میں ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ نسبةً واضح اور مکمل تصویر سامنے آ سکے ۔

(۲) دستاویزات کی ترتیب و تحریر : سب سے پہلے افتتاحیہ یا تمہید، متن اور خاتمہ ۔ (الف) افتتاحیہ یا تمہید کو طراز اور افتتاح کہا گیا ہے ۔ عربی کے بردی مخطوطات میں تمہید کے لیے طراز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ شروع شروع میں طرازیں دو زبانوں میں لکھی جاتی تھیں ، یونانی عربی میں ، پھر عربی یونانی میں ، اور بالآخر صرف عربی میں ۔ ان کے الفاظ میں خاصا تنوع ملتا ہے ۔ گرومن Grohmann نے بہت زیادہ مواد شائع کیا ہے ، اس کی غرض و غایت بظاہر یہ ہے کہ دستاویز کو مستند و معتبر بنا کر پیش کیا جائے ، لیکن جہاں تک عربی دستاویزات کی صحت کا تعلق ہے ، ایسا کرنا بے معنی ہے ۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی سے اسے بالکل ترک کر دیا گیا اور اب طراز کی اصطلاح صرف کاغذوں پر نام لکھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے ؛ القلقشندی اس اصطلاح کے صرف اسی مفہوم سے آشنا ہے ، چنانچہ وہ دستاویزات کی ابتدا کے لیے [طراز کا استعمال نہیں کرتا] ، افتتاح کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، مثلاً افتتاح الکتب اور افتتاح المکاتبة ۔ اس افتتاح کے مختلف اجزاء کو وہ فواتح کہتا ہے ، جو یہ ہیں : بسملہ (بسم اللہ)، حمدلہ (الحمد للہ)، تشہد، صلوٰتہ (درود و صلاة)، سلام اور بعدیہ (امّابعد) ان میں سے ہر اصطلاح کی اپنی تاریخ ہے ، کہا جاتا ہے کہ درود و صلاة کا استعمال ۲۹۲ء میں شروع ہوا ۔

عُنوان بھی افتتاح کا جز ہے ۔ ابتدا یہ مِن فُلانٍ اِلٰی فُلانٍ یا لِفُلانٍ مِن فُلانٍ کی صورت میں ملتا تھا اور یہیں سے اس نے اگلے مراحل طے کیے ۔ القلقشندی نے اس کی پندرہ مختلف صورتوں کا ذکر کیا ہے ۔ عنوان میں کاتب کے اسم و لقب کو تَرجَمة کہا جاتا تھا ، جو سادہ اَخوہٗ یا وَلَدہٗ سے بڑھ کر المملوک الناصری وغیرہ تک جا پہنچا ۔ اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ مُرسل کے لیے تَقدِیَہ کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی تھی ، جس نے قدیم جَعَلَنِی اللّٰہُ فِداکَ (مجھے خدا تم پر فدا کرے!) سے شروع ہو کر متعدد عبوری صورتوں سے گزرتے ہوئے دور عباسیہ تک پہنچتے پہنچتے یہ صورت اختیار کر لی ۔ مکتوب الیہ کے لیے جو دعائیہ الفاظ استعمال کیے جاتے تھے اور جنھیں دعا کہا جاتا تھا ، انھیں بے حد اہمیت دی جاتی تھی ۔ اس کی صورتیں اور بھی زیادہ مختلف اور متنوع تھیں ۔ دور بنو امیہ میں دعائیہ الفاظ کی حیثیت قطعی غیر نمایاں تھی، لیکن بنو عباس کے عہد تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک باقاعدہ نظام مراتب کی صورت اختیار کر لی ۔ معلوم ہوتا ہے کاتبوں نے اَدعِیَة کی فہرستیں خاصے ابتدائی زمانے میں مرتب کر لی تھیں اور جب دور فاطمی اور دور ممالیک میں

مختلف مناصب کے مابین زیادہ سے زیادہ امتیاز روا رکھا جانے لگا اور ہر لقب کے لیے ایک خاص دعا مخصوص ہونے لگی تو ادعیہ یا دعائیہ کلمات میں بھی زیادہ سے زیادہ تفصیل سے کام لیا جانے لگا۔

مختلف ذاتی نام (الاسماء والکُنٰی، اَلقاب، نُعُوت) خاصے ارتقائی مراحل سے گزرے ہیں۔ دستاویزات کی تشریح کے سلسلے میں ظاہر ہے کہ ان اسماء وغیرہ سے تعلق رکھنے والی تفصیلات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ القلقشندی کی مذکورہ بالا کتاب کا تیسرا مقالہ اسی بحث سے مخصوص ہے اور اس سلسلے میں اس نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بہت مفصل ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ناموں کے لکھنے کی روایت کا ارتقاء بتدریج پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا گیا۔ عہد بنو امیہ میں اسم اور کُنیت کو کافی سمجھا جاتا تھا، لیکن بنو عباس کے دور حکومت میں ”لقب“ اور ”نعت“ کا بھی رواج ہو گیا۔ ممالیک کے زمانے میں فی الواقع بہت سی اصطلاحات استعمال میں آ گئیں، چنانچہ اس کی تصدیق القلقشندی کی فہرستوں سے ہوتی ہے، جن میں ایک سو باون ”القاب“ اور تین سو بہتر ”نعوت“ درج ہیں اور ان کی توثیق Caetani: *Onomasticon* سے کی جا سکتی ہے۔

(ب) اصل عبارت کے لیے ”متن“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ مکتوبات میں اسے مَابَیْنَ السَّلَامَیْن بھی کہا گیا ہے، کیونکہ اس کا آغاز سلام سے اور اختتام بھی سلام پر ہوتا ہے۔ متن فاعلی یا مفعولی دونوں میں سے کسی بھی صورت میں لکھا جا سکتا ہے (مفعولی، مثلاً ھٰذا ما .....)۔ متن کے مختلف حصوں کے لیے علیحدہ علیحدہ اصطلاحات مقرر تھیں، مثلاً تقرر ناموں میں اسناد سے مراد مخصوص طور پر یہ الفاظ ہیں: اَنْ یُعْہَدَ اِلَیْہ وغیرہ۔ وَصِیَّة سے مراد وہ حصہ ہے جس میں نام زد فرد کے فرائض بالتفصیل درج ہوتے تھے۔ اس قسم کی تفصیلات بہت اہم ہیں کیونکہ ان سے سرکاری ملازمین کے فرائض اور ان کے اخلاق منصبی کا پتا چلتا ہے اور نسبةً غیر معروف مناصب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

(ج) اختتامی آداب میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں: ”خَوَاتِم“: اِسْتِثْنَا ــ انشاء اللہ تعالٰی، تحریر میں یہ اکثر یک جا آتے ہیں، لیکن بعض مستند علما کے نزدیک انھیں الگ الگ سطروں میں لکھنا چاہیے؛ ”تاریخ“: بعض اوقات محذوف ہوتی ہے اور اس پر علیحدہ بحث کی ضرورت ہے (دیکھیے ذیل میں شق ۱۳)؛ ”عَلَامَة“ = یعنی دستاویز لکھنے والے کے دستخط، بالعموم اسے حفظ مراتب کو قطعاً نظرانداز کرتے ہوئے ”رِجلِ غُراب“ (= کوے کا پاؤں) سے موسوم کیا جاتا تھا، عموماً اَلطُّومارالکامل (= طویل عبارت) میں؛ اِخوانیات میں ”علامة“ حاشیے پر ہوتا تھا۔ القلقشندی کے اختتامی کلمات مثال کے طور پر ”حسب المرسوم الشریف“ اور ”الاشارة العالیة الوزیریة“ ہوتے تھے۔ حَمْدَلة، صَلْوَلة، حَسْبَلة اور اسی طرح کے دوسرے اختتامی کلمات مذہبی ہیں۔ ان میں ’حر‘ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، جس کا مفہوم القلقشندی کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس لیے اس کے متعلق اس کا بیان یہ ہے کہ وہ دوسرا حَسْبَلة یا محض بھرتی کا لفظ ہے (غالباً زیادہ صحیح طور پر حرف ح کے تحت وہ محض ایک علامت امتیاز ہے)۔

۳ ـ دستاویزات کی اقسام: گروھمان Grohmann نے عربی دستاویزات کی صف بندی بھی اسی طریق پر کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح یورپی دستاویزات کی جاتی ہے، مثلاً: قانونی مافیہ کے ساتھ اور ان کے بغیر: سرکاری اور نجی دستاویزات؛ تنسیخی اور غیر تنسیخی دستاویزات؛ فرامین؛ اسناد؛ شہادت اور تجارت سے متعلق دستاویزات وغیرہ۔ عربوں نے بھی (خصوصاً القلقشندی نے) دستاویزات کی صف بندی

اسی طرح بڑی وضاحت سے کی ہے ۔

الف ۔ حسب ذیل عام اصطلاحات ہیں : کتاب، وَثِیقة ، صَکّ، سَنَد ، حُجّة، سِجِلّ، ظَهِیر ۔ "کتاب" کی صراحت اکثر اوقات اسی قسم کے لاحقوں ساتھ کی جاتی ہے، جیسے کتاب الأنشاء ، کتاب النکاح ، کتاب الطلاق ، کتاب الاعتماد وغیرہ ۔ اس کا نسبةً محدود مفہوم دوسروں کے ساتھ وابستہ کیا جاتا تھا، لیکن فاطمی "سجل" کو اور اہل مغرب والے "ظہیر" کو ترجیح دیتے تھے.

ب ۔ شروع شروع میں سرکاری دستاویزات کو بھی محض کُتُب کہا جاتا تھا ، اگرچہ ابتدائی عہد میں کُتُب عامّة یا مُطلَقات اور کُتُب خاصّة میں امتیاز کیا جاتا تھا اور مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے ان کی مزید تقسیم کتاب الایمان ، کتاب الاوقاف ، کتاب الملوک، کتاب السجلّ، وغیرہ میں کی جاتی تھی اور دوسروں کی تقسیم ان کے مافیہ کے مطابق کی جاتی تھی ۔ چونکہ "کتب" کا لفظ "سرکاری دستاویزات" کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس لیے یہ بڑے وسیع مفہوم کا حامل ہوگیا ۔ نتیجةً امور حکومت سے متعلق جن خطوط کا تبادلہ کیا جاتا تھا انہیں دورِ بنو عباس میں مکاتبات اور متعلقہ عملۂ وزارت کو دیوان المکاتبات کہا جاتا تھا ۔ مصر میں بنو فاطمہ ، آل ایوب اور ممالیک کے دوران حکومت میں بھی اس کا استعمال عام تھا ۔ "رسائل" اور "دیوان الرسائل" کی اصطلاحیں رائج تھیں ۔ "مُراسلات" اور "تَرَسُّل" کے الفاظ بھی استعمال ہوتے تھے ، لیکن بظاہر وہ زیادہ عام نہیں تھے ۔ انشاء اور مُنشآت کے الفاظ بھی استعمال ہوتے تھے ، چنانچہ عہد بنو عباس میں لوگ دیوان الأنشاء کے نام سے واقف ہو چکے تھے، لیکن آگے چل کر ، بالخصوص فاطمین اور ممالیک کے دور حکومت میں، یہ عملۂ وزارت کے لیے ایک عام اصطلاح بن گئی (قب شق ہ ، سطور ذیل) .

ج ۔ تقرر نامے : "ولایات" ۔ القلقشندی نے اپنے پانچویں مقالے میں مناصب پر اس عنوان کے تحت بڑی تفصیل سے بحث کی ہے ۔ بہر حال مرکب اصطلاحات بالعموم زیادہ مستعمل تھیں : مثلاً ولایت العَهد ، ولایت الدیوان ، ولایت الحِسْبة ، ولایت القاهرة وغیرہ ۔ مثال کے طور پر "نسخة سجلّ بولایة القاهرة" جیسی اصطلاح بھی ملتی ہے ۔ "تولیة" حق تقرر کو کہتے ہیں ، لیکن دور ممالیک میں یہ حق صرف شام کے عاملوں کو حاصل تھا، مصر کے عاملوں کو نہیں ۔ تقرر کے مختلف مدارج کے لیے حسب ذیل اصطلاحات ، کم از کم ممالیک کے عہد میں ، ان عام اصطلاحات کے مقابلے میں زیادہ رائج تھیں : بَیْعة ، عَهْد ، تقلید ، تفویض ، مرسوم ، توقیع، منشور۔ ان میں سے ہر اصطلاح کی ایک تاریخ ہے .

(الف) بَیْعة [رک بآں] = خلیفہ کی اطاعت اور وفاداری کا حلف و اقرار ۔ فاطمیوں کے عہد میں اسے خاص طور پر اہم سمجھا جاتا تھا ، چنانچہ دارالخلافت میں اس کی رودادیں ضبط تحریر میں لائی جاتیں اور صوبوں میں بھیجی جاتی تھیں ، جہاں صوبے کا عامل رعایا سے بیعت (حلف وفاداری) لیتا تھا .

(ب) عَهْد = عام معنوں میں اس کا مفہوم تھا معاهدہ، لیکن یہاں خاص طور پر خلیفہ اور اس کے جانشین یا کسی سلطان کے مابین معاهدہ مراد لیا جاتا تھا ۔ اسی طرح آگے چل کر اس سے سلطان اور اس کے جانشین یا سلطان اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے فرمانرواؤں کے مابین معاهدہ مراد لیا جانے لگا ۔ القلقشندی نے ان سب کی صنف بندی تقرر ناموں کے طور پر کی ہے ۔ اس کی حتمی رائے یہ ہے کہ پہلی دو قسم کے معاهدوں کا سراغ عہد نبویؐ تک پہنچتا ہے ، لیکن دوسری قسم کے معاهدوں کو وہ ارتقائی صورتیں قرار دیتا ہے، جو نورالدین کی وفات کے بعد ایوبیوں کے تحت ظہور پذیر ہوئیں .

(ج) عہد ۔ سرکاری ملازمین کے تقرر ناموں

میں ایک اعلٰی درجے کا پروانہ بھی ہوتا تھا ، جسے عَہْد کہتے تھے ۔ اس کا تعلق اعلٰی عہدیداروں کے تقرر سے ہوتا تھا۔ فاطمیوں کے بعد یہ مروج نہیں رہا :

(د) تَقْلِیْد ۔ یہ اصطلاح اعلٰی عہدیداروں ، مثلاً وزیروں اور قاضیوں کے لیے بکثرت مستعمل تھی ، البتہ دورِ ممالیک میں اس کا استعمال خاص الخاص اعلٰی عہدیداروں کے لیے محدود ہو گیا (جن میں سے ایک کاتب السِّر، یعنی پرائیویٹ سیکرٹری بھی تھا) ۔

(ہ) تَفْوِیض کا اطلاق قاضی القُضاۃ پر ہوتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح صرف دورِ ممالیک میں مستعمل تھی ۔ ممکن ہے کہ اس کا استعمال شہاب الدین بن فضل اللہ (؟) نے شروع کیا ہو ۔

(و) مَرْسُوم کی اصطلاح فوجی ملازمین کے لیے مستعمل تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رواج بھی صرف دورِ ممالیک ہی میں رہا ۔ شہاب الدین بن فضل اللہ کے نزدیک اس سے مراد وہ معمولی دستاویزات ہیں جن کا تقررات سے کوئی تعلق نہ تھا (ان میں سے اہم مَرْسُوم پر تَسْمِلَہ لکھی ہوتی تھی اور کم اہم دستاویزات، مثلاً اجازت ناموں پر اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی) ، لیکن القلقشندی نے اہم اور عام مراسیم میں یوں امتیاز کیا ہے کہ مُکَبَّرَۃ محافظ قلعہ اور اوسط درجے کا فوجی منصب رکھنے کے لیے اور مُصَغَّرَۃ ادنٰی مناصب کے لیے مخصوص تھا ۔ مؤخر الذکر کا استعمال شاذ ہی ملتا ہے (غالباً اس لیے کہ انہیں بالعموم منشور دیا جاتا تھا) ۔

(ز) تَوْقِیْع ۔ شروع شروع میں تو اس سے فرمانروا کے دستخط مراد تھے، جو دیوان المُکاتبات پر ثبت کیے جاتے تھے (اس کے برعکس علامۃ ایک قسم کا ماٹو (motto) ہوتا تھا ، جسے فرمانروا دستاویز کے لیے دستخطوں کی طرح اپنے قلم سے رقم کرتا تھا) ۔ تَوْقِیْع علی القِصَص غالباً اسی سے نکلا ہوگا ۔ آگے چل کر توقیع کا لفظ پروانۂ تقرر کے لیے بھی استعمال ہونے لگا ۔ شروع شروع میں یہ اصطلاح ہر ایک کے لیے (چنانچہ ابن فضل اللہ اور غالباً آلِ ایوب کا بھی اس سلسلے میں نام لیا جا سکتا ہے)، لیکن آگے چل کر صرف ادنٰی درجے کے ملازموں کے لیے اور القلقشندی کے بیان کے مطابق "مُتَعَمِّمِیْن" کے چوتھے اور ادنٰی ترین طبقے کے لیے استعمال ہونے لگی ۔

(ح) مَنْشُور ۔ ابتدائی صدیوں میں یہ ایک اجازت نامہ تھا جو مصری کسانوں میں اراضی ترک کرنے کے روز افزوں رجحان کو روکنے کے لیے جاری کیا گیا تھا ۔ بنو عباس کے عہد میں اس سے جاگیر کے عطیات مراد تھے ۔ بنو فاطمہ کے عہد میں اسے تقرر کے بعض پروانوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔ سلاطین آلِ ایوب کے دور میں اس سے نسبۃً عام تقرر اور ممالیک کے عہد حکومت میں محض جاگیر کا عطیہ مراد لیا جانے لگا ، جو حجم اور تحریر کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا ۔ عبارت مختصر اور واضح ہوتی تھی ۔ اس میں نہ تو کسی کی ہدایات (وصایا) ہوتی تھیں نہ سلطان کے دستخط ، البتہ کبھی کبھی اس کی پیشانی پر ایک طرح کا طُغْریٰ بنا دیا جاتا تھا ۔

د ۔ عہد نامے : اس سلسلے میں عَہْد ، عَقْد اور میثاق کی اصطلاحات قدیم ترین دور ، حتٰی کہ قرآن مجید کے دور نزول میں بھی، ملتی ہیں اور ہر زمانے میں مروج رہی ہیں ۔ عہد [رک بآں] خاص طور پر سیاسی نوعیت کے لیے مستعمل تھا ۔ عقد (رک بآں) معاشرتی معاہدوں کے لیے استعمال ہوتا تھا ، جس کی صراحت کے لیے اکثر مضاف الیہ لگا دیا جاتا تھا، مثلاً عَقْدُ النِّکاح، عَقْدُ الذِّمَّۃ ، عَقْدُ الصُّلْح ۔ میثاق کا استعمال کم نظر آتا ہے ۔ القلقشندی نے اس اصطلاح کا ذکر نہیں کیا ، البتہ ابن فضل اللہ کی التَّعریف میں مَوَاثِیْق اور مُواثَقَۃ کا ذکر آیا ہے ۔ القلقشندی نے جنگ بندی کے معاہدے کے لیے هُدْنَۃ اور مُہَادَنَۃ کی اصطلاحیں لکھی ہیں اور بنو عباس اور ممالیک کے عہد کی مثالیں پیش کی

ہیں ۔ اس نے اس قاعدے پر خاص طور پر توجہ دی ہے جس کے مطابق حلف اٹھایا جاتا تھا ۔ وہ کہتا ہے کہ کچھ عرصے سے اس قسم کے معاہدوں کا رواج نہیں رہا ۔ وہ مُوادَعہ ، مُسالمہ ، مُقاضاہ اور مُواصفہ کی اصطلاحات کا ذکر بھی کرتا ہے ، لیکن غالباً یہ بہت کم مستعمل تھیں ۔ اسی طرح کسی ایک فریق یا دونوں فریقوں کی طرف سے کسی معاہدے کو کالعدم کردینے کے لیے فسخ اور مُفاسَخہ کی اصطلاحات کا استعمال بکثرت ملتا ہے ۔ مزید معلومات کے لیے رک بہ شروط ۔

ہ ۔ زیادہ تر تجارتی نوعیت کی دستاویزات : ان میں صرف جاگیروں کے عطیے (دیکھیے ج (ہ)، سطور بالا) اور سالانہ محاصل کے تصفیے ہی نہیں بلکہ مُسامَحات اور تَرخانیات بھی شامل ہیں ۔ اول الذکر کا تعلق محاصل میں رعایت سے ہے اور غالباً ان کا اجراء ممالیک کے عہد ہی میں ہوا ۔ انھیں عِظام (بڑے) اور صِغار (چھوٹے) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ، جو علی الترتیب سلطان اور عامل کی طرف سے جاری ہوتی تھیں ۔ منسوخ شدہ محاصل کو مُکوس، جِہات، مُستَخرجہ ، مُنکرات اور بواقی (واجب الادا محاصل کا بقایا) کہتے تھے ۔ ان میں سے بعض تو تاجروں اور ان کے مال کے لیے جائز متصور ہوتے تھے اور بعض صرف مخصوص رقوم کے لیے ۔ ترخانیات سے مراد وہ رعایات تھیں جن کی رو سے معمر ملازمین ریاست کو محاصل سے مستثنٰی قرار دیا جاتا تھا اور بعض صورتوں میں ان کی معینہ تنخواہ (مَعلوم) مقرر کر دی جاتی تھی ۔ جہاں تک فوج کا تعلق ہے ان دستاویزات کو مَرسوم کہا جاتا تھا اور باقی کو توقیع ۔

و ۔ زیادہ تر فقہی (شرعی) نوعیت کی دستاویزات : ان کا اصطلاحی نام اَمان [رک بآن] ہے ۔ اس کی رو سے کسی پورے کے پورے قبیلے یا بعض افراد کو (بالخصوص دارالسلام میں رہنے والے غیر ملکی باشندوں کو) امن سے رہنے کی ضمانت دی جاتی تھی ۔ آگے چل کر ان میں وہ مسلمان بھی شامل کر لیے گئے جن کی طرف سے حملے کا خطرہ لاحق رہتا تھا ، اور بالخصوص وہ جو اطاعت سے منحرف ہو جاتے تھے تاکہ اگر ممکن ہو تو انھیں دوبارہ حلقۂ اطاعت میں شامل کیا جا سکے ۔ دیوان کا بیشتر کام اس قسم کی دستاویزات کو ضبط تحریر میں لانے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا ۔ القلقشندی نے ہر دو قسم کی دستاویزات کا سراغ عہد نبوی ؐ میں لگانے کی کوشش کی ہے اور بنو امیہ ، بنو عباس ، بنو فاطمہ اور ممالیک کے ادوار حکومت سے ان کی مثالیں پیش کی ہیں ۔ بعض دستاویزات میں مستأمن کی کسی عرضی کا حوالہ بھی ملتا ہے (مثلاً اِنَّکَ ذَکَرتَ رَغبَتَک)، لیکن باقی دستاویزات میں نہیں ۔

یَرلیغ = فَرمان، جس کا استعمال ترکوں نے وسیع پیمانے پر کیا اور یہ اصطلاح ممالیک کے دور میں سفیروں کی آمد و رفت کے باعث مصر تک پہنچ گئی ؛ لیکن وہاں اس کے معنی محدود تھے اور اس سے صرف وہ اجازت نامے مراد تھے جو غیر ملکی سفیروں کو دیے جاتے تھے ۔

اِطلاقات : وہ دستاویزات تھیں جن میں سابقہ فرمانرواؤں کے فیصلوں کی ازسرنو توثیق کی جاتی تھی ؛ تاہم بعض اوقات انھیں محض توقیع کہا جاتا تھا ۔ القلقشندی نے جن تین متنوں کا حوالہ دیا ہے ان میں فاطمیین کے اس اعلان کا اضافہ کر لینا چاہیے جو انھوں نے ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء میں کیا تھا (طبع Grohmann، در RSO، ص ۳۲، ۶۴۱) ۔

دَفن : (یعنی گناہوں کو دفن کر دینا) کہا جاتا ہے کہ یہ اصطلاح زمانہ قبل از اسلام کے عربوں میں مستعمل تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعدازاں متروک ہو گئی (غالباً اَمان [رک بآن] نے اس کی جگہ لے لی) [رک بہ] ذُنوب ، دَفن ۔

تقالید حکمیہ : یہ وقتاً فوقتاً قاضیوں کے لیے لکھی جاتی تھیں۔ یہ تقرر یا تو اسناد کی صورت میں عمل میں لائے جاتے تھے یا محض مکاتبات کی صورت میں۔

إسجالات العدالہ ، گواہوں کی نیک چلنی کے صداقت نامے : یہ مخطوطات بردی کی صورت میں بھی ملتے ہیں اور بعدازاں ممالیک کے دور تک بھی۔ اس کے آخر میں قاضی اپنے ہاتھ سے علامۃ ، تاریخ اور حسبلہ لکھتا تھا اور کاتب اس پر اپنی شہادت ثبت کرتے تھے۔

التوقیع علی القصص ، یعنی کھلی عدالت میں پیش ہونے والی درخواستوں پر فیصلے : کہتے ہیں کہ ساسانیوں کے عہد میں بھی اس کا رواج تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد بنو امیہ کے دور میں بھی یہ جاری رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کے عہد میں حقِ توقیع یحییٰ البرمکی کو منتقل کر دیا گیا تھا۔ والیانِ مصر بھی اس حق کو استعمال کرتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آل طولون کے بعد اس کا رواج ختم ہو گیا اور اس کی تجدید فاطمیوں کے عہد میں ہوئی۔ فیصلہ فوری طور پر کر دیا جاتا تھا، جیسے ''صاحبُ القلم الرّقیق'' عرضی کی پشت پر تحریر کر دیتا تھا۔ پھر سر براہِ دیوان کی طرف سے ہدایت (تعیین) مل جانے کے بعد ''صاحبُ القلمِ الجلیل'' اس فیصلے کی پوری پوری تعمیل کرتا تھا۔ فیصلے کا حق سر براہِ دیوان الانشاء کو حاصل تھا، حتیٰ کہ عہد ممالیک میں بھی یہی دستور رہا۔ سلطان خود عدالت میں صدر نشین ہوتا تھا۔ القلقشندی نے درخواست گزارنے کے چھے مختلف طریقے بیان کیے ہیں۔ یہ توقیع اس قدر مقبول ہوئی کہ لوگ پیشۂ کتابت کے لیے توقیع کی اصطلاح استعمال کرنے لگے اور خود کاتبوں کو مُوَقِّعُون کہنے لگے۔

عَقْدُ النکاح ، یعنی شادی کے معاہدے : یہ وہ قانونی دستاویزات تھیں جن میں معاشی تفصیلات کو خاص اہمیت حاصل تھی (حوائج العرس ، نُسخۃ صداق) ، تاہم مساوات کے اقرار ، بقایا مہر کی ادائیگی کے وعدے اور طلاق کی صورت میں تمام دعاوی سے دست برداری وغیرہ کو بھی ویسا ہی اہم سمجھا جاتا تھا۔

فتویٰ : اگرچہ مفتی میں بعض خصوصیات کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ کی کوئی باضابطہ اور معین صورت موجود نہیں تھی۔ بہرحال فتاوٰی کے متعدد مجموعوں کے مطالعے سے ایک مروجہ صورت ضرور سامنے آتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان میں ایک خاص قسم کے اختصار اور ایجاز کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

وَقفِیہ ، یعنی دستاویزِ وَقف : اس کا سراغ بھی عہد نبوی میں ملتا ہے۔ وکلاء نے اس کے مضمون اور طرز عبارت کے بارے میں قواعد و ضوابط مرتب کیے ہیں۔ اس قسم کی تمام دستاویزات میں وَقَفْتُ (=میں نے وقف کیا)، حَبَسْتُ (=میں نے وقف کیا) اور سَبَّلْتُ (=میں نے وقف کیا) کے الفاظ کے علاوہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسے نہ تو بیع کیا جا سکتا ہے نہ ہبہ اور نہ ترکے کے طور پر دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی عبارتیں، اصل مسودوں کی صورت میں، کتابوں میں اور پتھروں پر کھدی ہوئی محفوظ ہیں۔ زیادہ تعداد میں اوقاف معاشی صورتِ حال پر مضر اثرات ڈالتے تھے ، لہٰذا حکومت نے اس کا حل یہ نکالا کہ انہیں وسیع پیمانے پر بحق سرکار ضبط کرنا شروع کر دیا۔ زمانۂ حال میں بھی انہیں وزارت اوقاف کی نگرانی میں ضبط کر لیا جاتا ہے۔

وَصِیّۃ ، یعنی آخری خواہش، عہد نامہ، میراث : فقہ میں اس کی جزئیات پوری تفصیل سے درج ہیں۔ اس میں کسی طرح کی پابندی نہیں ، لیکن دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

وصایا دینیہ : یہ مرصّع عبارت کی طویل دستاویزات تھیں جنھیں اسلامی احکام و قوانین کی وضاحت کے لیے

منبر سے پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ فاطمیوں کے زوال کے بعد جب مسلک اہل السنة و الجماعت کا احیاء ہوا تو ان کی اہمیت خاص طور پر بڑھ گئی؛ علاوہ ازیں المغرب میں بھی ان کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔

یَمِین (قسم): بیعت لینے کی رسم میں حلف کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ایمان البَیْعة کو، جسے الحجّاج نے رواج دیا، بالخصوص بہت محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ فاطمیوں نے خاص طور پر، اس امر کے پیش نظر کہ ان کی رعایا ایک مختلف مذہب سے تعلق رکھتی تھی، ان قسموں کو بڑے منظم طریق سے وسعت دی۔ زمانۂ مابعد میں بھی جب [دو فریق] کوئی معاهده کرتے تھے، یا کوئی شخص کسی منصب پر فائز ہوتا تھا، یا کوئی پیشه اختیار کرتا تھا تو حلف اٹھانے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

عُمْرة: یه وہ دستاویزات ہیں جو ان زائرینِ بیت اللّٰہ کے لیے جو وہاں عمره ادا کرتے تھے تیار کی جاتی تھیں؛ لیکن یه بہت شاذ ملتی ہیں۔

إجازات: علماء اور مصنفین کی طرف سے بسا اوقات جاری ہوتی تھیں، مثلاً فُتْیا، تَدْرِیس، رِوَایَة۔ اکثر و بیشتر یه بڑی تقیطع کے قَرْخَة الشامی کی صورت میں ہوتی تھیں۔

مُلَطَّفات: یه فاطمیوں کی طرف سے اس وقت ارسال کی جاتی تھیں جب کسی صوبے کا عامل اپنا منصب سنبھالتا تھا یا کسی کو اعزاز (خلعة، تشاریف) عطا کیا جاتا تھا۔ نامۂ تقرر یا تحائف کے ساتھ جو خطوط بھیجے جاتے تھے ان کے لیے بھی ملاطفة کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

تَذْکِرة: یه وہ فرامین تھے جو اعلٰی عہدیداروں، سفیروں اور قلعوں کے کمانداروں کے نام صادر کیے جاتے تھے۔ ان کا تعلق زیادہ تر آمدنی اور اخراجات سے ہوتا تھا۔

تَقْرِیظ: اس کے ذریعے کتابوں یا منظومات (کے مطالعے) کی سفارش کی جاتی تھی؛ یه کبھی کبھی معرض تحریر میں آتی تھیں۔

۴۔ دستاویزات کا انتقال و اِضْعاف (=نقل نویسی):

اس میں کوئی شبهه نہیں که عرب مسودے، اصل اور نقل (نسخه) میں امتیاز کرتے تھے۔ ایک لائق نقل کرنے والا (ناسخ) ترقی کرکے منشی کے درجے تک پہنچ سکتا تھا (الصُّولی، ص ۱۱۸)۔ ابن الصَّیْرفی (ص ۱۳۲) لکھتا ہے که نسخه تیار کرنے کا پیشه اہم ہوتا تھا۔ اس نے مُبَیِّض (=صاف نسخه لکھنے والا) کا بھی ذکر کیا ہے۔ نقول پر نُسِخَ یا نُسِخَت (=لکھا گیا ہے) اور اصل کی طرح ان کی تصدیق بھی "صَحَّ" کے قلم سے ہو سکتی تھی۔ ان نسخوں کو محفوظ کر لیا جاتا تھا اور انشاء کے بعض مجموعے اور منتخبات غالباً انھیں مسودوں اور نسخوں کے مجموعوں سے مرتب کیے گئے ہیں۔

کتب تاریخ میں مسودات کی نقول کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ محمد حمید اللہ نے کم از کم ۲۶۹ ایسی دستاویزات جمع کی ہیں جو ۶۵۲ء سے قبل کے زمانے کی ہیں (*Documents sur la diplomatie musulmane à l'époque du Prophète et des khalifes orthodoxes*: Suivi de: *Corpus des traités et lettres diplomatiques de l'Islam*، پیرس ۱۹۳۵ء؛ نیز عربی میں: اَلْوَثَائِق السیاسیّة فی العهد النبوی والخلافة الرّاشدة)؛ لیکن اس امر کا ان دستاویزات کے مستند ہونے کے حل طلب مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔

۵۔ محافظ خانے: قدیم مشرق اور یونانی مصر میں بھی اصل اور نسخوں کو محافظ خانوں میں حفاظت سے رکھنے کا رواج تھا، لہٰذا یه قیاس کیا جا سکتا ہے که عرب بھی قدیم زمانے ہی میں اس دستور سے واقف تھے؛ چنانچه بعض مخطوطات بَرْدی کی پشت پر ان کا مختصر خلاصه ملتا ہے تاکه بسہولت انھیں جمع کیا جا سکے اور ان کا حواله تلاش کرنے میں زحمت نه ہو؛ لیکن وہاں کسی مرکزی محافظ خانے کی موجودگی

کا سراغ نہیں ملتا، جیسا کہ یونانی عہد میں ملتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں بارٹولڈ Barthold نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا کہ اسلامی مشرق میں دستاویزات کو محفوظ رکھنے کی کیا صورت تھی (*Arkhivnie Kursi*، ج ۱، پیٹروگراڈ ۱۹۲۰ء؛ دیکھیے *Islamica*، ۳ : ۱۳۵) - شاید یہ قیاس قابل قبول ہو کہ ہارون الرشید اور اس کے بیٹوں، امین اور مأمون کے مابین ۱۸۶ھ/۸۰۲ء میں معاہدے کی جو دستاویزات لکھی گئی تھیں وہ خانۂ کعبہ میں لٹکانے کے لیے مکّۂ معظمہ بھیج دی گئی تھیں اور یوں گویا انھیں اس مقدس مقام پر رکھ کر ایک طرح کے محافظ خانے کے اندر محفوظ کر دیا گیا تھا؛ [گو حقیقت یہ ہے کہ اس میں دستاویز کی اہمیت کو اس کی حفاظت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی]۔

عہد فاطمیین میں باقاعدہ محافظ خانہ ہوتا تھا اور ابن الصَیرفی (قانون، ص ۱۳۲) مہتمم محافظ خانہ کے لیے خازن [رکَ بآن] کی اصطلاح استعمال کرتا اور اس کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اس نے بغداد کے محافظ خانے الخِزَانَۃ العُظْمٰی کی تعریف کی ہے اور اُسے ایک مثالی نمونہ قرار دیا ہے۔ خازن کا فرض منصبی یہ تھا کہ آنے والی دستاویزات کے اصل نسخوں اور باہر جانے والی دستاویزات کی نقول کو ماہانہ ترتیب کے ساتھ علٰحدہ علٰحدہ مسلوں میں ان پر عنوانات لکھ کر مرتب کرے (إِضْبَارَۃٌ یَکْتُبُ عَلَیْھا بِطَاقَۃً)۔ عہد ممالیک میں اس دستور میں کسی حد تک کمی آ گئی اور ایسے بھی دور آئے جب کاتبُ السِّر کے دَوادار کو خازن کے فرائض سرانجام دینے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا۔

۶- دیوان : (الف) یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی کوئی دیوان قائم کیا تھا جہاں فرمانروایان عالم کے نام آپ کے شہرۂ آفاق مکتوبات معرض تحریر میں آئے، البتہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے کاتبوں کی مکمل فہرست موجود ہے، جس میں خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ ایک روایت کی رو سے بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس قسم کا پہلا محکمہ قائم کیا اور اسے دیوان [رکَ بآن] کا نام دیا۔ اس لفظ کا تعلق قدیم فارسی دیوان بلکہ آشوری دِپ dep سے قائم کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایرانی انتظامیہ کے ساتھ کسی حد تک اس کی مماثلت موجود ہے؛ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوانِ مالی اور فوجی امور کے لیے قائم کیا گیا تھا اور صحیح معنوں میں اسے دیوان حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(ب) دورِ بنو اُمیّہ میں عربی زبان کو سرکاری زبان کا وہ درجہ مل گیا جو قبل ازیں بلادِ مشرق میں فارسی اور بلادِ مغرب میں یونانی کو حاصل تھا۔ مشرق میں الحجّاج اور مغرب میں عبدالملک نے تحْویلُ الدِّیْوان إلی العَرَبِیَّۃ پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ ۸۲ھ/ ۷۰۱ء میں دَیْرالجَماجِم [رکَ بآن] کے قریب جنگ میں تمام دیوانوں کا جل کر خاکستر ہوجانا یقینا ایک تباہ کن حادثہ تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں اموی دیوانوں کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امیر معاویہؓ کے زمانے میں جب ایک بار جعلسازی کی کوشش کی گئی تو دستاویزات پر مہریں لگانے کا ایک خاص شعبہ دیوان الخاتَم قائم کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ولید بن عبدالملک نے بعض اِختراعات کیں، چنانچہ بردی کاغذ نسبۃً بہتر تیار ہونے لگا اور خط زیادہ خوشنما ہوگیا؛ تاہم حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دیگر امور کی طرح اس سلسلے میں بھی متقدمین ہی کی پیروی کو روا رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ بنو اُمیّہ ہی کے دور حکومت میں اَلتوقِیْعُ عَلَی القِصَص، یعنی کھلی عدالت میں خلیفہ کے مقدمات سننے اور فیصلے صادر کرنے کا دستور شروع ہوا۔ ان موقعوں پر خطّاط خلیفہ کے فیصلوں کو ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر لیتے تھے۔ عبدالحمید بن یحیی [رکَ بآن] اموی دور کا

مشہور ترین خطّاط تھا اور سلیمان کے عہد خلافت سے اس خاندان کے خاتمے تک سرگرم کار رہا۔ پتا چلتا ہے کہ اس نے فن خطّاطی کی ضرورت میں ہیئت اور مافیہ، دونوں کے اعتبار سے اضافہ کیا ؛ لیکن جو نگارشات اس سے منسوب کی جاتی ہیں وہ سب کی سب مستند قرار نہیں دی جا سکتیں۔

(ج) عہد بنو عباس کے دیوان: معلوم ہوتا ہے کہ بنو عباس نے اموی نظم و نسق کی بہت سی باتوں کو اختیار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے بالکل نیا نظام رائج کیا، جس میں ایرانی اثرات، جو عہد بنو امیّہ میں دبے دبے تھے، پوری طرح منظر عام پر آ گئے۔ "کاتب" کو وزیر کہنے لگے اور دیوان حکومت کو دیوان الرسائل یا دیوان الانشاء۔ اس کی تنظیم اور طریق کار کے بارے میں ہمیں بہت کم بیانات (بالخصوص ابن عَبْدوس الجَہْشیاری اور المَقریزی کے) ملتے ہیں۔ بعض نئی باتیں البرامکہ سے منسوب کی جاتی ہیں، مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ خالد بن برمک نے طومار (= صُحُف مُدْرَجَة) کے بجائے جرمی بھی کھاتوں (= "دفاتر من الجنود") کو رواج دیا اور یحیٰی بن خالد نے جسے ایک روایت کی رو سے ہارون الرشید نے توقیع القِصص کا حق عطا کر دیا تھا، بَسْمَلَة کو وسعت دے کر اس میں تَصْلِیَة بھی شامل کر دیا۔ جعفر بن یحیٰی کی توقیعات کے نسخے لکھے اور جمع کیے گئے اور ان کا مطالعہ تبحر و علمیت کے نمونوں کے طور پر کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ المَہدی نے یہ حکم دیا تھا کہ کاتبوں کو ہر جمعرات کی تعطیل ہوگی۔ المُستَعْصم کے عہد تک یہ حکم برقرار رہا، پھر اس روز بھی کاروبار جاری رہنے لگا۔ دَورِ بنی عباس کے مشہور کاتب اور وزیر حسب ذیل تھے: ابن مُقْلہ (م ۳۲۸ھ/ ۹۴۰ء)، ابن العَمید (م ۳۶۰ھ/ ۹۷۰ - ۹۷۱ء) اور ابو اسحٰق الصابی (م ۳۸۴ھ / ۹۹۴ء)۔ بہت سی اختراعات کا سراغ انھیں افراد تک لگایا جا سکتا ہے۔ لوگ مندرجۂ ذیل فقرے کو نقل کیا کرتے تھے: فُتِحَت الرسائل بِعَبْد الحمید و خُتِمَتْ بابن العَمِید (مکتوب نویسی عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہوئی)۔ آخر عہد عباسیہ کے دیوان الرسائل کے نظام کار کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس کے باوجود مصر اور دوسرے ملکوں کے دیوانوں میں اسی طریق کی پیروی کی گئی۔

(د) مصر میں دیوان: بردیات قدیم ترین عہد کے اصل مآخذ ہیں، اور گروھمان Grohmann نے *From the World of Arabic papyri*، ص ۴۴ ؛ ببعد میں انہیں کی بنا پر صوبوں کے نظم و نسق کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت مصر میں کوئی مرکزی دیوان موجود نہیں تھا، البتہ صوبوں کے لیے ایک دیوان قائم تھا، جس کا کام دارالخلافت کے ساتھ تبادلۂ مراسلات تھا۔ اتفاق سے فاتح مصر حضرت عَمرو بن العاص (م نواح ۴۳ھ/ ۶۶۳ء) کی ایک مہر کا نقش محفوظ رہ گیا ہے اور قُرّة بن شَریک (م ۹۶ھ/ ۷۱۴ء) کے متعدد مکتوبات بھی مل گئے ہیں، جن سے دیوان کا سا اسلوب جھلکتا ہے۔

۲۵۸ھ/ ۸۷۲ء میں جب احمد بن طُولون خودمختار ہوا تو نظم و نسق کی عام ترقی کے سلسلے میں اس نے بغداد کے نمونے کا ایک دیوان الانشاء قائم کیا۔ اس کا پہلا مہتمم ابن عَبْدکان تھا۔ اس کی بعض دستاویزات نے خاصی شہرت پائی۔ ابن الدّایَه (م ۳۴۰ھ/ ۹۵۱ء) اور عبدالحمید بن یحیٰی کی نسل سے تعلق رکھنے والے خانوادۂ بنو المُہاجر کے چار بھائی اس کے دوسرے کاتب تھے۔

مصر اور کسی غیر اسلامی ملک کے درمیان مراسلات کے تبادلے کے بارے میں پہلا بیان آلِ اِخشید کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے، یعنی جب محمد بن طُغج (۳۲۳ھ/ ۹۳۵ء تا ۳۳۵ھ/ ۹۴۶ء) نے بوزنطی شہنشاہ رومانوس Romanus اول کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو اس نے کئی کاتبوں کو اپنا اپنا مسودہ پیش

کرنے کا حکم دیا اور تجبّرمی کا مسودہ پسند کیا ۔

فاطمی دیوان کے بارے میں نسبتہً زیادہ معلومات ملتی ہیں، جس کے لیے ہم ابن الصَّیرفی کے مرہونِ منت ہیں ۔ اس کی تصنیف قانونُ دیوان الرسائل عملاً دیوان پر ایک رسالہ ہے اور وہ وزیر الأفضل (۴۸۷ تا ۵۱۵ھ/ ۱۰۹۴ تا ۱۱۲۱ء) کے نام معنون ہے ۔ ایک دیباچے کے بعد اس کتاب میں جو مندرجات آئے ہیں انہیں ایک دیوان کا دستورالعمل کہا جا سکتا ہے ۔ اگر حقیقتہً اسے جامۂ عمل پہنایا بھی گیا ہو تو مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب نہیں ملتے: اس سے پہلے دیوان کی کیا شکل و صورت تھی؟ اپنی تجاویز مرتب کرتے وقت اس کے پیش نظر کون سا نمونہ تھا؟ کیا یہ خود اس کے غوروفکر کا نتیجہ تھیں یا بغداد اور بوزنطیہ سے مأخوذ تھیں ؟ ابن الصیرفی سے ہمیں ان سرکاری ملازمین کے فرائض کی بہت سی تفصیلات کا پتا چلتا ہے جو دیوان میں ملازم تھے اور جیسے وہ دیوان الرسائل ، نیز دیوان المُکاتَبات اور (اپنی مؤخر تصنیف الاشارۃ إلٰی مَن نَالَ رُتْبَۃَ الوِزَارۃِ میں) دیوان الإنشاء لکھتا ہے۔ اس نے اہلکاروں کی بارہ مختلف اقسام بیان کی ہیں : (۱) مہتمم (رئیس، مُتَولّی، صاحب)؛ (۲) ایک کاتب یا دَبِیر فرمانرواؤں کو مکتوبات لکھنے (مُکاتبت السلوک) کے لیے ؛ (۳) شکایات کا فیصلہ کرنے کے لیے (التوقیعات فی رقاع المظالم)، جس کے ماتحت دو کاتب ہوتے تھے (صاحب القلم الدقیق اور صاحب القلم الجلیل)؛ (۴) ایک کاتب نامزدگیوں اور سرکاری اعلانات (اِنشاءات) کے لیے ؛ (۵) ایک کاتب ملک کے اہم افراد خصوصاً صوبوں کے عاملوں کو مراسلات لکھنے کے لیے ؛ (۶) ایک کاتب عطاے خلعت و خطاب (= مناشیر) کے لیے ؛ (۷) ایک مُبیِّض؛ (۸) ایک نقل نویس یا ناسخ؛ (۹) ایک تذاکر، یعنی نمونوں کے مجلد متون کا محافظ ؛ (۱۰) ایک خازن، یعنی مہتمم محافظ خانہ ؛ (۱۱) ایک حاجب یا محافظ ؛ (۱۲) ایک مترجم، جس سے صرف ضرورت کے وقت ہی مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔

اس اعتبار سے دیوان کے شعبے حسبِ ذیل تھے: سرکاری دستاویزات ، تقرّرات ، مقدمات کے فیصلے اور کبھی کبھی لکھی جانے والی دستاویزات، مثلاً اہم واقعات کے اعلانات (اَلکُتُب فی الحَوادِث اِلکبار و المُہِمّات) ، اجازت نامے (امانات)، قسموں اور حلفوں کے متون (کُتُبُ الأیمان وَ القَسامات)، وغیرہ .

ہمیں ایسا کوئی خاص متن نہیں ملتا جس سے سلاطین آل ایوب کے عہد کے دیوان الرسائل کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں ، لیکن چند تفصیلات رسائل القاضی الفاضل میں اور ابن مَمّاتی ، النابُلُسی اور ابن شِیث کے ہاں مل جاتی ہیں۔ القاضی الفاضل نے بتایا ہے کہ اسے دیوان الانشاء میں بڑے سخت امتحان کے بعد داخلہ ملا تھا ۔ اس نے دیوان میں گروہ بندیوں اور سازشوں کا حال لکھا ہے ۔ ابن شیث نے صوبۂ شام کی صورت حال کا ذکر کیا ہے اور دستاویزات کے اسلوب پر خاص توجہ دی ہے ۔ مرسل کے "ترجمہ" کا مفصل بیان ملتا ہے ؛ دُعا، نُعوت اور عُنوان کے علاوہ دیگر دیوانوں کے ساتھ شرکت کار کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے .

ہمارے مفصل ترین ماخذ کا آغاز عہد ممالیک سے یعنی شہاب الدین بن فضل اللہ (م ۷۴۹ھ/ ۱۳۴۸-۱۳۴۹ء) : التَّعریف بالمُصطَلَحِ الشّریف (تین شرحوں ، تثقیف ، عرف اور لطائف کے ساتھ) سے ہوتا ہے ۔ اس سلسلے میں القلقشندی (م ۸۲۱ھ/ ۱۴۱۸ء) کا جلیل القدر دائرۂ معارف صُبح الاعشٰی (مع مختصر ضوء الصبح) بہت ممتاز ہے ۔ عہد ممالیک کے اواخر کی تصنیفات میں سے ہمارے پاس دیوان الانشاء کا مخطوطۂ پیرس اور خلیل الظاہری (م ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۸ء) کی زُبدۃ کشف الممالیک موجود ہے ۔ القلقشندی کو بالخصوص اس لیے بنیادی مأخذ قرار دیا جانا چاہیے کہ اس نے خاصی تاریخی تحقیق کے بعد ابتدائی ارتقاء کا جائزہ پیش کیا ہے ،

لہذا اس کی تصنیف کو عربی دستاویز کا پیش رو سمجھنا چاہیے ۔ دیوان الانشاء کے رئیسوں میں بنو عبدالظاہر اور بنو فضل اللہ کے خانوادوں نے بڑی شہرت پائی اور ان کے مراتب برابر بلند ہوتے رہے ۔ کاتب السِّر کا لقب قلاوون کے عہد میں مروج ہوا اور ناصر محمد بن قلاوون کے دور حکومت میں رئیس دیوان الانشاء کو توقیع علی القصص کا منصب اور وزیر پر تقدم حاصل ہو گیا ۔ اس عہدے کی اہمیت بڑھ جانے سے ملازمین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ۔ اعلٰی درجے کے عہدے داروں کے لیے کاتب الدَّست اور ادنی درجے کے عہدیداروں کے لیے کاتب الدَّرج کے لقب استعمال ہونے لگے ۔ اگرچہ ان کی تعداد تو بڑھ گئی لیکن عوام کی نظروں میں ان کی توقیر گھٹ گئی ۔ رئیس دیوان آہستہ آہستہ سرکاری ڈاک اور اخبار رسانی کے انتظام کو اپنے تحت اختیار لانے میں کامیاب ہو گیا ۔

فرائض و اختیارات کی حدود یہاں بھی وہی تھیں جو فاطمیوں کے دور میں تھیں ، لیکن ان میں وسعت اور امتیاز پیدا ہو گیا ۔ اس زمانے میں دنیا کے تمام معمورہ حصوں کے ساتھ روابط پیدا ہونے کے باعث غیر ملکی خط و کتابت میں بالخصوص بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ۔ غیر ملکی زبانوں اور ترجمانوں کو اہمیت حاصل ہوئی ۔ جوں جوں مراتب ، القاب اور خطابات میں اضافہ ہوا ، صوبوں کے ساتھ تبادلۂ مراسلات میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں ۔ عہدوں (یا ولایات) کی تعداد بھی بڑھی اور وہ مزید تحریری کام کا تقاضا کرنے لگے ؛ چنانچہ اب عہدے داروں کے پانچ مختلف مدارج قائم ہو گئے (دیکھیے سطور بالا ، ج ۳) ۔ تمام وقتی دستاویزات ، مثلاً معاہدوں ، امانتوں ، قسموں اور معافی کے اعلانوں وغیرہ کی طرح توقیعات القصص بھی جاری رہیں ۔

۶۔ مصر کے مقابلے میں دیگر عرب ممالک ، مثلاً المغرب اور الاندلس کے دیوانوں کے بارے میں ہماری معلومات بہت مختصر ہیں ۔ یہاں اصطلاح ظَہِیر کا اطلاق عام طور پر تمام دستاویزات پر کیا جاتا تھا ۔ ابن الخطیب (م - ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ع) نے اپنی تصنیف ریحانة الکُتّاب کے باعث شہرت پائی ، جس کا القلقشندی نے کثرت سے حوالہ دیا ہے ، دیکھیے نیچے فصل ۲ ۔

۷۔ دستاویزات کی اہمیت بطور شہادت : فقہ اسلامی کی رُو سے صرف وہی ثبوت قابل قبول ہے جو گواہوں کے ذریعے پیش کیا جائے اور محض تحریری شہادت کو اصولی طور پر رد کر دیا جاتا ہے ۔ بہرحال جہاں تک قانون کے عملی اطلاق کا تعلق ہے دستاویزات کو بہت اہمیت حاصل رہی ۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عرب میں زمانۂ قبل از اسلام میں بھی معاہدے لکھے جاتے تھے ۔ بلاد مشرق میں مہر یا خاتم کا سراغ بہت قدیم زمانے سے ملتا ہے اور اسے عربی دستاویزات میں توثیق کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا تھا ۔ یورپ کی طرح یہاں دستخطوں نے مہر کی جگہ نہیں لی بلکہ یہاں دستاویز پر دستخط ثبت ہونے کی صورت میں بھی اسے اس وقت تک مستند نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک اس پر مہر نہ لگی ہو ۔ کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک چاندی کی مہر تھی ، جس پر کلمۂ "محمّد رسول اللہؐ" کندہ تھا ۔ قدیم ترین محفوظ مہر حضرت عمرو بن العاصؓ کی ہے ۔

۸۔ دستاویزات کا ارتقاء : عربی دستاویزات میں عرضداشتیں (قِصَص) اور ابتدائی امور بھی ملتے ہیں ۔ عرضداشتیں ظاہر ہیں کہ فیصلوں یا توقیعات سے مقدم ہوتی تھیں کیونکہ انھیں کی بنا پر فیصلے صادر کیے جاتے تھے ۔ توقیع کا اصل متن بالعموم مختصر ہوتا تھا اور اس میں صرف مطالب کی بات کہی جاتی تھی ؛ چنانچہ اس میں قصص کا ذکر مشکل ہی سے ہو سکتا تھا ۔ اسی طرح فتوی بھی کسی تفتیش کے بعد ہی دیا جاتا تھا اور اس میں صورت حال کو کم و بیش صراحت

کے ساتھ معین الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا اور نام محذوف ہوتے تھے۔ معاهدے طویل گفت و شنید کے بعد ضبط تحریر میں آتے تھے، لیکن معاهدے کے اصل متن میں ان مبادیات کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔

۹۔ طریق کار، توثیق اور مدارج توثیق: یورپی دستاویزات کے جو نو مدارج توثیق ہمیں معلوم ہیں، عربی دستاویزات میں ان میں سے ابھی تک صرف چند ایک کا سراغ ملا ہے۔ ابن الصَّیرفی (ص ۱۰۸ ببعد) نے نظرثانی اور درستی کے لیے مقابلہ اور اصلاح کی اصطلاحات کا ذکر کیا ہے۔ فرمانروا کے ساتھ مشورے کے دوران میں رئیس دیوان جواب میں لکھے جانے والے صرف بنیادی نکات کی طرف اشارہ کر دیتا تھا، لیکن اصل جواب متعلقہ کاتب (سیکرٹری) تحریر کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس جواب کا مقابلہ خلاصے کے ساتھ کرتا؛ اگر ضرورت محسوس ہوتی تو فروگذاشتوں اور فیصلوں کی اصلاح کرتا (ایک خاص اصلاح دینے والے: مُتَصَفِّح کا ذکر بھی ملتا ہے) اور پھر مکمل جواب فرمانروا کی خدمت میں دستخط کے لیے پیش ہوتا، جو اپنے دستخط (عَلَامَة) ثبت کر دیتا۔ پتا (عنوان) ہمیشہ رئیس دیوان ہی لکھتا تھا، جو اس بات کا واضح ثبوت ہوتا کہ وہ مضمون سے واقف اور اس کی ذمے داری قبول کرتا ہے۔ اور اس پر عملدرآمد کرانے کے لیے دستاویز "تعیین" کی متقاضی ہوتی تھی، یعنی اُسے عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ اس کا خلاصہ قِصّة کی پشت پر درج کیا جاتا تھا؛ یہ تعیین رئیس دیوان اپنے ہاتھ سے رقم کرتا تھا۔ جس کاتب کو فیصلے پر عمل درآمد کرانے کا حکم دیا جاتا تھا، اس کے مرتبے کے مطابق مختلف کلمات وغیرہ استعمال کیے جاتے تھے، مثلاً یُکْتَبُ بِذَالِکَ یا لِیُکْتَبْ بِذَالِکَ (=یہ لکھا جانا چاہیے) (دیکھیے القلقشندی، ۶ : ۲۱۰)۔ ظاہر ہے کہ صاف نسخے کی نفاست اور صفائی پر بے حد توجہ صرف کی جاتی تھی اور اس کام کے لیے فاطمیوں نے ایک خاص مُبَیِّض مقرر کر رکھا تھا جس پر ہر قسم کی دستاویزات کی ذمے داری ہوتی تھی (دیکھیے ابن الصَّیرفی، ص ۳۳ ببعد)۔ اس بات کی وضاحت کہیں نہیں ملی کہ یہ صاف نسخہ فرمانروا کے سامنے پڑھ کر سنایا جاتا تھا، یا اُس کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

۱۰۔ شفیع اور شاهد: نبی آکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی شفاعت دین اسلام میں مشہور ہے، مگر شفاعت کا لفظ غیر دینی نوعیت کی سفارش پر بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً فرمانروا کی خدمت میں عرضداشت پیش کرتے یا کسی مقروض کی ضمانت دیتے وقت۔ القلقشندی (۹ : ۳۴۲) نے ابتدائی اور مؤخر زمانے کے متون کے نمونے دیے ہیں اور ایک "امان" نقل کیا ہے (۱۳ : ۳۲۸) جس میں شفیع کا حوالہ ان الفاظ میں آیا ہے: إِنَّ مُحَمَّد ابْنَ الْمُسَیَّب سَئَلَ فِی أَمْرِکُمْ وَ ذَکَرَ رَغْبَتَکُمْ فِی الْخِدْمَة۔ (=محمد بن المسیب نے تمھارے بارے میں سوال کیا اور خدمت کے لیے تمھاری رغبت کا ذکر کیا)۔

۱۱۔ کاتبوں کے لیے نمونۂ دستاویزات: یورپ میں روما قدیم کے زمانے سے قرون وسطٰی کے آخر تک ہمیشہ دستاویزات کے لیے ایک معین قسم کی عبارت استعمال ہوتی رہی۔ پہلی صدی کی بعض عربی بردیات ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مراسلات اور دستاویزات ایک خاص طرز و عبارت میں لکھے جاتے تھے؛ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بعض نمونے رائج تھے، اگرچہ اب وہ محفوظ نہیں رہے۔ بعد کے زمانے کی عربی خطوط نویسی جسے انشاء کہا جاتا ہے، ادب کی ایک جداگانہ صنف ہے۔ اس میں تین اقسام متمیز کی جا سکتی ہیں: (۱) نمونوں کے مجموعے؛ (۲) طرز بیان اور تحریری دستاویزات کے متعلق رسائل جو یورپ کی artes یا summae dictaminis سے مشابہ ہیں؛ (۳) دونوں کا مرکب، یعنی اصول مع نظری شرحوں کے، یا نظری رسائل مع عملی مثالوں کے۔ یہ ان رسالوں سے ملتے جلتے ہیں جو یورپ میں بارھویں صدی

کے بعد سے ملتے ہیں ۔ متعدد (پچاس سے زیادہ) عربی کتب انشاء میں سے اہم ترین غالبًا حسب ذیل ہیں : الصولی (م ۳۳۵ھ/۹۴۶ء): ادب الکُتّاب (قسم دوم)؛ ابواسحٰق الصابی (م ۳۸۴ھ/۹۹۴ء): رسائل (قسم اول)؛ ابن الصَّیرفی (م ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء): قانون دیوان الرسائل (قسم دوم)؛ القاضی الفاضل (م ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء): رسائل (قسم اول)؛ شہاب الدین بن فضل اللہ (م ۷۴۹ھ/ ۱۳۴۸-۱۳۴۹ء) : التعریف بالمُصطلح الشریف (قسم سوم)؛ القلقشندی (م ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء) صبح الاعشٰی فی صناعۃ الانشا (قسم سوم)۔ مبادیات کے سلسلے میں غالبًا ان نگارشات کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو اِطْلاقات کے نام سے مشہور ہیں اور جن سے گزشتہ فرمانرواؤں کے فیصلوں کی توثیق کی جاتی تھی ۔

۱۲. نقول : یورپ میں تو اصل کے مطابق سرکاری نقلوں یا نسخوں کی کئی مثالیں ملتی ہیں لیکن مجھے اس قسم کی عربی نقول کا علم نہیں ، گو ان کی موجودگی کے قیاس کے اسباب یہاں بھی موجود تھے، مثلاً اصل کا گم ہو جانا یا کسی نئے فرمانروا کا بر سر حکومت آنا ؛ عربی میں غیر قانونی نقول یا جعلسازی کی مثالیں بھی ملتی ہیں ۔ الصُّولی (۱۴۳) کے ہاں قدیم زمانے کی ایک جعلسازی کا تذکرہ ملتا ہے کہ کس طرح مِئَۃُ اَلْف کو مِئَتَی اَلْف کر دیا گیا ؛ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ بنو اُمیّہ نے دیوان الخاتم قائم کیا ۔ القلقشندی (۱۳ : ۱۰۴) نے تمیم الداری کے پہلے عطیۂ اراضی کی دستاویز کے بارے میں لکھا ہے ۔ شہاب الدین بن فضل اللہ (مسالک، ۱ : ۱۴۳) نے دعوٰی کیا ہے کہ اس نے اس کی اصل دیکھی تھی، لیکن اسے زیادہ سے زیادہ ایک جعلی دستاویز کہا جا سکتا ہے ۔ جو دستاویزات نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے منسوب ہیں اُنھیں حمید اللہ نے مستند تسلیم کیا ہے؛ [اس سلسلے میں محدثین کے ہاں مفصل بحث ملتی ہے] ۔ جعلی بَرْدیات کے بارے میں تب Grobmann : Chrestomathie، ص ۳۵ .

۱۳. دستاویزات کی زبان : اگرچہ قرون وسطٰی میں لاطینی زبان کے ارتقاء پر بڑا سیر حاصل تحقیقی کام ہوا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں کلاسیکی قرون وسطٰی کی زبان سے لے کر موجودہ ادبی زبان تک عربی کے ارتقاء کا محض ایک عمومی سا خاکہ ہمارے سامنے آیا ہے (رکّ بہ عربیّہ) ۔ دستاویزات کی تحویل کے سلسلے میں یہ ارتقا بے حد اہمیت رکھتا ہے ۔ اس کی ایک مخصوص شاخ نثر مقفّٰی یا مُسَجَّع ہے ؛ جس پر زکی مبارک کے رسائل (*La prose arabe au 4^{e} siècle de l'hégire*، مقالۂ تحقیقی، پیرس ۱۹۳۱ء) کے علاوہ دیکھیے عربی میں النثر الفنّی فی القرن الرابع، ۲ جلد، ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳-۱۹۳۴ء) شاہد ہیں ۔ دوسری اصناف کی طرح دستاویزات میں سجع اپنے نقطۂ کمال پر دور ممالیک میں پہنچی ۔ دستاویزات کی زبان میں جو عامیانہ اور بازاری الفاظ ملتے ہیں اُن سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے ۔ اس طرح کی زبان کا سراغ مخطوطات پیرس میں بھی ملتا ہے اور اسی وجہ سے آگے چل کر کاتب بار بار غلطیوں کا ارتکاب کرتے رہے ۔ الصُّولی (ص ۱۲۹) اور القلقشندی (۱ : ۱۳۸ ببعد) کے ہاں اس کا ذکر تفصیل سے آیا ہے .

۱۴. تاریخ : یورپ کی طرح [عربی میں بھی] تاریخ کے سلسلے میں گوناگوں مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ عام ہجری تاریخیں بھی متعدد امکانات کی حامل ہیں ، مثال کے طور پر راتوں اور دنوں ، تہوار کے دنوں اور مہینے کے مختلف حصوں وغیرہ کی رو سے تاریخیں ڈالنا ، لیکن القلقشندی (۶ : ۳۳۲ ببعد) نے کم از کم اُنّیس قدیم تقویموں اور ایک نئی تقویم، یعنی یَزْدجِرد کی تقویم، کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بیشتر کی اہمیت زیادہ نہیں ۔ صرف عیسوی اور قبطی سن کثرت سے آتے ہیں ۔ ایک خاص مشکل محاصل کے

سلسلے میں قمری اور شمسی سال (سَنَۃ ھلالیہ و خراجیّہ) کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں پیش آتی ہے؛ دور بنی عباس جیسے قدیم زمانے ہی میں ضرورت پیش آنے پر "فی تحویل السنۃ" کے موضوع پر خصوصی دستاویزات لکھی گئیں [رک بہ تاریخ].

۱۵ - کتابت کا سامان: بَرْدی مخطوطات کے ماہرین نے سامان کتابت پر بڑا سیر حاصل کام کیا ہے۔ اس ضمن میں جدید ترین تحقیق گروھمان Grohmann کی ہے (Chrestomathie، ص ۶۳ ببعد)۔ عام معمولی سامان (گیارھویں صدی تک پیپرس، چمڑا، کاغذ) کے علاوہ ایسی چیزیں بھی تھیں جو کبھی کبھار استعمال ہوتی تھیں، مثلاً کپڑا (بالخصوص عَقد النکاح کے لیے)، لکڑی، پتھر، لاکھ، ہڈی اور ٹھیکری، سائز (قَطْع، الصُّولی کے ہاں مقدار) میں بڑا اختلاف پایا جاتا تھا۔ انواع اوراق کی قیمتوں کے سلسلے میں بھی یہی صورت تھی۔ القلقشندی نے روشنائی (حِبر مِداد) کی کئی قسمیں لکھی ہیں [نیز ابن السید البطلیوسی (م ۵۲۱ھ) نے الاقتضاب فی شرح ادب الکُتّاب (ص ۷۰ ببعد) میں سامان خط و کتابت، اقسام کاغذ و قلم وغیرہ پر مفید اور تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے؛ رک بہ جلد، کاغذ، قرطاس، رَقّ، وَرَق].

۱۶ - دستاویزات کا خط: اگرچہ اس موضوع پر Moritz، Tisserand، Cheikho اور دوسروں نے بہت سا بنیادی کام کیا ہے، تاہم عربی خط کی کوئی مکمل عالمانہ تاریخ نہیں ملتی (قب خط)۔ Grohmann نے پیپرس کے خط کی تحقیق کی ہے (Chrestomathie، ص ۸۸ تا ۱۰۳)۔ جہاں تک مؤخر دستاویزات کا تعلق ہے بلا تاریخ اوراق کے زمانے کا قریبی اندازہ لگانے کے لیے خط کی مختلف انواع کی امتیازی خصوصیات، اعراب کا استعمال اور امتیازی علامات کا علم کافی ہے۔ دستاویزات پر بعض عبارتیں، اعداد، یادداشتیں، وغیرہ اکثر اختصار کی صورت اور شکستہ خط میں ملتی ہیں، جسے مختصر نویسی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ Grohmann (Chrestomathie، ص ۸۳) نے سامان کتابت پر بحث کی ہے اور القلقشندی (۲: ۴۳۰) نے کم از کم سترہ اصطلاحات کی فہرست دی ہے، لیکن چونکہ ان کی تصویریں نہیں بنائی گئیں اس لیے ان کا صحیح مفہوم سمجھنا مشکل ہے۔ خفیہ تحریروں (codes) اور رمزیہ زبان کی بھی ہمیشہ کچھ نہ کچھ اہمیت رہی ہوگی، جیسا کہ الصولی (ص ۱۸۹، ترجمۃ) اور القلقشندی (۹: ۲۲۹، تَعْمِیَۃ، بعدازاں حَلّ الرُّمُوز) سے ظاہر ہے۔ یہ چیزیں بردی مخطوطات تک میں موجود ہیں (Grohmann: Chrestomathie، ص ۱۰۳ ب).

۱۷ - مہر لگانا: الصُّولی (ص ۱۳۹) اور القلقشندی (۳: ۲۷۳) کو تو مُہر یا خاتم سے دلچسپی تھی ہی، لیکن ھامر Hammer کے زمانے سے یورپ میں بھی عربی مہروں کی شکل و صورت اور استعمال کے بارے میں خاصی دلچسپی پیدا ہو چلی ہے۔ Grohmann کے خیال کے مطابق (Chrestomathie، ص ۱۲۹ ببعد) مہر لگانے کی مختلف غایتوں کا بھی امتیاز ذہن میں رکھنا ضروری ہے، یعنی توثیق کے لیے دستخط کے بجائے مہر لگانا، شناخت اور تصدیق کے لیے مہر لگانا، گواہوں کی طرف سے مہر لگانا [رک بہ خاتم].

مآخذ: عربی بردیات پر معلومات کے وسیع ذخیرے کے بارے میں غالبًا بہترین تصنیف (۱) A. Grohmann: *Einführung und Chrestomathie zur arabischen Papyruskunde*، ۱۹۵۵ء، ج ۴ تا ۷، ہے؛ قب نیز (۲) *Die Papyri und die Urkundenlehre*، ص ۱۰۷ تا ۱۳۰؛ عربی تصنیفات: (۳) الصُّولی: أدب الکُتّاب، طبع محمد بَہْجۃ الاثری، قاہرہ ۱۳۴۱ھ؛ (۴) ابن الصَّیْرَفی: قانون دیوان الرسائل، طبع علی بَہْجۃ، قاہرہ ۱۹۰۵ء؛ (۵) شہاب الدین بن فضل اللہ: التعریف بالمُصْطَلَح الشریف، قاہرہ ۱۳۱۲ھ؛ (۶) القلقشندی: صُبْح الاعشٰی فی صناعۃ الانشاء،

ج ۱ تا ۱۴، القاہرہ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء تا ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء؛ (۷) W. Björkman: *Beiträge zur Geschichte der Staatkanzlei im islamischen Ägypten*، ہیمبرگ ۱۹۲۸ء، ص ۸ تا ۱۰۷، بمدد اشاریہ؛ دستاویزات کی قدیم تر مطبوعات از S. de Sacy، Amari، Cusa، de sousa، Remiro، Ribera وغیرہ کو (۸) G. Gabrieli: *Manuale*، ص ۲۵۵ تا ۲۸۸، میں جمع کر دیا گیا ہے۔ جدید مطبوعات کے بارے میں قب (۹) H. R. Roemer: *Über Urkunden zur Geschichte Ägyptens und Persiens in islamischer Zeit*، در *ZDMG*، ۱۰۷ (۱۹۵۷ء): ۵۱۹ تا ۵۲۸ (اس میں فاطمی و مملوک دستاویزات کو طبع کرنے کے بارے میں [حکومت] مصر کے منصوبے کا ذکر بھی ہے)؛ (۱۰) A. Grohmann و Pahor Labib: *Ein fatimidenerlass vom Jahre* ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء، در *R. SO* ۳۲ (۱۹۵۷ء)؛ ۶۴۱ تا ۶۵۴ (جس میں *Monomenta diplomatica arabica* کے منصوبوں کا ذکر ہے)؛ (۱۱) J. Wansbrough: *A Mamluk letter of 877/1473*، در *BSOAS*، ۲۴/۲ (۱۹۶۱ء)؛ ۲۰۰ تا ۲۱۳؛ (۱۲) S. D. Goitein: *The Cairo Geniza as a source for the history of Muslim civilization*، در *Stud. Islam*، ۳ (۱۹۵۵ء)؛ ۷۵ تا ۹۳؛ (۱۲) الشیّال G. E. El Shayyal: مجموعة الوثائق الفاطمیه، ج ۱، القاہرہ ۱۹۵۸ء؛ (۱۴) حسن الباشا: الألقاب الاسلامیه، قاہرہ ۱۹۵۷ء؛ مزید رک بہ دفتر؛ سجل؛ توقیع؛ وغیرہ؛ (۱۵) ابن قتیبہ: ادب الکاتب؛ (۱۶) صبحی الصالح: النُّظُم الاسلامیة، بیروت ۱۳۸۵ھ؛ (۱۷) ابن السید البطلیوسی: الاقتضاب فی شرح ادب الکُتّاب، بیروت ۱۹۰۰ء؛ (۱۷) ابن ہشام: السیرة النبویه، القاہرة ۱۹۳۳ء؛ (۱۸) احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی، القاہرة ۱۹۶۲ء؛ (۱۹) ابن الأبّار: إعتابُ الکُتّاب، مطبوعة دمشق۔

(W. Björkman)

۲۔ المغرب

دستاویزات کی ظاہری خصوصیات (ترتیب عبارت، کاغذ کا رنگ، خط کی قسم وغیرہ) نیز طرز و انتخاب عبارات میں المغرب کی دستاویزات مشرق ممالک کے مقابلے میں سادگی کی حامل ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مراکش کے المُوحّدون نے ایک قلمی علامت توثیق کو رواج دیا۔ اسے عَلَامَة کہتے تھے اور یہ "والحمد لله وحده" کے نیازمندانہ کلمے پر مشتمل تھی۔ یہ عبارت جلی حروف میں بڑی نفاست سے کندہ ہوتی تھی۔ آخری لفظ میں حروف ہ اور د مربوط ہوتے تھے اور آخر میں اختتامی سجل آتا تھا (دیکھیے سطور زیریں)۔ یہ علامت توثیق بعد میں دستاویز کی پیشانی پر اس چوڑی پٹی پر لکھی جاتی تھی جسے کاتب بَسْمَلة اور تَصْلِیَة کے نیچے اس لیے خالی چھوڑ دیتا تھا کہ علامت اسی کا نتیجہ متصور ہوتی تھی۔

یہ کلمہ عقیدۂ توحید کا حامل ہے اور قیاس ہے کہ مہدی بن تُومَرت نے اسے اپنی بعض توقیعات میں استعمال کیا ہوگا؛ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس کے جانشین عبدالمؤمن نے اسے اپنے مشہور رسالة الفصول میں استعمال کیا (دیکھیے Elévi-Provençal: *Documents inédits d' histoire almohade*، عربی متن، ص ۱۳)۔ القرطاس (فاس ۱۳۰۵ء، ص ۱۵۳) کی رو سے دراصل یعقوب المنصور (۵۸۰/۱۱۸۴ء تا ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء) نے اس عبارت کو پہلی بار بطور (علامة) اختیار کیا اور اسے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ حقیقت یہی ہے کہ پہلی بار اسی فرمانروا کے عہد میں الموحدون کے دینار (رک بہ Lavoix: *Espagne et Cat mon mus Afrique*، ص ۳۰۳ تا ۳۰۸) پر سابقہ عبارت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی جگہ یہ عبارت بطور علامت کندہ ہونی شروع ہوئی۔

افریقیہ کے الموحد حَفْصی فرمانرواؤں نے اس

عبارت میں "والشُکْرُ لِلّٰه" کے الفاظ کا اضافہ کیا ۔ آگے چل کر غرناطہ کے بنو نصر نے "وَلَا غَالِبَ اِلَّا اللّٰه "(=صرف اللہ ہی غالب آنے والا ہے) کی عبارت اختیار کی ۔ عین ممکن ہے کہ اس کے پس منظر میں اپنے جد امجد نَصْر کی، جس کے نام پر یہ خاندان مشہور ہوا ، یادگار قائم کرنے کا جذبہ کارفرما ہو ۔ علاوہ بریں ان کے پہلے فرمانروا نے الغالب باللّٰہ کا لقب اختیار کیا تھا ۔

بنو حفص اور بنو نصر کی یہ دونوں خاندانی علامات ان کے سکوں اور بعض آثار پر بھی ملتی ہیں۔

شروع شروع میں خود فرمانروا اپنے ہاتھ سے یہ علامت رقم کرتا تھا ، لیکن بعد ازاں یہ ذمہ داری ایک بہت اعلٰی اور معتمد عہدیدار (جسے ایک طرح کا وزیر یا مہر بردار کہنا چاہیے) کے سپرد کر دی گئی ۔ اسے 'صاحب العَلَامَة' کہا جاتا تھا ۔ اکثر اوقات اس عہدے پر کسی بہت ممتاز عالم کو مقرر کیا جاتا تھا ، چنانچہ تونس میں ابن الأبّار [رکّ بآن] اور ابن خَلْدون [رکّ بآن] اس منصب پر فائز رہے ۔ توثیق طلب دستاویزات کی اہمیت کے اعتبار سے اس پر علامة کبریٰ یا علامة صغریٰ ثبت کی جاتی تھی ۔ یہ علامات دو مختلف درجوں کے وزراء کے سپرد کی جاتی تھیں ۔

مراکش میں بنو سعد کی حکومت کے خاتمے تک الموحدون کے حَمْدَلَه کا استعمال بطور علامة جاری رہا ، لیکن اس کی تحریر نے بڑی فنکارانہ صورت اختیار کرلی اور بالآخر طغرائی نقش و نگار کی صورت میں لکھی جانے لگی ، جس کا پڑھا جانا بھی مشکل تھا ۔ ممکن ہے کہ یہ ترکی طغریٰ [رکّ بآن] کی نقل ہو ۔ بنی سعد کی انتہائی فنکارانہ علامة، جسے ایک لحاظ سے ان کے خاندانی نشان کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی ، ان کی بندوقوں پر ، ان کے بعض سکوں پر اور ان کے محلات کے نقش و نگار پر ملتی ہے ۔ بنو سعد کی حکومت کے آخری برسوں میں قلمی 'علامة' کے علاوہ ایسی بیضوی مہر کا استعمال بھی ہونے لگا تھا جس پر 'علامة' کندہ تھی اور اسے روشنائی سے لگایا جاتا تھا ۔

ان کے جانشین مراکشی خانوادے، یعنی علویوں نے الموحدون کی علامة کا استعمال، خواہ وہ قلمی تحریر کی صورت میں ہو یا مہر کی صورت میں، قطعاً ترک کر دیا ۔ اب توثیق کا واحد نشان یہ تھا کہ ایک مُدَوَّر مہر (تابع) روشنائی سے ثبت کر دی جاتی تھی، جو دستاویز کی اہمیت کے اعتبار سے چھوٹی بڑی ہوتی تھی اور حَمْدَلَه اور تَصْلِيَة کے درمیان خالی جگہ میں لگائی جاتی تھی ۔

المغرب کی دستاویزات کی ایک اور قابل ذکر خاص بات یہ ہے کہ جہاں دستاویز کا متن ختم ہوتا تھا وہاں ایک اختتامی نشان تاریخ کے عین بعد لگایا جاتا تھا، جو حرف 'ہ' پر مشتمل ہوتا تھا ۔ اس کا آخری سرا دائیں جانب مڑا ہوا ہوتا تھا ۔ اسے بے معنی نہیں سمجھنا چاہیے ۔ دراصل یہ لفظ "انتہا" کی اختصار شدہ صورت تھی ۔ بہرحال اسے اس توقیع کی اختصارشدہ صورت نہیں سمجھنی چاہیے جسے فرمانروا اپنے قلم سے مراعات و عطیات کی اسناد کے خاتمے پر تحریر کرتا تھا، یعنی صَحَّ هٰذا یا صحیحٌ ذٰالِکَ (=یہ مستند ہے) ۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بنو وطاس اور بنو سعد کے زمانے کی بعض دستاویزات پر تاریخیں یونانی اعداد میں درج ہیں ۔ یہی بات ان کے بعض سکوں میں بھی ملتی ہے ۔ علاوہ ازیں بنو سعد کے سلطان احمد المنصور نے ایک رمزی تحریر بھی استعمال کی تھی ۔

المغرب کی دستاویزات کی بڑی بڑی اقسام حسب ذیل ہیں : (۱) ظہیر (کتاب ظہیر کے لیے ، جمع : ظہائر؛ مراکش کی مقامی بولی میں ضہیر، جمع : ضواہر) یہ ایک سند تھی جس کی رو سے کسی جاگیر وغیرہ یا محاصل ، مالیانہ اور بیگار کی معافی

عطا کی جاتی تھی اور بالخصوص شرفا یا مرابطون کے حق میں ہوتی تھی؛ (۲) تنفذہ، وہ سند تھی جس کی رو سے عمر بھر کے لیے کسی کا وظیفہ مقرر کیا جاتا تھا یا ایسی جائداد کا حق استفادہ عطا کیا جاتا تھا جو شاہی ملکیت ہو۔ دستاویزات کی یہ دو مخصوص اقسام صَکّ بھی کہلاتی ہیں؛ (۳) رسالۃ یا براءۃ (مقامی بولی میں بَرا)، کسی جماعت کے نام ایک مراسلہ ہوتا تھا، جس کے ذریعے کسی اہم واقعہ کا اعلان کیا جاتا تھا (نئے عامل کا تقرر، دشمن یا باغیوں پر فتح یابی وغیرہ) یا اس کا مقصد اسے نصیحت یا تنبیہ کرنا ہوتا تھا۔ یہ سرکاری مراسلات عموماً جمعہ کے روز مسجد میں منبر سے پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ مراکش کے بہت سے علوی سلاطین نے، جن میں سیدی محمد بن عبداللہ اور مولای سلیمان بن محمد بھی شامل ہیں، اس قسم کے مراسلات لکھنے پر مستقل شہرت حاصل کی؛ (۴) بَیعۃ، عہد وفاداری، جو عمائد اور نئے فرمانروا کے مابین طے پاتا تھا۔

مآخذ: (۱) ابن خلدون: مقدمۃ، بولاق ۱۲۷۴ھ، ص ۱۲۰ تا ۱۲۹، و ترجمۃ de Slane: *Prolégomènes*، ۱: xxxi و ۲: ۲۶، ۶۳؛ (۲) Rabino: *Contribution à l'histoire des Saadiens*، در *Archives berbères*، ۳ (۱۹۲۰ء): ۱؛ (۳) H. de Castries: *Les signes de validation des chérifs saadiens*، در *Hespéris*، ۱ (۱۹۲۱ء): ۲۳۱؛ (۴) G. Wiet و E. Tisserant: *Une lettre de l'almohade Murtaḍā au pape Innocent IV*، در *Hespéris*، ۶ (۱۹۲۶ء): ۲۷؛ (۵) E. Lévi-Provençal: *Un recueil de lettres officielles almohades*، در *Hespéris*، ۲۸ (۱۹۴۱ء): ۱-؛ مؤخرالذکر تین مقالات کے متن اور حواشی ایک بنیادی ماخذ کا کام دیتے ہیں۔ اس کے تتمے کے طور پر (۶) S. de Sacy: *Mémoires d' histoire et de littérature orientales*، پیرس ۱۸۳۲ء، ص ۱۱۹، ۱۴۹، کا اضافہ کر لینا چاہیے؛ (۷) G.S. Colin: *Contribution à l'étude des relations diplomatiques entre les Muslmans d'occident et l'Egypte*، در *Mélanges Maspero*، ۳: ۱۹۷، قاہرہ ۱۹۳۵ء؛ (۸) وہی مصنف: *Note sur le système cryptographique du Sultan Aḥmad al-Manṣūr*، در *Hespéris*، ۷ (۱۹۲۷ء): ۲۲۱؛ (۹) L. Di Giacomo: *Une poétesse grenadine du temps des Almohades*، در *Hespéris*، ۳۴ (۱۹۴۷ء): ۶۴ تا ۹۵؛ (۱۰) R. Brunschvig: *La Berbérie orientale sous les Ḥafṣides*، ۲: ۶۱؛ (۱۱) Cusa: *I Diplomi greci ed arabi di Sicilia*، Palermo ۱۸۶۸ء؛ (۱۲) عبداللہ اکنون: *Rasā'il Sa'diyya*، *Cartas de historia de los Saadies*، تطوان ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء؛ (۱۳) M. Nehlil: *Lettres Chérifiennes*، مراکش کے خاندان علویہ کی ایک سو اٹھائیس سرکاری دستاویزات کا مجموعہ، نقل مطابق اصل، پیرس ۱۹۱۵ء؛ (۱۴) *Sources Inédites de l'histoire du Maroc*، ایک مجموعہ، جس میں متعدد مراکشی سرکاری دستاویزات نقل مطابق اصل اور عکس کی صورت میں موجود ہیں۔

(G. S. COLIN)

۳- ایران

ایرانی دستاویزات کی ابتدا اس زمانے سے ہوتی ہے جب ایران کے علاقے میں ترکوں کی ریاستیں قائم ہوئیں۔ طاہری اور سامانی خاندانوں کے بادشاہ اگرچہ بہت سی باتوں میں ایرانی تہذیب سے متأثر تھے لیکن ان کے "دیوان" [=دفتر] میں عربی زبان ہی وسیلۂ اظہار رہی اور فارسی کو ("درباری زبان" کی حیثیت سے [رک بہ دری]) رواج دینے کی کوششیں [فوری طور سے] کامیاب نہیں ہوئیں۔ محمود غزنوی (۳۸۹ تا ۴۲۱ھ/۹۹۹ تا ۱۰۳۰ء) نے اپنے زمانے میں فارسی کو دفتری زبان بنانے کا اعلان کیا اور اس طرح دیوان میں اس کا رواج شروع ہوا۔ یہی صورت حال سلجوقی بادشاہوں کے عہد میں رونما ہوئی

(دیکھیے B. Spuler : Iran، ص ۲۳۵ تا ۲۳۹)؛ یہ بتانا مشکل ہے کہ عربی دستاویزات نے کہاں تک فارسی دستاویزوں کے لیے نمونے کا کام دیا، البتہ اس قدیم زمانے میں بھی گہرے عربی اثرات کا سراغ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ سلطان غزنہ اور دربار خلافت کے باہمی روابط کا تقاضا تھا کہ دستاویزات کا ترجمہ فارسی سے عربی میں اور عربی سے فارسی میں کیا جائے۔ علاوہ ازیں یہاں بعض ترک عناصر بھی موجود تھے جن میں ایلخانی بادشاہوں کے دور حکومت میں مغول اور ترکوں کی آمد سے خاصا اضافہ ہوا اور صدیوں تک دستاویزات اور دیگر مراسلہ نگاری کی ہیئت ان سے متاثر رہی۔

دستاویزات کی اقسام : فارسی دستاویزات بڑی حد تک عربی دستاویزات سے ملتی جلتی ہیں۔ دستاویزوں کی متعدد اقسام ہیں؛ بعض دستاویزات سے کسی امر کی تصدیق ہوتی ہے اور بعض کی رو سے کوئی فرمان صادر ہوتا ہے۔ پہلی قسم کی دستاویزات میں قانونی معاہدے اور تصدیق نامے شامل ہیں، جن پر گواہوں کی مہر اور توثیق ثبت ہوتی ہے، مثلاً قَبَالَہ (خریداری کا معاہدہ جس کی توثیق کوئی قاضی یا منصف کرتا ہے)، تمسُّک (فرد حساب، ہنڈی یا رسید)، عقدنامہ یا نکاح نامہ، وکالت نامہ، بیع شرط نامچہ (فروخت کا معاہدہ)، وصیت نامہ، وقف نامہ (کار خیر کے لیے کسی ادارے کا قیام)۔ ان دستاویزات (سِجِلّاتِ شرعیہ) کا تعلق بنیادی طور پر شرعی قانون نافذ کرنے والے احکام سے ہے۔ ان کے برعکس جو دستاویزات سرکاری احکام پر مشتمل ہوتی تھیں ان کا مکمل اختیار صرف ارکان حکومت کو حاصل ہوتا تھا۔ انھیں بادشاہ یا اس کے نائبین جاری کرتے تھے، جو دیوان میں تحریر کیے جاتے تھے۔ اصولی طور پر بادشاہ کی ہر منشا کے اظہار کے لیے سرکاری دستاویز (فرمان) مل سکتا ہے۔ عملی اعتبار سے ان دستاویزات کو حسب ذیل انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: تقرر یا عطیات کے فرامین (اِقْطاع، دور مغول و مابعد مغول : سُیُورغال؛ مُسَلَّمِی : محاصل کی معافی؛ تیُول : سرکاری خدمت کے صلے میں دی گئی جاگیر؛ وظیفہ : مذہبی عطیات، جو اوقاف یا سرکاری خزانے سے دیے جاتے تھے؛ خلعت کا عطیہ، وغیرہ) عہد نامے، پاسپورٹ، فرمانروا کے قانونی فیصلے اور صوبیداروں اور دیگر عہدے داروں کے نام عمومی نوعیت کے احکام۔ عہدِ سلاجقہ تک بظاہر مصطلحات میں پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ فرمان کے علاوہ ایک اور اصطلاح جو کثرت سے استعمال ہوتی ہے، مَنْشُور (جمع : مَنَاشِیر) ہے، جو متعدد قسم کی دستاویزات کے لیے رائج تھی۔ ان کے علاوہ تَقْلِید، تفویض، تسلیم، مثال (جمع، امثلہ) اور مَنْشُور تقلید یا تفویض کی اصطلاحیں بھی ملتی ہیں؛ دیکھیے : Rieu : *Cat. Pers. Mss in the Brit. Mus.*، لنڈن ۱۸۷۹ء، ۱ : ۳۸۹؛ Ethé : *Cat. Pers. Mss in the Ind. off. Library*، ۱ : ۱۱۲۱؛ منتجب الدین بدیع اتابک الجُوَیْنی: عَتَبَةُ الکَتَبَہ، بمواضع کثیرہ)۔ ایک اصطلاح "نشان" عہد تیموریہ میں ملتی ہے (دیکھیے Roemer: *Staatsschreiben der Timuriden-zeit*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، بمواضع کثیرہ)، جو سترھویں صدی عیسوی تک مستعمل رہی (دیکھیے Chardin : *Voyages du Chevalier Chardin en Perse*، طبع Longlés، پیرس ۱۸۱۱ء، ۲ : ۹۷)۔ "نشان" ھی کی مترادف اصطلاح "مکتوب" ہے، جو عہد تیموریہ میں وقتاً فوقتاً مستعمل رہی (نظام الدین شامی : ظفر نامہ، طبع F. Tauer، ۲ : ۲۶۳، بمدد اشاریہ)۔ فرمان کو حکم (حافظ اَبْرُو، طبع Tauer : *Cinque opuscules*، ص ۸۳، بمدد اشاریہ)، توقیع (فی الاصل صرف فرمانروا کے دستخط کے لیے اور بعدازاں اس کی مہر کے لیے بھی (دیکھیے نیچے) یا مثال (شامی، طبع Tauer، ۲ : ۲۹۹) بھی کہا جاتا تھا۔ مُغول عہدے کا نام یَرْلِیغ مفرد طور پر یا

حکم یرلیغ مرکب صورت میں پندرھویں صدی عیسوی کے خاتمے تک مستعمل رہا (شاہی، طبع Tauer، ۲: ۴۷۲)۔ نویں ۔ دسویں صدی ہجری/پندرھویں ۔ سولھویں صدی عیسوی میں مندرجات کے اعتبار سے نہیں، بلکہ افتتاحی کلمات کے فرق کی بنیاد پر بھی ایک تقسیم ملتی ہے: مثلاً پروانچہ اور حکم، جن کی عبارت پرشکوہ اور منجیلہ ہوتی تھی۔ ان کے برعکس سادہ تر دستاویزات "رقم" کہلاتی ہیں (دیکھیے H. Busse: *Untersuchungen zum islamischen Kanzleiwesen an Hand turkmenischer and safawidischer Urkunden*، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ۱: ۶۷)۔ ماتحت حکام کے احکام کو اب واضح طور پر "مثال" کہتے ہیں (مثال دیوان الصدارۃ: Papazyan، عدد ۷، ۱، ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء)۔ عہد قاجار میں ان عہدوں کے ناموں کا انحصار احکام جاری کرنے والے حکام پر ہوتا تھا۔ "فرمان" صرف شاہ کے حکم کو کہتے تھے اور شاہی نسل کے صوبیداروں کے احکام کو حکم (دیکھیے Greenfield: *Die Verfassung des persischen Staates*، برلن ۱۹۰۴ء، ص ۱۰۵)، لیکن نسبۃً کم سرکاری زبان میں تقریباً سب کی سب مذکورۂ بالا اصطلاحات مستعمل نظر آتی ہیں (دیکھیے S. Beck: *Persische Konversationsgrammatik*، ہائیڈل برگ ۱۹۱۴ء، ۲: ۲۱۱ ببعد)۔

زیادہ غور سے دیکھا جائے تو عہدناموں اور فرمانوں کو ان خطوط (مکتوب یا مراسلے) سے متمیز کیا جا سکتا ہے، جو داخلی یا خارجی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں۔ سابق الذکر دستاویزات کی طرح ان کی بھی سرکاری طور پر توثیق کی جاتی ہے اور ان کی ایک معینہ خارجی اور داخلی صورت ہوتی ہے، البتہ ان کی عبارت قانونی نوعیت کی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ان مکتوبات کو دیکھیے جن کے ذریعے دوستانہ تعلقات کی توثیق کی جاتی ہے (اِخْوانیات)۔ ہر موقعے کے لیے ایک مخصوص اسلوب عبارت ہوتا ہے، مثلاً تہنیت نامہ (اَدْعِیات)، تعزیت نامہ، وغیرہ۔ نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی تک کی غیر ملکی خط و کتابت میں، جو معقول طرز پر مبنی تھی، کسی حد تک فرمان کی شان باقی رہی، لیکن صفویوں کے عہد، یعنی گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں، اس میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ قانونی مندرجات کی بنا پر منشور نامے (مثالیں اوغلو حیدر: انشاء میں، نیز دیکھیے Rieu، ۱: ۳۹۰) طرز عبارت میں فرامین سے قریب آتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی بات سفیروں کو دی جانے والی اسناد سفارت کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ بادشاہ کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے (دست خطِ ہمایوں یا مبارک) مکاتیب کو جن کا مرتبہ سب سے اونچا سمجھا جاتا تھا، دستاویزات اور دوسری نگارشات کے درمیان جگہ دی جاتی ہے۔ ان مکاتیب کے مضمون میں بادشاہ کے فرمان کی عمل درآمد سے لے کر خفیہ احکام تک کی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔

ایرانی دیوان کی نو سو سال کی تاریخ کے دوران میں، یعنی زمانۂ حال تک، دستاویزات و نگارشات کی داخلی ساخت میں مشکل ہی سے کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہوگی۔ دستاویز کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے اور اکثر اس کے ساتھ کلمات عبودیت اَلْحُکْمُ لِلّٰہ (=حکم صرف اللہ کا ہے) اور اَلْمُلْکُ لِلّٰہ (=ملک صرف اللہ کا ہے) شامل کر دیے جاتے ہیں، افتتاح انھیں کلمات، نیز کلمات اعلان پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دستاویز کا اہم ترین حصہ، یعنی فیصلہ شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی حصے، یعنی طراز و افتتاح میں دستاویز کی غایت عام الفاظ میں (جن کی نوعیت اکثر مذہبی ہوتی ہے) بیان کر دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں دستاویز کو قرآنی نظائر و آیات سے زینت دی جاتی ہے اور خطیبانہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ دستاویز کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں، جن میں بڑی حد تک مقررہ تراکیب کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے، اس حصے کی تحریر میں انشا پرداز کو اپنی ادبی صلاحیت کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے، لیکن اس فن کا اظہار اصل

دستاویزات کی بہ نسبت کتب انشاء میں زیاد واضح نظر آتا ہے۔ دوسرا بیانیہ حصہ اصل مقدمے اور زیادہ تر مدعی کی عرضداشت کے خلاصے پر مشتمل ہوتا ہے، البتہ توثیق کرنے والی دستاویزات میں مجوزہ حکم یا مسئلۂ زیر بحث کے اعتبار سے متعدد احکام کلیّۃً یا ان کے اہم ترین حصے شامل کر دیے جاتے ہیں۔ بیانیہ حصّے ہی میں پہلی بار مکتوب الیہ کا نام و لقب آتا ہے۔ یہاں اس کا ذکر صیغۂ غائب میں اور بعدازاں صرف مذکور، مزبور، مشارٌ الیہ یا مُومیٰ الیہ ایسے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ مکمل القاب، پناہ، دستگاہ، نظام وغیرہ کے ادبی مرکبات سے کئی کئی سطور پر پھیل جاتے ہیں۔ اعلان کی عبارت (مثلاً فرزندان و وزراء بدانند کہ . . .) ابتدائی یا بیانیہ حصے سے قبل آتی ہے، لیکن اسے حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی حصہ بسا اوقات کلمۂ اَمّابَعدُ پر ختم ہوتا ہے۔

دستاویز کے اصل حصے میں بادشاہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ حکام کے تقرر اور عطیات کے احکام میں تاریخ تقرر، عہدے کا نام یا عطیے کے کی وجوہ کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے، البتہ دوسرے فرمانوں میں فیصلہ یا حکم براہ راست تحریر کر دیا جاتا ہے۔ فیصلے میں یا تو فعل معروف کا استعمال ہوتا ہے (دوسرے الفاظ میں بادشاہ اپنے بارے میں صیغۂ جمع متکلم استعمال کرتا ہے (مقرر فرمودیم و ارزانی داشتیم) یا فعل مجہول کا (مقرر فرمودہ شد کہ)۔ سترھویں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کی اِکّا دُکّا عبارتوں میں صیغۂ واحد متکلم کا استعمال بھی نظر آتا ہے: شاہ بابم، جدّ بزرگوارم (دعائیہ کلمات کے ساتھ)۔ بیانیہ حصے سے فیصلے کی طرف آتے ہوئے بعض مخصوص کلمات استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً "بناءً علیہ"، "بنابرایں"، "لہذا" یا "می باید کہ"۔ تقرر یا عطیات کے احکام کی صورت میں فیصلے کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ، عہدیداروں یا اشخاص متعلقہ کے نام ہدایات بھی درج کی جاتی ہیں، جنھیں عموماً "سبیل و طریق" کہا جاتا ہے۔ کلمات اعلان کے مقابلے میں، جہاں اعلیٰ ترین عہدیداروں کے نام سب سے اوپر درج ہوتے تھے، یہاں اُن کا نام آخر میں لکھا جاتا ہے۔ حساب داروں (مُستَوفیان) کو ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ دستاویز کو درج رجسٹر کریں۔ آخر میں بعض صورتوں میں ایک استناعی حکم شامل ہوتا تھا، جس کی رُو سے تجدید کی سالانہ درخواست کی ممانعت کی جاتی تھی اور یہ ہدایت لکھی ہوتی تھی کہ اس کا اطلاق اس قسم کے تمام مقدمات پر کیا جائے۔ ۔ ناجات کے علاوہ فیصلے سے قبل اور اس کے بعد لکھے جانے والے حصے حذف ہو سکتے تھے۔ اس صورت میں دستاویز صرف فیصلے پر مشتمل ہوتی تھی۔ تاہم بسا اوقات دستاویز کی ترتیب یوں ہوتی تھی: بیانیہ حصّہ، فیصلہ، اور خاتمہ (تاریخ وغیرہ)۔ اس صورت میں پورا متن "چون" (بیانیہ حصے کی ابتداء) اور "بنابریں" (فیصلے کا آغاز) کے درمیان آجاتا تھا۔ بیانیہ حصے میں یا فیصلے میں سیاق عبارت کے ذریعے دستاویز کو درج رجسٹر کرنے کی ہدایت بھی دی جاتی تھی۔ یہ ہدایت اگر دستاویز کی پشت (ظَہر، ضِمن) پر لکھی جاتی تو متن میں اشارہ کر دیا جاتا تھا۔

دستاویز کو ایسی عبارت پر ختم کیا جاتا تھا جس میں مہر ثبت کیے جانے کا حوالہ موجود ہوتا اور اسلامی تاریخ درج کر دی جاتی: "کُتِبَ فِی" (=لکھا گیا) (تا زمان رشیدالدین، طبع Jahn، GMS، n.s. ۱۹: ۲۲۲) یا "تحریراً فی" (=تحریر کیا گیا)۔ مہینے کا دن عربی نیز فارسی اعداد میں لکھنا دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں بالکل متروک ہو گیا۔ کبھی کبھی ہفتے کے دن کا ایرانی نام بھی لکھ دیا جاتا ہے (Papazyan، عدد ۱۸، ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء)۔ مہینے کے پہلے دن کو غُرّہ اور آخری کو سَلخ کہتے ہیں۔ مہینوں کے نام ان کی صفات کے ساتھ آتے ہیں: محرم الحرام، رمضان المبارک، وغیرہ۔ سال شروع شروع میں عربی حروف میں لکھا جاتا تھا، لیکن دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی

سے اس کے بجائے عربی اعداد لکھے جانے لگے ۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی تک ہجری سال کے ساتھ اس کے مطابق animal cycle کا سال بھی درج ہوتا تھا، جو فیصلے میں زمانۂ مابعد میں بھی (ہجری سال کے ساتھ) مندرجہ تاریخوں کے حوالے سے مستعمل رہا ۔ نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی تک تاریخ کے بعد اس مقام کا نام بھی لکھا جاتا جہاں سے حکم جاری ہوتا تھا : بمقام ، بمدنیة ، یا بدارالسلطنۃ ۔ چند مستثنیات سے قطع نظر یہ طرز آگے چل کر متروک ہوگیا ۔ ترکمانی دستاویزات تاریخ اور مقام کے نام کے بعد ایک دعائیہ عبارت درج ہوتی تھی : رَبِّ اِختِم بالخَیر وَ الاِقبال (=میرے رب ! بھلائی اور اقبالمندی کے ساتھ خاتمہ فرما! دیکھیے Busse : *Untersuchungen* ، عدد ۲)۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں یہ عبارت دائیں حاشیے پر لکھی جانے لگی اور مختصر ہو کر خُتِم بالخَیر یا خُتِم رہ گئی اور آگے چل کر بالکل محذوف ہو گئی ۔ اسی طرح نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے خاتمے اور دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آغاز تک متن کے عین نیچے اور عموداً اس کاتب اور ان عہدیداروں کا حوالہ دیا جاتا تھا جنھوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا ہوتا، مثلاً پروانچۂ اشرف اعلٰی ، بہ رسالہ (نام) بہ وقوف (نام) ۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے یہ حوالہ مختلف صورتوں میں دستاویز کی پشت پر ملنے لگتا ہے (دیکھیے سطور ذیل)۔

دستاویزات کی داخلی ہیئت کی بہ نسبت ان کی خارجیت میں زیادہ تبدیلیاں آئیں ۔ ترمیم کے زمانے کو سرسری طور پر حسب ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے : ماقبل مغول، مغول، تیموریہ، ترکمانیہ ، صفویہ ۔ چودھویں صدی ہجری / بیسویں صدی عیسوی تک ۔ طغریٰ [رک باں] کا استعمال سلاجقہ اور سلاطین خوارزم نے کیا (عتبة الکتبة میں ایک "وزیر طغریٰ" کا ذکر آتا ہے، عدد ۱۹ ؛ خوارزم کے لیے دیکھیے النسوی : سیرت السلطان جلال الدین منکوبردی، طبع حافظ احمد حمدی، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۲۲۳)۔ یہاں طغریٰ صرف فرمانروا کے نام اور لقب پر مشتمل ہوتا تھا، لیکن دور مغول میں نام کے بعد بہادر کے اضافے (۷۱۹ھ کے بعد، دیکھیے Spuler، *Mongolen* ، بار دوم ، ص ۲۶۷ تا ۲۷۱) کے علاوہ آگہ منّو ilge manu (فرمانے از ما) بھی بڑھا دیا گیا ۔ تیموری دستاویزات میں ترکی ترجمے میں یہ عبارت آتی ہے تیمور گورگان سوز و موز (دیکھیے Fekete : *Arbeiten der grusinischen Orientalistik auf dem Gebeit der türkischen und persischen Paläographie und die Frage der Formel sözümüz* ، در *AO Hung.* ، ے (۱۹۵۷ء)/۱ : ۱۴)۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں پورے ترکمانی دور کی خاص دستاویزات پر طغریٰ اسی صورت میں درج ہوتا رہا ۔ علاوہ ازیں خوانین بخارا اور جنوبی روس کے آلتون اردو کے ہاں بھی اس کا استعمال جاری رہا (دیکھیے Fekete : وہی کتاب ، ص ۱۴)۔ آق قویونلو کی دستاویزات پر طغریٰ کے ساتھ تمغے کا نشان بھی ثبت کیا جاتا تھا، جو ان کے سکوں پر بھی نظر آتا ہے (دیکھیے Hinz : *Irans Aufsteige zum Nationalstaat im fünfzehnten Jahrhundert* ، برلن و لائپزگ ۱۹۳۶ء، ص ۱۰۶ و تصویر بالمقابل ص ۱۰۴)۔ متن کی ابتدائی سطروں کو حاشیے سے ذرا ہٹا کر لکھنا اور (مشرق بعید کے بالواسطہ اثر کے ماتحت) نئی سطر کے آغاز میں نمایاں طور پر بادشاہ کا نام اور لفظ یرلیغ درج کرنا ایغور کا دستور تھا، جسے اختیار کرکے مغول نے دنیائے اسلام میں ایک نئی بات کو رواج دیا (دیکھیے Busse : *Die Entwicklung der Staaturkunde in Zentralasien und Persien von den Mongolen bis zu den Safawiden* ، در *Akten des xxiv. Internationnalen Orientalisten-kongresses München*

Wiesbaden، ۱۹۵۹ء، ص ۲۷۳ تا ۲۷۴)۔ یہ رواج معمولی تبدیلیوں کے ساتھ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی تک کی طغری دار دستاویزات میں بھی ملتا ہے۔ اس سے اس کا استعمال دوسری دستاویزات میں بھی عام ہوا۔ شاہ اسمٰعیل اول صفوی کے عہد حکومت (۱۵۰۱ تا ۱۵۲۴ء) میں بعض دستاویزات سے طغری غائب ہوگیا۔ البتہ متن کی پہلی دو سطروں کو بدستور حاشیہ چھوڑ کر لکھتے رہے۔ مہر، جو پہلے دستاویز کے نچلے حصے میں لگائی جاتی تھی، اب اس کی پیشانی پر ثبت ہونے لگی (جہاں یہ اب بھی "تاج" Crest کی صورت میں نظر آتی ہے)۔ صفوی خاندان کے دوسرے بادشاہ طہماسپ اول کے عہد (۱۵۲۴ تا ۱۵۷۶ء) میں یہ نئی تبدیلی رونما ہوئی کہ طغری، جسے رئیس دیوان الانشاء (منشی الممالک) رقم کرتا تھا، اب سرخ اور سنہری روشنائی میں لکھا جانے لگا اور اس کے ساتھ افتتاحی کلمات دو صورتوں میں تحریر ہونے لگے (اور پہلی دو سطروں کو حاشیہ چھوڑ کر لکھنے کا دستور ختم ہو گیا): "فرمان ہمایوں شد" یا "فرمان ہمایون شرف نفاذ یافت"۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک نئی عبارت: "حکم جہان مطاع شد" کا اضافہ ہو گیا (جسے وقائع نویس مجلس نویس یا وزیر چپ سیاہ روشنائی سے تحریر کرتا تھا)۔ دیوان بیگی کی دستاویزات میں یہی عبارت سرخ روشنائی سے لکھی جاتی تھی (دیکھیے تذکرۃ الملوک، طبع و ترجمہ منورسکی، لنڈن ۱۹۴۳ء، ورق ۱۲ ب، ۳۲ ب، ۳۰ الف)۔ شاہی خاندان کے ارکان کی طرف سے صادر ہونے والی دستاویزات کے طغری میں ایک اور فرق بھی رونما ہونے لگا تھا (پہلی مثال Papazyan شمارہ ۳، ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء میں) اور وہ یہ کہ سُوز و مُرز کی جگہ کلمہ سوزُوم (میرا حکم) دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے (دیکھیے Puliridz، شمارہ ۷، ۱۵۹۱ء)۔ علاوہ ازیں دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں صوبیداروں کی دستاویزات میں عبارت "امر عالی شد" مع طغری، جس میں کلمہ سوزُوم شامل ہوتا تھا (*Puluridze*، شمارہ ۶۷، ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۲ء)، ملتی ہے اور گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی "مقرر است کہ . . ."۔ عہد اسماعیل ثانی (۱۵۷۶ تا ۱۵۷۷ء) میں بعض احکام میں عبارت "امر دیوان اشرف اعلیٰ" استعمال ہوتی تھی۔ (Papazyan، شمارہ ۱۹، ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ تا ۱۵۷۷ء)۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے دوران اور بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں مرکزی حکومت کے حکام کی دستاویزات پر شاہی مہر ثبت ہوتی تھی، البتہ افتتاحی کلمات محذوف ہوتے تھے (دیکھیے Busse : *Untersuchungen*، ص ۶۵)۔ بادشاہ کے مراسلات میں یہ بات آج بھی نظر آتی ہے۔ ان مراسلات کی ابتداء مکتوب الیہ کے نام اور لقب ہی سے ہو جاتی ہے۔ صفویوں کے بعد کے زمانے میں مختلف قسم کی دستاویزات میں مختلف عبارتوں کا استعمال جاری رہا۔ افشاریوں کے فرامین میں عبارت "فرمان ہمایون شد" بدستور لکھی جاتی تھی البتہ ان کے ساتھ کلمہ بعون اللہ تعالیٰ (اللہ کی مدد سے) (بعد ازاں اعوذ باللہ تعالیٰ) کا اضافہ ہوگیا۔ اس عبارت کے حروف کے شوشوں کو بڑے فن کارانہ انداز سے موڑ دیا جاتا تھا۔ قاچاری دستاویزات میں "حکم جہان مطاع" مع "الملک للہ تعالیٰ" لکھا جاتا تھا۔ مظفرالدین شاہ (۱۸۹۶ تا ۱۹۰۷ء) کے فرامین میں ایک بار پھر "فرمان ہمایون شد" کی عبارت دیکھنے میں آتی ہے (دیکھیے Beck : کتاب مذکور، ۲، ۳۴۲ تا ۳۴۳ نقل مطابق اصل)۔ طغری بدستور سنہری روشنائی میں لکھا جاتا رہا۔ عبارت "حکم جہان مطاع شد" آخری افشار بادشاہوں کے ہاں نیز بعض زندی دستاویزات میں بھی ملتی ہے، جہاں وہی سادہ اسلوب برقرار رکھا گیا ہے۔ نادر شاہ کی تاجپوشی کے بعد جو فرمان (۸ مارچ

۱۷۳۶ء: برائے نام بادشاہ عباس سوم صفوی، ۱۷۳۲ تا ۱۷۳۶ء تھا) جاری ہوئے ان میں عبارت "فرمان عالی شد" (مع بعون . . .) اسی خاص انداز میں لکھی ہوئی ملتی ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ۱۷۳۶ء کے بعد سے "فرمان عالی شد"، کے بجائے "فرمان همایون شد" لکھا جانے لگا۔ عبارت "فرمان عالی شد" (اضافوں کے بغیر اور سادہ صورت میں) کریم خان زند (۱۷۵۰ تا ۱۷۹۶ء) کی دستاویزات میں بھی نظر آتی ہے، جو اسماعیل سوم صفوی کی برائے نام بادشاہت کے زمانے میں حکومت کے اصلی اختیارات کا مالک تھا۔ اس کے پیش رو بختیاری سردار علی مردان خان نے، کہ وہ بھی ایک "بے ضابطہ" بادشاہ تھا، اختتامی عبارت "حکم والا شد" کو (کسی اضافے کے بغیر) اختیار کیا۔ یہاں ایک ایسے دستور کی طرف میلان ظاہر ہونے لگا جو عہد قاچار میں پوری طرح رائج ہوا؛ یعنی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے صوبیدار عبارت "حکم والا شد" تحریر کرتے تھے اور ان کے مقابلے میں دیگر صوبیداروں کے لیے ضروری تھا کہ "حکم عالی شد" تحریر کریں (یہ دستور دور صفویہ ہی سے شروع ہو چکا تھا، دیکھیے سید الانشاء، تہران ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء؛ Beck : کتاب مذکور، ۱ : ۴۵۱، ۴۵۵)۔ جدید شاہی فرامین (جن میں یورپی اثرات نمایاں ہیں) کی ترتیب حسب ذیل ہے: شاہی نشان (شیر و خورشید)، "فرمان مطاع مبارک"، "اعلیحضرت همایون شاهنشاهی"، "بتائیدات خداوند متعال، ما — پہلوی شاهنشاه ایران"۔ مُہر۔ یہاں قدیم عبارتوں کے مختلف حصے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

رسوم الخط اور لوازم کتابت: اصلی دستاویزات کے فقدان کی بنا پر یہ بتانا ممکن نہیں کہ سلجوقوں کے دیوان الانشاء میں کس قسم کے رسوم الخط استعمال ہوتے تھے۔ طغری جلی قلم (دیکھیے Spuler : *Iran*، ص ۳۶۲) سے لکھا جاتا تھا۔ قیاس ہے کہ آخری دور بنی عباس میں جو مختلف قسم کے رسوم الخط رائج ہوئے (دیکھیے الفہرست، طبع فلوگل، ص ۴ ببعد) اور ان کی نشوونما پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے دیوان الانشاء میں جاری رہی۔ قدیم ترین فارسی دستاویزات کا جو ٹکڑا دستیاب ہوا ہے وہ ایک بیع نامہ ہے (دیکھیے Margoliouth، در *G R A S*، ۱۹۰۳ء، ص ۷۶۱ ببعد)۔ اس سے خط تعلیق کی طرف رجحان کا پتہ چلتا ہے، جو آگے چل کر عام طور پر رائج ہوا۔ ایلخانیوں کی مغول دستاویزات بلاشبہ اویغور رسم الخط ہی میں لکھی جاتی تھیں، جو نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی تک تیموریوں کی ترکی دستاویزات میں مستعمل رہا، البتہ ان میں بین السطور کی عبارت عربی رسم الخط میں نقل کر دی جاتی تھی (دیکھیے Kurat : *Topkapi sarayi yarlik vebitlikler*، استانبول ۱۹۴۰ء، ص ۱۹۵ ببعد : ابوسعید کا ایک فرمان مورخہ ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء)۔ دور مابعد مغول کے دیوانوں میں خط تعلیق پوری طرح مروج ہو چکا تھا اگرچہ بعض حصے (مناجات، طغری) وقتاً فوقتاً خط ثلث میں لکھے جاتے تھے۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں خط نستعلیق استعمال ہونے لگا، گو خط شکستہ بھی استعمال میں آتا رہا۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے خط تعلیق میں خط شکستہ کی جانب بڑھنے کا رجحان نظر آتا ہے، جو گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں جا کر اپنی خالص صورت میں منظر عام پر آیا۔

جہاں تک لوازم کتابت کا تعلق ہے شروع ہی سے غالباً کاغذ سے کام لیا جاتا تھا، جس نے تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک مشرق قریب میں ایک ملکی صنعت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی ہی سے دوسری اسلامی ریاستوں کی طرح یہاں بھی یورپ سے کاغذ آنے لگا۔ Chadrin (*Voyages*، ۴ : ۲۷۱ ببعد) اس بات کی

شہادت دیتا ہے کہ کم از کم گیارھویں صدی ہجری/ سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں کاغذ ایران میں درآمد ہوتا تھا۔ اعلٰی اقسام کا کاغذ بلخ، بخارا اور سمرقند سے آتا تھا۔ دستاویز کے کاغذ کا عرض مختلف اور پندرہ سے تیس میٹر تک ہوتا تھا۔ بعض دستاویزات کئی میٹر لمبی ہوا کرتی تھیں (مثلاً Busse، شمارہ ۱۲، ۲۹۳ سینٹی میٹر)۔ یہ متعدد اوراق پر مشتمل ہوتی تھیں جنھیں آپس میں جوڑ لیا جاتا تھا۔

مغول دستاویزات کی مختلف رنگ دار روشنائیوں (سرخ اور سنہری) سے اعلٰی درجے کی آرائش کی جاتی تھی۔ ان حصوں میں ان کا بطور خاص استعمال ہوتا جنھیں نمایاں کرنا مقصود ہوتا تھا۔ گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کی طغرٰی والی دستاویزات میں بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ ان میں بالخصوص مناجات، دعائیہ عبارات، تمغا (آق قویونلو کے فرامین میں) قرآنی آیات اور دائیں حاشیے میں لکھے جانے والے الفاظ کے لیے سنہری روشنائی استعمال کی جاتی تھی۔ افتتاحی عبارات والی دستاویزات میں سنہری اور سرخ روشنائی بکثرت استعمال ہوتی تھی، البتہ اس سے وہ دستاویزیں مستثنٰے ہیں جن میں عبارت "حکم جہان مطاع شد" درج ہوتی تھی۔ یہ دستاویزات سر تا سر سیاہ روشنائی سے تحریر ہوتی تھیں۔ صوبائی حکام کی جانب سے صادر ہونے والی دستاویزات میں بھی رنگ دار روشنائی کا استعمال ختم کر دیا گیا تھا۔ لکھتے وقت پیشانی اور دائیں جانب خاصا بڑا حاشیہ چھوڑا جاتا تھا۔ بالخصوص ابتدائی دور میں سطور بائیں جانب ذرا بلندی کی طرف جاتی تھیں، کبھی کبھی سطر کے آخری لفظ کو کھینچ کر کاغذ کے بائیں کنارے تک بڑھا دیا جاتا تھا تاکہ اس میں کسی اور لفظ کا اضافہ نہ کیا جا سکے۔ نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے خاتمے تک فیصلے کی عبارت کا آغاز خاص طور پر جلی حروف کی صورت میں نمایاں کیا جاتا تھا (دیکھیے Busse، شمارہ ۴)۔ جو مکتوبات غیر ملکی فرمانرواؤں کے نام لکھے جاتے تھے ان میں مکتوب الیہ کا نام متن کے اوپر درج ہوتا تھا۔ متن میں جہاں یہ نام مقصود ہوتے (القاب کے اندراج کے بعد) اس مقام کی نشان دہی کے لیے تھوڑی سی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی تھی۔

مُہریں: شروع شروع میں، دستاویزات و نگارشات کی (سوائے ان کے جن پر مُہر ثبت ہوتی) تصدیق فرمانروا کی توقیع یا دستخط سے کی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے ابتدائی زمانے ہی میں اس کی جگہ محض مُہر نے لے لی ہوگی۔ بہر طور دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں توقیع سے مُہر ہی مراد لی جاتی تھی۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی تک توقیع کی جگہ مُہر کے لفظ نے نہیں لی تھی (حالانکہ اس کا استعمال اس سے بہت پہلے شروع ہو جانا چاہیے تھا)۔ شاہ اسمٰعیل نے اپنے فرامین میں کلمہ "ھواللّٰہ العادل" شامل کر لیا (papazyan، شمارہ ۱۹، ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ - ۱۵۷۷ء) لیکن اسے ایک استثنا سمجھنا چاہیے۔ دور قاچار تک مُہر کے ساتھ شاہ کے تصدیقی دستخط (طغرٰی) کو ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا (دیکھیے Greenfield: کتاب مذکور، ص ۱۹۷؛ eck: کتاب مذکور، نقل مطابق اصل: صَحَّ پہلی سطر کے نیچے)۔ بادشاہ کی مُہر ابتداءً دستاویز کے نچلے حصے پر ثبت کی جاتی تھی، مغول کی مربع مُہر چسپاں شدہ اوراق کے جوڑوں پر بھی ثبت کی جاتی تھی تاکہ بعد میں کوئی اور ورق نہ شامل کیا جا سکے، البتہ نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی میں مُہر صرف دستاویز کے نچلے ہی حصے میں نظر آتی ہے (دیکھیے Kurat: کتاب مذکور، ص ۱۹)۔ دور صفویہ کے ابتدائی دنوں میں بادشاہ اور مرکزی حکومت کے فرامین میں مُہر دستاویزات کی پیشانی پر طغرٰی کی جگہ لگائی جاتی تھی۔ صوبیداروں کے فرامین میں، جن پر "حکم عالی شد" کا طغرٰی درج ہوتا تھا،

مُہر نچلے حصے ھی میں ثبت ھوتی تھی ، البتہ جو صوبیدار شاھزادے ھوتے ، وہ اپنی مُہریں طغری کے دائیں جانب (عثمانی وزراء کے پنجہ کی طرح) لگاتے۔ مکتوبات پر مہر پشت کی جانب لگائی جاتی تھی (دیکھیے *A choronicle of the Farmelites in Persia and the papel mission of the XVIIth and XVIIIth Centuries* ، ۲ جلد ، لنڈن ۱۹۳۹ء ، عکسی تصویر ، بالمقابل ص ۹۵ ، ج ۱ میں)۔ مغول بادشاھوں کے دیوان میں حکومت کے مختلف امور سے متعلقہ دستاویزات پر مختلف رنگوں کی مہریں لگائی جاتی تھیں ، مثلاً نیلی ، سرخ (یا سنہری) ، سبز اور سیاہ (دیکھیے Spuler : *Mongolen* ، ص ۲۹۳ ، مربع مہر کے لیے)۔ جس سے تیموری بادشاہ بھی کسی حد تک کام لیتے تھے اور سنہری روشنائی استعمال ھوتی تھی۔ آگے چل کر تمام مہریں سیاہ روشنائی سے لگائی جانے لگیں۔ مربع مُہروں کے علاوہ (غازان خان نے حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے مختلف مہروں کو رواج دیا تھا ، دیکھیے رشیدالدین ، طبع Jahn ، ص ۲۹۲)۔ تیموری خاندان کے بادشاہ گول مہریں استعمال کرتے تھے ، جو اکثر صورتوں میں دستاویزات کی پیشانی پر لگائی جاتی تھیں (دیکھیے J. Deny : *Un soyurgal du Timouride shah Rukh en écriture ouigure* ، در *JA* ، ۲۴۵ (۱۹۵۷ء) : ۲۵۳ تا ۲۶۶)۔ مختلف قسم کی دستاویزات کے لیے مختلف مہروں کے استعمال کا دستور ، جس کا رجحان شاہ اسمٰعیل اول کے عہد میں نظر آتا ھے ، آخر دور صفویہ میں پایۂ تکمل کو پہنچ گیا۔ بڑی مہریں مہر شرف نفاذ یا مہر ھمایون) ”فرمان ھمایون شرف نفاذ یافت“ اور ”فرمان ھمایون شد“ کی افتتاحی عبارات والی دستاویزات پر ثبت ھوتی تھیں اور چھوٹی مہریں ”مہر انگشتر آفتاب آثار“ یا مہر انگشتری ”حکم جہان مطاع شد“ والی عبارت پر۔ بڑی مہروں پر کندہ عبارت جزوی طور پر دوازدہ امام کے اسمائے مبارک پر مشتمل ھوتی اور چھوٹی مہروں پر صرف بادشاہ کا نام اور اکثر اس کے ساتھ لقب ھوتا ”بندۂ شاہ ولایت“۔ Chardin نے ایک مربع مہر کا ذکر کیا ھے (لوح ۳ ، ۵ و ۱۱ : ۳۹۶)۔ بڑی مہریں گول ھوتی تھیں (کبھی کبھی ان کا بالائی بڑھا ھوا حصہ چھت کی شکل کا ھوتا تھا) اور چھوٹی مہریں مستطیل یا ڈھال کی شکل کی (الواح ، در Rabinodi Borgomale : *Coins, medals and seals of the shah of Iran* ، ۱۵۰۰ تا ۱۹۴۱ء ، مقام طباعت ندارد ، ۱۹۴۵ء ، لوح ۳)۔ آگے چل کر بادشاہ کی مہریں زیادہ تر مستطیل بننے لگیں ، جن کا بالائی زائد حصہ چھت کی سی شکل کا ھوتا تھا۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء ھی سے مہروں پر ”شیر و خورشید“ کا نقش نظر آنے لگتا ھے (Chubua ، شمارہ ۴۷) بڑی (مستطیل ، زائد حصوں والی) اور چھوٹی (بیضوی) مہریں دورِ قاچار تک بھی ملتی ھیں (الواح در Rabino : کتاب مذکور ، ص ۴)۔ دور صفویہ کے صوبیداروں کی مہریں بیشتر مستطیل یا بیضوی ھوتی تھیں (اکا دکا مثالیں گول مہروں کی بھی ملتی ھیں) اور ان پر کندہ عبارت عہدیدار کے نام اور کسی مذھبی نشان (کلمے) پر مشتمل ھوتی تھی۔ آگے چل کر ان میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ھوئی۔ صفوی بادشاھوں کے دور میں شاھی حکام ایک خاص مدور مہر دیوان (مُہر مسوّدۂ دیوانِ اعلٰی) استعمال کرتے تھے۔ شروع شروع میں مہر کو مہر بردار کی حفاظت میں رکھا جاتا تھا لیکن صفوی دور کے ابتدائی ایام میں اس کی حفاظت افسرانِ حرم کے سپرد کر دی گئی (دیکھیے Roemer : *Der Niedergang Irans nach dem Tode Ism'ils des Grausamen* ، ۱۵۷۷ تا ۱۵۸۱ء ، Würzburg ۱۹۲۹ء ، ص ۴۴)۔ دور صفویہ کے آخر تک یہ انہیں کی سپردگی میں رھی۔ مہر لگانے کا اصل کام وہ عہدیدار انجام دیتے تھے جن کا لقب دوات دار [رک بہ دوادار] ھوتا تھا۔ مہر بردار صرف پشت کی جانب ایک چھوٹی سی مہر لگا دیتے تھے (دیکھیے تذکرۃ الملوک ، طبع منورسکی ، ورق ۴ الف ببعد)۔

مکتوب الیہ کے پاس پہنچانے سے قبل دستاویزات مالی انتظامیہ کے مختلف شعبوں (دفتر خانۂ همایون اعلٰی) میں بھیجی جاتی تھیں جہاں اعلٰی عہدیدار توقیعات اور مہریں لگانے اور دوسرے ملازمین مُہر و خط کے ذریعے ان دستاویزات کا مختلف رجسٹروں میں اندراج ہو جانے کی توثیق کرتے تھے (اس کی ایک اور صورت مثال کے طور پر عثمانی حکومت میں ملتی ہے جہاں یہ ملاحظات مسودے پر تحریر ہوتے تھے ان کی حیثیت محض دفتری حواشی کی ہوا کرتی تھی؛ Fekete: *Die siyaqat-schrift in der türkischen Finanzverwaltung*، ج ۱، بوداپسٹ ۱۹۵۵ء، ص ۶۷، ۶۸، حاشیہ ۲)۔ توقیعات اور حواشی کا اندراج، مثلاً بنی فاطمہ کے عہد میں، آخری سطور کے درمیان کیا جاتا تھا (دیکھیے Grohmann در *RSO*، ۳۲، ۱۹۵۷ء: ۶۴۱ تا ۶۵۴) لیکن ایران میں یہ پہلے پہل دستاویز کی پشت پر اور متن کے عموداً ہوتا تھا۔ ایلخانی دستاویزات میں بھی یہی صورت دیکھنے میں آتی ہے (دیکھیے Cleaves در *HJAS*، ۱۴، ۱۹۵۱ء: ۴۹۳ تا ۵۲۶)۔ اس سلسلے میں غازان خان نے لازمی ہدایات درج کرنے کا دستور بھی شروع کیا (دیکھیے رشید الدین، طبع Jahn، ص ۲۹۱ تا ۲۹۶) مُہروں اور حاشیوں کا ایک سلسلہ تیموری (دیکھیے Doey، کتاب مذکور)، ترکمانی اور ابتدائی صفوی دستاویزات (دیکھیے Busse: *Untersuchungen*، ص ۷۷ ببعد) میں بھی ملتا ہے۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک قطعی ضابطہ نافذ ہوا جس پر دور قاچار کے آخر تک عمل درآمد ہوتا رہا۔ توقیعات ایک مذہبی کلمے مثلاً تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ (میں نے اللہ پر بھروسا کیا) پر مشتمل ہوتی تھیں اور حواشی کے اندراج میں مسئلے کی نوعیت کا حوالہ بھی دیا جاتا تھا مثلاً "ثَبْتِ دَفْتَرِ تَوجِیْہِ دِیْوانِ اعلٰی شُد" (اس کا اندراج دیوان اعلٰی کے باہر بھیجی جانے والی دستاویزات کے رجسٹر میں کر دیا جاتا) یا محض صَحَّ (درست) لکھ دیا جاتا تھا۔ آخر دور صفویہ میں تمام دستاویزات پر تعلیقات اور مُہر وزیر اعظم (اعتماد الدولہ)، صدر اور ارکان دولت سے متعلقہ دوسرے عہدیدار، مثلاً قُورچی باشی اور قُلّر آقاسی ثبت کرتے تھے۔ ہر عہدیدار ان دستاویزات پر جن کا تعلق اس کے دائرۂ اختیار میں ہوتا، مہریں لگاتا تھا۔ اس کے برعکس حواشی کے اندراج اور مہریں لگانے کا کام مستوفی الممالک (یا خاصّہ)، لشکر نویس، صاحب توجیہ، ناظر دفتر خانۂ اعلٰی، داروغہ دفتر خانۂ اعلٰی اور دوسرے اہلکاروں کے سپرد تھا۔ عہدیداران سلطنت (سرکار ممالک) کے حواشی، اندراج ملازمین شاہی (سرکار خاصۂ شریفہ) کے حواشی سے مختلف ہوتے تھے: مثلاً "بہ نظر رسید" (عہدیداران سلطنت) "ثَبْتِ دَفْتَرِ نظارت شد" (ملازمین شاہی) دفترخانہ میں درج ہونے والی (ارقام دفتری) دستاویزات کے برخلاف بعض دستاویزات کا وہاں اندراج نہیں ہوتا تھا (ارقام بیاضی) کیوں کہ یا تو ان کا تعلق مالی انتظامیہ سے نہیں تھا یا انہیں خفیہ رکھا جانا مقصود ہوتا تھا (دیکھیے تَذْکِرَۃ الملوک، ورق ۴۲ ب اور Busse: *Untersuchungen*، ص ۷۹).

دستاویز تیار کرنے کا کام یا تو بادشاہ یا کوئی اور عہدیدار براہ راست، یا بالواسطہ تحریری طور پر دیوان کے سپرد کرتا تھا۔ اصل کارروائی کا اندراج دستاویز میں ہوتا تھا۔ دور مغول میں بھی یہی طریق رائج تھا (دیکھیے Hinz: *Die Resala-yi Falakiyya des Abdollah ibn Muhammad ibn Kiya al-Mazandarani*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، ورق ۱۴۴ و ببعد)، دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی تک ترکمانی دستاویزات میں اس تفصیل کا اندراج سامنے کی جانب کنارے کے نچلے حصے میں کیا جاتا تھا (دیکھیے سطور بالا)، لیکن گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے آغاز سے یہ اندراج پشت

پر ہونے لگا: اگر بادشاہ کا زبانی حکم براہ راست ملتا تو عبارت کے الفاظ یہ ہوتے "بالمُشافۃ العلیّۃ العالیۃ" ورنہ "هُوحَسَبُ الأمرِالاعلٰی" درج کیا جاتا ۔ دوسری صورت میں رابطہ کا نام اس عبارت کے نیچے لکھا جاتا "قرار نوشتہ . . ." اس صورت میں کہ درمیانی شخص وزیر اعظم ہوتا ، بصورت دیگر "برسالہ" لکھا جاتا ۔ جب دستاویز کی تیاری کا حکم وزیراعظم یا کسی اور عہدیدار کی طرف سے صادر ہوتا تو حَسَبُ الأمرِ الأعلٰی کی عبارت حذف کر دی جاتی (دیکھیے Busse : *Untersuchungen* ، ص ۹۵ ببعد) معلوم ہوتا ہے کہ صفوی دور کے بعد سے ان تفصیلات کا اندراج متروک ہوگیا ۔ جب ضابطے کی ان سب کارروائیوں کی پڑتال کر لی جاتی تو دستاویز کو اس طرح تہہ کر لیا جاتا کہ لکھا ہوا حصہ اندر کی طرف ہو جاتا ۔ غیر ملکی بادشاہوں کے نام کے خطوط زربفت کے پرتکلف غلافوں میں رکھ کر بھیجے جاتے تھے ۔ ان غلافوں پر ایک خاص مہر لگا دی جاتی تاکہ کوئی غیر متعلقہ شخص انھیں کھول نہ سکے ۔

ابتدائی زمانے میں دستاویزات شاہی دیوان (دار الانشاء، دیوان الرسائل) میں منشی الممالک کے زیر نگرانی مرتب ہوتی تھیں، گیارھویں صدی ہجری/ سترھویں صدی عیسوی سے "حکم جہان مطاع شد" کی (سیاہ روشنائی سے لکھے ہوئے) طغرٰی والی دستاویزات وقائع نویس کے دیوان میں لکھی جانے لگیں جو غیر ملکی فرمانرواؤں کے نام خطوط کی تیاری کا بھی ذمے دار ہوتا تھا ۔ اس سلسلے میں ایک اور تقسیم نظر آتی ہے، یعنی سرکار ممالک کے لیے اور سرکار خاصۂ شریفہ کے لیے ۔ امور سلطنت سے متعلقہ دستاویزات (معہ طغرٰی : فرمان ہمایون شرف نفاذ یافت یا فرمان ہمایون شد) منشی الممالک تیار کرتا تھا اور سرکار خاصۂ شریفہ کی دستاویزات وقائع نویس ۔ ان دو بااختیار عہدیداروں کے علاوہ دفتر خانہ کے جداگانہ شعبوں کو بھی دستاویزات کی تیاری کا اختیار دے دیا جاتا تھا ۔ مثال کے طور پر دور صفویہ میں یہ اختیار لشکر نویس کو نیز قُلّر آقاسی ، توپچی باشی تُفنگ باشی اور دوسرے حکام کے کاتبوں کو بھی حاصل تھا ۔ ان دستاویزات میں کوئی طغرٰی نہیں ہوتا تھا ۔ صوبائی حکام کے اپنے دیوان تھے ۔ مذہبی دستاویزات کی نوعیت بالکل جداگانہ تھی ۔ کم اہم مواقع پر اگرچہ دوسرے ضابطوں کا خیال رکھا جاتا تھا (مہر، طغرٰی) تاہم فیصلہ عرضداشت کے بالائی حاشیے پر درج کر دیا جاتا تھا ۔ ماتحت اہلکاروں کے ضمنی حواشی اور اضافے نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی تک بین السطور لکھے جاتے تھے لیکن اس کے بعد دائیں حاشیے پر تحریر ہونے لگے (عبارت: مقرر است کہ . . . اور مہر کے ساتھ) ۔ مذہبی فرامین میں اگر ضرورت ہوتی تو بادشاہ اپنے ہاتھ سے اضافے (حاشیہ بخطّ مبارک) کر دیتا تھا ۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، دیوان میں فارسی کے شعبے کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کا شعبہ شاہان غزنہ کے عہد ہی میں قائم ہو چکا تھا ۔ اسی سلسلے میں اگر ان اقوام کی تعداد پر نظر ڈالی جائے جن کے ساتھ خط و کتابت کی جاتی تھی، تو ایلخانی دیوان خاص طور پر جامع دکھائی دیتا ہے ۔ (دیکھیے Hinz : *Die persische Geheimkanzlei im Mittelalter* در west-östliche Abhandlungen ، wiesbaden ۱۹۵۴ء ، ص ۳۴۵) شاہان تیموریہ عثمانی سلاطین کے ساتھ خط و کتابت کچھ عربی میں اور کچھ مشرقی ترکی میں کیا کرتے تھے (Rieu ، ۱ : ۲۸۹ ؛ Kurat : کتاب مذکور، ص ۱۹۵ ببعد) اور صفوی بادشاہ عثمانی ترکی میں (دیکھیے Fekete : *Iran Sahlarinin iki türkçe mektubu* در *TM* ، ۵ ، ۱۹۳۵ء : ۲۶۹ تا ۲۷۳) دور قاچار کے دیوان میں فرانسیسی کو بنیادی غیر ملکی زبان کا مرتبہ حاصل ہو گیا اور ابھی تک وہ اس درجے پر فائز ہے ۔

اصل معاہدات اور توثیقات کو ان کے موقع

اجراء کے اعتبار سے متمیز کیا جا سکتا ہے۔ موروثی منصب داروں اور جاگیرداروں کی وفات، نیز حکومت میں تبدیلی آ جانے کے موقع پر توثیق کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اکثر دستاویزات کے خاتمے پر امتناعی عبارت: "تجدید کے لیے ہر سال درخواست نہیں دی جانے گی" اغلب ہے کہ بہ نظر احتیاط درج کی جاتی تھی، عملاً سالانہ تجدید کا دستور عام نہیں ہوتا تھا۔ عملی سہولتوں کے پیش نظر دستاویزات کے مالک ان کی تصدیق شدہ نقلیں جاری کر سکتے تھے جو اصل جیسی ہی مستند تصور کی جاتی تھیں۔ جن فرامین کا تعلق لوگوں کے بڑے بڑے گروہوں یا رعایا کے کسی پورے فرقے سے ہوتا تھا، انھیں سرکاری عمارات و مقامات پر چسپاں کر دیا جاتا تھا (دیکھیے Barthold و Hinz: *Die persische Inschrift an der Mauer der Manücehr Moschee zu Ani*، در *ZDMG*، ۱۰۱، ۱۹۵۱ء، ۲۳۱ تا ۲۶۹؛ Hinz: *Steuerinschriften aus dem mittelalterlichen Vorderen Orient*، در *Belleten*، ۱۲، ۱۹۳۹ء: ۷۳۵ تا ۷۶۹۔

جو قدیم ترین دستاویزات محفوظ ہیں وہ دور ایلخانیہ کی ہیں (یہ زیادہ تر یورپ کے بادشاہوں کے نام مغول فرمانرواؤں کے مراسلے ہیں) آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی اور نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کی کچھ ایرانی دستاویزات ایران (اور اس کی سرحدی ریاستوں) میں اور یورپ کے محافظ خانوں اور عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔ صرف دور صفویہ اور زمانۂ مابعد کی دستاویزات کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ اسی سلسلے میں گرجستانی دستاویزات (M. Chubua: *Persidskie firmani i ukazi Muzeya Gruzii*، ج ۱، Tbilisi، ۱۹۴۹ء؛ اور V. S. Puturidze: *Gruzino-persidskie istoričeskie dokumenti*، Tbilisi، ۱۹۵۵ء) اور ارمنی ماخذ (A.D. Papazyan: *Persidskie dokumenti matenadarana*، ۲ جلد، اریوان ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۰ء) خاص طور پر بہت جامع ہیں، صفوی دستاویزات (جن میں دو ترکمانی بھی ہیں) کا ایک چھوٹا سا مجموعہ برٹش میوزیم میں ملتا ہے (Rieu: *Suppl*، ص ۲۵۲ تا ۲۶۰، جس کا بیشتر حصہ Busse: *Untersuchungen* میں طبع ہو چکا ہے)۔ اِکا دُکا دستاویزات اور مکتوبات ویٹیکن Vatican میں (*A Chronicle of the Carmelites in Persia*، ضمیمہ B) اور اطالوی محافظ خانوں میں (دیکھیے F. Gabrieli: *Relazioni tra lo scià 'Abbas e i Granduchi di Toscana Ferdinondo I e Cosimo II*، در *Rend. Lin*، ۱۹۴۹ء)، پولینڈ میں (H. S. Szapszal: *Wyobrazenia swietych muzulmanskich*، Wilna ۱۹۳۴ء، ص ۲۶ تا ۳۸) سویڈن میں (دیکھیے K. V. Zettersteen: *Türkische, tatarische und persische Urkunden im schwedischen Reichsarchiv*، Uppsala ۱۹۴۵ء) آسٹریا میں (وی آنا) اور جرمنی میں بھی (ڈریسڈن، دیکھیے Fekete: *Iran ......Sahlarinin*) موجود ہیں۔ ایران میں چھوٹے بڑے مجموعے نجی ذخیروں میں محفوظ ہیں۔ یہ تہران (حسین شاہ شاھانی؛ محمود فرہاد معتمد خان؛ ملک) اور تبریز (محمد و حسین آقا نخجوانی) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسرے مجموعے عجائب خانۂ آثار قدیمہ تہران اصفہان کے چہل ستون، جلفای جدید کے ارمنی کلیسا اور کتاب خانۂ آستانۂ مشہد میں محفوظ ہیں، جرمنی میں دستاویزات کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جسے ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء میں Wilhelm Eilers (Würzburg) نے ایران میں مرتب کیا تھا (اصل دستاویزات نیز کتبات کی نقول) اور اب Hans R. Roemer (Mainz) کی ملکیت ہیں۔ مؤخر الذکر نے دو مقالات میں وہ تمام معلومات یکجا کر دی ہیں جو ۱۹۵۷ء تک مہیا ہو سکی تھیں: *Vorschläge für die sammlung von Urkunden zur islamischen Geschichte Persiens*، در *ZDMG*، ۱۰۳، ۱۹۵۳ء: ۳۶۲ تا ۳۷۰، اور

Über urkunden zur Geschichte Agyptens und Persiens in islamischer zeit، در *ZDMG*، ۱۰۷، ۱۹۵۷ء: ۵۱۹ تا ۵۳۸۔

مآخذ: (۱) V. Minorsky: *Some early documents in Persian*، در *JRAS*، ۱۹۴۲ء، ص ۱۸۱ تا ۱۹۴، ۱۹۴۳ء، ص ۸۶ تا ۹۹؛ (۲) A. Mostaert و F. W. Cleaves: *Trois documents mongols des Archives secrètes vaticanes*، در *HJAS*، ج ۱۵، ۱۹۵۲ء، ص ۴۱۹ تا ۵۰۶؛ (۳) F. W. Cleaves: *The Mongolian documents in the Musée de Teheran*، در *HJAS*، ج ۱۶، ۱۹۵۳ء، ص ۱ تا ۱۰۷؛ (۴) P. Wittek: *Ankarada bir ilhani kitabesi*، در *THITM*، ج ۱، ۱۹۳۱ء، ص ۱۶۱ تا ۱۶۳؛ (۵) V. Minorsky: *A soyūrghāl of Qāsim b. Jahāngīr Aq-qoyunlu 903/1498*، در *BSOS*، ج ۹، ۱۹۳۷ء، ص ۹۲۷ تا ۹۶۰؛ (۶) وہی مصنف: *A Mongol decree of 720/1320 to the family of Shaikh Zahid*، در *BSOAS*، ج ۱۶، ۱۹۵۴ء، ص ۵۱۵ تا ۵۲۷؛ (۷) Ann K. S. Lambton: *The administration of Sanjar's empire as illustrated in the 'Atabat al-kataba*، در *BSOAS*، ج ۲۰، ۱۹۵۷ء، ص ۳۶۷ تا ۳۸۰؛ (۸) محمود مہر آفتاب: دستور الکاتب فی تعیین المراتب، Ph. D کے لیے تحقیقی مقالہ، گوٹنجن ۱۹۵۶ء؛ (۹) *Arşiv Kilavuzu*، طبع مجلس منتظمہ موزۂ طوپ قپی سرای، ۲ کراسے، استانبول ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۰ء؛ (۱۰) J. Aubin: *Note sur quelques documents Aq-qoyunlu*، در *Mélanges L. Massignon*، ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۳ تا ۱۴۷؛ (۱۱) وہی مصنف: Note préliminaire *sur les archives du Takya du Tschima Rud*، تہران ۱۹۵۵ء؛ (۱۲) خان ملک: *Un ferman d' Abu Nasr Hasan Bahadur*، در آثار ایران، ج ۲، ۱۹۳۷، تا ۱۹۳۹ء، ص ۲۰۲ تا ۲۰۶؛ (۱۳) W. Hinz: *Zwei Steuerbefreiungsurkunden*، در *Documenta islamica inedita*، برلن ۱۹۵۲ء، ص ۲۱۱ تا ۲۲۰؛ (۱۴) H. Horst: *Ein Immunitätsdiplom Schah Muhammad Khudābandās vom Jahre 989/1581*، در *ZDMG*، ج ۱۰۵، ۱۹۵۵ء، ص ۲۸۹ تا ۲۹۷؛ (۱۵) وہی مصنف: *Zwei Erlasse Šāh Tahmāsps I*، در *ZDMG*، ج ۱۱۰، ۱۹۶۱ء، ص ۳۰۱ تا ۳۰۹؛ (۱۶) Ann K. S. Lambton: *Two Ṣafavid soyūrghāls*، در *BSOAS*، ج ۱۴، ۱۹۵۲ء، ص ۴۴ تا ۵۴؛ (۱۷) Khanikoff: *Lettre de M. Khanikoff à M* Dorn ۱۶ ستمبر ۱۸۵۲ء، در *Melanges Asiatiques*، سینٹ پیٹرز برگ، ج ۲، ۱۸۵۴ء، ص ۷۰ تا ۷۳ (آخر دور صفویہ کی دستاویز)؛ (۱۸) C. Speelman: *Journal der Reis van de Gezant der O. J. Companie Joan Cunaeus near Perzie in 1651-1652*، طبع A. Hotz، ایمسٹرڈم ۱۹۰۸ء (متعدد دستاویزات لفظی ترجمے کی صورت میں)؛ (۱۹) محمود فرہاد معتمد: تاریخ روابط سیاسی ایران و عثمانی، تہران، تاریخ ندارد (متعدد قاچاری دستخط ہای بسارون کے چربے)؛ (۲۰) H. L. Robino di Borgo-male: *Une lettre familière de Fath Ali chah*، در *RMM*، ج ۴۰ تا ۴۱، ۱۹۲۰ء، ص ۱۳۱ تا ۱۳۵؛ (۲۱) محمد حسن خان: مرآۃ البلدان ناصری، ۴ جلدیں، تہران ۱۲۹۴ھ (تقریباً ۷۰ دستاویزات کا متن)؛ (۲۲) وہی مصنف: کتاب تاریخ منتظم ناصری، ۲ جلدیں، تہران ۱۲۹۸ تا ۱۲۹۹ ش (تقریباً ۴۰ دستاویزات جن میں ۱۲ دور صفویہ کی ہیں)؛ زیادہ مفصل بیان کے لیے دیکھیے: (۲۳) H. Busse: *Persische Diplomatik im Überblick Ergebnisse und Probleme*، در *Isl*، ج ۳۷، ۱۹۶۲ء۔

(H. Busse)

۴۔ سلطنت عثمانیہ

ترکیہ میں دستاویزات کے آغاز کا سراغ سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی ایام یعنی آٹھویں صدی ہجری/

چودھویں صدی عیسوی تک لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا نظام ایشائی ترکوں کے لائے ہوئے ان نمونوں پر مبنی تھا جن کا ارتقا وسط ایشائی ریاستوں میں ہوا، چنانچہ اس کے طرز میں اویغوری اور چینی روایات کا امتزاج تھا۔ دوسری طرف اس کی تنظیم زیادہ‌تر یورپی اور بالخصوص بوزنطی سلطنت کے قائم کردہ طریق کار پر ہوئی۔ تاتاری، یعنی آلتون اردو اور قریم کے مغول کی دستاویزات میں بڑی حد تک وسط ایشیائی نمونوں کی تقلید کی جاتی تھی اور ان میں اویغوری اور بالواسط طور پر چینی دستاویزات کے اثرات نمایاں تھے۔ اس امر کی شہادت سولھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک کی ان ایرانی دستاویزات سے ملتی ہے جن پر سوز و موز کا عنوان قائم ہے (دیکھیے L. Fekete: *Arbeite der grusinischen Orientalistik auf dem Gebiete der türkischen und persischen Palaeographie und die Frage der Formel "sözümüz"*، در *A O Hung*، ۷، ۱ : ۱۹۵۷ء)۔ پندرھویں صدی سے ترکی دستاویزات کے محض چند ایک مقررہ نمونے ہیں جو پندرھویں صدی سے یکساں صورت میں مروج چلے آ رہے ہیں (دیکھیے F.Kraelitz Greifenhorst، در *SbAK Wien*، ۱۹۲۱ء و *TOEM*، ج ۲۸ و P. Wittek، در *WZKM*، ۱۹۵۷ء)۔ دستاویزات، جنھیں عموماً اوراق اور وثیقہ کہا جاتا تھا، باب عالی کے دیوان الانشاء سے جاری کی جاتی تھیں۔ سلطان یا وزراء کی طرف سے ہونے والے اعلانات کی اہم دستاویزات کا اجرا بے لک یا بے لِک قلمی کے دفتر سے ہوتا تھا، جو باب عالی کے صدر دیوان کا ایک خاص شعبہ اور قبل ازیں دیوان ھمایوں قلمی کے نام سے معروف تھا۔ بیشتر دستابزات پر کاتب، ناسخ اور بے لک جی (مہتمم دیوان) اپنے اپنے دستخط کرتے تھے۔ پھر انھیں رئیس افندی کے پاس اس کی مہر (رسید) ثبت کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ زیادہ اہم معاھدوں کی جانچ پڑتال "نشان جی" کرتا تھا۔ ان پر اس کے طغری کا ہونا ضروری تھا۔ دیوان تکویل میں تقرر ناموں، فرامین اور اسناد سفارت جیسی دستاویزات کی تجدید یا تصدیق کی جاتی تھی۔ تذکرہ نام کی دستاویزات "بویوق تذکرہ جی" کے دفتر سے جاری ہوتی تھیں اور مالیات سے متعلق دستاویزیں "دفتردار" کے محرر تیار کرتے تھے۔ دارالحکومت کے علاوہ صوبوں میں بھی چھوٹے درجے کے عہدے داروں کے اپنے کاتب ہوتے تھے اور انھیں اپنی دستاویزات کے اجراء کا اختیار حاصل تھا (دیکھیے J. Hammer: *Staatsverfassung und Staatsverwaltung des osman. Reichs*، وی انا ۱۸۱۵ء؛ اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: عثمانلی دولتی تشکیلاتی، ۱۹۴۵ء؛ نیز رک بہ بیلک۔

دستاویزات کی دو بڑی اقسام تھیں۔ پہلی قسم کی دستاویزات اعلانات اور پیغامات پر مشتمل ہوتی تھیں، مثلاً سلطان کے فرامین عام موسوم بہ نامہ۔ مکتوب، کتاب، یزی، بتی، توقیع۔ سب سے زیادہ باضابطہ وہ شاہی اعلانات ہوتے تھے جنھیں "خطِ ھمایوں" کہتے تھے۔ ان اصطلاحات کا مفہوم کبھی معین نہیں رہا۔ اکثر اوقات ایک ہی دستاویز مختلف ناموں سے موسوم ہوتی رہی ہے۔ یہی حال دوسری قسم کی مختلف دستاویزات کا ہے جو احکام و فرامین و قوانین سے متعلق ہوتی تھیں، مثلاً فرمان، امر، حکم بیورلدی [رک بآن]؛ نیز رک بہ ا۔ ح۔ اوزون چارشیلی: بیورلدی، در بلتن، ۵/۱۹، ۱۹۴۱ء اور تقرر نامے (برات)۔ اہم ترین سرکاری دستاویزات کے نام مرکب ہوتے تھے، مثلاً عہد نامہ، ملک نامہ (یاتملیک نامہ)، صلح نامہ۔ ایک اور قسم کی دستاویزات کو نشان (سرکاری کاغذات، اسناد، پروانے وغیرہ)، منشور (کسی عہدے یا منصب پر تقرر کی دستاویز)، مثال اور عرض حال وغیرہ کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات دستاویزات کے نام بڑے جامع اور معنی خیز ہوتے تھے، مثلاً نشان شریف عالی شان، فرمان بشارت عنوان وغیرہ۔ یہ نام صرف ان دستاویزات کے لیے مخصوص تھے جنھیں خود سلطان یا اس کے اعلیٰ ترین اہلکار اور سرکاری دفاتر کے محرر

جاری کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے احکام بھی ہوتے تھے جنھیں ادنے درجے کے اہلکار جاری کرتے تھے، جیسے تذکرہ، تلخیص، تحریر، دفتر، وغیرہ۔ ان کے مقابلے میں غیر ملکی سفارتوں کے ارکان جو اسناد اور پروانے ترکی حکومت کے سامنے پیش کرتے تھے انہیں "تقریر" کہا جاتا تھا۔ دستاویزات کی ایک اور قسم وہ تھی جو مذہبی حکام (بالخصوص شیخ الاسلام) جاری کرتے تھے، عرف عام میں انہیں فتوٰی کہتے تھے اور ان کا تعلق تنازعات و اختلافات کے فیصلوں سے ہوتا تھا۔

بحیثیت مجموعی ترکی دستاویزات اور یورپی دستاویزات میں بہت مشابہت نظر آتی ہے؛ عین ممکن ہے کہ ہیئت اور طرز کے اعتبار سے یہ بوزنطی دستاویزات کے چربے ہوں۔ ترکی دستاویزات دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں: پہلا حصہ (ابتدائی اور اختتامی عبارتیں) آداب و رسوم پر اور وسطی حصہ اصل متن پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض باتیں ہر ترکی دستاویز میں ملتی ہیں: آرکان: (۱) دعوت، یعنی مناجات جو ایسی عبارت پر مشتمل ہوتی ہے جس میں والی (بی) کا نام شامل ہوتا ہے، اس میں ھُوَ جیسے سادہ ترین کلمے سے طویل ترین القاب تک استعمال ہو سکتے ہیں (Fr. Kraelitz: Osmanische Urkunden in türkischer Sprache، در SbAK Wien، ۱۹۲۱ء میں اس کی متعدد مثالیں دی ہوئی ہیں)۔ ابتدائی عبارت کے بعد کسی قدر دائیں جانب تھوڑی سی خالی جگہ چھوڑی ہوئی ہوتی ہے (صرف سلطان کی جانب سے جاری شدہ دستاویزات میں) جس کے نیچے (۲) طغریٰ، یعنی سلطان کی امتیازی علامت یا نشان درج کیا جاتا ہے، جسے نشان ہمایوں، توقیع یا علامت بھی کہتے ہیں، ہر سلطان کی علامت مختلف نمونے کی ہوتی ہے۔ نشان سلطان، سلطان کے نام اور جملہ القاب و دیگر امتیازات اور عبارت "مظفر دائما" پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک آرائشی حاشیہ ہوتا ہے جس کی شکل اور نمونہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ طغریٰ ایک محرر بڑی احتیاط سے تیار اور درج کرتا تھا جو اسی کام کے لیے مخصوص ہوتا تھا اور طغریٰ کش کہلاتا تھا۔ طغریٰ رنگین بنایا جاتا تھا، اس کی اصل کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا (دیکھیے اوزون چارشیلی، در بلتن، ج ۵، ۱۹۴۱ء: P. Wittek در *Byzantion*، ج ۱۸، ۱۹۴۸ء اور ج ۲۰، ۱۹۵۶ء: F. Kraelitz-Greifenhorst در *MOG*، ج ۱: F. Babinger: *Sarre-Festschrift*، ۱۹۲۵ء: P. Miyatev: *Tugrite na osmanskite sultani ot XV-XX wek*، در *Godisclnik na plovdivska narodna biblioteka i muzei 1937—1939*، صوفیہ ۱۹۴۰ء: E. Kühnel: *Die osmanische Tughra*، Wiesbaden ۱۹۵۵ء: نیز رک بہ طغریٰ)۔ اعلٰی عہدیداروں کی طرف سے جاری کردہ دستاویزات پر طغریٰ کے بجائے ایک اور علامت پنجہ درج ہوا کرتی تھی۔ اسے دستاویز کے شروع میں نہیں بلکہ اس کے دائیں یا بائیں حاشیے پر یا طومار کے نچلے حصے میں ثبت کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات اسے اِمضاء اور غلطی سے طغریٰ بھی کہتے تھے (F. Kraelitz-Griefenhorst: *Studien zur osmanischen Urkundenlehre*، ج ۱: *Die Handfeste (Pençe) der osmanischen Wesire*، در *MOG*، ج ۲)۔ (۳) "عنوان" یعنی اس شخص کا لقب جس کی طرف سے مکتوب لکھا جا رہا ہو۔ دستاویزات سلطانی میں القاب بالخصوص بہت لمبے چوڑے ہوتے تھے اور اس سلسلے میں رسوم و آداب کا بے حد لحاظ رکھا جاتا تھا اور اس کی عبارت حسب دستور "بن کہ" سے شروع ہوتی تھی (دیکھیے Orgun Zarif: *Tuğralarda el muzaffer da'ima duasi ve Sah unvani, Türk Tarih, arkeol. ve etnogr dergisi*، استانبول ۱۹۴۹ء)۔ (۴) پتا یا مکتوب الیہ کے القاب، جو اہم دستاویزات میں خصوصًا بہت طویل ہوا کرتے تھے اور ان کی عبارت کا آغاز "سن کی" یا "عالا" سے

ہوتا تھا۔ نام اور القاب کے علاوہ (جہاں تک مسیحی فرمانرواؤں کا تعلق ہے) بعض ایسی عبارتیں بھی لکھی جاتی تھیں جو عرصے سے مروج تھیں، مثلاً ”مسیح کے شاہان عالی کا نمونۂ کامل“، ”امت مسیحؑ کے عمائدین ذی شان کا نمونہ“ وغیرہ۔ مکتوب الیہ کے نام کے بعد (۵) دعا آتی تھی، مثلاً ایک مختصر سی عبارت میں لکھنے والے کی نیک خواہشات کا اظہار ہوتا تھا جسے یورپی دستاویزات میں مندرجہ آداب و تسلیمات کا مترادف سمجھنا چاہیے۔ اگر مکتوب الیہ مسلمان ہوتا تو اس عبارت میں دعائے خیر و برکت ہوتی اور اس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ سے التجا کی جاتی۔ اگر خط کسی مسیحی کے نام ہوتا تو اس عبارت میں کنایۃً یہ توقع بھی ظاہر کی جاتی تھی کہ اس کا خاتمہ اسلام پر ہو، مثلاً خُتِمَت عواقبہ بالخیر، دیکھیے J. Østrup: *Orientalske Hoflighedsformler*، کوپن ہیگن ۱۹۲۷ء، ص ۸۵ تا ۸۸ (جرمن ترجمہ *Orientalische Höflichkeit*، لائپزگ ۱۹۲۹ء)۔ آداب و القاب کے ابتدائی حصے کا خاتمہ دعا پر ہوتا تھا۔ اصل متن کی طرف گریز ایک مخصوص عبارت سے ہوتا تھا مثلاً ”جب یہ تحریر آپ کے ہاتھ میں پہنچے تو واضح ہو کہ ۔ ۔ ۔“ اس کے بعد (۶) نقل اِبلاغ یا تصریح، یعنی خط یا دستاویز کا اصل متن لکھا جاتا تھا، جس میں اس تحریر کے لکھے جانے کی وجوہ اور سابقہ عطیات اور مراسلات کا ذکر کیا جاتا۔ بعض اوقات اس کا آغاز ”آرلنگ“، یعنی معافی اور اعتذار سے ہوتا جس میں کبھی کبھی کوئی قرآنی آیت یا ضرب المثل بھی شامل کی جاتی۔ غیر ملکی فرمانرواؤں کو بھیجی جانے والی دستاویزات میں بیانیہ حصے اور عبارت مابعد یعنی (۷) ”فیصلے“ میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی تھی، جس کے ابتدائی الفاظ حُکم یا اَمر ہوتے تھے۔ اس عبارت میں اپنے فیصلے یا ارادے کا اظہار کیا جاتا تھا، جس پر زور دینے کے لیے لفظ تاکید کا استعمال ہوتا تھا اور ”شویلہ بیلہ سنز“ جیسی عبارت کا اضافہ کر دیا جاتا تھا جس کے ساتھ (حکام اعلیٰ سے متعلق) لعنت یعنی عدول حکمی کی صورت میں سزا کی دھمکی بھی درج کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد ایک (۸) عبارت تصدیق آتی تھی، جیسے یورپی corroboratio کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً ”بِلی تحقیق بِلوب اعتماد قِلہ سنز“۔ (۹) تاریخ، ایک عربی عبارت کی صورت میں درج کی جاتی تھی، مثلاً تحریراً فی۔ اس کے بعد مہینے کا عشرہ، مہینے کا نام اور سال تحریر کیا جاتا تھا۔ اعداد حروف میں بلا اعراب لکھے جاتے تھے۔ عموماً مہینوں کے نام ان کے صفاتی لاحقوں کے ساتھ آتے تھے، جیسے رمضان شریف۔ دن کے نام کے بجائے بالعموم عشرۂ ماہ درج کیا جاتا تھا۔ پہلے عشرے کو اوائل، دوسرے کو اواسط اور تیسرے کو اواخر کہتے تھے۔ مہینے کا پہلا دن غُرّہ، آخری سَلْخ اور وسط ماہ مُنتصف کہلاتا تھا۔ کسی مہینے کا نام لکھتے وقت اس کی اختصار شدہ صورت تحریر ہوتی تھی۔ خط سیاقت میں لکھی جانے والی دستاویزات میں اسی اصول کی پابندی ہوتی تھی۔ اختصار شدہ صورتوں سے سال کے رُبعوں کے نام بتائے جاتے تھے (پہلا رُبع موشیر، دوسرا رِجیج، تیسرا ژِشن اور چوتھا اِلذِ ہے)، دیکھیے J. H. Mordtmann، در *ISL*، ج ۹؛ Kroelitz و Greifenhorst، در *ISL*، ج ۸؛ J. Mayr: *Islamische Zeitrechnungen*، در *MSOS*، ج ۳۰، ۱۹۲۷ء؛ H. Šabanović: *Izrazi evaʿil, ewasit i evahir u datamima turskih spomenika*، در *Prilozi za Orijentalnu filologiju*، ج ۱، ۱۹۵۰ء؛ (۱۰) مقام اشاعت یا مقام اعلان تاریخ کے بعد درج ہوتا ہے اور یہاں وہی عام عبارت ”بمقام ․ ․ ․ ․“ لکھی جاتی ہے۔ پھر شہر کا نام (بعض اوقات ایک موزوں اسم صفت کے ساتھ) تحریر کیا جاتا ہے اور اکثر اس کی کیفیت بھی بیان ہوتی ہے۔ اگر دستاویز سفر کے

دوران میں یا بڑاؤ پر لکھی گئی ہو تو کلمہ بیورت استعمال کیا جاتا ہے ۔ آخر میں (۱۱) مہر یا خاتم ثبت ہوتی ہے ، جس سے دستاویز کی تصدیق مقصود ہوتی ہے ۔ مہر چینی روشنائی سے نم‌دار کاغذ پر لگائی جاتی ہے جو مختلف سائزوں اور قطعوں کی ہوتی ہے ، گول، بیضوی ، مربع، کثیرالاضلاع وغیرہ اور اس پر کندہ عبارت، کاتب کے نام، مذہبی کلمات اور تزئینات پر مشتمل ہوتی ہے (دیکھیے اسمعیل حقی اوزون چارشیلی ، در بلتن ، ج ۴ ، ۱۹۴۰ء ؛ نیز [رک بہ مہر] ۔ تحریر کے سامنے کے صفحے پر یا اس کی پشت پر اسے مستند اور مصدقہ قرار دینے کے لیے دیوان انشاء کے عہدیدار مختلف تصدیقی عبارات مثلاً صحہ (=صحیح) درج کرتے ہیں ۔ اکثر اوقات بعض اصطلاحات کی اختصار شدہ صورتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں ، مثلاً م بمعنی مرقوم اور لہ بجائے اللہ وغیرہ ۔

عام طور پر ترکی محافظ خانے کی دستاویزات مقامی زبان (ترکی) میں تحریر کی جاتی تھیں لیکن ایسی دستاویزیں بھی ملتی ہیں جو یونانی ، قدیم سلاو (سریلی Cyrillic رسم الخط میں) اور ہنگروی میں ہیں اور ان پر اصلی طغریٰ یا پنچہ ثبت ہوتا ہے ۔ بعض جگہ ترکی متن کے ساتھ اطالوی، پولش وغیرہ میں ترجمہ بھی منسلک ہوتا ہے یا اس متن کو لاطینی، یونانی اور ارمنی حروف میں لکھ دیا جاتا ہے ۔ قازان خانیوں اور آلتون اردو کی دستاویزات، جو پندرھویں صدی عیسوی میں سلاطین کو ارسال کی گئی تھیں، اویغور زبان میں تحریر ہوتی تھیں ۔ ان میں وسط ایشیائی دستاویزات کی خصوصیات ملتی ہیں ۔

ترکیہ کی سیاسی حکمت عملی کے باعث زیادہ رسمی اور باضابطہ دستاویزات لکھنے کا اسلوب رائج ہوا ۔ ہر سطر کا بایاں سرا اوپر کی جانب گولائی کی صورت میں مڑ جاتا تھا جس سے خمدار سرے والی تلوار کی سی شکل بن جاتی تھی ۔ آرائش میں زیادہ باریکی پیدا کرنے کے لیے ہر سطر کا آخری حرف بیضوی صورت میں لکھا جاتا تھا (عموماً نون، راء یا تاء) ۔ رسم الخط دیوانی استعمال کیا جاتا تھا جسے توقیع بھی کہتے ہیں اور اس کی مختلف صورتیں مستعمل تھیں [رک بہ خط] ۔ بسا اوقات مناجات ثُلث میں لکھی جاتی تھی اور باقی متن دیوانی حروف میں ۔ جن دستاویزات پر ادنٰی درجے کے عہدیداروں کے دستخط ہوتے تھے وہ خط نسخی اور دیوانی میں لکھی جاتی تھیں (دیکھیے Mahmut Yazır : *Eski yazilari okuma anahtari* ، استانبول ۱۹۴۲ء) ۔ مالیات سے متعلق دستاویزات حروف سیاقت میں لکھی جاتی تھیں، جن کا پڑھنا بہت مشکل ہے (دیکھیے L. Fekete : *Die Siyāqat- Schrift in der türkischen Finanzverwaltung* ، ج ۱ و ۲، بوداپسٹ ۱۹۵۵ء ؛ N. Popov : *Paleografski osobenosti na čislitelnite imena v pismoto siyakat* صوفیہ ۱۹۵۵ء) ۔

سرکاری دستاویزات بالعموم دائیں جانب خاصا چوڑا حاشیہ (کِنار) چھوڑ کر لکھی جاتی تھیں اس پر ملاحظات حواشی (دِرکِنار)، یعنی وہ اہم نکات لکھے جاتے تھے جن پر جواب کا متن مبنی ہوتا تھا ۔

لکھنے کے لیے بالعموم سیاہ چینی روشنائی استعمال کی جاتی تھی بعض اوقات سیاہی سے لکھے ہوئے حروف پر سنہری ریت (آلتن ریگ یا رہ) بکھیر دی جاتی تھی ۔

دستاویزات کے لیے آبی نشان والا مومی کاغذ استعمال ہوتا تھا جو اکثر اطالیہ سے درآمد کیا جاتا تھا (دیکھیے F. Babinger ، در OM ، ج ۱۱ ، ۱۹۳۱ء) ۔ کاغذ کے اوراق لمبوترے ، مستطیل شکل کے، تقریباً ۵۰ سینٹی میٹر لمبے اور ۲۰ سینٹی میٹر چوڑے ہوتے تھے ۔ سلطانی مراسلات اور بین الاقوامی معاہدے بعض اوقات کئی کئی میٹر لمبے ہوتے تھے ۔ عام طور پر دستاویزات کو چوڑائی کی طرف سے چنٹ ڈال کر تہہ کیا جاتا تھا ۔ چنانچہ جب اس کی تہہ کھولی جاتی تو رسمی آداب و القاب والا افتتاحی حصہ سب سے پہلے نظر کے سامنے

آتا ۔ زیادہ لمبی دستاویزات طومار کی صورت میں لپیٹی جاتیں ۔ ہر ایک دستاویز ریشمی غلاف (کیسہ) میں رکھی جاتی جسے اوپر سے کس کر باندھ دیا جاتا ۔ کاغذ کی ایک پرچی باہر کی طرف نکلی ہوئی ہوتی، جس پر پتا یا "قلق" تحریر ہوتا ۔

نقول (صورت) تیار ہونے کے بعد فائلوں (منشآت) میں سی کر یکجا کر دی جاتی تھیں ۔ ان پر صرف متن تحریر ہوتا تھا اور کسی قسم کے حواشی، آراء، طغرا یا ٹکٹ ثبت نہیں ہوتے تھے ۔ عام طور پر دائیں حاشیے پر متن کی ابتدائی سطور کے بالکل قریب اس مطلب کی ایک قانونی عبارت (بالعموم) عربی میں تحریر ہوتی تھی کہ نقل اصل کے عین مطابق ہے: اسے امضاء یا توقیع قاضی کہا جاتا تھا (دیکھیے F. Kraelitz-Greifenhorst: *Legalisierungsformeln in Abschriften osmanischer kaiserlicher Erlässe und Handschreiben*، در *MOG*، ج ۲، ۱۹۲۶ء)۔ یہ بتانے کے لیے کہ یہ محض نقل ہے اور اصل نہیں، یزیلیجک، گوندریلہ جق، ارسال اولونن جیسے کلمات استعمال ہوتے تھے ۔ دستاویزات کے رجسٹر رکھے جاتے تھے جن میں نقول یا خلاصوں کی قسم کے جو اندراجات ہوتے، انہیں دفتر یا سجل کہتے تھے ۔

ترکی سرکاری و سیاسی دستاویزات کے اسلوب اور اصطلاحی زبان کا ارتقاء سترھویں صدی عیسوی تک جاری رہا تا آنکہ ان کی صورت متعین ہو کر ان میں یکسانی پیدا ہو گئی ۔ انیسویں صدی عیسوی کی تحریر بالکل مطبوعہ نظر آتی ہے ۔ ترکی دستاویزات کے اسلوب و زبان کا اثر کسی حد تک کریمیا کے مغول کے مختلف رسم و رواج پر پڑا ۔ اسی طرح ایران میں دستاویز نویسی بھی اس سے متاثر ہوئی ۔ ایرانی بادشاہ کے رئیس دیوان الانشاء کے دفتر سے مرسلہ متعدد مکتوبات ترکی میں لکھے گئے تھے (دیکھیے L. Fekete، در تورکیات مجموعہ سی، ج ۵، ۱۹۳۶ء)۔

دستاویزات کی نقول اور وصول شدہ مراسلات مخصوص دفاتر میں محفوظ رکھے جاتے تھے ۔ انہیں دفاتر نے آگے چل کر محافظ خانوں کی صورت اختیار کر لی (رک بہ باش وکالت ارشوی و F. Bajraktarević: *Glavni Carigradski arhivi i ispisi iz njega*، در *Prilozi za orijentalnu filologiju i istoriju jugosl naroda*، ج ۶ و ۷، سراجیوو ۱۹۵۸ء)۔

متعدد ترکی دستاویزات ان ممالک میں محفوظ ہیں جو کسی زمانے میں سلطنت ترکیہ کا حصہ تھے، مثلاً مصر (دیکھیے J. Deny: *Sommaire des Archives turques du Caire*، قاہرہ ۱۹۳۰ء)، تونس (دیکھیے R. Mantran، در *Les Cahiers de Tunisie*، ۱۹۵۷ء، ص ۳۳۱ ببعد)؛ بلغاریہ (دیکھیے V. Todorov-Hindalov، در *Godischnik na Narodna Biblioteka*، صوفیہ ۱۹۲۳ء: P. Mulafčiev، در *Mitteilungen des deutsch. wissenschaft. Instituts in Sofia*، صوفیہ ۱۹۳۳ء: P. Miyatev، در *Levéltári Közlemények*، ۱۹۳۶ء: B. Nedkov در *Istoričaki Pregled*، ۱۰/۲، ۱۹۵۳ء)؛ یوگوسلاویہ، دیکھیے F. Giese، در *Festschrift Jacob*: G. Elezoič: *Turski izvori za istoriju Jugoslavena*، بلغراد ۱۹۳۲ء: H. Šabanović: *Turski diplomatički izvori*، در *Prilozi za orijentalnu filologiju*، ج ۱، سراجیوو ۱۹۵۰ء: R. Muderizović: *Turski dokumenti v dubrovackom archivu*، در *Glasnik Zem. Muz*، سراجیوو ۱۹۳۸ء، ج ۵: رومانیہ (دیکھیے M. Guboglu: *Documentele turçesti din arhivele Statului*، بخارسٹ ۱۹۵۷ء)۔ یونان میں یہ دستاویزات نسبۃً کم تعداد میں ہیں (دیکھیے E. Rossi، در *OM*، ج ۲۱، ۱۹۴۱ء)۔ ان دستاویزات کی بہت بڑی تعداد سفارتی ذرائع سے مال غنیمت کے طور پر یا تجارتی تعلقات کے ذریعے غیر ملکی مجموعوں میں پہنچی ہے، خاص طور پر ان ممالک کے ذخیرے بہت باثروت ہیں

جن کے ترکی کے ساتھ بہت قریبی سیاسی یا کسی اور طرح کے روابط رہے ہیں، مثلاً آسٹریا (دیکھیے F. Zsinka، در *KCA*، ج ۱)؛ جرمنی (برلن اور ڈرسڈن کے مجموعوں کے بارے میں دیکھیے L. Fekete، در *Levéltári Közlémenyek*، ۱۹۲۸ - ۱۹۲۹)؛ ہنگری و پولینڈ (دیکھیے E. Zawaliński، در *RO*، ج ۴، ۱۹۲۸ء اور Z. Abrahamowicz: *Przeglad Orient*، ۱۹۵۴ء، ص ۲)؛ اٹلی (دیکھیے A: Bombaci، در *RSO*، ج ۱۸، ۱۹۳۹ء و ج ۲۴، ۱۹۳۹ء؛ L. Fekete، در *Levéltári Közlémenyek*، ۱۹۲۹ء)؛ اور سوویٹ یونین ۔ متعدد دستاویزات مندرجۂ ذیل ممالک میں بھی ملتی تھیں: (دیکھیے K. V. Zetterstéen: *Türkische, tatarische und persische Urkunden im schwedischen Reichsarachiv*، اپسلا ۱۹۴۵ء)؛ ڈنمارک (دیکھیے H. Duda: *Mitteil. d. Instit. f. Oesterreich. Geschichtsforschung*، ج ۵۸، ۱۹۵۰ء)؛ برطانیہ (دیکھیے P. Wittek: *The Turkish documentsts in Hakluyt's 'Voyages'*، در *Bull. of Inst. of Hist. Research*، ج ۱۹، ۱۹۴۲ء اور A.N. Kurat: *Türkiye . . . Ingiliz devlet arşivinde tarihine ait bazı malzemeye ait*، در *AÜDTCFD*، ۱۹۴۹ء)؛ اور چیکوسلوواکیہ وغیرہ (دیکھیے ماخذ از J. Reychman و A. Zajaczkowski: *Zarys dyplomatyki osmańsko-tureckiej*، وارسا ۱۹۵۵ء، انگریزی ایڈیشن زیر طبع) ۔ کئی مجموعوں کی صنف بندی ہونا باقی ہے۔ آج کل چند ایک کی فہرست تیار کی جا رہی ہے۔

مطبوعہ ترکی دستاویزات کے مکمل‌ترین اور جامع‌ترین ماخذ کے لیے دیکھیے J. Reychman و A. Zajaczkowski: (انگریزی ایڈیشن)؛ L. Fekete نے ترکی دستاویزات کی پہلی کتاب نصاب: *Bevezetés a hodoltság török diplomatikájába*، بوڈاپسٹ ۱۹۲۶ء، شائع کی، اس میں ایک "تعارف" اور اس کے بعد دستاویزات کی عکسی تصاویر کا ایک سلسلہ شامل ہے۔ "تعارف" میں تاریخ دستاویز نویسی کے اس مخصوص میدان میں تحقیقات کی ترقی سے متعلق بڑی قیمتی معلومات شامل ہیں۔

۱۹۵۵ء میں ایک کتاب نصاب A. Zajaczkowski و Jan Reychman نے وارسا سے شائع کی: *An outline history of Ottoman Turkish Diplomatic* *(Zarys dyplomatyki osmańsko-türeckiej)* ۔ اس کتاب کا ایک انگریزی ترجمہ بعنوان *A manual ot Ottoman Turkish Diplomatics*، جس میں خاصے اضافے بھی کیے گئے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ایک رومانوی عالم M. Guboglu نے ایک نئی کتاب شائع کی: *Paleografia, și diplomatica turco-osmană*، بخارسٹ ۱۹۵۹ء، جس میں "چربوں" کے علاوہ رومانوی محافظ خانوں سے حاصل کردہ دو سو تین ترکی دستاویزات شامل ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے ترکی دستاویز نویسی اور دستاویزات کے موضوع پر نئی اور مفید معلومات درج کی ہیں۔

مآخذ: مذکورۂ بالا تصنیفات کے علاوہ دیکھیے (۱) F. Babinget: *Das Archiv des Bosniaken Osman Pascha*، برلن ۱۹۳۱ء؛ (۲) L. Fekete: *L'Édition des chartes turques et ses problèmes*، در *Kőrösi Csoma, Arch.*، ج ۱، ۱۹۲۹ء؛ (۳) G. Jacob: *Türkisches Hilfsbuch*، ج ۱، برلن ۱۹۱۷ء؛ (۴) H. Scheel: *Die Schreiben der türkischen Sultane an die preuss. Könige*، برلن ۱۹۳۰ء؛ (۵) *Tarih Vesikaları*، انقرہ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۵۸ء؛ (۶) P. Wittek: *Zu einigen frühosmanischen Urkunden*، ج ۱ تا ۴: در *WZKM*، ج ۵۳ تا ۵۶ (۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۰ء)؛ (۷) L. Fekele: *A. török oklevelek nyelvezete és formai értéke*، در *Levéltári Közlemények*، ج ۳، ۱۹۲۵ء؛ نیز رک بہ باش وکالت آرشیوی، برات، بیلق، بیورلدی، دفتر، دارالمحفوظات العمومیہ، خطّ، مُہر، سجل، طُغراء، وثیقہ۔

(A. ZAJACZKOWSKI و J. REYCHMAN)

* **دَسْتَجِرد**، (ف)، دستگِرد کی معرّب شکل ہے۔ ساسانی مملکت کی کئی بستیوں کا نام تھا، رک بہ دَسْکَرہ.

⊗ **دَسْتُور** : رک بہ قانون اساسی.

⊗ **اَلدَّسْتُور** : رک بہ دفتر.

* **دَسْکَرہ** : عراق کے حسب ذیل چار مقامات کا نام : (۱) بغداد کے شمال مشرق میں دیالی ندی پر ایک شہر ؛ (۲) بغداد کے مغرب میں ضلع نہرالملک کا ایک گاؤں ؛ (۳) بغداد کے جنوب میں جبُل (Djabbul) کے قریب ایک گاؤں ؛ (۴) خوزستان کا ایک گاؤں (دیکھیے یاقوت، ۲ : ۵۷۵ ؛ مراصد، ۱ : ۴۰۲ ؛ دیکھیے المقدسی : ۲۶)۔ دسکرہ پہلوی کے لفظ دست کرتہ (dastakarta) سے معرب ہے۔ فارسی جدید میں اسے دَسْتَجِرْد [رک بآں] کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں مقام، گاؤں، شہر یا صرف مسطّح میدان (دیکھیے Herzfeld : Geschichte der Stadt Samarra، ہیمبرگ ۱۹۴۸ء، ص ۴۴ ؛ J. Mackwart : A catalogue of the provincial Capital of Eranshahr، روم ۱۹۳۱ء، ص ۹۵ ؛ الجوالیقی : المعرّب، ص ۶۷ ؛ A. Geiger، در WZKM، جلد ۴۲، ۱۹۳۵ء، ص ۱۲۳ ؛ ادّی شیر : الالفاظ الفارسیۃ المعرّبۃ، ص ۶۴ ؛ Vullers : Lexicon Persico-Lat.، ۱ : ۸۷۱ تا ۸۷۲، ۸۷۸ (بذیل مادّہائے دسکرۃ، دستکار، دست کرتہ : Fleischer در Levy : Chaldaeisches Wörterb.، ۲ : ۵۷۷ (contra و ۲ : ۴۳۰) ؛ Perles : Etymol. Studien، ص ۸۳ ؛ H. Hübschmann : Armenische Grammatik، ۱۸۹۷ء، ص ۱۳۵ ؛ یاقوت، ۲ : ۵۷۵).

سب سے زیادہ معروف دسکرہ (۱) ہے جو بغداد کے مشرق میں ڈاک کی سڑک پر بغداد سے ۱۶ فرسنگ (تقریباً ۸۸ کیلومیٹر) کے فاصلے پر (ابن خُرّداذبہ، ص ۱۸-۱۹) ٹھیک ۳۴ درجے عرض بلد شمالی کے پر واقع ہے۔ یہ شہر ساسانی دَسْتَجِرْد [رک بآں] کا معمولی سا قائم مقام ہے؛ یہ غالباً پہلے صرف کاروانوں کی ایک منزل تھا، پھر ترقی کر کے ایک اہم قصبہ بن گیا۔ اس کا تعلق ہرمزد اوّل (۲۷۲ تا ۲۷۳ء) سے بھی رہا، جس نے غالباً اس کی دوبارہ تعمیر کی (دیکھیے یاقوت : ۲ : ۵۷۵ اور حمزۃ الاصفہانی)۔ خسرو پرویز سے بھی (۵۹۰ تا ۶۰۸ء) اسے نسبت ہے جس نے اسے اپنی مستقل قیام گاہ بنایا۔ اسی وجہ سے اس کا نام دسکرۃ الملک (=بادشاہ کا دسکرہ) ہو گیا تھا (Herzfeld : سامرّا، ص ۴۴؛ ابن الاثیر : الکامل، ۱ : ۳۴۸، ۳۶۳)۔ ۶۲۸ء میں ہرقل (Heraclius) نے اسے تباہ کر کے کھنڈر بنا دیا۔ اس کے چند سال بعد عربوں کی فتوحات شروع ہو گئیں.

اسلامی عہد میں دسکرۃ (یا دسکرۃ الملک) ایک زرعی ضلع (=طسُّوج) "آستان شاذ قباذ" کا صدر مقام اور خراسان کی سڑک پر کاروانوں کی خاصی اہم منزل تھا (ابن خرّداذبہ، ص ۱۳، ۴۱ ؛ الیعقوبی : البلدان، ص ۲۷۰)۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں دسکرہ خارجیوں کا ایک مستحکم مرکز بن گیا (ابن الاثیر : الکامل، ۳ : ۲۹۰، ۳۱۳ ؛ الطبری، ۱ : ۳۳۱۰، ۳۳۸۸ ؛ ۲ : ۸۹۰، ۸۹۹) ؛ تیسری صدی ہجری/نویں عیسوی تک اس شہر سے خارجیوں کا تعلق رہا، کتاب مذکور، ۳ : ۱۶۸۹ تا ۱۶۹۰، ۲۱۰۸).

دسکرہ نے ایک گاؤں یا چھوٹے قصبے کی حالت سے رفتہ رفتہ ترقی کی اور تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں ایک خاصا متمول اور خوشحال مقام ہو گیا تھا (دیکھیے قُدامہ : الخراج، ص ۲۳۸، جہاں دسکرہ کے طسّوج (ضلع) کے مالی محاصل کا بیان ہے)۔ ابن رُستہ نے دسکرہ کو ایک بڑا شہر قرار دیا ہے (ص ۱۶۴)۔ الاصطخری (۳۱۸ تا ۳۲۱ھ/۹۳۰ تا ۹۳۳ء) اور ابن حوقل (تقریباً ۳۶۷ھ/۹۷۷ء) اس کو بارونق

شہر بیان کرتے ہیں جس کے اردگرد کھجوروں کے جھنڈ کے جھنڈ اور بہ کثرت مزروعہ اراضی ہے۔ وہ یہاں کی گڑھی کا بھی ذکر کرتے ہیں جسے غالباً عربوں نے بنایا تھا (الاصطخری، ص ۸۷؛ ابن حوقل، ۱ : ۲۴۶)، لیکن المقدسی (۳۷۵ھ/۹۸۵ء) نے اسے ایک چھوٹا سا قصبہ پایا تھا جس میں ایک لمبا بازار تھا (ص ۱۲۲، قب ص ۵۳)۔ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں دسکرہ کی رونق کم ہوگئی۔ یاقوت مَراصِد، کی پیروی کرتے ہوئے اسے محض ایک چھوٹا سا گاؤں لکھتا ہے (یاقوت، ۲ : ۵۷۵؛ دیکھیے ۳ : ۲۲۷؛ مَراصِد، ۱ : ۴۰۲)۔ یہ معلوم نہیں کہ دسکرہ کب اجڑا۔

عرب جغرافیادان قدیم دستجرد کے کھنڈر دیکھ کر متاثر ہوتے تھے۔ یعقوبی (البلدان، ص ۲۷۰) یہاں کے قدیم شاہان ایران کی قابل دید عمارتوں کا ذکر کرتا ہے اور ابن رستہ (ص ۱۶۳) ایک ساسانی محل کا، جس کے گرد بلند و بالا دیوار تھی۔

'دستجرد ۔ دسکرہ' کے کھنڈر آج کل شہربان کے جنوب میں تقریباً ۹ میل کے فاصلے پر دیالی کی بائیں جانب دکھائی دیتے ہیں (Herzfeld نے ۱۹۰۵ء میں ان کا ذکر کیا تھا)۔ مسلم عہد کے دسکرہ کے کھنڈر اسکی بغداد کہلاتے ہیں۔ یہ تقریباً نصف میل مربع کا رقبہ گھیرے ہو ہیں جن کے گرد مدوّر برجوں والی فصیل بنی ہوئی ہے۔

مآخذ: علاوہ ان مآخذ کے جو متن مقالہ میں بیان کیے گئے ہیں: (۱) یاقوت: اَلمُشترک، طبع وستنفلٹ Wüstenfeld، ص ۱۷۹؛ (۲) ابن دُلف: الرسالۃ الثانیۃ، طبع و ترجمہ از V. Minorsky، قاہرہ ۱۹۵۵ء؛ (۳) Le Strange، ص ۶۲، نیز ۳۸، ۸۰؛ (۴) Ritter: *Erdkunde*، ۹ : ۳۳۵، ۵۰۰ تا ۵۱۰۔

(A. A. Duri)

* **اَلدَّسُوقی : (ـ الدّسُوقی)**، برہان الدین ابراہیم بن ابی المجد عبدالعزیز [بن قریش بن محمد] معروف بہ ابو العَینَین، بانی سلسلۂ دسوقیّہ جسے برہانیّہ یا برہامیّہ بھی کہتے ہیں اور جس کے پیرو عموماً براھمہ کہلاتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ ان کی ولادت قریۂ مرقس میں جو زیریں مصر کے ضلع غربیہ میں ہے، ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء میں ہوئی، جیسا کہ الشعرانی نے لواقح میں کہا ہے (مگر المقریزی: کتاب السلوک میں سال پیدائش ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء دیا گیا ہے اور حسن بن علی شامہ، جس نے الدسوق کی حزب کی شرح لکھی ہے، ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء بتاتا ہے)۔ الدسوق نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ اپنے قریب کے ایک گاؤں دسوق کے گرد و نواح میں گزارا، اور وہیں ۴۳ سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کے والد (جو مرقس میں مدفون ہیں) ایک مشہور مقامی ولی تھے اور ان کے نانا ابوالفتح الواسطی ضلع غربیہ میں رفاعی فرقے کے سربرآوردہ خلیفہ اور امام تھے (الشعرانی: واقح، ۱ : ۱۷۶)۔ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ واسطی نے اپنے ایک شاگرد محمد بن ہارون کے ساتھ (وہی کتاب، ج ۲ : ۳) جو ممکن ہے کہ ابراہیم کے والد کا مد مقابل ہو، مل کر، پہلے پہل اس افسانے کی ابتدا کی کہ ابراہیم مادرزاد ولی ہے کیونکہ اس نے پیدا ہوتے ہی رمضان کے شروع ہونے کی شہادت دی اس طرح کہ شعبان کے آخری دن پیدا ہوا اور دوسرے دن ماں کا دودھ نہیں پیا۔ فقہ شافعی کا مختصر مطالعہ کرنے کے بعد ابراہیم صوفی بن گئے۔ انھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ان کے بھائی شیخ موسیٰ ہوئے۔

ان کی تصانیف یہ ہیں: اَلجَواھِر (جس کے طویل اقتباسات الشعرانی کی لَواقح میں دیے گئے ہیں) جو زیادہ‌تر مبتدیوں کے لیے ہدایات اور عملی احکام کا مجموعہ ہے؛ اَلجَوھَرۃ میں ان کی کرامات کا بیان ہے؛ اور اَلحَقائق میں وہ مناجاتیں درج ہیں جو

انھوں نے اللہ سے کی۔ ابراھیم چند قصیدوں کے مصنف بھی ھیں جن میں سے دو لواقح میں نقل کیے گئے ھیں (نیز دیکھیے دارالکتب، قاھرہ، فہرست تصوف، عدد ۹، ۳ مجامیع) اور انھوں نے ایک صلوٰۃ اور ایک حزب بھی لکھی ھے۔ ان کی سب سے بڑی کتاب الجواھر ھے جس میں حقیقت اور شریعت کے درمیان محکم دلائل سے تطبیق دی گئی ھے۔ (ان کا کہنا ھے کہ) صرف غلبۂ حال کے وقت شریعت کی پیروی ساقط ھو جاتی ھے۔ صفاے باطن کتاب کا اصل موضوع ھے۔ شریعت کی پیروی، فقط زبانی اقرار نہیں ھے۔ اسی طرح تصوف ظاھری لباس اور زاویہ نشینی کا نام نہیں ھے۔ یہاں باطنی کام ("عمل جوانی") کو دیکھا جاتا ھے، کیونکہ انسان کا اصلی خلوت کدہ اس کا دل ھے، ولی کو اللہ کے ساتھ گہرا تعلق ھوتا ھے، وہ اللہ کے ساتھ "متصل" ھے، اس کے لیے لازم ھے کہ اللہ کی کامل اطاعت بجا لائے۔ صوفی کے لیے حقیقی راستہ محبت، تسلیم (= ولی کا خدا پر کامل اعتماد) اور "ذبح النفس" (= نفس کشی) کا ھے۔ جوھرہ میں جو کرامات گنوائی گئی ھیں، اگرچہ مبالغہ آمیز ھیں، لیکن اس زمانے کے لحاظ سے وہ کوئی غیر معمولی باتیں نہیں۔ حقائق میں ابراھیم کی ایک پر اثر دعا درج ھے جو انھوں نے اللہ سے کی؛ وہ یہ کہ "یا اللہ میرا جسم اتنا بڑا کر دے کہ سارا جھنم اس میں بھر جائے تاکہ باقی تمام انسان اس سے بچ جائیں"۔ یہ واضح ھے کہ ابراھیم نے کسی اور صوفی سے "بیعت" نہیں کی۔ جوھرۃ میں وہ بیان کرتے ھیں کہ سات سال کی عمر ھی میں وہ باستثناے شیخ عبدالقادر (جیلانی)، باقی تمام اولیا سے رتبے میں بڑھ گئے تھے، (اس سے انھوں نے اس بات کی توثیق کر دی کہ وہ رفاعی اور بدوی کی پیروی سے آزاد ھیں)، مگر آگے چل کر وہ بیان کرتے ھیں کہ ایک آسمانی تقریب میں اللہ نے انھیں حکم دیا کہ وہ تمام اولیا کو "خرقہ" عطا کرے اور فرمایا کہ "اے ابراھیم تو ان سب کے اوپر "نقیب" ھے۔ اس تقریب میں وہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم کے پہلو میں تھے اور شیخ عبدالقادر ان کے پیچھے اور الرفاعی شیخ عبدالقادر کے پیچھے تھے۔

المقریزی نے ابراھیم کا بہت ھی مختصر ذکر کیا ھے (کتاب السلوک، ج ۱ : ۷۳۹) اور ابن ایاس (۲ : ۲۲۸) ایک شخص خیرالدین ابوالکرم (م ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) پر، جو خلفاے دسوقیہ میں سے ھیں، راے زنی کرتے ھوے فقط اتنا کہتا ھے کہ "لاباس بہ" (اس میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں)۔ قایتبای ابراھیم کی بہت تعظیم و تکریم کیا کرتا تھا، کیونکہ وہ ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں ان کی خانقاہ کی زیارت کے لیے گیا (وھی کتاب، ۲ : ۱۸۹)۔ اور اس عمارت کی توسیع کی (مبارک : الخطط، ۱۱ : ۷)۔ الشعرانی نے لواقح ۱ : ۱۴۳ تا ۱۵۸) میں ابراھیم کے لیے اتنی زیادہ جگہ وقف کی ھے کہ اور کسی بزرگ کو اتنی جگہ نہیں دی (اس میں زیادہ تر الجواھر کے اقتباسات ھیں) اور ممکن ھے کہ الدسوقی کے نام کی دوبارہ شہرت یہیں سے شروع ھوئی ھو۔ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں حسن بن علی شمہ نے ابراھیم کے حزب کی سب سے پہلی شرح لکھی اور اس کا نام مسرۃ العینین بشرح حزب ابی العینین رکھا (قاھرہ، فہرست تصوف، ۳۸، مجامیع اور سرکیس، ۷۶۲)۔ علی بن احمد الصیرفی نے کشف الغمۃ مختصر الشیخ حسن شمۃ کے نام سے اس کی تلخیص کی (وھی کتاب، عدد ۲۰۹۷)۔ اس حزب کی ایک اور شرح محمد البہی کی ھے (وھی کتاب، ۲۵۹۳) اور ایک غیر معروف شخص عبدالحی نے ۱۲۷۱ھ/۱۸۶۲ء میں الدسوقی کی کتاب الصلوٰۃ کی شرح لکھی تھی (وھی کتاب، ۲۵۹۳)۔ معلوم ایسا ھوتا ھے کہ ابراھیم کی شہرت بڑی حد تک اس کی حزب پر مبنی ھے جو مرادیں بر لاتے، جنات کے بھگانے اور عموماً شفا بخشی اور حفظ و امان

کی تاثیر رکھنے میں مشہور ہے۔ البہی نے لکھا ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے مشہور مصری بزرگ محمد الحفنی اس حزب کا ورد رکھتے تھے، جو عام طور پر صبح اور مغرب کی نمازوں کے بعد پڑھی جاتی تھی۔ الجبرتی (۴ : ۱۷۶) نے لکھا ہے کہ "برہانیّہ، رفاعیّہ، قادریہ اور احمدیہ چاروں کے چاروں "اصحاب العَشَائر" (عرس والے) ہیں۔ ان سلسلوں کے چاروں بانی اکثر چار "اقْیان" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ الدسوق کے مولد کی مکمل کیفیت علی مبارک (الخطط، ۱۱ : ۷) نے لکھی ہے۔ قبطی مہینوں برمُودہ، تُوبہ اور مِسرا میں علی الترتیب تین عرس منائے جاتے تھے۔ ان میں سے دوسرا اور تیسرا آٹھ آٹھ دن تک منایا جاتا لیکن تیسرا "مولد الکبیر" ہوتا تھا۔ خدیو اسمٰعیل نے الدسوق کے مزار کی توسیع کی اور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں اسمٰعیل کے فرزند ابراہیم پاشا نے اس کو نئے غلاف (= کِسْوَہ) سے آراستہ کیا۔ السَّنوسی اپنی کتاب سَلْسَبِیل المعین میں اس سلسلے کی جسے وہ برہانیہ کے نام سے موسوم کرتا ہے، خصوصیات گنواتا ہے جو حسب ذیل ہیں: الذکر الجہری، مجاہدات نفس کُشی اور "یا دائم" کا ورد۔

مآخذ: (۱) [متن میں مذکورہ کتب کے علاوہ] محمد السَّلَقُوِی: طبقات الشیخ احمد الشرنوبی، قاہرہ ۱۲۸۰ھ؛ (۲) صالح بن مہدی: العَلَم الشامخ، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۳۷۶؛ (۳) توفیق الطویل: التصوف فی مصر، قاہرہ ۱۹۴۶ء، بمواضع کثیرہ؛ (۴) A. Le Chatelier : *Les Confréries musulmanes*، پیرس ۱۸۸۷ء، ص ۱۹۰؛ (۵) Lane : *Modern Egyptians*، ۱ : ۳۰۳ تا ۳۰۷؛

(ولید خالدی)

* **الدَّسُوقی**: ابراہیم بن محمد بن عبدالرحمٰن، ایک مشہور صوفی، ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ء میں پیدا ہوئے اور شعبان ۹۱۹ھ/اکتوبر ۱۵۱۳ء میں دمشق میں وفات پائی، دعاؤں کے مجموعوں (وِرد، حزب) کے مصنف ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن العماد: شذرات، سال ۹۱۹؛ (۲) براکلمان، ۲ : ۱۵۳؛ تکملہ، ۲ : ۱۵۳۔

(C. BROCKELMANN)

* **الدَّسُوقی**: السید ابراہیم بن ابراہیم (عبدالغفّار): صوفی ابراہیم الدسوقی [رک بہ الدسوق برہان الدین] (جدید) کے بھائی موسیٰ کی اولاد میں سے تھا۔ وہ ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوا جو مالکی مسلک کا پیرو تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن دسوق میں حاصل کر کے جامع الازہر کے نامور شیوخ کے حلقۂ درس میں شریک ہوا، جن میں مشہور شیخ محمد علّیش مالکی (م ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) بھی تھے۔ اس کے بعد خود تھوڑے دن الازہر میں مدرس رہا، پھر ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں سرکاری ملازمت کے منسلک ہو گیا۔ چونکہ علم اللسان سے خوب واقف تھا اس لیے اُسے اعلیٰ مدارس میں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں کے مصحّح کا عہدہ مل گیا اور پھر خدیو اسمٰعیل پاشا کے عہد میں بولاق کے سرکاری مطبع کا باش مصحّح (یعنی صدر مصحح) مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصے تک سرکاری جریدہ الوقائع المصریہ کا مدیر معاون بھی رہا۔ اس نے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔ اس تالیف میں اس کے تذکرے کے استحقاق کا باعث یہ امر بھی ہے کہ جب لین E. W. Lane، قاہرہ میں دوبارہ جا کر فرسنل Fresnel کے ہاں مقیم ہوا تو فرسنل کی سفارش پر Lane کی مدّ القاموس (*Arabic English Lexicon*) کی تیاری اور اس کے لیے مواد جمع کرنے کے کام پر معتمد علیہ معاون کی حیثیت سے الدسوقی کو مقرر کیا گیا، اور اس نے کئی سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔ چنانچہ لین نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس کی خدمات کا بڑے زور دار الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور اس کی علمی لیاقت کی شہادت دی ہے۔ Lane کے انگلستان واپس چلے جانے کے بعد بھی الدسوقی عربی کتابوں سے اقتباسات بھیج بھیج کر اس کی مدد کرتا رہا (مقدمہ،

۱ : xxii، xxiii) ۔ ہمارے پاس ایک تذکرہ موجود ہے جو الدسوق نے سابق مصری وزیر علی مبارک کی قاموسی تصنیف کے لیے سجع میں لکھا تھا ۔ اس تذکرے میں وہ لین کے ساتھ اپنی ملاقات، لین کی شخصیت، قاہرہ میں اس کے رہن سہن اور طرز زندگی، اور وہاں کے مسلمانوں سے میل ملاقات پر اپنے تاثرات بیان کرتا ہے (ان مسلمانوں میں شیخ احمد بھی شامل ہیں، جن کا نام *Manners and Customs of the Modern Egyptians* کے مقدمہ کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا) ۔ پھر لین کی عربی محاورہ میں منفرد مہارت (گویا کہ وہ ایک عدنانی یا ایک قحطانی عرب تھا)، دونوں کامل کرائمۂ عربی لغت کی تصانیف کا مطالعہ اور اس مواد سے لغات میں استفادہ کرنے کے طریقے، اور لین کی اپنے عرب مددگاروں پر شفقت کی پوری تفصیل تحریر کی ہے ۔ الدسوق کا یہ مقالہ عربی زبان کے انگریز فاضل کے سوانح حیات کے لیے بڑی اہمّیت رکھتا ہے ۔

مآخذ : (۱) علی مبارک : الخِطَطُ الجدیدۃ لمصر القاہرہ ومدنہا و بلادہا القدیمۃ و الشہیرۃ، بولاق ۱۳۰۵ھ، ۱۱ : ۹ تا ۱۳؛ (۲) S. Lane-Poole : *Life of E. W. Lane*، ص ۱۰۷ و بعد؛ [(۳) جمال الدین الشیال : تاریخ الترجمۃ والحرکۃ الثقافیۃ فی عصر محمد علی، مصر ۱۹۵۱ء، ص ۱۸۲] ۔

(I. GOLDZIHER)

* **دَشْمَنْزِیار** : رک بہ کاکُویَہ (بنو) ۔

* **دُعا** : [ع، جمع : اَدْعِیَۃ]، [دَعَا یَدْعُو دُعَاءً و دَعْوٰی، لغوی معنی بلانا، پکارنا، منسوب کرنا، نام رکھنا جیسے دَعَوْتُ اِبْنِی زَیْدًا (میں نے اپنے بیٹے کا نام زید رکھا)، عبادت کرنا اور مدد طلب کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (دیکھیے لسان العرب، تاج العروس، اور المفردات، بذیل مادّہ) ۔ دعا کا اصطلاحی معنی اللہ تعالٰی سے استمداد و استغاثہ ہے، اپنے یا کسی کے حق میں (ل)، یا کسی کے خلاف (علٰی) ۔ اللہ تعالٰی سے دعا تین طرح سے ہوتی ہے : (۱) اس کی توحید بیان کرنا اور اس کی حمد و ثنا کرنا، جیسے کہ کہا جائے یا اللہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ، اور جیسے رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ؛ (۲) اللہ تعالٰی سے عفو و رحمت ایسی چیزیں طلب کرنا جن سے اس کا قرب حاصل ہو، جیسے اَللّٰہُمَّ اغْفِرْلَنَا؛ (۳) دنیا کی بھلائی کی درخواست کرنا، جیسے اَللّٰہُمَّ ارْزُقْنِی مَالًا وَّ وَلَدًا (ابو اسحاق کا قول، در لسان العرب، بذیل مادّہ) ۔ تہلیل و تحمید کو بھی دعا کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بھی اللہ تعالٰی سے جزا حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے : اِذَا شَغَلَ عَبْدِیْ ثَنَاؤُہٗ عَلَیَّ عَنْ مَسْئَلَتِیْ اَعْطَیْتُہٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِیَ السَّائِلِیْنَ ۔ دَعْوٰی بھی دعا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسے وَ اٰخِرُ دَعْوٰہُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۰ [یونس] : ۱۰) ۔

[قرآن مجید میں لفظ دعا تقریبًا ان جملہ معانی میں (تسمیہ کے سوا) استعمال ہوا ہے : بلانا، پکارنا، جیسے لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا (۲۴ [النّور] : ۶۳)؛ منسوب کرنا، جیسے اُدْعُوْہُمْ لِاٰبَآئِہِمْ ہُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَہُمْ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْکُمْ (۳۳ [الاحزاب] : ۵)، عبادت کرنا، جیسے اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ فَادْعُوْہُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ (۷ [الاعراف] : ۱۹۴)؛ استمداد و استغاثہ، جیسے وَادْعُوْا شُہَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲ [البقرۃ] : ۲۳)؛ اللہ تعالٰی سے استمداد و استغاثہ، جیسے قَالُوْا یٰمُوْسَی ادْعُ لَنَا رَبَّکَ بِمَا عَہِدَ عِنْدَکَ (۷ [الاعراف] : ۱۳۴]) ۔

ایسی متعدد احادیث ہیں جن میں دعا کا ذکر پایا جاتا ہے [اور جن میں اس کی فضیلت و اہمیت کو واضح کیا گیا ہے] ۔ امام الغزالیؒ نے إحیاء علوم الدین (قاہرہ ۱۳۵۲ھ)، ۱ : ۳۷۴ تا ۳۷۸ میں اس قسم کی کئی احادیث کا ذکر کیا ہے [جیسے ابو ہریرہؓ

سے روایت ہے: "لَیْسَ شَیْءٌ أَکْرَمَ عَلَی اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ مِنَ الدُّعَآءِ؛ النعمان بن بشیر سے روایت ہے: إِنَّ الدُّعَآءَ هُوَ الْعِبَادَةُ؛ الدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ؛ سَلُوا اللّٰہَ تَعَالٰی مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُحِبُّ اَنْ یُّسْاَلَ وَ اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ اِنْتِظَارُ الْفَرَجِ] ۔ خود باری تعالٰی نے اپنے بندوں کو دعوت دی ہے کہ اس سے دعا کریں، جیسے اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۷ [الأعراف]: ۵۵)، وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (۴۰ [غافر]: ۶۰) اور وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ (۲ [البقرة]: ۱۸۶) ۔ لیکن قضاے حوائج کے لیے کسی غیر اللہ سے دعا نہیں کرنی چاہیے، فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (۷۲ [الجن]: ۱۸)؛ بلکہ صرف اللہ تعالٰی ہی سے دعا کرنی چاہیے، کیونکہ سب سے بڑا گمراہ وہی ہے جو اللہ تعالٰی کو چھوڑ کر کسی سے استمداد کرے (۴۶ [الاحقاف]: ۵) ۔ البتہ کافروں کی دعا بے اثر اور بے سود رہتی ہے (۱۳ [الرّعد]: ۱۴؛ ۴۰ [المؤمن]: ۵۰) اور جن باطل معبودوں سے وہ دعا کرتے ہیں وہ ان کی دعا میں سے کچھ نہیں سن پاتے (۳۵ [فاطر]: ۱۴) ۔ ایک تنقیدی تجزیے میں دعا کے معانی میں صلوٰۃ، ذکر [رک باں]، حزب اور ورد کا ذکر بکثرت آتا ہے ۔ دل میں کی جانے والی عبادت کا مفہوم کسی حد تک ذکر اور فکر [کی اصطلاحات] سے ادا کیا جا سکتا ہے ۔ دعا میں ہمیشہ ایک باضابطہ استدعا کا تصور شامل ہوتا ہے، چاہے یہ دعاے خیر ہو یا دعاے بد ۔ حالات کے مطابق دعا (خدا سے استدعا کرنا) کئی طرح کی ہو سکتی ہے ۔ بنابریں دعا کا ترجمہ ذاتی التجا کرنا بھی جائز ہے، (دیکھیے ابن تیمیہؒ: فتاوی، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ۱ : ۱۹۷؛ مترجمہ Laoust: *Essai sur les doctrines sociales et politiques de Taki-d-Dīn Ahmad b. Taimiya*، قاہرہ ۱۹۳۹ء، ص ۳۲۸ تا ۳۲۹؛ جہاں ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ تلاوت قرآن حکیم سے صلوٰۃ افضل ہے؛ اور تلاوت قرآن حکیم ذکر سے افضل ہے اور ذکر انفرادی دعا سے افضل ہے) مزید براں یہ اجتماعی قدر و قیمت اور قومی پہلو کی بھی حامل ہو سکتی ہے ۔ دعا کے لیے الفاظ کے انتخاب میں انسان آزاد ہے، لیکن اکثر و بیشتر وہ دعائیں پڑھی جاتی ہیں جو متون قرآن حکیم و حدیث میں موجود ہیں ۔ [علماے کرام نے قرآنی دعاؤں کو ادعیة القرآن ایسی کتابوں میں جمع کر دیا ہے اور ماثورہ دعاؤں کو الگ رسائل و کتب میں، مثلاً ابن السنی الدینوری: عمل الیوم و اللیلة، حیدر آباد دکن ۱۳۱۵ھ؛ ابن تیمیہ: جوامع الکلم الطیب فی الادعیة والاذکار، ابن الجزری الدمشقی: الحصن الحصین من کلام سید المرسلین، چاپ سنگی مصر ۱۲۷۷ھ، بولاق ۱۳۰۲ھ؛ ملا علی القاری: الحزب الاعظم والورد الافخم لانتسابه و استناده الی الرسول الاکرم، چاپ سنگی آستانہ ۱۲۶۳ھ، بولاق ۱۳۰۰ھ و ۱۳۰۷ھ، اور چاپ سنگی مکہ ۱۳۰۷ھ؛ السیوطی: عمل الیوم و اللیل؛ اردو تراجم کے ساتھ بھی مسنون دعاؤں کی کئی کتابیں موجود ہیں، مثلاً پیارے رسول کی پیاری دعائیں، مکتبہ سلفیہ لاہور اور مولانا اشرف علی تھانوی مناجات مقبول] .

جن رسائل میں دعا کی ہدایت و تلقین کی گئی ہے، اور خاص طور پر صوفیہ کے رسائل میں، ان میں دعا کے لیے لازمی شرائط اور اس کے ضوابط و آداب کا بیان ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ ان شرائط و ضوابط کا مقصد یہ ہے کہ درگاہ الٰہی میں اجابت دعا کی زیادہ سے زیادہ ضمانت دلائی جائے، الباجوری: حاشیہ .... علی جوهرة التوحید، (قاہرہ ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء، ص ۹۰ تا ۹۱) میں شرائط دعا کا ذکر یوں آیا ہے: اکل (رزق) حلال؛ اجابت دعا پر مکمل یقین رکھتے ہوئے دعا کرنا؛ دوران دعا میں ذہنی یکسوئی،

کسی گناہ، خونی قرابت‌داروں کے مابین دشمنی یا کسی مسلمان کے مفاد کو نقصان پہنچانے کے لیے دعا نہ مانگنا، اور آخر میں یہ کہ کسی ناممکن کام کے لیے دعا نہ مانگنا، کیونکہ ایسا کرنا خدا کے حضور میں سوء ادب ہے ۔

(ب) دعا کے آداب : بہترین وقت کا انتخاب جو الباجوری کے نزدیک سجود، اقامت یا دوران اذان کا وقت ہے؛ دعا کی قبولیت کی شرائط میں سے ہے کہ باوضو ہو کر دو رکعت ادا کرنے کے بعد اعتراف گناہ اور احساس ندامت کے ساتھ دعا کی جائے؛ قبلہ رُخ ہونا، ہاتھ اٹھانا، دعا کے آغاز، وسط اور خاتمے پر خدا کی حمد و ثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر درود پڑھنا [آداب دعا میں شامل ہے] ۔

بعض صورتوں میں جب دعا کا مقصد امّت کی عام فلاح و بہبود ہو تو یہ دعا ایک مسلّمہ مذہبی رسم کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ اس کی نمایاں ترین مثال صلوٰۃ [نماز] استسقاء (بارش کے لیے دعا) ہے؛ اس مقصد کے لیے دعا سے پہلے دو رکعت نماز [رکّ بہ صلوٰۃ] اور دو خطبے نیز چادر کو الٹنے کی رسم کا ادا کرنا ضروری ہے، میّت کے لیے دعا کے بھی متعدد آداب مقرّر ہیں [اور یہ بھی نماز (صلوٰۃ) کی شکل میں ہوتی ہے] ۔

دعا کو پر اثر بنانے کے لیے یہ شرائط اور آداب ملحوظ رکھے جاتے ہیں ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ الفاظ کی تاثیر بڑھانے کے لیے شرعی طہارت اور [ہاتھ اٹھانے کے ساتھ تضرع و الحاح] بھی ضروری ہے ۔ یہ آخری نکتہ بحث طلب ہے؛ جن تصنیفات میں اکثر و بیشتر مواقع پر دعا کی تلقین کی گئی ہے ان میں وضو اور ہاتھ اٹھانے پر زور دیا جاتا ہے، اس کے لیے وہ اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں کہ : "حضور نے دعا میں ہاتھ اٹھانے سے پہلے وضو کیا" (البخاری، مغازی، ۲ : ۵۵)، لیکن النسائی" اور احمد بن حنبل" (۱ : ۲۴۳) صرف صلوٰۃ (دعائے) استسقاء میں ہاتھ اٹھانے کے قائل ہیں ۔

اسلامی عبادات میں اس بات پر اصرار ہے کہ دعا کو خیر و بہبود بالخصوص امّت مسلمہ کی بہبود کے لیے نیز خود اپنی اور دوسروں کی روحانی بہبود کے لیے دعائے خیر کے طور پر ملحوظ رکھا جانا چاہیے ۔ اہل السنۃ اور اہل تشیّع کی کتب عبادات میں اچھی اچھی دعاؤں کی کمی نہیں ہے، حنابلہ کی مقبول عام عبادات میں اکثر دعا کا ذکر ملتا ہے؛ مختلف فرقوں کی کتابوں میں بھی حزب و ورد کے کلمات میں دعا کی آمیزش نظر آتی ہے ۔ اس صورت میں یہ ایک ذاتی استدعائے خیر یا استدعائے بد کی بہ نسبت ایک ایسی دعا بن جاتی ہے جس میں رحمت خداوندی پر بھروسا کیا گیا ہو ۔ اس طرح اگر اسمائے حُسنٰی کا ورد بالتکرار کیا جائے تو ذکر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے یا پھر دعا کی صورت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ ذات باری کا ہر نام اور ہر صفت دعا گو کی کسی ضرورت سے تعلق رکھتی ہے اور یوں اظہار مدّعا ہو جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں دیکھیے اس موضوع پر گزشتہ صدی میں محمد علی خان البخاری کی مخصوص کتاب منحۃ السّراء فی شرح الدّعا ((طبع حیدرآباد)، ۱۳۳۲ھ) ۔ دعا خدا کے حضور میں ایک روحانی اُمنگ کے مترادف بن جاتی ہے ۔

(۲) فلسفہ اور علم کلام میں پیدا شدہ مسائل ۔

فلسفۂ یونان کے زیر اثر مسلم فلاسفہ اور متکلّمین نے اجابت دعا سے متعلق کئی مسائل پیدا کر دیے ۔ ہر دبستانِ فکر اور ہر مصنف نے اپنے نظریات کے مطابق اس کے مختلف جوابات دیے ہیں ۔ یہاں اس کی تین نمایاں مثالیں پیش کی جاتی ہیں (دوسرے مصنّفین کے علاوہ الباجوری نے علم کلام کے اصولوں کا ایک خلاصہ دیا ہے، دیکھیے حوالہ مذکورہ) :

(الف) معتزلہ دعا کی افادیّت کے منکر ہیں،

کیونکہ ان کے نزدیک دعا سے ذات الٰہیہ کی کامل ماورائیت میں فرق آ جاتا ہے۔ فی الحقیقت انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے، لہٰذا اسے اپنی مہمات و حوائج میں تائید ایزدی طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ افعال انسانی خود اپنے نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یوں جب اللہ تعالٰی نے قرآن حکیم میں اپنے بندوں کو اپنے حضور مستدعی ہونے کے لیے ارشاد فرمایا ہے تو دراصل اس سے مقصود ذات باری کی حمد و ثنا ہے اور جب بندوں سے ان کی دعائیں سننے کا وعدہ کرتا ہے تو یہ کسی نیک عمل کا اجرِ محض ہوتا ہے جس کی وہ انہیں ضمانت دیتا ہے۔

(ب) دوسری طرف اشعریّہ کا علمِ کلام، جو مطلق اور آزاد ارادۂ الٰہی پر مرتکز ہے، دعا کی قدر و قیمت کا قائل ہے۔ [ان کے ہاں] نمازِ جنازہ کی حیثیت ایک دعا کی ہے جس میں اللہ تعالٰی سے مغفرت کی التجا کی جاتی ہے، بشرطیکہ یہ اس کی رضا ہو۔ مزید برآں اشاعرہ نے بد دعا کا پہلو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ جو اگر کسی جائز سبب کی بنا پر بد دعا مانگی جائے تو ان لوگوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے جن کا برا چاہا جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ "مظلوم کی دعا قبول ہوتی ہے، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو"۔ بعض اوقات دعا بعینہٖ اور فوری طور پر قبول ہو جاتی ہے؛ بعض اوقات قدرے تاخیر سے، جس کا سبب صرف اللہ ہی جانتا ہے، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم دعا میں جس چیز کے طالب ہوتے ہیں اس کے بجائے اللہ تعالٰی ہمیں کچھ اور عطا کر دیتا ہے اور یہ بات ہمارے لیے زیادہ سودمند ہوتی ہے۔

اشعریہ دعا کو مسلّمہ طور پر "خیر" سمجھتے ہیں اور یہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ ان کا اختیارِ بشری اور دوسرے ثانوی اسباب سے انکار، اور اس کی بنا پر رضائے الٰہی کے سامنے جو مکمل سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اسے کسی طرح بھی عقیدۂ جبر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ضمناً یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اشعری رسائل میں یہ مسئلہ بڑی وضاحت سے اٹھایا گیا ہے کہ دعائے مقبول اور قضائے الٰہی یا قدر میں کیسے موافقت پیدا کی جا سکتی ہے۔

اس مسئلے کے جواب میں عموماً قضائے "مُبْرَم" اور قضائے "مُعلّق" (مشروط) میں خطِ امتیاز کھینچا جاتا ہے۔ مؤخرالذکر صورت یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کہ کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو یا نہ ہو ذات باری تعالٰی کی طرف سے دعا کے امر واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے اور یوں دعا اپنی نوبت پر مشیّت الٰہی کے طے کردہ اسباب میں داخل ہو جاتی ہے۔ قضائے مبرم کی صورت میں دعا مشیت الٰہی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتی، اس شخص کو بہر حال تائیدِ الٰہی نصیب ہوگی جو دعا کرے گا اور یہ دعا بہر حال اپنا مطلوبہ مقصد حاصل کر کے رہے گی۔ اور اجابت دعا کے اسباب و حالات کو "قضائے مُعلّق" میں شامل کر لیا جائے گا۔

(ج) فلاسفہ نے بالکل مختلف اصولوں کے تحت، لیکن اسی قسم کے اندازِ فکر کے ذریعے دعا کو منطقی طور پر اپنے عالمگیر عقیدۂ جبر میں شامل کر لیا ہے۔ اس موضوع پر ابن سینا نے کئی موقعوں پر بحث کی ہے (مثلاً النّجاۃ، طبع بارِ دوم ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء، ص ۲۹۱ تا ۳۰۲؛ معنی الزیارۃ اور رسالۃ فی ماھیۃ الصلوٰۃ، طبع A.F. Mebren، لائڈن ۱۸۹۴ء)۔ دعائے مستجاب دعا عالمِ ارضی کی ترتیب اور عالمِ سماوی کے اسباب کی موافقت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب ہم دعا کے ذریعے تائیدِ الٰہی کے طلب گار ہوتے ہیں تو (ہماری یہ دعا) قوانینِ کائنات کے مطابق کرہ‌ہائے سماوی کی خیالی صورتوں پر ایک مادی ہجوم کی طرح امڈ کر اسی طرح ٹھوس اثرات مترتب کرتی ہے جس طرح انسان کا تخیل اس کے اپنے جسم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مزید برآں

انھیں کرہ سماوی نے انسانوں کی دعا کے بارے میں صلاح دی اور پھر یہ صلاح عالمگیر سلسلۂ اسباب و علل میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ اس وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ درحقیقت ان اسباب کے باھمی تعامل کا نتیجہ ہے کہ دعا قبول ہوتی ہے۔ ابن سینا کے قول کے مطابق دعا ھی کرہ سماوی کے ساتھ انسان کا بلا واسطہ رابطہ استوار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دعائیں جو خاص طور پر بارش، اور ایسی ھی دوسری باتوں کے لیے مانگی جائیں بڑی افادیت کی حامل ہوتی ہیں (النجاۃ، ص ۳۰۱: دیکھیے L. Gardet: *La pensée religieuse d' Avicenne*، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۵ تا ۱۳۷).

دعا کا عقلی جواز پیش کرنے کی جو متعدد کوششیں کی گئیں وہ اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں دُعا کی بڑی اہمیت ہے۔ جہاں تک متّقی مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے نزدیک دعا انسان اور کرہ سماوی کے درمیان رابطہ نہیں بنتی بلکہ اصل رابطہ براہِ راست دعا کرنے والے اور خدا کے درمیان ہے۔ اس سے یہ معروف تصور مکمل ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات رفیع‌تر ہوتا ہے کہ اسم کو مسمّٰی پر قدرت حاصل ہوتی ہے [یعنی دُعا کرنے والا اللہ تعالٰی سے خطاب اپنی حاجت کی نسبت سے کرے، اگر شفا مطلوب ہو تو کہے یا شافی، اگر رزق مطلوب ہو تو کہے یا رزّاق، حاجت سے متعلق صفت کے ساتھ خطاب کرنا دعا کی استجابت پر اثر انداز ہوتا ہے؛ چنانچہ اکثر دعاؤں میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مثلاً رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (۲۳[المؤمنون]: ۱۱۸)؛ فَاغْفِرْلَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ (۷[الاعراف]: ۱۵۵)؛ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۵[المائدۃ]: ۱۱۳)؛ اَللّٰهُمَّ اشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاؤُكَ].

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں؛ [نیز مفتاح كنوز السنۃ، بذیل مادہ الدعاء].

(L. Gardet [و ادارہ]).

* **دُعَان**: رک بہ دُوَعَن.

* **دِعْبِل**: عہد عباسی کے شاعر ابو علی [یا ابو جعفر] محمد [یا حسن یا عبدالرحمٰن] بن علی [بن عبداللہ] بن رزین الخُزاعی کا تخلّص۔ یہ شاعر ۱۴۸ھ/۷۶۵ء میں پیدا ہوا، اور ۲۴۶ھ / ۸۶۰ء میں فوت ہوا۔ اس کی جاے پیدائش یقینی طور پر معلوم نہیں؛ شہر کوفہ اور شہر قرقیسیہ اس کی جاے پیدائش بتائے گئے ہیں۔ کتاب الاغانی میں دیے ہوے حالات کے مطابق اس نے اپنی جوانی کا زمانہ کوفہ میں گزارا، اور جہاں سے اسے اپنی فتنہ‌پردازی کے باعث فرار ہونا پڑا۔ دعبل نے شعرگوئی کی مشق مسلم بن الولید [رک بآں] کی شاگردی میں شروع کی، اور جلد ھی شاعری میں بڑا نام پیدا کر لیا، جس کی شہادت خَلَف الأحمر (م ۱۸۰ھ/۷۹۶ء) اور مروان بن ابی حفصہ (م ۱۸۱ھ/ ۷۹۷ء) کے ساتھ اس کے تعلقات سے ملتی ہے۔ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ / ۸۰۹ء) کے دربار میں باریابی کی سب سے زیادہ مرجّح تاریخ ۷۹۵ و ۸۰۹ء کے درمیان ہے۔ [طخارستان کے شہر سمنجان اور بعد ازاں اسوان مصر کا والی بھی رہا].

چونکہ اس کا میلان شیعیت کی طرف تھا اور حضرت علی الرضا [رک بآں] کی مدح‌سرائی میں شہرت پائی تھی، اس لیے وہ عموماً خلفاے عباسی پر، ہارون سے لے کر متوکل تک، چوٹ کرتا ہے۔ تاہم ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ دعبل کی مدح سرائی کا محرک حصول زر بھی ہوتا تھا؛ چنانچہ ہمیں اس کے قصائد ان خلفا کی تعریف میں بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ دعبل ہجوگوئی اور مدحیہ قصائد کے لیے مشہور ہے، ہجو میں مغلّظات تک سے نہیں چُوکتا، لیکن وہ لطیف جذبات کے اظہار اور فطری مناظر کی تصویر کشی کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس کا سادہ اور براہِ راست اسلوب بیان اسی صفت کا حامل

بلکہ اس کی مزید شہادت ہے جو ابتدائی عباسی عہد کی خصوصیت ہوگئی تھی ۔

ابن رشیق [رک باں] اس کو ابو نواس [رک باں] کے طبقے میں شمار کرتا ہے اور البحتری [رک باں] اسے مسلم بن الولید سے بلند مرتبہ دیتا ہے ۔ ابوتمّام [رک باں] کے ساتھ دعبل کی چشمک، محض شعر و ادب کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس میں سیاست اور مذہب کو بھی دخل تھا، اس لیے کہ ابوتمام شیعیوں کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتا تھا اور شمالی عربوں کا حامی تھا؛ چنانچہ انھیں وجوہات کی بنا پر دعبل نے ابوتمّام کو اپنی کتاب طبقات الشعراء میں جگہ نہیں دی ۔

دعبل کی کتاب طبقات الشعراء، جس کی تکمیل ۲۳۱ھ/۸۴۶ء کے بعد ہوئی اور جس کے اقتباسات نویں صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی عیسوی تک کی تصنیفات میں پیش کیے جاتے رہے ہیں، تاریخ ادب عربی میں ایک مقام رکھتی ہے کیونکہ یہ [محمد بن سلّام] الجُمحی (م ۲۳۰ھ/۸۴۵ء) کی طبقات [الشعراء] اور ابن قُتَیبہ (م ۲۷۶ھ/۸۸۹ء) کی کتاب الشعر کی درمیانی کڑی ہے ۔ علاوہ بریں دعبل چونکہ عہد اسلامی کے چھوٹے شاعروں کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتا تھا، جن میں ہارون الرشید، عبداللہ بن الزیّات (م ۲۳۳ھ/۸۴۷ء) اور احمد بن ابی دواد (م ۲۴۰ھ/۸۵۴ء) کی قسم کے شعراء شامل ہیں، اس لیے اس کی تصنیف ان "جدید شعرا" کی محافظ سمجھی جا سکتی ہے جو ابن قُتَیبہ کی کتاب الشعر کے شعراء سے ماقبل تھے ۔ [ابن الندیم نے اپنی الفہرست میں طبقات الشعراء کے ساتھ دعبل کے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اب اس کے چند طویل قصائد کے سوا اور کچھ نہیں ملتا ۔ ان قصائد میں دعبل کا قصیدہ تائیہ در مدح اہل بیت اور سات سو اشعار پر مشتمل ایک طویل قصیدہ در مدح اہل یمن خاص طور پر قابل ذکر ہیں]۔

مآخذ : (۱) براکلمان، ۱ : ۷۸، تکملہ، ۱ : ۱۲۱ تا ۱۲۲، [تعریب ۲ : ۳۹ تا ۴۱]؛ (۲) الفہرست، ص ۱۶۰؛ (۳) الاغانی، ۱۸ : ۲۹ تا ۶۰؛ (۴) ابن قتیبہ : الشعر (ڈخویہ)، ص ۵۳۹ تا ۵۴۱؛ (۵) تاریخ بغداد، ۸ : ۳۸۲ تا ۳۸۵، ۲ : ۳۴۳، ۹ : ۱۴۳؛ (۶) ابن الجرّاح : الورقہ، قاہرہ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء، ص ۱۷، ۱۲۳؛ (۷) ابن المعتز : طبقات الشعراء المحدثین، طبع A. Eghbal، لنڈن ۱۹۳۹ء، سلسلہ جدید یادگار گب، ج ۱۳)، ص ۱۲۳ تا ۱۲۷؛ (۸) المسعودی : مروج، بمدد اشاریہ؛ (۹) المرزبانی : معجم، قاہرہ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء، ص ۲۳۳؛ (۱۰) الآمدی : المؤتلف، قاہرہ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء، ص ۱۶۸؛ (۱۱) ابن رشیق : العُمدہ، قاہرہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء، ج ۱ : ۶۳؛ (۱۲) ابن حجر : الاصابۃ، قاہرہ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء، ۲ : ۱۰۲؛ (۱۳) وہی مصنف : لسان المیزان، ۲ : ۴۳۰ تا ۴۳۲؛ [(۱۴) ابن حزم : جمہرۃ انساب العرب، ص ۳۱۴؛ (۱۵) ابن عساکر : تاریخ دمشق ۵ : ۲۲۷ تا ۲۴۳؛ (۱۶) الیافعی : مرآۃ الجنان، ۲ : ۱۳۵؛ (۱۷) ابن العماد : شذرات الذہب، ۲ : ۱۱۱؛ (۱۸) عبّاس محمود العقّاد : مراجعات فی الادب و الفنون، ۱۰۶ تا ۱۵۳؛ (۱۹) وہی مصنف : الفصول، ۸۹؛ (۲۰) احمد فرید رفاعی : عصر المامون، ۳ : ۲۵۵ تا ۲۶۳]۔

(L. ZOLONDEK [و ادارہ])

* **دَعْوَۃ** : (ع)، اس کی جمع دَعَوات، مادہ دع و (بقول بعض دع ی) پکارنا، بلانا؛ اس کے اصلی معنی پکار اور بلاوا ہیں [دعا، دعوٰی اور دعوۃ ہم معنی الفاظ ہیں] ۔ قرآن [مجید] (۳۰ [الروم] : ۲۵) میں اس کو قیامت کے دن مُردوں کے قبروں سے اٹھنے کے لیے پکار کے لیے استعمال کیا گیا ہے ۔ اس کے معنی کھانے پر بلانے کے بھی ہیں، اور پھر مہمانوں کے ساتھ کھانے، یعنی ولیمہ کے لیے، بھی مستعمل ہوا ہے : البخاری، کتاب النکاح، ۷۱، ۷۴؛ لسان العرب، ۱۸ : ۲۸۵ ۔ اس کے معنی اللہ سے درخواست، دعا اور نذر و نیاز کے بھی ہیں [اُجیبُ دَعْوَۃَ الدّاعِ (۲ [البقرہ] : ۱۸۶) یہاں قرآن مجید نے

بمعنی دعا اور پکار استعمال کیا ہے]: البخاری، کتاب الدُّعوات، آغاز و باب ۲۶، کتاب الوضوء، باب ۶۹، کتاب الانبیاء، باب ۹ (دعاے ابراہیمؑ: دیکھیے قرآن مجید، ۲ [البقرة]: ۱۲۴ تا ۱۲۹)، باب ۴۰ (دعاے سلیمانؑ، نیز دیکھیے ۳۸ [ص]: ۳۵؛ ۱۰ [یونس]: ۸۹؛ ۱۴ [ابرٰهیم]: ۴۴؛ ۴۰ [المؤمن]: ۴۹ و ۵۰ [الطبری: تفسیر، ص ۲۴، ۴۵، میں لفظ دعا سے اس کی شرح کی گئی ہے])۔ "دعوة المظلوم" (یعنی مظلوم اور ستم رسیدہ کی پکار) ہمیشہ اللہ تعالٰی کے پاس پہنچتی ہے: البخاری، کتاب المظالم، باب ۹ (قب کتاب الجہاد، ۱۸۰)۔ ایک مسلمان کی دَعوة [=دعا] اپنے مسلمان بھائی کے حق میں ہمیشہ مقبول ہے: مسلم، کتاب الذکر و الدعاء، ۸۸۔ ہر قسم کے عہد یا منّت کو بھی دَعوة کہا گیا ہے (مثلاً المسعودی: مروج، ۷: ۳۶۱؛ ابن المعتز: رسائل، قاہرہ ۱۳۶۵ھ، ص ۵۳: دعوة بالشّفاء)۔ اس کا مفہوم بد دعا یا لعنت بھی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ لفظ دعوٰی کے ہم معنی میں بھی آسکتا ہے، جس کا مطلب عدالت میں فریاد، مقدمہ اور قانونی چارہ جوئی ہے۔

مذہبی مفہوم میں "دَعوة" وہ پیغام ہے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے توسط سے انسان کو دیا ہے کہ دین حق (یعنی اسلام) کو سچا مانو: [لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ (۱۳ [الرعد]: ۱۴)]، نیز دیکھیے ۱۴ [ابرٰهیم]: ۴۴، ۵۲]: ہر نبی کا دین اسلام رہا ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳ [اٰل عمرٰن]: ۱۹) اور ہر نبی کی اپنی ایک دَعوة ہے (دیکھیے S. Guyard: *Fragments relatifs à la doctrine des Ismaëliens*، در *Not. et Extr.*، ۲۲ (۱۸۷۴ء): ۱۹۳؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۳۹۲، ۴۱؛ قب Hodgson: *The Order of Assassins*، ۱۹۵۵ء، ص ۲۰۰ ببعد)، حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلّم کی بعثت کا مقصد اس دعوت کی تجدید تھی [جو از ابتدا انبیاے کرام دیتے چلے آئے تھے]۔ یہی دَعوة الاسلام یا دَعوة الرسول ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلّم نے دعوت اسلام کے لیے حکمت اور موعظۂ حسنہ کو ذریعہ بنایا اور اسی کا آپؐ کو حکم ملا تھا: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (۱۶ [النحل]: ۱۲۵)۔

[یہ بھی امر واقعی ہے کہ] جھوٹے مدعیان نبوت نے بھی اپنی تبلیغ کو دَعوة کا نام دیا ہے، خواہ یہ علانیہ ہو یا خفیہ؛ دیکھیے مثلاً الجاحظ: کتاب التّربیع، طبع Pellat، ص ۵۷۔ [یہ بطور تنزل معنی ہے]۔ زیادہ سے زیادہ توسیع کی صورت میں لفظ دَعوة میں پیغام انبیا کی جملہ محتویات، مذہبی قانون وغیرہ بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ دینی سیاست میں دَعوة یہ ہے کہ جمہور کو کسی خاص شخص یا خاندان کی، جو مسلمانوں کی "اِمامت" کا دعوٰی کرتا ہو، طرف داری اور تائید پر آمادہ کیا جائے، یعنی مسلمانوں سے اس کے دینی اور دنیوی اقتدار کو منوایا جائے...، جس کا آخر میں مقصد یہ نکلتا ہے کہ توحید کی بنا پر ایک مثالی حکومت الٰہیّہ قائم کی جائے یا اسے بحال کیا جائے۔ غرض "دَعوة" نئی امامت یا حکومت قائم کرنے کے ذریعوں میں سے ایک ذریعہ ہے، جیسا کہ ابن خلدون اپنے مقدّمہ، (۲: ۱۱۱، ۱۱۸ و انگریزی ترجمہ از روزنتھال Rosenthal، ۲: ۱۲۱، ۱۲۹) میں بیان کرتا ہے۔ عباسی دَعوة اسی قسم کی تھی، جو دراصل آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کے خاندان کے کسی فرد کے حق میں رائے کی تنظیم تھی؛ اس میں کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا جاتا تھا بلکہ تحریک کی بنیاد "الرّضا مِنْ آلِ محمد" یعنی خاندان نبوی کے ایک تسلیم کردہ شخص پر تھی، لیکن جب محمد بن الحنفیہ کے وارث نے اپنے حقوق محمد بن علی العباسی کی طرف منتقل کر دیے تو عباسیوں نے اس تحریک سے فائدہ اٹھایا۔ اسی کو دعوة بنی ہاشم یا دعوة بنی العباس کہتے ہیں (الطبری، ۲: ۱۴۶۷)؛

ابن ابی طاہر طیفور، ص ۲۸۸)۔ "صاحب الدعوۃ" وہ شخص ہے جس کے نام پر تحریک چلائی جائے، لیکن اس لفظ کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو فی الواقع تنظیم کا سربراہ ہو، چنانچہ ابومسلم [خراسانی] کو "صاحب دعوۃ بنی ہاشم" کہا جاتا ہے (الطبری، ۲: ۱۲۹)۔ یہ تحریک ان پیغام‌رسانوں کے ذریعہ چلائی جاتی تھی جو دل و جان سے اس مقصد کے حامی تھے اور جنھیں "دَاعی" (جمع: دُعَاۃ) اور کبھی کبھی "نقیب" (جمع نُقَباء) بھی کہا جاتا تھا۔

اسی طریقے سے علویوں کی "دعوۃ" کا ذکر بھی آتا ہے، جنھیں عباسی ستاتے تھے اور جنھوں نے بھاگ کر طبرستان اور دَیلم میں پناہ لی۔ وہاں انھوں نے اپنے حقوقِ امامت منوا کر ایک ریاست بھی قائم کر لی، جو تھوڑے ہی دن چلی (ابن خلدون: مقدمہ، ۲: ۱۲۲؛ انگریزی ترجمہ از Rosenthal، ۲: ۱۳۳)۔ ایسی ہی الموحدون کی "دَعْوۃ" بھی ہے (کتاب مذکور، ۲: ۲۳؛ Rosenthal، ۲: ۱۳۴)۔ ہر ایک قسمت آزما، جسے الہامی قوتوں کا دعوٰی اور اقتدار حاصل کرنے کی آرزو ہوتی، اسی قسم کی تدبیریں کام میں لاتا تھا اور اپنی "دَعْوۃ" الگ رکھتا تھا (دیکھیے محولۂ بالا کتابیں)۔

لفظ دعوۃ قرمطی اسمٰعیلی تحریک [رکّ بہ اسمٰعیلیہ] کے لیے بہت مشہور ہے۔ اس تحریک کا پہلا اثر شام اور عراق عرب کی قرمطی بغاوت (۲۸۹ھ/۹۰۲ء تا ۲۹۴ھ/۹۰۷ء) کی شکل میں ظاہر ہوا (دیکھیے الطبری، ۳: ۲۲۱۸ ببعد) اور آگے چل کر اس کے تحت شمالی افریقہ میں فاطمی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ اس تحریک سے لفظ دعوت کے ایک مخصوص معنی پیدا ہو گئے، جس کا منشا شیعیوں کے عقیدے میں یہ ہے کہ یہ دعوۃ آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم کی دعوۃ کا تکملہ ہے۔ اسمٰعیلیہ کے نزدیک یہ دعوت ہمیشہ جاری رہے گی اور امام اس کی تجدید کرے گا]۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے Ivanow: *The Rise of the Fatimids*؛ نیز دیکھیے سیدنا علی بن محمد: تاج العقائد، مقالہ ۷۵، در Ivanow: *A creed of the Fatimids*؛ نیز الشہرستانی، قاہرہ ۱۳۶۷ھ، ۲: ۲۶۔

شروع شروع میں اسمٰعیلی تبلیغ خفیہ طور پر ہوتی رہی۔ یہی طریقہ تھا جس سے یمن اور شمالی افریقہ میں کام جاری رہا (دیکھیے B. Lewis: *The origins of Ismā'īlism*، ص ۱۹، ۵۲، ۷۲ وغیرہ) اور مغرب میں اسی کے تحت مہدی عبیداللّٰہ کے داعی نے اپنے آقا سے اقتدار حاصل کیا۔ ابوحنیفہؒ النّعمان کی کتاب کا نام، جس میں انھوں نے یمن اور شمالی افریقہ میں فاطمی دعوت کے آغاز اور المغرب میں ان کی سلطنت کے قیام کا حال بیان کیا ہے، کتاب افتتاح الدعوۃ و ابتداء الدولۃ ہے۔ جب امام کافی طاقتور اور ایک ریاست کا سردار ہو گیا تو اس نے علانیّہ اپنی دَعْوۃ شروع کر دی ("اظہر دَعْوَتَہٗ": ابن خلدون: مقدمہ، ۱: ۳۶۳ و ترجمۂ روزنتھال، ۱: ۴۱۳)۔ عباسیّوں کی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد ان کی دعوۃ تو موقوف ہو گئی تھی، لیکن فاطمیوں کی دعوۃ ان کی ریاست قائم ہو جانے پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے برخلاف مصر میں ان کا اقتدار مستحکم ہو جانے کے بعد سے ان کی دعوۃ منظم ہو گئی اور زیادہ وسیع پیمانے پر جاری کی گئی۔ یہ دعوۃ فاطمیوں کے مقبوضہ علاقوں میں اور جہاں جہاں ان کے عقائد کو تسلیم کر لیا گیا تھا کھلم کھلا ہوتی تھی، لیکن دیگر مقامات میں خفیہ طریقے سے جاری تھی، البتہ جو علاقے ان کی طرف مائل ہوتے وہاں علانیہ کی جاتی تھی (جیسے کہ داعی المؤیّد فی الدین نے ابو کالیجار البویہی کو دعوت دی، دیکھیے سیرۃ مؤیدیہ، طبع محمد کامل حسین، قاہرہ ۱۹۴۹ء، ص ۴۳ ببعد)۔ ہر ایک داعی کو ایک مخصوص علاقہ تفویض کیا جاتا تھا، جسے

"جزیرہ" کہتے تھے (اس کی وجہ تسمیہ اور ان علاقوں کی بابت دیکھیے Rise : Ivanow، ص ۲۰؛ محمد کامل حسین: فی ادب مصر الفاطمیہ، قاہرہ ۱۹۵۰ء، ص ۱۹) ۔ ایران میں یہ دعوت "دعوة مصریان" کے نام سے مشہور تھی، جو اس کے مصری الاصل ہونے کی یاد دلاتی تھی (Rise : Ivanow، ص ۱۳۰) ۔ خالص سیاسی پہلو سے یہ دَعْوة وہ لوگ بھی دے سکتے تھے جو اس کے ساتھ فقط ہمدردی رکھتے تھے، لیکن اصول و عقائد کے لحاظ سے اس کی اشاعت داعیوں کا کام تھا، جن کے سربراہ "داعی الدُّعاة" کا صدر مقام قاہرہ میں تھا اور اس کے فرائض کا نام بھی "دَعْوة" تھا (القلقشندی : صبح الاعشی، ۱۰ : ۴۳۴) ۔ علی العموم اس کا سیاسی مقصد مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلانا تھا کہ فقط امام، جسے "اللّٰہ کی مدد" حاصل ہو اور جو "اسرار نبوی" کا محافظ ہو، وہی نوع انسان کی صحیح ہدایت کر سکتا ہے، نیز یہ کہ سوا فاطمی خاندان کے، جو اسمٰعیل بن جعفر الصادقؒ کی اولاد ہیں، باقی تمام حکومت کرنے والے غاصب اور ناجائز حاکم ہیں جو اپنی سیاست کی وجہ سے بگڑے ہوئے اور دین کے مقدس‌ترین فرائض سے غافل ہیں ۔ الفاظ "قیام (اقامة) بالدعوة الہادیہ" سے صاف ظاہر ہے کہ اماموں کا فرض، جو انھوں نے اپنے ذمے لیا تھا، بنی نوع انسان کو سیدھے راستے پر ڈالنا تھا اور اسی پر ان کے سارے داعی زور دیتے تھے ۔ مثال کے طور پر یہ جملہ ان خطوط میں دیکھا جاتا ہے جو فاطمی خلیفہ المُستنصر نے یمن کے صُلَیحی خاندان کی ملکہ کو لکھے؛ یہ ملکہ اسی فاطمی عقیدے کی تھی (رسائل المستنصر، طبع عبد المُنعم ماجد، قاہرہ ۱۹۵۴ء، عدد ۴۶، ص ۱۵۷)، نیز یہی جملہ داعیوں کے تقرّر کی اسناد میں ملتا ہے (القلقشندی : صبح، ۹ : ۱۹ و ۱۰ : ۴۳۵ ببعد) اور اسمٰعیلی حَلَف میں پایا جاتا ہے (شہاب الدین العُمَری : التعریف، ص ۱۵۸ ؛ قب The origins . . . : B. Lewis، ص ۳۹ تا ۶۰ و عربی ترجمہ، ص ۱۳۱ ؛ نیز در BSOAS، ۱۲ (۱۹۴۸ء) : ۵۹۷ تا ۵۹۸) ۔ علاوہ بریں M. Canard: L' impérialisme des Fatimides et leur propagande، در AIEO، الجزائر، ج ۳ (۱۹۳۲ء - ۱۹۳۷ء) ۔ ان طریقوں کی کیفیت لکھتا ہے جو فاطمی داعی اس خاندان کے دعووں کی تائید میں اور اس کے مخصوص فضائل ثابت کرنے کے لیے اور اس کے بوزنطی یا اموی یا عبّاسی دشمنوں کو بدنام اور کمزور کرنے کے لیے اختیار کرتے تھے ۔

ان کے پروپیگنڈے کے اندر یہ بھی داخل تھا کہ نئے مرید بنائیں اور انھیں تعلیم دیں ۔ حقیقت میں ان کا مذہب سیاسی، دینی ، فقہی اور فلسفی عقائد کا مجموعہ تھا، جس کا ان کے نزدیک ایک خفیہ (باطنی) پہلو بھی ہے (اسی بنا پر اس فرقے کا نام باطنیہ [رکَ باں] ہوا ۔ ابن خلدون (۱ : ۳۶۳ و مترجمۂ روزنتهال، ۱ : ۴۱۳) نے اس کی وجہ تسمیہ بیان کرنے میں غلطی کی ہے اس نے باطن سے امام کا چُھپا ہوا ہونا (مستر) مراد لیا ہے، جس کی بنیاد قرآن مجید اور احکام اسلام کے مجازی معانی پر ہے ۔ یہ معانی مؤمنین کے دانشوروں (=اولیا) کے لیے مخصوص ہیں اور اس کے برعکس ایک دوسرا پہلو ظاہری معنی کا ہے، جو ان لوگوں کے لیے ہیں جن سے فقط امام کی اطاعت مطلوب ہے کہ وہ اس اطاعت کے لوازم (دیکھیے ابو حنیفہ النّعمان : کتاب الهِمّة) نیز مذہبی فرائض ادا کرتے رہیں ۔ عقائد کی تبلیغ اور تعلیم دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے اور فرقے کی مخصوص شرعی عقائد یا حکمت کی تعلیم کے بھی تبلیغی مقاصد تھے ۔ اس کی تفصیل اس تقریر ہی سے واضح ہو سکتی ہے جو جامعة الازہر میں بہت پہلے، یعنی ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں، فقہ فاطمی پر کی گئی تھی اور جس کے سننے والے حاضرین کی فہرست اسما بھی موجود ہے؛ نیز دوسری تقریر سے، جو وزیر ابن کِلّس نے اپنے گھر میں

کی یحیی بن سعید، Patr. Or.، ۲۳/۳ : ۳۰۳ (۲۰۳)۔ ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں "علم اهل بیت" کے موضوع پر قاضی محمد بن النعمان کے خطبات سننے کے لیے شاهی محل میں جم غفیر اکٹھا ہوگیا؛ گیارہ آدمی بھیڑ میں کچلے گئے اور هلاک ہوگئے۔ ۳۹۵ھ/۱۰۰۵ء میں خلیفه الحاکم نے لوگوں کو مجبور کیا کہ "دعوۃ میں داخل ہوں"، جس کا مطلب یہ تھا کہ قاضی القضاۃ عبدالعزیز بن محمد بن النعمان کے خطبے سننے کے لیے حاضر ہوں۔ اس نے محل کے اندر خطبہ دینے کے لیے مختلف دنوں میں مختلف مجلسوں کا انتظام کیا تھا، جن میں سے بعض مردوں کے لیے اور بعض خواتین کے لیے مخصوص تھیں اور بعض میں فقط اعیان و عمائد شامل ہوتے تھے۔ ان مجلسوں میں بھی اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ لوگ دب کر مر جاتے تھے۔ دوسرے ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ رئیس الدعاۃ محل کے ایک حصے میں (جسے المحوّل کہتے تھے) دعوۃ کے جلسوں کا اهتمام کرتا تھا؛ یہ جلسے "مجالس الحکمۃ" کہلاتے تھے۔ اس کی خاص مجالس المحوّل میں ہوتی تھیں، جہاں اس کی ایک خاص کرسی (کرسی الدعوۃ) ہوتی تھی۔ وہ ان لوگوں سے جو فاطمی مذهب میں نئے داخل ہوتے تھے حلف لیتا تھا اور حاضرین مجلس (النجوی) اسے چاندی پیش کرتے تھے۔ خطبات کی تیاری میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا تھا اور وہ پڑھے جانے سے پہلے خلیفه کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔ ان خطبات کی تیاری میں اس کے وہ نقیب اور سرکاری فقیه اسے مدد دیتے تھے جو دارالعلم یا دارالحکمۃ [رک باں] میں پڑھاتے تھے (اسے ۳۹۵ھ/۱۰۰۵ء الحاکم نے قائم کیا تھا اور یہ ایک قسم کی یونیورسٹی تھی۔ اس میں ایک کتاب خانہ بھی تھا)۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ مجالس منعقد کی جاتی تھیں۔ ابن الطُّوَیر (۵۲۵ھ/۱۱۳۱ء تا ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء) کے مطابق مردوں کے لیے مجالس محل کے بڑے کمرے (الایوان الکبیر) میں اور عورتوں کے لیے مجلس الداعی میں منعقد ہوتی تھیں۔ دوسری جانب المُسَبِّحی (۳۶۶ھ/۹۷۷ء تا ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء) نے پانچ مختلف مجلسیں گنوائی ہیں: ایک اولیا کے لیے، ایک عمائدین حکومت اور محل کے جملہ عہدہ داروں کے لیے، ایک عوام الناس اور اندرون ملک سے آنے والے زائرین کے لیے، ایک عورتوں کے لیے (جامع الازهر میں) اور ایک محل کی عورتوں کے لیے (ان تمام جزئیات کے لیے دیکھیے المقریزی، ۱ : ۱۴۳ تا ۲۴۲ و ۲ : ۳۹۰ تا ۳۹۱)۔ القلقشندی (۳ : ۴۸۷) کے مطابق رئیس الدعاۃ کی فقهی مجلسیں منعقد ہونے کی جگه "دارالعلم" تھی اور وهیں مذهب میں نئے شامل ہونے والوں سے حلف لیا جاتا تھا، لیکن یہ پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مذهبی اور فرقے کے عقائد کے متعلق خطبات بھی اسی جگه دیے جاتے تھے (کامل حسین: فی ادب مصر الفاطمیه، قاهره ۱۹۵۰ء، ص ۳۲)۔ اس کا علم همیں اتفاقی طور پر ہوا کہ امیر رضوان (م ۵۰۷ھ/۱۱۱۳ء) کے زمانے میں حلب میں ایک دارالدعوۃ تھا (ابن الشِّحنه، ص ۲۷؛ کمال الدین ابن العدیم، در *Rec. Hist. Cr. Or.*، ۳ : ۵۸۹ تا ۵۹۰؛ ابن تغری بردی: النجوم الزاهرۃ، قاهرہ، ۵ : ۲۰۵، ۲۰۷)۔

همارے پاس اس طریق کار کا مفصل بیان موجود ہے جس سے اسمٰعیلی داعی اپنے فلسفیانه مذهبی نظریات کی طرف نئے لوگوں کو راغب کرتے تھے۔ ان میں وہ نوافلاطونی نظریۂ اشراق، دنیا اور امامت کے دوائر کے تصورات اور اپنے دعاوی کے ثبوت کے لیے قرآن مجید اور قوانین شرعی کی من مانی تاویلات پیش کرتے اور جس مذهب کا آدمی دیکھتے اسے مائل کرنے کے لیے اس کے مناسب حال مختلف طریقے اختیار کرتے تھے۔ اس بیان کے مطابق جو المقریزی، ۱ : ۳۹۱ ببعد، اور اس سے بھی زیادہ

تفصیل کے ساتھ النُّویری: (ترجمہ در S. de Sacy: *Expose de la religion des Druzes*، جلد ۱، مقدمہ) میں موجود ہے، نیے مرید (المدعُو) کا سلوک نو مدارج کی تعلیم و تربیت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا اور اس تعلیم کا ہر ایک درجہ دعوۃ کہلاتا تھا۔ یہ تنظیم اسمٰعیلی مسلک کے مبیّنہ بانی عبداللہ بن میمون القدّاح سے منسوب کی جاتی تھی۔ اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے اسرار کس طرح بتدریج نو آموز کے آگے "تاویل" اور "تاویل التاویل" کے ذریعہ کھولتا تھا (اس آخری تعبیر کے لیے دیکھیے المسعودی: تنبیہ، ص ۳۹۵، ترجمہ، ص ۵۰۱، اور قب Goldziher: *Vorlesungen*، بار دوم، ص ۲۳۶؛ فرانسیسی ترجمہ، ص ۲۰۶)۔ Ivanow نے متعدّد مقامات پر (*An Ismailitic Work by Nasirud-din Tusi*، در *JRAS*، ۱۹۳۱ء، ص ۵۳۴؛ *The Organization of the Fatimid propaganda*، در *JBBRAS*، ۱۵ (۱۹۳۹ء): ۱-۱۱، اور *Rise*، ص ۱۳۳ در باب *The Myth of 'Abdu'llahb. Maymūn al-Qaddāḥ*) اس بیان پر اعتراض کیا ہے کہ اسمٰعیلی مسلک میں نیے داخل ہونے والوں کو نو مدارج یا مراتب کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس طرح رفتہ رفتہ انھیں واقف اسرار کیا جاتا تھا۔ اس کی رائے کے مطابق اس جماعت "حدُود الدین" کی غلط تعبیر کی گئی ہے جو فاطمی پیشوایانِ مذہب کی ایک قسم تھی (اس طرز تعبیر کے لیے دیکھیے Ivanow: *Organization*، ص ۸ اور ایک حاشیہ در M. Canard کے ترجمۂ سیرۃ جوذر، ص ۵۲)۔ نیے مریدوں کی تعلیم کے ان نو درجوں کا قدیم طریق سے تعلق ہے اور نہ جدید طریق سے، اس کا کوئی نشان نہ خود اس فرقہ کی کتابوں میں ملتا ہے اور نہ مناظروں کی کتابوں میں کہیں دیکھنے میں آتا ہے؛ اسی طرح وہ اس فرقے اور فری میسنز Freemasons کی تعلیم گاہوں اور خفیہ رسوم کی تعلیم میں مشابہت کا انکار کرتا ہے۔ تاہم اس بات کو باور کر لینا مشکل ہے کہ اوپر کا بیان محض اختراع ہے۔ نو مدارج المقریزی اور النُّویری سے پہلے ہی سُنّی مآخذ کے ذریعے معلوم تھے، اگرچہ ان مآخذ میں یہ اسمٰعیلی سلوک کے نو درجے یا "مراتب" نہیں، بلکہ وہ مرحلے بتائے گئے ہیں جن سے (عام لوگوں کو) مذہب سے رفتہ رفتہ بالکل ہٹا دیتے تھے، ہر درجے کا ایک الگ نام رکھا گیا ہے جو استعمال میں آنے والے منطقی یا نفسیاتی طریقے کے مطابق ہوتا تھا۔ البغدادی: (الفرق بین الفِرق، طبع قاہرہ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء، ص ۱۷۹ ببعد) نے ان درجات (مراتب) کے نام حسب ذیل دیے ہیں: تفرّس، تأنیس، تشکیک، تعلیق، ربط، تدلیس، تأسیس۔ اس کے بعد حلفوں (ایمان) کی نوبت آتی ہے اور اس کے بعد مکمل ترک (خَلْع) کا درجہ ہے (نیز دیکھیے الغزالی: کتاب فضائح الباطنیۃ؛ Goldziher: *Streitschrift des G. gegen die Bāṭinijja Sekte*، ص ۳۰ اور ص ۴ ببعد، اور محمد کامل حسین: فی ادب . . . ص ۹ ببعد)۔

یہ مسئلہ ابھی تک قابلِ تحقیق ہے کہ اسمٰعیلی تبلیغ اور بحث کے مختلف طریقوں کی پوری ترتیب و تکمیل کا زمانہ کیا تھا۔ اسے اس قدر پیچھے بشکل ہی لے جایا جا سکتا ہے کہ اسمٰعیلی فرقے کے ابتدائی ایام سے [illegible] ملے۔ النُّویری اور المقریزی نے جو خاکہ پیش کیا ہے وہ اس زمانے کے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔

لفظ دَعْوۃ کا مفہوم صرف ترغیب اور تبلیغ ہی نہیں ہے، [اس کے بہت سے اور معنی بھی [illegible]]: [illegible] کے نزدیک اس کا مفہوم عقیدہ، مذہب، [illegible]ت، فرقہ، امام کے طرفداروں کی جماعت وغیرہ بھی ہے۔ Ivanow: *Organization*، ص ۱۸ تا ۱۹ نے لکھا ہے کہ دعوۃ کا مفہوم حلقۂ اطاعت، سلطنت، خاندان شاہی بھی لیا گیا ہے۔ ابن حوقل کہتا ہے (ص ۵۷ تا ۵۸) کہ "سرزمین مغرب امیرالمؤمنین المعزّ لدین اللہ کے حلقۂ دعوت میں اندر ہے" اور (ص ۲۲۱) "کرمان باشندگان

مغرب کی دعوة میں ہے"۔ ابوحنیفه النّعمان کی کتاب الہمّة، باب ۷ میں "مَنْ شَمَلَتْ دعوةُ الامام" خلیفه کی ساری رعایا کو ظاہر کرتا ہے ۔ سیرت جوذر (ترجمه، ص ۳۵، قب Ivanow : Rise، ج ۹) میں "شیوخُ الدعوة" کی ترکیب مجموعی طور پر "شیوخ الدولة" کے مترادف ہے ۔ انھیں معنوں میں شاہی خاندان کے واسطے اس کے استعمال کے لیے نیز دیکھیے الاصطخری، ص ۱۴۳س ۴ ۔ اور ۲۹۶س ۴؛ "سوادُ دعوة بنی العباس" عبّاسی خاندان کا سیاہ رنگ (BGA، ۴: ۲۳۶) المقریزی : سلوک، ۱ : ۱۸ ۔ آخر میں هم یه دیکھ سکتے هیں که دعوة کا مفهوم وهبی اِباضیوں کے هاں مذهب بهی لیا گیا ہے جو اپنے آپ کو اهل المذهب یا اهل الدعوة کہتے هیں (T. Lewicki : *La renartition gégraphique des groupements ibädites dans l'Afrique du nord au Moyen Age*، در *RO*، ج ۲۱، ۱۹۵۷ء).

۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء میں المستنصر کی وفات کے بعد، جب اس کے فرزند مستعلی کی جانشینی کا اس کے دوسرے فرزند نزار کے مقابلے میں اعلان کیا گیا، تو اسمٰعیلی فرقے میں تفرقه پڑ گیا ۔ اسمٰعیلیوں کے ایک گروه نے مستعلی کو جانشین ماننے سے انکار کر دیا، اس وقت سے اس فرقے کے دو گروه هو گئے، مستعلوی اور نزاری ۔ پہلا گروه "الدعوة القدیمة" اور دوسرا "الدعوة الجدیدة" کہلایا ۔ یه تفرقه همیشه کے لیے قائم هو گیا ۔ جب مستعلی کے فرزند آمر کو نزاریوں نے ۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء میں قتل کر دیا تو اس نے مرنے سے قبل اپنا حق سلطنت اپنے چچیرے بھائی عبدالمجید کو، جو آگے چل کر حافظ کہلایا، تفویض کر دیا، کیونکه اس کا اپنا لڑکا طیّب کمسن تھا ۔ اس کے بعد طیّب غائب هو گیا یا "ستر" میں داخل هو گیا ۔ دعوة قدیمه کا دوسرا نام "دعوة الطّیّبیّة" بھی هو گیا اور یمن میں اسے دوام حاصل هو گیا، جہاں کی صلیحی ملکه نے دعوة کو امام الطّیّب کے نام سے پھیلایا ۔ یہی دعوة قدیمه یا مستعلیه یا طیّبی دعوة ہے، جس کے پاک و هند کے بوهرے آج کل پیرو هیں ۔ دعوة جدیده یا نزاری دعوة کی شہرت حسن بن صباح اور حشیشین (Assassins) کی بدولت هوئی ۔ اس کے پیرو آج کل خوجے هیں ۔ اسمٰعیلی دعوة کی ان دو شاخوں کی بابت دیکھیے ابن خلدون، ۱ : ۳۶۳؛ روزنتھال، ۱ : ۴۱۳؛ الشهرستانی، طبع Cureton، ص ۱۴۷، ۱۵۰ تا ۱۵۲، (مطبوعه قاهره ۱۳۴۷ھ)، ۲ : ۲۶، ۲۸ تا ۳۱؛ Hodgson : *The Order of Assassins*، بمدد اشاریه ۔ شام کے نزاریوں یا حشیشیوں کو فدائیوں بھی کہا جاتا ہے، جنھوں نے اپنے قلعوں کی بدولت صلیبی جنگوں میں اهم حصه لیا ۔ ۶۷۱ھ/۱۲۷۲ء میں انھیں مملوک سلطان بیبرس نے مغلوب کر لیا ۔ پھر بھی وه متعدد مقامات پر بدستور قابض رہے ۔ اس وقت ان کا لقب "الطائفة الاسمٰعیلیة بقلاع الدعوة" مشہور هو گیا ۔ وه خود اپنے آپ کو "اصحاب الدعوة الهادیة"، یا "مجاهدون" کہتے تھے ۔ قاهره سے مقرر کرده ایک ایک ان پر حاکم هوتا تھا (دیکھیے القلقشندی، ۱ : ۱۲۲؛ ۴ : ۱۲۶، ۲۳۵، ۳۰۹؛ ۹ : ۲۵۴) ۔ موجوده دور میں اسلامی تبلیغ اور مبلّغین کے دبستان کے لیے، جسے رشید رضا نے قاهره کے قریب جزیرهٔ روضه میں قائم کیا اور جس کا نام "دار الدعوة و الارشاد" (مرکز تبلیغ و هدایت) رکھا، دیکھیے Goldziher : *Richtungen*، ص ۳۴۳ تا ۳۴۴؛ [نیز دیکھیے دعوت و عزیمت، در ابوالکلام آزاد : الہلال اور دوسری تحریریں نیز رک به اسمٰعیلیه، باطنیه، بوهره، خوجه، فاطمیین، قرامطه].

مآخذ : متن مقاله میں مذکور ماخذ کے علاوه دیکھیے (۱) De Goeje : *Mémoire sur les Carmathes du Bahrain et les Fatimides*، ص ۱۹۱ ببعد، ۲۲ ببعد، ۲۷ ببعد؛ (۲) Casanova : *La doctrine secrète des Fatimides d'Egypte*، در *BIFAO*، ج ۱۸، ۱۹۲۱ء؛ (۳) حسین ایف الہمدانی : *The history of the Isma'ili*

Da'wat and its literature during the last Phase of the Fatimid Empire، در JRAS، ۱۹۳۲ء، ص ۱۲۶ تا ۱۳۶؛ (۴) المجالس المستنصریة، طبع کامل حسین، قاہرہ ۱۹۴۶ء، مقدمہ؛ (۵) احمد حمیدالدین الکرمانی: راحت العقل، طبع کامل حسین اور مصطفٰی حلمی، قاہرہ ۱۹۵۲ء، مقدمہ؛ (۶) کامل حسین: فی ادب مصر الفاطمیة، قاہرہ ۱۹۵۰ء، ص ۹۱ ببعد؛ (۷) Ivanow: Brief survey of the evolution of Ismailism، ۱۹۵۲ء؛ (۸) A. M. Magued: Institutions et Cérémonial des Fatimides، قاہرہ ۱۹۵۳-۱۹۵۵ء، ۱: ۱۷۷ ببعد؛ (۹) مصطفٰی غالب: تاریخ الدعوة الاسمٰعیلیة، دمشق ۱۹۵۳ء (اس سے استفادہ نہیں کیا گیا)؛ (۱۰) Bayard Dodge: Ismāiliyyah and the origins of the Fatimids، در The Muslim World، اکتوبر ۱۹۵۹ء، ص ۲۹۶ تا ۳۰۰؛ (۱۱) B. Lewis: The origins of Ismāʿīlism، کیمبرج ۱۹۴۰ء، عربی ترجمہ Kh. A. Jallu اور J. M. Rajab، قاہرہ ۱۹۴۷ء نے کیا (دیکھیے ص ۱۶۳ ببعد اور مواضع کثیرہ)۔

(M. CANARD)

* **دعوٰی** : [ع، جمع دَعاوِی، دَعاوٰی]، قانونی چارہ جوئی [لغوی معنی وہ قول جس سے انسان کسی شخص کے مقابلے میں اپنا حق ثابت کرے۔ اقرار اس کا عکس ہے، یعنی اپنے خلاف کسی غیر کے حق کو ماننا۔ فقہا کی اصطلاح میں دعوٰی سے مراد قاضی یا حَکَم (ثالث) کے سامنے کسی شخص کا کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں اور اس غیر شخص کی موجودگی میں اپنے حق کی اطلاع کرنا۔ اگر یہ اطلاع قاضی یا حکم کے سامنے اور اس غیر شخص کی موجودگی میں نہ ہو تو اسے دعوٰی نہیں کہا جائے گا۔ اصل کی نیابت ولی، وصی یا وکیل کر سکتا ہے (التہانوی: کشّاف اصطلاحات الفنون، بذیل مادّۂ دعوٰی)]۔ ایک مشہور ضابطے کے مطابق اس کی تعریف یہ کی گئی ہے: "قاضی (حاکم عدالت) کے سامنے کسی شخص کا دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنے حق کا مطالبہ (مجلّة الاحکام العدلیّة، دفعہ ۱۶۱۳)۔ اسی طرح اس مقدمے کو بھی جو فیصلہ کے لیے کسی ثالث (حَکَم) کے سامنے پیش کیا جائے دعوٰی کہتے ہیں۔ نالش کرنے والا مُدّعی اور اس کا مقابل مُدّعٰی علیہ کہلاتا ہے، مطالبہ کا مقصد مدعٰی کہلاتا ہے، جس کے لیے زیادہ رائج نام "مدعٰی بہ" ہے، اگرچہ بعض مصنّفین کے نزدیک یہ زیادہ صحیح نہیں [مدعی اور مدعٰی علیہ کی یہ تعریفیں بھی کی جاتی ہیں: مدعی وہ فریق ہے جو اگر چاہے تو دعوٰی سے دستبردار ہو سکتا ہے اور مدعٰی علیہ وہ فریق ہے جو محض اپنی خوشی سے دعوٰی کے چلنے کو روک نہیں سکتا (ہدایة، ۳، کتاب الدعوٰی: ۱۸۵)۔ مدعی وہ ہوتا ہے جس کی بات اثباتِ حق پر مشتمل ہو اور مدعٰی علیہ وہ ہوتا ہے جس کی بات نفی پر مشتمل ہو۔ مدعی سے مراد وہ شخص جو غیر ظاہر (ظاہری حالت کے برعکس) کا مطالبہ کرتا ہے اور مدعٰی علیہ سے مراد وہ شخص جو ظاہر کو متمسّک ہے۔ مدعی وہ فریق ہے جو اپنے دعوے کو ثابت کیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا اور مدعٰی علیہ وہ فریق ہے جس کے حق میں بغیر شہادت پیش کیے فیصلہ صادر ہو سکتا ہے (التہانوی: ہدایة)۔ امام محمدؒ کے نزدیک مدعٰی علیہ وہ فریق ہے جو دعوٰی سے منکر ہو [عبدالرحیم: The Principles of Muhammanden Jurisprudence، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۳۶۶، نیز اردو ترجمہ]۔ مقدمے کے فریق، اگر دونوں طرف ایک ایک ہوں تو خَصمان، اور زیادہ ہوں تو خُصوم یا خُصَما (یعنی مقدمے میں ایک دوسرے کے حریف، مخالفین) کہلاتے ہیں (واحد: خَصْم)، یوں کہنا چاہیے کہ عملاً ایک دوسرے فریق کا خَصْم ہے۔ فریقین کا باہمی اختلاف "خُصُومة" کہلاتا ہے (اس کے اور مترادف، الفاظ جو اتنے

اصطلاحی نہیں، نزاع، منازعة اور تنازُع ہیں) .

دعوی کے لفظ میں دو باہم جھگڑنے والے فریقوں کا تصور اس کے مفہوم سے اس حاکم عدالت کی ایسی کارروائی کو خارج کر دیتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی منصبی حیثیت کی بنا پر اپنے کچھ اختیارات استعمال کرتا ہے، مثلاً وہ اقدامات جو وہ عوام کی بہبود کی حفاظت کے لیے کرتا ہے .

بہرحال ہر ایسے مقدمے میں جس کے اندر عملِ نزاع کے تین لازمی عناصر کام کر رہے ہوتے ہیں، ایک دعوی ضرور ہوتا ہے، خواہ اس قاضی کی جس کے سامنے مقدمہ پیش کیا گیا ہے حیثیت اور مقصد زیرِ بحث کی نوعیت کچھ بھی ہو .

الغرض دعوی کا وجود ذیل کی صورتوں میں متحقق ہوتا ہے: اس مقدمہ میں جس میں کوئی فرد جسے رنج یا نقصان پہنچا ہو رنج یا نقصان پہنچانے والے کے خلاف استغاثہ دائر کرے ۔ جس میں قصاص [رَک بآں] کے اجرا کا یا دیت [رَک بآں] دلوانے کا مطالبہ ہو؛ (۲) ان مقدمات میں جہاں مختلف حدود شرعیّہ [رَک بہ حَد] کے ماتحت کسی مظلوم کے کُلّی یا یا جزوی نقصان کی تلافی کے لیے ظالم کو عدالت میں طلب کیا جائے، جیسے سَرِقہ یا زنا کی صورت میں ہوتا ہے؛ (۳) فرائضِ منصبی کے تحت فوجداری مقدموں میں جہاں ضرر رسیدہ کو واسطہ بنا کر، یا "حِسْبة" [رَک بآں] کے اختیارات کے بموجب، جس میں تحفّظِ عوام مدّنظر ہوتا ہے، کارروائی کی جائے؛ یہ کارروائی اس اصول پر مبنی ہوتی ہے کہ شخصی شکایات کے علاوہ ہر مسلمان اس شخص کے خلاف چارہ جوئی کا مجاز ہے جس نے قانون شکنی کا ارتکاب کیا ہو اور (۴) اخیر میں ان مقدمات میں جو مظالم کی غیر معمولی کارروائی کے مطابق دائر کیے جائیں .

صحتِ دعوی، یعنی دعوی کو صحیح ماننے کے لیے چند شرائط درکار ہوتی ہیں [مثلاً] مدعیٰ بہ کی پوری تعیین، [اگر مدعیٰ بہ عدالت میں موجود ہے تو اس کی طرف اشارہ کافی ہے مگر موجود نہ ہو تو اس کی توصیف و تعریف، اور اس کی قیمت بیان کرنا ضروری ہے]، فریقین مقدمہ کا مشخص ہونا اور ان کی قابلیّت معلوم ہونا ضروری ہے ۔ جس شخص میں قانون کے سمجھنے کی عام قابلیّت نہ ہو، لیکن اس میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہو، وہ قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے، مگر ایسا کرنے کے لیے اس سرپرست [ولی] یا قاضی کی اجازت اس کے لیے ضروری ہے [اس طرح نابالغ یا مجنون کے خلاف مقدمہ اس کے ولی کے توسّط ہی سے چلایا جا سکتا ہے] ۔ اصلی چارہ جوئی میں ضروری ہے کہ فریق مخالف متنازع فیہ شے پر حقیقةً قابض (صاحبُ الید) ہو [صحتِ دعوی کے شرائط کی بابت دیکھیے، مثلاً مجلة الاحکام العدلیّة، دفعہ ۶۱۶ بعد] ۔ جس صورت میں دعوی دائر کرتے وقت جملہ شروط مکمل نہ ہوں تو انہیں دعوی دائر کرنے کے بعد مکمل کیا جا سکتا ہے ۔ اس تکمیل کا اصطلاحی نام "تصحیح الخصومة" ہے ۔ یہ تکمیل صرف مدعی کی درخواست پر یا قاضی کے حکم پر کی جا سکتی ہے.

مقدمہ میں فریقین خود بالاصالة بھی پیش ہو سکتے ہیں اور اپنے بجائے اپنا مختار بھی بھیج سکتے ہیں ۔ یہ مختار فریق مقدمہ کا خود مقرّر کردہ وکیل بھی ہو سکتا ہے یا جو اہلیّت نہیں رکھتے ان کا حسب اقتضائے قانون وصی یا ولی بھی ہو سکتا ہے ۔ جو چیزیں عوام الناس کے استعمال کے لیے آزاد ہیں، مثلاً سمندر کا پانی یا شاہراہ عام، ان میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے حق استعمال کی محافظت کے لیے قانونی چارہ جوئی کرے ۔ اگر محدود اور معیّن گروہوں کے درمیان باہم نزاع ہو، مثلاً ایک گاؤں کا دوسرے گاؤں سے مشترک چیزوں، جیسے جنگل "چراگاہ" وغیرہ، کے استعمال کے بابت جھگڑا ہو تو ایک گروہ کا کوئی فرد، سارے گروہ کی طرف سے بحیثیت مدعی یا مدعیٰ علیہ

قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس گروہ کے افراد کی تعداد غیر محدود ہو (قوم غیر محصور)؛ عام رائے کے مطابق "غیر محصور گروہ" وہ ہوتا ہے جس کے افراد کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہو۔

بعض جاگیروں کی صورت میں، جیسے کہ اوقاف، جنہیں قانوناً ایک مستقل حیثیت حاصل ہے، قانونی کارروائی میں خاص نمائندے پیش ہوتے ہیں۔ یہی حکم منقسم شدہ میراث کا بھی ہے۔ اصولاً ہر وارث سارے ورثا کی طرف سے مدعی یا مدعیٰ علیہ ہو سکتا ہے، [دعوٰی ثابت ہونے پر تمام ورثا اس سے متمتّع ہوتے ہیں۔ اور مقدمہ ہارنے کی صورت میں باقی ورثا کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ مدعی سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنا دعوٰی ہر ایک وارث کے مقابلے میں اس کے حصّہ کے لحاظ سے ثابت کرے، البتہ وہ فیصلہ کے متعلق مرافعہ کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اگر کسی خاص جائداد میں چند شرکا ہوں لیکن ان کی حیثّیت ورثا کی نہ ہو تو اس جائداد کی بابت دعوٰی میں ایک شریک باقی شرکا کی طرف سے بحیثیت مدعیٰ علیہ جواب دینے کا مجاز نہیں، لیکن اگر دعوٰی صرف اسی کے خلاف ہے تو بلحاظ اس کے حصّے کے اس کے خلاف فیصلہ صادر ہوگا]۔ دعوٰی ایسی عدالت میں دائر کیا جا سکتا ہے جو اس علاقے میں واقع ہو جہاں مدعیٰ علیہ کی مستقل یا عارضی سکونت ہے۔ املاک غیر منقولہ کے بارے میں بھی یہ ضابطہ اسی طرح قابلِ عمل ہے، لیکن مالکی مذہب میں یہ روا رکھا گیا ہے کہ غیر منقولہ املاک سے متعلق اس جگہ کی عدالت میں جہاں وہ جائداد واقع ہے مقدمہ دائر کیا جائے۔ جب ایک ہی مقام پر متعدد قاضی موجود ہوں، یا جہاں ایک عام قاضی ہو اور ایک ایسا قاضی ہو جسے فوجیوں کے مقدّمات سننے کے لیے مقرّر کیا گیا ہو (قاضی عسکر [رکّ باں]) تو عدالت مجاز کو پسند کرنے کا اختیار مدعیٰ علیہ کو ہے؛ تاہم عدالت کے مجاز ہونے کے متعلق قواعد قطعی نوعیت کے نہیں، فریقین کی باہم رضامندی سے انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

فریقین کا حاضر ہونا مقدمہ کی کارروائی کے لیے اصولاً ضروری شرط ہے، اسلامی قانون کے تحت کوئی فیصلہ غیر حاضری کی حالت میں نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں حاضری سے بچنے والے مدعیٰ علیہ کو حاضر ہونے پر مجبور کرنے کے مختلف طریقے مقرّر ہیں۔ انتہائی اقدام کے طور پر قاضی مدعیٰ علیہ کے بجائے اس کا ایک سرکاری نمائندہ مقرّر کرے گا۔

ایک دوسرے نظام میں، جو بالخصوص [مالکی اور] شافعی مسالک اور شیعی قانون میں مروّج ہے، یہ رائے پائی جاتی ہے کہ جب دعوٰی میں مدعیٰ علیہ کا نام اور دیگر کوائف موجود ہوں تو پھر صحتِ دعوٰی کے لیے اس کی حاضری ضروری شرط نہیں؛ مقدمے کی کارروائی اس کی غیر حاضری میں بھی حسبِ معمول کی جائے گی اور اس وجہ سے اسے "یک طرفہ کارروائی" قرار نہیں دیا جائے گا اور جو فیصلہ صادر کیا جائے گا وہ ویسا ہی جائز اور صحیح ہوگا جیسا کہ مدعیٰ علیہ کی حاضری کی صورت میں ہوتا۔

اصولاً مقدّمہ کی کارروائی زبانی ہوتی ہے۔ ہر چند کہ فریقین کو اپنے دلائل تحریری طور پر پیش کرنے کی اجازت ہے تاہم جب تک کہ فریق مقدمہ حاکم کے سامنے اس کے صحیح ہونے کا زبانی اقرار نہ کر لے اس کے تحریری بیان کو سند نہ مانا جائے گا۔

کسی دعوٰی کے جواب اور ردّ کے لیے اصطلاح "دفع" استعمال کی جاتی ہے۔ پھر اس لفظ کو وسعت دے کر ہر جواب کو، جو ایک فریق اپنے مقابل فریق کے کسی مخالف استدلال کو ردّ کرنے کے لیے دے، "دفع" کہنے لگے۔

دعوٰی کا بارِ ثبوت مدعی پر ہوتا ہے [اَلْبَیِّنَۃُ علی المُدَّعی، رکّ بہ البیّنۃ]۔ قانونی ثبوت کے طریقے یہ ہیں: اقبال یا اقرار، گواہی (شہادت)، حلف

(یمین)، طرزِ تحریر (خط) اور قانونی قرائن ۔

[اثباتِ دعوٰی کے لیے سب سے زیادہ قوی دلیل مدعیٰ علیہ کا اقرار ہے ، یعنی مدعیٰ علیہ اس بات کو تسلیم کر لے جس کا دعوٰی کیا گیا ہے ۔ مقِرّ اپنے اقرار سے پابند ہو جاتا ہے، لیکن صحّتِ اقرار کے لیے ضروری ہے کہ مُقِرّ بالغ اور عاقل ہو اور اس پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے، نیز یہ کہ غیر کے خلاف اقرار معتبر نہیں ہوتا ، یعنی اقرار کا اثر صرف اقرار کرنے والے تک محدود ہوتا ہے، بخلاف شہادت کے کہ وہ غیر پر بھی اثر انداز ہوتی ہے (البیّنۃ حجۃ متعدیۃ ، و الاقرارُ حجۃ قاصرۃٌ) ۔ اقرار کے موصوف ہونے کی صورت میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا ایسا اقرار قابلِ تجزیہ ہے یا نہیں، مثلاً قرضے کے دعوٰی میں اگر مدعیٰ علیہ یہ اقرار کرے کہ اس نے قرضہ تو لیا تھا لیکن وہ میعادی ہے تو اس صورت میں احناف اور مالکیّہ کے نزدیک اقرار کا تجزیہ کیا جائے گا، یعنی قرضے کی حدّ تک تو اس کا اقرار معتبر ہوگا، لیکن باقی کا ثبوت اس سے طلب کیا جائے گا ۔ حنابلہ اور مذہبِ ظاہری کے پیرووں کے خیال میں اقرار قابلِ تجزیہ نہیں ۔ شوافع کے اس مسئلہ کے بارے میں دو اقوال ملتے ہیں ۔ امام غزالی کی رائے میں اگر مدعیٰ علیہ میعادی قرضہ کا اقرار کرے تو اقرار قابلِ تجزیّہ نہ ہوگا اور اگر قرضہ کے اقرار کے ساتھ اس کے ادا کر چکنے کا بھی دعوٰی کرے تو اقرار کا تجزیّہ کیا جائے گا ۔

جب مدعیٰ علیہ قرضہ لے تو وہ حقوقُ العباد میں اپنے اقرار سے انحراف نہیں کر سکتا ، لیکن ان جرائم میں جن کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہیں وہ جمہور فقہا (باستثنائے ظاہریون) کے نزدیک انحراف کر سکتا ہے ۔

اثباتِ دعوٰی کی تیسری دلیل قسم (یمین) ہے ۔ اگر مدعی شہادت (بیّنۃ) پیش نہ کر سکے تو وہ مدعیٰ علیہ سے قسم لینے کا مجاز ہے، لیکن قسم فوجداری مقدمات میں جائز نہیں ۔ اگر مدعیٰ علیہ اپنے بری الذّمہ ہونے کی قسم کھا لے تو مدعی کا دعوٰی خارج کر دیا جائے گا ۔ اس پر تمام فقہا متفق ہیں ، لیکن اس مسئلے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مدعیٰ علیہ سے قسم لینے کے بعد مدعی گواہی پیش کر سکتا ہے یا نہیں ۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کے نزدیک شہادت قبول ہوگی کیونکہ شہادت اصل ہے اور قسم اس کی قائم مقام ہے ۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس کی گواہی قسم لینے کے بعد قابلِ قبول ہوگی بشرطیکہ اسے قسم لینے سے قبل یہ علم نہ ہو کہ اس کے پاس گواہ موجود ہے ۔ مذہبِ ظاہری کے مقلّدین کے نزدیک قسم لینے کے بعد مدعی کی گواہی قابلِ قبول نہ ہوگی ۔ اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کر دے تو اس صورت میں احناف اور امام احمدؒ بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق فیصلہ اس کے خلاف صادر کر دیا جائے گا اور مدعی سے قسم نہیں لی جائے گی کیونکہ البیّنۃُ علی المدّعی و الیمینُ علی مَن اَنکر ۔ باقی ائمہ اور امام احمدؒ بن حنبل کی دوسری روایت کے مطابق مدعی سے بھی قسم لی جائے گی ۔ مذہبِ ظاہری کے مقلّدین اور ابن ابی لیلٰی کے نزدیک مدعیٰ علیہ کو قسم کھانے پر مجبور کیا جائے گا، یعنی اسے مجبور کیا جائے گا کہ یا تو اپنے بری الذّمہ ہونے کی قسم کھائے یا اقرار کرے ۔

مجلۃُ الاحکام العدلیۃ ، (دفعہ ۱۷۷۴) میں البیّنۃ علی المدعی کے قاعدے میں ایک استثنا بھی دیا ہے ، چنانچہ وہاں لکھا ہے الامینُ مصدّقٌ بیمینہ، یعنی اگر مستودع یہ دعوٰی کرے کہ اس نے مودِع کو امانت واپس کر دی ہے اور مودِع وصول پانے سے انکار کرے تو مستودع کی قسم معتبر ہوگی اور اس سے اس دعوٰی کے ثبوت میں شہادت طلب نہ کی جائے گی ۔ تمام فقہا نے (باستثنائے مالکیہ) اس استثنا کو تسلیم کیا ہے ۔ مالکیہ اس استثنا کو صرف اسی صورت میں تسلیم کرتے ہیں

جب مودِع نے بغیر گواہوں کے امانت رکھوائی ہو، بصورت دیگر مستودع پر بار ثبوت ہوگا (صبحی محمصانی: فلسفة التشریع فی الاسلام، بار دوم، ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء، ص ۲۲۷؛ اقرار اور یمین کے لیے دیکھیے وہی مصنف: کتاب مذکور، ص ۲۳۰ تا ۲۳۲ و ۲۳۹ تا ۲۵۵ نیز اردو ترجمہ)]۔

شہادت کی ایک خاص شکل تَواتُر ہے۔ تواتُر کے معنی یہ ہیں کہ کثیر التّعداد اشخاص گواہی دیں (ایک عام مسلّمہ رائے کے مطابق اور یہ تعداد اتنی بڑی ہو جس سے عقلی طور پر فریب اور جھوٹ کا اِمکان زائل ہو جائے۔ تواتر کی صورت میں یہ ضروری نہیں کہ گواہی کی سخت شرطوں کا اعتبار کیا جائے، مثلاً یہ کہ گواہ کو شخصی طور پر اس واقعہ کا علم ہو جس کی وہ گواہی دے رہا ہے، یا یہ کہ وہ اخلاقاً ثقہ ہو (عدل [رک باں] سے متصف ہو) باوجود اس کے تواتر، سوائے اقبال (اقرار) کے، تمام طریقِ اِثبات سے افضل ہے۔

اثبات دعوٰی کے لیے تحریر (=خط) بجائے خود کوئی وقعت نہیں رکھتی؛ یہ اسی وقت صحیح طریقِ ثبوت ہوگی جب معتبر گواہ اس کی زبانی تصدیق بھی کر دیں۔ جب مدعی کے ساتھ مدعٰی علیہ خود بخود حاضر نہ ہو تو اس میں اختلاف ہے کہ آیا صرف مدعی کی حاضری سے اور دعوٰی پیش کر دینے سے دعوٰی صحیح قرار دیا جائے گا اور مقدّمے کی کارروائی شروع کر دی جائے گی یا یہ کہ کارروائی شروع کرنے کا اور مدعٰی علیہ کے نام لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا جب تک کہ قاضی پہلے تفتیش کر کے اس کا اطمینان نہ کر لے کہ مقدمے کی کارروائی شروع کرنے کے لیے کم سے کم واضح اور ظاہر وجوہ موجود ہیں۔

اثبات دعوٰی کا اصول ایک شرعی اصول ہے، ان معنوں میں کہ جب دعوٰی کا ایسا ثبوت بہم پہنچا دیا جائے جو قانونی تقاضوں کو پورا کرتا ہو اور ان واقعات کے مخالف نہ ہو جن پر دعوٰی کا دار و مدار ہے تو قاضی کو مقدمے کا فیصلہ اس ثبوت کے مطابق کرنا پڑے گا، خواہ اس کا اپنا دلی یقین کچھ ہی ہو۔ بنابریں فیصلہ کی حسب ذیل صورتیں ہوں گی: ایسے مقدمے میں جہاں فریقین، جن میں سے ہر ایک کسی چیز کے واحد مالک ہونے کا دعوٰی کرتا ہے، اپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں باقاعدہ قابلِ قبول دلائل پیش کر دیں تو قاضی کا فرض ہوگا کہ یہ فیصلہ کر دے کہ یہ دونوں اس چیز میں برابر کے حصّہ دار مالک ہیں، یا ایک رائے یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں قرعہ اندازی ضروری ہو جائے گی اور جس کے نام قرعہ نکلے گا اسے اس چیز کا مالک قرار دیا جائے گا (مگر یہ فریقین کی رضامندی سے ہوگا)۔

[قاضی القضاۃ کی عدالت میں مرافعہ کے لیے گنجائش ملتی ہے، لہٰذا عدالتوں کے درجات اور مرافعہ اسلام میں روا ہیں]، لیکن اس ضابطے کی دو اہم مستثنیات ہیں: اوّل تو جس علاقے میں یا جس زمانے میں "مظالم" کی بابت باضابطہ کارروائی کرنے کا انتظام ہو، ہر شخص جسے یہ گمان ہو کہ باقاعدہ سرکاری محکموں میں اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے، وہ اس کی تلافی کا مطالبہ اس طرح کر سکتا ہے کہ خود سلطان کے حضور میں ایک درخواست پیش کرے؛ دوسرے یہ کہ مقدمہ اسی قاضی کے پاس دوبارہ دائر کر دیا جائے، یا پہلے فیصلہ کرنے والے قاضی کے جانشین کے پاس یا فی الواقع کسی قاضی کے پاس جو دیگر وجوہ سے سماعت کا مجاز ہو، تاکہ وہ نئے سرے سے مقدّمے کا فیصلہ کرے۔ مستند فقہا کا اس رائے پر اتفّاق ہے کہ ایک فیصلے کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے اور مناسب حالات کے اندر وہ واپس لیا جا سکتا یا منسوخ کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں کسی مسلّمہ ضابطۂ قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہو۔

سلطنتِ عثمانیّہ میں قانونِ اسلام کے آخری مرحلے

میں جو صورت تھی وہ اس مجموعۂ قوانین سے ظاہر ہوتی ہے جسے ۱۸۷۰ اور ۱۸۷۷ء میں مجلة الاحکام العدلیة کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس مجموعۂ قوانین میں دعوے کے قدیم طریقے کی بعض جزئیات میں ترمیم کی گئی، جس میں خاص طور پر قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ تحریر یا وصیت نامے کا بجائے خود اثبات دعوٰی کے سلسلے میں مؤثر ہونا تسلیم کیا گیا (دفعہ ۱۷۳۶)، نیز نزاع فیصلہ شدہ (res Judicata) کا اصول مانا گیا (دفعہ ۱۸۳۷)۔ اور یہ کہ فریق مقابل کی غیر حاضری میں کارروائی کی صورت کیا ہونی چاہیے (دفعہ ۱۸۳۳ بعد)۔ ان ترمیمات کے ساتھ ساتھ عدالتی نظام کی بھی یورپ کے نمونہ کے مطابق تجدید ہوتی رہی، جس کی بنیاد قاضیوں کی مشترکہ عدالت (bench)، اور عدالتوں کے درجاتی نظام پر رکھی گئی اور محکمۂ عدالت میں مرافعہ (=اپیل) کرنے کے طریقے رائج کیے گئے۔

مآخذ: (۱) کتب فقہ میں "باب الدعوٰی"؛ (۲) ابن عبدالرحمٰن: رحمة الامة فی اختلاف الائمة [مصر ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۶۰ء، ص ۳۱۲ تا ۳۲۸]؛ (۳) مجلة، دفعہ ۱۶۱۳ بعد؛ (۴) Querry: *Recueil de lois concernant les musulmans schyites*، پیرس ۱۸۷۷ء، ۲: ۳۸۵ بعد؛ (۵) T. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*، لائڈن ۱۹۱۰ء، ص ۳۱۳ بعد؛ (۶) L. Milliot: *Introduction à l'étude du droit musulman*، پیرس ۱۹۵۳ء، ص ۶۸۲ بعد؛ (۷) M. Morand: *Études de droit musulman algérien*، الجزائر ۱۹۱۰ء، ص ۳۱۳ بعد؛ (۸) E. Tyan: *Histoire de l'organisation judiciaire en pays d'islam*، ج ۲، Lyons ۱۹۴۳ء، ص ۲۱ بعد، ۱۳۱ بعد، ۲۹۰ بعد، ۴۷۷ بعد؛ (۹) وہی مصنف: *La procédure du defaut en droit musulman*، در *Stud. Isl.*، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۵ بعد؛ [(۱۰) التھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل مادہ؛ (۱۱) البستانی: دائرة المعارف، بذیل مادہ؛ (۱۲) صبحی محمصانی: فلسفة التشریع فی الاسلام، بار دوم، ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۲ء، ص ۲۲۳ تا ۲۶۲، اردو ترجمہ از مولوی محمد احمد رضوی، لاہور بدون تاریخ، ص ۲۵۳ تا ۳۰۲؛ (۱۳) عبدالرحیم: *The Principles of Muhammedan Jurisprudence*، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۳۶۳ تا ۳۸۲، اردو ترجمہ از مولوی مسعود علی، ص ۴۰۹ تا ۴۳۰]۔

(E. TYAN [و ادارہ])

دقّار: رک بہ ظفار۔ *

دفتر: (ف) تاگے سے سیا ہوا یا مجلّد کتابچہ، یا رجسٹر، زیادہ محدود یا خاص معنوں میں حساب لکھنے یا خطوط کا اندراج کرنے کی کتاب، جو انتظامی اداروں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لفظ کا اصل مأخذ یونانی لفظ διφθέρα بمعنی "کھال" ہے، اور اس لیے اس کے معنی لکھائی کے لیے تیار کردہ کھال بھی ہیں۔ یہ لفظ چرمی کاغذ یا زیادہ عمومی طور پر لکھائی کے سامان کے مفہوم میں قدیم یونانی زبان میں پہلے ہی سے مستعمل تھا، پانچویں صدی قبل مسیح میں ہیروڈوٹس (Herodotus، ۵: ۵۸) بیان کرتا ہے کہ اس کے اپنے زمانے کے بعض غیر مہذّب لوگوں کی طرح آئی اونونی (Ionians) بھی پہلے زمانے میں کھالوں پر لکھا کرتے تھے اور اصطلاح کھال (diphthera) کا اطلاق اس وقت تک بھی اوراق بردی (papyrus) پر کیا کرتے تھے۔ چوتھی [صدی میں] Ctesias (در *Diodorus siculus*، ۲: ۳۲؛ قب A. Christensen: *Heltedigtning og Fortaellingslitteratur has Iranerne i Oldtiden*، کوپن ہیگن ۱۹۳۵ء، ص ۶۹ بعد) نے قدرے غیر اطمینان بخش طور پر دعوٰی کیا ہے کہ اس کی کہانیاں غالبًا ایران کی شاہی دستاویزات پر مبنی ہیں۔ یہ لفظ قبل اسلام بلکہ زمانۂ قبل مسیح کی یہودی۔ آرامی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے (V. Gardthausen: *Griechische Paläographie*، بار دوم، لائپزگ ۱۹۱۱ء، ۱: ۹۱ بعد؛ M. Jastrow: *A Dictionary of the Targumim,* etc.، بار دوم، نیو یارک ۱۹۲۹ء، ص ۴۰۳ ببعد)۔ اس لفظ کو ایک ایرانی اصل [دیپ] بمعنی "لکھنا" سے (جو دبیر، دیوان میں بھی پائی جاتی ہے) اخذ کرنے کی کوششیں معقول معلوم نہیں ہوتیں؛ لیکن دوسری طرف عرب مصنّفین کی شہادت کے پیش نظر، گمان یہ ہے کہ [اس کی اصل کچھ ہو] یہ لفظ فارسی کے ذریعے عربی زبان میں پہنچا۔

۱ ۔ زمانۂ قدیم (کلاسیکی): ابتدائی عہد اسلامی میں دفتر کی اصطلاح بظاہر کتاب یا کتابچے کی مجتمع شکل کے لیے استعمال کی جاتی تھی، برخلاف لپٹے ہوئے کاغذوں یا متفرق اوراق کے۔ شروع میں اس کا استعمال کاغذ کے دستوں یا کاپیوں پر کیا جاتا تھا، خصوصاً ان اوراق پر جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بعض احادیث کے جمع کرنے والے اپنے حافظے کی مدد کے لیے اپنے پاس رکھتے تھے؛ بعد میں جب زیادہ ضخامت کے مخطوطات وجود میں آ گئے تو اُن پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا (N. Abbott: *Studies in Arabic Literary Papyri*، ۱، شکاگو ۱۹۵۷ء: ۲۱ تا ۲۴)؛ قب Goldziber: *Muh. St.*، ۲: ۵۰ تا ۵۲، ۱۸۰ تا ۱۸۱)۔ پہلی صدی ہجری کے ذاتی کتب خانوں اور اسناد کے مجموعوں کے بارے میں جو روایتیں ہیں، انھیں احتیاط سے پرکھنے کی ضرورت ہے، قب J. Schacht کی توضیحات کُرَیب کے کتاب خانے کی ساختہ روایت کے بارے میں در *On Mūsā b. 'Uqba's Kitāb al-Maghāzī*، *AO*، ۲۱، ۱۹۵۳ء: ۲۹۶ تا ۲۹۷۔ عربی کے قدیم ترین اوراق بَرْدی (papyri) کے بارے میں دیکھیے A. Grohmann: *The Value of Arabic Papyri*، در *Proc. of the Royal Soc. of Hist. Studies*، ۱، قاہرہ ۱۹۵۱ء: ۴۴ ببعد).

سب سے پہلے دیوان دفاتر (record office) کی تأسیس بالعموم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کی جاتی ہے، جنھوں نے فوجیوں کی حاضری اور تنخواہ کا نظام قائم کیا [رک بہ دیوان]۔ اس نظام کی ابتدائی شکل معلوم نہیں، لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس کے تحت اندراجات غالباً اوراق بَرْدی (papyrus) پر کیے جانے لگے تھے، جو فتح مصر کے بعد خلافت کے انتظامی محکموں میں لکھائی کے لیے عام طور پر استعمال ہونے لگا تھا۔ اوراق بَرْدی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر میں زمین، آبادی اور لگان کے بارے میں یادداشتیں رکھی جاتی تھیں۔ جو دستاویزیں اب تک باقی ہیں ان میں کاغذ کے دستوں کے ساتھ لپٹے ہوئے کاغذ اور منتشر اوراق شامل ہیں، اگرچہ بظاہر موخرالذکر شکل عام تھی، اور مقابلۃً بعد کے زمانے تک عربی میں کوئی کاغذ کا دستہ نظر نہیں آتا (دیکھیے A. Grohmann: *New Discoveries in Arabic Papyri*، *An Arabic Tax-Account Book*، *BIE*، ۳۲، ۱۹۵۱ء: ۱۵۹ تا ۱۷۰)۔ معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر اموی خلفا بوزنطی دفتری معمولات پر کاربند رہے۔ وہ اپنی یادداشتوں کے لیے اوراق بَرْدی استعمال کرتے تھے جو کتابی شکل کے لیے موزوں نہ تھے۔ تاہم ایک اور دفتری روایت بھی موجود تھی۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ ساسانی حکمران اپنے نظم و نسق کے لیے درآمد کیے ہوئے مصری اوراق کی فراہمی پر انحصار نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ وہ لکھنے کے لیے مختلف قسم کی تیار کی ہوئی کھالیں بھی کام میں لاتے تھے (قب ابن النّدیم: اَلْفِہرِست، ص ۲۱)۔ حسن القُمّی کے قول کی رُو سے جس نے المدائنی کی سند سے الہمدانی کا حوالہ دیا ہے (تاریخ قُم، ص ۸۱)، ساسانی شہنشاہ قباد Kobād نے حُلوان میں زمین کے لگان کا ایک دفتر قائم کر رکھا تھا۔ اس کی تصدیق بالواسطہ الیعقوبی کے اس بیان سے ہوتی ہے (تاریخ، ۲: ۲۵۸) جو امیر معاویہؓ کے زمانے میں حلوان سے ساسانی شاہی زمینوں کی فہرستیں حاصل کرنے کے بارے میں ہے (A. K. S. Lambton: *Landlord and Peasant in Persia*، لندن ۱۹۵۳ء، ص ۱۵، حاشیہ ۱)۔ ممکن ہے کہ

نسبةً شروع کے دور ہی میں بعض فوجی رجسٹر — کم از کم سابق ایرانی صوبوں میں — کتابی شکل میں آ چکے ہوں۔ البلاذری (فتوح، ص ۴۵۰، قاہرہ ۱۹۰۱ء، ص ۴۵۵) نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو عدی سے کہا: "اگر دفتر تم پر ختم (یَطْبَق) ہو جائے"، اور وہ اس کے مفہوم کی وضاحت یوں کرتا ہے: "اگر تمہارے نام رجسٹر کے آخر میں لکھے جائیں"۔ ابو مسلم نے ۱۲۹ھ/۷۴۶ - ۷۴۷ء میں خراسان میں اپنے پیروؤں کی تنخواہ کا جو رجسٹر بنایا تھا، اسے خلاف معمول دیوان کے بجائے دفتر کہا گیا ہے (الطبری، ۲: ۱۹۵۷ تا ۱۹۶۹ء؛ مزید دیکھیے N. Fries: *Das Heerwesen der Araber zur Zeit der Omaijaden*، ۱۹۲۱ء، ص ۹؛ W. Hoenerbach: *Zur Heeresverwaltung der Abbasiden, Isl.*، ۲۹، ۱۹۴۹ - ۱۹۵۰ء: ۲۶۳)۔

دفتری روایت کے مطابق خالد بن برمک پہلا شخص ہے جس نے السفّاح کے عہد حکومت میں کتاب یا رجسٹر کو مرکزی نظم و نسق میں داخل کیا۔ اس وقت تک، بقول جہشیاری ورق ۴۵ ب؛ (مطبوعہ قاہرہ، ص ۸۹) دواوین کو صُحُف (منتشر اوراق) میں محفوظ کیا جاتا تھا۔ خالد نے سب سے پہلے انہیں دفاتر کی شکل میں مرتّب کیا۔ المقریزی (الخطط، ۱: ۹۱) اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ صُحُف مُدرجہ (لپٹے ہوئے اوراقِ بَرْدی؟ قب القلقشندی: صبح، ۱: ۴۲۳ — ادراج من کاغذ و رَقّ) کی جگہ جو اب تک مستعمل تھے، دفاتر میں الجُلود — جلدی کاغذ کے دفتر — استعمال میں لائے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کے عہد میں خالد کے پوتے جعفر بن یحیی برمکی نے کاغذ کے استعمال کی ابتدا کی۔ اس بیان میں کچھ مبالغہ بھی شامل ہے۔ ایک واقعے سے جس کا ذکر جہشیاری نے کیا ہے، (ورق ۷۹ ب؛ مطبوعہ قاہرہ، ص ۱۳۸) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ المنصور کے عہد تک، بھی سرکاری محکموں میں زیادہ‌تر اوراق بَرْدی مستعمل تھے اور مصر سے ان کی بہم‌رسانی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ہارون الرشید کے زمانے میں بھی ان کا استعمال جاری رہا، یہاں تک کہ المعتصم کے بعد کے زمانے میں مصری کاریگروں کی مدد سے سامرا میں اوراق بَرْدی کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی (W. Björkman: *Beiträge zur Geschichte der Staatskanzlei im islamischen Ägypten*، ہیمبرگ ۱۹۲۸ء، ص ۷؛ A. Grohmann: *From the World of Arabic Papyri*، قاہرہ ۱۹۵۲ء، ص ۳۲ ببعد، ۴۵ ببعد، ۵۲؛ *Corpus Papyrorum Raineri Archiducis Austriae*، ج ۳، *Series Arabica*، طبع A. Grohmann: I/i *Allegemeine Einführung in die Arabischen Papyri*، وی انا ۱۹۲۴ء، ص ۲۲ ببعد، ۴۵ ببعد وغیرہ)۔ تاہم بحیثیت مجموعی یہ صحیح ہے کہ عبّاسی خاندان کے برسر حکومت آنے کے وقت سے لے کر سرکاری دواوین میں دستاویزوں اور حساب کتاب رکھنے کے لیے کتابی شکل کے دفتر کا استعمال عام طور پر ہونے لگا تھا۔ نویں صدی سے لے کر آئندہ عام طور پر کاغذ کا رواج ہو جانے سے اس کے استعمال کو مزید تائید اور توسیع حاصل ہو گئی اور اس وقت سے دفتر کی اصطلاح زیادہ‌تر نظم و نسق سے متعلق رجسٹروں اور دستاویزوں کے مجموعوں کے لیے مخصوص ہوئی۔ دفاتر کے نظام کو بظاہر سب سے پہلے ایران اور عراق میں فروغ دیا گیا۔ مصر میں چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی تک اوراق بَرْدی کا استعمال جاری رہا، لیکن دفتر کی مشرقی شکل بظاہر کاغذ کے عام طور پر رائج ہونے سے پہلے ہی اختیار کر لی گئی تھی۔ کاغذ کے دستوں کی شکل میں اوراق بردی کے حساب ناموں کے جو نمونے اب تک موجود ہیں (جن کی کیفیت A. Grohmann: ... *New Discoveries* نے بیان کیا ہے، اور وہی مصنف: ... *New Discoveries*، *BIE*، 41، ص ۴۵،

۱۹۵۲ - ۱۹۵۳ء: ۱۵۹ تا ۱۶۹) وہ دفاتر کی کیفیت کے بارے میں ان بیانات سے خاصی قریبی مطابقت رکھتے ہیں جو مشرقی ماخذ کی تحریروں میں ملتے ہیں، (دیکھیے نیچے) ۔ مصر سے دفتر کا رواج مغربی اسلامی دنیا تک پہنچ گیا ۔ ۳۷۳ھ/[۹۸۳ء] میں المقدسی (ص ۲۳۹) کو یہ چیز قابلِ ذکر معلوم ہوئی کہ اندلس کے باشندوں کے پاس جو حساب نامے اور اس طرح قرآن مجید کے جو نسخے موجود تھے وہ چرمی کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے (لکھائی کے سامان کے بارے میں مزید دیکھیے جلد، کاغذ، قرطاس، رِقّ، ورق)۔

دفتر کی اقسام :

حکومت کی اداری تنظیمات میں وسعت پیدا ہو جانے کے ساتھ دفاتر کی نگہداشت ایک ایسا کام ہو گیا جس کے لیے مخصوص صلاحیت اور علمیت کی ضرورت تھی اور اس طرح بہت سے مختلف قسم کے دفاتر وجود میں آ گئے ۔ مالی نظام و نسق سے متعلق کسی اسلامی ادارے کی دستاویزات اور دفاتر کے بارے میں سب سے پہلا مرتب بیان جو ہمارے علم میں ہے، وہ محمد بن احمد الخوارزمی کا چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے آخر کا ہے ۔ اس میں اس نے مندرجۂ ذیل دفاتر شمار کیے ہیں :

(۱) قانون الخَراج : بنیادی جائزہ، جس کے مطابق خراج وصول کیا جاتا ہے ۔

(۲) الاوارِج : اَوارہ کا معرّب، جس کا مفہوم ہے "منتقل کیا ہوا"؛ ان قرضوں کو ظاہر کرتا ہے جو قانون کی رُو سے افراد کے ذمّے ہوں اور نیز ان اقساط کو جو ان کے بیباق ہونے تک ادا کی گئیں ۔ (اوارج پر دیکھیے تذکرۃ الملوک، طبع V. Minorsky، لنڈن ۱۹۴۳ء، ص ۴۴، جس کی ترمیم W. Hinz : Rechnungswesen، ص ۱۲۰ ببعد کی روشنی میں کرنی چاہیے)۔

(۳) الرُّوزنامج : روزنامچہ، جو رقوم ادا کی گئیں اور جو وصول ہوئیں ان کا روزانہ اندراج ۔

(۴) الختمہ : آمد خرچ کا حساب ہر ماہ جہبذ [رک بآں] پیش کرتا ہے ۔

(۵) الختمۃ الجامعۃ : سالانہ حساب ۔

(۶) التاریخ : جمع کا دفتر جو ان ابواب (اقسامِ مصارف) کو پیش کرتا ہے جنھیں مجموعی طور پر دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ان کی ترتیب میں جمع کی سہولت ملحوظ رکھی جاتی ہے، بشمولیت موازن، جو رقوم ادا کی جائیں، ان کی رسیدیں بھی اس دفتر میں درج کی جاتی ہیں ۔

(۷) العَرِیضۃ : تفریق کا دفتر، ان ابواب کے لیے جن میں دو رقموں کا فرق دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسے تین جدولوں (عمودوں) کی صورت میں مرتّب کیا جاتا ہے ۔ اور حاصل تفریق تیسری جدول (عمود) میں ہوتا ہے ۔ یہی شکل اس عریضے کی ہوتی ہے جو اصلی اور ترمیم‌شدہ رقموں کے درمیان فرق ظاہر کرتا ہے ۔ بحالیکہ مؤخّرالذکر بالعموم نسبۃً چھوٹا ہوتا ہے، یعنی تخمینے اور جو رقمیں فی الواقع موصول ہوئیں اس میں درج ہوتی ہیں ۔ اصلی اور استخراج کا بظاہر یہی مفہوم ہے نہ کہ آمدنی اور خرچ، جیسا کہ جودت اور اُوزون چارشیلی نے فرض کیا ہے ۔ ترمیم کے مفہوم میں استخراج پر قب اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی : مدخل، ص ۲۷۸ اور Hinz : Rechnungswesen، ص ۱۸؛ اصلی پر قب الماوردی : الاحکام السلطانیہ، طبع Enger، ص ۳۷۳؛ مطبوعۂ قاہرہ، ص ۲۰۹ ۔ اصطلاح، دفاترِ اصلی و استخراج آناطولی کے سلجوقی عہد کے ایک متن میں پائی جاتی ہے؛ O. Turan : ترکیہ سلجوقلری حقندہ رسمی وثیقہ‌لر، انقرہ ۱۹۵۸ء، متن ص ۲۶ ۔ یہ جدا جدا پہلے اور دوسرے عمودوں میں درج کیے جاتے ہیں، بحالیکہ ان کے درمیان جو فرق ہے اسے تیسرے عمود میں دکھایا جاتا ہے ۔ آخری میزانیں تینوں عمودوں میں سے ہر ایک کے نیچے دکھائی جاتی ہیں ۔

(۸) البَرَاءَة [رکّ باں]: لگان ادا کرنے والوں کو جَہْبَذ [رکّ باں] یا خازن کی طرف سے دی ہوئی رسید (یہ واضح نہیں کہ الخوارزمی کی مراد نقلوں اور رسیدوں کے دفتر سے ہے یا وہ براءة کا ذکر محض ایک دستاویز کے طور پر کر رہا ہے)۔

(۹) المُوافَقَة و الجماعة: جامع حساب و کتاب (حساب جامع) جسے کوئی عامل اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے پر پیش کرتا ہے۔ اگر اس کی تصدیق اس افسر کی جانب سے ہو جاتی ہے جس کے سامنے وہ اسے پیش کرتا ہے تو اسے مواقَفَة کہا جاتا ہے، اگر ان میں اختلاف ہو تو یہ محاسبہ کہلاتا ہے۔

فوج کے محکمے (دیوان الجَیْش) کا ذکر کرتے ہوئے الخوارزمی یہ فہرست دیتا ہے:

(۱۰) الجریدة السَّوداء: جو ہر ایک کمان کے لیے ہر سال مرتّب کیا جاتا ہے۔ اس میں سپاہیوں کے نام مع ان کے حسب نسب، (اصل و نسل)، حلیہ، راشن، تنخواہ وغیرہ لکھے جاتے ہیں۔ یہ اس دیوان کا بنیادی مرکزی رجسٹر ہوتا ہے۔

(۱۱) وَجّمة: ایک حکم نامہ (حساب)، جسے بخشی (مُعْطِی) دُور کے علاقوں میں متعیّنہ افواج کے لیے تنخواہ کے اجرا (طمع) کے بارے میں بحوالۂ دیوان صادر کرتا ہے۔

(۱۲) الرَّجمة الجامعة: مجموعی حکم نامہ جسے فوج کی تنخواہ، راشن وغیرہ کے ہر ایک عام اجرا (طمع) کے لیے دیوان الجیش کے سربراہ نے صادر کیا ہو۔

(۱۳) الصَّکّ: ایک فہرست (عمل، قبّ Dozy: *Suppl.*، ۲: ۱۲۵) جو تنخواہ کے اجرا کے لیے درکار ہوتی ہے، اس میں ان لوگوں کے نام مع اعداد و رقوم درج ہوتے ہیں جنھیں کوئی رقم دی گئی ہو۔ ادائی کی سند کے لیے اس پر سلطان کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔ خچّر والوں اور ساربانوں سے کرایہ پر کام لینے کے لیے بھی اس فہرست کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱۴) المُؤامَرة: ان احکام کی فہرست جو "طمع" کے نفاذ کے دوران میں جاری کیے جاتے ہیں، جس کے آخر میں اجازت کے طور پر سلطان کے دستخط ہوتے ہیں۔ اس قسم کا مؤامرہ ہر ایک دیوان تیار کرتا ہے۔

(۱۵) الاِسْتِقْرار: اس سامان کی فہرست جو اجراء اور ادائی کے بعد باقی رہ جاتا ہے۔

(۱۶) المُواصَفة: ایک فہرست (عمل) جو رَدّ و بدل (تبادلوں، موقوفیوں، اموات اور ترقیوں) کے احوال و اسباب کی وضاحت کرتی ہے۔

(۱۷) الجَرِیدَةُ المُسَجَّلة: سربمہر دفتر، سِجِلّ (مُہر) وہ خط ہے جو کسی ایلچی یا قاصد کو اس بات کا مجاز کرنے کے لیے دیا جاتا ہے کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر کسی بھی عامل سے اپنے سفر کے مصارف وصول کرے۔ کسی قاضی کا مرتّب کردہ عدالتی فیصلہ (مَحْضَر) بھی سجلّ کہلاتا ہے۔

(۱۸) الفِہْرِسْت: دیوان کی فہرستوں اور رجسٹروں کے بارے میں معلومات کا مخزن۔

(۱۹) الدَّسْتُور: "جماعة" کی نقل جو مسودے سے تیار کی جاتی ہے۔

آخر میں الخوارزمی تین دفاتر کے نام بتاتا ہے، جنھیں عراق کے کاتب استعمال کرتے تھے، وہ (طبع مذکور کے مطابق) درج ذیل ہیں: (۱) الانجیذج؛ (۲) الاوشنج؛ (۳) الدروزن۔

ان میں سے نمبر ۳ کی وضاحت پیمایش زمین کے جائزے (مساحة) کے دفتر کے طور پر کی گئی ہے۔ (الخوارزمی: مفاتیح العلوم، طبع Van Vloten، ص ۵۴ تا ۵۸، دیکھیے Mez: *Renaissance*، ص ۱۰۳، انگریزی ترجمہ ص ۱۰۹؛ تاہم اس ترجمے میں Mez کا مطلب کچھ زیادہ واضح نہیں کیا گیا۔ ترکی کے سرکاری محکموں کے تجربے کی روشنی میں ایم۔ جودت نے الخوارزمی کے متن کا ایک مختصر ترجمہ (دفتر، ص ۸۸ تا ۹۱) ترکی زبان میں کیا تھا۔ اسمٰعیل حقی

اُوزون چارشیلی کا مرتب کردہ ایک اور قدرے زیادہ رواں ترکی اختصار بھی ہے، یعنی عثمانلی دولتی تشکیلاتنہ مدخل، استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۳۷۹ تا ۳۸۰ - مؤخرالذکر کا ترجمہ جرمن زبان میں B. Spuler نے کیا ہے، بہ عنوان: *Iran in früh-islamischer Zeit*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، ص ۳۳۸، حاشیہ ۱.

اغلب یہ ہے کہ الخوارزمی کے بیان کا دراصل عباسی دواوین سے اس قدر تعلق نہیں جتنا سامانی دواوین سے ہے، تاہم تقریباً یقینی طور پر اس کا اطلاق بہت حد تک عباسی نظم و نسق پر بھی کیا جا سکتا ہے، اور اس کے بیشتر بیانات کی تصدیق ایران اور عراق کے مؤرخین کے ضمنی حوالوں سے ہو جاتی ہے.

الخوارزمی کے دفاتر دو بڑے مجموعوں میں منقسم ہیں: مالی اور فوجی، جن پر اب جدا جدا غور کیا جا سکتا ہے.

مالی دفاتر: دیوانِ خراج کا سب سے اہم دفتر القانون ہے، جو زمین اور لگان کے قابل فصلوں کے جائزے پر مشتمل ہوتا ہے (الماوردی: الاحکام السلطانیۃ، طبع Enger، ص ۳۷۰، طبع قاہرہ، ص ۲۰۷ میں اصطلاح قانون کا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے) - یہ دفتر لگان عائد کرنے اور وصول کرنے کے کام میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا تھا، اور اس طرح اس دیوان کی سرگرمیوں کے لیے اہم ترین ذریعہ تھا۔ اصطلاح قانون، جیسے پہلے ہی الخوارزمی یونانی سے معرب (یونانیۃ معرّبۃ) تسلیم کر چکا ہے، زیادہ تر عراق اور مشرق میں مستعمل تھی، اور تیرھویں اور چودھویں صدی تک بھی اس کا استعمال جاری رہا تھا جبکہ اس سے مراد ایک قسم کا ارضی و مالی جائزہ تھا (V. Minorsky اور M. Minovi: *Nasir al-Din Tusi on Finance*، BSOAS، ج ۱۰، ۱۹۴۰ء، ص ۷۶۱، ۷۷۳، ۷۸۱؛ Hinz: *Rechnungswesen*، ص ۱۳۰ ببعد)۔ ... کر زمانے میں اس مفہوم میں قانون کی اصطلاح بظاہر متروک ہو گئی تھی اور اس کی جگہ دوسری اصطلاحات نے لے لی تھی۔ مصر میں اصطلاح مکلّفہ زمین کے جائزے سے متعلق دفاتر کے لیے استعمال کی جاتی تھی، جنھیں ایک 'ماسح' [پٹواری] تیار کرتا تھا اور جن کی ترتیب دیہات کے مطابق ہوتی تھی (Grohmann: . . . *New Discoveries*، ص ۱۶۳) - المقریزی: الخطط: ۱: ۸۲) کے مطابق مصر میں ہر تیس سال بعد نیا جائزہ لیا جاتا تھا - (اوراق بردی پر لکھے ہوئے لگان کے مصری دفاتر کے نمونوں کے لیے دیکھیے A. Dietrich: *Arabische Papyri*، لائپزگ ۱۹۳۷ء، ص ۸۱ ببعد؛ (نیز دیکھیے دفترِ خاقانی، مساحہ، روک، تحریر اور تیو).

روزنامج یا روزنامچہ کا ذکر ایک حکایت میں آتا ہے، جو یحیٰی بن خالد البرمکی کے زمانے سے منسوب ہے۔ اصطلاحات اور تسمیات کے لیے عربی کا انحصار فارسی پر ہونے کے بارے میں ایک ایرانی ایک عرب پر یوں طنز کرتا ہے "تمھارے کھانا پکانے، پینے پلانے، یہاں تک کہ تمھارے دواوین سے متعلق الفاظ کا انحصار بھی فارسی پر ہے" - آخرالذکر سے متعلق الفاظ کی مثال میں وہ روزنامج کا حوالہ دیتا ہے (محمد بن یحیی الصُّولی: ادب الکاتب، قاہرہ ۱۳۴۱ھ، ص ۱۹۳ - مسکویہ کی ایک عبارت اس چیز پر روشنی پڑتی ہے کہ چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں بغداد میں روزنامج کو خزانے میں کیونکر رکھا جاتا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ ۳۱۵ھ / ۹۲۷ء میں وزیر علی بن عیسی نے ابراہیم بن ایوب (خزانے کا ایک عیسائی مہتمم جسے آئندہ سال میں دیوان الجہبذۃ کا افسر اعلی مقرر کر دیا گیا۔ عریب: صلتہ تاریخ الطبری، ص ۱۲۵ - نیز اس کے بارے میں دیکھیے الصُّولی: اخبار الرّاضی، ص ۱۹۹؛ ھلال الصابی: تحفتہ الامراء فی تاریخ الوزراء ص ۱۳۶، ۲۷۹، ۲۹۶) کو یہ خدمت تفویض کی تا کہ وہ اسے مالی معاملات سے الگ کرتا رہے، خازن (صاحب بیت المال) کہ

روزانہ مصارف کے بارے میں ہدایات دے اور اسے ہر ہفتے روزنامجات پیش کرنے کا مکلّف بنائے، تاکہ اسے جلد ہی معلوم ہو جائے کہ کیا ادا کیا گیا، کتنا وصول ہوا اور بقایا کیا تھا (ما حلّ وَ ما قبض و ما بقی) [کذا فی الاصل، لیکن بظاہر ما حمل و ما قبض و ما بقی، زیادہ صحیح ہوگا]۔ اس سے پہلے حساب تیار کرنے کا دستورالعمل یہ رہا تھا کہ ایک ماہانہ گوشوارہ دیوان کے سامنے آئندہ مہینے کے وسط میں پیش کیا جاتا تھا (تجارب الامم، طبع Amedroz، ۱ : ۱۵۱ تا ۱۵۲)۔

اسی تصنیف کے دو اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خزانے کے جس افسر کا کام ختمہ تیار کرنا تھا، وہ جہبذ کہلاتا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۵۵ و ۱۶۴۔ D. S. Margoliouth نے مسکویہ کا جو انگریزی ترجمہ کیا ہے، اس میں وہ ان عبارتوں کا اصطلاحی مفہوم واضح کرنے سے قاصر رہا ہے)۔ المقتدر کے عہد کی دو دستاویزوں سے، جن کا حوالہ تاریخ قم میں دیا گیا ہے، یہ واضح ہوتا ہے کہ قم اور فارس میں روزنامج سے کیا کام لیا جاتا تھا۔ یہاں روزنامج محرّر (کاتب) جہبذ سے الگ ہے اور وہ ایک سرکاری عہدیدار ہے۔ اس کا کام خراج کے سلسلے میں موصولہ رقوم کا اندراج اور ان کی رسیدیں دینا ہے، جو براءۃ [رک بآں] کہلاتی ہیں، اور جہبذ کی کارگزاریوں کا ایک طرح سے محاسبہ کرتا ہے (تاریخ قم، ص ۱۴۹ ببعد؛ دیکھیے Ann. K.S. Lambton: *An Account of the tarikh-i-Qumm*، BSOAS، ج ۱۲، ۱۹۴۸ء، ص ۵۹۵؛ C. Cahen: *Quelques problèmes économiques et fiscaux de l'Iraq Buyide* ...، AIEO، ج ۱۰، ۱۹۵۲ء، ص ۳۵۵؛ روزنامج پر مزید دیکھیے F. Lokkegaard: *Islamic Taxation in the Classic Period*، کوپن ہیگن ۱۹۵۰ء، ص ۱۴۹، ۱۵۵)۔ مصر کے ایوبی عہد میں ابن المماتی بدستور سابق روزنامج اور ختمہ کی تیاری کو جہبذ کے فرائض منصبی میں شامل کرتا ہے (دیکھیے کتاب قوانین الدواوین، طبع A.S. Atiya، قاہرہ ۱۹۴۳ء، ص ۳۰۳)۔ مصر میں روزنامج کی مثالوں کے لیے دیکھیے: Grohmann: ... *New Discoveries*؛ ان سے حساب کتاب کا جو طریق کار مترشح ہوتا ہے، اس کے لیے دیکھیے: C. Leyerer: ... *Die Verrechnung und Verwaltung*؛ نیز دیکھیے حساب اور محاسبہ۔

عباسی دواوین میں جو دفاتر مستعمل تھے، ان کے بارے میں متعدد حوالے مسکویہ، ہلال الصابی اور دیگر مصنفین کی تحریروں میں ملتے ہیں جو خاص طور پر ملکی نظم و نسق سے متعلق معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ سلطنت کے حسابات کے پیمانے اور پیش کرنے کے طریقے سے متعلق کچھ اندازہ شاہی مداخل و مخارج کے ان چند منفرد اوراق میزان سے ہو سکتا ہے جنہیں مورخین نے محفوظ کر رکھا ہے۔ ان میں سے قدیم ترین جو ہارون الرشید کے زمانے کا ہے، جہشیاری (ورق ۱۷۹ الف، ۱۸۲ ب، مطبوعہ ص ۲۸۱) نے، اور ایک مختلف بیان کی صورت میں ابن خلدون (مقدمہ، ۱ : ۳۲۱ تا ۳۲۴؛ Rosenthal، ۱ : ۳۹۱ تا ۳۶۵) نے محفوظ رکھا ہے۔ (نیز دیکھیے: R. Levy: *The Social Structure of Islam*، کیمبرج ۱۹۵۷ء، ص ۳۱۷ تا ۳۲۰، [۳۰۶ھ/۹۱۸ء] کا ایک میزانیہ ہلال (الوزراء، ص ۲۱۱) نے دیا ہے اور اس کا تجزیہ، مع دیگر مآخذ کے، A. von Kremer نے: *Über das Einnahmebudget des Abbasiden-Reiches, Denkschrift d. Phil. hist. Kl. d. Wiener Ak.*، ج ۳۶، ۱۸۸۸ء، ص ۲۸۳ تا ۳۶۲ میں کیا ہے۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں فرمانروا کی شخصی آمدنی (بیت المال الخاص) کی تفصیل مسکویہ نے دی ہے (Mez، ص ۱۱۵ تا ۱۱۶؛ نیز دیکھیے بیت المال)۔

فوجی دفاتر: فوجی سپاہیوں کی حاضری کے کاغذات

اسلامی سلطنت کے آغاز سے ہی وجود میں آگئے، تھے تاہم یہ قبائلی دفتر فوج کی ان باقاعدہ فہرستوں سے بالکل مختلف نوعیت کے تھے جن کی کیفیت الخوارزمی نے بیان کی ہے۔ ممکن ہے کہ ابو مسلم پہلا شخص ہو جس نے سپاہیوں کا دفتر مرتب کیا لیکن یہ دستور العمل عباسیوں کے عہد میں یقیناً عام ہو گیا تھا۔ الخوارزمی کے حواشی کے علاوہ دیوان الجیش سے متعلق فوجی فہرستوں کے بارے میں ایک زیادہ مفصل بیان قدامہ کی کتاب الخراج اور ابن حرب پر بعد کے ایک گمنام رسالے میں موجود ہے (ترجمہ: وستنفلٹ، در *Das Heerwesen der Muhammedaner*، گوٹنجن Gottingen ۱۸۸۰ء، ص ۱ تا ۷۔ ان دونوں کا، علاوہ دیگر شہادتوں کے، تنقیدی مطالعہ W. Hoenerbach نے کیا ہے: *Zur Heeresverwaltung* ...، ص ۲۶۹ ببعد، نیز دیکھیے عطاء)۔ اسی قسم کی فہرستیں مصر میں فاطمی خلفاء کے دیوان الجیش اور دیوان الرواتب (فوج کا دیوان اور تنخواہ کا دیوان) میں رکھی جاتی تھیں (القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ۳ : ۴۹۲ تا ۴۹۳؛ وستنفلٹ: *Die Geographie und Verwaltung von Ägypten*، گوٹنجن ۱۸۷۹ء، ص ۱۹۰ تا ۱۹۱)۔ فوجی فہرستوں کے لیے عام اصطلاح جریدہ تھی۔

سفارتی دفتر: الخوارزمی کا بیان مالیات و اعداد و شمار سے متعلق دفاتر، مال گزاری اور تنخواہ کے دواوین، حساب کتاب، اشیاء کی گنتی، اور اس قسم کی دوسری چیزوں تک محدود ہے۔ ان کے علاوہ مکتوبات کے مجموعے اور دیگر سفارتی دفاتر بھی ہوتے تھے جو دواوین رسائل میں مستعمل تھے۔ فاطمی دیوان الرسائل میں اس قسم کے جو کاغذات رکھے جاتے تھے ان کی کیفیت مصری کاتب ابن الصیرفی (۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء تا ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء) نے بیان کی ہے۔ اپنی تصنیف قانون دیوان الرسائل (طبع علی بہجت، قاہرہ ۱۹۰۵ء، ص ۱۳۷ تا ۱۴۱؛ فرانسیسی ترجمہ از H. Massé، در *BIFAO*، ج ۱۱، ۱۹۱۴ء، ص ۶۵ تا ۱۰۸؛ دیکھیے القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ۱ : ۱۳۳ تا ۱۳۵، جس میں یہ دفاتر قدرے مختلف ترتیب سے درج ہیں، اور Björkman: *Beiträge*، ص ۴۲ تا ۵۲) کی بارھویں فصل میں وہ ان دفاتر اور یادداشت کے کاغذات (تذکرہ؛ Massé نے اس کا ترجمہ "Bulletin" کیا ہے) کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے جن کا رکھنا اس دیوان میں ضروری ہے نیز ان کے نگران کی صفات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ان کی دیکھ بھال دیوان کے اہم ترین کاموں میں سے ہے۔ محافظ دفتر کے لیے لازمی ہے کہ وہ قابل اعتماد، جفاکش، محنتی اور کام سے دلچسپی رکھنے والا ہو اور ایسے مندرجہ ذیل تذکرے اور دفاتر اس کی تحویل میں ہونے چاہییں:

۱۔ ان اہم معاملات (مہمات الاُمور) کی یادداشتیں (تذاکیر) جو خط و کتابت میں زیر بحث آ چکے ہیں اور جن کا حوالہ دینے کی آئندہ ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہ یادداشتیں (تذاکیر) حوالہ کے کاغذات کے دستوں (اَضابیر، Massé اس کا ترجمہ "dossier" کرتا ہے) کے مقابلے میں سہل الوصول ہوتے ہیں، لہٰذا جو بھی خطوط وصول ہوں ان سب کو جواب دیے جانے کے بعد مسجّل (Registrar) کے پاس بھیج دینا ضروری ہے، جو ان پر غور کرے گا اور جو کچھ اس کی اپنی یادداشت کے لیے ضروری ہوگا، اسے درج کر لے گا اور اگر اس کا کوئی جواب بھیجا گیا ہو تو ساتھ ہی اس کو بھی درج کرے گا۔ وہ ہر ایک معاملے (صَفقَہ) کے لیے کچھ اوراق، ایک موزوں عنوان کے ساتھ، مخصوص کر دے گا۔ پھر وہ آنے والے خطوط کو درج کرے گا، یہ لکھے گا کہ وہ کہاں سے آئے، کس تاریخ کو پہنچے، ان کے مضامین کیا ہیں، نیز یہ کہ ان کا کیا جواب دیا گیا اور بصورت دیگر اگر کوئی جواب نہیں بھیجا گیا، تو یہ بات بھی لکھ لی جائے گی۔ وہ یہ

اندراجات سال کے خاتمے تک جاری رکھے گا اور اس کے بعد ایک نیا تذکرہ شروع کر دے گا۔

۲- باہر بھیجے جانے والے خطوط میں متضمن اہم احکام (اَوامر) کی یادداشت رقم کی جاتی ہے جس میں ان خطوط کے موصولہ جوابوں کے مضامین اور ان کے موصول ہونے کی تاریخیں بھی درج ہوتی ہیں۔ یہ اس کے یقین کے لیے کیا جاتا ہے کہ احکام کی جانب سے بے توجہی نہیں برتی جاتی اور انہیں بغیر جواب دیے نہیں چھوڑا جاتا۔

۳- ایک دفتر جو متفرّق قسم کے خطوط اور اسناد میں مختلف سرکاری افسروں اور منصب داروں، نیز غیر ملکی حکمرانوں اور باہر کے دیگر خط و کتابت کرنے والوں کے القاب و آداب (دعاء) وغیرہ کی صحیح شکلیں پیش کرتا ہے۔ ہر ایک منصب یا عہدے (خِدْمة) کے لیے ایک جدا ورق (الورقة المُفْرَدة) ہونا چاہیے جس پر اس شخص کا نام، اس کا لقب اور اس کے لیے مخصوص دعا لکھی ہوئی ہے۔ تبدیلیوں اور تبادلوں کے اندراج کی جانب خاص توجہ ضروری ہے۔

۴- **اہم واقعات (الحوادث العظیمة) کا دفتر۔**

۵- رسمی لباس (تشریفات) اور اعزازی خلعتوں کی خصوصیات کی وضاحت، جو بوقتِ ضرورت ان کی تیاری میں کام آ سکے۔ اس ضمن میں یہ بتانا چاہیے کہ ان کی تیاری کے لیے کیا رقوم دی گئیں، اور سلائی کی تفصیلات اور قیمتوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

۶- سال، مہینے اور دن کے مطابق، موصول ہونے والے خطوط کی فہرست، جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خط کہاں سے آئے، کس تاریخ کو ملے، اور ساتھ ان کا خلاصہ، یا ضرورت ہو تو متن کی نقل بھی اس میں درج ہوتی ہے۔

۷- ایسی ہی ایک فہرست باہر بھیجے جانے والے خطوط کے لیے۔

۸- اسناد، اعزازی مناصب، پروانہای راہداری وغیرہ کی فہرست۔ یہ ماہ بماہ تیار ہونی چاہیے، مثلاً بسال یکجا کی جانی چاہیے، اور ہر نئے سال پر از سرِ نو شروع ہونی چاہیے۔

آخر میں ابن الصَّیرفی ان خطوط کے عربی تراجم کی ضرورت کا ذکر کرتا ہے جو غیر ملکی رسم الخط جیسے کہ ارمنی، یونانی یا افرنجی (Frankish) میں موصول ہوں۔

القَلْقَشَنْدی کے بیان کے مطابق صبح الاعشٰی، ۱: ۱۳۹؛ دیکھیے Björkman: *Beiträge*، ص ۳۹) یہ فاطمی دفاتر بالعموم آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے اختتام تک قاہرہ کے دیوان الرّسائل میں بدستور سابق مستعمل آئے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ دیوان الرسائل سے متعلق دفاتر اور دستاویزات کے اس نظام کی ابتدا خلافت کے مشرقی ممالک میں ہوئی اور وہاں یہ کسی نہ کسی شکل میں قرونِ وسطٰی کے دوران میں باقی رہا۔ اس کی بعد کی نشوونما کو ترکی مُہِمّۂ دفتری، احکام دفتری، توجیہاتِ دفتری، تشریفاتجی قائمۂ دفتری کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۱- **ترکی و منگول عہد:** وسط ایشیا کے وسیع میدانوں کی رہنے والی ترک و منگول اقوام کے دورِ اقتدار میں حکومت اور نظم و نسق کے بیشتر دیگر شعبوں کی طرح دفتری دستورِ عمل میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض تبدیلیاں چینی اثرات کا نتیجہ ہوں، جو اویغور، قراختائی اور سب سے بڑھ کر منگولوں کی ایشیائی سلطنت کے ذریعے پھیلے۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ دفاتر کا نظام ایک حد تک مشرق ایشیا کی مثالوں سے متأثر ہوا ہو (مثال کے طور پر دیکھیے الجُوَینی، ۱: ۲۴ تا ۲۵ = Boyle، ۱: ۳۳ تا ۳۴ اور رشید الدین: جامع التواریخ، طبع Blochet، ص ۹۳ تا ۹۴، ۵۶ تا ۵۷؛ لیکن Pekin کے دفاتر کے بارے میں دیکھیے کتاب مذکور، ص ۴۸۳)، لیکن اس پورے مسئلے کے متعلق مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔

عظیم سلجوق حکمرانوں کے عہد میں تنظیم کو کی کچھ شہادت ملتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی سلطنت کے، نیز سلجوق آناطولی اور ایوبی مصر کے دفترداروں اور کتاب داروں نے بظاہر سابقہ دور کے بہت سے طور طریقوں کو برقرار رکھا۔ جو کچھ بھی جدّت نظر آتی ہے وہ بظاہر طریق کار سے متعلق باتوں، بالخصوص اعداد و شمار کی معلومات کے جمع کرنے اور پیش کرنے میں ہے۔ ترکی سلطنت کے دفتری دستور عمل کا کسی قدر اندازہ ابن بی بی: الاوامر العلائیۃ، عکسی طبع انقرہ ۱۹۵۶ء، طبع N. Lugal و A. S. Erzi جزو ۱؛ انقرہ ۱۹۳۷ء؛ اختصار Houtsma : *Recueil*، ج ۲؛ جرمن ترجمہ H.W. Duda، کوپن ہیگن ۱۹۵۹ء؛ ترکی ترجمہ از یازیجی اوغلو، Houtsma : *Recueil*، ج ۳ سے کیا جا سکتا ہے۔ دفاتر دیوانِ اعلٰی میں رکھے جاتے تھے۔ جن میں زمین اور لگان سے متعلّق امور درج ہوتے تھے۔ جب نئے علاقے فتح ہوتے تھے یا دوبارہ حاصل کیے جاتے تھے، تو نئی پیمائش عمل میں آتی تھی (ابن بی بی، ص ۱۴۶: انطالیہ، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴: Sinop، ص ۲۸۴، اَغلاط)۔ یازیجی اوغلو کا ایک اضافے (Recueil، ۳ : ۱۰۵؛ ابن بی بی میں موجود نہیں) سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ عزالدین کیکاؤس کے دورِ حکومت میں صاحب دیوان کا عہدہ اور مالی دفاتر (اموال دفاتر) کی نگہداشت خواجہ بدرالدین الخراسانی کے سپرد کی گئی، جو بلاد روم من خطّاطی، بلاغت، انشاء، سیاقت اور حساب رک بان میں یکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی خواجہ فخرالدین علی التبریزی کو انشاء اور مکتوبات کی خدمت تفویض کی گئی اور دیوانِ وزارت کے بارہ دفاتر میں سے ہر ایک کسی ماہرِ فن (استاد) کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ایک اور موقع پر امیر عارض کا عہدہ شمس الدین کو عطا ہوا، یہ بھی انشاء اور سیاقت میں ماہر تھا (ابن بی بی، ص ۱۲۷)۔ یازیجی اوغلو اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس عہدے میں فوجی دفاتر (چری دفتری، Recueil، ۳ : ۱۰۹)۔ سنجر نے دیوان العرض سے متعلق جو تقرریاں کیں ان کے لیے دیکھیے کتاب عتبۃ الکتبۃ، طبع محمد قزوینی و عباس اقبال، تہران ۱۳۲۹ھ، ص ۲۹ تا ۳۰، ۶۲ تا ۷۳) کی نگرانی شامل تھی۔ اس تصنیف کی ایک اور عبارت (Recueil، ۳ : ۲۱۰) میں چوبیس دفتروں کا ذکر ہے، بارہ زمین اور مالگزاری سے متعلق دیوانِ وزارت میں اور بارہ سپاہیوں کی فہرستوں، تنخواہ اور جاگیروں سے متعلق دیوانِ عارض میں تھے۔ یازیجی اوغلو نے ایک نظم نقل کی ہے (ص ۲۵۴ تا ۲۵۵)، جس میں یہی اعداد دُہرائے گئے ہیں، لیکن چونکہ اس نظم میں انہیں اوغوز روایت میں بار بار آنے والے عدد بارہ سے منسلک کر دیا گیا ہے اس لیے ان کا مستند ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔ یہی نظم زمینوں کے اندراج کے بارے میں مکمل معلومات مہیّا کرنے کا بھی دعوٰی رکھتی ہے (جودت، ص ۹۱ تا ۹۳).

ایلخانی عہد سے پہلی مرتبہ ہمیں ملکی سرکاری حساب و کتاب پر مفصل رسائل ملتے ہیں۔ دو اہم تصنیفیں، فلک علای التبریزی کا سعادت نامہ (مؤلفہ ۷۰۷ھ/۱۳۰۷ء)، اور عبداللہ بن محمد بن کیا المازندرانی کا رسالۂ فلکیّۃ (تقریباً ۷۶۷ھ/[۱۳۶۵ - ۱۳۶۶ء]) ذکی ولیدی [طوغان] کی دریافت ہیں اور اس نے ان کا تجزیہ کیا ہے (مغللر دورندہ اندلوئن اقتصادی وضیعتی، *THITM* ج ۱، ۱۹۳۱ء، ص ۱ تا ۴۲)۔ ایک مختصر تیموری رسالہ جو تقریباً ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ء میں ہرات میں لکھا گیا تھا عدنان ارزی نے دریافت کیا تھا (W. Hinz : *Ein orientalisches Handelsunternehmen im 15. Jahrhundert*, *Welt des Orients*، ۱۹۴۹ء، ص ۳۱۳ تا ۳۴۰) اور ایک مکمل میزانیہ (جامع الحساب) مؤرخہ ۷۳۸ھ/۱۳۳۷-۱۳۳۸ء ذکی ولیدی طوغان کی دریافت ہے۔ پہلے دو کا تفصیلی مطالعہ W. Hinz :

نے کیا ہے (*Das Rechnungswesen*) اور ان میں یہ دوسرے کی ایک تنقیدی طبع بھی، اُس کی کاوش کا نتیجہ ہے (*Die Reselā-ye Falakiyyā*، Wiesbaden ۱۹۵۰ء)۔ ان تصانیف سے حساب و کتاب رکھنے کے ایک نظام کا انکشاف ہوتا ہے، جو ذیل کے دفاتر پر مبنی ہے:

۱. روزنامہ: روزانہ حساب کی کتاب، معرّب شکل روزنامج، بہ دفتر تعلق بھی کہلاتا ہے۔

۲. دفتر آوارِجہ: رجسٹر نقدی (cash-book)، جو خزانے میں موجودہ رقوم کی میزان پیش کرتا ہے۔

۳. دفتر توجیہات: ادا کردہ رقوم کا دفتر۔

۴. دفتر تحویلات: دفتر ماسبق کی ایک شاخ، جو سامان کی فراہمی اور سرکاری اداروں اور مہموں کو چلانے کے مصارف سے تعلق رکھتا ہے۔

۵. دفتر مُفردات: میزان دفتر، جو آمدنی اور خرچ کو جدا جدا شہروں، ضلعوں اور صوبوں کے مطابق پیش کرتا ہے۔

۶. جامع الحساب: حساب کی جامع کتاب، جس سے سالانہ مالی اطلاعات تیار کی جاتی تھیں۔

۷. قانون: زمین کی پیمائش اور لگان کے تخمینے کی کتاب یا سلطنت کے بندوبستِ اراضی کی یادداشت۔

(ان دفاتر پر اور نیز دستور العمل اور اصطلاحات میں ردّ و بدل کے بارے میں پوری بحث کے لیے دیکھیے Hinz: *Rechnungswesen*، ص ۱۱۳ تا ۱۳۷)۔

مابعد منگول ریاستیں: بہت سے دیگر معاملات کی طرح دفتری طور طریقوں میں بھی مابعد منگول عہد کی مسلمان ریاستیں بظاہر بہت حد تک ایلخانی حکمرانوں کی پیروی کرتی رہیں، چنانچہ ان طور طریقوں میں سے بعض کا استعمال دور دراز ممالک مثلاً مملوک قاہرہ، عثمانلی استانبول اور مغول دہلی تک ہوتا تھا۔ ان میں سے صرف ایک، یعنی عثمانلی سلطنت نے دفاتر کا ایک ایسا مجموعہ چھوڑا ہے جو آج تک باقی ہے، اگرچہ کچھ منفرد دفتر دوسرے ممالک سے بھی دستیاب ہوئے ہیں، عثمانلی دفاتر دوسری جگہ زیر بحث آ چکے ہیں (دیکھیے باش وکالت آرشیوی، دفتر خاقانی، سیاسی، مہمہ دفتری، سجل وغیرہ)، لہذا ان کے متعلق یہاں کسی بیان کی ضرورت نہیں۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے سابق عثمانلی علاقوں سے بھی متعدد دفاتر دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی مادی شکل کے بارے میں دیکھیے L. Fekete: *Die Siyaqat-Schrift*، ۱: ۷۰۔

مآخذ: (۱) عام بحث کے لیے دیکھیے۔ جودت کا مقالہ مطبوعہ در معلّم ایم۔ جودتن حیاتی اثرلری و کتبخانہ سی از عثمان ارگین، استانبول ۱۹۳۷ء، ضمیمہ ص ۶۹ تا ۹۶، جو بدقسمتی سے نامکمل ہے؛ (۲) مالی دفاتر کے لیے دیکھیے C. Leyerer: *Studien zum Rechnungswesen der arabischen Steuerämter*، Aro، ج ۱۳، ۱۹۴۱ء، ص ۸۵ تا ۱۱۲؛ (۳) وہی مصنّف: *Die Verrechnung und Verwaltung von Steuern im islamischen Ägypten*، *ZDMG*، *N. F.*، ص ۲۸، ۱۹۵۳ء، ص ۳۰ تا ۹۹؛ (۴) W. Hinz: *Das Rechnungswesen orientalischer Reichsfinanz-ämter im Mittelalter*، *Isl.*، ج ۲۹، ۱۹۵۰ء، ص ۱ تا ۲۹، ۱۱۳ تا ۱۴۱؛ (۵) فوجی دفاتر کے لیے دیکھیے W. Hoenerbach: *Zur Heeresverwaltung der Abbasiden*، رسالہ مذکورہ، ص ۲۵۷ تا ۲۹۰؛ (۶) عثمانلی مالی دفاتر کے لیے دیکھیے L. Fekete: *Die Siyaqat Schrift in der türkischen Finanzverwaltung*، ج ۱، بوڈاپسٹ ۱۹۵۵ء، ص ۶۷ تا ۱۰۰؛ (۷) قاضی کے دفاتر کے لیے دیکھیے خالد اون گان: انقرہ نک I نومرولی شرعیہ سجلی، انقرہ ۱۹۵۸ء؛ اور J. Kabrda: *Les anciens registres turcs des Cadis de Sofia et de Vidin*، *Aro*، ج ۱۹، ۱۹۵۱ء، ص ۳۲۹ تا ۳۹۲؛ (۹) صفوی ایران کے لیے دیکھیے V. Minorsky: تذکرۃ الملوک، لندن ۱۹۴۳ء؛ (۱۰) وسطی ایشیا پر دیکھیے M. Yuldashev: *The State Archives of XIX century feudal Khiva*، در *Papers by the Soviet Delegation at the xxiii.*

International Congress of Orientalists, Iranian, Armenian and Central Asian Studies، ماسکو ۱۹۶۰ء، ص ۲۲۲ تا ۲۲۰؛ بعض دفاتر پورے طبع ہو چکے ہیں۔ قدیم‌ترین عثمانی جائزے کا دفتر H. Inalcik نے طبع کیا تھا، بنام هجری ۸۳۵ تاریخی صورتِ دفترِ سنجاقِ آروانید، انقرہ ۱۹۵۴ء؛ گرجستان Georgia کا ایک عثمانی دفترِ جائزہ S. Jikia نے طبع کیا تھا، بعنوان *Gurjistanis vilaethis didi davthari*، دفترِ مفصّلِ ولایتِ گرجستان: ولایت گرجستان کا بڑا دفتر، ج ۱: ترکی متن، ج ۲: گرجی ترجمہ: *Izdatel'stvo Akademii Nauk Gruzinskoy SSR*، تفلیس ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء۔

(B. Lewis)

* **دفتر امینی**: ایک لقب جو سلطنت عثمانیہ میں دفتر خاقانی [رک باں] کے ناظم کو دیا جاتا تھا۔

* **دفتر خاقانی**: اُن دفاتر کا مجموعہ جن میں اس پیمائش کے نتائج درج کیے جاتے تھے، جو عثمانی دور میں گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے شروع تک ایک قدیم انتظامی و مالی دستور کے مطابق ہر تیس یا چالیس سال بعد عمل میں آتی تھی۔

شاہی دفاتر یا دفتر خاقانی شروع میں سلطنت کے دیہاتوں اور شہروں کے بالغ ذکور کی فہرست پر مشتمل ہوتے تھے اور اس میں ان لوگوں کے ناموں اور ولدیت کے ساتھ ساتھ ان کی قانونی حیثیت، جس معاشی اور معاشرتی طبقے سے وہ تعلّق رکھتے تھے، اس کے مطابق ان کے حقوق و استحقاقات، اور جو زمینیں ان کے پاس تھیں، ان کی حدود کے بارے میں معلومات مہیّا کی جاتی تھیں۔

ان دفاتر میں زمین کے استعمال کی شکل (کھیت، پھلوں کے باغیچے، انگور کے باغات، دھان کے کھیت وغیرہ)، چکّیوں کی تعداد، بھیڑوں اور شہد کی مکھّیوں کے چھتّوں کے متعلق بھی بہت سی معلومات ہوتی ہیں جن سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ ان کی اندازاً کتنے اسپر (aspers، ترکی کا چاندی کا سکہ) قیمت ہے۔

تاہم ان دفاتر میں مندرجہ مالیہ سے متعلق معلومات اس زرعی فہرست تک محدود نہیں ہوتیں۔ ان میں ماہی گیری کے مقامات اور معدنیات کی کانوں کا بھی حوالہ موجود ہے اور اسی طرح محاصل چنگی، میلوں، منڈیوں اور ترازو گھروں سے آمدنی کے بارے میں اور ساتھ ہی ان کے وقوع کی جگہوں، ان کے قواعد و ضوابط، اور کاروبار کی کیفیت اور کمیّت کے متعلق بھی معلومات درج ہیں۔

دفتر خاقانی کی جانب رجوع کرنے سے ہم ملک کے محاصل کی سرکاری زمینوں، فوجی جاگیروں، اوقاف اور نجی جائیدادوں (مُلک) کے درمیان تقسیم کے بارے میں بھی صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ فی الواقع یہ دفاتر ایک ایسے جائزے پر مشتمل ہیں، جو ہر زرعی زمین کی ملکیت کی شکل، ان تبدیلیوں کی اجمالی کیفیت کے ساتھ پیش کرتا ہے، جو اس میں یکے بعد دیگرے واقع ہوئیں۔

ان دفاتر کی تالیف کا سبب سلطنت کی انتظامی تنظیم تھی۔ زیادہ تر عثمانی عہدیدار۔ شہری اور فوجی—دونوں، اپنی تنخواہیں مرکزی حکومت کے خزانے سے حاصل نہیں کرتے تھے، لیکن اس کے عوض میں انہیں اپنے طور پر کسی مقررہ علاقے پر لگان عائد کرنے کی اجازت دی جاتی تھی؛ چنانچہ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں صرف "تیماروں" (جاگیروں) پر تصرف رکھنے والوں کو، جن کی تعداد بڑھ کر تقریباً پینتیس ہزار تک پہنچ گئی تھی، ان لگانوں کا نصف سے زیادہ حصہ ملتا تھا، جو سلطنت کی سر زمین پر عائد تھے۔ مزید برآں یہ تناسب پوری سترھویں صدی عیسوی کے دوران میں بڑھتا رہا اور ساتھ ہی تیمارداروں (جاگیرداروں) کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

اس نظام کو کامیابی سے عمل میں لانے کے لیے سلطنت کے محاصل کے مختلف ذرائع کی ہر ایک تفصیل

کی معرفت اور کسی معیّن دور میں ان کی تبدیلوں کی سلسلہ وار پیروی ایک لازمی امر تھا ۔ اس طرح یہ اندازہ کرنا ممکن تھا کہ کیا تنخواہیں، جن کی رقوم دفاتر میں درج ہوتی تھیں، اور اقطاع (عطائی جاگیر) کے کاغذات (برات [بَرَت]) جن کا اجرا ان سے مستفید ہونے والوں کے لیے کیا جاتا تھا، ان لگانوں سے مطابقت رکھتے ہیں جو فی الواقع عائد کیے جاتے ہیں ۔ توسیع کے دور میں، جب کہ آبادی اور سلطنت کے وسائل میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، اکثر و بیشتر ہونے والے جائزے سلطنت کے محاصل میں ہمیشہ نئی فاضل مقداروں کی نشان دہی کرتے تھے، لیکن گیارھویں صدی ہجری/ سترھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے زمانے میں ملکی معاملات میں بدنظمی کی وجہ سے مرکزی حکومت کو ان جائزوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے ضروری اختیار حاصل نہ رہا ۔ علاوہ ازیں تیماروں کے نظام میں خلل پیدا ہونے کی وجہ سے ان اقدامات کا فائدہ بھی موہوم ہو گیا ۔

ان مفصل دفاتر کے علاوہ، جن میں جائزوں کے نتائج ترتیب وار درج کیے جاتے تھے، کچھ معاون دفتر بھی درکار ہوتے تھے، جو تیماروں کی تقسیم میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو ضبط کرنے میں کام آتے تھے، جس کی وجہ سے ان اضافوں اور ترمیموں کو درج کر لیا جاتا تھا جن کا شامل کرنا "مفصل دفاتر" میں ضروری ہو جاتا تھا ۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں جو نظام رائج تھا اس کے تحت دو یا کہ تین قسم کے معاون دفاتر استعمال کیے جاتے تھے ۔

۱ ۔ دفتر اجمال یا "فہرست بالاختصار": یہ مفصل دفتر پر مبنی ایک مختصر سا دفتر ہوتا تھا، جس میں باشندوں کے نام مذکور نہیں ہوتے تھے اور محاصل کو ہر ایک "وحدت" کے لیے مجموعی رقم کے طور پر درج کر دیا جاتا تھا ۔ دفتر اجمال میں کسی ... کی مستجاوز [illegible] عام طور پر وہ ایک یا دو قسموں تک محدود ہوتا تھا؛ چنانچہ تیماروں، یعنی تیمارداروں کی فہرستیں مع ان کے محاصل کے بارے میں مختصر بیانات کے رکھی جاتی تھیں نیز شاہی اراضی اور جاگیروں کی بھی فہرستیں بھی ۔

۲ ۔ دفتر در دست یا "تغیرات کا دفتر": یہ دفتر ان دیہاتوں یا شہروں کی فہرست پر مشتمل ہوتا تھا، جو فوجی جاگیروں کے مرکزی حصّے کی تشکیل کرتے تھے ۔ ان سے وہ تبدیلیاں سامنے آتی ہیں جو ہر جاگیر میں یکے بعد دیگرے واقع ہوتی تھیں، اور اس کو دیکھ کر عمّال باسانی یہ معلوم کر سکتے تھے کہ کون سی جاگیریں لاوارث ہونے کی وجہ سے حکومت کے قبضے میں آ گئیں، یا ان پر اب کوئی متصرّف نہیں رہا ۔

۳ ۔ دفتر روزنامچہ یا "روزمرہ کی کتاب"، جس میں حسب موقع عطائی جاگیر کے ان کاغذات (برات) کی نقل درج کر لی جاتی تھی جن کا اجرا نئے جاگیرداروں کے حق میں ہوتا تھا ۔

ہر مرتبہ جب کوئی نیا جائزہ لیا جاتا تو پرانے دفاتر کو نئے دفاتر سے بدل دیا جاتا اور انہیں دفتر خانے کے پرانے کاغذات میں رکھوا دیا جاتا تھا ۔ ایک مستقر سے دوسرے مستقر کو منتقل کیے جانے کے دوران میں پرانے دفتر کا بیشتر حصّہ کھو جاتا یا تلف ہو جاتا تھا، تاہم باش وکالت آرشوی واقع استانبول میں تقریباً ایک ہزار دفتر باقی ہیں اور علاوہ ان کے بعض ترکی اور غیر ملکی محافظ خانوں اور کتب خانوں میں چند دفتر موجود ہیں ۔ ان دفاتر میں سے بعض ایسے ہیں جو سلطان مراد ثانی (۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء تا ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء) اور سلطان محمد ثانی فاتح (۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء تا ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء) کے عہد کے ہیں اور جن میں اس عہد سے پہلے کے جائزوں کا حوالہ ملتا ہے ۔

پیمائش اور زمین سے متعلق دفتر خانے واقع انقرہ کے پرانے کاغذات کے شعبے میں ایسے دفاتر کا ایک [illegible]

تا ۹۸۲ھ/ ۱۵۶۶ تا ۱۵۷۴ء) اور سلطان مراد ثالث (۹۸۲ تا ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۷۴ تا ۱۵۹۵ء) کے عہد حکومت کے آخری جائزوں سے متعلّق ہے۔ ان دفتر میں ان جائزوں کے نتائج کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو ایسے صوبوں مثلاً اقریطش Crete میں عمل میں آئے، جو بعد میں فتح ہوا یا جیسے کہ موریا Morea جسے اہل وینس Venetians سے دوبارہ حاصل کیا گیا۔ آج تک بھی مقدمات میں بعض نادر موقعوں پر اس مجموعے سے استفادہ کیا جاتا ہے.

اس مجموعے میں "مفصل دفاتر" کی تعداد ۱۰۵۳، "مختصر فہرستوں" (اجمال) کی ۱۱۲، "تغیرات کے دفاتر" (دردست) کی ۹۹ اور "روزانہ دفاتر" (روزنامچہ) کی ۱۶۶۳ جلدیں ہیں۔ "مفصل دفاتر" میں سے ہر ایک میں تقریباً ۳۰۰ صفحات ہیں جن کا عرض ۱۵ سینٹی میٹر اور طول ۴۲ سینٹی میٹر ہے.

تین صدیوں سے زائد عرصے کے دوران میں، جو آخری جائزے سے لے کر اب تک گزر چکا ہے، جب کبھی نئے اوقاف کے وجود میں آنے پر بعض زمینوں کی قانونی حیثیت میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو درج کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو ایسے ہر موقع پر ان کاغذات میں ترمیم کر کے انہیں وقت کے مطابق کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے ان دفاتر کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے کہ ان میں بعض عدالتی فیصلے درج کیے گئے ہیں جو جاگیردار افراد کے حق میں کیے گئے تھے اور جن کا تعلق گانوں اور چراگاہوں کی حدود سے متعلق مقدمات سے ہے۔ پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ دفتر خانے کے طے کردہ سب معاملات کو ان دستاویزوں میں جگہ دی گئی ہے۔

بعض مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دفترِ خاقانی اراضی کا دفتر ہے۔ لیکن شاہی زمینوں (اراضی میریّہ) کے نظام میں کاشت کار کبھی بھی اس زمین کا مالک نہیں ہوتا تھا، جو محض اتفاقاً اس کے تصرّف میں ہوتی تھی، اور اس لیے وہ اس کا حق ملکیت فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی زیر کاشت زمین کے حق تصرف کو منتقل کر سکتا تھا، لیکن اس کارروائی کو جو مقامی زمیندار (سپاہی) کی زیر نگرانی اور اس کی اجازت سے عمل میں آتی تھی، شاہی دفاتر میں اندراج کا موضوع نہیں بنایا جاتا تھا۔ دفتر اراضی انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جا کر ترکی میں اس اصطلاح کے موجودہ مفہوم میں قائم کیا گیا.

مآخذ: (۱) Ö. L. Barkan: *Les grands recensements de la population et du territoire de l'Empire Ottoman*، در *Revue de la Faculté des Sciences Economiques de l'Université d'Istanbul*، ج ۲، ۱۹۴۰ء، ص ۲۱ تا ۳۲، ۱۶۸ تا ۱۷۹؛ (۲) وہی مصنف: *Essai sur les données statistiques des registres de recensements dans l'Empire Ottoman aux XVème et XVIème siècles*، *JESHO*، ج ۱، حصہ ۱، ۱۹۵۷ء؛ (۳) B. Lewis: *The Ottoman Archives as a Source for the History of the Arab lands*، *JRAS*، ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۹ تا ۱۵۵؛ (۴) وہی مصنف: *Studies in the Ottoman Archives I*، *BSOAS*، ج ۱۶، حصّہ ۳، ۱۹۵۴ء، ص ۴۶۹ تا ۵۰۱؛ (۵) H. Inalcik، ہجری ۸۳۵ تاریخلی صورتِ دفتر سنجاق آرونید، انقرہ ۱۹۵۴ء؛ (۶) آئی۔ ایچ۔ اوزون چارشیلی: عثمانلی دولتی مرکز و بحریہ تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۴۸ء، ص ۹۵ تا ۱۱۰؛ (۷) L. Fekete: *Die Siyāqat-Schrift in der türkischen Finanzverwaltung*، بوڈاپسٹ ۱۹۵۵ء؛ نیز دیکھیے، باش وکالت آرشیوی، دفتر، تحریر، لیوٗ.

(Ö. L. Barkan)

* **دفتر دار:** ترکی میں دِفتردار (defterdār)، دفتر [رک بآں] کا رکھنے والا، محکمہ مال کے اعلٰی افسر کے لیے عثمانی اصطلاح جو مشرقی اسلامی دنیا کی اصطلاح مُستوفی [رک بآں] سے مطابقت رکھتی ہے۔ القلقشندی کے قول کے مطابق (صبح، ۲: ۳۸۵،

۴۹۴ھ، ۵۲۵، ۵۲۰) صاحب الدفتر کا لقب فاطمی نظم و نسق میں اس افسر کے لیے پہلے ہی سے موجود تھا جو دفتر المجلس، یعنی حساب و محاسبہ کے دفتر کا مہتمم ہوتا تھا۔ لقب دفتر خوان — دفتر پڑھنے والا، سلطان صلاح الدین کے وقت میں دکھائی دیتا ہے (B. Lewis : *Three Biographies from Kamāl ad Dīn* در فؤاد کوپرولو ارمغانی، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۳۴۳)، اور اسلامی مغرب میں دوبارہ مستعمل ہوا (المقّری: *Analectes*، ۱ : ۶۶۰)۔ لقب دفتردار کی ابتدا بظاہر ایلخانوں کے ساتھ ہوئی جنھوں نے دفاتر مرتّب کرنے اور ان کی نگرانی کرنے کے لیے دفتردار دیوان ممالک یا دفتردار ممالک کا تقرر کیا (اوزون چارشیلی: مدخل، ص ۲۲۹ تا ۲۳۰)؛ کوپرولو: *Bizans*، ص ۲۰۳ تا ۲۰۵؛ Hammer : *Geschichte der Goldenen Horde*، Pest ۱۸۴۰ء، ص ۴۹۷ تا ۵۰۱)۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے ترکی قانون ناموں سے سلطنت عثمانیہ میں دفتردار کے عہدے کا ارتقا ظاہر ہوتا ہے۔ سلطان محمد ثانی کے قانون نامے میں سردفتردار پہلے ہی سے ایک اونچے درجے کا ملازم ہوتا تھا جو وزیراعظم کی عام نگرانی کے ماتحت سلطانی مالیات کا ذمے دار افسر (وکیل) ہوتا تھا (قانون نامۂ آل عثمان، *TOEM*، ضمیمہ، استانبول ۱۳۳۰ھ، ص ۱۰)۔ اس کا نام وزیراعظم کے نام کے فوراً بعد آتا تھا اور رتبے کے لحاظ سے وہ اس کے مقابلے کا تھا۔ دیوان میں اس کی نشست وزیر اعظم اور دو قاضیانِ عسکر کے فوراً بعد ہوتی تھی، اور ان کی طرح اسے بھی اپنے دائرہ اختیار کے اندر فرامین جاری کرنے کا حق حاصل تھا۔ اپنے سلطان سے ملاقات کرنے کا ذاتی حق بھی حاصل تھا، جو اسے خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑا ہوجاتا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۶۰ تا ۷۱، ۲۰۳ تا ۲۰۵)۔ اس کے فرائض منصبی میں محاصل و مخارج کی ایک سالانہ روئداد یا میزانیہ پیش کرنا شامل تھا جس کے صلے میں اس کو ایک خلعت عطا کی جاتی تھی۔ اس کی خدمات کا معاوضہ یا تو چھ لاکھ اسپر aspers کی مالیت کی جاگیر خاص [رک بآں] ہوتی تھی یا ڈیڑھ لاکھ اسپر سے لے کر دو لاکھ چالیس ہزار اسپر تک، شاہی خزانے سے سالانہ وظیفہ (سالیانہ)۔ اس کے علاوہ دفتردار جاگیر "خاص" کے تمام عطیات کی رجسٹری فیس (حق امضاء) کے حقدار ہوتے تھے، بحساب ایک ہزار اسپر فی بار (یوک = ایک لاکھ اسپر) خواہ یہ عطیہ بطور اجارے کے ہو یا بطور سپردگی (التزام یا امانت)؛ نیز جو نقد رقمیں سرکاری خزانے میں داخل کی جائیں ان پر ۲۲ اسپر فی ہزار کے حساب سے "جمع کرنے" کا معاوضہ (کسر میزان) اور شاہی زمینوں سے بطور عشر میں آئی ہوئی کی ہوئی پیداوار میں اس جنس کا ایک حصّہ بھی ان کے حقوق میں شامل تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر انھیں اسّی ہزار اسپر کی پنشن ملتی تھی (کتاب مذکور، ص ۸۰ تا ۹۲)۔ سر دفتردار (باش دفتردار) کمتر درجے کے افسرانِ مال کے نظام مراتب کی صدارت کرتا تھا۔ اول صف میں معمولی افسرانِ مال (مال دفتردار) بیٹھتے تھے؛ ان سے نیچے ان کے معاون (دفتر کتخداسی) اور ان کے ماتحت، تیمار کے دفتردار (تیمار دفترداری)۔ ان منصب کے لیے ترقی کا ایک مسلّمہ و معیّنہ زینہ تھا۔

بایزید ثانی کے وقت سے باش دفتردار کا تعلق زیادہ تر روم ایلی سے تھا اور وہ روم ایلی دفتردار کے نام سے بھی معروف تھا۔ ایک اور دفتردار، یعنی اندلو دفتردار آناطولی کے محاصل سے متعلق معاملات کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں زیادہ دور کے ایشیائی صوبوں کی دیکھ بھال کے لیے دفتردار کا ایک اور دیوان حلب میں قائم کیا گیا تھا، اس کا سربراہ دفتردار عرب و عجم کہلاتا تھا۔ اس دیوان کی بعد میں اس

طرح ذیلی تقسیم ہوئی کہ دیار بکر، ارزروم، دمشق، حلب، طرابلس اور دوسرے مقامات میں جدا جدا دیوان قائم کیے گئے ۔ سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں اناطولی کے لیے ایک علحدہ دیوان قائم کیا گیا، اور پھر اس صدی کے آخر میں ایک اور دیوان ڈینیوب Danubian کے صوبوں کے لیے ۔ یہ آخری دفتردار صرف ایک قلیل مدت تک رہا ۔ تین بڑے دیوان پہلی، دوسری اور تیسری قسمت کہلانے لگے (شق اول، ثانی، ثالث) یعنی روم ایلی، آناطولی اور نسبةً دور کے صوبے ۔ سلیم الثالث نے ایک چوتھی شق طرزِ جدید کی فوج کے میزانیے سے متعلق معاملات کے لیے قائم کی [دیکھیے نظامِ جدید] ۔ یہ شق مؤخرالذکر کے ساتھ منسوخ کر دی گئی ۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۸ء میں منصب دفتردار کا نام بدل کر وزارت مال (مالیّہ) کر دیا گیا، لیکن دفتردار کی اصطلاح مالیات کے صوبائی مدیران مال کے لیے مستعمل رہی ۔

مآخذ : (۱) محمد ذکی: تشکیلات عتیقہ دہ دفتردار، TTEM، پندرھواں سال، ۱۹۲۶ء، ص ۹۶ تا ۱۰۲، ۲۳۳ تا ۲۴۴؛ (۲) کوپرولوزادہ م ۔ فؤاد: بیزانس مؤسسہ لرینک عثمانلی مؤسسہ لرینہ تاثیری حقندہ بعضی ملاحظہ لر، THITM، ج ۱، ۱۹۳۱ء، ص ۲۰۱ تا ۲۰۵ (= م ۔ فؤاد کوپرولو: *Alcune Osservazioni intorno all'influenza delle Istituzioni bizantine sulle Istituzioni ottomane*، روم ۱۹۵۳ء، ص ۳۴ تا ۳۸)؛ (۳) Pakalin، بذیل مادہ؛ (۴) Gibb-Bowen، بمدد اشاریہ؛ (۵) Hammer-Purgstall، بمدد اشاریہ؛ (۶) *IA* بذیل مادہ (از اوزون چارشیلی) ۔

(B. Lewis)

* **دفرنگی** : رک بہ دوبرنکی ۔

* **دَفّ** : (جدید بتلفظ دَف، جس کا سلسلہ ابو عبیدہ [م تقریباً ۸۲۵ء] تک پہنچتا ہے) طنبورے یا ڈھولک کی جنس کے تمام سازوں کا عام نام ہے، گو کبھی کبھی یہ ایک خاص قسم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اسلامی روایت کے مطابق اس کا موجد تُبَل بن لَمَک تھا (المسعودی : مروج، ۸ : ۸۸) ۔ ایک حکایت یہ بھی ہے کہ اس ساز کو پہلے پہل حضرت سلیمانؑ اور بلقیس کی شادی کی رات بجایا گیا تھا (اولیا چلبی، ۱/۲ : ۲۲۶) ۔ المُفَضَّل بن سَلَمہ (م ۹۲۰ء) کہتا ہے کہ یہ عربی الاصل ہے (ورق ۲) اور ابن ایاس (م تقریباً ۱۵۲۴ء) اپنی کتاب بدائع الزھور میں لکھتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے سونے کے بچھڑے کے آگے جو ساز بجایا تھا وہ دُفّ ہی تھا ۔ یقینی طور پر یہ لفظ عبرانی "toph" کا مساوی ٹھیرایا جا سکتا ہے اور شاید اشوری adapa کے بھی مساوی قرار پائے ۔ ایک یہودی سَعْدیہ (م ۹۴۲ء) toph کا ترجمہ دُفّ ہی کرتا ہے ۔ گول اور چوکھونٹی، دونوں قسم کی شکل کا یہ ساز ہمیں قدیم سامی صنعت میں ملتا ہے (Rawlinson : *Five Great Monarchies*، ۱ : ۵۳۵؛ Perrot-Chipiez : *Hist. de l'art*، ۲ : ۳۵۱؛ Heuzey : *Figurines antiques*، لوحہ ۴، ص ۴)، اور قدیم مصر میں بھی پایا جاتا ہے (Wilkinson : *Manners and Customs of the Ancient Egyptians*، ۱ : ۴۴۳، شکل ۲۲۰) ۔

مسلمانوں کے طنبورے سات مختلف نمونوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں : ۱ ۔ چوکھونٹی شکل؛ ۲ ۔ سادہ گول شکل؛ ۳ ۔ گول تار کے جال والا؛ ۴ ۔ گول جھنکار دار تھالیوں والا؛ ۵ ۔ گول جھنکاردار چھلّوں والا؛ ۶ ۔ گول چھوٹی گھنٹیوں والا؛ ۷ ۔ گول جس میں جالی اور جھنکار کی تھالیاں دونوں ہوتی ہیں ۔

(۱) آج کل کا چوکھونٹی شکل کا طنبورہ دونوں طرف سے کھال سے منڈھا ہوتا ہے جس کے نیچے دونوں طرف یا ایک طرف تار کے حلقے (اوتار) پھیلے ہوتے ہیں ۔ المُطَرِّزی [م ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء] کہتا ہے کہ چوکھونٹے اور گول دونوں قسم کے طنبوروں کو دُفّ کہتے تھے ۔ چوتھی [illegible] عیسوی کے قدیم زمانے میں ہم جابر بن

حبشی شاعر کے کلام میں دُفّ کا ذکر پاتے ہیں اور غالباً یہ ایک چوکھونٹا ساز تھا۔ کشفُ الہُمُوم کا مصنّف کہتا ہے کہ اسلام سے پہلے کا طنبورہ (طار الجاهلی) اُس کے زمانے کے گول مصری طنبورہ (دفّ المصری) سے مختلف تھا (ورق ۱۹۳)۔ اسلامی دور کا پہلا نامور مُغَنّی طُوَیس ایک چوکور طنبورہ (دُفّ مربّع) بجایا کرتا تھا (الاغانی، ۴ : ۱۷۰)۔ مدینے کے معززین اسلام کی پہلی صدی میں چوکھونٹا ساز پسند کرتے تھے (المُفَضّل بن سلمه، ورق ۱۱)۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ شامی بھی اسی قسم کا ساز استعمال کرتے تھے کیونکہ عہد عتیق کے سریانی نسخے میں اس لفظ کا ترجمہ rᵉbhi'a (=چوکھونٹا)، کیا گیا ہے (خروج، باب ۱۵، آیة ۲۰؛ Judith، باب ۳، آیة ۷)۔ آج کل یہ شکل عرب، شام، مصر اور ایران میں متروک ہو گئی ہے لیکن مغرب میں مل سکتی ہے۔ اس کے نمونوں کے لیے دیکھیے Christianowitsch، ص ۳۲، لوحہ ۱۱ جس میں اسے دُفّ کہا گیا اور Höst، ص ۲۶۲، جدول xxxi، ۱۱، جس میں اسے bandair کہا گیا ہے۔ اس کے اصل نمونے برسلز Brussels میں موجود ہیں، عدد ۳۳۹، ۳۴۰ (Mahillon، ۱ : ۴۰۰) اور نیو یارک میں بھی پائے جاتے ہیں، عدد ۳۹۲، ۳۱۹ (*Catalogue*، ۲ : ۸۲؛ ۳ : ۵۰)۔

(۲) گول شکل: اس کا نام بھی دُفّ تھا (المُطَرِّزی) اور کہا جاتا ہے کہ اس شکل کا ساز جس میں جھنکار دار تھالیاں یا گھنٹیاں نہ ہوں 'جائز' شمار ہوتا تھا (اولیا چلبی، ۱/۲ : ۲۲۶)۔ غالباً یہی ہے جسے زمانۂ قبل از اسلام اور ابتدائی زمانۂ اسلام میں مُزْهِر یا مِزْهَر کہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عربی لغت نویس کہتے ہیں کہ مِزْهَر ایک عُود (lute) ہوتا تھا اور اس تعریف کی موسیقی پر لکھنے والے عربی مصنّفوں سے بھی تائید ہوتی ہے (العقد الفرید، ۳ : ۱۸۶؛ المُفَضّل ابن سَلَمة، ورق ۷۲؛ کتاب الاِمْتاع والانتفاع، ورق ۱۳؛ المسعودی: مروج، ۸ : ۹۳)، لیکن یہ بات بے حد مشتبہ ہے کہ مِزْهَر یا مُزْهِر عُود کی قسم تھی۔ یہ غلطی غالباً اس وجہ سے ہوئی کہ ایک قدیم لغت نویس نے یہ لکھ دیا تھا کہ "مِزْهَر عود کی طرح کا ایک آلۂ موسیقی ہے" (دیکھیے الفَیُّومی: مصباح)، جس سے مراد یہ تھی کہ عُود کی طرح مِزْهَر بھی ایک آلۂ موسیقی ہے۔ گیارھویں صدی کی ایک کتاب *Glossarium Latino-Arabicum* میں مُزْهِر (ص ۵۶۲) یا مِزْهَر (ص ۵۰۸) کو Tinfannum (*tympanum*=) کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔ آج کل بھی ساز کی یہ قسم ترکیہ (Lavignac، ص ۳۰۲۳) اور فلسطین (*ZDPV*، ۱ : ۶۳، لوحہ ۸) میں ملتی ہے۔ مصر کے مزہر میں جھنجھناتے ہوئے چھلّے لگے ہوتے ہیں۔

(۳) جالی والی گول شکل: یہ بالکل سابق الذکر قسم کا ساز ہے، لیکن اس میں سرے کے اندر تار کا جال بچھا ہوا ہوتا ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اس کا نام کیا تھا، لیکن غالباً یہ وہی آلہ ہے جسے اس کے چھلنی کی طرح گول ہونے کی وجہ سے غِربال کہتے تھے۔ الصَّغَانی (م تقریباً ۱۲۶۱-۱۲۶۲ء) کہتا ہے کہ حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے مندرجۂ ذیل ارشاد میں جس دائرے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اسی قسم کا ہے: [اَعْلِنُوا هٰذا النِّکاحَ، وَاضْرِبُوا عَلَیْهِ بِالْغِرْبالِ] "اپنی شادی کا اعلان کرو اور اس کے لیے دائرہ (غِرْبال) بجاؤ" (ابن ماجه: سُنَن، کتاب النکاح، باب ۲۰)؛ اس حدیث کے دیگر طرق روایت میں اس آلے کو دُفّ کہا گیا ہے [حدیث کے ضعیف یا موضوع ہونے سے قطع نظر، بعض شارحین حدیث کے نزدیک غربال سے مراد دُفّ ہے]۔ جدید الجزائر میں اس قسم کے آلۂ موسیقی کے لیے لفظ بَنْدَیر یا بَنْدِیر مستعمل ہے؛ یہ بظاہر گوتھک لفظ pandero سے مستعار ہے، جو ایک آلۂ موسیقی کا نام تھا اور ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے استعمال کیا جاتا تھا، اس کا اشبیلیہ کے Isidore کے

نے ذکر کیا ہے۔ بندیر عموماً دوسری اقسام، جیسے دُفّ، مِزہر اور طار، سے بڑا ہوتا ہے، اگرچہ کشف الہُمُوم میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ 'دائرے' مختلف نمونوں کے بنائے جاتے تھے اور "ان کا حجم طار کبیر سے لے کر گھٹتے گھٹتے "غربال دقیق" تک پہنچ جاتا تھا"۔ مصری آلۂ موسیقی کے لیے دیکھیے Villoteau (ص ۹۸۸) اور الجزائر کے لیے دیکھیے Christianowitsch (ص ۳۱، لوحہ ۹)، Delphin et Guin (ص ۳۷) اور Lavignac (۲۹۳۱)۔ بقول Höst (ص ۲۶۱، لوحہ ۳۱، ۶) مراکش میں اس کا نام ضِیق تھا۔ ان کے اصلی نمونے برسلز، عدد ۳۰۸، ۳۰۹، (Mahillon، ۱ : ۳۹۳ تا ۴۰۰) اور نیویارک، عدد ۴۵۲، (Catalogue، ۳ : ۵۰) میں مل سکتے ہیں۔

(۴) چھنچھناتی تھالیوں والی گول شکل : یہ (۲) کے مشابہ ہے، لیکن اس میں چند جوڑے جھانجھوں کی تھالیوں (صُنُوج) کے زائد لگا دیے جاتے ہیں، جو ساز کے کناروں میں بنے ہوئے سوراخوں میں لگے ہوتے ہیں۔ یہی وہ آلہ ہے جسے طار کہتے ہیں۔ اگرچہ کشف الہُمُوم کا مصنّف اس نام کو بہ نسبت دُفّ کے زیادہ قدیم بتاتا ہے، تاہم ہمارے پاس اس کا اب تک کوئی قوی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یمن میں طار کا وجود بارھویں صدی میں پایا جاتا تھا (Yaman : Kay، ص ۵۴)، چنانچہ تیرھویں صدی کی کتاب *Vocabulista in Arabico* میں یہ لفظ بشکل طَرّ (Tinpanum = Ṭarr) دیا ہوا ہے۔ Kaempfer نے دَفّ کے نام سے ایرانی آلے کی تصویر کھینچی ہے (ص ۷۴۱، تصویر ۷) اور Niebuhr نے اس کا ایک عربی نمونہ پیش کیا ہے، جس کا نام اس نے دَفّ بتایا ہے (ج ۱، لوحہ ۲۶)۔ Höst (ص ۲۶۱، لوحہ ۳۱) مراکشی آلے کا خاکہ پیش کرتا ہے، جو تیرھویں صدی میں مستعمل تھا اور اس کا نام تِرّ (Tirr) بتاتا ہے۔ الجزائر میں اس کو طار کہتے ہیں (Delphin et Guin، ص ۴۲؛ تذکرۃ النسیان، ص ۹۳؛ Lavignac، ۲۸۴۴)؛ اور اس کا ایک خاکہ Christianowitsch (لوحہ ۱۰) نے دیا ہے۔ مصری طار کو Villoteau (۱ : ۹۹۸) اور Lane (باب ۱۸) نے بیان کیا ہے اور نقشہ دیا ہے اور اس کے صحیح نمونے برسلز، عدد ۳۱۲ تا ۳۱۵ (Mahillon، ۱ : ۳۹۴ تا ۳۹۵) اور نیویارک، عدد ۴۵۵، ۳۱۹، ۱۳۵۹ (Catalogue، ۳ : ۵۱) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مصر میں اس سے ذرا چھوٹے نمونے کو رِقّ کا نام دیا گیا تھا (Villoteau، ۱ : ۹۸۹)، جو کسی طرح سے جدید نام نہیں ہے (کشف الہموم، ورق ۹۳ ا)۔ برسلز میں اس کے نمونے موجود ہیں، دیکھیے عدد ۳۱۶ تا ۳۱۷ (Mahillon، ۱ : ۳۹۵).

(۵) چھنچھناتے چھلّوں والی گول شکل : یہ سابق الذکر ساز سے ملتا جلتا ہے، لیکن اس میں جھنکار پیدا کرنے والے چھلّے (جَلاجِل) زیادہ ہوتے ہیں۔ انہیں اسی جگہ پھنسا دیا جاتا ہے جہاں سابق الذکر ساز میں تھالیاں لگائی ہوتی ہیں۔ Villoteau کے زمانے میں اسے مصر میں مِزْہر کہتے تھے، لیکن ایران میں ایک صدی بعد جو ساز ملتا ہے اسے Kämpfer دائرہ کا نام دیتا ہے (ص ۷۴۱، سطر ۸).

(۶) چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں والی گول شکل : یہ سابق الذکر ہی کے مشابہ ہے، لیکن گھنٹیوں کو کناروں پر بنے ہوئے سوراخوں میں لگانے کے بجائے اندر کی جانب لٹکایا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں (= اجراس، جرس کی جمع)، جو اکثر کُرے کی شکل کی اور sonnettes کے مشابہ ہوتی ہیں، کبھی کبھی اس کے کناروں کے اندرونی جانب لگی ہوئی دھات یا لکڑی کی سلاخ میں پرو دی جاتی ہیں۔ یہ آلہ ایران اور ترکستان میں مقبول ہے، جہاں اسے عموماً دائرہ کہتے ہیں۔ سترھویں صدی کا ایک ایسا آلہ Kaempfer نے دکھایا ہے (ص ۷۴۲، سطر ۸)۔ جدید آلے کے لیے دیکھیے Lavignac (ص ۳۰۷۶).

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دائرہ اور دُفّ ہر قسم کی ڈھولک یا طنبور کے نام ہوگئے ہیں، حالانکہ دائرہ کا نام صرف گول شکل کے آلے کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔

(۷) گول شکل، جس میں جالی اور جھانجھر دونوں ہوں: المغرب میں اس ساز کا نام شُکشاک ہے (Guin و Delphin، ص ۳۸، ۶۵؛ Lavignac، ۲۹۳۲ و ۲۹۳۳)؛ لیکن بعض علاقوں میں اس نمونے کو طبیلہ کہتے ہیں۔ مصر میں Villoteau کے کہنے کے مطابق بھی بندیر ہے۔

اگر ڈھول (طبل) کو مسلمانوں کی موسیقی کے رزمیہ رنگ کا حامل کہا جائے، جیسا کہ ایک دفعہ Doughty نے کہا تھا، تو ڈھولک یا طنبورہ میں بزمیہ رنگ ملے گا۔ یہ صحیح ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں طنبورہ بوقت جنگ بڑی بوڑھیوں اور گانے والی چھوکریوں (قَیْنات) کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور کبھی کبھی، جیسا کہ یہودی قبیلوں کا دستور تھا، اس کے ساتھ بالسری (مِزْمار) بھی ہوتی تھی (الاغانی، ۲: ۱۷۲)، لیکن مجلسی زندگی میں بھی بلا شبہہ یہی آلہ نمایاں طور پر استعمال کیا جاتا تھا (السیوطی: مزہر، ۲: ۲۳۶)، جیسا کہ بہت سی حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ فنی موسیقی میں تال سُر (ایقاعات، اصول، ضروب) قائم رکھنے کے لیے طُنبورہ کو اہم ترین ساز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

"دَفّ" فارسی میں دَف یا دَپ، کُردی میں دَیک، البانوی اور بوسنوی میں دِف، ہسپانوی اور پرتگالی میں اَدُف (adufe) ہوگیا۔ "دائرہ" قفقازی میں دھرہ dahare، سرویا اور البانیا میں دَیرہ daire اور ہندوستان میں دارا dara بنا [آج کل اردو یا ہندوستانی میں "دائرہ" ہی بولا جاتا ہے، بمعنی، ڈفلی، چنگ]۔ طار کی شکل پولینڈ کی بولی میں Tur اور سواحلی میں atari ہوگئی۔ طنبورہ کا یورپ میں عام رواج ہسپانیہ کے مسلمان موروں کے ذریعے ہوا اور ایک مدت تک طنبورۂ باسک (*tambour de Basque*) کے نام سے مشہور رہا، کیونکہ ہسپانوی مسلمانوں کی تہذیب یورپ میں باسک کے خطے ہی کے راستہ سے نفوذ کرتی تھی۔ تقریباً پندرھویں صدی عیسوی میں اس کا رواج یورپ میں متروک ہوگیا تھا، لیکن اٹھارھویں صدی عیسوی میں ترکوں یا ینی چریوں کی موسیقی کا شوق بہت بڑھا تو اسے بھی یورپ والوں نے اسی موسیقی کا جزو ہونے کی حیثیت سے دوبارہ اختیار کیا۔

مآخذ: (۱) Farmer: *History of Arabian Music to the xiiith Century*، ۱۹۲۹ء؛ (۲) وہی مصنف: *Studies in Oriental Musical Instruments*، ۱۹۳۱ء؛ (۳) Sachs: *Reallexikon der Musikinstrumente*، ۱۹۱۳ء؛ (۴) Fétis: *Histoire générale de la musique*، ۱۸۶۹-۱۸۷۶ء؛ (۵) Christianowitsch: *Esquisse historique de la musique arabe*، ۱۸۶۳ء؛ (۶) Guin و Delphin: *Notes sur la Poésie et la musique arabes dans le Maghreb algérien*، ۱۸۸۶ء؛ (۷) Advielle: *La musique chez les Persans en 1885*، ۱۸۸۵ء؛ (۸) Höst: *Nachrichten von Marokos und Fes*، ۱۷۸۷ء؛ (۹) Kaempfer: *Amoenitatum exoticarum* ...، ۱۷۱۲ء؛ (۱۰) المفضل بن سلمہ: کتاب الملاہی، قاہرہ، مخطوطہ، ورق ۵۳۳؛ (۱۱) کشف الہموم، مخطوطہ، ورق ۱؛ (۱۲) کتاب الاغانی (طبع بولاق)؛ (۱۳) Mahillon: *Catalogue ... du Musée Instrumental du Conservatoire Royal de Musique*، بار دوم؛ (۱۴) *Catalogue of the Crosby Brown Collection of Musical Instruments*، نیویارک؛ (۱۵) اولیا چلبی: *Narrative of Travels ... by Evliya Efendi*، ۱۸۴۶ء؛ (۱۶) ابن عبد ربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء؛ (۱۷) کتاب الامتاع و الانتفاع، Madrid، مخطوطہ، عدد ۶۰۳؛ (۱۸) Toderini: *Letteratura Turchesca*، ۱۷۸۷ء؛ (۱۹) Lavignac:

Encyclopédie de la musique، ج ۵، ۱۹۲۲ء؛ (۲۰) Villoteau، در Description de l'Égypte، ج ۱؛ (۲۱) Glossarium Latino-Arabicum، طبع Seybold؛ (۲۲) Niebuhr : Voyage en Arabie، ۱۷۷۶ء؛ (۲۳) فطرت : اوزبک کلاسک موسیقاسی، تاشقند ۱۹۲۷ء؛ (۲۴) Mironov : Pesni Fergani Bukhari i Khivi، تاشقند ۱۹۳۱ء؛ (۲۵) Belaiev : Muzikalnie instrumenti uzbekistana، ماسکو ۱۹۳۳ء؛ (۲۶) کامل الخُلعی : کتاب الموسیقی الشرقی، قاہرہ ۱۳۲۲ھ؛ [نیز رک بہ إیقاع].

(H. G. FARMER)

* **دَفْنُ الذُّنُوب** : رک بہ ذُنُوب.

* **الدَّقَّاق** : ابوعبداللہ، ایک مراکشی صوفی، جو سجلماسہ میں پیدا ہوا۔ وہ اور ابوعبداللہ محمد بن عمر الاصم (جو ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں قتل ہو گیا تھا) صوفیوں کے ان چھوٹے حلقوں میں سے ایک حلقے سے تعلق رکھتے تھے جنھیں عام طور پر حکومت پسند نہیں کرتی تھی۔ ابوعبداللہ اس سے پہلے فاس کے مقام پر اپنے بعض رفیقوں کے ساتھ، جن میں سے ایک الدقاق بھی تھا اور جنھیں بعد میں تاشفین بن علی المروی کے حکم سے رہا کر دیا گیا تھا، قید رہ چکا تھا۔

کسی کو نہ تو اس صوفی کی تاریخ پیدائش معلوم ہے نہ تاریخ وفات، تاہم یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں وہ فاس میں صوفی کی حیثیت سے معروف ہو چکا تھا، جہاں اس کے "احوال" نے ابن العریف اور ابن برّجان کو اس پر مہربان کر دیا تھا۔ ان دونوں کا انتقال ۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء میں ہوا۔

اگر ہم التادلی کی شہادت کو صحیح تسلیم کریں تو الدقاق کبھی سجلماسہ اور کبھی فاس میں رہتا رہا۔ فاس ھی میں اس کی ملاقات ابومدین سے اس وقت ہوئی جب مؤخرالذکر تحصیل علم کے سلسلے میں ابوالحسن بن حِرزِہم سے المحاسبی کی الرعایة اور ابن غالب سے الترمذی کی سُنَن پڑھ رہا تھا۔ الدقاق اور ابوالسّلاوی نامی ایک شخص نے اسے تصوّف کی طرف مائل کیا، التشوّف، ص ۳۱۹)۔ الدقاق چونکہ ابومدین کے اساتذہ میں سے تھا اس لیے اس کا نام محو نہیں ہو سکا۔

الدقاق نے ایک تارک الدنیا کی طرح زندگی بسر کی اور اس کی یہ خصوصیت دوسری تمام باتوں سے زیادہ نمایاں ہے کہ وہ عالم سے زیادہ صوفی تھا۔ اس نے جس انداز سے اپنے زھد و اتقا کا دعوی کیا ہے اور اس کے تسلیم کیے جانے پر جس مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا ہے اس کا ہمارے دلوں پر کوئی خوش گوار اثر نہیں پڑتا۔ الدقاق کا انتقال فاس میں ہوا۔ A. Bel کے بیان کے مطابق اس کی وفات زیادہ سے زیادہ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں ہوئی۔ وہ باب الجیسہ کے قبرستان میں دفن ہے۔

مآخذ : A. Bel : Sidi Bou Medyan et son maître Ed-Daqqâq à Fès، در Mélanges René Basset، پیرس ۱۹۲۳ء، ۱ : ۳۰ ببعد؛ (۲) التادلی : التشوُّف إلی [معرفة] رجال التصوّف، طبع A. Faure، الرباط ۱۹۵۸ء۔

(A. FAURE)

* **دَقُوقاء** : (یا دَقُوق)، سلطنت عباسیہ کے صوبۂ جزیرہ میں کرکوک سے کوئی پچیس میل جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا قصبہ، جو شاہراہ موصل –ب– بغداد پر واقع تھا۔ اس قصبے کا ذکر بعد کے عرب جغرافیا نویسوں نے کیا ہے۔ اندازہ ہے کہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں یہ قصبہ ترقی کرکے شہر بن گیا تھا، اگرچہ مشہور وہ کبھی نہیں ہوا۔ قرونِ وسطی کی کچھ خشتی عمارتوں کے آثار اور ایک مینار یہاں اب بھی موجود ہے۔ زمانۂ مابعد میں (نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی یا اس سے ذرا پہلے سے) اس کا نام "طاووق" یا "طاؤق" ہو گیا اور اس کا موجودہ نام بھی یہی ہے۔ یہ صحت افزا اور سرسبز و شاداب مقام پہاڑوں کی ترائی

کے عین مغرب میں ہموار سطح پر ایک چوڑے چشمے طاؤق چای کے ساتھ واقع ہے، جو گرمی کے موسم میں تو محض رستا رہتا ہے، لیکن سردیوں کی برسات کے بعد اس میں سخت سیلاب آ جاتا ہے۔ یہ پہلے دریاے عُظَیم میں جا کر گرتا ہے اور پھر وہاں سے دریاے دجلہ میں مل جاتا ہے، لیکن جب نہروان کی بڑی نہر موجود تھی تو اس میں جا ملتا تھا۔ جدید عراق میں طاؤق، جس میں کوئی دو ہزار کُردی اور ترکستانی زبان بولنے والے آباد ہیں، اب ایک "ناحیہ" کا صدر مقام ہے۔ شہر کا انداز تھوڑا بہت مغربی ہے اور یہ قرب و جوار کے کرد قبیلوں (داؤدیہ اور کاکئی) اور ترکمان دیہاتیوں کے لیے زرعی اور تجارتی منڈی ہے۔ طاؤق چای پر جدید قسم کے پُل بنائے گئے ہیں اور عراق ریلوے کی لائن اور پختہ سڑک ان پر سے ہو کر گزرتی ہے۔ حضرت زین العابدین بن حضرت امام حسین علیہ السّلام کا مزار یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔

مآخذ: (۱) Le Strange، ص ۹۲، اور عرب استاد جو وہاں مرقوم ہیں؛ (۲) عبدالرزاق الحسنی: العراق قدیمًا وحدیثًا، سدوم ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء، ص ۱۹۷؛ راقم کے اپنے مشاہدات۔

(S. H. LONGRIGG)

* **دَقَہْلِیَہ:** طاس نیل کے مشرقی علاقے میں مصر کا ایک صوبہ۔ یہ نام دَقَہْلَہ نام کے ایک گاؤں سے منسوب ہے جو قبطی نام تُکِہْلِی (Tkehli) کا معرّب ہے۔ یہ گاؤں دِمیرہ اور دِمیاط کے درمیان واقع تھا اور دمیاط کے مقابلے میں دمیرہ سے زیادہ قریب تھا۔ ایک زمانے میں یہ اپنے کاغذ سازی کے کارخانے کی وجہ سے مشہور تھا، لیکن آج کل ایک گمنام سا گاؤں ہے۔

یہ صوبہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں قائم کیا گیا اور آج تک اپنے حدود میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ باقی ہے۔ آج کل یہ دریاے نیل کی شاخ دمیتہ کے مشرقی کنارے پر بسا ہوا ہے اور نیل کی یہی شاخ اس کی مغربی سرحد بناتی ہے جو صوبۂ شرقیہ کے جنوب مشرق پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

مآخذ: (۱) ابن خرداذبہ، ص ۸۲؛ (۲) قدامہ، ص ۸۸؛ (۳) علی پاشا، ۱۱: ۱۴؛ (۴) Maspero اور Wiet: *Materiaux pour servir à la géographie de l'Égypte*، ص ۹۰، ۱۸۶ تا ۱۹۱۔

(G. WIET)

* **دَقیقی:** ابو منصور محمد بن احمد (یا محمد بن محمد بن احمد)، ایرانی شاعر، جس نے فارسی زبان میں پہلی قومی رزمیّہ نظم لکھی۔ اس کی جاے پیدائش غیر یقینی ہے (طوس، بخارا، بلخ یا سمرقند)۔ وہ ۳۱۸ اور ۳۲۹ھ/۹۳۰ اور ۹۴۰ء کے درمیان پیدا ہوا، اس لیے کہ جب وہ امراے چغانیان کا اور پھر سامانی امیر منصور بن نوح (۳۵۰ تا ۳۶۶ھ/۹۶۱ تا ۹۷۶ء) کا قصیدہ گو تھا، تو اس کی عمر کم از کم بیس سال تھی۔ علاوہ ازیں، فردوسی، جس نے اس کے بعد شاہنامہ کی تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا، کہتا ہے کہ جب اس نے امیر نوح [ثانی] بن منصور (۳۶۶ تا ۳۸۷ھ/۹۷۶ تا ۹۹۷ء) کی خواہش پر یہ کام شروع کیا تو دقیقی نوجوان تھا، اس لیے گویا دقیقی اس سلطان کے عہد سے پہلے مرا نہیں تھا اور فردوسی نے شاہنامہ کی تصنیف کا کام تقریبًا ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں دوبارہ اس وقت شروع کیا جب اس کے پیشرو (دقیقی) کو اس کے ایک غلام نے قتل کر دیا تھا۔

شعرا کے تذکروں (لباب الالباب، مجمع الفصحاء، ترجمان البلاغۃ وغیرہ) میں بعض غزلیہ اشعار اور قطعے ایسے ملتے ہیں جو دقیقی کی شاعرانہ صلاحیت، اس کے لطیف و نازک شاعرانہ مزاج اور اس کے آسان اور عام فہم طرز کے شاہد ہیں، لیکن وہ تصنیف جس نے اسے بقاے دوام بخشی ہے شاہنامہ کا ایک حصہ ہے (تقریبًا ایک ہزار اشعار جو اس کے جانشین فردوسی

نے اپنی نظم میں شامل کیے ہیں)۔ دقیقی کے اس منظوم حصے میں شاہ گشتاسپ کے عہد حکومت، زردشت کے ظہور اور اس کے کارناموں اور ان کے تورانی دشمنوں کے خلاف جنگ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

اگرچہ دقیقی کا نام مسلمانوں کا سا ہے، اس کی ایک رباعی اور بعض دوسری نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عقیدے کے اعتبار سے زردشتی تھا؛ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ دل سے زردشتی تھا؟ اگر وہ سچے دل سے مسلمان تھا تو کیا اسے اپنے شاہنامہ میں، جس کے لکھنے کا کام اس نے سامانی امیر جیسے انتہائی راسخ العقیدہ مسلمان کے حکم سے شروع کیا تھا، زردشتی مذہب کے عروج اور اس کی بھڑکائی ہوئی جنگ کی کھلم کھلا تعریف کرنی چاہیے تھی؟ بہرکیف اگر یہ بات یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہے کہ اس نے یہ واقعہ اس لیے منتخب کیا کہ اس کے پاس ایتکار زریران (=یادگار زریر) کا ایک نسخہ موجود تھا۔ یہ منظوم کتاب ساسانی عہد کی ہے اور پہلوی میں لکھی ہوئی ہے (جیسا کہ E. Benveniste نے بیان کیا ہے)۔ دقیقی براہِ راست اسی سے متاثر ہوا۔ اگر ہم دقیقی کی ان نظموں کو پیش نظر رکھیں اور اپنے اسلوب اور بحر کے اعتبار سے رزمیہ کہی جا سکتی ہیں جو تذکروں میں منتشر صورت میں ملتی ہیں، تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس نے شاید شاہنامہ کے دوسرے حصوں کو بھی نظم کیا ہو۔

دقیقی کے جو اشعار باقی رہ گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے بیانیہ، رندانہ، یا عاشقانہ اسالیب کے مطابق اپنے تأثرات کو بدلنے کی حیرت انگیز استعداد حاصل تھی۔ فارسی کے تذکروں اور لغات میں اس کے جو متعدد اشعار نقل کیے گئے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے اپنی شاعری کے مختصر سے دور ہی میں شہرت دوام حاصل ہو گئی تھی۔ بلاشبہہ شاہنامہ میں اس کے اشعار کی شمولیت نہ صرف بلند پایہ ہونے کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اس سے ایران کی اس عظیم قومی نظم کے مآخذ پر روشنی پڑتی ہے۔

مآخذ: (۱) فردوسی: شاہنامہ، طبع و ترجمہ از J. Mohl، ۳: ۲۵۸ تا ۳۰۷ (=۳: ۲۸۷ ببعد)؛ طبع Vullers-Landauer، ۳: ۱۴۹۵ تا ۱۷۲۷؛ طبع تہران ۱۹۳۴-۱۹۳۵ء (نشر Beroukhim)، ج ۶؛ (۲) E. Benveniste: *Le Mémorial de Zarēr*، در *JA*، ج ۲۲۰، ۱۹۳۲ء، عدد ۲، ص ۲۴۵ ببعد؛ (۳) غزلیات: G. Lazard: *Les premiers poèmes persans*، تنقیدی طبع، مع حواشی، ترجمہ اور مآخذ؛ (۴) براؤن E.G. Browne: *A Literary History of Persia*، ۱: ۴۵۹ تا ۴۶۲ و بمدد اشاریہ؛ (۵) رضازادہ شفق: تاریخ ادبیات ایران، تہران ۱۳۲۱، ص ۵۰ تا ۶۵، بمدد اشاریہ؛ (۶) حسین فریور: تاریخ ادبیات ایران و تاریخ شعراء، بار دوازدہم ۱۳۴۳ھ، ص ۹۲ تا ۹۵؛ (۷) سلیم نیساری: تاریخ ادبیات ایران، بار پنجم، تہران ۱۳۳۴ھ ش، ۱: ۲۸ تا ۲۹؛ (۸) جلال الدین ہمائی: تاریخ ادبیات ایران، بار دوم، تہران ۱۳۴۰ھ ش، بمدد اشاریہ؛ (۹) ذبیح اللہ صفا: تاریخ ادبیات در ایران، ج ۱، ۱۳۳۸ھ ش]۔

(CL. HUART و H. MASSÉ)

* **دکُرلی**: رک بہ دنزلی.

* **دکّالہ**: مراکشی قبائل کا ایک وفاق، جس نے فرانس کے زیر حمایت ایک خود مختار ریاست تشکیل کی تھی۔ جب مراکش کو آزادی مل گئی تو یہ علاقہ دارالبیضاء کے صوبے سے ملحق کر دیا گیا۔ اب یہ "الجدیدہ" کے حلقہ (مَزَگن) کے ایک حصے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ قبیلۂ غرب کے بعض فریقوں کا بھی یہی نام ہے۔

البکری دکّالہ کا ذکر نہیں کرتا، مگر الادریسی اور اس کے ہم خیال ابن خَلدون (عِبَر) اور آگے چل کر الحسن بن محمد الوزّان الزیاتی Leo Africanus اس وفاق کے لیے ایک وسیع رقبہ معین کرتے ہیں،

جس میں تقریباً وہ تکونی شکل کا رقبہ شامل ہے جو دریاے اُم الربیع ، دریاے تنصف اور بحراوقیانوس کے ساحل کے مابین واقع ہے ۔ بارھویں صدی عیسوی میں مراکش کے ایک بڑے دروازے کو بھی دکّالہ کا نام دیا گیا ہے ۔ روایت سے پتا چلتا ہے کہ اس وفاق میں چھے قبیلے شامل تھے : رِگراگہ، ھزمیرہ، بنو دُغوغ، بنو ماگر، مُشترَیہ اور صنہاجہ ۔ اس فہرست سے اس تضاد کا حل بھی نکل آتا ہے، جسے ابن خلدون پہلے ہی ظاہر کر چکا ہے، جس کی رُو سے دکّالہ کبھی مَصامِدہ کا (پہلے پانچ قبیلے تو یقیناً اس کا حصہ تھے) اور کبھی صنہاجہ [رک باں] کا حصہ سمجھا جاتا تھا ۔ یہ دونوں قبیلے بربر نسل کے تھے ۔ انھیں ایک اور بربر قبیلے تامسنا کے ساتھ، جو اب معدوم ہو چکا ہے، منسلک کرنا مشکل ہے ۔ یہ وفاق ان حوادث سے جو الموحدون کی بدولت رونما ہوے، بچ نہ سکا ۔ ان حوادث کا نتیجہ یہ ہوا کہ مراکش کے علاقے میں عرب قبیلے داخل ہوگئے اور کچھ دن بعد قبیلۂ حاحَہ اور قبیلۂ بنومَعقِل کو ان کے اپنے علاقے میں واپس دھکیل دیا گیا ۔ جنوب میں فقط رِگراگہ قبیلہ صحیح سالم بچ سکا، مگر اس سے پہلے تاریخی لحاظ سے اس نے بھی اپنا اہم کردار ادا کیا ۔ اس کے "سات درویشوں کے افسانے" نے مذہبی وقائع کی تمام کتابوں میں جگہ حاصل کر لی؛ جب ان کو ظہور اسلام کا علم ہوا تو یہ ساتوں کے ساتوں درویش مکّہ پہنچے اور انھوں نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے بربر زبان میں باتیں کیں ۔ ان کے مزارات کی، جو جبلِ الحدید میں ہیں، آج تک تعظیم و تکریم ہوتی ہے ۔ دکّالہ کے نام کی اب کوئی نسلی اہمیت نہیں ہے! اس سے آج کل قبائل عرب یا پورے طور پر عرب کے زیر اثر قبائل مراد لیے جاتے ہیں ۔ یہ قبائل ایک ہی جگہ مستقل طور پر مقیم ہیں اور اگرچہ ان میں سے کچھ ابھی تک خیموں میں رہتے ہیں، لیکن یہ طرز مسکونت عملی وجوہ کی بنا پر ہے، خالصۃً بدوؤں کی سی زندگی بسر کرنے کے خیال سے نہیں ۔ اس علاقے کا اقتصادی مستقبل امید افزا ہے، بشرطیکہ امفوٹ بند (Imfout dam)، جو ۱۹۵۰ء میں تیار ہو چکا تھا، ترقیاتی منصوبے طے شدہ خاکے کے مطابق تکمیل پاتے رہیں ۔ دکّالہ اور پرتگالیوں کے باہمی تعلقات کی بابت رک بہ اَزمُور اور اس سے بڑھ کر الجدیدہ .

مآخذ : (۱) ضروری معلومات M. Michaux-Bellaire: Reg. des Dukkala، ج ۱، در *Villes et Tribus du Maroc*، ج ۱۰، پیرس ۱۹۳۲ء میں دی گئی ہیں؛ نیز دیکھیے (۲) P. Lanete: *Rep. alph. des Conf. de tribus, des tribus de la zone franç. de l'emp. chér.*، دارالبیضاء ۱۹۳۹ء؛ (۳) H. Terrasse: *Histoire du Maroc*؛ (۴) ابن زیدان: إتحاف أعلام الناس (۵ جلدیں، ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء) اور (۵) محمد بن احمد القانونی: آسفی....، قاہرہ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء .

(G. DEVERDUN)

* **دِکّۃ یا دِکّۃُ المُبلّغ** : نماز جمعہ (یا نماز عیدین) کے موقع پر مسجد میں کسی بلند آواز نمازی کو "مبلّغ" [=مکبّر] کے فرائض سونپے جاتے ہیں ۔ نماز کے دوران میں وہ بلند آواز سے امام کے بعض کلمات [تکبیریں وغیرہ] دھراتا جاتا ہے تاکہ تمام نمازی انھیں سن سکیں ۔ بڑی بڑی ممتاز مسجدوں میں وہ ایک دِکّہ پر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ دِکّہ ایک چبوترے کو کہتے ہیں، جو عام طور پر ستونوں پر دو یا تین میٹر بلند بنایا جاتا ہے اور یہ مسجد کے مسقّف حصے میں محراب اور صحن کے درمیان ہوتا ہے ۔ قاہرہ میں ایسے متعدد چبوترے پائے گئے ہیں جن کی تاریخ معلوم نہیں ۔ سب سے قدیم چبوترہ، جس پر "د ۔ ک ۔ ۃ" حروف کندہ ہیں، سلطان قایت بے کے زمانے (نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر) سے تعلق رکھتا ہے ۔

عہد عثمانی کی مساجد کے دِکّے منبر کی شکل کے ہیں اور محراب کے بالمقابل دیوار کے ساتھ بنے ہوے ہیں۔ آج کل مبلّغ کی آواز کو بلند کرنے کے لیے آلۂ مکبّر الصوت استعمال ہوتا ہے۔

دِکّۃ کو "کرسی السُّورۃ" سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے، جو ایسی نشست کو کہتے ہیں جہاں قاری دو زانوں ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ دِکّہ کی اصطلاح ایک قسم کی چوبی چوکی کے لیے بھی آتی ہے، جو عام دنیاوی کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) Van Berchem، در *CIA*، *Egypte*، بمدد اشاریہ۔

(J. JOMIER)

* **دکّن**: یہ لفظ سنسکرت کے لفظ "دَکْشِنْ" (dakshina) سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں دائیں (ہاتھ)، یعنی جنوب، اس لیے کہ سمتوں کی تعیین طلوع آفتاب کے تعلق سے کی جاتی تھی۔ شمالی ہندوستان کو جنوبی ہندوستان سے جدا کرنے والے روایتی خط کی تشکیل کوہ وندھیاچل کے جنوب مغربی سمت کے بڑھے ہوے حصوں اور اس کے اس سلسلے سے ہوتی ہے جسے ست پڑا کہتے ہیں۔ اس خط کے جنوب میں جزیرہ نماے ہندوستان کا جو حصہ واقع ہے، اس کی مزید تقسیم عموماً اس طرح کی جاتی ہے: (۱) دکن خاص، جو تنگ بھدرہ تک پھیلا ہوا ہے اور (۲) جنوبی ہند، جو اس جزیرہ‌نما کے انتہائی جنوبی نقطے تک چلا گیا ہے۔ طبعی لحاظ سے بھی ان دونوں حصوں کی حیثیت دو علٰحدہ علٰحدہ وحدتوں کی ہے، اس لیے کہ جزیرہ نماے دکن کی تشکیل لاوا سے بنی ہوئی اس وسیع سطح مرتفع سے ہوئی ہے جو گوداوری اور کرشنا کے طاسوں سے چند میل دور مغرب میں ایک مقام سے آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہے اور مغربی گھاٹوں تک پہنچتے پہنچتے یکایک ختم ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ علاقہ جو تنگ بھدرہ کے جنوب میں واقع ہے اور بندرگاہ گوا کو چھوتا ہے، اپنی ایک منفرد اور واضح خصوصیت رکھتا ہے؛ لہٰذا دکن خاص کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے: (۱) مغربی حصہ، جس کے ارد گرد سمندر اور مغربی گھاٹ ہیں، جسے "دیش" کہتے ہیں۔ یہی مرہٹوں کا اصلی وطن ہے، یہ حصہ گھاٹوں کے آگے تک چلا گیا ہے اور اس میں وہ کل علاقہ شامل ہے جس کے بڑے شہر احمدنگر اور پونا ہیں؛ (۲) وہ علاقہ جسے قرون وسطٰی میں برار کہتے تھے اور جو اب اپنے قدیم نام وِدربھہ سے معروف ہے اور اس کا اہم شہر ناگپور ہے؛ (۳) مرتھ وادہ، قدیم ریاست حیدر آباد کا وہ حصہ جہاں مرہٹی بولی جاتی ہے اور جس کا مرکزی مقام اورنگ آباد ہے؛ (۴) تِلنگانہ، جہاں کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی مادری زبان تِلگو ہے۔ اس علاقے کا تاریخی اور ثقافتی مرکز حیدرآباد ہے؛ (۵) جنوب مغربی علاقہ، جس میں زیادہ‌تر کَنڈِگا آباد ہیں۔ اس علاقے کا سب سے بڑا شہر بیجاپور ہے۔

اگر رام اور راون کی مشہور دیومالائی جنگ کو نظر انداز کر بھی دیں تو یہ بات یقینی ہے کہ یہاں آریائی تمدّن موریا حکومت کے خاتمے تک پوری طرح پھیل چکا تھا۔ موریاؤں کے زوال سے آندھروں کے عروج تک جنھوں نے دکن کی پوری سطح مرتفع پر پانچ سو برس تک حکومت کی، کوئی خاص بات قابل بیان نہیں۔ ان کے علاوہ ہمیں تاریخوں میں ناگرجُنا کونڈہ کے اِکشوکوں، برار کے وَکاٹکوں، بداسی اور کلیانی کے مغربی چالوکیوں، ملکھید کے راشٹر کوٹوں، ونگی کے مشرقی چالوکیوں، دیوگری کے یادووں اور وارنگل کے کاکتیوں کا ذکر بھی ملتا ہے، جو مسلمانوں کی فتح سے قبل کی صدیوں میں دکن کے مختلف حصوں میں حکومت کرتے رہے۔

شمال کے مسلمانوں سے دکن کا پہلا سابقہ ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء میں اس وقت ہوا جب دھلی کے سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے بھتیجے علاء الدین نے

دیوگری [رک بہ دولت آباد] پر چڑھائی کی اور یادوں کے راجا رامچندر کو خراج دینے پر مجبور کیا، لیکن اس کی ریاست کا، جو مرھٹوں کے بیشتر علاقے میں پھیلی ھوئی تھی، ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء میں پہلی مرتبہ سلطنت دھلی کے ساتھ الحاق ھوا۔ سلطان محمد بن تغلق نے وارنگل کے کاکتیوں کے مقبوضات کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے علاوہ جنوبی ھندوستان کے ایک بڑے حصے کو بھی اس کے ساتھ ملحق کر لیا اور دیوگری کو اپنا دوسرا دارالسلطنت بنا کر اس کا نام دولت آباد رکھا؛ تاھم وہ اپنی وسیع سلطنت کا انتظام مؤثر طریقے سے نہ کر سکا اور ۷۴۶ھ/۱۳۴۵ء میں اس کے دکنی امرا ("امیران صدہ") نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور اسمٰعیل مخ کو دکن کا پہلا آزاد مسلمان حکمران منتخب کیا۔ ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں اس کی جگہ ظفر خان بادشاہ ھوا اور اس نے علاء الدین حسن بہمن شاہ کا لقب اختیار کیا اور یوں گویا اس نے بہمنی سلطنت [رک بہ بہمنی] کی بنیاد رکھی۔ بہمنیوں نے اپنی سلطنت کو سمندر کے ایک ساحل سے لے کر دوسرے ساحل تک پورے دکن میں پھیلایا اور پہلے احسن آباد گلبرگہ [رک بہ گلبرگہ] اور بعد ازاں محمد آباد بیدر [رک بہ بیدر] کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر اور سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں بہمنی صوبوں کے والی پہلے خود مختار اور پھر آزاد ھو گئے، اور آخر کار دکن احمد نگر، بیجاپور، برار، بیدر اور گولکنڈہ کی پانچ حکومتوں میں تقسیم ھو گیا، جہاں علی الترتیب نظام شاھی، عادل شاھی، عماد شاھی، برید شاھی اور قطب شاھی خاندان حکمران ھوے۔ برار اور بیدر تو کچھ ھی عرصے بعد احمد نگر میں شامل ھو گئے۔ پھر احمد نگر شاہ جہان کے عہد حکومت میں ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۳ء میں سلطنت دھلی کا حصہ بن گیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے خاتمے کی باری ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء اور ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں آئی جب کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ان دونوں حکومتوں کو اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا؛ لیکن دکن میں مرھٹوں کے مسلسل حملوں نے مغل حکومت کو مستحکم نہیں ھونے دیا۔ مرھٹوں نے شیواجی کے تحت ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں اپنی ایک علحدہ حکومت قائم کر لی اور اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ شہنشاہ کو اپنی مہموں کی قیادت اورنگ آباد میں رہ کر کرنی پڑی، جہاں ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں اس کا انتقال ھوا۔ دکن کی تاریخ میں دوسری اھم تاریخ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء ھے، جب نظام الملک آصف جاہ [رک بآں] نے مبارز خان کو شکر کھیڑہ کے مقام پر شکست دے کر پورے دکن پر قبضہ جما لیا۔ آصف جاھی خاندان نے پہلے اورنگ آباد اور پھر حیدرآباد [رک بآں] سے دکن پر بڑے مؤثر طریقے سے حکومت کی، لیکن ۱۹۴۸ء میں حکومت ھند نے اسے بھارت میں مدغم کر لیا۔ نظام دکن سر میر عثمان علی خان آصف جاہ ھفتم کو بھارت کے صدر نے راج پرمکھ یا ریاست کا آئینی سربراہ بنا دیا۔ وہ ۱۹۵۶ء تک اس حیثیت سے کام کرتے رھے جب کہ ریاست حیدرآباد کو لسانی اعتبار سے تقسیم کر کے آندھرا، بمبئی اور میسور کے صوبوں میں شامل کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) آر۔ جی بھنڈارکر: *Early History of the Dekkan down to the Mahomedan Conquest*، بار دوم، بمبئی ۱۸۹۵ء؛ (۲) ایس۔ کے۔ آئنگر: *South India and her Muhammadan Invaders*، لنڈن ۱۹۲۱ء؛ (۳) J. S. King: *History of the Bahmani Dynasty*، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ (۴) شروانی: *The Bahmanis of the Deccan, an Objective Study*، حیدرآباد، بدون تاریخ؛ (۵) J.D.B. Gribble: *History of the Deccan*، ج ۱، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۶) یوسف حسین خان: نظام الملک

آصف جاہ اوّل، منگلور ۱۹۳۶ء.

(ہارون خان شروانی)

* **دکنی** : (دکّونی) رک بہ اُردو.

* **دُکَین الرّاجز** : دو شاعروں کا نام، جنھیں ابن قُتَیبہ نے ملتبس کر دیا ہے (الشعر [و الشعراء]، طبع شاکر، ص ۵۹۲ تا ۵۹۵) نیز ان مصنّفوں نے بھی جنھوں نے اُس سے نقل کیا ہے، یا اس سے استفادہ کیا ہے، یعنی ابن عبد ربّہ : العقد، طبع ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء، ص ۲۰۲ تا ۲۰۳؛ الاغانی، ۸ : ۱۵۵ و طبع بیروت، ۹ : ۲۵۲ تا ۲۵۳؛ C.A. Nallino : *Litt.* (جس کی M. Nallino نے ایک حاشیے میں تصحیح کی ہے).

(۱) دُکَین بن رَجاء الفُقَیمی (م ۱۰۵ھ/۷۲۳ - ۷۲۴ء) : مصعب بن الزبیرؓ کی مدح میں ایک قصیدے کے علاوہ (جو بحر رجز میں ہے) اپنے گھوڑے کی تعریف میں اس کا ایک ارجوزہ بھی محفوظ ہے جو الولید بن عبدالملک کے حکم سے ہونے والی گھڑ دوڑ میں جیتا تھا (دیکھیے یاقوت، ۱۱ : ۱۱۳ تا ۱۱۷؛ ابن عساکر، ۵ : ۲۷۳ تا ۲۷۹) محفوظ ہیں.

(۲) دُکَین بن سعید الدّارمی (م ۱۰۹ھ/۷۲۷ - ۷۲۸ء)، جس کے لیے درحقیقت ابن قتیبہ نے اپنا مقالہ بعنوان دُکَین الرّاجز وقف کیا ہے؛ نیز دیکھیے ابن عساکر : وہی کتاب؛ یاقوت، ۱۱ : ۱۱۷ تا ۱۱۹ - اس نے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی شان میں ایک مدحیّہ قصیدہ اس موقع پر لکھا تھا جب وہ مدینۂ منورہ کے والی مقرر کیے گئے (۸۷ھ/۷۰۶ء) اور اس پر اُسے بیش بہا انعام دینے کے علاوہ مزید وعدے بھی کیے گئے اسے شاید حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تقرب بھی نصیب ہوا - جب وہ خلیفہ ہوگئے تو دُکَین ان سے ملاقات کے لیے گیا اور انھیں ان کے وعدے یاد دلائے اور مزید انعام حاصل کیا - اسی دُکَین کی طرف یہ بیت منسوب کیا گیا ہے :

”[اذا المرءُ لم یَدْنَسْ من اللّؤم عِرْضُہ
فکلّ رداءٍ یرتدیہ جمیل]

یعنی جب تک آدمی اپنی عزت پر بد اعمالی کا دھبہ نہ لگائے تو جو لباس بھی وہ پہنے خوب صورت ہے“۔ بہر صورت یہی شعر سَمَوْأل کے مشہور لامیے کے شروع میں بھی ملتا ہے (فؤاد بُستانی: المجانی الحدیثۃ، ۱ : ۲۳۵).

اس دُکَین کو دُکَین بن سعید (سَعْد) الخَثْعَمی (المزنی) سے، جو صحابۂ کرامؓ میں سے ہیں، ملتبس نہیں کرنا چاہیے (دیکھیے ابن حَجَر : الاصابۃ، عدد ۲۳۰۱).

مآخذ : مقالہ کے اندر دیے گئے ہیں.

(Ch. Pallet)

* **دکھن** : رک بہ دکن.

* **دِگّلال** : مغربی ارتریا Eritrea اور مشرقی سوڈان کے ضلع اگوردات Agordat کے قبائلی گروہ بنی عامر کے موروثی حکمران کا لقب؛ وہ امراء کے نبتاب Nabtab طبقے یا ذات کا رکن اعلٰی بھی ہے، جنھیں بنی عامر کی ہر شاخ میں بعض ایسے تاریخی اسباب کی بنا پر جن کی توضیح اب ناممکن ہے، برتری کا درجہ حاصل ہے - خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لقب شاید فونج الاصل ہے اور غالباً ان ایام کی یادگار ہے جب یہ قبیلہ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی اور گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں سِنّار کے مسلم فونج خاندان کا وقتاً فوقتاً باجگزار رہا، جس کا تعلق وادی نیل سے تھا - دِگّلال کے عہدے کی علامات میں سُرخ مخمل کی ایک انوکھی طرز کی تکونی ٹوپی بھی شامل ہے.

مآخذ : (۱) A. Pollera : *Le Popolazioni indigene dell' Eritrea*، Bologna ۱۹۳۵ء؛ ارتریا کے برطانوی فوجی نظم و نسق کے لیے (۲) S. F. Nadel : *Races and tribes of Eritrea*، اسمار ۱۹۴۳ء؛ (۳) S. H. Longrigg : *Short history of Eritrea*، آکسفرڈ ۱۹۴۵ء؛ [(۴) وؤ لائڈن، بار دوم، بذیل مادہ].

(S. H. Longrigg)

دلاور پاشا : (۱۰۳۱ - ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء)، عثمانی وزیراعظم، جو نسلاً کروٹ Croat تھا - اس نے

قصرِ سلطانی کی ملازمت میں چاشنی گیر باشی کے درجے تک ترقی کی، بعد ازآں وہ قبرص کا، پھر ذوالحجہ ۱۰۲۲ھ/جنوری ۱۶۱۴ء میں بغداد کا بیگلربیگی مقرر ہوا۔ دیار بکر کے بیگلربیگی کا عہدہ اسے ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں عطا ہوا۔ اس نے ایران کے صفویوں کے خلاف ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کی جنگ اریوان میں حصہ لیا۔ اس کی بعد کی زندگی ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء تک کسی قدر تاریکی میں ہے۔ عثمانی وقائع (دیکھیے پیچوی، ۲: ۳۶۶؛ حاجی خلیفہ، ۱: ۳۹۲؛ نعیما، ۲: ۱۶۶) میں مذکور ہے کہ مصطفٰی پاشا نامی ایک شخص، جو عثمانیوں اور صفویوں کی جنگ (۱۰۲۳ تا ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۵ تا ۱۶۱۸ء) کے آخری معرکوں میں میدانِ کارزار میں کام آیا تھا، اپنی موت کے وقت، جو ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۸ء میں ہوئی، دیار بکر کا بیگلر بیگی تھا۔ وینس کے ایک اطلاع نامے ("relazione")، مؤرخہ جولائی ۱۶۲۰ء، میں دلاور پاشا کی دیار بکر کے بیگلربیگی کے عہدے سے برطرفی کا ذکر ہے، اور یہ کہ وہ عہدہ اب "Silidar del Re" کو دے دیا گیا ہے (دیکھیے Hammer-Purgstall، ۸: ۲۶۷)۔ دلاور پاشا نے ایک دفعہ اور دیار بکر کے بیگلربیگی کی حیثیت سے (دیکھیے حاجی خلیفہ، ۱: ۴۰۶؛ نعیما، ۲: ۱۹۴) پولستانیوں کے خلاف ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء کی جنگ خوتین (Choczim) میں حصّہ لیا۔ یہ یکم ذوالقعدہ ۱۰۳۰ھ/۱۷ ستمبر ۱۶۲۱ء کا واقعہ ہے کہ سلطان عثمان ثانی (۱۰۲۷ تا ۱۰۳۱ھ/۱۶۱۸ تا ۱۶۲۲ء) نے دورانِ جنگ میں دلاور پاشا کو وزارتِ عظمٰی پر فائز کیا، لیکن اس کے اس عہدے کی مدت بہت مختصر تھی۔ ۸ رجب ۱۰۳۱ھ/۱۹ مئی ۱۶۲۲ء میں وہ ینی چریوں کی اس بغاوت میں مارا گیا جو عثمان ثانی کی معزولی اور موت پر منتج ہوئی تھی۔ دلاور پاشا نے الرّہا اور بیرہ جک کے درمیان چارملک کے مقام پر ایک بڑی "خان" (=سرای) تعمیر کرائی، اور دوسری "خان" سیدی غازی (سیّد غازی) کے مقام پر بنوائی، جو سلطان مراد چہارم (۱۰۳۲ تا ۱۰۴۹ھ/۱۶۲۳ تا ۱۶۴۰ء) کے زمانے تک پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

مآخذ: (۱) پیچوی: تاریخ، ۲: ۳۶۸، ۳۷۸، ۳۸۲، ۳۸۳؛ (۲) قرہ چلبی زادہ: روضۃ الابرار، ص ۵۴۴، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۹؛ (۳) حاجی خلیفہ: فذلکہ، ۱: ۲۷۵، ۲۹۳، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۱۰، ۳۱۱ و ۲: ۱، ۸، ۱۰ تا ۱۶ (بمواضع کثیرہ)، ۳۱: (۴) صولاق زادہ: تاریخ، ص ۷۰۲ تا ۷۱۴، بمواضع کثیرہ؛ (۵) نعیما: تاریخ، ۲: ۱۳۲، ۱۹۸، ۱۹۳، ۲۰۱ تا ۲۱۹، بمواضع کثیرہ؛ (۶) نظمی زادہ: گلشن خلفاء، استانبول ۱۱۴۳ھ، ۶۶ ب؛ (۷) ایم۔ سرت اوغلی: تنی تریحی، در Belleten، ۱۹۴۷ء، ۱۱: ۴۸۹ تا ۵۱۴، بمواضع کثیرہ؛ (۸) فریدون: منشآت السلاطین، ۲: ۲۲۹ ببعد؛ (۹) M. A. Danon: *Contributions à l'histoire des Sultans Osman II et Moustafa I*، در JA، سلسلۂ جدید، پیرس ۱۹۱۹ء، ۱۴: ۶۹ ببعد، ۲۴۳ ببعد، بمواضع کثیرہ؛ (۱۰) A. Galland: *La mort du Sultan Osman ou le retablissement de Mustapha sur le throsne, traduit d'un manuscrit Turc* . . .، پیرس ۱۶۷۸ء، ص ۲۹، ۳۵، ۵۱، ۶۰، ۷۹، ۸۲، ۸۵، ۹۸، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۱۷؛ (۱۱) M. Steinschneider: *Die Geschichtsliteratur der Juden*، ج ۱، فرنکفرٹ ۱۹۰۵ء، فصل ۱۳۶؛ (۱۲) S. Purchas: *Purchas his Pilgrimes*، گلاسگو ۱۹۰۵ء، ۸: ۳۴۳ تا ۳۵۹، بمواضع کثیرہ ("سلطان عثمان کی موت")؛ (۱۳) R. Knolles: *The Generall Historie of the Turkes... together with the Lives and Conquests of the Othoman Kings and Emperours : A Continuation of the Turkish History from . . . . 1620 untill . . . 1628. Collected out of the Papers and Dispatches of Sir Thomas Rowe* . . . . . .، لنڈن ۱۶۳۸ء، ص ۱۰۰۶ تا ۱۰۱۸، بمواضع کثیرہ؛ (۱۴) *The Negotiations of Sir Thomas Roe in his Embassy to the*

،*Ottoman Porte from the Year 1621 to 1628 inclusive* طبع رچرڈ سن S. Richardson، لنڈن ۱۷۴۰ء، ص ۴۲ تا ۵۱، بمواضع کثیرہ؛ (۱۵) Hammer-Purgstall : *Histoire*، ۸ : ۲۱۴، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۶۷، ۲۷۸، ۲۸۱ تا ۲۹۱ (بمواضع کثیرہ)، ۲۹۸، ۳۰۲؛ (۱۶) Zinkeisen، ۳ : ۴۳۳ تا ۴۳۹، بمواضع کثیرہ؛ (۱۷) N. Jorga : *Geschichte des osmanischen Reiches*، گوتھا ۱۹۱۰ء، ۳ : ۴۴۴؛ (۱۸) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی : عثمانلی تاریخی، انقرہ ۱۹۵۴ء، ۳/۲ : ۳۷۵؛ (۱۹) عثمان زادہ احمد تائب : حدیقۃ الوزراء، ص ۷۱؛ (۲۰) سامی : قاموس الاعلام، استانبول ۱۳۰۸ھ، ۳ : ۲۱۵۱؛ (۲۱) سجلّ عثمانی، ۲ : ۳۲۹؛ (۲۲) *IA*، بذیل مادّہ دلاور پاشا (از M. Tayyib Gökbilgin).

(V. J. PARRY)

* **دلاور خان** : سلطنت مالوہ [رک بآں] کا بانی، جس کا اصل نام حسن تھا (فرشتہ، طبع نولکشور، ۲ : ۲۳۴)، یا حسین (فرشتہ، ترجمہ Briggs، ۴ : ۱۷۰؛ نیز دیکھیے یزدانی : Mandu)، یا عمید شاہ داؤد (تُوزک جہانگیری، ترجمہ Rogers و Beveridge، ۲ : ۴۰۷، جو دھار کی جامع مسجد (= لاٹ مسجد) کے کتبوں پر مبنی ہے، دیکھیے ظفر حسن : *Inscriptions of Dhar and Mandu*، در *EIM*، ۱۹۰۹ تا ۱۹۱۰ء، ص ۱۱ تا ۱۲ و لوحہ ۳ و ۴)۔ جس کی شہادت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ وہ معزّالدین محمد بن سام شہاب الدّین غوری کی صلبی اولاد میں سے تھا اور یہ عقیدہ اس حقیقت میں بھی جھلکتا ہے کہ اس کے اور اس کی اولاد کے نام کے ساتھ عموماً خاندانی نام غُوری استعمال ہوتا ہے۔ [جیسا کہ طبقات ناصری اور دیگر مآخذ میں صراحت کی گئی ہے، سلطان معزالدّین غوری کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ غوری ایک بڑا خاندان تھا اور غور کے سبھی رہنے والوں کے لیے یہ نسبت استعمال ہو سکتی ہے، لہٰذا مقالہ نگار کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے]۔ فیروز تغلق کے عہدِ حکومت میں اسے ایک خطاب اور منصب عطا کیا گیا تھا۔ دھار میں شیخ کمال الدّین مالوی کے مزار کے احاطے سے سنگِ مزار کا ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے، جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ۷۹۵ھ/۱۳۹۲-۱۳۹۳ء میں دلاور خان مالوے کا والی تھا۔ اس کے دلاور خان کا لقب اختیار کرنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ وہ خطاب تھا جسے فیروز شاہ تغلق نے اُسے عطا کیا اور اسی کے بیٹے محمّد شاہ نے اسے مالوے کا صوبے دار مقرّر کیا تھا (حیرت ہے کہ محولۂ بالا کتبے میں اس زمانے کے فرمانروا کا نام محمود شاہ مذکور ہے)۔

جب ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دلاور خان نے مفرور تغلق بادشاہ ناصرالدین محمود شاہ کو بلا توقف حفاظت و پناہ دی۔ اس بدنصیب بادشاہ سے دلاور خان کے تعلقِ خاطر اور وفاداری کی وجہ سے اس کا جاہ طلب بیٹا الپ خان (بعد ازاں ہوشنگ غوری [رک بآں]) ناراض ہو گیا اور اس نے اپنے باپ کے پناہ گزین آقا کی اطاعت گزاری کو پسند نہ کیا، بلکہ مانڈو [رک بآں] میں منتقل ہو گیا، جہاں اُس نے قلعے کی عمارتوں کا انتظام درست کیا اور انھیں مستحکم بنایا۔ محمود تغلق جب ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء میں دھلی روانہ ہوا تو دلاور خان نے، جس نے ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء ہی سے مالیہ کی فاضل رقوم کا دھلی بھیجنا بند کر دیا تھا، اپنے بیٹے الپ خان کے بہت زیادہ اُکسانے پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا (دیکھیے Briggs : *Ferishta*، ۴ : ۱۶۹)۔ بہر حال دلاور خان اپنی خود مختای کے ثمر سے لطف اندوز ہونے کے لیے زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا اور ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں دفعۃً انتقال کر گیا۔ اس کی اچانک موت سے یہ شبہہ، جس میں بعض اعلٰی مرتبت سپہ سالار بھی شریک تھے، پیدا ہو گیا کہ اُسے اُس کے جاہ طلب بیٹے نے زہر دیا ہے،

چنانچہ گجرات کی ہمسایہ سلطنت کے حکمران مظفر شاہ اوّل کا بھی عرصے تک یہی خیال رہا اور آخرکار اسی شبہے نے اُسے اپنے دوست اور حلیف کا بدلہ لینے کی نیت سے مالوہ پر حملہ کرنے پر آمادہ کیا ۔ جہانگیر نے (توزک جہانگیری، طبع لاہور، ص ۲۳۴) دھار کی جامع مسجد کی تعمیر کی جو تاریخ دی ہے، یعنی ہشت صد و ہفتاد (۸۷۰ھ)، وہ بظاہر اس کتبے کی ایک سطر کی غلط قراءت پر مبنی ہے جو محوّلہ بالا مسجد کے مشرق دروازہ پر ہے؛ وجہ یہ ہے کہ دلاور خان ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں انتقال کر چکا تھا ۔ شمالی دروازے پر جو کتبہ ہے (EIM، ۱۹۰۹ تا ۱۹۱۰ء، ۱۲ و لوحہ ۱۴) اس میں سن تعمیر رجب سبع و ثمانی مائۃ (۸۰۷ھ) درج ہے ۔ دلاور خان کی دیگر عمارتیں یہ ہیں: مانڈو کے مقام پر ایک مسجد، جو اس کے نام سے معروف ہے (کتبہ مؤرخہ ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء) اور اس قلعے کا تاراپور دروازہ (۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء کا کتبہ، وہی کتاب، ۱۹ و لوحہ ۷/۲) : اگرچہ مؤخرالذکر اس کی تعمیر کو دلاور خان سے منسوب کرتا ہے، لیکن قرینہ یہ ظاہر ہے کہ یہ اس کی موت کے بعد اس دروازے کی تکمیل کی تاریخ ہے ۔

مآخذ: (۱) محمد ہادی کامور خان: ہفت گلشن (مخطوطہ)، فصل ۳؛ (۲) فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع نولکشور، ۲: ۲۳۳؛ (۳) توزک جہانگیری، انگریزی ترجمہ Beveridge و Rogers، لنڈن ۱۹۰۹ء، ۲: ۴۰۷ ببعد؛ (۴) E. Barnes: *Dhar and Mandu*، در *JBBRAS*، ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۳ء، ۲۱: ۳۳۹ تا ۳۹۱، بمواضع کثیرہ؛ (۵) J. Fergusson: *History of Indian and Eastern Architecture*، لنڈن ۱۹۱۰ء، ص ۵۳۱؛ (۶) G. Yazdani: *Mandū: the City of Joy*، آکسفرڈ ۱۹۲۹ء؛ (۷) امیر احمد علوی: شاہان مالوہ، لکھنؤ بدون تاریخ، ص ۱۴ تا ۱۷؛ نیز رک بہ دھار؛ مالوہ، مانڈو ۔

(بزمی انصاری)

* **دِلْتاوہ**: مرکزی عراق میں دیالا کی لوا میں واقع خالص کی "قضا" کا صدر مقام، جو ۴۴ درجے ۳۰ ثانیے مشرق، ۳۳ درجے ۵۰ ثانیے شمال میں واقع ہے ۔ اس شہر کی آبادی، جو تمام کی تمام مکین عراق عربوں پر مشتمل ہے اور جن میں شیعوں کی تعداد سنّیوں سے زیادہ ہے، ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں دس ہزار تھی ۔ پوری "قضا" کی آبادی ستّر ہزار تھی ۔ اس کے ماتحت جو دو "ناحیے" ہیں ان کے نام خان بنی سَعْد اور منصوریّہ (سابق دلی عبّاس) ہیں ۔ عراق علماء کے نزدیک دلتاوہ اپنے اصل نام دولت آباد کی بگڑی ہوئی صورت ہے ۔

مآخذ: (۱) عبدالرزّاق الحسنی: العراق قدیمًا و حدیثًا، صیدا (Sidon) ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء ۔

(S. H. LONGRIGG)

* **دُلْدُل**: نبی اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم کے خاکستری رنگ کے خچر کا نام، جو آپ کو مقوقس [رک بآں] نے بطور ہدیہ بھیجا تھا اور اسی کے ساتھ ایک گدھا بھی، جو یعفور یا عُفَیر کہلاتا تھا، ارسال کیا تھا ۔ دُلدُل نے آپؐ کے غزوات میں آپ کی سواری کا کام دیا ۔ یہ آپؐ کی وفات کے بعد بھی زندہ تھا اور یَنْبُوع میں اس قدر سن رسیدہ اور بے دندان ہو کر مرا کہ اُسے کھلانے کے لیے جَو اس کے مُنہ میں ڈالنا پڑتے تھے ۔ شیعی روایات کی رو سے جنگ جمل میں حضرت علیؓ اسی پر سوار تھے [رک بہ الجمل] اور صفّین میں بھی آپ نے اسی پر سواری کی تھی ۔ چونکہ عربی میں دُلدُل سیہہ یا خارپشت کو کہتے ہیں اس لیے ممکن ہے کہ یہ نام اس کی چال کی وجہ سے پڑ گیا ہو؛ لیکن یہ قیاس یقینی نہیں ۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم کے گھوڑوں کے ناموں کی بابت دیکھیے G. Levi Della Vida: *Les "livres des chevaux"*، لائڈن ۱۹۲۸ء، ص ۸، ۵۱؛ آپ کی اونٹنیوں، العَضباء اور القصواء، کے لیے دیکھیے الجاحظ: الحیوان، بمدد اشاریہ ۔

مآخذ: (۱) الجاحظ: البغال، طبع Pellat، قاہرہ

۱۹۵۵ء، ص ۱۰۲؛ (۲) محمد بن حبیب : المُحَبَّر، ص ۷۶؛ (۳) الطّبری، ۱ : ۱۷۸۳ء؛ (۴) المسعودی : مُرُوج، ۳ : ۳۱۷، ۳۵۶، ۳۶۹؛ (۵) ابن الاثیر، ۲ : ۲۳۸؛ (۶) النّووی، ص ۶۳؛ (۷) الدّمیری، بذیل مادّہ؛ (۸) تاج العروس، بذیل مادّہ؛ (۹) لسان العرب، بذیل مادّہ۔

(Cl. Huart و Ch. Pellat)

* **دِلْسِز** : ترکی میں بمعنی، بے زبان؛ سلاطین عثمانیہ کے محل کے اندر کام کرنے والے بہرے گونگے ملازموں کا نام، جنھوں نے کچھ عرصے کے لیے باب عالی میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ اسی مفہوم میں انھیں فارسی لفظ "بے زبان" سے بھی موسوم کرتے تھے۔ وہ محمد ثانی کے عہد سے سلطنت کے خاتمے تک محل میں موجود رہے۔ ان کی تعداد کے متعلق معلومات میں اختلاف ہے۔ بقول عطاء تین سے پانچ تک دلسز ہر ایوان (= قوغش) سے متعلق ہوتے تھے؛ Rycaut ان کی تعداد "تقریباً چالیس" بتاتا ہے۔ مصطفٰی ثانی (م ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء) کے وقت کی ایک دستاویز میں، جس کا حوالہ اوزون چارشیلی نے دیا ہے اور جو محل کے ملازمین میں کپڑے کی تقسیم سے متعلق ہے، لکھا ہے کہ ہر حرم سرا میں ایک "بے زبان"، شاہی خلوت خانے ("خاص اوطہ") میں دو "بے زبان" اور ایک بونا (جیجی)، ایوانِ خزانہ (خزینہ قوغش) میں اور ایک بے زبان سردار، ایک بونا سردار، چھے "بے زبان" اور دو بونے، ایوان لشکر کشی ("سِفرلی قوغش") میں ایک "بے زبان" سردار، ایک بونا سردار اور دس "بے زبان" ہوتے تھے۔

"بے زبانوں" کو تنخواہ اور پنشن ملتی تھی اور ان کی خاص وردیاں اور درباری لباس ہوتے تھے۔ ان کے سرداروں کو "باش دِلْسِز" (= بے زبان سردار) کہتے تھے، گو وہ پیدایشی گونگے بہرے ہوتے تھے، لیکن کہا جاتا تھا کہ عقل و فہم رکھتے تھے اور ان کی اشاروں پر مبنی ایک خاص جامع زبان تھی، جس کے ذریعے وہ آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے اور اپنے افسروں کے احکام وصول کرتے تھے۔ بقول Bon ان میں بہت سے لکھ سکتے تھے "اور وہ بھی سمجھ بوجھ کر اچھی طرح سے"۔ ان کے فرائض میں پاسبانی اور خدمت گزاری، نیز بہت ہی زیادہ خفیہ امور، بشمول سزاے قتل بھی، پیغام رسانی اور سفارت کے کام شامل تھے۔

مآخذ : (۱) تاریخ عطاء، ۱ : ۱۷۱ تا ۱۷۲؛ (۲) Robert Withers : *A description of the Grand Seignor's seraglio* (adapted from Ottaviano Bon, *Il serraglio del gransignore* (1608)), *Purchas his Pilgrims*، ج ۲/۲، لندن ۱۶۲۵ء (بار دیگر، گلاسگو ۱۹۰۵ء، ج ۹)، باب ۷ (نیز طبع J. Greaves، لندن ۱۶۵۰ء، ۱۶۵۳ء، ۱۷۳۷ء)؛ (۳) P. Rycaut : *History of the Present State of the Ottoman Empire*، بار چہارم، لندن ۱۶۷۵ء، باب ۸، ص ۶۱ تا ۶۲؛ (۴) D'Ohsson : *Tableau général de l'Empire othoman*، پیرس ۱۸۲۴ء، ۷ : ۴۵؛ (۵) Hammer-Purgstall : *Staatsverfassung*، ۲ : ۵۷؛ (۶) Gibb-Bowen، ۱/۱ : ۸۰؛ (۷) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی : عثمانلی دولتینن سارای تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۴۵ء، ص ۳۳۰؛ (۸) Pakalın، ۱ : ۴۳۶-۴۳۷۔ عثمانی دربار کے متعلق متعدد مغربی رودادوں میں ان گونگے بہروں کے حالات اور تصاویر ہیں۔

(B. Lewis)

* **الدُّلَفی** : تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کا ایک اہم قبیلہ، جس کی مقبوضہ اراضی ان کے ایک پورے ضلع پر مشتمل تھی، جو "الْاِیغارَیْن" (دو اقطاع) کہلاتا تھا اور الجبل میں نہاوند کے مشرق میں ھَمذان اور اصفہان کے درمیان واقع تھا۔ عیسٰی بن ادریس اس قبیلے کا بانی تھا، جس نے شاہراہوں پر لوٹ مار کر کے اتنی دولت جمع کر لی کہ آخرکار الکَرَج میں ایک مضبوط قلعہ بنا کر غارت گری چھوڑ دی۔ اسی قلعے کو اس کے فرزند

اور جانشین القاسم بن عیسٰی العِجلی نے، جو اَبُودُلَف کے نام سے معروف ہے، خانوادۂ دُلَفی کی اساس کے لیے استعمال کیا۔

اَبُودُلَف ایک شیعی اور بڑا تعلیم یافتہ آدمی، بسندیدہ شاعر، عظیم سپہ سالار اور لائق رہنما تھا۔ اس کا وقار اتنا تھا کہ اگرچہ اس نے علویوں کا پُرجوش طرف‌دار ہونے کے باعث المأمون کے خلاف فوج کشی بھی کی تھی لیکن المأمون نے اُسے معاف کر دیا اور اپنے درباریوں میں شامل کر لیا (رک بہ القاسم)۔ اپنی افواج کی مدد سے اس نے بابک الخُرّمی [رک بآں] (۲۲۲ھ/۸۳۶-۸۳۷ء) کی بغاوت کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس کے اخلاف نے، جو دُلَفی کہلائے، خلیفۂ وقت کے تحت اس کے طرف‌دار ہو کر خدمات انجام دیں اور خلافت کی بہت سی فوجی مہمات میں حصہ لے کر اس کے وفادار حمایتی ہونے کا ثبوت دیا۔ ابودُلَف اور اس کے پوتے احمد نے علی الترّتیب خلیفہ المعتصم اور المعتضد کے عہد میں بحیثیت سپہ سالار خاص طور پر نام پیدا کیا۔ ان کا خاندان تقریباً پورے طور پر خود مختار تھا اور کوئی ستّر سال فرمانروائی کرتا رہا؛ ان کو جاگیر دائمی طور پر عطا ہو گئی تھی اور دُلَفی ایک معیّن سالانہ خراج خلیفہ کو دیا کرتے تھے، نیز ان کے اوپر اور کوئی ٹیکس عائد نہ کیا جاتا تھا اور وہ سکّہ بھی اپنا ہی چلاتے تھے۔

دُلَفیوں کا دارالحکومت الکَرَج، کسی قدر بلندی پر بسایا گیا تھا اور ایک زرخیز علاقے کے وسط میں ایک اہم مقام پر واقع تھا، جس کی سالانہ پیداوار اکتیس لاکھ درہم کی قیمت کی ہوتی تھی۔ ابودُلَف نے شہر کو تقریباً دو فرسخ تک پھیلا دیا تھا اور اس میں پختہ اینٹوں کے اچھے بنے ہوئے مکانات تھے، دو منڈیاں تھیں اور متعدّد حمام تھے۔

۲۲۵ھ/۸۳۹-۸۴۰ء میں ابودُلَف کی وفات کے بعد اس کی اولاد اس ریاست پر حکمرانی کرتی رہی؛ شروع میں اس کا بیٹا عبدالعزیز تخت پر بیٹھا؛ جو ۲۵۲ھ/۸۶۶ء میں خلیفہ المعتضد کے تحت الرّے کا گورنر بھی رہا تھا (م ۲۶۰ھ/۸۷۳-۸۷۴ء)؛ پھر بہ تسلسل اس کے پوتے، دُلَف (م ۲۶۵ھ/۸۷۸-۸۷۹ء)، احمد (م ۲۸۰ھ/۸۹۳-۸۹۴ء)، عمر (م ۲۸۳ھ/۸۹۶-۸۹۷ء) اور الحارث المعروف بہ ابو لیلٰی تخت حکومت کے مالک ہوتے رہے۔ یہ سب خلیفۂ وقت کے وفادار رہے۔

الحارث ۲۸۴ھ/۸۹۷-۸۹۸ء کی لڑائی میں ایک حادثے کا شکار ہو کر مرا۔ المسعودی کے بیان کے مطابق، جس گھوڑے پر وہ سوار تھا اس کو گرا دیا گیا اور اس کی اپنی برہنہ تلوار، جو اس کے کندھے پر تھی، اس کے بدن میں گھس گئی جس سے کاری زخم لگا اور وہ مر گیا۔ اس کے مرنے کے ساتھ ہی دُلَفیوں کی حکومت اور ان کا خاندان دونوں ختم ہو گئے اور ان کی اراضی مرکزی حکومت کے قبضے میں چلی گئی۔

مآخذ: (۱) الطبری، ج ۳؛ (۲) المسعودی: مروج، بمدد اشاریہ، بذیل مادّہ؛ (۳) Schwarz: *Iran*، ۵: ۵۴۳ ببعد؛ (۴) Le Strange، ص ۱۹۷ تا ۱۹۸؛ (۵) ابن خلّکان، ترجمہ de Slane، ۲: ۵۰۲ تا ۵۰۷؛ (۶) Meynard: *Dictionnaire géographique*، ص ۴۷۸ تا ۴۷۹؛ (۷) یاقوت، ۲: ۸۳۲؛ (۸) ابن خُرّداذبہ، ص ۲۴۴؛ (۹) Zambaur، ص ۱۹۹، ۴۴؛ (۱۰) Ritter: *Die Geheimnisse der Wortkunst (Asrār al-Balāġa) des Abdulqāhir al-Curcānī*، در Bibl. Isl.، ۱۹۵۹ء، ۱۹: ۳۰ (حاشیہ)۔

(E. MARIN)

الدَّلْفِین: رک بہ نجوم۔

دَلّال: (عربی)، "کماشتہ"؛ دلّال کے لفظی معنی "رہنما" کے ہیں اور یہ "بیسار"، "سِنْسَل" کے لیے عربی کا عام لفظ ہے۔ تاج العروس میں "بِسْمار"

کے متعلق یہ لکھا ہے: ”یہ وہ شخص ہے جسے عام طور سے ”دلّال“ کہتے ہیں؛ یہ شخص خریدار کو بتاتا ہے کہ اس کی مطلوبہ چیزیں کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں اور بائع (بیچنے والے) کو بتاتا ہے کہ اچھے سے اچھے دام کس طرح وصول کیے جا سکتے ہیں“۔ عربی ماخذ سے دلالوں کی اصل کا بہت کم پتا چلتا ہے جو اقتصادی معاملات میں ہمیشہ سے بہت اہمیت رکھتے چلے آئے ہیں۔ دلّال بوزنطی کے μεσίτης کا ہم معنی تھا۔ چونکہ اس ضمن میں کوئی باقاعدہ مطالعہ نہیں ہوا اس لیے جو معلومات اِدھر اُدھر سے فراہم کی گئی ہیں انھیں یہاں بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ فقہ کی کتابیں دلّالوں کو بد دیانتی کے ان طریقوں سے محفوظ رہنے کی ہدایت کرتی ہیں جو کاروبار میں عام طور سے رائج ہیں (ابن الحاجّ: کتاب المدخل، ۳: ۵۷)۔ حقیقت یہ ہے کہ دلّال عموماً خریداروں سے وہ مال خریدنے کی سفارش کرتے تھے جسے وہ گھٹیا سمجھتے تھے اور ہمیشہ خریداروں کے مقابلے میں بیچنے والوں کی طرفداری کرتے تھے۔ ان کے پیشے کو ایک طرح کی سرکاری حیثیت حاصل ہوتی تھی اور اس پیشے کو ”دلالۃ“ کہتے تھے۔ الدلّال کا لفظ قدیم زمانے میں ایک لقب کی حیثیت سے استعمال ہوتا تھا (تاج العروس)۔ فاطمی خلفاء کے عہد میں بعض چیزیں صرف دلّالوں کے ذریعے فروخت ہو سکتی تھیں (المقدسی، ص ۲۱۳، س ۶)۔ دو فیصد رقم جو قدیم زمانے سے دستوری کے طور پر دلّالوں کو دی جاتی تھی اس پر مملوکوں کے عہد میں محصول عائد کر دیا گیا۔ اس طرح دلّال کا آدھا نفع اس سے چھن گیا، چنانچہ اس نے اپنا یہ نقصان گاہکوں کے سر ڈال دیا۔ دلّال کے اس عمل کے لیے ”نصف السَّمْسَرَۃ“ کی اصطلاح رائج ہو گئی (المقریزی: خطط، ۱: ۸۹، س ۵)۔ اس سے تقریباً ملتی جلتی رسم شمالی شام میں بھی موجود تھی (قب Sobernheim، در *Corpus Inscriptionum Arabicarum*، ج ۲، عدد ۵۵ اور وہ بیان جو C. H. Becker نے *Isl.*، ۱: ۱۰۰ میں دیا ہے)۔ بڑے بڑے سودے بحری دفاترِ محاصل میں طے پاتے تھے۔ وہاں دلّال اس موقع پر جب لین دین فرنگیوں سے ہوتا تھا مترجم کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ تجارتی معاہدوں میں واضح طور پر ان دلّالوں اور ترجمانوں کے معاوضے کی صراحت کر دی جاتی تھی (Amari: *Diplomi Arabi*، ص ۱۰۶، ۲۰۳)۔ اس قسم کے سودوں کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے دیکھیے Heyd: *Levantehandel*، ج ۱۔ مغربی بحیرۂ روم میں اس موضوع کی تفصیلات کے لیے de Mas Latrie: *Traités de paix et de commerce*، پیرس ۱۸۶۶ء، ص ۱۸۹، کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ آگے چل کر دلّالی کے معاملات کو مغرب نے اپنی اجارہ‌داری بنا لیا (قب Schaube: *Handelsgeschichte der romanischen Völker des Mittelmeergebietes*، ص ۱۶۷)۔

لیکن بلادِ مشرق میں لوگ صرف غیر ملکیوں سے تجارت کرتے وقت ہی نہیں بلکہ اپنے کاروبار میں بھی دلّال سے کام لیتے تھے (مثلاً دیکھیے عہدِ عثمانی میں دلّالی کے محاصل کے متعلق تفصیلات در B. Lewis: *Studies in the Ottoman Archives*، ۱، در *BSOAS*، ۱۹۵۴ء، ۱۶: ۴۹۵ ببعد)۔ علاوہ بریں دلّال اپنی ذاتی حیثیت میں بھی تجارت کرتے تھے، مثلاً وہ پرانے کپڑے بیچا کرتے تھے (*Description de l'Égypte État moderne*، ۱۸: ۲: ۳۲۱)۔ دلّال کا لفظ اس سوداگر کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا جو گدڑی بازار میں نیلامی کا کام انجام دیتا تھا اور اس سے بھی زیادہ اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا تھا جو چھوٹے چھوٹے سودوں میں دلّال کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ان دلّالوں کے طرزِ زندگی کی تفصیلات Lane نے اپنی کتاب *Manners and Customs of the modern Egyptians*، بار پنجم، ۲: ۱۳، میں بہت اچھی طرح بیان کی ہیں۔ عورتوں کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ وہ دلّالی کا کام کرتی

تھیں ۔ انھیں دلالہ کہتے تھے اور ان کی رسائی اونچے درجے کے حرموں تک تھی (Lane : کتاب مذکور، ١ : ٢٠٠، ٢٣٩، ٣٢٣)۔ لفظ دلال کے دوسرے مفاہیم کے لیے قب ڈوزی : تکملہ، بذیل مادہ ۔

٢۔ عہد اسلامی کے المغرب میں دلال خصوصیت کے ساتھ اس درمیانی شخص کو کہتے ہیں جو اجرت یا معاوضہ لے کر لوگوں کی ان چیزوں کو عام نیلام کے ذریعے بیچتا ہے جو وہ اس کے سپرد کر دیں۔ بڑے بڑے شہروں میں دلالوں کی ایک خاص برادری یا جماعت ہوتی ہے، جس کی نگرانی ایک "امین" کرتا ہے اور دلالوں سے ضامن ہونے کا وعدہ لیتا ہے ۔ ان لوگوں کا تعلق زیادہ‌تر ان چیزوں کی دلالی سے ہوتا تھا جو مختلف طرح کے کاریگر دوکانداروں کے ہاتھ بیچتے تھے، مثلاً جوتے، مقامی طور پر بنا ہوا کپڑا، قالین، زیور وغیرہ ۔ اس کے علاوہ صنعتی خام مال، جیسے کھالیں (خام یا دباغت شدہ)، اون (خام یا تاگا)، اور وہ اشیاء جو بڑی مقدار میں بکتی ہیں، مثلاً تیل، مکھن، شہد، مقامی صابون، حنا، انڈے، پھل اور سبزیاں، سواری اور بار برداری کے مویشی، گھر کا ساز و سامان، کتابیں اور پرانے کپڑے بھی ان کے کاروبار کی حد میں شامل ہوتے تھے ۔ فرانس کے زیر حمایت آنے سے قبل مراکش میں دلال غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کا کام بھی کرتے تھے ۔

یہ لفظ فارسی اور ترکی (تلّال) میں اور ترکی سے پھر کئی بلقانی زبانوں (جدید یونانی : tellâles) میں داخل ہو گیا ہے ۔ دلال (غرناطہ میں دلّیل) کے علاوہ ہسپانوی عربی میں لفظ سوّاق بھی استعمال ہوتا تھا ۔

المغرب میں آج کل دلال کا لفظ برّاح، بمعنی منادِ شہر اور "سمسار" (رک بآن) بمعنی تجارتی، ایجنٹ، سے بالکل مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ بڑے بڑے شہروں میں "دلالۃ" (مؤنث) کے معنی عورتوں کے لباس کی تجارت کرنے والی "عورت" کے ہیں، جو امیروں کے گھروں میں جا کر زنانہ ملبوسات، کپڑے اور زیورات بیچتی ہے؛ الجزائر میں اس کے یہی معنی ہیں ۔

مآخذ : (١) Le Tourneau : *Fès avant le protectorat*، ١٩٤٩، ص ٣٠٦ تا ٣٦٣؛ (٢) Kampffmeyer : *Texte aus Fes*، ص ٣٠؛ (٣) وہی مصنف : *Weitere Texte aus Fes und Tanger*، ص ٤١ ۔

(G. S. COLIN)

دلّی : رک بہ دھلی ۔

الدّلو : رک بہ نجوم ۔

دُلُوک : عرب مصنفین نے یہ نام اس مقام کو دیا ہے جو اناطولی اور شام کی سرحد پر، نہر کرزین کی بالائی وادی میں (کُرد طاغ) Anti-Taurus کے دامن میں عین تاب کے شمال مغرب میں واقع ہے ۔ زمانۂ قدیم میں اسے Doliche کہتے تھے جو ایک "سامی دیوتا کی، جس کا نام یونانی ـ رومی عہد میں Zeus Dolichenos ہو گیا، پرستش کی وجہ سے مشہور تھا ۔ یہاں جرمانقہ، نیکپولی اور زوغما جانے والے راستے باہم ملتے تھے ۔ اسے عیاض بن غانم نے فتح کر لیا تھا اور وہ ان قلعوں میں سے ایک تھا جو اسلام کے قدیم ترین ایام سے بوزنطیوں کے خلاف سرحد کی حفاظت کے کام آتے تھے (قب قصیدۂ عدی بن الرِّقاع، در یاقوت، ٢ : ٥٨٣، اور نولدیکہ کا ملاحظہ، در ZDMG، ٤٤ : ٧٠٠)؛ پہلے یہ جند قِنّسرین میں شامل تھا اور جب ھارون الرشید نے عواصم [رک بآں] کا ضلع بنایا تو اسے بھی اس میں شامل کر دیا گیا ۔ جب حمدانیوں اور بوزنطیوں کے درمیان سیف الدّولہ اور ابو فراس کے زمانے میں لڑائیاں ہوئیں تو دُلوک نے بھی ان میں حصہ لیا اور بوزنطیوں نے اسے ٣٥١ھ/٩٦٢ء میں فتح کیا (ابن الاثیر ٨ : ٤٠٤)، یعنی اسی سال جس میں ابو فراس [رک بآں] گرفتار ہوا تھا ۔ اس زمانے میں اس قلعے کو ایک اہم کاریز کے ذریعے پانی

پہنچایا جاتا تھا اور یہ میووں کے باغات سے گھرا ہوا تھا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں یہ (Tulupe کے نام سے) الرُّہا (Edessa) کے صوبے کے ایک اُسقف کی جائے قیام رہا اور بہت سے معرکے یہاں ہوئے۔ ۵۴۹ھ/ ۱۱۵۵ء میں جب نورالدین کی افواج نے عین تاب [رک بآں] کی فتح کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس پر دوبارہ قبضہ کیا تو دُلُوک کی حیثیت بہت گر چکی تھی، اس کا قلعہ کھنڈر ہو گیا تھا اور یہ ایک معمولی گاؤں سے زیادہ نہ رہا تھا۔

قدیم نام ابھی تک دُلُوک کُوئی Dülükköy کے نام میں محفوظ ہے، جو شام کی سرحد کے قریب ایک ترکی گاؤں ہے؛ نیز یہ تِل دُلُوک کے نام میں بھی موجود ہے، جو اس مقام کے جنوب میں واقع ہے اور جہاں اب ایک والی کی یادگار تعمیر کر دی گئی ہے۔

مآخذ: (۱) Fr. Cumont: *Études syriennes*، پیرس ۱۹۱۷ء، ص ۱۷۳ تا ۱۷۷؛ (۲) وہی مصنف: *Syria*، ۱، ۱۹۲۰ء: ۱۸۹؛ (۳) P. Merlat: *Jupiter Dolichenus*، پیرس ۱۹۶۰ء، ص ۱ تا ۵؛ (۴) R. Dussaud: *Topographie historique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۴۷۳؛ (۵) M. Canard: *Histoire de la dynastie des H'amdanides*، الجزائر ۱۹۵۱ء، ص ۲۲۲؛ (۶) Cl. Cahen: *La Syrie du nord à l'époque des Croisades*، پیرس ۱۹۴۰ء، بمدد اشاریہ، بالخصوص ص ۱۱۵، ۲۲۰؛ (۷) R. Grousset: *Histoire des Croisades*، ۳ جلدیں، پیرس ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶ء، بمدد اشاریہ؛ (۸) Le Strange: *Palestine*، ص ۳۸۶ تا ۳۸۷، ۴۳۸؛ (۹) البلاذری: فتوح، ص ۱۲۲؛ (۱۰) ابن خُرّدادبہ، ص ۹۷، ۹۸؛ (۱۱) قُدامہ، ص ۲۵۳؛ (۱۲) الیعقوبی، طبع Wiet، ص ۲۳۰؛ (۱۳) یاقوت، ۲: ۵۸۲، ۵۹۷؛ (۱۴) ابن الشِّحنہ: الدُّرّ المنتخب، ص ۲۲۳؛ (۱۵) ابن العدیم: تاریخ حلب، طبع S. Dahan، بمدد اشاریہ؛ (۱۶) ابن الاثیر، بمدد اشاریہ؛ (۱۷) ابن واصل: مُفرّج الکروب، طبع الشیّال، ۱: ۱۲۵؛ (۱۸) ابو شامہ: کتاب الروضتین، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۷۶ (طبع حلمی احمد، قاہرہ ۱۹۵۶ء، ۱/۱: ۱۹۲ تا ۱۹۳)۔

(D. SOURDEL)

* **دِلْوِینہ:** البانیا میں ایک سنجاق یے کا سابق صدر مقام؛ عہد عثمانیہ میں دِلْوِینہ (ترکی اور البانوی میں اسی طرح ہے؛ یونانی میں Δέλβινον، Delvinon) ولایت رومایلی کی ایک سنجاق تھی۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۷۷۰ فٹ اونچا اور بحر آئی اونین Ionian کے ساحل سے تقریباً ساڑھے دس میل دور ہے۔ اس میں صرف ایک ہی بازار ہے، جو زیتون، لیموں اور انار کے درختوں کے مابین واقع ہے۔ اس سے اوپر کسی قدیم، شاید بوزنطی قلعے کے کھنڈر چھائے ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۰ء سے پہلے یہاں کے باشندوں کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی، جن میں سے دو تہائی مسلمان اور بقیہ قدیم یونانی کلیسا کے پیرو عیسائی، نیز چند ایک (تقریباً ۴۰) یہودی تھے۔ ان کی گزر اوقات مویشیوں کی پرورش، ماہی گیری، زیتون کی کاشت اور خوردہ فروشی پر تھی۔ اپنی ہم نام سنجاق کے اس مرکزی شہر دلوینہ میں متعدد مساجد اور یونانی کلیسائے قدیم کے گرجا موجود ہیں۔ زمانۂ سابق میں ایسے اس آبادی کے حملوں کے خلاف اچھی طرح سے قلعہ بند کر دیا گیا تھا جو ترکانِ عثمانی کے زیر حکومت عموماً غیر مطمئن رہتی تھی۔

دِلوینہ، جو پہلے یونان کے قبضے میں تھا، ۱۹۱۳ء میں البانیا کی نو قائم شدہ ریاست کے اندر آ گیا؛ قب I. von Thallóczy: *Illyrisch-albanische Forschungen*، میونخ و لائپزگ ۱۹۱۶ء، ۱: ۳۶۰ (دلوینہ در ۱۸۷۸ء) و ۲: ۲۴۰ (البانیا کو دیا جانا)؛ Edith P. Stickney: *Southern Albania 1912-1923*، Stanford ۱۹۲۶ء، بمواضع کثیرہ۔

مآخذ: (۱) *Rumeli und Bosna geographisch beschrieben von Mustafa Ben Abdulla Hadschi*

Chalfa، مترجمہ J. Von Hammer، ویانا ۱۸۱۲ء، ص ۱۳۰ (جہاں دلوینہ کے غلط ہجے دیے ہیں)؛ (۲) M. F. Thielen : *Die europäische Türkey*، ویانا ۱۸۲۸ء، ص ۸۶ ببعد؛ (۳) Fr. Babinger، در Karl Baedeker : *Dalmation und die Adria* ، لائپزگ ۱۹۲۹ء، ص ۲۵۰: سیاحوں نے دلوینہ کی شاذ ہی کبھی سیاحت کی اور اس کا حال لکھا ، تاہم دیکھیے: (۴) W. Leake : *Travels in Northern Greece*، ج ۱، لندن ۱۸۳۵ء؛ نیز وہ اہم بیانات جو (۵) سامی : قاموس الاعلام، استانبول ۱۳۰۸ھ/ [۱۸۹۰ء]، ۳ : ۲۱۵۳، میں دلوینہ کے متعلق ۱۸۹۰ء تک کی مفصل معلومات کے ساتھ ملتے ہیں: سترھویں صدی عیسوی کے لیے اہم ترین ماخذ (۶) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ۸: ۶۶۸ ببعد، ہے: پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں البانیا کی آبادی نے عثمانیوں کی جو مخالفت کی تھی، اس کے لیے دیکھیے (۷) Fr. Babinger : *Das Ende der Arianiten*، در *SBBayr. Ak.*، Phil.-hist.Kl، ۱۹۶۰ء کراسہ ۴، ص ۱۹ ببعد و ماخذ، جو زیادہ تر مخطوطے ہیں؛ دلوینہ خاص کے لیے قب (۸) H. Louis : *Albanien. Eine Landeskunde*، شٹگرٹ ۱۹۲۷ء، ص ۹ ببعد، بالخصوص ۲۰۱؛ مزید رک بہ آرناودلق.

(Fr. Babinger)

* **دِلْہِیَّہ** : رک بہ ذُوالہِمّۃ.

* **دِلی** : ترکی میں اسم صفت، بمعنی سرپھرا، من چلا، شجاع، تندخو وغیرہ۔ سلطنت عثمانیہ میں دِلی گھڑ سواروں کا ایک گروہ تھا، جس کی تشکیل اصل میں بلقان (روم ایلی [رک بآں]) میں نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر یا دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی۔ اگرچہ بعد ازاں سرکاری طور پر ان کے حقیقی نام کو ترک کرکے انہیں "دلیل" (رہنما) کہنے لگے؛ تاہم عوام میں وہ زمانۂ حال تک بدستور اپنے اصل نام ہی سے پکارے جاتے تھے.

"دِلیوں" کی بھرتی کچھ تو ترکوں سے اور کچھ اقوام بلقان، مثلاً اہل بوسنہ ، کروٹ اور سرب سے کی جاتی تھی۔ شروع میں وہ سرحدی بیگوں اور روم ایلی کے (بیگلربیگی [رک بآں]) (بیاربای) کے ذاتی دستوں میں نجی حیثیت سے رکھے جاتے تھے اور اپنے غیر معمولی حوصلے اور تہور کی وجہ سے دِلی، یعنی سرپھرے، کہلاتے تھے۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ ان کے اوجاقوں (یعنی جمعیتوں) کے سرپرست خیال کیے جاتے تھے۔ ان کا قول "بازیلان گلیر باشہ" [= لکھا ہوا آتا ہے سر پر] تھا، یعنی جو قسمت میں لکھا ہے ہو کر رہے گا.

دِلی نیمچوں، مجوف ڈھالوں، نیزوں اور زین سے بندھے ہوئے گرزوں (بوز طوغان) سے مسلّح ہوتے تھے۔ وہ چرخ یا چیتے ایسے درندوں کی کھالوں کی بڑی بڑی ٹوپیاں پہنتے تھے، جن کے کناروں پر عقاب کے پر لگے ہوتے تھے۔ ان کی ڈھالیں بھی ایسے ہی پروں سے مزیّن ہوتی تھیں۔ ان کا لباس اور گھوڑوں کی باکھر، شیروں، چیتوں اور لومڑیوں کی کھال کی اور چست پاجامے ریچھوں یا بھیڑیوں کی کھال کے بنے ہوتے تھے، جن کا بالوں والا رخ سامنے رکھتے تھے۔ ان کے پنڈلیوں تک لانبے مہمیزدار جوتوں کے پنجے نوکدار ہوتے تھے اور ایڑی اونچی ہوتی تھی؛ انہیں سرحدلیق، یعنی سرحدی جوتے، کہتے تھے۔ ان کے گھوڑے طاقت اور قوت برداشت کے لیے مشہور تھے۔ وہ ان بیاربایوں یا بیگوں سے مقررہ تنخواہ پاتے تھے جن کی وہ ملازمت کرتے تھے۔ جلال زادہ مصطفٰی چلبی اپنی کتاب طبقات الممالک فی درجات المسالک میں سمندرہ کے بیگ یحیٰی پاشا زادہ بالی بے کے دلیوں کا ذکر مہاک Mohacz کی مہم کے سلسلے میں کرتا ہے اور ان کے لباس کا حال بیان کرتا ہے۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں یحیٰی پاشا زادہ بالی بے اور محمد بے اور بوسنہ کے سنجاق بای غازی خسرو کے

دلیوں کے لشکر بلقان میں مشہور تھے۔ خسرو بیگ کے پاس دیگر افواج کے علاوہ دس ہزار دلی تھے۔

دلیوں کی سوار فوج کی تنظیم بعد میں آناطولی میں پھیل گئی، جہاں دلی، وزیروں اور بیلربایوں کے خدم و حشم میں شمار ہوتے تھے۔ دلیوں کا لباس بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی میں تبدیل ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ نلکی نما لمبی ٹوپیاں، جو کوئی چوبیس انچ لمبی اور سیاہ قراقلی کی بنی ہوتی تھیں، پہنے نظر آتے تھے، ان کے ارد گرد پگڑی بندھی ہوتی تھی۔

پچاس سے ساٹھ تک دلیوں کا ایک فوجی دستہ بنتا تھا (ایک "بیرق"، یعنی جھنڈے تلے)۔ اس قسم کے چند دستوں کی قیادت "دلی باشی" کرتا تھا۔ نئے بھرتی ہونے والے جوان کو آغا [ترک بان] کے خدم و حشم میں شامل کر دیا جاتا تھا: اوجاق (= جمعیت) کے طور طریق سیکھ لینے اور اپنی قابلیت ثابت کرنے کے بعد وہ دین اور ملک کی خدمت کرنے اور لڑائی میں ثابت قدم رہنے کی قسم کھاتا تھا۔ اس تقریب کے اختتام پر، جس میں دعائیں بھی مانگی جاتی تھیں، اسے "آغا چراغی" (= آغا کا شاگرد) بنایا جاتا اور دلی کی کلاہ باقاعدہ طور پر اس کے سر پر رکھی جاتی تھی۔ اپنی قسم کو توڑ دینے، "اوجاق" کے قواعد پر پوری طرح عمل نہ کر سکنے یا میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ جانے والے دلی کو خارج کر دیا جاتا، اور اس سے کلاہ چھین لی جاتی تھی۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں بقول Rycaut ایک دلی کا روزینہ بارہ سے پندرہ آقچہ تک ہوتا تھا۔ Marsigli، جو کچھ بعد کا مصنف ہے، کہتا ہے کہ دلیوں کو صرف اس وقت تنخواہ ملتی تھی جب وہ لڑائی پر ہوتے تھے۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں دلیوں نے حکومت کی خوب خدمات انجام دیں، لیکن بعد میں دوسری فوجی جمعیتوں کی طرح ان میں بھی نظم و ضبط قائم نہ رہا۔ دلی جب اپنے سرپرست سے محروم ہو جاتے (یا تو اس والی کی برطرفی کی وجہ سے جس کے وہ ملازم تھے اور یا اپنی موقوفی کے نتیجے میں) تو اپنے لیے کسی نئے سرپرست کی تلاش میں مارے مارے پھرتے اور اس زمانے میں دیہاتوں پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ان کی تاختیں کوتاھیہ اور قونیہ کے علاقوں میں مرتکز ہو گئی تھیں۔ قوجہ باشی نام کا ایک "دلی باشی" ایک بہت بڑے گروہ کا سرخیل ہو گیا اواخر صدی میں وہ کوتاھیہ میں بہت بدنام تھا؛ ادھر ایک اور "دلی باشی" اسمٰعیل نے ۱۸۰۱ء میں قونیہ کے خطے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں (فوج کے) نظام جدید کے خلاف قونیہ میں جو بغاوت رونما ہوئی، اس میں اسمٰعیل نے باغیوں کی مدد کی اور قونیہ میں داخل ہو کر اس نے قاضی عبدالرحمٰن پاشا کو قید کر دیا، جو قونیہ کا والی مقرر ہوا تھا۔

دلیوں کا فتنہ و فساد بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر اور تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں انتہا کو پہنچ گیا اور وہ آناطولی کے لوگوں کے لیے سخت مصیبت کا باعث بن گئے۔ یہی وجہ تھی کہ وزیراعظم یوسف ضیا پاشا اپنی مصر کی مہم سے واپسی پر حلب میں یہ فیصلہ کرنے پر آمادہ ہو گیا کہ دلیوں کو دوبارہ منظم کیا جائے۔ اس نے ان میں سے بعض کو تو بغداد بھجوا دیا، لیکن ان میں سے جو اس کے خدم و حشم میں تھے، انھیں برخاست کرنے کے بجائے استانبول لے جا کر اسقودر کی چھاؤنی میں رکھ لیا۔ روم ایلی کے ترقہ بورو گرجی عثمان پاشا کے کثیر التعداد دلیوں کو بھی استانبول لایا گیا اور انھیں داؤد پاشا کی چھاؤنی میں ٹھیرایا گیا۔ بعد ازاں استانبول میں تمام دلیوں کو، جن کے دو سو دستے ("بیرق") تھے، بغداد بھیج دیا گیا۔

۱۸۲۹ء کی جنگ روس و ترکیہ کے بعد دو ہزار دلی، جن کی قیادت اٹھارہ دلی باشیوں اور ایک ھابطہ باشی (مسلح گروہ کا سرخیل) کے ہاتھ میں تھی، آناطولی میں داخل ہو گئے اور قونیہ کے خطّے میں جمع ہو کر انھوں نے پھر رہزنی اختیار کرنے کی کوشش کی : مگر سلطان محمود ثانی، جو اپنی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کر چکا تھا، ان کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ ان کے کچھ بقیّۃ السیف افراد مصر اور شام کی طرف بھاگ گئے : جو پیچھے رہ گئے اور جنھوں نے ملک میں بسنے کے احکام کی خلاف ورزی کی، انھیں قرمان کے والی اسد پاشا نے شکست دی ۔

(İ. H. UZUNÇARŞILI)

دِلی اُورمان : ایک ضلع کا تاریخی نام، جس کا بیشتر حصہ شمال مشرق بلغاریا اور بقیہ رومانیا میں ہے : لیکن یہ چونکہ اصطلاح عوامی ہے، اس لیے اس کے صحیح حدود نہیں بتائے جا سکتے ۔ اس کا اطلاق عموماً ایک مثلّث نما علاقے پر ہوتا ہے، جس کا نقطۂ راس تو شہر رُسْچُک ہے اور جس کے دونوں بازو دریاے ڈینوب اور رُسْچُک ۔ وارنہ ریلوے سے بنتے ہیں ۔ قاعدے کا خط قدرے غیر متعیّن ہے اور بحر اسود کے ساحل سے کسی قدر فاصلے پر چلا گیا ہے ۔ شمال مشرق میں دلی اورمان کی حد بندی دبروجہ سے اور جنوب میں توزلوک Tuzluk اور گِرلووو Gerlovo کے بلغاروی صوبوں سے ہوتی ہے ۔ دلی اورمان میں اہم ترین مقامات بلغاریا کے علاقے میں بال بونار Balbunar، کمانلار Kemanlar اور رازگراڈ Razgrad ہیں اور رومانیا میں اکادینلر Akkadinlar اور کُرت بونار Kurtbunar کے شہر ہیں ۔

دلی اورمان کا نام ترکی الاصل ہے اور اس کے معنی خودرو جنگل، قدیم جنگل کے سے ہیں ۔ یہ علاقہ واقعی کسی زمانے میں قدیم جنگل سے ڈھکا ہوا تھا، جس کے خاصے بڑے قطعے ابھی تک باقی ہیں ۔ جنگلوں کا ہونا اس ضلع کی وہ خصوصیت ہے جو اسے دبروجہ کے ، سطح اور بے شجر علاقے سے نمایاں طور پر متمیز کرتی ہے ۔

دریاے ڈینوب کے بائیں کنارے کا علاقہ بھی، جہاں افلاق (Wallachia) کے میدان میں دریاے آلوتہ Aluta اور ودِہ Vede کے دہانوں کے درمیان ضلع تلہاورمن Teleorman واقع ہے : اسی نام سے موسوم ہو چکا ہے (C. Jireček : *Einige Bemerkungen über die Überreste der petschenegen und Kumanen, sowie die Völkerschaften der sogenannten Gagauzi und Surguči im heutigen Bulgarien*، در *Sitzungsber d. K. böhmischen Gesellschaft der Wiss.*، *Philos.-gesch. Klasse*، ۱۸۸۹ء، ص ۱۱ ۔ بقول Jireček اس نام کا اطلاق پہلے اس تمام پہاڑی جنگل والے علاقے پر ہوتا تھا جو جنوبی مالدیویا Maldavia اور مشرقی افلاق میں کوہستان کارپیتھین Carpathians کے سامنے پھیلا ہوا ہے ۔ Tomaschek لکھتا ہے کہ بارھویں صدی کے ایک بوزنطی مصنف John Kinnamos کے ہاں ایک مقام کا بگڑا ہوا نام ملتا ہے، جو یہی تلہاورمن ہے ۔ اگر اس کی رائے درست ہے تو پھر دلی اورمان عثمانی ترکوں سے پہلے کا نام ہوگا، جو شمالی ترکوں کی کسی قدیم تر نقل مکانی کے ذریعے آیا ہے ۔

دلی اورمان میں صرف ایک نسل پہلے تک ترکوں کی آبادی کا غلبہ تھا، لیکن انیسویں صدی کے وسط سے بلغاریا کے آبادکار بتدریج بڑھتے جا رہے ہیں ۔ باایں ہمہ ترک اب بھی آبادی کا ایک قابل اعتنا حصہ ہیں، چنانچہ ترکی زبان ہر جگہ سننے میں آتی ہے اور یہی حال توزلوک اور گرلووو صوبوں کا ہے جو اس کے متصل جنوب میں ہیں ۔

دلی اورمان عہد عثمانی میں ہر قسم کے سیاسی اور مذہبی پناہ گزینوں کا ملجا تھا ، لہٰذا اس میں ابھی تک طرح طرح کے فر[illegible] پائے جاتے ہیں ۔ یہی جگہ تھی

جہاں سے شیخ بدرالدّین نے ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا (F. Babinger: *Schejch Bedr ed-Din, der Sohn des Richters von Simāw*، در *Isl.*، ج ۱۱، ۱۹۲۱ء، ص ۹۰)۔ کئی ادوار میں مختلف تعلیمات نے، جو عام طور پر شیعیت سے متاثر تھیں، یہاں پناہ لی ہے۔ دلی اورمان میں (حضرت) علی رضکے پیروؤں کے خاصے بڑے باقی ماندہ گروہ آج تک موجود ہیں، جو یہاں علوی یا قزلباش کہلاتے ہیں۔ بظاہر ان کا صدر مقام کمانلر (کمال کی جمع، جس میں دونوں لاموں کی آوازوں کو ایک خاص طریقے پر مختلف کر دیا گیا ہے) کا چھوٹا سا شہر تھا، جس کے قرب و جوار میں بکتاشی ولی دمیر بابا کی مشہور، مگر اب غیرآباد خانقاہ ہے (F. Babinger: *Das Bektaschi-Kloster Demir Baba*، در *MSOS As.*، ج ۳۴، ۱۹۳۱ء؛ Babinger میری توجہ اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۵: ۵۷۹ کی طرف مبذول کراتا ہے جہاں ایک جگہ دمیر بابا کو حاجی بکتاش کا مرید بتایا گیا ہے)۔ شمن Shumen واقع شمال مشرق بلغاریا کے بکتاشی شاعر دردلی کاتب گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کی اس خانقاہ کی تعریف میں ایک چھوٹی سی نظم "نفس" ہے (سعدالدّین نزہت: بکتاشی شاعرلری، استانبول ۱۹۳۰ء، ص ۵۵ ببعد)۔

شہر کی ایک نمایاں خصوصیت پہلوانوں کی کشتیاں ہیں جو بظاہر بکتاش ولیوں کی پرستش سے متعلق ہیں اور دلی اورمان کی ترکی آبادی کی دل پسند تفریح کا سامان ہیں۔ یہ علاقہ جس کے متعلق تحقیق و تفتیش بہت کم ہوئی ہے، بلاشبہ نہ صرف ترکوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بلکہ اسلامیات کے طلبہ کے لیے بھی تحقیق کا بہت دلچسپ میدان ہے۔

مآخذ: متن میں مندرجہ حوالوں کے علاوہ (۱) F. Kanitz: *Donau-Bulgarien und der Balkan*، ج ۳، لائپزگ ۱۸۸۹ء (پورے اشاریوں کے ساتھ)؛ (۲) C. Jireček: *Das Fürstenthum Bulgarien*، پراگ۔ ویانا۔ لائپزگ ۱۸۹۱ء (اشاریہ جات)؛ (۳) W. Stubenrauch: *Kulturgeographie des Deli Orman*، در *Berliner Geographische Arbeiten*، ج ۳، ۱۹۳۳ء (مکمل حوالوں کے ساتھ)۔ آبادی کے مسئلے پر: (۴) L. Miletič: *Staroto bălgarsko naselenije v severoiztočna Bălgarija*، صوفیہ ۱۹۰۲ء؛ (۵) S.S. Bobčev: *Turci i za Kizilbašite Zadeliormanskitě*، در *Sbornik na Bălgarskata Akademija na Naukitě*، ج ۲۴، ۱۹۲۹ء۔ زبان کے مسئلے پر: (۶) D. G. Gadžanov، دو مختصر تبصرے، در *Anzeiger der philos.-hist. Kl. d. k. Akad. d. Wiss. in Wien*، سال ۱۹۱۱ء، عدد ۵ و سال ۱۹۱۲ء، عدد ۳؛ (۷) T. Kowalski: *Compte rendu de l'excursion dialectologique en Dobroudja, faite du 10 septembre au 1er octobre 1937*، در *Bull. Intern. Acad. Polon. Philolog.*، ۱۹۳۸ء، ۱/۳: ۷ تا ۱۰؛ (۸) وہی مصنف: *Les éléments ethniques turcs de la Dobroudja*، در *RO*، ج ۱۶، ۱۹۵۰ء، ص ۶۶ تا ۸۰؛ (۹) J. Eckmann: *Razgrad Türk ağzı*، *Türk Dili ve Edebiyatı hakkında araştırmalar*، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۱ تا ۵۲؛ (۱۰) P. Wittek: *Les Gagaouzes — Les gens de Kaykaus*، در *RO*، ج ۱۷، ۱۹۵۳ء، ص ۱۲ تا ۲۴؛ (۱۱) J. Németh: *Zur Einteilung der türkischen Mundarten Bulgariens*، صوفیہ ۱۹۵۶ء؛ (۱۲) A. Caferoğlu: *Die anatolische und rumelische Dialekte*، در *Philologiae Turcicae Fundamenta*، ج ۱، ۱۹۵۹ء، ص ۲۳۹ تا ۲۶۰؛ (۱۳) G. Doerfer: *Das Gagausische*، کتاب مذکور، ص ۲۶۰ تا ۲۷۱؛ (۱۴) I. Donat اور I. Conea: *Contribution à l'étude de la toponymie pétchénègue-comane de la Plaine Roumaine du Bas-Danube*، در *Contributions*

Onomastiques؛ بخارسٹ ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۹ تا ۱۶۲ . J. Reychmann - T. Kowalski) اور (A. Zajaczkowski

* **دلیل** : رک بہ قیاس .

* **دُلَیم** : عراق کا ایک بڑا سنّی قبیلہ جو دریاے فرات پر فلوجہ کے بالکل نیچے سے لے کر القائم تک آباد ہے ۔ ان لوگوں کا دعوٰی ہے کہ پانچ صدی پہلے ان کے آبا و اجداد کا اصلی وطن دُلیمیّات تھا، جو نجد کے علاقے میں تھا، لیکن یہ محض اساطیری خیال ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قبیلہ مخلوط قبیلوں کے بہت سے مختلف حصوں اور بے قبیلہ کاشتکاروں کا ایک مجموعہ ہے؛ اس کے کچھ افراد الجزیرۃ میں خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں اور دریا کی طرف فقط اپریل سے ستمبر تک رہنے کے لیے آتے ہیں ۔ ان کی بڑی اکثریت عراق کسانوں کے غریبانہ معیار زندگی کے مطابق زمین کاشت کر کے زندگی بسر کرتی ہے ۔ یہ لوگ فرات سے پانی بھر بھر کر زمین کی آبیاری کرتے ہیں یا پھر اس سے جاری کی ہوئی نہروں سے (جن میں سے صقلاویّہ سب سے مشہور ہے) آبپاشی کرتے ہیں اور اپنی بھیڑوں اور اونٹوں کے ریوڑ اپنے ہی قبیلے کی شاخوں کے چرواہوں کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ یہ گروہ، ویشیوں کی برداخت کے ماہر ہوتے ہیں، عانہ، راوہ، حدیثہ اور فلُّوجہ کی آبادیوں میں ایک جگہ بسنے والے دیلم کے بعض عناصر بھی شامل ہیں ۔ دُلیم قبیلہ خود بہت سے حصوں اور شاخوں میں بٹا ہوا ہے جن کے باہمی روابط کا دار و مدار ان کے سربرآوردہ شیوخ کی شخصیت اور ان کے آپس کے میل ملاپ پر ہے ۔ دُلیم قبیلے کے بہت سے افراد اس تیل کمپنی میں کام کرتے ہیں جس کے تیل کے نل ان کے علاقے سے، حدیثہ کے قرب و جوار میں سے ہو کر گزرتے ہیں اور کچھ ہیت کے زفت (bitumen) کے مخازن میں کام سے لگے ہوے ہیں ۔ اس قبیلے کا الجزیرۃ کے شمّر سے پرانا عناد اور صحرائے شام کے عنزہ سے قدیم دوستانہ روایۃً مشہور چلا آتا ہے؛ تاہم قبائلی فساد ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء سے بہت کم اور شاذ و نادر ہی ہوا ہے اور دُلیم اپنے دو یا زیادہ نامور شیوخ کی سعی مشکور کی بدولت (بالخصوص علی سلیمانی)، عراق کے بڑے بڑے قبیلوں کے بہتر اور خوش اطوار قبائل میں سے ایک ہے ۔ ترکوں کے عہد میں بغداد تا حلب کی شاہراہ میں مسافروں پر ان کی جبرہ دستیوں کی وجہ سے حکومت کو کچھ تعزیری اقدامات کرنا پڑے؛ بالخصوص ۱۹۱۰ء میں ناظم پاشا کی جانب سے، اور اسی وجہ سے فوجی چوکیوں کا اور خانات (سراؤں) کا ایک سلسلہ بارھویں صدی ھجری/انیسویں صدی عیسوی میں قائم کیا گیا ۔ اس قبیلے کے علاقے پر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کا اقتدار قائم ہوا اور ۱۹۲۰ء کے پریشان کن سال میں جو باغیانہ تحریک اُٹھی وہ اس قبیلے کے صرف ایک حصے تک ہی محدود رہی، اس وقت سے مستقل آبادکاری اور خوش حالی میں ترقی ہوئی ہے .

عراق کے "دلیم لواء" (صوبے) کا نام اسی قبیلے کے نام پر رکھا گیا ہے (اس کی آبادی ۱۹۴۷ء میں ۱۹۳۰۰۰ تھی)، جس میں عانہ، فلوجہ اور رمادی کے "قضاء" شامل ہیں اور رمادی اس کا صدر مقام ہے .

(S. H. Longrigg)

* **دَمَاوَنْد** : شمالی ایران کے سرحدی پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹی [دیکھیے البرز] جو ۳۶ درجے عرض بلد شمالی سے کسی قدر نیچے کی طرف اور تہران سے تقریباً پچاس میل شمال مشرق کی جانب واقع ہے ۔ ڈی مارگن de Morgan کے بیان کے مطابق یہ پہاڑ رہنہ Rehna کی سطح مرتفع سے اُٹھتا ہے اور ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی تک چلا جاتا ہے ۔ اس کی بلندی کے متعلق لوگوں کے اندازے الگ الگ ہیں ۔ ٹامسن Thomson کے نزدیک اس کی بلندی ۲۱۰۰۰ فٹ ہے (جو یقیناً حد سے زیادہ ہے)، ڈی مارگن کا اندازہ ۲۰۲۶۰ فٹ ہے ۔ ہوتم شنڈلر Houtum Schindler کے اندازے کے مطابق یہ بلندی ۱۹۶۴۶ فٹ ہے ۔ سون ہیڈن

Sven Hedin کا قیاس ۱۸۱۸۷ فٹ ھے اور Stieler کی *Handatlas* (۱۹۱۰ء) کے سب سے آخری اڈیشن میں اس کی بلندی ۱۸۸۳۰ فٹ بتائی گئی ھے۔ اس کی چوٹی جو ھمیشہ برف سے ڈھکی اور تقریباً ھر وقت بادلوں میں گھری رھتی ھے، کئی دن کی مسافت کے فاصلے سے نظر آتی ھے، جیسا کہ یاقوت نے اپنے مشاھدے کی رُو سے لکھا ھے۔ صاف موسم میں جب مطلع روشن ھو تو ملگونوف Melgunof کے بیان کے مطابق یہ بحرخزر سے بھی نظر آتی ھے، جو اس سے ۲۶۰ ورسٹ versts (۱۶۲ میل) سے زیادہ فاصلے پر ھے۔ اس سلسلے میں قزوینی کے بیانات مبالغہ آمیز ھیں لیکن یہ بات یقینی ھے کہ دَماوَنْد کی اُونچی چوٹیوں کا سلسلہ مازندران (زمانۂ وسطٰی کا طبرستان) کی تمام ساحلی زمینوں پر چھایا ھوا ھے۔

ایران کی قدیم تاریخ میں دماوند پیش دادی اور کیانی حکمرانوں کی افسانوی تاریخ کے ساتھ منسلک ھے۔ آج تک بھی مازندران کے لوگ ان مقامات کی نشاندھی کرتے ھیں جہاں جمشید، فریدون، سام، زال، رستم اور دوسرے مشہور سورماؤں نے، جنھیں شاھنامہ نے جاودانی بنا دیا ھے، اپنے حیرت انگیز کارنامے دکھائے۔ دماوند ھی کو مشہور افسانوی طائر سیمرغ کا مسکن بتایا گیا ھے۔ زمانۂ قدیم ھی سے ظالم بادشاہ ضحّاک (قدیم ایرانی میں دھاکا۔ نیز بیوراسپ) کا قید خانہ بھی یہیں بتایا جاتا ھے۔ روایات میں موجود ھے کہ فریدون (قدیم ایرانی میں Qraetaona) نے ضحاک کو اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار میں بند کر دیا تھا۔ مقامی عوام کا اعتقاد ھے کہ وہ ظالم بادشاہ آج تک زندہ ھے اور اس غار میں رھتا ھے۔ اس پہاڑ کے اندر سے کبھی کبھی جو بھاری آوازیں سنائی دیتی ھیں، ان کے خیال میں وہ اسی کے کراھنے کی آوازیں ھیں اور وہ بخارات اور دھواں جو پہاڑ کی سطح کی درزوں اور چشموں سے نکلتا دکھائی دیتا ھے اس کے سانس ھیں۔ ظاھر ھے کہ یہ افواھیں دماوند کی آتش فشانی خصوصیتوں کی بنا پر عام ھوئی ھیں۔ ایک اور کہانی میں ھے کہ صَخْر نامی دیو بھی، جسے سلیمان علیہ السلام نے قید کیا تھا، کوہ دماوند میں بند ھے۔ چونکہ ایران میں دماوند ھی سب سے اونچا پہاڑ ھے اس لیے ایرانیوں کا خیال ھے کہ سفینۂ نوح طوفان کے بعد یہاں آ کر ٹھیرا تھا۔ دماوند سے متعلق بے شمار افسانوں کے سلسلے میں دیکھیے یاقوت، ۲: ۶۰۶، ۶۱۰؛ قزوینی؛ Melgunof، ص ۲۲ ببعد؛ Grünbaum در *ZDMG*، ۳۱: ۲۳۸ تا ۲۳۹۔

اس سے پہلے دماوند کی ڈھلانوں پر اور اس کی وادی میں بہت سے مستحکم اور قلعہ بند مقامات تھے۔ آج کل سب سے اھم مقام ایک چھوٹا سا قصبہ ھے جسے اس پہاڑ کے نام پر دماوند کہتے ھیں۔ یہ قصبہ پہاڑ کی جنوب مغربی سمت میں بڑھی ھوئی شاخوں پر واقع ھے۔

دماوند کا نام فارسی اور عربی ماخذ میں مختلف شکلوں میں آتا ھے۔ فارسی میں دُنباوند (Vullers: Lex. Persico-Lat.، ۱: ۹۰۷ ب)۔ دماوند (کتاب مذکور ۹۰۷ ب)، دِیماوند (وھی کتاب ۹۵۵ ب) اور دِیووند (کتاب مذکور، ۹۵۶ ب)؛ عربی میں دُنباوند، دُباوند، دُماوند۔ اس نام کی قدیم ترین شکل دُنباوند معلوم ھوتی ھے اور آج کل کی معمولی بول چال میں دَماوَنْد (دِماوِنْد) مستعمل ھے۔ اس نام کے لکھنے کے مختلف طریقوں کے متعلق دیکھیے Quatremère : *Hist. des Mongols*، ص ۲۰۰ ببعد۔ ابوالفداء، طبع Fleischer، *Hist. Ante-islamica*، لائپزگ ۱۸۳۱ء، ص ۲۱۳ ببعد، ۲۲۲؛ H. Hübschmann : *Armenische Grammatik*، لائپزگ ۱۸۹۷ء، ص ۱۲۷۔

مآخذ : (۱) *BGA*، بمواضع کثیرہ؛ (۲) یاقوت، ۲: ۵۴۴، ۵۸۵، ۶۰۶ ببعد؛ (۳) القزوینی: *Kosmographie*، طبع وُسْٹنفلٹ، ۱: ۸۲، ۱۵۸ ببعد، ۱۹۸؛ (۴) مراصد الاطلاع، طبع Juynboll، ۱: ۳۸۸، ۴۰۸؛ ج ۵: ۴۲۹، ۴۴۲، ۴۸۳؛ (۵) Quatremère : *Hist. des Mongols*،

ص ۱۰۰ ببعد؛ (۶) Le Strange، ص ۳۷۱؛ (۷) K. Ritter: Erdkunde، ۸ : ۱۱، ۵۰۲ تا ۵۰۵، ۵۵۰ تا ۵۵۷؛ (۸) Fr. Spiegel : Eranische Altertumskunde، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ۱ : ۷۰؛ (۹) W. Ouseley : Travels in var. countries of the East، لنڈن ۱۸۱۹ء ببعد، ۳ : ۳۲۶ تا ۳۳۰؛ (۱۰) W. Taylor Thomson در JRGeog. S، ج ۱۸، ۱۸۴۸ء، ص ۱۰۹ ببعد؛ (۱۱) Hommaire de Hell : Voy. en Turquie et en Perse، پیرس ۱۸۵۵ء ببعد، جس کے ساتھ Historical Atlas لگی ہوئی ہے، لوحہ ۱۷، ۱۹ الف؛ (۱۲) Th. Kotschy در Petermann's Geogr. Mitteil.، ۱۸۵۹ء، ص ۹۳ ببعد؛ (۱۳) J. E. Polak : Persien، لائپزگ ۱۸۶۵ء، ۱ : ۳۱۲، ۳۱۵، ۳۲۹؛ ج ۲ : ۱۷۳، ۱۷۸، ۲۹۹؛ (۱۴) G. Melgunof : Das südl. Ufer des Kasp. Meeres، لائپزگ ۱۸۶۸ء، ص ۲۱ تا ۲۷، ۵۳، ۱۳۹، ۱۸۳؛ (۱۵) F. v. Call-Rosenberg : Das Lärthal bei Teheran u. der Demāwend در Mitteil. der Geog. Ges. in Wien، N.F.، ج ۹، ۱۸۷۶ء، ص ۱۰۲ تا ۱۳۳؛ (۱۶) G. Napier کا بیان در Alpine Journal، ۱۸۷۷ء، ص ۲۶۲ تا ۲۶۵؛ اور در Petermann's Geogr. Mitteil، ۱۸۷۷ء، ص ۳۲۳؛ (۱۷) Tietze : Der Vulkan Demāwend in Persien در Jahrb. der k. k. geolog. Reichsanst، وی آنا ۱۸۷۸ء، ج ۲۸؛ (۱۸) de Morgan : Mission scientif. en Perse، Étud. géograph، ج ۱، پیرس ۱۸۹۴ء، ص ۱۰۵، ۱۲۰ تا ۱۳۶، مع مناظر برجستہ؛ (۱۹) Sven Hedin : Der Demāwend در Verh. der Ges. f. Erdkunde (برلن)، ۱۹ : ۳۰۴ تا ۳۲۲؛ (۲۰) Sarre در ZG Erdk. Berl.، ۱۹۰۲ء، ص ۱۰۰ ببعد؛ (۲۱) مسعود میہان : جغرافیائی مفصّل ایران، تہران ۱۳۱۱ھ/ ۱۹۳۲ء، اشاریہ بہ ذیل مادّہ؛ (۲۲) فردوسی : شاہنامہ، طبع اور ترجمہ J. Mohl، ۱۸۳۸ء، ج ۷، اشاریہ بہ ذیل مادّۂ دماوند، ضحاک؛ (۲۳) H. Massé : Croyances et coutumes persanes، اشاریہ، ج ۲، بہ ذیل مادّۂ دماوند.

(M. Streck)

دیمتوقہ : رک بہ دیمتوقہ.

اَلدَّمُرداشی : [=الدمورطاشی]، احمد، بارھویں صدی ہجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کا ایک مصری مؤرخ - اس کی زندگی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ وہ قاہرہ میں دستۂ (رجمنٹ) عَزَبان میں کتخدا کے عہدے پر مامور تھا - ہو سکتا ہے کہ وہ روزنامچی حسن اِفندی الدمرداشی کا رشتے دار ہو، جو گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے اوائل میں مشہور ہوا اور جس کے کارناموں کا اسے پورا علم تھا - اس کی تاریخی تصنیف الدرۃ المصانۃ فی اخبار الکنانۃ، ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء تا ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء کے احوال پر مشتمل ہے - اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ عربی نہیں جانتا تھا اس لیے کہ اس کی عبارتوں کا مطلب کہیں تو اُلجھ جاتا ہے اور کہیں مبہم ہو جاتا ہے - اس کے باوجود کتاب اوّل تو اس لیے قابل قدر ہے کہ اس میں قاہرہ کے حالات کا مفصل بیان موجود ہے اور دوسرے اس لیے کہ ترکی عہد کے مصر کے حالات پر یہ واحد کتاب ہے جو ایک اعلٰی فوجی افسر نے لکھی ہے؛ برٹش میوزیم اور بوڈلین کے مخطوطات وقفات اور عبارات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں - برٹش میوزیم کا مخطوطہ اس لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں مصنف کا نام درج ہے - الدرۃ کا کوئی نسخہ الجبرتی کی عجائب الآثار کا ماخذ معلوم ہوتا ہے؛ مثلاً ذوالفقاریہ اور قاسمیہ فرقوں کی ابتدا کی دوسری کہانی جو الجبرتی کی کتاب میں دی ہے وہ اور گیارھویں صدی ہجری کے اوائل کے سنجاق بیگوں Sandjakbegs کی جو فہرست اس میں دی گئی ہے الدرۃ سے بہت قریبی مشابہت رکھتی ہے (الجبرتی : ۱ : ۲۳ - ۲۴؛ BM. Or، عدد ۱۰۷۳، ورق ۵ الف تا ۶ ب؛ مخطوطۂ بوڈلین، Bruce، عدد ۴۳، ورق

۲ الف تا (۳ الف)۔

(P. M. Holt)

* **دِمَشْق** : دِمَشْق الشّام یا محض الشّام (لاطینی: Damascus، فرانسیسی : Damas)، شام کا سب سے بڑا شہر [اور الجمہوریۃ العربیۃ السّوریۃ کا دارالحکومت]، جو ۳۶ درجے ۱۸ دقیقے طول بلد مشرقی اور ۳۳ درجے ۳۰ دقیقے عرض بلد شمالی کے درمیان واقع ہے، یعنی قریب قریب اُسی عرض بلد پر جس پر بغداد اور فاس ہیں۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً سات سو میٹر بلند، صحرا کی حد پر اور لبنان شرقیہ کے سلسلۂ کوہ کی ایک مشرقی پہاڑی جَبَل قاسیُون کے دامن میں آباد ہے؛ مشرق اور شمال مشرق میں دریاے فرات تک ایک نیم صحرائی میدان پھیلا ہوا ہے، جو جنوب کی جانب عرب میں مدغم ہو جاتا ہے۔

شہر بحیرۂ روم سے کم و بیش ایک سو کیلومیٹر کے فاصلے پر جبل لبنان و جبل شرقی (لبنان) کے عقب میں ہے۔ یہ پہاڑ دہری سد کا کام دیتے ہیں اور تین ہزار میٹر تک بلند ہیں، لہٰذا سمندر کی ہوائیں اور بادل اس تک نہیں پہنچتے۔ ابتداءً یہی گمان گزرتا ہے کہ اس کا تعلق صحرا سے ہوگا۔ اس کے موسموں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ موسم سرما بہت مختصر ہوتا ہے، جس کے دوران میں کبھی کبھار برف پڑ جاتی ہے۔ بارش دسمبر، جنوری اور فروری کے مہینوں میں ہوتی ہے، جن میں سے مؤخرالذکر مہینہ بالخصوص مرطوب ہے؛ لیکن یہاں کی بارشوں کو کسی طرح بھی وافر نہیں کہا جا سکتا (حقیقت یہ ہے کہ یہاں اڑھائی سو سے تین سو ملی میٹر تک بارش ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں بیروت [رک بآں] میں ۸۵۰ سے ۹۲۰ ملی میٹر تک)۔ موسم بہار مختصر ہوتا ہے، دفعۃً آتا ہے اور اواخر مارچ اور اوائل اپریل میں محض چند ہفتوں تک رہتا ہے۔ اس کے بعد شدید گرمی آ جاتی ہے۔ مئی سے نومبر تک موسم قطعاً خشک رہتا ہے۔ روزانہ درجۂ حرارت سائے میں ۳۵ درجے سنٹی گریڈ سے بڑھ جاتا ہے۔ آنکھیں چندھیا دینے والی روشنی آدمی کو سائے کی تلاش پر مجبور کر دیتی ہے۔ نومبر کے آخر میں پہلی موسلا دھار بارش پتوں پر جمی ہوئی ریت دھو ڈالتی ہے۔ یہ یہاں کا موسم خزاں ہے، مگر اس نیم صحرائی قسم کی آب و ہوا میں خلاف توقع نباتات خاصی افراط سے ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اتنے عرصے تک ہوتی ہیں کہ جانوروں اور انسانوں کی ضرورت پوری ہو جائے۔ یہ وہ قطعہ ہے جہاں اس علاقے کا واحد دائمی چشمہ بَرَدی [رک بآں] پہاڑ کے پہلو سے نکل کر، صحرا میں جذب ہو جانے سے پیشتر، میدان میں داخل ہوتا ہے۔ اس چشمے کے پانی کو کام میں لانے کے لیے بڑی ذہانت سے آبپاشی کا ایک مصنوعی نظام تیار کیا گیا ہے۔ اس طرح اپنی ضروریات کے لیے ایک موزوں گوشۂ زمین گویا صحرا سے لے لیا گیا ہے؛ یہی نہیں بلکہ اسے ایشیا کے اس حصے کا زرخیزترین علاقہ الغُوطة [رک بآں] بنا دیا گیا ہے، جسے مسلمانوں کی روایات میں تین ارضی بہشتوں میں شمار کیا جاتا ہے (دوسری دو بہشتیں سمرقند اور الأُبُلّة بتائی جاتی ہیں، ابن عساکر : تاریخ، ص ۱۹۹)۔ یہی وجہ ہے کہ صحرا اور پہاڑوں کے درمیان اس کے محل وقوع، زمین کی زرخیزی اور پانی کی فراوانی کے باعث انسانی آبادی ایسے وسیع پیمانے پر یہاں کی پیداوار سے بہرہ ور ہوئی کہ ابتداے تاریخ سے لے کر اب تک اسے صدر مقام کا درجہ حاصل رہا ہے۔

شہر اور سمندر کے درمیان وسائل حمل و نقل کی دقتوں کی وجہ سے اہل دمشق کو اندرون ملک کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مغربی پہاڑوں کی بدولت محفوظ ہونے، پانی کی بہترین بہم رسانی اور شام میں سے شمالاً جنوباً گزرنے والی شاہراہ کے کنارے ایک زرخیز نخلستان کے وسط میں واقع ہونے کی بنا پر یہ شہر بدویوں کے لیے منڈی اور فرات سے نیل تک سفر کرنے والے قافلوں کے لیے پڑاؤ کا کام دیتا رہا۔ لوگوں کی لگاتار آمد و رفت

اور سامان کی مسلسل درآمد و برآمد کی وجہ سے یہاں کی چہل پہل کسی بڑی بحری بندرگاہ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ صحرا کے بالمقابل واقع ہونے کے باعث اس پر کئی بار حملے ہوے لیکن بمکمل طور پر تباہ و برباد کبھی نہیں ہوا، چنانچہ اپنے غیر متغیر پس منظر کی بنا پر دمشق ہمارے سامنے کئی ہزار سال کی تاریخ کی شہادت پیش کرتا ہے۔

ہمیں ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ تاریخ کے کس دور میں دمشق کی بنیاد رکھی گئی۔ بہر حال ۱۹۵۰ء میں دمشق کے جنوب مشرق میں تلّ الصالحیّۃ کے مقام پر جو کھدائیاں ہوئیں، ان سے یہاں چار ہزار سال قبل مسیح تک ایک شہری مرکز ہونے کا انکشاف ہوا ہے۔ جب ہم برنجی دور تک استعمال ہونے والے ابتدائی اور نامکمل اوزاروں کو دیکھتے اور ان کا مقابلہ (یہاں کے) پیچیدہ نظام آب پاشی سے کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ دو ہزار سال ق۔م کے وسط میں اس شہر کی خوشحالی ایک بڑے طویل اور سست رفتار تمدنی ارتقا کا نتیجہ ہوگی۔

تلّ الاَمرنۃ کی الواح میں اس کا تذکرہ آنے سے گویا دمشق کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کا نام ان شہروں کے ضمن میں آتا ہے جنھیں فرعون تھتموسس (Thutmoses) سوم نے، جو کچھ مدت کے لیے شام پر قابض ہوگیا تھا، پندرھویں صدی ق۔م میں فتح کیا تھا۔ [تلّ الامرنہ کے کتبوں میں اس کا نام دِمشقا Dimashka درج ہے۔ رامیسس ثالث کے کتبوں میں یہ نام دَرمیسک Darmesek کی شکل میں ملتا ہے]۔

گیارھویں صدی ق۔م میں دمشق سر زمین اَرَم کا بارونق صدر مقام تھا، جس کا حوالہ حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں ملتا ہے (کتاب مقدس، التکوین، ۱۴ : ۱۵؛ ۱۵ : ۲)؛ حتّی کہ آج بھی مسلمان دمشق کے شمال میں مقام برزہ کی مسجد ابراہیمؑ کو مقدس سمجھتے ہیں، جو بروے روایت حضرت ابراہیمؑ کا مقام ولادت تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں آرامیوں نے اس شہر کا "جالی نما" نقشہ تیار کیا، جس کے بازار بخط مستقیم ایک دوسرے کو قطع کرکے چوراہے بناتے تھے۔ یہ نقشہ دو ہزار سال ق۔م کے بابل اور آشور کے مشابہ تھا۔ دمشق کا شہر اپنے نہری نظام کی تیاری کے لیے آرامیوں ہی کا مرہون منت تھا۔ ہمیں کتاب مقدس (الملوک الثانی، باب ۵) میں نعمان الابرص کے قصے سے پتا چلتا ہے کہ دسویں صدی ق۔م میں نہر اَبانَۃ، بَرَدیٰ کے ساتھ ساتھ بہتی تھی اور نہر ثَورَی، جس کا نام آرامی ہے اور جو جبل قاسِیُون کی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ کھود دی گئی تھی، اس علاقے کو سیراب کرتی تھی جو شہر کے شمال اور شمال مشرق میں واقع ہے۔ اسے اس نخلستان کی زرعی معیشت میں بڑی اہمیت حاصل رہی۔

یہ شہر حضرت داودؑ کے ہاتھوں فتح ہوا (الملوک الثانی، ۸ : ۵ و ۶)، لیکن حضرت سلیمانؑ کے عہد میں دمشق کے بادشاہ نے شمال کے شاہان آشور اور جنوب کے ملوک اسرائیل کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ ۷۳۲ ق۔م میں تِگ لت پلیزر (Tigletpilezer) سوم کے آشوری لشکر نے دمشق کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے شہر پر قبضہ کرکے معبد اور محل کو لوٹ لیا، جس کا کچھ سامان ۱۹۳۰ء میں بالائی عراق عجم کے علاقے کی کھدائی سے نکلا ہے۔ اس دور میں شہر مذکور کی تاریخ کے لیے، جہاں تک اس پر آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوریوں، ساتویں صدی میں بابلیوں، چھٹی صدی میں ہخامنشیوں، چوتھی صدی میں یونانیوں اور پہلی صدی ق۔م میں بوزنطیوں کے یکے بعد دیگرے قبضہ کرنے کا تعلق ہے، دیکھیے K. Wulzinger و C. Watzinger: *Damascus*، ج ۱: *Die Antike stadt*؛ نیز مقالات از J. Benzinger، در *Pauly Wissowa*، ۴ : ۲۰۴۲ تا ۲۰۴۸؛ Jalabert، در *Dictionnaire d'archéologie chrétienne et de liturgie* طبع Cabrol و Leclercq، مادّۂ Damas، ۴ (۱۹۲۰ء) : عمود ۱۱۹ تا ۱۴۶؛ R. Janin، در *Dictionnaire d'histoire et de* *géographie ecclésiastiques*، طبع Aubert و E. van Cauwenbergh، ۱۴ (۱۹۵۷ء) : ۴۲ تا ۴۷ ۔

۳۳۲ ق م میں سکندر اعظم نے دمشق فتح کیا! یہ ایک بڑی اہم تاریخ ہے ۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ۱۴ھ/۶۳۵ء میں عربوں کی فتح تک کئی صدیوں کے لیے دمشق ہخامنشیوں کے ہاتھ سے نکل کر مغرب کے زیر اثر آ گیا ۔ یونانی عہد حکومت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : پہلے تو تیسری صدی ق م میں ایک بطلیموسی Ptolemaic سلطنت کی بنیاد رکھی گئی ، پھر کیزی کوس Cyzicus کے سلوقی Seleucid فرمانروا انطیاکوس Antiochus نہم نے اسے دارالحکومت بنا کر اس کا درجہ بلند کیا (۱۱۱ ق م) اور بالآخر ۹۰ ق م کے لگ بھگ دیمتریوس Demitrius سوم کے عہد میں یہاں ایک جدید یونانی نوآبادی قائم ہوئی ۔ سلوقی دارالحکومت کی حیثیت سے دمشق کو ایک بار پھر اہمیت حاصل ہوگئی اور وہ یونانیوں کی شہری منصوبہ بندی کے مطابق ترقی کرنے لگا ۔ آرامی بستی وہ تھی جہاں کا مندر نویں صدی ق م سے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی پر چھایا رہا تھا ۔ اب اس کے پہلو میں ایک دوسرا دمشق ابھرا ۔ جب ایک ہی مقام پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف نوعیت کی دو تہذیبیں ساتھ رہنے پر مجبور ہو جائیں تو عموماً ایسی ہی دورنگی ظہور میں آتی ہے ۔ یونانیوں کی شہری تعمیرات کے اسلوب کے بعض عناصر نمودار ہونے لگے ، مثلاً بازاروں کے دورویہ محرابی چھت، جن کا سراغ مسجد اُمویّہ کے مشرق میں ملتا ہے، یا گزرگاہ عام، جس کی یاد زُقاق السّاعة سے، جو اب تک موجود ہے، تازہ ہوتی ہے ، یا ۱۰۰ × ۵۰ میٹر کے مقررہ رقبے کے مکانات پر مشتمل چھوٹے چھوٹے محلّے، جن میں مکانوں کے طویل تر حصوں کی سمت شمالاً جنوباً رکھی جاتی تھی ۔

۸۵ قبل مسیح میں یہ شہر پہلی بار نبطیوں کے قبضے میں آیا، جو "یونان پسند" (the Philhellene) ارتیاس Artias الثالث کے عہد میں الرقیم (Petra) سے وارد ہوئے تھے ۔ ان نوواردوں نے یونانی شہر کے مشرق میں ایک نیا محلّہ بسایا، جسے قرون وسطٰی کے عرب مؤرخ النَّیطُون کے نام سے یاد کرتے تھے ۔ علاوہ بریں انھوں نے جَبَل قاسیُون کی ڈھلانوں پر نہر ثوری کے اوپر ایک نہر کھودی، جو عہد بنی امیّہ میں دوبارہ بنائی گئی اور نہر یزید کے نام سے مشہور ہوئی ۔

۶۴ قبل مسیح میں پومپی Pompey نے شام کے رومی سلطنت کا ایک صوبہ ہونے کا اعلان کیا، لیکن دمشق اس کا صدر مقام نہیں تھا بلکہ نمائندگان شہنشاہ نے انطاکیہ میں اپنا مستقر بنایا ۔ ۳۷ سے ۵۴ء تک بعہد ارتیاس الرابع فیلو پاتور Aretas IV philopator دربار روم کی رضامندی سے نبطی دوسری بار دمشق کے مالک بنے ۔ یہ اسی دور کا واقعہ ہے کہ ساؤل Saul، جو آگے چل کر پولوس St. Paul کے نام سے مشہور ہوا، مسیحیوں کا کھوج لگاتا شہر کی بڑی یہودی بستی میں پہنچا مگر انیاس Ananias کے ہاتھ پر خود دین مسیحی قبول کر لیا ۔ انیاس کا قدیم عبادت خانہ ۱۹۲۱ء میں کھود کر نکال لیا گیا اور اب تک محفوظ ہے ۔ قیصر ہیڈرین Hadrian کے عہد (دوسری صدی عیسوی کے آغاز) میں دمشق کو صدر مقام کا درجہ دیا گیا سپٹیمس سیوروس Saptimus Severus اور کارکلّا Caracalla نے یہاں بہت سی سرکاری عمارتیں تیار کرائیں اور ۲۲۲ء کے بعد الیگزانڈر سیوروس Alexander Severus نے اسے ایک رومی نو آبادی بنا دیا ۔

سلطنت روم نے دمشق کو داخلی امن و امان اور باقاعدہ نظم و نسق دیا، جس کے باعث یہاں ایسی خوشحالی پیدا ہوگئی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی ۔ اقتصادی طور پر روز بروز ترقی پذیر رجحانات کے باعث شہر میں لوگوں اور سامان کی ایسی ریل پیل ہوگئی کہ جلد ہی شہر کی حدود تنگ محسوس ہونے لگیں ؛ چنانچہ رومیوں نے تعمیر شہر کے ایک نئے منصوبے

کو چلایا اور قدیم آرامی بستی کو یونانی بستی کے ساتھ ملا دیا، جس سے ایک نیا شہر منظر عام پر ابھر آیا۔ حکومت نے اپنی توجہ زیادہ تر عام ضرورت کے منصوبوں پر مبذول رکھی، مثلاً فصیل شہر اور مزید پانی کی بہم رسانی کے لیے اضافی نہروں کی تعمیر۔

بردیٰ کے دائیں کنارے ۷۵۰ × ۱۵۰۰ میٹر کے رقبے میں فصیلیں تعمیر کی گئیں تاکہ یہاں کے باشندے بدویوں کی لوٹ مار سے محفوظ رہ سکیں۔ شمال مشرقی گوشے میں ایک قلعہ نما بُرج کی تعمیر سے فصیل کو مزید استحکام حاصل ہو گیا تھا۔ پورا شہر ایک وسیع مستطیل نظر آتا تھا، جس کے سات دروازے تھے: شرق میں باب شرقی، جنوب میں باب کَیسان اور باب الصغیر، مغرب میں باب الجابیة اور شمال میں باب الفرادیس (= باغوں کا دروازہ)، باب الجنیق اور باب تُوما (Thomas)۔ ان فصیلوں اور دروازوں کے بڑے بڑے آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ آبادی میں اضافے کے باعث کاریز ("القنوات") بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ لوگوں کو پینے کا پانی فراہم کیا جائے۔ یہ اب تک کام دے رہی ہے۔ چوک کے جنوب میں نئے مکانوں کی تعمیر سے نوواردوں کے لیے جائے سکونت کی تلاش کا مسئلہ حل ہو گیا۔ شہر کی ایک نئی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں دو وسیع سڑکیں ایسی بنائی گئیں جن کے دونوں جانب ستونوں کی قطاریں تھیں۔ ان میں سے ایک اہم شارع عام پچیس میٹر چوڑی تھی۔ اس کے دونوں جانب محرابی چھت تھی۔ یہ شہر کو شرقاً غرباً قطع کر کے باب شرقی کو باب جابیہ سے ملاتی تھی اور رومی شہروں کی شارع کبیر (decumanus) سے مشابہ تھی۔ یہ سڑک اب سوق مدحت پاشا کہلاتی ہے اور غیر ملکی [مصنف] اسے [عہد نامۂ جدید] اعمال الرسل، ۹ : ۱۱ کے ایک کنائے کی بنیاد پر اسے "الزُقاق المستقیم" (= سیدھا راستہ) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے بیچوں بیچ رُومیوں کے [زمانے میں] تین محرابی دروازے قائم تھے، جن میں سے ایک اب بھی موجود ہے؛ اس کے جنوب میں ایک چھوٹے سے نصف دائرے کی شکل میں "تل" ہے، جسے ایک ترچھی گلی پہلو سے قطع کرتی ہوئی گزرتی ہے۔ یہ تلّ یا ٹیلہ قدیم رومی تماشا گاہ کا محل وقوع تھا۔ دوسری ستونوں والی سڑک وہ قدیم راستہ تھا جو مندر اور مقام اجتماع (agora) کو آپس میں ملاتا تھا۔ اسے رُومیوں نے کھلی عدالت گاہ (forum) میں بدل دیا۔ مندر مشتری دیوتا دمشقی (Jupiter of the Damascenes) سے منسوب تھا جو کہ ہداد (Hadad) یعنی طوفان کے دیوتا کا جانشین تھا۔ کئی موقعوں پر بالخصوص دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں اسے جزوی طور پر از سرنو تعمیر کیا گیا اور اس میں تبدیلیاں کی گئیں۔ احاطے (peribolus) کا ایک حصّہ، جس کے کونوں پر واقع دو برج اب مسجد کے میناروں کی بنیاد کا کام دیتے ہیں، مسجد جامع کی بیرونی دیوار کے اندر آ گیا ہے۔ مندر کے مشرق دروازے (propylaea) مسجد جامع کے مشرق جانب موجودہ جیرون میں اور مغربی دروازے، جو کہ سائبانوں سے مزین تھے، مسجد کے مغربی جانب باب البرید میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ آخری بات یہ معلوم ہے کہ گول میدان (سرکس circus)، جس نے غالباً کھیلوں کے میدان (stadium) کی جگہ لے لی تھی، وہاں واقع تھا جہاں اب باب الفرادیس کے باہر گورستان کے شمال میں، جس سے رومی عہد کے سنگی تابوت برآمد ہوئے ہیں، "خرابان ہداد" ہے۔

قرون وسطیٰ کے عربی اعلام کی چند اور شکلوں میں بھی رومی اصطلاح کی یاد باقی رہ گئی ہے، مثلاً الدیماس قدیم (demosion) کے مطابق ہے؛ "الفورنق" سے furnace یا مٹی کے برتن پکانے کی بھٹی ذہن میں آتی ہے اور الفُسقار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سڑک کے خاتمے پر جو المستقیم کہلاتی ہے، کسی زمانے میں لوہے کی بھٹی تھی، جہاں سوئے (fusca) بنائے اور بیچے جاتے تھے۔

یہ امر یقینی ہے کہ بہت سے قدیم آثار زمین کے نیچے دب کر معدوم ہو چکے ہوں گے، جس کی سطح رومی عہد سے لے کر اب تک بعض مقامات پر چار میٹر سے زیادہ بلند ہو چکی ہے؛ لیکن شہر کے نقشے میں، جو تیسری صدی عیسوی میں اسے بسانے وقت تیار ہوا تھا، مسلمانوں کی آمد تک مشکل ہی سے کوئی ردّ و بدل ہوا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ رومی شہر ہی نے از منہ وسطٰی کے شہر کے لیے ایک ڈھانچے کا کام دیا تھا۔

رومیوں کی جگہ بوزنطیوں نے سنبھالی۔ ۳۹۵ء میں تیودوسیوس Theodosius کی وفات کے بعد شام سلطنت شرقیہ کا ایک حصہ بن گیا۔ جب دمشق بوزنطی سلطنت کا سرحدی شہر بنا تو یہاں اہل کلیسا کی صورت میں ایک نیا شہری عنصر نمودار ہوا۔ سب سے پہلے مشتری (Jupiter) کا مندر از سر نو تعمیر کر کے اسے گرجا کی شکل دی گئی اور اسے قدّیس یوحنّا [حضرت یحیٰیؑ] اصطباغی (Baptist) کے نام سے منسوب کیا گیا۔ حضرت یحیٰیؑ بن حضرت ذکریاؑ کا سر ایک (ذخیرہ تہ خانے crypt=) میں ابھی تک محفوظ ہے جو اب مسجد جامع میں واقع ہے اور اس کی مسیحی اور مسلمان یکساں طور پر تعظیم و احترام کرتے ہیں۔ جہاں کسی زمانے میں ولیہ مریم کا کلیسا واقع تھا وہاں اب کلیساے شرقی کے بطریق اعظم کا مرکز قائم ہے۔

غسّانیوں کے ضعف اور چھٹی صدی عیسوی کی ایرانی جنگوں نے دمشق کی اقتصادی حالت تباہ کر کے رکھ دی۔ ۶۱۲ء میں خسرو ثانی کی سپاہ نے دمشق پر قبضہ کر لیا جس کے باشندوں میں کثرت یعقوبی مونوفیزی monophysite فرقے کے عیسائیوں کی تھی [جو حضرت مسیح کے اتحاد باللہ کے قائل] اور بوزنطی فرقہ ملکی Melkites کے مخالف تھے۔ چونکہ ساسانیوں کا یہاں خیر مقدم ہوا تھا اس لیے انھوں نے اس شہر میں ویسی لوٹ مار نہیں کی جیسی کہ آگے چل کر بیت المقدس میں کی (۶۱۴ء)۔ ۶۲۷ء میں ایرانی شہنشاہ کی وفات پر شہر خالی کر دیا گیا اور اگلے سال ہرقل شام میں واپس آ گیا۔

فتح اسلامی: اول تو غسّانی امارت (phylarchate) کے خاتمے اور دوم ایرانیوں کی تباہی کے باعث ظاہر ہے کہ حجازی عربوں کے لیے شام فتح کرنا مشکل نہ رہا تھا۔ ہر سال عرب اپنی فوجی مہمات کے سلسلے میں بوزنطی سرحد پار کر جاتے تھے۔ جمادی الاولٰی ۱۳ھ / جولائی ۶۳۴ء میں حضرت خالدؓ بن الولید کے لشکر نے فلسطین کا علاقہ طے کر لیا اور شمال کی جانب جولان کے راستے کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔ محرم ۱۴ھ / مارچ ۶۳۵ء میں دمشق کی طرف جانے سے قبل بوزنطیوں نے الصّفّین کے شمال میں مَرج الصُّفّر میں کچھ مزاحمت کی۔ چند روز بعد مسلمان شہر کے دروازوں کے سامنے پہنچ گئے۔ حضرت خالدؓ بن الولید نے اپنا فوجی پڑاؤ شہر کے شمال مشرقی جانب قائم کیا۔ ایک قدیم روایت کی رُو سے ان کا مستقر باب تُوما کے باہر بتایا جاتا ہے، جہاں کہ اب شیخ رَسْلان کا مقبرہ ہے۔ [شہر کی] ناکہ بندی کر لی گئی تا کہ ان بوزنطی دستوں کے ساتھ جنھیں پسپا کر کے دمشق میں محصور کر لیا گیا تھا کوئی فوج شمال سے آ کر نہ مل سکے۔ چونکہ اہل دمشق بوزنطی حکومت کو ناپسند کرتے تھے لہٰذا ان کے زعما کی ایک جماعت نے، جس میں وہاں کا اسقف و ناظم اعلٰی اور قدّیس یوحنّا الدّمشقی کا باپ منصور بن سَرجُون بھی شامل تھا، باشندگان شہر کو غیر ضروری کشت و خون سے بچانے کے لیے گفت و شنید شروع کر دی۔ رجب ۱۴ھ / ستمبر ۶۳۵ء میں باب شرقی کو مسلمانوں کے واسطے کھول دیا گیا اور بوزنطی دستے شمال کی طرف ہٹ گئے۔ تسخیر شہر کے بارے میں کئی روایات ملتی ہیں۔ مشہور ترین روایت ابن عساکر (تاریخ، ۱ : ۲۲۳ تا ۲۳) کی ہے جس کی رُو سے حضرت خالدؓ ابن الولید شمشیر بدست لڑتے ہوئے باب شرقی سے اور دوسری طرف حضرت ابو عُبیدؓاللہ باشندگان شہر

کو امان دینے کے بعد باب الجابیۃ سے داخل ہوے اور دونوں سپہ سالار کنیسہ کے وسط میں ایک دوسرے سے ملے ۔ ایک اور روایت البَلاذُری (فتوح، ص ۱۲۰ تا ۱۲۳) کی ہے جس کا بیان ہے کہ حضرت خالدؓ نے باب شرقی پر شہر کا اقرار اطاعت قبول کیا اور [حضرت] ابو عبیدہؓ باب الجابیۃ سے بزور شمشیر داخل ہوے؛ دونوں سپہ سالاروں کی ملاقات البَرِیص کے مقام پر شارع المعروف بہ المستقیم کے وسط میں کلیساے المِقسلاط کے قریب ہوئی (ابن عساکر: تاریخ، ۱: ۱۲۰)۔ کائتانی Caetani نے ۱۴ھ میں حضرت ابو عبیدہؓ کی شام میں عدم موجودگی ثابت کر کے ان روایات کی صحت باطل کر دی ہے ۔ Lammens (*MFOB*، ۳: ۲۵۵) نے ان کی صحت کو ثابت کرنے کی کوشش میں حضرت ابو عبیدہؓ کی جگہ یزیدؓ بن سفیان کا نام تجویز کیا ہے ۔ بہر صورت Lammens نے شہر کے منقسم ہو جانے کو غیر اغلب بتایا ہے ۔ یہ روایت بہت بعد کے زمانے میں صلیبی جنگوں کے دوران میں وجود میں آئی تھی ۔

مسلمانوں نے عیسائیوں کو ان کی املاک یعنی اراضی، مکانات اور گرجاؤں کی حفاظت کی ضمانت دی . . .

۱۵ھ / ۶۳۶ء کے موسم بہار میں ہرقل کے بھائی تیودورس Theodorus کے زیرِ قیادت ایک لشکر دمشق کی طرف بڑھا ۔ حضرت خالدؓ بن الولید نے شہر خالی کر دیا اور طَبَرِیَّہ کے مشرق میں یَرمُوک کے قریب مورچہ آرا ہونے سے قبل الجابیہ کے مقام پر از سر نو فوج کو مرتّب کیا ۔ اس میدان میں ۱۲ رجب ۱۵ھ/ ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو حضرت خالدؓ نے بوزنطی فوج کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا ۔ وہ خود اس کامیابی کے بعد مدینۂ منورہ چلے گئے، لہٰذا اس بار شام اور دمشق کی فتح کا سہرا حضرت ابو عبیدہؓ بن الجرّاح کے سر رہا ۔ ۲ ذوالقعدۃ/ ۱۵، دسمبر ۶۳۶ء میں اہل دمشق نے دوبارہ ہتیار ڈال دیے اور اسلامی مملکت سے اس کا حتمی طور پر الحاق کر لیا گیا ۔

دمشق کا سقوط ایک ایسا واقعہ تھا جس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ۔ اس فتح نے مغرب کی تقریباً ہزار سالہ سیادت کا خاتمہ کر دیا ۔ اس کے بعد سے یہ شہر پھر سامی حلقۂ اثر میں آ گیا اور اس کا رُخ از سر نو صحرا اور مشرق کی طرف پھر گیا ۔ اہل دمشق زبان اور ثقافت کے اعتبار سے سامی، حضرت مسیح کے اتحاد باللہ کے قائل اور یونانی (بولنے والے) کلیساے مشرق کے مخالف تھے ۔ انھوں نے فاتحین کا دلی مسرت سے خیر مقدم کیا ۔ علاوہ بریں وہ اپنے آپ کو باعتبار نسل و زبان اور مذہب بوزنطیوں کی بہ نسبت ان سے نزدیک تر محسوس کرتے تھے ۔ خود اسلام کی نسبت ان کا خیال تھا کہ وہ اسلام سے بہت زیادہ قریب ہیں اور اُنھیں توقع تھی کہ وہ مسلمانوں کے زیر حکومت زیادہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں گے ۔ دوسرے شہروں سے کہیں زیادہ دمشق کے حالات عرب اور یونانی ثقافت کے امتزاج کے لیے سازگار معلوم ہوتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی آبادی کا، جو بیشتر آرامی زبان بولنے والوں پر مشتمل تھی، بہت ہی قلیل حصّہ یونانی ثقافت قبول کر سکا تھا ۔ جہاں تک نظم و نسق کا تعلق ہے بوزنطیوں کے مسلمہ اصولوں پر عمل درآمد جاری رہا البتہ مذہبی مناقشے پیدا ہو گئے؛ ان سے بڑی اسلامی الٰہیات کی تشکیل میں مدد ملی ۔ باہم شیر و شکر ہونے کا اثر (نصارٰی کی توقع کے) بالکل برعکس ہوا بلکہ مسلمانوں کی فتح کا مثبت نتیجہ اشاعت اسلام نکلا اور نصف صدی کے اندر اندر حکومت نے اسلام کی زبان عربی کو بطور سرکاری زبان رائج کر دیا ۔

خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ نے یزید بن ابی سفیان کو شہر کا والی نامزد کیا ۔ فاتحین میں سے ممتاز ترین افراد بوزنطیوں کے خالی کردہ مکانوں میں مقیم ہو گئے (ابن عساکر: تاریخ، ۱۲: ۱۳۳ تا ۱۴۴)۔ [عرب کے] بادیہ نشینوں کو اس شہر نے مسحور کر لیا

تھا ۔ وہ [قرآنی اشارات کی بنا پر] اسے "جنت ارضی" کے نام سے یاد کرتے تھے، لیکن جگہ اور اس سے بھی زیادہ چراگاہوں کی قلت کی وجہ سے وہ الجابیۃ کی چھاؤنی ہی میں مقیم رہے ۔ بہت جلد دمشق کو ایک مقدس شہر کا درجہ بھی حاصل ہو گیا کیونکہ روایات کی روشنی میں یہاں ان مقامات کا سراغ لگ گیا جنھیں انبیاے سابقین نے شہرت عطا کی تھی، چنانچہ زائرین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ۔ زیادہ تر لوگ جَبَل قاسیُون میں کہف آدم یعنی کہف "دم" (Blood)، جہاں روایت کی رُو سے ہابیل کا قتل ہوا تھا، یا کہف جبرئیلؑ میں جایا کرتے تھے ۔ برزَہ Berzé میں حضرت ابراہیمؑ کے مقام ولادت کی بڑی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی ۔ خیال تھا کہ حضرت موسٰیؑ بن عمران کا مقبرہ وہاں واقع ہے جہاں اب محلۂ قَدَم آباد ہے ۔ حضرت مسیح عیسٰیؑ بن مریمؑ کا نام ان انبیا کے زمرے میں لیا جاتا تھا جنھوں نے اپنی تشریف آوری سے اس شہر کو عزت بخشی تھی ۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ آپ [یہاں] ایک پُر سکون ٹیلے ("ربوہ") پر قیام فرما ہوئے تھے (اِلٰی رَبْوَۃٍ ذاتِ قرار، ۲۳ : [المؤمنون] ۵۰) اور دنیا کے خاتمے کے قریب دجّال سے لڑنے کے لیے سفید مینار پر، جسے کبھی تو باب شرقی کا مینار قرار دیا جاتا تھا اور کبھی مسجد جامع کا مشرقی مینار (مَاْذنۃ عیسٰیؑ)، نزول اجلال فرمائیں گے ۔

بنو امیّہ : ۱۸ھ/ ۶۳۹ء میں یزیدؓ بن ابی سفیان کا بعارضۂ طاعون انتقال ہوا ۔ ان کی جگہ جند دمشق کی قیادت ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں آئی ۔ ۳۶ھ/ ۶۵۶ء میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ خلیفہ منتخب ہوئے اور انھوں نے الجابیہ سے ترک سکونت کر کے دمشق میں اقامت اختیار کر لی ۔ اس نئے دارالحکومت کو درجۂ کمال تک پہنچانا بنو امیّہ کا کارنامہ تھا ۔ ایک صدی تک یہ خلافت کے مرکزی صوبے کا مدنی مرکز رہا اور اسے ایک ایسی سلطنت کے قلب کی حیثیت حاصل رہی جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں ہوتا ہے ۔

شروع شروع میں فاتحین کے تسلّط سے شہر کی زندگی میں کوئی تغیر رُونما نہیں ہوا کیونکہ مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی ۔ عربیت کا رنگ غالب آنے کا عمل بڑا سست رو تھا، چنانچہ خلیفہ عبدالملک کے عہد تک دربار خلافت پر عیسائی چھائے رہے ۔ اسی عہد میں مسلمان رعایا کی تعداد میں اضافے کے باعث ایک ردّ عمل ہوا، جس کی بنا پر نظم و نسق کی سرکاری زبان یعنی یونانی کی جگہ عربی نے لے لی ۔ اس خاندان خلافت کے ابتدائی دور میں نظم و ضبط، خوشحالی اور رواداری عام تھی لیکن آگے چل کر خانہ جنگیوں نے سخت ابتری ڈال دی، جو بنی اُمیہ کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہوئی ۔ شہر دمشق میں بھی جھگڑے فساد برپا ہونے لگے، آتش زنی کی وارداتوں میں اضافہ ہونے لگا، حتّٰی کہ جب مروان ثانی ۱۲۷ھ/ ۷۴۴ء میں اپنے نئے دارالخلافہ حَرّان میں تخت نشین ہوا تو دمشق کی فصیل تک منہدم ہو چکی تھی ۔

شہر کے نقشے (میں بوزنطی عہد کے بعد) حکومت کی تبدیلی کا سراغ دو عمارتوں کی تعمیر میں ملتا تھا جو ایک دوسرے سے ملحق تھیں، یعنی قصر خلافت اور مسجد، لیکن ان سے شہر کے عام نقشے میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا ۔ [امیر] معاویہؓ نے تو قدیم احاطے (peribolus) کے جنوب مشرق میں، جہاں آج کل سونے چاندی کے زیورات بنانے والوں کا بازار ہے، بوزنطی والیوں کی قیام گاہ کو نئے سرے سے تعمیر کرنے ہی پر اکتفا کیا ۔ یہ [قصر] "الخَضْرا" کے نام سے موسوم ہوا ۔ دراصل یہ نام سرکاری عمارتوں کے ایک مجموعے کو دیا گیا ہوگا جس کی مثال ہمیں قسطنطینیہ اور آگے چل کر بغداد میں بھی ملتی ہے ۔ محل کے پہلو میں دارالخَیل واقع تھا، جو سفیروں کے اقامت خانے کا کام دیتا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دورِ عبّاسیہ میں اسے زندان میں تبدیل

کر دیا گیا تھا ۔ پانی کی بہم رسانی کا انتظام بہتر بنانے کے لیے یزید الاوّل نے جَبَل قاسیُون کی ڈھلانوں پر، نہر توری کے پرے ایک نبطی نہر از سرِ نو کھدوائی ۔ اسے نہر یزید کا نام دیا گیا اور آج بھی یہ اسی نام سے مشہور ہے ۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے بیٹے الحجاج نے باب الجابیہ کے مغرب میں فصیلِ شہر کے باہر ایک قصر تعمیر کرایا جس کی یاد قائم رکھنے کے لیے آج ایک محلّہ قصر الحجّاج کے نام سے موسوم ہے ۔

اسلامی فن تعمیر کے اوّلین اور عظیم ترین شاہکاروں میں جامع مسجد اموی کی تعمیر کا سہرا خلیفہ الولیدالاوّل کے سر ہے ۔

عہد عباسیّہ : نئے خلیفہ ابوالعباس السفّاح کے چچا عبداللہ بن علی نے خاندان بنو اُمیّہ کا خاتمہ کرنے کے بعد رمضان ۱۳۲ھ/اپریل ۷۵۰ء میں دمشق فتح کیا اور وہ اس کا پہلا عباسی والی مقرر ہوا ۔ اموی عمارتیں تباہ و برباد کر دی گئیں، دفاعی انتظامات توڑ دیے گئے اور مقبروں کی بے حُرمتی کی گئی ۔ جہاں تک اس شہر کا تعلق ہے، ایک تاریک دور کا آغاز ہو گیا ۔ اس کی حیثیت ایک صوبائی شہر کی سی رہ گئی اور خلافت نے اپنا صدر مقام عراق میں قائم کیا ۔ شام کے دارالحکومت میں اندر ہی اندر بغاوت کی آگ سُلگتی رہی ۔ المہدی کے عہد (۱۵۶ھ/ ۷۷۳ء تا ۱۶۸ھ/ ۷۸۵ء) میں بنوقیس اور یمنیوں کے باہمی تصادم نے حکومت سے سرکشی کی صورت اختیار کر لی، جس کی قیادت السُّفیانی نام ایک اموی مدّعی کے ہاتھ میں تھی اور بنوقیس اس کے معاون تھے، لیکن یہ بغاوت ناکام رہی ۔ ہرون الرشید کے دورِ خلافت میں حکومت بغداد کے خلاف بغاوت کی تحریک زیادہ وسیع بنیادوں پر شروع ہوئی ۔ ۱۸۰ھ/۷۹۶ء عبّاسی خلیفہ نے جعفر البرمکی کی سپہ سالاری میں ایک تادیبی مہم روانہ کی مگر امن و انتظام صرف عارضی طور پر قائم کیا جا سکا اور عباسی خلفا کے احکام کی برابر تحقیر کی جاتی رہی ۔ امن و امان قائم کرنے کے لیے خلیفہ المأمون پہلی بار ۲۱۵ھ/۸۳۰ء میں یہاں آیا، لیکن شورشیں جاری رہیں ۔ ۲۱۸ھ/۸۳۳ء میں، یعنی جس سال اس نے وفات پائی، وہ دوسری بار پھر آیا ۔ ۲۳۹ھ/ ۸۵۳ء میں ایک خونریز بغاوت دمشق کے عبّاسی والی کی ہلاکت پر منتج ہوئی مگر لشکرِ خلافت امن قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ چار سال بعد خلیفہ المتوکّل نے اپنا دارالخلافۃ شام میں صدر مقام میں تبدیل کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں وہ صرف اڑتیس یوم قیام کرنے کے بعد سامرّا واپس چلا گیا ۔

۲۵۴ھ / ۸۶۸ء میں بُخارا کے ترک احمد بن طولُون [رک باں] کو خلیفہ نے، جس کا وہ محض برائے نام باجگزار تھا، مصر کا والی مقرر کیا ۔ اس نے دیکھا کہ زنج کی مسلسل و متواتر بغاوتوں سے خلافت بہت کمزور ہو چکی ہے؛ چنانچہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۶۴ھ/۸۷۸ء میں اس نے دمشق پر قبضہ کر لیا ۔ ۲۷۰ھ/۸۸۴ء میں اس کا بیٹا خُمارویہ [رک باں] اس کا جانشین ہوا اور مصر و شام پر اپنی فرمانروائی برقرار رکھنے کے لیے خلیفہ کو سالانہ خراج ادا کرتا رہا ۔ ذوالحجّہ ۲۸۲ھ/ فروری ۸۹۶ء میں اسے دمشق میں قتل کر دیا گیا ۔ بنو طولُون کی حکومت ہی کے آخری سالوں میں قرامطہ [رک باں] شام میں نمودار ہوئے اور ان کی وجہ سے سیاسی و معاشرتی شورشوں کے مرکزوں میں اضافہ ہو گیا ۔ بنو طولُون کے زوال اور قرامطہ کی روز افزوں سرگرمیوں نے، جو دمشق کا محاصرہ کر لینے کی حد تک جا پہنچی تھیں، خلیفہ کو وہاں فوجی دستے بھیجنے پڑے، جنھوں نے ۲۸۹ھ/ ۹۰۲ء میں قرامطہ کو ہتیار ڈالنے اور محاصرہ اُٹھانے پر مجبور کر دیا ۔ دمشق کے عامل طُغج بن جُفّ نے، جو ایک ماوراء النّہری ترک تھا، عباسی سپہ سالار محمّد بن سلیمان کے ساتھ بلاوقت رشتۂ اتحاد ایک بار پھر استوار کر لیا اور

بطور انعام اسے خلیفہ نے مصر کا والی مقرر کر دیا۔ اس ولایت میں اس کے بیٹے محمد نے ۳۲۶ھ/۹۳۸ء میں خاندان اِخشیدیہ [رک بآں] کی بنیاد رکھی؛ اسی لیے خانوادۂ شاہی نے بنو عباس کی برائے نام سیادت قبول کر لی اور حمدانیوں کے مقابلے میں دمشق کا دفاع کرنے کے لیے بڑھا۔ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء میں ایک معاہدہ ہو گیا، جس کی رو سے اخشیدی اس شہر پر قابض ہو گئے اور اس کے عوض انھوں نے فرمانروایانِ حلب کو خراج دینا منظور کر لیا۔ جب ۳۳۴ھ/۹۴۶ء میں بمقام دمشق محمّد الاخشیدی وفات پا گیا تو وہاں اور قاہرہ دونوں جگہ ابتری پھیل گئی۔

بنو فاطمہ [رک بآں] ۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں خاندان اِخشیدیّہ کے قاہرہ میں جانشین ہوے۔ ان کے پہلے مصر اور پھر شام میں برسرِاقتدار آنے سے ایک شیعی خلافت قائم ہو گئی، جو خلافت بغداد کی دشمن تھی۔ گیارھویں صدی کے شروع میں شہر دمشق کو بہت سی مشکلات کا سامنا رہا۔ حمدانی شمال سے دباؤ ڈال رہے تھے اور فاطمی جنوب سے۔ بوزنطی اقدامات، قرمطی سرگرمیاں اور ترکمانی حملے ان پر مستزاد تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شہر پر قرامطہ کا قبضہ ہو گیا، لیکن ۳۵۹ھ/۹۷۰ء میں فاطمیوں نے انھیں نکال باہر کیا، اگرچہ اس میں شہر کو خاصی آتش زدگی اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ بنو فاطمہ کے تسلط سے شہر کے حالات بدتر ہو گئے، کیونکہ شہر کی حکومتِ قاہرہ کے تنخواہ دار مغربی سپاہیوں نے وہاں کے باشندوں کو بہت تنگ کیا۔ غرض یہ ساری صدی ابتری اور انحطاط کا زمانہ تھی۔ بعض اوقات فسادات سخت مصیبت کا سبب ہو جاتے تھے۔ چونکہ بیشتر مکانات کچی اینٹوں کے بنے ہوے تھے اور ان کی چھتوں اور پہل پایوں میں پاپار poplar کی لکڑی لگائی گئی تھی، اور کسی بھی آتش زدگی کے سنگین نتائج ہو سکتے تھے، چنانچہ ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء میں بھی ہوا: اہلِ دمشق اور بربری سپاہیوں کے درمیان جھگڑے سے آگ لگی اور مسجد جامع اور شہر کو شدید نقصان پہنچا۔

ترکی حکومت: ایک ترکمان سردار اَتسِز بن اُوَق [رک بآں]، جو بنو فاطمہ کا تنخواہ دار ملازم تھا، ان کا ساتھ چھوڑ کر بطور خود دمشق پر قابض ہو گیا اور اس طرح ۴۶۸ھ/۱۰۷۶ء میں مصریوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ چونکہ اسے اپنے سابق آقاؤں سے خطرہ تھا لہٰذا اَتسِز نے بڑی عجلت سے قلعے کے استحکامات درست کیے اور ملک شاہ [رک بآں] کے ساتھ، جس سے اس نے مدد طلب کی، اتّحاد قائم کرنے کے لیے کوشاں ہوا۔ سلجوقی سلطان نے اس کے جواب میں دمشق اپنے بھائی تُتُش [رک بآں] کو جاگیر میں دے دیا۔ مؤخّرالذکر ۴۷۱ھ/۱۰۷۹ء میں دمشق پہنچا اور وہاں نئے سرے سے امن و امان قائم کر کے اَتسِز کو موت کے گھاٹ اتار کر اس سے چھٹکارا حاصل کیا۔ تشدّد کا دور جاری رہا۔ ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء میں مُسلم بن قُرَیش نے شہر کا محاصرہ کر لیا مگر اسے فاطمیوں کی طرف سے متوقع کمک نہ پہنچ سکی اور تُتُش شہر کو محاصرے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ تُتُش ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء میں اپنے بھتیجے بَرکیارُوق [رک بآں] کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بیٹوں نے اس کی ریاست آپس میں تقسیم کر لی۔ رِضوان نے حلَب اور دُقاق نے دمشق کی حکومت سنبھالی۔ مؤخرالذکر نے کاروبار سلطنت کی باگ ڈور اپنے ترک اتابک ظہیرالدین طُغتِگین کے ہاتھ میں دے دی۔ چنانچہ اس زمانے سے وہی دمشق کا حقیقی حکمران نظر آتا ہے۔ اس کی سیاسی حیثیت بہت مخدوش تھی کیونکہ مصر کے فاطمی اور سلاجقۂ بغداد اس کے مخالف تھے اور ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء سے افرنگی (Franks) بھی اسی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

دُقاق کی وفات (رمضان ۴۹۷ھ/جون ۱۱۰۴ء)

کے بعد طغتکین کم بن تتش الثانی کے نام پر حکومت کرتا رہا، لیکن تتش الثانی جلد ہی وفات پا گیا۔ اب اتابک دمشق کا واحد مالک تھا، چنانچہ ٥٤٩ھ/ ١١٥٤ء میں نورالدّین کی آمد تک اس کا خاندان بُوریہ [رک بآں] یہاں برسر اقتدار رہا۔ طغتکین کے عہد حکومت میں، جو رُبع صدی تک جاری رہا، شہر نے اخلاق اور معاشی دونوں اعتبار سے نمایاں ترقی کی۔ صفر ٥٢٢ھ / فروری ١١٢٨ء میں اس کی رحلت پر اس کا بیٹا تاج الملوک بُوری اس کا جانشین قرار پایا۔ فرقۂ باطنیّہ [رک بآں] نے ٥٠٧ھ/١١١٣ء ہی میں امیر مودود کو قتل کر کے دمشق میں اپنے موجود ہونے کا احساس دلا دیا تھا۔ اب انہوں نے دمشقی وزیر ابو علی الطّاہر المزدقانی کی اعانت پا کر اپنی سرگرمیاں دو چند کر دیں۔ ٥٢٣ھ / ١١٢٩ء میں بُوری نے اس وزیر کو مروا ڈالا۔ یہ گویا قتل عام کا اشارہ تھا، چنانچہ باشندگان شہر نے بے قابو ہو کر کئی سو باطنی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ جو لوگ باقی بچے اُنہوں نے بھی اپنا انتقام لینے میں تساہل نہیں برتا، چنانچہ تاج الملوک بُوری ٥٢٥ھ/١١٣١ء میں اقدام قتل کا ہدف بنا اور ایک سال بعد رجب ٥٢٦ھ/مئی - جون ١١٣٢ء میں اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ اس کے دو جانشین بھی یکے بعد دیگرے قتل کر دیے گئے۔ ان میں سے اسمٰعیل تو ٥٢٩ھ/ ١١٣٥ء میں خود اپنی ماں کے اور دوسرا شہاب الدّین محمود ٥٣٣ھ/١١٣٩ء میں اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

٥٣٤ھ / ١١٤٠ء میں قاالدین عسکر نو عمر ابو سعید آبق مجیرالدّین کو برسر حکومت لے آئے، جس نے زمام اقتدار اپنے اتابک معین الدّین اُنُر کے سپرد کر دی۔ دس برس بعد اتابک کی وفات پر آبق نے خود حکومت کا کاروبار سنبھالا لیکن نور الدّین کی سرپرستی قبول کرنے پر مجبور ہو گیا، جس نے آخر میں اسے دمشق سے بھگا دیا۔

بُوریہ کی حالت ناقابل رشک تھی۔ چونکہ انہیں سند حکومت خلیفہ بغداد سے ملی تھی اس لیے فاطمیوں کے زیر تسلّط مالک مصر کو جانے والے راستے کی سرحدی چوکی کا دفاع ان کے فرائض میں شامل تھا۔ دوسری طرف ان کے لیے غلّے کی بہم رسانی کا انحصار حَوران اور بِقمۃ کے دو علاقوں پر تھا، جنہیں بیت المقدس کی لاطینی حکومت سے حملے کا خطرہ لاحق رہتا تھا اور بعض اوقات ان کے لیے افرنگیوں کے ساتھ گفت و شنید کرنا ناگزیر ہو جاتا تھا۔ ادھر اپنے اس رویّے کے متعلق خلافت بغداد کے سامنے جواب دہ بھی ہونا پڑتا تھا۔ ٥٢٤ھ / ١١٣٠ء کے آغاز سے دمشق کو ایک نیا خطرہ لاحق ہونے لگا۔ یہ خطرہ زنگیوں کی جانب سے تھا، جو اس وقت حَلَب کے مالک بن گئے تھے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بُوریوں نے ایک سے زیادہ موقعوں پر افرنگیوں کی امداد حاصل کی، لیکن چونکہ ٥٤٣ھ/١١٤٨ء میں خود افرنگیوں نے دمشق پر حملہ کر دیا، اس لیے ان سے آئندہ معاہدات کرنے کا امکان باقی نہ رہا۔ شہر کو حال ہی میں اقتصادی خوشحالی دوبارہ نصیب ہوئی تھی، اسے برقرار رکھنے کے لیے مجبوراً بُوریوں کو نئے اتحادیوں کی جستجو ہوئی۔

طغتکین کے ہاتھوں امن و امان کی بحالی سے قبل دمشق تین صدیوں تک بد نظمی کا سامنا کر چکا تھا۔ چند روزہ والیوں اور ان کے گماشتوں کی من مانی حکومت کے پنجے میں پھنس کر شہر کی آبادی ایک عجیب دہشت اور مصیبت کے دور سے گزرتی رہی تھی، اسے اپنی حفاظت کا خیال ہر وقت دامن گیر رہتا تھا۔ اسی کے پیش نظر شہر کے گلی کوچے ایک مخصوص نقشے کے مطابق بنائے گئے۔ اہل دمشق ایسے لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرنا چاہتے تھے جن سے وہ بخوبی واقف ہوں اور جو ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے ہوں،

اور ایسے لوگوں کے قریب ہوں جن کا رہن سہن ان سے ملتا جلتا ہو۔ یہی وہ نقطۂ نظر تھا جسے سامنے رکھ کر ان کی اجتماعی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

شہر کا نقشہ، جس میں رومیوں کے زمانے سے بہت کم تبدیلی رونما ہوئی تھی، چوتھی صدی ہجری / [بہ تصحیح دسویں] صدی عیسوی سے متعدد علاقوں میں بٹ کر رہ گیا جن کا ایک دوسرے سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ تھا۔ ہر محلّہ (حَارۃ) اپنی دیوار اور دروازوں کے اندر مورچہ بند اور بجائے خود چھوٹے پیمانے پر ایک شہر بن جانے پر مجبور ہوا، جس میں شہری آبادی کے تمام لوازم موجود ہوں، جیسے مسجد، حمّام، ذخیرۂ آب "تالع"، عوامی تنور خانے، اور چھوٹا سا بازار (سُوَیْقَۃ) جس میں نانبائیوں کی دکانیں ہوں۔ ہر محلّے کا اپنا شیخ اور فوجی دستہ (اَحْداث) [رَک بآں] الگ الگ ہوتا تھا۔

قدیم شہر کی اس تقسیم کے ساتھ ساتھ مذہبی بنیاد پر لوگوں کی ایک دوسرے سے مکمل علٰحدگی بھی عمل میں آ گئی، کیونکہ ہر فرقے کا شہر میں اپنا علٰحدہ محلّہ تھا۔ مسلمان مغرب میں قلعے اور مسجد جامع کے قریب رہتے تھے، عیسائی شمال مشرق میں اور یہودی جنوب مشرق کے حصے میں تھے۔ شہر کی ظاہری ہیئت یکسر تبدیل ہو گئی، مکانات کے دروازے براہِ راست گلی کوچوں میں نہیں کھلتے تھے۔ شہر کی قدیم سڑکوں کے ساتھ ساتھ گلیاں (دُرُب) بن گئیں، جو اپنے اپنے محلّے کے شارع عام کا کام دیتی تھیں اور ان کے دونوں سروں کو بھاری دروازوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ گلیاں آگے چل کر کباروں (زُقاق) یا سربستہ راستوں میں بٹ جاتی تھیں۔

بایں ہمہ ابھی تک شہر میں چند چیزیں ایسی موجود تھیں جن سے باہمی اتحاد و اشتراک کا پتا چلتا تھا۔ ان میں سے ایک تو بیرونی مورچہ بند فصیل تھی جس سے پورے شہر کا دفاع ہوتا تھا؛ پھر جامع مسجد الاموی تھی، جو شہر کے دینی و سیاسی مرکز کا کام دیتی تھی اور یہیں سرکاری احکام کا اعلان ہوتا اور وہ منظر عام پر لائے جاتے تھے، اور آخری چیز یہاں کے سُوق تھے جہاں محتسب کے زیر نگرانی اجناس اور ضروری مصنوعات کی بہم رسانی ہوتی تھی۔ کاروبار تجارت انھیں مقامات پر ہوتا رہا جو رومیوں کے قدیم زمانے سے اس مقصد کے لیے مقرر تھے۔ ایک تجارتی علاقہ تو اس شارع کبیر پر واقع تھا جس کے دونوں جانب محرابی چھتے تھے اور دوسرا ستونوں والے راستے پر جو مسجد جامع کے مشرق میں پرانی عبادت گاہ کے بڑے چوراہے (agora) کو جاتا تھا۔ یہ شاہراہیں مکمل طور پر بدل چکی تھیں۔ چھتوں پر دکانیں بن گئی تھیں، خود گذرگاہوں پر سایبان لگا کر عارضی دکانیں قائم کر لی گئی تھیں اور ہر کاروباری علاقے میں بازاروں (اسواق) کا ایک جال بھول بھلیّوں کی طرح بچھ گیا تھا۔ قدیم رومی شارع کبیر (Decumanus) کا ایک مرکز دارالبطّیخ تھا، جو دراصل بغداد کے دارالبطّیخ کی طرح پھلوں کی منڈی تھی۔ اس کے مقابلے میں قدیم چوراہے (agora) کے قریب ہی قیصریوں میں بڑی آمد و رفت رہتی تھی۔ ان مسقّف احاطہ بند منڈیوں میں، شہری باسلیقوں (basilicas) کی طرح، جواہرات، کارچوبی کپڑوں، قالینوں اور سمور جیسی قیمتی چیزوں کی تجارت ہوتی تھی۔

جب تُغتگین کے عہد حکومت میں امن بحال ہو گیا تو نئے محلّے آباد ہونے لگے، مثلاً العُقَیْبَۃ شمال میں، شَغُور جنوب میں اور قصر الحجّاج جنوب مغرب میں۔ شہر کے دروازوں پر دباغت کے کارخانے تھے جن میں چمڑے کا کام کرنے والوں کے لیے خام مواد تیار کیا جاتا تھا، کاغذ بنانے کے دو کارخانے نویں صدی کے اوائل سے چل رہے تھے اور کئی پن چکیاں تھیں جن میں مختلف چکنی چیزیں پیسی جاتی تھیں۔

بُوریوں سے قبل کے عہد کی جو واحد یادگار

اب تک باقی رہی ہے وہ بیت المال کا قبہ ہے جو مسجد جامع میں خلیفہ المہدی کے ایک عامل نے ۱۶۱ھ/۷۷۸ء میں تعمیر کرایا تھا۔

دقاق کے دور حکومت میں شہر کا قدیم ترین شفاخانہ مسجد جامع کے مغرب میں تعمیر ہوا تھا؛ اسی طرح وہیں ۴۹۱ھ/۱۰۹۸ء میں پہلا مدرسہ الصادریۃ حنفیوں کے لیے بنایا گیا تھا۔

کسی زمانے میں دمشق کی اولین خانقاہ طاروسیہ میں دقاق اور اس کی والدہ صفوۃ الملک کے مقبرے موجود تھے لیکن اس خانقاہ کے آخری آثار ۱۹۳۸ء میں معدوم ہو گئے۔ بوریوں کی حکومت میں علمی سرگرمیوں اور سنیوں کی تبلیغ نے دمشق میں فروغ پایا۔ شافعیوں نے اپنا پہلا مدرسہ امینیۃ ۵۱۴ھ/۱۱۲۰ء میں قائم کیا تھا۔ لیکن حنبلیوں کا پہلا مدرسہ شرفیہ ۵۳۶ھ/۱۱۴۲ء سے پہلے تعمیر نہیں ہوا تھا۔ جب نورالدین نے دمشق فتح کیا تو اس وقت سات مدرسے قائم تھے لیکن ان میں سے کسی کا تعلق امام مالکؒ کے مذہب سے نہ تھا۔

دمشق نورالدین کے عہد میں: ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء میں نورالدین کی آمد سے شہر کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ دمشق میں اقامت گزیں ہو کر اس بادشاہ نے، جو پہلے ہی سے حلب کا فرمانروا بن چکا تھا، کلیسیا cilicia کے دامن کوہ سے لے کر جلیل (Galilee) کے پہاڑوں تک پورے شام کے اتحاد کو پکا کر دیا۔ بنو امیہ کے دور کے بعد پہلی بار دمشق پھر ایک وسیع، متحد اور خود مختار اسلامی ریاست کا دارالحکومت بنا۔ نورالدین کی سیاست کی بدولت شہر میں خود اس کے اپنے کردار کی چھاپ لگ گئی، اور دمشق کو فاطمی ملاحدہ اور کافر افرنجیوں کے مقابلے میں راسخ اسلامی عقائد رکھنے والوں کے لیے پشت و پناہ کی حیثیت حاصل ہوگئی، مذہبی جوش و خروش اس زمانے میں ایک بار پھر عود کر آیا جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ سنّی عقائد کو غلبہ نصیب ہو، اور تمام کوششیں جہاد [رک بآن] پر مرکوز ہو گئیں۔ دمشق اہل سنت والجماعت کا مرکز بن گیا۔ کثیر التعداد نئی مذہبی عمارات، مساجد اور مدارس کی تعمیر سے اس کی شہرت میں اضافہ ہوا اور اس دور میں عسکری اہمیت اور مذہبی وقار دونوں کے اعتبار سے اسے اپنی حیثیت مل گئی۔

عسکری نقطۂ نظر سے دفاعی استحکامات کا منصوبہ بڑی احتیاط سے بنایا اور عمل میں لایا گیا۔ فصیل شہر کو مستحکم کیا گیا۔ نئے برج تعمیر ہوئے، جن میں سے ایک آج بھی باب الصغیر کے جنوب میں موجود ہے۔ بعض دروازوں، مثلاً باب شرقی اور باب الجابیہ کو زیادہ مضبوط بنانے پر اکتفا کیا گیا، لیکن دوسرے دروازوں (باب الصغیر اور باب السلام) میں دہرے پھاٹک لگوائے گئے۔ فصیل شہر کی شمالی دیوار کا ایک حصہ بردی کے دائیں کنارے تک بڑھا دیا گیا اور یہاں ایک نیا دروازہ باب الفرج قلعے کی شرقی سمت تعمیر ہوا۔ اس کے برعکس باب کیسان، جو جنوبی جانب تھا، تیغا کر دیا گیا۔

نورالدین نے قلعے کے اندر بھی تعمیرات کیں، چنانچہ باب الحدید کو مستحکم کیا اور ایک وسیع مسجد تعمیر کرائی۔ علاوہ بریں دو وسیع قطعات اراضی شہر کی عسکری سرگرمیوں کے پیش نظر رسالے کی تربیت اور فوج کی قواعد کے لیے مخصوص کیے گئے یعنی میدان الأخضر شہر کے مغرب میں اور میدان الحصی جنوب میں۔

مذہبی اور علمی سرگرمیاں ترقی کے بلند مراحل طے کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں دو خاندان یعنی شافعی المذہب بنو عساکر اور حنبلی المذہب بنو قدامہ بہت ممتاز ہوئے۔ یہ لوگ ابتداءً ۵۵۵ھ/۱۱۶۱ء میں اس علاقے سے آئے تھے جو فصیل شہر کے باہر کوہ قاسیون کی ڈھلانوں پر واقع تھا اور آج کل صالحیہ کے نام سے مشہور ہے۔ عبادت گھروں کی تعداد میں

بہت اضافہ ہوا، خود نور الدّین نے کئی مساجد کو درست یا تعمیر کرایا ۔ سُنّی عقائد اور احادیث کی نشر و اشاعت میں خاص طور سے بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا گیا اور نورالدّین نے حدیث کی تعلیم دینے کے لیے پہلا مدرسہ دارالحدیث جاری کیا ۔ اس چھوٹے سے مدرسے کے اب صرف کھنڈر باقی رہ گئے ہیں ۔ اس کا پہلا معلم شافعی مؤرخ ابن عساکر تھا ۔ کئی اور نئے مدرسے بھی تعمیر ہوے، جن میں سے بیشتر شافعی یا حنفی مسلک سے متعلق تھے ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب المدرسۃ الصالحیہ بننا شروع ہوا، جسے صلاح الدّین نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ۔ العادلیّہ [جہاں اب عرب اکادیمی قائم ہے] کے عظیم مدرسے کی تعمیر کی ابتدا کا سہرا نورالدین کے سر ہے ۔ اس کی تعمیر کا آغاز ۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء میں ہوا اور نصف صدی بعد ۶۱۹ھ / ۱۲۲۲ء میں جا کر اس کی تکمیل ہوئی ۔

ایک اور نیا ادارہ دارالعدل بھی نورالدّین کا مرہون منّت ہے ۔ یہی آگے چل کر دارالسّعادہ کے نام سے مشہور ہوا ۔ یہ انصاف کی عدالت عالیہ اس عمارت میں قائم تھی جو قلعے کے جنوب میں ہے ۔ مساوات کے تقاضوں کے پیش نظر یہاں بادشاہ کے حکم سے چاروں مذاہب کے نمائندے قاضی القضاۃ کے پہلو میں بیٹھتے تھے ۔

دمشقی عمارات میں نئی نئی شکلیں نمودار ہوئیں، جن سے عراق کا اثر ظاہر ہوتا تھا؛ خاص طور پر گنبد قابل ذکر ہے، جسے باہر کی جانب سے مثقّب (honey-comb) بنایا جاتا تھا ۔ یہ نمونہ نور الدّین کے مقبرے اور اس سے ملحق مدرسے کے گنبد میں، جو ۵۶۷ھ/ ۱۱۷۱ء میں تعمیر ہوا، اور مارستان کے باب الدّاخلہ کے قبّے پر ملتا ہے، مؤخرالذّکر کے پھاٹک کی طاقچوں سے تزئین کی گئی ہے ۔ نور الدّین ہی نے اس شفاخانے ("مارستان") کی تعمیر کی، جسے اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں اہم ترین حیثیت حاصل ہے؛ اور مقصد یہ تھا کہ یہ علم طب کی درسگاہ کا کام بھی دے ۔ بارھویں صدی عیسوی میں دمشق کی یادگار عمارتوں کی صحیح فہرست ابن عساکر نے اپنی تاریخ مدینۃ دمشق کے دیباچے میں، جو مقامی جغرافیے سے متعلق ہے، دے دی ہے ۔ نورالدّین کے عہد کے آخر میں مساجد کی تعداد بڑھ کر فصیل شہر کے اندر دو سو بیالیس اور باہر ایک سو اٹھتر ہو گئی تھی ۔

دورِ ایوبیہ : ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں نورالدّین کی وفات پر اس کا بیٹا الملک الصّالح اسمٰعیل، جس کا اتابک امیر شمس الدّولہ ابن المُقدّم تھا، اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا ۔ دمشق میں، جہاں اس زمانے سے جب کہ صلاح الدّین [رک باں] کا والد ایُّوب وہاں کا عامل تھا، ایوّبیوں کے حامیوں کی ایک طاقتور جماعت موجود تھی؛ اب اُمرا طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگے ۔ نو عمر بادشاہ حلب بھیج دیا گیا اور شہر کا مختار ابن المقدم رہ گیا ۔ اپنی حکومت کے استحکام کی خاطر اس امیر نے افرنگیوں سے ہنگامی صلح نامہ طے کیا مگر اس سے آبادی کے ایک حصے کی رائے اس کے سخت خلاف ہو گئی ۔ صلاح الدّین کے گماشتوں نے اسے حامی اسلام کی حیثیت سے پیش کر کے اہل دمشق کو اپنا ہم نوا بنا لیا ۔ صلاح الدین نے، جو کسی زمانے میں نور الدّین کا کُرد باجگذار تھا، جہاد کا عَلَم بلند کیا اور ۵۷۱ھ / ۱۱۷۶ء میں دمشق میں داخل ہو گیا ۔ اگلے چند برسوں میں معرکۂ کارزار متواتر گرم رہا ۔ یہ تیسری صلیبی جنگ کا زمانہ تھا ۔ مسلمانوں کے دل میں اس یہی تمنا تھی کہ کسی طرح افرنگیوں کو واپس سمندر کی طرف دھکیل دیں ۔ آخر ۵۸۳ھ/ ۱۱۸۷ء میں فتح حطّین [رک باں] کے بعد لشکر اسلام بیت المقدس میں واپس پہنچنے کے قابل ہو گیا ۔ صلیبیوں کے ساتھ صلح کر لینے کے چند ماہ بعد خاندان ایوبیہ [رک باں] کے بانی صلاح الدّین نے ۲۷ صفر ۵۸۹ھ / ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو دمشق میں وفات پائی ۔

تدفین پہلے تو قلعے کے اندر عمل میں لائی گئی، لیکن بعد ازاں میت کو مسجد جامع کے شمالی جانب مدرسۃ العزیزیہ میں منتقل کر کے باقاعدہ مرقد بنا دیا گیا۔ سلطان موصوف کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں اور بھائی کے درمیان شدید جنگ چھڑ گئی۔ الافضل [رک بآں] چاہتا تھا کہ دمشق پر، جو ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں اسے باپ کی طرف سے بطور جاگیر ملا تھا، اپنا قبضہ برقرار رکھے، لیکن ۵۹۲ھ/۱۱۹۶ء میں اس کے چچا العادل نے اسے وہاں سے بھگا دیا اور اپنے [دوسرے] بھتیجے العزیز کی حکومت تسلیم کر لی، جو قاہرہ میں صلاح الدین کا وارث قرار پایا تھا۔ تین برس بعد العزیز بھی وفات پا گیا اور طویل تنازعات کے بعد بالآخر ۵۹۷ھ/۱۲۰۰ء میں العادل کو خاندان ایوبیہ کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا۔ صلاح الدین کے اس روحانی وارث کے زیر حکومت اعلیٰ نظم و نسق اور سیاسی امن و اطمینان کا دور شروع ہوا۔ اس زمانے سے قاہرہ سلطنت کا صدر مقام ہو گیا تھا، لیکن دمشق کو بدستور اہم سیاسی، عسکری اور معاشی مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ العادل نے ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء میں دمشق کے نزدیک وفات پائی اور مدرسۃ العادلیہ میں مدفون ہوا۔ الملک المعظم عیسیٰ نے، جو ۵۹۷ھ/۱۲۰۰ء سے شام میں اپنے والد کا نائب تھا اور جس نے ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں یہ صوبہ جاگیر میں پایا تھا، دمشق میں اپنی خود مختاری قائم رکھنے کی کوشش کی، لیکن سیاسی زندگی کے نشیب و فراز اور جوڑ توڑ سے مجبور ہو کر وہ ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء کے شروع میں خوارزم شاہ جلال الدین [رک بآں] کا نام خطبے میں پڑھوانے لگا اور یوں شہر دمشق پر خوارزم شاہ کی برائے نام سیادت قائم ہو گئی۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں المعظم کی وفات پر اس کا بیٹا الملک الناصر داؤد اپنے اتابک عزالدین ایبک کے زیر ولایت وارث تخت ہوا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد امیر الاشرف دیار مضر سے آ پہنچا اور اپنے بھتیجے داؤد کو برطرف کر کے ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں دمشق کی حکومت پر قابض ہو گیا۔

الکامل کی وفات پر، جو ۶۳۵ھ/۱۲۳۸ء میں العادل کی جگہ قاہرہ میں تخت نشین ہوا، دور زوال کا آغاز ہو گیا تھا۔ بھائیوں کے درمیان از سر نو لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ الملک الصالح اسمٰعیل دمشق پر قابض رہنے کی خاطر اپنے بھتیجے الصالح ایوب والی مصر کے مقابلے میں افرنگیوں کے ساتھ مل گیا۔ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں ایوب نے خوارزمیوں کی مدد سے اس پر فتح پائی اور ایک بار پھر دمشق حکومت قاہرہ کے تحت آ گیا۔ ایوب نے ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا تُوران شاہ لا پتہ ہو گیا اور اغلباً چند ماہ بعد قتل کر دیا گیا، اور ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء میں فرمانروائے حلب الملک الناصر یوسف نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ وہ یہاں کا آخری ایوبی بادشاہ تھا۔ مغول کا خطرہ اب بالکل سر پر منڈلانے لگا تھا، ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں بغداد کا سقوط ہوا اور دو سال نہ گزرنے پائے تھے کہ شامی دارالحکومت کی بھی باری آ گئی۔

اس میں شک نہیں کہ نورالدین کے برسر حکومت آ جانے سے دمشق کا احیاء شروع ہو گیا تھا، لیکن صلاح الدین کے عہد حکومت کے حالات ایسے تھے کہ شہر کی ترقی کی رفتار سست رہی۔

دور ایوبیہ میں جب دمشق پھر ایک بادشاہ کا دارالحکومت قرار پایا تو دوبارہ ترقی کا آغاز ہوا۔ آبادی میں اضافے اور اس اضافے کی وجہ سے نئے نئے وسائل دولت کی فراہمی سے یہاں کی عام معاشی زندگی پر بھی خوشگوار اثر پڑا، جو اس لیے اور بھی نمایاں ہوا کہ العادل اور اس کے جانشینوں کے پرسکون دور نے بڑی پر امن فضا پیدا کر دی تھی۔ ان معاشی سرگرمیوں میں ترقی کے ساتھ ساتھ تجارتی روابط بھی بڑھنے لگے۔ اس زمانے سے دمشق میں اطالوی تاجروں کی باقاعدہ آمد کا آغاز ہو گیا۔ صنعت و حرفت میں پھر ترقی شروع ہوئی؛ یہاں

کی ریشمی زربفت کی شہرت بدستور قائم رہی؛ سادہ یا کوفت کاری کے مسی برتن، ملمع کی ہوئی شیشے کی اشیا اور بڑے کی دباغت شدہ کھالوں کی بڑی مانگ تھی۔ اسواق یا منڈیوں میں بے حد چہل پہل رہتی تھی، شہر میں قیصریوں کے ساتھ بنے ہوئے گوداموں (فُندُقوں) کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا اور دارالوکالة نے، جو تجارتی شراکتوں کی ذخیرہ گاہ تھی، بڑی اہمیّت حاصل کر لی۔

افراد خاندان کی خواہش تخت و تاج، نیز افرنگیوں کے خطرے کی روک تھام کو مضبوط کرنے کے لیے اور اپنے دفاعی نظام کو عسکری فنون کی جدید ترین ترقیوں کے مطابق بنانے کی غرض سے آل ایّوب نے دمشق کی فصیل اور قلعے میں تبدیلیاں اور اصلاحیں کیں۔ فصیل کی مضبوطی کا کام محض بڑے دروازوں ہی پر ہوا۔ ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں المعظّم عیسٰی نے باب مشرق اور باب الصّغیر کو مستحکم کیا؛ النّاصر داؤد نے ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں باب تُوما دوبارہ بنوایا؛ باب الفَرج ۶۳۶ھ/۱۲۳۹ء میں ازسر نو بنایا گیا اور آخرالامر الصّالح ایّوب نے ۶۴۱ھ/۱۲۴۳ء میں باب السّلام کو اس طرح ایک نئی صورت دی کہ اس کے ساتھ ایک مربّع بُرج کا اضافہ کر دیا جو آج بھی فصیل کے شمال مشرقی گوشے پر نظر آتا ہے۔ قلعے کی مکمّل طور پر از سر نو تعمیر ہوئی۔ یہ کام جس پر دس برس صرف ہوئے، ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں شروع کیا گیا تھا۔ قلعے کے اندر سلطان کی سکونت کے لیے ایک نیا محل تعمیر کیا گیا؛ اس کے ایک کمرے کے اندر تخت رکھا جاتا تھا؛ نئی عمارتیں بنا کر اُن میں فوجی دفاتر اور دیوانی محکمے قائم کیے گئے۔ موجودہ زمانے تک جو انتظامات چلے آتے ہیں، ان کی ابتدا اسی دور میں ہوئی تھی۔ اگرچہ مغول نے قلعے کو نذر آتش کرکے منہدم کر دیا تھا، تاہم ساتویں/تیرھویں صدی کے بُرجوں میں سے دو ابھی تک اپنی اصل حالت میں قائم ہیں۔

عام خوشحالی کی بدولت آلِ ایّوب نے علما اور مصنفین کی ایسی دریا دلی سے سرپرستی کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس زمانے میں دمشق مسلمانوں کی ثقافتی زندگی ہی کا نہیں بلکہ دین مبین کا حصن حصین بھی تھا۔ اس خاندان کے طریق عمل میں تبلیغی رجحانات کا اظہار اس میں ہوتا ہے کہ اس کے سربراہوں نے سلجوقوں اور زنگیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین اسلام اور اس کے مسلّمہ عقائد کی تبلیغ و اشاعت کی حتی الامکان حوصلہ افزائی کی۔ غیر عسکری تعمیرات کو بھی اس دور میں بہت فروغ ہوا۔ شہزادیاں اور شہزادے، امرا اور عمائدین اور عمال حکومت مقدس عمارتوں کی تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے اور ایک قلیل مدت میں دمشق مدارس کا شہر بن گیا۔ ان کی تعداد، جو ابن جُبَیر نے ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰ء میں بیس بتاتی ہے، ایک ہی صدی میں اس سے چوگنی ہوگئی تھی (ایوبی مدارس کے بارے میں دیکھیے Herzfeld در *Ars Islamica*، ۱۱ - ۱۲ : ۱ تا ۷۱)۔ اس زمانے سے مساجد کی طرح مدرسے بھی اکثر اوقات مع اپنے درسی اور معلّمین و متعلّمین کے رہنے کے کمروں کے اپنے بانی کے مقبرے سے ملحق بنائے جانے لگے (مثال کے لیے دیکھیے العادلیّه اور المعظّمیه)۔ اسی زمانے میں "مقبرہ" مدرسوں سے مربوط ہونے کی وجہ سے دمشق میں ایک مخصوص قسم کی "تُرْبَة" منظر عام پر آنے لگی۔ یہ مقبرہ (تربة) ایک مربّع کمرے پر مشتمل ہوتا تھا جس کی دیواریں استرکاری کے نقوش سے مزیّن ہوتی تھیں۔ اس کے اُوپر چار نیم دائرہ طاقچے اور چار مسطّح طاقچے جنھیں متناسب فاصلوں پر رکھا جاتا تھا، مل کر ایک ہشت پہلو صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اس کے اوپر یکساں عرض و طول کے سولہ طاقچوں سے ڈھول نما سطح تیار کرتے جس پر ایک شانزدہ پہلو گنبد تعمیر ہوتا تھا۔ مربّع عمارت پر گنبد بنانے کی یہ ایک مخصوص صورت تھی۔ اس کی اوّلین مثال، جس

کی تاریخ ہمیں معلوم ہے، مقبرۂ زین الدین ہے، جو ٥٦٧ھ/١١٧٢ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس قسم کی جو یادگار عمارتیں آج بھی سلامت ہیں، ان میں حسب ذیل چھٹی/بارھویں صدی کی ہیں: تربۃ النوری، مدرسۃ النجمیۃ، مدرسۃ العزیزیۃ، جہاں صلاح الدین کا مقبرہ واقع ہے، اور مقبرۂ ابن سلامۃ، جو ٦١٣ھ/١٢٠٦ء میں تعمیر ہوا۔ ایوبی فن تعمیر کی ممتاز ترین خصوصیت اس کا حسن تناسب ہے۔ ان عمارتوں کی روکاریں تراشیدہ پتھر کے موزوں چوکوں سے بنائی گئی ہیں۔ ان میں سنگ بسل (Basalt) اور چونے کے پتھر یکے بعد دیگرے لگا کر آرائش کی ایک خوبصورت شکل نکالی گئی ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال مدرسۃ قلیجیۃ ہے، جو ٦٥١ھ/١٢٥٣ء میں مکمل ہوا۔ گنبدوں کا حجم ایسا ہے کہ وہ شہری عمارات کے پس منظر کا ایک طبعی حصہ بن گئے ہیں۔

ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کا شمار دمشق کے زریں ادوار میں ہوتا ہے۔ دمشق ایک بار پھر سیاسی، تجارتی، صنعتی، عسکری، علمی اور مذہبی مرکز بن گیا۔ جو عمارتیں اس شہر کے لیے ابھی تک باعث زینت ہیں، ان میں سے بیشتر اسی دور میں تعمیر ہوئی تھیں۔

دور ممالیک (٦٥٨ھ/١٢٦٠ء تا ٩٢٢ھ/١٥١٦ء):

جب ربیع الاول ٦٥٨ھ/مارچ ١٢٦٠ء میں ہلاکو کی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں تو اس شہر کی تاریخ یکسر بدل گئی۔ یہاں کا عامل فرار ہونے پر مجبور ہو گیا، محافظ دستوں کو جنوب کی جانب پسپا ہونا پڑا اور یہاں کا فرمانروا الملک الناصر اور اس کے بچے قید کر لیے گئے۔ خاندان ایوبیہ ختم ہو گیا۔ حملہ آور فوجوں کی پیش قدمی عین جالوت [رک بآں] کے مقام پر روکی گئی، جہاں مملوکوں نے امیر قوطوز اور امیر بیبرس کی سپہ سالاری میں مغول کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر انھوں نے دمشق خالی کر دیا، جس کا قبضہ قیمری کے طاقتور کرد خاندان نے سلطان مصر کی فوج کے حوالے کر دیا۔ شہر کے عیسائی اپنے اس رویے کی بدولت جو انھوں نے مغول کے ساتھ روا رکھا تھا، کسی قدر انتقامی کارروائی کا شکار ہوئے۔ اب دمشق کی جگہ قاہرہ نے لے لی، جہاں ٦٥٦ھ/١٢٥٨ء سے ایک برائے نام خلافت چلی آ رہی تھی۔ دمشق سیاسی اعتبار سے مصر کا ماتحت صوبہ ہو کر رہ گیا۔

بایں ہمہ یہ شہر صوبۂ شام یا دوسرے الفاظ میں مملکۃ یا نیابۃ الدمشق کا اہم ترین شہر متصور ہوتا تھا (اس کی انتظامیہ کے لیے دیکھیے Gaudefroy Demombynes: *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، پیرس ١٩٢٣ء، ص ١٣٥ تا ٢٠١)۔ پہلے جلیل القدر مملوک سلطان الملک الناصر بیبرس [رک بآں] نے دمشق پر خاص توجہ مبذول کی اور اپنے عہد حکومت (٦٥٨ھ/١٢٦٠ء تا ٦٧٦ھ/١٢٧٧ء) کے دوران میں اکثر وہاں جاتا رہا۔ اس نے قلعے کو از سر نو درست کیا، کیونکہ شہر میں ورود سلطانی کے موقع پر یہی شاہی فرودگاہ بنتا تھا۔ اس میں ٹکسال، سلاح خانہ، فوجی ضروریات کا گودام، خوراک کی ذخیرہ گاہیں، ایک چکی اور چند دکانیں بھی تھیں (دیکھیے J. Sauvaget: *La Citadelle de Damas*، در *Syria*، ١١ (١٩٣٠ء): ٥٠ تا ٩٠، ٢١٦ تا ٢٤١)۔

بیبرس نے میدان الاخضر میں، جو شہر کے مغرب میں واقع تھا، ایک محل تعمیر کرایا جس میں سیاہ اور ہلکے بادامی رنگ کے روڑے جمائے گئے تھے۔ یہ مشہور قصر ابلق تھا جس کے نمونے پر آئندہ سلطان محمد بن قلاوون نے قاہرہ میں محل بنوایا۔ چند صدیوں کے بعد دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں ترک سلطان سلیمان نے اس عمارت کی جگہ پر ایک ”تکیہ“ یا خانقاہ بنوا دی۔ ٦٧٦ھ/١٢٧٧ء میں بیبرس نے قصر مذکور میں وفات پائی اور اپنے بیٹے الملک السعید

کے حکم کے مطابق مدرسۃ الظّاھریہ میں ، جہاں آج کل کتب خانۂ ملی واقع ہے، دفن ہوا۔ اس کے سترہ سالہ طویل عہد حکومت میں دمشق میں صرف چار عامل مقرر ہوے، لیکن اس کی وفات کے بعد شہر کو سیاسی بے چینی کے ایک طویل دور سے گزرنا پڑا، جس کے دوران میں وقتاً فوقتاً بغاوتیں بھی برپا ہوتی رہیں.

سلطنت میں دوسرا سب سے اہم شہر دمشق ہی رہا۔ اس کے والی کے منصب پر بالعموم حلب کی نیابت سے آنے والے کسی ممتاز مملوک کو مقرر کیا جاتا تھا۔ قلعے میں ایک عامل کی موجودگی سے والی دمشق اور سلطان کے درمیان کسی مقابلے یا رقابت کا امکان معدوم ہوگیا تھا۔ بالفاظ دیگر اب یہاں کے عامل دو ہوتے تھے، ایک تو نائب شہر، جسے پروانۂ تقرر سلطان کی جانب سے عطا ہوتا تھا اور جو قلعے کے جنوب میں دارالسّعادۃ میں رہتا اور وہیں دربار لگاتا تھا؛ اور دوسرا نائب قلعہ، جسے ایک خصوصی مرتبہ حاصل تھا اور جو سلطان کا ذاتی نمائندہ تصور کیا جاتا تھا۔ ان دونوں حاکموں اور ان کے اپنے اپنے طبقوں کے امرا کے درمیان مسلسل رقابتیں سلطان کی سیادت برقرار رہنے کی کافی ضمانت تھیں۔ جب کبھی قاھرہ میں سلطان کی تبدیلی عمل میں آتی تو بالعموم والی دمشق بغاوت کا عَلَم بلند کر دیتا۔ چنانچہ جب بیبرس کا بیٹا السّعید تخت سے معزول کیا گیا اور سلطان الملک المنصور قلاؤون [رکن بان] نے اس کی جگہ سنبھالی تو یہاں کے والی سنقورالاشقر نے اس کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ امرا کی اعانت اور مشہور عالم مؤرخ، قاضی القضاۃ ابن خَلِّکان کے ایک فتوے سے تقویت پا کر سنقور نے قلعے پر قبضہ کر لیا اور حاکم قلعہ لَجِین [لاجین] کو گرفتار کرکے جمادی الآخرۃ ۶۷۸ھ/اکتوبر-نومبر ۱۲۷۹ء میں اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کیا، تا آنکہ بعض دمشقی دستوں کے اختلاف کی بدولت صفر ۶۷۹ھ/جون ۱۲۸۰ء میں قلاؤون کی فوجوں نے اس پر فتح پائی اور سنقور الرَّحْبہ کی طرف بھاگ گیا، جو دریاے فرات کے کنارے واقع ہے۔ لَجِین کو، جو اب آزاد ہو چکا تھا، شہر کا والی مقرر کر دیا گیا۔ ہر نیا سلطان اکثر والیوں کو تبدیل کر دینے کا فیصلہ کیا کرتا تھا؛ چنانچہ الملک العادل کَتْبغا کی تخت نشینی کے موقع پر عزّالدین ایبک کو ۶۹۵ھ/۱۲۹۶ء میں اس عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا، اور اس کی جگہ سلطان نے شجاع الدّین اَغِرلو کو نامزد کیا۔ کَتْبغا کی معزولی کے بعد، جسے قلعۂ دمشق میں قید کر دیا گیا تھا، لَجِین نے، جو سلطان بن گیا تھا، ۶۹۶ھ/۱۲۹۷ء میں سیف الدین قبچاق کو والی مقرر کیا۔ مؤخرالذکر نے اپنی خدمات شاہ غازان [رکن بان] کے سامنے پیش کر دیں اور جب شاہ مذکور نے شام پر یلغار کی تو اس نے اس کی رفاقت اختیار کی۔ ۶۹۹ھ/۱۳۰۰ء میں مغول لشکر دمشق میں داخل ہوا۔ اس نے مسجد جامع پر قبضہ کر لیا مگر قلعے کو تسخیر کرنے میں ناکام رہا جہاں مملوکوں نے مورچہ بندی کر لی تھی۔ ان دونوں مرکزوں کے درمیان شہر کا جو علاقہ تھا اُسے شدید نقصان پہنچا اور نورالدّین کا [تعمیر کردہ] دارالحدیث بھی اس کی زد میں آ گیا۔ جب مغول نے شہر کو چھوڑا تو قبچاق مصر گیا اور ایک بار پھر نئے سلطان الملک النّاصر محمد بن قلاؤون کے ساتھ مل گیا۔ ۷۰۲ھ/۱۳۰۳ء میں مغول کی جانب سے ایک نیا خطرہ شہر پر منڈلانے لگا تھا، لیکن ان کی پیشقدمی روک دی گئی۔ ۷۱۲ھ/۱۳۱۲ء کے اوائل سے محمد بن قلاؤون کے تیسرے دور حکومت میں تَنْکِز دمشق کا والی مقرر ہوا۔ وہ صحیح معنوں میں حکومت کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس کے اقتدار کو امراے شام نے تسلیم کر لیا۔ وہ نہ صرف براے نام بلکہ در حقیقت شام کا نائب السّلطان تھا۔ اس نے یہاں سلطان کا وقار قائم رکھا جس کی نمائندگی کا فرض اس

نے ربع صدی سے زیادہ مدت تک انجام دیا۔ اس زمانے میں دمشق کو جو خوشحالی نصیب ہوئی اس کے باعث علمی و فکری سرگرمیوں نے بڑا فروغ پایا۔ یہ مصلح اسلام ابن تیمیہ اور مؤرخ الصَّفدی کا زمانہ تھا۔ ۷۱۷ھ/ ۱۳۱۷ء میں تنکز نے وہ مسجد تعمیر کی جس کے احاطے کے باہر آگے چل کر اس کا مقبرہ تیار ہوا۔ چند برس بعد اس نے دمشق کی جامع کبیر کی بھی مرمت کروائی۔ آخرالامر ۷۳۹ھ/۱۳۳۹ء میں اس نے ایک دارالحدیث کی بنیاد رکھی۔ نئے سلطان الملک ابوبکر کی تخت نشینی پر دفعۃً وہ عتاب سلطانی کا مورد بن گیا۔ چنانچہ ذوالحجہ ۷۴۰ھ/ جون ۱۳۴۰ء میں وہ گرفتار ہو کر سکندریہ میں قید کر دیا گیا جہاں وہ زہر خورانی سے فوت ہوا۔

۷۳۰ھ/ ۱۳۴۰ء [بہ تصحیح ۱۳۳۰ء] سے ۷۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء تک وہ زمانہ تھا جب ابن بطوطہ اسلامی بلاد مشرق کی سیاحت کر رہا تھا۔ اس دوران میں بارہ بحری سلاطین یکے بعد دیگرے قاہرہ کے تخت پر بیٹھے اور درجن بھر والی، نائب شہر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان میں سے چند ایک کئی دفعہ شہر کی تقدیر کے مالک رہے۔ یہ ایک مسلسل کشاکش کا زمانہ تھا جو کسی نہ کسی کی آرزوے ملک و دولت کے باعث جاری رہتی تھی اور "زُعر" کی دراز دستی اسے اور بھی ہوا دیتی تھی، کیونکہ یہ شہری سپاہ، جس کا اصل مقصد شہر کا دفاع تھا، اپنے فرائض منصبی کو نظر انداز کرکے شہری آبادی کو دہشت زدہ کرتی رہتی تھی اور اکثر اوقات اس کی کوئی روک تھام بھی نہ ہوتی تھی۔

۷۳۴ھ/۱۳۸۲ء [بہ تصحیح ۱۳۳۴ء] میں بَرْقُوق [اَرکَ بان] کی تخت نشینی سے چرکسی (Circassian) سلاطین کا ایک نیا خاندان بر سر اقتدار آ گیا جسے بُرجیہ بھی کہا جاتا ہے۔

۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء میں چند ہفتوں کے لیے دمشق حلب کے ایک والی یَلْبُغَا [دیکھیے بوغا] النّاصری کے قبضے میں چلا گیا، جو سلطان مصر سے باغی ہو گیا تھا۔ شام پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ دمشق کی فصیل سے گزر کر شہر میں داخل ہوا اور برقوق کی بھیجی ہوئی ایک فوج کو شکست فاش دے کر مصر کی جانب بڑھا۔ اب کے خود اس نے شکست کھائی لیکن شعبان ۷۹۲ھ/ جولائی۔ اگست ۱۳۹۰ء میں ہم اسے ایک بار پھر والی دمشق کے عہدے پر فائز دیکھتے ہیں۔

اگرچہ برْقُوق کو تیمور کی پیش قدمی کی اطلاع مل چکی تھی تاہم اُسے اپنے ملک کے دفاع کو مزید مستحکم کرنے کی فرصت نہ ملی اور ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۹ء میں وفات پا گیا۔ دمشق میں سیف الدّین تَنْبک نے، جو یہاں ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء سے حکومت کر رہا تھا، نئے سلطان فَرَج کے خلاف بغاوت کر دی اور مصر پر چڑھائی کرنے چلا۔ غزّہ کے قریب اُسے شکست ہوئی، وہ گرفتار ہوا اور دمشق میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ امرا کی باہمی رقابتوں نے شام کو پارہ پارہ کر دیا تھا چنانچہ اس پر تیمور کا قبضہ بڑی آسانی سے ہو گیا۔ مغل سپہ سالار بڑھتے بڑھتے دمشق تک آ پہنچا اور یہیں شہر کے قریب اس کے پڑاؤ میں جا کر ابن خَلْدون نے تیمور سے ملاقات کی جو تاریخ میں یادگار ہے۔ سلطان فَرَج، جو برقُوق کے بھتیجے امیر مَدَّن کی مدد پر آیا تھا، اپنے ساتھیوں کے مسلسل ساتھ چھوڑ دینے کے باعث واپس جانے پر مجبور ہوا۔ شہر [دمشق] کی (تیموری) تسخیر کے بعد لوٹ مار کی عام اجازت مل گئی تھی۔ قلعہ ایک ماہ تک مقابلے میں ڈٹا رہا۔ آتش زنی کی کئی وارداتوں سے شدید نقصان پہنچا اور بہت سے افراد جان سے گئے۔ اس آفت سے جامع کبیر تک نہ بچ سکی اور نہ دارالسّعادۃ محفوظ رہا۔ ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۱ء میں تیمور دمشق سے رخصت ہوا مگر یہاں کے تمام

باقی ماندہ با ہنر معماروں اور کاریگروں کو اپنے ساتھ سمرقند لے گیا۔ وسیع پیمانے پر آبادی کا یہ انخلا شہر کی تاریخ کے عظیم ترین حادثات میں شمار ہوتا ہے۔ مغول کی رخصت کے بعد امیر تغری بردی الظاہری اس تباہ شدہ شہر کا، جو اپنی دولت اور آبادی سے محروم ہو چکا تھا، عامل بنا۔ علاقے میں دم نہ رہا تھا اور اُسے ہزاروں مشکلات کا سامنا تھا۔ بارے دو بادشاہوں کے طویل عہد حکومت نے دمشق کو اپنے کھنڈروں سے اُبھرنے کا موقع دیا۔ ہمارا مطلب سلطان برس بای (۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء تا ۸۴۱ھ/۱۴۳۸ء) اور اس سے بھی زیادہ اہم قائت بای [رک باں] کے عہد سے ہے جو ۸۷۲ھ/۱۴۶۸ء سے ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء تک جاری رہا اور ملک میں امن و سکون کا ایک طویل دور لانے کا باعث بنا۔ علاوہ بریں ۱۶ شعبان اور ۱۰ رمضان ۸۸۲ھ / ۲۳ نومبر اور ۱۶ دسمبر ۱۴۷۷ء کے مابین یہ سلطان خود دمشق آیا۔ اس زمانے میں یہاں کا عامل امیر قجمس تھا۔

سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے ایک طرف حکومت کے محاصل میں زبردست کمی واقع ہو گئی تھی اور دوسری جانب اس کے اخراجات حد سے بڑھ گئے تھے۔ میزانیہ کو متوازن کرنے کے لیے حکومت وقت مزید محصول لگانے پر مجبور تھی، جس سے رعایا کی مالی پریشانیوں میں اضافہ ہونا ناگزیر تھا۔ اس سے نئے سیاسی ہنگامے پرورش پاتے، جن کو فرو کرنے کے لیے حکومت بعض اوقات تشدد کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس صورت حال کا بالآخر خاتمہ قانصوہ الغوری (۹۰۵ھ/ ۱۵۰۰ء تا ۹۲۲ھ / ۱۵۱۶ء) کا عہد حکومت آنے ہی سے ہوا۔ اس آخری مملوک سلطان کو آل عثمان کے مقابلے میں، جنھوں نے شام پر حملہ کر دیا تھا، اپنا دفاع کرنا پڑا۔ وہ رمضان ۹۲۲ھ/وسط اکتوبر ۱۵۱۶ء میں جنگ میں مارا گیا اور سلطان سلیم اول کی فوجیں دمشق میں داخل ہو گئیں۔

یہ عجیب اجتماع ضدین ہے کہ شہر میں عمارتوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسی المناک دور میں تیار ہوئی۔ ممالیک کی زندگی کا نہج کچھ ایسا تھا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں وہ وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے، مگر انھوں نے اپنے لیے کم از کم آخری آرام گاہوں کا بندوبست ضرور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے بہت کم مدارس تعمیر کیے لیکن مقبروں اور مقبرہ مسجدوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔

اس عہد کے فن میں کہیں کہیں جدت نظر آتی ہے، کیونکہ یہ نیا حکمران خانوادہ اسلامی فنی روایات کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اپنے اوائل عہد میں ممالیک نے ایوبی اسلوب کے مطابق عمارتیں بنوائیں۔ مدرسۃ القاہریّۃ، جو اب کتب خانۂ ملی ہے اور جہاں بیبرس کا مقبرہ واقع ہے، دراصل الاَقْبقی کا گھر تھا، جہاں صلاح الدّین کا والد ایوب مقیم رہا تھا۔ ۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء میں اس کے اندر جو تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں وہ ایک گنبد اور ایک شش پہلو دروازے کے اضافے تک محدود رہیں۔

دہرے مقبرے کو نئی طرز کی واحد عمارت کہا جا سکتا ہے۔ سلطان کتبغا کا پرانا مقبرہ، جو ۶۹۵ھ/ ۱۲۹۶ء میں تعمیر ہوا تھا، دمشق میں اس طرز کی پہلی مثال تھا۔

۷۴۷ھ/ ۱۳۴۶ء میں یلبغا نے، جو اُن دنوں شہر کا عامل تھا، ایک عمارت ایک سابقہ مسجد کی جائے وقوع پر بنوائی، جس کا نقشہ اسے مسجد جامع کو دیکھ کر سوجھا تھا۔ موجودہ میدان المرجہ کے نواح میں یہی وہ مسجد تھی جہاں پر نیا عامل شہر میں رعب داب کے ساتھ داخل ہونے سے قبل خلعت زیب تن کیا کرتا تھا۔

صنّاعی کا زوال، جس کے آثار آٹھویں صدی ہجری/

چودھویں صدی عیسوی کے دوران میں واضح تر ہونے لگے تھے، نویں صدی ہجری کے اوائل میں تیمور کی غارت گری کے بعد پوری طرح منظر عام پر آ گیا۔ اب ہر چیز ظاہری ہیئت پر قربان کی جانے لگی۔ بڑی بڑی عمارتیں محض نمائشی آرائش کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ اِس ذوق خوشنمائی کا اظہار ان میناروں میں ہوا جن کی لاٹھیں کثیر الاضلاع بنائی جاتی تھیں اور اُوپر بہت سے جھرو کے اور توڑے یعنی آگے بڑھے ہوے چھجّے تیار کیے جاتے تھے اور ان کی کثرت اور یک رخّے منظر سے پورے شہر کا فضائی نظارہ یکسر بدل گیا۔ اس کی پہلی مثال جامع ھشام کا منیار تھا، جو ۸۳۰ھ / ۱۴۲۷ء میں تعمیر ہوا۔ رنگ برنگ کی رو کاریں بہت مقبول ہو گئیں بلکہ ان میں ترصیع بھی کی جانے لگی۔ مسجد الصّابونیّۃ، جو ۸۶۸ھ/ ۱۴۶۴ء میں مکمل ہوئی اور سیبے کا مقبرہ مدرسہ، جو جامع الخزّاطین کے نام سے مشہور ہے اور نویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے ابتدائی برسوں میں تعمیر ہوا، آخری مملوک فرمانرواؤں کے عہد میں فن تعمیر کے زوال کی دو ممتاز مثالیں ہیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ بیشتر مملوک یادگاریں فصیل شہر سے باہر تعمیر ہوئیں، فصیل شہر کے اندر گنجائش باقی نہیں رہی تھی اور شہر گویا چھلک پڑا تھا، وجہ اس کی وہی اجتماع اضداد سمجھیے، کہ "اس المناک دور میں اقتصادی سرگرمیوں کو انتہائی فروغ حاصل ہوا تھا"۔ پچھلی چند صدیوں میں وہ تمام صنعت و حرفت جس کی ترقی سلاطین کی سرپرستی کی مرہون منت تھی، اب اس کے فروغ کا انحصار فوجی امرا پر تھا، جو امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی گزارنا کرتے تھے۔ دمشق حَوران کے غلّے کی ایک بہت بڑی منڈی تو تھا ہی، اب وہ ایک بڑا صنعتی شہر بھی بن گیا اور اس نے سامان تعیش اور اسلحہ کی صنعت میں خصوصیت حاصل کر لی۔ کاروبار کی ترقی منڈیوں ("اسواق") کی نئی توسیعات سے نمایاں ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف تجارتی علاقے اپنے گاہکوں کی اقسام کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہوتے جاتے تھے۔ ایک نیا محلّہ تحت قلعہ، شہر کے شمال مغرب میں قلعے کے نیچے آباد ہو گیا، سُوق الخیل میں، جس کا کھلا میدان بدستور عسکری زندگی کا مرکز رہا، بہت سے کاریگر آ رہے، جن کے گاہکوں کا تعلق بنیادی طور پر فوج سے تھا اور جنھوں نے اندرون شہر میں اپنی دکانیں دوسرے کاریگروں کے حوالے کر دی تھیں۔ پھلوں اور سبزیوں کا تھوک بیوپار بھی بیرون شہر منتقل ہو گیا۔ اُلعُقَیبہ میں، جہاں امرا اور ان کے ارکانِ جُند رہتے تھے، ایک نیا دارالبطّیخ قائم ہوا۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک اقتصادی بحران کے اوّلیں آثار ظاہر ہونے لگے۔ سرکاری خزانہ خالی ہو چکا تھا اور اس کا کاروبار صرف دفع الوقتی کی تدبیروں سے چل رہا تھا، لیکن جیسا کہ Ludovico de Varthema (*Itinerario*، ج ۵ تا ۷)، جو ۹۰۷ھ / ۱۵۱۲ء میں دمشق آیا تھا، اور اس جیسے دوسرے سیّاحوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے، تجارت کی گرم بازاری ابھی تک جاری تھی۔ یورپ اور اسلامی ممالکِ مشرق کے درمیان زوردار تجارت سے شہر کو بڑا فائدہ پہنچا۔ یورپ سے تاجر بکثرت یہاں آتے تھے اور خوب کاروبار کرتے تھے، لیکن وہ اہلِ دمشق سے، جو خود سیانے تاجر تھے، کسی قسم کی تجارتی اجارہ داری حاصل نہ کر سکے۔ یہ سوداگر سب سے بڑھ کر فلانڈرز Flanders کا کپڑا؛ تھے اور ریشمی زربفت، تانبے کے کوفت کاری یہاں لاتے کے برتن، مینا کیا ہوا شیشے کا سامان لاد کر یہاں سے رخصت ہو جاتے تھے۔ راس امید کا بحری راستہ دریافت ہو جانے کے بعد بھی اس کے اثرات فوری طور پر

محسوس نہیں ھوے۔ آل عثمان کی آمد کے قریب تجارت کی گرم بازاری میں کمی آجانے کا اصل باعث محاصل کی زیادتی ھی سمجھنا چاھیے۔

دور آل عثمان (۹۲۲ھ/ ۱۵۱۶ء تا ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء): ۲۵ رجب ۹۲۲ھ/۲۴ اگست ۱۵۱۶ء کو ترکی لشکر نے حلب کے قریب مرج دابق کے مقام پر ممالیک کے رسالے کو میدان جنگ سے بھگا دیا۔ اس فتح کا سہرا ان کے اعلٰی تربیت یافتہ رسالے اور برتر قسم کے توپ خانے کے سر ھے۔ چونکہ مقامی حکام (نائبین) کی اکثریت ترکوں کے ساتھ آملی تھی، لہٰذا اس کامیابی کے بعد پورے شام کو بہت جلد فتح کر لینا سلطان سلیم اول کے لیے آسان ھو گیا۔ دمشق کی طرف سے عملاً کسی مزاحمت کا سامنا نہیں ھوا، کیونکہ ممالیک کا حفاظتی دستہ وھاں سے پسپا ھو گیا۔ یکم رمضان ۹۲۲ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۵۱۶ء کو سلطان شہر میں داخل ھوا۔ تین ماہ بعد غزّہ کے قریب ممالیک کے ان دستوں کو شکست ھوئی جو مصر کے دفاع پر مامور تھے۔ شام کی امدادی افواج کا سپہ سالار جنبردی الغزالی اپنی فوج سمیت سلطان سے مل گیا اور اسے والی دمشق کے عہدے پر واپس جانے کی اجازت دے دی گئی جس پر آخری مملوک سلطان قانصوہ الغوری نے اسے نامزد کیا تھا۔

آل عثمان کی آمد کو اھل دمشق نے ایک مقامی واقعے سے زیادہ حیثیت نہیں دی۔ ان کے نزدیک یہ کوئی انقلابی واقعہ نہ تھا، جو کسی نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ھوتا۔ ان کے خیال میں تو صرف آقا بدلے تھے۔ پہلے قاھرہ کے مملوک حاکم تھے اب ان کی جگہ غیر ملکیوں کے ایک اور ذی اقتدار گروہ یعنی ینی چری نے ترکی سے آ کر حکومت سنبھال لی، لیکن کچھ زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ طبقۂ امرا کی طرف سے مخالفت شروع ھوئی۔ جنبردی نے وہ تمام عناصر اپنے گرد جمع کر لیے جو ترکوں کے خلاف تھے۔ ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں سلیم اول کی وفات پر والی دمشق نے سلطان سلیمان کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور قلعے پر قابض ھو گیا۔ جنبردی طرابلس، شام، حمص اور حماۃ کو اپنے مقبوضات میں شامل کر کے حلب کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ کر لیا، مگر ناکام رہا اور واپس دمشق آ گیا۔ سلیمان نے [اسے کچلنے کے لیے] فوج روانہ کی، جس نے شام کی سرحد عبور کر لی اور جنگ قابون میں جو دمشق کے شمال میں ھے، ۱۷ صفر ۹۲۷ھ/ ۲۷ جنوری ۱۵۲۱ء کو والی شام مارا گیا۔ اس کے بعد ترکی سپاہ نے جس تشدّد اور سختی کا مظاھرہ کیا اس سے دمشق اور اس کے نواح میں دھشت بیٹھ گئی۔ شہر کے ایک تہائی حصّے کو ینی چریوں کے ھاتھوں نقصان پہنچا۔

سلیمان کے عہد حکومت میں سیاسی نظام تبدیل ھو گیا اور انتظامیہ میں باقاعدگی کے آثار ظاھر ھوے۔ ۹۳۲ھ/۱۵۲۵-۱۵۲۶ء میں آل عثمان نے دمشق کی اراضی، آبادی اور محاصل کا پہلا جائزہ لیا (دیکھیے دفتر خاقانی و B. Lewis: *The Ottoman Archives as a source of the history of the Arab Lands*، در JRAS، ۱۹۵۱ء، ص ۱۵۳ و ۱۵۵، جہاں دمشق سے متعلق دفاتر کی فہرست دی گئی ھے)۔ دمشق کا مرتبہ اس وسیع و عریض سلطنت میں، جس پر ترک سلطان کا ظلّ عثمانی چھایا ھوا تھا، ایک معمولی پاشالیق سے زیادہ نہ تھا۔ دمشق کے شہر کو ایک صدی تک مصر کے چرکسی فرمانرواؤں کے عہد میں، سیاسی جوڑ توڑ کا مرکز ھونے کا جو امتیاز حاصل رہا تھا وہ اس سے بھی اب یقیناً محروم ھو گیا۔ مختلف پاشا یکے بعد دیگرے اور جلد جلد یہاں کی حکومت پر مامور ھوتے رھے۔ ایک قاضی اور ایک مہتمم مالیات ان کا معاون ھوتا تھا، لیکن اُسے حفاظتی فوج پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء اور ۱۱۰۳ھ/۱۶۷۹ء [یہ تصحیح ۱۶۹۱ء]

کے درمیان کے زمانے میں دمشق پر ایک سو تینتیس والیوں نے حکومت کی۔ ان کے ناموں کی ایک فہرست اور عہد حکومت کا بیان H. Laoust : *Les gouverneurs de Damas sous les Mamelouks et les premiers Ottomans*، دمشق ۱۹۵۲ء، میں ملے گا۔

بارھویں صدی ہجری کے اوائل/سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں پوری سلطنت میں نئے خیالات چھا گئے۔ سلاطین اپنے اختیارات کھو بیٹھے اور حرم سرائے (Seraglio) میں ہی رہنے لگے۔ سلطنت عثمانیہ کی حدود سمٹنے لگیں، لیکن اب بھی یہ اتنی وسیع تھیں کہ دمشق دشمن سے محفوظ رہا۔ البتہ اس زمانے میں یہاں کی آبادی اندرونی آفتوں سے دو چار ہوئی۔ سرکاری عہدے مستاجری پر دیے جانے لگے۔ یہ مستاجر یا ٹھیکے دار اور بالخصوص والی اپنے منصب کے حصول پر صرف کی ہوئی رقم جلد از جلد وصول کرنے کے خواہاں ہوتے اور عوام پر دباؤ ڈالتے تھے۔ رشوت ستانی عام ہو گئی اور قواعد و ضوابط سے انحراف معمول بن گیا۔ بایں ہمہ ایک خاص حد تک دمشق کی خوشحالی قائم رہی۔ یہ دو باتوں کی مرہون منت تھی یعنی تجارت اور حج کعبہ۔

اس سے بہت قبل یعنی ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء ہی میں فرانس نے باب عالی سے ایک معاہدۂ امتیازات خصوصی طے کر لیا تھا جس کی رو سے ترکی بندرگاہیں فرانسیسی تاجروں کے لیے کھل گئی تھیں اور وہ بحیرۂ روم کے تمام مشرقی ممالک میں تجارت کر سکتے تھے۔ گرانبار محاصل، سرکاری اہلکاروں کی بد سلوکی، اور بعض اوقات عدم تحفظ کے باوجود بیرونی تجارت بہت منفعت بخش تھی اور سیاسی واقعات اطراف سلطنت میں تجارت کی گرم بازاری میں کبھی حائل نہ ہو سکے تھے۔ شام کے دوسرے اقطاع کی طرح دمشق میں بھی مقامی عیسائی فرنگیوں اور حکومت ترکی کے اہلکاروں نیز یہاں کے باشندوں کے درمیان واسطے کا کام دیتے تھے۔ اہل دمشق ایسی عربی بولتے تھے جس میں گزشتہ چار صدی کے دوران میں ترکی کے بہت سے الفاظ دخیل ہو گئے تھے۔ تاجروں کی کثرت سے آمد و رفت کی بدولت کئی "خانیں" (سرائیں) تعمیر ہو گئیں جو غیر ملکی تاجروں کے لیے ہوٹلوں، صرافے اور گوداموں کا کام دیتی تھیں۔ قدیم ترین، خانوں مثلاً "خان الحریر" کا، تعمیری نقشہ ملک شام کے مروجہ نقشے ہی کے مطابق ہے، اسے ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں درویش پاشا نے تعمیر کرایا تھا اور ابھی تک سلامت ہے، اس میں ایک صحن، جو عموماً مربع ہوتا ہے، اس کے چاروں طرف ایک محرابی دالان جس میں دکانوں اور اصطبلوں کے دروازے کھلتے ہیں اور اس کی بالائی منزل مسکونات کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ یقیناً وینسی (Venetian) فُندُق کی شکل بھی یہی ہو گی جو دمشق میں ۱۵۳۳ء کے بعد ظہور میں آئی تھی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس نقشے میں اصلاح کی گئی۔ وسطی صحن کا رقبہ کم کر کے اس پر گنبد بنا دیے گئے۔ اس طرح سامان تجارت موسمی خرابیوں سے محفوظ ہو گیا۔ یہ نئی قسم کی عمارت صرف دمشق سے مخصوص تھی۔ آج بھی "خان سلیمان پاشا" موجود ہے، جس کی تعمیر ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۲ء میں ہوئی تھی۔ اس کے وسطی صحن پر دو بڑے بڑے گنبد بنے ہیں۔ اس سلسلے کی اہم ترین عمارت "خان اسعد پاشا" ہے جو ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ آج بھی قائم ہے اور یہاں کاروبار ہوتا ہے۔ فن تعمیر کا یہ شاہکار ایک وسیع و عریض مربع صحن پر مشتمل ہے۔ اس کے اُوپر آٹھ چھوٹے گنبد بنے ہیں، جن کے وسط میں ایک بڑا گنبد سنگ مرمر کے چار ستونوں پر قائم ہے۔

یورپ کے ساتھ تجارت ولایت دمشق کی بندرگاہوں سے ہوتی تھی جن میں سے اہم ترین صیدا تھی۔

چونکہ عثمانی سلاطین نے مقامات مقدسہ کی حفاظت کی ذمے داری [خادم الحرمین] بھی سنبھال لی تھی اس لیے انہوں نے حج کعبہ کے بارے میں خاص دلچسپی کا

اظہار کیا اور حج، دمشق کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔ حضری علاقے میں "دَرْب الحجّ" [شاہراہ حجاج] کی آخری منزل ہونے کے باعث اس شہر میں ہر سال سلطنت کے شمالی علاقوں سے آنے والے حجاج ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ اس سالانہ اجتماع سے تجارتی کاروبار میں بہت ترقی ہوئی۔ صحرا کو عبور کرنے کی تیاریوں کے سلسلے میں، حجاج اس جگہ اپنے قیام سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہاں وہ بار برداری اور سواری کے لیے جانور، راہ میں قیام کے لیے خیمے اور تین ماہ کی ضروریات کے لیے خوراک خریدتے تھے۔ وقت مقررہ پر پاشاے دمشق، جسے امیرالحجّ کا لائق رشک لقب حاصل ہوتا تھا، سرکاری قافلے کی قیادت کرتا اور محمل لے کر، فوج کی حفاظت میں، مقامات مقدسہ کی طرف روانہ ہو جاتا۔ واپسی کے سفر میں بھی دمشق پہلا اہم شہر ہوتا تھا چنانچہ یہاں حجاج عرب سے خرید کر لایا ہوا سامان، مثلاً قہوہ اور افریقہ کے حبشی غلام فروخت کر دیتے تھے۔

باب اللہ سے گزرتے ہی، جو شہر کے انتہائی جنوبی سرے پر واقع تھا، قافلے تین کیلومیٹر کا فاصلہ میدان کے علاقے میں طے کرتے، جس میں غلے کے گودام اور ممالیک کے مقبرے یکے بعد دیگرے مسلسل بنے ہوئے تھے۔ جنوب کی طرف آمد و رفت کے باعث باب جابیہ کے باہر فصیل کے قریب بھی ایک نیا محلّہ آباد ہو گیا تھا۔ یہاں قافلے قیام کرتے تھے۔ وہ اپنی خوراک اور ضروریات کا سامان (قریبی) منڈیوں سے خریدتے جہاں زین سازوں اور لُہاروں کے ساتھ ساتھ نوادر فروشوں نے بھی اپنی دکانیں قائم کر لی تھیں۔ اس محلے کا نام السنانیہ اس جامع مسجد کی وجہ سے پڑا جو صدر اعظم سنان پاشا، والی دمشق نے ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء اور ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء کے مابین تعمیر کرائی تھی۔ اس کا مینارہ جس پر سبز رنگ کی روغنی اینٹیں لگی ہیں، دور دور سے نظر آتا ہے۔ اس مسجد کی تعمیر سے بھی چند برس قبل ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء میں درویش پاشا نے ایک بڑی مسجد اس محلے کے شمال میں بنوائی تھی جس کی خوبصورت چینی ٹائلیں قابل تعریف ہیں۔ آرائش کا یہ انداز آل عثمان کے ساتھ یہاں پہنچا اور پول استانبولی فن کا پودا سرزمین دمشق میں یک لخت لگا دیا گیا۔ شہر میں فن تعمیر کے اعتبار سے ایک نیا اسلوب بھی منظر عام پر آنے لگا۔ ہماری مراد ترکی مسجد سے ہے، جس کا نقشہ کچھ یوں ہوتا تھا کہ ایک وسیع و عریض مربع ایوان، اس کے اوپر گول تکونوں (pendentives) پر قائم ایک نیم کروی گنبد، سامنے کی جانب مسقّف پیش دروازہ اور گوشوں میں ایک یا ایک سے زیادہ گول مینار جن کی چوٹی پر گُل گیرنما کلس ہوتے تھے۔ دمشق میں اس طرح کی عمارت کی پہلی مثال وہ مسجد تھی جو قصر الابلق کے محل وقوع پر سلطان سلیمان قانونی نے سنان معمار کے نقشے کے مطابق ۹۶۲ء / ۱۵۵۵ء میں تعمیر کرائی۔ حقیقت میں یہ مسجد بہت سی عمارات کا حصہ تھی جو آج بھی تکیۂ سلیمانیہ کے نام سے معروف ہیں۔ نماز کے بڑے دالان کا اگلا کمانچہ ایک وسیع صحن کی جنوبی سمت میں کھلتا تھا۔ اس کے مشرق اور مغربی جانب حجروں کی قطاریں تھیں، جن کے سامنے ستون دار پیش دالان تھا۔ شمال کی طرف حجروں کے ایک مجموعے میں مطبخ اور طعام خانے واقع تھے، لیکن ۱۹۵۷ء سے ان میں فوجی عجائب خانے کی اشیا محفوظ کر دی گئی ہیں۔ دینی سرگرمیوں کے بارونق مراکز محلّۂ الصالحیہ کے مدرسۂ عُمریہ نیز محی الدین [ابن] العربی کے مقبرے کے آس پاس قائم ہو گئے تھے جہاں ۹۵۹ھ / ۱۵۵۲ء میں سلطان سلیم اول نے ایک لنگر خانہ بنوا دیا تھا کہ اس شہرۂ آفاق صوفی کے مقبرے کی زیارت کے لیے آنے والے غُربا کو مفت کھانا تقسیم کیا جائے۔ اسی طرح کا مرکز تکیۂ مَولَویہ میں بھی قائم ہوا، جو ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں اہل وجد و حال

درویشوں کے لیے مسجد تنکز کے مغرب میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ بات کہ مذکورۂ بالا بڑی بڑی مذہبی عمارتیں عثمانی عہد میں بیرون شہر تعمیر ہوئیں، اس امر پر دال ہے کہ اب جامع مسجد الاموی مسلمانوں کے اجتماع کا واحد مرکز نہیں رہی تھی، اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شہر اپنی قدیم حدود سے باہر پھیل گیا تھا۔

عہد جدید میں توپوں کے فروغ سے دمشق کے پرانے دفاعی استحکامات فرسودہ ہو کر رہ گئے۔ دوسری طرف اس امن و امان کی بدولت جو سلطنت کے گوشے گوشے میں قائم تھا فصیلوں کی اہمیت باقی نہ رہی اور ان پر سکونتی مکانات بکثرت بننے لگے اور خندقیں، جن سے گھوڑے کا کام لیا جاتا تھا، کوڑے کرکٹ سے پاٹ دی گئیں۔

شہر پناہ کے اندر آخری مملوک فرمانرواؤں کے دستور کے مطابق کوچوں کے پختہ فرش، صفائی اور روشنی وہاں کے صاحبان خانہ کے خرچ پر ہوتی تھی۔ جہاں ایک طرف لوگوں کی خدا ترسی سے بہبود عامّہ کے لیے سبیلیں، مدرسے اور زاویے تعمیر ہوئے، وہاں ایسے آدمی بھی تھے جو ان کے بجائے قہوہ خانوں کو پسند کرتے تھے، چنانچہ ان کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا اور ان کا شمار بھی عام اجتماع کے مقامات میں ہونے لگا۔ اندرون شہر میں "خانوں" یعنی سراؤں کے علاوہ جو واحد قابل ذکر عمارت بنی وہ ایک محل ہے، جسے یہاں کے والی اسعد پاشا العظم نے مسجد جامع کے جنوب مشرقی جانب ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس محل کی سب عمارتیں اٹھارھویں صدی کے شامی مکانات کی ترتیب کے مطابق بنائی گئی ہیں، البتہ اس میں ایک سلاملیق [دیوان خانہ] اور ایک حرملیق [زنانخانہ] کا اضافہ کر دیا گیا ہے، جنھیں ترکی اسلوب کے مطابق چوبی کام سے مزین کیا گیا ہے۔ آج کل اس محل میں نسلیات (ethnography) اور عوامی فنون کا قومی عجائب خانہ ہے۔

دور حاضر (۱۸۳۱ء تا ۱۹۴۲ء): دمشق میں جو گزشتہ کئی صدیوں تک سیاسی واقعات کے بڑے دھارے سے الگ تھلگ رہا تھا، ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۰ء کے دوران مصری تسلط کی بدولت تاریخ انقلاب پیدا ہو گئی۔ ۱۸۳۲ء میں محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے فلسطین کا علاقہ عبور کر کے دمشق پر قبضہ کر لیا، جہاں اس کی آمد سے قبل عثمانی حکومت کے خلاف بغاوتیں برپا ہو چکی تھیں۔ شہریوں نے ابراہیم کی افواج کی اعانت کی، جنھوں نے حمص کے قریب عثمانی لشکر کو بھگا دیا اور پھر جولائی کے آخر میں حلب کے قریب اسے ایک اور شکست دی اور کوہ طوروس Taurus کے پار دھکیل دیا۔

مصری حکومت دس برس تک قائم رہی۔ اس نے یورپیوں کو واپس آنے کی اجازت دے دی، جنھیں اب تک شہر کے اندر مغربی لباس میں آنے کی ممانعت تھی اور کئی قسم کے دوسرے رسوم و آداب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ۱۸۳۳ء کے موسم بہار میں سلطان نے شام کی نیابت محمد علی کے حوالے کر دی اور ابراہیم پاشا اپنے والد کے نام پر یہاں حکومت کرنے لگا۔ اس زمانے سے غیر ملکی نمائندے یہاں آ کر مقیم ہونے لگے۔ ابراہیم پاشا مذہبی اعتبار سے بہت وسیع الخیال اور روا دار تھا۔ اس نے دمشق میں ایک دارالعلوم قائم کیا، جہاں چھے سو کے قریب باوردی طلبہ فوجی اور عام دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کئی عمارتیں سرکاری دفتر بنیں اور اس سلسلے میں بعض قدیم یادگاروں کو بھی قربان کر دیا گیا، مثلاً تنکزیّہ کو ایک فوجی مدرسے میں بدل دیا گیا، جو یہاں ۱۹۳۲ء کے بعد تک جاری رہا۔ والی دمشق کے لیے ایک نئی قیام گاہ سرایل Sérail تیار ہوئی۔ یہ عمارت، جو فصیل شہر کے باہر باب الحدید کے بالمقابل تعمیر ہوئی تھی، روسی کاریز کے قریب ایک نئے

محلّے، القنوات، کے ظہور میں آنے کا باعث بنی۔ دارالسعادۃ اور الاصطبل کی عمارتیں، جہاں ممالیک کے زمانے سے ایک چھوٹا سا چڑیا گھر قائم تھا ایک فوجی صدر دفتر کی صورت میں بدل دی گئیں جس کا وجود ۱۹۱۷ء میں کہیں جا کر ختم ہوا۔ شہر کے اسی علاقے میں بارونق دکانیں ایک ہی جگہ سوق الاروام میں واقع تھیں۔ J. L. Porter: *five years in Damascus*، ۲ جلد، لنڈن ۱۸۵۵ء، میں انیسویں صدی عیسوی کے وسطی زمانے کے دمشق کی بڑی دلچسپ کیفیت ملتی ہے۔ ۱۸۳۰ء میں نظم و امن قائم کرنے کے بعد ابراھیم پاشا نے اصلاح کی طرف پہلا قدم اٹھایا (رک بہ بلدیہ، مجلس) اور ایک خود مختار اور مرکزی حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اہل یورپ محمد علی کے عزائم کے مخالف تھے اور سب سے بڑھ کر پامرسٹن تھا؛ چنانچہ جبری فوجی بھرتی کے باعث جو بے چینی شہر میں پھیلی اس سے فائدہ اُٹھا کر اُنھوں نے عوام کو ابراھیم پاشا کے خلاف بھڑکا دیا، جو دمشق خالی کر جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے اصلاحی اقدام کی تجدید نہ ہوئی اور دمشق ایک بار پھر آل عثمان کے زیر تسلّط آ گیا۔ پھر فرقہ دارانہ فسادات نے یہاں کی پُر سکون زندگی کو تدریجاً درہم برہم کر ڈالا۔ لبنان کے جنوب میں رہنے والے مارونیوں اور دُروزیوں کے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ دمشق میں رائے عامّہ کو بھڑکایا گیا اور ۱۲ جولائی ۱۸۶۰ء کو مسلمانوں اور عیسائیوں میں خونریز تصادم ہوا۔ اس خونریزی کے دوران میں امیر عبدالقادر نے جو الجزائر سے جلا وطن ہو کر یہاں آئے ہوئے تھے، بیچ میں پڑ کر کئی سو انسانی نفوس کو ہلاکت سے بچا لیا۔ اس فساد کے برپا کرنے والوں کو سلطان نے شدید سزائیں دیں اور اسی سانحے سے برانگیختہ ہو کر اگست ۱۸۶۰ء کے آخر میں نپولین سوم کی بھیجی ہوئی افواج شام کے ساحل پر اُتر گئیں۔

اس دور کی ابتدا ہی سے یورپی اثرات شہر کی ثقافت اور معاشیات کے شعبوں میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ مختلف مذہبی فرقوں کے غیر ملکی مدارس اپنی حکومتوں کی اعانت کی بدولت ترقی کرتے رہے۔ ۱۷۷۵ء سے لزاری (Lazarist) فرقے کے پادری بڑی سرگرمی سے ایک مدرسۂ عالیہ چلا رہے تھے اور ۱۸۵۳ء سے ایک پروٹسٹنٹ تبلیغی ادارہ کام کر رہا تھا۔ ۱۸۶۰ء کے بعد نئے نئے ادارے قائم ہونے لگے، مثلاً برطانوی شامی تبلیغی ادارہ اور عیسوی فرقے (Jesuists) کا کالج (۱۸۷۲ء)، تعلیم نسواں کا کام Sisters of charity (عیسائی راہبات) نے سنبھال رکھا تھا۔ مدحت پاشا نے سرکاری طور پر تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی جسے آئندہ جاری نہ رکھا گیا۔ اس زمانے میں صحیح معنوں میں علمی و فکری مرکز قاہرہ تھا اور دمشق میں قاہرہ ہی کے اخبارات المُقتطَف اور المُقطّم پڑھے جاتے تھے۔ دمشق میں مرتّب اور طبع ہونے والا عربی زبان کا پہلا اخبار الشّام کہیں ۱۸۹۷ء میں جا کر شائع ہونا شروع ہوا۔ بہر حال رفتہ رفتہ دارالحکومت شام عرب قومیت کے مراکز میں شمار ہونے لگا۔ اُنیسویں صدی کے ربع آخر میں شام کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی خفیہ انقلابی جماعتیں سرگرمِ کار تھیں اور عوام کو وقتاً فوقتاً بغاوت پر اُکساتی رہتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ مدحت پاشا، جو ۱۸۷۶ء کے حریت پسندانہ آئین کا مصنف تھا، جب ۱۸۷۸ء میں والی دمشق بنا تو ان تحریکوں کی حمایت کرتا رہا۔ اس جلیل القدر مصلح کے پیش نظر ڈیڑھ لاکھ کی آبادی پر مشتمل شہر کا نظم و نسق تھا اور اس نے یہاں ایسے مفید کام کیے جو مستقل نوعیت کے تھے۔ اس کی اصلاحات کا تعلق زیادہ تر عوام کے حفظانِ صحت اور آمد و رفت کے ذرائع سے تھا۔ گاڑیاں چل نکلنے سے قدیم شہر کا پرانا نظامِ آمد و رفت ناکافی اور غیر موزوں ہو کر رہ گیا تھا۔ والی موصوف نے 'بازاروں' میں تنگ گلیوں کی جگہ زیادہ

چوڑے بازار بنوائے۔ شارع موسوم بہ مستقیم کے مغربی حصے کو مزید فراخ کرا کے اس پر لوہے کی نالی دار چادر کی چھت ڈلوا دی، موجودہ زمانے کا سوق مدحت پاشا یہی ہے۔ قلعے کے جنوب میں جو خندق تھی اسے پاٹ دیا گیا اور اس پر نئے سوق آباد ہو گئے۔ اسی طرح باب الجابیہ کو مسجد جامع سے ملانے والی سڑک کو شروع سے آخر تک اتنا وسیع کر دیا گیا کہ اس پر گاڑیوں کی دو طرفہ آمد و رفت ہو سکے۔ اس کا نام سوق حمیدیہ رکھا گیا۔ شہر کے مغرب میں المرجۃ یعنی سبزہ زار کے آس پاس جو خالی قطعے پڑے تھے، وہاں نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ یہ عمارتیں ایک نئی سرائے، انتظامیہ کے دفتر، فوجی عملے کے صدر دفتر، دارالبلدیہ، عدالتوں، ایک ڈاک خانے اور سپاہیوں کی بارکوں پر مشتمل تھیں۔ حمیدیہ بارکیں، جنھیں ۱۹۰۵ء کے بعد نئے ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا، آجکل جامعہ کی مرکزی عمارت کا کام دیتی ہیں۔ باب توما کے عیسائی محلے میں عالیشان مکانات تعمیر ہوئے جہاں یورپی سفیروں، پادریوں اور تاجروں وغیرہ نے سکونت اختیار کی۔ اس کے برعکس قدیم شہر غیر آباد ہونے لگا۔ اب مغربی جانب القنوات اور سُویقات اور شمال مغربی جانب مَروجۃ اور العقیبۃ کی مضافاتی بستیوں کے درمیان کوئی خالی قطعۂ اراضی باقی نہیں رہا۔ الصّالحیۃ میں کُردوں اور اقریطش (کریٹ) کے تارک الوطن مسلمانوں کی ایک نئی بستی قائم ہو گئی اور اس کا نام المہاجرین پڑ گیا۔ جبل قاسیون کی ڈھلانوں پر اس بستی کا محل وقوع ترکوں کے امرا کو اتنا پسند آیا کہ انھوں نے وہاں بڑے خوبصورت مکانات بنوائے، جو باغات سے گھرے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات میں مزید سہولتیں پیدا ہوئیں، اور ان دو لوکانڈوں [ریستوران restaurants] کے علاوہ جو ۱۸۶۰ء سے قبل سے موجود تھے، غیر ملکیوں کے لیے نئے ہوٹل بن گئے۔ ۱۸۶۳ء کے بعد غیر ملکی باشندے بیروت سے دمشق تک ڈاک گاڑی میں اس نئی سڑک پر سفر کرنے لگے جسے فرانسیسی ٹھیکیداروں نے تعمیر کیا تھا۔ ذرائع آمد و رفت میں مزید ترقی اس وقت ہوئی جب ایک فرانسیسی کمپنی نے بیروت، دمشق، اور حوران کے درمیان ریل جاری کر دی۔ بعدازاں رَیاق سے اس کی ایک شاخ شمال کی طرف حمص اور حلب تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد عزت پاشا العبید کو، جو شام کا باشندہ اور سلطان کا دبیر دوم تھا، یہ خیال سُوجھا کہ سفر حج کو آسان بنانے کے لیے دمشق اور مدینۂ منورہ کے درمیان ریل جاری کی جائے۔ انھیں دنوں سلطان اور قیصر ولیم ثانی کے درمیان، جو ۱۸۹۸ء کے موسم سرما میں دمشق آیا تھا، دوستانہ تعلقات کا آغاز ہو گیا تھا، چنانچہ اس ریلوے لائن کی تعمیر کا کام جرمنوں کے سپرد کر دیا گیا۔ چھوٹی لائن کی حجاز ریلوے کا افتتاح ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ حجاج، جو قبل ازیں قافلوں کی صورت میں مدینۂ منورہ چالیس روز میں پہنچتے تھے، اب وہاں پانچ دن میں پہنچنے لگے۔ اسی سال فوجی افسروں کی ایک تحریک سے مجبور ہو کر سلطان نے وہ آئین بحال کر دیا جو گزشتہ اکتیس برس سے معطل پڑا تھا۔ اس کے بعد پھر تھوڑا ہی عرصہ گزرنے پایا تھا کہ عبدالحمید ثانی کو معزول کر دیا گیا۔ اس خبر کا دمشق میں بڑی مسرت سے خیر مقدم کیا گیا۔ لوگوں نے وسیع پیمانے پر مظاہرے کیے، اور آتش بازی چھوڑی گئی، لیکن ان کی مسرت بہت دنوں قائم نہ رہ سکی۔ حریت کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا جس کی امید پر کُرد علی نے اپنا مجلہ المقتبس، جسے تین سال قبل قاہرہ سے بطور روزنامہ جاری کیا تھا، دمشق میں منتقل کر لیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں حکومت عثمانیہ نے اسے خلاف قانون قرار دے کر بند کر دیا اور عرب قوم پرستوں نے خفیہ جماعتوں کی صورت میں منظم ہونا شروع کر دیا۔

۱۹۱۴ء میں اعلان جنگ ہوا تو دمشق کو اس

کے بہت بُرے نتائج بھگتنے پڑے۔ اس سال کے آخر میں جمال پاشا شام، لبنان اور فلسطین کا نائب السلطنت اور عثمانی جیش چہارم کا سپہ سالار مقرر ہوا، جس کا مستقر اعلی دمشق تھا۔ بہت جلد یہ شہر جرمن اور ترک افواج کا مرکز اور منطقۂ سویز پر لشکر کشی کرنے کے لیے چھاؤنی بن گیا۔ جمال پاشا نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ وہ اوسط درجے کا سپہ سالار لیکن نہایت مستعد ناظم ہے۔ اسے توقع تھی کہ وہ اہل دمشق کو ترکوں کی حمایت پر آمادہ کر لے گا لیکن چند ہی روز بعد اسے اپنے اس خیال کو ترک کرنا پڑا۔ دمشق ہی وہ شہر تھا، جہاں اپریل ۱۹۱۵ء میں، البکری خاندان کے حلقے میں، شریف مکہ حسین کا بیٹا امیر فیصل عرب بغاوت کے منصوبے کا حامی بنایا گیا۔ وہ اسی زمانے میں خفیہ انجمنوں الفتات اور العہد کے ارکان سے ملا۔ مئی کے آخر میں فیصل قسطنطینیہ سے واپس آیا اور انگریزوں کی مشارکت سے ترکوں کے خلاف جنگ کا ایک منصوبہ تیار کرنے میں حصہ لیا۔ بالآخر وہ مشہور "میثاق دمشق" طے ہوا جس کی رو سے برطانیہ سے عربوں کی آزادی تسلیم کرنے اور (یورپی) امتیازات خصوصی ختم کر دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ جنوری ۱۹۱۶ء میں فیصل ایک بار پھر دمشق میں موجود تھا اور ۶ مئی کو بھی وہیں مقیم تھا جب جمال پاشا کے حکم سے عرب بغاوت کے اکیس حامیوں کو پھانسی دی گئی۔ آج بھی یہ سانحہ "یوم شہداء" کے رنگ میں ہر سال منایا جاتا ہے۔ ۱۰ جون کو حجاز میں بغاوت برپا ہو گئی، جہاں شریف حسین نے 'سلطان عرب' ہونے کا اعلان کر دیا۔ دمشق سے ترکی افواج کا انخلاء ۳۰ ستمبر ۱۹۱۸ء کو عمل میں آیا۔ یکم اکتوبر کو اتحادی فوجیں، جن میں امیر فیصل کے دستے بھی شامل تھے، شہر میں داخل ہو گئیں۔ شام کی مجلس ملّی کا قیام عمل میں لانے کے لیے مئی ۱۹۱۹ء میں انتخابات ہوئے اور جون میں اس مجلس نے پیرس کی صلح کانفرنس کے وہ فیصلے مسترد کر دیے جو انتداب (mandate) کے بارے میں وہاں کیے گئے تھے۔ ۱۰ دسمبر کو ایک قومی شامی حکومت تشکیل پذیر ہوئی۔ ۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو مجلس ملّی نے شام کی آزادی کا اعلان کر دیا اور فیصل کو بادشاہ منتخب کر لیا۔ [Sykes-Pical معاہدے کے مطابق جو خفیہ طور پر انگلینڈ، فرانس، روس کے درمیان ہوا شام کو فرانس کے زیر حمایت دے دینے کا فیصلہ کیا گیا]۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں معاہدۂ سان ریمو San-Remo کی رُو سے فرانس کو 'جمعیۃ اقوام' کے نمائندے کی حیثیت سے شام پر انتداب کا حق مل گیا، لیکن اس فیصلے سے دمشق اور شام کے دوسرے بڑے شہروں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ مجلس ملّی نے ۱۰ جولائی کو حالت محاصرہ کا اعلان اور جبری بھرتی کا قانون نافذ کیا، لیکن ۱۴ جولائی کو جب جمہوریۂ فرانس کے ہائی کمشنر جنرل گورا Gouraud نے فیصل کو آخری تنبیہ (الٹی میٹم) دیا تو اس نے تمام شرائط تسلیم کر لیں۔ دمشق میں عوامی شورش زور پکڑ گئی۔ ۲۰ جولائی کو عرب فوج نے عوام کے ایک بہت بڑے جلسے کو زبردستی منتشر کیا۔ معاہدے کی شرائط پر عمل کرانے کے لیے فرانسیسی فوجیں شام بھیجی گئیں۔ ۲۴ جولائی کو میسلون میں جنگ چھڑ گئی اور ۲۵ جولائی کو فرانسیسی شہر میں داخل ہو گئے۔ شاہ فیصل کو ملک چھوڑنا پڑا اور اقتدار ہائی کمشنر کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا۔ اب واقعی انتداب کا دور آ گیا تھا۔ [تفریق ڈالو اور حکومت کرو کے مطابق فرانس نے اپنے زیر انتداب شامی علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے حکومت کرنا شروع کر دی]۔

موجودہ دور: دور انتداب کی خصوصیت یہ تھی کہ انتدابی قوت کے خلاف مخاصمت کے مظاہرے ہوتے رہے جو کبھی تو ہڑتالوں اور کبھی تشدد آمیز بلووں کی صورت اختیار کرتے تھے۔

اس سلسلے میں شدیدترین مظاہرہ ۱۹۲۵ء میں

جبل دُروز میں امیر سلطان الاطرش کے زیر قیادت ہوا، جس میں مخالفین دمشق پر قابض ہوگئے۔ اگست کے آخر میں مخالفوں کو جو مضافات شہر میں وارد ہو چکے تھے، پسپا کر دیا گیا۔ اہل شہر نے اس وقت تک ان کی کھلم کھلا حمایت نہیں کی جب تک وہ دوسری بار وہاں نہیں آ گئے۔ ۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو شہر میں سخت فساد برپا ہو گیا جس کے پیش نظر ۱۸ اکتوبر کو جنرل سریل Sarrail نے شہر پر گولہ باری کی۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں غوطہ اور شہر میں ایک اور بغاوت کو کچلنے کے لیے دوبارہ گولہ باری کی گئی، لیکن امن و امان آئندہ موسم خزاں تک بحال نہ ہو سکا۔

۱۹۲۶ء کے بعد سے شہر مغربی نقطۂ نظر سے خوب ترقی کرنے لگا۔ الصّالحیّہ اور قدیم شہر کے درمیان جو غیر ترقی یافتہ محلّے تھے وہاں بڑی تیزی سے تعمیرات ابھرنے لگیں اور اس زمانے سے الجسر، العَرنُوس اور الشُّہداء نام کے مضافات میں یورپی جن کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی، اور شامی کسی قومی غیریت کا لحاظ کیے بغیر پہلو بہ پہلو آباد ہونے لگے۔ باب تُوما کے عیسائی قصّاع کے نئے محلّے میں آباد ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں اندرون شہر سے باہر آ گئے۔ شہری عمارتوں میں ترتیب اور یکسانی پیدا کرنے کے لیے ۱۹۲۹ء شہری منصوبہ بندی کے فرانسیسی ماہر Danger نے آئندہ بننے والے شہر کا ایک مربوط اور متوازن نقشہ تیار کیا اور مشہور ماہر تعمیرات Michel Écochard کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ حکومت شام کے سرکاری محکموں کے تعاون سے اسے عملی جامہ پہنائے۔ نئی سڑکیں بنائی گئیں، جن میں سے بیشتر کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں اور تُرّاب کا قدیم علاقہ ابورُمّانۃ کے سکونتی محلّے میں تبدیل ہو گیا اور مغرب کی جانب پھیلتا گیا۔ قدیم شہر کی شمالی سمت خیابان بغداد اور جبل قاسیون کے درمیان اور شمال میں حلب کو جانے والی سڑک کی سمت نئی مضافاتی بستیاں بن گئیں۔ آبادی میں اضافے اور عوام کے حفظان صحت کے پیش نظر ۱۹۲۲ء کے اوائل میں پینے کا پانی خاص نلوں کے ذریعے عَین فیجَۃ کے طاقتور چشمے سے لایا گیا جو وادی بَردی میں واقع ہے۔ [تقریباً دس برس شامیوں کی جد و جہد کے بعد آخر فرانسیسی انہیں آزادی دینے پر رضا مند ہوگئے]۔

پہلی عالمگیر جنگ کی بہ نسبت دوسری جنگ میں دمشق نے بہت کم نقصان اٹھایا۔ [۲۱] جون ۱۹۴۱ء میں برطانوی [آسٹریلین، ہندوستانی] اور آزاد فرانسیسی دستے شام میں داخل ہوئے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۱ء کو جنرل Catroun نے اس کی آزادی کا اعلان کر دیا [اور تاج الدین اس کے پہلے صدر بنائے گئے] لیکن کوئی آئینی زندگی اگست ۱۹۴۳ء سے قبل شروع نہ ہو سکی تا آنکہ [اگست ۱۹۴۵ء کو] شکری القُوّتلی کا انتخاب بطور صدر جمہوریۂ شام عمل میں آیا۔ ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو شام اقوام متحدہ کا رکن بن گیا [اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اس نے آزاد رکن کی حیثیت سے شرکت کی] تو انتداب کا خاتمہ ہو گیا لیکن فرانس اور شام کے باہمی تعلقات میں ایک نیا کھچاؤ محسوس ہونے لگا۔ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ ۲۹ مئی ۱۹۴۵ء کو دمشق پر فرانسیسی فوج نے گولہ باری کی۔ برطانیہ نے امن بحال کرنے کے لیے فوج سے دخل اندازی کی۔ چند ماہ بعد [اپریل ۱۹۴۶ء کو] غیر ملکی افواج بالآخر شام کی سر زمین سے رخصت ہوگئیں۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک کئی بار حکومت میں فوجی انقلابات آئے۔ ۱۹۵۵ء میں شکری القُوّتلی ایک بار پھر صدر جمہوریہ بنا اور ۱۹۵۶ء سے اتحاد مصر و شام کی گفت و شنید شروع ہو گئی۔ [فروری] ۱۹۵۸ء میں 'جمہوریۂ متحدۂ عرب' کی تشکیل کے اعلان سے دمشق شمالی علاقے کا صدر مقام قرار پایا، لیکن ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کے فوجی انقلاب سے [ناظم القدسی کے زیر اقتدار] وہ دوبارہ جمہوریۂ عرب شام کا دارالحکومت

بن گیا۔ [۸ مارچ ۱۹۶۳ء کو وہاں پھر انقلاب آیا اور جنرل امین الحافظ پریزیڈنسی کونسل کے صدر مقرر ہوے]۔

شہر دمشق کا نظم و نسق ایک مجلس بلدیہ کے ہاتھ میں ہے؛ ۱۹۵۵ء میں اس کی آبادی ۴۰۸۸۰۰ نفوس پر مشتمل تھی جس میں ۹۰ فی صد سُنّی مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ کُرد، دروزی اور امریکی گروہ خاصی اہم تعداد میں یہاں پائے جاتے ہیں۔

متعدد ثقافتی اداروں کے باعث دمشق کا شمار اوّل درجے کے علمی مراکز میں ہوتا ہے۔ جون ۱۹۱۹ء میں محمد علی کُرد کی تجویز پر مشہور عرب اکادمی (المَجْمع العِلْمی العربی) کی بنیاد رکھی گئی تھی جو مدرسة العادلیہ میں قائم ہے۔ اس کے بالمقابل مدرسة الظاہریّة میں کتب خانۂ ملّی ہے، جس میں آٹھ ہزار سے زیادہ مخطوطات موجود ہیں۔ جامعۂ سوریہ، جس کی ابتدا ایک مدرسۂ طب (۱۹۰۳ء) اور ایک مدرسۂ قانون (۱۹۱۲ء) سے ہوئی تھی، ۱۵ جون ۱۹۲۳ء کو قائم کی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں یہاں تقریباً دس ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے اور یہ چھے شعبوں (faculties) میں منقسم تھی۔ شام کے قومی عجائب خانے (Museum) کی بنیاد ۱۹۲۱ء میں رکھی گئی اور ۱۹۳۸ء سے اس کی اشیا ایسے مکانات میں فراہم کی گئیں جو خاص طور پر قیمتی مجموعوں کو محفوظ رکھنے کے لیے بنائے گئے تھے، مثلاً Palmyra (تدمر)، Doura Europos (دورۂ یوروپوس)، Ras Shamra (راس شَمرۃ) اور Mari (ماری کے کمرے)۔ شام کی اشیاے قدیمہ کی نظامت عمومی (Direction général des antiquités de Syrie) کا دفتر، جو ۱۹۲۱ء میں قائم کیا گیا تھا، اسی عمارت میں ہے۔ کتابوں کی بہت سی دکانیں، کوئی درجن بھر سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشرگاہیں، ان سب کی بدولت دمشق ایک بڑا جدید شہر دکھائی دیتا ہے۔ یہ وسائل حمل و نقل کا ایک اہم مرکز ہے؛ ریل کے ذریعے دمشق، عمان اور آگے کے علاقے کے ساتھ مربوط ہے۔ عقبہ، دمشق اور حمص کو ملانے والی لائن اور اس کی شاخوں (D. H. P.) کا آخری سٹیشن ہے۔ یہاں موٹر کے ذریعے سفر کرنے کے قابل سڑکیں بیروت۔۔۔بغداد۔۔۔الموصل نیز بیت المقدس۔۔۔عمان۔۔۔بیروت ہیں اور اس کا درجۂ دوم کا فضائی مستقر مزّۃ میں واقع ہے۔ حُوران کے غلے کی سب سے بڑی منڈی اور غُوطہ کے کسانوں اور بدوؤں کو خوراک و سامان مہیا کرنے کا مرکز بھی دمشق ہے۔ ان بازاروں میں غیر ملکی مصنوعات ہی نہیں بلکہ دیہاتیوں کی ضروریات کے مطابق خاص طور پر تیار کی ہوئی چیزیں بھی ملتی ہیں۔ یہاں کاریگروں کے ایک طبقے کو آرائشی سامان تیار کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے، مثلاً چوبی مرصع کاری، سیپیوں سے پچی کاری، ریشمی زربفت کی صنعت اور تانبے کے برتنوں پر کندہ کاری یا بھرت کرنا۔ لکڑی کے خرادیے اور شیشہ گر بھی اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں صنعت کے تحفظ کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان سے اس میدان میں نمایاں طور پر ترقی نظر آتی ہے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ایک کپڑے کا کارخانہ (۱۹۲۹ء)، دُمّر میں ایک سیمنٹ تیار کرنے کا کارخانہ (۱۹۳۰ء) اور مربّے اچار بنانے کا کارخانہ (۱۹۳۲ء) قائم ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں جدید طرز کے سوت کاتنے کے کارخانے جاری ہوے۔ ۱۹۳۹ء تک مجموعی طور پر اسّی کارخانے قائم ہو چکے تھے جو ڈیڑھ ہزار پیشوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں شیشے کا ایک بہت بڑا کارخانہ شہر کے جنوب میں قَدَم کے مقام پر قائم ہوا۔ مشرقی علاقے میں چمڑے کی دباغت اور رنگنے کے کئی کارخانوں میں یہاں کا صدیوں پرانا کام جاری ہے۔ ۱۹۵۴ء سے ہر سال موسم گرما کے ختم ہونے پر ایک اہم بین الاقوامی نمائش بردیٰ کے کناروں پر لگتی ہے؛ دمشق کو مشرق قریب

کے عرب ممالک کا ایک عظیم تجارتی و صنعتی مرکز بنانے میں اس نمائش کا بھی حصہ ہے ۔

[ملک کی دو یونیورسٹیوں میں سے ایک دمشق میں ہے جس کی بنیاد ۱۹۲۳ء میں رکھی گئی تھی؛ دوسری حلب میں ہے اور ۱۹۶۰ء میں قائم ہوئی تھی ۔ ۱۹۶۳ء میں دمشق یونیورسٹی کے طلبہ کی تعداد پندرہ ہزار تھی]۔

مآخذ: متن میں مندرجہ حوالوں کے علاوہ: (ا) جغرافیہ پر: (۱) R. Thoumin: *Géographie humaine de la Syrie Centrale*، Tours ۱۹۳۶ء؛ (۲) Ch. Combier: *La climatologie de la Syrie et du Liban*، در *Revue Géogr. Phys. et Géol. Dynam.*، ۶ (۱۹۳۳ء): ۳۱۹ ببعد؛ (۳) R. Tresse: *L'irrigation dans la Ghouta de Damas*، در *REI*، ۱۹۲۹ء، ص ۴۵۹ تا ۵۷۶؛ (۴) R. Thoumin: *Notes sur l'aménagement et la distribution des eaux à Damas et dans sa Ghouta*، در *BEO*، ج ۴ (۱۹۳۶ء)، ص ۱ تا ۲۶؛ — (ب) عربی متون: (۵) الرّبعی: کتاب فضائل الشام والدمشق، طبع ص منجّد، *RAAD*، ۱۹۵۰ء؛ (۶) ابن عساکر: تاریخ مدینۃ دمشق، ج ۱، طبع منجّد، *RAAD*، ۱۹۵۱ء؛ (۷) عبدالقادر بدران: تہذیب تاریخ دمشق لابن عساکر، ۷ جلدیں، دمشق ۱۹۱۱-۱۹۳۲ء؛ (۸) ابن شدّاد: الاعلاق الخطیرۃ (*Description de Damas*)، طبع S. Dahan، *PIFD*، ۱۹۵۶ء؛ (۹) یوسف بن عبدالہادی: ثمار المقاصد فی ذکر المساجد، طبع اسعد طلس، *PIFD*، ۱۹۴۳ء؛ (۱۰) النُّعیمی: الدارس فی تاریخ المدارس، طبع جعفر الحسنی، ۲ جلدیں، *RAAD*، ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۱ء؛ (۱۱) محمد کرد علی: خطط الشام، ۶ جلدیں (مطبوعۂ دمشق) ۱۹۲۵ تا ۱۹۲۹ء؛ (۱۲) یاقوت: معجم البلدان، بذیل مادّۂ دمشق؛ (۱۳) ابن القلانسی: ذیل تاریخ دمشق، طبع Amedroz، لائڈن ۱۹۰۸ء؛ (۱۴) الہروی: کتاب الزیارات، طبع J. Sourdel-Thomine، *PIFD*، دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۱۰ تا ۱۶ (ترجمہ وھی مصنف، *PIFD*، دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۲۳ تا ۳۰)؛ —(ج) تراجم و عام تصانیف: (۱۵) G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۲۲۴ تا ۲۷۳؛ (۱۶) ابن جُبیر: الرحلۃ، ترجمۂ M. Gaudefory-Demombynes، ۳ جلدیں، پیرس ۱۹۴۹ تا ۱۹۵۶ء؛ (۱۷) ابن بطوطہ: الرحلۃ، ترجمۂ گب H. A. R. Gibb، کیمبرج ۱۹۵۸ء، ۱: ۱۱۸ تا ۱۵۷؛ (۱۸) H.A.R. Gibb: *The Damascus chronicle of the Crusades*، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (۱۹) R. Le Tourneau: *Damas de 1075 à 1154*، *PIFD*، ۱۹۵۰ء؛ (۲۰) M. Gaudefroy-Demombynes: *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، *BAH*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۳۵ تا ۲۰۱، ۲۱۲ تا ۳۴۸؛ (۲۱) H. Lammens: *La Syrie, précis historique*، بیروت ۱۹۲۱ء؛ (۲۲) *Sovremenaya Siriya*، شائع کردہ A.N.S.S.R.، ماسکو ۱۹۵۸ء؛ (۲۳) P. Hitti: *Syria, a short history*، لنڈن ۱۹۵۹ء؛ (۲۴) R. Dussaud: *Topographie historique de la Syrie*، *BAH*، ج ۴، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۲۹۱ تا ۳۲۲؛ (۲۵) R. Mantran اور J. Sauvaget: *Règlements fiscaux ottomans relatifs aux provinces syriennes*، *PIFD*، ۱۹۵۱ء، ص ۳ تا ۳۳؛ (۲۶) Cl. Cahen: *Mouvements populaires et autonomisme urbain dans l'Asie Musulmane du Moyen Age*، در *Arabica*، ۵ (۱۹۵۸ء): ۲۲۵، ۲۵۰؛ ۶ (۱۹۵۹ء): ۲۵ تا ۲۶، ۲۳۳ تا ۲۶۵؛ (د) شہر اور اس کی یادگاروں کے بارے میں تصنیفات: (۲۷) H. Sauvaire: *La description de Damas*، در *JA*، سلسلۂ نہم ۳ تا ۷، ۱۸۹۴ تا ۱۸۹۶ء؛ Index général از E. Ouéchek، *PIFD*، ۱۹۵۴ء؛ (۲۸) K. Wulzinger اور C. Watzinger: *Damaskus, i, Die antike Stadt, ii Die islamische Stadt*، ۲ جلدیں، برلن ۱۹۲۱ تا ۱۹۲۴ء؛ (۲۹) J. Sauvaget: *Le plan antique de Damas*،

در Syria، ج ۲۶ (۱۹۴۹ء)، ص ۲۱۳ تا ۲۵۸؛ (۳۰) وہی مصنف: Monuments historiques de Damas، بیروت ۱۹۳۲ء؛ (۳۱) وہی مصنف: Esquisse d'une histoire de la ville de Damas، در REI، ۱۹۳۴ء، ص ۴۲۲ تا ۴۸۰؛ (۳۲) K. A. C. Creswell: A short account of early Muslim architecture، لنڈن ۱۹۵۹ء، ص ۶ بعد؛ (۳۳) Monuments ayyoubides de Damas، PIFD، دمشق ۱۹۳۸ تا ۱۹۵۰ء، ۴ کراسے (از J. Sauvaget، M. Écochard اور J. Sourdel-Thomine)؛ (۳۴) M. Écochard و Ch. le Coeur: Les Bains de Damas، ۲ جلدیں، PIFD، ۱۹۴۲ تا ۱۹۴۳ء؛ (۳۵) E. Herzfeld: Damascus: studies in architecture، در Ars Islamica، ۹: ۱ تا ۵۳؛ ۱۰: ۱۳ تا ۷۰، ۱۱ تا ۱۲: ۱ تا ۷۱؛ ۱۳ تا ۱۴: ۱۱۸ تا ۱۳۸، (دیکھیے J. Sauvaget: Notes ...، در Syria، ۲۴: ۲۱۱ تا ۲۲۸)؛ (۳۶) J. Sourdel Thomine: Les anciens Lieux de pèlerinage damascains d'après les sources arabes، در BEO، ۱۴: ۶۵ تا ۸۵؛ (۳۷) H. S. Fink: The Rôle of Damascus in the history of the Crusades، در MW، ج ۴۹ (۱۹۵۹ء)، ص ۴۱ تا ۵۳؛ (۳۸) N. Elisséeff: Les monuments de Nūr ad-Dīn، در BEO، ۱۳: ۵ تا ۴۳؛ (۳۹) وہی مصنف: Corporations de Damas sous Nūr al-Dīn، در Arabica، ج ۳ (۱۹۵۶ء)، ص ۶۱ تا ۷۹؛ [(۴۰) Muslim World Gazetteer، کراچی ۱۹۶۴ء، بذیل مادہ Syria؛ (۴۱) The Statesman year Book، ۱۹۶۹ تا ۱۹۷۰ء.

(N. ELISSÉEFF)

* **الدمشقی**: شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی طالب الانصاری الصوفی، المعروف بہ ابن شیخ حطین، ایک کتاب کائنات اور دوسری تصانیف کا مصنف۔ وہ الربوۃ کا شیخ اور امام تھا جس کے بارے میں ابن بطوطۃ نے لکھا ہے کہ دمشق کے قریب ایک خوشگوار مقام ہے۔ آج کل یہ الصالحیہ کے مضافات میں شامل ہے۔ الدمشقی نے بمقام صفد ۷۲۷ھ/ ۱۳۲۷ء میں وفات پائی۔ اس کی مشہور ترین تصنیف نخبۃ الدهر فی عجائب البر و البحر ہے، جو وسیع ترین معنوں میں جغرافیے سے متعلق ہے اور بہت حد تک القزوینی کی عجائب المخلوقات سے ملتی جلتی ہے۔ اگرچہ مصنف کا نقطۂ نظر نمایاں طور پر غیر تنقیدی ہے، تاہم اس کتاب میں بہت سی ایسی معلومات موجود ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ الدمشقی کی ایک اور کتاب المقامات الفلسفیۃ و الترجمات الصوفیہ ہے جو نسبۃً کم معروف لیکن اس کے ساتھ ہی خاصی دلچسپ ہے (رک بہ براؤن E.G. Browne: Handlist of the Muḥammadan Mss. preserved in the library of the University of Cambridge، ص ۲۱۷ و ۲۱۸، شمارہ ۱۱۰۲)۔ یہ کتاب پچاس "مقامات" پر مشتمل ہے جن سے طبیعیات، ریاضیات اور الٰہیات کی ایک دائرۃ المعارف مرتب ہو گئی ہے۔ یہ مقامات ابو عبداللہ الاواب کی سند پر ابوالقاسم التواب کی زبان سے روایت کیے گئے ہیں۔ الدمشقی نے اسلام کی حمایت میں بھی ایک تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے، یعنی جواب رسالۃ اهل جزیرۃ قبرص، جس میں تصوف کی جھلک نظر آتی ہے دیکھیے E. Fritch: Islam u. Christentum im Mittelalter، Breslau ۱۹۳۰ء، ص ۳۳ تا ۳۶)۔ اس کی ایک اور تصنیف الرسالۃ (یا باختلاف نسخہ: السیاسۃ) فی علم الفراسۃ (قاہرہ ۱۳۰۰ھ) چھپ چکی ہے؛ لیکن محاسن التجارۃ (قاہرہ ۱۳۱۸ھ)، جسے براکلمان نے شمس الدین سے منسوب کیا ہے (صحیح نام: کتاب الاشارۃ الی محاسن التجارۃ، ترجمہ H. Ritter در Islam، ج ۷، ۱۹۱۷ء، ص ۱ تا ۹۱)، دراصل ابوالفضل جعفر بن علی الدمشقی کی تصنیف ہے۔

مآخذ: (۱) A. F. Mehren: Cosmographie de Chems-ed Din Abou Abdallah Mohammed ed-Dimichqui، عربی متن، سینٹ پٹرزبرگ ۱۸۶۶ء؛ ترجمہ

، *Manual de la Cosmographie du Moyen Age* کوپن ہیگن ۱۸۷۴ء؛ (۲) براکلمان، ۲ : ۱۳۰، تکملہ ۲ : ۱۶۱، GAL، طبع دوم ۲ : ۱۶۱ .

(ڈنلپ D.M. DUNLOP)

٭ **الدّمّام** : خلیج فارس کی ایک بندرگاہ اور سعودی عرب کے صوبۂ شرقیہ کا صدر مقام ۔ پہلے یہ ایک برج نما قلعے کا نام تھا جو ۲۶ درجے ۲۷ دقیقے ۵۶ ثانیے عرض بلد شمالی اور ۵۰ درجے ۶ دقیقے ۶ ثانیے طول بلد شرقی میں ساحل بحر کے قریب ایک مسطّح پہاڑی پر جو آج کل کے شہر کے شمالی جانب ہے، واقع تھا ۔ یہ تو معلوم نہیں کہ یہ قلعہ کب اور کیسے بنا لیکن اس کی عمارت کے بقیہ آثار جو ۱۹۵۷ء میں چھوٹے جہازوں کی لنگرگاہ بنانے کی غرض سے منہدم کر دیے گئے تھے، جلاہمہ کے معروف سمندری کپتان رحمۃ بن جابر (رک بآں) کے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں ۔ ابن جابر نے ۱۸۰۹ء میں آل سعود سے اتحاد کرکے الدّمّام میں ایک قلعہ تعمیر کیا تھا لیکن جب اُس نے اُن سے منحرف ہو کر البحرین پر حملہ کر دیا تو ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۶ء میں سعودیوں نے اس قلعے کو تباہ کر دیا ۔ دو سال بعد اس نے القطیف پر قبضہ کرنے میں ابراہیم پاشا کی ترکی مصری فوجوں کی مدد کی اور الدّمّام پر دوبارہ قابض ہو گیا ۔ اس نے قلعے کو فوراً از سر نو تعمیر کیا اور یہ قلعہ اپنے ضمنی استحکامات اور ملحقہ ساحل کی دیہاتی آبادی سمیت البحرین کے آل خلیفہ کے خلاف اس کی بحری کارروائیوں کا مرکز بن گیا ۔ ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۶ء میں جب رحمۃ بن جابر بحرین کے محاصرہ کرنے والے بیڑے سے لڑتا ہوا مارا گیا تو آل خلیفہ اور بنی خالد نے الدّمّام پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد سترہ سال تک الدّمّام البحرین کے قبضے میں رہا ۔ اس زمانے میں آل خلیفہ نے بنی خالد کی شاخ عمائر اور بنی ہاجر کے لوگوں کو الدّمّام میں بسنے کی اجازت دے دی ۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں جب عبداللہ آل خلیفہ کو اس کے بھتیجے کے بیٹے محمد نے الدّمّام سے نکال دیا تو خشکی کی طرف سے سعودی فوج یہاں داخل ہو گئی اور سمندر کی طرف سے البحرین کے بیڑے نے اسے آ گھیرا؛ فیصل بن ترکی آل سعود نے ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں قلعے پر قبضہ جما لیا ۔ اس سے بشر بن رحمۃ بن جابر کو سخت مایوسی ہوئی، اس لیے کہ اس نے اس امید پر حملے میں شرکت کی تھی کہ اسے اس کی آبائی ریاست پھر مل جائے گی ۔ ۱۲۶۰ھ/۱۸۵۲ء میں آل سعود کا محمد آل خلیفہ سے جھگڑا ہو گیا اور آل سعود نے الدّمّام میں فرزندان عبداللہ کو دوبارہ برسر اقتدار کر دیا ۔ جلاوطنوں نے البحرین پر پھر قبضہ کرنے کی کوشش کی ۔ اس پر برطانیہ نے آل سعود سے اُنھیں البحرین سے نکال دینے کا مطالبہ کیا ۔ جب آل سعود نے یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں سمندر سے تھوڑی سی گولہ باری کرکے برطانیہ نے خود انھیں وہاں سے نکال دیا ۔ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء میں الدّمّام کی محافظ فوج نے برطانوی بحری فوج کو پسپا کر دیا ۔ برطانیہ کی فوج چاہتی تھی کہ قلعے کو برباد کرکے اس واقعے کا انتقام لے جو عمّان کے مقام صُور میں پیش آیا تھا ۔ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں ترکی کی حملہ آور فوج نے جو مشرقی عرب کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو چکی تھی، الدمام پر بھی قبضہ کر لیا ۔ ترکی انتظام کے تحت قلعے کی کوئی مرمت اور دیکھ بھال نہ کی گئی اور الدمام گھٹتے گھٹتے ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی ہو کر رہ گیا جس کا ذکر کبھی کبھی بنی ہاجر کے ساتھ ان کی بحری ڈاکہ زنی میں آ جاتا تھا ۔ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں لوریمر (Lorimer) نے اسے ایک کھنڈر بتایا ہے جو کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے ۔ عبدالعزیز آل سعود نے جب ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء میں الحسا کو فتح کیا تو الدّمّام پھر سعودی حکومت میں شامل ہو گیا ۔ موجودہ شہر الدّمّام کی بنیاد قبیلۂ الدّواسر (رک بآں) کے لوگوں نے رکھی جو ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء میں اپنے آپ کو برطانیہ کے انتقام سے محفوظ

رکھنے کے لیے البحرین سے بھاگے تھے۔ بیس سال تک الدمام ماہی گیروں کا ایک گمنام گاؤں رہا۔ ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء میں کیلیفورنیا اریبین سٹنڈرڈ آئل کمپنی California Arabian Standard Oil Company نے (جو اب اریبین امریکن آئل کمپنی Arabian American Oil Company ہے) قریب کے ایک مقام الظَّہران [رک بآں] میں تیل دریافت کیا جو اس بلند مقام پر واقع تھا جو بُرج دمام کہلاتا تھا۔ الدّمام نے اس وقت سے ترقی کرنا شروع کی جب ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء میں اُسے جدید طرز کی گہری سمندری بندرگاہ بنایا گیا اور یہاں سے ایک ریل دارالحکومت الرِّیاض جانے لگی۔ یہ بندرگاہ جو اینٹ اور پتھر کے ایک پایے (pierhead) پر مشتمل ہے جسے خشکی سے لکڑی کے ۱۰٫۷ کیلومیٹر لمبے پل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے، ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء میں کھولی گئی تھی اور بعد ازآں اسے زیادہ وسیع کر دیا گیا ہے۔ ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ء میں صوبۂ شرقیہ کا صدر مقام الہُفُوف سے جو الحسا کے نخلستان میں واقع ہے، الدّمام میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت سے الدمام تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اب یہاں شہری زندگی کی مختلف سہولتیں مہیا ہوگئی ہیں اور چھوٹے پیمانے پر تجارت اور صنعت و حرفت بھی شروع ہوگئی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اس شہر کی آبادی کا اندازہ پنتیس ہزار لگایا گیا تھا۔

مآخذ : (۱) محمد النبہانی: التحفة النبہانیہ، قاہرہ ۱۳۴۲ھ؛ (۲) عثمان ابن بشر: عنوان المجد، قاہرہ ۱۳۷۳ھ؛ (۳) J. G. Lorimer: *Gazetteer of the Persian Gulf*، کلکتہ ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء؛ (۴) H. St. J. B. Philby: *Sa'udi Arabia*، لنڈن ۱۹۵۵ء۔

(H. W. ALTER)

* **دَمْنات** : (=دِمْنات، دِمْنَت)، بربروں کا ایک چھوٹا سا شہر جو مراکش میں اطلس اعظم کے کنارے پر شہر مراکش کے مشرقی جانب ایک سو بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر نو سو ساٹھ میٹر اونچی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ یہاں سے اوید تَسَوت Oued Tassawt کی حاصل خیز وادی (جَو اور لوبیا) سامنے دکھائی دیتی ہے۔ اس پہاڑی کی ڈھلانیں زیتون کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

الحسن بن محمد بن الوزان الزیاتی (Leo Africanus) نے لکھا ہے کہ دمنات میں کئی علمائے حدیث و فقہ موجود تھے، جن میں علی بن سلیمان الدمناتی (البجعموی: ۱۲۳۴ھ تا ۱۳۰۶ھ) کا نام بآسانی لیا جا سکتا ہے [جس نے کتب حدیث کی شروح اور حواشی کی طرف بالخصوص توجہ کی]، مثلاً سنن ابی داؤد کی مختصر شرح لکھی ہے جس کا نام درجات مرقاة الصعود إلى سنن ابی داؤد ہے اور جو ۱۲۸۵ھ اور ۱۹۲۸ء میں قاہرہ میں طبع ہو چکی ہے؛ [نیز ۱۲۹۳ھ میں صحیح البخاری کا حاشیہ روح التوشیح (طبع قاہرہ ۱۲۹۸ھ) لکھا؛ وشی الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج (طبع ۱۲۹۹ھ)؛ جامع الترمذی کی شرح نفع قوت المغتذی علی جامع الترمذی (طبع ۱۲۸۹ھ)، نور مصباح الزجاجة علی سنن ابن ماجة، (طبع ۱۲۹۹ھ) وغیرہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں]۔

مآخذ : (۱) P. Flammand: *Les communautés israélites au Sud-Marocain*، دارالبیضاء ۱۹۵۹ء؛ (۲) L. Voinot: *Pèlerinages judéo-musulmans au Maroc*، در *IHEM*، Notes et Documents، ج ۴، پیرس ۱۹۴۸ء، ص ۱۵ ببعد، ۶۰ تا ۶۱؛ (۳) E. Doutté: *Missions au Maroc: En tribu*، پیرس ۱۹۱۴ء، ص ۲۱۶ تا ۲۱۷؛ (۴) *Textes Berb. en dial. de l'Atlas marocain* (در École des Lettres d. Alger، ج ۳۶)، پیرس ۱۹۰۸-۱۹۰۹ء؛ (۵) E. Laoust: *Étude sur le dialecte berbère des Ntifa*، پیرس ۱۹۱۸ء؛ [(۶) سرکیس: معجم المطبوعات العربیة، عمود ۵۲۷ تا ۵۲۸؛ (۷) عمر رضا کحالہ: معجم المؤلفین، ۷ : ۱۰۳ (مع مآخذ)؛ (۸)

الزرکلی: الأعلام، ۵: ۳۰۱]

([و اداره] Ch. Pellat)

* **دمنت**: رک به دمنات

* **دمنهور**: یه نام قدیم مصری زبان کے لفظ تِمَنْهُور سے لے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں حورس Horus کا شہر۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نام کے بہت سے شہر ملتے ہیں جو تقریباً سب کے سب دریاے نیل کے طاس میں واقع ہیں۔ (۱) دمنهور الشہید یعنی "شہید کا" دمنهور، یاقوت کے زمانے تک بھی اس کا یہی نام تھا اور اس نے یہی نام لکھا بھی ہے؛ بعد میں اس گاؤں کا نام دمنهور شبرا ہو گیا، لیکن یہ نام المقدسی کے علم میں پہلے ہی سے تھا۔ ابن مماتی اسے فقط دمنهور لکھتا ہے، ان دونوں ناموں میں اجزا کی ترتیب کبھی اُلٹ جاتی ہے۔ چنانچہ بعض مصنفین نے اسے شُبرا دمنهور لکھا ہے یہاں تک کہ بعض نے اسے شبرا شہید بھی لکھا ہے۔ اس قسم کے تغیرات مصر میں اکثر نظر آتے ہیں، خاص کر اس صورت میں جب ایک نام کے کئی مقاموں کو باہم الگ الگ کرنا ہوتا ہے۔ شُبرا کو شُبرا الخیمه یا شُبرا الخیام بھی کہہ دیتے ہیں یعنی خیموں کا شبرا.

اس مقام پر کبھی عیسائیوں کا ایک تابوت تھا جس میں کسی شہید کی ہڈیاں دفن تھیں۔ ۸ بَشَنْز (۳ مئی) کو ہر سال اس گاؤں میں عام تعطیل منائی جاتی تھی اور لوگ اس تابوت کو ساتھ لے کر جلوس کی شکل میں دریاے نیل تک جاتے تھے جہاں وہ تابوت دریا میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح دریا میں پانی زیادہ مقدار میں آئے گا۔ یہ بات یقینی ہے کہ ۷۰۲ھ/۱۳۰۲ء میں اس دن زیادہ شراب پینے اور دعوتیں کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ یہ رواج ۷۳۸ھ/۱۳۳۸ء میں دوبارہ شروع ہو گیا، لیکن ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء میں اسے قطعی طور پر بند کر دیا گیا اور تبرکات کو جلا دیا گیا۔

مآخذ: (۱) ابو صالح، ورق ۵۳؛ (۲) ابن مماتی، ص ۱۲۷؛ (۳) المقدسی، ص ۵۴، ۱۹۳، ۲۰۶؛ (۳) یاقوت، ۲: ۶۰۱؛ (۴) ابن دقماق، ۵: ۳۶؛ (۵) المقریزی، طبع Wiet، ۱: ۲۹۲ تا ۲۹۶؛ (۶) وہی مصنف: السلوک، ۱: ۹۳۹ (مترجمهٔ Quatremère، ج ۲ ب، ص ۲۱۳)؛ (۷) ابن تغری بردی، (طبع قاہرہ)، ۸: ۲۰۲ تا ۲۰۳؛ (۸) ابن جیعان، ص ۷؛ (۹) Quatremère: *Mémoires sur l'Egypte*، ۱: ۳۶۰؛ (۱۰) Amelineau: *Geographie de l'Egypte*، ص ۱۱۳ تا ۱۱۵ (اس سے باحتیاط کام لینا چاہیے)؛ (۱۱) J. Maspero اور G. Wiet: *Matériaux*، ص ۱۰۸ تا ۱۱۰، ۲۰۷.

(۲) صوبۂ بحیرہ کا صدر مقام جو بوزنطی عہد میں ہرموپولس پروا (Hermopolis Parva) کہلاتا تھا۔ نام چونکہ قدیم ہے اس لیے اسے مسلمانوں کی تخلیق نہیں کہہ سکتے، لیکن عرب فتوحات سے پہلے کی قدیم تاریخوں میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ یہاں کا مشہور مقام قرطسه ہے اور یہی ایک نام ہے جس سے قدیم مصنفین واقف تھے؛ انھوں نے اسے ایک کورہ کا صدر مقام بتایا ہے۔

اس کا قدیم ترین ذکر ابن مماتی کے یہاں ملتا ہے جو اسے دمنهور الوحش کہتا ہے۔ ابن جُبیر اور یاقوت اس میں سے ہو کر گذرے تھے۔ وہ اسے اوسط درجے کا شہر بتاتے ہیں، جو فصیل سے گھرا ہوا تھا۔ ابن مماتی ایک نہر کا بھی ذکر کرتا ہے جو شہر کے نام پر بحر دمنهور کہلاتی تھی۔ سلطان برقوق نے اس کی قلعہ بندی دوبارہ درست کرائی تاکہ بدوؤں کے حملوں کی مؤثر طریقے پر روک تھام ہو سکے۔ علاوہ بریں اس شہر کو ۷۰۲ھ/۱۳۰۲ء میں زلزلے سے بھی سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ دمنهور کی اہمیت بڑھتی رہی، اور ابن دقماق کے بیان کے مطابق اس میں ایک جامع مسجد، متعدد مدارس، کاروان سرائیں

اور چھوٹی ہوئی منڈیاں بھی تھیں۔ اس زمانے میں یہ فقط صوبۂ بحیرہ کا صدر مقام ہی نہیں تھا بلکہ ایک مملوک افسر اعلٰی کی اقامت گاہ بھی تھا، جس کا اقتدار پورے علاقے پر تھا۔ ڈاک کی جو سڑک صحرا کے کنارے کنارے قاہرہ سے اسکندریہ جاتی تھی، یہ مقام اس کی ایک منزل گاہ تھا اور یہاں پیغام رساں کبوتروں کا اڈّا بھی تھا۔ Sonnini کے بیان کے مطابق یہ شہر تو بڑا تھا لیکن اس کی تعمیر بہت بھدے انداز سے ہوئی تھی۔ یہاں کے تقریبًا سارے مکان یا تو کچے ہیں یا ناقص اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ یہ کپاس کی تجارت کا مرکز ہے جو فراخ اور وسیع میدانوں سے جو اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، اکٹھی کرکے وہاں لائی جاتی ہے۔

۳۰ اپریل ۱۷۹۹ء کو مہدی احمد کی فوجوں نے یہاں ایک فرانسیسی دستے کو تہہ تیغ کیا اور اس کے بڑے خوفناک نتائج برآمد ہوئے۔

دَمَنْہور آج کل آبادی کے لحاظ سے بڑا گنجان شہر ہے، قاہرہ سے اسکندریہ جانے والی ریل بھی یہاں ٹھہرتی ہے اور یہاں سے بہت سے دوسرے مقامات کو بھی ریلیں جاتی ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن عبدالحکم، ص ۸۳؛ (۲) Synaxaire Patrologia Orientalis، ۱۷: ۵۶۵، ۱۱۰۷؛ (۳) الادریسی: المغرب، ص ۱۶۰؛ (۴) ابن مماتی، ص ۱۶۹، ۲۲۶ تا ۲۲۷؛ (۵) ابن جُبیر، ص ۴۴ (ترجمہ Gaudefroy Demombynes، ص ۴۵)؛ (۶) یاقوت، ۲: ۶۰۱؛ (۷) ابن فُرات، ۹: ۸۶؛ (۸) ابن دُقماق، ۵: ۱۰۱؛ (۹) القلقشندی، ۳: ۴۰۶، ۱۴: ۲۷۶ (مترجمۂ وسٹینفلٹ، ص ۱۱۳)؛ (۱۰) المقریزی: السلوک، ۱: ۹۴۴ (مترجمۂ Quatrémere، ۲،ب، ۲۶۶)؛ (۱۱) الظاہری، ص ۳۵، ۱۱۷، ۱۱۹ (مترجمۂ Venture de Paradis، ص ۵۵، ۱۹۷، ۲۰۱)؛ (۱۲) ابن تغری بردی، (طبع قاہرہ)، ۱۱: ۲۹۱، ۱۲: ۱۱۳ تا ۱۱۴؛ (۱۳) ابن جیعان، ص ۱۱۶؛ (۱۴) Quatrémere: *Mémoires sur l'Égypte*، ۱: ۳۶۱ تا ۳۹۳؛ (۱۵) Dehérain: *Histoire de la Nation Égyptienne*، ۵: ۳۳۶؛ (۱۶) J. Maspero اور Wiet: *Matériaux*، ص ۱۳۶ تا ۱۳۷، ۱۷۵ تا ۱۷۸، ۱۸۰ تا ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۹۳۔

اسی نام کے دیگر مقامات جغرافیائی فہرست میں درج ہیں لیکن ان کا کچھ حال بتایا نہیں گیا۔

مآخذ: المقدسی: ص ۵۵؛ ابن مماتی، ص ۱۳۴-۱۳۵؛ ابن دقماق، ۵: ۸۹؛ ابن جیعان، ص ۷۸۔

(G. WIET)

* **دِمْیاط:** (Damietta)، مصرِ زیریں کا ایک شہر، جو دریاے نیل کی مشرقی شاخ پر اس کے دہانے کے قریب واقع ہے۔ دمیاط کو، جو فتح اسلام سے پہلے ایک اہم شہر تھا، مقدادؓ بن الاسود کی قیادت میں ایک فوج نے تسخیر کیا جسے عمروؓ بن العاص نے بھیجا تھا۔ مسلمانوں کے قبضے میں آنے کے بعد اس شہر کو بار بار بحری حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ حملے پہلے بوزنطیوں کی طرف سے ہوے اور پھر صلیبیوں کی طرف سے۔ ذوالحجہ ۲۳۸ھ/ جون ۸۵۳ء میں ایک حملے کے بعد المتوکل نے بحیرۂ روم کے ساحل کی مورچہ بندی کے ایک عام منصوبے کے مطابق دمیاط کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ بنو فاطمہ کے خاتمے پر اور آل ایوب کی حکومت کے دوران فرنگیوں اور مسلمانوں کی باہمی جنگوں میں دمیاط کو کلید مصر کی حیثیت سے خصوصی اہمیّت حاصل رہی۔ جب صلاح الدّین ایوبی وزیر مصر تھا، فرنگیوں نے امالرک (Amalric) اوّل، فرمانرواے بیت المقدس کی کمان میں دمیاط کا محاصرہ کر لیا، لیکن ربیع الاول ۵۶۵ھ/دسمبر ۱۱۶۹ء میں انہیں پسپا کر دیا گیا۔ دمیاطؔ دوبارہ پھر اہم فوجی مہموں کا مرکز بنا۔ ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء تا ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء کی عظیم صلیبی مہم کے دوران میں صلیبی اس شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے (دیکھیے Hans. L. Gotts-

chalk: *Al-Malik al-Kāmil von Egypten und seine Zeit*، Wieshaden ۱۹۵۸ء، ص ۵۸ تا ۷۰، ۷۶ تا ۸۸، ۱۰۴ تا ۱۱۵) لیکن بالآخر الملک الکامل نے انھیں ہتیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا۔ صفر ۶۴۷ھ/جون ۱۲۴۹ء میں ملک الصالح کی وفات سے کچھ ھی عرصہ پہلے لوئی نہم Louis نے دمیاط فتح کر لیا لیکن بعد ازاں لوئی کے سپر انداز ھونے پر یہاں مسلمانوں کا قبضہ بحال ھو گیا۔ بحری ممالیک نے کہ ان دنوں مصر کا حکمران طبقہ انھیں پر مشتمل تھا، دمیاط کی عسکری اھمیت ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ - ۱۲۵۱ء میں مسجد کے سوا فصیل اور سارے کا سارا شہر منہدم کر دیا گیا اور ۶۵۹ھ/۱۲۶۰ - ۱۲۶۱ء میں بیبرس کے حکم سے دریا کا دہانہ سمندر کی جانب جانے والے جہازوں پر بند کر دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ دمیاط کی بربادی وھاں کی کپڑے کی صنعت کے معدوم ھو جانے کا باعث بنی لیکن بہت جلد پرانے قصبے کے جنوب میں ایک نیا شہر وجود میں آ گیا جو پرانے نام ھی سے مشہور ھوا۔ دور ممالیک اور عہد آل عثمان میں دمیاط کو مقام جلاوطنی کی حیثیت حاصل رھی۔ ربیع الاول ۱۲۱۸ھ/جولائی ۱۸۰۳ء میں مصر کے عثمانی نائب السلطنت محمد خسرو باشا کو البانوی فوجیوں کی ایک بغاوت کے سبب سے قاھرہ سے نکلنا پڑا اور اس نے دمیاط کے مقام پر، جہاں وہ محصور ھو گیا تھا، اس فوج کے سامنے ہتیار ڈال دیے جس کی کمان محمد علی اور مملوکوں کا امیرالامرا عثمان بک البردیسی کر رھے تھے۔

مآخذ: ضروری معلومات (۱) المقریزی: المواعظ، طبع Wiet، ۲/۳: ۷۲ تا ۸۰؛ (۲) علی مبارک: الخطط الجدیدۃ، ۱۱: ۳۶ تا ۵۷ (جہاں زیادہ تر المقریزی ھی کے بیانات نقل کر دیے گئے ھیں) میں موجود ھیں۔ مکمل مآخذ کے لیے دیکھیے (۳) Maspero-Wiet: *Matériaux*، ص ۹۰ تا ۹۰۔

(P. M. Holt)

الدمیاطی البناء

الدمیاطی البناء: احمد بن محمد بن احمد بن محمد بن عبدالغنی الدمیاطی المعروف بہ البناء، اگرچہ وہ مصر زیرین میں مقامی طور پر درویشوں کے سلسلۂ نقشبندیہ کے رکن رکین کی حیثیت سے مشہور تھا، لیکن اس کی اصلی شہرت اس کی تصنیف اِتحاف فضلاء البشر کے باعث ھے، جو قرّاء اربع عشرۃ کی مختلف قرآنی قراءتوں کے بارے میں ھے۔ الدمیاطی دمیاط میں پیدا ھوا۔ وھاں اس نے مقامی اساتذہ سے وھی تعلیم حاصل کی جو اس زمانے میں عام مسلمان لڑکے پاتے تھے تا آنکہ اسے قاھرہ جانے کا موقع ملا جہاں اس نے المزاحی اور شبراملسی سے علم القراءات، حدیث اور شافعی فقہ پڑھی، اور الاجہوری، الشوبری، القلیوبی اور المیمونی جیسے کاملان فن سے بھی استفادہ کیا۔ اپنی تعلیم ختم کر لینے کے بعد وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکۂ معظمہ گیا جہاں اس نے الکورانی سے علم حدیث حاصل کیا۔ دمیاط میں واپس آ جانے کے بعد الدمیاطی نے اپنی کتاب اتحاف شائع کی جسے وہ بظاھر اپنے قیام حجاز کے دوران تصنیف کرتا رھا تھا۔ اس کتاب میں اس نے ابن مُحَیصن المکّی، الیزیدی البصری اور الاعمش الکوفی نیز ان قرّاء عشرۃ کی قراءتیں جمع کیں جن کا عام طور پر زیادہ مطالعہ کیا جاتا ھے اور اس میں علم قراءت پر ایک نہایت فاضلانہ مقالہ بطور مقدمہ شامل کیا۔ الدمیاطی نے مشہور کتاب السیرۃالحلبیۃ کا ایک جلد میں ملخص بھی تیار کیا اور ایک رسالہ الذخائرالمہمات روز قیامت سے پہلے ظہور میں آنے والی نشانیوں کے بارے میں لکھا۔ پھر اس نے دوسری بار حج کیا اور حرمین شریفین کی زیارت کے بعد یمن کا سفر اختیار کیا جہاں شیخ احمد بن عجیل کے کہنے پر وہ سلسلۂ نقشبندیہ میں منسلک ھو گیا۔ مصر واپس آ کر اس نے عزبۃالبرج کے ساحلی گاؤں میں سکونت اختیار کی اور ایک رابط (تارک الدنیا درویش) کی زندگی بسر کرنے لگا۔ الدمیاطی جب تیسری بار حج

کرنے گیا تو مدینۂ منورہ میں محرم ۱۱۱۷ھ/اپریل - مئی ۱۷۰۵ء میں وفات پا گیا اور البقیع میں سپرد خاک ہوا۔ اتحاف کے علاوہ، جو قسطنطنیہ میں ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ - ۱۸۶۹ء میں اور قاہرہ میں ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ - ۱۹۰۰ء میں چھپی تھی، اس نے قراءت قرآن کے بارے میں چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی تھیں جن کے قلمی نسخے اب تک باقی ہیں۔ علاوہ بریں امام الحرمین کی تصنیف الورقات پر المحلّی کی شرح کا ایک حاشیہ بھی الدمیاطی نے لکھا تھا، جو قاہرہ میں ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ - ۱۸۸۶ء اور بار دوم ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ - ۱۹۱۴ء میں طبع ہو چکا ہے۔

مآخذ: (۱) الجبرتی: عجائب الآثار، ۱: ۸۹، ۹۰، منقول در علی پاشا مبارک: الخطط الجدیدۃ، ۹: ۵۶؛ (۲) سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، عمود ۸۸۵؛ (۳) براکلمان، ۲: ۳۲۷ و تکملہ، ۲: ۴۵۴۔

(A. JEFFERY)

* **الدِّمیاطی**: عبدالمؤمن بن خلف شرف الدّین التّونی الدّمیاطی الشافعی، ایک محدّث، جو ۶۱۳ھ/۱۲۱۷ء میں دمیاط اور تنّیس کے درمیانی جزیرے تونا میں پیدا ہوا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ منصوریّہ میں اور قاہرہ کے مدرسۃ الظاہریّہ میں معلم تھا اور یہیں ۷۰۵ھ/۱۳۰۶ء میں اس نے وفات پائی۔ براکلمان کی دی ہوئی فہرست تصانیف کے علاوہ (جس میں A. Dietrich کے حالیہ مطالعے *Abdalmu'min b. Xalaf ad-Dimyati'nin bir muhâcirûn listesi* در شرقیات مجموعہ سی، ۳ (۱۹۵۹ء): ۱۲۵ تا ۱۵۵ کا بھی اضافہ کر لینا چاہیے) الدمیاطی نے معجم شیوخ کے نام سے ایک لغت اسناد بھی تصنیف کی ہے۔ زمانۂ مابعد کے مؤرخوں اور سوانح نگاروں نے اکثر اس کتاب کے حوالے دیے ہیں اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ آج یہ کتاب اپنے ایک واحد نامکمل نسخے کی صورت میں موجود ہے (کتاب خانۂ احمدیہ، تونس، ص ۹۱۱ تا ۹۱۲)، جو مکمل تصنیف کے ۱۲۵۰ میں سے ۱۱۸۵ مندرجات پر مشتمل ہے اور جس کی کتابت خود مصنف نے کرائی تھی۔ اس تصنیف میں وہ احادیث اور دیگر متون شامل ہیں جو الدمیاطی نے ۶۳۶ھ/۱۲۳۸ء اور ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء کے مابین مصر، حرمین شریفین، شام، الجزیرہ اور عراق کے متعدد سفروں کے دوران میں اکٹھے کیے تھے۔ یہ تمام جزیں، نیز کئی اسناد قراءت، جو ان کے ساتھ شامل ہیں، G. Vajda کے ایک تحقیقی مقالے کا موضوع بنی ہیں۔ انہی تصنیفات سے قطع نظر الدمیاطی ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کی آخری تہائی میں حدیث کا اہم ترین راوی تصور کیا جاتا تھا۔

مآخذ: (۱) براکلمان، بار دوم، ۲: ۸۸ و تکملہ، ۲: ۷۹؛ (۲) الدرر الکامنۃ، ۲: ۴۱۷، عدد ۲۵۲۵؛ (۳) ابن رافع: منتخب المختار، طبع العزّاوی، ص ۱۲۰ تا ۱۲۲، عدد ۱۰۴؛ الدمیاطی بحیثیت راوی حدیث کے بارے میں نیز دیکھیے (۴) Ahlwardt: *Verzeichniss .... Berlin*، عدد ۹۶۳۸ (۹: ۱۹۲ ببعد)؛ (۵) G. Vajda: *Les certificats de lecture* ...، ص ۲۱؛ (۶) احمد آتش، در *RIMA*، ۱۹۵۸ء، ۴/۱: ۴۱۔

(G. VAJDA)

* **الدِّمیاطی**: نور الدّین، یا اصیل الدّین؛ اس کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کے بارے میں معلومات یقینی نہیں ہیں، لیکن اتنی بات کم و بیش وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا زمانہ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے پہلے کا نہیں ہے۔ وہ اسماے باری تعالٰی کی تشریح میں ایک قصیدۂ لامیّہ کا مصنف تھا (رک بہ الاسماء الحسنٰی: ذکر)۔ مشہور ہے کہ اس قصیدے کے ہر شعر میں پراسرار خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اس کی شرحوں میں، جو بکثرت لکھی گئی ہیں، انہیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (مشہورترین شرح مراکشی

صوفی احمد البرنوسی زرّوق، م ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء کی ہے) - خاص طور پر شمالی افریقہ کے نیم خواندہ عوام کے اوراد و وظائف میں قصیدۂ دمیاطیہ کو خاصا بلند مقام حاصل ہے - ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں اس کا ترجمہ عثمانی ترکی میں ابراہیم بن محمد صالح القادری القسطمونی الاستانبولی نے کیا تھا، جو اگلے سال کئی تقریظوں اور عربی متن کے ساتھ استانبول میں فرائدالآلی فی بیان اسماءالمتعالی کے نام سے طبع ہوا - اسی نوع کی ایک اور تصنیف الدمیاطی سے منسوب ہے، جس کا ایک حصہ مع شرح ایک مخطوطے کی صورت میں کتاب خانۂ ملی، پیرس (عربی، عدد ۱۰۵۰، ورق ۱۲۸ تا ۱۲۹) میں محفوظ ہے - اس کی ایک نقل، جو عوامی زبان سے مبرا نہیں، محمود عزۃ الدمیاطی نے لکھی تھی (جو الاستغفار الاسماء فی نظم اسماء اللہ الحسنٰی کے نام سے بولاق ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں بدیع المثال کے ضمیمے کے طور پر طبع ہوئی تھی .

مآخذ : (۱) J. Goldzihr، در *Orientalische Studien* ...... Nöldeke، ۱ : ۳۱۷ تا ۳۲۰؛ (۲) E. Doutté: *Magie et Religion en Afrique du Nord*، ص ۱۹۹ تا ۲۱۱؛ (۳) G. Levi Della Vida: *Elenco*، ص ۵۵ تا ۶۶؛ (۴) براکلمان: تکملہ، ۲ : ۳۶۱ حاشیہ .

(G. VAJDA)

* **دِمیر بَاش :** لفظی معنی "لوہے کی انی"؛ دفتر، دکان، کھیت وغیرہ سے تعلق رکھنے والے قابل انتقال اثاثے اور ساز و سامان کے لیے ایک ترکی اصطلاح - عثمانی ترکوں کے محاورے میں اس کا اطلاق عموماً ان اشیا پر ہوتا تھا جو حکومت کی ملکیت ہوتی تھیں، خاص طور پر اس سے مراد سرکاری دفاتر کے فرش و فروش، ساز و سامان اور مستقل لوازمات ہوتے تھے، جو کسی مستقل ادارے سے متعلق ہوتے تھے - لفظ "دمیر باش" کے معنی ضدی اور مستقل مزاج کے بھی آتے ہیں اور عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اسی مفہوم میں اس لفظ کا اطلاق ترکوں نے سویڈن کے بادشاہ چارلس دوازدہم پر کیا تھا - ممکن ہے کہ یہ عرفی نام اس کے ترکی سرکاری دفاتر میں چکر لگاتے رہنے پر ایک طنزیہ تنقید ہو .

مآخذ : (۱) BSLP، ۱۹۶۰ء / ۱۹۶۱ء، ج ۲۳ (ادارہ [و]، لائڈن، بار دوم).

* **دُمیرقپو :** (یا دُمیر قپی) [- تامر قپو، تمیر قپو]، رک بہ درآہنین .

* **الدَّمیری :** محمد بن موسٰی بن عیسٰی کمال الدین، ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء کے اوائل میں قاہرہ میں پیدا ہوا (اس کی خود نوشت تحریر کے مطابق، جسے السخاوی نے الضوء اللامع، ۱۰ : ۵۹ میں نقل کیا ہے) اور وہیں ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں وفات پائی - بعض مآخذ میں اس کی تاریخ پیدائش اس کے بعد کی بتائی گئی ہے (۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء یا ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء)، لیکن یہ تاریخیں اس کی زندگی کی بعض تفصیلات سے مطابقت نہیں رکھتیں - اس کی نسبت دو چھوٹے چھوٹے گاؤوں کے ناموں سے مأخوذ ہے، جن میں سے ہر ایک کا نام دمیرہ ہے اور دونوں سمنود کے قریب طاس میں واقع ہیں .

شروع میں وہ اپنے آبائی شہر میں درزی کے کام سے کسب معاش کرتا رہا - بعد ازاں اس نے پیشہ ور عالم دین بننے کا فیصلہ کیا اور تحصیل علم کے لیے مشہور شافعی عالم بہاءالدین السبکی [رک باں] کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور اس کے دامن علم سے وہ کئی سال تک وابستہ رہا - اس کے علاوہ اس نے جمال الدین الاسنوی (براکلمان، ۲ : ۱۱۰ و تکملہ، ۲ : ۱۰۷)، ابن العقیل، جو الفیہ ابن مالک کا مشہور شارح ہے (براکلمان، ۲ : ۱۰۸ و تکملہ، ۲ : ۱۰۳)، برہان الدین القیراطی (براکلمان، ۲ : ۱۵ و تکملہ، ۲ : ۷) اور دیگر علما سے بھی درس لیا - اس کے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ اسے فقہ، علوم حدیث، تفسیر، عربی علم اللسان اور معانی و بیان میں بڑی

مہارت تھی۔ اس کا کم سن ہمعصر المقریزی [رک بآں] اپنی کتاب المقفّٰی میں اس کا ذکر محبت اور تحسین کے ساتھ کرتا ہے.

جب الدمیری کو متداول علوم اسلامیہ کی تدریس اور فتوے دینے کی اجازت مل گئی تو وہ بعض دینی درسگاہوں اور خانقاہوں سے وابستہ رہا (الازہر، جامعہ الظاہر، مدرسۂ ابن البقری، قبّہ بیبرس دوم وغیرہ)، جہاں وہ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں مصروف رہا اور حصہ رسدی اپنا وقت مختلف مدارس کے لیے وقف کرتا رہا۔ وہ تصوف کے اس مسلک سے وابستہ تھا جس کی تاسیس خانقاہ صالحیہ (جو پہلے دار سعید السعداء کہلاتی تھی؛ قب علی مبارک: ۴: ۱۰۲؛ المقریزی: خطط، بولاق، ۱۲۷۰ھ، ۲: ۴۰۵) میں ہوئی تھی۔ الدمیری اپنی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے مشہور تھا اور لوگ اسے صاحب کرامات سمجھتے تھے۔ نوجوانی میں تو وہ کھانے پینے کا حد سے زیادہ شوقین تھا، لیکن بعد میں اس نے تقریباً ہمیشہ روزہ رکھنے کو اپنی عادت بنا لیا تھا۔ وہ اپنا وقت نمازوں میں گزارتا اور شب بیداری کرتا۔ ۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء اور ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء کے درمیان اس نے چھے حج کیے۔ مکے اور مدینے کے دوران قیام میں اس نے مختلف مقامی علما و فضلا سے تعلیم کی تکمیل کی اور درس فتاوی سے بھی عوام کو مستفید کیا۔ اس نے دو شادیاں کیں۔ اپنے آخری حج کے بعد وہ اپنی وفات تک قاہرہ میں رہا۔ وفات کے بعد اسے جامعۂ سعید السعداء کے قریب صوفیوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا (قب علی مبارک، ۴: ۱۰۲ ببعد).

مصنف کی حیثیت سے الدمیری اپنی کتاب حیٰوۃ الحیوان کی وجہ سے مشہور ہے، جو علم الحیوانات کا دائرۃ المعارف ہے۔ اسی کتاب کی بدولت مشرق اور مغرب دونوں میں اس کی شہرت ہوئی۔ اس کتاب کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے کہ اس نے یہ کتاب کسی فطری میلان کی بنا پر نہیں لکھی بلکہ اس کا مقصد ان غلط خیالات کی اصلاح تھا جو جانوروں کے متعلق عموماً پڑھے لکھے لوگوں میں بھی عام تھے۔ اس کتاب کا مسودہ اس نے ۷۷۳ھ/۱۳۷۱-۱۳۷۲ء میں تیار کر لیا تھا۔ اس کی حیثیت عربی میں محض علم الحیوانات کی ایک مختصر تصنیف ہی کی نہیں بلکہ وہ مسلم عوام کی متداول روایات و عقائد کا مخزن بھی ہے، جس کا حال جزئی طور پر J. de Somogyi نے اپنی علمی تحقیقات میں لکھا ہے۔ مصنف نے اپنے بیان کو اصل موضوع، یعنی محض حیوانات ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ بڑی تفصیل کے ساتھ ہر اس جزء کا حال لکھ دیا ہے جو جانوروں کے متعلق کسی طرح بھی کہی گئی ہو۔ علاوہ بریں وہ اپنا اصل موضوع چھوڑ کر دوسرے مباحث کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہے، جن میں سب سے نمایاں اور اہم تاریخ خلفا کا جائزہ ہے اور یہ اس کی پوری کتاب کا تقریباً تیرھواں حصہ ہے.

اس کتاب کے مقالات حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیے گئے ہیں اور ترتیب میں حیوانات کے ناموں کے پہلے حروف کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر مقالے میں مندرجۂ ذیل مطالب سے بحث کی گئی ہے: (۱) ہر حیوان کے نام کے لسانی پہلو؛ (۲) حیوان اور اس کی عادات کی تفصیل؛ (۳) حدیث کی کتابوں میں حیوانات کا ذکر؛ (۴) بحیثیت غذا مختلف حیوانات کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق مختلف مذاہب کی رائے؛ (۵) حیوانات کے نام سے تعلق رکھنے والی ضرب الامثال؛ (۶) ہر حیوان کے اعضا اور اجزا کے طبی اور دیگر خواص؛ (۷) مختلف حیوانات کے خواب میں دکھائی دینے کی تعبیر۔ کتاب میں ۱۰۶۹ مقالے ہیں۔ ان مقالوں میں جن مختلف جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں براق بھی شامل ہے۔ جانوروں کی تعداد مقالات کی تعداد سے بہت کم ہے کیونکہ ایک ہی جانور کا ذکر مختلف ناموں کے تحت بار بار آتا ہے۔ مصنف چونکہ طبیعات کا ماہر نہیں اس لیے اس نے کسی طرح کی تنقید کیے بغیر جانوروں کے ذکر میں

وہمی اور خیالی باتوں کو بھی جگہ دی ہے۔ اس نے جانوروں کے متعلق ان تمام معلومات کو جن کی حیثیت روایتی ہے ایک ترتیب کے ساتھ جمع کرکے دوسروں تک پہنچا دیا ہے اور ان معلومات کی بنیاد سینکڑوں ماخذ پر رکھی ہے۔ ان ماخذ کا تجزیہ J. de Somogyi نے کیا ہے گو یہ تجزیہ اطمینان بخش نہیں۔ یہ کتاب تین منقح نسخوں میں ملتی ہے: ایک مفصل، ایک مختصر اور ایک متوسط۔ مطول نسخہ مشرق میں تیرہ بار طبع ہوچکا ہے (ان اشاعتوں کے علاوہ جن کا ذکر براکلمان نے کیا ہے یہ کتاب قاہرہ میں ۱۳۱۵-۱۳۱۶ھ، ۱۳۲۱-۱۳۲۲ھ، ۱۳۵۳ھ میں بھی چھپی تھی) اس کتاب کی تنقیدی طباعت کا ہنوز انتظار ہے۔ اس کے متعدد خلاصے اور اقتباسات بھی مرتب کیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں سترھویں صدی کا ایک فارسی ترجمہ اور قریبی زمانے کا ایک ترکی ترجمہ بھی ملتا ہے۔ Jayakar کا انگریزی ترجمہ مقالۂ ابو نواس تک ہے (جو پوری کتاب کا تقریباً تین چوتھائی ہے) اور لسانی نقطۂ نظر سے قابل اطمینان نہیں۔

الدمیری کی دیگر تصانیف میں سے اس وقت صرف تین موجود ہیں (دیکھیے براکلمان)۔ اس کی آخری تصنیف الدیباجۃ، ابن ماجہ (رک باں) کی نصف سنن کی شرح ہے لیکن الدمیری اپنی وفات سے پہلے اس کا صاف نسخہ تیار نہیں کر سکا تھا۔

مآخذ: (۱) علی مبارک: الخطط الجدیدۃ، ۱۱: ۵۹؛ (۲) براکلمان، ۲: ۱۴۲ ببعد و تکملہ، ۲: ۱۷۰ ببعد و ۳: ۱۲۶۰؛ (۳) الدمیری: حیاۃ الحیوان، عربی سے ترجمہ از A. S. G. Jayakar، لنڈن و بمبئی ۱۹۰۶ تا ۱۹۰۸ء، دیباچہ؛ (۴) حاجی خلیفہ، ۱: ۶۹۶ ببعد و طبع Flügel، بمدد اشاریہ، ص ۱۲۲۷، عدد ۴۷۵۹؛ (۵) ابن العماد: شذرات، بذیل ۸۰۸ھ؛ (۶) السخاوی: الضوء اللامع، ۱۰: ۵۹ ببعد؛ (۷) Sarton: *Introduction to the History of Science*، ۳/ب: ۱۱۶۸ ببعد، ۳ : ۱۲۱، ۱۳۴۹ھ/۱۹۲۹ء؛ (۸) الشوکانی: البدر الطالع، ۲: ۲۷۲؛ (۹) J. de Somogyi: *Index des sources de la Ḥayāt al-Ḥayawān ad-Damīrī*، در *JA*، جولائی-ستمبر ۱۹۲۸ء، ص ۵ ببعد، جس کا دارومدار بعض طبع قاہرہ ۱۲۸۴ھ پر ہے؛ (۱۰) وہی مصنف: *Biblical Figures in ad-Damīrī's Ḥayāt-Ḥayawān*، در *Dissert. in honorem E. Mahler*، ۱۹۳۷ء، ص ۲۶۳ ببعد؛ (۱۱) وہی مصنف: *ad-Damīrī's Ḥayāt al-Ḥayawān*، در *Osiris*، ج ۹ (۱۹۵۰ء)، ص ۳۳ ببعد؛ (۱۲) وہی مصنف: *ad-Damīrī Ḥayāt al-Ḥayawānja* (زبان ہنگروی)، در *Sem. St. in Memory of I. Löw*، ۱۹۴۷ء، ص ۱۳۳ ببعد؛ (۱۳) وہی مصنف: *Chess and Backgammon in ad-Damīrī's Ḥayāt al-Ḥayawān*، *Et. or. à la mém. de P. Hirschler*، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۱ ببعد؛ (۱۴) وہی مصنف: *Medicine in ad-Damīrī's Ḥayāt-al-Ḥayawān*، در *JSS*، ۲ (۱۹۵۷ء): ۶۲ ببعد؛ (۱۵) وہی مصنف: *The Interpretation of Dreams in ad-Damīrī's Ḥayāt al-Ḥayawān*، در *JRAS*، ۱۹۴۰ء، ص ۱ ببعد؛ (۱۶) *Die Chalifengeschichte in Damīrī's "Ḥayāt Ḥal-ayawān"*، در *Isl.*، ۱۸ (۱۹۲۹ء): ۱۵۴ ببعد؛ (۱۷) وہی مصنف: *A History of the Caliphate in the Ḥayāt al-Ḥayawān of ad-Damīrī*، در *BSOS*، ۸ (۱۹۳۵ تا ۱۹۳۷ء): ۱۴۳ ببعد؛ (۱۸) E. Wiedemann: *Beitr. z. Gesch. d. Naturw.*، ۵۳: ۲۳۳ ببعد؛ (۱۹) H. A. Winkler: *Eine Zusammenstellung christlicher Geschichten (im Artikel über das Schwein in Damīrī's Tierbuch*، در *Isl.*، ۱۸ (۱۹۲۹ء): ۲۸۵ ببعد۔

(L. Kopf)

* **دَنابُل، دَناقلہ**: رک بہ دَنْقلی۔

* **دِرْب**: رک بہ نُجوم۔

* **دُنْباوَنْد**: رک بہ دَماوَنْد۔

* **دُنْبُلی**: رک بہ کُرد۔

* **دِنْدان** : ابو جعفر احمد بن حسین کا لقب، جو تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کا ایک شیعی محدّث تھا ۔ اس کا والد ایک معتبر راوی تھا، جس نے امام علی الرضاؑ، امام محمد الجوادؑ اور امام علی الہادیؑ سے احادیث روایت کی ہیں ۔ وہ دراصل کوفے کا باشندہ تھا اور وہ کچھ مدت اہواز میں بھی رہا اور وہیں اس کے ہاں دندان کی ولادت ہوئی ۔ دِنْدان نے بھی اپنے والد کے شیوخ کی سند پر احادیث روایت کی ہیں؛ لیکن چونکہ وہ غُلاۃ میں سے متصوّر ہوتا تھا اس لیے بطور راویِ حدیث اس کی ذات قابل گرفت سمجھی جاتی رہی ہے ۔ دندان نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں کتاب الاحتجاج، کتاب الانبیاء، کتاب المثالب اور کتاب المختصر فی الدعوات شامل ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی محفوظ نہیں رہ سکی ۔ وہ قمّ میں فوت ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوا ۔

یہ معلومات بارہ شیعی تالیفات میں ملتی ہیں، جو علما اور ان کی کتابوں کے بارے میں ہیں (مثلاً *Tusy's List of Shy'ah Books*، طبع شپرنگر و عبدالحق، کلکتہ ۱۸۵۳ء، ص ۲۶؛ ابن شہر آشوب : معالم العلماء، طبع اقبال، تہران ۱۹۳۴ء، ص ۱۰؛ استرآبادی : منہاج المقال، تہران ۱۳۰۷ھ، ص ۱۴) ۔ دندان کے غالی عقائد پر ان سنّی ماخذ میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جو اسمٰعیلیوں کے اصل و ابتدا کے بارے میں ہیں (الفہرست، ص ۱۸۸؛ البغدادی : فَرق، ص ۲۶۶؛ مترجمۂ A. S. Halkin : *Moslem schisms and sects*، تل ابیب ۱۹۳۵ء، ص ۱۰۸؛ المقریزی، طبع قاترمیر، در *JA*، ۱۸۳۶ء، ص ۱۳۲ وغیرہ) ۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دندان نے عبداللہ بن میمون [رک باں] کے ساتھ مل کر اس فرقے کی بنیاد رکھی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اسمٰعیلی عقائد کی تشکیل و تبلیغ میں عملی حصہ لیا اور دعوت کے مالی پہلو کو مستحکم کرنے کی غرض سے بڑی بڑی رقمیں فراہم کیں ۔ بروے الفہرست وہ احمد ابن عبدالعزیز بن ابی دلف (م ۲۸۰ھ/۸۹۳ء) [رک باں] کا دبیر تھا ۔ اس کا نام اور شجرۂ نسب ان ماخذ میں مختلف طریقوں سے بگاڑا گیا ہے ؛ تاہم قابل شناخت ہے ۔ اس کے دادا کا نام مختلف تصحیفات کے ساتھ "چہار لختان" ملتا ہے، جو لازماً اس کا عرف ہوگا ۔ ابوالمعالی (بیان الادیان، طبع اقبال، ص ۳۶، مترجمۂ Masse، در *RHR*، ۱۹۲۶ء، ص ۵۷) نے چہار لختان کو باطنی فرقے کی بنیاد رکھنے میں دندان اور عبداللہ بن میمون کا شریک کار قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس جماعت میں سرمایہ لگانے والا وہی شخص تھا ۔

شیعی ماخذ میں ان سے کہیں بہتر معلومات دستیاب ہوتی ہیں ۔ ان کی رو سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دندان تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں زندہ تھا؛ لہذا وہ ابن ابی دلف کا دبیر تو ہو سکتا ہے لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ وہ عبداللہ بن میمون کا معین و مددگار ہو کیونکہ مؤخرالذکر دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں زندہ تھا اور اسی صدی میں فوت ہوا تھا ۔ بایں ہمہ ممکن ہے کہ اس نے اسمٰعیلیہ کی ابتدائی تاریخ کی تشکیل میں کچھ حصہ لیا ہو، لیکن یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ اسمٰعیلیوں کے ہاں نہ تو اس کا نام کہیں ملتا ہے، نہ اس کی کسی تصنیف کا ذکر آیا ہے ۔

مآخذ : (۱) M.J. De Goeje : *Mémoire sur les Carmathes........*، بار دوم، لائڈن ۱۸۸۶ء، ص ۱۵؛ (۲) L. Massignon : *Esquisse d'une bibliographie Carmathe*، در *A volume of Oriental Studies presented to E. G. Browne*، کیمبرج ۱۹۲۲ء، ص ۳۲۹؛ (۳) B. Lewis : *The origins of Ismā'ilism*، کیمبرج ۱۹۴۰ء، بمدد اشاریہ؛ (۴) S.M. Stern : *Abu'l-Qasim al-Busti and his refutation of Isma'ilism*، در

JRAS، ۱۹۶۱ء، ص ۸۲ تا ۹۱ .

(B. Lewis)

دِنِزلی : (= دگزلی، دِنیزلی)، جنوب مغربی آناطولی میں اسی نام کی ولایت کا سب سے بڑا شہر، جو ایک زرخیز میدان میں واقع اور ازمنۂ قدیم سے آباد ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں دنزلی نے لادیق (قدیم زمانے کا Laodicea ad Lycum) کی جگہ لے لی، جس کے کھنڈر اسکی میں گنجلی کے رباوے سٹیشن کے نزدیک، دنزلی سے نو کیلومیٹر کے فاصلے پر، دریاے بیوک مندرس کی معاون ندی چوروک صُو کے کنارے ابھی تک باقی ہیں۔ تیسری صدی ق - م میں اسے سلوکسی خاندان کے انطاکیوس Antiochus ثانی نے قدیم دیوس پولس Diospolis (Pliny، ۵ : ۱۰۵) کی جگہ پر تعمیر کرایا تھا اور تجارتی راستوں کا ایک اہم مقام اتصال تھا۔ رومیوں کے زمانے میں اس کا شمار فرجیہ Phrygia کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتا تھا (Strabo، ۱۲ : ۵۷۸)۔ گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک لاودیکیا (Laodicaea) بوزنطی علاقہ رہا، لیکن بعد ازاں یہ کمنینی (Comneni) خاندان اور سلجوق ترکوں کے مابین متنازع فیہ بن گیا، چنانچہ سلاجقہ نے کئی دفعہ اس پر قبضہ کیا۔ الکسیوس Alexis اول نے اسے ۴۹۱ھ/۱۰۹۸ء میں ان سے چھین لیا اور عارضی طور پر وہ اس کے ہاتھ میں رہا (Anna Comnena، طبع Leib، ۲ : ۲۷)۔ ۵۱۳ھ/۱۱۱۹ء میں جون کمنینوس John Comnenus نے اس پر دوبارہ قبضہ کیا اور اسے مستحکم کر دیا (.Cinn، ص ۵؛ Nicetas، ص ۱۷)۔ گو ترکی قبائل نے، جو قریب قریب انھیں ایام میں اس ضلع میں آباد ہوے تھے، ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء اور ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء میں اسے تاراج کیا، تاہم وہ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء تک بوزنطیوں ہی کے ہاتھوں میں رہا (.Cinn، ص ۱۹۸؛ Nicetas، ص ۱۹۳، ۵۲۳) تاآنکہ اس تاریخ کو تھیوڈور لاسکاریس Theodore Lascaris لاودیکیا اور چوناءی Chonae (موجودہ خوناس) کو مانویل موروزومیس Manuel Mavrozomes کے حوالے کر دینے پر مجبور ہوگیا، جو غیاث الدین کیخسرو اول کا خسر تھا (Nicetas، ص ۲۸۷؛ Houtsma: *Rec. de textes rel. à l'hist. des. Seldj.*، ۳ : ۶۶ تا ۶۷ و ۴ : ۲۲)؛ تاہم ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء میں عزالدین کیکاؤس ثانی نے یہ شہر میخائیل بلیولوجوس Michael Palaeologus کو دے دیا، تاکہ وہ اس سے اپنے بھائی رکن الدین اور مؤخرالذکر کے حلیف مغول کے خلاف امداد حاصل کر سکے؛ لیکن مختصر سی یونانی محافظ فوج زیادہ دیر تک مدافعت نہ کر سکی (Acropolitus، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴) اور دو سال بعد یہ شہر ایک بار پھر ترکمانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ تقریبًا اسی زمانے میں مشرقی دستاویزات میں لادیق کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے طونزلو کا ذکر آتا ہے؛ یہ نام بعد میں تبدیل ہو کر دنزلی ہوگیا اور چودھواں صدی عیسوی میں اس نے لادیق کی جگہ لے لی۔ ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء میں اس ضلع کے ترکمان سردار، محمد بیگ نے (جسے اسی نام کے قرامانی سردار کے ساتھ جو ۶۷۵ھ/۱۲۷۷ء میں فوت ہوا اور محمد بیگ ایدین اوغلو کے ساتھ، جو ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء میں فوت ہوا، خلط ملط نہیں کرنا چاہیے) عزالدین کیکاؤس کے خلاف بغاوت کر دی اور اس ضلع کو فتح کر لیا۔ پھر سلجوقی سلطان کی اطاعت سے انکار کرکے اس نے ہولاگو سے طونزلو، خوناس (Honaz) اور طالمانی (Dalaman) کے شہروں کی باقاعدہ تحویل کے لیے فرمان کی درخواست کی۔ اس طرح دنزلی کی پہلی ترکمان ریاست کی بنیاد رکھی گئی، لیکن یہ چند روزہ ثابت ہوئی۔ ۶۶۰ھ/۱۲۶۲ء میں رکن الدّین کی درخواست پر ہولاگو نے محمد بیگ کے خلاف چڑھائی کر دی۔ محمد بیگ نے شکست کھائی اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کا داماد علی بیگ علاقے کے ترکمانوں کا سردار بن گیا،

لیکن لاذیق اور خوناس کے شہر ان مقبوضات میں شامل کر دیے گئے جو ۶۶۹ھ/ ۱۲۷۱ء میں وزیر فخرالدین علی کے بیٹوں کو عطا ہوے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ علی بیگ نے محض دوبارہ آزادی حاصل کرنے ہی کے لیے ۶۷۵ھ/۱۲۷۷ء میں جِنْدری اور محمد قرامانی کی بغاوت میں حصہ لیا تھا، لیکن اس نے سلطان کی فوج کے ہاتھوں شکست کھائی اور مارا گیا۔ بہر کیف مرکزی حکومت کی کمزوری کے نتیجے میں طونزلو۔ لاذیق کا خطہ گرمیان کے ترکمان امیروں کے ہاتھ آ گیا، جنھوں نے تیرھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں کوتاھیہ کے شہر پر قبضہ کرتے ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ العمری اور ابن بطوطہ کے بیانات کی رو سے، جنھوں نے ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء اور ۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء میں اس شہر کی سیاحت کی، طونزلو اور نواحی علاقہ اس وقت گرمیان خاندان کے ایک امیر ینج [= ائنانج] بیگ کے قبضے میں تھا۔ بہر حال یہ شہر، گو اب بھی خوشحال تھا، منتشہ کے ترکمان امیروں کی فتوحات کی وجہ سے اپنی قدر کھو چکا تھا، جنھوں نے تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کاریہ Caria کے ساحلی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ طونزلو، جس کے متعلق منتشہ کے امیروں اور گرمیان کے درمیان تنازع تھا، نتیجۃً سرحدی چوکی کے طور پر اپنی حیثیت کھو بیٹھا اور وہ پھر کسی اہم ریاست کا مرکز نہ بن سکا۔ ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء میں طونزلو۔ لاذیق کا ضلع بھی اسی وقت گرمیان کی امارت کی حیثیت سے سلطنت عثمانیہ کو واپس مل گیا۔ تیمور نے طونزلو عارضی طور پر گرمیان کو واپس کر دیا؛ وہ ۱۴۰۲ء کے موسم خزاں میں وہاں ٹھیرا۔ بایزید ثانی کے عہد حکومت میں اس کا ایک فرزند اس شہر میں مقیم رہا۔ ان دنوں وہ ایک لواء کا، جو اناطولیہ کی ایالت کے ساتھ ملحق تھی، سب سے بڑا شہر تھا۔ سترھویں صدی میں اس کا درجہ گھٹا کر اسے قضاء بنا دیا اور کوتاھیہ کی سنجاق کے ساتھ ملا دیا گیا۔ یہی زمانہ تھا جب طونزلو کے نام کی جگہ دنزلی نے لے لی، چنانچہ اسی نام سے اس شہر کا ذکر اولیا چلبی اور کاتب چلبی کے بیانات میں آیا ہے۔ ان سیاحوں کے قول کے مطابق دنزلی اس وقت چوبیس محلوں میں منقسم تھا اور اس میں سات مسجدیں تھیں؛ ایک چھوٹا سا قلعہ بازار کی حفاظت کرتا تھا اور لوگ اصل شہر سے باہر باغوں اور کھیتوں میں مکان بنا کر رہتے تھے۔ یہی صورت حال آج کل بھی پائی جاتی ہے اور انیسویں صدی عیسوی کے یورپی سیاحوں کے بیانات کے خلاف یہ صورت اس خوفناک زلزلے کا نتیجہ نہیں جو ۱۷۰۲ء میں اس شہر میں آیا تھا اور جس میں بارہ ہزار جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ اگرچہ دنزلی کو دوبارہ وہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی جو اسے قرون وسطٰی میں حاصل تھی، لیکن جب سے جمہوریہ قائم ہوئی ہے یہ ایک دفعہ پھر روز بروز خوشحال ہو رہا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ایک ریلوے لائن بچھائی گئی جس نے دنزلی کو براہ گنجلی، ازمیر۔ اگردیر لائن کے ساتھ ملا دیا۔ دنزلی، جو انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں سنجاق کا صدر مقام اور ولایت ایدین سے منسلک تھا، قیام جمہوریہ کے بعد ولایت دنزلی کا صدر مقام بن گیا۔ [اس کی] آبادی ۱۹۳۰ء میں ۱۹۳۶۱ باشندوں پر مشتمل تھی (جب کہ ۱۹۲۷ء میں ۱۵۷۸۷ تھی)۔ دنزلی میں اب ایک سرکاری ثانوی مدرسہ ہے اور یہ زراعتی پیداوار (پھل، اناج، تمباکو، کپاس، تل اور پوست کے بیج)، نیز دستی صنعتوں (چمڑا رنگنے، کپڑا بننے اور قالین بافی) کا مرکز ہے۔ قدیم شہروں کے آثار نے بھی، جو اس علاقے میں بکھرے پڑے ہیں (Laodicaea، Hierapolis، Hydrela، Kolossai، Chonae کے کھنڈر)، اسے سیاحت کا ایک اہم مرکز بنا دیا ہے۔

مآخذ: (۱) ہوتسما **Houtsma** : *Recueil*، ۳ : ۶۶ تا ۷۶، ۴ : ۲۲، ۱۸۸ تا ۲۸۹، ۳۰۸، ۳۳۳؛ (۲) العمری، در *Not. et. Ext. des MSS de la Bibl. Nat.*، .

۱۲ : ۲۵۸ تا ۲۵۹؛ (۳) ابن بطوطه، طبع Defrémery و Sanguinetti، ۲ : ۲۷۰ تا ۲۷۷؛ (۴) اولیا چلبی : سیاحت نامه، استانبول ۱۹۳۵ء، ۹ : ۱۹۲ تا ۱۹۵؛ (۵) کاتب چلبی : جهان نما، طبع ابراهیم متفرقه، استانبول ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء، ص ۶۳۳؛ (۶) Pauly Wissowa، ج ۱۲، بذیل مادّهٔ Laodikeia؛ (۷) رمزے W. M. Ramsay : The cities and bishoprics of Phrygia، آوکسفرڈ ۱۸۹۵ء، ۱ : ۳۲ تا ۸۳؛ (۸) V. Cuinet : La Turquie d'Asie، پیرس ۱۸۹۴ء، ۴ : ۶۳۴ تا ۶۳۸؛ (۹) A. Philippson : Reisen und Forschungen im Westlichen Kleinasien، گوتها Gotha، ۱۹۱۳ء، ۳ : ۶۷ تا ۷۰، ۸۵ تا ۱۰۷؛ (۱۰) اوزون چار شیلی : کتابلر، استانبول ۱۹۲۹ء، ۲ : ۱۸۱ تا ۲۰۹؛ (۱۱) Cl. Cahen : Notes pour l'histoire des Turcomans d'Asie Mineure، در JA، ۲۳۹ (۱۹۵۱ء) : ۳۳۵ تا ۳۴۰؛ (۱۲) Besim Darkot، در آ ت، ج ۳، بذیل مادّهٔ دنزلی ۔

(I. Mélikoff)

* **دُنغُزلُم** : رک به دِنزلی ۔

* **دُنقُله** : (عربی)، Dongola [متبادل شکل : دنقلا : متروک اشکال : دُمقُله اور دُمقَلہ] : نوبیا میں دو شہروں کا نام اور زیادہ عمومیت کے ساتھ اس ساحلی خطے کا نام جس کا انحصار ان دو شہروں پر ہے ۔ یہ سارا علاقہ موجودہ جمہوریۂ سودان میں واقع ہے ۔ دنقله کے مستعرب نوبی لوگ دناقله کہلاتے ہیں ۔ ان کا یہ نام قبیلے کی نسبت سے نہیں بلکہ علاقے کی نسبت سے ہے ۔

(۱) دُنقلة العجوز (قدیم دنقله) دریاے نیل کے دائیں کنارے اس جگہ واقع ہے جہاں عہد قبل اسلام کا شہر اور مسیحی سلطنت کا دارالحکومت المُقرّہ آباد تھا ۔ ۳۱ھ/۶۵۲ء میں [اسلامی] لشکر نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح [رک باں] کی زیر سرکردگی اس شہر کا محاصرہ کیا تھا، لیکن ایک معاهده (بقت [رک باں]) طے پاجانے کے بعد یہ محاصرہ اٹھا لیا گیا ۔ اس معاهدے کے نتیجے میں نُوبیا اور مصر کے درمیان چھے صدیوں تک کے لیے باضابطه طور پر تعلقات استوار ہو گئے ۔ ازمنۂ وسطٰی کے دنقله کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس شہر کے گرد فصیل تھی اور اس میں بہت سے گرجے، بڑے بڑے مکانات اور کشادہ سڑکیں تھیں ۔ سرخ اینٹوں سے بنے ہوے گنبدوں والا قصر شاہی ۳۹۲ھ/۱۰۰۲ء میں تعمیر ہوا تھا ۔ مسیحی نُوبیا کے مکمل زوال کے بعد دنقله ایک اسلامی شہر بن گیا ۔ یہاں کی مسجد میں ۱۶ ربیع الاول ۷۱۷ھ/مئی ۱۳۱۷ء کا لکھا ہوا ایک عربی کتبه موجود ہے ۔ دسویں صدی هجری / سولھویں صدی عیسوی میں فُنج [رک باں] کا وفاقی نظام قائم ہونے پر دُنقله ایک ماتحت سلطان (مَکّ) کے صدر مقام کی حیثیت سے دوبارہ منظر عام پر آیا ۔ شمال میں اس کا حلقۂ اختیار [دریاے نیل کے] تیسرے آبشار (Third Cataract) تک بڑھ گیا تھا ۔ یہ جگہ فُنج سلطنتوں اور برابرہ [رک باں] کے مابین حد فاصل تھی، جو عثمانی سیادت کو تسلیم کر چکے تھے ۔ گیارھویں صدی هجری/سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں شُیقیۃ وفاق کے عروج کے بعد شمال سے جنوب کو جانے والی شاهراهیں دنقله کے علاقے سے ایک طرف ہٹ کر گزرتی تھیں ۔ آخری دنوں میں یہ علاقه شیقیه اور جدید دُنقله میں پناہ لینے والے ممالیک دونوں کی ترک تازیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں نے اسمٰعیل کامل پاشا کی ترک مصری افواج کا خیر مقدم کیا، جس نے ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں ان غارت گر فوجی اشراف کی حکومتوں کو کچل دیا ۔

(۲) دُنقله جدید (العُرضی، یعنی اردو، بمعنی لشکر گاہ)، جو آج کل اس خطے کا اہم ترین شہر ہے، اس جگہ آباد ہوا جہاں ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا کی گرفت سے بچ نکلنے والے مملوکوں نے اپنی بستی

بسا لی تھی۔ آگے چل کر دنقلۂ جدید ایک کاشف (بعد ازاں مدیر-گورنر) کا صدر مقام اور صوبۂ دنقلہ کا دارالحکومت ہو گیا۔ ۱۸۸۶ء اور ۱۸۹۶ء کے مابین یہاں مہدوی فوجی گورنر (عمّال؛ واحد: عامل) حکومت کرتے رہے۔ ۱۸۹۶ء میں کچنر کی مہم دنقلہ کا صوبے کی از سرنو تسخیر پر گہرا اثر پڑا۔ اس وقت یہ مقام اپنی انفرادی حیثیت کھو چکا تھا کیونکہ مشترک حکومت (Condominium) کے دور میں اسے وادی حلفا اور بربر [رک بآں] میں مدغم کر کے شمالی صوبہ بنا دیا گیا تھا۔

مآخذ: ازمنۂ وسطٰی کے منتشر بلکہ سرسری حوالوں کی فہرست کے لیے دیکھیے (۱) میسپرو Maspero و وائٹ Wiet: *Metériaux*، ص ۹۴؛ نیز (۲) کرافورڈ O. G. S. Crawford: *The Fung Kingdom of Sennar*، گلوسٹر Gloucester ۱۹۵۱ء، بالخصوص ص ۳۳ تا ۳۶؛ ۱۶۹۸ء میں قدیم دنقلہ کی کیفیت کے لیے دیکھیے (۳) Ch. J. Poncet: *A voyage to Ethopia*، لنڈن ۱۷۰۹ء؛ نیز اس کتاب کی اشاعت ثانی، طبع ازسر Sir William Foster، بعنوان *The Red Sea and adjacent countries at the close of Seventeenth century*، (Hakluyt Society، سلسلۂ دوم، عدد C)، لنڈن ۱۹۴۹ء، ص ۹۹ تا ۱۰۰؛ (۴) ۱۸۲۱ء میں اس کا ذکر L. M. A. Linant de Bollefonds: *Journal d'un voyage à Meroé*، طبع M. Shinnie، خرطوم ۱۹۵۸ء، ص ۲۳ تا ۳۴، میں آیا ہے؛ (۵) مہدوی دور کی سرکاری مراسلت، جو خرطوم میں حکومت سوڈان کے محافظ خانے میں محفوظ ہے۔

(P. M. HOLT)

* **دُنْقلی**: (جمع دناقل)، ایک قبیلہ، جو بحیرۂ احمر کے مغربی ساحل پر زوّلہ (۳۹ درجے ۱۵ دقیقے مشرق، ۱۵ درجے ۱۰ دقیقے شمال) کے نواح سے لے کر فرانسیسی صومالیہ تک آباد ہوا ہے اور اندرون ملک کی سخت گرم اور ویران سرزمین میں حبشہ کی سب سے بڑی پہاڑی ڈھلان کے دامن تک دیرداوا سے عَصّاب جانے والی سڑک کے دونوں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس قبیلے کے لوگ زیادہ تر خانہ بدوش ہیں، لیکن سب کے سب نہیں، کیونکہ ان میں مویشی پالنے والے بعض ایسے گروہ بھی ہیں جنھوں نے ساحل اور اندرونی علاقے میں متعدد نیم مستقل بستیاں اور چند بڑے دیہات بسا رکھے ہیں، جہاں معدودے چند لوگ کاشتکاری بھی کرتے ہیں۔ ان کے دوسرے پیشے ماہی گیری اور کانوں سے نمک نکالنا ہیں۔ بڑے بڑے مستقل دیہات میں آج کل منڈیاں اور پولیس کی چوکیاں قائم ہیں اور ان کی صدیوں کی مکمل علیحدگی اب بتدریج ختم ہوتی جا رہی ہے۔ معیار زندگی عام طور پر بہت ہی زیادہ پست ہے اور یہ غیرمعمولی موسمی شدتوں اور (ماضی میں) حبشہ کے پہاڑی علاقوں کی طرف سے بے رحمانہ اور مسلسل یلغاروں کا نتیجہ ہے۔ دنقلی کے لوگوں کی فطرت شکی، متلوّن اور وحشیانہ خیال کی جاتی ہے۔ یورپ والوں نے اول اول عَصّاب کو مرکز بنا کر حالات معلوم کرنے کی کوششیں کیں تو ان پر قاتلانہ حملے کیے گئے اور Müntzinger (۱۸۷۵ء)، Giuletti (۱۸۸۱ء) یا Bianchi (۱۸۸۴ء) کی فرنگی مہموں سے، جو اس غرض سے بھیجی گئی تھیں، کوئی شخص زندہ بچ کر نہ آیا۔

دناقل حامی نسل کے نمائندے معلوم ہوتے ہیں، جن میں قدیم زمانے میں عرب، صومالی اور دیگر نسلیں بکثرت مدغم ہو گئیں۔ اصل نسل کے متعلق ان کی اپنی کہانیاں سب کی سب اساطیری ہیں، لیکن ان سے مبہم طور پر بیرونی حملوں اور معاشرتی تبدیلیوں کا پتا چلتا ہے، نیز اس صورت حال کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے جو ارتریا اور شمالی حبشہ میں بھی کم و بیش موجود تھی، یعنی ایک نسبۃً چھوٹی حکمران جماعت رتبے، آزادی اور معاشی اعتبار سے ایک بڑی لیکن نیم غلام جماعت پر فوقیت رکھتی ہے اور پھر ان دونوں کا فرق قوم کو مزید

برادریوں اور ذیلی قبیلوں میں تقسیم کر دیتا ہے، جن پر دناقل مشتمل ہیں۔ یہ لوگ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء اور ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء کے مابین ارتریا (یعنی اطالوی اور برطانوی علاقے) اور حکومت حبشہ میں بٹ گئے۔ ان میں کبھی کوئی سیاسی وحدت نہ تھی اور نہ اس کا کوئی نشان ہی ملتا ہے۔ ان میں باہمی میل جول بھی صرف اسی قدر ہے جتنا ایک مشترکہ بولی، مشترکہ مذہب اور معاشی زندگی کی یکسانی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ فقط ایک ہی حکمران سلطان آوسہ، جو سردو میں رہتا تھا، ایسا ہوا ہے جس کا چھوٹے گروہ یا ذیلی قبیلے کے علاوہ اوروں میں بھی احترام کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں دناقل کی تعداد غالباً پچاس ہزار سے اسّی ہزار تک تھی۔

دناقل زبان کو، جسے عفر بھی کہتے ہیں، جنوبی حامی گروہ کی کسی زیریں شاخ کی ایک بولی قرار دے سکتے ہیں۔ یہ (زولہ کے مغرب اور جنوب میں سطح مرتفع پر رہنے والے قبائل کی) سہو زبان سے بہت ملتی جلتی ہے، اور اس کا صومالی بولیوں سے بھی رشتہ ہے۔

مآخذ: (۱) M. Nesbitt: *La Dankalia esplorata*، فلورنس ۱۹۳۰ء؛ (۲) O. Dante: *La Dankalia Settentrionale*، اسمارہ ۱۹۰۹ء؛ (۳) A. Pollera: *Le Popolazioni indigene dell' Eritrea*، Bologna ۱۹۳۵ء؛ (۴) برطانوی عسکری انتظامیہ ارتریہ (بواسطہ S. F. Nadel): *Races and Tribes of Eritrea*، اسمارہ ۱۹۴۳ء؛ (۵) D. Buxton: *Travels in Ethiopia*، لنڈن ۱۹۴۹ء۔

(S. H. LONGRIGG)

* **دِنگن:** (دُونگن، تُنگن)، چینی مسلمانوں کا نام، رک بہ چین؛ ترک؛ ترکستان۔

* **دِنّی:** (دِنّہ) جمہوریۂ سوڈان کا ایک شہر، جو ٹمبکٹو سے ۳۶۰ کیلومیٹر جنوب مغرب میں اور سگو سے ۲۰۰ کیلومیٹر مشرق شمال مشرق میں ۱۳ درجے ۵۵ دقیقے طول بلد شمالی اور ۴ درجے ۳۳ دقیقے عرض بلد غربی (گرینچ) پر سطح سمندر سے ۲۷۸ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔

دِنّی کا (جسے اکثر غلطی سے دجنہ لکھا جاتا ہے) اشتقاق نامعلوم ہے، لیکن شاید یہ دائنہ (Dianna) سے چھوٹا دِنّہ ہو (دِنّہ ایک قدیم سوڈانی شہر ہے، ۳ کیلومیٹر شمال مغربی جانب)۔ دِنّی کا ذکر اول اول Genoese Malfante نے ۱۴۴۷ء میں، بذیل Geni، کیا تھا۔

دِنّی دریاے نائجر اور دریاے بنی کے سیلابی علاقے میں مؤخر الذکر کے بائیں کنارے سے ۵ میل پر واقع ہے اور ایک نہر کے ذریعے، جس میں جہاز رانی ہوتی ہے، اسے دریا سے ملا دیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر ریتلی مٹی کی ایک پہاڑی پر ہوئی، جو سیلاب کی زد میں تو نہیں آتی لیکن چاروں طرف سے پانی میں گھری رہتی ہے، خصوصاً سیلاب کے موسم میں، جو عموماً اگست سے فروری تک رہتا ہے اور جس میں یہاں آمد و رفت آسان ہو جاتی ہے، اس لیے کہ دریاے نائجر اور بنی کے درمیان قابل جہاز رانی نہروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور بکثرت استعمال ہونے والی نہر کوکرو ہے۔ خشک موسم میں الراس شہر اور اس کے آس پاس کے ضلعوں میں کچی سڑکوں کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے، جن پر موٹر گاڑیاں بھی چل سکتی ہیں۔

یہ معلوم نہیں اس شہر کی بنیاد کب رکھی گئی۔ تاریخ السودان، مترجمۂ Houdas، ص ۲۳، میں مذکور ہے کہ پہلی بستی زبرو میں قائم ہوئی اور شہر کی بنیاد ۱۵۰ھ/۷۶۷ء کے لگ بھگ رکھی گئی اور باشندے ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء کے قریب مشرف بہ اسلام ہوئے؛ لیکن غالب گمان یہ ہے کہ یہ شہر آگے چل کر آباد ہوا ہوگا۔ M. Delafosse کے نزدیک ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء میں اور نونو (the Nono)، یعنی سوننکہ Soninke، تاجروں نے آباد کیا۔ وہ کہتا ہے کہ باشندے غالباً

۷۰۰ھ/ ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ مسلمان ہوئے . . . . [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے آآ، لائڈن، بار دوم، بذیل مقالہ]۔

مآخذ: (۱) Th. Monod و P. de Cenival: *Description de la Côte d'Afrique de ceuta au Sénégal par valentim Fernandes (1506-7)*، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۲) تاریخ الفتّاش، مترجمۂ O. Houdas و M. Delafosse، پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۳) تاریخ السودان، مترجمۂ O. Houdas، پیرس ۱۹۰۰ء؛ (۴) Leo Africanus: *Description de l'Afrique*، ترجمہ از Épaulard، پیرس ۱۹۵۶ء، ۲: ۴۶۳ تا ۴۶۵؛ (۵) R. Caillié: *Journal d'un voyage à Tombouctou et à Dienne dans l'Afrique centrale*، پیرس ۱۸۳۰ء، ج ۲، باب ۱۸؛ (۶) *Reisen und Entdeckungen in Nord und Zentral Afrika in 1849-1855*، Gotha ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء، ج ۴؛ (۷) F. Dubois: *Tombouctou la mystérieuse*، پیرس ۱۸۹۶ء، باب ۵ تا ۶؛ (۸) Ch. Monteil: *Monographie de Djénné*، Tulle ۱۹۰۳ء؛ (۹) A. H. Ba و J. Daget: *L' Empire du Macina*، ج ۱ (۱۸۱۸ء - ۱۸۵۳ء)، *IFAN*، بماکو ۱۹۵۵ء۔

(R. Mauny [تلخیص از ادارہ])

⊛ **الدُّنیا**: (ع) مادہ د ن و سے دنی یدنو دنوًا؛ اَدْنٰی بھی اسی سے ہے۔ لسان میں ہے: الدُّنیا . . . اسمٌ لھذہ الحیاۃ لِبُعد الآخرۃ عنھا والسّماءُ الدنیا لقُربِہا من ساکنی الارض۔ امام راغب کی مفردات میں ہے کہ دُنُوّ کے معنی قریب ہونے کے ہیں اور یہ قرب ذاتی، حکمی، مکانی اور زمانی بھی ہو سکتا ہے اور بلحاظ مقام اور مرتبہ بھی۔ لفظ ادنٰی کبھی بمعنی اصغر آتا ہے؛ اس صورت میں یہ اکبر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ کبھی ادنٰی بمعنی ارذل استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا استعمال خیر کے مقابلے میں ہوتا ہے؛ کبھی بمعنی اول استعمال ہوتا ہے اور آخر کے مقابل میں بولا جاتا ہے۔ کبھی ادنٰی بھی آخر میں آتا ہے اور اقصٰی کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ایک سو پندرہ مرتبہ آیا ہے اور اکثر آخرۃ [رک بآں] کے مقابلے پر آیا ہے۔ کبھی کبھی یہ لفظ حیاۃ سے مل کر ترکیب (حیٰوۃ الدنیا) کی صورت میں آتا ہے اور سماء الدُّنیا کی ترکیب بھی ایک سے زائد مرتبہ استعمال ہوئی ہے، جس کے معنی ہیں سب سے نیچے کا آسمان۔ کائناتی لحاظ سے دنیا وہ ہے جو گردش لیل و نہار کے اندر محدود ہے، آسمان اس کے اوپر سایہ کیے ہوئے ہے اور زمین اسے تھامے ہوئے ہے۔ یہ عالم الشہادۃ ہے، جسے آنکھ دیکھ سکتی ہے، اگرچہ اس کا ایک باطن بھی ہے جس کا عالم خدا ہے (عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ، ۲۳ [المؤمنون]: ۹۲)۔ قرآن مجید کی آیات سے دو نتیجے باسانی نکلتے ہیں: اول یہ کہ قرآن کی رُو سے دنیا اور آخرۃ دونوں کائنات کی حقیقت میں شامل ہیں اور ایک مؤمن سے یہ توقع ہے کہ ان دونوں کی فلاح و سعادت کے لیے کوشاں ہو۔ خدا پرستی اور دین داری، دنیوی معیشت اور ترقی کے خلاف نہیں، اس لیے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (۲ [البقرہ]: ۲۰۱) کی دعا سکھائی گئی ہے، جس میں دنیا و آخرۃ دونوں کے کمالات کے حصول کی التجا کی گئی ہے۔ حج کے احکام کے سلسلے میں حکم ہوا: . . . . . لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ [= . . . . . اس میں تمہارے لیے کوئی گناہ نہیں کہ (اعمال حج کے ساتھ) تم اپنے پروردگار کے فضل کی بھی تلاش میں رہو (یعنی کاروبار تجارت کا بھی مشغلہ رکھو)، البتہ ایسا نہ کرنا چاہیے کہ کاروبار دنیوی کے انہماک کی وجہ سے حج کے اوقات و اعمال سے بے پروا ہو جاؤ . . .] (۲ [البقرہ]: ۱۹۸)؛ لیکن اس امر کی ممانعت ہے کہ صرف دنیا (اسی زندگی) کو عین مقصود سمجھ لیا جائے اور آخرت کا انکار یا اس سے قطع نظر ہو جائے:

اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (۹ [التوبة] : ۳۸) ۔ کیا تم آخرة کے مقابلے میں حیاة دنیوی کو پسند کرنے لگے ہو (ترجیح دینے ہو) ؛ نیز ۱۶ [النحل] : ۱۰۷؛ ۵۳ [النجم] : ۲۹؛ ۷۹ [النازعات] : ۳۸؛ ۸۷ [الاعلیٰ] : ۱۶) ۔ ان سب آیتوں میں اس دنیاداری کی مذمت کی گئی ہے جسے آخرة کے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔

ان ارشادات ربانی سے معلوم ہوا کہ دین اسلام دنیا کا مخالف نہیں بلکہ اس دنیا پرستی کا مخالف ہے جو انسان کو خدا پرستی، نیکی اور جزا و سزا کے عقیدے سے غافل کر دیتی ہے ۔ انسان کی اس ذہنی و قلبی حالت کو قرآن مجید نے ناپسند کیا ہے اور اس قسم کی دنیا طلبی اور نفع پرستی سے حاصل کی ہوئی دولت اور متاع کو متاع الغرور (فریب، غرور، بے ثباتی اور گمراہی) قرار دیا ہے : وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۳ [آل عمران] : ۱۸۵ و ۵۷ [الحدید] : ۲۰) ؛ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (۴ [النسآء] : ۷۷) ؛ وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا (۶ [الانعام] : ۷۰) ؛ نیز دیکھیے ۶ [الانعام] : ۱۳۰؛ ۷ [الاعراف] : ۳۲، ۵۱ ۔ قرآن مجید میں قبیح دنیا داری کو جن وجوہ سے مذموم قرار دیا گیا ہے ان کی فہرست اس آیت میں موجود ہے : اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَكُمْ (۵۷ [الحدید] : ۲۰) جان لو کہ حیاة دنیا (جو آخرة کے تصور کے بغیر اور جزا سزا کے خیال کے بغیر ہو) لہو و لعب سے زیادہ کچھ نہیں، اور نمائش اور تفاخر ہی اس کا کل مقصد ہے ۔ ان حوالوں سے ظاہر ہوا کہ اسلام کا تصور دنیا فقط یہ ہے کہ یہ بھی حقیقت ہے، مگر آخرت کے عقیدے کے بغیر (جس کے ساتھ عمل صالح لازم ہے) یہ ناقص ہی نہیں، موجب فساد و تباہی ہے ۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ دنیا کا حصول ایک اخلاقی اصول کا طلبگار ہے، اسی لیے ایسی دنیا طلبی کے ساتھ قرآن مجید نے حَسَنَة کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ حسنة کے معنی میں خوش حالی، اطمینان اور نیکی تینوں چیزیں شامل ہیں ۔ حسنة کے تصور سے یہ بھی مترشح ہے کہ اس سے وہ قباحتیں خارج ہونگی جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، یعنی زینة، تفاخر اور لہو و لعب (بے مقصدیت) ۔ ظاہر ہے کہ دنیا داری کا یہ رنگ اچھے معاشرے کے لیے ایک تمدنی مصیبت ہے، نیز باعث فساد اور موجب عدم توازن ہے ۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مال اور اولاد (المال والبنون) اور بیوی بچے حیات دنیوی کی زینت (رونق اور زُہرَة الحیاة الدنیا) ہیں، لیکن اگر صرف یہی ہو تو زندگی بے جہت ہو جاتی ہے ۔ دنیا کا یہی تصور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور ان کی پیروی میں صحابہؓ اور ائمۂ تابعینؒ نے پیش کیا ۔ اس امر کے ثبوت میں کہ عملی طور پر مسلمانوں میں یہ عقیدہ رچا بسا ہوا تھا یہ ثبوت کافی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم، صحابہؓ، تابعینؒ اور بعد کے زمانوں میں مسلمانوں نے وسیع فتوحات ملکی کے ساتھ غیر معمولی اور قابل فخر علمی کارنامے انجام دیے اور زندگی کے عمل کو ایک کار خیر سمجھ کر تسخیر و انکشاف کو اپنی حد تک درجۂ کمال تک پہنچا دیا ۔

دوسری تیسری صدی ہجری میں زہد و تصوف کے کچھ مسلک ظہور میں آئے، جن کے زیر اثر ترکِ دنیا اور ترکِ سعی کی تلقین ہوئی، لیکن یہ انتہا پسند صوفیوں اور زاہدوں کا مسلک تھا ۔ جن معتدل صوفیہ کی نظر روح شریعت پر رہی، انھوں نے بُری دنیاداری سے بچنے کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ کسب معاش اور سعی و عمل کو ضروری قرار دیا ہے ۔

علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں باب فقر میں اس مسئلے پر طویل بحث کی ہے اور مختلف آرا دی ہیں ۔ ان میں یہ قول بھی درج کیا ہے : "فقیر نہ آن بود کہ دستش از متاع و زاد خالی بود، بلکہ فقیر آن بود کہ طبعش از مراد خیال خالی بود" ۔

بعض لوگ اصحاب صفّہ کی موجودگی سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام نے فقر (یعنی کسب معاش کے لیے ترک سعی) کو پسندیدہ قرار دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ اصحاب صفّہ صحابہ کی کثیر جماعت کے مقابلے میں ایک مختصر سا گروہ تھا اور اسے بھی بے کار اور تارک الدنیا کہنا غلط ہے کیونکہ یہ گروہ خدمات دینی کے لیے وقف تھا، جس کی معاشی ذمے داری امت پر تھی۔ یہ بزرگ وقتاً فوقتاً سعی معاش کے علاوہ خدا کے دین کی خدمت بھی کرتے تھے اور یہ سعی کی اشرف صورت ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین اور کیمیاے سعادت وغیرہ میں دنیا کے موضوع پر مفید بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دنیا کو اس لیے یہ نام دیا گیا ہے کہ یہ مرگ کے قریب کی منزل ہے۔ دنیا کا مقصد زاد آخرت ہے (الدّنیا مزرعة الآخرة)۔ ان کا یہ قول قابل توجہ ہے: "باین مذمت که دنیا را کرده آمد گمان مبر که هرچه در دنیا ست مذموم است بلکه در دنیا چیزها ست که آن نه از دنیاست، چه علم و عمل در دنیا ست و نه از دنیا۔ مذموم دنیا آن باشد که مقصود ازان نه کار دین بود بلکه وے سبب غفلت و بطر و قرار گرفتن دل بود درین عالم (کیمیاے سعادت، فصل حقیقت دنیا)۔

الغزالیؒ کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا اور تن کی ذمے داری (تعہد) خود اعلٰی مقاصد اور آخرت کے لیے بھی لازمی ہے، لیکن یہ حقیقت ان کے یہاں بلکہ پورے اسلامی ادب میں شدّ و مد سے نمایاں کی گئی ہے کہ "تعهد او بقدر حاجت کند" اور یہ اس لیے کہ اسلام میں زندگی کا اصل نصب العین مقاصد عالیہ کی پیش رفت ہے، تن پروری غرض اصلی نہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اسلامی ادبیات میں بعض اوقات بے تعلقی اور ترک اسباب پر زور دیا گیا ہے۔ اوّل تو یہ رجحان صوفیہ کے بعض انتہا پسند گروہوں کا ہے، جو بعض غیر اسلامی صوفیانہ تصورات سے متاثر ہوے؛ دوم یہ تاریخ کے بعض پرآشوب ادوار کے درد ناک واقعات (مثلاً حملۂ تاتار اور تیمور کی یلغاروں) کی وجہ سے بطور ایک ردّ عمل کے نمایاں ہوا۔ ایک ایسا دور جس میں سیاست نے برادر کشی اور اخلاق باختگی کا روپ دھار لیا ہو اس میں زندگی کے اس گھناؤنے کاروبار کے خلاف طبائع میں بیزاری کا پیدا ہونا امر قدرتی ہے۔

اس کے باوجود اکابر علما و حکما نے زندگی کو ایک معرکۂ عمل قرار دیا ہے اور اس سے فرار کا سبق نہیں سکھایا۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں دنیا کو آخرت کی تجربہ گاہ قرار دے کر اس میں حسن زندگی کو انسان کا فطری تقاضا اور اس کا کمال ظاہر کیا ہے اور حضارت کو شرف انسانی کی علامت قرار دیا ہے۔ امام ماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیّة کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے: الامامة موضوعة لخلافة النبوة فی حراسة الدین و سیاسة الدنیا . . . . .

صوفیہ میں سے رومیؒ نے دنیا کی تشریح کرتے ہوے کہا ہے:

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقره و فرزند و زن

متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ دھلویؒ نے حجة اللہ البالغة میں بھی بحث ارتفاقات کے ضمن میں کی ہے اور ارتفاقات اربعہ سے ان کی مراد وہ چار درجے ہیں جن سے انسانی تمدن گزرتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ کسی بھی پیغمبر نے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی (اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا یہ قول تو مشہور ہے: لا رهبانية فی الاسلام)۔ وہ لکھتے ہیں: "اللہ تعالٰی کی خوشنودی اس سے حاصل نہیں ہوتی کہ آدمی ارتفاق ثالث (یعنی تمدن کے معاملاتی حصے میں بعض طبائع کی خود غرضی اور فساد) سے بیزار ہو کر اس سے علٰحدگی اختیار کر لے۔ جنھوں نے لوگوں سے میل جول رکھنے اور خیر و شر میں ان کے

شریک حال رہنے سے قطعاً علیحدگی اختیار کر کے پہاڑوں کی کھوؤں اور خانقاہوں کے تنگ و تاریک حجروں میں جا کر پناہ لی اور وحشیانہ زندگی بسر کرنا انھوں نے اختیار کر لیا ان کی یہ ادا حق سبحانہٗ تعالٰی کے ہاں ہرگز پسندیدہ نہیں" (اردو ترجمہ، از مولانا عبدالرحیم، ۱ : ۵۲۰)۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحبؒ نے یہ لکھا ہے کہ "ارتفاقات کے ایسے نظام کو بھی اللہ تعالٰی پسند نہیں فرماتا جس کا مقصد خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کو منتہاے کمال (یعنی عیش پرستی) تک پہنچانا ہو"۔ ان کے نزدیک تمام پیغمبروں کی تعلیم یہ ہے کہ ارتفاقات کو باقی رکھ کر خدا کی یاد کو مناسب طریقے سے اس میں شامل کر دیں؛ دنیاوی معاملات میں بھی احکام و آداب شرعیہ کی پابندی کی تاکید کریں۔ صالح دنیا داری عیش پرستی سے مختلف شے ہے۔

دنیوی زندگی کو آخرت سے وابستہ کرنے کی حکمت انھوں نے یہ بتائی ہے کہ اعمال انسانی کے لیے ایک ایسا اخلاقی معیار مہیا ہو جائے جو مثالی ہو۔ اعمال بہر حال ایک مقصد کے تابع ہیں اور مقصد اخلاقی ہونا چاہیے تاکہ دنیا کا نظام مکمل طور پر چل سکے۔ جزا و سزا دنیا میں بھی مل سکتی ہے؛ مگر ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی شخص جزا سے محروم رہ جائے، یا سزا سے بچ جائے، اس لیے آخرت سے بھی اسے وابستہ کر دیا ہے تاکہ یقینی ہو جائے۔ ابن مسکویہ اور امام غزالی کی طرح شاہ صاحب نے سعادت کو دنیوی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔ دور آخر کے اسلامی ادیبوں یا اسلام کے متعلق مستشرقین کی کتابوں میں دین و دنیا کی تقابلی بحث سابقہ ادوار کے مقابلے میں کچھ زیادہ آئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آخری صدیوں میں مختلف اسلامی ممالک میں تصوف کے بعض ایسے مسلک زور پکڑ گئے تھے جو ترک دنیا پر زور دیتے تھے، یا افلاطونی حکمت کے تحت شدید داخلیت نے نفوذ حاصل کر لیا تھا، جس پر اقبال نے (اور سرسیّد نے بھی) بڑی کڑی تنقید کی ہے اور اس کے ساتھ کم کوشی اور تقدیر پرستی کے غلط تصور پر بھی لے دے کی ہے۔ اس دور میں مغرب کی مادیت (Materialism) اور دنیویت (Secularism) کے نظریات بھی ایک چیلنج کے طور پر سامنے آئے۔ ان سے نئے مصنفوں کا ایک طبقہ متأثر بھی ہوا، چنانچہ ترکیہ، مصر، شام اور ہندوستان میں ایک مؤثر اقلیت دین اور دنیا (اور ضمناً مذہب اور سیاست) کو جدا جدا شعبے قرار دینے لگی؛ لیکن روایت سے وابستہ دینی نقادوں اور مفکروں کی اکثریت اس پر قائم ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا دونوں ایک کلّی حقیقت کے طور پر یک جا ہیں اور دونوں ایک عظیم مقصد کے تحت لازمی ہیں۔ ان نقادوں میں شبلی، اقبال، ابوالکلام، سلیمان ندوی، ابوالاعلٰی مودودی وغیرہ شامل ہیں۔ علماے عرب میں مفتی محمد عبدہٗ، الاستاذ عبدالعزیز شاویش، رشید رضا، سیّد قطب شہید وغیرہ نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے [نیز رک بہ الآخرۃ].

مآخذ: متن میں مذکور کتابوں کے علاوہ (۱) غزالی: احیاء علوم الدین (مطبوعہ ۱۳۲۲ھ)، ص ۳، ۴۵، ۱۳۸؛ (۲) الابشیہی: المستطرف، آخری باب؛ (۳) اقبال: *Reconstruction of Religous Thought*؛ (۴) خلیفہ عبدالحکیم: *Islamic Ideology*؛ (۵) سید قطب شہید: اسلام کا نظام عدل اجتماعی (اردو ترجمہ).

(ادارہ)

دُنَیسر: بالائی عراق عرب میں، قرون وسطٰی کا ایک تباہ شدہ شہر (جو موجودہ ترکیہ کی سرحد کے اندر)، ماردین سے ۲۰ کیلومیٹر جنوب مغرب میں خابور کے ایک معاون دریا پر واقع ہے۔ اس کی جگہ کی نشاندہی آج کل ایک کردی گاؤں کوچ حصار سے ہوتی ہے، جسے مغربی وقائع نگاروں نے کوسر لکھا ہے۔ دُنیسر پہلے زمانے کا ایک قلعہ تھا عموماً اسے اور

Dio Cassius کے *Adenystrai* کو ایک ہی مقام قرار دیا ہے، لیکن عہد اسلامی کے ابتدائی برسوں میں یہ کسی اہم مقام کی حیثیت سے مذکور نہیں؛ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں کہیں جا کر اس کا نام ابن حوقل کے ایک مخطوطے میں نظر آتا ہے، جہاں اسے ایک منڈی کا مقام بتایا گیا ہے۔ آگے چل کر ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں شہر دُنَیْسَر ایک تجارتی، زرعی اور علمی مرکز بن گیا، جس کی خوشحالی کی شہادت اُرتُقی فرمانرواؤں کے حکم سے بنائی ہوئی عمارتیں دے رہی ہیں، مثلاً مسجدیں اور مدرسے، جن کے آثار آج تک باقی ہیں۔ یہ شہر ایک وسیع میدان پر پھیلا ہوا تھا، جس کے گرد کوئی دیوار نہ تھی اور یہ ایک نالے کے پہلو میں واقع تھا، جسے ایک سنگی پل کے ذریعے عبور کیا جاتا تھا۔ ابن جُبَیر اس کے متعلق کہتا ہے: ”یہ شہر پھولوں اور سبزیوں نباتات) کے باغات سے گھرا ہوا تھا اور آس پاس کے علاقے کے باشندے اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ جمعے سے اتوار تک یہاں ایک عوامی میلا لگا کرتا تھا“۔ آگے چل کر دُنَیْسَر کا مرتبہ گر گیا اور وہ ماردین کا طفیلی ہو کر رہ گیا۔

مآخذ: (۱) Pauly-Wissowa، بذیل مادّہ Adenystrai؛ (۲) R. Dussaud: *Topographie historique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۴۹۳؛ (۳) Le Strange، ص ۹۴؛ (۴) A. Gabriel: *Voyages archéologiques dans la Turquie orientale*، پیرس ۱۹۴۰ء، ص ۵۰ تا ۵۳؛ (۵) ابن حوقل، در *BGA*، ۲: ۱۵۱، حاشیہ؛ (۶) ابن جبیر: رحلۃ، طبع ڈخویہ، ص ۲۳۰ تا ۲۳۲ و مترجمۂ Gaudefroy Demombynes، ص ۲۷۷ تا ۲۸۰؛ (۷) یاقوت، ۲: ۶۱۲؛ علماے دُنَیْسَر کے لیے دیکھیے فرہنگ: (۸) براکلمان، ۱: ۶۰۳ (۳۳۲) و تکملہ، ۱: ۵۶۹۔

(D. Sourdel)

دُنْیَوِیَّت (Secularism): رَکَ بہ الدُّنیا۔ ⊛

دِنْیہ: (رَکَ بہ دانیہ)۔ *

دَوا: رَکَ بہ اَدْوِیہ۔ *

دوآب: (ف) لفظی معنی: دو دریا۔ برصغیر ⊛ * پاک و ہند میں اس کا [اصطلاحی طور پر] اطلاق اس علاقے پر ہوتا ہے جو دو ساتھ ساتھ بہنے والے [اور آگے جا کر باہم مل جانے والے] دریاؤں کے درمیان واقع ہو، بالخصوص اس زرخیز علاقے پر جو اُتّر پردیش (بھارت) میں دریاے جمنا اور گنگا کے درمیان ہے۔ پنجاب کے پانچ دریاؤں کے درمیان لمبوتری شکل کے جو قطعات بن گئے ہیں انھیں بھی دوآب [یا دوآبہ] کہتے ہیں، مثلاً ستلج اور بیاس کے درمیان بست دوآب (یا دوآبۂ بست جالندھر)، بیاس اور راوی کے درمیان باری دوآب، راوی اور چناب کے درمیان رچنا دوآب، چناب اور جہلم کے درمیان چج (یا چیچ) دوآب اور جہلم اور سندھ کے درمیان سندھ ساگر دوآب۔ کہا جاتا ہے کہ ان دوآبوں کے نام شہنشاہ اکبر [رک بآں] نے رکھے تھے (آئین اکبری، مترجمۂ H. S. Jerret، ۲: ۳۱۵ ببعد)۔ جنوبی ہند میں سب سے مشہور دوآب رائچور دوآب ہے، جو دریاے کِسْتْنا (کرشنا) اور تُنْگبَھدْرا کے درمیان واقع ہے۔ یہ دونوں دریا وجیا نگر کی ہندو ریاست اور دکن کی اسلامی ریاستوں کے درمیان ایک غیر مستقل سرحد کا کام دیتے تھے۔

مآخذ: [(۱) آئین اکبری، حصۂ دوم، آئین سیزدہم، بذیل صوبۂ لاہور؛ (۲) کنہیا لال: تاریخ پنجاب، لاہور ۱۲۹۸ھ؛ (۳) مفتی غلام سرور: تاریخ مخزن پنجاب، مطبع نولکشور ۱۸۷۷ء؛ (۴) سید محمد لطیف: تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور، لاہور ۱۸۸۸ء؛ (۵) سجان رائے: خلاصۃ التواریخ، طبع ظفر حسن، دہلی ۱۹۱۸ء؛ (۵) A. Cunningham: *The Ancient Geography of India*، لندن ۱۸۷۱ء؛ (۶) H.K. Trevaskis: *The Land of the Five Rivers*، مطبوعۂ آکسفرڈ

یونیورسٹی پریس ۱۹۲۸ء؛ (۷) W. H. Moreland: *The Agrarian System of Moslem India*، کیمبرج ۱۹۲۹ء؛ (۸) محمد اکبر: *Punjab under the Mughals*، لاہور ۱۹۴۸ء؛ مزید ماخذ کے لیے رک بہ پاکستان؛ پنجاب.

(C. Collin Davies [و ادارہ])

* **دوات دار**: (= دوادار، نیز دُویدار اور امیر دوات)، سرکاری روشنائی کے ذخیرے کا منصب دار و محافظ۔ دوات عباسیوں کے عہد میں وزیر کے عہدے کا خصوصی نشان۔ دوادار کا عہدہ سلجوقیوں نے قائم کیا اور اس عہدے پر انتظامی صیغے کے ملازم فائز رہے۔ سلطان بیبرس نے یہ عہدہ ایک مملوک امیر عشرہ کو منتقل کر دیا۔ بحری ممالیک کی حکومت میں "دوادار" کا شمار با وقعت امرا میں نہ تھا، البتہ چرکسی بادشاہوں کے تحت دوا دار سلطنت کے اہم امرا میں شمار ہونے لگا اور اسے "دوا دار کبیر" کا لقب دیا گیا، جس کے تحت چند اور دوا دار ہوتے تھے۔ دوا دار کا عہدہ سلطنت کے سات اہم عہدوں میں سے ایک شمار ہوتا تھا۔ رأس نوبہ اور اور دوا دار کبیر کا پانچویں اور چھٹے درجے کے لیے مقابلہ رہتا تھا اور یہ درجے کبھی ایک اور کبھی دوسرے کے ہاتھ آ جاتے تھے۔ بعض دوا دار سلطان کے درجے تک بھی پہنچے۔ مملوکوں کے عہد کے اواخر میں دوا داروں کے فرائض میں یہ فیصلہ کرنا بھی شامل تھا کہ جنگی مہمات میں حلقے کے کون سے افراد شامل ہونے کے قابل ہیں (رک بہ حلقہ)؛ علاوہ بریں وہ بالائی مصر کا باقاعدہ دورہ کرتا تھا اور کبھی کبھی جبل نابلُس، الشرقیہ اور الغربیہ کے صوبوں میں بھی جاتا تھا تاکہ وہاں کے محصولات اور قصابین جمع کرے۔ یہ دورے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہوتے تھے۔ ہمارے ماخذ میں ان پر طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ ان دوروں میں مقامی آبادی کے ساتھ ظلم و ستم کا برتاؤ بھی ہوتا تھا۔ عہد ممالیک کے اختتام کے قریب دوا داروں کو بڑا اقتدار حاصل ہو گیا تھا، مثلاً امیر یشبک دوا دار کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ امیر سلاح، وزیر، اُستادار، کاشف الکُشّاف (انسپکٹر جنرل)، مدیر المملکۃ اور رأس المیسرہ بھی ہوتا تھا؛ اس سے پہلے کسی مملوک کے پاس اتنے زیادہ عہدے جمع نہ ہوئے تھے بالکل یہی عہدے دوا دار طُومان بای نے بھی سنبھالے ہوئے تھے، جو بعد میں سلطان ہو گیا۔ عثمانی اور صفوی ممالیک میں دوادار (جو دِوِتّار اور دوات دار کہلاتے تھے) دفتر وزارت میں صرف کاتبوں کی خدمات انجام دیتے تھے.

مآخذ: (۱) اسمٰعیل حقی اوزون چارشلی: عثمانلی دولتی تشکیلاتنہ مدخل، استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۹۱، ۹۶ و بعد اشاریہ؛ (۲) D. Ayalon: *Studies on the structure of the Mamluk army*، در *BSOAS*، ۱۶ (۱۹۵۴ء): ۶۲ تا ۶۳، ۶۸ تا ۶۹.

(D. Ayalon)

دَوّار: بدوی عربوں کا پڑاؤ، جس میں خیمے دائرے کی طرح یا بیضوی شکل میں اس طرح لگائے جاتے ہیں کہ بیچ کی خالی جگہ (مراح) کے گرد ایک قسم کا احاطہ بن جاتا ہے، جس کے اندر مویشی رات بسر کرتے ہیں۔ پڑاؤ ڈالنے کا یہ بہت پرانا طریقہ آج کل بھی مشرقی بدویوں میں (شمالی شام، عراق عرب) نیز شمالی افریقہ کے تمام خانہ بدوشوں یا نیم خانہ بدوشوں میں رائج ہے۔ اس پڑاؤ کو جو دوار نام دیا گیا ہے وہ قرون وسطٰی کے بعض سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کی تحریروں میں موجود ہے۔ مشرق میں اس لفظ کی صحیح شکل دَوّار یا (بسکون 'د') دْوار اور مغرب میں اس کی شکل دُوّار یا دوّار (جمع "دوادر") ہے۔ ان خیموں کی تعداد، جن سے دوار بنتا ہے، بہت مختلف بھی ہو سکتی ہے؛ کبھی یہ کئی سو بھی ہوتے ہیں اور کبھی دس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ بہت سے مختلف النوع اسباب

ہیں جن کی وجہ سے بدویوں کا ایک ہی گروہ چھوٹے دواروں میں بٹ جاتا ہے، جو کچھ اہمیت نہیں رکھتے، یا پھر باہم مل کر خاصے بڑے بڑے دوار بن جاتے ہیں۔ یہ اسباب اس قسم کے ہوتے ہیں، مثلاً چراگاہوں کی کثرت یا کمیابی، امن و امان یا بدامنی وغیرہ۔ یوں تو دوار کی اصطلاح ایسے پڑاووں کے لیے بمنزلۂ اسم جنس ہو گئی ہے، لیکن کم اہمیت اور چھوٹا درجہ رکھنے والے پڑاووں کے لیے مختلف علاقوں کی بولی میں اس کے نام الگ الگ ہیں، مثلاً رَسْم، حِلّہ، نَزْلہ، فَرِیق وغیرہ۔ الجزائر کی سرکاری اصطلاح میں لفظ ”دوار“ کے وہ معنی نہیں رہے جو اصلی اور ابتدائی تھے بلکہ اس سے مراد ایک ایسا انتظامی حلقہ لیا جاتا ہے — خواہ یہ خانہ بدوشوں کا ہو یا مستقل باشندوں کا — جو ایک ہی سردار، قائد یا شیخ کے تحت ہو۔ عہد اسلامی کے ہسپانیہ میں لفظ دوار سے لوگ واقف تھے۔ Vocabulista (طبع Schiaparelli) میں اسے مفہوم کے اعتبار سے اطالوی لفظ ''mansio'' کا مرادف قرار دیا گیا ہے، لیکن مزید تشریح نہیں کی گئی۔ موجودہ زبان میں ادوار aduar کے معنی خانہ بدوشوں (=جپسیوں) کے پڑاؤ کے ہو گئے ہیں۔

مآخذ: (۱) Dozy: *Supplément aux Dictionaires Arabes*، ۱: ۴۷۳: مشرق بدویوں کے دوار کی بابت دیکھیے: (۲) Burckhardt: *Voyages en Arabie* (فرانسیسی ترجمہ)، ۲: ۲۳: (۳) von Oppenheim: *Vom Mittelmeer zum Persischen Golf*، ۲: ۳۳: (۴) A. Musil: *Arabia Petraea*، ۳: ۱۲۰ تا ۱۲۱ و شکل ۱۸۰: مغربی عربوں کے دوار کی بابت دیکھیے: (۵) Delphin: *Recueil de Textes Pour l'Étude de l'Arabe Parlé*، ص ۲۸۳: (۶) A. Bernard و N. Lacroix: *L'Évolution du nomadisme en Algérie*، ص ۲۷۶ ببعد: (۷) Urquhart: *Pillars of Hercules*، ۱: ۳۵۲: (۸) *Archives Marocaines*، ۳: ۱۰۵، ۱۰۶: (۹) Loubignac: *Textes Arabes des Zaër*، ص ۱۲۹، ۲۱۵، ۳۰۴: (۱۰) Marmal: *Descripcion general de Africa*، ج ۱، باب ۳۴، ورق ۳۲ ب۔

(G. S. COLIN و W. MARÇAIS)

دُوارِکا : (دُوارْکا): بھارت کے صوبۂ گجرات کے ضلع اوکھا منڈل کا ایک شہر، جو جزیرہ نمائے کاٹھیاواڑ کے شمال مغرب میں، گومتی ندی کے کنارے، ۲۲ درجے ۱۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۶۹ درجے ۱ دقیقہ طول بلد شرقی پر واقع ہے۔ اسے دواروتی اور جگت بھی کہتے ہیں۔ یہ ہندوؤں کا ایک متبرک مقام ہے کیونکہ اس کا تعلق سری کرشن سے بتایا جاتا ہے۔ اس کے کچھ قدیم تاریخی حالات ہندو اساطیر میں ملتے ہیں۔ روایت ہے کہ سری کرشن نے اوکھا منڈل فتح کر کے اپنا دارالحکومت دوارکا میں قائم کیا تھا۔ یہاں کا مشہور مندر دوارکا ناتھ (یا ترلوک سُنْدر) ان کے پڑپوتے وَجْرنابھ نے تعمیر کرایا تھا اور اس کا شمار بھارت کے انتہائی متبرک ”استھانوں“ میں ہوتا ہے (ہندو دور کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے *Gazetteer of the Bombay Presidency*، ج ۸)۔

اسلامی دور کی تاریخ میں دوارکا پر مسلمانوں کے مندرجۂ ذیل حملوں کا ذکر ملتا ہے:

(۱) ۸۷۷-۸۷۸ھ/۱۴۷۲-۱۴۷۳ء میں گجرات کے سلطان محمود شاہ بیگڑہ نے دوارکا پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا، کیونکہ اوکھا منڈل کے بحری قزاقوں کے ہاتھوں حجاج کا راستہ بہت غیرمحفوظ ہو گیا تھا اور انھوں نے نامور فاضل مولانا محمود سمرقندی سے بدسلوکی کی تھی۔ اس وقت دوارکا پر وادھل خاندان کا راجا بھیم حکومت کرتا تھا (تاریخ فرشتہ، مترجمۂ Briggs، ۴: ۵۹ ببعد)۔

(۲) ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷-۱۵۲۸ء میں دوارکا کے ہندو راجا پر سورٹھ کے صوبیدار ملک اسحٰق نے حملہ کیا (مرآۃ سکندری، مترجمۂ فضل اللہ لطف اللہ فریدی،

مطبوعہ ایجوکیشن سوسائٹی پریس؛ عبداللہ محمد بن عمر، طبع ڈینی سن راس E. Denison Ross : *Arabic History of Gujrat*، ص ۷، ۱۱، ۱۵).

(۳) ۱۰۰۰-۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۱-۱۵۹۲ء میں گجرات کے معزول سلطان مظفر سوم نے فرار ہو کر دوارکا میں پناہ لی۔ اس کے تعاقب میں خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش نے شاہی فوج روانہ کی، جس نے دوارکا پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا (مرآۃ احمدی؛ مرآۃ سکندری؛ اکبر نامہ)؛

(۴) ۱۱۱۷ھ / ۱۷۰۵-۱۷۰۶ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے یہ اطلاع پا کر کہ دوارکا کی مغل چوکی پر حملہ ہو گیا ہے، فرمان جاری کیا کہ باغیوں کی سرکوبی کی جائے اور وہاں کے مندر کو مسمار کر کے مسجد تعمیر کر دی جائے؛ تاہم یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت دستیاب نہیں (J. Burton-Page، در *BSOAS*، ج ۲۰)۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں دوارکا بحری قزاقوں کی ایک بدنام آماجگاہ تھا، جن کی سرگرمیوں کے باعث سندھ سے دیو تک بحیرۂ عرب کا ساحل کسی تاجر کے لیے محفوظ نہیں رہا تھا۔ ان کا قلع قمع کرنے کے لیے بڑودے کے انگریز ریذیڈنٹ نے فوج روانہ کی، جس نے ۱۸۱۶ء میں دوارکا پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے یہ علاقہ مہاراجہ بڑودہ کے حوالے کر دیا، لیکن مقامی آبادی کو یہ انتظام پسند نہ آیا، چنانچہ آئندہ پچاس ساٹھ برس کے دوران گائیکواڑ کا تسلط ختم کرنے کے لیے یہاں کئی بار بغاوت ہوئی اور انگریزوں کو یہاں بار بار فوجی مہمات بھیجنی پڑیں۔ بالآخر ۱۸۷۳ء میں شورش پسند عناصر پر پوری طرح قابو پا لیا گیا۔ ۱۸۹۸ء میں یہاں کی آبادی ساڑھے چار ہزار کے قریب تھی۔

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی حکومت کے خاتمے کے بعد بھارتی حکومت نے دوارکا میں ایک زبردست فوجی اڈا قائم کر لیا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ پاکستان و بھارت میں یہاں کا قلعہ عسکری نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل تھا، کیونکہ یہاں ایک انتہائی طاقتور راڈر سٹیشن لگا ہوا تھا، جس سے اس علاقے میں پاکستانی فضائیہ کی نقل و حرکت بہت محدود ہو کر رہ گئی۔ علاوہ ازیں کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں پر بمباری کے لیے بھارتی طیارے بھی یہیں سے پرواز کرتے تھے۔ سات اور آٹھ ستمبر کی درمیانی شب پاکستانی بحریہ کے چند جہازوں نے جنگی جہاز عالمگیر کے زیر قیادت دوارکا پر حملہ کیا اور اپنی بمباری سے دوارکا کا قلعہ مع راڈر سٹیشن بالکل تباہ کر دیا۔

مآخذ: (۱) *Gazetteer of the Bombay Presidency*، ج ۸ (کاٹھیاواڑ)، بمبئی ۱۸۸۴ء، ص ۵۸۵ ببعد؛ (۲) J. Burton-Page، بذیل مادہ، در وو، لائڈن، بار دوم؛ (۳) وہی مصنف: *Aziz and the Sack of Dvarka*، در *BSOAS*، ۲۰ (۱۹۵۷ء): ۱۰۵ ببعد، جس میں مزید مآخذ بھی درج ہیں؛ (۴) اسرار زیدی: شکست در شکست، لاہور ۱۹۶۷ء۔

[ادارہ]

دَوارُو : جنوبی حبشہ (Ethiopia) کی ایک مسلم تجارتی ریاست۔ ایک تنگ سی لمبی پٹی کی شکل کا یہ علاقہ بالی کے متصل جانب مشرق واقع تھا اور اس میں ہرر Harar کا عظیم اسلامی مرکز تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حد جنوب کی طرف وبی شبیلہ Webi Shabelle تک پہنچتی تھی اور شمال میں دناقل Danakil کے نشیبی علاقے کے کنارے تک، جہاں اس کی اور بالی کی سرحدیں ریاست افات سے جا ملتی تھیں۔ بہر حال اتنی بات صاف ہے کہ کم سے کم کچھ زمانے تک۔ اور بلاد الحبشہ کے بادشاہ عامدہ صیون Amda Syon اول کے عہد حکومت ہی میں۔ دوارو نام کا ایک جداگانہ قطعہ دریائے ہَوَش (Hawas) زیریں کے شمالی جانب پھیلا ہوا تھا اور اس میں موجودہ سلطنت

آوسہ Awssa کا ایک حصہ بھی شامل تھا۔ دوارو کا ذکر حبشہ کے وقائع ناموں میں پہلے پہل عامدہ صیّون اوّل کے عہد (۱۳۱۲ء تا ۱۳۴۲ء) میں آیا ہے۔ حبشہ کی دیگر مسلم ریاستوں کی طرح دوارو بھی اپنے الگ بادشاہ کے زیر حکومت تھا (جسے "تاریخ عامدہ صیون" مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد ۸۲۱ .Or، ورق ۴۴ میں "مکوانن makuannen" کہا گیا ہے)، جو شاہ حبشہ کا باجگزار تھا۔ عامدہ صیّون کے عہد حکومت میں شاہ ھایدارا Haydara نے بغاوت کر دی اور آدل کے باغی لوگوں سے مل گیا؛ مگر اس ریاست کو فتح کر لیا گیا اور وہ ۱۵۲۸ء کے بعد تک حبشہ کی باج گزار رہی جب کہ گلاودی ووس Galāwdewos کے تحت فنوئل Fanu'al یہاں کا والی تھا۔ العُمری کے بیان کے مطابق گو اس کا طول فقط پانچ دن کی اور عرض صرف دو دن کی مسافت کے برابر تھا، پھر بھی اس ریاست کی فوج بڑی اور طاقتور تھی؛ یہاں کے باشندے حنفی مسلمان تھے۔ المقریزی نے العمری کے بیان کو دہرایا ہے۔ اومو Omo ندی کے مغرب میں سدما قوم کی چھوٹی سی ریاست کُلّو Kullo کا بھی مقامی نام دوارو ہو گیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ حبشہ اور احمد گران میں جب لڑائی ہو رہی تھی (۱۵۲۷ تا ۱۵۴۳ء) تو دوارو کے پناہ گزینوں نے اس علاقے میں اپنی بستی قائم کر لی تھی، ورنہ کلو اور دوارو میں اور کوئی تعلق نہ تھا۔

مآخذ: Perruchon: *Histoire des guerres d' 'Amda Syon*، در *JA*، ۱۸۸۹ء، ص ۲۷۱ تا ۳۶۳، ۳۸۱ تا ۳۹۲؛ (۲) I. Guidi: *Le canzoni geez-amarina*، ۱۸۸۹ء، عدد ۸ و ۱۰؛ (۳) Perruchon: *Les Chroniques de Zar'a Ya'eqôb et de Ba'eda Mâryâm*، پیرس ۱۸۹۳ء؛ (۴) العمری: مسالک الابصار، مترجمۂ Gaudefroy-Demombynes، پیرس ۱۹۲۷ء؛ (۵) المقریزی، طبع F. T. Rinck، لائڈن ۱۷۹۰ء؛ (۶) Beckingham و Huntingford: *Some Records of Ethiopia, 1593-1646*، لنڈن ۱۹۵۴ء۔

(G. W. B. HUNTINGFORD)

دوازدہ امام: رکّ بہ اثنا عشریہ۔

* **الدَّوَاسِر**: واحد: دَوسَری) ایک بڑا قبیلہ، جس کا مرکز وسطی عرب ہے۔ الدواسر اس کی ممتاز خصوصیات یہ ہیں: ان میں سے اکثر لوگ عرب سے باہر دور دور تک پھیل گئے؛ انہوں نے ایسے علاقوں میں جو ان کے اصل وطن سے بہت دور تھے اپنی مساعی میں کامیابی حاصل کی؛ جو لوگ مستقل طور پر جگہ جگہ آباد ہوئے انہوں نے اپنے قبیلے سے غیر معمولی تعلق اور عصبیت برابر قائم رکھی اور وہ اپنے بدوی آبا و اجداد کے طور طریقے سے نہیں ہٹے۔

قبیلے کی اصل و نسل خواہ کچھ ہی ہو، الدواسر کا نام شروع ہی سے جنوبی نجد کی وادی الدواسر (جو ان اطراف کے تمام آباد اضلاع کی بہ نسبت الربع الخالی سے قریب ترین خطہ ہے) کے ساتھ اور الافلاج [رکّ بآں] کے ساتھ منسلک چلا آتا ہے۔ اگرچہ وہ ترک وطن کرکے شمال اور مشرق کی جانب جاتے رہے، تاہم دواسر (مہاجر یا وہ لوگ جو اپنے قدیم وطن کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے) جنوب و مغرب میں مأرب کے قریب رغوان میں اور حجاز کے کوہستان الخُرمہ میں پائے جاتے ہیں۔ الافلاج کے شمال میں دواسر اضلاع الخرج (جہاں کے بڑے شہر الدّلَم میں دوسروں کی نسبت ان کی تعداد بہت زیادہ ہے)، العارض، المحمل اور سُدَیر میں بکثرت موجود ہیں۔ ان شہروں میں، جہاں حال کی صدیوں میں دواسر قبیلے کے لوگ حاکم یا قاضی بنے یا ممتاز شہریوں کی حیثیت میں مشہور ہوئے، ضلع المحمل کے قصبات البیر اور ثادق اور سُدَیر کے قصبات المَجْمَعَہ، جلاجل، الرَّوضہ اور الغاط شامل ہیں (ابن بشیر، ۲: ۲۴۱ تا ۲۴۴، نے حُرَیملا کے ایک مشہور دواسر قاضی کا تذکرہ لکھا ہے)۔ دواسر الزُّلفی میں، جو القصیم کی سرحد پر ہے، بود و باش رکھتے ہیں، مگر اس سے آگے

شمال کی طرف زیادہ تعداد میں نہیں بڑھے ۔

دواسر میں سُدیریوں کا خاندان (السّدارۃ) ان کے لیے باعث فخر ہوا ہے ۔ ان کا نام السُّدیری اس لیے ہوا کہ وہ تقریباً چار صدیوں سے سُدَیر کی بستی الغاط میں رہتے تھے ۔ تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی میں احمد بن محمد السُّدَیری آل سُعُود کا ایک مشہور و معروف نائب تھا ۔ اس کی اولاد کے تعلقات اس وقت سے آل سعود کے ساتھ بہت گہرے چلے آ رہے ہیں ۔ اسی کی ایک بیٹی شاہ عبدالعزیز [ابن سعود] (م ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) کی والدہ تھی ۔ اس کی ایک پڑپوتی کے بطن سے اس بادشاہ کے سات بیٹے ہوئے، جن میں سے دو (فہد اور سلطان) ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء میں سعودی عرب کی حکومت کے وزیر تھے ۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء میں سدارہ خاندان کے تیرہ افراد سعودی عرب میں کسی نہ کسی صوبے یا ضلع کے حاکم تھے؛ اسی سدارہ خاندان کی بدولت دواسر مملکت سعودی کے کونے میں پہنچ گئے ۔

خلیج فارس پر دواسر نجد سے براستۂ بحرین آئے اور وہاں اپنے نئے قصبے الدّمام [رَکْ بآن] اور الخُبَر بسائے، جن میں وہ خوب پھول پھل رہے ہیں ۔ دوسرے دواسر بحرین اور قطر میں بود و باش رکھتے ہیں ۔ کچھ ان میں سے بحرین سے ایرانی ساحل کی طرف ہجرت کر گئے ہیں ۔ ان کے کچھ لوگ قطر سے جزیرۂ دَلْما میں چلے گئے ہیں ۔ عراق کے اندر دواسر الزُّبَیر میں ہیں اور شطّ العرب کا ایک قطعہ ضلع دواسر کہلاتا ہے اور وہاں کے دریائی جزیروں کا نام بھی یہی ہو گیا ہے ۔

اس قبیلے کے دو بڑے حصے ہیں : عیال زائد اور تغالبہ، جو ابتدا میں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے ۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے مورث اعلٰی کا نام "دوسر" (= قوی اونٹ) نہیں بتاتا، گو ادبیات عالیہ میں ایک قبائلی نام کے طور پر دوسر کا ذکر آیا ہے ۔ اس کی جمع "دواسر" عموماً ترکیب "الدیاسر" (جو کبھی کبھی بیچ میں ایک لام بڑھا کر "الدّل یاسر" آتا ہے) سے ماخوذ ہے، مگر اس کا مفہوم اور اطلاق غیر واضح ہیں ۔

مآخذ : (۱) حمد بن لعبون: تاریخ، مکہ ۱۳۵۷ھ؛ (۲) احمد بن فضل اللہ : التعریف، قاہرہ ۱۳۱۲ھ؛ (۳) عثمان ابن بشر : عنوان المجد، قاہرہ ۱۳۷۳ھ؛ (۴) ابراہیم بن عیسی : عقد الدرر، قاہرہ ۱۹۵۳-۱۹۵۵ء؛ (۵) J. G. Lorimer : *Gazetteer of the Persian Gulf*، کلکتہ ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۵ء؛ (۶) H. St. J. B. Philby : *The Heart of Arabia*، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۷) وہی مصنف : *Arabian Jubilee*، لنڈن ۱۹۵۲ء؛ (۸) وہی مصنف : *Arabian Highlands*، Ithaca (نیویارک) ۱۹۵۲ء؛ (۹) Max Freiherr von Oppenheim و Werner Caskel : *Die Beduinen*، ج ۳، Wiest baden ۱۹۵۲ء؛ نیز وہ اطلاعات جو اس قبیلے کے افراد سے اور فضلائے سعودی عرب سے ہاتھ لگیں ۔

(G. Rentz)

دوائر : دائرہ کی جمع؛ الجزائر میں خاندانوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو کسی مقامی سردار کی خدمت گزاری اور ذات سے وابستہ ہو ۔ فرانس کی فتح سے پہلے دوائر (مقامی تلفظ دوائر) خاص طور پر ان چار قبائلی گروہوں کا نام تھا جو اُوران کے جنوب مغرب میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور شہر کے بے (= حاکم) کے ملازم تھے، اگرچہ ان کے علاوہ اور دوائر بھی تھے، جیسے تِتری Tittri میں ۔ ان کی تنظیم رضا کار فوج (Militia) کی طرح کی جاتی تھی ۔ ان کا گزارہ اس زمین کی پیداوار پر تھا جو سلطنت ترکیہ نے ان کی تحویل میں دے دی تھی، نیز اس منافع پر جو بے قابو یا مالیہ نہ دینے والے قبائل کے خلاف تادیبی مہمات سے حاصل ہوتا تھا ۔ ان کے پڑوسی زمالہ بھی اسی طرح کی خدمات انجام دیتے تھے ۔

فرانس کی فتح کے بعد پتا لگا کہ مقامی روایات میں ان گروہوں کے افراد کو آن فوجیوں کی اولاد قرار

دیا جاتا تھا جنھیں مولای اسمٰعیل سلطان مراکو ترکوں سے جنگ کرنے کے لیے ۱۷۰۱ء میں اس علاقے میں لایا تھا ۔ لڑائی میں ترکوں سے شکست کھا کر بہت سے مراکشی سپاہی ترکوں کی ملازمت میں داخل ہو گئے اور انھوں نے مل کر اپنا ایک قبیلہ "مخزن" بنا لیا جو دو مقامی خاندانوں کے زیر قیادت تھا ۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے وز لائڈن بار دوم بذیل مادہ.

مآخذ: (۱) گمنام مصنف: *Douair et Zmala*، اوران Oran ۱۸۸۳ء؛ (۲) Pellissier de Raynaud: *Annales algériennes*، ۳ جلدیں، پیرس اور الجزائر ۱۸۵۴ء، بمواضع کثیرہ؛ (۳) W. Ezterhazy: *Notice sur le Maghzen d'Oran*، الجزائر ۱۸۴۸ء اور *De la Domination Turque dans l'ancienne Régence d'Alger*، پیرس ۱۸۴۰ء، ص ۲۶۶ ببعد؛ (۴) Desmichels: *Oran sous la Commandement du général Desmichels*، پیرس ۱۸۳۵ء، بمواضع کثیرہ؛ (۵) الناصری: کتاب الاستقصاء، قاہرہ ۱۳۱۲ھ، ۳ : ۱۸۴ تا ۱۹۲؛ (۶) M. Emerit: *L'Algérie à l'Époque d'Abdal-Kader*، پیرس ۱۹۵۱ء، بمواضع کثیرہ؛ (۷) R. Tinthoin: *Colonisation et Evolution des Genres de Vie dans la Région Ouest d'Oran de 1830 à 1885*، اوران ۱۹۴۷ء، بمواضع کثیرہ.

(A. COUR-[R. LE TOURNEAU])

* **دوبروجہ:** ایک سطح مرتفع، جو شمال میں دریاے ڈینیوب اور دریاے لوم Lom کے درمیان واقع ہے اور جس کے مشرق میں بحر اسود اور جنوب میں دریاے پروَجسکہ Prown dijska یا کوہستان بلقان ہے ۔ اس علاقے میں دلی ارمان کو مشرق کے صحرائی خطے دُبرجہ کبیری سے متمائز کیا گیا ہے، جیسے دُبرجہ خاص خیال کیا جاتا ہے ۔ اس کا جدید نام دبرجہ میں الی سے ماخوذ ہے (جیسے ایدن، ایدن الی سے)، جس کے ترکی میں معنی دُبرجہ کی سر زمین ہے، دُبرونیچ (جیسے کرلوئز سے کرلُنجہ) (قب susmanoseli در نشری: جہان نما، طبع Fr. Taeschner، لائپزگ ۱۹۵۱ء، (ص ۶۶، ۹۸) ۔ نشری میں دُبرونیچ کے بیٹے ینکو یا اِونکو کا نام دبرجہ اوغلو، مذکور ہے .

مآخذ: (۱) *Başvekalet* استانبول، محافظ خانے، *Tapu Defterleri*، عدد ۳۰۳، ۳۸۳، ۷۲۲؛ (۲) *Tapu ve Kadastro Um. Md.*، انقرہ، قیود قدیمہ، عدد ۹۴، ۳۹۸، ۳۹۹؛ (۳) I. Bromberg: *Toponymical and historical miscellanies on mediaeval dobrudja, Bessarabia and Moldo-Wallachia*، در *Byzantion*، ۱۲ : ۱۵۱ تا ۲۰۷، ۴۵۹ تا ۴۷۵؛ ۱۳ : ۹ تا ۷۲؛ (۴) N. Bănescu: *La question du Paristrion*، در *Byzantion*، ج ۸ (۱۹۳۳ء)؛ (۵) P. Mutafčiev: *Dobrudja*، صوفیہ ۱۹۴۷ء (بزبان بلغاروی)؛ (۶) *La Dobrudja*، طبع Acad. Roumaine، بخارسٹ ۱۹۳۸ء؛ (۷) Müstecib H. Fazil (Ülküsal): *Dobruca ve Turkler*، Köstence ۱۹۴۰ء؛ (۸) C. Jireček: *Geschichte der Bulgaren*، پراگ ۱۸۷۶ء؛ (۹) N. Iorga: *Hist. des Roumains*، ج ۱ تا ۱۰، بخارسٹ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء؛ (۱۰) P. Wittek: *Yazijioghlu Ali on the Christian Turks of the Dobruja*، در *BSOAS*، ج ۱۴ (۱۹۵۲ء)، ص ۶۳۹ تا ۶۶۸؛ (۱۱) A.I. Manof: *Gagauzlar*، ترکی ترجمہ از T. Acaroglu، انقرہ ۱۹۴۰ء؛ (۱۲) N. Iorga: *La politique vénitienne dans les eaux de la mer noire*، در *Acad. Roumaine, Bull sect. hist.*، ج ۲ تا ۴ (۱۹۱۴ء)، ص ۲۸۹ تا ۳۰۷؛ (۱۳) وہی مصنف: *Dobrotich, Dobrotić, Dobrotici*، در *Rev. hist. du sud-Est Europeen*، ج ۵ (۱۹۲۸ء)؛ (۱۴) *Documente privind Istoria Romîniei, A. Moldova*، ج ۱، بخارسٹ ۱۹۵۴ء (Ivanco اور Genoese کے درمیان معاہدے کا متن، ص ۲۹۶ تا ۳۰۱)؛ (۱۵) G. I. Bratianu: *Recherches sur Vicina et Cetatea Alba*، بخارسٹ ۱۹۳۵ء؛ (۱۶) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ج ۳، استانبول ۱۳۱۴ھ، ص ۳۶۵

تا ۲۷۰؛ (۱۷) *Analel Dobrogei*، اشاعت در Constanta از ۱۹۲۰ء؛ (۱۸) *IA*، مقالهٔ Dobruca (Aurel Decei)؛ (۱۹) نیز ملاحظه هوں تپه دغی، دلی آرمان، کاکڑه، صری سلتق (صروملتق).

(HALIL INALCIK)

دُوبیتی : رک به رباعی.

اَلدَّوْحَة : (دوحه) خلیج فارس کی ایک ریاست قطر کا دارالحکومت اور واحد عظیم شهر؛ ۲۵ درجے ۱۷ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۵۱ درجے ۳۲ دقیقے طول بلد شرقی پر جزیره نمائے قطر کے مشرقی ساحل کی ایک خلیج (خلیج فارس - عربی میں "دوحة") کی لنگر گاه کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ھے۔ یه لنگرگاه دو پتھریلے ساحلوں کے ملنے سے بنی ھے اور قدرتی طور پر پایاب ھے۔ پہلے اسی جگه مچھیروں کا ایک گاؤں البِدْع تھا، وه اب اس شهر کا ایک محله ھے۔

۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء سے پہلے الدوحه کے حالات تاریکی میں ھیں جب که خلیج فارس کا برطانوی قائم مقام Political Risident اس شهر میں آیا اور اس نے اطلاع دی که یه بحرین (البحرین) کے تحت ایک علاقه ھے تاهم اس رابطے کی نوعیت حالات کے ساتھ بدلتی رهی ھے۔ تیرهویں صدی هجری/انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں الدوحه بظاهر بحرین کے تحت تھا اور خود بحرین نجد کے آل سعود کو زکوٰة ادا کرتا تھا جسے برطانوی قائم مقام الدوحه سے وصول کرتا تھا کیونکه بحرین ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء میں، اور دوحه کی طرف سے محمد بن ثانی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں برطانیه کے ساتھ بحری صلح قائم رکھنے پر سمجھوتا کر چکے تھے۔ جب ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء میں ترکی فوج نے الدوحه پر قبضه کر لیا اور اسے سنجاق نجد کا حصه قرار دے دیا تب بھی اس شهر نے اپنے روابط بحرین اور نجد کے آل سعود، نیز برطانیه سے قائم رکھے۔ ترکوں کے انخلا تک قطر کے دوسرے حصے کبھی بحرین، ابوظبی یا کبھی نجد کے ماتحت سمجھے جاتے رهے۔ ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء میں عبدالله الثانی نے شیخ قطر کی حیثیت سے حکومت برطانیه کے ساتھ ایک معاهده کر لیا جس کی رو سے اس کی حیثیت قریب تر زمانے میں "ریاست زیر حمایت برطانیه" جیسی قرار دی گئی پھر بھی اس کا تعلق برطانوی محکمهٔ خارجه سے رها، حالانکه جو ریاستیں پورے طور پر برطانیه کے زیر حمایت هیں، جیسے جنوبی عرب کی ریاستیں، وه محکمهٔ نو آبادیات کے زیر نگرانی میں هیں۔ [مگر ان آبادیوں کی سیاست بھی معرض تغیر میں ھے اور ان جگھوں سے برطانوی اثر ختم هوتا جاتا ھے].

مآخذ : (۱) ابن بشر: عنوان المجد، قاهره ۱۳۷۳ھ؛ (۲) محمد النبهانی: التحفة النبهانية، قاهره ۱۳۴۲ھ؛ (۳) C.U. Aitchison: *A Collection of Treaties* ...، ج ۱۱، دہلی ۱۹۳۳ء؛ (۴) J. G. Lorimer: *Gazetteer of the Persian Gulf* ...، کلکته ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء.

(R. L. HEADLEY)

دُودَالقزّ : رک به حریر.

دُورباش : (ف)، گرز یا تبر جو فوجی اعزاز کے ایک نشان کے طور پر مستعمل تھا؛ فارسی اور ترکی زبان میں دُورباش کا اطلاق اس (محافظ) پر بھی هوتا ھے جو گرز اٹھائے هوئے هو (دیکھیے چاؤش، سرهنگ)۔ نظام الملک نے سیاست نامه باب ۳۹ میں چوبداروں کا ذکر کیا ھے، جن کے اعمال بھی کچھ اس سے ملتے جلتے تھے۔ یه چوبدار سونے چاندی کے عصا اٹھائے هوئے تھے؛ عوفی: جامع الحکایات (جس کی عبارت M. Fuad Köprülü: *Bizans müesseselerin Osmanli müesseselerine tesiri Türk Hukuk ve Iktisat hakkinda bazi mülahazalar* در *Tarihi Mecmuasi*، استانبول ۱۹۳۱ء، ص ۲۱۳؛ اطالوی ترجمه *Alcune osservazioni*، روما ۱۹۵۳ء، ص ۵۷ میں نقل کی ھے) میں دُورباش کی کیفیت یوں بیان کی ھے که وه چاندی کی پٹی باندھے جواهر

نگار گرز اٹھائے ہوتا تھا: Köprülü، موضع مذکور میں جواہر نگار گرزوں کے استعمال کے متعلق جو غزنویوں اور سامانیوں کے دور میں رائج تھا، کہتا ہے کہ یہ سامانیوں کے دربار کا ورثہ تھا۔

مسلم ہندوستان میں دُورباش زیادہ تر گرز کو کہتے تھے، گرز اٹھانے والے چوبدار کو نہیں۔ سب سے پہلے اس کا ذکر امیر خسرو کے نہ سپہر، ج ۲، میں آیا ہے، جہاں مصنف نے ورنگل کے راجہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ اپنی دُورباش کو جو اس نے پہلے سلطان سے لیا تھا، خُسرو خان، قطب الدین مبارک شاہ کے سپہ سالار کے حوالے کر رہا ہے تاکہ وہ اس کے بدلے میں اسے سلطان وقت کا، جو تقریباً ۷۱۸ھ/ ۱۳۱۸ء میں حکومت کرتا تھا، دُورباش عنایت کرے (دُور باش کا ترجمہ Elliot and Dowson : History of India، ج ۳ : ص ۵۶۱ میں شاہی چھتر "Canopy" کیا گیا ہے جو غلط ہے)؛ قب امیر خُسرو : قران السعدین، طبع سنگی، علیگڑھ : ص ۷۸ - ۷۹۔ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی، Bib. Ind. : ص ۱۳۶ میں لکھا ہے کہ بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے پیادے کندھوں پر دُورباش رکھے ہوئے دوڑتے تھے۔ یحیی بن احمد سرہندی نے تاریخ مبارک شاہی میں اس دُورباش کی بابت کہا ہے کہ وہ ایک مرصع دو شاخہ ڈنڈا ہوتا تھا (قب غیاث اللغات، بہ ذیل مادہ؛ فرہنگ انجمن آرائے ناصری، بہ ذیل مادہ)، اور مؤید الفضلاء نے اس کو نیزوں (نیزہ‌ها) سے تعبیر کیا ہے جنہیں اٹھائے ہوئے چوبدار قیاصرہ اور ملوک کے آگے آگے چلتے تھے (مخطوطۂ کتبخانۂ ملا فیروز، بہ ذیل مادہ)۔ مغلوں کے عہد میں اس کے استعمال کی تصدیق یورپی سیاحوں نے کی ہے: Manucci نے Storia de Mogor، ج ۱ : ص ۲۲۰ میں لکھا ہے کہ شاہجہان کی دختر جہان آرا کی سواری کے ساتھ دُورباش بھی ہوتا تھا، اس میں آگے آگے چوبدار سونے یا چاندی کا عصا ہاتھوں میں لیے ہوئے آواز دیتے جاتے تھے "راستے سے ہٹ جاؤ"۔ ان چوبداروں کو ٹیورنیئر Tavernier اور برنیئر Bernier سیاحوں نے "گرز بردار" کہا ہے۔

مآخذ : ان کتابوں کے علاوہ جو متن مقالہ میں دیے گئے ہیں (۱) Redhouse، مخطوطۂ موزۂ برطانیہ اورینٹل ۲۹۹۵ء : ۷۷۸ تا ۷۷۹ (تفصیل مع چند اقتباسات)۔ عصا اور ڈنڈوں وغیرہ کے لیے دیکھیے "عنزہ"؛ عصا؛ قضیب، صَولجان۔

[J. Burton—Page]

دَورَق : پہلے یہ جنوب مغربی خوزستان کا ایک شہر تھا اور اسے دَورق الفُرس (ایرانیوں کا دَورق) اور کبھی کبھی المدینہ [شہر] بھی کہتے تھے، اصلی ایرانی نام دراق تھا۔ قرون وسطٰی میں دورق ایک ضلع کا صدر مقام تھا جسے کبھی تو اسی نام سے موسوم کرتے اور کبھی سُرَّق کہتے تھے۔ دَورق اسی نام کے ایک دریا کے کنارے واقع تھا جو دریاے جَرّاحی کا معاون تھا۔ یہ ایک نہر کے ذریعے کارُون [رک بآن] سے ملا ہوا تھا اور اپنی نقابوں اور گندھک کے چشموں کے لیے مشہور تھا۔ کرمان اور فارس سے جو حاجی آتے تھے، وہ مکۂ معظمہ کو جاتے اور آتے ہوئے دَورق سے گزرتے تھے۔ ایک آتشکدہ اور بعض شاندار عمارتیں جو ساسانی عہد کی تھیں، چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی تک اس شہر میں دکھائی دیتی رہیں۔ حدود العالم (۱۳۰) میں دَورق کا ذکر ایک خوشنما، خوشحال اور دولتمند شہر کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے اختتام پر بنی تمیم نے دَورق اور نواحی علاقے پر قبضہ کر لیا، لیکن انھیں حَوِیزہ کے خاندان مشعشع کے سید مبارک نے نکال باہر کیا جو ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱-۱۵۹۲ء کے قریب عربستان (خوزستان) کا والی تھا۔ ۱۰۲۹ھ/ ۱۶۱۹-۱۶۲۰ء میں فارس کے بگلر بیگی نے دورق اور اس کے ضلع کو فتح کر لیا (دیکھیے تاریخ

عالم آرائے عباسی، ۶۷۵) ۔ بعد ازاں، اس ضلع پر قبیلۂ افشار [رک بآں] کی ایک شاخ نے قبضہ کر لیا، لیکن نادر شاہ [رک بآں] کے عہد حکومت میں کعب [رک بآں] کے شیخ سلمان نے انھیں نکال باہر کیا ۔ شیخ سلمان نے دورق کے جنوب میں پانچ میل دور ایک نیا شہر تعمیر کرایا، جو فلاحیہ کے نام سے موسوم ہوا ۔ بعد میں یہ کھنڈر بن گیا ۔ فلاحیہ کو حُوَلہ اور دیگر دشمن قبائل سے بچانے کے لیے شیخ سلمان نے وہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا اور شہر کے گردا گرد گارے کی دیوار بنوائی جس کا گھیرا دو میل تھا ۔ جب ایک صدی بعد لیرڈ Layard فلاحیہ پہنچا تو یہ دیوار خستہ حالت میں تھی ۔ اس کا یہ بیان تھا کہ متعدد نہریں اور آبی گزرگاہیں شہر کو گھیرے ہوئے ہیں، اگر ان کا مؤثر دفاع کیا جائے تو وہ حملے کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہیں (۱) *Description of the province of Khuzistan*، در *JRGS*، ۱۸۴۶ء، ۱۶، ۹۳؛ نیز دیکھیے اس کی تصنیف *Early adventures in Persia susiana and Babylonia*، لنڈن ۱۸۸۷ء، ۲، ۵۷).

۱۹۳۳ء . . فلاحیہ کا نام بدل کر شادگان ہو گیا ۔ یہ اسی نام کے ایک ذیلی ضلع (بخش) کا صدر مقام ہے جو خرم شہر (سابق محمرہ) کے شہرستان کا ایک حصہ ہے ۔ کھجور کے درختوں کے جھنڈ اور دھان کے کھیت شہر کو محیط ہیں، ان کی آبپاشی نہروں کے ذریعے ہوتی ہے ۔ کھیتوں میں گیہوں کی کاشت ہوتی ہے ۔ شہر میں تقریباً چار سو مکان، ایک سو بیس دکانیں، دو مسجدیں اور دو مدرسے ہیں؛ آبادی بشمول نواحی ضلع بیس ہزار کے قریب ہے ۔ شادگان اور خلیج فارس کے ساحل کے درمیانی دلدلی علاقے کو ابھی تک دورقستان کہتے ہیں ۔ یہ نام "خور دورق" میں بھی موجود ہے جو "خور موسیٰ" کا شمالی بازو ہے ۔ یہ خلیج فارس کی ایک بڑی سی تنگ کھاڑی ہے اور مشرق اور شمال مشرق میں دورقستان کی حد بندی کرتی ہے ۔

مآخذ: متن میں دیے ہوئے حوالوں کے علاوہ: (۱) B.G.A.، بمواضع کثیرہ؛ (۲) البلاذری: فتوح، ص ۳۸۲، ۳۸۵؛ (۳) یاقوت، ۲: ۶۱۸، ۶۲۰؛ (۴) مراصد الاطلاع (طبع Juynboll)، ۱: ۴۱۳؛ ۵: ۵۰۲، ۵۰۳؛ (۵) القزوینی: عجائب المخلوقات (وستنفلٹ)، ۱۹۱؛ (۶) J. Macdonald Kinneir: *A geographical memoir of the Persian Empire*، ص ۸۸ تا ۸۹؛ (۷) J. H. Stocqueler: *Fifteen months' pilgrimage through untrodden tracts of Khuzistan and Persia*، ۱: ۷۲؛ (۸) Ritter: *Erdkunde*، ۹: ۱۵۸ تا ۱۶۰؛ (۹) Le Strange، ص ۲۴۳؛ (۱۰) G.N. Curzon: *Persia and the Persian Question*، ۲: ۳۲۲ تا ۳۲۳؛ (۱۱) رزم‌آرا اور نوتاش: فرہنگ جغرافیای ایران، ۶: ۲۲۸.

(L. Lockhart)

دوریگی: (یا دِفرِیکی)، اب دِورِگی، جدید ترکیہ میں ایک قصبہ ہے، جو ارمینیہ اور Cappadocia کی سرحدوں پر شام اور بالائی عراق سے اناطولیہ کے بلند مرتفع میدان کو جانے والے ایک راستے پر واقع ہے ۔ اس میں ایک نالا بہتا ہے، جو کرہ سو (شمالی دریاے فرات) کے ایک معاون چلتی اِرمک میں جا گرتا ہے ۔ سِواس کے صوبے میں ایک "قضا" کا یہ صدر مقام ہے، اور سبزی ترکاری کے باڑوں اور پھلوں کے باغوں کے درمیان واقع ہے، جن کی وجہ سے یہ خوشگوار تفریح گاہ بن گیا ہے ۔ قرون وسطٰی میں اس کی خوشحالی کی شہادت صرف آثار قدیمہ سے ملتی ہے ورنہ آج کل اس کی حیثیت ایک پراگندہ گاؤں سے زیادہ نہیں، جس کا ایک حصہ ویران بھی ہو چکا ہے (۱۹۳۰ء کے قریب اس کے باشندے چار ہزار سے کم تھے) ۔ یہ ایک زرخیز وادی کے زیریں حصے میں واقع ہے ۔ قصبے کے پرانے محلے قلعے کے کھنڈروں کے ساتھ دائیں کنارے پر ایک دوسرے سے

ملحق ہیں ۔

مآخذ : (۱) ابن رُستہ، ص ۹۳؛ (۲) المسعودی : مروج : ۸ : ۷۳؛ (۳) التنبیہ، ص ۱۵۱، ۱۸۳؛ المقدسی : *Livre de la création*، طبع و ترجمہ از Cl. Huart، ۴ : ۵۳ ؛ (۵) الہروی : کتاب الزیارات، طبع و ترجمہ از J. Sourdel-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء و ۱۹۵۷ء، ص ۵۹ تا ۶۰ (ترجمہ : ص ۱۳۳ تا ۱۳۵)؛ (۶) یاقوت، ۱ : ۸۷ تا ۸۸ ؛ (۷) ابن بی بی، طبع ہوتسما Houtsma، ۴ : ۲۱۰، ۳۱۸ ؛ (۸) حمداللہ المستوفی : نزھۃ، ص ۹۹ ؛ (۹) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۶۲۴ ؛ (۱۰) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ۳ : ۲۱۰ تا ۲۱۳ ؛ (۱۱) لسٹرینج Le Strange، ص ۱۱۹ ؛ (۱۲) M. Gaudefroy Demombynes : *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۹۸ ؛ (۱۳) J. Sauvaget : *La poste aux chevaux dans l'empire des Mamelouks*، پیرس ۱۹۴۱ء، ص ۵۶ ؛ (۱۴) Cuinet : *Turquie d'Asie*، ۱ : ۶۸۵ ؛ کتبوں اور یادگاروں کے لیے دیکھیے : (۱۵) M. Van Berchem و H. Edhem : *CIA, Asie mineure*، ۱ : ۵۵ تا ۱۰۱ ؛ (۱۶) A. Gabriel : *Monuments turcs d' Anatolie*، پیرس ۱۹۳۴ء، ۲ : ۱۶۹ تا ۱۸۹، ولوحہ ۶۲ تا ۷۹ ؛ (۱۷) J. Sauvaget : *Décrets mamlouks de Syrie*، در *BEO*، ۱۲ (۱۹۴۷-۱۹۴۸ء) : ۵۲ تا ۵۵ (۸۹۱ھ/۱۴۸۶-۱۴۸۷ء کا فرمان)؛ (۱۸) ووآت بذیل مادّہ (مقالہ از Besim Dorkot) ۔

(J. Sourdel-Thomine)

* **دوزخ** : رک بہ جہنم ۔

* **دوزمہ مصطفی** : رک بہ مصطفی دوزمہ ۔

* **دوس** : رک بہ ازد ۔

* **دوست محمد** : افغانستان میں بارک زئی حکومت کا حقیقی بانی اور پایندہ خان کا، جو تیمور شاہ کے عہد میں بارک زئی قبیلے کا سردار تھا، بیسواں فرزند ۔ جب زمان شاہ کی حکومت میں پایندہ خان کو قتل کر دیا گیا تو دوست محمد کی پرورش اس کی قزلباش والدہ کے رشتے داروں نے کی، یہاں تک کہ وہ اپنے سب سے بڑے بھائی فتح خان کی حفاظت میں آیا، جو محمود شاہ کے عہد میں بڑا اثر و رسوخ رکھتا تھا ۔ محمود کی دوسری بار حکومت کے زمانے میں دوست محمد ممتاز عہدوں پر فائز رہا، جن میں کوھستان کی گورنری بھی شامل تھی ۔ اس نے کشمیر اور ھرات کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے کامیابی کے ساتھ فوج کشی کی (۱۸۱۶ء) ۔ ھرات کی مہم کے بعد دوست محمد پر اس کا عتاب نازل ہوا تو وہ کشمیر بھاگ گیا ۔ اب یا تو دوست محمد کی اس حرکت کا بدلہ لینے کے لیے یا خود فتح خان کی طاقت پر حسد کرتے ہوے محمود شاہ اور اس کے فرزند کامران نے فتح خان کی آنکھیں نکلوا ڈالیں اور پھر اسے قتل کر دیا ۔ دوست محمد نے کشمیر میں فوج اکھٹی کرکے کابل پر قبضہ کر لیا اور شاھزادہ سلطان علی کو برائے نام وہاں کا حکمران بنا دیا ۔ محمود نے اسے بے دخل کرنے کی کوشش کی، مگر دوست محمد نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا، تاہم اسے مجبور کیا گیا کہ وہ کابل اپنے سب سے بڑے بھائی محمد اعظم خان کے سپرد کر دے، جو کشمیر کا والی (گورنر) رہ چکا تھا ۔ اس نے کابل بھائی کو دے دیا اور غزنہ کی حکومت خود سنبھال لی، لیکن دل میں یہ امنگ تھی کہ کابل کی حکومت بھی ہاتھ آئے ۔ جب ۱۲۳۸-۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں اعظم چل بسا تو دوست محمد نے اس کے بیٹے اور وارث تخت حبیب اللہ خان کو شکست دی، لیکن اب بھی کابل اس کے ایک اور بھائی سلطان محمد خان پشاوری ھی کو ملا کو کابل کے قزلباشوں کی تائید دوست محمد خان کو حاصل رہی ۔ آخرکار سلطان محمد نے وہاں جمے رہنے کی کوشش ترک کر دی اور ۱۲۴۱-۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء میں

دوست محمد خان وہاں کا فرمانروا بن گیا؛ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں اس نے امیر کا لقب اختیار کیا۔

جب دوست محمد کے قدم کابل میں جم گئے تو اس نے افغانستان کے دوسرے علاقوں پر اپنی حکومت پھیلانے کی کوشش شروع کی اور وہاں کے حاکموں کی جگہ اپنے بیٹوں کو حاکم مقرر کیا۔ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء میں وہ پشاور کو سکھوں سے واپس نہ لے سکا۔ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸-۱۸۴۹ء میں سکھوں نے اس احسان کے عوض کہ اس نے انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی میں سکھوں کی مدد کی تھی، پشاور اسے دے دیا، لیکن وہ اسے اپنے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ بایں دوسرے مقامات پر اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی فوجوں نے اسے کابل سے نکال دیا۔ اس سے پہلے وہ جلال آباد اور غزنہ اور ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸-۱۸۳۹ء میں کندز کے مراد بیگ کو شکست دے کر اپنی حکومت ھندوکش کے شمالی علاقوں تک پھیلا چکا تھا اور حدود سلطنت میں کوہستان کُدار اور ھزارہ قبائل کے علاقے میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تھا۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنا وھی سیاسی مسلک جاری رکھا اور شمال میں اپنا اقتدار بلخ اور خُلم (۱۲۶۶-۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء)، شبر غان (۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء)، میمنہ اور اندخوئی (۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء) اور کُندز (۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) تک بڑھا لیا، اگرچہ اس کے اقتدار پر لوگ معترض تھے۔ مغرب کی طرف اس نے قندھار (۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء) اور ھرات (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) لے لیا۔ اس کے ساتھ ھی اس نے قبائل کے سرداروں کی قوت گھٹا کر اپنی طاقت بڑھائی۔ بالخصوص اس طرح کہ اس نے جاگیرداروں کی فوجی طاقت کے بجائے، جس پر دُرّانی بادشاھت کی بنیاد قائم تھی، ایک باقاعدہ فوج منظم کرنی شروع کی۔ اس فوج کے قیام اور اخراجات کے لیے وھی آمدنی، جو اس سے پہلے قبائلی سرداروں کے ھاتھ آتی تھی، صرف کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے غلزئیوں کی طاقت کو ختم کر دیا اور بعض ممتاز قبائلی سرداروں کو قتل، بعض کو قید اور بعض کو جلا وطن کر دیا؛ مزید برآں اس نے قزلباش اور سُنّی عناصر کو، جنھوں نے کابل کی حکومت کو اس سے پہلے بہت کمزور کر دیا تھا، اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ اس کے نظام حکومت کا کمزور پہلو یہ تھا کہ اس کا تمام تر انحصار اپنے بیٹوں کے تعاون پر تھا، جنھیں اس نے اھم علاقوں میں والی (گورنر) مقرر کر رکھا تھا۔ یہ تعاون اس کی وفات کے بعد قائم نہ رہ سکا۔ بہر حال اس نے افغانستان جدید کی جغرافیائی حدود کو مضبوطی کے ساتھ قائم کیا اور داخلی استحکام کی بنیاد ڈالی۔ حقیقت یہ ھے کہ "مؤسس افغانستان" کہلانے کا وہ سب سے زیادہ حقدار ھے۔

دوست محمد نے ۱۲۷۹ھ/۹ جون ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے کئی بیٹے تھے، جن میں زیادہ اھم یہ تھے: محمد افضل خان، محمد اعظم خان اور ولی محمد خان (یہ سب اس کی بنگش زوجہ کے بطن سے تھے، جو کُرّم کی رھنے والی تھی)، محمد اکبر خان (م ۱۸۴۸ء؛ وزیر ۱۸۴۳ تا ۱۸۴۸ء؛ ۱۸۴۱ تا ۱۸۴۲ء کے ھنگاموں میں سب سے نمایاں شخصیت)، شیر علی خان (جو آئندہ امیر ھوا)، محمد امین خان اور محمد شریف خان (یہ سب اس کی پوپلزئی زوجہ کے بطن سے تھے)۔ یہ امر قابل توجہ ھے کہ اپنے جانشین مقرر کرتے وقت دوست محمد نے اپنے بڑے بیٹوں کو نظر انداز کر کے علی الترتیب اکبر، غلام حیدر، اور شیر علی کو نامزد کیا اور یہ اس کی اس بیوی کے بطن سے تھے جس نے نسبةً زیادہ عالی مرتبہ خاندان میں جنم لیا تھا۔

مآخذ: (۱) رک بہ: افغانستان؛ نیز C. M. Macgregor (طبع): *Central Asia, ii, Afghanistan*، کلکتہ ۱۸۷۱ء؛ (۲) محمد الدین: *Dost Muhammad and* the second Sikh war، در J. Pak. Hist. Soc.، ج ۲ (اکتوبر ۱۹۵۴ء)، ص ۲۸۰ تا ۲۸۶؛ (۳) D.M. Chopra: Dost Muhammad in India، در Proc. I.H.R.C.، ۱۹ (۱۹۵۳ء): ۸۲ تا ۸۶؛ (۴) B. Saigal: Lord Elgin I and Afghanistan، در J. I. H.، ۳۲ (۱۹۵۴ء)، ص ۶۱ تا ۸۱؛ (۵) M. E. Yapp: Disturbances in Eastern Afghanistan 1839-42، در BSOAS، ۲۵/۲ (۱۹۶۲ء): ۴۹۹ تا ۵۲۳؛ (۶) H. B. Lumsden: Mission to Kandahar، کلکتہ ۱۸۶۰ء۔

(M. E. YAPP)

* **دَوسہ**: (دَوسہ)، لفظی معنی روندنا؛ ایک رسم، جو پہلے قاہرہ میں صوفیوں کے طریقۂ سعدیہ کے شیخ ادا کیا کرتے تھے۔ یہ رسم قاہرہ کے ایک مشہور ولی اللہ کے سلطان حنفی مولد یا محافل میلاد کے موقع پر دن کے وقت ادا کی جاتی تھی؛ ایک ایسی ہی رسم شیخ البکری، جو مصر کے طریقوں کے امام تھے، الدشطوطی کے مولد کے موقع پر رات کے وقت ادا کرتے تھے۔ اس رسم کو لین Lane نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (کتاب مذکور، جس کے ساتھ قلمی تصویر دی ہے؛ ایک اور بیان میں C. Rodulf Huber کے ہاتھ کی تصویر ہے جس نے اس رسم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، در G. Ebers: Aegypten، شٹٹ گارٹ و لائپزگ ۱۸۷۹-۱۸۸۰ء، ۲: ۱۲۹ ببعد)۔ مختصر طور پر اس رسم کی کیفیت یہ ہے کہ طریقۂ مذکور کے تین سو مرید زمین پر اوندھے منہ لیٹ جاتے تھے اور شیخ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے اوپر سے گزرتا تھا۔ لوگوں کے عقیدے میں طریقے کی خاص کرامت [رک بآں] یہ تھی کہ اس سے کسی کو کبھی کوئی بدنی نقصان نہیں پہنچا اور ادھر اس جسمانی رابطے کے ذریعے شیخ کی برکت (= "نسبت") اس کے مریدوں میں ہر ایک کو پہنچ جاتی تھی۔ یہی رسم اور مقامات پر بھی ادا کی جاتی تھی بارزہ، نواح دمشق، کے لیے دیکھیے Lady I. Burton: The inner life of syria, etc.، باب ۱۰؛ محمد بن عمر التونسی، م ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء، در Voyage au ouaday، ترجمہ از A. Perron، ص ۷۰۰)۔ دوسرے طریقوں میں شیخ کے پاؤں یا محض اس زمین کی خاک، جس پر سے شیخ گزرا ہو، بدن پر ملنے سے "برکت" حاصل ہوتی تھی۔ سعدیہ طریقے میں گھوڑے کا استعمال بانی طریقہ کے بلندی مرتبہ سے منسوب کیا جاتا تھا، جو پیغمبر کی اولاد میں سے تھے۔ مصر میں دوسہ کی ابتدا ٹھیک معلوم نہیں۔ مشہور روایت یہ ہے کہ جب سعدالدین الجبراوی، بانی طریقۂ سعدیہ، کے فرزند شیخ یونس مصر میں آئے تو ان کے مریدوں نے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے کوئی ایسا طریقہ جاری کریں جو اپنی کرامت کی وجہ سے ان کے مرتبۂ ولایت کا ثبوت ہو۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میرے راستے میں شیشے کے گول چکنے برتن پھیلا دو پھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ان برتنوں پر سے گزر گئے اور ان میں سے ایک برتن بھی نہ ٹوٹا۔ یہ بات ان کے جانشینوں سے نہ ہو سکی، اس لیے شیشے کے برتنوں کے بجائے آدمیوں کو اوندھا لٹایا جانے لگا (Goldziher، در ZDMG، ۱۸۸۲ء، ص ۶۴۷ ببعد؛ محمد رشید رضا: تاریخ ... محمد عبدہ، ۲: ۴۷ ببعد و بار دوم، ۲: ۱۳۹ ببعد)۔ شیخ یونس کی بابت بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ باب النصر کے باہر مدفون ہیں (Goldziher، کتاب مذکور؛ خطط جدیدہ، ۲: ۴۷) سعدالدین کو عام طور پر ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کا بزرگ بتایا گیا ہے، لیکن یہ تاریخ غیر یقینی ہے اور غالبًا ان کو کسی حد تک شیخ یونس الشیبانی کے ساتھ، جو ایک "مجذوب" اور یونسی طریقے کے بانی تھے، ملتبس کر دیا گیا ہے (المقریزی: خطط، بولاق ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء، ۲: ۴۳۵) دوسہ کی رسم کو مصر کے مفتی اعظم کے فتوٰی دینے کے بعد کہ یہ "بدعۃ قبیحہ" ہے اور

اس میں مسلمانوں سے تحقیر کا برتاؤ ہوتا ہے؛ ۱۸۸۱ء میں خدیو محمد توفیق نے بند کرا دیا۔ اس کے بعد کچھ زمانے تک مذکورۂ بالا محافل میلاد کے بعد صبح کو سعدیہ طریقے کے پیرو اپنے شیخ کے دروازے کے آگے لیٹ جاتے تھے کہ وہ ان پر پاؤں رکھ کر گزرے (A. Le Chatelier: *Les confréries Musulmanes du Hedjaz*، ص ۲۲۵)، مگر پھر اس کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

مآخذ: جو حوالہ جات متن مقالہ میں دیے جا چکے ہیں ان کے علاوہ: (۱) علی پاشا مبارک: الخطط الجدیدہ، ۳ : ۱۱۲؛ (۲) X. Coppolani و O. Depont: *Les Confréries religieuses musulmanes*، ص ۲۲۹ ببعد۔

(D. B. MACDONALD)

* **دَوْعَن:** (بعض دفعہ دُوْعَن)، وادی (ـ ندی) حضرموت کے جنوبی معاونوں میں سے سب سے بڑا معاون۔ یہ (سطح مرتفع) الجَوْل میں ایک گہری تنگ درز ہے، جو تقریباً سیدھی شمال کی جانب ۱۰۰ کیلومیٹر تک جا کر قریۂ ہینن کے مقابل بڑی ندی میں جا گرتی ہے۔ دوعن کے سلامی دار کنارے تقریباً ۳۰۰ میٹر بلند ہیں۔ اس کے کناروں کی بستیاں زیریں ڈھلانوں پر آباد ہیں اور ان کے نخلستان اس ندی کے پیٹے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وادی دوعن دو شاخوں، الایمن (جسے لیمن کہتے ہیں) اور الایسر (جسے لیسر بولتے ہیں) کے اتصال سے بنی ہے، جن میں سے الایمن بسا اوقات اصلی دوعن ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ الایمن کی گنجان آبادیوں میں الرباط، الخریبہ، الرشید اور المصنعہ شامل ہیں۔ ٹھیک اس جگہ کے نیچے جہاں الایمن اور الایسر باہم ملتی ہیں، قصبۂ صیف واقع ہے، جس کے بعد قیدون اور الحجرین آتے ہیں۔ آخر الذکر کے نام پر کبھی کبھی وادی کے زیریں حصے موسوم کیے جاتے ہیں۔ الحجرین کے شمال میں ایک نسبۃً جدید درگاہ موسومہ المشہد واقع ہے، جس میں السید علی بن حسن العطّاس کی قبر ہے۔ وادی العین مشرق کی جانب سے اور وادی عمد مغرب کی جانب سے اسی ندّی میں گرتی ہیں۔ وادی الکسر (الہمدانی نے کسر قعاقش لکھا ہے) ندی کے سب سے آخری حصے کا نام رکھا گیا ہے، جہاں عمد، دوعن اور العین تینوں کے دھارے مل کر بہتے ہیں۔ حورہ اور العجلانیہ کے قصبے اس کے دائیں کنارے پر ہیں۔

المکلّا سے اندرونی علاقے کو موٹر کی ایک سڑک جاتی ہے، جو اس علاقے کی سب سے بلند چوٹی کور سیبان سے گزرتی ہے اور پھر مولا مطر کی مقدس چوٹی سے گزرتی ہوئی دوعن کے بالائی حصے تک پہنچتی ہے۔

اس وادی میں سبائیوں کے عہد کے آثار دریافت ہوئے ہیں اور المشہد کے جنوب میں غیبون کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔

دوعن کے بہت سے باشندے وطن چھوڑ کر عدن، مشرق افریقہ اور جاوا چلے گئے ہیں، مگر دولت مند تارکین وطن نے جذباتی وجوہ کی بنا پر وطن میں اپنے مکانات اور باغات برقرار رکھے ہیں۔ علاقے سے صرف شہد کی برآمد ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) الہمدانی؛ (۲) محمد بن ہاشم: تاریخ الدولة الکثیریہ، ۱، قاہرہ ۱۳۶۷ھ؛ (۳) صلاح البکری: تاریخ حضرموت السیاسی، قاہرہ ۱۳۵۴-۱۳۵۵ھ؛ (۴) مصنف مذکور: فی جنوب الجزیرۃ العربیہ، قاہرہ ۱۳۶۸ھ؛ (۵) M. de Goeje، در *Rev. Colon. Internat*، ۱۸۸۶ء؛ (۶) H. Von Wissmann و M. Höfner: *Beitrage zur hist. Geog.*، Wiesbaden ۱۹۵۳ء؛ (۷) L. Hirsch: *Reisen*، لائڈن ۱۸۹۷ء؛ (۸) H. Von Wissmann و D. Van der Meulen: *Hadramaut*، لائڈن ۱۹۳۲ء؛ (۹) W. Ingrams: *A Report on ... Hadhramaut*، لنڈن ۱۹۳۷ء؛ (۱۰) مصنف مذکور: *Arabia and the Isles*، بار دوم، لنڈن ۱۹۵۲ء؛ (۱۱) یاقوت: معجم البلدان، بذیل مادہ۔

(G. RENTZ)

* **دُوغانجی** : رک بہ طوغانجی۔

* **دوغر** : اوغوز قوم کے ایک قبیلے کا نام۔ ان کا ذکر اوغوز نامہ میں ملتا ہے (مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے اوغوز قوم کے حالات زندگی کے لیے دیکھیے F. Sümer : *Oguzlar, a ait destani mahiyette eserler*، در *DTCFD, Ank. Ün.*، xvii/۳ تا ۴)، جہاں یہ لکھا ہے کہ اوغوز حکمرانوں کے بعض اہم بیگ (= سردار) اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے؛ بقول شامی مؤرخ شمس الدین محمد الجزری (۶۵۸ھ/۱۲۶۰ع تا ۷۳۹ھ/ ۱۳۳۸ع) ارتق خاندان جو ماردین و دیاربکر کے علاقے پر حکومت کرتا تھا، دوغر قبیلے سے تعلق رکھتا تھا (F. Sümer، کتاب مذکور، ص ۵۰۴، عدد ۱۷۱) اس لیے یقیناً اس نے سلجوقیوں کی فتوحات میں حصہ لیا ہوگا، آٹھویں صدی ہجری/ (بہ تصحیح) چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں دوغر کی ایک اہم شاخ اُرفہ (ادیسہ) کے جنوب میں اور جُعبر کے گرد و نواح میں مقیم تھی؛ ۷۷۳ھ/۱۳۷۱-۱۳۷۲ع میں ان کا سردار سالم نامی ایک شخص تھا۔

سالم کے خاندان سے قطع نظر، دوغر کے دیگر بیگوں : بار علی، محمد اور کُتی کو ہم شام میں حلب کے ترکمانوں کے درمیان دوغر خیلوں کے سرداروں کی حیثیت میں دیکھتے ہیں؛ کُتی ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ع میں مملوکوں کی طرف سے بحیرے کا "نائب" تھا۔ سلیمان اول کے زمانے میں شام کے دوغر حلب، "حما" اور دمشق کے علاقوں میں تین خیلوں میں منقسم تھے۔ "تبو" یعنی سرکاری دفاتر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم میں ان کے دو چھوٹے گروہ باب العامود اور بنو زید کے محلوں میں رہتے تھے (قب B. Lewis در *BSOAS*، ۱۹۵۴ع، xiv/3 : ۴۷۹)، دیگر خیل دیار بکر کے گرد و نواح میں نیز اُتوس (آق قویونلو قبیلے کا ایک بچا ہوا قبیلہ) کے درمیان کرکوک کے مقام پر، نیز ایران کے ترکی قبائل میں بھی پائے جاتے تھے۔ دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی میں، دوغر کا نام متعدد مقامات کے ناموں میں ملتا تھا، جن میں سے بہت کم باقی بچے ہیں۔

مآخذ : (۱) F. Sümer : *Döğerlere dair*، در *Turkiyat Mecmuasi*، ج ۱۰، ۱۹۵۳ع، ص ۱۳۹ تا ۱۵۸؛ (۲) Cl. Cahen : *Contribution à l'histoire du Diyâr Bakr au quatorzième siècle*، در *JA*، ج ۲۴۳، ۱۹۵۵ع، ص ۸۱؛ (۳) ابوبکری طہرانی : کتاب دیار بکریہ، طبع N. Lugal اور F. Sümer، انقرہ (TTK) ۱۹۶۲ع، ص ۴۵، عدد ۵ تا ۷، ص ۱۲۳، عدد ۱۔

(F. SÜMER)

* **دُوغلات** : بعض اوقات دُوقلات، ایک منگول قبیلہ جس کا نام ابوالغازی (طبع Desmaisons، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۱ع، ۱ : ۶۵) کے بیان کے مطابق منگول لفظ دوغولونگ (= لنگ)، بمعنی "لنگڑا" سے مشتق ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ منگول سلطنت کے ابتدائی دور میں اس قبیلے نے کوئی کارنامہ سر انجام نہیں دیا گو خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ ہمیشہ چنگیز خان کی حمایت کرتا رہا (رشید الدین، طبع Berezin، در *Trudi vost otd Imp Russk Arkheol obshčestva*، ۷ : ۲۷۵ : ۱۳/متن : ۷۳، ۵۲؛ ترجمہ L. A. Khetagurov، ماسکو۔ لینن گراڈ ۱۹۵۲ع، ۱/۱ : ۱۹۳) اس وقت یہ قبیلہ سارے کا سارا منگولیا سے نقل مکانی کر گیا؛ کم از کم اس وقت وہاں اس نام کا کوئی قبیلہ نہیں۔

ایلخانی سلطنت [رک بہ ایلخانیہ] کا شیرازہ بکھر جانے تک دوغلات کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہوئی، البتہ اس زمانے سے اسی قبیلے کے ایک فرد محمد حیدر دوغلات (حیدر میرزا [رک بآں]) نے اپنی تصنیف تاریخ رشیدی (طبع E. Denison Ross و N. Elias، لنڈن ۱۸۹۵ع) میں اُن سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں لیکن اس کی یہ معلومات ہمیشہ قابل اعتماد نہیں ہوتیں، اور بعض جگہ تو، جہاں اس قبیلے کا ذکر

دوسرے مآخذ میں بھی ملتا ہے، وہ اُن کی تردید کرتا ہے۔ دوغلات حیدر کے بیان کے مطابق اس قبیلے کے ایک رکن تُولک یا غالباً اس کے چھوٹے بھائی تُولاجی (ابوالغازی کے مطبوعہ نسخے میں ورق ۵۵ پر بولادجی چھپا ہے لیکن یہ شکل مخطوطات میں نظر نہیں آتی) کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے طاس طارم (Tarim Basin) میں آق سُو کے مقام پر ۷۴۸ھ/مطابق ۱۳۴۷-۱۳۴۸ء میں خان تغلق تیمور کو تخت نشین کیا تھا؛ پھر یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ مؤخرالذکر نے اس کے بدلے میں "نو امتیازات" دے کر دوغلات کی احسان مندی کا حق ادا کیا، اس طرح طاس طارم کے علاقے میں اُن کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ حیدر دوغلات کا دعوٰی ہے کہ اس نے بچپن میں یہ دستاویز منگولی زبان اور منگولی رسم الخط میں دیکھی تھی، لیکن اس کا کہنا ہے کہ دستاویز شیبانی خان (م ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء) [رک بآں] کے زمانے میں تلف ہو گئی (تاریخ رشیدی، ص ۵۵ ببعد ۳۰۵) بہر حال مؤرخ مذکور نے واقعہ نگاری میں تاریخوں سے متعلق جو غلط بیانیاں کی ہیں، ان سے اس دستاویز کی اصلیت کے بارے میں سنگین شکوک پیدا ہو جاتے ہیں، ۷۶۹ھ/۱۳۶۸ء اور ۷۹۴ھ/۱۳۹۲ء (؟) کے مابین مغولستان (مشرق ایشیا کا اندرونی علاقہ جو قریب قریب سمیریچی semiryeće سے شروع ہوتا تھا، ان دنوں اسی نام سے موسوم تھا) میں قمرالدین دوغلات بر سر اقتدار تھا (شرف الدین یزدی: ظفر نامہ طبع .Bibl Ind، کلکتہ ۱۸۸۷-۱۸۸۸ء، ۱ : ۷۸ ببعد) جو تاریخ رشیدی کے بیان کے مطابق بُولاجی کا بھائی تھا۔ شروع شروع میں وہ ایک عرصے تک تیمور [رک بآں] کے ساتھ تعاون کرتا رہا لیکن پھر ایک طویل کشمکش کے بعد تیمور نے اُسے اِرتش کے اُس پار التائی کے علاقے میں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا (یزدی، ۱ : ۳۹۴ ببعد) اس کے دو بھائی تیمور کی ملازمت میں رہے (یزدی، ۱ : ۱۰۴ ببعد ۶۵۰)؛ تیمور کی ایک بیٹی خاندان دوغلات کے ایک فرد سے بیاہی ہوئی تھی۔

۱۳۹۲ء کے بعد قمرالدین کا بھتیجا (؟) خدایداد بظاہر مغولستان کا مدارالمہام لیکن فی الحقیقت وہاں کا فرمانروا تھا۔ اس نے آل چنگیز [رک بہ چنگیز] کے جن خوانین کو تخت پر بٹھایا، ان کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی تھی۔ خدایداد نے آل تیمور [رک بہ تیمور] کے ساتھ مفاہمت کرنے پر اپنی آمادگی کا اظہار اسی امر کے پیش نظر کیا کہ دونوں دین اسلام کے پیرو ہیں اور ۸۲۸ھ/۱۴۲۵ء میں اُلغ بیگ [رک بآں] سے سمیریچی میں ملاقات کی (عبدالرزاق سمرقندی: مطلع سعدین، مطبوعۂ لینن گراڈ، عدد ۱۵۷، ورق ۲۳۰)؛ اس معاہدے کی رُو سے خوانین مغولستان کو خدایداد کے بھائیوں اور فرزندوں میں اپنے علاقے کی تقسیم منظور کرنا پڑی (تاریخ رشیدی، ص ۱۰۰)؛ اس کے بڑے لڑکے محمد شاہ (نواح ۱۴۱۸ تا ۱۴۳۹ء) کو خان ویس کی طرف سے قبیلے کا سردار (الوس بیگی) مقرر کیا گیا۔ اس نے سمیریچی میں سکونت اختیار کر لی (تاریخ رشیدی، ص ۷۸)، تیموریوں نے اس کے چھوٹے بیٹے کو طاس طارم کے مغربی علاقے سے باہر نکال دیا (۱۴۱۶ء؟ سمرقندی، در Notices et extraits، ۱۴/۱ : ۲۹۶) اور وہ اپنے والد کی وفات سے پہلے ہی مر گیا۔ اس کے بیٹے سید علی نے بالآخر کاشغر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور چوبیس سال تک وہاں حکومت کرتا رہا۔ اس نے جیسا کہ کاشغر میں اس کے مزار سے پتا چلتا ہے (۸۶۲ھ/مطابق ۱۴۵۷-۱۴۵۸ء میں وفات پائی؛ دیکھیے تاریخ رشیدی، ص ۷۸ و ۹۹)۔ اس کے جانشین اس کے دو بیٹے سانِیز میرزا (تا ۸۶۹ھ/۱۴۶۴-۱۴۶۵ء) اور محمد حیدر (تا ۸۸۵ھ/۱۴۸۰ء) ہوئے، ان دونوں نے اس علاقے کی ترقی کے لیے بڑی خدمات انجام دیں، پھر سانیز کے بیٹے ابوبکر میرزا نے اپنے چچا حاکم خان یُونس حاکم مغولستان کو مغربی طاس طارم سے نکال

بآہر کیا ۔ اس کے بعد اس نے یارقند میں سکونت اختیار کی اور ۹۰۴ - ۹۰۵ھ / ۱۴۹۹ء میں خوانین مغولستان کے ایک حملے کو روکا ۔ ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء کے بعد سعید خان نے اسے حکومت سے علاحدہ کر دیا ۔

[دوغلات کے] بڑے خانوادے کے علاوہ اس کی دوسری شاخوں نے بھی کئی بار چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کیں، اور گاہ بگاہ بڑے خانوادے سے برسر پیکار بھی رہیں؛ مثال کے طور پر محمد حیدر نے جو مؤرخ محمد حیدر کا دادا تھا، یونس چنگیزی اور احمد میرزا تیموری کے ساتھ مل کر ابوبکر میرزا (دیکھیے سطور بالا) کے خلاف جنگ لڑی، اس کے بیٹے محمد حسین اور سید محمد میرزا ہمیشہ متذبذب رہے کہ ان دونوں خاندانوں میں سے کس کی حمایت کی جائے، وہ وقتاً فوقتاً ازبکوں کی ملازمت بھی کرتے رہے، مقدم الذکر بالآخر ہرات میں شیبانی خان [رک بآن] کے حکم سے ۹۱۴ھ/۱۵۰۸-۱۵۰۹ء میں مارا گیا ۔ اس کا بھائی ۱۵۳۳ء میں مغولستان کے خان عبدالرشید کی نفرت و خصومت کا نشانہ بنا جو اسی سال برسر اقتدار آیا تھا (تاریخ رشیدی، ص ۶ ببعد، ۳۰۵ و ۴۰۵) محمد حسین کے بیٹے میرزا محمد حیدر مؤرخ نے کشمیر میں خود مختاری کا اعلان کرنے کی نیت سے طاس طارم کے حکمران کے ماتحت ۱۵۴۱ء میں لداخ کی گورنری کا عہدہ چھوڑ دیا (دیکھیے حیدر میرزا)۔

۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں اس خانوادے کے خاتمے اور ابوبکر [دیکھیں اوپر] کی حکومت کے قیام پر طاس طارم میں دوغلات خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا وہ چنگیزخانیوں کی بدستور مدد کرتے رہے اور سترھویں صدی عیسوی میں انھوں نے خاصا اقتدار حاصل کر لیا ۔

بیسویں صدی میں دریاے ایلی اور جیحون (Jaxartes) کے درمیان قزاقوں کے "اردوے کبیر" (Great Horde) کا ایک معاون قبیلہ دولت نام سے موسوم تھا؛ جو یقینی طور پر دوغلات سے مشتق ہے، انیسویں صدی کے خاتمے پر یہ "اردو" تقریباً چالیس ہزار خیموں پر مشتمل تھا (دیکھیے N. Aristov: *Zamětki ob etničeskom sostave Tyurkskikh plemēn i narodnostey*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۶ء، ص ۷۷)۔

مآخذ : (حوالے اوپر دیے جا چکے ہیں ۔ مطالعے میں حسب ذیل کو بھی شامل کر لیا جائے (۱) W. Barthold: *Zwölf Vorlesungen über die Geschichte der Türken Mittelasiens*، برلن ۱۹۳۵ء، ص ۲۰۹ تا ۲۱۳ (فرانسیسی ترجمہ پیرس ۱۹۴۵ء)؛ (۲) وہی مصنف: *Four studies on the history of Central Asia*، ترجمہ V. Minorsky (۱۹۵۶ء)، ۱ : ص ۱۵۴؛ (۳) R. Grousset: *L'Empire des steppes*، پیرس ۱۹۳۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۴) P. P. Ivanov: *Očerki po istorii Sredney Azii* (تاریخ وسطی ایشیا کا خاکہ)، ماسکو ۱۹۵۸ء، ج ۱ و ۲؛ (۵) B. Spuler در *Handbuch der Orientalistik*، ۵ : ۵ بمدد اشاریہ ۔ مؤخر الذکر دو ماخذ میں مفصل ماخذ دیے ہوئے ہیں ۔

(W. BARTHOLD-[B. SPULER])

دُولاب : رک بہ ناعورہ ۔ *

دَوْلَت : رک بہ الدولة؛ مالیات؛ بیت المال ۔ *

اَلدَّوْلَة : (ع) [دول مادے سے، اس کے متعدد معنی ہیں : (۱) یہ لفظ کسی حکمران کے خاندان یا اس کے عرصۂ حکومت و اقتدار کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ (۲) بطور لقب یا خطاب کے (۳) اقتصادی مفہوم میں ۔ ان سب کے بارے میں تصریحات درج ذیل ہیں ا ۔ (۱) دول کے اساسی معنی عربی میں صاف طور پر "گردش کرنا اور یکے بعد دیگرے آنا" ہیں ۔ (جس سے اس کا سلسلہ زمانۂ بعید سے قائم ہو جاتا ہے)۔ قرآن مجید میں لفظ تُدَاوِلُهَا هم ان دنوں کو ادلتے بدلتے رہتے ہیں (۳ [آل عمران] : ۱۴۰) اور دُولَة کے معنی "کوئی چیز جس کے مالک ادلتے بدلتے رہیں" (۵۹ [الحشر] : ۷) *

آئے ہیں، علاوہ بریں حدیث میں لفظ اُدالَ کسی کو اس کی "کامیابی یا فتح کی" باری دلانا آیا ہے اور سیرۃ (ابن ہشام، ص ۱۰۱۱) کی مشہور روایت میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات سے متعلق ہے، بیان کیا ہے آپؐ کی وفات اس وقت ہوئی جب حضرت عائشہؓ صدیقہ کے ہاں آپکیؐ تشریف آوری کی باری (دَولتی یا دُولتی) تھی۔ اس کے معنی نَوبَۃ، وقت (کامیابی، عہدے پر فائز ہونے کی باری وغیرہ) کی تصدیق قدیم شواہد سے ہوتی ہے، مثلاً فروۃ بن مُسیک کے اشعار میں یہ لفظ دو بار آیا ہے، مگر ایک جگہ دولۃ کے بجائے ایک دوسرا لفظ استعمال ہوا ہے (لسان العرب، بذیل مادہ ط، ب، ب؛ الطبری: ص ۱۷۳۵)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان کے معنی میں لفظ دولۃ کا استعمال اسی زمانے سے ہونے لگا تھا۔

یہ مسئلہ ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ دولۃ کے معنی "خاندان شاہی" کس طرح ہو گئے، زمانۂ قبل اسلام میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے اس کی اصل کا پتا چلے۔ قبیلہ (خاندان) کے لیے لفظ "بنو" یا "آل" اسلامی زمانے میں بھی مستعمل رہے ہیں۔ ابتدائی عباسی زمانے سے پہلے زمانے کے ایسے قابل وثوق اشعار ابھی تک علم میں نہیں آئے جن میں "دولۃ" خاندان کے معنی میں استعمال ہوا ہو۔ نثر کے حوالے زمانی اعتبار سے مشتبہ ہیں، مثلاً یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ایک اموی جرنیل حضرت عثمانؓ کے فرزند کو ان الفاظ میں الزام دے "ہم تو تمہارے خاندان "(دولتکم)" کے لیے لڑیں اور تم اس سے بے وفائی کرو" (البلاذُری: انساب، ۴ب، ۹۴)۔ اس لفظ کے کثرت استعمال کی شہادت عباسیوں کی بالکل ابتدائی دستاویزوں میں ملتی ہے جن میں سے بعض میں اصلی الفاظ غالباً ہوبہو نقل کر دیے گئے ہیں۔ السفّاح کو جب فتح حاصل ہو گئی تو وہ اہل کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: "... تمہیں ہمارا زمانہ نصیب ہوا اور اللہ تمہارے لیے ہماری "دولۃ" (عہد حکومت، یا زمانۂ فتح) لے آیا" (الطبری، ج ۳: ۳۰)۔ ابو منصور، السفاح کو ابو مسلم کے مار ڈالنے کا مشورہ دیتے ہوئے اپنی "دولۃ" کی قوت کی مدح کرتا ہے (وہی کتاب، ۳: ۸۵؛ *History of the Arabs* : P. K. Hitti، بار ششم، ص ۲۸۶) السفّاح، ابومسلم کی "دولۃ" (=عہدے داری کے زمانے) کا ذکر کرتا ہے (الطبری، ۳: ص ۸۶) اور ایک تحریر میں، جس کی تاریخ مشتبہ ہے، اس نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اس "دولۃ" (یہاں بہ معنی خاندان شاہی) میں خلفشار چاہتے ہیں (کتاب مذکور، ۳: ۱۰۴]۔ چند سال بعد منصور ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے عباسی "دولۃ" کی تائید کی تھی (کتاب مذکور، ۳: ۳۲۹) مگر دیکھیے ایک ایسی ہی عبارت در کتاب مذکور ۳: ۱۳۲، جہاں "دولۃ" کو بمعنی فتح استعمال کیا گیا ہے) المنصور کی آخری وصیت کی تشریح میں المہدی کی "دولۃ" (حکومت) کا ذکر آتا ہے (کتاب مذکور، ۳: ۴۵۴)۔

ان شہادتوں سے کوئی بات قطعی طور پر ثابت نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عباسی عہد کی ابتدا میں "دولۃ" کا استعمال خاندان شاہی کے مفہوم میں پوری طرح متعین نہیں ہوا تھا۔ ہاں بنو عباس اس لفظ کو اپنی کامیابی کی باری آ جانے کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے۔ اس طرح سے اس لفظ کا تعلق حکمران گھرانے کے ساتھ قائم ہو گیا اور شائستہ اصطلاح کے طور پر اسی کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگا اور جلد ہی "دولۃ" کے حامی اور ارکان (اصحاب، رجال)، خاندان شاہی کے حامی اور ارکان سمجھے جانے لگے، پھر بھی وہ تاریخ قطعی طور سے متعین نہیں ہو سکتی جب کہ یہ لفظ پہلے پہل خاندان شاہی کے معنی میں بولا جانے لگا۔

قیاس کیا گیا ہے کہ یونانی (فلسفی مؤرخ) پولی بئین (Polybian) کے اصول ἀνακύκλωσις τῶν πολιτειῶν کی

ہم نوائی میں خراسانیوں کے سیاسی نظریات بھی لفظ "دولة" بمعنی خاندان شاہی کے استعمال کا باعث بنے۔ اس قیاس کی کچھ خفیف سی تائید مذکورۂ بالا اس رائے سے ہو سکتی ہے کہ عباسیوں نے اپنے غلبہ و اقتدار کی باری کو اپنی "دولة" کہنے پر اتنا زور دیا کہ یہ اصطلاح مشہور ہو گئی، اور ابھی اس میں کسی سیاسی نظریے کا شعوری اطلاق نظر نہیں آتا، اگرچہ آگے چل کر فی الواقع "دولة" کا اطلاق سیاسی اقتدار کے مختلف ادوار پر بھی ہوتا رہا۔ الکندی اپنے رسالہ فی مُلک العرب (طبع O. Loth، در *Morgenländische Forschungen: Festschrift Fleischer*، لائپزگ ۱۸۷۵ء) میں "دولة" کو عموماً مُلک کا مترادف قرار دیتا ہے، نیز قبّ الرازی: فی امارات اقبال الدولة (طبع P. Kraus در *Razis opera Philosophica*، پیرس ۱۹۳۹ء)، جس میں دولة کے معنی "سیاسی کامیابی" لیے گئے ہیں۔

(۲) الدولة، القاب کے دوسرے جز کے طور پر:

تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں وزیر القاسم بن عبیداللہ بن وہب کو ولی الدولة (یعنی مملکت یا خاندان شاہی کا ہمدرد) لقب عطا کیا گیا، جو اس کے بعد المکتفی کے سکوں پر بھی نمایاں ہوا (۲۹۱ھ/۹۰۴ء کے سکوں کے نمونے عام طور پر ملتے ہیں، ۲۸۹ھ کے کسی ایسے سکے کی موجودگی G. C. Miles کی اطلاع میں مشکوک ہے)۔ مصنفین کے بیان کے مطابق یہ پہلا موقع ہے جب "دولة" کے لفظ سے مرکب لقب کسی کو ملا۔ القاسم کے فرزند الحسین نے بھی اپنے باپ کی رسم کو قائم رکھا، جب کہ المقتدر نے اسے عزت و وقار کے ساتھ "عمید الدولة" (مملکت کا سہارا) لقب دیا جو سکوں میں کندہ ہوا۔ یہ ماہ محرم ۳۲۰ھ / فروری ۹۳۲ء کا واقعہ ہے (ارشاد الاریب، ص ۲۶؛ مسکویہ، در *Eclipse*، ۱: ۲۳۳؛ ترجمہ ۴: ۲۶۴)۔

اس کے متصل زمانے میں مترادف توصیفی القاب لوگوں کو دیے گئے۔ اسی زمانے کے قریب قریب ہم ایک دوسرے ذہین ادیب کا عرف "جراب الدولة" (جراب: تھیلا) سنتے ہیں، لیکن اس کی بابت کہا گیا ہے کہ اس نے آل بویہ کا مضحکہ اڑانے کے لیے خود ہی اپنا یہ عرف پسند کیا تھا (یاقوت: ارشاد الاریب، ۲: ۶۲ ببعد)۔ پھر جلد ہی دولة کے لفظ سے مرکب القاب صحیح معنوں میں اس وقت رائج ہوئے جب شعبان ۳۳۰ھ/اپریل ۹۴۲ء میں حسن حمدانی اور علی حمدانی کو علی الترتیب ناصر الدولة اور سیف الدولة کے لقب عطا ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد (آغاز ۳۳۴ھ/۹۴۵ء) بنو بویہ بھائیوں کو لفظ "دولة" سے مرکب لقب دیے گئے اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ انھوں نے بغداد اور مشرق پر اقتدار قائم کر لیا ہے۔ ان کے القاب معز الدولة، عماد الدولة اور رکن الدولة تھے۔ یہ القاب محض رسمی نہ تھے بلکہ ضمنی طور پر ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ خلیفہ نے بہت سے مسلّمہ اختیارات اپنے نائب والیوں کو عطا کر دیے تھے۔

حمدانیوں اور بویہیوں نے لفظ "دولة" سے مرکب القاب قائم رکھے اور اپنے اپنے وقتوں میں دوسروں نے بھی ان کی تقلید کی، مثال کے طور پر مشرق میں غزنویوں اور ایلکخانیوں نے اور اندلس میں بعض ملوک طوائف نے نیز فاطمیوں نے بھی کبھی کبھی "دولة" سے مرکب القاب اپنے اعلیٰ عہدے داروں کو دیے، لیکن دسویں صدی عیسوی ختم ہونے ہی باقی تھی کہ یہ القاب اپنی اہمیت بہت کچھ کھو بیٹھے۔ پہلے تو ان کے ساتھ اور القاب بطور تکملہ ملائے گئے، پھر ان کی جگہ دوسرے القاب دیے جانے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلم ممالک میں القاب کی بھرمار ہونے لگی تھی، جس پر مصنفان اہل قلم کبھی کبھی نکتہ چینی کرتے تھے۔ عباسیوں

کے زمانے کے بعد "دولة" سے مرکب القاب دیے جانے کے بارے میں ابھی تک زیادہ تحقیق نہیں کی گئی ہے، مگر اس کا استعمال مختلف صورتوں میں مل رہا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں ایک درباری طبیب ھبۃاللہ ابن التلمیذ "امین الدولة" کہلاتا تھا (غیر مسلموں کے لیے "دولة" سے مرکب القاب کے لیے دیکھیے، القلقشندی: صبح، ۵: ۴۹۰ ببعد؛ حسن الزیات، در المشرق، ۴۲، ۱۹۴۸ء: ۸ ببعد)۔ اگرچہ "دولة" سے مرکب القاب گھٹتے گھٹتے محض عزت افزائی کی علامت رہ گئے تھے، پھر بھی ان سے معاشرے میں بلند مراتب کا اظہار ہوتا تھا، مثلاً ہندوستان میں بعض والیان ریاست کے نام کے ساتھ لفظ "دولة" نظر آتا ہے (ایران میں یہ لقب دولت قاچاریہ کے خاتمے تک موجود تھا) جب اعزازی القاب کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ ایرانی مجلس وزرا کے ارکان کو بھی اکثر "دولة" سے مرکب القاب ملتے رہے۔

[الدَّولة (یا الدُّولة) کا ایک اقتصادی مفہوم بھی ہے۔ لغات میں ہے کہ الدَّولة اور الدُّولة ایک ہی ہیں۔ بقول بعض الدَّولة کا تعلق گردش مال سے ہے اور الدُّولة (بضم دال) کا تعلق حرب اور جاہ سے (یعنی ان کا اپنی باری لینا (جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے)۔ یہ بھی خیال ہے کہ الدَّولة بفتح دال اسم ہے اور بضم دال مصدر (جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹ [الحشر]: ۷) اور اسی مادے سے تَدَاوُلٌ کا لفظ اس آیت میں آیا ہے۔ وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (۳ [آل عمران]: ۱۴۰)۔ فارسی میں اس کے معنی ہیں: گردش زمانہ بہ نیکی و ظفر و اقبال بسوی کسی (فرھنگ آنند راج، بذیل دولة)۔ اصولی طور سے مال اور دولت کے معنی ایک ہی ہیں، مگر مال میں ملکیت کا تصور بنیادی ہے۔ اموال میں منقولہ و غیر منقولہ سب ملکیتیں شامل ہیں۔ دولة میں گردش کا مفہوم بنیادی ہے اس لیے یہ قدرتی معلوم ہوتا ہے کہ دولت کا خصوصی تعلق زر سے ہو۔ اس میں کثرت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ کم زر والے کو ہم دولت مند نہیں کہہ سکتے۔ دولت میں جاہ و اقتدار کا مفہوم بھی شامل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ کسی مملکت کو دولت کہا جاتا تھا بحالیکہ مال میں جاہ و اقتدار لازمی نہ ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی عبارت میں تینوں مفہوم (یعنی باری اور نوبت اور جاہ و اقتدار اور زر کی کثرت) شامل ہوں۔ اسلامی ادب کے جدید دور میں خصوصاً اردو میں لفظ دولت کا اطلاق وسائل پیداوار اور پیداوار دونوں پر ہوتا ہے۔

اسلام میں تقسیم دولت کا نظام کئی کتابوں کا موضوع ہے خصوصاً زمانۂ قریب میں معاشیات کے اسلامی تصور پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں [رک بہ معاشیات (اسلامی)]۔ اس موضوع کی زیادہ تفصیلی بحث کے لیے رک بہ المال۔ یہاں مختصر طور سے اسلام کے تقسیم دولت کے نظام کا ایک خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے چند بنیادی اصول یہ ہیں: (۱) اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور معاش کی جائز سرگرمیوں کو "فضل اللّٰہ" اور "خیر" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اسے اَلطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ کہتا ہے۔ لیکن معاش مقصود حیات نہیں بلکہ کردار کی بلندی اور آخرت کی بہبود اس کا مقصد ہے؛ (۲) دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اللّٰہ کی ملکیت ہے۔ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اللّٰہ کی عطا ہے اور اس کی ملکیت حکم خداوندی کے تحت ہوگی؛ (۳) حکم خداوندی کے تحت مال میں تصرف کے لیے ایک نظام قائم کیا گیا ہے، جس میں یہ مد نظر رکھا گیا ہے کہ ہر انسان اپنی قابلیت کے مطابق دولت پیدا کرے۔ پھر اس میں کچھ صدقہ واجبہ (زکوٰۃ کے طور سے اور کچھ اختیاری طور سے (وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱ [الذریٰت]:

۹۱)؛ (۳) تقسیم دولت کا ایک مقصد معیشت انسانی کو انصاف کے اصولوں پر منظم کرنا ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ حق، حقدار کو مل جائے اور سب انسانوں کی سبیل معاش مہیا ہو جائے۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے پائے (کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ) ۵۹ [الحشر]: ۷ گردش کرتی رہے۔

یہ اصول اسلام کے نظام تقسیم دولت کو مغربی سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ نظام نہ تو اتنا آزاد ہے کہ اس میں پیداوار و تصرف دولت پر کوئی پابندی ہی نہ ہو اور نہ اتنا جبری ہے کہ انسان کے اختیار کو اس میں دخل ہی نہ ہو۔ یہ مخلوط نظام ہے جس میں آزادی بھی ہے اور پابندی بھی۔ یہ وسط کا راستہ ہے۔

دولت سے متعلق دوسرے مباحث مثلاً اجتماعی یا قومی دولت، استحقاق دولت، ملکیت، عوامل پیداوار، سود اور سرمایہ کاری، محنت اور اجرت کے اصول وغیرہ سے متعلق بحثوں کے لیے رک بہ معاشیات (اسلامی)؛ المال (ج اموال)؛ الخراج؛ قرآن مجید کی آیت کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ کا تعلق مال غنیمت کے اصولوں سے ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی جو تعبیر کی تھی، اس میں اس کا اطلاق زمینوں پر بھی ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ سے صحابہؓ نے عراق اور شام کی مفتوحہ اراضی کے بارے میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ یہ زمینیں ان میں تقسیم کر دی جائیں اور ان کو اراضی کا مالک بنا دیا جائے، لیکن حضرت عمرؓ نے انکار کیا اور کہا کہ یہ زمینیں اجتماعی دولت ہیں اور اس میں انہوں نے دُوْلَة والی آیت پیش کی (کتاب الخراج اور قاضی ابوبکر رازی: الجصاص: احکام القرآن) اور بالآخر اسی پر فیصلہ ہوا]۔

مآخذ: (۱) البیرونی: آثار الباقیة، ص ۱۳۲ تا ۱۳۳؛ (۲) ہلال بن صابی: رسوم دار الخلافة، در السیوطی: اوائل، بغداد ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء، ص ۸۳؛ (۳) القلقشندی: صبح، ۱: ۴۳۱؛ ۵: ۴۳۳، ۴۹۰ ببعد؛ (۴) M. Van Berchem در ZDPV، ۱۶، ۱۸۹۳ء، ۹۴ تا ۹۷؛ (۵) F. Babinger در Isl.، ۱۱، ۱۹۲۱ء، ۱۶ عدد ۴؛ (۶) A. Mez: Renaissance، ص ۱۳۳، عدد ۱؛ (۷) J.H. Kramers در AO، ۵، ۱۹۲۷ء، ۵۳ تا ۶۲؛ (۸) E. de Zambaur، بمواضع کثیرہ؛ (۹) H. Bowen: The Life and times of ʿAli Ibn ʿIsa، کیمبرج ۱۹۲۸ء، ص ۵۹؛ (۱۰) حسن الزیات، در المشرق، ۴۲، ۱۹۴۸ء؛ ۲۰۷؛ (۱۱) G. C. Miles: Rare Islamic Coins، نیویارک ۱۹۵۰ء، ص ۴۳ ببعد؛ (۱۲) B. Spuler: Iran، ص ۳۲۴؛ (۱۳) M. Canard: Histoire de la dynastie des Hamdanides، ۱، الجزائر ۱۹۵۱ء: ۴۲۶؛ (۱۴) E. Tyan: Institutions du droit public musulman، ۲، پیرس ۱۹۵۶ء: ۲۶ ببعد؛ (۱۵) حسن الباشا: الالقاب الاسلامیة، قاہرہ ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۳، ۳۱۲، ۵۱۵، اور بمواضع کثیرہ۔ آگے چل کر دولة کے اصل معنی سے کئی اور خاص مفہوم پیدا ہو گئے، قب: (۱۶) Dozy: Suppl.، ۱: ۴۶۷ ببعد اور (۱۷) عربی زبان کے علاوہ فارسی، ترکی اور اردو زبانوں کے لغت؛ اس کے علاوہ مثال کے طور پر، (۱۸) A.J. Maclean: A dictionary of the Dialects of vernacular Syriac، اوکسفرڈ ۱۹۰۱ء: ۶۲؛ (b) موجودہ زمانے میں دولة یا اس کی جمع دول سے توصیفی الفاظ دَوْلِی یا دُوَلِی بن گئے ہیں جس کا مفہوم قوم لیا جاتا ہے (مملکت، گورنمنٹ، خاندان) اور عربی میں ان کا رواج international کے ہم معنی اصطلاح میں عام طور پر ہونے لگا ہے؛ [(۱۹) محمد شفیع (مفتی): اسلام کا نظام تقسیم دولت، کراچی ۱۹۶۸ء؛ (۲۰) محمد امین الحق: اسلام کا معاشی نظام اور معاشی نظریات، محکمۂ اوقاف لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۲۱) محمد مظہر الدین صدیقی: اسلام کا معاشی نظریہ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۱ء؛ (۲۲) مودودی: اسلام اور جدید معاشی نظریات قدیم ماخذ میں: (۲۳) ابو یوسف: کتاب الخراج (اردو ترجمہ از نجات اللہ صدیقی)؛ (۲۴) ابو عبید: کتاب الاموال؛

(۲۵) N. P. Aghnides: *Mohammedan Theories of Finance*، لاہور ۱۹۶۱ء؛

([و ادارہ] F. Rosenthal)

دولت آباد : ایک پہاڑی قلعہ، عرض بلد شمالی ۱۹ درجے ۵۵ دقیقے، طول بلد مشرق ۷۵ درجے ۱۵ دقیقے اورنگ آباد سے دس میل شمال مغرب کی جانب صوبۂ مہاراشٹرا میں واقع ہے۔ دولت آباد پہلے دیوگری (صحیح دیواگری) یعنی "خدائی پہاڑی" کہلاتا تھا اور مسلمانوں سے پہلے یادوا Yadvas خاندان کے راجاؤں کا صدر مقام تھا جو اصل میں مغربی چالوکیہ راجاؤں کے باجگزار، مگر ۱۱۸۳ء سے خود مختار ہوگئے تھے اور اس کے بعد اس مملکت پر خود مختارانہ طور پر دیوگری سے حکومت کرتے رہے۔ دہلی کے سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے بھتیجے علاء الدین کو دیوگری کی بے حساب دولت کی خبریں سن کر قلعے کی تسخیر کا شوق پیدا ہوا۔ وہ ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء میں بڑی بڑی منزلیں طے کر کے یہاں آ پہنچا اور قلعے کو گھیر لیا۔ اس وقت وہاں کا راجہ رامچندر تھا۔ وہ ناگہانی حملے سے گھبرا کر مجبور ہوگیا کہ حملہ آوروں کو سونے، چاندی اور جواہرات کی کثیر مقدار اور ایلچپور کا علاقہ سلطنت دہلی کے حوالے کرے۔ اس دولت فراواں کا لالچ دے کر علاء الدین نے جلال الدین فیروز کو بلایا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔ رامچندر ۷۰۶ھ/۱۳۰۷ء میں ایلچپور کا خراج بھیجنے سے قاصر رہا اس لیے کافور ہزار دیناری کے زیر کمان، جو اس وقت نائب السلطنت تھا، ایک لشکر اس کے خلاف روانہ کیا گیا، لیکن راجہ نے کافور کے سامنے اظہار اطاعت کیا اس لیے اس کو عزت و توقیر کے ساتھ دارالسلطنت بھیج دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے خراج کے بدلے بیش قیمت تحائف پیش کیے، اس کا قصور معاف کر دیا گیا اور رائے رایان کا خطاب دے کر اسے دیوگری کی حکومت تفویض کی گئی مگر رامچندر کا فرزند اور جانشین شنکر دہلی کی سیادت سے منحرف ہوگیا۔ ۷۱۳ھ/۱۳۱۳ء میں کافور کو پھر وہاں روانہ کیا گیا اور اس نے شنکر کو قتل کرا کر ریاست دیوگری کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کوئی تین سال بعد شنکر کے داماد ہرپال نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ دہلی کا نیا سلطان قطب الدین مبارک خلجی اس کے مقابلے میں خود لشکر لے کر آیا۔ ہرپال کو قتل کر دیا گیا اور دیوگری کے علاقے کا سلطنت دہلی سے الحاق ہوگیا۔ ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء میں وہاں ایک بڑی جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ (دیکھیے آثار قدیمہ ذیل میں)

اس کے بعد دیوگری کی تاریخ میں اہم زمانہ وہ ہے جب ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء میں محمد بن تغلق نے یہ محسوس کر کے کہ اس کے ممالک محروسہ میں دہلی خاطر خواہ مرکزی مقام نہیں، یہ فیصلہ کیا کہ دیوگری کا نام بدل کر دولت آباد رکھا جائے اور وہی اس کی سلطنت کا صدر مقام بنے۔ پہلے تو سرکاری عہدے داروں کو اس پر راضی کیا گیا کہ وہاں جا کر آباد ہوں، لیکن ۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء میں تمام آبادی کو تادیباً مجبور کیا گیا کہ دہلی چھوڑ کر دولت آباد جائیں (برنی، ۴۸۱ ببعد؛ ابن بطوطہ، ج ۳: ۳۱۴ ببعد) پھر دولت آباد کو مرکز عمل بنا کر تمام دکن میں امن و امان قائم کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد جب شمالی ہند پر مغلوں نے تاخت کی تو محمد تغلق کو مجبوراً دہلی واپس آنا پڑا اور دولت آباد پہلے کی طرح پھر جنوب میں فوج کا ایک مستقر بن کر رہ گیا۔ دولت آباد ہی میں (از ادارہ) ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء امیران صدہ نے اسمٰعیل مُخ کو اپنا سردار منتخب کیا اور ایک سال بعد ظفر خان، جو دہلی کی فوج کو شکست دے چکا تھا، اسمٰعیل کی جگہ وہیں پہلا بہمنی سلطان بن گیا۔ بہمنیوں نے دولت آباد کو شمالی سرحد کی چھاؤنی بنائے رکھا اور

اس کی دفاعی قلعہ بندی کو اور مضبوط کیا۔ مشہور چاند مینار انھیں کے زمانۂ تسلّط کی یادگار ہے۔ ۹۰۹ھ/ ۱۵۰۰ء میں یہ ان کا دارالسلطنت بن گیا۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں بخوبی سمجھتا تھا کہ دکن پر تسلط قائم رکھنے کے لیے دولت آباد کلیدی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ مہابت خان نے ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۳ء میں اس کا سختی سے محاصرہ کیا اور مغل سلطنت کے لیے اسے فتح کر لیا (عبدالحمید لاہوری: بادشاہ نامہ، ۱: ۴۹۶-۵۳۶)۔ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء میں صلابت جنگ نے دولت آباد کو نظام الملک کے لیے مسخر کیا، مگر تین سال بعد یہ شہر مرہٹوں کے ہاتھ آ گیا۔

دولت آباد کو کبھی فتح آباد کے دارالضرب ہونے پر فخر تھا (محمد اول بہمنی کے زمانے میں دولت آباد کا نام فتح آباد رکھ دیا گیا تھا؛ اس کے لیے دیکھیے برہان المآثر، مطبوعہ ۱۹۳۶ء، ص ۱۷)۔ اس دارالضرب میں ۷۶۱ - ۷۶۲ھ سے سکے مضروب ہونے لگے۔ یہ شہر کاغذ سازی کی صنعت کا بھی مرکز تھا۔

مآخذ: علاوہ ان کتابوں کے جن کا ذکر متن میں آ چکا ہے دیکھیے (۱) بلگرامی و Willmott: *Historical and Descriptive Sketches of H. H. Nizam's Dominions*؛ (۲) T.W. Haig: *Historical landmarks of the Deccan*؛ (۳) *Imperial Gazetteer of India. Hyderabad State*.

(ہارون خان شروانی)

(۲) **یادگار عمارات:** دولت آباد میں پہلا تعمیری کام (پہلی صدی ق۔م میں چٹانوں کو کاٹ کر بنائے ہوئے غاروں سے قطع نظر) دیوگری کو تراشنا تھا جو ایک مخروطی شکل کی دو سو میٹر اونچی سالم چٹان ہے اور ایک قدرتی درے کے سرے پر سر بلند کیے کھڑی ہے۔ اس تراش خراش کے باعث (جس کا آغاز کم از کم یادوا خاندان کے اوائل عہد میں ہو چکا تھا) پوری چٹان کا حلقہ پچاس سے پینسٹھ میٹر بلند عمودی دیوار کی شکل میں نظر آتا ہے جس کے نیچے چٹان کو مزید پندرہ میٹر اندر تک مستطیل شکل میں کاٹ کر ایک پانی سے بھری ہوئی خندق بنائی گئی ہے (اس پر سے ایک تنگ بستہ راستہ پہاڑی میں تراشے ہوئے ایک دیول تک جاتا ہے اور اس کی ہندوانہ اصل کو واضح کرتا ہے)۔ بعد کی مسلمانوں کی تعمیرات میں ہندو کاریگروں کے تراشے ہوئے پتھروں کا استعمال ثابت کرتا ہے کہ مشرقی جانب کی ڈھلوان زمین پر پہلے زمانے میں ایک شہر موجود تھا۔

قلعے کی تیسری فصیل بھی مشرق ہی کی جانب بنی ہوئی ہے، جس کی بنیاد محمد بن تغلق کے زمانے میں رکھی گئی؛ سب سے باہر کی دیوار بیرونی شہر کی فصیل ہے جسے اورنگ آباد سے خُلد آباد جانے والی سڑک شمالاً جنوباً قطع کرتی ہے، شہر (جسے عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں جا بجا عنبر کوٹ لکھا ہے) کا رقبہ شمالاً جنوباً تقریباً ۲ کیلو میٹر اور شرقاً غرباً زیادہ سے زیادہ ایک کیلو میٹر ہے۔ دوسری دیوار ۱ء۲ × ۰ء۴ کیلومیٹر کا رقبہ گھیرے ہوئے ہے، جو پہلی دیوار کے مغرب میں واقع ہے اور جس کا نام ابن بطوطہ نے کٹک اور عبدالحمید لاہوری نے مہا کوٹ (قلعۂ بزرگ) بتایا ہے۔ اس حصۂ شہر کے اندر ایک مڑے تڑے راستے سے داخل ہوتے ہیں، جو گول برجوں کے آگے پیچھے بنانے سے بن گیا ہے۔ اس سے کچھ کم پیچیدہ داخلہ تیسری فصیل کے اندر کا ہے، جس کے ذریعے قلعۂ دیوگری میں جاتے ہیں (جسے لاہوری بالا کوٹ لکھتا ہے)۔ پہلے ایک زینہ طے کرتے ہیں، پھر چٹان میں کھدی ہوئی خندق پر بنے ہوئے ایک تنگ سنگی پل سے گزر کر ایک سرنگ میں داخل ہوتے ہیں جو پہاڑ کے اندر تراشے ہوئے حجروں اور پرانے جین مت کے غاروں میں سے گزرتی ہے۔ اس طرح کوئی پندرہ میٹر اوپر جا کر پھر چٹان میں کاٹی ہوئی چوڑی سیڑھیاں آتی ہیں، جن پر چڑھ کر ایک مغل بارہ دری میں جاتے ہیں اور جسے طے کر کے

سے، پیچ آخر میں سو سیڑھیوں کا ایک اور زینہ آتا ہے جس پر چڑھ کر اصل بالا حصار پر پہنچتے ہیں۔ اس چبوترے کا رقبہ ۵۰ میٹر × ۳۶ میٹر ہے اور یہاں توپیں نصب ہیں۔ مذکورۂ بالا تینوں فصیلیں باہر کی جانب ایک خندق اور آمنے سامنے کے دمدموں سے مستحکم کی گئی ہیں۔ ان سب میں (چھوٹے پتھر کی نفیس تراش خراش اور بہتر استعمال کو دیکھتے ہوے ان تبدیلیوں کا پتا چلتا ہے) جو بہمنی عہد کے فن تعمیر میں ظہور پذیر ہوئیں۔ دفاعی استحکامات کے سلسلے میں یہ تعمیرات باعث دلچسپی ہیں: (۱) آخری خندق کے پل کا بیچ کا حصہ، دونوں پہلوؤں کی سطح سے تقریباً تین میٹر نیچا ہے اور خندق کی منڈیر اور سرنگ تک ایک عمودی زینے کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ خندق کے پانی کی سطح کو بلند کر دینا یقیناً اختیار میں ہوگا تاکہ پل کے بیچ کا یہ حصہ پانی میں غرق کیا جا سکے؛ (۲) لمبی سرنگ، جس کے داخلے کے دروازے پر ایک آہنی روک لگی ہوئی تھی، جسے تپا کر سرخ انگارا بنایا جا سکتا تھا۔

قطب الدین مبارک خلجی، شاہ دہلی، کی مسجد (کتبہ ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء) شاید قدیم ترین اسلامی یادگار ہے۔ اس کے پشتیبان نالدار دے کر گاؤدم بنائے ہیں اور گنبد اس کا مورنیوں والا ہے۔ اس کے مجموعی احاطے کا رقبہ کوئی ۷۰۸ میٹر مربع ہے (تصاویر در *Annual Report of Archaeological Department Hyderabad*، ۱۹۲۵-۱۹۲۶ء، لوحہ III)۔ کچھ عرصے سے اس کی محراب کو ایک بت رکھ کر بھر دیا گیا ہے۔

اس مسجد کا کوئی مینار نہیں، تاہم مینار کا کام "چاند مینار" دیتا ہے، جس کی بلندی تیس میٹر ہے اور تعمیر کی تاریخ ۸۴۰ھ/۱۴۳۵ء ہے۔ شکل میں وہ بیدر [رک بآں] میں واقع مدرسۂ محمود گاوان کے گنبدوں کے مشابہ ہے، مگر اس میں تین غلام گردشیں ہیں جن کے سہارے کے لیے بڑے اہتمام سے دیوار گیریاں بنا دی گئی ہیں۔ چاند مینار مسجد کے مینار کے علاوہ دیدبان کا بھی کام دیتا تھا کیونکہ اس پر سے شمال مشرق کے جٹیل سنسان میدان کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے۔

محلات زیادہ تر کھنڈر ہو گئے ہیں۔ ان میں قابل توجّہ "بارہ دری" ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں شاہجہان کی آمد کی تقریب میں بنائی گئی تھی۔ دوسری عمارت مہا کوٹ کا چینی محل ہے، جو نظام شاہی عہد میں تعمیر ہوا۔ اس میں کاشی کاری کی گئی ہے؛ چینی محل سے آخری قطب شاہی بادشاہ ابوالحسن کے لیے سرکاری قید خانے کا کام لیا گیا تھا (خافی خان: منتخب اللباب، ۲: ۴۷۱ ببعد)۔

مآخذ: دولت آباد کی مقامی حیثیت کے متعلق کوئی خاص تحریر موجود نہیں ہے۔ متن مقالہ میں جو حوالے دیے گئے ہیں ان کے علاوہ دیکھیے S. Piggott: *Some ancient cities of India*، بمبئی ۱۹۴۵ء، ص ۷۰ (اس میں خاکے کی تصویر بھی شامل ہے)۔

(J. BURTON-PAGE)

* **الدّولت آبادی**: شہاب الدین احمد بن شمس الدین بن عمر زاولی الہندی، نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز ہندوستانی عالم، جو دکن کے شہر دولت آباد میں پیدا ہوے۔ وہ دہلی میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے ممتاز شاگردوں قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی سے تعلیم پا کر فارغ التحصیل ہوے۔ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو شہاب الدین نے دہلی کو خیر باد کہا اور جونپور کی سکونت اختیار کی، جہاں سلطان ابراہیم شرقی (۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء] تا ۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء) نے نہایت اعزاز سے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنی سلطنت کا قاضی القضاۃ

مقرر کرکے انھیں "ملک العلماء" کا خطاب عطا کیا۔ فرشتہ کا قول ہے کہ سلطان کی نظر میں ان کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ دربار میں ان کے لیے چاندی کی ایک خاص کرسی مہیا کی گئی تھی۔ ان کا جونپور میں ۸۴۸ھ/۱۴۴۵ء میں انتقال ہوا۔

شہاب الدین کثیرالتصانیف بزرگ تھے۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور محمد غوثی شطاری فارسی شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی کچھ نہ کچھ شہرت تھی۔ ان کی تالیفات میں سے مندرجۂ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں: شرح الہندی، جو کافیہ کی شرح ہے (مخطوطے کے لیے دیکھیے، زبید احمد: Contribution of India to Arabic Literature، ص ۱۰۳)؛ (۲) شرح اصول البزدوی (مخطوطہ مملوکۂ مولانا ابوالکلام آزاد)؛ (۳) العقائد الاسلامیہ، علم کلام پر ہے (مخطوطۂ رامپور، ۱۰۳)؛ (۴) الارشاد، عربی نحو پر (مطبوعۂ حیدرآباد)؛ (۵) مصدق الفضل، مشہور قصیدۂ بانت سعاد کی شرح (مطبوعۂ حیدرآباد)؛ (۶) بحر المواج، قرآن مجید کی فارسی تفسیر، جو سلطان ابراہیم شرقی کے نام معنون ہے (مخطوطے کے لیے دیکھیے سٹوری، ۱: ۱۹۳)؛ (۷) تاریخ المحمدیہ (سٹوری، ۷۳۴)؛ (۸) فتاوی ابراہیم شاہی؛ (۹) بدائع البیان؛ (۱۰) مناقب السادات، آل رسول کے فضائل و حقوق خصوصی پر (سٹوری، ۱: ۲۱۱، ۱۲۶۱)۔

مآخذ: (۱) عبدالحق محدث دہلوی: اخبار الاخیار (دہلی ۱۳۰۹ھ)، ص ۱۷۵ تا ۱۷۶؛ (۲) محمد غوثی شطاری: گلزار ابرار (مخطوطۂ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ص ۳۷)؛ (۳) محمد صادق: طبقات شاہجہانی (مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، ورق ۹۰)؛ (۴) غلام علی آزاد: مآثر الکرام (آگرہ ۱۹۱۰ء)، ص ۱۸۸ تا ۱۸۹؛ (۵) فقیر محمد: حدائق الحنفیہ (نولکشور، لکھنؤ ۱۹۰۶ء)، ص ۳۱۶؛ (۶) رحمٰن علی: تذکرۂ علمائے ہند (نولکشور، لکھنؤ ۱۹۱۴ء)، ص ۸۸، ۸۹؛ (۷) نور الدین: تجلی نور (جونپور ۱۹۰۰ء)، ۲: ۳۳؛ (۸) زبید احمد: The Contribution of India to Arabic Literature، ص ۱۹۷ ببعد؛ (۹) سٹوری Storey، ص ۹ تا ۱۰؛ (۱۰) براکلمان، ۲: ۲۲۰۔

(ک ۔ اے ۔ نظامی)

دولت شاہ: (امیر) بن علاء الدولہ بختی شاہ، ایک ایرانی مصنف، جو خراسان کے شہر اسفرائن کے ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔ اس کا باپ تیمور کے بیٹے شاہرخ کے بہت بے تکلف درباریوں میں سے تھا۔ یہ خود ان لڑائیوں میں شریک ہوا جو تیموری سلطان ابوالغازی سلطان حسین اور سلطان محمود نے اندخود کے نزدیک لڑیں۔ جب اس نے تذکرۃ الشعراء لکھنی شروع کی اس وقت اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور اسے اس نے تقریباً ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں اپنی وفات کے قریب مکمل کیا، لیکن اس کی وفات کی صحیح تاریخ نامعلوم ہے۔ مشہور وزیر، مصنف اور ادب اور فن کا سرپرست میر علی شیر نوائی (قب براؤن: A Literary History of Persia، ۳: ۴۳۷) دولت شاہ کی اس بنا پر مدح کرتا ہے کہ اس نے بڑے آدمیوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا تاکہ وہ اپنا وقت مطالعۂ کتب اور اپنی کتاب لکھنے میں صرف کرے۔ اس کی کتاب تذکرۃ الشعراء سب سے پہلا تذکرہ ہے جس سے اہل یورپ Von Hammer کے ترجمے کی بدولت روشناس ہوئے۔ یہ تذکرہ سات حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصے میں بیس یا کچھ کم و بیش شاعروں کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان ملوک و سلاطین کا بھی حال لکھا ہے جو ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس کا ایک دیباچہ بھی ہے، جس میں فن شعر سے بحث کی گئی ہے۔ آخری حصہ ان سات شاعروں کے لیے وقف ہے، جو مصنف کے ہمعصر تھے۔ اس میں تیموری شاہزادے ابوالغازی سلطان حسین بن منصور بیقرا کی ثنا و صفت بھی شامل ہے، جو خود بھی ایک ادیب تھا (براؤن، ۳: ۳۹۰، ۴۳۹)۔ تذکرے میں شعرا کے

کلام کا نہایت عمدہ انتخاب دیا گیا ہے، جو تاریخ ادبیات خصوصاً آٹھویں اور نویں صدی ہجری/چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے شعرا کے مطالعے کے لیے بہت مفید ہے، لیکن اس کی یادداشتوں میں ملوک، امرا اور شاعروں کے حالات کے بیان میں بہت سی فروگزاشتیں پائی گئی ہیں اور ساتھ ہی ان کے اوصاف شعرگوئی پر جو فیصلے صادر کیے گئے ہیں ان میں جا بجا ناقدانہ شعور کی کمی نظر آتی ہے۔

فتح علی شاہ کا سب سے بڑا بیٹا بھی دولت شاہ کہلاتا تھا۔ وہ شہر نوا میں ۲ ربیع الآخر ۱۲۰۳ھ/ ۲ جنوری ۱۷۸۹ء کو پیدا ہوا۔ برسوں تک وہ کرمان شاہان کا حاکم رہا۔ محمود پاشا کے مقابلے میں لشکر کشی سے واپسی پر ۲۶ صفر ۱۲۳۶ھ/ ۳ دسمبر ۱۸۲۰ء کو وفات پائی۔ اس نے دو نظمیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

مآخذ: طبعات: (۱) تذکرۃ الشعراء، بمبئی ۱۸۸۷ء؛ (۲) تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن E. G. Browne، لنڈن ۱۹۰۱ء؛ ترجمہ: *Geschichte der schönen Redekünste Persiens* از Von Hammer، ویانا ۱۸۱۸ء؛ (۳) رضا قلی خان: مجمع الفصحاء، ۱: ۲۲؛ (۴) Belin در JA، ۱۸۶۲ء؛ ۳۳۵؛ (۵) براؤن: ج ۳، بمدد اشاریہ؛ (۶) وہی مصنف: *The Sources of Dawlat-Shah* در JRAS، ۱۸۹۹ء، ص ۳۷ تا ۶۹؛ دوسرے تذکروں کی فہرست کے لیے دیکھیے (۷) Storey, C. PL.، ۱: ۷۸۳ تا ۷۹۶؛ (۸) سید عبداللہ: تذکرۂ دولت شاہی (تنقید و مباحث)، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

(H. Massé و Cl. Huart)

* دولت گرای [خان] اول

: ۹۱۸ھ/ ۱۵۱۲ء تا ۹۸۵ھ/ ۱۵۷۷ء، الملقب بہ تخت آلغان (= فاتح دارالسلطنت)، جو ۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء سے ۹۸۵ھ/ ۱۵۷۷ء تک قریم (کریمیا) کا خان رہا۔ وہ مبارک گرای کا فرزند تھا اور ۹۳۸ھ/ ۱۵۳۲ء میں سعادت گرای خان نے اسے "قلغہ" یعنی تخت کا وارث اول مقرر کیا۔ جب ۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء میں عثمانی ترکوں کی زوردار تائید سے وہ خان بنا دیا گیا تو قریم میں عثمانیوں کا اثر بڑھ گیا۔ اس نے اپنے پیش رو کی طرح روسیوں کے ساتھ مخالفانہ رویہ بہت زور شور سے جاری رکھا اور ۹۵۹ھ/ ۱۵۵۲ء میں پولینڈ کے خانوادۂ جاگیلو سے روسیوں کے خلاف اتحاد کر لیا۔ اس نے ماسکو پر چند بار فوج کشی کی، مگر روسیوں کو قریب کی دو ریاستوں قازان [رک بآں] اور استرا خان [رک بآں] پر قبضہ جما لینے سے نہ روک سکا۔ جب ۹۷۷ھ/ ۱۵۶۹ء کی فوجی مہم میں عثمانی ترک والگا کے زیریں علاقے پر اپنا تسلط جمانے میں ناکام رہے تو انھوں نے دولت گرای کو ترغیب دی کہ روس سے جنگ جاری رکھے۔ ۹۷۹ھ/ ۱۵۷۱ء میں دریائے اوکا Oka پر روسیوں کی مقاومت توڑ کر وہ ماسکو پہنچ گیا اور اس کو جلا ڈالا اور اسی سے اسے "تخت آلغان" کا لقب ملا۔ اس سے اگلے سال جب زار نے قازان اور استرا خان کی بابت خان کا مطالبہ رد کر دیا تو اس نے پھر نیا حملہ کیا، لیکن اسے ماسکو کے قریب مولوڈی Molody پر سخت شکست دی گئی۔ پولینڈ کے انتخابات میں روس کے خلاف اس کا ترکوں کے ساتھ تعاون زیادہ کامیاب رہا (دیکھیے Bellaten، عدد ۹۴، ص ۳۰۹)۔ اس کی وفات صفر ۹۸۵ھ/ اپریل - مئی ۱۵۷۷ء میں ہوئی۔ اس کا عہد حکومت اس لیے امتیاز رکھتا ہے کہ ایک طرف تو ابھی قریم کی خانی ریاست اور روس کے درمیان والگا کے طاس میں التون اُردو یعنی چنگیزی ورثے کے لیے فیصلہ کن کشمکش جاری تھی اور دوسری طرف کریمیا سلطنت عثمانیہ کا کامل جزو بن گیا۔ یہاں اس جامع مسجد کا بھی ذکر مناسب ہے جو خان نے ۹۵۹ھ/ ۱۵۵۲ء میں بمقام Gözleve تعمیر کی۔ خان کے بعد اس کے اٹھارہ فرزندوں میں سے چھ خان ہوئے (رک بہ گرای، در آآ، ت)۔

مآخذ : (۱) محمد رضا: السبع السیّار فی اخبار ملوک التاتار، طبع کاظم بیگ، قازان ۱۸۳۲ء، ص ۹۳ تا ۱۰۱؛ (۲) حلیم گرے : گلبن خانان، استانبول ۱۲۷۸ء، ص ۱۸ تا ۲۱؛ (۳) عبدالغفار : عمدة التواریخ، در *TOEM*، ص ۱۱۲؛ (۴) H. Feyiz-khanoghlu-V. Zernov : *Kirim yurtuna wa ol 'taraflargha dā'ir bolghan yarlıqlar wa khatlar* سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۶۴ء، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۶۴ء، ص ۵۵۸ بعد : (۵) فریدون : منشآت السلاطین، استانبول ۱۲۶۵ء، ۲ : ۵۳۱، ۵۵۸ تا ۵۵۹ : (۶) اے۔ رفیق ; *Bahr-i Khazar - Karadeniz* در *'Kanali ve Ejderkhan seferi* *TOEM*، ج ۸، عدد ۴۳، ص ۱ تا ۱۴؛ (۷) H. Inalcik : *Osmanli-Rus rekabetinin menşei ve Don-Volga kanali teşebbüsü*، *Belleten*، ج ۱۲، عدد ۴۶، ص ۳۶۸ تا ۳۹۰۔

(HALIL INALCIK)

* **دولمہ باغچہ** : [طولمہ باغچہ]، رک بہ استانبول [۲ : ۶۶۲ ه]۔

* **دُومَة الجَنْدَل** : وادی سِرحان کے سرے پر ایک واحہ (نخلستان)؛ وادی سِرحان جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ایک سرے پر وسطی عرب اور دوسرے سرے پر حوران اور شام کا کوہستان ہے اور یہ وادی دونوں کو ملاتی ہے؛ اور اس لیے یہ مدینے اور دمشق کے درمیان سب سے زیادہ سیدھے راستے پر واقع ہے جو تقریباً پندرہ دن کی مسافت پر مدینے سے اور تقریباً سات دن یا اس سے زیادہ کی مسافت پر دمشق سے پیدل چل کر ہے۔ یہ واحہ (نخلستان) ایک غائط (کَھڈ) یا خَبْت (وسیع نشیبی زمین) میں ہے جس کا طول بقول یاقوت پانچ فرسنگ، یا موجودہ اصطلاح میں حافظ وہبہ کے کہنے کے مطابق، تین میل اور عرض آدھ میل اور گہرائی اِردگرد کی صحرا کی بلند سطح سے پانسو فٹ نیچی ہے۔ اس علاقے کی ہیئت کے تحت اس واحہ (نخلستان) کے نام میں بھی تغیر ہو گیا ہے، اور اب اسے، کم سے کم پچھلی صدی سے اَلجَوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے (الجوف)، یعنی "وسیع نشیب، گول حوض، چوڑا اسفنجی صحن، ایک وادی یا قطعۂ زمین جس میں پانی جمع ہوتا ہو"۔ یاقوت، جو اس مقام کا کسی قدر طویل ذکر کرتا ہے، اس کے نام کے بدل جانے سے ناواقف ہے۔

دُومہ (اس کا تلفظ دَومہ ناقابل قبول ہے) غالباً ایک آرامی لفظ ہے؛ قدیم فضلاے عرب مثلاً ابن الکلبی اور الزجاجی کے کہنے کے مطابق یہ نام حضرت اسمٰعیلؑ کے لڑکوں میں سے ایک کے نام (دُوم یا دُومان یا دُوما) سے ماخوذ ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ دُوما نام بائیبل میں بھی آیا ہے (سِفر التکوین، ۲۵ : ۱۴؛ سفر اخبار، ۱، ۳۰) اور وہاں اسے ایک اسمٰعیلی قبیلے کا نام بتایا گیا ہے۔ عرب مصنفین نے کہا ہے کہ جب تہامہ اسمٰعیل کے کثیر التعداد گھرانوں کے لیے کافی چراگاہیں مہیا نہ کر سکا تو ان کا مذکور الصدر فرزند اس علاقے میں ہجرت کر کے چلا آیا اور اسی کے نام پر اس علاقے کا نام بھی دُومہ پڑ گیا اور اس نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اسلام سے پہلے ہی دُومة الجَنْدَل میں ایک قلعہ موجود تھا اور اس کے نام مارد کا ایک قدیم مَثَل میں ذکر آیا ہے جس کی بنیاد اس فقرے پر ہے جو الزبّاء سے منسوب ہے (تَمَرَّدَ مارِدٌ وَعزَّالابلَق)۔ ایک قدیم قلعے کے کچھ بچے کھچے نشانات پچھلی صدی تک باقی تھے اور Euting نے ۱۸۸۳ء میں ان کا ایک خاکہ بھی بنایا تھا۔ یہ قلعہ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے گرد ایک دیوار بھی پتھر ہی کی تھی؛ ان تعمیرات ہی کی بنا پر اس کے نام کے ساتھ الجَنْدَل کا لفظ بڑھایا گیا تھا جو ایک اسم جنس ہے جس کے معنی پتھر کے ہیں۔ قبل اسلام یہاں وَدّ بت کی پرستش ہوتی تھی۔

یاقوت اور دیگر عرب جغرافیہ دان حدیں بتاتے

میں کہ دُومۃ نام کے تین مقام ہیں: ایک دمشق کے قریب (جہاں اب تک بھی ایک دُومہ موجود ہے)، اور دوسرا الحِیرہ کے پاس، اور تیسرا جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، شمالی عرب میں تھا۔ ناموں کے اس توارد کی وجہ سے بعض عربی تاریخی مآخذ میں ایک التباس پیدا ہو گیا ہے؛ اور بعض حوادث جو دوسرے مقامات میں رونما ہوئے ان کو دُومۃ الجَنْدَل کی طرف منسوب کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

دُومۃ الجندل کے باشندے بنو کِنانہ تھے کیونکہ بنو کلب کی اس شاخ کا زیادہ تر حصہ، اسلام سے پہلے شمالی عرب کے صحراء السماوۃ کے اندر، شمال میں دومۃ الجَنْدَل کے مسطح میدان سے لے کر، جنوب میں طَیّ کے دو پہاڑ اَجا و سَلْمٰی [رک بآں] تک، پھیل گیا تھا۔ بنو کلب کے عام اجتماع میں جو اس لیے منعقد ہوا تھا کہ دو فریقوں کے درمیان باہمی جنگ کا خاتمہ کر دیا جائے، یہ علاقہ ان کی چراگاہوں کے لیے دیدیا گیا تھا (Register : F. Wustenfeld، بذیل مادۂ کلب بن وَبَرہ؛ قب البکری: مُعجم: ص ۳۳ ببعد)۔ خود وَاحَہ (نخلستان) میں کچھ لوگ الحیرۃ کے "عِباد" میں سے آکر بس گئے تھے (البلاذری میں ان کا نام "عِبادُ الکوفۃ" آیا ہے لیکن ڈخویہ نے اس کی تصحیح "عبادالحیرۃ" کی ہے)، جس کا مطلب یہ ہوا کہ عیسائیوں کی بھی کچھ تعداد تھی جو اس شہر میں رہتی تھی اور یہ تَنُوخ سے الگ تھے جو ارد گرد کے اضلاع کے خانہ بدوش لوگ تھے۔ گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ عِباد جو اس وَاحَہ (نخلستان) میں رہتے تھے تجارت پیشہ تھے اور کچھ لوگ زراعت بھی کرتے تھے، کیونکہ دُومۃ الجندل کا شمار شمالی عرب کی بڑی منڈیوں میں تھا۔

دُومۃ الجندل کو قدیم اسلام میں ایک خاص شہرت حاصل رہی ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے فتح کرنے کے لیے تین غزوات کیے: اول غزوہ ۵ھ/ ۶۲۶ء میں جس میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قائد الجیش تھے۔ اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا کیونکہ وَاحَہ کے باشندے لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی تتر بتر ہو گئے تھے؛ دوسرا غزوہ ۶ھ/ ۶۲۷-۶۲۸ء میں پیش آیا جس کے قائد الجیش حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار الاَصْبَغ بن عمرو الکلبی اسلام میں داخل ہو گیا۔ تیسرے غزوے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تبوک سے تیاری کی اور خالدؓ بن ولید کو اس مہم پر ۹ھ میں بھیجا۔ خالدؓ بن ولید نے وَاحَہ (نخلستان) کے شہر پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی آبادی پر بھاری تاوانِ جنگ عائد کیا اور سردار اُکَیْدِر بن عبدالملک الکندی السَّکونی [رک بآں] پر زور ڈالا کہ مدینے جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے معاہدۂ صلح کرے۔ اس صلحنامے کی اصل عبارت اب تک محفوظ چلی آتی ہے، اور ممکن ہے کہ بعد میں اس کے اندر جہاں تہاں کچھ بڑھایا بھی گیا ہو (البلاذری: الفتوح، ص ۶۱ ببعد؛ ابن سعد، ۱: ۲، ۳۶ ببعد؛ یاقوت: ج ۲، ص ۶۲۷؛ نیز دیکھیے ایم حمید اللہ: وثائق، عدد ۱۹۱؛ Skizzen und Vorarbeiten : Wellhausen، ۴: ۱۳۳، حاشیہ ۳ و ص ۴۰۴، حاشیہ ۱؛ Caetani : Annali، ۹ ہجری اور ص ۵۴ حاشیہ ۲)۔ ان سرداروں کے، جن سے مسلمانوں کو ۵ھ اور ۹ ہجری میں واسطہ پڑا، ناموں میں اختلاف، نیز ان کے قبائل کی اصل میں تفاوت جن میں ایک کلبی اور ایک کندی تھا، نیز اُکَیْدِر کے حالات میں روایات کے تضاد کی وجہ سے ڈخویہ نے کچھ سوالات اٹھائے ہیں اور کائتانی نے کچھ شکوک ظاہر کیے ہیں جو حد سے متجاوز معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان خانہ بدوش کلبیوں (بنو کلب) میں جو ایک بڑا رقبہ سنبھالے ہوئے تھے اور جن کے اپنے الگ الگ سردار تھے اور ان مستقل باشندگان وَاحَہ میں جن کے افراد زراعت پیشہ، سوداگر

اور صنّاع تھے اور غزوات دومہ سے یہاں ہی وہاں آ بسے تھے، فرق سمجھ لیا جائے جس کی نے مسعودی بھی تصدیق کی ہے (التنبیہ، ص ۲۴۸)، تو بہت سے اشکال حل ہو سکتے ہیں۔ اُکیدر کے حالات کے بیان میں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ واحہ چھوڑ کر عراق میں آ بسا تھا اور دُومۃ الجندل کی یادگار کے طور پر اپنے عراقی گھر کا نام دُومہ رکھا تھا؛ ایک اور روایت میں جسے البلاذری (کتاب مذکور، ص ۶۳) اور یاقوت (ج ۲، ص ۶۲۷) نے محفوظ رکھا ہے، اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ اس عربی واحہ کو اُکیدر دُومۃ الجندل اس لیے کہتا تھا کہ یہ اس دومۃ سے جو الحیرہ کے قریب تھا اور جہاں سے وہ خود آیا تھا، ممیز ہو جائے۔ ان میں سے پہلی روایت غالباً زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس بات کے تسلیم کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اس واحہ (نخلستان) کا نام دُومۃ الجندل قدیم سے چلا آتا ہے۔

بعض مآخذ میں دُومۃ الجندل کا نام اس سلسلۂ بیان میں آتا ہے جو ۱۲ھ/۶۳۳ء میں خالدؓ بن الولید کے مشہور واقعہ عبور صحرا سے تعلق رکھتا ہے۔ جب خالدؓ ابن الولید سے کہا گیا کہ شام کے مسلم عساکر سے جس قدر جلد ہو سکے دوبارہ جا ملے، کیونکہ وہ خطرے میں گھر گئے تھے، تو حضرت خالدؓ روانہ ہو گئے اور کہا گیا ہے کہ راستے میں دُومۃ الجندل پر حملہ کیا اور اُکیدر کو قتل کر دیا۔ ڈخویہ نے (کتاب مذکور، ص ۱۵ ببعد) یہ خیال پیش کیا ہے کہ یہاں الجندل کا لفظ خواہ مخواہ بڑھا دیا گیا ہے اور کہا ہے کہ مآخذ میں جو دُومہ یہاں مذکور ہے اس سے مراد الحیرہ کا دُومہ ہے؛ یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے اتنا چکر لگایا ہو جو انہیں اپنے راستے سے دور ہٹا دے اور یلغار میں دیر لگا دے۔ ڈخویہ کا استدلال بہت مغالطانہ ہے اور (Palestina) Mednikov ج ۱، ص ۴۳۳ ببعد) نے اسے مان لیا ہے اور کایتانی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس بنا پر اُکیدر کا قتل، اگر وہ قتل تھا، تو عراق میں واقع ہوا۔ ہمیں یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ عمروؓ بن العاص کو دوران "ردّہ" میں حکم ملا تھا کہ وَدِیعہ کلبی سے قتال کرے جو بعض دیگر کلبیوں کے ساتھ باغی ہو گیا تھا اور دُومۃ الجندل میں پناہ گزین ہوا، رہا ابن الأصبغ تو وہ تو اسلام کا وفادار ہی رہا تھا (الطبری، ج ۱، ۱۸۷۲، ۱۸۸۰)۔ شاید یہ عمروؓ ہی ہوں جنہوں نے دُومۃ الجندل فتح کیا؛ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کارنامہ عیاض بن غَنْم کی طرف منسوب کیا جائے۔ فی الواقع قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک فوجی دستہ اس کی قیادت میں مدائن سے روانہ ہوا تھا اور اس کی غرض بھی یہی تھی مگر وہ مشکلات میں پھنس گیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عیاض اس واحہ (نخلستان) پر ۱۳ھ/۶۳۴ء میں حکومت کرتا تھا (الطبری، ۱: ۲۱۳۶)۔ اسی کے مطابق یہ نہ دُومۃ الجندل میں ہوا نہ الحیرہ کے قریب کے دُومہ میں، جیسا کہ ڈخویہ نے کہا ہے (کتاب مذکور، ص ۱۶ ببعد)۔

تاریخ اسلام میں ایک اور موقع پر، ایک بڑے واقعے کے سلسلے میں، دُومۃ الجندل کا نام بھی باعث نزاع بن گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صِفّین میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ حَکَمَیْن ابو موسٰی الاشعریؓ [رک باں] اور عمرو بن العاصؓ [رک باں] جب علیؓ اور معاویہؓ کی باہمی نزاع کے بارے میں اپنی تحقیقات مکمل کر چکیں تو اسی نخلستان (واحہ) میں اکھٹے ہوں اور اسی جگہ اپنا فیصلہ سنائیں؛ لیکن بعض مآخذ اکھٹے ہونے کی جگہ اذرح [رک باں] بتاتے ہیں۔ اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ حقیقت میں ان کا اجتماع مختلف تاریخوں میں دو دفعہ ہوا (*Supra*، بذیل مادّۂ علی بن

ابی طالب)، ایک دفعہ دُومۃ الجندل میں اور اس کے چند ماہ بعد، بہت ہی مختلف حالات کے اندر، اَذرُح میں (اگر یہ امر تسلیم کر لیا جائے تو واقعات کا تسلسل واضح ہو جاتا ہے اور ان کی تاریخی ترتیب کا نہایت پیچیدہ مسئلہ قابل حل نظر آتا ہے)۔ حضرت علیؓ کو پریشان کرنے والی کارروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ امیر معاویہؓ نے ۳۹ھ/ ۶۶۰ء میں ایک فوج دومۃ الجندل روانہ کی؛ حضرت علیؓ اس فوج کو پسپا کر دینے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن نخلستان کے باشندوں نے علیؓ اور معاویہؓ ہر دو کا اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس وقت ممالک اسلامیہ کا مرکز بنو امیہ کے زمانے میں شام میں اور بنو العباس کے زمانے میں عراق میں مقرر ہوا تو دُومۃ الجندل کی ساری اہمیت جاتی رہی۔ اسی وقت سے وہ عرب کے ایک واحہ (نخلستان) کے سوا کچھ نہ تھا جس میں غریب کسانوں کی کچھ بکھری ہوئی آبادی رہ گئی تھی کیونکہ اس وقت تجارت کے دوسرے راستے مقرر ہو گئے تھے۔ حقیقت میں عرب جغرافیہ نویس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتے کہ ان حوادث تاریخیہ کا ذکر کر دیں جن کا اوپر ذکر ہوا، اور قدیم شعرا کے اشعار میں سے شواھد نقل کر دیں۔

یہ ہمیں معلوم ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی آخری صدیوں میں شمالی عرب میں عام طور پر فسادات کا دور دورہ تھا اور یہ حالت جبھی درست ہوئی جب وہابیوں نے اس ملک پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ انھوں نے دُومۃ الجندل پر بھی قبضہ کر لیا اور یہ قبضہ اس وقت تک رہا جب کہ آل رشید کے امیر شمّر طلال نے حکومت سنبھالی کیونکہ ۱۸۵۵ء میں یہ حائل کے تحت ایک ریاست بن گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں قبائل رُوالہ کے سردار نُوری ابن شعلان نے اس پر قبضہ جمایا۔ ۱۹۲۰ء میں امیر شمّر نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور آخرکار عبدالعزیز بن سعود نے حکومت شمّر کا قلع قمع کرنے کے بعد اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا (۱۹۲۱ء)۔ اس کے فوراً بعد شرق اردن نے جنوب کی طرف اپنی سرحد کو النفود تک بڑھانے کی کوشش کی، لیکن ابن سُعود سختی کے ساتھ اڑ گیا اور (۱۹۲۳-۱۹۲۴ء) کی کُویت کی مجلس میں اس مسئلے کا کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ ابن سُعود نے حجاز اور عراق کے خلاف وسیع عسکری کارروائیوں کے دوران میں شرق اردن پر بھی یورش کی۔ جب ابن سعود اور سر جی کلے ٹن G. Clayton کے درمیان حد بندی کا معاہدہ ہوا تو اس میں سرحدیں معین کر دی گئیں (۲ نومبر ۱۹۲۵ء) - اس وقت سے وادی سرحان مع الجوف [رک بآں] اور قُرَیّات المِلح نجد کا حصہ قرار پا گئے (OM، جلد ۱ تا ۸ (۱۹۲۲-۱۹۲۸ء) بمدد اشاریہ).

خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبیلے جو اس علاقے میں جنوب میں تیماء سے لے کر شمال میں کَرک تک اور مشرق میں نفود اور وادی سرحان تک بود و باش رکھتے ہیں ان کو ایک ہی نام الحُوَیطات [رک بآں] کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔ پچھلی صدی کے دوران میں چند یورپی سیاحوں نے اس واحہ (نخلستان) کی سیر کی: ان کے اکتشافات کا بیان Hogarth میں ملے گا۔

مآخذ: (۱) واقدی، طبع ولہاوزن: ص ۱۷۴ ببعد، ۲۳۶ ببعد، ۳۹۱، ۴۰۳ ببعد: (۲) ابن ہشام، طبع وُسْتِنْفِلْت: ص ۶۶۸، ۹۰۳ (اور ج ۲، ص ۲۰۵)، ۹۹۱: (۳) ابن سعد، ۱/۲: ۴۹ ببعد، ۲/۱، ص ۱۱۹ ببعد: (۴) البلاذری: الفتوح، ص ۶۱ تا ۶۳، ۱۱۱: (۵) الطبری، ج ۱، ۳۶۳ ببعد، ۱۵۵۶، ۱۷۰۲ ببعد، ۱۸۴۷، ۱۸۸۰، ۲۰۶۵، ۲۰۷۷، ۲۱۳۶ اور اشاریہ بذیل مادۂ دومۃ الجندل اور اُکَیدِر: (۶) المسعودی تنبیہ، BGA، ج ۸، ص ۲۳۸، ۲۵۳، ۲۷۲، ۲۹۶: (۷) ابن الاثیر، ۲: ۱۳۵ ببعد، ۱۶۰، ۲۱۳ ببعد، ۳۰۳ اور اشاریہ: (۸) یاقوت، ۱: ۴۵۲، ۴۸۵: ۲: ۶۲۵ تا ۶۲۹، ۸۵۲: ۳: ۱۰۶: ۴: ۷۲، ۳۸۹، ۹۱۳:

(۷) وہی مصنف: مشترک، طبع وسٹنفلٹ: ص ۱۸۶ ببعد، ۸۳۳؛ بکری: مُعْجَم، طبع وسٹنفلٹ: ص ۲۵۳ ببعد؛ ابن الاثیر اُسْدُ الغابۃ بذیل مادۂ اُکیدر؛ Caetani: Annali، ۳۵، فصل ۱، عدد ۷: ۳۵، فصل ۲، ۷۷-۷۸؛ ۹۵، فصل ۱۶؛ ۹۵، فصل ۲۳، ۳۶، ۳۵-۳۸؛ ۲۰۲، فصل ۱۷، ۱۸۰-۱۸۲، ۲۱۹-۲۲۰، ۲۳۲-۲۳۴؛ ۲۳۸، فصل ۲۸، ۳۸؛ L. Veccia Voglieri: *Il conflitto ʿAli-Muʿāwiya e la secessione Khārigita riesaminati alla luce di fonti ibāḍite*، در *AIUON*، ۱۹۵۲ء، ص ۹-۱۰، ۵۲، ۵۳، ۸۲-۸۴؛ J. Wellhausen: *Skizzen Und Vorarbeiten*، ۳: ص ۱۳۳ حاشیہ ۲، ۳۰۳ حاشیہ ۱؛ M. J. de Goeje: *Mémoire sur la conquête de la Syrie* (اس کی *Memoires d'histoire et de geographie Orientales*، کے اندر)، طبع دوم: ۱۰۰ -؛ (۱۵) D. G. Hogarth: *The penetration of Arabia*، لنڈن ۱۹۰۴ء، اشاریہ.

(L. VECCIA VAGLIERI)

* **دُونْبُولی**: رک بہ گُرد.

* **دُولْم**: (= دُونَم رک بہ مصاحَبہ).

* **ڈُونْمہ**: (DONME) (ترکی لفظ، بمعنی نو مسلم) ترکیہ میں ایک فرقے کا نام، جو ان یہودیوں پر مشتمل تھا جنھوں نے گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں شَبْتای صِبی کی تقلید کرتے ہوے، جسے وہ مسیح خیال کرتے تھے، اسلام قبول کر لیا تھا.

یہ فرقہ بعض صوفیانہ تصورات کے پیش نظر وجود میں آیا تھا، جن کی رو سے یہودیوں کے قبول اسلام کو اس اعتبار سے حق بجانب قرار دیا جاتا تھا کہ یہ ظہور مسیح کے سلسلۂ واقعات کی ایک اہم کڑی ہونے کے علاوہ ان لوگوں کے لیے باعث استحکام و تقویت تھے جو اپنے "نو مسلم مسیح" کے مقلد اور اس کی وفات کے بعد بھی اس کے وفادار رہنا چاہتے تھے۔ عقیدۂ ظہور مسیح پر ایمان رکھنے کی وجہ سے انھوں نے مسلمان ہونے کے بعد بھی حتی الامکان یہودیت کو اس کی روایات و رسوم اور "سبتی ۔ مسیحائی ترانیم" کے ساتھ برقرار رکھنے کی کوشش کی ۔ اس طوفانی دور کے ابتدائی تصورات، جب وہ عقیدۂ ظہور مسیح کے حامل ہوتے ہوے مشرف باسلام ہوے تھے، رفتہ رفتہ بڑی حد تک دھندلے اور معدوم ہو گئے ہیں ۔ البتہ ایک جماعت کی حیثیت سے ان کے وجود کا اظہار مخصوص رسوم کی ادائی، سماجی یہود کی سرگرمیوں، جسد عنصری کے ساتھ مسیح کے ظہور ثانی کی توقع اور اس کی یاد سے بنیادی عقیدت اور نتیجۃً قیادت کی جائز جانشینی کے سلسلے میں اختلافات کی صورت میں ہوتا رہا.

یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مسلمانوں کے ساتھ بیاہ شادی سے پرہیز کیا جاتا تھا؛ ہیکل کی بربادی کی یاد میں ("ماہ آب" کی نو تاریخ کو) جو یوم صوم چلا آ رہا تھا، اسے مسیح کے روز ولادت کے طور پر یوم مسرت قرار دیا گیا؛ عبرانی زبان کے علم کو بھی کسی حد تک باقی رکھا گیا؛ بظاہر اسلامی رسم و رواج کے ساتھ موافقت و مطابقت کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، لیکن در پردہ عبرانی نام رکھے جاتے تھے اور شادی و مرگ کی رسوم بھی مختلف طریقے سے ادا ہوتی تھیں .

معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی طور پر اس فرقے کے قبول اسلام کا واقعہ ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۳ء میں Salonika میں پیش آیا، چنانچہ یہ شہر اس کا مرکز بن گیا، تاہم اس کی شاخیں ادرنہ ازمیر اور آگے چل کر استانبول کے علاوہ البانیہ میں بھی قائم ہو گئیں .

داخلی مناقشات کے باعث، جنھیں زیادہ تر مسیح کی جانشینی اور قیادت کے متعدد مدعیوں نے ہوا دی، یہ فرقہ تین ذیلی فرقوں میں منقسم ہو گیا (ان کے ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ تازہ ترین نام حسب ذیل ہیں: حمدی یمار، کرہ کش Karakas، کپن جیلر Kapancilar)۔ یہ سب آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے ۔ ہو سکتا ہے

کہ یہ تقسیم معاشرتی طبقہ بندی سے غیر متعلق نہ ہو، چنانچہ اس کا اظہار بالوں اور لباس کی تراش خراش کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ ایک علحدہ محلے میں رہتے تھے۔

یہ لوگ اپنے آپ کو ایمان والوں (مَأمِینِیم) کی جماعت سمجھتے ہیں۔ اس میں سخت رازداری سے کام لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے بعد ان کی ادبی کارکردگی عبرانی، آرامی، یہودی ہسپانوی اور ترکی زبانوں میں نظموں اور دعاؤں تک محدود رہ گئی تھی۔ مآخذ کی کمی اور رازداری کے باعث اس فرقے کے عقائد کا مطالعہ مشکل اور اس کی تاریخ پیچیدہ ہو کر رہ گئی ہے۔

۱۷۰۰ء میں چند گھرانے ایسے تھے جن کا تعلق مرکزی سلانیکی Salonika گروہ سے تھا۔ ۱۹۰۰ء کے قریب ان کی تعداد کا اندازہ دس ہزار لگایا گیا تھا۔ انھیں تجارت، صنعت و حرفت اور انتظامی ملازمتوں میں نمائندگی حاصل تھی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مغرب سے متأثر نوجوانوں کا ایک روز افزوں طبقہ معلّموں، ڈاکٹروں، قانون دانوں اور صحافیوں کی شکل میں سامنے آیا اور انھوں نے ترکیہ کی عوامی زندگی میں حصہ لیا، بعض اوقات انھیں کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ انقلاب ۱۹۰۸ء کے بعد "نوجوان ترکوں" کے دور میں جاوید بے کا عروج اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

عام طور پر مسلمان اس فرقے کے بارے میں بے نیاز تھے، لیکن کبھی کبھار باز پرس اور پکڑ دھکڑ کی رو چل پڑتی تھی (مثلاً ۱۷۲۰ء، ۱۸۵۹ء اور ۱۸۷۵ء میں) دونمہ کی اصل کے بارے میں ناپسندیدگی کے اظہار کی مثالیں بھی نایاب نہیں۔

یونانی اور ترک آبادی کے باہمی تبادلے کے ساتھ دونمہ کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ سلانیکی دونمہ کو مجبوراً اپنے آبائی شہر کی سکونت ترک کر کے جمہوریۂ ترکیہ میں منتقل ہونا پڑا (۱۹۲۳ تا ۱۹۲۴ء)۔ زیادہ تر وہ استانبول میں آباد ہوئے، لیکن ان کے چھوٹے چھوٹے گروہ دوسرے شہروں میں بھی بس گئے۔ وطن کی یہ تبدیلی اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار، سلانیک کے خالص یہودیانہ ماحول سے قطع تعلق، غیر مذہبی ترکی قومیت کے مکتب فکر کے اثرات، ان سب عناصر نے مل کر دونمہ کی نئی پود میں باہمی لاتعلقی اور بے اعتنائی کے روز افزوں رجحان میں اور بھی اضافہ کر دیا، تاہم اس کا جماعتی وجود، بالخصوص سماجی بہبود کے میدان میں برقرار رہا۔ استانبول میں کئی ہزار دونمہ کی آمد کے باعث ۱۹۲۴-۱۹۲۵ء میں ترکی اخبارات میں قومی ادغام کے مقابلے میں فرقہ وارانہ علحدگی کے موضوع پر گرما گرم بحثیں ہونے لگیں۔ اب ان میں مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے اور مشکلات کے باوجود وہ جدید ترک معاشرے میں جذب ہوتے جا رہے ہیں۔

مآخذ: (۱) تاریخ یہود پر H. Graetz، S. Dubnow اور S. W. Baron کی عمومی تصنیفات میں دونمہ کے حالات بھی ملیں گے؛ (۲) یہودی تصوف پر G. Scholem کی قابل قدر تحقیقات کا خلاصہ *The Jewish People*، ج ۱، نیو یارک ۱۹۴۸ء، میں شامل ایک خاکے میں ملتا ہے؛ نیز (۳) وہی مصنف: *Main Trends in Jewish Mysticism*، نیو یارک ۱۹۴۶ء، بالخصوص ص ۲۸۷ ببعد؛ (۴) وہی مصنف: *Shabbetai Sebi* (عبرانی)، ۲ جلد، تل ابیب ۱۹۵۷ء؛ (۵) وہی مصنف: مقالات، در *Zion*، ج ۶ و *Kiryat Sepher*، ج ۱۸ تا ۱۹؛ (۶) وہی مصنف: *Die Kripto-Judische Sekte der Dönme (Sabbatianer) in der Turkei*، در *Numen*، ۷ (۱۹۶۰ء): ۹۳ تا ۱۲۲؛ (۷) *Encyclopaedia Hebraica*، ج ۱۱ (۱۹۵۹ء)، بذیل مادہ (از L. Ben. Zvi)؛ و (۸) [illegible]، ۳: ۹۳۶ ببعد؛ (۹) I. Ben Zvi: *The exiled and the redeemed*،

فلاڈلفیا ۱۹۵۷ء؛ (۱۰) A. Danon، در *REJ*، ۱۸۹۷ء؛ (۱۱) Sciaky: *Farewell to Salonica*، نیویارک ۱۹۴۶ء، باب ۹؛ (۱۲) A. Struck، در *Globus*، ۱۹۰۲ء؛ (۱۳) A. Galanté: *Nouveaux documents sur Sabbetai Sevi*، استانبول ۱۹۳۵ء؛ (۱۴) E. E. Ramsaur Jr.: *The Young Turks*، پرنسٹن ۱۹۵۷ء، ص ۹۶ ببعد، ۱۰۸ (حاشیہ)؛ ترکی رد عمل کی جھلک کے لیے دیکھیے (۱۵) A. Govsa: *Sabatay Sevi*، استانبول بدون تاریخ و (۱۶) مقالہ از Gordlevsky، در *Islamica*، ج ۲، ۱۹۲۶ء (۱۷) دونمہ متون M. Attias، I. Ben Zvi، R. Molho اور G. Scholem نے شائع کیے ہیں؛ قب (۱۸) *Sefunot*، ج ۳، بیت المقدس ۱۹۶۰ء۔

(M. PERLMANN)

* **الدَّوانی**: محمد بن اَسعد جلال الدین، ۸۳۰ھ/ ۱۴۲۷ء میں دَوان ضلع کازرون میں پیدا ہوے۔ ان کے والد یہاں کے قاضی تھے جو خلیفہ ابوبکرؓ کی اولاد میں سے تھے، اس لیے الصدیقی کہلاتے تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے تعلیم پائی۔ اس کے بعد شیراز گئے اور وہاں مولانا محی الدین گوشہ کناری اور مولانا ہمام الدین گلباری اور صفی الدین الایجی کی شاگردی کی۔ وہ یوسف بن جہان شاہ قراقویونلو کے زمانے میں صدر کے عہدے پر مامور رہے اور وہاں سے مستعفی ہو کر مدرسۂ بیگم میں مدرس ہوگئے جسے "دارالایتام" بھی کہتے تھے۔ آق قویونلو کے زمانے میں وہ فارس کے قاضی مقرر ہوے۔ جب آق قویونلو کی مملکت کے زوال پر ملک میں افراتفری پھیلی اور شاہ اسمٰعیل صفوی سے لڑائیاں ہوئیں تو الدوانی نے لار اور جُرون میں پناہ لی۔ ابوالفتح بیگ بیاندر نے شیراز پر قبضہ کر لیا تو وہ کازرون کا ارادہ کر کے روانہ ہوے مگر ابوالفتح کی لشکرگاہ میں پہنچنے کے تھوڑے دنوں بعد ۹۰۸ھ/ ۱۵۰۲-۱۵۰۳ء میں وفات پائی اور دوان میں دفن ہوے۔

انہوں نے عربی میں فلسفے اور تصوف کی مشہور کتابوں کی بہت سی شرحیں اور عقائد، تصوف اور فلسفے پر رسائل لکھے۔ اُن کی التفتازانی (م ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء) کی تہذیب المنطق والکلام کی شرح، لکھنؤ ۱۲۶۴، ۱۲۹۳ھ (مع حواشی از میر زاہد) اور رسالۃ الزوراء، جو ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۵ء میں مکمل ہوا (قاہرہ ۱۳۲۶ھ مع تعلیقات) دونوں چھپ چکے ہیں۔ فارسی میں ان کی سب سے زیادہ مقبول عام تصنیف لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق ہے۔ یہ اخلاق جلالی کے نام سے مشہور ہے (طبع سنگی کلکتہ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶-۱۸۶۷ء)۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ W. T. Thompson نے کیا جس کا نام *Practical philosophy of the Muhammedan people* ہے (لنڈن ۱۸۳۹ء)۔

یہ کتاب نصیرالدین طوسی کی اخلاق ناصری کا "بہ طرز جدید" اور "مقبول عام" بیان ہے جسے آق قویونلو بادشاہ اوزون حسن کے حکم سے لکھا گیا اور اسی کے نام مُعنون ہے (فارسی متن، ص ۱)۔ جلال الدین نے اس ممنونیت کا اعتراف بھی کیا ہے (ص ۳۲۱)۔ اخلاق ناصری تین حصوں میں منقسم ہے: علم اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مُدن؛ پہلا حصہ ابوعلی احمد بن یعقوب ابن مسکوَیہ کے عربی رسالہ کتاب طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق سے ماخوذ ہے؛ دوسرا حصہ Bryson سے بواسطہ مقالۂ بوعلی ابن سینا تدبیر المنزل، لیا گیا ہے؛ اور تیسرا الفارابی کی المدینۃ الفاضلۃ اور کتاب السیاسۃ المدنیۃ پر مبنی ہے۔ اخلاق جلالی میں بھی اسی ترتیب کا تتبع کیا گیا ہے۔ جلال الدین نے بھی نصیرالدین طوسی کی طرح بدلائل ایک اعلٰی ملکی قانون، ایک فرمانروا اور ایک سکۂ رائجہ کی ضرورت ثابت کی ہے۔ قانون سے اس کی مراد شریعت ہے اور فرمانروا سے ایسا شخص مراد ہے جو اللہ کی تائید کے ساتھ ممتاز ہو اور اپنے اندر ایسی صفات

رکھتا ہو جن سے وہ لوگوں کی درجۂ کمال تک رہنمائی کرسکے۔ حکومت اگر صالح ہوگی تو اس صورت میں وہ "امامت" ہے، یا غیر صالح ہوگی تو وہ مبنی بہ جبر ہوگی۔ وہ فرمانروا کے انتخاب اور اس کے عزل کی کوئی شرائط پیش نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک ہر عادل سلطان زمین پر ظل اللہ، خلیفۃ اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نائب ہے، بلاشبہہ ان معنوں میں دوانی اپنے سرپرست، اوزون حسن کو "خلیفہ" کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ صالح حکمران دنیا میں توازن قائم رکھتا ہے، جس کی بقا کے لیے انسانوں کے باہمی تعاون کی ضرورت ہے۔ جلال الدین تمدن کی دو قسمیں مانتا ہے: صالح اور غیر صالح۔ جلال الدین، الفارابی اور نصیر الدین طوسی کا تتبع کرتے ہوئے ان کا نام مدینۂ فاضلہ اور مدینۂ غیر فاضلہ رکھتا ہے؛ غیر فاضلہ کی آگے چند قسمیں ٹھیراتا ہے، مدینۂ جاہلہ، مدینۂ فاسقہ (بد معاشرہ شہر) اور مدینۂ ضالّہ (شرانگیز شہر)۔ مدینۂ فاضلہ کے رہنے والوں کے فہم و ذکا کے اعتبار سے کئی درجے ہیں اور ان کے عملی فرائض یا وظائف میں (بھی) تفاوت ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر طبقے کو اس کے مناسب مقام پر قائم رکھا جائے اور ہر فرد کو اسی کام میں لگایا جائے جس کے لیے وہ موزوں ہے اور جس میں وہ مہارت حاصل کرسکتا ہے۔ حکومت صالح یعنی امامت کا کام یہ ہوگا کہ وہ لوگوں کے معاملات کا ایسا انتظام کرے کہ ہر فرد اس قابلیت کی تکمیل کرسکے جو اسے ودیعت کی گئی ہے (۲۶۹)۔ حکومت غیر صالح کا مدار جبر و تعدی پر ہے۔ اس کا کام بندگان خدا کو غلام بنانا اور خدا کی زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔ تمدن میں توازن برقرار رکھنے کے لیے معاشرے کے اندر چار طبقے قائم کرنے چاہییں: (۱) صاحبان علم مثلاً علما، فقہا، قضاۃ، کتّاب، ریاضی اور ہیئت کے ماہرین، اطبا اور شعرا (۲) صاحبان شمشیر؛ (۳) سوداگر، کاریگر اور اہل حرفہ؛ (۴) زراعت پیشہ جن کے بغیر، انسانی زندگی کی بقا ناممکن ہے۔ اس کے آگے بھی وہ نصیر الدین طوسی کا تتبع جاری رکھتے ہوئے اخلاقی سیرت کے لحاظ سے آدمیوں کی پانچ قسمیں بیان کرتا ہے: (۱) وہ لوگ جو فطرۃً نیک ہیں اور جو دوسروں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں، انھیں نصیر الدین زبدۂ خلائق قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ حاکم کو چاہیے کہ ان کی سب سے زیادہ تعظیم و توقیر کرے اور ان کو تمام طبقوں سے افضل جانے۔ جلال الدین ان کی تفصیل اس طرح پیش کرتا ہے کہ یہ لوگ علمائے شریعت، شیوخ طریقت اور اصحاب تصوف ہیں؛ (۲) وہ لوگ جو فطرۃً تو نیک ہیں لیکن دوسروں پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتے؛ (۳) وہ لوگ جو نہ نیک ہیں نہ بد؛ (۴) جو خود بد ہیں لیکن دوسروں پر اثر نہیں ڈالتے؛ (۵) جو خود بھی بد ہیں اور دوسروں پر بھی اپنا بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان ذرائع سے بحث کرتا ہے جو بدی کے دبانے کے لیے اختیار کرنے چاہییں، نیز وہ حاکم کے لیے اپنی رعایا کے معاملات سے شخصی طور پر واقف ہونا ضروری ٹھیراتا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ جس کی بنیاد بھی اخلاق ناصری پر ہے، بہت سے سیاسی مقولات پر مشتمل ہے جو افلاطون اور ارسطاطالیس کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔

جلال الدین کے عرض نامہ کا جو سلطان خلیل کی خاطر اس وقت لکھا گیا جب وہ اپنے والد اوزون حسن کی طرف سے فارس کا والی تھا، انگریزی میں ترجمہ V. Minorsky نے *A civil and Military Review in fars in 881/1476*، در *BSOS*، ۱۰/۱، ۱۴۱-۱۷۸، کر دیا ہے۔

مآخذ: (۱) خواندامیر: حبیب السیر (بمبئی ۱۸۵۷ء)، ۳: ۴، ۱۱۱؛ (۲) حسن روملو: احسن التواریخ (طبع C. N. Seddon، بڑودہ ۱۹۳۱ء)، ۱: ۲۱-۲۲؛ (۳) حاجی مرزا حسن فسائی: فارس نامۂ ناصری، تہران، طبع سنگی،

۱۸۹۴ تا ۱۸۹۶ء، ۲: ۲۵۰؛ (۴) Reiu: Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum، ۳: ۱۰۴۴ ب؛ (۵) براکلمان، ۲: ۲۱۷؛ (۶) Storey، ۱: ۲: ۷۷۴؛ (۷) Browne، ۳: ۴۴۳؛ (۸) E. I. J. Rosenthal: *Political Thought in Medieval Islam*، کیمبرج ۱۹۵۸ء، ص ۲۱۰ تا ۲۲۳؛ ممالک عثمانیہ میں الدوانی کے اثر و رسوخ کی بابت دیکھیے: (۹) S. Mardin: *The Mind of the Turkish Reformer 1700-1900*، در *The Western Humanities Review*، ۱۴، ۱۹۶۰ء، ۴۱۸ ببعد۔

(ANN K S. LAMBTON)

* **دوہ بویونی**: (= دوہ بویون: Deve Boynu)؛ لفظی ترجمہ "اونٹ کی گردن"۔ ترکی میں ایک جغرافیائی اصطلاح جو بعض پہاڑی دروں اور پہاڑ کی چوٹیوں کے لیے استعمال کی جاتی ھے۔ سب سے مشہور پہاڑی درہ جسے دوہ بویونی کہتے ھیں وہ ھے جو ارز روم [رک بان] اور حسن قلعہ کے بیچ میں ھے اور جس نے ارز روم کے بچاؤ میں بڑا حصہ لیا ھے۔ اس میں سے گزرنے والی سڑک طرابزون [رک بان] سے ایران جاتی ھے اور ارز روم سے کرس ریلوے بھی اس میں سے ھو کر گزرتی ھے (دیکھیے F. B. Lynch: *Armenia, Travels and Studies*، ۱۸۹۸ء، لنڈن ۱۹۰۱ء، ۲: ۱۹۴ ببعد؛ E. Nolde: *Reise nach Innerarabien, Kurdistan und Armenien*، ۱۸۹۵ء: ص ۲۶۰ ببعد)۔ دوہ بویونی نام کا ایک اور درہ گول جوک (Göldjük) کے قریب واقع ھے جس میں ھو کر العزیز۔ ارغنی (Elâzix-Ergani) (دیار بکر، [رک بان]) کی سڑک گزرتی ھے (دیکھیے Hommaire de Hell: *Voyages en Turquie*، ۴: ۸۳؛ E. Chaput: *Voyages d'études géologiques et géomorphogéniques en Turquie*، ص ۹۳ ببعد)۔ اس نام کے کچھ درّے اور بھی ھیں عین تاب [رک بان] (Gaziantep) اور بسنی کے درمیان قرہ داغ کے پہاڑوں میں) نیز کچھ گاؤں بھی اسی نام کے ھیں (مثلاً البستان اور گوک سو کے درمیان)۔ اسی طرح کے دوسرے نام یہ ھیں: دوہ گچیدی Deve Geçidi (درہ شتر) جو دیار بکر کے شمال مغرب میں ایک گاؤں اور وادی ھے؛ دوہ چایر Deve Çayiro (چراگاہ شتر) گورون Gürün کے مغرب میں ایک گاؤں؛ دوہ تپسی Deve Tepesi (کوہ اول) بلغر داغی کے پہاڑوں میں ایک چوٹی (دیکھیے T. Kotschy: *Reise in den Kilik Taurus*، ۱۸۵۸ء، ص ۱۰۲)؛ دوہ لی، آباد بستیوں اور پہاڑ کا نام۔ اسی قسم کے نام شام اور عراق میں بھی ملتے ھیں۔ قدیم آشوری زبان میں Gaugamela (آرامی زبان میں گب گمیلا Gab Gamela)، جہاں ایک مشہور لڑائی لڑی گئی، کے معنی ھیں "پشت شتر" (Pauly-Wissowa، ۷: ۸۶۵، بذیل مادہ Gaugamela۔ بحری رئیس Piri Re'is نے دوہ بویونی نام کی تین چوٹیوں کا ذکر کیا ھے، جو آناطولی کے افریقی ساحل پر واقع ھیں (کتاب البحریۃ، ص ۱۳۰، ۱۵۱، ۲۴۰)۔ جدید نقشوں میں اسی نام کی ایک اور چوٹی دکھائی گئی ھے جو دَڈیہ Dadya کے جزیرہ نما کے مغربی کنارے پر واقع ھے، نیز بحیرۂ وان (Lake Van) [رک بان] کے جنوبی ساحل پر بھی دوہ بویونی نام کی ایک چوٹی ھے۔

(BASIN DARKOT)

* **دوہ جی**: ایک ترکی لفظ، جس کے معنی شتربان ھیں۔ یہ نام ینی چری [دیکھیے Yen Čri] کے بعض دستوں کو دیا گیا تھا، جو اس جماعت کا ایک حصہ تھے اور ان کا کام سامان رسد لانے لے جانے والے دستوں کی نگرانی کرنا تھا۔ ان کے لیے لقب کے طور پر فارسی لفظ شتربان بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ شروع میں جماعت کے پہلے پانچ اورتا (Ortas) دوہ جی ھی تھے (D'Ohsson کے مطابق چار)۔ آگے چل کر ان میں اوروں کو بھی شامل کر دیا گیا، وہ اپنی کلغی

میں بگلے کا پر لگایا کرتے تھے (دیکھیے سورگج (Sorguč)۔ یہ لوگ جب دیوان میں حاضر ہوتے تو مخملی وردی پہنتے تھے، جسے سمور اور لنکس کے نرم بالوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ "اورتا" میں دوہ جی افسروں کو بڑی تقدیم کا درجہ حاصل تھا۔ مرسگلی Marsigli کے بیان کے مطابق مرکزی محافظ قلعوں کے افسران اعلی مقرر کرتے وقت ہمیشہ پہلی پانچ اورتا کے سرداروں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ان کا سردار اعلی "باش دوہ جی" رتبے کے لحاظ سے بہت اونچا ہوتا تھا اور ان کا درجہ بابا باشی [رک بآن] کے اوپر اور خاصکی آغا [رک بآن] سے نیچے ہوتا تھا۔

مآخذ: (۱) Marsigli: *L'Etat militaire de l'Empire Ottoman* the Hague ۱۷۳۲ء، ۱: ۷۲؛ (۲) D'Ohsson: *Tableau general de l'empire Ottoman*، ۷، پیرس ۱۸۲۴ء، ۳۳۳؛ (۳) Hammer Purgstall: *Histoire*، ۲: ۲۱۲، ۳۳۶؛ (۴) وہی مصنف: *Staatsverfassung*، ۲: ۲۰۹؛ (۵) احمد جواد: تاریخ عسکری عثمانی، استانبول ۱۲۹۹ھ، ص ۱۲ وغیرہ؛ (۶) I. H. Uzunçarşılı: *Osmanli Devleti teşkilatindan Kapi Kulu Ocaklari*، ج ۱، انقرہ ۱۹۴۳ء؛ (۷) Gibb-Bowen، ۱/۱: ص ۳۲۱ - ۳۲۲ و بمدد اشاریہ؛

(B. Lewis)

* **دوہ لی قرہ حصار:** رک بہ قرہ حصار۔

* **دوی:** (ذوی) رک بہ ذو۔

* **دوین:** اس کا تلفظ دُفِن بھی ہے۔ پہلے ارمینیہ میں ایک اہم شہر تھا اور عربوں کے دور میں دارالحکومت۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب ارمینیہ کے ارساسی یہاں آئے تو یہ نام بھی اپنے پہلی سکونت گاہ سے لیتے آئے جو آج کل ایک ترکمان سپاٹ میدان ہے۔ عرب مصنفین کے ہاں یہ نام دوین یا دُوِین (یاقوت، ۲: ۶۲۳؛ ابن خلکان، مطبوعۂ بولاق، ۱: ۵۰۰) ہے اور دبیل (یاقوت، ۲: ۵۴۸) سب سے زیادہ مستعمل شکل ہے؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نہ یاقوت نے اور نہ ابوالفداء (۲: ۲، ۱۵۰ تا ۱۵۱) نے اور نہ مختصر ابن حوقل کے مصنف نے اس بات کی تحقیق کی کہ دبیل اور دوین ایک ہی شہر کے دو نام ہیں [نیز دیکھیے وآ، لائڈن، بذیل مادۂ Dwin]۔

(M. Canard [تلخیص از ادارہ])

* **دہاس:** شمالی افغانستان میں ایک دریا، جس کی تشریح ابن حوقل (ص ۳۲۹) نے کی ہے: "دہ آس" یعنی جو دس چکیاں چلاتا ہے۔ یہ کوہ بابا (ضلع بامیان) کے پہاڑوں میں بند امیر کے پہاڑی جوہڑ سے نکلتا ہے اور کئی قدرتی جھیلوں میں سے ہوتا ہوا، مدر اور رباط کروان کے پاس سے گزرتا، عام طور پر شمالی جانب بہتا ہوا آخر کار بلخ [رک بآن] کے خطے میں پہنچ جاتا ہے۔ اس علاقے، خاص کر جنوبی حصے، کی سیرابی اور سرسبزی کا اس دریا پر دار و مدار ہے، خصوصاً سیاہ گرد کا، جو ترمذ کے راستے پر ہے، نیز مضافات کی بستی نوبہار کا؛ چونکہ دہاس بلخ کے لیے اہم ہے اس لیے اسے نہر بلخ بھی کہتے تھے (مثلاً حدود العالم، ص ۷۳، ۱۰۲، عدد ۲۳)، مگر قرون وسطی میں یہ آمو دریا [رک بآن] کا بھی ایک نام تھا۔ آج کل اس دریا کو بلخ آب کہتے ہیں۔

مآخذ: (۱) الاصطخری، ص ۲۷۸؛ (۲) Le Strange، ص ۴۲۰؛ (۳) J. Markwart: *Ērānšahr*، ۱۹۰۱ء، ص ۲۳۰؛ (۴) وہی مصنف: *Wehrot*، لائڈن ۱۹۳۸ء، ص ۲ بمدد اشاریہ؛ (۵) W. K. Fraser-Tytler: *Afghanistan*، لنڈن ۱۹۵۳ء، بمدد اشاریہ بذیل مادۂ بلخ؛ (۶) A. Foucher: *De Kaboul a Bactres*، در *La Geographie*، ۳۲ (۱۹۲۳ء)، ۳ تا ۳۱؛ نیز دیکھیے مقالہ بلخ کے مآخذ، خصوصاً: (۱) حدود العالم، ص ۱۰۹؛ (۲) Fraser-Tytler، ص ۱۱۰۔

(B. Spuler [تلخیص از ادارہ])

* **دہر:** زمانہ، خصوصاً غیر متناہی امتداد زمانہ (قب ابن؛ البیضاوی: انوار التنزیل، ۲: ۳۷۶)۔ اسلام سے

رہنے کے عرب، جیسا کہ ان کے بہت سے اشعار سے ظاہر ہے، دہر (نیز زمان اور الایام) کو انسان پر گذرنے والے ہر اچھے اور برے حادثے کا منبع اور سبب قرار دیتے تھے؛ اس طرح گویا وہ اس لفظ کو قسمت یا تقدیر کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے، گو اس کی پرستش نہیں کرتے تھے (W. L. Schrameier: *Über den Fatalismus der vorislamischen Araber*، بون ۱۸۸۱ء؛ Th. Nöldeke: *Encyclopaedia of Religion and Ethics*، ۱: ۶۶۲ ب؛ اس کے مماثل اقوال کے لیے دیکھیے A. Christensen: *Iran*، ۱۹۴۴ء، ص ۱۵۰ ببعد، زروان Zurvān زمان اور تقدیر دونوں کا دیوتا تھا؛ کرونس Kronos، زئیوس Zeus کا باپ؛ نیز دیکھیے R. C. Zaehner: *Zurvan*، آکسفرڈ ۱۹۵۵ء، خصوصاً ص ۲۴۵ تا ۲۶۲)۔ قرآن مجید میں یہ نظریہ کفار کی طرف منسوب کیا گیا ہے: وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵ [الجاثیة]: ۲۴) (= کہتے ہیں، ہماری تو یہی دنیا کی زندگی ہے اور بس کہ یہیں مرتے ہیں اور یہیں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مار دیتا ہے)۔ قبل اسلام کے ان تصورات نے [جہال] کے مسئلۂ قضا و قدر پر اثر ڈالا (W. Montgomery Watt: *Free Will and Predestination in Early Islam*، ۱۹۴۸ء، ص ۲۰ ببعد، ۳۱)۔ حدیث سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ لوگ اللہ اور دہر کو ایک ہی قرار دینے کی کوشش کرتے تھے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایک مرفوع روایت ہے: لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللّٰهُ، يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ .... (= آپؐ نے حکم دیا دہر کو برا نہ کہو، کیونکہ اللہ تعالٰی ہی دہر ہے۔ ابن آدم نے زمانے کو گالی دے کر مجھے ایذا دی کیونکہ جسے وہ زمانے سے منسوب کرتا ہے اس کا خالق تو میں ہوں، تمام چیزیں میرے قبضے میں ہیں) (مثلاً بخاری، باب التفسیر بذیل سورہ ۴۵ [الجاثیہ]: ۲۴؛ کتاب الادب، باب ۱۰۱؛ کتاب التوحید، باب ۳۵؛ الطبری: تفسیر، سورہ ۴۵ [الجاثیة]: ۲۴؛ علاوہ تشریح کے لیے دیکھیے لسان العرب، بذیل مادہ دھر)۔ ظاہریہ [رک بان] کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ دہر کو خدا کے اسماء میں سے ایک اسم قرار دیتے ہیں (لیکن دیکھیے Goldziher: *Die Zâhiriten*، لائپزگ ۱۸۸۴ء، ص ۱۵۳ ببعد)۔ بہت سے محدثین نے التباس سے بچنے کے لیے حدیث کی تشریح اس طرح کی ہے (دیکھیے I. Goldziher: کتاب مذکور، ص ۱۵۵؛ ابن قتیبہ: تاویل مختلف الحدیث، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۲۸۱ تا ۲۸۴)۔ متکلمین نے اس بحث میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ الغزالی نے دہر کو دہریہ [رک بان] کے ان افکار کے لیے استعمال کیا ہے جن کا قبل اسلام کے عرب ماخذ سے کوئی تعلق نہیں (تہافت الفلاسفة، طبع M. Bouyges، بیروت ۱۹۲۷ء، ص ۸۰، ۲۰۱)۔ شاعروں اور نثر نگاروں نے اس لفظ کو اس مفہوم میں استعمال کیا ہے جس طرح زمانۂ قبل اسلام میں یہ استعمال ہوتا تھا (دیکھیے المتنبی، طبع F. Dieterici، برلن ۱۸۶۱ء، ص ۳۲۷، ۵۷۶)۔ ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ الزمان (وقت) اور الایام (دن) الغزالی کو کہیں سے کہیں لے گئے (السبکی: طبقات الشافعیة، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۴: ۱۰۹)۔

(W. MONTGOMERY WATT)

⊛ **الدَّھْر**: (سورة)، اس جلد کے اختتام پر۔

* **دَہْران**: رک بہ ظَہْران۔

* **دہریہ**: دہر سے منسوب، وہ گروہ جو دہر کو قدیم مانتا ہے اور اسی کو حوادث کا باعث جانتا ہے۔ کشاف اصطلاحات الفنون کی رو سے یہ لفظ اسم جمع ہے اور بہیئت مجموعی ایک فرقے کا مظہر ہے۔ یہ لفظ "دہریون" سے الگ ہے جو دہری کی جمع ہے اور دہر سے منسوب ہے جس کے معنی قرآن میں امتداد زمانہ کے لیے آئے ہیں۔ قرآن مجید کے بعض مصاحف میں چھہترویں سورة [الدھر] کا نام سورة "الانسان" بھی آیا ہے، لیکن پینتالیسواں سورة [الجاثیة]: ۲۴ میں اس کا استعمال کافروں،

بے دینوں، گمراہوں اور کور چشموں کے لیے کیا گیا ہے۔ ان مفاہیم نے آگے چل کر اس کے مفہوم کے ارتقائی مدارج پر اثر ڈالا اور بالآخر اس لفظ کا ایک فلسفیانہ مفہوم متعین ہو گیا جو اصلی معنی سے بالکل مختلف ہے۔ یہ بے دین کہتے ہیں: وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ، ۴۵ [الجاثیة] : ۲۴؛ کہتے ہیں: "ہماری تو بس دنیا کی زندگی ہے اور بس کہ یہیں مرتے ہیں اور یہیں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مار دیتا ہے" اس وقت تک اس کا کوئی فلسفیانہ مفہوم مقرر نہیں ہوا تھا؛ البیضاوی اور الجلالین کی تفاسیر کے مطابق دہر سے مرور زمانہ مراد ہے۔ الزمخشری نے ۴۵ [الجاثیة] : ۲۴ کی تفسیر کرتے ہوئے اس سے زمانے کی گزرنے والی مدت (دَهْرٌ يَمُرُّ) مراد لی ہے (الکشاف، ص ۲۴)؛ اور سورۃ ۷۶ [الدہر] : ۱ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس سے زمانے کی طویل مدت کا ایک وقفہ مراد ہے [دیکھیے وهی کتاب، ۴ : ۶۶۵]۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ "زمانے کی ایک طویل مدت" کا مفہوم روز بروز غالب ہوتا چلا گیا اور آخرکار زمانے کی غیر متناہی مدت کو دہر کہنے لگے۔ اس مفہوم نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ بعض مصنفین نے الدّہر کو خدا کا ایک نام قرار دے دیا، اگرچہ اس رجحان کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا (لین، بذیل مادہ دہر؛ نیز دیکھیے کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۴۸۰)۔ رسائل اخوان الصفاء کی طبع جدید ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، جلد سوم، فصل نہم، ص ۴۵۵ میں اس کا تلفظ دُہْرِیّہ لکھا ہے۔ اس خیال کو ماہرین لسانیات کی تائید حاصل ہے اور انھوں نے اسے ان تغیرات کے تحت داخل کیا ہے جو اسمائے نسبت کے حرکات و سکنات میں ہوتے رہتے ہیں (السیبویہ، طبع Derenbourg، ۲ : ۳۶۳، ۱۹ تا ۲۱)۔ الجرجانی: التعریفات نے دہر کی قدامت پر زور دیا ہے (زیر مادہ)، اور دہر کی یہ تعریف کی ہے: "وہ لحظۂ دائمی ہے جو حضرۃ الالہیۃ کا امتداد ہے اور "زمان" کا باطن ہے جس میں ازل اور ابد دونوں متحد ہیں"۔

البیضاوی کی تشریح کے مطابق مادی دنیا کے ساتھ اس کے معنوی تعلق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ دہر بنیادی طور پر وہ عرصۂ زمانی ہے جس میں یہ دنیا گزر رہی ہے اور جو رفتار زمانہ پر غالب ہے، آگے چل کر اس لفظ کو دہریہ کے عقیدے کی تعبیر کے لیے استعمال کیا گیا اور اس کے مطابق غزالی منجملہ اور لوگوں کے "القول بالدہر" (دہر کے قائل ہونے) کا ذکر کرتا ہے (تہافت، طبع Bouyges، ص ۱۹)۔ بعض اوقات اس کا ترجمہ قدری (fatalists) کیا گیا ہے، لیکن یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اس لحاظ سے اسم نسبت یعنی دہری کے دو فلسفیانہ مفہوم ہو سکتے ہیں: اس سے ایک تو وہ شخص مراد ہے جو دنیا کو ماضی اور حال دونوں میں قدیم اور دائمی جانتا ہے اور اس عقیدے کی رو سے قیامت اور آخرت کی زندگی سے انکار کرتا ہے؛ اس کے دوسرے معنی ملحد یعنی اس شخص کے ہیں جو صحیح عقیدے سے انحراف کرتا ہے (لین، بذیل مادۂ دہری)۔ پہلے مفہوم کے لیے دیکھیے Pococke : *Notae miscellaneae* لائپزگ ۱۷۰۵ء، ص ۲۳۹ تا ۲۴۰ بذیل لفظ دہرینی۔ انسانی زندگی کو اس دنیا کے اندر منحصر کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان تیزی سے لذت پسند بن جاتا ہے۔ ادب میں یہ لفظ سب سے پہلے اس مفہوم میں الجاحظ کی کتاب الحیوان (قاہرہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۶ء تا ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۷ء) میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس لفظ کو سورۃ ۴۵ [الجاثیة] : ۲۴ کے زیر اثر ایک وسیع مفہوم کا حامل قرار دیا گیا ہے اور دہری کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔ "دہری وہ شخص ہے جو رب الارباب (اللہ)، خالق، ثواب و عذاب، دین اور قانون سب سے انکار کرتا ہے، اپنی نفسانی خواہشات کے سوا

کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کرتا اور بدی صرف اس چیز میں ہے جو اس کے خواہشات کی تکمیل میں حائل ہو۔ اس کے نزدیک انسان، پالتو جانوروں اور وحشی درندوں میں کوئی فرق نہیں، اور مسئلہ صرف لذت و الم کا ہے؛ خیر اس کے نزدیک صرف وہ چیز ہے جو اس کے مفاد کے حصول میں مدد دے، چاہے اس میں ہزار آدمیوں کی جان بھی چلی جائے (کتاب الحیوان، ۷ : ۵ تا ۶)۔ دہریوں کے ان مسلّمہ اصول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اوہام العوام کو تسلیم نہیں کرتے؛ فرشتوں اور شیطانوں کے وجود کے قائل نہیں؛ خوابوں اور ساحروں کی قوت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے (الجاحظ: کتاب مذکور، ۲ : ۵۰)، لیکن ان میں سے بعض عقلی قیاسات کی بنا پر بہ ظاہر مسخ یعنی آدمی کے جانور کی شکل میں بدل جانے کے قائل معلوم ہوتے ہیں (کتاب مذکور، ۴ : ۲۴)۔

مفاتیح العلوم (طبع Van Vloten، لائڈن ۱۸۹۵ء، ص ۳۵) میں دہریّہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: "وہ لوگ جو زمان کے قدیم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں"۔ رسائل اخوان الصفا میں انہیں ازلیّہ کہا گیا ہے یعنی وہ لوگ جو نظام کونی کے دوام اور اس کی قدامت کے قائل ہیں؛ برخلاف ان لوگوں کے جو اس سارے نظام کائنات کو ایک خالق اور مسبّب کی تخلیق اور نتیجہ سمجھتے ہیں (مطبوعۂ بمبئی ۱۳۰۶ھ، ۴ : ۹۲، مطبوعۂ بیروت، ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، ۳ : ۴۰۵)۔ اس لحاظ سے متکلمین ان کے خلاف ہیں۔ وہ عالم اجسام کے حدوث کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ نے اجسام اور عالم اجسام کو پیدا کیا۔ اس عقیدے میں وہ اللہ کے لیے اسماے صفات کا اضافہ بھی کرتے ہیں اور قدیم اور قوت والا صرف اللہ ہی کو مانتے ہیں (کتاب مذکور، مطبوعۂ بمبئی، ص ۹۳ تا ۹۴؛ مطبوعۂ بیروت، ص ۴۵۶)۔

ابومنصور عبدالقاہر بن طاہر البغدادی اپنی کتاب الفَرق بین الفِرق میں دہریّہ کا شمار فرقوں میں نہیں کرتا، لیکن منکرین خدا کے زمرے میں بار بار ان کا ذکر کرتا ہے۔ خصوصاً ان فلسفیوں کے ساتھ جو افلاک و نجوم کو ایسا پانچواں طبیعہ قرار دیتے تھے جو فساد و ہلاک سے محفوظ ہے اور قدم عالم کا قائل تھا (طبع بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء، ص ۲۰۲، ۱۰۶)۔ وہ انہیں عیسائیوں کا مماثل بھی قرار دیتا ہے، لیکن اس کی وجہ بیان نہیں کرتا (ص ۱۵۷)۔

الغزالی بھی دہریّہ کو فلسفیوں کا ایک گروہ بتاتا ہے جنہوں نے صدیوں تک خیالات کی ایک نوع کو پھیلایا، جس سے متاثر ہونے والے کسی نہ کسی تعداد میں ہر زمانے میں ملتے ہیں۔ وہ ان کے متعلق ہمیشہ ایک سے خیالات ظاہر نہیں کرتا۔ المنقذ من الضّلال (باب ۴، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ص ۹۶ تا ۹۷) میں وہ انہیں سلسلۂ واقعات کی ترتیب میں صنف اوّل میں رکھتا ہے۔ اس وقت وہ قدیم فلسفیوں کا ایک گروہ (طائفہ) تھے۔ ایک ایسے خالق کے وجود سے منکر تھے جو دنیا کا نظام چلاتا ہے؛ وہ عالم آخرت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ ان کا دعوٰی تھا کہ عالم ہمیشہ سے ایسا ہی ہے جیسا آج نظر آتا ہے اور وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ وہ انہیں زنادقہ کے مماثل قرار دیتا ہے، جن میں ایک اور گروہ بھی شامل ہے جو تعداد میں ان سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ گروہ "طَبیعیُّون" (naturalits) کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دہریّہ قدم عالم کو اپنے عقائد کی بنیاد ٹھیراتے ہیں اور طبیعیون مزاجوں کے خواص پر زور دیتے ہیں؛ اور گو وہ تخلیق عالم سے تو انکار نہیں کرتے، لیکن جنت، دوزخ، قیامت اور حساب اعمال کے قائل نہیں۔ ان دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی تھا جنھیں "اِلٰہیُّون" کہتے تھے، جو ان کے بعد ظاہر ہوا اور اس میں سقراط، افلاطون اور ارسطاطالیس شامل تھے۔ ان لوگوں نے پہلے دو گروہوں کے غلط عقائد کی تردید کی، لیکن اسلامی فلسفیوں مثلاً ابن سینا اور الفارابی نے ہمیشہ ان کے خیالات کا اتباع نہیں کیا۔

الغزالی نے تہافت الفلاسفۃ میں انھیں دونوں کا ذکر کیا ہے (طبع Bouyges، بیروت ۱۹۲۷ء، ص ۹)، اور انھیں کے حوالے دے کر فلاسفہ کے بیان میں تضاد و تنافر ثابت کیا ہے (M. Bouyges نے اپنے ترجمے میں اس تخریب کے بجائے تضاد اور تنافر ہی کہا ہے اور دکھایا ہے کہ ان کے مخالف ان کے مقابلے میں قاصر اور عاجز ہیں)۔ ان دونوں مسلمان فلسفیوں نے ان لوگوں سے مقابلہ کیا، جو اللہ کے وجود سے منکر تھے، لیکن ان نظریات سے محفوظ نہیں رہ سکے جن کی بنا پر غزالی کی رائے میں انھیں دُہریہ میں شامل کیا جانا ضروری ہے۔ دُہریہ کی طرف ذیل کے نظریات منسوب کیے گئے ہیں: وہ کسی ایسے سبب سے منکر ہیں جو مسبب الاسباب بھی ہو (ص ۶۵، سطر ۳ تا ۴)؛ عالم قدیم ہے اس کا کوئی سبب ہے نہ خالق؛ سبب فقط حوادث جدیدہ کا ہوتا ہے (ص ۱۳۳، سطر ۶ اور ص ۲۰۶، سطر ۵)۔ عالم میں فلاسفہ کے صرف دو گروہ ہیں، تین نہیں۔ اول اہل الحق؛ دوم دُہریہ (ص ۱۳۳، سطر ۶)۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ فلسفی ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عالم قدیم ہے، لیکن وہ ایک صانع کا کارنامہ ہے۔ الغزالی کے نزدیک اس بات میں بدیہی تضاد ہے (ص ۱۳۳، سطر ۹ ببعد)۔ ابن سینا نے اس بحث کو بار بار چھیڑا ہے اور اسے اپنے استدلال کی قوت پر یقین ہے۔ الغزالی اس استدلال سے مطمئن نہیں۔ وہ فلاسفہ اور دُہریہ کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہیں (ص ۵۹، سطر ۲)۔ وہ اس استدلال کو مبہم قرار دیتے ہیں جس سے فقط یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ اللہ خالق عالم ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس نے پہلے سے عالم کی تخلیق کا کوئی منصوبہ تیار نہ کیا ہو، بلکہ عالم بطور ایجاب اس سے صادر ہوا ہے۔ کم و بیش یہی نظریہ ہے جس کا ابن سینا قائل تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اللہ نے عالم کو کسی پہلے سے تیار کیے ہوے منصوبے کے مطابق پیدا کیا تو اس کا فعل ایک خارجی عامل کا محتاج ہوا اور یہ بات قابل تسلیم نہیں۔ الغزالی نے اس نظریے کو بھی ناقص قرار دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ واحد سے فقط ایک ہی چیز صادر ہو سکتی ہے (ص ۹۵ تا ۱۳۲)؛ اور یہ کہ مادہ قدیم ہے جس میں چار عناصر ایک طرف ہیں اور دوسری طرف ایک پانچواں عنصر ہے جو غیرفانی ہے اور جس سے ملکوتی عناصر بنے ہیں۔ یہی تمام اسباب اس کے متقاضی ہیں کہ ان نظریات پر اعتقاد رکھنے والوں کو دُہریہ کہا جائے (ص ۲۰۶، سطر ۵ ببعد)۔ ابن رشد نے تہافت التہافت (طبع Bouyges، ۱۹۳۰ء) میں الغزالی کا سا سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ ان لوگوں کو جو فقط الغزالی کے نظریات کی بنا پر دُہریہ ٹھیراتے ہیں دُہریہ نہیں کہتا (ص ۳۱۳، ص ۵)۔ وہ دَہر کے لفظ کو فقط اس کے اصلی معنی یعنی "زمان کی ایک مدّت" کے مفہوم میں استعمال نہیں کرتا بلکہ ان مسائل کے معنی میں بھی جو فلسفے کے مشہور معتقدات ہیں اور غلطی سے مسلمان حکما کی طرف بھی منسوب کر دیے گئے ہیں (ص ۳۱۵)۔

ابن حزم اور الشہرستانی نے اس لفظ کی جو تعریف کی ہے اس کی رُو سے دُہریہ محض ایک فرقہ ہے۔ ابن حزم قدم عالم کو دُہریہ کا عقیدہ بتاتا ہے جس سے لازم آتا ہے کہ عالم پر کوئی حکمران نہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسرے تمام فرقوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عالم حادث اور مخلوق (مُحدَث) ہے (کتاب الفصل، قاہرہ ۱۳۱۷ھ، ۱ : ۹)۔ ابن حزم دُہریہ کی ان پانچ دلیلوں کا ذکر کرتا ہے جن کی رو سے دُہریہ کو "القائلون بالدھر" کہتے ہیں (ص ۱۱، س ۹)۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے: (۱) ہم کسی چیز کو حادث اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب وہ کسی چیز سے نکلے یا اس کے اندر پیدا ہو (ہم نے ایسی چیز کوئی نہیں دیکھی جس کی بابت کہا جائے کہ وہ حادث ہوئی جب تک کہ وہ کسی چیز سے یا کسی چیز کے اندر پیدا

نہ ہو)؛ (۲) اجسام کی پیدا کرنے والی چیزیں (مُحْدِث اجسام) جواہر ہیں یا اعراض؛ (۳) اگر کوئی چیز اجسام کی مُحدث ہے تو بالکل اجسام جیسی ہوگی یا اس سے بالکل مختلف؛ بالکل مختلف ہوتا تو باطل ہے اس لیے کہ کوئی چیز ایسی شے پیدا نہیں کر سکتی جو اس کی ضد یا مخالف ہو؛ مثلاً آگ کبھی ٹھنڈک پیدا نہیں کر سکتی؛ (۴) اگر عالم کا کوئی بنانے والا (فاعل) ہوگا تو وہ اس کے بنانے میں یا تو اپنا کچھ نفع سوچے گا یا نقصان کی کمی پوری کرے گا، اور یہ اسی طرح کا کام ہوگا جیسے اس دنیا کی مخلوق کرتی ہے یا وہ صرف اسے اپنی طبیعت کے تقاضے سے بنائے گا اور اس وقت اس کا کام قدیم اور دائمی ہوگا؛ (۵) اگر اجسام حادث ہوں تو ان کا مُحدث ان کے بنانے سے پہلے ان کے معدوم کرنے کے لیے عدم بنائے گا، پھر عدم خود جوہر ہوگا یا عرض، اور اس سے جوہر اور عرض کا قدیم ہونا لازم آتا ہے (ص ۱۰-۱۱)۔ ان دلائل کو ترتیب وار رد کرنے کے بعد ابن حزم اپنے پانچ دلائل، جو ان کے معارض ہیں، پیش کرتا ہے اور پھر اس بحث کو اس کے آگے کے باب میں جاری رکھتا ہے جو تمام کی تمام ان لوگوں سے بحث کے لیے وقف ہے جو عالم کو قدیم کہنے کے باوجود اس کا ایک قدیم خالق بھی مانتے ہیں۔

الشہرستانی اپنی کتاب الملل والنحل کا دوسرا باب، جس میں فلاسفہ کے گروہوں کا بیان ہے، ان لوگوں کے بیان سے شروع کرتا ہے جو اس عالم محسوسات کے علاوہ کسی اور عالم کو نہیں مانتے۔ یہ گروہ "الطبیعیون و الدہریون" یعنی ان لوگوں کا ہے جو طبیعة (نیچر) کے قائل ہیں اور دہر پر اعتقاد رکھتے ہیں اور کسی عالم معقول کو ثابت شدہ نہیں مانتے: "لایثبتون معقولاً"۔ یہ آخری لفظ مفرد ہے (طبع Cureton، ص ۲۰۱، س ۷)۔ ایک اور جگہ کی عبارت . . . "کبھی کبھی دوسری جانب وہ معقول کو بھی تسلیم کرتے ہیں (طبع Cureton، ص ۲۰۲، س ۱۵)"۔ غالباً ان (طبیعیون) سے تعلق نہیں رکھتی جو دہر کے قائل ہیں، بلکہ یہ "فلاسفۂ دہریوں" سے متعلق ہے، جن سے غالباً ابن سینا اور فارابی مراد ہیں جنھیں وہ طبیعیون کا ضد مقابل قرار دیتا ہے۔ یہ بات ان فلسفیوں کے حال کے عین مطابق ہے، کیونکہ وہ خود اس بات کو پرزور دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ ایک عالم معقول موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دہریوں کو جو بعض مسائل میں طبیعیوں سے متفق ہیں اور بعض میں فلسفیوں کے ساتھ اتحاد رکھتے ہیں، پوری طرح دونوں میں سے کسی کے ساتھ شامل نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ عبارت بہر حال مبہم ہے۔ کتاب نہایة الاقدام (طبع Guillaume، آکسفرڈ ۱۹۳۴ء، مع جزئی ترجمہ کے) میں الشہرستانی دہریوں (ترجمے میں مادیوں) اور ان کے مخالفوں کے درمیان چند مباحثوں کا حال بیان کرتا ہے (ص ۲۹، س ۱۱، ۳۰ س ۱۵، ۱۲۳ ص ۱۰، ۱۲۶، س ۹)۔ مباحثوں کا موضوع عالم کا آغاز ہے، اس میں جواہر فرد کا نظریہ بھی شامل ہے جو ابتدا میں غیر منظم حالت میں ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے، دہریوں کا طرز استدلال سوفسطائیوں کا سا ہے، لیکن ان کے مخالف بھی جو زحل کی حرکت کے قائل ہیں کوئی دلیل پیش نہیں کرتے۔ جمال الدین القزوینی اپنی کتاب مُفید العلوم و مُبید الہموم، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ص ۳۷ میں اس رائے کو بھی دہریوں کی طرف منسوب کرتا ہے کہ عالم کی ابتدا ذرات جوہری کے اتفاقی تصادم سے ہوئی ہے جو اس سے پہلے فضا میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے۔

انیسویں صدی میں آ کر اس لفظ کی صحیح تعریف کی گئی جو ایک مدّتِ دراز سے غیر معیّن اور غیر محدود معنی میں استعمال ہوتا رہا تھا۔ یورپ کے علوم طبیعیہ کو جب مشرق میں دخل حاصل ہوا تو ان سے نہایت سادہ لیکن مادّی خیالات کا ایک چشمہ

بھوٹا جو علماے اسلام کے لیے غیر متوقع مسائل کا منبع بن گیا (۱۷۹۸ء ایک عثمانی فرمان میں انقلاب فرانس کے دہری نظریے کو رد کیا گیا ہے اس کے لیے دیکھیے امیر حیدر احمد شہاب: تاریخ احمد باشا الجزار، طبع شبلی اور خلیفہ، بیروت ۱۹۵۵ء، ص ۱۲۵ ببعد؛ قب B. Lewis، در Journ. World Hist.، ۱۹۵۳ء، ۱: ۱۲۱ تا ۱۲۲)۔ مادیت کا مسئلہ ہندوستان میں بڑے شدید انداز میں اٹھایا گیا۔ ۱۸۵۷ تا ۱۸۵۸ء کی جنگ آزادی کے بعد سید احمد خان نے اندازہ لگا لیا کہ مسلمان اس وقت تک برطانیہ کے تفوق کا مقابلہ نہیں کر سکتے جب تک مغربی سائنس اور نظام عدل کو نہ اپنائیں۔ ۱۸۷۵ء میں انھوں نے علی گڑھ [رک بآں] میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی بنا۔ اس کالج میں انگریزی تہذیب اور اسلامی دینیات کو مطالعے کا مشترک موضوع بنا دیا گیا۔ ضمیر اور نیچر کے تصورات کا گہرا اثر قبول کرکے سرسید نے اصول طبیعیہ کو دینی اقدار کا معیار قرار دے دیا۔ علما نے اس نظریے کی سخت مخالفت کی اور اس کے رد میں کتابیں لکھیں۔

۱۲۹۸ھ/۱۸۷۸ء ہی میں جمال الدین الافغانی [رک بآں] نے فارسی میں اس کا ایک سخت رد لکھوا اور اسے بطور ضمیمہ اپنی کتاب الرد علی الدہریین (*Refutation of the materialists*) میں شائع کیا؛ اس کا ترجمہ اردو میں ۱۸۸۳ء میں کلکتے میں چھپا۔ عربی میں اس کا ترجمہ محمد عبدہٗ نے کیا جو پہلے پہل رسالۃ فی إبطال مذهب الدہریین و بیان مفاسدهم و إثبات ان الدین اساس المدنیة و الکفر فساد العمران، کے نام سے شائع ہوا (بار اول، بیروت ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء)؛ اس کے بعد (بار دوم، قاہرہ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء اور بار سوم، قاہرہ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) الرد علی الدہریین کے عنوان سے چھپا (فرانسیسی ترجمہ A. M. Goichon، پیرس ۱۹۴۲ء)؛ اصل نسخے میں اس کے نام میں انشا النیشریین [نیچری] شامل تھا، جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک دہری کے معنی کیا تھے اور اس لیے اس کا ترجمہ "نیچری مادہ پرست" کیا گیا۔ اس مختصر سی تصنیف میں جمال الدین اس نظریے کا سلسلہ یونانی فلاسفہ تک پہنچاتے ہیں اور وہ اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جن سے الغزالی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ وہ پہلے اس کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور اپنے بیان کو ڈاروِن پر ختم کرتے ہیں، مگر ان کے رد کا انداز شروع سے آخر تک مناظرانہ ہے۔

ایک طرف تو مادیت پھیلتی چلی جا رہی تھی، خصوصاً یورپ کی کتابوں کے عربی ترجموں کے ذریعے مثلاً Büchner کی کتاب *Kraft und Stoff* جس کا ترجمہ شبلی شمیل (اسکندریہ ۱۸۸۴ء) نے کیا اور دوسری طرف اس کے خلاف ایک تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ ان دو متخالف تصورات کی تاریخ نزاع ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کے لیے بہت زیادہ جستجو اور تحقیق ضروری ہے، لیکن اس کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان مختلف تصانیف میں جن کا ذکر اوپر ہوا مادیۃ اور مادیون کے الفاظ ہمیشہ دہریہ اور دہریون کے معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ انجام کار دہریہ اور دہریوں کے الفاظ ختم ہو گئے اور ان کی جگہ زیادہ صحیح الفاظ نے لے لی۔ مصر میں جو الفاظ استعمال ہو رہے ہیں ان میں یہ الفاظ نظر نہیں آتے، (یہ اطلاع R. P. Jomier نے بہم پہنچائی ہے)۔ دوسرے ممالک کے متعلق ہماری معلومات مکمل نہیں ہیں، لیکن ہم برصغیر پاک و ہند کے متعلق ضرور یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کی تصانیف میں [یہ الفاظ اب زیادہ استعمال نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو قدرے غیر معین مفہوم میں]۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہوے، ان کے علاوہ دیکھیے: (۱) W. L. Schrameier: *Über den Fatalismus der vorislamischen Araber*، بون ۱۸۸۱ء، ص ۱۲ 6

۲۲؛ (۲) M. Horten : *Die philosophischen Systeme der spekulativen Theologen im Islam*، بون ۱۹۱۲ء، اشاریه بذیل مادّه؛ (۳) الزمخشری : الکشّاف ۳ : ۲۹۱، ۱۳۶۵ھ بیروت بلا تاریخ].

(I. GOLDZIHER - [A. M. GOICHON])

* **دہستان** : شمال مشرقی ایران میں دو اضلاع اور ان سے متعلق شہروں کا نام۔

(۱) ہرات کے شمال مشرق میں ایک شہر، خطۂ باد غیس [رک باں] کے جنوبی حصّے کا دارالحکومت اور اس علاقے کا دوسرا بڑا شہر (رقبے میں بوشنج کے نصف کے برابر)؛ بقول یاقوت (۱ : ۳۶۱)، ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء کے قریب سارے بادغیس کا دارالحکومت، یہ شہر ایک زرخیز علاقے میں چاندی کی ایک کان کے قریب پہاڑی پر واقع تھا؛ شہر ۹۸ھ/۷۱۶-۷۱۷ء میں پختہ اینٹوں سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کا ذکر ایک ایرانی "دہقان" کے دارالحکومت کے طور پر بھی آتا ہے (طبری، ۲ : ۱۳۲۰)۔ ۴۲۶ھ/۱۰۳۵ء کے نواح میں یہ شہر سلجوقیوں کی وساطت سے (جنہوں نے غزنویوں سے لیا تھا) ایک ترکی "دہقان" کے قبضے میں آ گیا (ایسے لقب ترکوں میں بھی رائج تھے)۔ ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں، وہ اغز سلطان اختیار الدین اَیتَق کی قیام گاہ بن گیا، جس نے اس ضلع کے واحد حکمران کی حیثیت سے خوارزم شاہ ثانی ارسلان کی اطاعت اختیار کر لی تھی (بیہقی : تاریخ بیہق)۔ پھر جب خوارزم شاہ سلطان شاہ کے بجائے اس کا بھائی تِکِش اس کا جانشین ہوا اور سلطان شاہ ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں اپنی ماں تِرکِن (اسلامی نام : تُرکان) کے ساتھ راہ فرار اختیار کر کے آیا تو تِکِش نے دہستان کا شہر بھی اپنے قبضے میں لے لیا اور ترکان کو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سلطان شاہ البتہ اور آگے بڑھ کر غوریوں کے ہاں پناہ گزین ہوا (ابن الأثیر، ۹ : ۲۴۷/۲۵۳)۔ معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد دہستان میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ غالبًا وہی شہر ہے جہاں اب خواجہ دہستان کا مزار واقع ہے۔

مآخذ : (۱) اصطخری، ص ۲۶۸ و بعد؛ (۲) ابن حوقل، ص ۳۱۹ و بعد؛ (۳) المقدسی، ص ۲۸۵، ۳۰۸، ۳۲۰؛ (۴) حمد اللہ مستوفی : نزہة، ص ۱۵۳، ترجمه (۱۹۱۹ء)، ص ۱۵۱؛ (۵) لسٹرینج Le Strange، ص ۳۷۹ و بعد؛ (۶) مارکوارٹ J. Marquart : *Ērānšahr* . . . . . (۱۹۰۱ء)، ص ۵۰؛ (۷) وہی مصنف J. Markwart : *Wehrot und Arang* (۱۹۳۸ء)، ص ۳۰؛ (۸) بارتولڈ W. Barthold : *Turkestan*، ص ۳۰۸، ۳۲۵، ۳۳۸؛ (۹) Spuler : *Iran*، ص ۲۱۱.

(۲) ایک خطّے کا نام جو باعتبار زراعت بڑا زرخیز اور اترک زیریں [رک بہ اترک] کے شمال میں واقع ہے۔ اس کا جنوبی حصہ اسی دریا سے سیراب ہوتا ہے۔ دارالحکومت آخُور ہے (جُرجان کے شمال میں چار روز کی مسافت پر)، جسے بقول المقدّسی (ص ۳۵۸ بعد)، دہستان بھی کہتے تھے، اور جو اس راستے پر آباد ہوا جو جُرجان سے خوارزم کو گیا تھا۔ اسی نام کا ایک سرحدی قلعه (رباط) بھی تھا، یہاں خوبصورت مسجدیں اور ایک بارونق منڈی تھی (المقدّسی، ص ۳۵۸، نیز مقابله کیجیے، وہی کتاب، ص ۳۱۲، ۳۶۷، ۳۷۲؛ اور نیچے دیکھیے)۔ بارتولڈ W. Barthold کے نزدیک یہ قلعه بارھویں صدی میں سارے علاقے کا دارالحکومت تھا۔ اس بیان کا تعلق یاقوت سے ہے (۱ : ۳۹)۔ اس علاقے کے بارے میں اسلامی معلومات غیر واضح ہیں۔ بقول ابن حوقل (۱ : ۲۷۲، ۲۸۶؛ ۲ : ۳۸۸، ۳۹۸)، اس علاقے کی آبادی چھدری تھی، جہاں صرف بحر خزر کے ماہی گیر ہی آباد تھے، مگر اس کے علی الرغم المقدّسی نے بیان کیا ہے کہ اس علاقے یعنی جُرجان کے گاؤں بہت زیادہ گنجان آباد تھے۔

ایران کے وسطی زمانے کے شہروں کو پیش نظر رکھا جائے تو دہستان کی بنیاد اشکانی بادشاہ

Arsacid Narsahē نے رکھی تھی (مارکوارٹ J. Marquart : *Ērānšahr* [۱۹۰۱ء]، ص ۵۴، ۷۳، ۳۱۰) : لیکن اسلامی عہد میں اسے ساسانی بادشاہ قُباذ بن فیروز (پیروز) سے منسوب کیا گیا ہے (حمد اللہ مستوفی : نزہت القلوب [۱۹۱۵ء]، ص ۱۶۰؛ ترجمہ [۱۹۱۹ء] ص ۱۵۷؛ اشاریہ کا بھی مقابلہ کیجیے)۔ چوتھی/دسویں صدی میں اس کی حیثیت ایک سرحدی علاقے کی تھی ("ترکوں کے خلاف")، اور حمداللہ، ص ۲۱۲ (ترجمہ، ص ۲۱۵) نے تو چودھویں صدی میں بھی اس کا ذکر اسی حیثیت سے کیا ہے لیکن اس زمانے میں اس کا اشارہ ان خانہ بدوش قبائل کی طرف ہو سکتا ہے جو خوارزم اور اُست یُرت کے درمیان آباد تھے، کیونکہ اس وقت تک یہاں بلکہ ماوراء النہر کے مغول میں بھی اشاعت اسلام ہو چکی تھی۔

حدود العالم، مرتبۂ منورسکی V. Minorsky (۱۹۳۷ء)، ص ۶۰، میں جزیرہ‌نما دہستانان سُور (؟) کا ذکر بھی آتا ہے جو مچھیروں اور پرندوں کے شکاریوں سے آباد تھا، اور جسے بارتولڈ W. Barthold نے جدید "راس حسن قلی" (دہانہ، اترک کے شمال میں) قرار دیا ہے۔ لیکن اگر الاصطخری کی معلومات (ص ۲۱۹) صحیح ہیں تو ایسا ہونا ممکن نہیں۔ وہ کہتا ہے دریاے جرجان کے دہانے اور اس جزیرہ نما کے درمیان ۵۰ فرسنگ کا فاصلہ ہے؛ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلیج قزل صو (روسی : Krasnovodsk) تک پھیلا ہوا تھا۔

منورسکی V. Minorsky نے (حدود، ص ۳۸۶) دہستان کا نام قدیم دَہَر (Δαι) کے نام سے جوڑ دیا ہے (ان کے متعلق، مقابلہ کیجیے W. Tomaschek، در Pauly-Wissowa : *Realencyklopädie*، ۴: ۱۲ [۱۹۰۱ء] کالم ۱۹۴۵/۶ء)۔ آج کل رباط دہستان کے آثار کو (جن کا اندازہ تیرھویں صدی کے اوائل کی ایک مسجد کے کتبے سے کیا جا سکتا ہے) مشہد مصریان [رک باں] سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مآخذ: متن میں حوالوں کے علاوہ: (۱) تاریخ بیہقی، تہران ۱۹۳۶ء؛ (۲) سمعانی: کتاب الانساب، ۱۹۲۲ء (GMS، جلد ۲۰)، ورق ۲۳۴ ب (صحیح تلفظ دیتی ہے)؛ (۳) تکّبی (در نرشخی، طبع Ch. Schefer)، ص ۲۲؛ (۴) Gg. Hoffmann : *Syr. Akten pers. Märtyrer*، (۱۸۸۰ء) ص ۲۷۷ تا ۲۸۱؛ (۵) بارتولڈ W. Barthold : *K istorii orosheniya Turkestana* (ترکستان کی تاریخ آبپاشی)، (۱۹۱۴ء) ص ۲۱ تا ۲۷؛ (۶) لسٹرینج Le Strange، ص ۳۲۷ تا ۳۸۲؛ (۷) Spuler : *Iran*، ص ۳۲۰، ۳۵۵، ۳۶۴؛ (۸) حدود العالم، بمدد اشاریہ۔

(B. Spuler)

* **دِہْشُور** : رَکّ بہ دَہْشُور؛ صحیح املا دِہْشُور ہی ہے۔

* **دِہْقان**، دِہْکان، دِہکان، دِہْگان، کی معرب شکل؛ [نیز دیہقان] گاؤں کا چودھری اور ایران کے ساسانی عہد میں کمتر درجے کے جاگیردار طبقۂ امرا کا ایک رکن۔ "دہقانوں" کا اختیار، جو ان کے موروثی خطاب کے باعث انھیں حاصل تھا، مقامی عملداری تک محدود تھا۔ اس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی، گو زمین کا اصل رقبہ، جس کی کاشت وہ خاندان کی موروثی ملکیت کے طور پر کرتے تھے، بالعموم چھوٹا ہوتا تھا۔ وہ حکومت کے نمائندے ہوتے تھے، ان کا سب سے اہم فریضہ محاصل کی وصولی تھا؛ Christensen کی رائے میں وہ چونکہ ملک اور اہل ملک کے حالات سے بخوبی واقف ہوتے تھے، لہٰذا دربار کی شان و شوکت اور جنگوں کے بڑے بڑے مصارف کے لیے انھیں کافی مالیانہ بہم پہنچایا جاتا تھا (*L'Iran sous les Sassanides*، طبع ثانی، کوپن ہیگن ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۲ تا ۱۱۳)۔ مسعودی "دہقانوں" کو پانچ طبقوں میں تقسیم کرتا ہے، جو اپنے لباس کے ذریعے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے تھے (مسعودی، ۲: ۲۴۱) اور ایرانی روایات کی رو سے ان کا نسب اساطیری بادشاہ ہوشنگ کے بھائی ویکرد

تک پہنچتا ہے (Christesen : Le premier homme et le peremier roi dans L' histoire Légendaire des iraniens، ۱ : ۱۴۳، ۱۵۰-۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۵۹) - عربوں کی فتح کے بعد "دہقان" بدستور مقامی عملداری اور ذمیوں سے جزیے کی وصولی کے ذمے دار رہے؛ ان میں سے بیشتر مشرف بہ اسلام ہوگئے اور ان کی زمینیں زیادہ تر انہیں کے پاس رہیں (فان کریمر Van Kremer : Culturgeschichte، ۲ : ۱۹۰) - ماوراء النہر میں جہاں عربوں کے حملے سے کچھ ہی پہلے "دہقانوں" کا اثر و نفوذ اس سے کہیں زیادہ تھا، جتنا کہ ایران میں، اس لیے کہ ان کے اختیارات ابھی بادشاہت اور زرتشتی موبدوں کی وجہ سے محدود نہیں ہوئے تھے، مقامی حکمران اور زمیندار دونوں کے لیے "دھقان" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی (بارتولڈ : Turkestan، ۱۸۰-۱۸۱؛ اور دیکھیے نرشخی : تاریخ بخارا، طبع مدرس رضوی، ۲۷) - طاہریہ اور سامانیہ کا اقتدار بھی زیادہ تر اس لیے قائم ہوا کہ ان کا اور دھقانوں کا مفاد باہم مشترک تھا؛ باایں ہمہ سامانی عہد کے اختتام کے قریب "دہقان" غیر مطمئن ہو چکے تھے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بغداد کے ہارون بن موسیٰ ایلک خان کے ہاتھوں سامانی خاندان کے بالآخر زوال کی ذمے داری جزواً ان پر بھی عائد ہوتی ہے (بارتولڈ، ۲۵۷، ۳۰۷) - پانچویں/گیارھویں صدی میں جب نظام "اقطاع" ہر طرف پھیل گیا اور زمینداروں کے طبقوں کا زور گھٹنے لگا تو "دہقانوں" کی حیثیت اور اثر و نفوذ بھی کم ہوتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نام کا وقار بھی جاتا رہا حتٰی کہ پانچویں/گیارھویں صدی میں اس کے معنی کاشتکار کے ہوگئے جیسا کہ ناصر خسرو (دیوان، تہران ۱۳۰۴-۱۳۰۷ ہجری شمسی، ۵۵۷) اور کاؤس بن اسکندر (قابوس نامہ، G.M.S.، ۱۳۸) نے اسے استعمال کیا ہے - برعکس اس کے، سلطنت کے مشرقی حصے میں سلجوقیوں کے ماتحت "دہقانوں" کا درجہ بطور گاؤں کے چودھری یا زمیندار کے بدستور قائم رہا - یہ اصطلاح ان معنوں میں اس دستاویز میں بھی ملتی ہے جو سنجر کے دیوان نے شائع کی (عتبۃ الکتبہ، طبع عباس اقبال، تہران ۱۹۵۰ء، ۵۳، ۵۵) علی ھذا خوارزم کے ایک معمار کو حاصل ہونے والی سند میں بھی جس کا زمانہ چھٹی صدی کا آخری نصف ہے، اس کا یہی مفہوم ملے گا - (بہاء الدین محمد مؤید بغدادی : الترسل الی التوسل، طبع بہمن یار، تہران ۱۳۱۵ ہجری شمسی، ۱۱۳، ۱۱۴) - نجم الدین رازی نے بھی اسی طرح "دہقان" کی اصطلاح "مالک زمین" کے معنوں میں استعمال کی ہے (مرصاد العباد، ۱۳۱۲ ھ شمسی، ۲۹۳ ببعد) - نصیر الدین طوسی (اخلاق ناصری، لاہور طبع سنگی، ۱۸۰-۱۸۱) اور جلال الدین دوانی (اخلاق جلالی، طبع سنگی، ۲۷۸)، کے نزدیک البتہ "دہقان" کا مفہوم کسان ہی ہے، جدید فارسی میں بھی اس کے یہی معنی ہیں - ترکستان میں کاشتکاروں کو دہقان ہی کہتے ہیں (RMM، جلد ۱۳، ۱۹۱۱ء، ص ۵۶۸) -

مآخذ : (۱) فردوسی : شاہنامہ (طبع Mohl، جلد ۸ ببعد)؛ (۲) M.C. Inostrantzev : Sasanidskie Etiudi؛ (۳) Quatremère، JA، سلسلہ ۲، ۱۶ : ۵۳۲؛ (۴) P. Horn : Gr. I. Ph.، ۱ : ۲، ۷۸؛ (۵) نولدکہ : Gesch. der Perser، ۴۴۰؛ (۶) Max van Berchem : Propriété territoriale، ۲۵؛ (۷) A. V. Kremer : Culturgeschichtl Streifzüge، ۱۳؛ (۸) Wellhausen : Das arabische reich und sein Sturz، برلن ۱۹۰۲ء؛ (۹) بارتولڈ : Die Rolle der Gebiete des kaspischen Meeres in der Geschichte des muslimanischen Welt، باکو ۱۹۲۴ء، ص ۲۲؛ (۱۰) K. H. Menges : Drei Ozbekische Texte در Isl.، ۲۱ : ۱۷۹؛ (۱۱) F.Lokkegaard : Islamic taxation in the classic period، کوپن ہیگن ۱۹۵۰ء؛ (۱۲) D. C. Dennett : Conversion and the poll tax in early Islam، ہارورڈ ۱۹۵۰ء، ص ۲۲ تا ۲۳، ۲۹ تا ۳۰، ۳۲ تا ۳۳؛ (۱۳) F.W. Cleaves : Daruya

cand Gerege در *Harvard journal of Asiatic Studies*
۱۹۵۳ء، ص ۲۲۷؛ (۱۳) A. K. S. Lambton : *Land‑*
lord and Peasant in Persia، (آوکسفرڈ) .

(ANN K. S. LAMBTON)

* **دہلک** (جزائر): بحیرۂ احمر کے مغربی ساحل کے قریب مُصَوَّع (Eritrea) کے بالمقابل واقع جزیروں کا ایک مجموعہ، جن کا مرکز تقریباً ۴۰ درجے ۱۰ دقیقے مشرق اور ۴۵ درجے ۵ دقیقے شمال میں ہے، تقریباً ان ۱۲۵ جزیروں میں سے، جن میں چھوٹے چھوٹے جزیرے، چٹانیں اور ٹاپو (reefs) شامل ہیں، دو سب سے بڑے جزیرے دَہْلَک الکبیر اور نُورَہ ہیں۔ ان کے علاوہ نوکرہ (Nokra)، دوھول (Dohol)، ھَرَت (Harat)، درکہ (Daraka) اور دِنْفارِخ (Dinifarikh) ہیں۔ یہ سب سپاٹ اور نشیبی ہیں، بحالیکہ ان کے ساحل بہت گہرے کٹے ہوئے ہیں ان میں بارش کم ہونے کی وجہ سے نباتات کی قلت ہے۔ بعض جزائر میں معمولاً یا وقتی طور پر تگری (Tigre) زبان بولنے والے مسلمان آباد ہیں، جن کی مجموعی تعداد پندرہ سو سے ڈھائی ہزار نفوس ہے، اور جو سَمْہر کے ساحلی قبائلیوں سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں یہ لوگ حبشی الاصل ہیں جس میں عربوں، دناقلہ صومالیوں اور سوڈانیوں کی آمیزش ہے۔

مآخذ: (۱) C. Conti Rossini : *Storia d'*
Etiopia، میلان ۱۹۲۸ء، ج ۱؛ (۲) Issel : *Viaggionel*
mar Rosso، میلان ۱۸۸۹ء؛ (۳) R. Basset : *Les*
Inscriptions de l'iple de Dahlak، در *J.A.*، پیرس
۱۸۹۳ء؛ (۴) A. Pollera : *Le Popolazioni indigene*
dell' Eritrea، بولوگنا ۱۹۳۵ء؛ (۵) G. Wiet : *Roitelets*
de Dahlak، در *RIE*، ۱۹۵۲ء، ص ۸۹ تا ۹۵ - [نیز
دیکھیے وو لائڈن بار دوم - بذیل مقالہ]

(S.H. LONGRIGG [تلخیص از ادارہ])

* **الدہلوی، نورالحق**: رک بہ نورالحق الدہلوی.

* **دہلی**: (۱) تاریخ: دہلی کا شہر دریاے جمنا [رک باں] کے مغربی کنارے پر واقع ہے اور آج کل ۲۸ درجے ۳۰ ثانیے اور ۲۸ درجے ۴۴ ثانیے طول بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۵ ثانیے اور ۷۷ درجے ۱۵ ثانیے عرض بلد مشرق کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ یہ ۶۰۸ھ/ ۱۲۱۱ء سے ہندوستان کے اولین مسلمان فرمانرواؤں کا دارالحکومت تھا اور چند مستثنیات (مثلاً دولت آباد، آگرہ اور لاہور [رک باں] (جنھیں گاھے بگاھے بعض حکمرانوں نے اپنا مرکز بنانا پسند کیا) سے قطع نظر، ۶۰۸ھ/۱۲۱۱ء سے ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر کی معزولی تک شمالی ہندوستان کے شاہی خاندانوں کا پاے تخت رہا؛ ۱۹۱۱ء میں یہ برطانوی ہند کا دارالسلطنت قرار پایا اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے آزاد بھارت کا دارالحکومت ہے۔

اس نام کو رومن حروف میں عام طور پر Delhi لکھتے ہیں، جو مسلمانوں کے ہاں قدیم سے مستعمل شکل "دہلی" پر مبنی ہے؛ اردو، ہندی (یقیناً ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کی تصنیف پرتھی راج راسا کے زمانے سے یقینی طور پر) اور پنجابی میں اس کا عام تلفظ "دِلّی" ہے۔ اس کا اشتقاق مبہم ہے، بعض مشہور و مقبول اشتقاقات کے لیے دیکھیے A. Cunningham، در *ASI*، ۱: ۱۳۷ ببعد۔

"دہلی کے سات شہروں" کا ذکر عوامی روایات میں اکثر ملتا ہے، لیکن دہلی کے علاقے میں مراکز حکومت کی تعداد فی الحقیقت اس سے تقریباً دو چند رہی ہے۔ سطور ذیل میں ان کا حال حتّی الوسع تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

قدیم ترین بستی اِندرپت (سنسکرت: اِندر پرستھ) ایک ٹیلے پر تھی، جہاں اب پرانا قلعہ واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ دیو مالائی دور میں پانڈووں نے تعمیر کیا تھا۔ یقیناً یہ ایک بہت قدیم عمارت ہے، کیونکہ یہاں سے خاکستری رنگ کے روغنی اور شمالی علاقے سے مخصوص سیاہ جلا دار ظروف کے ٹکڑوں

کے علاوہ، جو پانچویں صدی قبل مسیح کی ساخت کا نمونہ ہیں، پہلی اور دوسری صدی عیسوی کے کشان عہد کے ظروف کے ٹھیکرے بھی دستیاب ہوے ہیں (دیکھیے Ancient India، ۱۰ - ۱۱ (۱۹۵۵ء) : ۱۳۰، ۱۴۴) - بعد ازاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر دہلی کے علاقے کو تقریباً ترک کر دیا گیا تھا، کیونکہ اس کے بعد جو بستی ظہور میں آئی اس کا تعلق نویں یا دسویں صدی عیسوی سے ہے - یہ تُمار خاندان کا وہ شہر تھا جسے اب سورج کنڈ کہتے ہیں اور جہاں ابھی تک پختہ چنائی کا ایک بڑا تالاب اور مٹی کا ڈھس موجود ہیں - چوہان راجپوتوں نے جو شہر بسایا، اس کی باقیات نسبۃً زیادہ وسیع ہیں : اس کی آبادی کی تاریخ غالباً دسویں صدی عیسوی ہے اور وہ مسلمانوں کی فتح سے ذرا پہلے موجود تھا - اس علاقے کے جنوب مغرب میں، ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اننگ پال نے ۱۰۵۲ء کے لگ بھگ ایک قلعہ "لال کوٹ" تعمیر کرایا تھا اور پرتھوی راج نے ۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء کے قریب مسلمان حملہ آوروں کے خلاف اپنی مدافعت کے لیے بستی کے گرد ایک اور بیرونی فصیل تیار کرا دی تھی (Cunningham، در ASI، ۱ : ۱۸۳) - فتح کے بعد قطب الدین ایبک نے ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں مسجد "قوت الاسلام" تعمیر کرائی اور بعد ازاں اس کے متصل اس مینار کی تعمیر شروع کی جو نہ صرف مسجد کا "مأذنہ" تھا بلکہ اس کی فتح کی یادگار بھی تھا - ان عمارات اور ان میں شمس الدین اِلتتمش اور علاءالدین خلجی کے حکم سے کی جانے والی توسیعات، نیز اس علاقے کی، جو "قطب" کے نام سے مشہور ہے، دیگر عمارات کے لیے دیکھیے نیچے، بعنوان "یادگار عمارتیں"- ہندوؤں کی قدیم فصیل کی توسیع اور اسے باقاعدہ طور پر از سرنو مستحکم کرنے کا کام یہاں کے ابتدائی مسلمان صوبیداروں اور بادشاہوں کے ہاتھوں انجام پایا اور یوں دہلی کا پہلا مسلم شہر وجود میں آیا، جو اپنے سابقہ حکمران کی نسبت سے قلعۂ رائے پتھورا کے نام سے موسوم ہوا - آثار قدیمہ سے ملنے والی شہادتوں کے بارے میں بحث کے لیے دیکھیے J. D. Beglar، در ASI، ۴ (۱۹۷۴ء) : ۶ ببعد.

قلعۂ رائے پتھورا ہی سلاطین دہلی کی مستقل اقامت گاہ رہا، یہاں تک کہ ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء کے قریب معزالدّین کیقباد نے کیلوکھڑی کے مقام پر جو اس وقت جمنا کے کنارے تھا، اپنا محل بنوایا (تاریخ فرشتہ، مترجمۂ Briggs، ۱ : ۲۷۴) - ۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء میں جلال الدّین فیروز خلجی نے اس پر قابض ہو کر اس کی تکمیل کی اور اس کے مضافات کو وسعت دی - اب یہ مقام پورے طور پر ویران ہو چکا ہے - معلوم ہوتا ہے جلال الدّین کے وقت میں بھی پرانا شہر نسبۃً زیادہ قدر و منزلت کا حامل تھا، چنانچہ جونہیں اسے سیاسی طور پر ممکن نظر آیا، اس نے اپنا دربار وہاں منتقل کردیا - سلطان علاء الدّین خلجی نے اس میں بہت کچھ ترمیم کی اور ترقی دی - لال کوٹ کے مغربی دروازے (رنجیت دروازہ) کی تعمیر اسی میں شامل ہے - (امیر خسرو، ترجمہ در Elliott و Dowson، ۳ : ۵۶۱) - اس نے قلعۂ لال کوٹ کی توسیع کا بھی آغاز کیا (دیکھیے Beglar، محل مذکور)- حملہ آور منگولوں سے بچاؤ کے لیے اس نے پہلے شمال میں سیری (یا سیڑی) کے میدان میں ایک فوجی مستقر قائم کیا - بعد ازاں خندقوں سے اس کا احاطہ کر لیا اور بالآخر ۷۰۳ھ/۱۳۰۳ء کے قریب اس کے گرد فصیل بنا دی - سیری کے اصل محل وقوع پر اعتراض کیے گئے ہیں (مثلاً کیمبل C. J. Campbell : *Notes on the history and topography of the ancient cities of Delhi*، در *JASB*، ۳۵ (۱۸۶۶ء) : ۲۰۶ تا ۲۱۴)؛ لیکن ابن بطوطہ (۳ : ۱۴۶، ۱۵۵) اور تیمور (ملفوظات تیموری، ترجمہ در Elliott اور Dowson، ۳ : ۴۴۷) نے اس کا جو حال قلمبند کیا ہے، اس کے پیش نظر، نیز یہاں کے آثار اور

زمین پر دفاعی مورچوں کے نشانات کی مدد سے کننگھم Cunningham (در ASI، ۱ : ۲۰۷ ببعد) نے کیمبل Campbell کے نظریات کی مدلل طور پر تردید کر دی ہے ۔ سیری کی قدیم فصیلوں کے اندر جو کچھ باقی رہ گیا ہے، وہ نسبۃً زمانۂ حال کا گاؤں شاہ پور ہے .

اگرچہ ہم اسے مشکل ہی سے "دہلی کا شہر" قرار دے سکتے ہیں تاہم یہاں کی عمارتیں دہلی کی تاریخ میں ایک اہم مقام کی حامل رہی ہیں ۔ ہماری مراد اس مجموعۂ عمارات سے ہے جس کی قدیم ترین عمارتیں خلجی عہد سے تعلق رکھتی ہیں اور جو سلسلۂ چشتیہ کے مشہور ولی اللہ حضرت نظام الدّین اولیاءؒ کے مقبرے کے گرد پھیلی ہوئی ہیں ۔ ان سب سے مل کر ایسی شکل پیدا ہو گئی ہے جسے Piggott نے "بد زیب مگر دلچسپ گورکھ دھندے" سے تعبیر کیا ہے ۔ سرکاری طور پر اب یہ "[بستی] نظام الدین" کہلاتی ہے (ان عمارات کے نقشے اور حالات کے لیے دیکھیے نیچے بعنوان "یادگار عمارتیں") .

سلاطین دہلی کے دور کی آکثر عظیم الشان عمارتوں کے منصوبے خاندان تغلق کے عہد میں تیار ہوے، جو خلجیوں کے بعد برسر اقتدار آیا تھا ۔ اولاً غیاث الدّین تغلق نے ناصر الدّین [خسرو شاہ] کو، جو ہندو دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا، ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں شکست دینے کے فوراً بعد قلعۂ رائے پتھورا سے تقریباً آٹھ کیلومیٹر مشرق میں اپنا دارالحکومت تغلق آباد بنانے کے لیے جگہ منتخب کی ۔ اس شہر کی قدیم شہر پناہ کے آثار سے پتا چلتا ہے کہ یہ قریب قریب شش پہلو تھی؛ اس بیرونی فصیل کے اندر شاہی محلات کا رقبہ برج و بارہ سے مستحکم تھا اور اس سے بھی زیادہ مستحکم بالا حصار کو بنایا گیا تھا ۔ شہری رقبے میں ایک مسجد کے آثار باقی ہیں، نیز شہر کے بازاروں، گلی کوچوں اور ان کے مکانات کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خوب گنجان آباد تھا ۔ یہ آثار باقیہ Ancient India (ج ۱) کی ایک عکسی تصویر (لوحہ ۹) میں دیکھے جا سکتے ہیں، جو فضا سے لی گئی تھی ۔ شہر کے جنوب میں پہلے ایک مصنوعی جھیل تھی، جس میں غیاث الدّین کا مقبرہ اب تک موجود ہے ۔ قلعے سے مقبرے تک ایک مورچہ بند راستہ محرابوں کے اوپر بنایا گیا تھا اور ان محرابوں میں بھی دفاعی استحکامات موجود تھے ۔ تغلق آباد سے جنوب مشرق میں ایک سنگ بستہ راستہ عادل آباد کے ذیلی قلعے کو تغلق آباد سے ملاتا ہے؛ یہ راستہ دراصل جھیل کا پانی روکنے کے لیے بند کا کام دیتا تھا ۔ عادل آباد، غیاث الدین کے بیٹے محمد بن تغلق نے ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء کے لگ بھگ تعمیر کرایا تھا، لیکن جب اس نے اپنا دارالحکومت دولت آباد [رک بآں] میں منتقل کیا (۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء) تو تغلق آباد کے ساتھ اسے بھی ترک کر دیا (ان مقامات کے لیے دیکھیے Hilary Waddington : *Adilabād : a part of the "fourth" Delhi*، در *Ancient India*، ۱ : ۶۰ تا ۷۶، مع عکسی تصاویر اور پیمائش کے نقشوں کے) ۔ جب تغلق آباد تعمیر ہو رہا تھا تو مشرق میں ایک چھوٹے سے قلعے کو، جسے "حجام" یا "دھولی" کا قلعہ کہتے تھے اور جو اصل میں ممکن ہے کہ کوئی مدرسہ یا درگاہ ہو، مورچہ بند کر دیا گیا تھا اور قیاساً وہ ان دنوں غیاث الدّین کی اقامت گاہ کے طور پر استعمال ہوا.

تقریباً عادل آباد کی تعمیر کے زمانے ہی میں محمد بن تغلق نے جملہ مضافات شہر کے گرد، جو قلعہ رائے پتھورا اور سیری کے درمیان نمودار ہو گئے تھے، فصیل بنانے کا ایک عظیم منصوبہ تیار کیا تھا ۔ اس سے ایک اور شہر وجود میں آیا، جو "جہاں پناہ" کے نام سے موسوم ہوا ۔ اس فصیل کی دیواریں کوئی بارہ میٹر چوڑی تھیں، جو اب بالکل گر چکی ہیں اور ان کے صحیح محل وقوع کا سراغ لگانا آسان نہیں رہا ۔ موضع کھڑکی کے قریب فصیل میں جو نہری پھاٹک

(مت پلا) بنایا گیا تھا اس کے لیے دیکھیے سطور آئندہ، بذیل "یادگار عمارتیں".

ایک اور شہر فیروز آباد کی تعمیر محمد تغلق کے جانشین فیروز تغلق کی مرہون منت ہے۔ یہ شہر اندراپت سے کوشک شکار تک پھیلا ہوا تھا۔ "کوشک شکار" زمانۂ مابعد کے شہر شاہجہان آباد سے تین کیلومیٹر شمال مغرب میں واقع تھی اور اب بڑی حد تک شاہجہان آباد ہی کے اندر آ چکی ہے۔ فیروز آباد کی عمارات کو بعد کے حکمرانوں، خصوصاً شیر شاہ سوری اور شاہجہان نے [نئی عمارتیں بنانے کے لیے] توڑ پھوڑ دیا تھا اور اب فقط اس کا بالا حصار باقی ہے، جسے کوٹلہ فیروز شاہ کہتے ہیں۔ اس کی فصیلوں کو توڑ کر انہیں دفاعی روزنوں تک نیچا کر دیا گیا۔ ان کے اندر اب محل کی عمارات، ایک خوبصورت مسجد کے آثار اور ایک عجیب سا مخروطی چبوترہ نظر آتا ہے، جو اشوک کی اس لاٹھ کی کرسی کا کام دیتا تھا جسے انبالے کے قریب سے یہاں لایا گیا تھا۔ قدم شریف کی الگ تھلگ عمارت اور اس کے قریب عیدگاہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شہر کی مغربی حد زمانۂ مابعد کے شاہجہان آباد سے آگے نہیں گئی تھی۔ دہلی کے اردگرد دور دور تک فیروز شاہ کی بنائی ہوئی عمارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے تک مضافات شہر بخوبی آباد تھے۔ اس کی مزید شہادت جہاں پناہ میں دو بڑی مسجدوں، نظام الدّین میں ایک بڑی مسجد اور شمالی مضافات اور وزیر آباد میں متعدد چھوٹی چھوٹی مسجدوں سے ملتی ہے۔ علاوہ ازیں کچھ تعمیرات علاء الدّین کے تعمیر کردہ تالاب "حوض علائی" (جسے بعد میں اسے "حوض خاص" کہنے لگے) کے گرد بھی وجود میں آئیں۔ یہاں فیروز تغلق نے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا اور اپنا مقبرہ بنوایا.

تیمور کی تباہ کاری کی وجہ سے دہلی کا عظیم شہر کچھ زمانے تک گہن میں رہا، اگرچہ سیّد خاندان کے حاکم خضر خاں نے اپنا دربار خضر آباد میں اور مبارک شاہ نے مبارک آباد میں قائم کیا (یہ دونوں مقامات دریاے جمنا کے کنارے واقع تھے) اور بعدازاں سلطان مبارک شاہ نے اپنا مقبرہ مبارک پور (یا مبارک شاہ کوٹلہ) کے قلعہ بند گاؤں میں بنایا، لیکن سیّدوں اور ان کے جانشین لودیوں نے دہلی میں مزید شہر نہیں بسائے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لودی اپنا پاے تخت آگرے لے گئے اور دہلی ایک وسیع گورستان سے کچھ ہی بہتر رہ گیا، اس لیے کہ سیری اور فیروز آباد کے درمیان کا میدان اس عہد کے مقبروں سے پٹا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں یہ علاقے بالخصوص قابل ذکر ہیں: نظام الدّین سے دو کیلومیٹر مغرب میں خیر پور کا میدان؛ مبارک پور سے ایک کیلومیٹر مغرب میں ایک علاقہ "تین برج" اور حوض خاص کو جانے والی سڑک کے کنارے کا علاقہ "کھربیرا"۔ موضع مہرولی کی جنوبی سمت اِلتتمش کے تعمیر کردہ تالاب حوض شمسی کے علاقے میں بھی کچھ عمارتیں تھیں.

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں مغل [رک بان] برصغیر میں داخل ہوگئے۔ ہمایوں دہلی میں مقیم ہو گیا اور اس نے ۹۴۰ھ/ ۱۵۳۳ء میں اندراپت کے پرانے ٹیلے پر قلعۂ دین پناہ کی تعمیر شروع کی، لیکن [جلد ہی] شیر شاہ سوری نے اسے تاج و تخت سے محروم کر دیا اور زمام حکومت سنبھالنے کے بعد اس عمارت کو ایک نئے شہر کے قلعے کے طور پر پایۂ تکمیل کو پہنچایا؛ مگر اس شہر کا کوئی خاص نام مذکور نہیں اور اب اس کے آثار بھی باقی نہیں رہے، بجز شمالی دروازے کے، جو فیروز شاہ کوٹلہ کے قریب ہے اور جنوبی دروازے کے جو قلعے (دین پناہ) کے بالمقابل رہ گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شیر شاہی شہر کا بیشتر پتھر آگے چل کر شاہجہان آباد کی تعمیر میں استعمال کیا گیا تھا۔ شیر شاہ کے

بیٹے اور جانشین اسلام شاہ نے، جو سلیم شاہ کے نام سے معروف ہے، ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء کے قریب ہمایوں کی مراجعت کا سدِّباب کرنے کی غرض سے دریاے جمنا کے کنارے ایک چھوٹا سا قلعہ سلیم گڑھ شہر کے بیرونی مورچے کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ ہمایوں کی مراجعت پانچ برس بعد ہوئی، مگر [اس کے مختصر سے دوسرے عہد حکومت میں] دہلی کی عمارتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور بعد کے دو مغل حکمرانوں نے آگرے اور لاہور میں قیام کرنا پسند کیا، تاہم دہلی کی بعض عمارات ان کے عہد کی تعمیر کردہ ہیں، خصوصاً جو عمارتیں ہمایوں کے مقبرے کے گرد تعمیر کی گئیں (دیکھیے ایس۔ اے۔ اے۔ نقوی: *Humāyun's tomb and adjacent buildings*، دہلی ۱۹۴۷ء) شاہ جہان نے بھی گیارہ برس آگرے رہ کر بادشاہی کی، لیکن وہاں کی زحمتیں دیکھ کر وہ دہلی منتقل ہو گیا (عمل صالح، ورق ۵۷۵ تا ۵۷۶؛ Manucci: *Storia de Mogor*، ۱: ۱۸۳) اور وہاں اس نے ہمعصر مؤرخین، نیز خوابگاہ کے کتبے کی رو سے ۱۲ ذوالحجہ ۱۰۴۸ھ/۱۶ اپریل ۱۶۳۹ء کو، لیکن بروے مآثر الامراء (۳: ۴۶۴) اور بقول سید احمد خان ۹ محرم ۱۰۴۹ھ/۱۲ مئی ۱۶۳۹ء کو ایک نئے قلعے کی بنیاد رکھی، جسے لال قلعہ کہتے ہیں۔ یہ اس کے نئے شہر شاہجہان آباد کا بالا حصار تھا اور نو برس میں مکمل ہوا۔ شہر کے گرد فصیل بنانے کا کام ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ اور اس کے اندر شاہجہان اور اس کے جانشینوں کے عہد حکومت میں بہت سی نئی عمارات نے شہر کی زینت بڑھائی (ان میں ممتاز ترین جامع مسجد ہے، جس کی تعمیر قلعے کی تکمیل کے دو برس بعد شروع ہوئی)، مگر انھوں نے کسی اور شہر کا اضافہ نہیں کیا اور شاہجہان آباد بدستور مغل حکمرانوں کا دارالحکومت بنا رہا (بجز اورنگ زیب کے، جس نے اپنا بیشتر وقت دکن میں بسر کیا اور اورنگ آباد [رک بآں] میں انتقال کیا)؛ تاہم مضافات میں تعمیرات بدستور ہوتی رہیں، مثلاً ہمایوں کے مقبرے سے ملحقہ عمارات، درگاہ نظام الدینؒ اور درگاہ روشن چراغ دہلی قدیم جہاں پناہ میں، اور درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ مہرولی میں؛ مؤخر الذکر عمارتیں مغل حکمرانوں کے قبرستان کے طور پر کام آتی رہیں۔ علاوہ ازیں مہرولی میں ایک چھوٹا سا گرمائی محل ہے، جسے آخری مغل بادشاہ استعمال کرتے تھے۔

۱۸۵۸ء میں خاندان مغلیہ کے خاتمے کے ساتھ انگریزوں نے غدر کے دوران میں اور بعد میں بہت سی یادگار عمارات کو تباہ کر ڈالا اور دارالحکومت کلکتے میں منتقل کر دیا تو شہر دہلی کی اہمیت کم ہو گئی اور وہ مقامی فوج کی ایک چھوٹی سی چھاؤنی ہو کے رہ گیا۔ انگریزوں نے اس شہر کو شاہجہان آباد کے شمال میں وسعت دی، جہاں سول لائنز بنائی گئی۔ اسی جگہ ۱۹۱۱ء میں (ہندوستان کا) دارالحکومت منتقل ہوا اور نئے شہر کی تعمیر شروع ہوئی، جسے ابتدا میں رائے سینا کہتے تھے اور بعد میں نئی دہلی کہنے لگے۔ بعد ازاں شاہجہان آباد کے مغربی جانب توسیع ہوئی، یعنی سبزی منڈی، قرول باغ اور صدر بازار کے علاقے میں؛ خیر پور کے جنوب میں اور مہرولی کی سڑک پر؛ نیز چھاؤنی کے گرد، گڑگاؤں کی شاہراہ اور پالم کے نئے ہوائی مستقر کے نواح میں۔

مذکورۂ بالا بیانات میں ناموں کی جن الجھنوں کو ہم نے نظر انداز کر دیا ان کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ لال کوٹ اور قلعہ رائے پتھورا کو تیمور کے زمانے تک "پرانی دہلی" کہتے تھے اور یہی نام برطانوی عہد کے اوائل میں باقاعدہ استعمال ہوتا تھا؛ مگر جب سے "نئی دہلی" بنی ہے "پرانی دہلی" کے نام کا اطلاق اکثر غلطی سے شاہجہان آباد پر کر دیتے ہیں۔ شاہجہان کے نئے قلعے، یعنی لال قلعے کی تعمیر کے بعد ہمایوں اور شیر شاہ کے قدیم تر قلعے

کو ہراب "پرانا قلعہ" یا "قلعۂ کہنہ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

یادگار عمارتیں: دہلی کی عمارات برصغیر میں مستقل اسلامی حکومت کی قدیم ترین یادگاروں کو پیش کرتی ہیں۔ اسی جگہ سب سے اول ہندوستانی مسلمانوں سے مخصوص اسالیب تعمیر نے نشوونما پائی، جن کا اثر و نفوذ خود دہلی سے باہر دور دراز تک پھیلا۔ اس اعتبار سے یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ فقط بڑی بڑی عمارتوں کی سادہ اور مجمل سی کیفیت تک محدود ہے، البتہ انہیں زمانی ترتیب سے لکھا گیا ہے اور مختلف زمانوں کی عمارتوں کی ممتاز خصوصیات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ لوحوں اور تفصیلی نقشوں کے ساتھ ان اسالیب پر بحث کے لیے رک بہ فن؛ تعمیر: ہند۔

دوسرے مقامات (رک بہ اجمیر؛ بیجاپور؛ دولت آباد؛ دھار؛ جون پور؛ گوڑ؛ گجرات؛ مانڈو؛ تربنی) کی طرح دہلی کی اسلامی تعمیرات کے اولیں دور میں بھی ہندوؤں کے مندروں سے حاصل کیے ہوئے تعمیری مسالے سے کام لیا گیا۔ اس کی شہادت ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد، یعنی قلعۂ رائے پتھورا میں قطب الدین ایبک کی تعمیر کردہ مسجد قوت الاسلام میں ملتی ہے، جس کا قدیم ترین کتبہ ۵۸۷ھ/۱۱۹۱-۱۱۹۲ء کا ہے۔ اس مسجد کا وسطی دالان (۳ء۵۶ × ۳ء۵۳ میٹر) ایک مندر کی کرسی (۸ء۷۳ × ۳ء۵۳ میٹر) پر تعمیر کیا گیا ہے، جس میں ستونوں پر تین کمانچے مشرق میں ہیں اور دو شمالی اور جنوبی جانب۔ مغربی "لیوان" (=دالان) کی چوڑائی چار گھر کی ہے۔ اصل میں یہاں محراب قبلہ کے گوشوں کے آگے جو جگہ چھوٹی ہوئی تھی، اس پر پانچ گنبد تھے اور دالان کی چھت شمالی سرے پر اونچی کر دی گئی تھی تاکہ اس حصے میں زنانہ شاہ نشین بن سکے۔ "لیوان" اور کھلے صحن کے درمیان ۵۹۴ھ/۱۱۹۹ء میں ایک بلند محرابی پردے کا اضافہ ہوا تھا، لیکن اس کی محرابیں عقبی دالان کے ستونوں کے فصل اور محرابوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ دالان کی محرابوں کے تقریباً ستانس ستون ہندو اور جینی مندروں سے لیے گئے اور مطلوبہ ارتفاع تک لانے کے لیے جہاں تہاں لگا دے گئے تھے تاکہ مسجد کی چھت ان پر ڈالی جائے؛ اکثر ستون پر ستون جما دیا ہے۔ چھت بھی اسی قبیل کے مندروں کی سنگی پٹیوں سے بنی ہے؛ ان پر تراشی ہوئی مورتیوں کی صورتیں مسخ کر دی گئیں اور ان پر روا روی میں چونے کی تہہ چڑھا دی اور کہیں کہیں ان کا رخ اندر کی جانب اوندھا کر دیا گیا۔ صحن میں کھلنے والی محرابیں چونی پر بل دے کر بنائی اور ان سے سورتیاں نکالی گئی ہیں۔ ان کی چوڑائی کوئی ۲ء۵ میٹر رہی، وسطی محراب ۱۳ء۷ میٹر بلند ہے اور کمان کی چوڑائی ۷ء۰۶ میٹر ہے۔ اس مقصورے کی کل سطح پر نقش و نگار تراشے ہیں، جن میں ہندوانہ پھول پتی اور عربی نقوش اور نسخ خط کی عمودی سطور کندہ ہیں۔ صحن میں ایک بے زنگ، ڈھلے ہوئے لوہے کا ستون استادہ ہے، جو عہد گپتا (چوتھی صدی عیسوی) کے ایک وشنو مندر سے لایا گیا اور بلاشبہہ عمارت بنانے والوں نے اسے وہاں نہ صرف ایک نادر قدیم شے کے طور پر بلکہ بت پرستوں پر اپنی فتح کا نشان بنا کے گاڑا ہے۔ جب مسجد قطب الدّین پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو اس کے جنوب مشرقی کونے میں قطب مینار بننا شروع ہوا، جس کا حال آگے آتا ہے۔

قطب الدّین کے جانشین شمس الدّین اِلتتمش کے عہد حکومت میں تعمیرات میں اضافہ ہوا اور یہ فقط دہلی تک محدود نہ تھا۔ اس نے مسجد دہلی میں ستونوں کے سلسلے اور بڑے "مقصورے" والی دیوار میں توسیعیں دے کر ان میں مزید حسن تناسب اور

عظمت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جہاں تک نئی محرابوں، کمانچوں اور مقصورے کی محرابوں کا تعلق ہے، انھیں ایسے متناسب انداز میں بنایا گیا کہ پوری عمارت ایک متوافق و ہم آہنگ نقشے سے بنائی ہوئی معلوم ہو۔ نئے صحن میں مینار شامل تھا، جس میں اس نے اضافے بھی کیے اور اس کے داخلوں کو سابقہ مسجد کے بالمقابل اور جوڑ کا ترتیب دیا۔ ان ستونوں کی قطار مقابلۃً سادہ ستونوں پر مشتمل ہے اور دیوار مقصورہ کی تزئین کی کوفی خطاطی اور طغرائی نقوش واضح طور پر بتاتے ہیں کہ وہ کسی ایسے صناع کی صنعت ہیں جو اپنے مسالے سے پہلے کاریگروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ محرابیں ابھی تک موری والی ہیں، مگر قدیم تر مقصورے کی کمانوں سے تراش بدلی ہوئی ہے، یعنی راس پر ڈھوا بل نہیں دیا گیا ہے۔ اس مسجد کی شمالی جانب اس نے جو توسیع کی تھی، اسی سے ملا ہوا مغرب میں مقبرۂ اِلتتمش (حدود ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء، بدون کتبۂ تاریخ) ہے: یہ ایک جوکور کمرہ ہے، جس پر ابتدا میں گول گنبد موری والی بڑی ڈاٹوں پر استوار تھا۔ تمام اندرونی سطح طغرائی گلکاریوں، ماھی پشت کی نقاشی اور نسخ و کوفی کتبوں سے (جو سب کے سب قرآنی ہیں) مزیّن ہے۔ بیرونی حصہ پتھر کے تراشیدہ چوکوں کا بنا ہوا ہے، جس میں شمالی، مشرق اور جنوب کی طرف سنگ خارا یا بھربھرے سنگ سرخ کے محرابی روشن دان ہیں؛ یہی سنگ سرخ اندرونی حصے میں بھی استعمال ہوا ہے، لیکن سمت قبلہ کی دیوار اور تعویذ قبر میں سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ اصل قبر نیچے تہہ خانے میں ہے۔ اِلتتمش نے قطب مینار میں تین مزید منزلوں کا اضافہ کرکے اس کی توسیع کی تھی، جس سے مجموعی بلندی ۶۹ء۲ میٹر ہو گئی (Cunningham : ASI، ۱ : ۱۹۵) اور یہ کام ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء کے لگ بھگ مکمل ہو گیا۔ ڈھلان کا زاویہ چوٹی سے تقریباً ساڑھے چار درجے ہو گیا ہے اور ہر منزل بالکھنڈ کو جھروکے ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ یہ جھروکے طاقچہ دار توڑوں پر ٹکے ہوئے ہیں۔ ہر منزل میں پخیں یا نالیاں تراشی ہیں اور اس طرح غالباً غزنہ کے اصلی نمونۂ مینار کی کثیرالاضلاع ساخت کو ترقی دی گئی، چنانچہ پہلی یعنی سب سے نیچے کی منزل میں باری باری سے نالی اور ترچھے کٹاؤ ہیں اور دوسری منزل ساری کی ساری نالی کی اور تیسری کُھر کی یا ترچھے کٹاؤ کی ہے۔ بالائی منزلیں سادہ و صاف ہیں جو فیروز تغلق کی بنائی ہوئی ہیں (نیچے دیکھیے)۔ سب سے نیچے کی منزلوں میں سے ہر ایک خط نسخ کے عربی کتبوں سے مزیّن ہے، جو چوڑے چوڑے پٹکوں کے اندر دائرہ بناتے چلے گئے ہیں۔ ان کتبات پر تاریخ زمانۂ تعمیر، معزالدّین محمد بن سام اور شمس الدّین کی تعریف اور آیات قرآنی درج ہیں)۔ غرض اس یادگار عمارت میں ہندوانہ اصل کی خصوصیات قریب قریب کُلّیۃً مفقود ہیں۔ ہندوستان میں قبر پر یادگار عمارت یا مقبرہ بنانے کی پہلی مثال اِلتتمش کے عہد حکومت میں نظر آتی ہے؛ یہ ملک پور میں اس کے بیٹے ناصرالدّین محمود کا مقبرہ (۶۲۹ھ/۱۲۳۱ء) ہے۔ یہ ایک ہشت پہلو حجرے میں کوئی دو میٹر اونچی کرسی پر استادہ ہے، جس کی چھت بڑھ کر بیرونی چار دیواری سے ملحق ہے۔ اس چار دیواری میں موری والی محرابیں تراشی ہیں اور مشرق و مغربی دیواروں پر ھندو ساخت کے ستونوں کے محرابی دالان ہیں۔ مغربی سمت کا دالان ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جس میں وسطی کمانچہ اور محرابِ قبلہ بنا دی گئی ہے۔ بیرونی صدر دروازے پر کوفی حروف میں تاریخ بنا کا کتبہ لگا ہے (خط کوفی میں غیر قرآنی کتبے یہاں کے علاوہ فقط مسجد قوت الاسلام اور اجمیر ھی میں دیکھے جاتے ہیں)۔ کونے کے برج فیروز تغلق کی اصلاح عمارات کا حصہ معلوم

ہوتے ہیں (فتوحات فیروز شاہی، علیگڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۱۶) ۔ اس مقبرے کو مقامی طور پر "سلطان غازی" کہتے ہیں ۔ بظاہر اس کی وجہ وہ گہرا سردابہ یا غار ہے جس میں ناصرالدّین مدفون ہے، لیکن یہ نام سید احمد خان (آثار الصنادید، دہلی ۱۸۴۸ء، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸) سے پہلے مذکور نہیں (مفصل مطالعے کے لیے دیکھیے ایس۔ اے۔ نقوی : سلطان غازی، دہلی، در *Ancient India*، ۳ (۱۹۴۷ء) : ۴ تا ۱۰ و لوحہ ۱ تا ۱۲)۔

بعد میں آنے والے بادشاہوں کے عہد میں علاء الدّین خلجی کے برسر حکومت آنے تک سلطان بلبن (۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء) کے مقبرے کے سوا کوئی بڑی اور قابل ذکر عمارت تعمیر نہیں ہوئی ۔ یہ مقبرہ قلعۂ رائے پتھورا کے جنوب مشرق میں ہے اور اِلتتمش کے مقبرے سے بھی بڑا ہے ۔ اس میں صدر ایوان کے ساتھ بغلی کمرے ہیں اور ایوان میں پہلی مرتبہ صحیح معنی میں کیلی کی محراب کا استعمال نظر آتا ہے ۔ اس سے نہ صرف تعمیر میں فنی ترقی کا پتا چلتا ہے بلکہ ہندو کاریگروں سے جو کام لیا جاتا تھا ان کی تعمیری روایت کے خلاف یہ فن تعمیر کی اسلامی روایت کے مستحکم ہو جانے کی نشاندہی کرتا ہے۔

علاء الدّین خلجی کی قلعۂ لال کوٹ کی توسیعات اور سیری کی عمارات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ۔ اس نے مسجد قوت الاسلام کے شمال اور مشرق میں توسیع کے ایک مہتم بالشان منصوبے کا آغاز کیا ؛ چند ستون اور شمالی مسقّف دروازے کی بنیادیں باقی رہ گئی ہیں، جن سے اس کی اور "مقصورہ" کے بہت بڑے دالان کی دیوار کی وسعت کا پتا چلتا ہے، جسے سابقہ دالانوں کی دیواروں کی مجموعی لمبائی کے برابر لمبا اور دگنے پیمانے پر بنانا مقصود تھا۔ شمالی صحن میں ایک دیو ہیکل مینار کی پہلی نامکمل منزل کھڑی ہے، جس کا قطر بنیاد پر قطب مینار کے قطر سے دگنا ہے۔ ان توسیعات کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت جنوبی داخلہ، موسوم بہ علائی دروازہ، ہے، جو بے مثل تعمیری خوبی کا حامل ہے۔ اس مربع عمارت کے اوپر، جس کی اندرونی پیمائش ۱۰ء۵ میٹر اور دیواریں ۳ء۴ میٹر موٹی ہیں، ایک چپٹا گنبد بنا ہوا ہے۔ مشرق، جنوب اور مغرب کی جانب نہایت رفیع محرابیں ہیں (سطح زمین سے چوٹی تک ۱۰ء۷ میٹر) اور شمال میں ان سے چھوٹی ایک سہ گوشہ محراب ہے، جس سے صحن کی مشرقی توسیع میں راستہ جاتا ہے ۔ تین بڑی محرابیں اور ڈاٹیں، جو گنبد کو اٹھائے ہوئے ہیں، نوکدار نعل کی وضع کی ہیں اور کیلی کا پتھر دے کے بنائی گئی ہیں ۔ محرابوں کے اندرونی خموں پر نیزوں کے پھل کی مروّجہ وضع کی جھالر ہے۔ اسی قسم کا اسلوب درگہ نظام الدّین کی جماعت خانہ مسجد میں دکھائی دیتا ہے اور یہ ہندوستان میں ایسی مساجد کی پہلی مثال ہے جسے ہندو عمارتوں کے مسالے سے، جیسا بھی مل گیا، نہیں بنایا گیا تھا بلکہ اس کے لیے پتھر خاص طور پر پہاڑ سے کاٹ کر لایا گیا تھا (اس مسجد کی بحث کے لیے دیکھیے ظفر حسن : *A guide to Nizam-ud-Din* (= *Memoire ASI*، ج ۱۰، ۱۹۲۲ء) ۔ حوض علائی (حوض خاص) پر ایک ابتدائی عمارت (مدرسہ ؟) بھی اس نے بنوائی تھی، مگر اس سے قطع نظر دہلی میں علاؤ الدّین کی دیگر عمارتوں میں سے اس کا مقبرہ اور مدرسہ ہی رہ گئے ہیں؛ یہ مسجد قوت الاسلام کے جنوب مغرب میں واقع ہیں اور اب بالکل کھنڈر ہو گئے ہیں ۔ ان کی مغربی دیوار پر چھوٹے حجروں کا سلسلہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ وہ گنبد پیش کرتا ہے جو نیچی دیوارگیریوں کا سہارا دے کر اٹھایا گیا ہے ۔ "قطب صاحب" کی تمام یادگار عمارتوں اور آثار کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے **J.A. Page** : *Historical Memoir on the Qutb, Delhi* (= *Memoir ASI*، ج ۲۲)، ۱۹۲۵ء؛ وہی مصنف : *Guide to the Qutb*.

Delhi (مذکورہ کتاب کا ملخص)، دہلی ۱۹۳۸ء؛ بہترین تصاویر، در H. H. Cole : *The architecture of Ancient Delhi* لندن ۱۸۷۲ء.

خاندان تغلق کے بانی غیاث الدّین کی تعمیرات تغلق آباد کے شہر (دیکھیے اوپر، تاریخ) اور اس کے اپنے دو مقبروں کی تعمیر تک محدود ہیں۔ پہلے مقبرے کی تعمیر کے لیے رک بہ ملتان۔ دوسری تعمیر کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ پنجاب چھوڑ کر بادشاہ کی حیثیت سے دہلی میں آ گیا۔ شکل کے اعتبار سے یہ ایک بے قاعدہ مخمس ہے، جس کے ہر زاویے پر برج ہیں۔ احاطے کے سب سے چوڑے حصے میں مقبرے کی عمارت آڑی بنی ہوئی ہے۔ روضہ سرخ پتھر کا ہے، جس کے سہرے میں سفید سنگ مرمر لگا ہے۔ اس کی دیواروں میں اچھی نمایاں مخروطیت (راس سے ۲۵ درجے) ہے۔ شمالی، مشرقی اور جنوبی اضلاعوں میں کمانچہ دار دروازے ہیں (مغربی پہلو محراب قبلہ کے لیے بند ہے)۔ خلجیوں کے عہد حکومت میں نیزے کے پھل والی جھالر کا رواج چلا تھا؛ اسے ان کمانچوں میں استعمال کیا گیا ہے اور محراب کے سرے پر خفیف سا دُہرا بل دیا ہے۔ یہاں ہندوؤں کے قدیم کڑیاں استعمال کرنے کے طریقے کو نئے قوسی طریقے سے اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ جہاں سے قوس محراب شروع ہوتی ہے وہاں نیچے آر پار سردل بھی جما دی گئی ہے۔

محمد تغلق کے ہاتھوں عادل آباد اور دین پناہ کی بنیاد رکھے جانے کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ دین پناہ کی فصیل میں پانی کا پھاٹک یا ست دریچے بنائے ہیں، جن میں چھوٹی محرابوں سے کام لیا گیا ہے اور سرے پر برجیاں بنا دی ہیں۔ یہ ست پلا ہے اور اس کے دو درجے، بند کے اندر پانی کی سطح اونچی نیچی کرنے کا بندوبست رکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اسی بادشاہ کے عہد کی ایک عمارت موضع بیگم پور کے قریب بیجے منڈل، کہلاتی ہے، جسے قصر ہزار ستون کے آثار قدیمہ گمان کرتے ہیں۔ اس میں جالیاں ڈاٹ کی ہندوستان بھر میں سب سے پہلی مثال پائی گئی ہے۔ اس کے بالکل قریب ایک شاندار مگر گمنام مقبرہ اور بارہ کھمبا ہے (نیچے دیکھیے).

محمد بن تغلق نے دہلی کی کل منتخب آبادی کو دولت آباد (رک باں) میں منتقل کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی ہند کے صناع تتر بتر ہو گئے۔ اس کے جانشین فیروز شاہ (۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء تا ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) نے تعمیرات میں بڑی سرگرمی دکھائی اور اس کی سرپرستی میں گارے کی چنائی اور استرکاری کے دور کا آغاز ہوا۔ اس بادشاہ نے بہت سے تعمیری منصوبوں کا بیڑا اٹھایا، جن کی فہرست شمس سراج عفیف (تاریخ فیروز شاہی) اور فرشتہ نے دی ہے۔ وہ خود اپنی فتوحات فیروز شاہی میں اپنے پیش رو بادشاہوں کی ان یادگار عمارتوں کا ذکر کرتا ہے جو اس نے دوبارہ بنوائیں یا ان کی مرمت اور تجدید کی۔ تعمیر اور مرمت کے یہ متعدد منصوبے سخت کفایت شعاری کے مقتضی تھے، چنانچہ ہر منصوبے کی تجاویز دیوان وزارت کے سامنے پیش کی جاتی تھیں اور زیادہ قیمتی تعمیری مسالا (سنگ مرمر وغیرہ) استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ فیروز شاہ کے شہروں میں سے فیروز آباد کا ذکر اوپر گزر چکا ہے (نیز رک بہ جونپور؛ فتح آباد؛ حصار فیروزہ؛ کوٹلے کی قلعہ بندی اور فصیل کے کنگوروں میں روزن سازی کا طریقہ اختیار کرنے کے لیے رک بہ برج)۔ کوٹلے کے اندر جامع مسجد بہت بلند کرسی پر استادہ ہے اور اس کا صدر دروازہ شمال میں ہے۔ صحن کے چاروں جانب گہری گہہ کے تہرے دالان بنائے تھے اور وسطی ہشت پہلو حوض کے گرد فیروز شاہ کی رفاہ عامہ کی عمارتوں کی فہرست مرتسم کر دی تھی۔ اب ان عمارات کا صرف ڈھانچہ بچا ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا بہت سا پتھر برطانوی

انجینئروں نے شاہجہان آباد کی فصیلوں میں لگا دیا تھا۔ دوسری عمارت، جو کوٹلے کے اندر کھڑی ہے، ایک سہ منزلہ مخروطی چُنائی ہے۔ اس کے اوپر اشوک (تیسری صدی ق م) کی ایک لاٹھ چڑھائی گئی ہے، جسے ضلع میرٹھ سے لایا گیا تھا۔ ان کے لیے اور قلعے کے اندر کے دیگر کھنڈرات کے لیے دیکھیے J. A. Page: *Memoir ASI=) A memoir on Kotla Firoz Shah, Delhi* ج ۵۲)، دہلی ۱۹۳۷ء۔ اس عہد میں مسجد بنانے کا جو طرز رائج تھا وہ تقریباً ۷۶۶ھ/۱۳۶۴ء تا ۷۷۶ھ/ ۱۳۷۵ء کے عشرے میں تعمیر شدہ نصف درجن مساجد سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ یہ سب گارے کی چُنائی اور اوپر استر کر کے بنی ہیں، جس پر شروع میں سفیدی کی جاتی ہوگی۔ ان میں ستون اور سنگ خارا میں کاٹے ہوئے ہندووانہ طرز کے طاقچے اور دیوار گیریاں بنی ہیں۔ ڈھلان دار مسقّف دروازے، کئی کئی گنبد کی چھتیں اور دروازوں کے پہلو میں مخروطی شکل کے آرائشی ستون ہیں۔ ان میں سب سے سادہ مسجد وزیر آباد (=تیمور پور) میں "شاہ عالم کی درگاہ" میں ہے۔ پانچ کمانچوں کے سیدھے سادے غربی دالان کے اندر عقبی گوشے میں ایک زنانہ بغلی دالان ہے، جسے دہلی میں اس طرز کا اولین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے؛ مسجد پر تین گنبد ہیں۔ بیگم پور کی بڑی مسجد کا صحن (۷۵۴۳ × ۶۸۴۰ میٹر) چاروں طرف سے برجی دار محرابی دالانوں سے گھرا ہوا ہے اور مغربی "لیوان" کے وسط میں داخلے کی کمان روکار تک اتنی اونچی بنائی ہے کہ مسجد کے بڑے گنبد کو نیچے کے رخ سے چھپا لیتی ہے۔ "نظام الدّین" میں مسجد سنجر (جسے کالی مسجد بھی کہتے ہیں) میں ایک وسطی صحن ہے؛ اسے چلیپائی شکل کے ایک گھہ کے محرابی دالان نے چار چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، جن میں سے ہر ایک ۱۳۴۱ × ۱۰۰۱ میٹر ہے؛ نیز اس میں چاروں طرف کے محرابی دالان گنبد دار بنائے ہیں (*ASI, Annual Report*، ج ۲۷، لوحہ ۱)۔ سات پُلا کے نزدیک جہاں پناہ کے جنوب میں کھڑکی گاؤں کی مسجد کا نقشہ بھی اسی طرح کا ہے، لیکن چلیپائی دالانوں میں، جو ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں، محرابوں کے تین درجے رکھے ہیں، جیسا کہ پہلو کے صدر دالان یا لیوانوں میں؛ لہٰذا فقط چار صحن، جن میں سے ہر ایک ۹۴۸ مربع میٹر ہے، تقریباً ۵۲ مربع میٹر کے کل رقبے میں غیر مسقّف ہیں۔ کلاں مسجد (جسے بعض اوقات غلطی سے کالی مسجد کہتے ہیں) زمانۂ مابعد میں شاہجہان آباد کی شہر پناہ کے اندر آ گئی تھی۔ یہ نسبةً چھوٹی ہے اور اس میں صرف ایک کھلا صحن ہے، جسے قبہ دار محرابی دالانوں کا سلسلہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ کلاں مسجد، کھڑکی کی مسجد اور کوٹلا کی جامع مسجد، تینوں نیچے تہہ خانے کی منزل دے کر ایک بلند کرسی پر بنی ہوئی ہیں اور خود مسجدوں میں اونچی سیڑھیوں کے ذریعے اندر جاتے ہیں۔ کلاں مسجد بلاشبہہ نئے فیروز آباد کے مضافات کی سب سے بڑی مسجد تھی؛ لیکن بیگم پور اور کھڑکی کی مسجدوں کی وسعت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ پرانے شہروں میں بھی ابھی تک اچھی خاصی آبادی تھی۔ پہاڑی کے شمالی مضافات کے لیے چوبرجی مسجد تعمیر کی گئی تھی؛ اب وہ طرح طرح کے کام لیے جانے کی وجہ سے اس قدر تبدیل ہو چکی ہے کہ اس کا اصل تعمیری نقشہ مشکل ہی سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مسجد کے نزدیک فیروز شاہ کی کوشک شکار یا جہان نما کے باقی آثار نظر آتے ہیں، جہاں وہ ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء میں اپنے بیٹے فتح خان کی موت کے بعد غم غلط کرنے چلا آیا تھا۔ یہ شہزادہ قدم شریف میں مدفون ہے، جو ایک قلعہ بند احاطہ ہے (رک بہ برج؛ نیز *ASI, Annual Report*، ۲۲:۳ و لوحہ ۳ ج و د)۔ احاطے کے اندر قبر کے چاروں طرف قبہ دار محرابی دالان ہیں۔ قبر کے اوپر ایک پتھر پر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا نقش قدم پانی کے ایک چھوٹے سے حوض میں نصب ہے۔ خود فیروز تغلق کے مقبرے سے ایک مدرسہ ملحق ہے، جسے اس نے حوض خاص پر علاء الدّین کی عمارت کے ڈھانچے کی جگہ پر بنایا تھا۔ اس حوض کے مشرق اور جنوب میں مدرسے کی عمارتوں میں، جو جھیل کے سامنے دو منزلہ اور عقب میں یک منزلہ ہیں، کئی گہہ کی ستونوں کی قطاریں ہیں۔ چھتیں محرابوں یا سردل اور دیوار گیریوں پر بنائی گئی ہیں۔ فصیل چھوڑ کر قبّہ دار چوکور ایوان دالانوں کو باہم ملاتے ہیں۔ یہ عمارت تقریباً ۷۶ میٹر ایک کنارے پر اور ۱۲۰ میٹر دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی ہے۔ جنوب مشرق کنارے پر ۱۳ء۷ میٹر چوکور مقبرہ ہے، جس کی استر کی ہوئی دیواروں کی موٹائی اوپر کی جانب قدرے کم ہوتی چلی گئی ہے۔ بیرونی دو دیواروں (جنوبی اور مشرقی) میں معمولی سا ابھار دے کر کمان کھولی ہے اور کمان کے اندر سردل اور دیوار گیری کے چوکھٹے میں دروازہ بنایا ہے۔ عمارت میں ہشت پہلو ڈھولے پر ایک ہی گنبد اٹھایا ہے اور مدوّر ڈاٹوں سے اسے مستحکم کیا گیا ہے۔ مغربی دیوار میں ایک دروازہ متصلہ ایوان میں کھلتا ہے اور اس میں ایک چھوٹی سی محراب ہے۔ یہ عمارت ایک چھوٹی سی کرسی دے کر چنی گئی ہے اور یہی کرسی جنوبی سمت آگے بڑھ کر کھلا چبوترہ بن جاتی ہے، جس کے گرد پتھر کا کٹہرا نر مادہ خانوں کی ساخت کی طرح چنا ہے، جو چوبی کام کے مشابہ ہے۔ ایک اور مقبرہ، جو بڑی تعمیری اہمیت رکھتا ہے، فیروز شاہ کے وزیر اعظم خان جہان تلنگانی (م ۷۷۰ھ/۱۳۶۸-۱۳۶۹ء) کا نظام الدّین میں کوٹ کے اندر ہے۔ یہ دہلی میں پہلا ہشت پہلو مقبرہ ہے (اگرچہ "سلطان غازی" میں مقبرے کا حجرہ بھی ہشت پہلو ہے)۔ اس کے گردا گرد ایک برآمدہ ہے، جس کے ہر رخ تین محرابیں کھلی ہوئی ہیں اور ان کے اوپر چوڑے چھجے دہرے ہیں۔ عمارت میں ایک وسطی گنبد ہے اور آٹھ گنبد نما چھتریاں ایک دوسری کے بالمقابل بنائی ہیں۔ اس مقبرے کا اصلی نمونہ تلاش کرنے میں لوگ بیت المقدس کے القُبّۃ الصخرہ تک پہنچے ہیں اور یہ تو واقعہ ہے کہ بعد کے سیّد، لودی اور سوری خاندانوں کے بہت سے شاہی مقبروں کے لیے یہ نمونے کا کام دیتا رہا۔ تغلقوں کی سب سے آخری عمارات میں شیخ کبیر الدّین اولیا کا مقبرہ ہے (غالباً ناصر الدّین محمود کے عہد اور ۷۹۶ھ/۱۲۹۴ء کے بعد کا)! گو یہ غیاث الدّین تغلق کے مقبرے کی نصف پیمانے پر سرسری سی نقل ہے، لیکن وہ اس لحاظ سے لائق توجہ ہے کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد فیروز شاہی کی خشک سادگی سے اکتا کر لوگ پھر اسلوب کی رنگا رنگی کی طرف مائل ہو رہے تھے۔

دہلی میں فیروز شاہ کی سرنگوں کے لیے دیکھیے H. Hesten در *JASB*، سلسلۂ جدید، ۸ (۱۹۱۱ء): ۹۹ تا ۱۰۸ و ۸ (۱۹۰۲ء): ۲۷۹ تا ۲۸۱ و ۹ (۱۹۱۳ء): ۸۳ تا ۹۱۔

چونکہ نظام الدّین کی درگاہ میں بڑی عمارتیں اسی زمانے کی ہیں، لہٰذا اس مجموعۂ عمارت کی کیفیت یہاں دی جاتی ہے۔ داخلے کے دروازے پر تاریخ ۷۸۰ھ/۱۳۷۸-۱۳۷۹ء مرقوم ہے اور اس کے اندر ایک بڑی باؤلی [رگ بان] ہے، جس کے کنارے پر دو مقبرے اور ایک دو منزلہ مسجد ہے۔ ان تینوں کا طرز تعمیر فیروز شاہی نظر آتا ہے۔ باؤلی کا تاریخی نام "چشمۂ دلکشا" (۷۰۳ھ/۱۳۰۳-۱۳۰۴ء) ہے۔ درگاہ کے احاطے کے اندر جانے کا ایک اور بڑا دروازہ بنا ہے۔ شیخ (نظام الدّین اولیاؒ) کا مقبرہ اکبر کے زمانے کا ہے اور اس قدیم مقبرے کی جگہ بنا ہے جسے فیروز تغلق نے تعمیر کروایا تھا، لیکن اکبری عہد کے بعد بھی بارہا اس کی تجدید ہوتی رہی ہے، چنانچہ اس کے گنبد کا اضافہ اکبر شاہ ثانی نے ۱۸۱۳ء میں کیا تھا۔ اس

مقبرے کے مغرب میں جماعت خانہ کی مسجد کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس احاطے کے جنوب میں بہت سے اکابر (جہاں آرا، دختر شاہجہان؛ محمد شاہ، م ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء؛ جہانگیر، پسر اکبر ثانی؛ شیخؒ کے مشہور مرید امیر خسروؒ، گو ان کا مقبرہ اوائل گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کی تعمیر ہے، وغیرہ) کی قبریں ہیں۔ اس صحن کی مشرقی دیوار کے باہر کی طرف اکبر کے رضاعی باپ اتکہ خان م ۹۶۹ھ/ ۱۵۶۲ء کا چوکور مقبرہ ہے، جس میں مختلف رنگوں سے پچی کاری کی ہوئی ہے اور ہمایوں کے مقبرے کی طرز پر بنا ہوا ہے (نیچے دیکھیے)۔ اس مقبرے سے کوئی ساٹھ میٹر جنوب مشرق میں چونسٹھ کھمبا ہے، جو بھورے سنگ مرمر کی نہایت نفیس و موزوں عمارت ہے اور اتکہ خان کے فرزند میرزا عزیز کوکلتاش، م ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۴ء کے خاندانی گورستان کا کام دیتی تھی۔ متصلہ کوٹ اور اس کے اندر مقبرۂ تلنگانی کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ان تمام عمارات کی مکمل تفصیلات کے لیے دیکھیے ظفر حسن: *A Guide to Nizamu-d-Din* (*'Memoir* = *Memoir ASI*، ج ۱۰)، کلکتہ ۱۹۲۲ء۔

ایک اور درگاہ، جو زیادہ تر عہد فیروزی سے تعلق رکھتی ہے، نصیر الدّین چراغ دہلی (م ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۶ء) کی ہے (رک بہ چشتیہ)۔ اس کا مشرقی دروازہ ۷۷۵ھ/۱۳۷۳ء کا ہے، لیکن مقبرے میں بہت سی حالیہ جدتیں کی گئی ہیں۔ اس درگاہ اور گاؤں کے گرد کی فصیل کو محمد شاہ نے ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۲۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے پہلو میں بہلول لودی کے مبینہ مقبروں میں سے ایک مقبرہ کھڑا ہے۔

سید اور لودی خاندانوں نے کوئی بڑے تعمیری منصوبے نہیں تیار کیے۔ بجز ایک ممتاز مسجد کے ان کی یادگار عمارتیں کلیۃً مقبروں پر مشتمل ہیں۔ یہ سب عمارتیں مندرجۂ ذیل تین مقامات ہی میں مرتکز ہیں: خیر پور، مبارک پور اور مجاہد پور کے جنوب میں اس سڑک پر جو حوض خاص کو جاتی ہے۔ یہ مقبرے دو جداگانہ نمونوں کے ہیں: چوکور اور مثمن، مگر دونوں صورتوں میں، ان میں ایک بڑا وسطی گنبد ہوتا ہے اور منڈیر کے اوپر عموماً کھلی چھتریاں ہوتی ہیں۔ مثمن کا سب سے قدیم نمونہ کوٹلہ مبارک پور میں مبارک شاہ (م ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء) کا ہے، جو مقبرۂ تلنگانی کے طرز کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ گو مقبرہ کافی اونچا نہیں ہے اور ہر مہرے پر آمنے سامنے ہشت پہلو چھتریاں بہت قریب قریب بھنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔ دس سال بعد اسی خاندان کے فرمانروا محمد شاہ کے مقبرے میں گنبد کے ڈھولے اور چھتریوں کو اونچا کر کے اور برآمدے کی منڈیر کے ہر گوشے میں گلدستے کا اضافہ کر کے ان نقائص کو دور کر دیا گیا ہے۔ سکندر لودی (حدود م ۹۲۳ھ/۱۵۱۸ء) کا مقبرہ خیر پور کے شمال میں ہے اور طول و عرض میں اسی کے برابر ہے، لیکن اس میں چھتریاں نہیں اور گنبد کا ایک اندرونی اور ایک بیرونی خول ہے۔ یہ مقبرہ فصیل بند احاطے میں واقع ہے، جس کی مغربی دیوار پر محرابوں کا ایک سلسلہ عیدگاہ کے مشابہ ہے اور قیاساً ایک بیرونی محراب تباہ ہے۔ مبارک شاہ کے مقبرے میں ایک علاحدہ مسجد ہے، لیکن محمد شاہ کے مقبرے میں ایسی کوئی مسجد نہیں۔ تمام مقبروں کے گوشوں پر ڈھلواں پشتیبان بنے ہیں۔

دوسرے نمونے کے چوکور مقبرے تمام کے تمام غالباً نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے آخری ربع کے ہیں، لیکن ان میں کتبوں کی کمی ہے اور وہ ایسے مقامی ناموں سے موسوم ہو گئے ہیں جن سے حقیقت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ مبارک پور کے مغرب میں جو تین گنبد "تین برج" کہلاتے ہیں ان میں سے عمدہ ترین "بڑے خان کا گنبد" ہے۔ یہ ان میں سے سب سے بڑا (بلندی ۲۵ میٹر) ہے۔ مذکورہ گنبد باہر سے بظاہر تین درجوں کا، لیکن فی الواقع ایک ہی بڑا

ایوان ہے ۔ اس کے اور اس کے متصلہ "چھوٹے خان کے گنبد" میں ڈھولے کے نیچے جو مربع بنا ہے اس کے گوشوں میں ہشت پہلو چھتریاں ہیں، جس طرح مجاہد پور کے مجموعۂ عمارات میں "دادی" اور "پوتی" کے گنبدوں میں بنی ہیں ۔ خیرپور میں سب سے اچھی حالات میں محفوظ عمارات ایک تو بڑا گنبد (تعمیر ۸۹۹ھ/۱۴۹۴ء) ہے، جس کے اندر کوئی قبر نہیں اور جس کے متعلق مقامی لوگ کہتے ہیں کہ وہ متصلہ مسجد، صحن اور "مجلس خانہ (؟)" کا دروازہ ہے ۔ مسجد کے ہر عقبی گوشے میں بھاری بھر کم مخروطی اور ڈھلوان ستون ہیں ۔ ہر ستون میں نالی کا پٹکا ایک گول، ایک زاویہ دار کی ترتیب سے بنایا ہے، جو قطب مینار کی سب سے نیچے کی منزل کی یاد تازہ کرتا ہے ۔ مشرق میں بیرونی رخ وسیع وسطی محرابیں ہیں، جن کے علاقے (=اوپر کے خالی زاویے) استرکاری کے بہترین نقش و نگار سے مزین ہیں ۔ دہلی کی عمارتوں میں استرکاری پر اتنی اچھی نقش تراشی اور کہیں نہیں ہے ۔ اس کے قریب شیش گنبد ہے، جو بڑے گنبد کے بالکل مشابہ ہے، مگر اس میں گہرے نیلے رنگ کی کاشی کاری کے ردے بھی دیے گئے ہیں ۔ مذکورۂ بالا مسجد کے علاوہ لودیوں نے اس درجے کی عمارتوں میں ایک بڑا نمونہ اور تیار کیا تھا، یعنی مبارک پور کے جنوب میں موٹھ کی مسجد، جو ایک بالکل الگ تھلگ عمارت ہے ۔ اسے سکندر لودی کے وزیر نے حدود ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں تعمیر کرایا تھا ۔ اس کی مغربی دیوار میں اسی قسم کے مخروطی ستونوں کے کنگورے ہیں، لیکن بڑھی ہوئی محراب قبلہ کے گوشوں پر، نیز بیرونی کونوں پر، دو منزلہ دوچھجے برج بنائے گئے ہیں؛ پہلو کی دیواروں میں عمودی کڑیاں ڈال کر جھروکے نکالے ہیں؛ مغربی "ایوان" کے سامنے کے رخ محرابوں کے خطوط ان کی زمین کو نیچا کر دینے سے اور نمایاں کر دیے گئے ہیں ۔ اسی طرح وسطی محراب کے ساتھ ایک اور دروازہ نما چیز بنا دی ہے، جو باقی عمارت کے برابر ہی بلند اور جاذب توجہ ہے ۔ "ایوان" کے پہلو میں جو گنبد ہیں، ان کی بنیاد گروی گوشوں پر رکھی ہے، جو طاقچوں سے مزین ہیں ۔ سفید سنگ مرمر، بھربھرا سنگ سرخ اور کاشی کاری کے رنگین چوکوں سے، نیز استرکاری میں نقش تراشی سے جا بجا کام لیا ہے ۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے ہندوستان بھر میں یہ مسجد مسلمانوں کے فن تعمیر کے انتہائی جان دار نمونوں میں شامل ہے ۔ لودیوں کی دیگر عمارتیں کم ہیں ۔ ایک عمارت (مدرسہ؟)، جس میں ایک چھوٹی سی مسجد شامل ہے، "جہاز محل" کہلاتی ہے اور مہرولی میں حوض علائی کی مشرقی جانب واقع ہے ۔ نظام الدین کے قریب چند چھوٹی بارہ دریاں اور محل اور بیگم پورہ کے مقام پر سکونتی مکان (بارہ کھمبا) ہے، جس کا صحن احاطہ بند ہے اور اس میں ایک سہ منزلہ مینار ہے ۔

مغل فتوحات کے ابتدائی ایام میں، جب کہ ان کی سلطنت کو ہنوز استقلال نصیب نہیں ہوا تھا، لودی طرز بدستور مروج نظر آتا ہے ۔ ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء کی مسجد (شیخ) جمالی میں، جو قلعۂ رائے پتھورا کے جنوب میں ہے، پتھر کے نفیس چوکے لگائے ہیں ۔ بڑے دالان کی پانچ محرابیں ہیں، جن کے مرغولوں کی سطح کی زمین نیچی رکھی ہے ۔ داخلے کی وسطی محراب ایک اور بڑی محراب سے مل کر ایک ہو گئی ہے، جس میں نیزے کے پھل جیسی جھالر لگی ہوئی ہے ۔ یہ وسطی کمانیں مل کر پیش دروازہ بن گیا ہے، جو روکار کی عام سطح سے اوپر ابھرا ہوا ہے ۔ مسجد میں صرف ایک ہی وسطی گنبد شمال کی جانب ہے ۔ فضل اللہ [رک بآن] المتخلص بہ جمالی کی قبر کے اوپر ایک مستطیل عمارت ہے، جو بہت معمولی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کی چھت میں رنگوں کی آرائش دہلی بھر میں بہترین ہے ۔ ہشت پہلو مقبرے کا طرز

۹۵۴ھ/۱۵۴۷-۱۵۴۸ع کے عیسی خان نیازی کے مقبرے میں یعنی اسلام شاہ سوری کے عہد حکومت میں بھی قائم رہا؛ اس کی ساخت پہلے دونوں کی طرح ہے، بشمول بند مغربی دیوار اور محراب قبلہ کے، لیکن اس میں کاشی کاری کے جو روغنی چوکے باقی رہ گئے ہیں ان کی تعداد زیادہ ہے ۔ ہشت پہلو صحن کے مغرب میں ایک علٰحدہ مسجد موجود ہے، جو بھورے سنگ موسہ اور سنگ سرخ کی ہے؛ عرضاً تین دالانوں میں سے وسطی دالان کو ایک آگے نکلے ہوئے ڈھانچے میں بٹھایا گیا ہے؛ اوپر ایک وسطی گنبد اور بغلی دالانوں پر چھتریاں ہیں؛ مقبرے کی عمارت کے ہر گوشے پر ڈھلواں پشتیبان ہیں اور یہ دہلی میں آخری عمارت ہے جس میں یہ عمل کیا گیا ہے (ان عمارات کے لیے دیکھیے S. A. Naqvi : *Humayun's tomb and adjacent buildings*، دہلی ۱۹۴۷ء، ص ۱۱ تا ۲۴)۔ دہلی میں سب سے آخری ہشت پہلو مقبرہ کوئی چودہ سال بعد اکبر کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ ادھم خان کا مقبرہ ہے، جو قلعۂ رائے پتھورا کے انتہائی جنوب مغرب میں واقع ہے ۔ اس میں مزید بلندی پیدا کرنے کی کوشش میں گنبد کے ڈھولے کو ایک درمیانی منزل کی صورت دے دی گئی ہے ۔ باہر کے رخ بمحرابی کوشکیں ہیں، مگر اوپر چھتریاں نہیں ہیں؛ گنبد کے درمیان کی منزل میں دیواروں کے چوڑے آثاروں کے اندر سیڑھیوں کی بھول بھلیاں بن گئی ہے ۔ عمارت کا عام تأثر بے کیف سا ہے (عکسی تصویر اور مختصر حال کے لیے دیکھیے Cole : کتاب مذکور) ۔

پہلے دو مغل شہنشاہوں، یعنی بابر اور ہمایوں نے دور اول میں قلعۂ کہنہ کی تعمیر کا آغاز کرنے کے سوا دہلی کی یادگار عمارتوں میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور اس کی تعمیر بھی زیادہ شیر شاہ سوری کی مرہون منت ہے، جس نے مغلوں سے سلطنت چھینی اور جو اسے اپنے نئے شہر کا بالا حصار بنانا چاہتا تھا ۔ اس شہر کے فقط دو بڑے دروازے باقی رہ گئے ہیں : شمالی (لال، کابلی یا خونی دروازہ)، جو کوٹلہ فیروز شاہ کے بالمقابل ہے اور جنوبی دروازہ، جو اپنی تھوڑی سی دیوار کے ساتھ پرانے قلعے کے نزدیک ہے (دیکھیے *ASI, Annual Report* ۱۲ : ۲ ج و لوحہ ۳ ۔ شیرشاہی قلعے کی فصیلوں کے علاوہ اندرونی عمارات میں سے صرف دو باقی رہ گئی ہیں : (۱) شیر منڈل، سرخ پتھر کی ایک دو منزلہ مثمن عمارت، جس کی اصلی غرض بنا معلوم نہیں ، لیکن ہمایوں اسے کتب خانے کے طور پر استعمال کرتا تھا اور اسی (کے زینے) سے گر کر فوت ہوا تھا؛ (۲) ایک مسجد، جس کا کوئی الگ نام نہیں ہے اور جس کا سب سے قریبی نمونہ جمالی مسجد ہے، لیکن اس میں عرضاً پانچوں دالانوں کی روکار کی کمان کسی قدر چھوٹی اور نیچی ترشی ہوئی سطح کے خانے میں بنائی ہے اور سابق الذکر مسجد کے دوسرے اجزا کو بھی بہتر و نفیس تر کر دیا گیا ہے ۔ بیرونی چنائی تراشیدہ پتھر کے چوکوں سے کی گئی ہے اور "ایوان" کا سہرا سنگ سرخ کا ہے؛ اس کے کچھ حصے میں نفیس نقش تراشے ہیں اور سنگ مرمر اور رنگا رنگ کی کاشی کاری سے اس کی تزئین کی گئی ہے؛ وسطی گنبد کے اندرونی حصے کو ڈاٹوں کے دو سلسلوں پر قائم کیا ہے اور بغلی دالانوں کی چھت جن کروی گوشوں پر رکھی ہے ان میں آرائشی طاقچے بنائے ہیں ۔ عقبی دیوار میں محراب قبلہ جو آگے نکلی ہوئی ہے اس کے دونوں پہلوؤں پر مخروطی شکل کے مینار ہیں اور ہر گوشے پر کولی ہشت پہلو برجیاں بنی ہیں.

دہلی میں مغلوں کی پہلی بڑی عمارت شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ ہے، جس کا طرز وہی ہے جس کا نقشہ پہلے نظام الدّین میں اتگہ خان کے چھوٹے سے مقبرے کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے ۔ اس کی بنیادیں اس کی بیوہ نے ۹۷۶ھ/۱۵۶۸-۱۵۶۹ع میں رکھی تھیں

(دیکھیے سنگین بیگ : سیر المنازل، مخطوطہ در عجائب خانۂ لال قلعہ، دہلی)؛ مگر بقول سید احمد خان ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء میں، جس کی بعد کے بیشتر مصنفین پیروی کرتے ہیں) اور اس کے لیے اس نے ایرانی ماہر تعمیرات مرزا غیاث کو مامور کیا تھا۔ بایں ہمہ احاطے کی دیوار کوئی پانچ برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ روضے کی عمارت ایک بڑے باغ کے احاطے میں ہے (۳۴۰ میٹر ضلع؛ یہ ہندوستان میں پہلا چار باغ ہے جو ابھی تک اپنے اصلی نقشے پر قائم ہے)؛ یہ عمارت ۴۷،۵ میٹر مربع ہے اور ۹۵ مربع میٹر کرسی پر بنائی ہے، جو ۴۷ میٹر اونچی ہے۔ عمارت کے چاروں رخ یکساں ہیں۔ ہر رخ کے وسطی مستطیل کے اندر بڑی لمبی چوڑی محراب ہے اور دونوں طرف دو چھوٹے بازو ہیں، جن میں سے ہر ایک میں نسبۃً چھوٹی محراب ہے؛ یہ بازو نقشے میں ہشت پہلو اور بڑی محرابوں کے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ وسطی دالان کے اوپر اونچا گردنا اور بصلی گنبد قائم ہے، جس کے اردگرد بازووں اور دالانوں کے اوپر چھتریاں ہیں۔ عمارت ساری کی ساری سنگ سرخ کی ہے، جس میں سفید اور رنگین سنگ مرمر کا استعمال فراخدلی سے کیا گیا ہے۔ نواحی عمارتیں یہ ہیں: نائی کا گنبد، یعنی حجام کا ایک چھوٹا مقبرہ؛ نیلا گنبد، جو ہمایوں کے مقبرے سے پہلے کا ہے (لہٰذا فہیم خان م ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کا نہیں ہے، جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے)؛ "افسر والا" مقبرہ اور مسجد؛ عرب سرائے اور عیسٰی خان کا مقبرہ، جس کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ان عمارات کی مکمل تفصیلات در S.A.A. Naqvi: *Humāyūn's tomb and adjacent buildings*، دہلی ۱۹۴۷ء)۔ جنوب میں قریب ہی عبدالرحیم [رک بآں] خانخاناں (م ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶-۱۶۲۷ء) کا مقبرہ ہے، جو اسی قسم کی، مگر نسبۃً چھوٹی عمارت ہے اور اس کے گوشوں میں ہشت پہلو کمرے نہیں؛ لہٰذا یہ ہمایوں کے مقبرے کی بہ نسبت واضح طور پر تاج محل کی پیشرو ہے۔ اس عمارت کے سنگ مرمر کو بعد میں آصف الدولہ، وزیر اودھ، اتار کر لے گیا تھا۔ دیگر مغل عمارات یہ ہیں: لال چوک یا خیرالمنازل؛ مؤخر الذکر نام مادۂ تاریخ ہے (۹۶۹ھ/۱۵۶۱-۱۵۶۲ء)؛ ایک مسجد، جسے اکبر کی انا ماہم انگہ نے تعمیر کرایا تھا؛ اس کے مشرق، جنوب اور شمال میں دو منزلہ دالان ہیں، جو مدرسے کا کام دیتے تھے (*ASI, Annual Report*، ۲۲ : ۹ و لوحہ ۱ الف و ب؛ کتبہ *Memoir ASI*، ۳۴ : ۱۰) اور شیخ عبدالنبی یعنی اکبر کے صدر الصدور کی بنائی ہوئی مسجد، جو فیروز شاہ کے کوٹلہ اور پرانے قلعے کے درمیان ہے اور ۹۸۳ھ/۱۵۷۵-۱۵۷۶ء میں تعمیر ہوئی (دیکھیے ظفر حسن : *Mosque of Shaikh Abdu-n Nabi*، (*Memoir ASI* ج ۹)، کلکتہ ۱۹۲۱ء۔

دہلی میں مغلیہ تعمیرات کا سب سے بڑا دور وہ ہے جب شاہجہان آباد اور لال قلعے کی تعمیر ہوئی؛ مؤخر الذکر کی بنیاد ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں رکھی گئی تھی۔ مغلیہ محلات اور دیگر عمارات کی اہم خصوصیات کے لیے رک بہ فن: مغل۔ یہاں فقط مختصر سا حال دیا جاتا ہے۔ محل کا احاطہ تقریباً ۹۵۰ × ۵۰۵ میٹر اور اس کے وسطی صحن میں دیوان عام ہے۔ اس کے دونوں جانب پھر کھلے صحن ہیں، جن میں باغات ہیں۔ مشرقی فصیل کے ساتھ محلات کا جو سلسلہ ہے اس کا رخ اندر کی طرف ان باغات کی جانب اور باہر کی طرف دریا کی جانب ہے۔ دیوان عام سنگ سرخ کا ہے، جس کے کھلے ضلعوں میں دُہرے نازک ستون ہیں۔ ان میں اور جانب مشرق محلات میں دندانے دار محرابیں ہیں۔ یہ عمارتیں نیچی کرسیوں پر بنائی گئی ہیں اور ان میں سے بہتوں کی چھت کے ہر گوشے پر کھلی چھتریاں ہیں۔ محلّات میں سے ایک آرائشی نہر، جس کا نام نہر

بہشت ہے، گزرتی ہے۔ یہ شاہ برج سے جنوب کی طرف بہتی ہے اور اس کا پانی تیس کوس دور اوپر جا کر دریاے جمنا سے لایا جاتا تھا (مغربی نہر جمنا کے ذریعے؛ اس کی تاریخ فیروز شاہ تغلق کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ پوری کیفیت کے لیے دیکھیے *History and description of Govern-* : I. J. Hatten *ment canals in the Punjab* لاہور بدون تاریخ، ص ۱ تا ۳)۔ لال قلعے کی مذکورہ نہر سادہ سنگ مرمر کی بنائی ہے، جو رنگ محل میں پہنچ کر ایک حوض میں جا گرتی ہے، جس میں سنگ مرمر کا کنول نصب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ نہر ایک پردے کی دیوار کے نیچے نیچے، جس پر "میزان عدل" کی تصویر ترشی ہوئی ہے، شاہی محل کے نجی کمروں سے گزر کر آتی ہے۔ ان کمروں کے آگے باہر کو نکلا ہوا وہ جھروکا یعنی مثمن برج ہے، جس سے شہنشاہ درشن [رک بآں] دیا کرتا تھا۔ ان محلات میں رنگ محل اور دیوان خاص کی سب سے زیادہ اور انتہائی پرتکلف تزئین کی گئی ہے۔ ان کی تعمیر اور فرش بندی سفید سنگ مرمر سے ہوئی ہے اور محرابوں کے ستونوں میں سیپ اور نگینے جڑ کر بیل بوٹے بنائے ہیں۔ اس دیوان خاص میں بیش بہا تخت طاؤس رکھا تھا، جسے نادر شاہ ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں ایران لے گیا اور وہاں اسے تڑوا دیا (*Persia* : G. N. Curzon، *and the persian question*، ۱ : ۳۲۱ تا ۳۲۲)۔ ابتدا میں قلعے کے اندر کوئی مسجد نہیں تھی۔ موتی مسجد کا اضافہ اورنگ زیب نے ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲-۱۶۶۳ء میں کیا تھا۔ یہ کلیۃً سفید سنگ مرمر کی ہے، جس کے وسطی حصے میں اوپر مڑی ہوئی "بنگلی" منڈیر قابل دید ہے (قلعے اور اس کی عمارات کے لیے دیکھیے *A Guide to the buildings and gardens* : G. Sanderson، *Delhi Fort*، بار چہارم، دہلی ۱۹۳۷ء)۔

شاہجہان آباد کی جامع مسجد (جس کا نام مسجد جہاں نما ہے) ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۸ء تا ۱۰۵۹ھ/۱۶۵۰ء میں تعمیر ہوئی، لال قلعے کے مغرب میں ایک کھلے میدان میں موجود ہے۔ اس کی بلند بنیادی منزل، جس کی تمام سمتوں میں خفی محرابیں ہیں، کوہ اراولی کے ایک الگ تھلگ ٹیکرے پر اٹھائی گئی ہے۔ شمال، مشرق اور جنوب کے دروازوں میں پہلے باہر کے رخ نصف گنبد کی شکل کا کھلاؤ ہے پھر سب میں نیچے کے رخ نسبۃً چھوٹا دروازہ ہے۔ مشرقی دروازہ، جو شاہی داخلے کے لیے استعمال ہوتا تھا، سب سے بڑا ہے۔ "لیوان"، جو صحن کے تین جانب بنا ہے، باہر کی طرف بھی کھلا ہوا ہے اور اس میں ایک تو چوکور برج ہے اور اوپر چھت کے ہر گوشے پر ایک کھلی چھتری محیط ہے۔ مغرب میں اصل مسجد یا ایوان صلوۃ دوسرے اجزا سے الگ مستقل دالان ہے، جو ۹۷ میٹر × ۲۷ء۵ میٹر ہے۔ اس سے متصل صحن مسجد (۹۹ مربع میٹر) کی طرف بہت چوڑی مرکزی محراب ہے اور اس کے دونوں جانب عرضاً پانچ پانچ دالان دندانہ دار محرابوں کے ہیں۔ سامنے کے دونوں سروں پر ایک ایک سہ منزلہ مینار ہے۔ اوپر تین سفید سنگ مرمر کے بصلی گنبد ہیں، جن میں سیاہ سنگ مرمر کی باریک عمودی دھاریاں ڈالی گئی ہیں۔ اس کی قریب ہمعصر فتح پوری مسجد چاندنی چوک کے مغربی کنارے پر ہے۔ یہ شاہجہان آباد کا خاص بازار ہے۔ مسجد اسی طرز کی ہے جیسی جامع مسجد، مگر نفاست کم ہے اور اس میں صرف ایک ہی گنبد ہے؛ اس کے احاطے میں مسجد کا مدرسہ ہے۔ اسی طرز کی ایک نسبۃً چھوٹی مسجد، جس میں تین گنبد ہیں اور جو زیادہ پیاز نما ہیں اور جن میں مساوی طور پر سیاہ اور سفید سنگ مرمر کی دھاریاں ہیں، زینت المساجد ہے، جو حدود ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں شاہجہان آباد کے مشرق (یعنی کنار جمنا کے) حصے میں تعمیر ہوئی تھی۔

عہد مغلیہ کے آخری دور کی مندرجۂ ذیل

عمارتوں کا ذکر بھی کر دینا چاہیے: موتی مسجد، جو مہرولی میں حضرت قطب الدّین بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں ہے (بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں)؛ غازی الدین پدر آصف جاہ کا مقبرہ، مدرسہ اور مسجد: تینوں کی مجموعی عمارت کا نقشہ سینگ کی شکل کا ہے اور شاہجہان آباد کے اجمیری دروازے کے باہر ہے (سن بنا ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء)، جس میں اینگلو عربک کالج ابھی تک چل رہا ہے؛ قدسیّہ باغ کا دروازہ (حدود ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء)؛ اسی عہد کی جاوید خان کی چھوٹی سی نفیس مسجد (سنہری مسجد)، جو ھلکے بادامی رنگ کے کھُردرے پتھر کی ہے؛ صفدر جنگ (م ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء) کا اسی پتھر سے نہایت متناسب بنایا ہوا مقبرہ جو مغلوں کے آخری بڑے باغ میں قائم ہے۔ ایک برطانوی عمارت بھی قابل ذکر ہے اور وہ سینٹ جیمز کا گرجا ہے، جسے کرنل جیمز سکنر J. Skinner نے ۱۸۲۴ء میں پالاڈی (Palladian) طرز پر تعمیر کرایا تھا۔ نئی دھلی کے بہت وسیع تعمیری منصوبے کہیں کہیں مغلیہ تعمیر کی عظمت کی یادوں کو تازہ کرتے ھیں، لیکن اسلامی فن تعمیر کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔

مآخذ: خصوصی مقالات اور رسالوں کا ذکر متن میں کر دیا گیا ہے۔ عام تصانیف: (۱) H. C. Fanshawe: *Delhi Past and Present*، لنڈن ۱۹۰۲ء؛ (۲) H. Sharp: *Delhi: its story and buildings*، لنڈن ۱۹۲۱ء؛ (۳) G. Hearn: *The seven cities of Delhi*، کلکتہ ۱۹۲۸ء، (عام طور پر معتبر نہیں)؛ (۴) P. Brown: *Indian Architecture: Islamic period*، بمبئی بدون تاریخ، بمواضع کثیرہ؛ (۵) سیّد احمد خان: آثار الصنادید، دہلی ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء؛ بار دوم، دہلی ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء و لکھنؤ ۱۸۷۶ء، ۱۹۰۰ء و کانپور ۱۹۰۴ء؛ فرانسیسی ترجمہ از Garcin de Tassy، در *JA*، سلسلۂ پنجم، ۱۵: ۵۰۸ تا ۵۳۶ و ۱۶: ۱۹۰ تا ۲۵۴، ۳۹۲ تا ۴۵۱، ۵۲۱ تا ۵۴۳ و ۱۷: ۵۵۱ تا ۵۶۰؛ (۶) Carr Stephen: *The archaeology and monumental remains of Delhi*، شملہ وغیرہ ۱۸۷۶ء؛ (۷) *Journal of the Archaeological Society of Delhi*، ۱۸۵۰ء، بمواضع کثیرہ؛ (۸) J. Ph. Vogel: *Catalogue of the Delhi museum of archaeology*، کلکتہ ۱۹۰۸ء، تکملہ ۲: *The Sultans of Delhi and their existing monuments* ...، ص ۹۰؛ (۹) W. Franklin: *An Account of the present state of Delhi*، در *Asiatick Researches*، ۴ (۱۷۹۵ء): ۴۱۹ تا ۴۳۲؛ دہلی میں کتبوں کے لیے دیکھیے خصوصاً (۱۰) J. Horovitz: *A list of the published Mohammedan inscriptions in India*، در *EIM*، ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء، ص ۳۰ تا ۱۴۴؛ (۱۱) *Memoir ASI*، ج ۴۷؛ (نیز دیکھیے) (۱۲) A. Cunningham: *Archaeological survey of India*، ج ۱، شملہ ۱۸۷۱ء؛ (۱۳) A. Harcourt: *The New Guide to Delhi*، میرٹھ ۱۸۷۰ء؛ (۱۴) محمد ریاض الدین امجد: سیر ریاض، آگرہ ۱۸۷۶ء؛ (۱۵) عبدالغفور: آثار المتاخرین، دہلی ۱۸۷۵ء؛ (۱۶) مرزا حیرت: چراغ دہلی، دہلی ۱۹۰۳ء؛ (۱۷) سیّد احمد دہلوی: یادگار دہلی، دہلی ۱۹۰۱ء؛ (۱۸) نواب علی نور: سیر دہلی، دہلی ۱۹۱۱ء؛ (۱۹) بشیر الدین احمد: واقعات دارالحکومت دہلی، آگرہ ۱۹۱۹ء؛ (۲۰) حسن نظامی: سیر دہلی، بار پنجم، دہلی ۱۹۲۷ء؛ (۲۱) *Ency. Brit.*، بذیل مادّہ۔

(J. BURTON-PAGE)

دہلی سلطنت: رک بہ ہند۔

⊗ **دہلی کالج:** ۱۸۲۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی قائم کردہ مجلس تعلیم عامّہ نے ملک کے تعلیمی حالات کی چھان بین شروع کی۔ دہلی کی مقامی مجلس تعلیم نے مدرسۂ غازی الدین خان میں کالج کے قیام کی سفارش کی۔ مشرقی علوم کی یہ درسگاہ ۱۷۹۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں کمپنی کی حکومت کی سرپرستی میں دہلی کالج کی تنظیم جدید عمل میں آئی۔ ایسٹ

انڈیا کمپنی کے منتظمین کی سفارش پر برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ منظور کیا، جس میں سے پانچ سو روپے ماہوار دہلی کالج کے لیے مقرر کیے گئے۔ یہاں عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۹۲۸ءمیں دہلی کالج میں انگریزی زبان کی تعلیم بھی دی جانے لگی، لیکن عام مخالفت کی وجہ سے انگریزی جماعت مشرقی شعبے سے برائے نام علاحدہ کر دی گئی۔ دہلی کالج کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں السنہ و علوم کا ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔ ۱۸۳۵ء میں ہندوستان میں نئے تعلیمی نظام کا نفاذ ہوا، جس میں نہ صرف مغربی علوم میں بلکہ عربی، فارسی، سنسکرت کے لیے بھی ذریعۂ تعلیم انگریزی کو قرار دیا گیا تھا، لیکن دہلی کالج کا ذریعۂ تعلیم اردو ہی رہا۔ ۱۸۴۴ء میں مغربی اور مشرقی شعبوں کا نصاب تعلیم یکساں کر دیا گیا۔ کالج میں حساب، جیومیٹری، الجبرا، طبیعی فلسفہ، طبیعیات، جغرافیہ، تاریخ، معاشیات، اصول قانون وغیرہ مضامین داخل نصاب تھے۔ مغربی شعبے میں انگریزی اور مشرقی شعبے میں اردو ذریعۂ تعلیم تھا۔ نصابی کتب کی کمیابی کی وجہ سے شروع میں تعلیم زیادہ تر لیکچروں کی صورت میں دی جاتی تھی۔ مسٹر کارگل، پرنسپل، اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "مشرقی شعبے کا طالب علم سائنس کی تعلیم میں آگے بڑھ رہا ہے اور کسی طرح اپنے حریف یعنی انگریزی شعبے کے طالب علم سے پیچھے نہیں ہے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ مناسب کتابوں کے نہ ہونے سے وہ بخوبی اس علم کو حاصل نہیں کر سکتا جو کتابوں کے موجود ہونے سے کر سکتا ہے" (مرحوم دہلی کالج، ص ۱۰)۔

اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ۱۸۴۳ء میں "دہلی ورنکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" قائم کی گئی۔ اس انجمن نے علوم و فنون کی کتابوں کو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے چند قواعد بھی وضع کیے (مرحوم دہلی کالج، ص ۱۲۵ ببعد)۔ مسٹر بتروس، پرنسپل (تقرر ۱۸۴۱ء)، نے انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ کرانا شروع کر دیا تھا، انجمن کے قیام سے یہ سلسلہ ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ کالج کے اساتذہ اور ذہین طلبہ پرنسپل کی نگرانی میں ترجمہ کرتے، جس کا انھیں فی صفحہ معاوضہ دیا جاتا۔ ترجمہ مکمل ہونے پر ہر کتاب کے ایک ایک سو نسخے طبع کرا کے نصاب میں داخل کر دیے جاتے۔ ان ترجمہ شدہ کتب کے متعلق یہ قرار پایا تھا کہ مدرسین پڑھاتے وقت تمام غلطیوں اور مبہم جملوں وغیرہ پر نظر رکھیں جو اُن کی رائے میں قابل اصلاح ہوں اور بعد میں پرنسپل کے مشورے سے دوسرے ایڈیشن میں اصلاح کر لی جایا کرے؛ اس طرح ہر ترجمہ گو شروع میں کیسا ہی ناقص کیوں نہ ہو، آخر میں تمام غلطیوں سے پاک و صاف ہو جائے گا۔ ۱۸۴۵ء میں مسٹر بتروس کی سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر سپرنگر پرنسپل مقرر ہوے۔ ان کے عہد میں بھی تالیف و ترجمے کا کام بڑی سرگرمی سے جاری رہا۔ پہلے درسی کتب کے تراجم کیے گئے، پھر دوسری کتابیں بھی تالیف و ترجمہ ہونے لگیں۔ جب کسی انگریزی کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہو کر چھپ جاتا تو وہ کتاب دہلی کالج کے مشرقی شعبے میں بالکل اسی طرح کام آتی جس طرح مغربی شعبے میں اصل انگریزی کتاب کام آتی تھی۔ اُردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی سعی تھی جو خاص اصول اور قاعدے کے ساتھ عمل میں آئی۔ ٹرانسلیشن سوسائٹی نے ریاضی، جیومیٹری، قانون، تاریخ، ہیئت، کیمیا، جغرافیہ، طبیعی فلسفہ، معاشیات، نباتیات، عضویات، طبیعیات، طب، لسانیات، صرف و نحو، شعر و ادب وغیرہ مختلف موضوعات پر کم و بیش ۱۱۷ کتب تالیف و ترجمہ کرائیں (فہرست کے لیے دیکھیے مرحوم دہلی کالج، ص ۱۳۷ ببعد)۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دہلی کالج کو سخت

نقصان پہنچا اور اس کا ساز و سامان تباہ ہوگیا۔ ۱۸۶۴ء میں کالج دوبارہ جاری ہوا، لیکن اس کی صورت بہت کچھ بدل گئی تھی۔ کالج کا تعلق پنجاب گورنمنٹ سے تھا، لیکن طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں امتحان دیتے تھے اور وہیں کا نصاب تعلیم رائج ہو گیا تھا، جس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی تھی۔ کالج میں اردو کا چرچا کم ہوگیا اور ترجمہ و تالیف کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ ۱۸۷۷ء میں دہلی کالج ٹوٹ گیا اور اس کا عملہ گورنمنٹ کالج میں منتقل ہو گیا.

مآخذ: (۱) مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد؛ (۲) Ram Babu Saksena: *A History of Urdu Literature*، ص ۱۹۲ و اردو ترجمہ: تاریخ ادب اردو، از محمد عسکری، مطبع نولکشور، بار دوم، حصۂ نثر، ص ۲۷۰؛ (۳) محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی، دہلی ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۰ ببعد؛ (۵) H.L.O. Garret: *A History of the Government College, Lahore* ۱۹۱۴ء، ص ۲۵؛ (۶) سی۔ ایف اینڈریوز: ذکاء اللہ دہلوی (ترجمہ ضیاء الدین برنی)، کراچی ۱۹۵۱ء، ص ۶۵ ببعد.

(غلام حسین ذوالفقار)

* **اَلدَّهْناء**: سعودی عرب میں، صحرائے نَفُود کا ایک طویل و تنگ محراب نما قطعہ، جس کا عرض دس سے لے کر ۷۰ کیلومیٹر تک ہے اور مجموعی طور پر ایک ہزار کیلومیٹر سے زائد لمبائی میں ایک شرق رویہ خمدار خط کے گرد پھیلا ہوا ہے، جو شمال مغرب کے نفوذ اعظم کو جنوب کے (اَلرُّبع الخالی [رَکَ بآں]) سے ملا دیتا ہے۔ کناروں کے ماسوا اس کا باقی حصہ پانی کے قدرتی وسائل سے عاری ہے، لیکن چراگاہ کے طور پر یہ ایک مقبول عام خطّہ ہے۔

گزشتہ زمانے میں یہ الیمامہ کے اندرونی علاقے کو البحرین کے ساحلی خطے سے جدا کرتا تھا، لیکن آج کل نجد کے صوبے اور مشرقی صوبے (۱۹۵۳ء تک الحساء یا الأحساء کا صوبہ) کے درمیان ایک غیر رسمی حد فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس کا مغربی کنارہ بڑی حد تک اس علاقے کی مغربی حد کی تشکیل کرتا تھا جہاں سے تیل نکالنے کا اجارہ ۱۹۳۳ء میں امریکی کمپنی کو دیا گیا تھا، تاہم اس علاقے کی حدود اس سے بھی زیادہ مغرب کی جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں تیل کے بہتر کنویں کی کھدائی سے اس ریگستان میں، نیز مشرقی سمت میں اس سے ملحق علاقے میں تیل کا ایک خطہ دریافت ہوا، جو خُرَیص کا خطّہ کہلاتا ہے اور غوار کے بڑے خطّے کے تخمیناً ۱۲۰ کیلومیٹر مغرب میں اور الہفوف (الحساء کے نخلستان میں) کے تقریباً ۱۵۰ کیلومیٹر مغرب میں واقع ہے.

الدّهناء ریتلے صحراء کے ان دو متوازی ٹکڑوں میں سے مشرقی اور نسبۃً بڑا مسلسل ٹکڑا ہے جو النّفود سے بحیثیت مجموعی جنوب مشرق کی سمت میں پھیلے ہوئے ہیں (دیکھیے جزیرۃ العرب، بالخصوص ص ۵۳۶ الف).

مآخذ: علاوہ ان جغرافیہ نگاروں اور مؤرخین کے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے (۱) Admiralty: *A Handbook of Arabia*، لنڈن ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء؛ (۲) حدود العالم (طبع Minorsky)، لنڈن ۱۹۳۷ء؛ (۳) ابن بُلَیہد: صحیح الأخبار، قاہرہ ۱۳۷۰ھ؛ (۴) R.E. Cheesman: *In Unknown Arabia*، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۵) H.R.P. Dickson: *The Arab of the Desert*، لنڈن ۱۹۴۹ء؛ (۶) وہی مصنف: *Kuwait and Her Neighbours*، لنڈن ۱۹۵۶ء؛ (۷) ابن جُبَیر: الرِّحلۃ طبع Wright، لائڈن ۱۹۰۷ء؛ (۸) D.G. Hogarth: *The Penetration of Arabia*، لنڈن و نیویارک ۱۹۰۴ء؛ (۹) G.E. Leachman: *A Journey in Northeastern Arabia*، در *G J*، ج ۳۷، ۱۹۱۱ء؛ (۱۰) وہی مصنف: *A Journey through Central Arabia*، در *G J*، ج ۴۳، ۱۹۱۴ء؛ (۱۱) G. Rentz، Roy Lebkicher

M Steinike: The Arabia of Ibn Saud، نیویارک ۱۹۵۱ء؛ (۱۲) J. G. Lorimer: Gazetteer of the Persian Gulf, Oman, and Central Arabia، کلکتہ ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۵ء؛ (۱۳) Alois Musil: Northern Neǧd، نیویارک ۱۹۲۸ء؛ (۱۴) W. G. Palgrave: Central and Eastern Arabia، لنڈن ۱۸۶۵ء؛ (۱۵) Lewis Pelly: A Visit to the Wahabee Capital, Central Arabia، در JRGS، ج ۳۵، ۱۸۶۸ء؛ (۱۶) H. St. J. B. Philby: Across Arabia: the Persian Gulf to the Red Sea، در GJ، ج ۵۶، ۱۹۲۰ء؛ (۱۷) وہی مصنف: The Heart of Arabia، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۱۸) وہی مصنف: The Empty Quarter، نیو یارک ۱۹۳۳ء؛ (۱۹) Barclay Raunkiaer: Gennem Wahhabiternes Land paa Kamelryg، کوپن ہیگن ۱۹۱۳ء؛ (انگریزی ترجمہ نقشوں اور تصویروں کے بغیر: Through Wahabiland on Camel-Back، قاہرہ ۱۹۱۶ء؛ جرمن ترجمہ از W. Schmidt: Auf dem Kamelrücken durch das Land der Wahhabiten، ۱۹۱۷ء)؛ (۲۰) امین ریحانی: Ibn Sa'oud of Arabia، لنڈن ۱۹۲۸ء؛ (۲۱) G. F. Sadlier: Account of a Journey from Katif... to Yamboo..., Transaction... Lit. Soc. Bombay، ج ۳، لنڈن ۱۸۲۳ء؛ (۲۲) وہی مصنف: Diary of Journey Across Arabia، طبع P. Ryan، بمبئی ۱۸۶۶ء؛ (۲۳) عمر رضا کحالۃ: جغرافیۃ شبہ جزیرۃ العرب، دمشق ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء؛ (۲۴) Ferdinand Wüstenfeld: Die Strasse von Baçra nach Mekka...، در Abh. K. G. W. Gött، ج ۱۶، ۱۸۷۱ء؛ (۲۵) وہی مصنف: Bahrein und Jemâma, nach Arabischen Quellen، ج ۱۹، ۱۸۷۴ء۔

نقشے: وزارت مالیات و قومی معاشیات (مملکت سعودی عرب) اور وزارت خارجہ (امریکہ) کی مشترکہ سرپرستی میں شعبۂ مساحت ارضیات، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور عرب امریکی آئل کمپنی کے نقشوں کا سلسلہ۔ پیمانہ ۱ : ۲۰۰۰۰۰۰ (جغرافیائی): "جزیرۂ عرب"، نقشہ ۱ - ۲۷۰ B-I (۱۹۵۰ء)۔ پیمانہ ۱ : ۵۰۰۰۰۰ (جغرافیائی): جنوبی طویق، نقشہ ۱ - ۲۱۲ B (۱۹۵۶ء)؛ شمالی طویق نقشہ ۱ - ۲۰۷ B (۱۹۵۷ء)؛ مغربی خلیج فارس، نقشہ ۱ - ۲۰۸ B (۱۹۵۸ء)؛ درب زبیدہ، نقشہ ۱ - ۲۰۲ B (زیر طبع ۱۹۶۰ء)۔ The Times Atlas of the World، طبع Bartholomew، Mid Century Edition، نقشۂ عرب در جلد ۲، لنڈن ۱۹۶۰ء [نیز دیکھیے آآ، لائڈن، بار دوم، بذیل مادّہ]۔

(C. D. MATTHEWS [تلخیص از ادارہ])

دَہْنَج: فارسی دہنۃ، دہانۃ، مرمر سبز (سبز سنگ مرمر)؛ ترکی: دہنۂ فرنگی؛ انگریزی: malachite؛ تانبے کی معروف سبز رنگ کی خام دھات۔ رسائل اخوان الصفا میں اس دھات کے بارے میں جو بیان ہے اس کا تعلق نام نہاد ارسطاطالیسی دور کی حکائی سے ہے۔ اس بیان کی رُو سے جب تانبے کی کانوں میں گندھک کے بخارات تانبے میں سرایت کر جاتے ہیں تو سبز رنگ کا پرت دار پتھر بن جاتا ہے۔ اس کے رنگ کو زَبَرْجَد (chrysolith) کے رنگ سے مشابہ بتایا گیا ہے، تاہم یہ مختلف رنگتوں میں ظاہر ہوتا ہے: گہرا سبز، دھاری دار (veined)، مور کے پروں کی رنگت اور ہلکا سبز اور سبز رنگ کی دوسری اقسام۔ بعض اوقات زمین کے اندر تہ در تہ شکل اختیار کرنے کے دوران میں ایک ہی ٹکڑے میں یہ سب رنگتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ پتھر نرم ہوتا ہے، لیکن ایک زمانے کے بعد اس کی چمک دمک زائل ہو جاتی ہے۔ بلیناس (= اپولونیوس تیانوی) کے تتبّع میں تیفاشی بیان کرتا ہے کہ کس طرح بہترین تانبا اس پتھر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ مصر، کرمان اور خراسان سے ایک قسم کا نیا اور پرانا دہنج دستیاب ہوتا ہے۔ سب سے اعلٰی قسم پرانا کرمانی پتھر ہے۔ یہ قدیم مصری مقابر میں بالعموم تعویذوں (scarabs)، چھوٹی چھوٹی مورتیوں اور تراشے ہوئے پتھروں کی شکل میں پایا گیا ہے۔ دہنج کے بارے میں ایک مفصل بیان الرازی [illegible] ہے،

جو امور ذیل سے بھی بحث کرتا ہے: (۱) اس کی تکلیس (اس کی تحلیل اور اس میں شامل گندھک اور تیل کا جل جانا)، جس کے عمل کے چار طریقے ہیں؛ (۲) نمکیات اور سہاگے کی وجہ سے اس کا مٹی بن جانا؛ ہر ایک بجاے خود چار طرح سے عمل کرتا ہے۔

سفوف کی شکل میں سرکے کے ساتھ اس کا استعمال زہر کا اثر زائل کرنے کے لیے بہت مفید سمجھا جاتا ہے؛ اس کے برعکس یہ اس شخص کے لیے مضرت رساں ہے، جسے زہر نہ دیا گیا ہو؛ چنانچہ اس صورت میں یہ اعضا میں خطرناک سوزش پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اسے بچھو یا شہد کی مکھی کے کاٹے پر مل دیا جائے تو تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ یہ جذام اور آشوب چشم کے لیے داروے شفا ہے۔ شاعری میں اس لفظ کے استعمال کی مثال الشَّمّاخ کے کلام میں مل سکتی ہے (LA، بذیل مادۂ دہنج)۔

مآخذ : (۱) رسائل اخوان الصفا (مطبوعۂ بمبئی)، ۲ : ۱۰۸؛ (۲) التیفاشی : ازہار الافکار، مترجمۂ C. Raineri، Bisdia، طبع جدید، Bologna ۱۹۰۶ء، ص ۹۰)؛ (۳) القزوینی : عجائب المخلوقات (Cosmography)، طبع Wüstenfeld)، ۱ : ۲۳۳؛ (۴) ابن البیطار (طبع بولاق ۱۲۹۱ھ)، ۲ : ۱۱۷ ببعد؛ (۵) Leclerc : Traité des Simples، ۲ : ۱۳۲؛ (۶) Clément-Mullet، در JA، سلسلۂ ششم، ۱۱ (۱۸۶۸ء) : ۱۸۵ ببعد؛ (۷) Steinschneider، در WZKM، ۱۲ (۱۸۹۸ء) : ۱۳۰؛ (۸) Ruska : Das Steinbuch aus der Kosmographie des Al-Qazwini (Beilage zum Jahresbericht 1895-96 der prov. Oberrealschule zu Heidelberg، ص ۲۲؛ (۹) وہی مصنف : Das Steinbuch des Aristoteles، ص ۱۰۳ ببعد، ۱۳۵ تا ۱۳۷؛ (۱۰) وہی مصنف : Al-Razi's Buch Geheimnis der Geheimnisse، ص ۳۳، ۸۶، ۱۰۹ ببعد، ۱۷۷ ببعد، ۱۹۵ ببعد؛ (۱۱) Barhebraeus : منتخب کتاب جامع المفردات لاحمد ۔ ۔ ۔ الغافقی (طبع Meyehof و Sobhy)، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ۲/۱ : ۱۱۷ (عربی متن) و ص ۵۲ (انگریزی ترجمہ)؛ (۱۲) Wiedemann : Beiträge، ۳۰ : ۲۲۷ (= SBPMS Erlg.، ج ۴۴، ۱۹۱۲ء)، بہ تتبع ابن الاکفانی : نخب الذخائر۔

(A. DIETRICH)

* **دِہْ ہانی** : خوجہ، ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی کا اناطولوی شاعر، "دیوان" (یعنی غزل کی) شاعری کا قدیم ترین نمائندہ۔ اس کی زندگی کے متعلق بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ خراسان سے آیا تھا اور ایک زمانے میں سلجوق سلطان علاء الدین کیقباد سوم کے دربار میں تھا، جس کے لیے اس نے بیس ہزار شعروں کا سلجوق شاہنامہ لکھا، جو ہم تک نہیں پہنچا (M. F. Koprulu : Anadolu Selcuklu Tarihinin Yerkli Kaynakari، در Belleten، ۷ : ۲۷ ۳۹۶ تا ۳۹۷)۔ اس کی صرف دس غزلیں باقی بچی ہیں۔ انھیں کئی "نظیرہ" مجموعوں سے اکٹھا کیا گیا ہے اور وہ ۱۹۲۶ء اور اس کے بعد سے شائع ہوتی رہی ہیں (دیکھیے مآخذ)۔ اپنے ہم عصروں کے برعکس وہ متصوفانہ یا ناصحانہ موضوعات کو نہیں چھیڑتا، بلکہ عروض کی حیرت انگیز مہارت کے ساتھ بڑے رواں انداز میں عشق مجازی، شراب اور صاحب دیوان شاعروں کے دوسرے مقررہ موضوعات پر شعر کہتا ہے۔

مآخذ : (۱) کوپرولوزادہ محمد فواد : خوجہ دہ ہانی، در حیات، ۱ : ۱، انقرہ ۱۹۲۶ء؛ (۲) وہی مصنف : Selçuklu devri edebiyati hakkinda bazi notlar، در حیات، ۳ : ۱۰۳، انقرہ ۱۹۲۸ء؛ (۳) Mecdut Mansuroğlu : Dehhānī ve Manzumeleri : xiii asir Anadolu Turkçesi، استانبول ۱۹۴۷ء۔

(FAHIR IZ)

دی : رَکَ بہ دابی۔

دیار بکر : یعنی "بنو بکر کی سرزمین وطن"، جو جزیرہ (العراق) کے شمالی صوبے کا نام ہے۔ یہ اس خطّے کو محیط ہے جو دریاے دجلہ کے منبع سے

بائیں اور دائیں کناروں پر وہاں تک چلا گیا ہے جہاں دریا اپنی شرقاً غرباً گزرگاہ کو تبدیل کرکے جنوب مشرقی جانب مڑ گیا ہے۔ لہٰذا یہ شہر آمد اور حِصْنُ الْحَمَّہ (جرمک) کے شمال مغرب تک آمد کے مغرب اور سِعِرْت تل فافان سے لے کر آرقنین کے خطے تک دریائے دجلہ کا بالائی طاس ہے۔ یاقوت نے یہی وضاحت کی ہے کہ دیار بکر میدانی علاقے سے آگے نہیں جاتا۔

اسے دیار بکر اس لیے کہتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے دوران میں یہ بکر بن وائل [رک بآں] کے قبیلۂ ربیعہ کے ایک ممتاز گروہ کا مسکن بن گیا تھا۔ قبائل بکر قبل از اسلام کی قبائلی جنگوں کے سلسلے میں پہلے ہی عراق میں آ گئے تھے۔ الکوفہ کے خطے میں کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد ان کے گروہ شمال کی طرف پھیل گئے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے عہد فتوحات میں، جب حضرت معاویہؓ شام اور جزیرے کے والی تھے، بعض مُضری اور ربیعی قبائل حکومت کے حکم سے اس خطے کی غیر مقبوضہ اراضی میں بس گئے۔ حضرت معاویہؓ نے مُضریوں کو جس جگہ بسایا اسے دیار مضر، اور جہاں ربیعوں کو بسایا اسے دیار ربیعہ کہنے لگے۔ البلاذری، جو یہ معلومات بہم پہنچاتا ہے، بنو بکر کا ذکر واضح طور پر نہیں کرتا، جو ربیعی گروہ میں شامل تھے، لیکن اغلب یہ ہے کہ وہ اسی طریقے سے اور اسی زمانے میں دیار بکر میں مقیم ہوئے۔ تاہم اس نام سے یہ مراد نہیں کہ یہ علاقہ فقط بنو بکر سے اباد تھا: اسی بنو بکر دوسرے مقامات میں بھی موجود تھے۔

یہ دونوں گروہ چونکہ باہم مل گئے تھے لہٰذا دیار بکر اور دیار ربیعہ دونوں کو بعض اوقات مشترکہ طور پر دیار ربیعہ کے واحد نام سے پکارا جاتا تھا (یاقوت، ۲ : ۶۳۷)۔

دیار بکر کے بڑے بڑے شہر یہ ہیں: آمِد جو دارالحکومت تھا؛ مَیّافارقین؛ حِصْن کَیفا اور اَرْزَن، جو دراصل ارمینیا کا ایک حصہ ہے۔ انتظامی نقطۂ نظر سے دیار بکر کے علاقے کی قسمت عام طور پر وہی رہی جو الجزیرہ کی تھی۔ پھر بھی اس نے بعض اوقات اپنے ہمسایہ ارمینیا کے ساتھ مل کر جداگانہ اور نیم خود مختار حکومت قائم کی اور عہد اسلامی میں بڑے بڑے تاریخی واقعات کا محل و مقام رہا [تفصیل کے لیے دیکھیے [illegible] لائڈن، بار دوم، بذیل مقالہ]۔

یادگاریں: دیار بکر کے موجودہ شہر کے سب سے زیادہ امتیازی خصائص میں ایک بلا شبہہ اس کالے پتھر کے شہر کی اثری دولت ہے جس میں اس کے قدیم محلے بڑی حصہ دار ہیں، جو فصیل بند ہونے سے اس شہر کو اس کی خصوصیت عطا کرتے ہیں اور جنہوں نے سارے قرون وسطٰی کے دوران میں اسے بڑی جنگی اہمیت دی تھی، کیونکہ قدرتی حفاظت کے دیگر ذرائع کی یہاں کمی تھی۔ اس کا حصار ابھی تک محفوظ ہے، لہٰذا قدرتی طور پر اس نے انیسویں صدی عیسوی کے یورپی سیاحوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کیا؛ نیز عرب فتح کے وقت سے جو سیاح بھی اس قلعے کی سیر کو آئے ان سے ستائش حاصل کی (مثلاً ناصر خسرو کا بیان)۔ لیکن جب تک A. Gabriel نے موقع پر باقاعدہ اثری تفتیش نہ کرلی اس مشترکہ مطالعے کا از سرنو آغاز نہیں ہوا جسے پہلے J. Strzygowski اور M. van Berchem فقط عکسی تصاویر کے مواد کی بنا پر انجام دے رہے تھے، اور اس کے بعد ہی تسلیم کیا گیا کہ یہ آثار مشرق قریب میں قرون وسطٰی کے عسکری فن کے سب سے واضح شواہد میں سے ہیں۔ یہاں باقاعدہ طویل و عریض دمس دکھائی دیتا ہے، جس میں زمین کے نشیب و فراز کے مطابق کسی قدر ترمیم کر دی گئی ہے (اصل شہر فی الحقیقت ایک سطح مرتفع کے کنارے پر واقع تھا، دریائے دجلہ کی طرف کی ڈھلانیں اس کی حدبندی کرتی تھیں)؛ پانچ کیلو میٹر سے زائد محیط

کی فصیل اور اس کے بازوؤں پر برج اور جوابی دمدمے بنے ہوئے تھے؛ آگے مصنوعی ڈھلان دے کر خندق تھی جو اب پر ہو چکی ہے۔ فصیل میں کئی یادگار بڑے دروازے تھے اور اب کئی جگہ اس میں شگاف کر دیے گئے ہیں۔ بردۂ فصیل کی خانہ بندی (آٹھ تا بارہ میٹر اونچی، تین تا پانچ میٹر چوڑی، دونوں طرف استرکاری، بیچ میں اینٹ پتھر) اور اس کے اوپر گشت کے راستے کی حفاظت روزن دار منڈیر (= کنگوروں) سے کی گئی ہے اور گشت کے راستے کے بعض خاص خاص مقامات پر محرابی چھتے بنا دیے گئے ہیں؛ پور مربع، کثیرالاضلاع یا گول، مختلف ابھار والے برجوں کی ترتیب، سنگ مل کے مضبوط پیل پائے، جن کے نیچے خانے اور اوپر کمرے یا چبوترے دفاع کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں۔ یہ اور رومن عہد کے بعض تعمیری اجزا جو خردوت، اُرفہ اور ماردین نام کے بڑے دروازوں کے بیرونی گوشوں میں موجود ہیں، یہ سب کتبات کی شہادت کے ساتھ مل کر اس حصار کی قدامت ظاہر کرتے ہیں، جس میں مسلمانوں کی فتح کے بعد بلاشبہہ مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ پھر کیف، ان عمارتوں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں جو بعد میں تعمیر ہوئیں، یعنی ایک طرف تو عہد عباسی میں خصوصاً بڑے دروازوں کی تعمیر نو، جنھیں مُعتضد نے منہدم کرا دیا تھا، پھر المُقتدر نے انھیں دوبارہ تعمیر کروایا، (جیسا کہ ۲۹۷ھ/۹۰۹ء کے کتبات تصدیق کرتے ہیں)، دوسری جانب بنو مروان، بنو سلجوق اور بنو اُرتق کی عمارت، جنھوں نے مختلف اوقات میں مغربی جانب فصیل اور بُرجوں کی جزوی مرمتیں کروائیں (جن کی طرف کتبے اور چُنائی ہی تھوڑی کی موجودگی دونوں اشارہ کرتے ہیں)، یا اور بڑے بڑے وہ عمارتی کام ہیں جن کا ثبوت اُرتقی عہد کے اُلُو بدن اور یدی گردش کے عظیم الجثہ بُرجوں کی تعمیر سے ملتا ہے۔ ان بُرجوں کا قُطر پچیس میٹر سے زائد ہے اور اپنے تہ خانوں اور غلام گردش کے پیچیدہ نظاموں کے ساتھ سابق عمارت کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ آخر میں عثمانی ترکوں کے عہد کے کام ہیں جنھوں نے حصار کی تو صرف مرمت پر قناعت کی لیکن اپنی اہم کوششوں کو قلعے کی طرف لگایا، دھس کے شمال مشرقی کونے پر آگے بڑھایا اور اُرتقوں کے سابق محل کے کھنڈروں کی جگہ اپنی عمارتیں بنوائیں۔

احاطے کے اندر جامع مسجد، یعنی اُلُو جامع قابل ذکر ہے۔ اس کے کتبے بڑی تعداد میں (عمارت کے) غیر متجانس حصوں میں بکھرے پڑے ہیں، جن میں دوبارہ استعمال میں لایا ہوا مسالا غالب نظر آتا ہے۔ عمارت مذکور کی اصل اور تاریخ کے بارے میں یہ کتبے شدید اختلاف کا باعث بنتے رہے ہیں۔ جہاں تک اس عمارت کی اصل حالت اور ان آفتوں (بالخصوص آگ) کا تعلق ہے جن سے ہماری کتابی معلومات کی رُو سے یہ دو چار ہوتی رہی ہے، قرین قیاس نتیجہ یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عمارت خالصۃً اسلامی ہے؛ اور اس میں ملک شاہ کے زمانے سے سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے عثمانی سلاطین تک مختلف فرمانرواؤں کے عہد میں ترمیم و اصلاح ہوتی رہی ہے۔ یہاں چند اُرتقی مدرسوں کا ذکر بھی لازم ہے۔ ان کے بیچوں بیچ صحن ہوتا تھا، اس کے گرد کمانچے اور پھر مسعودیہ اور زنجیریہ مدارس، نیز متعدد عثمانی مساجد کی طرح ایک بہت بڑا اندرونی ایوان ہوتا تھا؛ مسجدوں میں نماز کے دالان کا داخلہ ایک سادہ کمانچے سے ہوتا اور اوپر کثیرالاضلاع ڈھولے پر ایک گنبد بنا دیتے تھے۔ یہ گنبد ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں شہر فتح ہو جانے کے بعد کے سنین میں تعمیر ہوئے۔ اس آخری دَور کے دوسرے دلچسپ آثار، جن سے دیار بکر کی حقیقی معاشی خوشحالی کا پتا چلتا ہے، شہری تعمیرات سے تعلق رکھتے ہیں اور بالکل نئے طرز کی عظیم الشان کاروان سراؤں اور شاندار حویلیوں پر مشتمل ہیں، جو

ایک ہی طرز کی اور عمدہ تراشیدہ پتھروں سے بنی ہوئی ہیں۔

ان مختلف عمارتوں کی ساخت کی خصوصیات کے ذکر میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرون وسطی میں اعلٰی درجے کے ماہرین سنگ تراشوں کا بھی ایک دبستان دیار بکر میں تیار ہو گیا تھا، جس نے نہ صرف فنی اعتبار سے بہت بلند پایہ منبّت کاری کے نمونے ان کی دیواروں پر نقش کیے (ارتقی منبت نقش و نگار میں اکثر حیوانی اشکال ملتی ہیں) بلکہ آرائشی تحریر [خط طغری] کو، جو ان دنوں یادگار عمارتوں کی بیرونی تزئین میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں بہت مقبول تھا، ایک مخصوص اسلوب بخشنے میں تحریک کا کام دیا۔ دیار بکر کی پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں کتبوں والے فیتے جو S. Flury کی (جسے صحیح معنوں میں اس میدان کا پہلا محقق کہا جا سکتا ہے) گہری تحقیق کا موضوع بن چکے تھے، شمالی میسوپوٹیمیا (عراق) کی آرائشی کتابت کی بہترین مثالیں ہیں۔ انہی نے آگے چل کر نواحی علاقوں کو متأثر کیا۔ ان کی آرائش و ترصیع سے "اس حیرت انگیز تنوع کی اہمیت بہت نمایاں ہو گئی ہے جس سے جزئیات پیش کرنے میں کام لیا جاتا تھا اور جس سے ایک نیا طرز وجود میں آیا جو مخترعانہ صلاحیت کا نمونہ تھا" (J. Sauvaget در *Ars Islamica*، ۱۹۳۸ء، ص ۲۱۳)۔

مآخذ: (۱) M. van Berchem: *Arabische Inschriften, apud:* M. von Oppenheim, *Inschriften aus Syrien, Mesopotamien und Kleinasien*، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ص ۱ تا ۱۰۰ (عدد ۱۱۳ تا ۱۲۵)؛ (۲) J. Strzygowski و M. van Berchem: *Amida*، ہائیڈل برگ ۱۹۱۰ء؛ (۳) S. Flury: *Islamische Schriftbänder Amida-Diarbekr*، باسل، پیرس ۱۹۲۰ء، (=*Bandeaux ornementés à inscriptions arabes*) در *Syria*، ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۱ء، ص ۲۳۵ تا ۲۴۹، ۳۱۸ تا ۳۲۸، ۵۴ تا ۶۲؛ (۴) A. Gabriel: *Voyages archéologiques dans la Turquie orientale*، مع J. Sauvaget: *Recueil d'inscriptions arabes*، پیرس ۱۹۴۰ء، ص ۵ تا ۲۰۵، ۳۱۲ تا ۳۲۸ (عدد ۳۸ تا ۱۰۸)۔

(J. Sourdel-Thomine [تلخیص از ادارہ])

الدیار بکری

الدیار بکری: حسین بن محمد بن الحسن، * آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تاریخ بعنوان تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس کا دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کا مصنف۔ مذکورہ تاریخ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھی اور متعدد مخطوطات کی صورت میں محفوظ ہے اور دو مرتبہ چھپ بھی چکی ہے (قاہرہ ۱۲۸۳ھ/۱۳۰۲ھ)۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بعد کی تاریخ اسلام کا مختصر خاکہ بھی درج ہے۔ اختتام پر عثمانی حکمرانوں کے نام گنائے گئے ہیں۔ بعض مخطوطات میں یہ شمار سلیمان قانونی پر ختم ہو جاتا ہے، لیکن عام طور پر اس کا خاتمہ مراد سوم (۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء) پر ہوا ہے۔ اس مصنف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مکۂ معظمہ کے خانۂ کعبہ کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ اس کی شخصیت کے متعلق بہت الجھن پائی جاتی ہے۔ بقول حاجی خلیفہ (طبع فلوگل)، ۳: ۱۷۷، یہ تاریخ ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور اس کا مصنف مکۂ معظمہ میں رہتا تھا اور ۹۶۰ھ/۱۵۵۰ء کے عشرے میں فوت ہوا۔ لیکن اسے اور قاضی کرم الدین حسین المالکی مکی کو، جسے ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴-۱۵۷۵ء میں قاضی مقرر کیا گیا تھا (العیدروسی: النور السافر، ۳۸۰ تا ۳۸۳؛ ابن العماد: شذرات، ۸: ۴۱۹ ببعد)، چونکہ ایک ہی شخص مان لیا گیا ہے اس بنا پر اس کی تاریخ وفات اب ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء دی جاتی ہے، لیکن ان کے ایک ہی شخص ہونے کا

ثبوت نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ النہروالی کی غیر مطبوعہ تصانیف سے اس مسئلے کا فیصلہ ہو جائے۔ بہر کیف، دونوں کا ایک ہونا غیر اغلب ہے، یعنی اگر تاریخ کے فقط وہ مخطوطے پیش نظر رکھے جائیں جو استانبول میں موجود ہیں، جیسے [مخطوطہ] طوپ قپو سرائے، احمد ثالث، ۳۰۴۴، جو زیادہ سے زیادہ ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء کے لگ بھگ لکھا گیا تھا اور جس میں کہا گیا ہے کہ یہ تصنیف ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸-۱۵۲۹ء میں مکمل ہوئی تھی (اور جو ایک قدیم تر تصحیح کردہ نسخے پر مشتمل ہے جو دراصل مصر میں یوسف المستنصر کی خلافت پر پہنچ کر منقطع ہو جاتا ہے)، یا داماد ابراہیم [کتب خانے کا مخطوطہ] عدد ۸۹۸، جس کی تاریخ کتابت ۲۸ صفر ۹۴۱ھ چہارشنبہ/ (سہ شنبہ) ۸ ستمبر ۱۵۳۴ء ہے اور جس میں مذکور ہے کہ یہ کتاب یک شنبہ ۸ شعبان ۹۴۰ھ/۲۲ فروری ۱۵۳۴ء کو مکمل ہوئی تھی (دیکھیے حاجی خلیفہ، موضوع مذکور).

مآخذ : (۱) براکلمان، ۲ : ۳۰۰؛ تکملہ ۲ : ۴۱۵؛ تکملہ ۳ : ۱۲۹۳؛ (۲) عثمانلی مؤلفاری، ۳ : ۱۸ و بعد؛ (۳) رسالہ فی ذرع الکعبۃ کا ایک اور نسخہ در استانبول، Bagdatli Vehbi، ۱۱۳۲، ورق ۱۰ ب تا ۱۶ الف.

(F. Rosenthal)

⁎ **دیار ربیعہ** : ایک نام جس کی تشکیل اسی طرح ہوئی ہے جیسے دیار بکر [رک باں] کی، الجزیرۃ کا سب سے مشرقی اور وسیع ترین صوبہ ہے۔ اس میں تین خطّے شامل ہیں : دریاے خابور اور اس کے معاون ہرماس (جغ جغ) اور ان کے سرچشموں کا خطّہ، یعنی طور عبدین کی ڈھلانیں؛ دریاے ہرماس اور دریاے دجلہ کے درمیان کا قطعہ، یعنی سابقہ بیث عربایہ، مع جبل سنجار کے؛ اور دریاے دجلہ کے دونوں کناروں پر تل فافان اور تکریت کے درمیان کا خطّہ، جو عراق کی سرحد بناتا ہے۔ دونوں زاب ندیوں کے زیریں سلسلے بھی اس آخری خطّے میں شامل ہیں۔ بڑے بڑے شہر یہ ہیں : دارالحکومت موصل (الموصل) دریاے دجلہ کے بائیں کنارے پر، بلد، جزیرۃ ابن عمر، الحسنیۃ، اور مغرب میں برقعید، سنجار، نصیبین، ماردین اور راس العین۔

دیار ربیعہ کی تاریخ کو عموماً الموصل کی تاریخ کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت خارجیوں کی متعدد بغاوتیں تھیں جنھوں نے الجزیرۃ کے دوسرے خطّوں کو بھی متاثر کیا، عہد بنی اُمیّہ میں بھی اتنا ہی جتنا عہد عباسیّہ میں۔ پہلے عہد میں ان بغاوتوں میں الجزیرۃ اور شام کے والیوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ عہد عباسیہ میں دیار ربیعہ میں جو فسادات رونما ہوئے ان کا بیان ان تصانیف میں ملتا ہے : (۱) سلیمان صائغ : *Histoire de Mossoul*، بیروت ۱۹۲۳ تا ۱۹۲۸ء، ۱ : ۷۳ ببعد؛ (۲) L. Veccia Vaglieri : *Le vicende del Ḫārigismo in epoca abbaside*، در *RSO*، ۲۴ (۱۹۴۹ء) : ۳۱ ببعد؛ (۳) M. Canard : *Hist. de la dynastie des Ḥamdānides*، ۱ : ۲۹۱ ببعد.

دیار ربیعۃ ہی وہ خطّہ ہے جہاں سے حمدانیوں کا تغلبی خاندان پیدا ہوا، جس نے خارجیوں کی مذکورہ بغاوتوں میں حصہ لیا اور بعد ازاں الموصل کی نیم آزاد امارت کی بنیاد رکھی، جو ناصرالدّولہ کے عہد حکومت میں زیادہ تر دیار ربیعہ پر مشتمل تھی۔ الموصل کی حمدانی امارت کو آل بُویہ کے فتح کر لینے کے بعد آخری حمدانیوں، ابراہیم اور حسین کی طرف سے بُویہی بہاءالدّولۃ (۳۷۹ھ/۹۸۹ء تا ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء) کے زمانے میں اپنے مفاد کے مطابق امارت قائم کرنے کی کوشش کی گئی، جس کی ایک طرف دیار بکر [رک باں] کے مروانیوں نے اور دوسری

جانب عُقَیلی امیر محمد بن المُسَیَّب نے مخالفت کی، حالانکہ شروع میں اس نے ان دو حمدانی حکمرانوں کی مدد کی تھی اور صلے میں دیار ربیعہ کے تین مقامات حاصل کیے تھے۔ مؤخرالذکر الموصل کا حکمران بن گیا اور برائے نام ہی بغداد کے بُویہیوں کا محکوم تھا۔ وہ الموصل کے عُقَیلی خاندان کا بانی تھا، جس کا خاتمہ سلجوقوں نے کیا۔

مآخذ: ان حوالوں کے علاوہ جو متن میں دیے گئے ہیں دیکھیے: (۱) Le Strange، ص ۸ ببعد؛ (۲) M. Canard: *Hist. de la dynastie des H'amdânides*، ۱: ۹۷ ببعد، ۲۹۱ ببعد، ۳۷۵ ببعد و بمواضع کثیرہ، جہاں دیار ربیعہ کے مختلف خطوں کے جغرافیائی مطالعے کے ماخذ کے متعلق معلومات ملیں گی؛ (۳) Margoliouth: *The eclipse of the Abbasid caliphate*، بمدد اشاریہ۔

(M. CANARD)

۲۔ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے وسط میں دیار ربیعة کو ترکوں کی پیش قدمی کے عواقب برداشت کرنا پڑے۔ ۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء تا ۴۳۴ھ/۱۰۴۳ء سے اسے ترکمانوں کے پہلے گروہ نے تاخت و تاراج کیا جو آخر میں سب کے سب قتل کر دیے گئے۔ ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء میں جب سلجوق سلطان طغرل بیگ کو عباسی خلیفہ نے بغداد میں تخت نشین کیا تو بنو عقیل اپنے عقیدے اور اپنی چراگاہوں [کے ہاتھ سے نکل جانے] کے خوف سے مخالف ہو گئے اور اس کے بلاوے پر نہیں گئے۔ پھر انہیں کے علاقے میں سلطان کے عرب مخالفین کے جتھے کی تنظیم ہوئی اور وہ ایک سابق بُویہی سپہ سالار البَساسیری [رک بآن] کے تحت مجتمع ہو گئے جو اب قاہرہ کے فاطمی خلیفہ کا ساتھ دے رہا تھا (۴۴۹ھ/۱۰۵۷ء تا ۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء)۔ تاہم عقیلِ قریش نے مناسب وقت کے اندر طغرل بیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کا فیصلہ کیا اور ادھر اس نے بھی اس سرحدی علاقے پر ایک باج گزار حکمران کی حیثیت پر قناعت کرنا ہی بہتر سمجھا۔ عقیلی ریاست اس طرح ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء تک قائم رہی، یہاں تک کہ مسلم بن قریش، جس پر آخر میں مصر کے ساتھ ساز باز کرنے کا شبہہ کیا گیا تھا، شام کی ایک لڑائی میں کام آیا تو ملک شاہ نے، جو تیسرا سلجوق سلطان تھا، اس کے مقبوضات کو بغیر مزاحمت کے اپنی سلطنت میں مدغم کر لیا۔ اس تاجدار کے بعد سلجوق سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور دیار ربیعة کا وہی حشر ہوا جو الموصل کا، جہاں مسلسل کئی روز افزوں خود مختار ہو جانے والے سپہ سالاروں کی حکومت رہی۔ انہیں میں سے ایک زنگی تھا، جس کا تقرر ۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء میں ہوا تھا؛ اس نے بالآخر اپنی خود مختاری کا اعلان کرکے الموصل کے خاندان اتابک کی بنیاد رکھی۔ یہ خاندان کوئی ایک صدی کے قریب رہا، گو اس کے افراد کے درمیان تنازعات کی وجہ سے، جن میں سے بعض کو ایوبی حمایت حاصل تھی، وقتاً فوقتاً سنجار یا جزیرة ابن عمر کو الموصل سے علاحدہ ہونا پڑا۔ زنگیوں کا سابق غلام اور وزیر بدر الدّین لؤلؤ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں اُن کا جانشین ہوا؛ ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء میں وہ کچھ عرصے کے لیے مغول کی اطاعت قبول کر لینے پر مجبور ہو گیا، لیکن اس کے فرزندوں نے مملوکوں سے اپنے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ وہ ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء میں بے دخل کر دیے گئے۔ بعد ازاں الموصل اور دیار ربیعہ، جو دیار بکر کے کردوں اور ترکمانوں اور دیار مُضَر کے مملوک والیوں کے بالمقابل پہلے تو الجزیرة میں ایرانی ایلخانوں کی حکومت کی بنیاد بنے، پھر ان کے جلائری [رک بآن] جانشین قرہ قویونلو اور آق قویونلو ترکمانوں کے زیر نگین رہے اور آخر میں صفویوں کے قبضے میں آ گئے تاآنکہ انہیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔ یہ الحاق ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں جا کر مکمل ہوا۔ ایرانیوں کے حملوں کے باوجود یہ صوبہ ۱۹۱۸ء تک عثمانی حکومت ہی میں

شامل رہا ۔ چونکہ دیار بکر کے برعکس اس نے اصل ترک آبادی کو اپنے اندر جذب نہیں کیا تھا، لہٰذا ایسے جدید ترکیہ میں شامل نہیں کیا گیا، سرحدوں کی عجیب و غریب ترتیب و تقسیم کی وجہ سے یہ عراق اور شام میں منقسم ہو گیا ہے ۔

مزید دیکھیے مقالات الجزیرة، جزیرة ابن عمر، الموصل، نَصیبین، سنجار اور زنگی [خاندان] .

مآخذ : اس کے مآخذ اس عہد کی عام تاریخ کے مآخذ ہیں ؛ خاص تصنیف فقط یہ ہے، ابن الأثیر : تاریخ الدولة الاتابکیة بالموصل (طبع اور فرانسیسی ترجمہ در *Recueil des Hist. des Croisades, Hist. Arabes*، ۲/۲)، جو بہر حال خصوصاً نور الدّین کے کارہا ہے نمایاں سے بحث کرتی ہے، جس نے حلب پر حکومت کی تھی نہ کہ الموصل پر ۔ عزالدّین بن شدّاد کی اعلاق دیار ربیعہ کا حال بیان کرتی ہے (دیکھیے Cl. Cahen، در *REI*، ۱۹۳۴ء، ۱، لیکن الموصل کے متعلق معروضہ واقعات کو بیان نہیں کرتی.

(CL. CAHEN)

* **دیارِ مُضَر** : ایک نام جو اُسی طرح شکل پذیر ہوا جس طرح دیار بکر [رکّ باں]، الجزیرة کا وہ صوبہ ہے جس کے علاقے کو دریاے فرات اور اس کا معاون بَلِیخ، نیز دریاے خابور کے نشیبی سلسلے سیراب کرتے ہیں ۔ یہ دریاے فُرات کے دونوں کناروں پر شمال میں سُمَیساط Samosata سے لے کر جنوب میں عنا (عانات) تک پھیلا ہوا ہے۔ دیارِ مُضَر کا بڑا شہر دریاے فرات کے بائیں کنارے پر الرَّقّة تھا؛ دیگر بڑے شہر دریاے بلیخ پر واقع حَرّان، الرُّها Edessa، اُسرھُوئنہ Osrhoene کا دارالحکومت اور الرُّها کے جنوب میں سروج تھے ۔ وہ مقامات جو بلیخ سے اس کے سنگھم سے آگے دریاے فُرات پر واقع تھے، القِرقیسیاء اور الرَّحبة تھے جنھیں بعض اوقات ایک خاص ضلع میں شامل کر دیا جاتا تھا، جسے شارع فرات کہتے تھے ۔

دیارِ مضر زیادہ تر الجزیرة کی حکومت میں شامل رہا، لیکن کبھی کبھی اس سے جدا بھی ہو جاتا تھا ۔ چنانچہ حمدانی عہد میں یہی صورت تھی، جب وہ سیف الدّولہ کے عہد میں امارت حلب کا ایک حصہ تھا۔ بعد ازاں یہ الموصل کی امارت کے پاس دوبارہ چلا گیا، اور اس کے بعد باقی ماندہ جزیرے کی طرح آل بویہ کے قبضے میں آ گیا، پھر وہ ایک چھوٹے سے نُمَیری خاندان (بنو نُمَیر) کا دارالحکومت بن گیا، جس کا خاتمہ سلجوقوں نے کیا ۔ دوسری طرف چوتھی صدی هجری/ دسویں صدی عیسوی میں بوزنطی فوجیں دیارِ مُضر کو عموماً تہ و بالا کرتی رہیں، اور پانچویں صدی هجری/ گیارھویں صدی عیسوی میں بوزنطی سلطنت الرُّها اور اس کے ضلع کو ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں اپنے علاقے سے ملحق کرنے میں کامیاب ہو گئی ۔

مآخذ : (۱) Le Strange، ص ۸٦ ببعد، ۱۰۱ ببعد؛ (۲) Cl. Cahen : *La Syrie du Nord*، ص ۱۱۰ ببعد؛ (۳) Margoliouth : *The eclipse of the Abbasid Caliphate*، بمدد اشاریہ؛ (۴) M. Canard : *Hist. de la dynastie des H'amdânides*، ۱ : ۸٦ ببعد، ۵۹۵ ببعد، ۸۳۸ ببعد، و بمواضع کثیرہ؛ (۵) D. S. Rice : *Medieval Harran*، در *Anatolian Studies*، ج ۲ (۱۹۵۲ء)، ص ۳٦ تا ۸۳ .

(M. CANARD)

۲- الرُّها کی بوزنطی فتح کے بعد دیارِ مُضَر کی حیثیت ایک رابطے کے علاقے کی رہی، جسے صحیح معنوں میں خود مختاری حاصل نہیں تھی ۔ یہ اس وقت دو حصوں میں منقسم تھا : ایک حصہ شمال میں، جس پر عیسائیوں کا غلبہ تھا اور اس میں جزوی طور پر ایک آرمینی نو آبادی قائم ہو گئی تھی؛ دوسرا جنوب میں تھا، جس کا بڑا مرکز حَرّان تھا اور جہاں نُمَیری عربوں کے اثرات غالب تھے ۔ اسے ۴۵۷ھ/ ۱۰٦۵ء سے ترکوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا سامنا کرنا پڑا، یعنی پہلے تو اسے لٹیروں کے جتھوں نے دق

کرتے رہے، پھر ۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء کے اوائل میں سلجوق سلطان آلپ آرسلان شام جاتے ہوئے یہاں سے گزرا اور ایک موقع پر اس نے الرُّھا کا محاصرہ کر لیا۔ ۴۷۸ھ/۱۰۸۶ء میں نئے سلطان ملک شاہ کے بھائی تُتُش کا گزر ہوا۔ اسی سال حرّان اور سَرُوج مع حلب مسلم بن قریش العقیلی [رک بآں] الموصلی کی قلمرو میں شامل کر لیے گئے، جو ملک شاہ کا برائے نام محکوم اور الموصِل کا والی تھا۔ الرُّھا یونانی نژاد ارمن Philaretes کی ریاست میں شامل ہو گیا جو مغربی طارس اور بعد ازاں انطاکیہ کا حاکم بنا۔ انجام کار دیار مُضَر کے دونوں حصے ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں الموصل اور شمالی شام سمیت خود ملک شاہ کے ہاتھ آ گئے۔

بایں ہمہ اس سرحدی علاقے میں سلجوق تسلط کچھ ڈھیلا ہی رہا اور ملک شاہ کے انتقال ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء کے بعد جو فسادات برپا ہوئے ان کی وجہ سے الرُّھا میں ایک ارمن حکومت قائم ہو گئی، جو عملاً خود مختار تھی۔ ۱۰۹۷ء کے اواخر میں صلیبی جنگ نے اس تقسیم کو نصف صدی تک کے لیے از سر نو قائم کر دیا، جس کا آغاز بوزنطی فتح سے ہوا تھا۔ اگرچہ الرُّھا کے افرنجی و ارمن علاقے، نیز وسطی دریائے فرات کے ساتھ ساتھ مغربی طارس کے جنوبی اقطاع پر دیار مضر کا شمالی حصہ مشتمل ہو چکا تھا، تاہم حرّان، جو چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک چند روزہ ترکی ریاست کا دارالحکومت رہا، حلب کے ساتھ کبھی ارتقیوں اور کبھی زنگیوں کے ماتحت آتا رہا۔ ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء میں زنگی نے اُسے علی کوچک کو، جو الموصل کے مشرق میں اِربِل پر قابض تھا، بطور جاگیر عطا کر دیا تاکہ ترک اور کرد فوجیوں کی بھرتی یقینی ہو جائے؛ یہی لوگ اس کے دفاع کے ذمے دار تھے، جو فوجی نقطۂ نظر سے اہم تھا۔ اس کے جانشین خانوادۂ بکتگین [رک بآں] نے اُسے نصف صدی تک اپنے قبضے میں رکھا۔ عُقَیلی عرب حکمران کو، جس کی حکومت قلعۂ جعبر پر تھی، نورالدین [رک بآں] نے ۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء میں مطیع کر لیا۔ اس سلطان کی جانشینی کے سلسلے میں جو فسادات برپا ہوئے، ان کی بدولت صلاح الدّین [رک بآں] نے دیار مُضَر پر قبضہ کر لیا اور پہلے تو اسے اپنے بھتیجے تقی الدّین عمر کو پھر اپنے بھائی العادل کو عطا کیا۔ مؤخّرالذکر نے، جو سلطنت کا وارث ہوا، اسے اپنے بیٹے الاشرف (۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء) کے حوالے کر دیا، جس نے ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں اُسے اپنے بھائی، یعنی مصر کے والی الکامل سے دمشق کے ساتھ بدل لیا۔ الکامل نے اسے اُس مملکت میں شامل کر دیا جو اس نے مشرق میں اپنے فرزند الصّالح ایوب کی خاطر قائم کی تھی، مگر الکامل کی وفات پر جب ایوبی خاندان کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو الصالح نے اس پر حملے کے اندیشے سے اُسے ایشیائے کوچک کے تازہ وارد خوارزمی پناہ گزینوں کو عنایت کر دیا (۶۳۵ھ/۱۲۳۸ء)۔ بعد ازاں خوارزمیوں کی شکست اور مصر میں ایوّبی خاندان کے سقوط کی وجہ سے یہ خطہ حلب کے النّاصر یوسف ایوّبی کے ہاتھ آ گیا، جس کے زمانے سے عزیزالدّین بن شدّاد کے تحریر کردہ کوائف انتظامیہ کا آغاز ہوا ہے۔ ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں اسے مغلوں نے فتح کر لیا، جو ایشیائے کوچک اور عراق پر پہلے ہی قابض ہو چکے تھے۔

اس کے بعد سے دیار مُضَر کی حیثیت بدل گئی۔ اسے مملوکوں نے، جنھوں نے مصر اور شام میں ایوّبیوں کی جگہ لے لی تھی، دوبارہ فتح کر لیا اور پہلے ایران کے مغولوں کے ساتھ اور بعد ازاں ترکمان خاندانوں کے ساتھ، جو آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ان کے جانشین بن گئے تھے، اپنی سرحد قائم کر لی۔ لگاتار حملوں نے اس علاقے کو اور خصوصاً اس کے جنوبی حصے کو

تباہ کر دیا اور حرّان ناقابل تلافی طور پر زوال پذیر ہو گیا، حالانکہ الرُّھا اس صوبے کا دارالحکومت تھا۔ شمال، مشرق اور مغرب کے ہمسایہ علاقوں کی طرح ترکمانی عنصر، خصوصاً قبیلۂ دوگر Döger نے یہاں بھی اپنا اثر و نفوذ بڑھا لیا۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس خطے کو تیمور نے تباہ و برباد کر دیا۔ آئندہ صدی میں بھی جب مملوکوں نے اپنے علاقے کی توسیع کے لیے ناکام کوششیں کیں، تو اس علاقے نے ان کے لیے فوجی مرکز کا کام دیا اور اس طرح اسے امن و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ یہ مملوکوں کے برائے نام تسلط کے تحت بلا دقت دیار بکر کے آق قویونلو کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ پھر ترکان عثمانیہ کا شام و عراق پر قبضہ ہوا تو اسی زمانے میں یہ بھی ان کے ہاتھ آ گیا۔ یہ بات لائق لحاظ ہے کہ عرب آبادی کی حدود آج بھی زیادہ تر وہی ہیں جو صلیبی جنگوں کے وقت تھیں؛ چنانچہ ترکی اور شام کی جدید سرحد دیار مضر کو اسی طرح دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے جس طرح وہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی اور چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں بٹا ہوا تھا۔

مآخذ: اس عہد کی تاریخ اور جغرافیے کے مآخذ کے لیے، جن کا اطلاق تقریباً سارے الجزیرہ پر ہوتا ہے، دیکھیے عزالدین ابن شداد: الاعلاق، ج ۳، تجزیہ از Cl. Cahen در REI، ۱۹۳۶ء۔

(CL. CAHEN)

دیاسقوریدس: رک بہ دیسقوریدس۔

* **دیالی**: وسطی عراق کے مشرق میں ایک اہم دریا۔ اس کا نام، جس کی اصل اور معنی نامعلوم ہیں، بہت پرانا ہے اور قدیم زمانے میں Σιλλα یا Δελας یا دیالاس کی صورت میں ملتا ہے۔ اس کے بالائی حصے کو سروان یا (اصل میں اور صحیح تر) شیروان کہتے ہیں جیسا کہ یاقوت کے علم میں آیا اور اس کے بیشتر حصے کے لیے عموماً یہی نام مستعمل ہے۔ یہ دریاے دجلہ کے بائیں کنارے کا معاون بنتا ہے؛ اس میں صرف چھوٹی کشتیاں ہی چل سکتی ہیں اور پانی کا اخراج سیلاب کے موسم (مارچ تا مئی) میں شدت سے، لیکن گرما اور خزاں کے موسموں کے اواخر میں معمولی ہوتا ہے۔

یہ دریا مغربی ایران سے نکلا ہے، جہاں بہت سے پہاڑی ندی نالے (جو موسم گرما اور خزاں میں اکثر خشک رہتے ہیں) باہم مل کر اس کے بڑے معاون بنتے ہیں اور مندرجۂ ذیل علاقوں کا پانی اس میں بہا کر لے آتے ہیں: (۱) کرمان شاہ کے شمال کا علاقہ؛ (۲) صوبۂ اردلان میں سنندج (سنّاہ سِخنہ) کے شمال اور جنوب کا علاقہ؛ (۳) مروان کے اردگرد کا ایرانی و عراقی سرحدی علاقہ اور (۴) صوبۂ کرمان شاہ کا مغربی علاقہ، جو کرند کے مغرب میں (عراقی) خانقین اور (ایرانی) قصر شیریں کے بالمقابل واقع ہے۔ ان میں پہلے تینوں علاقوں کا پانی تو اصلی دریا، یعنی شیروان کی ایرانی سرحد کو عبور کرنے سے قبل ہی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی معاون ندیاں مختلف مقامی ناموں سے موسوم ہیں اور یہ سب ان وادیوں سے گزرتی ہیں جو قدرتی حسن سے مالا مال ہیں؛ وہاں زمانۂ قدیم سے ایرانی اور کرد قبائل آباد ہیں۔ مذکورۂ بالا علاقوں میں سے چوتھے علاقے کے پانی سے آلوَند ندی کی تشکیل ہوتی ہے (یہ عہد عباسیہ میں اپنے مشہور شہر کے نام پر حُلوان کہلاتی تھی)؛ یہ ندی خانقین کے متصل مغرب میں سرحد عراق میں داخل ہوتی ہے۔ تنجرہ ندی بھی، جو وادی شہر زور (سلیمانیہ لوا) کے پانی کو بہا کر لاتی ہے، دریا کی عراقی معاون ہے؛ چھوٹے موٹے اور بھی معاون ہیں۔ اس دریا کی وسطی گزرگاہ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء کی سرحدی کمیشن کی مکرر حد بندی تک ترکی و ایرانی

سرحد کی نشان دہی کرتی تھی، جتنی کہ اس وقت تک مستقل طور پر قائم ہو چکی تھی؛ لیکن اس قطعے کے مغرب میں، جو اب خانقین کی "قضا" کا علاقہ ہے، بعد میں اور رقبے بھی "منتقل شدہ علاقوں" کے نام سے ترکیہ کے حوالے کر دیے گئے.

یہ دریا وسطی اور نشیبی گزرگاہ میں اپنی مخصوص وضع کو بدلنا رہتا ہے: پہلے وہ ناھموار علاقے سے گزرتا ہے، پھر مسطّح میدانی علاقے میں بہتا ہے، جہاں بہاؤ کی رفتار کم ہو جانے کے باعث یہ آب پاشی کے استعمال کے قابل ہو جاتا ہے ۔ جس جگہ یہ جبل حمرین کو کاٹ کر نکلا ہے، وہاں بڑی بڑی نہروں کا ایک سلسلہ بنا ہوا ہے جو کھجوروں کے وسیع باغوں اور سرمائی اور گرمائی فصلوں کے لیے پانی بہم پہنچاتا ہے ۔ یہ نہریں خاص طور پر دائیں کنارے سے نکلتی ہیں، مثلاً نہر خالص، جو دَلْتاوہ [رک بآں] کو سیراب کرتی ہے؛ بائیں کنارے سے نہر رُوز (جس پر بَلَد رُوز واقع ہے)، نہر مُخْرُوت اور نہر خراسان نکلتی ہیں۔ دیالی کا "لِوا" (= ضلع) اسی دریا کے نام پر موسوم ہے اور عراق میں اس کی تقریبًا ساری گزرگاہ اسی علاقے میں ہے (اس "لِوا" کا صدر مقام بَعْقُوبہ ہے اور اس کی ماتحت "قضائیں" [= تحصیلیں] خانقین، مَنْدَلی، خالص اور بَعْقُوبہ ہیں) ۔ اس ضلع میں وسیع پیمانے پر زراعت اور یہاں کے مشہور پھل کلیّةً اس آب پاشی کے مرہون منت ہیں جو ان نہروں یا "کَرْد" (ڈھینکلی) اور دیگر آب کش آلات کے ذریعے کی جاتی ہے ۔ یہ نظام آبپاشی اسی انداز سے کام کر رہا ہے جو منگولوں کے ھاتھوں تباہی سے پہلے تیسری صدی ھجری/نویں صدی عیسوی سے لے کر ساتویں صدی ھجری/تیرھویں صدی عیسوی تک موجود تھا، تاہم یہ سابقہ نظام کے عین مطابق نہیں بلکہ اس سے کچھ کمتر ھی ہے ۔ اس عہد میں یا اس کے زیادہ حصے میں جبل حَمْرین کے نیچے دریاے دیالی کا پانی نہر تامرّا ۔ نہروان میں گرتا تھا [رک بہ دجلہ؛ نہروان] اور اس سے بہ کثرت نہریں نکالی گئی تھیں؛ بڑور دیالی کا بڑا حصہ غالبًا دریاے دجلہ میں اس کے موجودہ دہانے ھی کے مقام پر، یا اس کے قریب، بغداد سے دس میل نیچے آ کر مل جاتا تھا ۔ تکنیکی اعتبار سے دیالی (جس میں یکایک سخت طغیانی آ جانے کی خصوصیت پائی جاتی ہے) اور نہروان کے نظام انہار کے درمیان تعلق کی وجہ واضح نہیں؛ عرب جغرافیہ نویسوں کے اصطلاحی نام یکساں نہیں؛ وہ مصنوعی نہروں اور محض سیلابی نالوں میں امتیاز نہیں کرتے، حتّٰی کہ بعض اوقات دریاے دیالی اور نہروان یا تامرّا میں بھی فرق نہیں کرتے ۔ قرون وسطی کی جن بستیوں کا دیالی اور اس سے نکلی ہوئی نہروں پر انحصار تھا، ان میں نہروان، باجِسْرا، بَعْقُوبہ، دَسْکَرہ اور جَلُولا شامل تھیں ۔ اس کی نشیبی گزرگاہ کے دونوں جانب کے علاقے کا انتظام بڑی توجہ سے کیا جاتا تھا اور وہ سیکڑوں دیہات اور ایک گنجان آبادی کی کفالت کرتا تھا ۔ ساسانی اور قدیم مقامات کے آثار بتاتے ہیں کہ یہ ھمیشہ سے ایک پسندیدہ علاقہ رہا ہے ۔ بغداد سے جو بڑی سڑک صوبۂ الجبال کو یہاں سے ہو کر جاتی اور شاھراہ خراسان کہلاتی ہے، وہ اس علاقے سے گزرتی اور زیادہ تر دریا کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ جاتی تھی؛ یہی صورت حال اب بھی ہے ۔ پکّی سڑک، جو بغداد سے شروع ہو کر ایرانی سرحد کے پار تک جاتی ہے، واقعةً پرانی حدبندی کے مطابق بعقوبہ، شَہْرَبان، قِزِل رباط، خانقین اور قصر شیرین کے راستے سے گئی ہے ۔ چھوٹی پٹڑی کی ریل کا بھی، جو ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء میں اور اس کے بعد تعمیر ہوئی تھی، یہی راستہ ہے ۔ بعقوبہ اور قرغان کے مقام پر ریل کے پل ہیں جہاں سے کرکوک ۔ اربیل لائن نکلی ہے.

مآخذ: عرب جغرافیہ نویسوں، نیز Streck، لسٹرینج Le Strange، Willcocks اور Longrigg کی متعلقہ تصانیف کے لیے دیکھیے مآخذ، بذیل مادّہ دجلہ.

(S. H. LONGRIGG)

* **دِیبَاج :** رک بہ قماش.

* **دَیبُل :** دِیبل یا دِیوَل) سندھ کی قدیم بندرگاہ، جس میں "البُدّ" کا ایک دیوَل (مندر) تھا (البلاذری : فتوح، مطبوعۂ قاہرہ، ص ۴۴۲)۔ یہ ایک کھاڑی (الخَور) کے دہانے پر واقع تھا، جو مہران، یعنی دریاے سندھ کے مغربی جانب تھی۔ دَیبُل پہلا مقام تھا جو محمّد ابن قاسم الثّقفی [رک بآن] نے تسخیر کیا۔ اس نے راجا داہر حاکم سندھ کو سزا دینے کی غرض سے ۹۲ھ/۷۱۱-۷۱۲ء میں فوج کشی کی تھی۔ راجا پر یہ الزام تھا کہ دَیبُل کے مقام پر بحری قزاقوں نے بعض ایسی کشتیوں کو لوٹ لیا جو مسلم مرد و زن کو لنکا سے عراق اور مکّۃ [معظّمہ] لے جا رہی تھیں اور اس نے اغماض سے کام لیا۔ دَیبُل ایک بارونق شہر تھا، جو بحری تجارت اور کاروبار کا مرکز تھا۔ اس کے باشندوں کی بڑی تعداد تاجروں اور کاریگروں کی تھی، جو زیادہ‌تر قبیلۂ مید سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے پہلے دَیبُل کو فتح کرنے کے لیے عربوں کے دو بحری حملے ناکام ہو چکے تھے، جن کے قائد علی الترتیب عُبَیداللہ بن نبہان اور بُدَیل بن طَہفَۃ البجلی تھے۔ تیسری بار محمد بن قاسم نے دیبل پر خشکی کی طرف سے چڑھائی کرنے کا فیصلہ کیا، اس کی یہ تدبیر کامیاب ہوئی۔ عربوں نے ہندوستان میں پہلی بار منجنیق [البلاذری : عروس] کو استعمال کرکے اسے لڑائی کا ایک کارگر ہتیار ثابت کر دیا۔ دَیبُل کے بُرج کے اُوپر ایک قبہ [البلاذری : دَقَل] تھا، جس کی اونچائی ۴۰ گز تھی۔ اس قبے سے ایک بہت بڑا سرخ جھنڈا سارے شہر کے اُوپر لہراتا تھا۔ بُرج میں بُدھ مت کا ایک سُتوپا (stupa) یا وہ دیول تھا جس کے باعث بظاہر شہر ہی کا نام دیوَل (دِیبل، جسے عربوں نے دَیبُل کر لیا) مشہور ہو گیا۔ ایک بہت وزنی پتھر، جو منجنیق سے پھینکا گیا تھا، اس بُرج پر آ کر لگا اور ایسی ضرب پڑی کہ وہ دھڑام سے زمین پر آرہا اور گنبد اور وہ عظیم جھنڈا، جسے مقامی لوگ ناقابل تسخیر ہونے کی یقینی علامت سمجھتے تھے، خاک پر گر پڑا۔ شہر پر قابض ہو جانے کے بعد محمد بن قاسم نے مغلوب غیر مسلموں کے سامنے نرم شرائط پیش کیں اور ذِمّیوں کی حیثیت سے انھیں پورے حفظ و امان کا یقین دلایا۔ اس نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، جو سرزمین سندھ کی پہلی مسجد تھی اور ایک نیا محلہ خود تعمیر کرا کے اس میں چار ہزار عرب خاندان بسا دیے۔ برباد شدہ سُتوپا ایک عرصے تک کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا تا آنکہ عنبسۃ بن اسحٰق الضّبّی نے، جو الواثق باللہ [رک بآں] کے عہد میں دَیبُل کا والی تھا، اس کی کسی قدر مرمت کر کے اسے سرکاری قیدخانے میں تبدیل کر دیا۔ یہ تقریباً ۲۲۲ھ/۸۳۶ء کا واقعہ ہے.

عربی وقائع کے مطابق (الطبری، بذیل سن مذکور؛ ابن الجَوزی : المُنتَظَم، ۵: ۱۴۳) ایک ہولناک زلزلے نے ۲۸۰ھ/۸۹۳ء میں اس شہر کے بڑے حصے کو تباہ کر دیا اور ہزاروں باشندے لقمۂ اجل ہو گئے۔ اس مصیبت کے باوجود شہر بچ گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ برباد شدہ حصہ دوبارہ تعمیر ہو گیا کیونکہ اس کے بعد بہت عرصے تک یہ شہر موجود تھا یہاں تک کہ تقریباً ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء میں رضی الدّین حسن بن محّمد الصغانی [رک بآں] نے اس کی سیر کی اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ دَیبُل کے مالدار طبقے کی اس پرانی عادت کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اس وقت بھی بحری لوٹ مار اور ڈاکہ زنی میں حصہ لیتے تھے، ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں جلال الدّین خوارزم شاہ تاتاریوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد سندھ آیا اور دَیبُل پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا اور وہاں بت پرستوں کے ایک مندر کی جگہ ایک جامع مسجد تعمیر کرا دی۔ اس کے معنی یہ ہوے کہ ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی تک دَیبُل میں بت‌پرستی

ہوتی تھی اور وہاں غیر مسلموں کی خاصی بڑی تعداد رہتی تھی۔

برباد شدہ دیبل کی جگہ اور نشان متعیّن کرنے کی مختلف کوششیں اب تک ہو چکی ہیں، لیکن ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔ عرب مصنفوں اور سیاحوں نے اس شہر کے متعلق جو بیانات دیے ہیں ان سے اس شہر کی گزشتہ شان و شوکت کی بابت مفید معلومات تو حاصل ہوتی ہیں، لیکن اور کسی حیثیت سے یہ بیانات مفید نہیں۔ محکمۂ آثار قدیمۂ پاکستان نے اس جگہ پہلی دفعہ ۱۹۵۸ء میں بڑے پیمانے پر کھدائی کی، جہاں ایک اور شہر بھنبھور واقع تھا اور جسے بعض علما نے فرض کر لیا تھا کہ اصل میں شہر دیبل یہی تھا، لیکن بھنبھور کے ٹیلوں کی جگہ کھودنے سے اس وقت (۱۹۶۰ء) تک جو کچھ ظاہر ہوا ہے اس سے اس امر کی قطعی شہادت نہیں ملتی کہ بھنبھور کے کھنڈر وہی دیبل کے کھنڈر ہیں، الإصطخری شہر دیبل کا اور بھنبورا (بھمبھور) کے بت خانے کا ذکر الگ الگ کرتا ہے۔

مسلمانوں کے حملوں کے ابتدائی زمانے میں دیبل ثقافت اور تعلیم کا بڑا مرکز تھا اور السمعانی (کتاب الانساب، ورق ۲۳۹ ب) اور یاقوت محدثین کی ایک بڑی تعداد کا ذکر کرتے ہیں جو وہاں پیدا ہوئے۔

دیبل کی تباہی، اس تباہی کے اغلب اسباب اور ایک ایسے شہر کا بالآخر بالکل غائب ہو جانا جو اس قدر بڑی وسعت اور آبادی رکھتا تھا اور اتنے عرصے تک دنیا میں موجود رہا، یہ وہ مسائل ہیں جن کا کوئی خاطر خواہ حل اس وقت تک دستیاب نہیں ہو سکا اور تمام کوششیں تاحال ناکام ہی ہیں۔

مآخذ: (۱) سلیمان المہری: قلادۃ الشموس و استخراج قواعد الاسوس (جو مجھے دستیاب نہیں ہوئی)؛ (۲) ابن خرداذبہ: المسالک و الممالک، لائڈن ۱۳۰۶ھ، ص ۶۲ ببعد؛ (۳) المسعودی: مروج (مطبوعۂ قاہرہ)، ۱: ۳۲۸؛ (۴) الاصطخری، ص ۱۷۵ ببعد؛ (۵) ابن حوقل، ص ۳۱۷، ۳۲۲؛ (۶) یاقوت، ۲: ۶۳۸؛ (۷) النویری: نہایۃ الأرب (میرے ہاتھ نہیں لگی)؛ (۸) القلقشندی: صبح الاعشٰی، ۵: ۶۲؛ (۹) حدود العالم، ص ۲۷۲؛ (۱۰) الادریسی: نزہۃ المشتاق (اقتباسات)، علی گڑھ ۱۹۵۴ء، ص ۲۸؛ (۱۱) عبدالحمید خان: *Towns of Pakistan*، کراچی بدون تاریخ، ص ۵۹ تا ۶۹؛ (۱۲) *Journal of Sind Historical Society*، مئی ۱۹۳۴ء، ص ۳ ببعد؛ (۱۳) J. McMurdo در *JASB*، ۱۸۳۴ء؛ (۱۴) سلیمان ندوی، در *JPakHS*، ۱، ۱۹۵۳ء؛ ۸ تا ۱۳؛ (۱۵) N. B. Baloch: *The most probable location of Daibul, the first Arab settlement in Sind*، در *Dawn* کراچی، فروری (۱۴، ۱۸)، ۱۹۵۱ء؛ (۱۶) الجوینی، ۲: ۹۴، ۱۴۲ تا ۱۴۸؛ (۱۷) Djuwayni-Boyle، ۲: ۴۱۱ ببعد؛ (۱۸) Sidi Ali Reis: *Travels and Adventures*، لنڈن ۱۸۹۹ء، ص ۳۸؛ (۱۹) چچ نامہ (طبع محمد عمر داؤد پوتا) دہلی ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء، ص ۸۹ تا ۹۱، ۱۰۰ تا ۱۱۰؛ (۲۰) البیرونی: قانون مسعودی، حیدرآباد ۱۹۵۵ء، ۲: ۵۵۲؛ (۲۱) مراصد الاطلاع، تہران ۱۳۱۰ھ، ص ۱۸۳؛ (۲۲) البلاذری: فتوح، ص ۲۳۲، ۴۳۵ تا ۴۳۸، ۴۴۴؛ (۲۳) Le Strange، ص ۳۳۱؛ (۲۴) H. Cousens: *The Antiquities of Sind*، کلکتہ ۱۹۲۵ء، ص ۱۲۴ ببعد؛ (۲۵) Elliot اور Dowson: *The history of India as told by its own historians*، لنڈن ۱۸۶۷ء، بمدد اشاریہ؛ (۲۶) H. G. Raverty: *The Mihran of Sind*، کلکتہ ۱۸۹۲ء (*JASB* کی خاص اشاعت)؛ (۲۷) M. R. Haig: *The Indus Delta Country*، لنڈن ۱۸۹۴ء، ص ۴۲ ببعد؛ (۲۸) J. Abbot: *Sind*، آکسفرڈ ۱۹۲۴ء، ص ۴۳ تا ۵۵؛ (۲۹) البیرونی: کتاب الہند (ترجمہ E. Sachau)، لنڈن ۱۹۱۰ء، ص ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۶۰، ۳۱۶؛ (۳۰) الیعقوبی، ۲: ۳۳۰ تا ۳۳۱،

۲۳۵ تا ۲۳٦، ۳۳۸؛ (۳۱) الطبری، ۱ : ۸٦۷؛ (۳۲) ابن الاثیر : تاریخ (مطبوعۂ قاہرہ)، ۴ : ۲۵۷ تا ۲۵۸؛ (۳۳) منہاج سراج : طبقات ناصری، (ترجمہ Raverty)، ۱ : ۲۹۴، ۲۹۵، ۴۵۲؛ (۳۴) الجوالیقی : المُعَرَّب، ص ٦۷؛ (۳۵) محمد طاہر نسیانی : تاریخ طاہری، (مخطوطہ)؛ (۳٦) المُقدّسی، ص ۴۸۱ تا ۴۸۳؛ (۳۷) *TA*، بذیل مادّہ دیبل؛ (۳۸) N. B. Baloch : *The most probable site of Debal*...، در *IC*، ۳/۲٦، ۱۹۵۲ء، ص ۳۵ تا ۳۹ ۔

(ازہری انصاری)

✱ **دِیَۃ** : [خون بہا]، زر نقد یا مال کی وہ معین مقدار جو کسی کو قتل کرنے یا ظالمانہ طور پر کسی کو جسمانی ضرب پہنچانے کی صورت میں واجب الادا ہو ۔ یہ ذاتی بدلہ لینے کا قائم مقام ہے اور اس حیثیت سے یہ اس معاوضے یا "Wergeld" کے بالکل مطابق ہے جو قدیم رومی یا جرمن قانون میں مقرر تھا، لغت کے اعتبار سے اس لفظ کے معنی اس چیز کے ہیں جو ادا کی جائے ۔ دِیَۃ کو، نسبۃً بہت شاذ طور پر "عَقْل" بھی کہتے ہیں ۔

محدود مفہوم، یعنی اس مفہوم میں، جو قانون میں زیادہ تر لیا جاتا ہے، دِیَۃ وہ معاوضہ ہے جو قتل کے عوض واجب الادا ہو اور جسم کو دوسری قسم کا ضرر پہنچانے کے عوضانے کو خصوصی طور پر "اَرْش" کہتے ہیں ۔

آئین دِیَۃ کی تاریخی اصل زمانۂ قبل اسلام کے رواجی دستور میں پائی جاتی ہے جب کہ یہ عرب کے معاشرتی نظام کے ساتھ لازم و ملزوم تھا ۔ معاشرے کی بنیاد قبائلی زندگی پر تھی ۔ ملک میں کوئی سیاسی اقتدار عام موجود نہیں تھا، بلکہ کسی قبیلے میں علٰحدہ شکل میں بھی نہیں پایا جاتا تھا، اپنا انصاف خود چکانے کا رواج تھا جس میں کسی حد تک پنچایت کے فیصلے کو بھی دخل ہوتا تھا ۔ قتل کی صورت میں شخصی طور پر بدلہ (= ثأر) [رک بہ قصاص] لینے کا قاعدہ خاص طور پر ہر جگہ نافذ تھا ۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ اس حق سے باختیار خود کوئی دست بردار ہو جائے اور اس کے بدلے میں دِیَۃ لینا منظور کر لے ۔ اس دِیَۃ کی مقدار اصولاً سو عدد اونٹ مقرر تھی، کم از کم اس علاقے کے اندر جہاں اسلام وجود میں آیا، اگرچہ بعض روایات میں صرف دس اونٹوں کا ذکر بھی موجود ہے ۔ اس قاعدے پر عمل کرنے میں قبیلے کے تمام افراد کا بالقوۃ اور بالفعل قوی اتحاد کام کرتا تھا ۔ سارا قبیلہ مجموعی طور پر دِیَۃ کے ادا کرنے کا ذمّے دار تھا، جس طرح قصاص میں بھی خود قاتل کے بجائے اس کے قبیلے کے کسی فرد یا افراد سے انتقام لیا جا سکتا تھا ۔ برعکس اس کے جہاں مقتول کا قریبی رشتے دار خود قصاص لینے کے قابل نہ ہوتا اس کے قبیلے کا کوئی مستحق شخص اس کی طرف سے قصاص لے سکتا تھا ۔

اسلام نے اس رواج کی اصل بنیاد میں مداخلت نہیں کی؛ قرآن مجید کی مختلف عبارتیں اس کی صراحۃً تصدیق کرتی ہیں، لیکن ان آیات میں بعض ترمیمات پائی جاتی ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ قتلِ خطا میں بھی دِیَۃ ادا کرنا واجب ہوگا ۔

دوسری جانب اس قدیم دستور کے وحی قرآنی میں آ جانے کا اثر یہ ہوا کہ وہ لا محالہ ایک معیّن قانون کی صورت میں آ گیا اور آئندہ نظری طور پر اس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش نہ رہی ۔

تاہم بہت عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یہ قانون بعض مسلمانوں کے جدید معاشرے کے حالات کے لیے عملاً سازگار نہ رہا ۔ معاشرہ ترقی کرکے بہت جلد ایسی جماعت بن گیا جو نظری طور پر متحد اور بالخصوص ایک منتظم ریاست کی صورت میں نمودار ہوئی ۔

ان مخالفانہ مطالبات کے زیر اثر کام کرتے ہوئے ماہرین قانون نے دِیَۃ [اور ذاتی انصاف کے قانون (رک بہ قصاص)] کا ایک نظریہ قائم کیا جس کے اندر

مختلف مبلانات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ نظریہ عموماً، سنّی اور شیعہ دونوں مسلکوں میں یکساں پایا جاتا ہے، اس کے سوا کہ ثانوی امور میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض کی طرف ہم آگے اشارہ کریں گے.

اس نظریے (دستور) کا میدان عمل قتل اور بعض جسمانی ضرروں تک محدود ہے، جن کی صراحت ذیل میں آتی ہے، جنھیں نام بہ نام گن کر اس طرح معین کر دیا گیا ہے کہ ان کے باہر جتنی صورتیں ہیں ان پر حقوق شہریت کے مروجہ قانون کا اطلاق ہو اور نقصان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرکے اس کی تلافی کی جائے۔ دیۃ کہیں اختیاری ہے کہیں واجب.

اختیاری دیۃ تو وہاں ہوتی ہے جہاں ضرر رسانی کا عمداً ارتکاب کیا گیا ہو۔ قتل عمد کی صورت میں ارادے کی تعریف چند قیود سے مقید کی گئی ہے: نمایاں قید یہ ہے کہ قتل کا ارتکاب ایسے آلے سے کیا گیا ہو جو بذاتہ مہلک ہے۔ اگر یہ آلہ جان سے مارنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا تو اس قتل کو قتل شبہ عمد قرار دیا جائے گا اور اس صورت میں دیۃ اختیاری نہیں رہتی۔ مالکی مذہب میں قتل کی اس تفریق کو نہیں مانا گیا۔ وہ کہتے ہیں جب قتل کا ارادہ ثابت ہو جائے تو خواہ مارنے کے لیے کوئی سا آلہ استعمال کیا جائے، دیۃ اختیاری رہے گی.

لیکن چند صورتیں ایسی ہیں جہاں قتل عمد میں قصاص کا حق نہیں دیا جاتا اور ان صورتوں میں دیۃ اختیاری نہ رہے گی: مثلاً بچے کا قتل، یا ایسا قتل جس میں موت فوری اور براہ راست حملے کے اثر سے واقع نہ ہوئی ہو وغیرہ (رک بہ قصاص)۔ قتل عمد کی اس صورت کے سوا جہاں حق قصاص ثابت ہو جاتا ہے، دیگر صورتوں میں دیۃ واجب ہے.

مختلف مذاہب میں اس مسئلے کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے کہ اختیاری قصاص کی جگہ دیۃ قبول کرنے کا حق فقط مقتول یا اس کے ورثہ کا ہے یا اس اختیار کے نافذ ہونے میں قاتل کی رضامندی بھی ضروری ہے.

اگر فریقین میں اس کے خلاف کوئی باہمی سمجھوتا نہ ہو جائے تو دیۃ کی مقدار کا ایک معین اور محدود پیمانہ مقرر ہے۔ اصولاً اس میں مختلف صورتوں میں مختلف عمر اور جنس کے اونٹوں کی تعداد مقرر کر دی گئی ہے۔ قتل نفس کی صورت میں اونٹوں کی تعداد سو مقرر ہے جو برابر تعداد کے پانچ گروہوں میں منقسم ہے: ۴-۵ سالہ، ۳-۴ سالہ، ۲-۳ سالہ مادہ اونٹ اور ۱-۲ سالہ نر اونٹ، لیکن اس تقسیم میں مختلف فقہی آرا کے اعتبار سے اگر قتل عمد یا شبہ عمد ہے تو دیۃ کی قیمت میں زیادتی کر دی جائے (دیۃ مغلّظہ) یعنی چار پہلی انواع میں نر اونٹ کے بجائے صرف مادہ اونٹ دینا پڑیں گے.

ہر اس صورت میں بھی جہاں کسی پورے عضو کے کاٹ دینے یا جسمانی یا ذہنی وظیفے کے مختل کر دینے کا نتیجہ اتفاقی موت ہو پوری دیۃ واجب الادا ہوگی۔ اگر موت نہ واقع ہو تو دیۃ ہر ضائع شدہ عضو کے مناسب ہوگی: ایک بازو، ٹانگ، آنکھ یا اس کے ڈھیلے کے بدلے کامل دیۃ کا نصف واجب الادا ہوگا؛ پلکوں کے ضائع کر دینے کے عوض چوتھائی دیۃ دینا ہوگی: ہاتھ یا پاؤں کی ایک انگلی کاٹ ڈالنے کے بدلے دیۃ کا دسواں حصہ دینا ہوگا؛ ایک دانت کے عوض دیۃ کا بیسواں حصہ واجب الادا ہوگا وغیرہ.

باقی ماندہ جسمانی ضرر جن کے لیے دیۃ یا اَرش مقرر ہے اور جس کی مقدار دیۃ قتل کا کوئی حصہ مقرر کی جاتی ہے، حسب ذیل ہیں: الجائفۃ، وہ زخم جو بدن کے اندر تک گھس جائے، اور الآمّۃ (یا المأمومۃ) وہ زخم جو دماغ تک پہنچ جائے: پوری دیۃ کا تیسرا حصہ؛ المنقّلۃ، وہ چوٹ جس سے ہڈی ٹوٹ کر جگہ سے ہٹ جائے $\frac{۳}{۲۰}$ واں حصہ؛ الہاشمۃ، جس سے ہڈی ٹوٹ جائے، پوری دیۃ کا دسواں حصہ؛ المُوضحۃ، وہ

زخم جس سے ہڈی کھل جائے، $\frac{1}{10}$ دیۃ۔

اس کے سوا دیگر ضرر دیۃ کے نظام سے باہر ہیں اور ان کا فیصلہ اس بنا پر کیا جاتا ہے جسے "حکومۃ عدل" کہتے ہیں، یعنی اصلی نقصان کی تشخیص، پھر بھی یہ نظام دیۃ کے تحت اس حد تک باقی رہتا ہے کہ معاوضے کی مقدار اس ضرر سے مقابلہ کرکے معین کی جاتی ہے جس کے لیے کوئی دیۃ معین ہو چکی ہے اور کسی حالت میں مقررہ مقدار دیۃ سے نہیں بڑھ سکتی۔

دیۃ یا اَرش کی یہ مقداریں جن کا اوپر ذکر ہوا پوری پوری اس صورت میں واجب ہوتی ہیں جب ضرر رسیدہ شخص مسلم مرد اور رتبے میں آزاد ہو۔ عورت کی دیۃ مرد سے آدھی ہوتی ہے۔ مالکیہ، جن کے اس مسئلے میں شافعیہ بھی پیرو ہیں، کہتے ہیں کہ آدھی دیۃ انہیں صورتوں میں ہوگی جہاں دیۃ پوری دیۃ کے تیسرے حصے سے بڑھی ہوئی ہو، لیکن مثال کے طور پر جہاں جُرم کی نوعیت پوری دیۃ کے فقط چوتھائی حصے کی متقاضی ہو تو عورت کے لیے بھی وہی چوتھائی دیۃ دینا ہوگی جو مرد کے لیے مقرر ہے۔

ذمی اور مستأمن (وہ غیر مسلم اجنبی جو اسلامی علاقے میں عارضی طور پر اجازت لے کر آیا ہو [وہ اجنبی غیر مسلم جو اجازت سے نہ آیا ہو اس کے لیے کوئی دیۃ مقرر نہیں]) کے لیے اکثر فقہا کی رائے میں شرح دیۃ ایک تہائی یا نصف دیۃ ہے، اگرچہ حنفی مساوی شرح کے قائل ہیں۔ ہر صورت میں دیۃ، جبھی واجب الادا ہوگی جب ارتکاب جرم مسلم علاقے میں ہوا ہو۔ غلام کی بابت یہ فیصلہ ہے کہ اگر وہ جرم کا شکار ہوا ہو تو وہ نظام دیۃ کے تحت نہیں آتا (اگر غلام خود مجرم ہو تو اس کا حکم آگے بیان کیا جائے گا) چونکہ وہ دوسرے شخص کی ملک میں مانا گیا ہے اس لیے اگر وہ قتل کر دیا جائے یا اسے ایسا ضرر پہنچایا جائے جس سے اس کی جسمانی صحت بگڑ جائے تو خود مالک کو جتنا نقصان پہنچا ہے اسی کے مناسب وہ معاوضے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ یہ معاوضہ اس دیۃ کی مقدار سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے جو حُرّ کے لیے مقرر ہے، لیکن فقہا کی کثیر تعداد اس طرف ہے کہ قتل کی صورت اس سے مستثنی ہے جہاں معاوضہ دیۃ کی مقدار سے نہیں بڑھ سکتا۔

اگرچہ اصل قاعدے کی رو سے دیۃ میں اونٹ دینا چاہییں، لیکن سونے کے سکوں میں (١٠٠٠ دینار) یا چاندی کے سکوں میں (١٠٠٠٠ یا ١٢٠٠٠ درہم، اس میں اختلاف رائے ہے جس کی بنا بلا شک و شبہہ سونے اور چاندی کے سکوں کی شرح مبادلہ مختلف ہونے پر ہے) ادا کرنا بھی بالکل اسی کے برابر ہے۔ بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ دیۃ مویشی (٢٠٠)، بھیڑ (١٠٠٠) یا لباس (٢٠٠ حلّہ) کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے، لیکن اس مسئلے میں اختلاف رائے ہے کہ صورت ادا کا فیصلہ فریقین کی باہم رضامندی سے ہوگا یا مجرم فریق کو اختیار دیا جائے گا یا قاضی فیصلہ کرے گا، یا یہ ہوگا کہ ان میں سے ایک صورت ادا واجب التعیین ہو جائے گی، اس لیے کہ جہاں قرض چکایا جا رہا ہے اس علاقے میں اسی صورت میں ادا کرنے کا عام رواج ہے؛ یا صورت یہ ہے کہ دیۃ اونٹوں ہی کی شکل میں ادا کرنا پڑے گی جو اصل قانون میں مقرر کی جا چکی ہے، سوا ان حالات کے جن کے تحت اونٹوں کی شکل میں ادا کرنا ناممکن ہو اور اس کی وجہ سے کسی اور شکل میں ادا کرنا ضروری ہو گیا ہو۔

پوری دیۃ کے ادائے مؤجّل کے بارے میں اکثر مذاہب (شافعی، مالکی اور حنبلی) قتل عمد اور بلاعمد میں فرق کرتے ہیں۔ قتل عمد کی صورت میں دیۃ کی ادائی کا مطالبہ اس سال کے اندر اندر کیا جا سکتا ہے جس میں ارتکاب جرم ہوا ہو؛ بلا عمد کی صورت میں دیۃ کو تین سال کے اندر ایک تہائی فی سال کی

قسط میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ہر سال میں دیۃ تین سال کے اندر ادا کی جا سکتی ہے۔

جب دیۃ پوری دیۃ کی ایک تہائی ہو تو ہر صورت میں، ہر مذہب کے مطابق پہلے سال کے اندر بالجبر وصول کی جا سکتی ہے۔ جب دیۃ پوری دیۃ کی ایک تہائی سے زیادہ ہو تو اس کی ادائی میں وہی اختلاف ہے جو پوری دیۃ کی صورت میں ہے؛ جرم عمد کی صورت میں دوسری قسط، حسب رائے اکثریت، وقوع جرم کے سال کے اندر بالجبر وصول کی جا سکتی ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ وہ دوسرے سال کے دوران میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔

دیۃ کی قانونی نوعیت پیچیدہ ہے اور مختلف اور متضاد اوصاف کی حامل ہے جو اس کی اصل صورت اور بعد کے تکمیلی مراحل کا نتیجہ ہے۔ یہ بیک وقت ذاتی انتقام کے قانون کا مظہر، امن عامّہ قائم رکھنے کا ذریعہ اور نقصان رسیدہ کے نقصان کی تلافی کی صورت ہے۔

دیۃ کا لین دار ضرر رسیدہ ہوتا ہے، قتل کی صورت میں اس کے وارث حسب قانون وراثت حصہ دار ہوں گے۔ اس میں مقتول کی صرف حیثیت دیکھ کر دیۃ کا تعین نہیں ہوگا۔

شروع سے دیۃ کے ادا کرنے کی ذمّے داری مجرم کے سارے قبیلے پر عائد ہوتی تھی اور ان حالات میں اس کے قبیلے کو عاقلۃ [رک بآں] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس بات سے دیۃ کی رقم بہت زیادہ ہونے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اجتماعی ذمّے داری کا قاعدہ نظری حیثیت سے تو ضرور قائم رکھا گیا؛ لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس کی صحیح اہمیت کا احساس کھو بیٹھے اور آخرکار بالکل مفقود ہوگیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جُرم بالعمد میں اس کو سراسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ عاقلہ کی ذمّے داری جو پہلے اوّلین درجہ رکھتی تھی، خود مجرم کی ذمّے داری کے سامنے ماند پڑ گئی۔ اس کی وقعت ایک ایسے خیراتی کام سے زیادہ نہ رہی جو ایک مفلس قرضدار کی مدد کے لیے عمل میں لایا جائے۔ اس کے بعد ترقی یافتہ اسلامی معاشرے میں قبیلے کی ذمے داری کا خاتمہ مان لیا گیا تو عاقلہ کی جگہ حکومت نے ذمے داری سنبھال لی، مگر اس کی ذمے داری بھی آخرکار ختم ہو گئی۔ جس جرم کے ارتکاب میں بہت سے مجرم شریک ہوں تو دیۃ کی رقم ہر شخص پر بحصۂ مساوی عائد ہوگی۔

اگر جُرم کا مرتکب مملوک (غلام) ہو تو اس صورت میں بھی قتل عمد اور قتل خطا میں فرق کیا جائے گا۔ پہلی صورت میں قصاص کا احتمال ہے، بالکل اسی طرح جیسے آزاد شخص بجز اس کے کہ ستم رسیدہ یا اس کے وارث مملوک کو حوالے کر دینا پسند کریں لیکن جمہور اس طرف ہیں کہ اگر مستغیث مقدمہ جیت جائے تو وہ یا تو قصاص لے سکتا ہے یا بالکل معاف کر سکتا ہے۔

قصاص یا دیۃ سے متعلق قسامۃ [رک بآں] کی ضمنی رسم بھی تھی یعنی اگر کسی مقام، قبیلے، گاؤں یا علاقے میں کوئی لاش پڑی ملے اور قاتل کا پتا نہ چلے تو اس مقام کے باشندوں میں سے پچاس آدمی حلف اٹھائیں کہ انھیں مجرم کے نام و نشان کا کوئی علم نہیں۔ اگر پچاس آدمی یہ حلف نہ اٹھائیں تو تمام مقامی باشندوں کو مل کر دیۃ کا ادا کرنا لازم آئے گا۔ یہ دستور بھی آخر کار معدوم ہو گیا جیسا کہ چوتھی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی کے ایک مصنف نے لکھا ہے۔

دیۃ کی موجودہ صورت:

موجودہ زمانے میں دیۃ کا نظام دو خاص شکلوں میں، مقامی حالات کے مطابق، باقی نظر آتا ہے۔

بدوی قبائل میں، جو بالطبع ہر نظام حکومت سے دلی مخالفت رکھتے ہیں، ذاتی انتقام کا طریقہ ابھی تک جاری ہے جس کے ساتھ دیۃ سے بھی حسب موقع

کام لیا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد چند خصوصیات کے لحاظ سے ایسے رسم و رواج پر ہے جو قدیم عرب کے رواج سے ملتا جلتا ہے اگرچہ ہر قبیلے میں اس کی صورت الگ الگ ہے . . . .

. . . . متعلقہ حکومتیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکیں کہ ان جماعتوں کے طریق عمل پر چند پابندیاں عائد کر دیں جن کا دائرۂ اثر بھی محدود ہے۔

چنانچہ مصر، اُردن اور شام میں یہ رسم تقریباً عام ہے کہ قتل عمد کے سوا ہر صورت میں دِیَة واجب ہے۔ دیة کے اجزائے ترکیبی میں قبیلے قبیلے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے: صرف ۴۰ نر اونٹ یا ۴۰ نر اونٹ اور ایک دوشیزہ لڑکی یا نقد روپیہ (مثلاً مصر میں ۴۰۰ مصری پونڈ یا ۳۰۰-۴۰۰ پونڈ یا ۱۵۰-۲۰۰ پونڈ وغیرہ)۔ عورت کی دیة مرد کی دِیَة سے زیادہ ہوتی ہے؛ بعض قبائل میں اس کی مقدار مرد کی دیة سے چار گنا یا آٹھ گنا تک زیادہ ہوتی ہے۔ اثبات جُرم کے لیے، آگ یا پانی میں سے گزرنے کا امتحان اکثر عمل میں لایا جاتا ہے، بعض قبائل میں عمل قَسامة بھی دیکھا جاتا ہے۔

زیادہ ترقی یافتہ اور سیاسی حیثیت سے زیادہ منظم قوموں میں بھی دِیَة در اصل اس لیے باقی رہی کہ اس کی نوعیت مذہبی حکم کی سی ہو گئی تھی۔ اس کی مخصوص مثال حکومت عثمانیہ میں ملتی ہے۔ اگرچہ وہاں انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب زمانۂ حال کے مطابق قانون کی اصلاح ہو چکی تھی اور نقصان رسیدہ کے معاوضے کا قانون (معاوضے کے صحیح معنوں کے لحاظ سے) نافذ کر دیا گیا تھا اور اس کے مطابق قانون عامّہ باقاعدہ معمول بہ ہو چکا تھا؛ پھر بھی اہل مقدمہ کے قصاص کا اور آگے چل کر دِیَة کے مطالبے کا حق باقی رکھا گیا۔ خاص طور پر ۱۸۶۳ء کے قانون تعزیرات میں، سرکاری طور پر دِیَة کی مقدار دو سو چوبیس ترکی پونڈ معین کی گئی تھی۔

اب عملی طور پر یہ سب باتیں، دستور سازی سے غالب ہو چکی ہیں؛ لیکن پہلے حالات کے آثار جن کا مٹانا سخت مشکل ہے ابھی تک باقی ہیں۔ بعض ممالک، جیسے شام میں عدالتیں اگرچہ قانون کی ظاہراً و باطناً پابند ہیں اور دیوانی اور فوجداری قوانین زمانۂ حال کے تقاضے کے مطابق ۱۹۴۹ء سے جاری ہیں پھر بھی وہ دِیات ادا کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں جس کی مقدار قتل انسان کی صورت میں یکمشت رقم ہوتی ہے اور اس کی کمی بیشی قتل عمد یا قتل خطا کے لحاظ سے معین کی جاتی ہے۔

قانون دیة کی تمدنی حکمت کے لیے رَکّ بہ قصاص۔

مآخذ: (۱) شیخ زادہ: مجمع الأنہُر، طبع احمد بن عثمان، ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء، ج ۲: ص ۶۱۳ ببعد؛ (۲) دَرْدیر بر الدسُوقی یعنی حاشیہ مختصر الخلیل، ص ۴، ۲۵۸ ببعد؛ (۳) ابن عبدالرحمٰن الدمشقی: رحمة الامة فی اختلاف الائمة، طبع عبدالحمید، قاہرہ، ص ۲۵۵ ببعد؛ (۴) ابن الہُمام: فتح القدیر، قاہرہ، ۸: ۳۴۴ ببعد؛ (۵) ابن قدامہ: المغنی، بار سوم، طبع رشید رضا، قاہرہ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء، ۷: ۲۹۶ ببعد، ۸: ۱ ببعد؛ (۶) خرشی: شرح مختصر الخلیل، ۸: ۲ ببعد؛ (۷) Querry: *Recueil de lois concernant les musulmans chites*، پیرس ۱۸۷۱ء، ۲: ۵۳۱ ببعد؛ (۸) [امام] الشافعیؒ: کتاب الام، قاہرہ ۱۹۰۳ء، ۶: ۲ ببعد؛ (۹) ابو ہیف: الدیة، (فرانسیسی سے عربی ترجمہ)، قاہرہ ۱۹۳۲ء؛ (۱۰) Hakim: *Le dommage de source délictuelle et son évaluation en droit musulman*، مقالہ (ثانی شدہ)، بیروت ۱۹۵۵ء، ص ۱ ببعد؛ (۱۱) Juynboll: *Handbuch*، ص ۲۹۵ ببعد، ۳۵۳؛ (۱۲) Tyan: *Système de responsabilité délictuelle en droit musulman*، مقالہ لیون ۱۹۲۶ء، ص ۱۳ ببعد۔

[(۱۳) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغۃ، مبحث المظالم، ۲: ۱۵۱ تا ۱۵۸: ۱۳۵۵ھ (اردو ترجمہ، ج ۲، مظالم کا بیان)]۔

(E. TYAN)

⊗ **دی تریسی**: فریڈرش دی تریسی (Friedrich Dieterici)، انیسویں صدی کا ایک ممتاز جرمن مستشرق ہے، جس نے عربی ادب اور مسلمانوں کے فلسفے کو اپنا خاص موضوع بنایا اور اس سلسلے میں قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ دی تریسی ۱۸۲۱ء میں برلن میں پیدا ہوا اور برلن یونیورسٹی ہی میں اس نے تحصیل علم کی۔ برلن کے علاوہ اس نے لائپزگ اور ہالہ Halle کی دانشگاہوں کے اساتذہ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ اس نے مشرقی ملکوں یعنی مصر، شام اور فلسطین کا بھی سفر کیا اور وہاں کے علما سے بھی استفادہ کیا۔ دی تریسی ۱۸۵۰ء میں برلن یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور عمر بھر اسی دانشگاہ سے وابستہ رہا۔

عربی ادب کے سلسلے میں دی تریسی نے عربوں کے مشہور شاعر المُتَنَبّی کو اپنا موضوع سخن بنایا اور اس کے محاسن کلام سے بحث کی، اور اس ضمن میں اس کے دیوان کو واحدی کی شرح کے ساتھ دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں الثعالبی کے "رسالۃ فیما جری بین المُتَنَبّی و سیف الدَّولۃ" کو بھی طبع کیا اور اس طریق سے عربوں کے اس مایۂ ناز اور مقبول شاعر کو اہل یورپ سے روشناس کرایا۔

یورپ میں دی تریسی سے پہلے مونک Munk اور رینان Renan وغیرہ مستشرقین مسلم فلاسفہ کے متعلق مستقل کتابیں تصنیف کر چکے تھے۔ دی تریسی نے ان روایات کو قائم رکھتے ہوئے مسلمانوں کے فلسفے کی تحقیق میں خاص نام پیدا کیا اور اس ضمن میں سب سے پہلے رسائل اخوان الصفاء پر توجہ کی، جو چوتھی صدی ہجری میں مرتب ہوئے تھے اور جن کے مؤلفین نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اپنے زمانے کا سارا فلسفہ اور اپنے عہد کے جملہ علوم عام فہم انداز اور سادہ اور سلیس زبان میں بیان کر دیے جائیں۔ دی تریسی نے ان رسائل کے مندرجات سے بحث کی، اور ان میں سے بعض کو جرمن زبان میں منتقل کیا اور اس طریق سے اہل مغرب کو ان رسائل سے آشنا کیا جو مسلمانوں کی علمی اور فکری تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

دی تریسی نے فارابی اور اس کے فلسفے کی تشریح پر بھی خاص توجہ مبذول کی، چنانچہ اپنی عمر کے آخری ایام میں پروفیسر موصوف فارابی کی کتاب السیاسۃ المدنیۃ کا جرمن زبان میں ترجمہ کر رہے تھے، لیکن ابھی اسے مکمل نہ کرنے پائے تھے کہ انھیں داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ تاہم ان کی وصیت کے مطابق ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر پال برونلہ Paul Brönnle نے اس کی تکمیل کی اور آغاز کتاب میں ایک مقدمہ لکھا اور اس میں اپنے نامور استاد کے مختصر حالات کے علاوہ ان کے علمی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ ترجمہ مقدمۂ مذکورہ کے ساتھ ذیل کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے: *Die Staatsleitung von Alfarabi, deutsch Bearbeitung, herausgegeben mit einem Gedenkblatt von Dr. P. Brönnle*، لائڈن ۱۹۰۴ء۔ پروفیسر دی تریسی نے اگست ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔

مآخذ: (۱) ابوالقاسم سحاب: فرہنگ خاورشناسان، صفحہ ۱۱۱؛ (۲) نجیب العقیقی: المستشرقون، ۲: ۶۱۶، قاہرہ ۱۹۶۵ء؛ (۳) Paul Brönnle: *Introduction to F. Dietrici Die Staatsleitung von Alfarabia*، لائڈن ۱۹۰۴ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

* **دیدبان**: فارسی "دیدبان" کا معرّب، ایک اصطلاحی لفظ جو مختلف زمانوں میں بعض انواع کے پہرے داروں، چوکیداروں اور ناظروں وغیرہ کے لیے

مستعمل تھا۔ رسائل اخوان الصّفا میں یہ لفظ پہلے ہی ایک پیشے کے نام کے طور پر نظر آتا ہے (رسالہ ۸، رسالۂ اوّل، طبع قاہرہ ۱: ۲۰۰؛ نیز دیکھیے IC، ۱۹۴۳ء، ص ۱۷۳)؛ اور اس کے ساتھ "ناطُور" بھی مذکور ہے۔ ترکان عثمانی کی معیاری اصطلاح میں یہ لفظ، جس کا تلفظ ان کے ہاں "دیدہ بان" تھا، جنگی خانے کے محافظوں کے لیے مخصوص تھا جن کا سردار "دیدہ بان باشی" کہلاتا تھا۔ استانبول کے برجہاے آتش کے چوکیداروں کو بھی یہی نام دیا جاتا تھا اور اسی طرح بحری اور فوجی دنکو بوال کی چوکیوں کو بھی۔

مآخذ: (۱) Dozy: *Supplement*، ۱: ۴۸۱؛ (۲) اسمعیل حقی اوزون چارشیلی: *Osmanli Devleti Teşkilâtından Kapikulu Ocaklari*، انقرہ ۱۹۴۳ء، ج ۱، ص ۳۹۴؛ (۳) M. Z. Pakalin، ۱: ۴۵۰۔

(ادارہ [وُ] لائڈن)۔

⊛ **دیدُو**: رک بہ دُوو۔

* **دَیر**: سریانی الاصل لفظ، ان عیسائی خانقاہوں پر دلالت کرتا ہے جو مشرق وسطٰی میں عربوں کی فتح کے بعد بھی کام کرتی رہیں۔ اگر ہم عرب مصنفین کی مرتب کردہ فہرستوں پر یقین کریں تو ان خانقاہوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، بالخصوص زیریں عراق (دجلہ اور فرات کی وادیوں کے ساتھ ساتھ) بالائی عراق، شام (اجڑے شہروں کے قرب و جوار میں "منارہ نشین" Stylite راہبوں کی درگاہیں)، فلسطین اور مصر میں (وادی نیل کے ساتھ ساتھ)۔ ان کے نام اکثر مربیّ راہبوں کے نام پر (: تکریت کے نزدیک دَیر مار یُوحنّا، شمالی شام میں دَیر سمعان)، یا اپنے بنانے والوں کے نام پر (عراق میں دَیر عبدون) رکھے جاتے تھے، لیکن گاہے گاہے قریب ترین شہر یا دیہات (: شام میں دیرالرصافة) یا مقامی علاقے کی خصوصیت کی بنا پر (: موصل کے قریب دَیرالأعلٰی، بالائی عراق میں دیرالزعفران) بھی رکھے جاتے تھے۔ راہب جنھیں "دیّار یا دَیرانی" کہتے تھے، ان دیروں میں رہتے تھے (جنھیں عراق میں "عُمر" بھی کہتے تھے، جس کی اصل کا صحیح علم نہیں)۔ خانقاہیں اکثر و بیشتر سیدھے سادے حجروں سے زیادہ مختلف نہ ہوتی تھیں خصوصاً اگر وہ زیادہ دور دراز علاقوں میں واقع ہوتیں، تاہم وہ عموماً کئی عمارتوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ایک گرجا (کنیسہ یا بیعہ) رہنے کے حجرے (قلّیہ، جمع قلالی، یا کُرح، جمع اکراح اور اکیرح۔ یہ سریانی زبان کے الفاظ ہیں، اگرچہ دوسرا صحیح معنوں میں عراقی ہے) اور بیرونی عمارتیں، مثلاً دکانیں اور سرائیں۔ دَیر فی الحقیقت زراعت کو فروغ دینے کا بھی مرکز بن گیا تھا اسے ان اراضی سے مالیہ حاصل ہوتا تھا جو اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کاشت کی جاتی تھیں (تاکستان، زیتون کے باغ اور نخلستان)۔ حجروں اور خانقاہوں کو حفاظتی دیواروں کے ذریعے، یا محفوظ مقام انتخاب کرکے انھیں قابل دفاع بنایا جاتا تھا (مثلاً انھیں پہاڑوں کے پہلو پر بلکہ گھاٹیوں کے اندر بنایا جاتا تھا اور اس طرح وہ داخلے کے عام ذرائع سے بالکل الگ کر دیے جاتے تھے)۔

عیسائی خانقاہیں اسلام کے ابتدائی ایام میں مذہبی اور دماغی مشاغل کا مرکز ہوتی تھیں مثلاً تیسری۔ چوتھی صدی ہجری / نویں۔ دسویں صدی عیسوی میں نسطوری کلیسا میں عبادت کے جو قواعد رائج ہوے انھیں موصل کے "دیرالاعلٰی" میں مرتب کیا گیا تھا (دیکھیے J. M. Fiey: *Mussoul chrétienne*، بیروت ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۶ تا ۱۳۲)۔ قدیم یونانی کتابوں کی اشاعت میں بھی ان خانقاہوں نے بڑا معقول حصہ لیا۔ یہ کتابیں عام طور پر سُریانی میں اور وہاں سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ بعض صورتوں میں ان خانقاہوں میں بڑے بڑے کتاب خانے قائم کیے گئے، جن میں سے کوہ سینا پر سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ کا ذخیرۂ کتب

قابل ذکر ہے (دیکھیے A. S. Atiya: *The Arabic manuscripts of Mount Sinai*، بالٹی مور ۱۹۵۵ء)۔ مزید برآں، بعض عراقی خانقاہیں اور ان سے وابستہ عیسائی فرقے عباسی عہد میں، سرکاری محرّروں کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوئے۔ وہ سلطنت کے نظم و نسق میں حصہ لیتے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد منصب وزارت تک کے مستحق ہو جاتے تھے [رک بہ دیر قُنّا]۔

اسلامی دنیا کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بھی ان خانقاہوں کی خاصی اہمیت رہی۔ ان میں بلا امتیاز مذہب کم و بیش سب مسافروں کو، جن میں ممتاز شخصیتیں بھی شامل ہوتی تھیں، آنے کی اجازت تھی اور بلا شبہہ یہ اکثر کسی دوسری جگہ سے زیادہ محفوظ پڑاؤ مہیا کرتی تھیں، مثلاً دمشق کے قریب دیر مُرّان [رک بآں] کے مقام پر ایک شاہی اقامت گاہ تھی (جسے بعض مصنفین نے غلطی سے خانقاہ بیان کیا ہے)۔ بعض اوقات بادشاہ یا حکّام کو خاص "دیر" کے اندر ٹھیرنے کی جگہ دی جاتی تھی۔ یہی صورت موصل کے دیر الاعلٰی، الرقّہ کے دیر الزکّی یا الانبار کی خانقاہ کی تھی، جہاں ہارون الرشید اور اس کے خدم و حشم نے ۱۸۷ھ/۸۰۳ء میں قیام کیا تھا۔ یہی جگہ تھی جہاں جعفر البرمکی کو قتل کیا گیا (الطبری، ۳: ۶۷۵ تا ۶۷۸) فاطمی خلیفہ المعزّ نے مصر پہنچ کر چند ماہ الجیزہ کی خانقاہ میں قیام کیا تھا۔ ایسے بہت سے تحریری شواہد موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکمران اور شہزادے سیر و شکار کے دوران میں مقامی خانقاہوں میں جاتے جہاں راہب کھانے پینے کی چیزوں سے ان کی تواضع کرتے تھے۔ ہر خانقاہ میں کوئی نہ کوئی سالانہ مذہبی تیوہار منایا جاتا تھا اور ان عمارات کے آس پاس عموماً کھیل تماشے بلکہ بدکاری کے اڈّے ہوتے تھے۔ خصوصاً جب وہ کسی بڑے شہر کے قریب واقع ہوتیں۔ علاوہ ازیں ان کے ساتھ عام طور پر شراب خانے بھی ملحق ہوتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رندانہ اور عشقیہ شاعری میں خانقاہوں کا ذکر کیوں آتا ہے اور کیوں ان کے بعض مکینوں کے قابل اعتراض کردار کے متعلق طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔ تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے عرب مصنفوں نے ایسی نظموں اور کہانیوں کو جمع کرکے جن میں ان کا ذکر آتا ہے، ان کے متعلق پوری کی پوری کتابیں لکھ ڈالی تھیں۔ اگرچہ ان میں سے اب محض الشّابُشْتی (م ۳۸۸ھ/۹۹۸ء) کی کتاب الدِّیارات ہی موجود ہے، تاہم ہمیں کئی دوسری کتابوں کے نام معلوم ہیں جنھیں ہشام الکلبی، ابوالفرج الاصفہانی، شاعر السَّرِی الرفّاء اور دو بھائیوں الخالدیّان اور السُّمَیساطی نے لکھا تھا۔

عرب فتح کے بعد خانقاہوں اور گرجاؤں پر فقہا کی لگائی ہوئی شرطیں عائد کر دی گئیں۔ اگرچہ جو خانقاہیں موجود تھیں انھیں جوں کا توں رہنے دیا گیا، لیکن راہبوں کو نئی عمارات بنانے کی، بلکہ فرسودگی یا کسی حادثے کے باعث جو نقصان پہنچا ہو اس کی مرمت کی بھی ممانعت کردی گئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ خانقاہوں کی حالت وقت کے ساتھ بدلتی رہتی تھی اور مذہبی رواداری کے بعد جبر و تشدّد کے دور بھی آتے رہتے تھے۔ خانقاہوں کے مکینوں پر عائد ہونے والے محاصل مستقل بحث و تمحیص کا موضوع ہوتے تھے۔ راہب، ابتدا میں جزیے سے مستثنٰی تھے اور فقہا بعد میں اس متواتر عمل کی اکثر توثیق کرتے رہے، لیکن بعض کے نزدیک یہ استثنا فقط مفلوک الحال راہبوں کے لیے جائز تھی اور شوافع کی رائے میں تو یہ معافی قطعاً ناجائز تھی۔ تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ عہد بنوامیّہ میں بعض والیوں نے مصری خانقاہوں میں راہبوں پر شخصی محصول عائد کر دیا تھا اور عباسی عہد میں بعض والی صرف خاص حالات میں معافی کی منظوری

دیتے تھے۔ المُقتدر کی خلافت میں یہ سوال پھر اٹھایا گیا جب ۳۱۳ھ/۹۲۵ء میں مصر میں محصولات کے ناظر اعلٰی علی بن عیسٰی نے مطالبہ کیا کہ وادی النُّطرُون کے راہبوں کو جو محصول کی معافی دی گئی تھی اسے منسوخ کر دیا جائے۔ خلیفہ نے اس کی درخواست کو منظور نہ کیا۔ ۳۶۶ھ/۹۷۶ء میں الطّائع نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ جزیے کا اطلاق غریب راہبوں پر نہ کیا جائے (دیکھیے ذِمّہ)۔

پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی عیسائی خانقاہوں کے لیے روز افزوں تکلیف کے آغاز کا زمانہ تھا۔ انہیں پے در پے سلجوق اور مغول حملوں، بڑھتی ہوئی بدامنی (مثلاً بالائی عراق میں ترکمانی حملے)، صلیبی جنگوں کے وقت مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کی خرابی اور چھوٹی عیسائی بستیوں کی روز افزوں معدومی سے سابقہ پڑا۔

• عراق میں بغداد اور سامرّا کے قریب جو خانقاہیں تھیں وہ تباہ ہو گئیں اور جو مصر میں تھیں ان میں سے بیشتر کو خالی چھوڑ دیا گیا اور وہ ریت میں دب گئیں (ان میں سے بعض حالیہ کھدائیوں میں ظاہر ہوئی ہیں)۔ مغول حملے کے بعد سے عیسائی خانقاہی زندگی صرف چند ایک خانقاہوں تک محدود ہو کر رہ گئی، جو زیادہ تر بالائی عراق، الموصل اور علاقۂ ماردین میں (طُور عبدِین کی خانقاہیں)، صحرائے سینا اور مصر میں (وادی النُّطرُون کے کنارے اور بحیرۂ احمر کے قریب)۔ فلسطین اور شام میں، جو عرب فتح سے پہلے خانقاہوں کے بڑے مرکز تھے، فقط چند ایک منتشر خانقاہیں ہی باقی رہ گئیں اور وہ بھی زیادہ تر یروشلم اور جبالِ لبنان کے علاقے میں۔ اس کے برعکس خود لبنان میں خانقاہی نظام کو ایک نئی زندگی ملی، خصوصاً پندرھویں صدی میں جب پہاڑوں میں واقع قنوبین کی خانقاہ مارونی بطریق کا صدر مقام مقرر ہو گئی۔

عیسائی خانقاہوں نے اپنے عہد فروغ میں اپنے علاقے کی فنکارانہ زندگی میں حصہ لیا، چنانچہ بعض خانقاہوں میں مستعمل تزئینی اسالیب کا اس عہد کے اسلامی فن پاروں سے تقابل بڑا معلومات افزا ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مصر میں وادی النُّطرُون کے مقام پر دَیرالسُّریانی (جہاں چونے گچ کے نقش و نگار میں سامرّا کے اسلوب کے اثرات نمایاں ہیں) اور موصل کے قریب خانقاہ مار بِہنام (جس کے بعض حصے قدامت میں چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی تک جاتے ہیں) خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ مزید برآں خانقاہوں میں نقل شدہ بعض مخطوطوں کی طلا کاری قدیم ترین اسلامی مرقعوں سے مشابہت رکھتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مخطوطوں نے اپنے اسلوب اور فن کی بعض خصوصیات وہیں سے ورثے میں پائی تھیں۔

مآخذ: (۱) حسن زیّات: الدیارات النصرانیه فی الاسلام، در مشرق، ۱۹۳۸ء، ص ۲۱۹ تا ۴۱۷؛ (۲) A. Fattal: *Le statut légal des non-Musulmans*، بیروت ۱۹۵۸ء، ص ۱۷۴ تا ۲۰۳، ۲۷۰ تا ۲۷۲؛ (۳) الشابشتی: کتاب الدیارات، طبع کورکیس عوّاد، بغداد ۱۹۵۱ء؛ (۴) البکری: المعجم، طبع وُسٹنفلٹ، ۱: ۲۵۹ تا ۳۸۱؛ (۵) یاقوت، ۲: ۶۳۹ تا ۷۱۰ و ۳: ۷۲۴ تا ۷۲۶؛ (۶) العمری: المسالک، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۲۵۴ تا ۳۸۶؛ (۷) A. S. Marmardji: *Textes géographiques arabes sur la Palestine*، پیرس ۱۹۵۱ء، ص ۷۲ تا ۷۹؛ (۸) المقریزی: الخطط، طبع بولاق، ۲: ۵۰۱ تا ۵۰۹، و طبع قاہرہ، ۴: ۴۰۹ تا ۴۲۷؛ (۹) *The churches and monasteries of Egypt*، جسے ابو صالح ارمنی سے منسوب کیا جاتا ہے، ترجمہ از Evetts-Butler، آکسفرڈ ۱۸۹۵ء؛ (۱۰) E. A. Wallis Budge: *The chronography of Gregory Abū 'l-Faradj (Bar Hebraeus)*، لنڈن ۱۹۳۲ء، مقدمہ؛ (۱۱) R. Honigmann: *Le Couvent de Barsauma et le patriarcat jacobite d' Antioche et de Syrie*، لووین ۱۹۵۴ء؛ (۱۲) N. Abbott:

The monasteries of the Fayyum، در *A J S L*، ۵۳ (۱۹۳۷ء): ۱۳ تا ۳۳، ۴۳ تا ۹۶، ۱۵۹ تا ۱۷۹؛ (۱۳) H. C. Evelyn White: *The monasteries of the Wadi n' Natrun*، ۲ جلدیں، نیویارک ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۳ء؛ (۱۴) S. Flury: *Die Gipsornamente des Dêr es-Sûrjâni*، در *Isl.*، ۴ (۱۹۱۳ء): ۷۱ تا ۸۷؛ (۱۵) F. Sarre و E. Herzfeld: *Archäologische Reise im Euphrat und Tigris Gebiete*، برلن ۱۹۱۱ء، ۲: ۳۰۴؛ (۱۶) J. Leroy: *Moines et monastères du Proche-Orient*، پیرس ۱۹۵۸ء؛ (۱۷) وھی مصنف: *Les manuscrits syriaques à peintures conservés dans les bibliothèques d'Europe et du Proche-Orient*، جلد شائع ھونے والی ھے۔

(D. SOURDEL)

* **دِیر**: ایک نوابی ریاست، جس کا الحاق ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے ھوا۔ اس کا رقبہ ۲۰۴۰ مربع میل ھے اور اس کی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۱،۴۸،۶۴۸ تھی۔ یہ چترال [رک بآں] کے جنوب میں ۳۵ درجے ۵۰ ثانیے اور ۳۴ درجے ۲۲ ثانیے عرض بلد شمالی اور ۷۱ درجے ۲ ثانیے اور ۷۲ درجے ۳۰ ثانیے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ھے۔ اس کا نام والیِ ریاست کے صدر مقام موضع دیر سے موسوم ھے اور یہ موضع اسی نام کی ایک ندی کے کنارے واقع ھے، جو دریاے پنج کوڑا کی معاون ھے۔ سیاسی لحاظ سے ریاست دیر کم و بیش اس علاقے پر مشتمل ھے جسے پنج کوڑا اور اس کی معاون ندیاں سیراب کرتی ھیں۔ اس ریاست کو انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں "مجاھدین" کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے شہرت حاصل ھوئی: یہ مجاھدین سیّد احمد بریلوی" [رک بآں] کی شکست خوردہ فوج کے باقی ماندہ لوگ تھے، جن کا صدر مقام پہلے اَسمَسْت (ستّھانہ) میں اور بعد ازاں یاغستان میں چمرکند تھا۔

[۱۹۶۹ء میں عوامی مطالبات کے پیش نظر سوات، دیر اور چترال کی ریاستیں پاکستان میں مدغم کرکے ان پر مشتمل مالاکنڈ ڈویژن تشکیل کی گئی، جو شمال مغربی سرحدی صوبے کا حصہ ھے]۔

دیر کا آخری نواب، سلطان محمد شاہ خسرو اخوند خیل کا فرد تھا، جو یوسف زئی کے پایندہ خیل کی ایک ذیلی شاخ ھے۔ دیگر ھمسایہ ریاستوں، سوات، امب اور چترال کے بانیوں کی طرح دیر کے حکمران خاندان کے بانی مُلّا الیاس المُلقّب بہ اخوند بابا نے گیارھویں صدی ھجری / سترھویں صدی عیسوی میں فروغ پایا۔ مگر کہا جاتا ھے کہ سب سے پہلے اس کے پوتے غلام بابا نے مذھبی مقتدا کی زندگی ترک کر کے دنیوی اقتدار اختیار کیا۔ اس کا پرپوتا غزن خان بن قاسم خان بن ظفر خان تھا، جو ۱۸۶۳ء میں اپنی دس ھزار فوج کے ساتھ امبیلا کی مہم میں قبائلی لشکروں کے ساتھ شریک ھو گیا۔ یہ مہم برطانوی ھندوستانی فوج سیّد احمد بریلوی" کے مجاھدین اور اُن کے حلیفوں کے خلاف لائی تھی۔ جب غزن خان نے دیکھا کہ لڑائی کا پلّہ حملہ آور (انگریزوں) کے حق میں جُھک رھا ھے تو وہ اپنا لشکر لے کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا رحمت اللہ خان جانشین ھوا۔ اُسے اپنے استحقاق کی کمزوری کا علم تھا، لہٰذا اس نے مہاراجا کشمیر کی مالی امداد سے ریاست حاصل کی۔ ۱۸۷۵ء میں رحمت اللہ نے کشمیر کے ایجنٹ (برطانوی قائم مقام) سے ناراض ھو کر مہاراجا سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے اور اس کی سیادت سے نکل گیا۔ ۱۸۸۴ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا محمد شریف تخت نشین ھوا اور جلد ھی اس نے اپنی ھمسایہ ریاست چترال [رک بآں] کے خلاف لڑائیوں اور چڑھائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا، مگر محمد شریف خان کی فوجوں کو شکست فاش ھوئی اور چترال کے مہتر امان المُلک کا دیر میں بڑا عمل دخل ھو گیا۔ محمد شریف خان کو سوات [رک بآں] میں پناہ لینا پڑی،

جس کے ساتھ اس کی ریاست کو ہمیشہ برسرِ پیکار رہنا پڑتی تھی۔ اس نے امان الملک سے اپنا علاقہ واپس لینے کی کئی بار کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ۱۸۹۰ء میں اسے جنڈول کے طالع آزما سردار عمرا خان نے فتح کر لیا تھا۔ پانچ سال بعد ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں محمد شریف خان برطانوی فوجوں کی اخلاقی اور مادی مدد سے دیر کو واپس لینے بلکہ چترال کے تخت کے مدعی شیر افضل کو گرفتار کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

۱۸۹۷ء میں محمد شریف خان کو نواب کا لقب عطا کیا گیا اور اسی سال اس نے اپنے خاندان کی دیرینہ دشمن ریاست سوات کے بالائی علاقے کے ایک حصے کو اپنی ریاست سے ملحق کر لیا۔ نواب کا خطاب اسے غالباً انگریزوں کی خیر خواہانہ خدمات کے صلے کے طور پر عطا ہوا تھا، کیونکہ اس نے دیر کے قبائل کو اس جہاد میں حصہ لینے سے باز رکھا جسے مُلّا سعد اللہ خان بُنیری عرف "سر آور" (یعنی سر پھرا) نے بیرونی حکومت کے خلاف شروع کیا تھا۔ محمد شریف خان برطانوی حکومت کا بہت پکا حلیف رہا۔ اسے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا اورنگ زیب خان (بادشاہ خان) اس کا جانشین ہوا۔ جلد ہی اس کا اپنے چھوٹے بھائی میاں گل خان سے جھگڑا ہو گیا، جس نے دیر کی آبادی میں نواب کے مخالف گروہوں سے اتحاد کر کے اپنے بڑے بھائی کے خلاف پیش قدمی کر دی اور جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ/جون ۱۹۰۵ء میں دیر کے دو قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے برطانوی چیف کمشنر کی کوششوں سے ان میں صلح ہو گئی، مگر وہ چند روزہ ثابت ہوئی اور دونوں بھائیوں کے درمیان ۱۹۱۱-۱۹۱۲ء میں پھر لڑائی چھڑ گئی۔ اس خانہ جنگی کا زمانہ ۱۹۱۴ء میں جنڈول کے مقام پر میاں گل کی وفات کے ساتھ ختم ہوا۔

۱۹۱۷ء میں، جب کہ پہلی عالم گیر جنگ ابھی جاری تھی، بادشاہ خان نے عمرا خان کے ایک بیٹے عبدالمتین خان کو جنڈول کا علاقہ دوبارہ حاصل کر لینے میں مدد دی، لیکن فوراً بعد اس پر خود قبضہ کر لیا۔ اس کے اس فعل کو بدترین قسم کے غصب اور دغا بازی پر محمول کیا گیا۔ محرم ۱۳۳۶ھ/اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ترکیہ کے سلطان کی طرف سے ایک دعوت نامہ یاغستان کے جنگجو قبائل کے نام جاری ہوا تھا۔ اس میں بھی دیر کے نواب پر زور دیا گیا تھا کہ وہ قبائل کے درمیان پھوٹ ڈالنا چھوڑ دے اور جنڈول کو اس کے حق دار وارث کے حوالے کر دے۔ ۱۹۱۹ء میں سوات کی ستائی ہوئی رعایا نے میاں گل شاہزادہ کے تحت بادشاہ خان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا، لیکن انگریزوں نے ۱۹۲۲ء میں شاہزادے کو اپنے مفتوحہ علاقے سے واپس ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں جب بادشاہ خان کا انتقال ہوا تو اس کا سب سے بڑا بیٹا محمد شاہ جہان خان، معزول حکمران، اس کا جانشین ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں پورا شمال مغربی سرحدی صوبہ انگریزی حکومت کے خلاف اُٹھا تو اس نے پشاور اور اس کے نواحی علاقوں میں سرخ پوشوں کے فسادات کے سدباب کرنے میں اپنے تمام وسائل برطانوی حکومت کو پیش کر دیے۔ اسی سال دیر اور سوات کی موجودہ سرحدوں کی توثیق ہو گئی اور اس طرح صدیوں پرانی عداوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔

دیر کے علاقے کا ایک بڑا حصہ چھوٹی چھوٹی خانیوں میں منقسم ہے، جو نواب کے اقربا کے قبضے میں ہیں۔ حال ہی میں (۱۹۵۹ء) ریاست میں کچھ فسادات ہوئے تھے لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ سیاسی قسم کے نہیں تھے بلکہ زیادہ تر زرعی قسم کے تھے۔

۱۹۶۰ء میں حکومت پاکستان نے محمد شاہ جہان خان کو بد انتظامی اور بے نظمی کے سنگین الزامات کی بنا پر گدی سے معزول اور گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ اس کا جانشین اس کا سب سے بڑا بیٹا شہزادہ

محمد شاہ خسرو ہوا جسے ۹ نومبر ۱۹۶۰ء کو مالاکنڈ ایجنسی میں چکدرہ کے مقام پر باضابطہ دیر کا نواب بنایا گیا ۔

مآخذ : (۱) C. U. Aitchison: *Treaties, Engagements and Sanads . . .*، دہلی ۱۹۳۳ء، ۱۱ : ۳۱۷ تا ۳۴۴؛ (۲) غلام رسول مہر : سرگذشت مجاہدین، لاہور ۱۹۵۶ء، ص ۳۴۸، ۲۵۹، ۲۶۵، ۲۶۸، ۳۸۹، ۴۵۰؛ (۳) *Imperial Gazetteer of India*، آکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ص ۲۶۰ تا ۲۶۱؛ (۴) *The Indian Musulmans*، کلکتہ ۱۹۴۵ء، ص ۲۹؛ (۵) *Memoranda on the Indian States*، دہلی ۱۹۴۰ء، ص ۲۱۰ تا ۲۱۵؛ (۶) نیز دیکھیے مقالہ سوات ۔

(یزنی انصاری)

* **دیرُ الاَعْوَر** : عراق میں ایک مقام، جو قبیلہ ایاد کی شاخ امیّہ بن حُذَافَة کے ایک فرد کے نام پر موسوم ہے (البلاذری: فتوح، ص ۲۸۳؛ ابن الفقیہ الہمدانی: بلدان، ص ۱۸۲؛ یاقوت، ۲ : ۶۴۴) ۔ اس لیے یہ ایک ایادی دَیر ہے (ابن الفقیہ الہمدانی، ص ۵۳۲ بحوالہ الہیثم بن عَدی؛ اَلبکری، ص ۹۹ بحوالہ ابن شَبّہ) ۔ الہمدانی کا اسے دیرالجَماجم سمجھنا (محلّ مذکور) غالباً غلطی ہے، کیونکہ اس کی تائید کسی دوسرے مآخذ سے نہیں ہوتی ۔

دَیرالاَعور کا ذکر ساسانی سپہ سالار رستم کے پیش قدمی کے بیان میں ملتا ہے جو اس نے مدائن (Ctesiphon) سے قادسیّہ تک براہ کُوثابرس (قدیم Bursippa) ۔ ملطاط، نجف کی تھی جہاں وہ خیمہ زن ہوا تھا (الطبری، ۱ : ۲۲۵۴) ۔ اس دَیر کا ذکر اس وقت بھی ملتا ہے جب سلیمان بن صُرَد نے اقساس مالک اور کربلا کی طرف کوچ کرنے سے پہلے توابین کی معیت میں کوفہ چھوڑا اور اسی مقام کو اپنے متّبعین کے جمع ہونے کے لیے منتخب کیا (الطبری، ۲ : ۵۴۸؛ البلاذری : اَنساب، ۵ : ۲۰۹) ۔ پھر اس وقت جب حُمَید بن قحطَبہ جنوب کی طرف کربلا ۔ دیرالاعور ۔ عباسیّۃ کے راستے بڑھا (الطّبری، ۳ : ۱۵) نیز اس وقت جب الحسن بن قحطَبۃ نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تھا (الطّبری، ۳ : ۱۸) اور آخر میں جب سعید اور ابوالبَطّ قصبہ نیل سے چڑھائی کر کے دَیر الاَعْور سے گذرے تا کہ ہَرثَمۃ کی فوجوں کو روکیں جو نہر سُری کے کنارے شاھی نامی گاؤں میں ڈیرے ڈالے پڑی تھیں ۔

ان متون سے ظاہر ہوتا ہے کہ دَیرالاَعْور کی جاے وقوع برس کے مغرب اور نجف کے مشرق میں ہے نیز کربلا سُرّی اور شاھی کے جنوب اور عباسیّہ اور نیل کے شمال میں ہے ۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک لوگ اسے جانتے تھے ۔

کوفی باغی عُبَیداللہ بن الحُرّ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مُصْعَب کے زمانے میں عُمر بن عُبَیداللہ کے ہاتھوں شکست کھا کر دَیر الاَعْور کی جانب پسپا ہوا تھا (الطّبری، ۲ : ۷۷۵؛ ابن الاَثیر، ۴ : ۲۳۱) ۔

مآخذ : درمتن ۔

(SALEH A. EL ALI)

* **دیرالجاثلیق** : یہ نام عراق میں دو خانقاہوں کو دیا گیا ہے ۔ پہلی مَسکِن کے ضلع (طسّوج) میں واقع ہے جس کی آبپاشی نہر دُجَیل سے ہوتی ہے ۔ یہ نہر سامرّے کے جنوب میں دریاے دجلہ کے مغربی کنارے سے نکلتی ہے اور جنوب کی طرف تقریباً اسی خط پر بہتی ہے جس پر جدید دُجَیل یہاں تک کہ وہ بغداد کے قریب پہنچ جاتی ہے مَسْکِن کا محل وقوع بغداد کے شمال میں تقریباً نو دس فرسنگ (۵۰ تا ۵۵ کیلومیٹر) کے فاصلے پر متعین کیا جا سکتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آثار ہی اب اپنے قدیم نام سے موسوم اور "خرائب مسکِن" (یعنی مسکن کے کھنڈر) کہلاتے ہیں ۔ وہ جدید دُجَیل کے مغربی

کنارے سے کوئی تین کیلومیٹر دور سُمیکہ گاؤں کے جنوب میں ہیں (دیکھیے Sousa : *Rayy Samarra*، ۱ : ۱۹۰ - ابو صخیر مسکن کے کھنڈر نہیں ہو سکتے جیسا کہ Streck کا خیال تھا - وہ دجلے کی قدیم گذرگاہ کے قریب ہے؛ دیکھیے وہی کتاب نقشہ مقابل ص ۱۹۲).

دَیرالجاثلیق کا مقام مسکن کے قریب تھا (تب البلاذری : انساب، ۵ : ۳۳۷) - یہ بات قرین صحت معلوم ہوتی ہے کہ اس کے آثار وہ ہیں جنھیں "تل الدّیر" کہتے ہیں اور جو اب سمیکہ گاؤں سے چھے کیلومیٹر جنوب مشرق کو ہیں - ان آثار میں اینٹوں کی ایک چوکور عمارت مع ایک چوکور صحن کے آس پاس کی زمین سے بلند تر دکھائی دیتی ہے Sousa : کتاب مذکور، ۱ : ۱۹۶-۱۹۷).

تاریخ عرب میں دَیرالجاثلیق اپنی شہرت کے لیے اس فیصلہ کن جنگ کا مرہون منت ہے جو اس کے نواح میں خلیفہ عبدالملک اور مُصعب بن الزُبیر والی عراق کے درمیان ۷۲ھ/۶۹۱ء میں لڑی گئی - مُصعب اپنے بھائی اور خلافت کے مدعی حضرت عبداللہ بن الزُبیر کی طرف سے عراق کے والی تھے - زبیری شاعر عبداللہ بن قیس الرُقیّات اسے "یوم الدّیر" کہتا ہے - مُصعب کو شکست ہوئی اور وہ شہید ہو گئے (دیکھیے البلاذری : انساب، ۵ : ۳۴۳، ۳۵۰، ۳۵۵؛ المسعودی، ۵ : ۲۴۶ ببعد؛ الاغانی، ۸ : ۱۳۲؛ ۱۰ : ۱۴۷، ۱۶۲؛ الطبری، ۲ : ۸۰۶، ۸۱۸، ۸۱۲؛ الیعقوبی، ۲ : ۳۱۷؛ Wellhausen : *Das Arab. Reich* (۱۹۰۲ء)، ص ۲۰، تا ۱۲۲).

مُصعب جس جگہ دفن ہوے وہاں ایک مقبرہ تعمیر ہوا جو جلد ہی زیارت گاہ بن گیا - قرینۂ غالب یہ ہے کہ امام منصور کا قبہ ہی مُصعب کا مقبرہ ہے (البلاذری : انساب، ۵ : ۳۳۷؛ Sousa : کتاب مذکور، ۱ : ۱۹۸) - البلاذری یہ بھی کہتا ہے (ص ۳۵۰) کہ لڑائی کی جگہ کو "خربۂ مُصعب" کہتے ہیں جو ایک صحرا ہے جہاں، لوگوں کے قول کے مطابق، کچھ نہیں اگتا).

اس کا نام "کیتھولکوس Catholicos کی خانقاہ" اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نسطوریوں کا سربراہ وقتاً فوقتاً اس جگہ ٹھیرا کرتا تھا.

دوسرا دیرالجاثلیق مغربی بغداد میں ایک بڑی خانقاہ تھا (دیکھیے M. Streck : *Die Alte Landschaft Babylonien*، ۱ : ۱۶۴؛ اسٹرینج : *Baghdad*، ص ۲۱۰؛ الشابشتی : الدّیارات، طبع کورکیس عوّاد، ص ۲۲۱ تا ۲۲؛ ر۔ بابو اسحق : نصاری بغداد، ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۳ تا ۱۰۸).

مآخذ : کتابوں کے حوالے مقالے میں مذکور ہیں۔ مندرجۂ ذیل قابل لحاظ ہیں : (۱) یاقوت، ۲ : ۶۵۱، ۶۶۰؛ (۲) مراصد الاطلاع، طبع Juynboll، ۱۸۵۰ء ببعد، ۱ : ۴۲۳؛ ۵۳۹؛ (۳) Sousa : *Rayy Samarra*، ج ۱ (بغداد ۱۹۴۸ء)، ص ۱۹۸ ببعد؛ (۴) M. Streck : *Die Alte Landschaft Babylonien*، ۲ : ۱۹۰، ۲۳۶؛ (۵) الشابشتی : الدّیارات، (طبع کورکیس عوّاد)، بغداد ۱۹۵۱ء، ص ۲۲۱ تا ۲۲۳.

(A. A. Duri)

دَیرالجماجم : عراق میں کوفے کے نزدیک ایک مقام، یہ اصل میں قبیلہ اِیاد کے عراق سے نقل مکانی کر جانے سے پہلے ان کی ملکیت میں تھا (البکری، ص ۹۰، بحوالہ ابن شبہ؛ الہمدانی، بلدان، ص ۱۳۵، بحوالہ الہیثم بن عدی).

اس کی اصل کے متعلق بہت سی لغوی تشریحات پائی جاتی ہیں - ابو عبیدہ کہتا ہے کہ اس کا نام لکڑی کے پیالوں سے ماخوذ ہے جو وہاں بنائے جاتے تھے (نقائض، ص ۲۱۲؛ ابن قتیبہ : المعارف، ص ۱۵۶؛ البکری : المعجم، ص ۳۷۵؛ یاقوت : ۲ : ۱۱۲، ۶۵۲)- دیگر مستند مصنفین کا دعوی ہے کہ اس کا نام ان

ان مقتولوں کی مدفون کھوپریوں پر رکھا گیا تھا جو إیاد بہرا (الشرق: فتوح، ص ۲۸۳؛ ابن الفقیہ الہمدانی: البلدان، ص ۱۸۲)، یا إیاد اور ساسانیوں کے درمیان لڑائی میں مارے گئے تھے (ابن الکلبی: الفتوح، ص ۲۸۳، ابن شبّہ درالبکری، ص ۷۰؛ المسعودی: التنبیہ، ص ۱۷۵)؛ یاقوت (۲ : ۶۵۲) کہتا ہے کہ اس کا نام ایک کنویں سے ماخوذ ہے جو شور زمین میں تھا۔

دَیرالجماجم فرات کے مغرب میں (البکری، ص ۷۰، ۳۷۵، بحوالۂ ابن شبّہ) کوفے کی سطح مرتفع پر (الاصفہانی درالبکری، ص ۳۷۵؛ یاقوت، ۲ : ۶۵۲)، عین التُّمر اور قُلوجہ کے قریب (الطّبری، ۲ : ۱۰۷۳) کوفے سے تقریباً سات فرسنگ پر واقع ہے۔

جماجم کی لڑائی (۸۳ھ/۷۰۲ء) کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دَیر کوفے اور فرات سے نسبۃً زیادہ قریب دَیر قُرّہ [رک باں] کے نزدیک (الاصفہانی درالبکری، ص ۵۹۲؛ یاقوت ۲ : ۸۵۷) جنوب مشرق میں ہے۔

تاریخ اسلام میں دَیرالجماجم، الحجّاج اور ابو عبدالرحمٰن بن الاشعث کے درمیان ۸۳ھ/۷۰۲ء کی جنگ کے میدان کے طور پر معروف ہے (دیکھیے ابن الاشعث)۔ مؤخر الذکر کی حمایت بیشتر عرب کوفیوں اور بعض غیر عرب موالیوں نے کی تھی۔ جب طویل گفت و شنید ناکام ہوگئی تو الحجّاج نے، جسے شامی عربوں کی کمک پہنچ گئی تھی، ابن الاشعث کو شکست دی، جو مسکن کی طرف پسپا ہوگیا اور الحجاج کا کوفے سے متعلق کوئی حریف نہ رہا۔ اسے موقع مل گیا کہ اپنے مخالفوں کے خلاف سخت اقدامات کر کے شہر پر پورا اقتدار جمالے۔ اس لڑائی کے لیے دیکھیے الطّبری، ۲ : ۱۰۷۰ ببعد؛ الیعقوبی، ص ۳۳۲؛ المسعودی: التنبیہ، ص ۳۱۵ اور مروج، ۴ : ۳۰۳؛ ابن قتیبہ: المعارف، ص ۱۵۶؛ ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۷۵؛ ابن الاثیر، ۴ : ۳۷۶ ببعد۔

مآخذ: در مقالہ۔

(SALEH A. EL-ALI)

دَیرالزُّور

* **دَیرالزُّور**: شام کا ایک چھوٹا سا شہر، جو سطح بحر سے ۱۹۵ میٹر بلند اور دریاے فرات سے دائیں کنارے پر ہے، جس پر ۴۵۰ میٹر لمبا معلق (Suspension) پل، جو ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوا تھا، شہر سے کچھ آگے بنا ہوا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں یہ ایک "سنجاق" اور بعد میں ایک "محافظۂ" کا صدر مقام بن گیا۔ یہ شہر آج کل دور جدید کی بھی جھلک رکھتا ہے۔ اس کے بائیس ہزار باشندوں میں اکثریت سُنّی مسلمانوں کی ہے اور مختصر سی عیسائی اقلیت سابق ترکی مقبوضات سے آئے ہوئے ارمنی مہاجرین پر مشتمل ہے۔ اس میں تین مسجدیں اور کئی مشرق کلیسا اور رومن کیتھولک گرجے ہیں۔ یہ ایک اہم فوجی مرکز اور حلب و دمشق سے ہستچے Hasatche، موصل اور بغداد جانے والی سڑک پر ایک منزل ہے۔ اس طرح یہ آج کل وہ کردار ادا کرتا ہے جو قرون وسطٰی میں رحبۃ مالک اور قرقیسیۃ کیا کرتے تھے۔

یہ غالبًا قدیم شہر اوزرہ Auzara کی جگہ بنا تھا اور "اوزرہ" ہی کی بدلی ہوئی ترتیب حروف سے دَیر الزُّور کا نام نکلا ہے۔ اس کے معنی اب "درختوں کے جھنڈ میں بنی ہوئی خانقاہ" کے بتائے جاتے ہیں۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اسی دَیر الزُّور کے بالکل متصل دَیر الرُّمّان واقع تھا، جسے یاقوت (۲ : ۶۶۲) نے الرقّہ اور خابور کے درمیان بتایا ہے۔

مآخذ: (۱) V. Cuinet : *La Turquie d'Asie*، ۲، پیرس ۱۸۹۰ء؛ ۲۷۵ ببعد؛ (۲) A. Musil : *The Middle Euphrates*، نیویارک ۱۹۲۷ء، ص ۱ تا ۳؛ (۳) R. Dussaud : *Topographie historique*، ۲۵۰ de la Syrie، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۳۵۶، ۳۸۲ تا ۳۸۳؛ (۴) M. Canard: Histoire des H'amdânides، ۱، الجزائر ۱۹۵۱ء، ۱: ۹۵.

(D. Sourdel)

* **دَیر سَمْعان**: شام میں کئی مقامات کا نام، جسے ماضی و حال کے اہل قلم اکثر خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ نام ان عیسائی خانقاہوں کی جگہوں کے لیے آتے تھے جو اسلام کی ابتدائی صدیوں تک آباد اور پررونق تھیں۔ ان خانقاہوں میں سے جنھیں سمعونؑ کا نام، جو شام میں عام ہے، دیا جاتا تھا، دیر مُرّان [رک بآن] ہے، جو معرّۃ النعمان کے قریب ہے، اور جس کے نام دیر سمعان کا اطلاق غلطی سے دمشق کے دَیر مُرّان پر بھی کیا جانے لگا؛ نیز انطاکیہ کے علاقے میں ان بوزنطی عمارتوں پر جو پہاڑی چوٹیوں پر جا بجا بنی ہوئی تھیں (کیونکہ یہ سبھی چوٹیاں جبل سمعان کہلاتی تھیں)۔ مگر اس نام کی خانقاہوں میں سب سے ممتاز حلب کے شمال مغرب میں ۳۰ کیلومیٹر پر تھی اور اپنی شہرت کے لیے ایک منارہ نشین Stylite راہب سمعون اکبر (Simeon the Elder) کی مرہون منت تھی، جو وہاں اقامت پذیر تھا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں اس خانقاہ کو بوزنطیوں اور عربوں کی جنگ میں اور پھر آگے چل کر فاطمیوں اور حمدانیوں کے مابین جنگ میں سخت نقصان پہنچا۔ عہد ایوبی تک غالباً یہ خانقاہ ویران ہو چکی تھی۔ بہرکیف شمالی شام کے دلچسپ آثار الصّنادید میں سے ایک یہاں کے "سمعون یا سمعان ولی کا دیوان خانہ" (باسلیق basilic) اور ان حجروں کے کھنڈر میں جہاں زائرین آ کر ٹھیرتے تھے (اسی کی طرف جدید لفظ "دَیْر" خصوصیت سے اشارہ کرتا ہے)۔ قرون وسطٰی میں مسلمانوں نے اس دیوان خانے کو قلعہ بنا کر قلعۃ سمعان نام رکھ دیا۔ ایک دوسری خانقاہ، جو انطاکیہ سے مُونِدِیَہ کو جانے والی سڑک پر واقع ہے، منارہ نشین راہب سمعون اصغر (Simeon the Younger) کی یادگار تھی اور بلاشبہہ یہی وہ دیر سمعان ہے جس پر ابن بُطلان کے بیان کا، جسے یاقوت (۲: ۶۷۲) نے نقل کیا، اطلاق ہوتا ہے۔

مآخذ: (۱) ابن العدیم: زبدہ، طبع سامی الدہان، ۱، دمشق ۱۹۵۱ء، ۱: ۲۲۳؛ (۲) J. Lassus: Sanctuaires chrétiens de Syrie، پیرس ۱۹۴۷ء، بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ دَیر سَمعان، قلعۂ سمعان، Mont Admirable؛ (۳) G. Tchalenko: Villages antiques de la Syrie du Nord، ۲، بیروت ۱۹۵۸ء، ۱۹۲: ۱۰۰، ۱۱۹، ۱۲۳؛ (۴) Howard C. Butler: Ancient architecture in Syria (Publications of the Princeton University archaeological expeditions to Syria in 1904-1909)، قسمت ۲، لائڈن ۱۹۱۹ء۔

(D. Sourdel)

* **دَیر العاقُول**: عراق کا ایک قصبہ، جو دجلے کے کنارے بغداد کے جنوب مشرق میں ۱۵ فرسنگ (تقریباً ۸۳ کیلومیٹر) پر واقع ہے (یاقوت، ۲: ۶۷۶-۶۷۷؛ المُقدّسی، ص ۱۲۳، بہ فاصلہ دو منزل بتاتا ہے اور ابن فضل اللہ العُمَری: مسالک الابصار، قاہرہ ۱۹۲۳ء، ۱: ۲۶۳، اسے ۱۲ فرسنگ یا ۶۷ کیلومیٹر لکھتا ہے)۔ اس قصبے نے غالباً ایک عیسائی خانقاہ کے اردگرد ترقی پائی اور وہ مرکزی نہروان میں ایک زراعتی ضلع (طَسُّوج) کا مرکز بن گیا تھا۔

ابن رُستہ (۳۰۰ھ/۹۱۲ء) وہاں کی جامع مسجد اور منڈی کا ذکر کرتا ہے؛ اس طرح اس کی قدرے خوشحالی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک چوکی تھی جہاں کشتیوں میں لائے ہوئے تجارتی سامان "ماصر" پر محصول لیا جاتا تھا (ابن رُستہ، ص ۱۸۶)۔ الاِصْطَخْری (۳۱۸ھ/۹۳۰ء تا ۳۲۱ھ/۹۳۳ء) اس کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ واسط کے شمال میں دوسرے

قصبات کے مانند متوسط رقبے کی بستی تھا، اس کے چاروں طرف کھیت تھے۔ نصف صدی بعد حدود العالم کا مؤلف (۳۷۲ھ/۹۸۲ء) اسے ایک خوشحال شہر بتاتا ہے، جب کہ المقدسی (حدود ۳۷۵ھ/۹۸۵ء) اسے بغداد اور واسط کے درمیان دجلے کے کنارے کا اہم ترین شہر لکھتا ہے، جو بہت خوشحال اور پررونق تھا۔ اس میں کئی منڈیاں تھیں، جن کی جامع مسجد سے کچھ دور بہت سی شاخیں تھیں (المقدسی، ص ۱۲۳).

تاریخ میں دیرالعاقول اس فیصلہ کن جنگ کے لیے مشہور ہے جو ۲۶۲ھ/۸۷۶ء میں یعقوب بن اللیث الصفار اور خلیفہ المعتمد کی فوج کے مابین ہوئی، جس کی قیادت اس کے قابل بھائی الموفق نے کی تھی۔ اس میں باغی والی کو پہلی دفعہ شکست ہوئی اور خلافت کو جو بہت بڑا خطرہ لاحق ہو گیا تھا دور ہو گیا (دیکھیے الطبری، ۳: ۱۸۹۳؛ المسعودی: مروج، ۸: ۱۰ ببعد؛ Weil: *Geschichte der Chalif*، ۲: ۴۴۱؛ Müller: *Isl.*، ۱: ۵۸۳؛ Nöldeke: *Sketches*، (۱۸۹۲ء)، ص ۱۹۵ ببعد).

بعد ازاں یہ شہر زوال پذیر ہو گیا اور جب یاقوت نے اس کے حالات لکھے (ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کا آغاز)، جن کی مراصد الاطلاع میں لفظ بہ لفظ نقل کی گئی ہے، تو العاقول کی خوشحالی کا زمانہ قصۂ ماضی ہو چکا تھا۔ خلافت کا انحطاط، نہر نہروان کی تباہی اور گزرگاہ دجلہ میں تبدیلی اس انحطاط کے بڑے اسباب تھے۔ یاقوت نے اسے دریا سے مشرق کی طرف ایک میل (۱۸۴۸ میٹر) دور دیکھا تھا، جہاں وہ الگ تھلگ ایک ویران علاقے میں واقع تھا.

عرب جغرافیہ نویسوں کے نقشوں سے دریاے دجلہ کے تعلق سے اس کے محل وقوع کی بتدریج تبدیلی ظاہر ہوتی ہے۔ البلخی (۳۰۸ھ/۹۲۰ء) اور الاصطخری نے اسے براہ راست دریاے دجلہ کے مشرقی کنارے پر دکھایا ہے (Sousa: العراق فی الخوارط القدیمۃ، بغداد ۱۹۶۰ء، عدد ۱۲، ۱۸؛ قب نقشۂ المقدسی، عدد ۲۳ اور الجیہانی، عدد ۲۷)۔ ابن حوقل دریا کو قدرے مغرب کی جانب ہٹا ہوا دکھاتا ہے (وہی کتاب عدد ۲۲)۔ ابوسعید المغربی (۶۸۵ھ/[بہ تصحیح ۱۲۸۶ء]) اسے دریاے دجلہ کے مشرق میں کچھ فاصلے پر دکھاتا ہے، اور اس طرح وہ یاقوت کی تائید کرتا ہے (وہی کتاب، نقشہ عدد ۲۴)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی نے پھر سنبھالا لیا تھا، کیونکہ حمد اللہ المستوفی (م ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء) اسے ایک بڑا قصبہ بتاتا ہے، جس کی آب و ہوا باغوں اور نخلستانوں سے گھرے ہونے کے باعث مرطوب تھی (نزہۃ القلوب، ص ۴۶)۔ العمری (م ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء) اگرچہ خانقاہ کی عمدہ عمارات کا ذکر کرتا ہے لیکن خود بستی کو ایک بڑا گاؤں بتاتا ہے.

دیر العاقول انجام کار بالکل ویران ہو گیا۔ اس کا محل وقوع ان کھنڈروں کے درمیان جنہیں مقامی طور پر 'الدیر' کہتے ہیں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ الدیر تین ٹیلوں پر مشتمل ہے جو دریاے دجلہ کے مشرق اور جدید عزیزیہ کے شمال میں ہیں (دیکھیے ہاشمی: مفصل جغرافیۃ العراق، بغداد ۱۹۳۰ء، ص ۵۲۹).

دیر العاقول کا نام، جو بظاہر عربی ہے (لفظاً اونٹ کٹارا Camel-thorn، [Alhagi maurorum یا Hedysarum Alhagi] کی خانقاہ)، عراق کے دیگر متعدد قبل از اسلام ناموں کی طرح آرامی زبان کا ہے۔ عربی دوسری شکل زبان کے "عاقول" سے آرامی زبان کا آکولہ (akola: موڑ) بنا ہے، اس لیے اس نام کے معنی دریا کے موڑ کی خانقاہ ہوے۔ آکولہ عراق میں ایک دوسرے قصبے کا نام بھی ہے، جو کوفے کے مضافات میں ہے، اور یہ نام دریاے فرات میں ایک بہت ہی نمایاں خم کے باعث دیا گیا ہے، جیسا کہ سریانی

ماخذ میں صراحۃً بیان کیا گیا ہے (دیکھیے Nöldeke، در S B Ak. Wien، ج ۱۲۸، Abh. ۹ : ۴۳).

مآخذ: حوالے مقالے میں موجود ہیں۔ مندرجۂ ذیل بھی قابل غور ہیں: (۱) Sumer، ۱۰، ۱۹۵۴ء، ص ۱۲۰؛ (۲) لسٹرینج، ص ۵۰؛ (۳) وہی مصنف در JRAS، ۱۸۹۵ء، ص ۷۰؛ (۴) K. Ritter : Erdkunde، ۱۰ : ۱۹۱، ۲۳۴.

(A. A. Duri)

* **دیر عبدالرحمٰن**: کوفے کے نواح میں حمام اَعیَن کے قریب (الطّبری، ۲ : ۳۰۷) قناطر رأس الجالوت (الطّبری، ۲ : ۱۰۷) سے اگلا مقام، جو کوفی فوج کا مقام اجتماع تھا، جسے حجّاج نے الجَزْل کی قیادت میں خوارج اور ابن الاَشْعث کے خلاف بھیجا تھا (الطّبری، ۲ : ۹۰۲، ۹۲۰)۔ الحارث بن ابی ربیعۃ نے المختار کے خلاف بغاوت کے دوران یہاں پڑاؤ کیا تھا (الطّبری، ۲ : ۷۵۹).

(Saleh A. El-Ali)

* **دیر قُرّہ**: ایک جگہ جو امیّہ بن حُذافۃ ایادی قبیلے کے کسی فرد کے نام پر موسوم ہے (الفقیہ الہمدانی: البلدان، ص ۱۸۲؛ یاقوت: معجم، ۲ : ۶۸۵، بحوالۂ ابن الکلبی)۔ یہ قبیلۂ ایاد کی ایک شاخ تھی (البَلاذُری: فتوح، ص ۲۸۳؛ البَکری، ص ۵۹۲ - بحوالۂ ابن شَبّہ) اس لیے اسے اصل کے لحاظ سے ایادی دیر سمجھنا چاہیے (الفقیہ الہمدانی، ص ۱۳۵ - بحوالۂ الہَیثم بن عَدی؛ البَکری، ص ۶۹۸ بحوالہ ابن شبّہ)۔ الاصفہانی کا دعوی ہے کہ قرّہ ایک لخمی شخص تھا (البکری، ص ۵۹۱؛ یاقوت، ۲ : ۶۸۵) اور یہ دیر المُنذِر کے عہد حکومت میں قائم ہوا تھا (البکری، محل مذکور).

قدیم اسلامی تاریخ میں دیر قرّہ کا ذکر ایک ایسے مقام کے طور پر ملتا ہے جس میں سے ساسانی فوج کا ایک دستہ قادسیہ کی لڑائی میں پسپا ہو کر گزرا تھا (الطّبری، ۱ : ۲۲۵۷) اور جہاں الحجّاج نے جنگ جماجم کے دوران میں پڑاؤ کیا تھا [رک بہ دیر الجماجم]۔ یہ دیر کوفے سے سات فرسنگ کے فاصلے پر ہے، جو کربلا سے بہت دور ہے اور اس کی سرحد پر نہیں، جیسا کہ A. Musil نے اپنے مقالے میں غلطی سے اس کا محل وقوع بتایا ہے (*Middle Euphrates*، ص ۳۱۱).

(Saleh A. El-Ali)

* **دیر قُنّا**: عراق کا ایک مقام، جو کوئی ۹۰ کیلومیٹر بغداد کے جنوب میں، دریاے دجلہ کے بائیں کنارے سے ایک میل دور ہے۔ یہ نام ایک بڑی خانقاہ کی نسبت سے ہے، جو عہد عباسیہ تک بڑی بہت بارونق تھی۔ اس میں ایک گرجا، ایک سو حجرے اور زیتون اور کھجور کے وسیع باغات تھے اور ان سب کو چوڑے آثار کی دیواریں احاطہ کیے ہوے تھیں۔ متبرک صلیب کے تہوار کے موقع پر بہت سے لوگ خانقاہ میں جمع ہو جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلجوق قبضے کے زمانے میں یہ خانقاہ ویران ہو گئی۔ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے جغرافیہ نویس لکھتے ہیں کہ اس وقت فقط اس کے کھنڈر باقی رہ گئے تھے.

دیر قنّا اصل میں عیسائی نیز نو مسلم اعلٰی عہدے داروں کے خاندان کی وجہ سے، جن کا یہ وطن تھا، مشہور ہوا۔ ان میں معروف ترین بنو الجرّاح کا خاندان ہے۔ تین وزیر الحسن بن مَخْلد، محمد بن داؤد اور علی بن عیسٰی اسی خاندان کے افراد تھے۔ دیر قُنّا کے سرکاری کاتب تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں خاصا اہم سیاسی کردار ادا کرتے تھے۔ خلیفہ المُعتَمِد کے عہد حکومت میں انھوں نے نَجْران کے معاہدے کو عام تسلیم کرانے کی کوشش کی، جس میں عیسائیوں کو خاص خاص مراعات دی

گئی تھیں اور ابن المعتز (۲۹۶ھ/۹۰۸ء) کی سازش کی تائید کی۔ جب انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو وہ پکے سنّی مسلمان بن گئے اور انھوں نے خلافت کے انحطاط پذیر اقتدار کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ وہ الحلّاج کی تعلیمات سے بھی متاثر ہوئے (الحلّاج کے مریدوں میں سے کم از کم ایک دیر قنّا کا تھا)، لیکن شیعیوں کے حمایتی گروہوں کی کھلم کھلا دشمنی نے سنّی خلیفہ کے اقتدار کو بحال کرنے اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

مآخذ: (۱) یاقوت، ۲: ۶۸۲ تا ۶۸۸؛ (۲) الشابشتی: کتاب الدیارات، بغداد ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۱ تا ۱۲۶، ۲۳۸ تا ۲۵۰؛ (۳) البکری: المعجم، طبع وسٹنفلٹ، ۱: ۳۸۱؛ (۴) العمری: مسالک الابصار، طبع احمد زکی پاشا، ص ۲۵۶ تا ۲۵۸؛ (۵) الطبری، ج ۳، ۱۹۶۱ء؛ (۶) لسٹرینج، ص ۲۶ تا ۲۷؛ (۷) میخائیل عوّاد: دیر قنّاء، در مشرق، ۳۷، ۱۹۳۹ء: ۱۸۰ تا ۱۹۸؛ (۸) L. Massignon، *Vivre et penser (Revue biblique)* در سلسلۂ دوم، ۱۹۴۲ء، ص ۷ تا ۱۴؛ (۹) وهی مصنف، در *Dieu vivant*، ۴، ۱۹۴۶ء: ۱۸، ۲۲؛ (۱۰) A. Fattal: *Le statut légal des non-Musulmans*، بیروت ۱۹۵۸ء، ص ۴۹؛ (۱۱) D. Sourdel: *Le vizirat abbaside*، دمشق ۱۹۵۹ تا ۱۹۶۰ء، بمدد اشاریہ۔

(D. SOURDEL)

* **دَیر کعب**: ایادی دَیر (البلاذری: فتوح، ص ۱۸۳) جو عراق میں مدائن (Ctesiphon) سے کوفے جانے والی اُس بڑی شاہ راہ پر ہے جو کوثہ۔ دیر کعب۔ مزاحمیّہ (نزد قسّین) سے گذرتی ہے (الطبری، ۱: ۲۰۶۰؛ الاصفہانی: مقاتل الطالبین، ص ۶۳)۔ مسلم افواج قادسیة میں فتح حاصل کرکے جب مدائن کی طرف بڑھیں تو انھوں نے یہاں ایک ساسانی دستے کو، جو نخیر جان کی قیادت میں تھا، شکست دی (فتوح، ص ۲۶۲)۔

(SALEH A. EL-ALI)

* **دَیر مرّان**: شام میں دو سابقہ خانقاہوں کا نام۔ اس نام کی اصل مبہم ہے۔ عربی اشتقاق "دَیر المُرّان" بمعنی "جنگلی زیتون کی خانقاہ" مشتبہ ہے اور سریانی زبان میں بھی اس کی کوئی تسلی بخش تشریح نہیں ملتی۔ ان دو خانقاہوں میں سے زیادہ معروف دمشق کے نزدیک تھی، گو اس کے بالکل صحیح محل وقوع کی تعیین نہیں ہو سکتی۔ یہ جبل قَیسون کی زیریں ڈھلانوں پر باب الفرادیس اور ایک عقبہ (درّہ) کے قریب تھی جہاں سے غُوطہ کے میوہ دار باغ سامنے نظر آتے ہیں۔ اور غالبًا [نہر] بَرَدٰی [رک بآن] کا دہانہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک وسیع خانقاہ تھی اور بنوامیّہ کے زمانے میں پچّی کاری سے مزیّن تھی۔ اس کے ارد گرد ایک گاؤں بسایا گیا تھا۔ اور قیاس یہ ہے کہ یہ ایک سکونت گاہ تھی جہاں رہ کر خلفاء تفریح بھی کر سکتے تھے اور اپنے دارالخلافہ پر نگاہ بھی رکھ سکتے تھے۔ دیر مرّان کا ذکر اپنے زمانے کی نظموں میں اکثر آتا تھا۔ خلیفہ یزید اول نے نہر یزید کو جو ترقی دی اس سے بلاشبہہ اس کی اراضی کو فائدہ پہنچا۔ وہ اس جگہ قیام پذیر تھا جب اس کی تخت نشینی سے پہلے اس کے والد نے اسے قسطنطینیہ کے خلاف مہم کی قیادت کے لیے طلب کیا تھا۔ الولید اوّل نے ۹۶ھ/۷۱۵ء میں اس جگہ انتقال کیا اور خیال یہ ہے کہ الولید ثانی نے اسے اپنی سکونت گاہ بنا لیا تھا۔ عباسی خلفا اور ان کے نائب کئی موقعوں پر دیر مرّان آئے یا اس میں مقیم ہوئے تھے۔ ھارون الرشید اور المأمون، جس نے پہاڑ کے پہلو پر دیدبان تعمیر کروایا اور ایک نہر کھدوائی تھی، اور اسی طرح المعتصم بھی یہاں آ کر رہے۔ الواثق نے قَیس کی بغاوت فرو کرنے کے لیے رَجَہ بن ایوّب کو دمشق بھیجا، تو اس نے دیر مرّان ہی میں اپنا مستقر قائم کیا تھا۔

دَیر مُرّان کو ابوالفرج البَبَّغا (الثعالبی: یتیمۃ، ۱ : ۱۸۰) اور کُشاجم اور الصَّنَوبَری حلبی نامی شعرا نے چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں شہرت دی۔ عہد ایوبی میں اس کا ذکر ایک جغرافیہ نویس اور صلاح الدّین کے ایک مدّاح قصیدہ گو نے بھی کیا تھا۔

بعض لوگوں نے یہ غلط دعوٰی کیا ہے کہ حضرت عُمَر بن عبدالعزیزؓ کا مقبرہ دَیر مُرّان میں تھا۔ دراصل وہ اسی نام کی ایک دوسری خانقاہ میں تھا جو ایک پہاڑی پر معرّۃ النعمان کے قریب شمالی شام میں تھی، جس کے نیچے کَفَر طاب نظر آتا تھا۔ مؤخر الذکر کو دَیر النَّقیرہ اور دَیر سَمْعان بھی کہتے تھے۔ اگرچہ یہ خانقاہ ایوبی عہد ہی میں بے نشان ہو گئی تھی تاہم وہ موضع اس وقت تک آباد تھا اور ایک مقدس بزرگ شیخ ابو زکریا المغربی کا مسکن تھا۔ ان سے ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے وقائع نویس واقف تھے اور سلطان صلاح الدّین نے بنفس نفیس ان کی زیارت کی تھی۔ انھیں حضرت عُمَر بن عبدالعزیزؓ کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا تھا (J and D. Sourdel: *Annales archéologiques de Syrie*، ۳، ۱۹۵۳ء : ۸۳ تا ۸۸)۔

مآخذ: (۱) الطبری، ۲ : ۱۲۷۰، ۱۲۹۲؛ (۲) الیعقوبی، ۲ : ۲۷۲؛ (۳) ابن الاثیر، ۶ : ۳۷۲؛ (۴) الاغانی، ۶ : ۱۹۵؛ ۷ : ۵۵؛ ۱۶ : ۳۳؛ (۵) البکری: المعجم، طبع وُسْتَنفِلْت، ۱ : ۳۶۲؛ (۶) ابن عساکر: تاریخ مدینۃ دمشق، طبع صلاح الدین المنجِّد، ۲، دمشق ۱۹۵۴ء : ۳۱، ۱۰۳، ۱۹۶؛ (۷) ابن شدّاد: تاریخ دمشق، طبع سامی الدہان، دمشق ۱۹۵۶ء، ص ۲۸۲ تا ۲۸۷؛ (۸) یاقوت، ۱ : ۸۲۵؛ ۲ : ۶۹۶ تا ۶۹۷؛ ۳ : ۶۰۳، ۶۸۰؛ (۹) ابن شاکر الکتبی: عیون التواریخ، بہ تتبع H. Sauvaire: *Description de Damas*، در *JA*، ۱۸۹۶ء، ص ۳۸۱، ۷۰۳ : (۱۰) العمری: مسالک الابصار، طبع احمد زکی پاشا، ۱ : ۳۵۰ تا ۳۵۶؛ (۱۱) *Études sur le règne du calife omaiyade Mo'awiya Ier*، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۳۷۷ تا ۳۷۸، ۳۳۳ تا ۳۳۵؛ (۱۲) R. Dussaud: *Topographie historique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۱۸۳ تا ۲۹۸؛ (۱۳) محمد کرد علی: غوطۃ دمشق، ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۹ء، ص ۲۰۱ تا ۲۰۳؛ (۱۴) حسن زیات، در مشرق، ۴۳ (۱۹۴۹ء): ۳۱۵ تا ۳۳۸۔

(D. SOURDEL)

* **دَیر موسٰی**: مُرّی جاتے ہوئے کوفے کے نزدیک ایک مقام (الطّبری، ۲ : ۶۳۳)۔ جب حضرت علیؓ نے الاَشْعَث کو خوارج کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بھیجا تو انھوں نے اپنی فوجوں کے اجتماع کے لیے یہ مقام منتخب کیا (الطّبری، ۱ : ۳۳۲۲ تا ۳۳۳۳)۔ المُختار اس دَیر میں یزید بن اَنَس کو الوداع کہنے کے لیے پہنچا تھا جسے اس نے موصل پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا تھا (الطّبری، ۲ : ۶۳۳)۔

(SALEH A. EL-ALI)

* **دیسقوریدیس**: [= دیا سقوریدس]، یونانی Διοσκορίδης کی صحیح ترین عربی املا۔ دوسری شکلوں مثلاً دیاسقوردوس، میں سُریانی اثر و نفوذ تسلیم کرنے کی گنجائش ہے۔ اسلام میں یہ نام ہمیشہ Pedanius Dioscorides (پہلی صدی قبل از مسیح) کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کلیکیا میں عین زربہ Anazarbe کے مقام پر پیدا ہوا، اس کے نام کی مکمل معرب شکل "دیسقُردیس العینَ زَربی" ہے۔ قرون وسطٰی میں مسلمان اس کے اور اس کی تصانیف کے متعلق جو کچھ جانتے تھے اس کا خلاصہ ابن جُلجُل کی طبقات الاطبّاء و الحکماء (طبع فؤاد سیّد، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ص ۲۱) میں مل سکتا ہے۔ جالینوس [رک بآں] (۳۷۷ھ/۹۸۷ء) کے بعد بھی طبیب تھے جس کا مسلمان بکثرت حوالہ دیتے ہیں۔ اس کی تصنیف περὶ ὕλης ἰατρικῆς جسے جالینوس پہلے ہی

قرابادین (materia medica) کا ایک معیاری دستور العمل خیال کرتا تھا اور جو مسلمانوں کے علم دوا سازی (دیکھیے ادویہ) کی اساس رہی ہے، عربی زبان میں اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے: ہیولی علاج الطب، کتاب الأدوية المفردة اور کتاب الحشائش۔ یہ یونانی سے سُریانی میں اصل ترجمہ تھا، جس نے عربی ترجمے کی بنیاد کا کام دیا؛ اسے اِصطفان بن بسیل نے اصل متن سامنے رکھ کر کیا تھا، اور اس کی اصلاح حُنَین بن اسحٰق [رک بآن] نے تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں بغداد میں کی تھی۔ فقط یہی ایک مکمل ترجمہ تھا جو بلاد اسلامیہ میں کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ قدیم یونانی متن کی طرح دو نسخوں میں شائع ہوا: (۱) دیسقردیس Dioscorides کا اصل نسخہ، جس میں مفرد ادویہ کو مختلف اقسام میں باقاعدہ ترتیب دیا گیا تھا، جس سے کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ان میں سمیات پر بعد میں تین اور موضوعہ کتابوں یا حصوں کا اضافہ کیا گیا؛ (۲) دوسرے نسخے میں حوالے کی سہولت کے لیے حروف تہجی کی ترتیب اختیار کی گئی اور اس سے متن کی عبارتوں میں اضافہ ہوا.

دیسقردیس Dioscorides کے عربی متن کی مجموعی یا جزوی صورت میں کُل بلاد اسلامیہ میں اشاعت ہوئی اور اس نے عربی زبان میں علم الادویہ کے متأخر مطالعات میں مدد دی۔ آغاز ہی سے دو بڑی مشکلات نمایاں تھیں: پہلی مشکل تاریخ طبیعی کا مسئلہ تھا کیونکہ نباتی انواع ہر جگہ ایک جیسی نہیں تھیں؛ دوسری لسانی اور قاموسی دقت، کیونکہ مختلف انواع کو بغیر ابہام کے موسوم کرنا آسان نہیں تھا۔ اصلی عربی ترجمے کے متن میں اصل یونانی، سُریانی اور ایرانی ناموں کو داخل کر کے ان مشکلات کو تسلیم کیا گیا ہے.

اسی بنا پر دیسقردیس کی قرابادین *materia medica* کے مخطوطات کے ذیلی حواشی و تشریحات بہت ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک سب سے قیمتی مخطوطہ، جسے شہزادی اینسیا جولیانا Anicia Juliana کے لیے بوزنطی حکومت کے شاہی دربار میں نقل کیا گیا تھا، اپنے متنوع حواشی کی بنا پر بہت دلچسپ ہے۔ یہ حواشی یونانی، نیز عربی مخطوطات کی مشرق سے مغرب کی جانب پُر خطر نقل مکانی کے شاہد ہیں اور اس مسلسل عالمانہ تحقیقات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں جس کے یہ خود محرک ہوتے رہے۔ چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی میں اس غیر مختتم محنت کا مرکز قرطبہ کا دربار خلافت تھا، جہاں راہب نکولاس Nicholas نے، جو قسطنطنیہ سے آیا تھا، حسدائے بن شپروط [رک بآں] اور دوسروں کے ساتھ مل کر عربی کے قدیم مشرقی ترجمے کو مغرب کی ھسپانوی عربی مصطلحات علمیہ کی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا۔ اس کام کو ابن جُلجُل، ابن بکلارش اور دوسروں نے برابر جاری رکھا۔ مشرق میں الحسین بن ابراہیم النّاتِلی نے اسی قسم کی مکرّر تطبیق کی خدمت انجام دی اور اپنی عربی تالیف دیسقردیس کو ۳۸۰ھ/ ۹۹۰-۹۹۱ء میں طبرستان کے سلطان ابو علی السمجوری کے نام سے منتسب کیا۔ اب اگر عربی علم الادویہ کی نسبت یہ مان لیا جائے کہ اندلس میں اسے الغافقی اور ابن البیطار [رک بآں] نے کمال تک پہنچایا تھا تو اس میں نہ صرف دیسقردیس کے متن کے اجزاء سے استفادہ کیا گیا تھا بلکہ ابن البیطار (ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی میں) نے خود تفسیر کتاب دیسقردیس مدوّن کی تھی جس کا ایک مخطوطہ تشریحات کے ساتھ مکۂ معظمہ میں محفوظ ہے۔ بعد ازاں کثیر التصانیف ابوالفرج ابن العبری (Bar Hebraeus) (ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی) نے سُریانی میں *Kethobha dhe Dhioskoridhus* کے نام سے ایک خلاصہ لکھا۔ مجموعی لحاظ سے لوگ دیسقردیس کی تصنیف

کو ان اجزا کی صورت میں زیادہ جانتے تھے جنھیں ابن الوافد، ماسویہ اور دوسروں نے قلم بند کر دیا تھا۔ لاطینی تراجم کے ذریعے، جن کا بیشتر حصہ طایطلہ میں تیار ہوا، قرون وسطٰی کے یورپ کو دو ترجموں کے واسطے سے اس کی تصنیف کے فقط ایک حصے سے واقف ہونے کا موقع ملا، اور دیسقوریدس کا مکمل متن مغرب میں فقط احیاء علوم کی تحریک کے وقت عام میں آیا۔ عربی دیسقوریدس کے اجزاء کا ترجمہ مشرق میں بھی ہوا تھا جیسا کہ امیر دولت (پندرھویں صدی کے نصف آخر) کی ارمنی کتاب علم الادویہ سے ثابت ہوتا ہے۔

اگر دیسقوریدس کی قرابادین کی تصویر نگاری (Iconography) کا حال حذف کر دیا جائے تو اس کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا۔ خود دیسقوریدس نے اپنے پیش رو Cratevas (پہلی صدی قبل مسیح) کی نباتاتی تصاویر کو استعمال کیا تھا جس کے خاکے یونانی اور عربی مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ ان مخطوطات کی تصاویر میں ایک زائد عنصر پایا جاتا ہے، جس سے ان کی اصل کی تعیین میں مدد مل سکتی ہے۔ رہی تصویر نگاری، تو مذکورۂ بالا قدیم نمونے کے علاوہ، اس سے بعض اوقات بوزنطی اور کبھی ایرانی اثرات کا پتا چلتا ہے۔ اشیا کی نوعیت سے مسلمانوں کے مختلف دبستان مصوری مترشح ہوتے ہیں، مثلاً دبستان بغداد یا متأخر ایرانی دبستان۔ مسلم ماہرین نباتات میں ایک جدت پسند مصنف ابن الصوری (م ۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء) ہے۔ وہ شام میں نباتات پر کام کرتے وقت اپنے ساتھ ایک فن کار رکھتا تھا جو اس کے لیے پودوں کی تصاویر، ان کی نشو و نما کے مختلف مراحل پر تیار کرتا تھا۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ ابن بیطار اس مصنف کا حوالہ نہیں دیتا، جو اس کا ہمعصر تھا۔ عربی تراجم دیسقوریدس میں تصویر نگاری سے ہمیں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ دیسقوریدس تمام سابقہ روایات کا نقطۂ اتحاد بن گیا تھا، جنوبی مسلمانوں کے مشاہدات فطرت نے باثروت بنا دیا تھا۔

مآخذ: (۱) Pauly-Wissowa، بذیل مادہ Dioskurides؛ (۲) G. Sarton: *Introduction to the history of Science*، ۱: ۲۵۸ تا ۲۶۰، ۶۱۱، ۶۱۳، ۶۲۷، ۶۸۰، ۶۸۲، ۷۲۸؛ ۲: ۵۲، ۵۴، ۷۹، ۸۴، ۴۴۹، ۶۶۳، ۹۴۶، ۱۰۷۳؛ (۳) L. Leclerc: *De la traduction arabe de Dioscoride*، در *JA*، ۹ (۱۸۶۷ء): ۵ ببعد؛ (۴) M. Meyerhof: *Die Materia Medica des Dioskorides bei den Arabern*، در *Quellen u. Studien zur Gesch. d. Naturwissenchaften u. Medizin*، ۳ (۱۹۳۳ء): ۷۲ ببعد؛ (۵) H. P. J. Renaud: *Le Musta'ini d'Ibn Beklores*، در *Hesp*، ۱۰ (۱۹۳۰ء): ۱۳۵؛ (۶) C. E. Dubler: *Le "Materia Medica" de Dioscorides transmision medieval y renacentista*، ج ۱ و ۲، بارسلونا ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء؛ (۷) احمد عیسیٰ بے: تاریخ النبات عندالعرب، قاہرہ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء، ص ۳۸ ببعد؛ (۸) مصطفیٰ الشہابی: تفسیر کتاب دیسقوریدس لابن البیطار، در *RIMA*، ۳/۱ (مئی ۱۹۳۷ء): ۱۰۵ ببعد؛ (۹) F. E. Day: *Mesopotamian manuscripts of Dioscorides*، در *The Metropolitan Museum of Art Bulletin*، مئی ۱۹۵۰ء؛ (۱۰) K. Weitzmann: *The Greek sources of Islamic scientific illustrations*، در *Archaeologica Orientalia in Memoriam Ernst Herzfeld*، ص ۲۵۰ ببعد۔

(C. E. DUBLER)

دیسلان: بیرن میک گوکن دیسلان (Baron MacGuckin de Slane)، انیسویں صدی کا ایک ممتاز فرانسیسی مستشرق، جس کے علمی آثار سے اہل علم آج تک استفادہ کر رہے ہیں۔ ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوا

اور اپنے زمانے کے شہرۂ آفاق استاد بیرن سلوستر دساسی De Sacy سے عربی زبان کی تعلیم پائی ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس کا فرانسیسی فوج میں مترجم اعلٰی کے عہدے پر تقرر ہوا، جو ان دنوں الجزائر میں متعین تھی ۔ اس تقریب سے اسے شمالی افریقہ کی تاریخ کے ساتھ گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس نے تاریخ ابن خلدون کے اس حصے کو جو اقوام بربر کے متعلق تھا ۔ مع فرانسیسی ترجمہ الجزائر سے ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۶ء کے درمیان متعدد جلدوں میں شائع کیا اسی طرح اس نے البکری کی کتاب المسالک و الممالک کا بھی وہ حصہ طبع کیا جس میں شمالی افریقہ کا جغرافیہ بیان ہوا ہے ۔

قاضی ابن خلکان کی وفیات الاعیان کی اسلامی سوانح نگاری کے اعتبار سے جو اہمیت اور افادیت ہے، محتاج بیان نہیں ۔ وفیات کا عربی متن اس سے پہلے جرمن مستشرق وستنفلٹ Wüstenfeld گوٹنگن سے شائع کر چکے تھے ۔ بیرن دیسلان نے اس اہم کتاب کو انگلستان کے اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی فرمائش پر تمام و کمال انگریزی کا جامہ پہنایا جو لندن سے چار ضخیم جلدوں میں ۱۸۴۳ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان شائع ہوا ۔

دیسلان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مقدمۂ ابن خلدون کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا ۔ مقدمۂ مذکور کا عربی متن اس سے پیشتر پروفیسر کاترمیر Quatremere تین جلدوں میں شائع کر چکے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ عربی متن کی طباعت کے بعد اس کا فرانسیسی ترجمہ بھی شائع کریں گے، لیکن اس منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے انتقال کر گئے ۔ ان کی وفات کے بعد بیرن دیسلان نے اس کٹھن کام کا بیڑا اٹھایا اور کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد مقدمے کا فرانسیسی ترجمہ (مع حواشی) تیار کیا، جو فرانس کے سرکاری مطبع سے ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۸ء کے درمیان تین جلدوں میں شائع ہوا ۔ بیرن موصوف کے ترجمے کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اس کے ذریعے مغرب کے علما اس نامور عرب مؤرخ کے خیالات اور افکار سے بخوبی واقف ہوے اور انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ابن خلدون نہ صرف ایک غیر معمولی صاحب بصیرت فلسفی مؤرخ ہے، بلکہ وہ علم العمران (Sociology) کا بھی بانی ہے ۔ گزشتہ صدی میں پروفیسر رابرٹ فلنٹ R. Flint نے اور موجودہ صدی میں پروفیسر ٹائن بی Toynbee نے ابن خلدون کے افکار کا جو عالمانہ جائزہ لیا ہے اور اس کی عظمت کا جس کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے، وہ اسی فرانسیسی ترجمے کے مطالعے کی بدولت ہے ۔

دیسلان کا انتقال چار اگست ۱۸۷۸ء کو ہوا ۔

مآخذ : (۱) ابوالقاسم سحاب: فرہنگ خاور شناسان، صفحہ ۱۰۷، مطبوعۂ تہران؛ (۲) نجیب العقیقی: المستشرقون، ۱: ۱۹۷، قاہرہ ۱۹۶۴ء ۔

(شیخ عنایت اللہ)

دَیصانیہ : (Disanites یا Daysanites) شہر الرُّها (Edessa) کے مشہور حامی تطبیق عقائد (Syncretist) اور ملحد (heresiarch) بَردَیصان (Bardesanes) یا ابن دَیصان کے مریدوں کا فرقہ ۔ ابن دَیصان، ۱۵۴ء (یا ۱۳۴ء) تا ۲۰۱ء ابگر اعظم کا مشہور درباری اور ہمعصر ہے جس نے مختلف نظریات کو ملا کر ایک نیا (مسیحی) مذہب بنایا تھا ۔ ثنویوں کے متعلق لکھنے والے عرب مصنفوں نے اسے زردُشت اور مرقیون Marcion کے درمیان اور مانی کے بعد جھوٹے نبیوں میں شمار کیا ہے ۔ اس کے متعلق ان کا بیان بہت حد تک قیاس آرائی پر مبنی اور غیر معتبر ہے ۔ عجب نہیں دیصانیہ کے متعلق اُن کا علم مذہب ثنویت کے کسی تاریخ نویس (مثلاً ابو عیسی الورّاق) کی کتاب کے صرف ایک باب تک محدود ہو جو اب تک ان کا واحد ماخذ معلوم

ہوتا ہے۔ وہ ابن دیصان کے نہ تو حالات زندگی لکھتے ہیں اور نہ اس کی نسل و نسب کی تفصیلات۔ اس سے جو عقیدہ منسوب کیا جاتا ہے وہ قدیم عام ثنویت کا ہے جو فقط وجود کی جسمانی حالت کے نقطۂ نظر سے ہے؛ جو مذاہب اور فرقوں پر لکھنے والے عرب مصنفین کے مستقل انداز فکر کے عین مطابق ہے، اس میں شروع ہی سے اثبات عدل الٰہی (theodicy) کا عقیدہ مرکوز خاطر رہتا ہے۔ دیصانیہ نور و ظلمت کو عناصر اولی تصور کرتے ہیں اور انہیں بالترتیب خیر و شر کا ماخذ مانتے ہیں لیکن اس امتیاز کے ساتھ کہ نور، فعّال، زندہ، مدرک اور حیات کی بنیادی صفات، علم اور قوت سے متصف تھا۔ اس کے برخلاف ظلمت، محض جامد، صفات مذکور سے معرّا تھی اور فقط وجود رکھتی تھی۔ آفرینش کے عمل کا آغاز نور کے اس عزم سے ہوتا ہے کہ وہ ارادی عمل کے ذریعے ظلمت میں سرایت کر جائے اور اس طرح انجام کار نجات تک لے جائے۔ اس ارادی عمل کے بعد نور کسی طبعی افتاد و بلا کے سبب اپنے آپ کو ظلمت سے جدا کرنے میں ناکام ہو چکا ہے، جس کے سبب کی صراحت نہیں کی گئی۔ عرب مصنفین جنھوں نے بردیصان اور اس کے متبعین کے عقیدے کے متعلق لکھا ہے، ان کے دو اعتقادی رجحانات میں امتیاز کرتے ہیں؛ یعنی یہ کہ ان میں ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ظلمت کی اعلی صورتوں میں کمتر درجے کی نوری مخلوقات کے ساتھ مل جانے کا رجحان پایا جاتا ہے جو بعد میں اس اتحاد سے رہائی نہیں پا سکتیں۔ دوسرے گروہ کے خیال میں نور و ظلمت کا ایک دوسرے سے مل جانا نور کا ایک شعوری عمل ہے جس کے ایسے غیر متوقع نتائج برآمد ہوتے ہیں، جو ظلمت کی طبعی فطرت میں ودیعت ہوئے ہیں۔

مذکورۂ بالا خیالات کے ساتھ ساتھ ہم ان تصورات کو بھی پیش کر سکتے ہیں جو بدعتی عقائد کے عیسائی محققین کی بالاتفاق فراہم کی ہوئی معلومات سے اخذ ہوتے ہیں۔ ان میں سربرآوردہ لوگ یہ ہیں: Epiphanius، Eusebius، دمشق کا قدیس یوحنا (سینٹ جون) اور سریانی مصنفین میں تھیوڈور بار کونی Barkouni، نصیبین کا الیاس، Moses Bar Kepha، Elias of Nisibi اور St. Ephraem اور اس طرح ہم بعض مفید موازنے کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ بردیصان نے غیر اہل کتاب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نظام آفرینش کا مطالعہ اور اس پر غور و فکر کیا۔ وہ بروزی (وجودی) (Emanationist) اور سحر آمیز (Hermetic) عقائد سے متاثر ہوا، جنہیں جوتش (نجوم) کہتے تھے۔ دوسرے ہمعصروں کی طرح اس کے خیال میں بھی یہ دنیا اجرام فلکی کے موجودات پر تاثیر کا نتیجہ تھی اور یہ عمل جوہر واحد (Monad) یا جوہر ثنوی (Dyad) کے تواتر سے مرتب ہوا۔ ایرانی اثرات جو الرہا (Edessa) کے خطے کے عقائد کی تہہ میں موجود ہیں، جہاں بردیصان رہتا تھا، بلاشبہہ تصور ثنویت کی بنیاد ہیں، جس کا پتا عرب مصنفین کے نزدیک اس کی طبیعیات میں چلایا جا سکتا ہے۔ اس کی تعلیم نے جو تصورات آفرینش عطا کیے تھے ان کی بنیاد پر بردیصان نے عیسائیت کی وہ تعبیر تیار کی جو الرُّہا کے ایک باشندے کو نظر آتی تھی جس کی پرورش ہائرو پولس Hiero polis کی شامی دیوی کے ایک پجاری کے گھر میں ہوئی تھی؛ اور وہ بھی ٹھیک اس زمانے میں جب کہ Samosata کے Lucian نے ان رسوم کو بیان کیا جو وہاں ادا کی جاتی تھیں (Lucian تقریباً ۱۲۰ء میں پیدا ہوا تھا)۔

بلاشبہہ بردیصان نے نجات کامل کے جو معنی بتائے اس میں نور و ظلمت کی باہمی آمیزش کے متعلق ان اساطیری کہانیوں کے مبدأ کا سراغ لگانا چاہیے جو ابن الندیم اور الشہرستانی نے نقل کی ہیں۔ بردیصان کی ایک بڑی تصنیف *The Dialogue on The Laws of the Lands* جو سلامت رہ گئی ہے، تقدیر پر اس ممتاز

متن کی حامل ہے جسے Eusebius نے محفوظ کر لیا تھا۔ اس سے ہم اس کے بنیادی فلسفے کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں وجود کی طبعی حالت جو بلحاظ ساعت ستاروں پر منحصر ہوتی ہے (اس نے فلکیاتی جبریت کے عقیدے کے خلاف جو استدلال کیا، اس کی صداے باز گشت ہمیں ابن حزم کے ایک باب میں سنائی دیتی ہے جو اس نے نجومیوں کی تردید کے لیے وقف کیا ہے، مطبوعۂ قاهرہ، ۴: ۴۲) اور اخلاق تقدیر کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے۔ یہ اخلاقی تقدیر ظلمت سے فرار کی مانند مادّے کی ناقابل تبدیل فطرت اور انسان کی آزاد فطرت میں تضاد سے پیدا ہوتی ہے اور یہ دونوں قسم کی فطرتیں خدا کی طرف سے ملتی ہیں۔ یہ خالق حقیقی ہے جس نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور اختیار یا آزادی کی صفت عطا کی۔ مزید برآں، سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا ان وجودوں کے نظام مراتب کا مدون اور خالق ہے جن کے اصل خصائص اور میلانات وہ متعین کر چکا ہے اور انہیں کے مطابق یہ دنیا مسلسل بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ناکامی کی دنیا ہے اور یہاں فلسفۂ مانی کی روح ظاہر ہوتی ہے؛ جہاں خدا اپنے حلم کے سبب بے نظمی و ابتری کو جاری رہنے دیتا ہے، یہاں تک کہ چھے ہزار برس گذرنے کے بعد وہ دوبارہ ایک دنیا پیدا کرے گا جو ساری کی ساری سفید، نورانی اور صالح ہوگی۔

بردیصان کی شہرت بحیثیت جوتشی کے بھی تھی۔ اس نے اپنی روش کو اس بارے میں خود بالکل صاف اور واضح کر دیا تھا لیکن آخر میں اس حیثیت کو قدّیس افرائم (St. Ephraem) نے متعیّن کیا، جس نے اس کے خلاف اس کے اپنے شہر الرّھا میں لڑائی لڑی، اس کے خلاف مواعظ لکھے اور ایسے نغمات حمد لکھے جنھوں نے آگے چل کر بردیصان کے حمدیہ ترانوں کو بھلا دیا اور خود ان کی جگہ لے لی۔ بعد کی نسلوں نے تسلیم کیا کہ بردیصان مرقیون Marcion سے مختلف روش رکھتا تھا پھر بھی اسے مرقیون کے ساتھ مانی کے متبّعین کی صف میں شمار کیا۔ اس راے کی عرب مصنفین نے متابعت کی۔ بدعتی عقائد کے متأخر عیسائی علما کے نزدیک بھی اس کا فلسفہ، جو ویلنٹائن (Valentinism) کے زیر اثر پھولا پھلا تھا، فلسفۂ مانی سے ملوث ہے۔

مآخذ : (۱) ابن الندیم، (مطبوعۂ قاهرہ)، ص ۴۷۴؛ (۲) الشہرستانی، ابن حزم کے حاشیے پر، قاهرہ، ۲: ۷۰ تا ۷۲؛ (۳) عبدالقاهر البغدادی، قاهرہ ۱۹۱۰ء، ص ۲۲۳؛ (۴) الباقلانی، طبع MacCarthy، بیروت، ص ۷۶ ببعد؛ (۵) Euesbius، در *Patr. Graec*، ۲۰: ۳۹۷ تا ۴۰۰، ۵۲۳؛ (۶) Philosophumena: V. *Patr. Graec.*، ج ۱۶: عمود ۳۱۲۰/۵۱۹؛ (۷) Merx: *Bardesanes von Edessa*، Halle ۱۸۶۳ء؛ (۸) F. Nau: *Bardisane l'Astrologue: Le livre des lois des pays*، پیرس ۱۸۹۹ء؛ (۹) وہی مصنف: *Dictionnaire de Théologie catholique*، بذیل مادہ (مع مآخذ)۔

(A. Abel)

* **دِیک** : مُرغ، یہ لفظ شاید سامی الاصل نہیں چنانچہ جنوبی عرب کی جدید زبان کے سوا اور کسی سامی زبان میں اس لفظ کا ہم جنس مترادف نہیں ملتا (Leslau: *Lexique Soqotri*، ۱۹۳۸ء، ص ۱۲۶)۔

قدیم عربی نظموں، ضرب الامثال اور حدیث میں مُرغ (دیک) کا اکثر ذکر ملتا ہے۔ علم الحیوانات کی کتابوں میں اسے تمام پرندوں سے زیادہ پر شہوت اور خود پسند پرندہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ذہانت کمزور ہوتی ہے، کیونکہ جب یہ کسی دیوار سے نیچے گرے تو اپنے دڑبے کا راستہ معلوم نہیں کر سکتا۔ باوجود اس کے اس میں متعدد قابل ستایش خصائص پائے جاتے ہیں۔ یہ دوسرے مرغوں سے لڑنے اور اپنی مرغیوں کی حفاظت کرنے میں بڑا نڈر، جفاکش، جری

اور چالاک ہوتا ہے، یہ ان تمام مرغیوں سے یکساں سلوک کرتا ہے جن سے اس کا جوڑ ہوتا ہے ۔ وہ خود بھوکا ہی کیوں نہ ہو، لیکن دانہ دنکا ان مرغیوں میں تقسیم کر دیتا ہے جس سے اس کی فیاضی ضرب المثل ہو گئی ہے ۔ غذا کے طور پر استعمال کرنے کے لیے بہترین مرغ وہ ہوتے ہیں جو ابھی بانگ نہ دیتے ہوں۔ افزائش نسل کے لیے دو برس کے مرغ کا انتخاب کرنا چاہیے ۔ اس کی قوت کا اندازہ گول کلغی، چھوٹی چونچ اور آنکھ کی سیاہ پتلی وغیرہ سے لگایا جا سکتا ہے ۔ اچھے لڑاکا مرغ کی نشانی یہ ہے کہ اس کی کلغی سرخ اور اس کی گردن موٹی ہوتی ہے، وغیرہ .

مرغ اپنی تمام عمر میں [ایک روایت کی رو سے سال میں] صرف ایک چھوٹا سا انڈا دیتا ہے جسے "بیضة العُقر" کہتے ہیں ۔ اس کے خصیے بڑے، خوش ذائقہ اور زود ہضم ہوتے ہیں ۔ خصی کیے ہوئے مرغوں کا گوشت دوسرے تمام جانوروں کی بہ نسبت زیادہ چربی دار اور لذیذ ہوتا ہے ۔ جب مرغوں کو خصی کر دیا جاتا ہے تو ان کی کلغی اور "ڈاڑھی" مرجھا جاتی ہے ۔ عربی کتابوں میں "دیک" کی بہت سی اقسام اور القاب (ہندی، ابطی، زنجی وغیرہ) بیان کیے گئے ہیں، بقول النُّوَیری سندھ کے ایک شہر میں مرغ، شتر مرغ کے قد و قامت تک پہنچ جاتا ہے .

مرغ کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ رات خواہ نو گھنٹے کی ہو یا پندرہ گھنٹے کی، وہ رات کے مختلف اوقات کے مطابق بانگ دیتا ہے ۔ لوگ اس کی بانگ سے خوشی محسوس کرتے ہیں ۔ مریض جب اسے سنتے ہیں تو وہ اپنے درد میں افاقہ محسوس کرتے ہیں ۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ مرغ کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ وہ لوگوں کو نماز کی طرف بلاتا ہے (صحیح المسلم، باب ۵) دوسری حدیث میں ہے کہ جب تم بانگ مرغ سنو تو اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو (صحیح البخاری، باب بدء الخلق).

اسرائیلی روایات میں ہے کہ جنت میں عرش الٰہی کے بالکل نیچے ایک فرشتہ ہے وہ جب نماز کے اوقات کا اعلان کرنے کے لیے بانگ دیتا ہے تو اس کی بانگ دنیا کے تمام مرغ دہراتے ہیں (M. Asin Palacios : *La escatologia musulmana en la Divina Comedia*، طبع دوم، میڈرڈ اور غرناطہ ۱۹۴۳ء، ص ۵۰ ببعد؛ E. Cerulli : *Il Libro della scala*، Vatican city ۱۹۴۹ء، ص ۹۸ ببعد (فصل ۹۶) اور لوحہ ۴ (بالمقابل ۹۴)؛ R. Ettinghausen : در *Convegno di Scienze morali Storiche e Filologiche* (۱۲ "Volta" Convegno)، روم ۱۹۵۷ء، ص ۳۶۲ ببعد؛ J. Berque : *Les Arabes*، پیرس ۱۹۵۹ء، ص ۱۷) ۔ برغواطہ [رک بآں] اپنی نمازوں کے اوقات کی تعیین مرغ کی بانگ سے کرتے تھے اور اس کا گوشت نہیں کھاتے تھے (البکری، طبع de Slane، ۱۳۹ ببعد).

اگرچہ دیک "دَجاجة" [رک بآں] کا نر ہے مگر بیشتر کتب میں اس کا تذکرہ الگ عنوان کے تحت کیا گیا ہے ۔ تاہم، ابن البیطار اور داؤد انطاکی نے اس کے طبی خواص کا ذکر "دجاجة" کے ابواب کے تحت ہی کیا ہے، زیادہ تر اس کا گوشت اور اس گوشت کی یخنی، پتا، بھیجا، کلغی اور خون کو طبی استعمال میں لایا جاتا تھا.

الجاحظ، جس نے "صاحب الدّیک" اور "صاحب الکلب" کے درمیان جھگڑے کا اکثر ذکر کیا ہے، بظاہر کسی گمنام تصنیف کے اقوال نقل کرتا ہے، جو اس قسم کی کتب سے تعلق رکھتی ہے جن سے Steinschneider نے اپنی تصنیف *Rangstreit Literatur* (*SHAK, Wien*، *phil-hist. Kl*، ۱۵۵، Abh ۴، ۱۹۰۸ء) میں بحث کی ہے .

مآخذ : (۱) السُّیُوطی : کتاب الدیک فی فضل

الدیک، قاہرہ ۱۳۲۲ھ (براکلمان، ۲ : ۱۹۸؛ تکملہ، ۲ : ۱۹۲، عدد ۲۴۵)؛ (۲) احمد بن احمد القبّوسی القرقاوی: الاشارات و الدلائل الی بیان ما فی الدیک من الصفات و الفضائل (براکلمان، تکملہ، ۲: ۴۲۸)؛ (۳) عبدالغنی النابلسی: مطیر الانام، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، ۱ : ۲۱۹ ببعد؛ (۴) ابوحیّان التوحیدی : الامتاع، ۱ : ۱۴۴، ۱۸۶ (ترجمہ Kopf : *Osiris*، ج ۱۲، ۱۹۵۶ء، بمدد اشاریہ) ؛ (۵) الدمیری، بذیل مادّہ (ترجمہ Jayakar، ۱ : ۸۰۰ ببعد)؛ (۶) الجاحظ : الحیوان، بار دوم، بمدد اشاریہ؛ (۷) ابن العوّام: فلاحۃ (ترجمہ Clément-Mullet)، ۲ ب : ۲۴۴ ؛ (۸) ابن قتیبہ : عیون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء، ۲ : ۷۸، ۸۹ (ترجمہ Kopf، ص ۵۳، ۶۵)؛ (۹) الابشیہی : المستطرف، باب ۶۲، بذیل مادّہ ؛ (۱۰) القزوینی : عجائب المخلوقات، (طبع Wüstenfeld)، ۱ : ۴۱۲ ببعد ؛ (۱۱) المستوفی (طبع Stephenson)، ص ۱۷ ببعد ؛ (۱۲) النویری : نہایۃ الارب، ۱۰ : ۱۹۴ ببعد؛ (۱۳) J. Schacht اور M. Meyerhof : *The medico-philosophical controversy between Ibn Butlan of Baghdad and Ibn Ridwan of Cairo*، قاہرہ ۱۹۳۷ء، ص ۳۷ ببعد، ۹۷ ببعد (انگریزی) و ۲۷ ببعد، ۳۴ ببعد (عربی)؛ (۱۴) J. Henninger : *Über Huhnopfer und Verwandtes in Arabien und seinen Randgebieten*، در *Anthropos*، ج ۴۱ تا ۴۴، ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۹ء، ص ۳۳۷ تا ۳۴۶ ۔

(L. Kopf)

* **دیک الجنّ الحمصی** : ایک شامی عرب شاعر عبدالسلام بن رَغبان بن عبدالسّلام بن حبیب بن عبداللہ بن رَغبان بن یزید بن تمیم کا لقب ۔ یزید بن تمیم، مؤتۃ [رک بان] میں حبیب بن مَسْلَمۃ الفِہری [رک بان] کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا، اور اس کا مولٰی بن گیا ۔ اس شاعر کے آبا و اجداد میں سے حبیب نے بغداد میں اپنے نام پر ایک مسجد بنوائی جو مسجد ابن رَغبان کہلاتی ہے ۔ وہ خلیفۃ المنصور کے زمانے میں دیوان العطاء کا صدر مہتمم تھا (الجاحظ : البخلاء، طبع حاجری، ص ۱۲۹؛ ترجمہ Pellat، بمدد اشاریہ ؛ الجہشیاری، ص ۱۰۲ ؛ Le Strange : *Baghdad*، ص ۵۹) ۔ دیک الجنّ ۱۶۱ھ/۷۷۷-۷۷۸ء بمقام حمص پیدا ہوا اور المتوکّل کے عہدِ خلافت یعنی ۲۳۵ یا ۲۳۶ھ/۸۴۹-۸۵۱ء میں فوت ہوا ۔ وہ شام کے علاقے سے کبھی باہر نہیں گیا ۔ کہتے ہیں کہ وہ خوش باش اور لا ابالی سا آدمی تھا ۔ امام حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب کے متعلق اس کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معتدل شیعی تھا ۔ احمد بن علی الہاشمی اور اس کے بھائی جعفر سے اس کے خاص تعلقات تھے اور ان دونوں کی مدح میں اس نے قصائد لکھے ۔ اس نے اپنے زمانے کے ذوق کے مطابق ہجویہ نظمیں اور غزلیات بھی لکھیں ۔ اس کے بہت سے اشعار اگرچہ اس کے وطن سے باہر تک مشہور ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود عرب نقاد اس میں کسی اعلٰی صلاحیت کو تسلیم نہیں کرتے ؛ پھر بھی پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے قیروانی فضلا اس کے کلام میں سے ایک بہت ہی پیچیدہ اور غامض شعر نکال لائے (ابن رشیق : العمدۃ، ۱ : ۷۴؛ ابن شرف، طبع و ترجمہ Pellat، ص ۸۵؛ A. Benhamouda، در *Bull. des Ét. Ar.*، مارچ ۔ اپریل ۱۹۴۹ء، ص ۶۵) ۔ اس کے چند متفرق اشعار جو ہم تک پہنچے ہیں وہ اس اعتبار سے دلچسپ ہیں کہ شاعر مذکور اپنے ہم وطن مستعرب شامیوں کے لیے اصلی عربوں کے برابر حقوق کا حامی تھا اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ جنوبی اور شمالی عربوں کے باہمی معرکوں پر شعر لکھنے کے مواقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ۔

مآخذ : متن میں دیے ہوئے مآخذ کے علاوہ : (۱) الاغانی، بار اول، ۱۲ : ۱۴۲ تا ۱۴۹ (= طبع بیروت، ۱۴ : ۴۹ تا ۶۵)؛ (۲) ابن خلکان، عدد ۴۰۹؛ ترجمہ از

de Slane، ۲: ۱۳۳؛ (۳) الثعالبی: الیتیمۃ، ۱: ۲۶۶، ۲۶۴؛ (۴) Goldziher: *Muh. St.*، ۱: ۱۵۶؛ (۵) براکلمان: تکملۃ، ۱: ۱۳۷ .

([CH. PELLAT] و A. SCHAADE)

* **دَیلَم** : عراق کا ایک قبیلہ جو دریاے فرات پر فلوجہ کے بالکل زیریں مقام سے شروع ہو کر القائم تک آباد ہے ۔ اس قبیلے کے لوگوں کا دعوٰی ہے کہ پانچ صدی پہلے ان کے آبا و اجداد کا اصلی وطن دلیمیات تھا، جو نجد میں واقع تھا، لیکن یہ محض اساطیری خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قبیلہ مخلوط قبیلوں کے مختلف حصوں اور بے قبیلہ کاشت کاروں کا ایک مجموعہ ہے ۔ اس کے کچھ افراد جزیرے میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دریا کی طرف فقط اپریل سے دسمبر تک رہتے ہیں؛ لیکن ان کی بڑی اکثریت، عراق کسانوں کے غریبانہ معیار زندگی کے مطابق، زمین کاشت کر کے زندگی بسر کرتی ہے .

عراق کے "دیلم لیواء" (صوبہ) کا نام، اسی قبیلے کے نام پر رکھا گیا ہے ۔ اس کی آبادی ۱۹۴۷ء میں ۱۹۳۰۰۰ تھی، جس میں فلوجہ اور رمادی کے "قضاء" شامل ہیں اور رمادی اس کا صدر مقام ہے .

(S. H. LONGRIGG [و تلخیص از ادارہ])

* **دَیلَم** : جغرافیائی حیثیت سے گیلان [رک باں] کی سطح مرتفع کا نام ۔ جنوب کی جانب گیلان خاص کی پست زمینیں سلسلۂ کوہ البرز سے گھری ہوئی ہیں؛ اس مقام پر یہ سلسلۂ کوہ ایک ہلال کی شکل بنائے ہوے ہے؛ اس ہلال کا مشرقی سرا (لاہیجان اور چالوس کے درمیان) بحیرۂ خزر کے ساحل کے قریب تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس کے وسطی حصے میں ایک خلا ہے جس میں وسطی ایران کی پہاڑیوں سے سفید رود بہتا ہوا بحیرۂ خزر میں جا گرتا ہے ۔ منجیل کے مقام پر پہاڑ کی گھاٹی میں داخل ہونے سے پہلے، جہاں اس کے بہاؤ کا رخ مغرب سے مشرق کی جانب ہے، اس میں ایک بڑا معاون شاہ رود آ کر مل جاتا ہے، جو ضلع طالقان سے نکل کر مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہوا کوہ البرز کی جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ گزرتا ہے ۔ جنوب کی طرف شاہ رود کے طاس کو پہاڑیوں کی ایک قطار، قزوین [رک باں] کے میدان سے جدا کرتی ہے اور ادھر دائیں پہلو سے بہت سے ندی نالے البرز کی جنوبی ڈھلانوں سے اتر کر اس میں مل جاتے ہیں ۔ ان معاون ندیوں میں سے بڑی وہ ہے جو الموت [رک باں] کی وادی کو سیراب کرتی ہے ۔ بظاہر اسی شاہ رود اور اس کے معاونوں کی وادیاں دیلمی قبیلے کا گہوارہ تھیں ۔ اگرچہ یہ سب علاقہ گیلان کے بڑے دریا (سفید رود) کے طاس میں شامل ہے پھر بھی دیلم خاص (الدیلم المحض) کو کوہ البرز کی بلند دیوار جدا کرتی ہے ۔ قبیلۂ دیلم کے لوگ اس پہاڑ (کوہ البرز) اور اس کی شاخوں کی شمالی ڈھلانوں پر بھی آباد تھے جو سمندر کی جانب شاخ در شاخ چلی گئی ہیں (دیکھیے حدود العالم) اور اس جگہ دیلم، گیلان اور طبرستان کے درمیان حائل ہو گیا تھا .

گیلان کا علاقہ دلدلی اور غیر صحت بخش مگر بہت زیادہ حاصل خیز ہے ۔ اس کے مقابلے میں دیلم کا بلند علاقہ، جو زیادہ زرخیز نہیں، توانا، باہمت اور حوصلہ مند لوگوں کا گہوارہ ہے اور وہ وطن چھوڑ کر باہر جانے اور خدمات انجام دینے کے لیے کمربستہ رہتے ہیں ۔ جغرافیائی نام "دیلم" چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں دیلمیوں کے اطراف و جوانب میں پھیلنے کے ساتھ ساتھ وسعت پذیر رہا ہے اور اس نے بہت سے قرب و جوار کے علاقوں کو اپنے مفہوم میں شامل کر لیا تھا (دیکھیے نیچے) .

دور قدیم : دیلمیوں کی قدیم نسل و نژاد کی بابت یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب ان لوگوں سے ملتا ہے جو ایرانیوں

سے پہلے اس سرزمین میں آباد تھے۔ پہاڑ کی اس چوٹی کا نام جو سفید رود کے دائیں کنارے منجیل کے شمال مشرقی جانب ہے دُلْفَک (یا دُلْفک) ہے، اسے ایک پرانے قبیلے ΔpiBuκες کے نام کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ دیلم کے نام سے بہت سے قدیم یونانی مصنف واقف تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں Polybius، ۵ : ۴۴، میڈیا کے شمالی ہمسایوں کا ذکر کرتا ہے : Αναριακαι، ΔλΕυματοι (غیر آریا)، Καδουσιοι، Ματιανοι۔ دوسری صدی عیسوی میں بطلمیوس، ۶ : ۲، Δελυμαις (= دیلومس) کو Chromithrene (رے کے جنوب مشرق خوار و ورمیز) کے شمال میں اور تاپوری Tapuri (طبرستان) کے مغرب میں بتاتا ہے۔ ایران کی جانب سے صرف ساسانیوں کے زمانے سے معلومات کا آغاز ہوتا ہے۔ اُردشیر ساسانی کی اُردوان اشکانی (Arsacid) پر آخری فتح سے پہلے کہا جاتا ہے کہ اُردوان اشکانی نے رَی، دُماوند، دیلمان اور پتشخوارگر Patishkhwargar کی فوجوں کو اکھٹا کیا (کارنامک ارتخشیر، ترجمہ Nöldeke، ص ۴۷)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشکانیوں کا اقتدار کوہ البرز کے جنوب کے باشندوں میں مستحکم ہو چکا تھا۔ ابتداء میں ساسانیوں کا دیلمیوں کے ساتھ محتاط برتاؤ رہا (دیکھیے Marquart : ایرانشہر، ص ۱۲۶)، لیکن رفتہ رفتہ لشکر اور دربار دونوں میں دیلمی نمایاں نظر آنے لگے۔ کواز [قباذ] نے ایک مہم آئیبریا (گرجستان) پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی۔ اس کا قائد ایک "ایرانی" تھا، مگر اس کے نام Boēs (بویہ) اور لقب Ουαριζης وہرز (Wahriz) سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کا دیلمیوں سے تعلق ہوگا (دیکھیے Procopius : *De bello persico*، ۱ : ۱۴)۔ خسرو انوشیروان کے زمانے میں دیلمیوں کے ایک فوجی دستے کا Lazica میں Archeopolis (آج کل Tsikhe-Godji) کے محاصرے (تقریباً ۵۵۲ ق ـ م) کے موقع پر ذکر آتا ہے۔ اس میں دیلمیوں سے ماہر کوہ پیماؤں کا کام لیا گیا اور Turkic Sabirs [صبری قبیلہ ترکان] سامنے سے حملے کی قیادت کر رہے تھے (دیکھیے Procopius : *De bello gothico*، ۴ : ۱۴، طبع Dindorff، ص ۵۲۹-۵۳۰)۔ چند سال بعد دیلمیوں نے سبریوں کے ایک اور دستے پر، جسے بوزنطیوں نے ملازم رکھا تھا، شبخون مارا، جو ناکام رہا (دیکھیے Agathias، ۳ : ۱۷)۔ Procopuis کے مطابق دیلمی (Dolomites) ناقابل گزر پہاڑوں کے رہنے والے تھے اور ایران کے بادشاہوں کے زیر فرمان کبھی نہیں ہوئے، لیکن وہ تنخواہ دار سپاہی بن کر کام کیا کرتے تھے۔ یہ پیادہ پا لڑتے تھے۔ ان میں ہر شخص تلوار اور ڈھال سے مسلح ہوتا تھا، اور ہاتھوں میں تین چھوٹے نیزے (یا acontia = خنجر) ہوتے تھے۔ عہد اسلام کے بیانات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

خسرو اول کی یمن پر مشہور مہم (تقریباً ۵۷۰ء) میں دیلم اور اس کے قرب و جوار کے آٹھ سو قیدی شامل تھے، جن کا سردار ملقّب بہ وہرز Wahriz [رک بآں] ایک سن رسیدہ شخص تھا، جو خود قید سے رہا کیا گیا تھا۔ جب قباذ اور خسرو کے زمانے میں قفقاز کے درے قلعہ بند کر دیے گئے اور ان کے قریب فوجی نوآبادیاں قائم ہوگئیں تو بستیوں کے ناموں سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ دیلم اور اس کی نواحی بستیوں سے مأخوذ تھے (دیکھیے نیچے، مقامی نام)۔ خسرو کے جانشین ہرمزد چہارم کے خلاف سازش، جس کا انجام ہرمزد کا زوال ہوا (زونب) Zoanab کی سرکردگی میں ہوئی تھی اور یہ دیلمیوں کا سردار تھا (Theophylactus Simocatta، ۴ : ۳، ۱)۔

دیلم اور عرب : عربوں کے حملے کے زمانے میں جب قزوین کے باشندوں نے دیلمیوں سے مدد طلب کی تو دیلمیوں نے تامّل و تذبذب کا موقف اختیار کیا، لیکن انھوں نے رے کے لوگوں کی مدد سے نُعمان بن مقرّن کا، جسے حضرت عمرؓ نے بھیجا تھا، مقابلہ کیا۔

دیلمیوں کی قیادت ان کا بادشاہ (سردار؟) موتا (یا موڑتا) کر رہا تھا، جیسے دستبے (دشت بے، یعنی اس میدان کا کنارہ جو رے اور ھمدان کے درمیان پھیلا ہوا تھا) (الطّبری، ۱ : ۲۶۵۰ تحت سنہ ۲۲ھ/ ۶۴۳ء) میں دریاے واج پر شکست ہوئی۔ البلاذری (ص ۳۱۷ - ۳۲۵) اور دیگر مؤرخوں نے دیلم پر مسلمانوں کے سترہ حملوں کا ذکر کیا ہے، جو حضرت عمرؓ سے شروع ہو کر المامون کے زمانے تک ہوے اور جن کا ذکر عربی اشعار میں ملتا ہے (دیکھیے کسروی، ص ۳ تا ۲۰)۔ شاعر الاَعشٰی ھمدان (۸۳ھ/ ۷۰۲ء) کو دیلمیوں نے قید کر لیا تھا، اگرچہ جن مقامات کا اس نے خود ذکر کیا ہے (قلعہ لسم، فیول، حامن، لهزین) وہ بظاہر دماوند (ونیما؟) کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں، تاہم دیلم نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ ان کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کے مستحکم مقامات یہ تھے: جنوب میں قزوین؛ اور شمال مشرق میں طبرستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ قلعہ بند مقامات دریاے کلار اور چالوس پر۔

زبان اور مذہب: بادشاہ مُوتا (؟) کا نام تو ایک غیر معمولی سا معلوم ہوتا ہے لیکن جب چوتھی صدی ھجری اور دسویں صدی عیسوی میں دیلمی سردار بڑی تعداد میں نمودار ہوتے ہیں تو ان کے نام صاف طور پر ایرانی بے دین لوگوں (pagans) کے سے ہیں۔ یہ نام جنوب مغربی "ایرانی" ساخت کے نہیں بلکہ شمالی مغربی نوعیت کے ہیں جیسے گورانگیز (کورانکیج نہیں، جیسا کہ پہلے پڑھا گیا تھا)، فارسی "گور۔انگیز" کے مطابق ہے (یعنی گورخر کا شکاری)، شیرزل فارسی شیردل (شیر کے سے دل والا) سے ملتا ہے، وغیرہ۔ الاَصطخری (ص ۲۰۵) فارسی اور دیلمی زبان میں فرق کرتا ہے اور یہ اضافہ کرتا ہے کہ دیلم کے پہاڑوں پر ایک قبیلہ بستا تھا، جو دیلم اور گیلان دونوں سے الگ زبان بولتا تھا۔

ممکن ہے کہ دیلم میں کچھ زرتشتی اور عیسائی موجود ہوں، لیکن دیلمیوں کے جاہلی عقائد کی بابت در حقیقت کوئی بات معلوم نہیں۔ البیرونی کے کہنے کے مطابق (الآثار، ص ۲۲۴) یہ لوگ اساطیری افریدون کے قائم کردہ قانون کی پیروی کرتے تھے، جس نے حکم دیا تھا کہ مرد اپنے اپنے خاندان میں حکمران ہونے چاہییں، اور ان کا لقب اس نے کذ خُدا (Kadhkhudha) مقرر کیا تھا۔ کسی قدر مبہم طریقے سے البیرونی اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ یہ آئین الناصر الاُطروش علوی (دیکھیے نیچے) نے منسوخ کر دیا تھا، اس کے بعد یہ لوگ پھر اسی طریقے کی طرف لوٹ گئے جو جابر بادشاہ ضحّاک بیوراسپ کے زمانے میں رائج تھا جب کہ ان کے گھروں کو "بھوتوں اور دیووں" (الشیاطین و المَرَدَة) نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور لوگ ان کے آگے بے بس تھے۔

کذخُداؤں کے علاوہ، جو خاندان پر حکومت بزرگان کا حق رکھتے تھے، دیلمیوں کے اپنے اپنے مقامی حکمران بھی ہوتے تھے، جن کی موجودگی بعض القاب جیسے وردان شاہ، وھرز (wahriz) سے قیاس کی جا سکتی ہے (قب Hübschmann: *Armen. Gramm.*، ص ۸۷؛ "*Vahrič-i vahričān*" (vahriz of vahriz)، ان میں بادشاہ تک بھی ہوتے تھے (دیکھیے اوپر، مُوتا)۔ بادشاہوں کے کارنامے صرف نویں اور دسویں صدی عیسوی میں واضح طور پر سامنے آتے ہیں جب کہ انھوں نے علویوں کے ساتھ اشتراک عمل کیا تھا۔ علویوں کے ابتدائی زمانے ہی میں دیلم کے مستحکم مقامات نے اُن علویوں کے لیے پناہ گاہوں کا کام دیا جو عباسیوں سے بچ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جہاں تک معلوم ہے قدیم ترین پناہ گزین یحیی بن عبداللہ تھا، جس کے دو بھائیوں کو سزاے قتل مل چکی تھی اور جو خود ھارون الرشید کے ایک باغی بھائی سے ساز باز رکھتا تھا۔ وہ دیلم میں ۱۷۵ھ/ ۷۹۱ء

میں آیا مگر اس نے جلد ہی فضل بن یحیی البرمکی کی اطاعت قبول کر لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں خلیفہ نے شاہ دَیْلم پر ترغیب و ترہیب دونوں سے دباؤ ڈالا (قب الطَّبری: سنۂ ۱۷۶ھ؛ الیعقوبی، ۲ : ۳۶۲)

خاندانِ جُستانی : ۱۸۹ھ / ۸۰۵ء میں جب ہارون الرشید رے پہنچا تو اس نے بحر خزر کے علاقے کے حکمرانوں کو بلایا اور دَیْلم کے سردار مرزُبان بن جُستان کو نقد روپے کا انعام اور اعزازی خلعت دے کر رخصت کیا؛ اس سردار کی بابت ادائے خراج کا ذکر کہیں نہیں، حالانکہ دیگر حکمرانوں پر خراج لگایا گیا تھا۔ اگرچہ یہ پہلا موقع ہے جب ہم خاندان جُستان کا ذکر سنتے ہیں، پھر بھی گمان غالب یہ ہے کہ ہارون کی اس مہربانی کا تعلق ۱۷۵ھ/۷۹۱ء کے واقعات سے تھا، جب کہ ضرور یہی سردار (مرزبان یا اس کا باپ) حکمران ہوگا۔ سردست ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ "بنو جُستان" کے فرمانرواؤں کی فہرست میں پہلا نام مرزُبان ہی کا ہے۔

اس کے بعد کا حکمران جو ہمارے علم میں آیا ہے وہ وہسودان بن جُستان ہے؛ مرزُبان (جس کا زمانہ ۱۸۹ھ/ ۸۰۵ء بیان کیا گیا ہے) اور وَہْسودان (۲۰۹ھ/۸۲۴ء تک زندہ تھا) کے درمیان کی مدت اتنی زیادہ ہے کہ ہم انھیں بھائی خیال نہیں کر سکتے، اس وقت اتفاق رائے (جُسْتی Justi، وسمر Vasmer، الکسْروی، القزوینی) اس امر پر ہے کہ جستان اوّل (عدد ۲)، پہلے بادشاہ مرزبان کے فرزند اور عدد ۳ کے والد کے درمیان وَہْسودان کو شمار کیا جائے۔ فی الواقع سال ۲۰۱ھ/۸۱۶ء کے تحت الطّبری لکھتا ہے کہ عبداللہ بن خُرداذبہ نے دَیْلم پر اپنے فاتحانہ حملے کے دوران میں ایک بادشاہ کو گرفتار کیا جو ابو لَیلی کہلاتا تھا، لَیلی (یا لیلی) دَیْلم میں مردوں کا نام ہوتا ہے (قب ایک بخت آزما لیلی بن النعمان)، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ خود جُستان (عدد ۲) ہی کا نام تھا یا کسی غاصب یا مقامی حاکم (لاھیجان؟) کا۔

دَیْلم کا حال اس وقت سے زیادہ صاف اور واضح ہوتا ہے جب حَسَنی خاندان کے سیّد اس کی سرحد پر نمودار ہونا شروع ہوے۔ یہ ہوشیار سیاست دان اور بہت اچھے جنگ آزما تھے اور دیلمیوں کو اپنی جد و جہد اور منصوبوں کے اندر شامل کر لینے میں کامیاب ہو گئے، گو ابھی تک ان پر اسلام کا اقرار کرنے کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی تھی۔

سیّد حسن بن زید "الداعی الکبیر" (عدد ۱) ۲۵۰ھ/۸۶۴ء کی شورش کا، جو چالوس اور کلار میں برپا ہوئی، سرگروہ تھا، اور اس نے وہاں کے باشندوں کی طاہری عامل کے خلاف حمایت کی۔ یہ عامل چاہتا تھا کہ شاملات اراضی کو، جہاں مویشی چرتے تھے اور ایندھن مہیا ہوتا تھا، خود ہتیالے (الطّبری، ۳ : ۱۵۲۴)۔ الاصْطَخْری کے بیان کے مطابق حسن بن زید سے پہلے دَیْلم کو کُفر کی سرزمین (دارالکُفر) خیال کیا جاتا تھا، مگر علویوں نے دَیْلمیوں کی حمایت کی، وَہْسودان بن جُستان (عدد ۳) نے حسن بن زید کی اطاعت کا حلف اُٹھایا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس سے قطع تعلق کر لیا اور انھیں دنوں وفات پائی۔

تاریخ جیل و دَیْلم میں (جس کا حوالہ جُوَینی، ۳ : ۲۷۱ میں دیا گیا ہے) اطلاع درج ہے کہ ۲۴۶ھ/ ۸۶۰ء میں ایک جُستانی نے کوہ الموت پر ایک عمارت بنانا شروع کی، جس پر شاہان دیلم فخر کیا کرتے تھے۔ یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ کارنامہ وَہْسودان کی حکومت کے خاتمے کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کے مستعد فرزند جستان دوم (عدد ۴) کی حکومت کے آغاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس جُستان دوم نے (سادات کے) داعی کو دعوت دی کہ وہ اپنے نمائندے دیلم میں بھیجے اور اسی نے علویوں کے زیر حمایت

طاہریوں سے ری چھین لیا اور قزوین اور زنجان پر قبضہ کر لیا ۔ ۲۵۳ھ/۸۶۷ء میں خلیفہ المُعتزّ نے موسٰی بن بُغا کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی، جس نے جُستان کی کمانداروں کو ملیا میٹ کر دیا ۔ ۲۵۹ھ/۸۷۳ء میں جُستان نے پھر کوشش کی کہ ری پر قبضہ کر لے مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی ۔ تاہم وہ صفاریوں کے خلاف لڑائی میں داعی کی برابر مدد کرتا رہا ۔ ۲۷۰ھ/۸۸۴ء میں حسن بن زید نے وفات پائی اور اس کا بھائی محمد بن زید جسے "الداعی الصغیر" کہتے ہیں، اُس کا جانشین ہوا اور جُستان دوم نے اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا ۔

دیلم پر سب سے بڑی مصیبت تقریباً ۲۷۶ھ/۸۸۹ء میں نازل ہوئی، جب رافع بن ہَرْثَمة نے، جو ایک خراسانی بخت آزما سپاہی تھا اور سامانیوں کی طرف سے کام کر رہا تھا، محمد بن زید کو جُرجان سے نکال دیا۔ اس داعی نے دیلم میں جا کر پناہ لی ۔ رافع کے سپاہیوں نے چالوس پر قبضہ کر لیا مگر سید نے جُستان کی مدد سے ان کا محاصرہ کر لیا ۔ تب رافع خود آگے بڑھا۔ محمد بن زید گیلان کی طرف پسپا ہوا۔ اُدھر جُستان کا رافع نے پیچھا کیا اور چالوس سے طالقان تک بڑھتا چلا گیا ۔ تین مہینے تک (۲۷۸ھ/۸۹۱ء کا موسم گرما) حملہ آوروں نے اس علاقے میں لوٹ مار کا بازار گرم رکھا ۔ جُستان نے وعدہ کیا کہ سید کی مدد نہ کروں گا اور رافع نے قزوین اور ری پر قبضہ کر لیا (دیکھیے ابن الاثیر، ۷ : ۳۰۳ اور ابن اسفندیار، طبع اقبال، ص ۲۵۲ تا ۲۵۴)۔ ۲۷۹ھ/۸۹۲ء میں رافع نے جب دیکھا کہ اسے بہت سی جانب سے حملوں کا خطرہ ہے تو اس نے یکایک داعی کی اطاعت کا حلف اٹھا لیا اور اسے جرجان واپس دے دیا؛ سمجھوتا یہ ہوا کہ داعی کے لیے چار ہزار دیلمی بہادر بھیجے گا ۔ عمرو بن لَیث الصفّاری نے دھمکا کر اور کچھ وعدے وعید کرکے داعی کو رافع کی مدد کرنے سے روکا اور رافع کو کچھ دن بعد بھاگ کر خوارزم جانا پڑا، جہاں وہ ۲۸۳ھ/ نومبر ۸۹۶ء میں مارا گیا ۔ اس کے چار سال بعد (۲۸۷ھ/ اکتوبر ۹۰۰ء) محمد بن زید بھی ایک سامانی سپہ سالار سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔

تھوڑے وقفے کے بعد علویوں کے حق کی حمایت حسن بن علی الحسینی ناصر الدّین الطّاہر الاُطْرُوش "الاصَمّ" (الثالث) نے سنبھالی ۔ اس کی حکومت کی مدت اگرچہ مختصر تھی (۳۰۱ تا ۳۰۴ھ [بہ تصحیح ۹۱۳ تا ۹۱۷ء]) پھر بھی اسے علوی حکمرانوں میں سب سے بڑا مانا گیا ہے ۔ الطّبری کے بیان کے مطابق اس ملک نے الاُطْرُوش کا سا عدل و انصاف کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ تیرہ سال تک دیلمیوں کے درمیان رہا تھا اور "سفید رود کی آخری سرحد (مشرق) اور آمل کے درمیان" لوگوں کو خاصی بڑی تعداد میں زیدی عقیدے کا پیرو بنانے میں کامیاب ہوا ۔ اپنی اس کامیابی کو ثابت کرنے کے لیے اُس نے چالوس کے برج گرا کر زمین کے برابر کر دیے ۔ جُستان نے اس کی حکومت تسلیم کر لی، اگرچہ سامانیوں کے مقابلے میں ناکام رہا لیکن اس نے آئندہ سال، چالیس دن تک جم کر لڑائی کر کے سامانیوں کو بحر خزر کے صوبوں سے باہر نکال دیا ۔

البیرونی کی اس مبہم عبارت کا، جس کا اوپر ذکر ہوا اور جو ناصر کی اس کارروائی سے متعلق تھی جس سے کہ خدا کے سابقہ اقتدار میں رخنہ پڑا، ممکن ہے مطلب یہی ہو کہ دیالمہ کے متفرق خاندان اسلامی شعائر کے زیر اقتدار آ گئے تھے ۔ واقعات کا ایسا میلان دیکھ کر جُستانیوں نے ضرور اظہار ناراضی کیا ہوگا اور بعض مؤرخوں (اولیاء آملی: تاریخ رُویان (۷۶۰ھ/ ۱۳۵۹ء)، مطبوعۂ تہران، ص ۷۷؛ ابن واصل: التاریخ الصّالحی، در Dorn: *Muhamm. Quellen z. Gesch. d. Kasp. Meers*، ۴ : ۳۴۷) نے ذکر کیا ہے کہ جُستان

اور ناصر میں ایک مدت تک کشمکش چلتی رہی، اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ ناصر کی تخت نشینی (۳۰۱ھ/۹۱۳ء) سے پہلے ہوا ہوگا۔ ناصر کی وفات ۵ شعبان ۳۰۴ھ/۳۱ جنوری ۹۱۷ء کو ہوئی۔ وفات سے پہلے وہ اپنے داماد حسن بن القاسم الحسینی (حسن الرابع) کو اپنا جانشین بنا چکا تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں، چالیس سال حکومت کرنے کے بعد، جُستان کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس جُرم کا مرتکب اس کا بھائی علی بن وَهْسُودان (عدد ۵) تھا، جسے پہلے ہی ۳۰۰ھ/۹۱۲ء میں بنو عباس اصفہان میں اپنا مالی عامل بنا چکے تھے۔ ۳۰۴ھ میں اسے برطرف کر دیا گیا لیکن ۳۰۷ھ/۹۱۹ء میں عباسی سپہ سالار مؤنس نے، جو اسی زمانے میں یوسف بن ابی السّاج کو قیدی بنا چکا تھا، علی کو دوبارہ رے، قزوین اور زنجان کا والی بنا دیا۔ اسی سال اسے (تاروم Tarom کے دوسرے دیلمی حاکم خاندان کنگری یا سلّاری کے) محمد بن مسافر نے قزوین میں قتل کر ڈالا۔ محمد بن مسافر کی شادی جُستان بن وَهْسُودان (عدد ۴) کی ہوشیار لڑکی خراسُواہ سے ہوگئی تھی۔ اس لڑکی کی خواہش تھی کہ اپنے خُسر (اپنے بھتیجے کا نہیں، جیسا کہ ابن الاثیر نے، ۸: ۷۶ میں لکھا ہے) کا انتقام لے۔ اپنے سیاسی مؤقف کے پیش نظر علی بن وَهْسُودان کو سارا دیْلَم بمشکل ہی (اپنا حکم) مان سکتا تھا۔ بہر حال یہ معلوم ہوا ہے کہ جب حسن بن القاسم الحسینی (داعی رابع) کو طَبَرِسْتان میں گرفتار کر کے علی کے سپرد کیا گیا کہ اسے بغداد بھجوا دے تو علی نے اسے اپنے بزرگوں کے قلعے اَلَمُوت میں قید کر دیا (دیکھیے ابن اسفندیار، طبع اقبال، ص ۲۸۱)۔ علی کی موت کے فوراً بعد اس کے دوسرے بھائی خسرو فیروزان نے، جو بہ ظاہر علی کے مقامی عامل (locum tenens) کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، سیّد کو رہا کر دیا۔ خُسرو فیروزان (عدد ۶) نے ابن مسافر پر فوج کشی کی لیکن ابن مسافر نے اسے قتل کر دیا۔ خسرو کے فرزند مہدی (عدد ۷) نے بھی کنگری ابن مسافر کے خلاف ہتیار سنبھالے لیکن شکست کھائی اور دیْلَم کے نئے اُبھرتے ہوئے ستارے اسفار بن شیرُویہ یا شیرُوَیْہ کے ہاں پناہ لی۔

متأخرین اس واقعے کے ساتھ (تقریباً ۳۱۵ھ/۹۲۷ء) جُستانیوں کی بابت ہماری براہ راست اطلاعات ختم ہو جاتی ہیں، مگر خاندان کے بچے کھچے افراد، کم سے کم اپنی مملکت کے کسی حصے میں، سرگرم ہوں گے۔ جب ابن مسافر اپنے جستانی مخالفوں (عدد ۵، ۶، ۷) سے بھگت رہا تھا اس وقت علویوں کے سابق امیر اور جستانی امیر پہلے ہی ایران کی سطح مرتفع پر پہنچ چکے تھے اور دیلم ابن مسافر کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ایک اطلاع نامے میں کسی سرکاری عہدے دار نے ۳۷۹ھ/۹۸۹ء سے کچھ مدت پہلے شمیران (تاروم) کی تاریخ کا خلاصہ بویہیوں کے وزیر ابن عبّاد کے لیے کرایا تھا (دیکھیے یاقوت، ۳: ۱۴۹ تا ۱۵۰؛ الکسروی، ۱: ۱۳۰ تا ۱۳۴)۔ اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ مسافری خاندان والے سارے پہاڑی اُستانیہ پر حکمران تھے اور (اس طرح ؟) دیْلَم کے ایک حصے کو بھی ہتھیا لیا تھا۔ چنانچہ اس وقت وَهْسُودان (عدد ۳) بن جُستان کی اولاد کو فقط لاہِجیّہ کے علاقے پر قناعت کرنا پڑی تھی۔ یہی کیفیت دیلمیوں کے مخالف اور ترکوں کے موافق اس رسالے میں بھی ظاہر کی گئی ہے جو کاتب (Secretary) ابن حَسُّول نے طُغرل بیگ کے وزیر الکُندری کو پیش کیا (تقریباً ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء) [دیکھیے فضائل الاتراک، طبع العزّاوی /vi '*Belleten* : A. al 'Azzawi ۴-۱۵؛ (۱۹۴۰ء) م ۱۳]۔ ابن حَسُّول نے یہ وضاحت کی ہے کہ اوستان دیْلَم کا اونچا علاقہ ہے اور لاہِج (جو غلط طور پر "لانج" چھپ گیا ہے) دیْلَم کا نشیبی حصہ ہے، اوستان وَهْسُودانی (جنوبی یہاں کنگری

کہتے ہیں) عاملوں کے قبضے میں تھے اور لانج جستانی بادشاہوں کے تحت تھے۔ ایک دوسرے سے الگ یہ اطلاعات ظاہر کرتی ہیں کہ جستان بن وہسودان (عدد ۴) کی وفات کے بعد اس کے مقبوضات منتشر ہوگئے۔ وہسودانیوں (یعنی تاروم کے کنگری وہسودان بن محمد کی اولاد) نے دیلم کے اونچے علاقوں پر قبضہ کر لیا (شاید یہی جستانیوں کا "اوستان" یعنی "وطن" ہے)۔ جستانی ضرور یہاں سے وطن چھوڑ کر لاہیجان (یعنی دیلم کے ساحلی علاقے میں، جس کے دس ضلعے حدود [العالم] میں گنوائے گئے ہیں) چلے گئے ہوں گے۔

اس کے برخلاف، جب سلطان طغرل قزوین کے نزدیک معرکہ آرائی میں مصروف تھا (ابن الاثیر، ۴۳۴ھ / ۱۰۴۲ء) اس وقت دیلم کا بادشاہ اس کے پاس خراج لے کر حاضر ہوا؛ اس کے بعد ابن الاثیر الگ بھی 'سلار' طارم (تاروم) کے مطیع ہو جانے کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ یا تو جستانی اپنی مملکت کے ایک حصے پر دوبارہ قابض ہوگئے تھے یا خراج لاہیجان کی شاخ نے ادا کیا ہوگا، یہ دوسرا احتمال زیادہ قوی ہے کیونکہ ناصر خسرو اپنے سفرنامے میں بیان کرتا ہے کہ ۴۳۸ھ/ ۱۰۴۶ء میں شاہ رود کے معبر پر (اس مقام کے قریب جہاں وہ سفید رود سے ملتا ہے) امیر امیران کی طرف سے، جو دیلمان کا ایک بادشاہ تھا، محصول لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ناصر خسرو اپنے شمیران جانے کا حال لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس وقت شمیران کے فرمانروا کا لقب "مرزبان الدیلم جیل جیلان (کذا) ابو صالح تھا" اس کا نام جستان ابراہیم تھا اور اس کے قبضے میں "دیلم کے بہت سے قلعے تھے"۔ یہ فرمانروا ضرور تاروم کے وہسودان کا پرپوتا ہوگا (دیکھیے مقالہ مسافریہ) اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید شاہ رود کا "باج" بھی اسی کے نام سے لیا جا رہا تھا۔

داعیوں کی سرگزشت مذکورۂ بالا حسن بن قاسم الحسنی (السائع) کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، جو الاطروش کا داماد (ختن) تھا، اگرچہ اسے خود ناصر الاطروش نے اپنا ولیعہد نامزد کر دیا تھا پھر بھی اس کے اور ناصر کے بیٹوں کے مابین مسند نشینی کے بارے میں کشاکش شروع ہوئی اور ناصر کی وفات کے بعد دیلمی امیر تنازعات میں مبتلا ہو کر خود اپنی سیادت بڑھانے کے لیے باہم لڑتے رہے۔ حسن بن قاسم تقریباً ۳۱۶ھ/۹۲۸ء میں مرداویج بن زیار کے ہاتھ سے قتل ہوا، جو اس وقت اسفار بن شیرویہ کا حلیف تھا۔

دیلمیوں کا ادھر اُدھر پھیلنا: علویوں کی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیلمیوں میں، جن کے ایک حصے نے زیدی عقیدہ اختیار کر لیا تھا، خلافت کے خلاف بہت زور کا جذبہ پیدا ہو گیا، ادھر علویوں کی خاطر بہت سی لڑائیوں میں شریک ہونے سے ان کی فوجی مہارت بہت کچھ بڑھ گئی اور ان میں اپنی طاقت کا احساس پیدا ہو گیا۔ ماجد یوسف بن دیوداد کی بغاوتوں (۲۹۵ھ/۹۰۷ء اور ۳۰۴ھ/۹۱۶ء تا ۳۰۷ھ/ ۹۱۹ء) اور ۳۱۵ھ/۹۲۸ء میں اس کی وفات سے پہلے اس کی حتمی معزولی کی وجہ سے بدنظمی کا دروازہ کھل گیا۔ رے میں سامانی عامل ترک غلام اور دیلم کے علوی یکے بعد دیگرے برسراقتدار آتے رہے۔ تاروم کے مسافریوں کی ایک اہم شاخ آذربیجان اور ماورائے قفقاز (Transcaucasia) کی جانب پھیل گئی تھی (دیکھیے Minorsky، در *BSOAS*، *XV*/۳، ۱۹۵۳ء: ۵۱۴-۵۲۹) اور ادھر ایران کی سطح مرتفع کے وسطی علاقے کے اندر بالکل جدید گروہ نمودار ہو گئے تھے: اوّل اسفار بن شیرویہ، جس نے تقریباً ۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا، پھر زیاری (۳۱۶ھ/ ۹۲۸ء تا ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء)، جو تھوڑی مدت تک رے

میں اور اصفہان میں اس کے بعد بحر خزر کے جنوب مشرق کونے میں جہاں انھیں اپنے سے زیادہ نامور بنو بویہ [رک بآں] کے سامنے سے پسپا ہونا پڑا، برسر اقتدار رہے۔ اس عہد کے حالات ہمیں ایسے مآخذ کے ذریعے معلوم ہوے، جیسے المسعودی: مروج، ۹: ۴ تا ۱۵؛ مسکویہ، در *Eclipse*؛ ابن اسفندیار، طبع اقبال Eghbal، ص ۲۲۴ تا ۳۰۱، ترجمہ از براؤن: ص ۱۶۲ تا ۲۲۲؛ اور ایسے ضمنی تذکروں سے جیسے سامانیوں کے تاریخ نویسوں کے ہاں ملتے ہیں، قب گردیزی: زین الاخبار؛ ابن فضلان در رحلۃ، وغیرہ۔

ایران کی سطح مرتفع کے بڑے حصے پر قبضہ کرنے کے بعد (باستثناے خراسان جو سامانیوں کے قبضے میں تھا) بنو بویہ نے جن کا ۳۲۰ھ/ ۹۳۲ء میں خروج ہوا، ۳۳۴ھ/۹۴۶ء میں بغداد پر قبضہ کر لیا اور ۱۰۹ سال تک خلیفہ کو اپنے علوی اقتدار کے ماتحت بے دست و پا رکھا۔ ان کے زیر سایہ بہت سے ایرانی نسل کے مقامی حکمران خاندان (دیلمی اور کرد) سرحدی اضلاع میں اٹھ کھڑے ہوے: (۱) مسافری؛ (۲) گنجہ کے کرد نژاد شدادی (۳۴۰ تا ۴۰۹ھ/۹۵۱ تا ۱۰۱۸ء) اور ان کی شاخ انی Ani (۴۵۱ تا ۵۵۹ھ/۱۰۵۹ تا ۱۱۶۳ء)؛ (۳) کاکویہ [رک بآں] ہمدان اور اصفہان میں (۳۹۸ تا ۴۴۳ھ/ ۱۰۰۷ تا ۱۰۵۱ء)؛ (۴) حسنوی کرد [دیکھیے حسنویہی Hasanwayhids] کرمانشاہ کے علاقے میں (۳۴۸ تا ۴۰۶ھ/۹۵۹ تا ۱۰۱۵ء)؛ (۵) عنازی کرد [رک بآں] اور کوہ زگروس کی جنوبی ڈھلانوں پر (۳۸۱ تا ۵۱۱ھ/۹۹۱ تا ۱۱۱۷ء)؛ (۶) مروانی کرد میافارقین اور دیار بکر میں (۳۸۰ تا ۴۷۸ھ/ ۹۹۰ تا ۱۰۸۵ء) وغیرہ — دیلمی نظام کی کمزوری کی اصل وجہ یہ تھی کہ دیلمی گروہ جن کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہ تھی، حد سے زیادہ وسیع رقبے میں پھیلے ہوے تھے؛ ان کا حکمران خاندان چند حریف شاخوں میں بٹا ہوا تھا اور آخر میں فوج کے اندر دیلمیوں اور ترکوں کی مخاصمت (دیکھیے بیان آئندہ)۔ بنو بویہ کے اقتدار کو سب سے بڑا دھچکا اس سے لگا کہ ۴۲۰ھ/ ۱۰۲۹ء میں محمود غزنوی نے رے پر قبضہ کر لیا۔ اس خاندان کا قطعی خاتمہ طغرل بیگ سے متصادم ہونے پر ہوا، جس نے ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء میں بغداد کے آخری بویہ الملک الرّحیم کو گرفتار کر لیا۔ فارس میں بویہ خاندان کے آخری افراد نے چند سال اور سلجوقیوں کے باجگذار ہو کر گزارے (دیکھیے Bowen در *JRAS*، ۱۹۲۹ء: ص ۲۲۹ - ۲۴۵)؛ اپنے ملک کے باہر دیلمی لوگ اجیر سپاہیوں کی حیثیت میں خدمت انجام دیتے رہے۔ نظام الملک: سیاست نامہ، باب ۱۹ میں اپنے زمانے تک ۱۰۰ دیلمیوں اور خراسانیوں کو قصر شاہان سلجوقیہ کے محافظوں کے طور پر ملازم رکھنے کی سفارش کرتا ہے۔ دیلمیوں کی پراگندہ بستیاں بہت سے مقامات پر الگ الگ آباد رہیں یہاں تک کہ وہ مقامی آبادی میں مدغم ہو گئے۔

مقامی نام: وہ رقبہ جس میں دیلمی مدتہاے دراز تک نسلاً بعد نسل پھیلے پڑے رہے بہت وسیع ہے، لیکن تاریخی ترتیب کی مشکلات کے پیش نظر بہتر یہ ہے کہ ناموں کا ذکر ایک واحد عنوان کے تحت اکھٹا کر دیا جائے؛ مثلاً بہت قدیم بابلی نام جزیرۂ دلمون (Dilmun) (بحرین) اس وقت بھی قابل توجہ ہے اور دوسری طرف فارس کے جنوبی ساحل پر بندر دیلم کا نام زیادہ سے زیادہ بویہی عہد تک جاتا معلوم ہوتا ہے۔ قفقاز کے نیچے کی سرزمین میں ساسانیوں کے زمانے کی فوجی چھاؤنیوں کا وجود اس قسم کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے، جیسے لیزان یالائزان (آجکل لہیج) جس کا تعلق لاہیجان سے ہے، شروان کا نام غالباً شیر (عربی شرز) کے نام سے وابستہ ہے جو دو دریا طالقان اور الموت کے سنگھم پر واقع ہے، دیکھیے حدود، باب ۳۲، فصل ۲۴؛ اور جوینی، ۳: ۴۲۵ (حاشیہ محمد قزوینی)۔

سریر (Avaria) کے بادشاہ کا لقب، جو البلاذری میں ص ۱۹٦ پر درج ہے، وہرزان آیا ہے، اس کا تعلق وھرز لقب کے ساتھ ثابت ہو سکتا ہے؛ دیکھیے Minorsky : *History of Sharvan*، ۱۹۵۸ء، ص ۲۳ تا ۲۵۔ نام نہاد زازا Zaza جو دیار بکر کے شمال میں پالو اور درسم تک بسے ہوئے ہیں اور ابھی تک ایک ایرانی زبان بولتے ہیں اپنے کو دملا Dimlä کہتے ہیں، اور اس نام کو F. C. Andrees دیلم ہی کی صورت بتاتا ہے۔ قبیلہ دُمبلی (Dumbuli) (جو اب ترکوں کے رنگ میں رنگ گیا ہے) اور اُنیسویں صدی عیسوی کے شروع میں خوی Khoy کے علاقے میں سرگرم کار تھا، دملا سے رشتہ رکھتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ امر لائق توجہ ہے کہ اگاتھیاس (Agathias)، ۳ : ۱۷، "دِلمیتیائی (Dilimnitai) فوجوں کے ذکر کے ضمن میں، جو Lasica میں مصروف جنگ تھیں، بتاتا ہے کہ ان کا آبائی وطن (شاید اس مخصوص گروہ کا؟) ایران کی سر زمین کے آس پاس "دجلہ (Tigris) کے وسطی حصے میں تھا" یعنی (اگر دجلہ غلطی سے سفید رود کے بدلے نہیں لکھا گیا ہے) اس علاقے میں جہاں آج کل زازا آباد ہیں۔ ابو دلف سیاح، طبع Minorski، قاہرہ ۱۹۵۵ء، فصل ۲۵، ایک مقام دِیلستان کا ذکر کرتا ہے جو شہر زور سے سات "فرسخ" مشرق کی طرف ہے، جہاں سے قدیم شاہان ایران کے زمانے میں دیلمی اپنی غارت گر جماعتیں عراق کے نشیبی علاقوں میں بھیجتے تھے۔ قصبۂ دیلمان جو لاھیجان کے مغرب میں ہے، اس امر کا شاھد ہو سکتا ہے کہ دیلمیوں کا مرکز اوستان (دیکھیے اوپر) سے ھٹ کر لاھیجان کے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا۔ بحیرۂ اُرمیا (Lake Urmia) کے شمال مغرب میں سلماس کا وسطی حصہ ابھی تھوڑا عرصہ پہلے تک دِلمقان کہلاتا تھا؛ بحیرۂ اُرمیا کے جنوب مغرب میں کوھستان زگروس کے ایک اہم درے کے قریب ایک ضلع موجود ہے جو لاھیجان کہلاتا ہے (دیکھیے سوج بولاق Sawdj Bulak [آ، ترکی]) چند اور گاؤں بحیرۂ اُرمیا کے طاس میں کوہ سوالن (Mt. Savalan = لاھی) وغیرہ کے شمال میں اسی نام لاھیجان سے موسوم پائے جاتے ہیں۔

ملک اور باشندے: قدیم مسلم جغرافیہ نویس جیسے ابن خُردادْبہ، الیعقوبی، ابن رُستہ، ابن فقیہ دیلم کا کچھ ذکر نہیں کرتے مگر ان کے ملک اور ان باشندوں کی بابت معلومات ان مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں نے بافراط مہیا کی ہیں جو چوتھی صدی ھجری/دسویں صدی عیسوی میں دیلمی حکمران خاندانوں کے عروج کے بعد ہوئے ہیں۔ الاصطخری پہلے ہی دیلم کے ذیل میں بحر خزر کا تمام جنوبی ساحل اور وہ سر زمین جو کوھستان البرز کے جنوب میں ایک پٹی بناتی ہے، شامل کر چکا تھا (جس میں رے اور قزوین شامل ہیں)۔ المقدسی (جو دیلمی سلطنت کے انتہائی زمانۂ عروج میں ہوا ہے) اس میں بحر خزر کے سارے ساحلوں کا اضافہ کرتا ہے جس میں والگا کے خلیجی دہانے کی مملکت خزر شامل تھی۔

الاصطخری (شاید البلخی کا تتبع کرتے ہوئے) خاندان جُستان کا دارالحکومت رُوذبار کو ٹھیراتا ہے۔ جوینی، ۳ : ۴۳۳ کا مصحح مرزا محمد قزوینی اس بات کے وزنی دلائل پیش کرتا ہے کہ یہ رُوذبار وھی رُوذبار الموت ہے اور یہی خانوادۂ دیلم کا اصلی وطن ("اُستان" ostān) ہے۔ ابن حَوقَل کے متن میں جو دراصل الاصطخری کے بیان پر مبنی ہے جُستانیوں کا دارالحکومت طرم معین کیا گیا ہے جو غالباً کسی کاتب یا قاری کا سہو ہے، کیونکہ طارم (= Tārom) جُستانیوں کا نہیں بلکہ مسافریوں کا جو ان کے بعد آئے، صدر مقام تھا۔ بروان (B. rwān) کی تعیین اور بھی پیچیدہ ہے اور وہ المقدسی، ص ۳٦۰ ("بروان" بلا اعراب) کے کہنے کے مطابق دیلم کا صدر مقام تھا۔ یہ مقام سہولتوں سے محروم تھا۔ اس کے مقابلے میں طالقان (شاہ روذ کی وادی میں) کہیں زیادہ حاصل خیز

تھا اور مصنف کی رائے میں دارالسلطنت بننے کا زیادہ مستحق تھا۔ بروان (B. rwān) میں حکومت کی قیام گاہ ("مستقر السلطان") شہرستان کہلاتی تھی جہاں خزانہ ایک گہرے کنوئیں میں رکھتے تھے (ظہیرالدّین شہرستان کا املا شاید شہر "اوستان" بمعنی "اوستان کا شہر" کرتا ہے، دیکھیے اوپر)۔ المقدّسی دو نام الگ الگ بیان کرتا ہے۔ ایک سُمَیرُوم Samīrūm (کذا) سلار وندی (Sallārwand) ([illegible] (A[illegible])) حاکموں کا صدر مقام جو طارم کے علاقے کے حاکم تھے اور دوسرا خشّم جو علوی داعیوں کا شہر تھا اور مشرقی گیلان میں ایک پل کے پاس واقع تھا۔

الاصطخری، ص ۲۰۵، دیلمیوں کی بابت لکھتا ہے کہ وہ دبلے پتلے لوگ تھے، جن کے بال ہلکے (غالباً بھورے ہوئے) ہوتے تھے، مزاج کے تیز، جلد باز اور بے مروت تھے۔ وہ زراعت پیشہ تھے، مویشی پالتے تھے، مگر گھوڑے ان کے پاس نہ تھے۔ المقدّسی، ص ۳۶۸ - ۳۶۹، کہتا ہے کہ دیلمی خوبرو تھے اور داڑھیاں رکھتے تھے۔ "دیلم خاص" اور گیلان کی بابت حدود العالم باب ۳۲، فصل ۳۴ یا ۳۵ میں گراں قدر معلومات دی گئی ہیں: دیلم کے دس اضلاع بحر خزر کی ترائی میں اور تین وستان، شیر (بہ ظاہر وہی ہے جسے عربی مآخذ میں شیرز کہا گیا ہے) اور پزم، کوہستانی علاقے میں ہیں۔

عادات و رسوم۔ دیلمیوں کی عادات و رسوم پر اس وقت کے ہم عصر مصنف تعجب کرتے ہیں۔ ان کے مرد انتہا درجہ قوی تھے اور فقر و فاقہ کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کر سکتے تھے (مسکویہ: *Eclipse*، ۱: ۴۰)؛ ان کے اسلحہ میں سانگ یا پھینک کر مارنے والی برچھیاں ("ژوبین") اور لمبی ڈھالوں کا خاص طور پر بیان آتا ہے، جن کے رنگ شوخ ہوتے تھے اور جنھیں مددگار لڑکے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ ان ڈھالوں کو ملا کر پہلو بہ پہلو جما لینے سے حملہ آوروں کے سامنے ایک دیوار بن جاتی تھی۔ فوج کے اندر ایک خاص جماعت ان کی ہوتی، جو ژوبین کے ساتھ جلتا ہوا نفط (مزارق النفط و النیران) پھینک کر مارتے تھے (دیکھیے *Eclipse*، ۱: ۲۸۲)۔ دیلمیوں کی جنگ کا ایک شاعرانہ بیان گرگانی کی مثنوی ویس و رامین، طبع Minovi، باب ۹۹ میں دیا گیا ہے۔ دیلمیوں میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ ان کے پاس سوار فوج نہ تھی، وہ مجبور تھے کہ اجیر ترک سواروں کے ساتھ (جن کے اسلحہ ان سے زیادہ مکمل ہوتے تھے، دیکھیے *Eclipse*، ۲: ۳۳۶) مل کر کام کریں، مگر ان دونوں کے درمیان جو گہری رقابت تھی اس نے لشکر کو منتشر کر دیا۔

اس بات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے کہ دیلمی اپنے عزیزوں کی وفات پر حد سے زیادہ آہ و زاری کیا کرتے تھے اور اسی طرح مصیبت کے وقت خود اپنے حال پر فریاد و ماتم کرتے تھے (المقدّسی: ۳۶۹؛ *Eclipse*، ۲: ۱۶۲؛ ۳: ۲۶۰)۔ ۳۵۲ھ/۹۶۳ء میں اسی قوم کے معزّالدّولہ نے امام حسینؓ کے عام ماتم ("نیاحہ") کی رسم جاری کی (ابن الاثیر، ۸: ۴۰۶؛ التنوخی: نشوار، ترجمۂ Margoliouth، ۲۱۹؛ لیکن دیکھیے ہلال بن محسّن اس رسم کی وقتی نوعیت ہونے پر، *Eclipse*، ۳: ۴۵۸، sub ۳۹۳)؛ اور یہی رسم آگے چل کر ایرانی تعزیوں کی بنا ہوئی جو ماہ محرم میں [illegible] جاتے ہیں (دیکھیے A. E. Krimskiy: *Perskiy teatr* - [ایرانی ناٹک]، Kiev، ۱۹۲۵ء)۔

تقریباً ۲۰۰ء میں ایک شامی حکیم Bardesanes نے لکھا تھا کہ گیلان کی عورتیں کھیتوں میں کام کرتی ہیں (*Leges regionum*، Patrologia Syriaca، ۱/۲، ۱۹۰۷ء، طبع F. Nau، ص ۵۸۶)۔ آٹھ صدی بعد حدود کا مصنف لکھتا ہے کہ دیلم کا نسائی طبقہ زراعت میں مردوں کی طرح مشغول رہتا ہے۔ رُذراوری (Rudhrawari: *Eclipse*، ۳: ۳۱۳) کے قول کے مطابق

وہ (عورتیں) اپنی طبیعت، کردار کی قوت اور انتظامی معاملات میں حصہ لینے میں مردوں کے برابر ھیں۔ دیلمیوں میں صرف اپنے گھرانے یا برادری ھی کے اندر شادی کرنے کا رواج تھا اور طرفین کی براہ راست رضامندی سے شادی ھو جاتی تھی (المقدسی، ص ۳۶۸-۳۶۹)۔

اسمٰعیلیہ۔ فاطمی اسمٰعیلی دعوت و تبلیغ (رے کے قرب و جوار میں تیسری صدی ھجری/نویں صدی عیسوی کے شروع ھی سے جاری ھو چکی تھی، دیکھیے S.M. Stern، در BSOAS، ج ۲۳، ۱۹۶۰ء، ص ۵۶ تا ۹۰)۔ طارم کے اسفار اور گیلان کے مرداویج نیز دیلمیوں نے اس نئی تعلیم کو قبول کر لیا تھا (البغدادی: الفرق، ترجمہ A. Halkin، تل ابیب ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۱؛ وجہ الدین: اسمٰعیلیان، طبع دانش پژوہ، تہران ۱۳۳۸ھ/۱۹۵۹ء، ص ۱۲)۔ بویہیوں کے آخری زمانے میں فارس کے دیلمی سات اماموں کے عقیدے پر قائم رہے اور آخر سے پہلے بویہی فرمانروا ابوکالیجار (م ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) نے المؤید واعظ کی تعلیم پر کان لگانا شروع کیے۔ یہ واعظ آخر میں فارس سے نکال دیا گیا (سیرۃ المؤید فی الدین، قاہرہ ۱۹۴۹ء، ص ۴۳ ببعد؛ دیکھیے فارس نامہ، ص ۱۱۵)۔ دیلم کا علاقہ ایک تو قدرتی طور پر مستحکم تھا دوسرے اس کے باشندے باغیانہ رجحانات رکھتے تھے۔ ان دونوں سے متاثر ھو کر حسن بن صباح نے دیلم میں پہلے تو اپنے داعی بھیجے اور بعد ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء میں قلعۂ الموت پر قبضہ کر لیا جو اس وقت ملک شاہ کی طرف سے ایک علوی مسمی مہدی کو بطور جاگیر ملا ہوا تھا (جوینی، ۳: ۱۹۳)۔ اس طرح آئندہ ۱۶۶ سال تک دیلم کا یہ مضبوط قلعہ سلجوقی ممالک کے عین دروازے پر نہایت خطرناک مقام اور تمام سنت والجماعت دشمن تحریکوں کا مرکز بنا رہا۔ الموت کا قلع قمع کرنے میں سلجوقیوں کی تمام مساعی ناکام رہیں، لیکن ان سے عام باشندوں کو بہت نقصان پہنچا؛ دیکھیے ارسلان تاش کی فوجی کارروائی ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء، نظام الملک کے فرزند کا حملہ ۵۰۳ھ/ ۱۱۰۹ء میں، شیرگیر کا حملہ ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء سے پہلے۔ بویہیوں کی دیلم میں آخری یادگار جوینی کی یہ اطلاع (۳: ۲۳۹) ھے، جو اس نے ان کے ایک فرد حسن بن نام آور کی بابت بہم پہنچائی ھے کہ اس حسن نے ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء میں اسمٰعیلیوں کے سردار کو خنجر بھونک کے مار ڈالا کیونکہ گو وہ اس کا سالا تھا لیکن حسن اس کی فرقہ وارانہ تبلیغ کو پسند نہیں کرتا تھا۔

مغل اور ان کے بعد: ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں ھلاکو کی افواج نے حشیشیوں کے قلعوں (الموت لمسر، میمون دز) کو کاملاً منہدم کر دیا اور حشیشیوں کے آخری امام کے پیروؤں کا نام و نشان مٹا ڈالا۔ اس واقعے سے دیلم کے اصلی کوھستانی باشندوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ شاہ رود کی وادی کا قزوین سے راستہ بالکل آسان اور صاف ہو گیا (دیکھیے الجایتو خان کے معرکوں کا بیان جس نے ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں گیلان پر حملہ کیا اور لاھیجان تک پہنچ گیا؛ تاریخ الجایتو، Bibl. Nat., Supp. ۱۴۱۹، ورق ۴۳ ب)۔

کچھ مدت بعد دیلم کا کوھستانی علاقہ مشرقی گیلان [بیاپیش] کے حکمران خاندان کارکیا کے کم و بیش زیر اقتدار رھا، جس کا صدر مقام لاھیجان تھا۔ اس خاندان نے آہستہ آہستہ ان کے اشکور (Ashkawar) کے "ھزار اسبی" شاھزادوں کو جو الموت کے اسمٰعیلیوں کے آخری اخلاف تھے اور دیلمان اور رودبار کے قبیلۂ کوشیج کو رفتہ رفتہ ختم کر دیا۔ ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں لاھیجان کے سید رضی نے دیلمیوں کو سفید رود کے کنارے بلا بھیجا اور ان کے دو یا تین ھزار افراد کو مع ان کے سرداروں کے قتل کروا دیا (ظہیر الدین: تاریخ گیلان، طبع Rabino، رشت ۱۳۳۰ھ؛ ص ۷۵، ۸۱، ۱۲۲ تا ۱۲۶)۔

دَیلَم کی تاریخ میں جدید ترین واقعہ اہل حق [آرک یان] کے پیشوا سید محمد کا اکتوبر ۱۸۹۱ء میں کلاردشت کے اندر شورش برپا کرنا ہے (دیکھیے Minorsky : *Notes sur la secte des Ahlé-Haqq*، پیرس ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء، ص ۱۱).

دَیلَم خاص کی آبادی کی بابت کوئی مکمل تحقیق نہیں کی گئی H. Rabino (*Le Guilan*، ص ۲۸۰) بیان کرتا ہے کہ اصلی دیلمی (سرما میں) فقط کلاردہ اور جوسال میں ہوتے ہیں اور موسم گرما میں کلج خانی کو چلے جاتے ہیں۔ دیلمان (لاھیجان کے جنوب مغرب میں) کے باشندوں نے اپنی زمینیں بیچ دی ہیں اور اب برفجان میں بود و باش رکھتے ہیں (جس کو حدود میں دَیلَم کی نشیبی زمین کا ایک پرگنہ کہا گیا ہے).

مآخذ: متن مقالہ میں دے دیے گئے ہیں۔ (۱) تاریخ جیل و دیلم جو فخرالدولہ بویہی کے نام سے معنون ہے (جس نے G. C. Miles کے کہنے کے مطابق، رَی میں ۳۷۳ تا ۳۸۷ھ/۹۸۳ تا ۹۹۷ء حکومت کی) اور جس سے الجوینی نے ۲ : ۲۸۰ کام لیا، اس وقت ناپید ہے۔ جستانیوں کے سکے ابھی تک ہاتھ نہیں لگے ہیں؛ (۲) Marquart : ایرانشہر، ص ۱۲۶ تا ۱۲۷؛ (۳) H. L. Rabino : *Les provinces Caspiennes*، در *RMM*، ج ۳۲، ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء، ص ۲۲۷ تا ۲۸۳ (دیلمان، لاھیجان، رانِ کوہ)؛ (۴) R. Vasmer : *Zur Chronologie d. Gastaniden*، در *Isl.*، ج ۱۶، ۱۹۲۷ء، ص ۱۶۵ تا ۱۸۶ اور ۳۸۳ تا ۳۸۵؛ (۵) اے کسروی A. Kasrawi : پادشاہان گمنام، ۱۹۲۸ء، ۱ : ۲۳ تا ۷۳ (جستانیان) ایک بیش قیمت تصنیف؛ (۶) V. Minorsky : *La domination des Dailamites*، Soc. des Études Iraniennes، عدد ۳، ۱۹۳۲ء، ص ۱ تا ۲۱؛ (۷) محمد قزوینی، تعلیقات برالجوینی، ۳ : ۳۰۶ تا ۳۰۹ (علویوں)، ۳۳۲ تا ۳۵۳ (جستانیوں)؛ (۸) *IA*، بذیل مادّۂ دیلم (A. Ates).

(V. MINORSKY)

* **دیمتوقہ**: جسے دیمتوقہ یا دمتکہ بھی کہتے ہیں، سابقہ ترکی حکومت کے صوبۂ روم ایلی کا ایک شہر۔ دیمتوقہ مغربی تھریس Thrace میں دریائے مریچ (Maritsa) کی ایک بغلی وادی میں واقع ہے اور بعض اوقات تاریخ آل عثمان میں اسے بڑی ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے.

مآخذ: متن کی مندرجہ کتابوں کے علاوہ دیکھیے (۱) سالنامۂ ادرنہ، طبع ہژدہم ۱۳۰۹ھ، ص ۲۰۳ تا ۲۰۹؛ طبع بست و ھشتم ۱۳۱۹/۱۹۰۱ء، ص ۹۹۶ ببعد؛ (۲) سامی بک فرشہری (Frashëri) : قاموس الاعلام، ج ۳، قسطنطینیہ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء، ص ۲۲۱۶ ببعد؛ (۳) Ami Boue : *Recueil d'itineraires dans la Turquie d'Europe*، ج ۱، وی انا ۱۸۵۴ء، ص ۱۰۲ ببعد۔ یورپی سیاحوں نے دیمتوقہ اور اس کے نواح کو مشکل ہی سے سیاحت کے قابل سمجھا ہے اور اس کے بارے میں کوئی بیان قلمبند نہیں کیا؛ [(۴) وو، لائڈن، بار دوم بذیل مادّہ].

(F. BABINGER)

* **ڈیموکرٹ پارٹی**: ترکوں کی سیاسی جماعت، جس کا ۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو سرکاری طور پر اندراج عمل میں آیا۔ اسی سال جولائی میں جو عام انتخابات ہوے، ان میں اس جماعت نے ۴۶۵ نشستوں کے لیے ۲۷۳ امیدوار کھڑے کیے، ان میں سے ۶۱ منتخب ہوے اور یہ حزب اختلاف کا سب سے بڑا گروہ بن گئے۔ اس جماعت کی پہلی مجلس (= کانگرس) ۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوئی، اس میں باقاعدہ طور پر جماعت کے لیے ایک لائحۂ عمل اور منشور منظور کیا گیا۔ کئی اندرونی اختلافات کی وجہ سے خصوصاً نمائندگان کے اس گروہ کے علحدہ ہو جانے سے، جس نے جولائی ۱۹۴۸ء میں نیشنل پارٹی (= "ملت پارتیسی") کی تشکیل کی تھی، مجلس ملی میں ڈیموکرٹ پارٹی کے اراکین کی تعداد ۱۹۵۰ء میں ۲۱ رہ گئی۔ تاہم اس کا اثر ملک میں بڑھتا رہا اور مئی ۱۹۵۰ء کے

عام انتخابات میں وہ واضح اکثریت سے جیت گئی۔ ب ڈیموکرٹ پارٹی نے ملک کی حکومت سنبھالی اور اگلے دس سال تک اسے اقتدار حاصل رہا۔ کئی بار کابینہ بنی، جلال بایار اور عدنان مِندریس بالترتیب صدر اور وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۴ء کے عام انتخابات میں ڈیموکرٹ پارٹی مزید بھاری اکثریت سے جیت گئی، لیکن ۱۹۵۷ء کے انتخابات عوام کی اکثریت نے اس کی تائید کی، لیکن پارلیمنٹ میں اسے واضح اکثریت محض اس بنا پر حاصل ہو سکی کہ حزب اختلاف کئی گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ روز افزوں بے اطمینانی کے ایک دور کے بعد ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کے انقلاب (دیکھیے ترکیہ، تاریخ) نے ڈیموکرٹ پارٹی کو اقتدار سے محروم دخل کر دیا۔ ۲۹ مئی ۱۹۶۰ء میں یہ پارٹی ہی باقاعدہ طور پر ختم کر دی گئی۔

مآخذ: (۱) K. H. Karpat: *Turkey's politics, the transition to a multi-party system*، پرنسٹن ۱۹۵۹ء، ص ۴۰۸ تا ۴۳۱ اور بمواضع کثیرہ؛ (۲) Tarik Z. Tunaya: *Türkiyede Siyasi Partiler*، استانبول ۱۹۵۲ء، ص ۶۳۶ تا ۶۹۲؛ (۳) B. Lewis: *Democracy in Turkey*، در *MEA*، ج ۱۰، ۱۹۵۹ء، ص ۵۵ تا ۶۲؛ (۴) G. Lewis: *Turkey: the end of the first Republic*، در *World Today*، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۳۷۷ تا ۳۸۶؛ حالات پر تبصرہ در *COC*، *MEA*، *MEJ*، *OM*۔

[ادارہ [و لائڈن]

⊛ **دَین:** لغت میں عَین کی ضد کو کہتے ہیں۔ عَین کے معنی ہیں بعینہٖ وہی چیز۔ چنانچہ عرب ہر اس چیز کو دَین کہتے تھے جو خرید و فروخت کے وقت بعینہٖ سامنے موجود نہ ہو، اس کے برعکس جو چیز بوقت بیع و شری سامنے موجود ہو، اسے عَین کہتے ہیں۔ دَین کی جمع اَدیُن اور دُیُون آتی ہے جس طرح عَین کی جمع اَعیُن اور عُیُون آتی ہے (دیکھیے احکام القرآن لابن العربی ۱: ۲۴۷؛ لسان العرب، زیر مادۂ دَانَ اور عَانَ؛ مفردات القرآن، ۱: ۲۶؛ النہایۃ، ۱: ۲۳۴ ببعد)۔ شرعی نقطۂ نظر سے دَین ہر وہ چیز ہے جو کوئی عَقد (سودا) طے پانے یا کسی خاص فعل کا ارتکاب کرنے کے باعث کسی شخص کے ذمے لازم اور واجب الادا ہوتی ہے۔ عقد کی مثال یہ ہے کہ جیسے عَقدِ نکاح کے بعد مہر کی رقم شوہر کے ذمے واجب ہو جاتی ہے، جب تک یہ ادا نہ ہو اس وقت تک یہ شوہر کے ذمے دین کی حیثیت سے واجب الادا رہتی ہے؛ یا عقد (سودے) کی ایک مثال یہ ہے کہ جیسے خریدار یا مشتری کے ذمے کی چیز کی قیمت واجب الادا ہوتی ہے اور جب تک ادا نہیں ہوتی خریدار کے ذمے دَین کی حیثیت سے واجب رہتی ہے۔ جو دَین کسی خاص فعل کے ارتکاب سے واجب ہوتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا مال قبضے میں کرلے اور پھر اسے تلف کر دے تو اس صورت میں بھی جو چیز تلف کنندہ کے ذمے واجب ہوگی وہ بھی دَین کے ضمن میں آتی ہے (احکام القرآن لابن العربی، ۱: ۲۴۷؛ دستور العلماء، ۲: ۱۱۸ تا ۱۱۹)۔ تھانوی (کشاف، ۱: ۵۰۲) نے دَین کی تعریف کے ضمن میں لکھا ہے کہ شرعاً دَین سے مراد وہ مال ہے جو عقد (سودا کرنا)، استہلاک (خرچ کرنا، تلف کرنا) اور استقراض (قرض مانگنا) کے باعث کسی شخص پر واجب ہوتا ہے؛ اس کے نزدیک حقیقت میں دَین صرف ان تین اسباب کے باعث واجب ہوتا ہے، لیکن مجازاً اس ذمے داری کو بھی دین سے تعبیر کرتے ہیں جس سے عہدہ برآ ہونا مال کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔

دَین اور قرض میں معمولی سا فرق ہے، قرض خاص ہے، صرف نُقُود (درہم، دینار، روپیہ) لینے کے لیے بولا جاتا ہے لیکن دَین عام ہے۔ عبدالنبی احمد نگری (دستور العلماء، ۲: ۱۱۸ ببعد) نے لکھا ہے کہ فقہائے اسلام کے ہاں متعارف یہ ہے کہ دین عام ہے اور قرض خاص،

گویا قرض پر دَین کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن ہر دَین کو قرض سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مرغینانی (ہدایہ اخیرین، ص ۳۹ ببعد) اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی (التفسیر المظہری، ۱ : ۳۱۳ ببعد) کی رائے یہ ہے کہ دین "بیع السلم" ہی کی ایک شکل ہے جو صرف ان اشیا میں جائز ہے جن کی مقدار اور وزن معلوم و مقرر ہو اور ساتھ ہی مدت (اَجَل) بھی متعین ہو۔ دَین یا بیع السلم میں صاحبِ حق قبل از وقت مطالبہ نہیں کر سکتا اور جس کے ذمے حق واجب ہو، وہ وقت آ جانے کے بعد ٹال نہیں سکتا۔ اس کے برعکس قرض میں سہولت اور ڈھیل ہو سکتی ہے اور اس میں وہ التزام نہیں جو دَین میں ہوتا ہے کیونکہ قرضہ تو ایک ایسی مستعار چیز ہے جو بعینہٖ واپس ہوگی [مقابلے کے لیے رک بہ ربوا].

ادائی اور عدم ادائی کے لحاظ سے دَین کی دو قسمیں ہیں: اوّل دَین صحیح اور اس سے مراد وہ دَین ہے جو واجب الادا ثابت ہونے کے بعد صرف ادا کر دینے یا بری الذمہ قرار دے دینے (بِالْاَدَاء اَوِ الْاِبْرَاء) سے ہی ساقط ہو سکتا ہے، جیسے دَین القرض (قرضہ لینے کی صورت میں جو دَین واجب ہوتا ہے)، دَین المَہر (مہر کی صورت میں شوہر کے ذمے جو دین واجب ہوتا ہے) اور دَینِ الْاِسْتِہْلَاک (کسی کی چیز تلف یا خرچ کرنے پر جو دَین واجب ہوتا ہے)۔ دَین کی دوسری قسم غیر صحیح ہے اور اس سے مراد وہ دَین ہے جو اداء اور اِبراء (بری الذمہ قرار دینا) کے بغیر بھی ساقط ہو سکتا ہے جیسے بَدَلُ الکِتَابَۃ (یعنی وہ معاوضہ جو کسی غلام یا عبد مکاتب نے اپنے آقا کو اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر ادا کرنا ہوتا ہے)۔ یہ دین اس صورت میں بھی ساقط ہو سکتا ہے جب غلام قانونی طور پر معاوضہ ادا کرنے سے عاجز قرار پائے (کشاف، ۱ : ۶۷، ۲ ۱۷۲، ۳ ، ۵۰)۔ وجوب ادا اور عدم وجوب ادا کے لحاظ سے دَین کی دو قسمیں ہیں: اول دَین حال یا مُعَجَّل جو دائن (دَین دینے والے) کے طلب کرنے پر ادا کرنا واجب ہوتا ہے؛ دوسرا دین مؤجل جس کی ادائی وقت آنے (حُلُولِ اَجَل) سے قبل واجب الادا نہیں ہوتی لیکن قبل از وقت ادا کر دینا صحیح ہے اور ذمّے داری پوری ہو جاتی ہے (حوالۂ سابق)۔

اس بارے میں فقہاے اسلام میں اختلاف رائے موجود ہے کہ دَین کا معاملہ کرتے وقت دستاویز مرتب کرنا واجب ہے یا مستحب؟ بعض علما کے نزدیک آیت دَین (۲ [البقرۃ] : ۲۸۲) میں امر کا صیغہ (فاکتبوہ: دین کو ضبط تحریر میں لاؤ) ہے، جس سے وجوب ثابت ہوتا ہے، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ دین کا ضبط تحریر میں لانا مستحبات میں سے ہے کیونکہ آگے چل کر اسی آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا، یعنی اگر تمہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو پھر تمہیں صاحب امانت کو دَین ادا کر دینا چاہیے، اَحناف کا یہی مسلک ہے۔ زیادہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ اگر خیانت کا خطرہ ہو تو دستاویز اور گواہ ضروری ہیں اور اگر اس کا خطرہ نہ ہو تو مستحب ہے کیونکہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری نے جن تین اشخاص کی دعا نہ قبول ہونے کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس نے دین پر گواہ نہ بنائے ہوں (جصّاص: احکام القرآن، ۱ : ۴۸۲)۔ مالکی، شافعی اور حنبلی فقہا کی اکثریت اس بات پر زور دیتی ہے کہ معاملۂ دین کی دستاویز ضبط تحریر میں لانا واجب ہے کیونکہ معاملۂ دین اور حُلُول اَجَل (وقت پورا ہونے) کی مدت کے درمیان انسان پر کئی قسم کے عَوارض طاری ہو سکتے ہیں (جیسے موت، غفلت، نسیان بلکہ نفس شیطانی انکار پر بھی ابھار سکتا ہے) جو ادائے دین میں رکاوٹ کا باعث بنیں گے۔ کتابت دَین کی دستاویز جامع و مانع اور ایسی واضح ہونی چاہیے کہ اگر معاملہ عدالت میں لے جانا پڑے تو اس کے مطابق صحیح فیصلہ کرنا

ممکن ہو (کتاب الام، ۸ : ۱۰۳ ببعد)۔ اگر کوئی شخص دین ادا نہ کرے تو اس کی جائداد فروخت کرکے ادا ہوگا اور اگر جائداد نہ ہو تو حاکم اسے قید کر سکتا ہے (مختصر المزنی، ۲ : ۲۲۲؛ کتاب الام، ۸ : ۱۰۳)۔

مدیون (جس کے ذمہ دَین ہو) کی وفات کی صورت میں امام شافعیؒ کے نزدیک تجہیز و تکفین کے اخراجات کے بعد جو ترکہ بچے، اس میں سے سب سے پہلے دَین ادا ہوگا، اس کے بعد زکوٰۃ، پھر فریضۂ حج کے اخراجات نکالے جائیں گے اور پھر جو مال بچے گا وہ وارثوں میں تقسیم ہوگا، لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ترکہ وارثوں کا حق ہے لیکن اگر مرنے والا دین، زکوٰۃ یا حج کے بارے میں وصیت کر گیا ہو تو پھر پہلے یہ واجبات ادا ہوں گے اور باقی وارثوں میں تقسیم ہوگا (احکام القرآن لابن العربی، ۱ : ۳۳۳؛ مختصر المزنی، ۲ : ۲۲۲؛ کتاب الام، ۸ : ۱۰۳؛ الشریفیة، ص ۸۵ ببعد)۔

مآخذ : (ابن منظور: لسان العرب زیر مادّہ دان، عان؛ (۲) ابن الاثیر: ال ، قاھرہ ۱۳۰۶ھ؛ (۳) راغب: مفردات القرآن، قاھرہ ۱۳۰۶ھ؛ (۴) عبدالنبی احمد نگری: دستور العلماء، حیدر آباد دکن، ۱۳۲۹ھ؛ (۵) تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ ۱۸۶۲ء؛ (۶) ابوبکر الجصّاص: احکام القرآن، قاھرہ، ۱۳۳۵ھ؛ (۷) ابن العربی: احکام القرآن، قاھرہ، ۱۹۵۷ء؛ (۸) امام شافعی: کتاب الام، قاھرہ ۱۹۶۱ء؛ (۹) ثناء اللہ پانی پتی: التفسیر المظھری، حیدر آباد دکن، بلا تاریخ؛ (۱۰) المرغینانی: ھدایة الاخیرین، لکھنؤ ۱۳۱۴ھ۔

(ظھور احمد اظھر)

* **دِین** : رک بہ اسلام۔

* **دین الٰہی** : [یا دین الٰہی اکبر شاھی]، جسے ھندوستان کے مغل شہنشاہ اکبر نے ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں جاری کیا۔ اخلاقی اعتبار سے [بظاھر] دین الٰہی میں نفس پرستی، غبن، فریب، غیبت، جبر، تعدّی، تخویف اور تکبر کی ممانعت تھی۔ ان میں جین مت کے عقیدۂ اھنسا اور کیتھولک عیسائیوں کی تجرّد پسندی کا اضافہ کیا گیا۔ دین الٰہی میں جن دس فضائل کی تاکید کی جاتی تھی، ان میں سے نو غالباً براہ راست قرآن مجید سے ماخوذ تھے: کشادہ نظری، اعمال بد سے اجتناب اور غیظ کو حلم سے دبانا، تشدّد آمیز مادّی مشاغل سے پرھیز، پرھیزگاری، تقوٰی، زھد، احتیاط، نرمی، شفقت؛ دسویں فضیلت یہ تھی کہ صوفیہ کے طریق پر آرزوے الٰہی کے ذریعے تزکیۂ نفس کیا جائے۔ مذھبی رسوم کے اعتبار سے اسے ایک طرح کی "شمسی توحید" کہا جا سکتا ہے، جس میں نور، شمس اور نار پر مبالغے کی حد تک زور دیا جاتا تھا؛ اس سے اولاً زرتشتی، ثانیاً ھندوانہ اور صوفیانہ اثرات کا پتا چلتا ہے۔

دور اکبری پر راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تنقید کا ھدف زیادہ تر یہ بات تھی کہ شہنشاہ کو بالواسطہ طور پر نبی بلکہ خدا کا درجہ دے دیا گیا تھا، چنانچہ اس کے تمام مرید آپس میں ملتے وقت "اللہ اکبر" اور "جلّ جلالہ" کہہ کر سلام کرتے تھے۔ یہ کلمات اگرچہ صوفیانہ ذکر کے اکثر اوراد میں آتے ھیں، تاھم ان میں اکبر کے نام کی طرف ایک خوشامدانہ اشارہ بھی پایا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر اپنے مذھب میں شامل ھونے والوں کو یہ کہہ کر باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ "خود ھدایت پانے سے پہلے میں کسی کو ھدایت کیسے دے سکتا ھوں"؟ اس کے مریدوں کی تعداد انیس سے آگے نہیں بڑھی۔ معلوم ھوتا ہے کہ اکبر دینِ الٰہی کو ایک روحانی کلب Club تصور کرتا تھا، جو ان منتخب درباریوں تک محدود تھی جن کی وفاداری نے اس کی حوصلہ افزائیوں سے شہ پاکر ایک مخفی اور غیر شرعی شخصیت پرستی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دین الٰہی میں نہ تو

کسی الہامی کتاب کے نازل ہونے کا دعوٰی کیا گیا، نہ اس سے مذہبی پیشواؤں کے کسی سلسلے کا آغاز ہوا۔ عبداللہ خان ازبک [رک بآں] کے ساتھ سیاسی خط و کتابت کے دوران میں اکبر کی حمایت میں کہا گیا ہے کہ اس کا مذہبی عقیدہ دراصل عقلیت پر مبنی ہے اور اکبر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلام کی تصدیق کرتا ہے اور اس امر کی تردید کی گئی ہے کہ اس نے نبی یا خدا ہونے کا دعوٰی کیا۔ دوسری طرف ابوالفضل نے اکبر کا ایک اعتراف بھی نقل کیا ہے جس کی رو سے اکبر نے کم از کم مجازاً اورکنایۃً ترک اسلام کا اقرار کیا تھا۔

اگرچہ انتخاب عقائد میں دین الٰہی دیگر ادیان سے متأثر ہے، لیکن اس کے بنیادی ارکان شرعی اور غیر شرعی تصوف کے مختلف سلسلوں سے لیے گئے ہیں۔ اس دین میں روشنی کا جو بار بار ذکر آتا ہے، وہ اس نظریۂ نور کی مبالغہ آمیز صورت ہے جس پر سلسلۂ سہروردیہ میں بہت زور دیا جاتا تھا۔ اکبر کی ذات کی پرستش کا سرچشمہ "انسان کامل" کے بارے میں ابن العربی [رک بہ ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ و رک بہ انسان کامل] اور الجیلی کے نظریات میں۔ سلام کرتے وقت شہنشاہ کے نام کا استعمال دراصل صوفیہ کے ایک مقبول کلمۂ ذکر کی غیر شرعی صورت تھی۔ مرید کی بیعت لیتے وقت جو رسوم ادا کی جاتی تھیں، وہ چشتیہ طریقے پر مبنی تھیں [دیکھیے آئندہ سطور]۔

سورج اور آگ سے متعلق مذہبی رسوم کے بعض آداب، بالخصوص ایک زمانے میں اکبر کا سنسکرت میں سورج کے ایک ہزار نام جپنا، ہندو مذہب کے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں؛ لیکن یہاں یہ امر قابل غور ہے، کہ ٹھیٹھ ہندو دھرم یا بھگتی تحریک سے بہت کم باتیں اخذ کی گئیں۔ دین الٰہی کو صرف ایک ہندو راجا بیربل نے قبول کیا تھا، مگر بھگوان داس اور مان سنگھ جیسے اکبر کے معتمد منصب دار اس کے مخالف تھے۔

[دین الٰہی کی تشکیل میں جو محرکات کارفرما تھے ان میں ملکی مصالح کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے۔ اکبر ہندوستان میں ایک عظیم الشان اور مستحکم سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا، لیکن علماء، بالخصوص مخدوم الملک اور صدرالصدور اس قدر با اثر اور مقتدر ہو چکے تھے کہ ملک کے جملہ فوجداری اور دیوانی معاملات ان کی رائے کے مطابق طے پاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے منصب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنی من مانی بھی کرنے لگے تھے اور انھوں نے نہ صرف جلب زر و منفعت کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا، بلکہ حسب ضرورت فقہی مسائل میں بھی رد و بدل کرنا شروع کر دیا تھا، تاہم ان کے یہ نقائص اور کمزوریاں ضمنی اور ثانوی حیثیت کی تھیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ بادشاہ مختار بالذات ہے یا علما کے فتووں کا پابند؟ ایک اعتبار سے یہ ارباب شرع اور حکومت کی کشمکش بھی تھی، جس میں بالآخر حکومت کا پلہ بھاری رہا۔ عبداللہ خان ازبک کے نام اکبر کے مذکورۂ بالا خط میں علما کی مخالفت کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے: "می خواھند کہ در فرمانروائی و کارگزاری شریک بادشاہی باشند" (دیکھیے رودکونر، ص ۹۴، ۹۵)۔

پھر یہ بھی ملکی مصالح کا تقاضا تھا کہ (۱) سُنّی افغانوں کے مقابلے میں، جن کے ہاتھوں ہمایوں کو ملک بدر اور جن کے ساتھ اکبر کو اپنے ابتدائے عہد میں قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑا تھا، شیعی ایرانیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، جن کی مدد سے ہندوستان میں مغلیہ حکومت دوبارہ قائم ہو سکی تھی۔ برصغیر میں مروجہ فقہ اسلامی سے اکبر نے شروع شروع میں جو روگردانی کی، اس کا ایک باعث یہ اثرات بھی قرار دیے جا سکتے ہیں؛ (۲) ملک کی اکثریت اسے ایک

غیر ملکی فاتح نہیں، بلکہ اپنی ہی برادری کا فرد سمجھے۔ جزیے کی معافی، یاتریوں کے محاصل کی موقوفی، راجپوت راجاؤں کے ساتھ رشتے ناتے اور ان کا اعلیٰ ترین مناصب پر تقرر، یہ سب اسی لیے تھا کہ ہندوؤں کی دلداری کی جائے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے حکومت کے وفادار بن جائیں۔ بد قسمتی سے اس کی یہ حکمت عملی صرف دنیوی امور تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے مذہبی امور و عقائد کو بھی متاثر کر گئی۔

ابتدا میں اکبر ایک سیدھا سادہ خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ وہ علما، مشائخ اور صوفیہ کا بے حد احترام کرتا تھا اور علمی و مذہبی حقائق کا جویا رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے شیخ سلیم چشتیؒ کی خانقاہ کے قریب ایک عظیم الشان "عبادت خانہ" تعمیر کرایا، جس میں مسلمانوں کے تمام فرقوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے علما اور پیشوا بھی جمع ہوتے اور بادشاہ کے سامنے مختلف مسائل پر آزادانہ بحث و تمحیص کرتے۔ وہ کچھ ایسا پڑھا لکھا نہ تھا کہ ذاتی طور پر کسی کتاب کا مطالعہ یا کسی امر کی تحقیق کرنے پر قادر ہوتا، البتہ جو سنتا اسے دماغ میں بٹھا لیتا۔ ان مجالس میں اسے محسوس ہوا کہ علما ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کج بحثی اور بہتان طرازی پر اتر آتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایک نے کسی بات کو حرام قرار دیا تو دوسرے نے اسے حلال ٹھیرا دیا۔ مختلف فرقوں اور مذاہب کے نظریات سنتے سنتے اکبر کے اعتقادات میں پہلے ہی سے لغزش پیدا ہو چلی تھی، علما کے اس رویے نے اسے صرف انہیں سے نہیں بلکہ اس مذہب سے بھی بد گمان کر دیا جس کی نمائندگی کے وہ مدعی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسی زمانے میں شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں، فیضی اور ابوالفضل، کو بادشاہ کا تقرب حاصل ہو گیا۔ وہ اپنی "آزاد خیالی" کے باعث علما کے ہاتھوں بہت تکلیفیں جھیل چکے تھے، اب ان کا زور توڑنے کے لیے انہوں نے ایک محضر تیار کیا، جس کی رو سے اکبر کو سلطان عادل قرار دیتے ہوئے اسے مختلف فیہ دینی مسائل میں اجتہاد کے وسیع اختیارات دے دیے اور اس پر اکثر علما کے دستخط بھی ثبت کرا لیے۔ اگرچہ محضر میں اس کی تصریح موجود تھی کہ بادشاہ ان اختیارات سے صرف ایسے امور میں کام لے گا جو نص کے خلاف نہ ہوں اور عوام کی بہبود کا باعث ہوں، تاہم ایک ایسے دور میں جبکہ مہدویت، اور بھگتی تحریک کی مقبولیت اور آزاد صوفیانہ طریقوں کی ترویج سے ملک میں ایک روحانی انتشار رونما ہو چکا تھا اور دربار میں ظل الٰہی کے ہر ارشاد کی از روے کتاب و سنت تاویلات پیش کرنے والے بھی موجود تھے تو نص شرعی کے سراسر خلاف بدعات کا رواج پانا باعث حیرت نہیں ہونا چاہیے! بقول شیخ احمد سرہندی: "ہر فتورے کہ دریں زمان در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ از شومی علماے سوء است" (بحوالہ ابوالکلام آزاد: تذکرہ، ص ۲۱)۔

عبادت خانے کی مجالس اور ابوالفضل جیسے ندیموں کی بدولت اکبر کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ سچائی کسی ایک مذہب کا اجارہ نہیں، بلکہ ہر مذہب میں اچھی اچھی باتیں موجود ہیں اور اس معاملے میں اسلام کو کوئی برتری نہیں دی جا سکتی۔ اس رجحان کو دیکھ کر ہندو پنڈتوں اور مسیحی پادریوں کو اسلام، شارع اسلام اور شعائر اسلام کے خلاف زبان درازی کا موقع مل گیا۔ ان مجالس کی ابتدا تو بے لاگ تحقیقات سے ہوئی تھی اور بادشاہ کی کوشش یہ تھی کہ ہر مذہب کے عقائد و شعائر معلوم کیے جائیں، لیکن کچھ تو مخالف مولویوں کی ضد میں، کچھ اپنی ہندو رانیوں کی دلدہی اور راجپوت راجاؤں کی تالیف قلوب اور کچھ ابوالفضل جیسے مشیروں کے زیر اثر نوبت یہاں تک پہنچی کہ بقول بداؤنی ارکان دین اور اسلامی عقائد کے متعلق پہلے تو شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا، پھر نماز، روزہ اور ان سب باتوں کو جن کا تعلق نبوت

سے ہے، تقلیدات کا نام دے دیا گیا۔ اس سلسلے میں ابوالفضل: آئین اکبری، باب آئین رہنمونی میں بھی بعض واضح اشارات ملتے ہیں۔ اکبر شروع شروع میں سنّیوں کی ضد میں شیعوں اور ایسے صوفیوں کی طرف مائل ہوا تھا جو عقائد میں نسبۃً آزاد اور بے باک تھے، لیکن جب تعریض کی نوبت ائمۂ اربعہ سے گزر کر ائمہ اثنا عشر اور انبیا تک پہنچی تو یہ بھی پیچھے ہٹ گئے اور انہیں بھی تقلید کا ملزم ٹھہرا دیا گیا۔ یہی حال پارسی موبدوں اور پرتگیز پادریوں کا ہوا، جنھیں ایک زمانے میں یہ خیال ہو چلا تھا کہ اکبر ان کا مذہب قبول کر لے گا۔ در اصل بادشاہ اور اس کے مشیر ہر مذہب کو اپنے علم و عقل کی کسوٹی پر کستے تھے اور جو چیز ان کی سمجھ میں نہ آتی (جیسے حشر و نشر، وحی و رسالت وغیرہ) اسے بے تکلف رد کر دیتے چونکہ تحقیق کرنے والا ایک مطلق العنان بادشاہ تھا، اس لیے اکثر لوگ اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر ریا کاری سے اور بادشاہ کے میلان کے مطابق سخن سازی سے کام لیتے۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ہندوؤں کے دل جیتنے کے لیے اکبر تمام حدود سے تجاوز کر گیا تھا اور اس نے ایسی رسوم اختیار اور رائج کیں جو سراسر ہندوانہ تھیں اور شریعت کے منافی، مثلاً ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت، جھروکہ درشن، داڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قشقہ لگانا، اور ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر ان کی مذہبی رسموں میں حصہ لینا۔ اسے خواہ سیاسی مصلحت بینی ہی سے تعبیر کیوں نہ کیا جائے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس حکمت عملی کے نتائج و عواقب برصغیر میں اسلام اور پیروان اسلام کے لیے سخت مہلک ثابت ہوئے۔ دربار کی اس روش سے ملک میں بے چینی پھیلنا ایک قدرتی امر تھا، چنانچہ ملا محمد یزدی نے فتوی دے دیا کہ بادشاہ بد مذہب ہو گیا ہے اور اس کے خلاف جہاد واجب ہے۔ قطب الدین کوکہ اور شہباز خان کنبوہ جیسے امرا نے جرأت سے کام لے کر اکبر کو سمجھانے کی کوشش کی اور مرزا حکیم نے علم بغاوت بلند کیا، لیکن بادشاہ پر کوئی اثر نہ ہوا اور یکے بعد دیگرے تمام مخالفین ترغیب و تخویف یا تشدد کا نشانہ بن گئے۔ ادھر حاشیہ نشینوں نے یہ بات اڑا دی کہ بعثت نبوی پر ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد اسلامی شریعت کی عمر پوری ہو چکی ہے، لہٰذا ایک نئے دین اور ایک نئے شارع کی ضرورت ہے اور اس منصب کے لیے اکبر ہی سزاوار ہے۔ اس کی تصدیق میں طرح طرح کی جھوٹی سچی پیشگوئیاں، اقوال اور اشعار پیش کیے گئے اور بالآخر دین الٰہی اکبر شاہی کا اعلان کر دیا گیا۔

جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے تھے انہیں بیعت کرتے وقت کلمۂ "لا الٰہ الا اللہ۔ اکبر خلیفۃ اللہ" کے ساتھ دین اسلام مجازی و تقلیدی (یعنی جو باپ دادا سے دیکھا سنا تھا) سے علیحدگی اور اخلاص چہارگانہ (یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس، ترک دین) کا اقرار کرنا پڑتا تھا۔ ان مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں چیلہ کہا جاتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے انہیں زنار یا انگشتری "جس پر اسم اعظم و نقش اللہ اکبر کندہ ہوتا تھا" (آئین اکبری) اور بطور شجرہ بادشاہ کی تصویر عطا ہوتی تھی، جسے وہ مرصع غلاف میں رکھ کر دستار میں لگاتے تھے (منتخب التواریخ) اس دین کے عقائد و عبادات کے بیان میں ابوالفضل نے انتہائی ابہام اور اجمال سے کام لیا ہے، البتہ بداؤنی کے ہاں بڑی تفصیل ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ نے علی الاعلان اسلام کی مخالفت شروع کر دی: وہ قرآن کا منکر ہو گیا اور وحی، حیات بعدالموت اور یوم جزا کا انکار کرنے لگا: اس کے برعکس وہ آفتاب پرستی اور مسئلۂ تناسخ کا قائل ہو گیا: علاوہ ازیں سجدۂ تعظیمی پر زور دیا گیا: شراب حلال کی گئی: سور کا گوشت شراب کا جزو بن گیا: جزیہ موقوف کر

دیا گیا؛ سود اور جوئے کی حلّت کا اعلان ہوا؛ صوم و صلٰوۃ اور حج منسوخ کر دیے گئے؛ دیوان حکومت میں اذان اور نماز باجماعت موقوف ہوگئی؛ عربی کے مطالعے کو بہ نظر تحقیر دیکھا جانے لگا اور فقہ و تفسیر و حدیث کے بجائے نجوم و طب اور حساب و فلسفہ کی تعلیم رائج کی گئی؛ تقویم اسلامی کے بجائے الٰہی ماہ و سال رائج کیے گئے؛ "صلح کل" کی آڑ میں ہندوؤں کو اجازت مل گئی کہ وہ رمضان میں علی الاعلان کھائیں پئیں، لیکن جب ہندو برت رکھیں تو مسلمان علانیہ کھانے پینے سے باز رہیں؛ بعض مقامات پر عیدالاضحٰی کے موقع پر گائے ذبح کرنے کی پاداش میں مسلمانوں کی جان لی گئی؛ بعض مقامات پر ہندوؤں نے مساجد کو منہدم کرکے مندر بنا لیے، وغیرہ وغیرہ۔ بعض مؤرخین کی رائے میں بداؤنی کے یہ بیانات اکبر اور ابوالفضل سے اس کی ذاتی مخالفت پر مبنی ہیں اور اس مخالفت سے کسی صورت انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بایں ہمہ عہد جہانگیری کے ابتدائی ایام میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے، جن کے ہاتھوں سر زمین ہند میں شریعت اسلامی کا احیا عمل میں آیا، شیخ فرید بخاری کے نام اپنے مکتوب میں دور اکبری پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ بداؤنی کا بیان صداقت سے سراسر خالی بھی نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "گزشتہ زمانے میں کافر غالب ہو کر دارالاسلام میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے عاجز و مجبور تھے اور اگر کرتے تو قتل کیے جاتے۔ ہائے افسوس! حق تعالٰی کے محبوب نبی کریمؐ کی تصدیق کرنے والے ذلیل تھے اور ان کے منکر معزز تھے۔ مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کا ماتم کرتے تو دشمن تمسخر کر کے ان کے زخموں پر نمک پاشی کرتے۔ ہدایت کا آفتاب گمراہی کے حجاب میں مستور تھا" (مکتوبات امام ربانی، ۱ : ۴۷، نیز دیکھیے ۱ : ۸۱، ۱۹۵ و ۲: مکتوب ۲۹)].

زمانۂ حال کے محققین کے ہاں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ دین الٰہی کو اسلام سے ارتداد تصور کرنے کے بجائے دائرۂ اسلام ہی کے اندر ایک غیر شرعی فرقے کی حیثیت دی جائے [لیکن مجدد سرہندیؒ کے ملفوظات کی روشنی میں اس رائے کو قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے.

بہر حال اکبر کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مروجہ اسلام کے دائرے سے باہر آ جانے کے باوجود اس نے علی الاعلان خدا یا نبی ہونے کا دعوٰی نہیں کیا اور نہ کسی کو اپنا نیا مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ۱۰۰۱ھ میں شیخ مبارک اور ۱۰۰۴ھ میں فیضی کے انتقال کے بعد اس نو ساختہ دین کے دو بڑے ستون گر پڑے۔ ۱۰۰۷ھ میں ابوالفضل دکن کی مہمات پر بھیج دیا گیا تو دربار میں دین الٰہی کی سرگرمیاں مدھم پڑ گئیں اور بقول جہانگیر ابوالفضل کے خاتمے (۱۰۱۱ھ) کے بعد اکبر کی بد اعتقادی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور وہ ایک پکے عقیدہ مسلمان کی طرح دنیا سے خدا کے حضور میں گیا۔ اگرچہ اکبر کی وفات کے ساتھ دین الٰہی کا خاتمہ ہو گیا لیکن اس کی بدولت ملک کے اندر بے دینی اور بدعت کی جو رو چل نکلی تھی، وہ دور جہانگیری میں بھی ایک عرصے تک جاری رہی]۔ اس کے خلاف راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرف سے نہایت شدید رد عمل کا اظہار ہوا، جس کی نمائندگی نقشبندیہ تصوف میں حضرت شیخ احمد سرہندی نے اور علوم دینیہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کی.

مآخذ: (۱) ابوالفضل علامی: آئین اکبری، ج ۱ (انگریزی ترجمہ از بلوخمن)، کلکتہ ۱۹۲۷ء، ص ۵۰ تا ۵۸، ٦۴، ۱۱۰ تا ۱۱۵، ۱۵۷ تا ۱۷٦ و ج ۲ (ترجمہ از جیرٹ)، کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۳۰ و ج ۳ (ترجمہ از جیرٹ)، کلکتہ ۱۹۴۸ء، ص ۴۲٦ تا ۴۲۹؛ (۲) وہی مصنف:

مکتوبات، لکھنؤ ۱۸۸۹ء، ۳ : ۲۶؛ (۳) بداؤنی : منتخب التواریخ، کلکتہ ۱۸۶۸ - ۱۸۶۹ء، ۲ : ۲۰۰ تا ۲۰۸، ۲۵۵ تا ۲۸۷، ۳۰۱ تا ۳۲۶، ۳۳۲ تا ۳۳۹، ۳۵۶، ۳۹۱ تا ۳۹۲، ۴۰۴؛ (۴) محسن فانی : دبستان مذاہب (انگریزی ترجمہ از A. Troyer و D. Shea)، پیرس ۱۸۴۳ء، ۳ : ۴۸ تا ۱۰۵؛ (۵) عنایت خان راسخ : عنایت نامہ، مخطوطہ انڈیا آفس، عدد ۱۴۵ فارسی، ورق ۲ ب تا ۱۱ الف؛ (۶) V. A. Smith : *Akbar the Great Mogul*، آکسفرڈ ۱۹۲۷ء، ص ۲۰۹ تا ۲۲۲، ۲۶۲؛ (۷) F. W. Buckler : *A New interpretation of Akbar's "infallibility" decree of 1579*، در *JRAS*، ۱۹۲۴ء، ص ۵۹۱ تا ۶۰۸؛ (۸) سری رام شرما : *The religious policy of the Mughal Emperors*، آکسفرڈ ۱۹۴۰ء، ص ۱۸ تا ۶۸؛ (۹) مکھن لال رائے چودھری : *The Din-i-Ilahi*، کلکتہ ۱۹۴۱ء؛ (۱۰) شیخ محمد اکرام : رود کوثر، مطبوعۂ کراچی، ص ۴۷ تا ۸۲؛ (۱۱) B. Wellesz : *Akbar's religious thoughts reflected in Mogul Painting*، لندن ۱۹۵۲ء؛ (۱۲) Y. Hikmet Bayur : *L'Essai de reforme religieuse et sociale d'Ekber Gurkan*، در *Belletin*، ۲ (۱۹۳۸ء) : ۱۲۷ تا ۱۸۵؛ (۱۳) عزیز احمد : *Akbar, heretique or apostat?*، در *JA*، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱ تا ۳۸؛ (۱۴) Correia Afonso : *Father Xavier and the Muslims of the Mughal Emperor*، ۱۹۵۷ء؛ نیز دیکھیے (۱۵) ابوالفضل : اکبر نامہ، ۳ جلد، کلکتہ ۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۶ء؛ (۱۶) محمد میاں : علمائے ہند کا شاندار ماضی، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۶ ببعد؛ (۱۷) سید ہاشمی فرید آبادی : تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، مطبوعۂ کراچی، ص ۴۵۶ ببعد؛ (۱۸) مجلّۂ الفرقان، بریلی، مجدد الف ثانی نمبر و شاہ ولی اللہ نمبر؛ (۱۹) محمد فرمان : حیات مجدد، لاہور ۱۹۵۸ء؛ (۲۰) محمد حسین آزاد : دربار اکبری؛ (۲۱) اسلم قریشی : دین الٰہی؛ (۲۲) حسن علی : تعلیمات مجددیہ؛ نیز دیکھیے ماخذ بذیل مادہ ہای (شیخ) احمد سرہندی، ابوالفضل، اکبر وغیرہ)۔

(عزیز احمد [و ادارہ])

دیناج پور : مشرقی پاکستان کا ایک ضلع، ⊛ آبادی (۱۹۵۱ء میں) ۱۳۵۴۴۴۲۔

۱۹۴۷ء میں یہ ضلع تقسیم ہو گیا اور اس کا جنوبی حصہ بھارت میں شامل کر دیا گیا۔

مآخذ : (۱) *Eastern Bengal District Dinajpur Gazetteer*، الٰہ آباد ۱۹۱۲ء؛ (۲) A. Cunningham : *ASI*، ج ۱۵، کلکتہ ۱۸۸۲ء؛ (۳) G.H. Damant : *Notes on Shah Isma'il Ghazi, with a sketch of the contents of a Persian Ms. Risālat ush-Shuhada*، در *JASB*، ۱۸۷۴ء؛ (۴) A. H. Dani : *The House of Rādja Ganessa of Bengal*، در *JASB*، ۱۹۵۲ء؛ (۵) وہی مصنف : *Bibliography of the Muslim inscriptions of Bengal*، ڈھاکہ ۱۹۵۷ء۔

(A. H. DANI [تلخیص از ادارہ])

دینار : (جمع دنانیر) ابتدائے اسلام میں ایک * طلائی سکے کا نام۔ یہ لفظ یونانی کلمہ δηναριον (لاطینی denarius) سے ماخوذ ہے، جو دراصل چاندی کے ایک سکے کا نام تھا، لیکن عہد قسطنطینی کے بعد کے زمانے میں یہ صولیدوس Solidus، دیناریوس اوریوس denarius aureus یا νομισμα/χρυσουν کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ عرب ظہور اسلام سے پہلے اس لفظ سے اور رومی و بوزنطی طلائی سکے سے بخوبی مانوس تھے (قرآن مجید ۳ [آل عمران] : ۷۵؛ نیز دیکھیے J. Stepková، در *Numismatický Sborník*، ۳ (۱۹۵۶ء) : ۶۵)۔

قدیم ترین عربی دینار پر کوئی تاریخ درج نہیں، لیکن اسے نواح ۷۲ھ/۶۹۱ - ۶۹۲ء سے منسوب کیا جاتا ہے اور یہ بات قریب قریب پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ دمشق میں مضروب ہوا تھا۔ یہ ہرقل اور اس کے دو بیٹوں کے

عہد کے صولدیوس Solidus کی نقل ہے، لیکن اس کی مخصوص مسیحی علامات حذف کر کے ان کے بجائے عربی زبان میں ایک مذہبی عبارت کندہ کر دی گئی ہے۔ جب عبدالملک نے سکوں کی اصلاح کی تو اس کا دینار کی شکل و صورت پر بڑا گہرا اثر پڑا؛ چنانچہ چند شاذ مستثنیات سے قطع نظر اس پر صرف عبارت باقی رہ گئی۔ شمالی افریقہ اور اندلس کے دینار (قوق) کی اپنی ایک الگ تاریخ ہے: تقریباً ۸۵ھ/۷۰۴ء سے پہلے دینار اور اس کے مکسور سکے ہرقل کے قرطاجنی صولدیوس کی نقل تھے، لیکن ان پر اسلامی عبارات کا مختصر لاطینی ترجمہ درج کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں ۹۵ھ/۷۱۳-۷۱۴ء تک شبیہیں خارج رہیں اور تاریخ ضرب بعض اوقات قسطنطینی تقویم کے مطابق لکھی جاتی رہی۔ ۹۵ھ سے ہجری تاریخیں درج ہونے لگیں اور ۹۷ھ/۷۱۵-۷۱۶ء میں دو زبانوں میں عبارات لکھی جانے لگیں اور پھر نئی صدی کے آغاز ہی سے افریقیۃ (قیروان) اور الاندلس (قرطبہ) دونوں جگہ خالص عربی نمونے کے دینار جاری ہو گئے، جو صرف معمولی جزئیات کے اعتبار سے بلاد مشرق کے اصلاح شدہ دیناروں سے مختلف تھے۔ طلائی سکوں کا ضرب ہونا الاندلس میں ۱۰۶ھ/۷۲۴-۷۲۵ء میں بند ہو گیا (۱۲۷ھ/۷۴۴-۷۴۵ء میں بے قاعدہ ضرب کیے ہوئے سکے، جو جاری بھی نہیں ہوئے، اس سلسلے میں واحد استثنا ہیں) اور ۳۱۷ھ/۹۲۹ء تک، جو عبدالرحمٰن الثالث کا عہد ہے، اس کا دوبارہ اجرا نہ ہو سکا۔

قدیم عبوری دینار کا معیاری وزن وہی تھا جو بوزنطی صولدیوس کا تھا، یعنی تقریباً ۴،۵۵ گرام۔ عبدالملک کی اصلاحات کے بعد اس کا وزن گھٹا کر ۴،۲۵ گرام کر دیا گیا۔ اس وزن کی تصدیق نہ صرف دیناروں کے اوزان سے ہوتی ہے، جو بڑی احتیاط سے محفوظ رکھے گئے ہیں، بلکہ مصری دینار اور اس کے مکسور سکوں کے شیشے کے بنے ہوئے باٹوں سے بھی، جو پہلی صدی ہجری کے آخر سے دوسری صدی ہجری کے آخر تک مروج رہے۔ دور اصلاحات کے بعد کے دیناروں کے وزن کی کمی کا باعث یہ تھا کہ مثقال (یعنی دینار) کا وزن نئے سرے سے مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب یہ ۲۰ شامی - عراقی قیراط – ۰،۱۲۵ گرام کے مساوی تھا۔ یہ مساوات ۳/۷ ۲۱ قیراط یا "کچھ کسر کم ۲۲ قیراط" ایسے بے ڈھنگے اعداد کے مقابلے میں سہل تھی جو ظہور اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں مثقال کا وزن بتانے میں استعمال ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اٹیکی درہم پر مبنی تھا، جس کا وزن نظری اعتبار سے ۴،۳۷ گرام تھا، لیکن فی الحقیقت عرب میں جو اٹیکی درہم مروج تھے، ان کا وزن اس سے کسی قدر کم تھا۔ عالم اسلام کے بیشتر حصوں میں چوتھی صدی ہجری تک اگرچہ عام طور پر دینار کا معیاری وزن برقرار رکھا گیا، تاہم بعد ازاں وزن کے لحاظ سے اور کھرے ہونے کے اعتبار سے انتہائی بے قاعدگیاں ہونے لگیں۔ بہر حال ان ادائیوں کے سوا، جو ایسے سکوں کی سربمہر تھیلیوں (صُرّة) میں ہوتی تھیں جن کے وزن اور کھرے ہونے کی ضمانت دی جاتی تھی، دینار کا لین دین گنتی کے حساب سے نہیں بلکہ وزن کے اعتبار سے ہوتا تھا۔

آدھا دینار (نصف، Semissis) اور تہائی دینار (ثلث، tremisses) شمالی افریقہ اور اندلس میں عبوری دور اور دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں مضروب ہوئے اور ان مکسور سکوں کے مساوی الوزن (۲،۱۲ اور ۱،۴۱ گرام) شیشے کے باٹ اس صدی کے تیسرے ربع تک جاری رہے۔ چوتھائی دینار (ربع) تیسری صدی ہجری کے اوائل میں شمالی افریقہ میں بنو اغلب نے جاری کیا اور بعد ازاں بنو فاطمہ نے اپنے شمالی افریقہ اور صقلیہ دونوں

ملکوں میں بکثرت رائج کیا۔ صقلیہ میں آگے چل کر یہ tarì d'oro کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی طرح اسے اندلس میں عبدالرحمن الثالث اور اس کے جانشینوں نے اور بعض ملوک الطوائف نے جاری کیا۔

جہاں تک کھرے پن کا تعلق ہے، ابتدائی دور کے دینار کا معیار بہت بلند تھا۔ دور اصلاحات کے بعد کا اموی دینار ۹۶ فی صد اور ۹۸ فی صد کے درمیان کھرا ہوتا تھا اور کم و بیش یہی معیار عہد بنی امیہ میں بھی قائم رہا۔ اس سلسلے میں جو ادوار مستثنٰی قرار دیے جا سکتے ہیں وہ الامین اور المأمون کی باہمی خانہ جنگی کے ایام، مصر میں بنی طولون کے خاتمے اور اخشیدی خاندان کی حکومت کے آغاز کا درمیانی عرصہ اور بغداد میں آل بویہ کا عہد ہے۔ ان کے مقابلے میں خلیفہ الناصر اور اس کے جانشینوں نے جو سکے اپنے نام پر دور خلافت کے آخری ایام میں بغداد میں دوبارہ ضرب کرانے شروع کیے تھے ان کے سونے میں بہت کم کھوٹ تھی، پھر بھی یہ پرانے سکوں کے معیار سے خاصے گرے ہوئے تھے۔ بنو فاطمہ کے عہد میں مصر میں ان کا معیار بڑھ کر ۹۸ فی صد ہو گیا بلکہ الآمر کے دور میں یہ ۱۰۰ فی صد کے قریب پہنچ گیا۔ صلاح الدّین کے عہد میں یہ ۹۰ فی صد سے بھی گھٹ گیا، لیکن اس کے جانشینوں خصوصاً الکامل کے عہد میں یہ دوبارہ بڑھ کر ۹۸ سے ۱۰۰ فی صد تک ہو گیا۔ ابن بعرة ۶۱۵ اور ۶۲۵ھ کے مابین لکھتا ہے: "مغرب میں یا مشرق میں کوئی دینار معیار کے لحاظ سے الآمر الکامل کے دینار سے بازی نہیں لے جا سکا"۔ بلاد مشرق میں اپنے دور انحطاط میں دینار کے کھرے پن کے بارے میں قابل اعتماد اعداد و شمار نہیں ملتے (غزنویہ، سلاجقہ، خوارزم شاہیہ وغیرہ)، لیکن اس عہد کے جو سکے محفوظ میں انہیں دیکھنے سے، نیز پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں مشرق خراسان سے متعلق جو محدود فنی معلومات دستیاب ہوتی ہیں ان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں ملاوٹ گھٹیا درجے کی دھاتوں کی ہے، جن میں چاندی کی اچھی خاصی مقدار موجود ہے۔ یہ کھوٹ ملوک الطوائف کے اندلسی سکوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ عہد مغول اور دور مابعد میں مشرق ایران اور ماوراء النہر میں چاندی اور تانبے کے دیناروں کا بھی پتا چلتا ہے (دیکھیے V. Schrötter : کتاب مذکور در مآخذ)۔

دینار کی مختلف مکسور سکوں میں تقسیم کے بارے میں رک بہ دانق، قیراط، حبّة، بذیل مادّة "سکہ"۔

ظاہری وضع کے اعتبار سے خلفا اور بیشتر خود مختار شاہی خانوادوں کے دیناروں میں بڑا معمولی اختلاف نظر آتا ہے۔ ابتدائی سکّوں پر کلمۂ شہادت اور سورۃ الاخلاص کا ایک حصہ درج کیا جاتا تھا اور مدور حاشیوں پر "مقصد نبوت" [القرآن التوبہ] : ۳۳) هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ [- اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے دین پر اور پڑے برا مانیں مشرک (۹ [التوبة] : ۳۳)] : نیز ایک عبارت جس میں تاریخ ضرب الفاظ میں لکھی جاتی تھی۔ بنو عبّاس نے عبارات اور ان کی ترتیب قدرے بدل دی۔ ۱۷۰ھ / ۷۸۶ - ۷۸۷ء تک دینار پر کسی کا نام درج نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد مہتمم دارالضرب کا نام لکھا جانے لگا۔ الامین اور المأمون کے جاری کردہ بعض سکّوں پر ان کے نام بھی موجود ہیں اور المعتصم کے زمانے سے خلیفہ کا نام باقاعدہ درج ہونے لگا۔ ۱۹۸ھ / ۸۱۳ - ۸۱۴ء تک سکّوں سے دارالضرب کا پتا نہیں چلتا، البتہ سال مذکور سے مصر (فسطاط) اور بعدازاں مدینة السلام (بغداد) صنعا، دمشق، المحمّدیّة (رَیّ)، مرو، سُرّ مَن رَأی (سامرّا) اور کئی دوسرے شہروں میں تیار ہونے والے سکّوں پر تاریخ ضرب

والی عبارت میں دارالضرب کا نام بھی درج ہونا شروع ہوگیا۔ آہستہ آہستہ کچھ اور عبارات کا بھی اضافہ ہونے لگا، مثلاً ولی عہد کا نام، ذیلی مذہبی عبارتیں اور بالآخر خود مختار شاہی خانوادوں اور فرمانرواؤں کے نام۔ اگرچہ بنو فاطمہ نے ابتدائی سکّوں کے نمونوں کو یک قلم ترک نہیں کیا تاہم وہ ان پر شیعی عبارات درج کرنے لگے۔ ان کے سکوں پر تمام عبارتیں ہم مرکز دائروں کی صورت میں لکھی جاتی تھیں۔

چھٹی صدی ہجری میں المغرب میں، ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں بلاد مشرق اور ہندوستان میں اور آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں مصر میں دینار کا لفظ متروک ہوگیا۔ دینار کے باقاعدہ رواج کے دوران میں اور اس کے بعد بھی ایک حسابی سکّے کے اعتبار سے اس کا استعمال دور دور تک جاری رہا۔

مغربی یورپ کی معاشیات پر دینار کے اثر اور ازمنۂ وسطٰی کی بین الاقوامی تجارت میں بوزنطی صولدیوس Solidus یا نومسمہ Nomisma کے ساتھ ساتھ اس کے استعمال کے بارے میں Pirenne، Monneret de Villard، Block، Lombard، Lopez، Bolin، Grierson وغیرہ نے بالخصوص سیر حاصل بحث کی ہے (ان تمام مباحث کو مآخذ کے ساتھ F.J. Himly نے *Rev. Suisse d' Histoire*، ۵۰ (۱۹۵۵ء): ۱، ۳۱ میں آسانی کی خاطر یکجا کر دیا ہے)۔ لہٰذا یہ ناگزیر تھا کہ جس طرح مختلف اوقات میں دوسرے مقبول عام مبادلے کے سکّوں (مثلاً فلورن florin، ڈوکٹ ducat وغیرہ) کی نقل ہوتی رہی تھی ان کی بھی وقتاً فوقتاً نقل ہوئی (مثلاً صلیبی بزانت اور عربی دینار صوری، جو زیادہ تر المستنصر اور الآمر کے فاطمی سکّوں کی نقل تھا)۔ مغربی بحیرۂ روم کے علاقوں میں دینار نے mancus کی صورت اختیار کی۔ یورپی کلمہ صرف عربی دینار اور اصطلاح حساب کے طور پر ہی نہیں بلکہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں ان مسیحی سکوں کے لیے جو ہسپانیہ میں دینار کی نقل میں تیار ہوئے، بطور اسم صفت بھی استعمال ہوتا ہے (دیکھیے P. Grierson : *Rev. belge de phil. et d'histoire*، ۳۲ (۱۹۵۳ء): ۱۰۵۹؛ J. Duplessy در *Rev. Numismatique*، ۱۹۵٦ء، ص ۱۰۱)۔ الفانسو ہشتم، حکمران قشتالہ، کا ابتدائی سکہ marabotino (maravedi وغیرہ) مرابطی دینار کی نقل تھا، جس پر مسیحی عبارات عربی رسم الخط میں درج تھیں۔

مختلف قسم کے دیناروں کو بیان کرنے اور ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے مختلف مآخذ میں جو اسما اور اسماے صفات ملتے ہیں، ان کی ایک فہرست Sauvaire (دیکھیے مآخذ) نے مرتب کی ہے۔ اس میں حسب ذیل کا اضافہ کر لیجیے: اتابکی (زنگی)، ٹوری (برائے ذری؟ *JAOS*، ۱۹۵۳ء، ص ۱٦۳)؛ جیشی (Dozy، تکملہ)، حاکمی (فاطمی)، حسنی (فاطمی)، الخریطۃ (مخصوص موقعوں کے لیے؛ Herzfeld : *Geschichte .... Samarra*، ص ۱۹۵)، عدد ("گنا ہوا"، *αριθμια νομισματα*، بردی papyri)، سوا (درست وزن کا، بردی)، طری (تازہ، غیر مدور، بردی)، قوامی (بویہی؛ *Ars Islamica*، ۱۹۵۱ء، ص ۲۳)، مثقالی (پورا وزن، بردی)، مدوّرۃ (فاطمی، جس پر ہم مرکز دائروں کی صورت میں عبارات درج ہیں ؟)، مسطّرۃ (فاطمی، جس پر عبارات متوازی سطور میں ہیں ؟)، مُشخّص یا مُشَخّص (جس پر شبیہیں ہیں، یعنی یورپی، *BSOAS*، ۱۹۵۳ء، ص ۷۲؛ *JESHO*، ۱۹۵۸ء، ص ۳۸)، مشرق (بردی papyri)، مظفری (شاہ ارمز؛ *JAOS*، ۱۹۵۳ء، ص ۱٦۳)، معمول ("صحیح طور پر گنا ہوا"، بردی papyri)، ماکی (زریعی؛ Zuray'id : *Num. Zeitschrift*، ج ۲۷، ۱۹۱۳ء، ص ۱۷۲)، منحت ("تراشا ہوا"، بردی)، نزاری (فاطمی)، یوسفی (موحّدی، ابن خلکان)۔

مختلف دھاتوں مثلاً نکل، تانبا وغیرہ کے سکّوں کے لیے لفظ دینار عہد حاضر میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے، مثلاً قاجاری (ناصر الدین شاہ اور اس کے جانشین اور خاندان پہلوی) عہد میں اور عراق (دینار کاغذی سکہ ہے . . . ، فلز Fils) اور یوگوسلاویہ (دینار = . . ، پیرا para) میں، لیکن ان کا قدیم عربی سکے سے کوئی تعلق نہیں۔

(نیز رک بہ مثقال، قیراط، سنہ جات اور سکّہ)۔

مآخذ: (۱) المقریزی: کتاب شذور العقود، مختلف طباعتیں بشمول Tychsen (۱۷۹۷ء)، استانبول (۱۲۹۸ء)، L.A. Mayer (۱۹۳۳ء)، A. M. de St. Elie (۱۹۳۹ء)؛ (۲) E. V. Bergmann: *Die Nominale der Münzreform der Chalifen Abdulmelik*، در *SBAk.* Wien، ۱۸۷۰ء، ص ۲۳۹؛ (۳) H. Sauvaire: *Matériaux pour servir à l'histoire de la numismatique et de la métrologie musulmanes*، (*JA* ۱۸۷۹ تا ۱۸۸۲ء)؛ اس جامع اور ضروری کتاب کا مفید خلاصہ از S. Lane-Poole در *NC*، ۱۸۸۳ء، ص ۶۶ تا ۹۶؛ (۴) R. Vasmer در F.V. Schrötter: *Wörterbuch der Münzkunde*، (برلن-لائپزگ ۱۹۳۰ء) بذیل مادۂ دینار؛ (۵) J. Walker: *A catalogue of the Arab-Byzantine and post-reform Umaiyad coins* (*Cat. of the Muhammadan coins in the British Museum*، ج ۲، لنڈن ۱۹۵۶ء)؛ (۶) A. Grohmann: *Einführung und Chrestomathie zur arabischen Papyruskunde* (*Monographie Archivu Orientálního* ۱۳/۱، پراگ ۱۹۵۵ء)؛ (۷) A. S. Ehrenkreutz کے دینار اور اس کے سونے کے معیار کے بارے میں کئی مقالات، در *JAOS*، ۱۹۵۳ء، ص ۱۶۲؛ ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۸ اور *JESHO*، ۱۹۵۹ء؛ (۸) G.C. Miles: *Some early Arab dinars*، در American Numismatic Society *Museum Notes*، ج ۳، ۱۹۴۸ء، ص ۹۳؛ (۹) وہی مصنف: *The numismatic history of Rayy* (نیویارک ۱۹۳۸ء)؛ (۱۰) وہی مصنف: *Fatimid coins* (نیویارک ۱۹۵۰ء)؛ (۱۱) وہی مصنف: *The coinage of the Umayyads of Spain* (نیویارک ۱۹۵۰ء)؛ (۱۲) عربی شیشے کے باٹوں کی کئی فہرستیں (دیکھیے مادۂ سنہ جات)؛ (۱۳) P. Grierson: *The monetary reforms of Abd al-Malik*، در *JESHO*، ۱۹۶۰ء، ص ۲۴۱؛ (۱۴) کاغذی سکّوں کی متعدد فہرستیں (مکمل مآخذ در A. Grohmann: *Arabic papyri in the Egyptian Library*) اور سکّوں کے ذخیروں کے بارے میں جن میں سے ممتاز ترین ذخیرے لنڈن (لین‌پول)، پیرس (Lavoix)، برلن (Nutzel)، استانبول (اسمٰعیل غالب، احمد توحید، خلیل ادھم) میں ہیں اور (۱۵) اموی و عباسی سکّوں کے بارے میں ملخص از W. Tiesenhausen: *Moneti vostočnago Khalifata*؛ (۱۶) متعلقہ کتابوں کی تفصیل: *Bibliography of Moslem Numismatics*، طبع دوم لنڈن ۱۹۵۳ء میں ملتی ہے۔

(G.C. Miles)

* **دینار ملک**: جن اوغوز سرداروں نے سلجوق فرمانروا سنجر کی سلطنت میں خلل آجانے کے بعد خراسان پر قبضہ جما لیا تھا، ان میں ایک سردار دینار ملک بھی ہے۔ چونکہ خوارزم شاہی سلطنت کے دباؤ کے باعث یہاں حکومت قائم رکھنا دشوار تھا اس لیے دینار ملک نے سلاجقۂ کرمان کے باہمی نزاع سے فائدہ اٹھا کر اس ریاست پر قبضہ کر لیا (۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) اور ان تمام مخاصمتوں کے باوجود، جن کا اندیشہ اسے سیستان، فارس اور خلیج فارس کی سرحدوں کی طرف سے لاحق رہتا تھا، وہ تا دم مرگ یعنی ۵۹۱ھ/۱۱۹۵ء تک کرمان پر قابض رہا۔ البتہ اس کی وفات کے بعد کرمان بھی خوارزمیوں کی سلطنت کا حصہ بن گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اوغوز یہاں کافی تعداد میں نقل مکانی کر کے نہیں آ سکے تھے۔

مآخذ: (۱) بدائع الازمان فی وقائع کرمان غالباً اس دور کی تاریخ کرمان کا واحد مآخذ ہے۔ یہ ہم عصر

مؤرخ افضل الدین الکرمانی کی تصنیف ہے ۔ اس کا متن مؤلفین مابعد (بالخصوص حسن یزدی) کی کتابوں سے از سرِ نو مرتب کر کے مہدی البیانی نے ۱۳۳۱ھ/۱۹۵۲ء ابه تصحیح ۲۱۹۱ء میں شائع کیا لیکن اس ماخذ تک ہماری رسائی اس سے پہلے اسی آسانی کے ساتھ محمد بن ابراہیم کی تصنیف *History of the Saldjūkids of Kirmān*، طبع Th. Houtsma: *Recueil de textes relatifs à l'histoire des Seldjoucides*، ج ۱ (جس کا تجزیہ Houtsma نے *ZDMG*، ۱۸۸۵ء میں ایک مقالے میں کیا ہے) کے ذریعے ممکن تھی ۔ اس سلسلے میں ملک دینار کے بارے میں افضل الدین کی ایک خاص کتاب (۲) عِقدالعُلی، طبع ۱۳۱۱ھ/۱۹۳۲ء نیز (۳) رسالۃ سے رجوع بھی لازم ہے جو حال ہی میں عباس اقبال کو ملا اور ۱۳۳۱ش/۱۹۵۲ء میں اس نے شائع کیا ہے ۔ اس میں کرمان کی تاریخ کا تسلسل ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء تک قائم رکھا گیا ہے ۔ (مدیر نے افضل الدین پر ایک بہترین تعارف تحریر کیا ہے)؛ متفرق حوالے (۴) ابن الاثیر، ۱۱: ۲۲۶، ۲۳۸ تا ۲۴۳؛ ۱۲: ۹۸ میں اور (۵) الجوینی: تاریخ جہانگشای، طبع محمد القزوینی ۲: ۲۰ تا ۲۲ (دور خراسانی) میں بھی ملتے ہیں ۔

(Cl. Cahen)

* **دِینَور**: (جسے بعض اوقات غلطی سے دِینوَر لکھا گیا ہے) ازمنۂ وسطٰی میں الجبال (Media) کا ایک اہم شہر تھا، مگر اب کھنڈر بن چکا ہے ۔ اس کا صحیح محل وقوع ۳۴ درجے ۳۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۴۷ درجے ۲۶ دقیقے طول بلد مشرق (گرینچ) ہے ۔ اس کے کھنڈر سطح سمندر سے ۱۶۰۰ فٹ بلند ایک میدان کے شمال مشرقی کنارے پر واقع ہیں جو جَم دِینَور سے سیراب ہوتا ہے ۔ یہ ندی تنگ دِینَور کے زرخیز علاقے کو قطع کرتی کوہ بِیستُون کے قریب گَمَش آب سے جا ملتی ہے ۔ گمش آب قرہ صو کا ایک معاون ہے جس کی زیریں گزرگاہ کرخا کے نام سے مشہور ہے ۔ جب ابن خُرّداذبہ (طبع ڈخویہ، ص ۱۷۶) یہ بیان کرتا ہے کہ نہر السوس (کرخا) دینور کے نواح سے نکلتی ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک اس کا حقیقی منبع جم دینور تھا ۔

دینور کی بنیاد، اگر زیادہ قدیم زمانے میں نہیں، تو کم از کم سلوکی (Seleucid) دور میں رکھی گئی تھی ۔ کنگاور (۴۴ کیلومیٹر شرقًا جنوبًا) میں ایک یونانی بستی موجود تھی، جہاں زمانۂ حال کی کھدائی میں پتھر کا ایک آفتابہ دریافت ہوا ہے، جس کی آرائش سلینوس (Silenus) اور ساطیروں (Satyrs) کے جسموں کے بالائی حصوں کی تصویروں سے کی گئی ہے، اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ یہاں یونانیوں نے دیونیسس (Dionysus) پرستی کی ترویج کی ہو گی (دیکھیے R. Ghirshman: *Iran*، ص ۲۳۶) ۔

۲۱ھ/۶۴۲ء میں جنگ نہاوند کے فورًا ہی بعد اہل دینور نے عربوں کی اطاعت قبول کر لی ۔ [حضرت] امیر معاویہ [رضی اللّٰہ عنہ] کے عہد میں اس کا نام ماہ الکوفۃ رکھا گیا ۔ خلیفہ موصوف کے زمانے میں جب سلطنت کو نظم و نسق کے اعتبار سے مختلف اضلاع میں تقسیم کیا گیا تو ماہ الکوفہ صرف دینور کے شہر ہی کا نہیں بلکہ جبال کے دو اضلاع کا بھی نام تھا ۔ دینور بالائی اور قرمیسین (کرمان شاہ) زیریں علاقے پر مشتمل تھا ۔ ماہ الکوفہ کے مغرب میں ضلع حلوان، جنوب میں ماسبذان، مشرق میں ہمذان اور شمال میں آذربیجان تھا (دیکھیے قدامۃ، در *BGA* (طبع ڈخویہ)، ۶: ۲۴۳ ببعد) ۔ ماہ الکوفہ اور ماہ البصرۃ (نہاوند) جیسے ناموں میں لفظ ماہ کے مفہوم کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے ۔ بعض عرب مصنفوں کی رائے میں ماہ ایک فارسی اسم ہے اور عربی لفظ قصبۃ بمعنی شہر یا صدر مقام کا مترادف ہے؛ اس کے برعکس بلعمی نے تاریخ الطبری کے فارسی ترجمے میں لکھا ہے کہ یہ ایک پہلوی لفظ ہے جس کے معنی ہیں صوبہ یا سلطنت (دیکھیے Zotenberg، ۳

فرانسیسی ترجمہ، ۳ : ۳۸۰)۔ ملحوظ رہے کہ یہ توضیح عربی متن میں نہیں ملتی۔ ایک اور نسبۃً زیادہ قابل قبول توضیح یہ ہے کہ ماہ اپنے معنی میں قدیم مادۃ یا مدیۃ (Media) کا مترادف ہے۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ وہ تمام جغرافیائی نام جو لفظ ماہ سے مرکب ہیں، ان کا محل وقوع پورے وثوق کے ساتھ علاقہ مدیۃ (Media) میں متعین کیا جا سکتا ہے (دیکھیے مثلاً ماہ البصرۃ)۔ ماہ الکوفہ کے نام کی توجیہ کے سلسلے میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ جو محاصل یہاں سے اور اس کے ضلع سے وصول کیے جاتے تھے وہ اہل کوفہ کی فلاح و بہبود پر صرف ہوتے تھے۔ لفظ ماہ کے بارے میں دیکھیے بالخصوص نولدکہ Nöldeke، در ZDMG، ۳۱ : ۵۵۹ ببعد اور وہی مصنف: *Gesch. der Perser und Araber zur Zeit der Sasaniden*، ۱۸۷۹ء، ص ۱۰۳ و مارکوارٹ J. Marquart: ایرانشہر، برلن ۱۹۰۱ء، ص ۱۸ تا ۱۹۔

بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں دینور میں بڑی خوشحالی رہی۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں، بقول ابن حوقل، یہ ہمذان سے رقبے میں صرف ایک تہائی کم تھا۔ المقدسی نے اس کے نہایت عمدہ بنے ہوئے بازاروں اور پھلوں سے لدے پھندے باغات کی تعریف کی ہے۔ المقتدر (م ۳۲۰ھ/۹۳۲ء) کے عہد کے آخری برسوں میں جو انتشار برپا ہوا، اس سے یہ شہر کچھ مدت کے لیے تباہ ہو کر رہ گیا۔ جب باغی سپہ سالار مرداویج نے اس لشکر کو شکست دے کر، جو خلیفہ نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا تھا، الجبال کے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا تو دینور بھی اس کے تصرف میں آگیا (۳۱۹ھ/۹۳۱ء)، اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد کئی ہزار باشندے (جن کی تعداد ۷ ہزار سے ۲۵ ہزار تک بیان کی جاتی ہے) ہلاک ہو گئے۔ حسنویہ، ایک کرد شہزادہ، اسی علاقے میں رہتا تھا۔ اس نے یہاں ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست قائم کر لی جس کا دارالحکومت دینور تھا۔ یہاں اس کا قبضہ تقریباً پچاس برس (۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں اس کی وفات) تک قائم رہا۔ حمداللہ مستوفی (نزھۃ، ص ۱۰۶) نے دینور کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے، آب و ہوا معتدل اور پانی کی فراوانی ہے۔ یہاں غلے کی فصلیں ہوتی ہیں اور پھل بھی بکثرت ہوتا ہے۔ مستوفی کے زمانے سے پچاس برس بعد تیمور کے ہاتھوں دینور پوری طرح تباہ و برباد ہو گیا اور پھر دوبارہ کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔

تھیوڈور شتراوس Theodore Strauss، جس نے ۱۹۰۵ء میں سیاحت کے دوران میں دینور کے کھنڈروں کو دیکھا تھا، لکھتا ہے: "دینور کے محل وقوع کا سراغ صرف مٹی کے ان ٹیلوں سے ملتا ہے جنھیں سکوں کی تلاش میں کئی بار کھودا جا چکا ہے۔ اب بھی کئی پرانی چیزیں ملتی رہتی ہیں، بالخصوص ان کسانوں کو جو کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں (دیکھیے Strause: *Eine Reise im Westlichen Persien*، در Petermann: *Geog. Mittell*، ۱۹۱۱ء، ص ۶۵)۔ شتراوس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ تنگ دینور میں، جو اس کے نواح میں واقع ہے، ایک قدیم سڑک کے آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ یہ سڑک پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی تھی اور غالباً دینور کو بغداد سے ملاتی تھی۔

مآخذ: متن میں مندرجہ کتابوں کے علاوہ: (۱) المکتبۃ الجغرافیۃ العربیۃ (طبع ڈخویہ)، بمواضع کثیرہ، بالخصوص ۳ : ۳۹۵ تا ۳۹۶؛ ۵ : ۲۵۹؛ ۶ : ۱۱۹ ببعد، ۲۲۶ ببعد، ۲۴۳ ببعد، ۷ : ۲۷۱؛ (۲) البلاذری: فتوح، ص ۱۹۳، ۳۰۶ تا ۳۰۸، ۳۱۰؛ (۳) المسعودی: مروج، ۳ : ۲۶۳؛ ۹ : ۲۳، ۲۵، ۳۱؛ (۴) یاقوت، ۲ : ۷۰۳؛ ۴ : ۳۰۷؛ (۵) القزوینی (طبع وستنفلٹ)، ۲ : ۲۵۰؛ (۶) الاغانی، جلد اول، ص ۱۵۷؛ (۷) لیسٹرینج، ص ۱۸۹، ۲۲۷؛ (۸) A. v. Kremer: *Culturgeschichte des Orients unter* den Chalifen (۱۸۷۵ء)، ۱ : ۳۳۷ تا ۳۳۸، ۳۱۵ ؛ (۹) Nöldeke، در ZDMG، ۲۸ : ۱۰۲ ؛ (۱۰) Weil : Chalifen، ۱ : ۳۳، ۲ : ۶۲۰ ؛ (اس میں غلط املا Deinewr لکھی ہے) ؛ (۱۱) J. de Morgan : Mission Scientif. en Perse Études Géograph.، ۲ : ۹۵ ببعد ؛ (۱۲) Guides Bleus : Moyen Orient، پیرس ۱۹۵۶ء، ص ۷۰۵ .

(L. Lockhart)

* **الدِّیْنَوَری** : ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن وَنَنْد، شہرۂ آفاق ماہر نباتیات کی ولادت تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی ۔ ابن الندیم کے مطابق وہ دینور ہی کا باشندہ تھا ۔ شاید پیدا بھی وہیں ہوا ہو ۔ اس کی وفات ۲۶ جمادی الاولی ۲۸۲ھ کو ہوئی، جیسا کہ یاقوت نے ارشاد الاریب میں مشہور طبیب ابن المسیح کی قلمی یاد داشت کے حوالے سے درج کیا ہے، (اگرچہ ایک روایت ۲۸۱ھ کی بھی ہے؛ تیسری روایت "۲۹۰ھ سے قبل" سے ظاہر ہے کہ کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی) .

اگرچہ وہ ماہر نباتات کی حیثیت ہی سے زیادہ تر مشہور ہے، لیکن "نحو، لغت، ہندسہ، نجوم، ریاضی، تاریخ اور ہر علم میں قابل وثوق" سمجھا گیا ہے ۔ فقہ اور تفسیر میں بھی اس نے گراں قدر آثار چھوڑے ہیں .

ادبیات اور عربیت کی حد تک تعلیم بصرے اور کوفے کے دبستانوں میں حاصل کی، لیکن زیادہ تر السکیت اور ابن السکیت سے ۔ بطور ادیب وہ الجاحظ کا ہم پلہ مانا جاتا ہے، اور جغرافیے میں ابوزید البلخی کا ۔ ممکن ہے وہ الجاحظ کے برابر ذہین نہ ہو، لیکن علوم دقیقہ (ریاضی و فلکیات) میں خصوصی درک کے باعث منہاج و اسلوب کے نقطۂ نظر سے وہ وضاحتِ بیان اور ضبط و اتقان میں الجاحظ سے بہت آگے ہے ۔ بروایت الذہبی و عبدالقادر البغدادی وہ حنفی المذہب تھا ۔ ہندؤوں نے نباتیات کی اچھی خدمت کی ہے لیکن علم میں بھی شاید چھوت چھات ہوگی کہ ان کی کتابوں میں غیر ملکوں کے پودوں کا نام و نشان تک نہیں ۔ بہر حال ان کی اور یونانیوں کی نباتیاتی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہونے سے پہلے ہی الدینوری نے خالص اسلامی معلومات کی مدد سے چھے ضخیم جلدوں میں "کتاب النبات" تیار کر لی تھی جو گویا نباتیاتی دائرۂ معارف تھی ۔ اس کے متعلق جرمن محقق زلبربرگ کے اس بیان میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ یونانیوں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ اور اپنے علم و فضل کی انتہا کے زمانے میں نباتیات پر جو کتابیں تالیف کیں، ابو حنیفہ الدینوری (جو اسلامی نباتیات کا آغاز کرتا ہے) ان کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیتا ہے .

اس کی تقریباً بیس کتابوں کا پتا چلتا ہے ۔ ان میں سے اب تک صرف الأخبار الطوال اور جزء کتاب النبات دستیاب ہوئی ہیں ؛ نیز کتاب الانواء کے طویل اقتباسات ملے ہیں ۔ تفصیل یہ ہے :

۱ . تفسیر (تیرہ جلدوں میں) .

۲ . فقہ میں کتاب الوصایا اور کتاب فی حساب الدور (علم فرائض اور تقسیم ترکہ کے ایک پیچیدہ مسئلے کے متعلق)، کتاب القبلة و الزوال (نیم فقہی، نیم فلکیاتی امور پر) .

۳ . لغت و ادبیات میں ما یلحن فیه العامة، کتاب اصلاح المنطق، کتاب الفصاحة، کتاب الجمع و التفریق، کتاب الشعر و الشعراء (اس آخر الذکر کے جواب میں لُغْدَة الاصفہانی نے الرد علی الشعراء لکھی تو اس کے جواب الجواب میں کتاب الرد علی لغدة الاصفہانی) اور جواہر العلم .

۴ . نباتیات میں کتاب النبات (جو چھے ضخیم جلدوں میں ہے) ابن اخت غانم الاندلسی نے، بروایت نفح الطیب، اس کی شرح ساٹھ جلدوں میں لکھی .

۵ . طب میں کتاب الباہ (یا کتاب الباءة) ۔

مزید برآں کتاب النبات میں پودوں کی خاصیتوں میں طبی خواص و اثرات کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔

۶۔ ریاضی اور فلکیات میں البحث فی حساب الهند، کتاب الجبر والمقابلة، کتاب نوادر الجبر، کتاب الکسوف اور بارش کے نچھتروں کے متعلق کتاب الانواء (جس کا بڑا حصہ ابن سیدہ: المخصص ۹ : ۱۰ ببعد میں منقول ملتا ہے، اوراسی کے ایک حصے کو المقریزی نے اپنی کتاب الخبر عن البشر مخطوطہ استانبول، جلد رابع، ذکر السماء و الفلک میں بلا حوالہ نقل کیا ہے)۔

۷۔ جغرافیے میں کتاب البلدان، جو ایک بڑی کتاب تھی (الاخبار الطوال، ص ۴۴، سطر ۹ تا ۱۷ میں الدینوری نے اپنی جس تالیف کا اشارہ کیا ہے وہ غالباً یہی ہے)۔

۸۔ تاریخ میں الاخبار الطوال، خلافت راشدہ میں ایران کی فتح کے متعلق ایک گراں قدر ماخذ [اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے]۔

ایران کے شہر دینور میں (جو اب کھنڈر ہے، اور جس کے تلفظ میں دال کی زیر اور زبر دونوں روایتیں عرب مؤلفوں کے ہاں ملتی ہیں، ایک ابن خلکان کے ہاں، دوسری سمعانی کے ہاں، گویا یاے مجہول پڑھنا چاہیے، نیز واو کو زبر ہے) ہمارا مؤلف ایک مکان کی چھت پر سے فلکیاتی مشاہدے کیا کرتا تھا۔ ۳۳۵ھ / ۹۴۶ء میں عبدالرحمٰن الصوفی (مشہور ماہر فلکیات) وہاں گیا تو اس وقت بھی یہ مکان موجود تھا اور دینوری کے رصدی مشاہدات کی روایت چلی آ رہی تھی۔ الصوفی نے الدینوری کی فلکیاتی مہارت کے ریاضیاتی حصے پر کچھ اعتراض کیا ہے، لیکن البیرونی نے اس بارے میں الدینوری پر کافی اعتماد ظاہر کیا ہے، اور اپنی کتاب الآثار الباقیة میں الدینوری کی رصدی جدولیں نقل کی ہیں۔ ممکن ہے الدینوری نے کتاب الانواء کے علاوہ رصدی مشاہدات پر کوئی مستقل زیج بھی مرتب کی ہو۔

المسعودی نے (مروج الذهب، ۲ : ۲۴۴، باب ۶۱ میں) لکھا ہے کہ ابن قتیبہ قاضی دینور اور ابوحنیفہ الدینوری کی فلکیاتی اور دیگر متعدد تصانیف کے بارے میں انتساب کی غلطی ہو گئی ہے، چونکہ الدینوری اور ابن قتیبہ دونوں کی فہرست تالیفات میں کتاب الانواء اور کتاب الشعر و الشعراء موجود ہیں (اور ابن قتیبہ کی حد تک دونوں دستیاب بھی ہو گئی ہیں) اس لیے یہ اشارہ انھیں کتابوں کے متعلق ہو سکتا ہے۔

فارسی اس کی آبائی زبان تھی۔ اس کا دادا وَنَنْد شاید مسلمان بھی نہیں ہوا تھا۔ بہر حال کتاب النبات میں پودوں کے ناموں اور اصطلاحوں کو وہ کثرت سے عربی اور فارسی دونوں میں لکھتا ہے اور اس طرح تیسری صدی ہجری کی فارسی کا ایک گراں قدر ماخذ معلومات بھی ہے۔ خود عربی کی حد تک وہ مقامی لہجوں کا بھی غور سے مشاہدہ کرتا، اور جا بجا اپنی کتاب میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ پودوں کے ناموں کی تفصیل میں جب بھی موقع ملتا ہے وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ اس کے مترادفات دیگر عرب علاقوں میں کیا ہیں، یا مختلف قبائلی تلفظ میں کیا فرق ہے۔

اس کا شاہکار یقیناً کتاب النبات ہے۔ اس پر نباتی لحاظ سے تو نہیں، البتہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے کچھ اعتراض کیے گئے ہوں تو چنداں باعث حیرت نہیں۔ چنانچہ علی بن حمزة البصری نے التنبیہات علی اغالیط الرواة کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ (طبع عبدالعزیز المیمنی قاہرہ ۱۹۶۸ء)۔ اس میں آٹھ باب ہیں؛ تیسرا باب "التنبیهات علی ما فی کتاب النبات للدینوری" پر ہے اور تقریباً چوتھائی کتاب پر مشتمل ہے، لیکن یہ اعتراضات شاذ ہی صحیح ہیں؛ مثلاً الدینوری انسان کو اشرف

المخلوقات قرار دیتا ہے تو ابہری کو اعتراض ہے کہ فرشتے انسان سے بہتر ہیں، وغیرہ۔ ابن سیدہ کی المخصص میں اس تنقید کے اقتباسات "قال المتعقب" کہہ کر بارہا دیے گئے ہیں۔

اس کے برخلاف طبیبوں کے ہاں اس کی بڑی وقعت رہی ہے۔ چنانچہ ابن سمجون (مخطوطات آوکسفرڈ و لنڈن) پھر الغافقی (مخطوطات قاہرہ و لیبیا و مونٹریال) اور بعد ازاں ابن البیطار نے مفردات طبیہ پر اپنی کتابوں میں دل کھول کر الدینوری کے بیانات نقل کیے ہیں اور ان کو دیگر تمام معلومات پر ترجیح دی ہے۔

لغت دانی کی حد تک الازہری: تہذیب اللغۃ؛ ابن سیدہ: المحکم؛ وہی مصنف: المخصص؛ ابن منظور: لسان العرب؛ الصغانی: العباب؛ مرتضی الزبیدی: تاج العروس وغیرہ میں الدینوری کے جو اقتباسات ہیں ان کو جمع کیا گیا تو بحذف مکررات پندرہ سو صفحوں میں ان کا مبیضہ تیار ہوا ہے۔ ان کی مدد سے کتاب النبات کا کم و بیش نصف حصہ دوبارہ مرتب ہو جاتا ہے، جیسا کہ کتاب النبات کی دستیاب شدہ جلدوں سے متعلقہ اقتباسات کا مقابلہ کرکے واضح ہوا ہے۔ اس سے ضمناً ان متأخرین کی صحت نقل اور دیانت داری کی بھی وقیع شہادت فراہم ہو جاتی ہے۔

فتوحات جنگی، تدوین قانون، تعمیرات اور متعدد دیگر علوم کی طرح نباتیات میں بھی مسلمانوں کی تیزگامی مؤرخ کو حواس باختہ کر دیتی ہے۔ اوپر زلبربرگ کا اعتراف اس بارے میں نقل ہوا۔ الدینوری نے نباتات کی قاموس بہ ترتیب تہجی مرتب کی۔ کتاب النبات کی جلد پنجم کا نصف دوم اور جلد ششم اس پر حاوی تھی۔ جلد پنجم میں الف سے ز تک چار سو بیاسی پودوں کا ذکر ہے۔ س سے ی تک میرے ہاں اس سے دگنی تعداد میں پودوں کے تذکرے الدینوری کے حوالے سے جمع ہوے ہیں۔ ان تذکروں میں پودوں کی ساخت، ان کے غذائی و دوائی اور دیگر خواص و منافع کا بہت دقیقہ رس اور جامع بیان ملتا ہے۔ پودوں کی جنس وار تقسیم بھی اس نے ایک مستقل باب میں کی تھی۔ زمین، بارش، نہروں اور پودا پھوٹنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کا مفصل حال بھی اس نے دیا تھا۔ ضمناً شہد، انگور، کھجور، خضاب و رنگ، پھول اور عطر، ٹڈیوں حتّٰی کہ وہ چراگاہوں کے ضمن میں اونٹوں کی بیماریوں اور علاجوں کا ذکر کرتے ہوئے پٹرول (نفط) اور ڈاہر نک کے متعلق دلچسپ تفصیلات دیتا ہے۔ ابیات شواہد کے ذریعے سے اس نے عربی شاعری کے نباتی ذخیرے کو اجاگر کر دیا ہے اور ایسی ہزاروں ابیات نقل کرکے اس مقولے کی صحت ظاہر کر دی ہے کہ الشعر دیوان العرب۔ اس کی کتاب سہ گانہ مأخذوں سے مرتب ہوئی ہے: اپنے پیشروؤں کے بیانات کا اعادہ، اپنے ذاتی مشاہدات اور اپنے ہم عصروں (اساتذہ، ملنے والوں اور دیگر مأخذ معلومات) کے بیانات کی نقل۔ ذاتی مشاہدات کے سلسلے میں وہ ایران، عراق، بوزنطی سرحد، شام عرب، افغانستان، بلوچستان، خراسان وغیرہ کے بکثرت مقامات کے پودوں کا ذکر کرتا ہے۔

الدینوری کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ نباتی اصطلاحات کے سلسلے میں وہ معربات کا ذرا بھی محتاج نہیں رہا اور اس کی درج کردہ اصطلاحیں اتنی عمدہ ثابت ہوئیں کہ پھر کبھی عربوں کو ان کے بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ الدینوری ہمیشہ اپنے مأخذ کا حوالہ دے کر کھلے دل سے اپنی ممنونیت کا اعتراف کرتا ہے۔ ان میں ابو زیاد، ابو عمرو، ابو نصر، ابن الاعرابی السندی اور ابن السکیت کے کثرت سے حوالے ملتے ہیں۔ بدویوں میں "الاعراب القُدُم" (کذا) اہل السراۃ، اعراب عمان و بنی اسد و ربیعہ وغیرہ کا بھی کافی ذکر ہے۔ کتاب النبات کی جلد سوم جامعہ Yale ییل (امریکا) اور جلد پنجم جامعہ استانبول کے کتاب خانوں میں ملی ہے۔ ان کے علاوہ چند ابواب کا

ایک حصہ کتاب خانہ شیخ الاسلام (مدینۂ منورہ) میں ہے۔ مکمل کتاب کا تاحال پتا نہ چل سکا۔

اس کی شہرت مشرق ہی میں نہیں، بلکہ مغرب اقصیٰ اور اندلس تک پہنچ گئی تھی ۔ اگر فرنگیوں اور تاتاریوں کے ہاتھوں لاکھوں عربی مخطوطات کی بربادی نہ ہوئی ہوتی تو الدینوری کی اصل کتاب کے سوا ابن اخت غانم کی شرح، جو ساٹھ جلدوں میں تھی، انسانی میراث میں قابل قدر چیز ہوتی۔

یہ امر مشتبہ ہے کہ اس نے فلکیاتی مشاہدوں کے لیے اپنے وطن دینور کو چھوڑ کر اصفہان کا کبھی سفر کیا ہو، کشف الظنون (عدد ۶۳۶۳ و ۹۹۳۶) سے ایسا گمان کیا جاتا رہا ہے، مگر یہ بیانات صاحب کشف الظنون نے تاریخ گزیدہ سے لیے ہیں، اور اس کا یہ کہنا کہ الدینوری [رکن الدولہ ابوالحسن علی الدیلمی کے عہد میں اصفہان میں صاحب رصد رہا اور اس] نے زیج بنائی تھی درست نہیں، اس لیے کہ الدینوری ۲۸۱ھ میں یا بقول دیگر ۲۹۰ھ میں فوت ہو چکا تھا۔ ممکن ہے اس نے حج کیا ہو اور حرمین کی زیارت کی ہو، لیکن قطعیت اس لیے دشوار ہے کہ جن چار پانچ مقامات میں وہ مکے اور مدینے کا ذکر کرتا ہے، وہاں چشم دید حالات نہیں لکھتا۔

ہم عصروں سے مناظرے اس زمانے کی عام چیز تھی، چنانچہ الدینوری نے بھی مناظرے کیے۔ یاقوت نے الدینوری کے المبرد سے دینور میں عیسی بن ماہان کے ہاں ایک علمی بحث کا ذکر کیا ہے، جس سے اس کی فقہ، حدیث اور لغت دانی میں فوقیت ظاہر ہوتی ہے۔ لغذۃ الاصفہانی سے تو رسالہ بازی تک نوبت آ گئی تھی جیسا کہ اوپر کی تالیفات کے سلسلے میں بیان ہوا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ قدما میں الدینوری سب سے بڑا ماہر نباتیات تھا۔ اور علوم دقیقہ و ادبیہ میں بھی اس کو بلند رتبہ حاصل تھا۔ اس کی تاریخ، جامع و مانع الفاظ میں ضخیم تر کتابوں کا عمدہ نچوڑ ہے (مثلاً حضرت ابوبکر رضؓ کی ہرقل کے ہاں بھیجی ہوئی سفارت کے حالات دلائل النبوۃ لابی نعیم اور الدینوری کی الاخبار الطوال دونوں میں درج ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے سے یہ پہلو بآسانی ہویدا ہو سکتا ہے)۔ اگر اس کی دوسری کتابیں بھی کبھی دستیاب ہوں تو اندرونی شہادت سے اس کے مزید حالات زندگی کے علاوہ مختلف علوم میں اس کی مہارت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے گا۔ فقہ و تفسیر میں اس کی تالیفات کو چھوڑ کر اس کے سوانح نگار اسے "ثقہ" اور "من کبار الحنفیة" بھی لکھتے ہیں جس سے اس کا تقدس اور زہد و ورع بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

مآخذ: کشف الظنون، السمعانی: الانساب اور براکلمان کے علاوہ: (۱) کتاب النبات (ج ۵، قسم دوم) طبع اپسالا ۱۹۵۳ء؛ (۲) الاخبار الطوال خصوصاً اشاریہ کی جلد میں اس کے حالات بقلم کراچکوفسکی، لائڈن ۱۹۱۲ء؛ (۳) ابن الندیم: الفہرست، طبع یورپ، ص ۷۸؛ (۴) یاقوت: ارشاد الاریب: ۱: ۱۲۳ تا ۱۲۷؛ (۵) السیوطی: بغیة الوعاة، طبع قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۱۳۲؛ (۶) البغدادی: خزانة الادب، طبع بولاق ۱۲۹۹ھ، ۱: ۲۶؛ (۷) معارف، اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۴۹ء و جون ۱۹۵۰ء؛ (۸) عبدالرحمٰن الصوفی: الکواکب الثابتة، طبع دائرة المعارف حیدرآباد دکن، ص ۷ و ۸؛ (۹) ابن خلکان: وفیات الاعیان، ص ۱۱۸ (عدد ۲۹۵) طبع یورپ؛ (۱۰) Silberberg در *Zeitschrift für Assyriologie*، ج ۲۳، ۲۵ (۱۹۱۰ء)، ص ۲۲۵ تا ۲۶۵، (۱۹۱۱ء)، (ص ۳۹ تا ۸۸): *Die Pflanzenbuch des Abu Hanifa Ahmad ibn Daud ad-Dinawari*؛ (۱۱) S. de Sacy: *Relation de l'Egypte*، ص ۳۶۸، ۷۸؛ (۱۲) وستنفلڈ: *Gesch. d. arabischen Aerzte und Naturforscher*، ۳: ۲۸ بعد عدد ۹۲ (گوٹنگن ۱۸۴۰ء)؛ (۱۳) وہی مصنف: *Geschichtsschreiber der Araber*، گوٹنگن ۱۸۸۲ء، ص ۲۷، عدد ۷۹؛ (۱۴) E. Meyer: *Geschichte der Botanik*، Königsberg ۱۸۵۶ء،

۳ : ۱۶۳ تا ۱۷۷؛ (۱۵) G. Flügel : *Grammatische Schulen der Araber*، لائپزگ ۱۸۶۲ء، ص ۱۹۰ ببعد؛ (۱۶) L. Leclerc : *Historie de la médecine arabe*، پیرس ۱۸۷۶ء، ۱ : ۲۹۸؛ (۱۷) Steinschneider در *ZDMG*، ج ۲۳ : ۳۷۳؛ (۱۸) H. Derenbourg در *Revue Critique*، پیرس ۱۸۸۸ء، ص ۶۱ تا ۶۳؛ (۱۹) H. Suter : *Die Mathematiker. u. Astronomen d. Araber*، لائپزگ ۱۹۰۰ء، ص ۳۱، عدد ۶۰؛ (۲۰) محمد حمیداللہ : *Dinawariy's Encyclopaedia Botanic*، در *Fuad Köprülü Armagani*، ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۵ تا ۲۰۹؛ (۲۱) (احمد عیسیٰ بے) Ahmed Issa Bey : *Abou Hanifa elDinawari et son Livres des plantes*، در *Bulletin de l'Institut d'Egypte*، ج ۱۶ (۱۹۳۵ء)، ص ۱ تا ۷.

(محمد حمید اللہ)

* **الدِّینَوری** : ابو سعید (سعد) نصر بن یعقوب ایک مصنف ہے جو زیادہ تر اپنی کتاب القادری فی التعبیر کی وجہ سے مشہور ہے جو اس نے ۳۹۷ھ/۱۰۰۶ء میں تصنیف کی اور القادر باللہ (۳۸۱ تا ۴۲۲ھ/۹۹۱ تا [۱۰۳۰ء]) کے نام معنون کی۔ یہ تعبیرات پر عربی زبان میں قدیم ترین مستند رسالہ ہے جس میں وہ سارا مواد نہایت اچھے طریقے سے جمع کر دیا گیا ہے، جو اس زمانے میں اس موضوع پر ملتا تھا۔ اس کے ماخذ عربی [زبان میں] ہیں: ابن سیرین [رک بان] جن سے بے شمار تعبیرات منسوب کی گئی ہیں؛ یونانی: ارتمیدورس الیسوسی Artemidorus of Ephesus جس کی اونی روکری طیقا (*Oneirocritica*) [یعنی تعبیر الرؤیا] کا ترجمہ عربی میں حُنین بن اسحٰق (م ۲۶۰ھ/۸۷۳ء) نے کیا تھا (دیکھیے الفہرست، ص ۲۵۵؛ مخطوطۂ عربی ۴۷۲۶، در کتاب خانۂ جامعۂ استانبول، جو اشاعت کے لیے تیار ہو رہا ہے) تقریباً ساری کی ساری اس علمی کتاب میں نقل کر دی گئی ہے۔ جہاں تک مسیحی اور بوزنطی ماخذ کا تعلق ہے، الدینوری نے غالباً یونانی رسالہ المعروف بہ Αχμετ υἱὸς Σηρεὶμ کے اصل عربی نسخے سے استفادہ کیا ہوگا۔ اسے ایک عیسائی نے لکھا تھا اور ۱۱۶۰ء میں لیونسکس Leo Tuscus نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا تھا [دیکھیے ابن سیرین]۔ ہندو اور ایرانی ماخذ کے طور پر بھی یہی کتاب اس کے کام آئی ہوگی۔ مصنف یہودیوں سے منسوب تعبیرات کا اکثر مقامات پر حوالہ دیتا ہے اور اس نے بائبل سے متعدد اقتباسات نقل کیے ہیں۔

مآخذ : (۱) القادری فی التعبیر ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے ۲۹ قلمی نسخوں کا ہمیں علم ہے۔ اس کا فارسی میں ترجمہ (AS ۴۱۷۸) اور حاجی خلیفہ (۲ : ۲۱۳ شمارہ ۳۰۶۸) کے بعد اس کا ترکی میں منظوم ترجمہ شہاب الدین احمد بن عرب شاہ (م ۸۵۴ھ/۱۴۵۰ء) نے کیا۔ اس تصنیف اور عربی میں تعبیر گوئی پر دوسری کتابوں کے بارے میں دیکھیے (۲) T. Fahd : *Les Rêves en Islam*، در *Sources Orientales*، ج ۲، پیرس ۱۹۶۰ء، ص ۱۲۵ تا ۱۵۸.

(T. Fahd).

دِیو : (دراصل "دیْو" ہے، اوستا میں دایوا daeva، سنسکرت میں دیو dēva) فارسی میں بدی اور تاریکی کی ارواح کا نام ہے، جو گناہوں کے دیوتا اہرمن کی آفریدہ ہیں؛ ان کی تعداد بے شمار ہے، ان میں اہرمن سمیت سات بڑے دیوتاؤں کا گروہ دوسروں سے ممتاز ہے، یہ سات دیوتا سات امشسپند (اوستا۔ امیشا سپنتا amǝ̌sa spǝnta، "غیر فانی ارواح مقدسہ") کے مد مقابل ہیں۔

"دیو (Daiva) اسم جمع کے طور پر سب سے پہلے فقط دشمن دیوتاؤں کے معنی دیتا ہے، پھر ان دیگر فوق الفطرت ہستیوں پر بھی، جن کی جبلت شر ہے اور جو نیکی اور دین کی دشمن ہیں، اطلاق کیا جانے لگا۔۔۔ یہ دیوا (daiva)، یہ دیو (dēva) ان روز افزوں

تعداد میں ان غولوں اور دیگر شیطانی ہستیوں کے ساتھ مدغم ہوگئے جن کی اصل اسلاف کے معتقدات میں مل جاتی ہے (A. Christensen).

یہاں ان سارے دیووں کا جو ایرانی ادب یا عوامی ماخذ میں پائے جاتے ہیں، ذکر کرنا ناممکن ہے: اکثر دیو کا لفظ عربی کے الفاظ عفریت، شیطان، طاغوت کے پہلو بہ پہلو لایا جاتا ہے، مثلاً گائے کے سے پاؤں والے دیو ("دیو گاؤ پاے": سعد الدین الوراوینی: مرزبان نامہ، طبع محمد القزوینی: ص ۷۹ بعد؛ ایم۔ نظام الدین: *Introduction to the Jawāmi'-ul hikāyāt of Muhammad Awfī*، ص ۱۲۳)۔ زمانۂ حال کی عوامی کہانیوں میں عموماً دیو کی جگہ جن کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے، مگر دیو بھی موجود ہے، مثلاً در H. Massé: *Contes en persan populaire*، شمارہ ۲۷ اور ۲۹؛ یا یہ کہ اسے جن اور پری دونوں کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے (مثلاً Ria Hackin اور A. A. Kohzad: *Légendes et coutumes afghanes*، ص ۷۱ اور حاشیہ)۔ شیعیوں کے نزدیک آدمی، دیو اور جن بروز حشر انعام یا سزا دیے جائیں گے (تبصرة العوام، طبع اقبال، ص ۲۱۰)۔ حمد اللہ مستوفی القزوینی دیو رود (ندی) کا ذکر کرتا ہے (ضلع جیرفت، کرمان)۔ اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ اس کا بہاؤ بہت تیز و تند ہے (نزهة القلوب، ترجمہ Le Strange، ص ۲۱۷، ۱۳۹)۔

مآخذ: دیو کے مختلف مفہوموں اور اس ترکیب کلام میں اضافۃً اور استعارۃً استعمال کے لیے (۱) Vullers: *Lexicon persico-latinum* اور Desmaisons: *Dictionnaire persan-français*؛ فردوسی کے ہاں دیو بہ کثرت استعمال ہوا ہے (دیکھیے F. Wolff: *Glossar zu Firdosis Schahname*، بذیل مادۂ dīw, dēv اور شاہنامہ طبع اور فرانسیسی ترجمہ از J. Mohl، ۱۸۷۸ء، اشاریہ، بہ ذیل مادّہ)؛ (۲) Spiegel: *Eranische Altherthumskunde*، ۱: ۱۲۹ تا ۱۳۱؛ (۳) A. V. W. Jackson، در *Gr. I. Ph.*، ۲: ۱۳۹، ۱۶۵، ۱۷۵، ۱۹۶، ۶۳۶ بعد ۶۶۲؛ (۴) A. Christensen: *Essai sur la démonologie iranienne*، ص ۶۰ (دیو، پریاں اور اژدہا، جدید فارسی رزمیہ میں)، ص ۶۷ (دیو عربی اور فارسی متون میں)، ص ۷۱ (دیو اور جن)، ص ۹۲ (نتائج)؛ فارسی کی ثانوی جنگی نظموں میں دیووں سے متعلق: فردوسی: کتاب مذکور، ج ۱، مقدمہ، ص ۱۶، حاشیہ ۱، ص ۲۰، حاشیہ ۱، ص ۷۲، ۷۷، ۸۷؛ (۵) H. Massé: *Croyances et coutumes persanes* ـ عوامی اعتقادات؛ ج ۲، باب ۱۳ اور اشاریہ III؛ دیو ارمینیا کے دیووں سے متعلق: Christensen: کتاب مذکور، ص ۸۷؛ (۶) F. Macler: *Les dew arméniens* (متن اور اصلی نقل مخطوطہ)۔ چند تصاویر خرد، علاوہ ان کے جو داستانوں کی توضیح کے لیے دی گئی ہیں، بھی موجود ہیں؛ بعض نے دیووں اور پریوں میں التباس پیدا کر دیا ہے؛ دیکھیے (۷) E. Blochet: *Enluminures ... de la Bibliothèque Nationale*، لوحہ ۲۰، ۳۶ ب، ۷۵، ۷۸ الف، ۹۳ ب، ۱۱۷ الف؛ (۸) Sakisian: *La miniature persane*، لوحہ ۷۸؛ (۹) Ph. W. Schulz: *Die persische-Islamische Malerei*، لوحہ ۱۳، ۶۳، ۳۱، ۷۳ (دیو اور پری)؛ *Iran: Miniatures de la Bibliothèque Impériale de Téhéran*، (نیویارک، Graphic Soc-Unesco)، لوحہ ۶ (دیو بہیئت انسان)۔

(CL. HUART-[H. MASSÉ])

دیو: ہندوستان میں سوراشٹرا (سورٹھ) کے * جنوبی کونے کے سامنے ایک جزیرہ ہے، جس میں ایک اچھی بندرگاہ ہے، جو خلیج کھمبایت (کیبے) کے خطرناک مدوجزر سے بچی ہوئی ہے۔ ۶۹۸ھ/۱۲۹۸ - ۱۲۹۹ء میں اسے علاء الدین خلجی کے سپہ سالاروں نے Čudāsamas سے لیا۔ غالباً چند سال کے بعد یہ ہاتھ سے نکل گیا اور محمد بن تغلق نے ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء میں دوبارہ فتح کیا۔

۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں مظفر خان نے، جو آخری تغلق بادشاہوں کی طرف سے گجرات کا صوبے دار اور پھر گجرات کا پہلا بادشاہ ہوا، دیو میں مسجدیں بنائیں، قاضی مقرر کیے اور محافظ فوج تعینات کی۔ ۸۳۴ھ/۱۴۳۱ء میں دیو با رونق بندرگاہ تھا جو گجرات کے بیڑے کے لیے جہاز مہیا کرتا تھا۔ ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء سے یہ سورٹھ کے صوبے داروں کا صدر مقام بن گیا جن میں سے مشہور ملک ایاز ہوا ہے۔ اس نے دیو کو ایک بڑا تجارتی مرکز بنا دیا، قلعہ بنایا، بندرگاہ کی دفاع کا بندوبست کیا اور خشکی کے قریبی قصبے گوگلا سے ملانے کے لیے ایک پل تعمیر کیا۔ ۹۱۴ھ/۱۵۰۹ء میں اس کے بیڑے اور مملوک امیرالبحر امیر حسین کے بیڑے کو پرتگیز حاکم فرانسسکو ڈی آلمائڈا (Francisco d'Almeida) نے دیو کی بندرگاہ میں شکست دی۔ پھر بھی امیر حسین اس قابل رہا کہ ۹۱۹ھ/۱۵۱۳ء میں سلطان مظفر دوم کو آمادہ کر سکے کہ البوکرک Albuquerque کو اس نے جو دیو کی پیشکش کی تھی، اُسے واپس لے لے، اور ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء اور ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں وہ پرتگیزی بیڑوں کو پسپا کرسکے.

ملک ایاز نے ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء میں وفات پائی اور دیو میں اس کا فرزند اسحٰق اس کا جانشین ہوا۔ ۹۳۳ھ/۱۵۲۶-۱۵۲۷ء میں اسحٰق نے بغاوت کر دی اور پرتگیزوں کو دیو کی پیش کش کی۔ نئے صوبے دار قوام الملک کا بیڑا وہاں پہلے پہنچ گیا اور اس نے ان کے بیڑے کو شکست دی، لیکن آئندہ موسم بہار میں پرتگیزوں نے دیو کے بیڑے کو، جو قوام الملک کے بیٹے کے زیر قیادت تھا، کچل دیا اور قوام الملک کو برطرف کرکے اس کی جگہ ملک ایاز کے دوسرے فرزند ملک طُوغان کو دیو کا حاکم مقرر کر دیا گیا.

۹۳۷ھ/۱۵۳۱ء میں طُوغان نے دو عثمانی جرنیلوں، امیرمصطفٰی اور خواجہ صفر کی بر وقت مدد سے، وائسرے Nuno da Cunha کے بھرپور حملے میں اسے شکست دی.

۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء میں سلطان بہادر شاہ، جو ہمایوں سے بچ کر بھاگا تھا، اور مغل شہنشاہ دونوں نے پرتگیزوں کو دیو کی پیش کش کی۔ ادھر نونودا کنہا Nuno da Cunha نے بہادر شاہ کو کم طاقتور جان کر دیو کے بدلے میں جنگی مدد دینے کے ایک معاہدے پر ۲۷ ربیع الآخر ۹۴۲ھ/۲۵ اکتوبر ۱۵۳۵ء کو دستخط کیے.

۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں بہادر شاہ مغلوں کو نکال کر دیو واپس پہنچ گیا۔ یہاں اس نے نونودا کنہا کو دعوت دی کہ شمالی جانب آئے اور پھر ترغیب دی کہ ساحل میں اُتر آئے؛ جب وہ نہ آیا تو خود بہادر شاہ اس کے جہاز پر اس سے ملنے گیا۔ وہاں سے ساحل پر واپس آتے وقت پرتگیزوں سے ایک جھڑپ میں ۳ رمضان ۹۴۳ھ/۱۳ فروری ۱۵۳۷ء کو مارا گیا.

اس کے بعد پرتگیزوں نے دیو کے محل، خزانے اور اسلحہ‌خانے پر قبضہ کر لیا اور دیو پر ان کا اقتدار تسلیم کر لینے کے عوض میں ۹۴۳ھ/۱۵۳۷ء میں محمد زمان میرزا کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ تاہم وہ دیو کے باہر شکست کھا گیا اور ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں خواجہ صفر نے اس جزیرے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ (خادم) سلیمان پاشا [رکّ بآن] والی مصر کے ایک طاقتور بیڑا لے کر پہنچنے کے بعد اور زیادہ سخت ہو گیا، لیکن ۴ ماہ بعد ترکوں اور گجراتیوں میں باہم بدگمانی ہوگئی۔ ادھر اطلاع آئی کہ نونودا کنہا پہنچا چاہتا ہے، اس پر محاصرہ اٹھا دیا گیا اور ۲ شوال ۹۴۵ھ/۲۵ فروری ۱۵۳۹ء کو صلح ہوگئی.

۲۰ ربیع الآخر ۹۵۳ھ/۲۰ جون ۱۵۴۶ء کو خواجہ صفر نے دیو کا دوسری دفعہ محاصرہ شروع کیا جو سات مہینے جاری رہا۔ جواؤدی کاسترو (Joao de Castro) نے ۱۹ ذوالقعدہ ۹۵۳ھ/ [بہ تصحیح ۱۱ جنوری ۱۵۴۷ء] کو اسلام فوج کو

شکست دی اور محاصرہ ہٹا دیا۔ اس سے پہلے ہی دوران محاصرہ میں خواجہ اور اس کے فرزند کی جان جا چکی تھی۔

پرتگیز دیو کے قلعے سے کئی سال تک اجازت ناموں (cartazes) کے ذریعے گجرات کی ساری بحری آمد و رفت کی نگرانی کرتے رہے۔

اگرچہ ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء اور ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۶ء میں عربوں نے دیو پر چڑھائی کر کے اسے غارت کیا لیکن پرتگیزوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال سے فائدہ اٹھا کر پورے جزیرے اور اس کے پاس کے خشکی کے علاقے تک اپنا قبضہ بڑھا لیا تھا اور ان کا یہ قبضہ دسمبر ۱۹۶۱ء تک قائم رہا۔

مآخذ: (۱) M. S. Commissariat: *A history of Gujrat*، ج ۱، لنڈن ۱۹۳۸ء؛ (۲) A. B. de Bragança Pereira: *Os Portugueses em Diu*، Bastora، بدون تاریخ۔

(J. B. HARRISON)

دِیوان: اشعار یا نثر کا مجموعہ [دیکھیے مقالہ عربیہ، فارسی ادب، ترکی ادب، اردو ادب اور شعر]؛ کتاب اندراجات، دفتر۔ اس کے مادّے کے متعلق مآخذ میں اختلاف ہے۔ بعض کاتب کے لیے فارسی لفظ "دیو" (بمعنی دیوانہ یا شیطان) کو اس کی اصل قرار دیتے ہیں۔ دوسرے اسے "دَوَّن" سے مشتق عربی لفظ خیال کرتے ہیں، جس کے معنی جمع کرنے یا دفتر میں اندراج کرنے کے ہیں، لہٰذا اس کے معنی مثلوں یا کاغذات کا مجموعہ ہوئے (دیکھیے القلقشندی: صبح الاعشٰی، ۱: ۹۰؛ *I.A*، ۱۷: ۲۳ تا ۲۴؛ الصولی: ادب الکُتّاب، ص ۱۸۷؛ الماوردی: الاحکام السلطانیہ، ص ۱۷۵؛ الجہشیاری: کتاب الوزراء، ص ۱۶ تا ۱۷؛ دیکھیے البلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۴۹)۔ بہر حال نظم و نسق میں اس اصطلاح کے معنی پہلے فوجوں کی فہرست کے تھے (دیکھیے الصولی: کتاب مذکور، ص ۱۹۰؛ الکندی: الولاۃ والقضاۃ، ص ۸۶؛ البلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۴۹)۔ پھر اس کے معنی ہر قسم کی فہرست یا کتاب اندراجات کے ہو گئے، دفتر کے لیے تو یہ بعد میں استعمال ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور خارجی ہے لیکن یہ اصطلاح بذات خود پہلے سے مروج تھی۔

۱۔ خلافت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تاریخ اسلام میں پہلا دیوان (جسے عموماً الدیوان کہتے تھے) قائم کیا (الجہشیاری: کتاب مذکور، ص ۱۶)۔ مآخذ سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے تنخواہوں کے انتظام، جنگ کے سپاہیوں کی فہرست اور بیت المال کی تنظیم کی ضرورت سے ایسا کیا (دیکھیے الجہشیاری، ص ۱۶، ۱۷؛ البلاذری: فتوح، ص ۴۴۹ تا ۴۵۱؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۱۴۸؛ الیعقوبی: تاریخ، ۲: ۱۴۰؛ [امام] ابو یوسفؒ: کتاب الخراج، ص ۲۵؛ الصولی: ادب الکتاب، ص ۱۹۰ تا ۱۹۱؛ ابو سالم: العقد، ص ۱۵۴ تا ۱۵۵)۔ گو بعض بیانات اس واقعے کو ۱۵ ہجری سے منسوب کرتے ہیں، لیکن زیادہ معتبر و مستند مآخذ ۲۰ ہجری کو ترجیح دیتے ہیں (دیکھیے الطبری، ۳: ۱۶۲؛ الیعقوبی، ۲: ۱۷۰؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۱۴۸ تا ۱۴۹؛ البلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۵۰؛ ابو یوسف، ص ۲۴)۔

یہ پہلا دیوان "دیوان الجند" تھا۔ یہ فہرست مدینۂ منورہ کے باشندوں، فتوحات میں حصہ لینے والی فوجوں اور ان افراد پر مشتمل تھی، جو صوبوں کی محافظ فوج میں شامل ہونے کے لیے اپنے خاندان سمیت نقل مکانی کر گئے۔ کچھ موالی بھی فہرست میں درج کیے گئے تھے، لیکن یہ طریق کار جاری نہ رہا۔ ناموں کے ساتھ تنخواہ اور راتب بھی مذکور ہوتے تھے (ابو عبید: کتاب الاموال، عدد ۵۶۲، ۵۶۷، ۵۶۸؛ الطبری، ۳: ۱۶۳)۔ علم الانساب کے تین ماہروں کی جماعت قبیلہ وار اندراج کرتی تھی اور تنخواہ گزشتہ اسلامی خدمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے ساتھ رشتے داری

کے مطابق مقرر کی جاتی تھی۔ قبیلہ وار اندراج کا سلسلہ اموی عہد کے اختتام تک جاری رہا [امام] ابو یوسفؒ، ص ۲۴، ۲۶ تا ۲۷؛ الطبری، ۴: ۱۶۲ تا ۱۶۳؛ الیعقوبی: تاریخ، ۲: ۱۳۲؛ ابو عُبَید: کتاب الاموال، عدد ۵۶۹، ۵۲۰، ۵۷۷؛ البلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۵۰ ببعد، ۴۵۷ تا ۴۵۹؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۱۴۹ تا ۱۵۰)۔ اسی قسم کے دیوان (الجُند) بصرے، کوفے اور فسطاط جیسے صوبائی صدر مقامات میں قائم کیے گئے (دیکھیے الجہشیاری، ص ۲۱، ۳۳؛ الثعالبی: اللطائف، ص ۵۹)۔ علاوہ ازیں، صوبوں میں بوزنطی اور ساسانی خراج کے دیوان (مالگزاری کے محکمے) پہلے کی طرح بدستور اپنا کام کرتے رہے (جہشیاری، ص ۳۸؛ قب ص ۳)۔

اموی عہد: دمشق کا دیوان الخراج مرکزی دیوان بن گیا اور اس کی اہمیت جتانے کے لیے اب اسے الدیوان کہنے لگے۔ یہ اراضی کی مالگذاری کی تشخیص اور وصولی کی نگرانی کرتا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (م ۶۰ھ/ ۶۸۰ء) کے تحت دیوان الرسائل (دیوان خط و کتابت) وجود میں آیا۔ خلیفہ تمام خط و کتابت پڑھتا اور اپنی رائے کا اظہار کرتا، پھر معتمد (کاتب) اس کے حسب منشا خطوط یا دستاویزات تیار کرتا تھا (الجہشیاری، ص ۲۴، ۳۴؛ القلقشندی، ۱: ۹۲)۔ حضرت معاویہؓ نے "دیوان الخاتم" یا "دفتر مہر" قائم کیا، جہاں اس خط یا دستاویز کی نقل تیار کی جاتی اور سنبھال کر رکھی جاتی تھی۔ پھر اصل کی جانچ پڑتال ہوتی، اور اس پر مُہر لگا کے ارسال کر دی جاتی۔ یہ انتظام جعلسازی کی روک تھام کے لیے کیا گیا تھا (جہشیاری، ص ۲۵؛ الثعالبی: لطائف، ص ۱۹؛ Nabia Abbott: *Kurrah papyri*، ص ۱۴؛ نیز دیکھیے Grohmann: *C P R*، ج ۳، Bd. ۱/۱، ۲۷ ببعد)۔ البلاذری کہتا ہے کہ یہ دفتر زیاد بن ابیہ، والی عراق نے سب سے پہلے فارسی اثرات کے تحت قائم کیا تھا (فتوح البلدان، ص ۴۶۴)۔ حضرت معاویہؓ نے "دیوان البرید" (ڈاک خانہ) کی بنا ڈالی جس کی تنظیم نو بعد میں عبدالملک (م ۸۶ھ/ ۷۰۵ء) نے کی تھی [مزید دیکھیے برید]۔

دیوان الجند اپنی فہرستوں کی تجدید کے لیے وقتاً فوقتاً عربوں کی قبیلہ وار مردم شماری کرتا رہا تھا۔ دیوان مصر نے پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے دوران میں تین بار مردم شماری کی، تیسری مردم شماری قرہ بن شریک نے ۹۵ھ میں کی تھی (الکندی: تاریخ الولاۃ، ص ۸۶؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۱۵۱)۔

دیوان النفقات (اخراجات)، جو غالباً ایک بوزنطی محکمے ہی کا سلسلہ تھا، کل اخراجات کا حساب رکھتا تھا (دیکھیے جہشیاری، ص ۴)۔ یہ بیت المال [رک بآں] سے وابستہ دکھائی دیتا ہے (جہشیاری، ص ۴۹)۔ دیوان الصدقہ کی بنیاد زکوٰۃ اور عُشر [رک بآنہا] کی تعیین کے لیے رکھی گئی تھی۔ ایک دیوان المستغلات، بظاہر، شہروں میں سرکاری اراضی اور عمارات، خصوصاً لوگوں کو کرائے پر دیے ہوئے "سوقوں" (- متدون) کے انتظام کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ دیوان الطراز پھریرے، علم، سرکاری وردیاں اور فرنیچر بنانے کا ذمے دار تھا۔ اس کے کاتب کا نام کپڑے پر لکھا ہوتا تھا (دیکھیے الجہشیاری، ص ۵؛ الصابی: الرسائل، ۱: ۱۴۱)۔

ہر صوبے میں ایک دیوان الخراج، جہاں کل مالیہ ("الوجوہ الاموال") جمع ہوتا، ایک دیوان الجند اور ایک دیوان الرسائل ہوتا تھا (الجہشیاری، ص ۱، ۲۳، ۲۴، ۲۷، ۳۶، ۴۴ تا ۴۵، ۶۰، ۶۱، ۶۳ تا ۶۴)۔ ایک دیوان کا کاتب اعلی حجاج کے تحت تین سو درہم ماہانہ تنخواہ پاتا تھا (الجہشیاری، ص ۶۱)۔

عبدالملک نے دیوان، طراز اور رائج الوقت سکوں میں عربیت پیدا کرنے کی حکمت عملی کا آغاز کیا۔

اب تک خراج کے دیوان مقامی زبانیں استعمال کرتے تھے: فارسی عراق اور ایران میں، یونانی شام میں، قبطی اور یونانی مصر میں؛ نیز وہ حساب کتاب رکھنے میں سابق طریقوں کا تتبع کرتے تھے حتّٰی کہ اکثر مقامی مہریں اور تاریخیں عام استعمال ہوتی تھیں۔ اب عربی علامات اور قواعد کو مروّج کیا گیا اور سابق نظام تقویم کو اسلامی قمری سال کے مطابق بنا دیا گیا (دیکھیے *PERF* عدد ۵۹۶، ۵۵۴، ۵۶۶، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۹، ۶۰۱؛ *CPR* ۳، Bd. ۱، Teil ۱ : ۸۷، Teil ۲، ccci)۔ سرکاری زبان بننے سے پہلے عربی کبھی کبھار استعمال ہوتی تھی (سب سے پہلا ورق بردی جو سلامت ہے اس کی تاریخ ۲۲ھ ہے۔ *PERF*، عدد ۵۵۸)۔ پھر بھی مقامی زبانیں دوسری صدی ہجری آٹھویں صدی عیسوی میں خاصی دیر تک وقتاً فوقتاً استعمال ہوتی رہیں (قب Grohmann : *Étude de papyrologie*، ۱ : ۷۷ تا ۹۷؛ *P. Lond*، ۴ : ۴۱۷؛ Nabia Abbott : کتاب مذکور، ص ۱۳ تا ۱۴)۔ سلطنت کے محکموں میں عربی کی ترویج درجہ بدرجہ ہوئی۔ ۷۸ھ/۶۹۷ء میں حجّاج نے عراق کے دیوانوں میں عربی رائج کی (الجہشیاری، ص ۳۹؛ البلاذری: فتوح البلدان، ص ۳۰۰ تا ۳۰۱؛ الصولی: ادب الکتّاب، ص ۱۹۲)؛ پھر ۸۱ھ/۷۰۰ء میں عبدالملک نے شام کے دواوین میں عربی رائج کی (البلاذری: فتوح البلدان، ص ۱۹۳؛ الجہشیاری، ص ۴۰؛ الصولی: ادب الکتّاب، ص ۱۹۲ تا ۱۹۳)۔ مصر کے دیوان ۸۷ھ/۷۰۵ء میں عربی ہوئے (الکندی: تاریخ ولاۃ مصر، ص ۸۰؛ ابن عبدالحکم: فتوح مصر و المغرب، ص ۱۲۲؛ المقریزی: الخطط، ۱ : ۱۵۰)۔ آخر میں، خراسان کے دیوان میں ۱۲۴ھ/۷۴۲ء میں الہشام کے عہد میں عربی سرکاری زبان قرار پائی (الجہشیاری، ص ۴۳ تا ۴۴)۔ ذمّیوں کو، جو ان محکموں میں کثرت کے ساتھ کاتب تھے، ہٹانا پڑا، لیکن کچھ بدستور ملازم رہے۔ موالی برابر ملازمت میں لیے جاتے رہے (قب الجہشیاری، ص ۶۱، ۶۷، ۳۸ تا ۴۰، ۵۱؛ Tritton : *The Caliphs and their non-Muslim subjects*، باب ۲؛ الکندی: تاریخ ولاۃ مصر، ص ۸۰؛ البلاذری: فتوح البلدان، ص ۱۹۳؛ von Kremer : *The Orient*، ص ۱۹۶ تا ۱۹۷)۔

عباسی عہد: بنو عباس نے دیوان کے اموی نظام میں توسیع کی اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور وزیر [رک باں] کے توسّط سے مرکزی دفتر سے ہدایات دینے کا انتظام کیا۔

السفّاح کے تحت بنو مروان کی ضبط شدہ اراضی کے لیے ایک دیوان قائم کیا گیا (الجہشیاری، ص ۹)۔ یہی غالباً ترقی کرکے "دیوان الضیاع" بن گیا، جو خلیفہ کی ذاتی جاگیر کی بھی نگرانی کرتا تھا (کتاب مذکور، ص ۲۷۷)۔

المنصور کے تحت سیاسی حریفوں کی جائدادوں کو ضبط کرنے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک عارضی دیوان بنایا گیا (الیعقوبی، ۳ : ۱۲۷؛ الفخری، ص ۱۱۵)۔ ایک "دیوان الاحشام" کا بھی ذکر ملتا ہے؛ یہ غالباً محل کے ملازمین کی دیکھ بھال کرتا تھا (Wiet۔ الیعقوبی: *Les Pays*، ص ۱۵)۔ ایک دیوان الرقاع (درخواستیں) بھی تھا، جس کا کام خلیفہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے درخواستیں جمع کرنا تھا (ابن طیفور: تاریخ بغداد، ج ۶)۔

المہدی کے عہد حکومت میں، ۱۶۲ھ/۷۷۸ء میں "دواوین زمام" (= نگرانی) کا ذکر آتا ہے؛ یہ زمام ہر دیوان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ۱۶۸ھ/۷۸۴ء میں تمام دواوین زمام کے اوپر ان کی نگرانی کے لیے ایک اور مرکزی دیوان، زمام الازمّہ قائم کیا گیا، جو تمام دواوین زمام کے حسابات کی جانچ پڑتال اور کام کی نگرانی کرتا اور واحد دیوان اور وزیر یا دیگر دواوین کے درمیان واسطے کا کام کرتے تھے (الجہشیاری، ۱۴۶، ۱۶۶، ۱۶۸؛ الطبری، ۱۰ : ۱۱؛ البلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۶۴)۔ دیوان المظالم کو

سرکاری گماشتوں کے خلاف لوگوں کی شکایات پر غور کرنے کے لیے بنایا گیا تھا ۔ اس دیوان میں قاضی اجلاس کرتے تھے (الفخری، ص ۱۳۱) .

معلوم ہوتا ہے کہ دیوان الخراج تمام محاصل اراضی کی دیکھ بھال کرتا تھا، جب کہ دیوان الصدقۃ کا کام مویشیوں کی زکوٰۃ تک محدود تھا (قب الیعقوبی: کتاب البلدان، ص ۱۱؛ [امام] ابو یوسفؒ: کتاب الخراج، ص ۸۰ تا ۸۱)۔ اس کی مختلف شاخیں تھیں، جن میں جہبذ کی شاخ بھی شامل تھی جو حسابات کی پڑتال اور مالیہ کی مدات کی کیفیت کی جانچ کے لیے تھی (الجہشیاری، ص ۲۲۰ تا ۲۲۱؛ التنوخی: الفرج، ۱ : ۳۹ تا ۴۰ [مزید دیکھیے جُہبذ] ـ ایک اور شاخ تھی، جس کا نام "مجلس المسکدار" تھا، جہاں موصول ہونے والے اور باہر بھیجے جانے والے خطوط اور دستاویزات کی مثلیں متعلقہ افراد کے ناموں کے ساتھ تیار کی جاتی تھیں ۔ یہی شاخ "دیوان البرید" میں اور "دیوان الرسائل" میں پائی جاتی ہے (الجہشیاری، ص ۹۹؛ الخوارزمی: مفاتیح العلوم، ص ۳۳، ۵۰)۔ "دیوان الخراج" کے خطوط کی جانچ پڑتال "دیوان الخاتم" میں ہوتی تھی اور اس دفتر میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے الرُشید نے اپنے وزیر کو براہ راست خطوط بھیجنے کی اجازت دی تھی (الجہشیاری، ص ۱۷۸).

المتوکّل کے عہد حکومت میں دیوان الموالی و الغلمان کا ذکر بھی آتا ہے جو شاید دیوان الاحشام کا دوسرا نام ہے۔ اس کا تعلّق محل کے غلاموں اور متوسّلین سے ہوتا تھا جن کی تعداد بہت زیادہ تھی (الیعقوبی : کتاب البلدان، ص ۲۳).

"دیوان الخاتم" جسے "دیوان السِّر" (صیغۂ راز) بھی کہتے تھے (الجہشیاری، ص ۱۷۷)، اس بنا پر خاص اہمیت رکھتا تھا کہ اس کے سربراہ کا خلیفہ سے قریبی رابطہ ہوتا تھا (قب الطبری، ۱۰ : ۵۱ تا ۵۲).

صوبوں میں خراج، جُند اور رسائل کے مقامی دیوان ہوتے تھے جو مرکزی دیوانوں کی چھوٹے پیمانے پر نقل ہوتے تھے (قب الجہشیاری، ص ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۷۷، ۲۲۰ تا ۲۲۱).

کبھی کبھی ایک نامور کاتب کا ایک سے زیادہ دواوین پر تقرر کر دیا جاتا تھا (کتاب مذکور، ص ۲۶۶؛ قب ص ۱۷۹) ۔ مامون کے عہد تک "کتّاب" کی تنخواہیں تین سو درہم سے دس درہم ماہوار تک ہوتی تھیں (الجہشیاری، ص ۲۳؛ ۱۲۶، ۱۳۱ تا ۱۳۲) ۔ الجاحظ کہتا ہے کہ مامون کے بعد سب سے زیادہ تنخواہ پانے والا کاتب الخراج تھا (قب ثلاث رسائل، طبع Finkel، ص ۴۹) ۔ (مزید دیکھیے مادۂ کاتب).

دیوان تیسری، چوتھی صدی ہجری / نویں، دسویں صدی عیسوی میں پوری طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تھے .

دیوان الخراج کے پاس عموماً مقامی (صوبائی) دیوانوں کی مثلوں کی نقول ہوتی تھیں، لیکن تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے وسط تک ہر صوبے کا دارالخلافت میں ایک خاص دیوان (الخراج) الگ الگ تھا ۔ المعتضد نے ان تمام دیوانوں کو باہم ملا کر ایک دیوان بنا دیا جسے دیوان الدار (یا دیوان الدار الکبیر) کہتے تھے ۔ اس کے جانشین المکتفی کے عہد میں دوبارہ تین دیوان بنا دیے گئے : دیوان المشرق، مشرقی صوبوں کے لیے؛ دیوان المغرب، مغربی صوبوں کے لیے اور دیوان السواد عراق کے لیے ۔ علی بن عیسیٰ دیوان السواد کو اہم ترین دیوان خیال کرتا تھا (مسکویہ : تجارب الأمم، ۱ : ۱۵۲) ۔ بہر حال المقتدر کے عہد میں بھی ایک مرکزی دفتر دیوان الدار موجود تھا ۔ تینوں دیوان وزیر یا اس کے بعد کے کسی ایک کاتب کے ماتحت رہے، اور انھیں ابھی تک دیوان الدار کی شاخیں تصور کیا جاتا تھا (قب الصابی،

کتاب الوزراء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۴؛ ۱۳۱ تا ۱۳۲، ۲۶۲؛ یاقوت: ارشاد، ۱: ۲۲۶؛ العریب، ص ۲۴؛ مسکویہ، ۱: ۱۵۱ تا ۱۵۲؛ Bowen: علی بن عیسٰی، ص ۳۱ تا ۳۲)۔ ایسا معلوم ہے کہ دار یا محل دارالوزارۃ یا وزیروں کی اقامت گاہ پر دلالت کرتا ہے (قب الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۱۳۰)۔ دیوان الدار کا کاتب عمّال کے ساتھ براہ راست خط و کتابت کرنے کا مجاز تھا (الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۱۷۷)۔ بنو بویہ کے قبضے (۳۳۴ھ/۹۴۵ء) کے بعد خلافت کے حصے بکھرے ہو جانے کے باعث ہم فقط دیوان السواد ہی کا نام سنتے ہیں (قب صابی: تاریخ الوزراء، ص ۴۶۷ تا ۴۶۸)۔

خراج کے دیوانوں کے پاس اراضی کے رقبوں، محاصل کی شرحوں، نقد یا جنس میں، اور مستعمل اوزان کی فردیں رہتی تھیں (الماوردی: کتاب مذکور، ص ۱۸۲ تا ۱۸۳؛ الخوارزمی: مفاتیح العلوم، ص ۳۷)۔ وہ خراج، جزیہ اور زکوٰۃ کی آمدنی وصول کرتے تھے (الحسن بن عبداللہ: آثار الاُوَل (بولاق ۱۲۹۵/۷۲)۔ "دیوان العشر" کے نام سے الماوردی کے مطابق اس دیوان کی ایک شاخ ہی ہو سکتا تھا (الماوردی، ص ۱۸۲)۔

جب دیوان الدار بنایا گیا تو زمام کے متعلقہ دیوانوں کو یکجا کر دیا گیا (الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۷۳، ۸۴؛ وہی مصنف: تاریخ، ص ۴۶۸)۔ زمام "بیت المال اور لوگوں کے حقوق کا نگہبان ہوتا تھا" (الماوردی، ص ۱۸۹)۔ یہ دیوان الخراج میں اراضی سے متعلقہ دستاویزات کی ایک اور نقل رکھتا تھا، اور مالیے کی تشخیص اور رقوم کی ادائی اور وصولی کے احکام کی جانچ پڑتال کرتا تھا (الماوردی، ص ۱۹۰ تا ۱۹۱)۔ المعتضد کی عطا کردہ اقطاع جو وزیر اور دیوان الدار کے کاتب کی منظور شدہ ہوتی تھی، اس کا انتقال دیوان الزمام کا کاتب اس وقت تک نہ ہونے دیتا تھا جب تک کہ وہ اپنے اندراجات میں اس اقطاع کی پڑتال نہ کر لیتا تھا (الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۶۸۳)۔

دیوان النفقات کا تمام دیوانوں سے سروکار تھا۔ وہ ان کے اخراجات کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرتا اور اس کے بارے میں اپنی رائے لکھتا تھا (الحسن بن عبداللہ: کتاب مذکور، ص ۷۱)۔ تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے اختتام پر اس کا زیادہ تر واسطہ دارالخلافت کی ضروریات سے رہ گیا (Mez (عربی)، ۱: ۱۲۵؛ قب الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۱۱ ببعد)۔ یہ متوالی اور جاریہ اخراجات کی مثلیں رکھتا تھا (الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۱۶)، اور اس کے کئی ذیلی شعبے تھے جو اخراجات کی مختلف مدات سے سروکار رکھتے تھے (قب Mez (عربی)، ۱: ۱۲۵، تا ۱۲۶)۔ نفقات کا زمام بھی تھا اور ۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں اس کے کاتب کے پاس خزائن کا زمام بھی ہوتا تھا (الصولی: اخبار الراضی و المتقی، ص ۶۱؛ مسکویہ، ص ۱۵۲)۔

"بیت المال کا دیوان" جسے الدیوان السامی بھی کہتے تھے، بیت المال میں داخل ہونے والے نقود و اجناس کے ذرائع کی قسم وار مثلیں رکھتا تھا، اور اس کی تحویل میں مختلف اقسام کے محاصل کے لیے خزانہ اور ہر ایک کے لیے ایک چھوٹا دیوان ہوتا تھا، مثلاً دیوان الخزانہ (کپڑے اور روپے کے لیے)، دیوان الاہراء (اناج کے لیے)، اور دیوان خزانۃ السلاح (اسلحہ کے لیے) (الحسن بن عبداللہ: کتاب مذکور، ص ۷۲؛ قب الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۱۶)۔ یہ دیوان آمدنی کی تمام مدات کی پڑتال کرتا تھا اور اسی سے اخراجات کی منظوری لینا پڑتی تھی۔ وزیر تمام ہنڈیوں اور روپے کی ادائی اس کے کاتب کا نشان دیکھ کر کرتا تھا (Mez (عربی)، ۱: ۱۲۶ تا ۱۲۷)۔ یہ دیوان عموماً ماہانہ اور سالانہ آمد و خرچ کی فہرستیں یا فردیں تیار کرتا تھا۔ (۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں علی بن عیسٰی نے ہفتہ وار فردیں تیار کرنے کی استدعا کی تھی۔ مسکویہ، ۱: ۱۵۱ تا ۱۵۲؛ الصابی: تاریخ الوزراء، ۳۰۳، ۳۰۶)۔

دیوان الجهبذه بیت المال [زرک بآں] هی کی ایک شاخ تھی (مزید دیکھیے دفتر، جهبذ)۔ دیوان الضیاع خزانے کی جاگیروں کا انتظام کرتا تھا (الهمدانی: تکمله، ص ۱۸؛ مسکویه، ۱: ۲؛ قب الصابی: الرسائل، ۱: ۱۳۹)، تاهم وقتاً فوقتاً هم ایک سے زائد دیوان الضیاع کے نام سنتے میں آتے هیں۔ ۳۲۵ھ میں دیوان الضیاع الخاصّه والمستحدثه تھا (یعنی خلیفه کی ذاتی اور نئی حاصل کی هوئی جاگیریں)، اور دیوان الضیاع الفراتیه (یعنی دریاے فرات کے کنارے کی جاگیریں) (الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۲۲۳ تا ۲۲۴؛ مسکویه، ۱: ۱۵۲)۔

۳۰۴ھ/۹۱۶ء میں ابن الفرات نے ایک دیوان المرافق قائم کیا (لفظی ترجمه امدادیں؛ رشوتیں، یعنی جو والیان صوبه ادا کرتے تھے، صریحاً اس دولت سے، جو مشتبه ذرائع سے اکھٹی کی هوتی تھی)۔ مرافق کی رقم ان دنوں شام سے ایک لاکھ دینار سالانه اور مصر سے دو لاکھ دینار آتی تھی۔ علی بن عیسٰی نے مرافق کی ممانعت کر دی، کیونکه ان سے انتظامیه میں بدعنوانیاں پیدا هوتی تھیں (مسکویه، ۱: ۴۳، ۱۰۸، ۱۳۱ تا ۱۳۲؛ الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۳۱ تا ۳۲، ۸۱)۔

اگرچه هر دیوان میں، جو مالیات کا کام کرتا تھا، زمام (محکمهٔ نگرانی) هوتا تھا، مگر وقتاً فوقتاً زمام کے تمام دیوان ایک هی شخص کو سونپ دیے جاتے تھے۔ ۲۹۵ھ/۹۰۷ء میں یک روزه کے خلیفه ابن المعتزّ کے وزیر نے تمام "اصول" (حقیقی دیوان) علی بن عیسٰی کے تحت اور زمام کے دیوان ابن عبدون کے تحت کر دیے (مسکویه، ۱: ۶۰)۔ ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں جمله زمام کو ایک کاتب اور "اصول" کو وزیر کے ماتحت کر دیا گیا (مسکویه، ۱: ۲۲۶)۔ اس کا اعاده ۳۲۵ھ/۹۳۶-۹۳۷ء اور ۳۲۷ھ/۹۳۸-۹۳۹ء میں کیا گیا (الصولی: اخبار الراضی والمتقی، ص ۸۷، ۱۳۷)۔

دیوان الجند کے پاس افواج کی فهرست رهتی تھی، جس میں ان کے عهدوں اور ان کی تنخواهوں یا اقطاع کے مطابق درجه بندی هوتی تھی۔ یه دو حصوں پر مشتمل هوتی تھی، ایک تنخواه (عطاء [زرک بآں]) اور اخراجات کی، اور دوسری فوج کی بھرتی اور جماعت بندی (تصنیف) کی (الجاحظ: ثلاث رسائل، ص ۴۹)؛ قدامه انهیں مجالس التقریر اور مجالس المقابله سے موسوم کرتا هے، Mez (عربی)، ۱: ۱۶۵۔ نیز دیکھیے الماوردی، ص ۱۷۹ تا ۱۸۰۔ اس دیوان کا ایک زمام تھا، جسے دیوان زمام الجیش کهتے تھے جو اس کے حساب کتاب اور خرچ پر نگرانی رکھتا تھا (مسکویه، ۱: ۱۵۲)۔

دیوان الرسائل براه راست وزیر یا ایک کاتب کے ماتحت هوتا تھا۔ مکتوبات اور دستاویزات کا مسوده وزیر (یا خلیفه) کی هدایات پر کاتب اول تیار کرتا تھا، اور جب وه اس کی منظوری دے دیتا تو پھر اس کی آخری نقل تیار کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی خاص خوشنویس (محرّر) یه آخری نقل تیار کرتا تھا۔ تین سال کے بعد مکتوبات اور دستاویزات الخزانة العظمٰی (بڑے محافظ خانے) میں بھیجی جاتی تھیں تاکه وهاں ان کی آخری تسم بندی کی جاے، اور فهرست بنائی جاے (القلقشندی، ۱: ۹۶؛ ابن الصیرفی: قانون دیوان الرسائل، ص ۹۳، ۱۰۰ تا ۱۰۳، ۱۰۸ و بعد، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۴۳ تا ۱۴۵؛ الجاحظ: ثلاث رسائل، ص ۴۹؛ الخوارزمی: مفاتیح العلوم، ص ۵۰؛ قب الصابی: تاریخ الوزراء، ص ۹۰، جهاں "دیوان الخرائط" استعمال هوا هے)۔ دیوان الفض، جو غالباً ابتدا میں دیوان الرسائل کا ایک شعبه تھا، مکتوبات اور دستاویزات وصول کرتا، انهیں کھولتا اور ان کی قسم بندی کرتا، ان کی پشت پر ان کے مندرجات کا خلاصه لکھتا، انهیں وزیر کے سامنے پیش کرتا اور ان کی تحریری یاد داشت رکھتا تھا (Mez (عربی)، ۱: ۱۳۰ تا ۱۳۱؛ ابن الصیرفی: کتاب مذکور، ص ۱۰۸؛ التوحیدی: الامتاع والمؤانسة، ۱: ۹۸)۔ ۳۱۵ھ میں قص اور خاتم کو ایک دیوان

میں جمع کر دیا گیا (مسکویہ، ۱ : ۱۵۲)۔

۳۰۱ھ میں علی بن عیسیٰ نے مذہبی خیرات و مبرّات ("وقوف" اور "صدقات") کے انتظام کے لیے ایک دیوان البِرّ قائم کیا۔ اس کی آمدنی مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے مقدس مقامات اور بوزنطی محاذ جنگ کے رضاکاروں پر خرچ کی جاتی تھی (مسکویہ، ۱ : ۲۵۷؛ قب ص ۱۵۱)۔ دیوان الصدقات بدستور مویشیوں پر زکوٰۃ لگاتا رہا۔ ۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں ایک ہی کاتب البرّ اور صدقات کے دونوں دیوانوں کی نگرانی کرتا تھا (مسکویہ، ۱ : ۱۵۲؛ صابی : رسائل، ص ۱۱۱)۔

دیوان الحَرَم کا ذکر بھی آتا ہے، جو محل کے زنان خانے کے امور کی نگرانی کرتا تھا (مسکویہ، ۱ : ۱۵۲)۔

ضبط شدہ املاک کے انتظام کے لیے ایک دیوان تھا، جسے دیوان المصادرین کہتے تھے (صابی : وزراء، ص ۳۰۶، ۳۱۱)۔ ترقیوں کی دو نقلیں تیار کی جاتی تھیں، ایک دیوان کے لیے اور دوسری وزیر کے لیے (مسکویہ، ۱ : ۱۵۵)۔ ضبط شدہ جاگیروں کے انتظام کے لیے دیوان الضیاع المقبوضہ بنایا گیا تھا (صابی : وزراء، ۲۰، ۳۰؛ مسکویہ، ۱ : ۸۴؛ ھمدانی : تکملہ، ص ۸۳، جہاں ایک "دیوان المخالفین" کا بطور املاک مؤنس کے منتظم کے ذکر کیا گیا ہے)۔

یہ بات واضح ہے کہ ایک ہی دیوان کے الگ الگ شعبوں کو بھی بعض اوقات دیوان کہتے تھے؛ نیز بعض دیوان مختصر مدت کے لیے ہوتے تھے اور انھیں عارضی ضروریات کے لیے قائم کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں بعض اوقات ایک سے زائد دیوان ایک کاتب کے ماتحت ہوتے تھے (دیکھیے صابی : وزراء، ص ۲۷، ۱۲۳ تا ۱۲۴)۔

معتضد کے عہد حکومت میں پھر دو دن کی تعطیل کی جانے لگی تھی، منگل کو آرام کے لیے اور جمعے کو نماز کے لیے (صابی : وزراء، ص ۲۲۳)۔

دیوانوں کے سربراہوں کی تنخواہوں میں تفاوت پایا جاتا تھا۔ چوتھی صدی ھجری/دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں دیوان السواد کا کاتب ۵۰۰ دینار ماہانہ وصول کرتا تھا اور دیوان العطاء کا کاتب صرف دس دینار۔ ۳۱۴ھ میں علی بن عیسیٰ نے تنخواہوں میں ایک تہائی کی کمی کر دی، لہٰذا دیوان السواد کے کاتب کو ۳۳۳ $\frac{1}{3}$ دینار ملتے تھے اور دیوان الفضّ اور دیوان الخاتم کے کاتبوں کو دو دو سو دینار۔ دیوان المشرق اور دیوان الضیاع الخاصّہ والمستحدثہ کے کاتبوں میں سے ہر ایک کو ۱۰۰ دینار، دیوان الدار کے کاتب کو ۵۰۰ دینار اور زمام کے دیوانوں کے ہر ناظم کو مع اپنے کُتّاب کے ۲۷۰۰ دینار (صابی : وزراء، ص ۲۰، ۸۴، ۱۷۷، ۱۷۸، ۳۱۴؛ قب کتاب مذکور، ص ۲۰ تا ۲۱؛ مسکویہ، ۱ : ۶۸)۔ کفایت شعاری کے اقدامات کے پیش نظر علی بن عیسیٰ نے سال کو گھٹا کر تنخواہ کے ۸ تا ۱۰ ماہ کا کر دیا اور یہ عام معمول ہو گیا (صابی : وزراء، ص ۳۱۳؛ مسکویہ، ۱ : ۱۵۲)۔

بویہی عہد (۳۳۴ تا ۴۴۷ھ/۹۴۵ تا ۱۰۵۵ء) تک بھی ہم دیوان السواد، مع اس کے ایک کاتب اور ایک معاون کاتب (خلیفہ) کے، نیز دیوان الضیاع (یا الضیاع الخاصّہ) کا نام سنتے ہیں (صابی : تاریخ، سال ۳۹۰ھ، ص ۳۰۱ تا ۳۰۲، سال ۳۹۲ھ، ص ۴۶۷ تا ۴۶۸؛ مسکویہ، ۲ : ۱۲۰ تا ۱۲۱؛ ابوشجاع : ذیل تجارب الامم، ص ۱۷۴)۔ مالیات کے مرکزی دیوان کو اب "الدیوان" کہتے تھے؛ یہ وزیر کے ماتحت یا اس سے اگلے درجے کے کاتب کے ماتحت ہوتا تھا (دیکھیے مسکویہ، ج ۲، سال ۳۳۸ھ، ص ۲۴۲، ۲۶۳، ۲۶۶؛ ابوشجاع، ص ۱۴۳)۔ ۳۸۹ھ/۹۹۹ء میں بغداد کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے پر عشر عائد کرنے کے لیے ایک خاص دیوان بنایا گیا (صابی :

تاریخ، ص ۳۶۴) ۔ دیوان النفقات ایک خاص "زمام" کے ساتھ (مسکویہ ۲ : ۱۲۰ تا ۱۲۱) اخراجات کے حساب کتاب اور رقم کی جانچ پڑتال کے لیے جاری رہا (دیکھیے صابی : تاریخ، ص ۳۵۳، ۳۵۷) ۔ تاہم مالیاتی دیوانوں کی نگرانی کے لیے دیوان الزمام بھی موجود تھا (کتاب مذکور، ص ۳۶۷ تا ۳۶۸) خزانے کے دیوان کو دیوان الخزائن یا دیوان الخزن کہتے تھے (ابوشجاع، ص ۷۶؛ صابی : تاریخ، ص ۳۶۸؛ الخوارزمی : مفاتیح، ص ۴۱) ۔ اس دیوان کا سربراہ خازن یا ناظر کہلاتا تھا اور وقتاً فوقتاً دارالضرب بھی اس کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا (ابو شجاع، ص ۲۵۰ تا ۲۵۱) ۔ تاہم التوحیدی دارالضرب کے لیے ایک اور دیوان کا ذکر کرتا ہے، جسے دیوان النقد و العیار و دارالضرب کہتے تھے (امتاع، ۱ : ۹۸) ۔

دیوان الجند دو دیوانوں میں منقسم تھا، ایک دیلمیوں کے لیے اور دوسرا ترکوں کے لیے (فوج کے دو بڑے عنصر یہی تھے)، اور اسے دیوان الجیشین کہتے تھے (صابی : تاریخ، ص ۳۶۷ تا ۳۶۸) ۔ تاہم ان دونوں کا سربراہ یا بخشی ایک ہی ہوتا تھا، جسے "العارض" کہتے تھے (ابو شجاع، ص ۲۵۸) ۔

بنو فاطمہ : فاطمی دیوان بنیادی طور پر عباسیوں کے دیوانوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ دیوان الرسائل یہاں دیوان الانشاء ہو جاتا ہے؛ اس کا سربراہ "صاحب دیوان الانشاء" یا "کاتب الدست الشریف" کہلاتا ہے ۔ اس دیوان کی تفصیلی روداد سے، جو ابن الصیرفی نے دی ہے، پتا چلتا ہے کہ یہ عباسی دیوان کے مانند تھا (دیکھیے ابن الصیرفی : قانون دیوان الرسائل، طبع اے ۔ بہجت، قاہرہ ۱۹۰۵ء؛ المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۴۳، ۳۰۶؛ ۳ : ۱۴۰؛ القلقشندی، ۳ : ۴۹۰؛ ۱ : ۱۰۳، ۲ : ۱۰، ۳؛ ابن القلانسی : ذیل تاریخ دمشق، ص ۸۰؛ شیال : الوثائق الفاطمیہ، ص ۳۶۵) ۔

دیوان الجند کو "دیوان الجیش" یا "دیوان الجیش والرواتب" (فوجوں اور تنخواہوں کا دفتر) کہتے تھے ۔ یہ دو شعبوں پر مشتمل تھا : دیوان الجیش ایک مستوفی کے ماتحت ہوتا تھا، اور اس کا سروکار فوجی بھرتی، فوج کے ساز و سامان اور فوجوں کے معائنے سے تھا اور دیوان الرواتب تنخواہ سے متعلق تھا ۔ بہر حال دیگر حوالوں سے مترشح ہوتا ہے کہ دونوں دیوان عموماً علحدہ علحدہ ہوتے تھے، پہلا صاحب دیوان الجیش کے ماتحت تھا اور مؤخر الذکر کا سروکار فوجیوں اور غیر فوجی ملازمین کی تنخواہوں سے تھا (دیکھیے المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۴۲؛ القلقشندی، ۳ : ۴۹۲ تا ۴۹۳، ۴۹۵؛ (۳) قب ابن الصیرفی : اشارہ، ص ۲۵، ۴۷؛ المقریزی : اتعاظ، سال ۵۳۲؛ شیال : الوثائق، ص ۳۰۴) ۔ بنو فاطمہ جنگی بیڑے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے، ان کے ہاں ایک دیوان ہوتا تھا، جو جہازوں کی تعمیر اور ان کے لشکروں کی دیکھ بھال کرتا تھا (القلقشندی، ۳ : ۴۹۶) ۔

مالیات کے دیوانوں کے معاملات الجھے ہوئے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوان المجالس مرکزی محکمہ تھا، اس کے مختلف شعبے تھے، ان میں سے ایک کا کام جاگیروں (اقطاعات) سے متعلق تھا ۔ یہ غالباً عباسیوں کے الدیوان کے مانند تھا ۔ یہ بوقت ضرورت تمام دیوانوں سے تخمینے حاصل کرنے کے بعد میزانیہ کا تخمینہ (استیمار) تیار کرتا تھا (المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۳۶ ببعد؛ ۱ : ۱۶۰ تا ۱۶۲؛ دیکھیے ۲ : ۲۴۵؛ شیال : الوثائق، ص ۳۲۵) ۔ دیوان النظر کے ہاتھ میں مالیات (اموال) کے دیوانوں اور ان کے عمال کی نگرانی تھی ۔ یہ عباسیوں کے مرکزی دیوان الخراج کے مشابہ معلوم ہوتا ہے (دیکھیے شیال : الوثائق، ۱ : ۳۰۴؛ ابن الصیرفی : اشارہ، ص ۳۵؛ المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۴۱؛ القلقشندی، ۳ : ۴۹۳) ۔ دیوان التحقیق دیوان النظر سے وابستہ تھا، لیکن اس کا کام مالیات کے دوسرے دیوانوں کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال

کرتا تھا۔ یہ عباسیوں کے مرکزی زمام کے برابر تھا (المقریزی، ۲ : ۲۴۲؛ القلقشندی، ۳ : ۴۹۳؛ ۱ : ۱۰۴؛ ابن میسّر: اخبار، ص ۴۳)۔

دیوان الخاص، محل کے مالی امور کی نگہداشت کرتا تھا (المقریزی: اِتّعاظ، ص ۲۰۰)۔ وقف کا دفتر دیوان الاحباس تھا (القلقشندی، ۳ : ۹۵، ۴۹۴ تا ۴۹۵)۔ لاوارث اور ضبط شدہ املاک کے انتظام کے لیے دیوان المواریث الحشریہ قائم کیا گیا تھا (ابن میسّر، ص ۵۶؛ القلقشندی، ۳ : ۴۹۶)۔ "مظالم" خلیفہ یا وزیر کے سامنے پیش ہوتے تھے؛ ان کا بندوبست کرنے کے لیے دو کاتبوں سمیت ایک دیوان التوقیع تھا (المقریزی: اِتّعاظ، ص ۲۰۷، القلقشندی ص ۴۹۱)۔

کاتبوں کی تنخواہوں میں تفاوت تھا۔ انشاء کے کاتب کو ۱۵۰ دینار ماہانہ، نظر کے کاتب کو ۷۰ دینار، بیت المال کے کاتب کو ۱۰۰، اور تحقیق کے کاتب کو ۵۰ دینار ملتے تھے، اور جیش، توقیع مجلس اور اقطاع کے کاتبوں میں سے ہر ایک کو چالیس دینار، کمتر درجے کے کاتبوں کو ۵ سے ۱۰ تک (القلقشندی، ۳ : ۵۲۶؛ المقریزی: الخطط : ۲ : ۲۴۳)۔ غیر مسلموں کو کثرت سے دیوانوں میں ملازم رکھا جاتا تھا اور اس کے باعث وقتاً فوقتاً ان سے مخالفت پیدا ہوتی تھی (دیکھیے ابن القلانسی، ص ۹۵؛ ابن العبری: تاریخ، ص ۲۷۰؛ ابن الصیرفی: الاشارہ، ص ۳۴، ۳۵، ۴۸، ۵۳؛ Tritton، کتاب مذکور، باب ۲)۔

گیارھویں سے تیرھویں صدی تک: بویہی عہد سے دیوان الرسائل کو دیوان الانشاء کہا جاتا تھا اور اس کے دبیر (سیکرٹری) کو "کاتب الانشاء" (ابوشجاع، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴؛ ابن الجوزی: المنتظم، ۹ : ۵۵؛ ۱۰ : ۱۲۵؛ ابن الفُوَطی: حوادث، ص ۱۶؛ ابن الساعی: جامع، ۹ : ۲۲۲)۔ مرکزی دفتر "الدیوان" تھا (دیکھیے ابن الجوزی، ۹ : ۹۱، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۸۳)۔ اس کا سربراہ وزیر ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی دبیر بھی ہوتا تھا، جسے صاحب الدیوان کہتے تھے (ابن الجوزی، ۱۰ : ۵۶، ۱۶۵، ۱۲۵)۔ بعد ازاں اسے الدیوان العزیز کہنے لگے تھے۔ (دیکھیے الفُوَطی، ۴۷، ۶۳، ۸۸؛ ابن الساعی: جامع، ۹ : ۲۸۵)۔

مالیات، فی الاصل دیوان الزمام کی ذمے داری تھی، جو فی الواقع دیوان الخراج کا کام کرتا تھا؛ جاگیروں کے مستاجر اور والیان صوبہ اسے مالیہ بھیجتے تھے (ابن الساعی، ۹ : ۱۶)۔ اس کے دو شعبے تھے: بڑے دیوان کا سربراہ کاتب (کاتب الزمام) (دیکھیے ابن الجوزی، ۹ : ۱۵۰، ۲۲۳؛ ۱۰ : ۲۷، ۱۲۳) تھا، جسے بعد میں صدر کہنے لگے۔ دوسرے شعبے کا سربراہ ایک مشرف ہوتا تھا، جو دیوان کے کام کی اور آمدنی کی نگرانی کرتا تھا (ابن الساعی، ۹ : ۹۸ تا ۹۹، ۱۱۸؛ ابن الفُوَطی، ص ۱۶، ۹۲، ۶۳)۔ ہر صوبے (یا ضلع) میں بھی اسی قسم کا دیوان تھا، جس کا سربراہ ایک ناظر اور ایک مُشرف ہوتا تھا (ابن الفُوَطی، ص ۶۳، ۱۰۱)۔

المخزن المعمور جو آگے چل کر المخزن (خزانہ) ہو گیا تھا، بیت المال کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس کے سربراہ صاحب المخزن کی جگہ ناظر یا صدر نے لے لی تھی۔ یہ دیوان دارالضرب کی نگرانی بھی کرتا تھا (دیکھیے ابن الجوزی، ۱۰ : ۲۳ تا ۲۵، ۵۲، ۱۲۵؛ ۹ : ۱۲۵، ۱۵۵، ۲۱۶)۔ اس کا مرتبہ بہت بلند تھا (قب ابن الجوزی، ۹ : ۲۰۳)۔ ۵۹۴ھ/۱۱۹۸ء میں اس کے صدر کو تمام دیوانوں پر اختیار دے دیا گیا (ابن الساعی، ۹ : ۲۵)۔ اس کے بہت سے شعبے تھے اور ہر ایک کا سربراہ ایک ناظر ہوتا تھا مثلاً خزانۃ الغلّات (ابن الفُوَطی، ص ۷، ۳۴۔ دیکھیے ابن الجوزی، ۹ : ۸۳؛ ۱۰ : ۵۲؛ ابن الساعی، ۹ : ۱۰۳، ۱۲۷۔ اس نے تقرر کی رسم کا حال بیان کیا ہے، ص ۱۰۱)؛ یہاں بھی ایک مشرف ہوتا تھا جو

مخزن کی نگرانی کرتا تھا ۔ اِشراف واضح طور پر سابقہ زمام کی جگہ لے لیتا ہے (ابن الفُوَطی، ص ۱۰۳؛ ابن الساعی، ۹ : ۲۰، ۲۲۹)۔

دیوان الجوالی (یعنی جزیہ) جزیہ کی تشخیص و تعین کی نگرانی کرتا تھا (دیکھیے جوالی، جزیہ)۔ لاوارث جائداد کے انتظام کے لیے ایک نیا محکمہ دیوان الترکات الحشریہ قائم کیا گیا (ابن الساعی، ص ۱۰۷؛ ابن الجوزی، ۱۰ : ۶۸)۔ دیوان العقار، جس کا سربراہ ایک ناظر ہوتا تھا، عمارات کی نگرانی کرتا تھا، مثلاً دکانیں جو حکومت کی مملوکہ ہوتی تھیں (ابن الفُوَطی، ص ۹۳؛ قب ابن الجوزی، ۱۰ : ۲۴۳)۔ تاہم تعمیر و مرمت کا کام ایک دوسرے محکمے سے تعلق رکھتا تھا جسے دیوان الابنیہ (محکمۂ تعمیرات) کہتے تھے ۔ اس کے عملے میں مہندس اور ماہران تعمیرات ہوتے تھے (ابن الساعی، ۹ : ۹۳، ۱۸۴)۔ ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ - ۱۲۳۸ء میں اس نے بغداد کی فصیل کی مرمت میں حصہ لیا (ابن الفُوَطی، ص ۱۱۰)۔ دیوان الحِسبہ عموماً قاضی القضاۃ یا ایک نائب کے ماتحت ہوتا تھا (ابن الساعی، ۹ : ۱۶؛ ابن الفُوَطی، ص ۹۴)۔

خلافت کے اختتام تک مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم مالیاتی دفاتر میں کام کرتے تھے ۔ ان کے خلاف وقتاً فوقتاً قدغنیں عائد کی جاتی تھیں، مگر فقط عارضی طور پر ۔ ۵۳۳ھ/۱۱۳۹ء میں یہودیوں اور عیسائیوں کو الدیوان اور المخزن سے معطل کر دیا گیا لیکن ایک ہی ماہ بعد انھیں واپس بلا لیا گیا (ابن الجوزی، ۱۰ : ۷۸)۔ ایسے احکام کے (مثلاً ۶۰۱ھ میں النّاصر لِدین اللہ کے) تکرار ہی سے ظاہر ہے کہ ان پر عمل درآمد نہیں ہوا اور غیر مسلم بدستور ملازمت میں رہے (ابن الساعی، ۹ : ۱۶۲)۔

مآخذ : مقالے میں درج ہیں ۔ مزید دیکھیے Nabia Abbott : *The Kurrah papyri*، شکاگو ۱۹۳۸ء؛ (۲) *British Museum Greek Papyri IV. the Aprodito Papyri*، طبع H. I. Bell، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۳) *National Bibliothek Papyrus Erzherzog Rainer*، وی انا ۱۸۹۵ء؛ (۴) *Corpus Papyrorum Raineri Archiducis Austriae III*، طبع Adolf Grohmann، ۱۹۲۳ تا ۱۹۳۴ء؛ (۵) H. F. Amedroz : *Abbasid administration in its decay ...*، در *JRAS*، ۱۹۱۳ء، ص ۸۲۳ تا ۸۴۲؛ (۶) H. Bowen : *The life and times of ʿAlī b. ʿīsa*، کیمبرج ۱۹۲۸ء؛ (۷) A. A. Duri : النُّظُم الاسلامیہ، ج ۱، بغداد ۱۹۵۰ء؛ (۸) R. Levy : *The social structure of Islam*، کیمبرج ۱۹۵۷ء، ص ۳۲۵ ببعد؛ (۹) S.A.Q. Husaini : *Arab administration*، مدراس ۱۹۴۹ء، ص ۶۷ ببعد، ۱۴۹ ببعد؛ (۱۰) Mez : *Renaissance*، باب ۶ (عربی ترجمہ از اے ۔ ایچ ۔ ابو ریدہ، ۲ جلد، قاہرہ ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۱ء)؛ (۱۱) D. Sourdel : *Le vizirat ʿabbāside de 132/750 à 324/934*، دمشق ۱۹۶۱ء۔

(A. A. Duri)

۲ ۔ مصر

مصری دیوان کی نشو و نما کے لحاظ سے تین دور الگ الگ نمایاں کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ حکومت کی تبدیلیوں کے مقابلے میں انتظامی اداروں میں تسلسل زیادہ قوی نظر آتا ہے، لٰہذا ان تین ادوار کے درمیان فی الواقع کوئی واضح انقطاع نہیں ہوا : (۱) وہ عہد جب مصر اسلامی سلطنت عظمٰی کا صوبہ تھا (۱۸ھ/[بہ تصحیح ۶۳۹ء] تا ۳۵۸ھ/۹۶۹ء)؛ (۲) خلافت فاطمیہ (۳۵۸ھ/ ۹۶۹ء تا ۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء)؛ (۳) ایوبی اور مملوکی عہد (۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء تا ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء)۔

پہلے حصے کے مآخذ متقدم و متاخر مؤرخین کی منتشر آرا اور کتاب کے لیے دستور العمل، نیز عربی کے اوراق بردی ہیں جن کی تعداد روز افزوں ہے ۔

دوسرے اور تیسرے دور کے لیے کتاب کے لیے دستور العمل، اور مفصل و جامع کتابیں وافر مواد مہیا کرتی ہیں، جن میں وسطی دور کے اواخر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے؛ پھر مؤرخین ہیں جن کے بیانات مذکورۂ بالا مآخذ کی تشریحات میں تو زیادہ اضافہ نہیں کرتے لیکن مزید اصل واقعات فراہم کرتے ہیں ۔ متاخرین میں المقریزی (م ۸۴۵ھ/۱۴۴۲ء) کی الخطط امتیازی اھمیت رکھتی ہے، کیونکہ وہ مصری انتظامیہ کی تاریخ مسلم فتح سے لے کر خود اپنے وقت تک تقریباً مسلسل بیان کرتا ہے (مطبوعۂ بولاق، ۱ : ۸۱ ببعد، ۲۹۷ ببعد؛ ۲ : ۲۱۵ ببعد)، علاوہ ازیں اس نے متفرق سوانح اور عمارات کے بیانات میں اہم اضافے کیے ہیں ۔

(۱) مسلمان مصر میں اسی طریقے سے انتظامات چلاتے رہے جیسے بوزنطیوں نے وہاں کی مقیم عیسائی آبادی کی مدد سے قائم کیا تھا، حتی کہ مقامی باشندوں کو قبطی زبان تک استعمال کرنے کی اجازت تھی ۔

چونکہ دیوان کی اصطلاح مصر میں بوزنطیوں کے تحت مستعمل نہیں تھی، لہذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ایسے مصر کے نئے آقا اپنے ساتھ لائے تھے ۔ سورس بن المقفع (جو ۱۰۰۰ء کے قریب زندہ تھا؛ دیکھیے ابن المقفع، ابوالبشر) اطلاع دیتا ہے کہ دوسرے والی مصر عبداللہ بن سعد بن سہل (۲۳ھ/۶۴۴ء تا ۳۵ھ/۶۵۶ء)، [رک بآں] نے "مصر (الفسطاط) میں دیوان قائم کیا، جہاں مصر کے تمام محصولات ادا کیے جاتے تھے" (*History of the Patriarchs of Alexandria*، طبع C. F. Seybold، ص ۱۰۳؛ طبع B.T. Evetts (*Patr. Orient.*، ج ۵)، ۱ : ۵۰، نقل کردہ از N. Abbott : *The Kurra papyri*، ص ۱۳، اور D.C. Dennett : *Conversion and poll tax*، ص ۷۳) ۔ بد قسمتی سے اسلامی مآخذ سے اس بات کی توثیق نہیں ہوتی کہ اس ابتدائی زمانے میں کوئی مرکزی دفتر مال قائم ہوا تھا یا اس کے لیے لفظ دیوان کا استعمال ہوتا تھا ۔ المقریزی لکھتا ہے (الخطط، ۱ : ۹۴، ۲ تا ۱۰) کہ والی مسلمہ بن مخلد الانصاری (۴۷ھ/۶۶۷ء تا ۶۲ھ/۶۸۲ء؛ الکندی، طبع Rh. Guest، ص ۳۸ تا ۴۰؛ المقریزی : الخطط، ۱ : ۳۰۱، ۸۱ تا ۷۲) نے اس بات پر ایک سرکاری افسر مامور کیا کہ وہ ہر صبح عرب آباد کاروں کے درمیان جا کر ان کی خاندانی حیثیت میں تبدیلیوں یا مہمانوں کی آمد کے متعلق پوچھ گچھ کرے اور اس کی اطلاع دیوان کے سامنے پیش کرے ۔ اسی اطلاع پر والی اہل الدیوان (دیوان کے عمّال) کو مزید وظائف جاری کرنے کی ہدایت کرتا تھا ۔ اس بیان سے ایک باقاعدہ محکمۂ دیوان کا موجود ہونا ظاہر ہوتا ہے، نیز یہ کہ دیوان مذکور عرب مہاجران کے ناموں کا اندراج اور ادائے وظائف کا کام کرتا تھا ۔ دیوان کی اصطلاح کا ایسا ہی استعمال الکندی کی ایک تحریر میں بھی دکھائی دیتا ہے (طبع Guest، ص ۱۷؛ المقریزی : الخطط، ۱ : ۹۴، ۱۰ تا ۱۳) ۔ مصر میں پہلا دیوان حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے، دوسرا دیوان عبدالعزیز مروان، تیسرا قرہ بن شریک [رک بآں]، چوتھا بشر بن صفوان نے قائم کیا تھا ۔ چوتھے دیوان کے قیام کے بعد کوئی قابل ذکر بات وقوع پذیر نہیں ہوئی، اس کے سوا کہ قیس قبیلے کو ھشام بن عبدالملک بن مروان کے دور خلافت (۱۰۵ھ/۷۲۴ء تا ۱۲۵ھ/۷۴۳ء) میں دیوان میں داخل کیا گیا ۔ الکندی (طبع Guest، ص ۷۶) اس واقعے کو ۱۰۹ھ / ۷۲۷ء سے منسوب کرتا ہے؛ قیس کے تین ہزار خاندان مع ان کے دیوان [یعنی فہرستوں اور وظائف کی کتابوں] کے مصر کو منتقل ہوئے ۔ ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان کی اصطلاح قدیم زمانے ہی سے ان معانی کے لیے استعمال ہوتی تھی : (الف) مسلمان عرب قبائل کے وظائف کی فہرستیں؛ (ب) اور یہ کہ قبیلہ

جہاں جاتا تھا یہ فہرستیں ان کے ساتھ بھیجی جاتی تھیں؛ (ج) نیز یہ کہ نتیجۃً قبیلۂ تیم کا دیوان (یعنی فہرست وظائف) بھی مصر منتقل ہوا تو وہاں جو دیوان پہلے ہی سے موجود تھے ان میں اس کا اضافہ ہو گیا۔

پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے نصف ثانی کے دوران میں مرکزی سرکاری دفاتر کو ظاہر کرنے کے لیے دیوان کی اصطلاح کا استعمال یقیناً زیادہ عام ہو چکا تھا۔ بتایا گیا ہے (الکندی، ص ۵۸ تا ۵۹؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۹۸، ۱۱ تا ۱۵) کہ مصری دیوانوں میں قبطی زبان کو چھوڑ کر عربی زبان کو ۸۷ھ/۷۰۵ء میں اختیار کیا گیا تھا (قب طبع Wiet، ۲: ۵۸)۔ اس کا مطلب فقط یہ ہو سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا سال میں اصطلاح دیوان پہلے ہی سے الفسطاط میں مرکزی سرکاری دفتر کا نام تھا۔ مالیات کا پہلا آزاد مدیر (عامل الخراج) اُسامہ بن زید التنوخی تھا، جسے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے والی مصر قرہ بن شریک کی وفات پر ۹۶ھ/۷۱۵ء میں مقرر کیا تھا۔ یہ بات کہ اُسامہ ایک دیوان کی مدد سے کام کرتا تھا المقریزی کی ایک تحریر سے (الخطط، ۱: ۷۷، ۳ تا ۷۸، ۳) ثابت ہے، جہاں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ (۹۹ھ/۷۱۷ء تا ۱۰۱ھ/۷۲۰ء) نے مسلمانوں پر سے جزیہ منسوخ کر دیا اور اس سے دیوان (الخراج ؟) کو مطلع کر دیا۔ ۱۰۵ھ/[بہ تصحیح ۷۲۴ء] میں والی الحُرّ بن یوسف نے دیوان کے اہلکاروں کو قبطی کسانوں کے خلاف زائد محصولات کی جبراً وصولی کے لیے بھیجا۔ دو سال بعد مشہور عامل الخراج ابن حبحاب (C. H. Becker: Beiträge، ۲: ۱۰۷ تا ۱۱۰) نے محصول دہندگان کی فہرستیں تیار کیں، جنھیں احتیاط سے یکجا رکھا گیا اور دیوان الخراج کے لیے ان میں مفصل معلومات درج کیں (المقریزی: الخطط، ۱: ۷۳، ۲۳ اور ۹۹، ۱۰)۔ اصحاب الاہراء (اناج کے سرکاری گوداموں کے عمّال) کا پہلے ہی ایک ورق بردی مؤرخہ شوال ۹۰ھ/اگست۔ ستمبر ۷۰۹ء میں ذکر ملتا ہے؛ یہ بات اغلب معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اسی دیوان الاہراء کے اہل کار تھے جس کا نام بعد میں النابلسی نے فہرست میں درج کیا ہے (C. H. Becker: *Pap. Schott-Reinhardt*، ۷۰، ۷۳ اور ۹۴؛ نیچے دیکھیے)۔ المقریزی کہتا ہے (الخطط، ۲: ۲۲۶، ۲۷ تا ۲۹؛ W. Björkmann: *Staatskanzlei*، ص ۱۸، حاشیہ ۳) کہ دیوان البرید (ڈاک کا دیوان) قدیم زمانے کے دیوان الانشاء سے بھی پہلے بنا تھا؛ اور A. Grohmann (*Studien z. hist. Geogr. und Verw*، ص ۳۵) اس بات کو مسلّم سمجھتا ہے کہ محصول کے دفاتر، عامل اور نائب عامل کے ساتھ، دوسرے بہت سے دفاتر کے علاوہ صوبوں کے بڑے بڑے مقامات کورا میں [صحیح کورہ = ضلع] تھے۔ دیوان اسفل الارض (شمالی مصر کا دیوان) کی موجودگی ایک ورق بردی مؤرخہ ۱۴۳ھ/۷۶۱ء سے ثابت ہوتی ہے (C. H. Becker: *Pap. Schott-Reinhardt*، ص ۳۹، حاشیہ ۹؛ A. Grohmann: *APEL*، ۴: ۱۴۳؛ نیچے دیکھیے).

طولونیوں کے عروج سے ذرا پہلے کے برسوں میں دیوانوں کی تعداد میں اضافہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے (المقریزی: الخطط، ۱: ۱۰۷، ۲۸ تا ۲۹؛ C. H. Becker: *Beiträge*، ۲: ۱۴۴؛ A. Grohmann: *Zum Steuerwesen im arabischen Ägypten*، در *Actes d. V. Cong. Int. d. Pap.*، برسلز ۱۹۳۸ء، ص ۱۳۲)۔ مشہور عامل مالیات ابن مدبّر نے چراگاہ اور ماہی گیری (مراعی، مصاید) پر نئے محصول عائد کیے اور ان کے انتظام کے لیے ایک خاص دیوان قائم کیا۔ دوسری طرف، خلیفہ المعتصم کے ایک حکم سے عرب آبادکاروں کے حقوق وظیفہ ختم کر دیے گئے اور اس لیے غالباً متعلقہ دیوان بھی باقی نہیں رہے۔ الفسطاط میں دیوان الخراج کی جگہ پہلے مسجد عمرو ابن العاص کے

قریب ایک عمارت میں تھی؛ متولّی الخرج (ناظر مالیات) جاگیروں کی تشخیص کے لیے خود مسجد کے اندر اجلاس عام کرتا تھا ۔ احمد بن طُولُون نے اس دیوان کو مسجد احمد بن طُولُون میں منتقل کر دیا، جہاں وہ عہد فاطمیہ تک رہا (المقریزی : الخطط، ۱ : ۸۲، ۳ تا ۱۵) ۔ ایک ورق بردی مؤرخہ ۳۰۱ھ/ ۹۱۳ء مقامی دفتر محصولات کو دیوان الخراج کے نام سے بیان کرتا ہے (A. Grohmann : APEL، ۴، بار دوم، ۲۲۷) ۔ احمد بن طولون کے تحت خلافت بغداد سے مصر کی بالفعل آزادی کا اظہار دیوان الانشا (ملک کا دفتر وزارت) کی تأسیس سے کیا گیا، جس کا پہلا سربراہ ابو جعفر محمد بن عبدکان (م ۲۷۰ھ/ ۸۶۸ء، القلقشندی، ۱ : ۹۵؛ W. Björkman، ص ۱۸ تا ۱۹؛ زکی محمد حسن : Les Tulunides، ص ۱۹۱ تا ۲۱۶ و ۲۸۰ تا ۲۸۲) مقرر ہوا ۔

(۲) عہد فاطمیہ : ہمارے بڑے بڑے ماخذ یہ ہیں : (الف) عام معلومات کے لیے (۱) القلقشندی (۳ : ۴۹۰ تا ۴۹۶؛ وستنفلٹ، ۱۸۸ تا ۱۹۴)؛ (۲) المقریزی الخطط، ۱ : ۳۹۷ تا ۴۰۲)؛ (۳) خانوادۂ فاطمی کے آخری عشروں اور ایوبیوں کے ابتدائی سنین کے لیے ابن المماتی (قوانین الدواوین، ج ۸ و ۹)؛ (ب) دیوان الانشاء کے لیے خصوصاً ابن الصیرفی کا قانون دیوان الانشاء ۔ القلقشندی اور المقریزی کے بیانات زیادہ تر المرتضی ابو محمد عبدالسلام بن محمد بن الطویر القیسرانی، جس کا زمانۂ حیات نامعلوم ہے، کی گمشدہ کتاب نزھة المقلتین فی اخبار الدولتین الفاطمیّة والصالحیّة پر منحصر ہیں (حاجی خلیفہ (طبع جی۔ فلوگل G. Flügel)، ۶ : ۳۳۴، عدد ۱۳۷۲۰؛ R. Guest : Writers, books, etc., in the Khitat، در JRAS، ۱۹۰۲ء، ص ۱۱۷؛ C. H. Becker : Beiträge، ۱ : ۲۹ تا ۳۰؛ W. Björkman، ص ۲۶ حاشیہ ۱، ۸۳) ۔ بقول ابن الطُّوَیر (القلقشندی، ۳ : ۴۹۳؛ المقریزی : الخطط، ۱ : ۳۹۷، ۲۲ ببعد؛ نیز دیکھیے النابلسی : لمعة، باب ۴، در Cl. Cahen : Quelques aspects...، ص ۱۰۴) ۔ پہلا مرکزی انتظامی دفتر اور دیگر تمام دیوانوں کی ماں دیوان المجالس (مشاورت کا دیوان) تھا، جس میں کُل انتظامیہ مرتکز تھی ۔ متعدد منشی اپنے اپنے الگ کمروں میں ایک یا دو معاونوں (مُعین) کے ساتھ وہاں بیٹھتے تھے ۔ اس دیوان کا حاکم اعلٰی جاگیروں (اقطاعات) کو عطا کرنے کا ذمے دار تھا (C. H. Becker : Islamstudien، ۱ : ۲۳۲؛ W. Björkman ببعد اشاریہ؛ Cl. Cahen : L'évolution de l'iqṭa'، در Annales ESC، ۱۹۵۳ء) اور اس کے فیصلوں کو "دفتر المجالس" (مجلس کی امثلہ) کہتے تھے ۔ دیوان المجالس کے مختلف شعبے خیرات، عطیات، لباس اور سلطان کے ذاتی اخراجات کی مدّوں سے متعلق تھے ۔ ہمارے ماخذ سے اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ آیا بنو فاطمہ سے پہلے یہ دیوان موجود تھا یا وہ کب خود مختار شعبوں میں منقسم ہوا ۔ بایں ہمہ یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ دیوان المجالس دیوان الاموال کا پیش رو تھا، اور یہ کہ دیوان الانشاء اس کے پہلو بہ پہلو موجود تھا ۔

دواوین کی مفصلۂ ذیل فہرست، جو مذکورۂ بالا ماخذ سے اخذ کی گئی ہے، مکمل ہونے کا دعوٰی نہیں کر سکتی ۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ دیوان کی طرز کے مختلف دفاتر ایک ہی درجے کے نہیں تھے، کیونکہ دیوان سے کبھی کبھی مرکزی دفاتر کی محض صوبائی شاخیں مراد ہوتی تھیں ۔

(۱) دیوان الانشاء، یا الرسائل، یا المکاتبات (ملک کا دفتر وزارت) تین ذیلی شعبوں میں منقسم ہے : (۱) صحابت دیوان الانشاء والمکاتبات یا دیوان النظر (صدر دفتر یا نگرانی کرنے والا محکمہ)، اس کے سربراہ کو رئیس (سربراہ) یا متولّی (نگران) یا صاحب (حاکم) یا مُشِدّ (مدیر) کہتے تھے اور اسے الشیخ الاجل

(عزت مآب) سے خطاب کرتے تھے۔ اسے یہ بلند مرتبہ اس لیے حاصل تھا کہ وہ خلیفہ کے حضور میں رسوخ رکھتا تھا، جس کے پاس وہ سرکاری کاغذات لاتا اور ان کے جواب کے بارے میں مشورہ دیتا تھا۔ اس کی معاونت، بقول ابن الصیرفی، دو بلند مرتبت عہدے دار کرتے تھے۔ دیوان الانشاء کے دیگر دو شعبے یہ تھے: (۱) اعلیٰ محکمہ یا مرافعہ کا دفتر (توقیعات بالقلم الدقیق) جس کا تعلق خلیفہ کے ان فیصلوں سے ہوتا تھا جو وہ شکایت کی ان عرضیوں پر صادر کرتا تھا جنھیں کوئی شخص عام باریابی کے وقت اس کے سامنے پیش کر سکتا تھا؛ اور (۲) رجسٹرار کا دفتر (توقیعات بالقلم الجلیل) جو عرضی گذار کی درخواست پر مفصل قانونی کیفیت لکھتا اور دفتر مرافعہ کے فیصلوں پر عمل درآمد کراتا تھا۔ دیوان الانشاء کے دوسرے چھوٹے چھوٹے دفاتر میں یہ شامل تھے: (الف) بیرونی ممالک کے سلاطین سے مراسلت کا محکمہ (مکاتبہ الی الملوک)، (ب) دفتر تقررات (انشاءات تقلید)، (ج) صوبے کے اعلیٰ عہدے داروں اور امرا سے مراسلت کا محکمہ (مکاتبہ إلی امراء الدولۃ و کبرائہا)، (د) سند شاہی کا محکمہ (مناشیر)، خفیہ احکام کتب الطاف اور نقول (نسخ) کا محکمہ۔ ان محکموں کے علاوہ کمتر درجے کے چار منشیوں کا ذکر ملتا ہے، مگر وہ مستقل شعبوں کو نہیں چلاتے تھے: نقل نویس (ناسخ) منشی، جو متنوں کو ایک منظم طریقے سے محفوظ رکھنے کے لیے ہوتا تھا تا کہ انھیں آئندہ بطور نظائر استعمال کیا جا سکے؛ اصلی دستاویزات کا رکھنے والا (خازن) اور حاجب، جو اس بات کا خیال رکھتا کہ کوئی شخص بغیر اجازت رئیس دیوان کے پاس نہ چلا جائے (ابن الصیرفی۔ Massé، بمدد اشاریہ؛ القلقشندی، ۱: ۱۳۰ و ۳: ۴۹۰ ببعد؛ W. Björkman، ص ۲۰ ببعد؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۴۰۲)۔

(۲) دیوان الجیش والرواتب (فوج اور تنخواہوں کا دیوان) تین شعبوں میں منقسم تھا: (الف) دیوان الجیش ایک قسم کا جنگی دفتر نیز عسکری انتظامیہ؛ اس کے سربراہ کا مسلمان ہونا ضروری تھا؛ (ب) دیوان الرواتب، وزیر سے رسالے کے سوار تک کے لیے تمام تنخواہ یافتہ اشخاص کی تنخواہ کا مرکزی دفتر (قب A. Mez: *Renaissance*، ص ۷۷ تا ۷۹)؛ (ج) دیوان الاقطاع (جاگیروں اور وظیفوں کا دیوان) غیر فوجی ملازمین کے لیے، کیونکہ فوجی عملہ دیوان الرواتب سے تعلق رکھتا تھا (القلقشندی، ۳: ۴۹۲ تا ۴۹۳؛ المقریزی: الخطط، ۱: ۴۰۰ تا ۴۰۲)۔

(۳) دیوان الاموال (مالیات کا دفتر، خزانہ) چودہ شعبوں میں منقسم تھا، جنھیں دیوان ہی کہتے تھے، جنھیں القلقشندی نے شمار کیا ہے (۳: ۴۹۳ تا ۴۹۶) اور اس سے کہیں مختصر طور پر المقریزی نے (الخطط، ۱: ۴۰۰ تا ۴۰۱)۔ ابن المماتی نے شہری ملازمت کے درجے کے سترہ ملازمین کی فہرست دی ہے۔ (اسماء المستخدمین من حمل الاقلام)، جو ظاہرا طور پر دیوان الاموال کے عملے سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن یہ بات ہر موقع پر واضح نہیں ہوتی کہ چودہ شعبوں میں سے کن کن کے ساتھ یہ سترہ گروہ مطابقت رکھتے تھے (طبع A. S. Atiya، ص ۲۹۷ تا ۳۰۶)۔ (الف) نظر الدواوین یا دیوان النظر (یعنی دیوان کا نگران محکمہ)۔ دیوان الاموال کا سربراہ یعنی وزیر مال بحیثیت منصب اس کا سربراہ ہوتا تھا۔ ابن المماتی ناظر دیوان (نگران کار، محاسب، جو حسابات کی جانچ پڑتال اور تصدیقی دستخط کرتا تھا) اور متولّی (مہتمم) کے درمیان تمیز کرتا ہے، جو تمام امور دفتر کا ذمے دار تھا (C. H. Becker: *Islamstudien*، ۱: ۱۷۰، ۱۷۳)؛ (ب) دیوان التحقیق (سرکاری تفتیش کا دفتر) (قب ڈوزی، بذیل مادّہ)،

جس کی بنیاد الافضل بن بدرالجمالی [رَکّ بان] نے ۵۰۱ھ / ۱۱۰۷-۸-۱۱ء میں رکھی تھی، جب ایک یہودی اور ایک نصرانی اس کے سربراہ مقرر کیے گئے؛ بعد میں اسے بہت عرصے تک پُر نہیں کیا گیا (ابن الصیرفی / Massé، ص ۸۲ حاشیہ ۱)؛ (ج) دیوان المجلس، فقط شاہی عطیات، خیرات وغیرہ کا انتظام کرتا تھا؛ (د) دیوان خزائن الکسوۃ، کپڑے کے گوداموں کا دیوان؛ متعدد مال گوداموں کے لیے دیکھیے طویل فہارس در القلقشندی، ۳ : ۴۷۵ ببعد؛ اور المقریزی : الخطط، ۱ : ۴۰۰ ببعد؛ (ہ) دیوان الطراز (کشیدہ کاری کے کارخانوں اور گوداموں کا دیوان) ۔ دیوان کی ان مقامات پر کئی شاخیں قائم کی گئی تھیں، جہاں کارخانے واقع تھے، مثلاً اسکندریہ، دمیاط، تینس (ابن المماتی، ص ۳۳۰ تا ۳۳۱؛ A. Grohmann : Stud. z. hist. Geogr. u. Verw، ص ۴۴)؛ (و) دیوان الاحباس (اوقاف کا دیوان) ۔ خلیفہ المعزّ نے اس کی بنیاد ۳۶۳ھ / ۹۷۴ء میں رکھی تھی اور اسی وقت سے اس دیوان نے مقدس اداروں کے انتظام سے سروکار رکھا؛ اس کے عہدے دار فقط مسلم ہوتے تھے (المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۹۵ ببعد؛ Cl. Cahen : Le régime des impôts در Arabica، ۳ : ۲۴ تا ۲۵)؛ (ز) دیوان الرواتب (اُجرتوں کا دیوان) ۔ یہ بات واضح نہیں کہ اس دیوان اور دیوان الجیش کے تحت اسی نام کے دفتر کے درمیان کیا تعلق تھا ۔ یہ بات ممکن دکھائی دیتی ہے کہ یہ دیوان الرواتب، دیوان الخاص (خلیفہ کے نجی خزانے کا دیوان، القلقشندی، ۳ : ۴۹۵ اور ۴۷۵) کا ایک طرح سے پیشرو ہو؛ (ح) دیوان الصعید (بالائی مصر کا دیوان)؛ (ط) دیوان اسفل الارض (نشیبی مصر کا دیوان)؛ (ی) دیوان الثغور (سرحدی اضلاع کا دیوان) ۔ اسکندریہ، دمیاط، تینس اور عیذاب کی سرحدی بندرگاہوں پر تاجروں سے محصول درآمد وصول کرنے کی خاطر ایک انتظامی وحدت بن گئی تھی (الخمس اور متجر [دیکھیے مَکْس]؛ ابن المماتی، ص ۳۲۵ تا ۳۲۷)؛ (ک) دیوان الجوالی والمواریث الحشریۃ (جزیے اور زمینوں کی جاگیروں کے محصول کا دیوان)؛ F. Lokkegaard : Islamic Taxation، ص ۵۰ اور ۱۴۰ تا ۱۴۱؛ C. H. Becker : Islamstudien، ۱ : ۱۷۱؛ ابن المماتی، ص ۳۰۹، ۳۱۷ تا ۳۱۸ اور ۳۵۴؛ Cl. Cahen : Le régime des impôts در Arabica، ۳ : ۲۴؛ (ل) دیوان الخراجی والہلالی (شرعی و غیر شرعی محاصل کا دیوان) ۔ F. Lokkegaard، ص ۱۸۵ تا ۱۸۶؛ C. H. Becker : Islamstudien، ۱ : ۱۷۷ تا ۱۷۹) ۔ ابن المماتی اس دیوان سے تعلق رکھنے والے کئی عہدے دار گنواتا ہے : الجہبذ (محصل محصولات)، الشاہد (ناظر اندراجات)، جو بیجک پر تصدیقی دستخط کرتا تھا، الماسح (مساحت کرنے والا) وغیرہ؛ (م) دیوان الاصطبلات (گھوڑوں یا اصطبلوں کا دیوان)؛ (ن) دیوان الجہاد یا العمائر (دینی جہاد یا بحریہ کا دیوان) ۔ اس کا مقام قاہرہ میں بندرگاہ کی گودیوں میں تھا، اور یہ بحری فوج کے لیے انتظامی مرکز کی خدمت سرانجام دیتا تھا (ابن المماتی، ص ۳۴۰ تا ۳۴۱) ۔

(۳) ایوبی عہد : مصر کے لیے خلافت فاطمیہ کا خاتمہ سیاسی اور مذہبی انقطاع کے معنی رکھتا تھا، مگر انتظامی تسلسل کے ذریعے اس کی تلافی ہو گئی، جیسے ایک سربرآوردہ شخصیت نے عملاً کر دکھایا، یعنی آخری صاحب دیوان الانشاء، القاضی الفاضل محی الدین کو سلطان صلاح الدین نے اسی عہدے پر برقرار رکھا اور بعدازاں وزیر بنا لیا ۔ لہٰذا القاضی الفاضل اور اس کے بہت سے شاگرد، ان دو ادوار کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں ۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ابن المماتی کی کتاب قوانین الدواوین

ایوبی عہد کے پہلے نصف کے لیے ہم عصر ماخذ کا کام دے سکتی ہے؛ نصف آخر کے لیے دو ہم عصر مصنف یہ ہیں: ابن شیث القرشی اور عثمان النابلسی۔ ابن المماتی کی طرح ابن شیث القرشی بھی قاضی الفاضل کا شاگرد تھا، جو اسے شعر و ادب میں مہارت رکھنے کی وجہ سے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ دمشق چلا گیا، جہاں وہ دیوان الانشاء کا سربراہ اور المعظّم بن العادل (م ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء) کا دوست بن گیا۔ معالم الکتابۃ، میں جو دیوان الانشاء کے منشیوں کے لیے [صحیح خطوط نویسی کی] رہنما کتاب ہے، ہمارے موضوع پر فقط ایک ہی باب ہے (ص ۲۳ تا ۳۲)۔ ابن شیث کی نظروں میں دیوان الانشاء اہم ترین سرکاری دفتر ہے؛ لہٰذا اس کے سربراہ (صاحب الدیوان) کو اس اخلاقی معیار کا ہونا چاہیے جو اس کے بلند رتبے اور اس عزت کے مطابق ہو، جو اسے اپنے رفقاے کار کے درمیان حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ماتحت عہدے دار، جسے وہ خطوط و دستاویزات جواب کے لیے بھیجتا تھا، متولّی کتاب الانشاء (وزیر کے صدر دفتر کا مہتمم) کہلاتا تھا۔ ابن شیث نے جو دیگر دفاتر گنوائے ہیں وہ یہ ہیں: دیوان الجیوش، جس کا سربراہ (کاتب الجیش) صاحب دیوان الانشاء سے درجے میں کم تر ہوتا ہے اور اسے حساب کا ایک کھاتا رکھنا ہوتا ہے، جس میں تمام فوجی عملے کے نام اور جائدادیں درج ہوں تاکہ وہ ان کی تنخواہیں اس حالت میں بھی ادا کر سکے جب کہ دیوان الاقطاع کا کوئی سربراہ مقرر نہ ہوا ہو۔ دیوان الاقطاع بظاہر ایک خودمختار دفتر تھا، جس کا سربراہ دیوان الجیش سے عہدے میں کم تر ہوتا تھا اور وہ دونوں صاحب دیوان النظر کے ماتحت اکٹھے کام کرتے تھے، جو صاحب دیوان المال ہی کی مانند ہوتا تھا۔ اس اہم عہدے دار کا تقرر براہ راست سلطان کرتا تھا۔ صاحب دیوان المال کا معاون مستوفی (سیاق دان) کہلاتا ہے؛ خزانے کے دیگر عہدوں میں یہ شامل ہیں: (الف) شاہد بیت المال (خزانے کا ناظر اندراجات)، (ب) المشرف (نگران)، (ج) الجہبذ (محصّل محصولات) اور (د) الخازن (اندراج کرنے والا)۔ النابلسی مندرجۂ ذیل دیوانوں کا ذکر کرتا ہے: (الف) دیوان الجیوش، (ب) دیوان الانشاء، (ج) دیوان الاحباس، جو عہد فاطمیہ میں دیوان الاموال کی ماتحت شاخ سے ترقی کر کے خود مختار وزارت بن گیا تھا (اوپر ۲۰)، (د) دیوان المال، جو دو شعبوں میں منقسم ہے: (۱) دیوان بالعمّال (صوبوں کے لیے دیوان) اور (۲) دیوان بالباب (دربار کے لیے دیوان)۔ یہ دونوں نام اور دفتر نئے ہیں؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نے دیوان الصعید، دیوان اسفل الارض اور دیوان الثغور کی جگہ لے لی تھی؛ یہ ان صوبوں میں خراجی اور ہلالی محصولوں کا انتظام کرتا تھا۔ دیوان بالباب زکوٰۃ، جوالی اور مواریث کے محصولوں کا بندوبست، نیز خزانے کے تمام شعبوں بشمول سابق دیوان التحقیق، دیوان المجالس وغیرہ کے نظم و نسق کی نگرانی بھی کرتا تھا۔

دیوان کی اصطلاح کا نسبۃً زیادہ وسیع اور مبہم استعمال لمعۃ القوانین کے ایسے جملوں میں آیا ہے جیسے دیوان خزائن السلاح (اسلحہ کا دیوان)، دیوان ساحل السنط (ببول والے ساحل کا دیوان؛ ابن المماتی، طبع A.S. Atiya، ص ۳۴۷ تا ۳۴۸؛ المقریزی: الخطط، طبع Wiet، ج ۲، *MIFAO*، ج ۱۳، ۱۹۱۳ء (ص ۱۰۸، حاشیہ ۴) اور دیوان الاہرا (دیکھیے اوپر، جلد ۳۰)۔ النابلسی بھی دیوان الزکوٰۃ، دیوان المواریث اور الدیوان النبوی (رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اولاد کے لیے دیوان) کا ذکر کرتا ہے جس کا دوسرا نام نقابۃ الاشراف تھا اور اس کے سربراہ کو نقیب الاشراف (نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اولاد کے وکیل) کے نام سے موسوم کرتے تھے (W. Popper: *Egypt and Syria*، ص ۱۰۱، ۱۵؛ W. Bjorkman،

بمدد اشاریہ)۔

(۴) عہد مملوک: ممالیک کے عہد کے نظم و نسق میں فوجی طبقے (ارباب یا اصحاب السیوف) کا اثر و نفوذ غیر فوجی کُتّاب (ارباب الاقلام) اور متعدد سرکاری محکموں میں بڑھ جانا ثابت ہے، جیسا کہ اُستادار، دوادار وغیرہ کا دخل پایا جانا۔ ابن خلدون اسے ایک عہد اور خاندان کی "ضعیفی" کا مخصوص نشان تصوّر کرتا ہے، کیونکہ ایسی حالت میں "تلوار" "قلم" پر فوقیت رکھتی ہے (۲ : ۱۳، ترجمہ Rosenthal، ۲ : ۴۷؛ I. Goldziher : *Uber Dualtitel* در *WZKM*، ج ۱۳، ۱۸۹۹ء، ص ۳۲۱ تا ۳۲۹)۔ انتظامیہ میں دو اصلاحات کرنے کی کوشش کی گئی اور دونوں سے دیوان متأثر ہوئے: سلطان الناصر محمد بن قلاوون (۷۰۹ھ / ۱۳۰۹ء تا ۷۴۱ھ/ ۱۳۴۱ء) نے پہلی مرتبہ ۷۱۰ھ/ ۱۳۱۰ء میں وزارت منسوخ کر دی اور اس کے وظائف کو چار عہدے داروں میں تقسیم کر دیا: ناظر المال (خزانے کا منتظم)، شادالدواوین (دیوانوں کا مہتمم)، ناظر الخاصّ (سلطان کے ذاتی خزانے کا ناظم)؛ W. Popper : *Egypt and Syria*، ص ۹۷ : (شاہی خزانے کا ناظم) اور کاتب السرّ (امین مملکت)؛ القلقشندی، ۴: ۲۸؛ المقریزی : الخطط، ۲: ۲۲۷؛ السلوک، ۲: ۲، ۹۳ اور ۱۰۳۔ بعد ازاں پہلے چرکسی مملوک سلطان الظاہر سیف الدین برقوق (۷۸۴ھ / ۱۳۸۲ء تا ۸۰۱ھ/ [بہ تصحیح ۱۳۹۸ء] نے دیوان الخاص کو ثغر الاسکندریہ (اوپر دیکھیے) کا نظم و نسق حوالے کر کے اسے مزید قوت دی اور دیوان المفرد (خاص محکمے کا دیوان) کو شاہی ممالیک کے وظائف اور لباس وغیرہ کے نظم و نسق کے لیے قائم کیا، اور ان کی وجہ سے وزارت کے اختیارات کم ہوگئے۔ پھر بھی وزیر خزانے کا سربراہ بن گیا اور اسے تمام قسم کے مختلف محصولات کو وصول کرنے کا کام تفویض کیا گیا کیونکہ وہ مالیاتی امور کے جملہ عمال سے بلند مرتبہ رکھتا تھا اور اسی بنا پر ابن خلدون وضاحت کرتا ہے کہ کیوں متعدد قبطیوں کو اس عہدے اور اس قسم کے دیگر عہدوں کے لیے منتخب کیا گیا، جو زمانۂ قدیم سے ان امور سے خوب واقفیت رکھتے تھے (دیکھیے ابن خلدون، ۲ : ۱۵ اور ۲۰؛ ترجمہ Rosenthal، ۲ : ۱۹، ۲۵؛ (۲) المقریزی : الخطط : ۲ : ۲۲۳، ۲۲۸؛ Gaudefroy-Domombynes : *Syria*، ج ۴۳؛ W. Popper : *Egypt and Syria*، ص ۹۶ تا ۹۸)۔ (۱) دیوان الانشاء جسے "کتابت السرّ" بھی کہتے تھے (المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۲۵، ۲۲۶ بعد؛ القلقشندی، ۴ : ۳۰؛ الظاہری : زبدہ، ص ۹۹ تا ۱۰۰) ابھی تک اپنے متعدد سابق کام سرانجام دیتا رہا (اوپر دیکھیے ۳)۔ اس کے سربراہ کاتب السرّ کو غیر فوجی عہدے داروں کے نظام مراتب میں سب سے زیادہ توقیر حاصل تھی (W. Popper : *Egypt and Syria*، ۹۷؛ المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۲۶، ۲۲۷)؛ لیکن وہ دوادار یعنی ایک صاحب السیف کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا، اور یہ عسکری طبقے کے بالا دست ہونے کی دلیل ہے۔ وہ سلطان کی غیر فوجی کابینہ کا سربراہ رہ چکا تھا، جو ڈاک وصول کرتا اور سلطان کی خدمت میں بھجواتا یا غیر ملکی سفیروں کو حکمران کے حضور پیش کرتا تھا (القلقشندی، ۴ : ۹۱)۔ دوسری طرف کاتب السرّ نے بتدریج صاحب البرید کا کام سنبھال لیا؛ ان دونوں عہدوں کا اوّلین حامل اوحدالدین عبدالواحد بن اسمٰعیل الحنفی (م ۷۸۶ھ/۱۳۸۵ء) تھا؛ المقریزی : الخطط، ۱ : ۸۷؛ ابوالمحاسن بن تغری بردی : منہل، عدد ۱۴۸۳؛ W. Björkman : *Staatskanzlei*، ص ۱۴ و حاشیہ ۳۔ دیوان الانشاء ان امور سے متعلق تھا: (الف) غیر ملکی حکومتوں اور صوبائی حکام سے خط و کتابت (مکاتبات)۔ اسی لیے القلقشندی اس دیوان کے عہدے داروں کے لیے غیر ملکی زبانوں کے علم کا

مطالبہ کرتا ہے؛ مثلاً ترکی، ایرانی، یونانی اور "الفرنجیۃ" (لاطینی ؟)؛ صبح الاعشی، ۱ : ۱۶۵ تا ۱۶۷؛ Björkman : *Staatskanzlei*، ص ۴۴ و حاشیہ ۱)؛ (ب) تقرریاں (ولایات)، بشمول بیعت اور سلطان کے جانشین کے لیے تحریر (عہد)، نیز صوبوں کے والیوں کے لیے (تقلید) اور دیگر عہدے داروں کے تقرر کے لیے (تفویض، توقیع)؛ القلقشندی، ۱ : ۲۵۲؛ Björkman : *Staatskanzlei*، ص ۴۸، ۵۲؛ (ج) عامّۃ الناس کی شکایات پر شاہی فیصلے (توقیعات علی القصاص؛ اوپر دیکھیے؛ القلقشندی، ۶ : ۲۰۲ ببعد؛ Björkman : *Staatskanzlei*، ص ۴۹ تا ۵۳)۔ (۲) دیوان الجیش یا دیوان الجیوش المنصورہ، فوجی عملے کے لیے جاگیروں کے عطیے کا انتظام کرتا تھا (القلقشندی، ۱ : ۱۰۲)، اسی لیے اسے بعض اوقات دیوان الاقطاع کہتے تھے؛ القلقشندی، ۳ : ۴۵۷؛ Björkman : *Staatskanzlei*، ص ۵۱، حاشیہ ۲۔ اس کا سربراہ ناظر الجیش فوج کے دیوان کا ناظم اکثر قاضی ہوتا تھا، اس کی معاونت دیوان الجیش کا ناظر (صاحب دیوان الجیش) اور دیگر کثیر التعداد اہل کار کرتے تھے، جو شہود، کُتّاب وغیرہ کہلاتے تھے (Popper : *Egypt and Syria*، ص ۹۷)۔ بقول الظاہری (زبدۃ، ص ۱۰۳) دیوان الجیش دو علاقائی شعبوں میں منقسم تھا : دیوان الجیش المصری اور دیوان الجیش الشامی۔ (۳) دیوان الخاص نے اپنی اہمیت سلطان الناصر محمد بن قلاؤن کے تحت حاصل کی تھی (دیکھیے اوپر) ۳؛ المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۲۷، ۱۰ میں فاطمیوں کے عہد ہی میں اس کا موجود ہونا لکھتا ہے، اور مابعد کے عشروں میں اس کا اثر و نفوذ زیادہ ہوتا گیا یہاں تک کہ الظاہر برقوق کے عہد حکومت کے اوائل میں ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء میں اپنے عروج کو پہنچ گیا، جب کہ دیوان الخزانہ (مال گوداموں کا دیوان) بھی اس کے اندر ضم ہو گیا؛ المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۲۷، ۱۵ ببعد؛ Popper : *Egypt and Syria*، ص ۹۶، ۴۔ (۴) دیوان المفرد (خاص محکمے کا دیوان) کی بنیاد الظاہر برقوق نے رکھی تھی، جب اس نے وزارت کے بجائے اسے قائم کیا (المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۲۳، ۲۸ ببعد؛ القلقشندی، ۳ : ۴۵۷، اس نام کے ایک دفتر کا ذکر کرتا ہے جو پہلے سے فاطمیوں کے تحت موجود تھا)۔ اس کا اصلی سربراہ اُستادار ایک صاحب السیف ہوتا تھا، جسے کبھی کبھی نام نہاد وزیر تک ہی مقرر کیا جاتا تھا (Popper : *Egypt and Syria*، ص ۹۳، ۹؛ الظاہری : زبدۃ، ص ۱۰۷؛ ترجمہ ص ۱۷۸)۔ اس اُستادار کے تحت دیوان المفرد کا ناظر ایک بڑے عملے کی اعانت سے اس دیوان کے فرائض مثلاً سلطان کے مملوکوں کے لیے وظائف، لباس، خوراک چارے وغیرہ کے متعلق ہدایات دیتا تھا (Popper، ص ۹۷)۔ (۵) دیوان الاموال، کُل مالی لین دین یا خرچ پر قابو رکھتا تھا اور تنخواہوں کی ادائی اور حسابات رکھنے کا ذمے دار تھا (القلقشندی، ۴ : ۲۹ ببعد؛ المقریزی : الخطط، ۲ : ۲۲۳، ۷ ببعد)۔ وزیر اس کا سربراہ تھا، لیکن وہ بھی ناظر دیوان المفرد کی طرح زیادہ سے زیادہ اُستادار کے ماتحت ہوتا چلا گیا، لہٰذا اس عہدے کی جو اعلیٰ توقیر تھی وہ کم ہو گئی (Popper : *Egypt and Syria*، ص ۹۶؛ ابن خلدون، ۲ : ۲۰ تا ۲۱؛ ترجمہ ص ۲۵)۔ پھر فاسد طریقوں سے جو تقرر ہوئے ان سے صورت حال واضح ہو جاتی ہے، مثلاً جب ۸۶۸ھ/۱۴۶۳ء میں ایک تھوک فروش قصاب شمس الدین محمد البباوی کو وزیر اور ناظر الدولہ بنایا گیا اور پھر ۸۷۰ھ/۱۴۶۶ء میں "مکّوں کا دلّال قاسم بغیتہ شغیتہ مقرر ہوا، یہ دونوں اشخاص غیر تعلیم یافتہ تھے (ابوالمحاسن بن تغری بردی، طبع Popper، ۷ : ۷۲۳ تا ۷۲۵ اور ۷۳۸ تا ۷۳۹؛ ترجمہ Popper، ۴ : ۵۸، ۷۶؛ ابن ایاس غیر مطبوعہ صفحات ۱۳۶، ۲ و ۱۶۰، ۳ تا ۵)۔

یہ ناظرالدولہ (بعض اوقات خود وزیر، اور بعض اوقات وزیر کی شرکت میں) خزانے کے حاکم اعلیٰ کے طور پر کام کرتا تھا اور اس کے تحت متعدد مناصب (مستوفی) محافظ دفتر (شاهد) وغیرہ ہوتے تھے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ دیوان الاموال متعدد محکموں کی نگرانی کرتا تھا جنھیں دیوان یا نَظَر کہتے تھے اور جو انتظامیہ کے مختلف شعبوں سے متعلق تھے، مثلاً نَظَر بیت المال، جو المَقْریزی کے قول کے مطابق اس کے زمانے میں موجود نہیں تھا (الخطط، ۲: ۲۲۴، ۲۲۹ تا ۲۳۷)، نظرالمواریث الحشریہ (لاوارث جائداد کی نگرانی کا دفتر: Popper : Syria and Egypt، ص ۹۹، ۱۷)، نظرالمرتجعات جسے نظرالسلطان (یعنی املاک کی بازیابی کے نگران کا دفتر بھی کہتے تھے: W. Popper، کتاب مذکور، ۹۹، ۱۸؛ القلقشندی، ۴: ۳۳)، اس کے سربراہ کو مُسْتوفی المرتجعات، نظر الوَجْہ القبلی و نظرالوَجْہ البحری (پہلا بالائی اور دوسرا زیریں مصر کا نگران دفتر)، دیوان الاستیفاء (تنخواہوں کی ادائی کا دیوان)، دیوان الاحباس (محکمۂ اوقاف)، دیوان الزکوٰۃ کہتے تھے۔ مؤرخین اس پیچیدہ نظام کے طریق کار اور اس کی عملی کمزوریوں کے تباہ کن اثرات کی بہ کثرت مثالیں پیش کرتے ہیں، جو اعلیٰ حکّام نیز حکمرانوں کی مسلسل تبدیلیوں اور مزاؤں کے ظالمانہ اور مستبدانہ نظام (: مصادرہ) کی وجہ سے، جو ہر تبدیلی کا لازمہ تھا، اور بھی بڑھ گئے تھے۔

مآخذ : ان حوالوں کے علاوہ جو مقالے میں درج ہیں:
(۱) عربی ورق بردی پیرس کی مطبوعات کی تازہ فہرست در
Arabische Briefe aus der Papyrus- : A. Dietrich
samlung der Hamburger Staats-und Universitäts-
bibliothek، ہمبرگ ۱۹۵۵ء؛ (۲) A. Grohmann کی
نہایت ضروری تصنیفات کی ایک فہرست در Isl.، ج ۱۳
(۱۹۵۷ء)، ص ۲ تا ۳؛ (۳) A. Grohmann : Studien zur
historischen Geographie und Verwaltung des
frühmittel-alterlichen Ägypten، وی انا ۱۹۵۹ء
Ost. Akad. d. Wiss. Phil. hist. Kl. Denkschr)
Beiträge zu : C. H. Becker (۴) ؛(77 Bd., 2 Abh.
Geschichte Ägyptens unter dem Islam، ۱/۲
سٹراس برگ ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۳ء؛ (۵) وہی مصنف :
Papyri Schott Reinhardt، ج ۱، هائیڈل برگ ۱۹۰۶ء؛
(۶) وہی مصنف : Islamstudien، ۱/۲، لائپزگ ۱۹۲۴
تا ۱۹۳۲ء؛ (۷) D. C. Dennett : Conversion and
poll-tax in early Islam، کیمبرج، Mass، ۱۹۵۰ء؛
(Harvard Historical Monograph، ج ۲۲)؛ (۸)
Islamic taxation in the classic : F. Lokkegaard
period، کوپن هیگن ۱۹۵۰ء؛ (۹) زکی محمد حسن : Les
Tulunides، پیرس ۱۹۳۳ء؛ (۱۰) Cl. Cahen : Evolution
de l'iqtâ'du IXe au XIIIe siècle در Annales ESC،
ج ۸، (۱۹۵۳ء)، ص ۲۵ تا ۵۲؛ (۱۱) وہی مصنف :
Le régime des impôts dans le Fayyum ayyubide
در Arabica، ج ۳ (۱۹۵۶ء)، ص ۸ تا ۳۰؛ (۱۲)
وہی مصنف : Histoires Coptes d'un cadi médiéval،
BIFAO، ج ۵۹ (۱۹۶۰ء)، ص ۱۳۳ تا ۱۵۰؛ (۱۳)
La Syrie à l'ep- : M. Goudefroy-Demombynes
oque des mamelouks، پیرس ۱۹۲۳ء؛ (۱۴) W. Popper:
Egypt and Syria under the Circassian Sultans
1382-1468 A. D.، برکلے اور لاس اینجلز ۱۹۵۵ء
ببعد (in University of California Publications،
Semitic Philology، ج ۱۵ اور ۱۶)؛ (۱۵) D. Ayalon :
The system of payment in Mamluk military society،
در JESHO، ۱ : ۳۷ ببعد و ۲۵۷ ببعد؛ (۱۶) وہی مصنف :
The plague and its effects upon the Mamluk army،
در JRAS، ۱۹۴۶ء، ص ۶۷ تا ۷۳؛ (۱۷) وہی مصنف :
Studies on the structure of the Mamluk army I،
در BSOAS، ج ۱۵ (۱۹۵۳ء)، ص ۲۰۳ تا ۲۲۸؛
(۱۸) حصہ ۲، کتاب مذکور، ص ۴۴۸ تا ۴۷۶؛ (۱۹)

حصہ ۳، کتاب مذکور، ج ۱۶ (۱۹۵۳ء)، ص ۵۷ تا ۹۰؛ (۲۰) وہی مصنف: Gunpowder and fire arms in the Mamluk kingdom، لنڈن ۱۹۵۶ء؛ (۲۱) A. N. Poliak: Les révoltes populaires en Egypte à l'époque des Mamlouks et leurs causes économiques، در REI، ج ۸ (۱۹۳۴ء)، ص ۲۵۱ تا ۲۷۳؛ (۲۲) وہی مصنف: Feudalism in Egypt, Syria, Palestine and the Lebanon 1250-1900، لنڈن ۱۹۳۹ء؛ (۲۳) ابن ایاس، محمد بن احمد: Unpublished pages of the chronicle of Ibn Iyas, A. H. 857-873/A.D. 1453-1468، قاہرہ ۱۹۵۱ء؛ (۲۴) ابن خلدون: مقدمہ، ترجمہ F. Rosenthal، ج ۱ تا ۳، نیویارک ۱۹۵۷ء؛ (۲۵) ابو بکر بن عبداللہ الدواداری: Die Chronik des Ibn Dawādārī، ج ۹، طبع H. R. Roemer، قاہرہ، ۱۹۶۰ء۔

(H. L. GOTTSCHALK)

۳۔ المغرب

(الف) جہاں تک اندلس کا تعلق ہے، ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہلے مسلم فاتحین نے وہاں وزی گوتھ Visigoths کے دیوانی اور فوجی نظم و نسق کو جو بلاشبہہ بوزنطی نظام سے متاثر تھا، کس حالت میں پایا اور کس طرح اسے خود اختیار کیا۔

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں، عہد اُمیّہ میں اتنا معلوم ہے کہ تین بنیادی دیوان، حکومت کی تین بنیادی ضرورتوں کے لیے کام کرتے تھے اور ہر ایک کا نظم و نسق ایک خاص وزیر (یا صاحب)، کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ وہ یہ تھے:

۱۔ دیوان الرسائل (=الترسیل) والکتابۃ (وزارت اور ملکی دفتر)۔ یہ موصولہ اور مجاریہ دونوں طرح کے مراسلات اور مختلف اسناد اور فرامین (=سجلات صکوک) تیار کرتا تھا۔

۲۔ وزارت مال: دیوان الخراج والجبایات، دیوان الاشغال یا الاعمال (الخراجیہ یا مالیہ)، دیوان الحسبان، دیوان الزمام، جو مختلف محصولات کی وصولی، محصّلوں کی نگرانی اور آمد و خرچ کا حساب رکھنے کا ذمے دار تھا۔ اس کے ساتھ ایک حد تک دیوان الخزانہ کا براہ راست تعلق تھا، جو سرکاری خزانے کی دیکھ بھال کرتا تھا اور بیت المال سے، جس کی نوعیت مذہبی تھی، جداگانہ تھا۔

۳۔ وزارت فوج: دیوان الجیش، دیوان الجُند، دیوان العساکر، دیوان اہل الثغور، جس کے تین مختلف فرائض تھے: (الف) باقاعدہ فوج کے مالی دفتر کو تاریخ جاریہ تک مکمل رکھنا؛ (ب) حسابات رکھنا، فوجیوں کو تنخواہ (ارزاق) اور (فوجی خدمت کے صلے میں) عطیات دینا؛ اور (ج) اعلٰی افسروں میں جاگیریں (اقطاعات) تقسیم کرنا۔ تاہم فوجوں کی قیادت یا لڑائیوں کے متعلق احکام دینے میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔

بنو اُمیّہ کے بعد اسی قسم کی سہ گونہ تنظیم، گو نظری طور پر بہت محدود پیمانے پر تھی، صوبائی حاکموں (ملوک الطوائف) کے درباروں میں اور آگے چل کر نصریہ خاندان میں پائی جاتی تھی۔

الموحّدون کے عہد (چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی) سے قبل جہاں تک شمالی افریقہ کا تعلق ہے، ہمیں دواوین یا ایسے محکموں کا عملاً کچھ علم نہیں۔

۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء میں عبدالمؤمن المُوَحِّد نے شمالی افریقہ پر وادی نُول سے برقہ تک اپنا تسلّط جمانے کے بعد سلطنت کی مساحت اس غرض سے کروائی کہ زر نقد اور جنس میں ادا ہونے والے زمین کے مالیے (خراج) کی تعیین کے لیے جمع بندی تیار کی جائے: اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ایک خاص مالی دیوان یا تو قائم کیا گیا تھا یا اسے ترقی دی گئی۔

ایک دوسرے المُوَحِّد یعقوب المنصور (۵۸۰ تا

۵۹۵ھ/۱۱۸۳ء تا [بہ تصحیح ۱۱۹۹ء] نے علامت کے طریق کار کا آغاز کیا، یعنی توقیعی کلمات جو مراسلوں اور احکام کے سرناموں پر بڑے بڑے حروف میں لکھے ہوتے تھے، ان کے بعد والحمد للہ وحدہ ہوتا تھا۔ پہلے تو حکمران خود اپنے ہاتھ سے یہ ثبت کرتا تھا؛ بعد میں علامت کی تحریر وزیر اعلٰی کے سپرد کر دی گئی۔ اس پر بنو حفص اور بنو مرین کے فرمانروا بھی عمل کرتے رہے اور بنو سعد کے زوال تک اس کی پابندی ہوئی۔ فقط علویوں نے اسے اختیار نہیں کیا۔

دوسری باتوں میں الموحّدون کے دیوان اندلس کے اموی دیوانوں سے مشابہ تھے، لیکن وزارت اعلٰی کے دفتر میں دیوان الانشاء بننے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ اس تنظیم کو افریقیہ میں بنو حفص نے، اور مراکش میں بنو مرین نے قائم رکھا تھا، تاہم بسا اوقات بہت سے دیوانوں کو باہم ملا کر ایک مدبر کے تصرّف میں دے دیا جاتا تھا۔ یہ مدبر وزیروں کے کسی نہ کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی سے شمالی افریقہ میں دیوانوں کے کاروبار، بلکہ ان کے وجود تک کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ مراکش میں ہم صرف دیوان الجیش کے متعلق جانتے ہیں، جس میں تمام باقاعدہ افواج شامل تھیں، جو ابتدا میں عربوں اور بعد میں حبشیوں (عبید یا حراطین) پر مشتمل تھیں۔ ان افواج (بالخصوص عبید) نے چونکہ اکثر علوی سلاطین کو بنایا اور معزول کیا تھا، لہٰذا ان کا دیوان بعض اوقات شاہی مجلس شورٰی کی قسم کا ہو جاتا تھا۔

تطوان کی تباہ کن جنگ (۱۸۶۰ء) کے بعد سلطان محمد الثالث بن عبدالرحمٰن نے جدید قسم کا دیوان الجیش قائم کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اس کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔

مآخذ : (۱) ابن خلدون : مقدّمہ، طبع بولاق ۱۲۷۴ھ، ص ۱۱۲ تا ۱۲۰؛ ترجمہ de Slane، حصۂ دوم، ص ۱ تا ۲۹؛ (۲) E. Lévi Provençal : *L'Espagne musulmane au X^{e} siècle*، ص ۶۹، ۱۲۸؛ (۳) ابن فضل اللہ العمری : مسالک الابصار، ترجمہ Gaudefray Demombynes، در اشاریہ، بذیل مادّہ دیوان۔ سعدیوں اور علویوں کے ماتحت مراکش کے لیے دیکھیے احمد الناصری : کتاب الاستقصاء، ترجمہ Fumey (در *Archives Marocaines*، ج ۹، ۱۰)، ۱ : ۵۳، ۶۶، ۹۳، ۱۱۸، ۱۲۸، ۲۲۹، ۲۸۳، ۲ : ۲۳۰۔

(ب) الموحّدون کے عہد (چھٹی صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی) سے ان بندرگاہوں میں، جنھیں عیسائی یورپ سے تجارت کرنے کی اجازت تھی (افریقیہ میں المہدیہ سے سبطہ (Ceuta) تک، نیز المریہ میں) ان خاص دفاتر کی موجودگی کی تصدیق ہو چکی ہے جو دیوان الاشغال کے ماتحت ہوتے تھے اور جن کا کام عشر اور متفرق محصولات (ملازم) کی وصولی تھا، جو یورپی درآمد کنندگان پر عائد کیے جاتے تھے۔ اس قسم کے دفتر کو عام طور پر محض الدیوان کہتے تھے؛ لیکن اس سے زیادہ تفصیلی نام بھی کہیں کہیں ملتے ہیں : دیوان البحر اور خصوصاً دار الاشراف علی عمالة الدیوان، "محصولات عائد کرنے کی نگرانی کے صدر دفاتر"۔ مقامی مہتمم کو مشرف کہتے تھے۔

محصولات کے طریق کار کو سہل بنانے کے لیے اور اس کے علاوہ عیسائی تاجروں اور ان کے تجارتی مال کے تحفظ کے لیے ایک یا زیادہ تجارتی سرائیں (ہر قوم کے لیے ایک) "دیوان" کے بالکل قریب ہوتی تھیں، یہ فُندُق یا قیساریّہ کہلاتی تھیں، جن کے مشرقی مترادفات "خان" اور (دارالوکالة) تھے۔

اس قسم کے دفاتر، شاذ صورتوں میں اندرون ملک کے بڑے بڑے شہروں مثلاً تلمسان اور فاس میں بھی کام کرتے تھے، مؤخرالذکر شہر میں دفتر محصولات یورپ سے درآمد شدہ کپڑے پر محصول عائد

کرتا تھا ۔ اس کی نسبت Leo Africanus نے (دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں) لکھا ہے کہ یہ قیساریہ میں تھا ۔ وہ ضرور اسی چھوٹے تجارتی محلے میں ہوگا، جسے موجودہ قیساریہ کے بالکل شمال میں ابھی تک "الدیوان" کہتے ہیں ۔

لفظ دیوان، اگر اس محدود مفہوم میں لیا جائے (جس سے یورپی تاجر یقیناً زیادہ اچھی طرح واقف ہوں گے) تو وہ صریحاً اطالوی dogana اور ہسپانوی aduana کا اور اسی طرح فرانسیسی douane کا مأخذ ہوگا، لیکن یاء کا فقدان اور الف کا اضافہ پہلے دو مستعار لفظوں میں دشواری پیدا کرتا ہے ۔ غرناطہ میں (نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی) کے اختتام پر P. de Alcala نے اپنے زمانے تک ہسپانوی لفظ aduana کا عربی ترجمہ "دیوان" کیا ہے ۔

بہر حال جو صورت حال بھی ہو، مراکش میں رائج الوقت اصطلاح دیوانہ ہے، شاید اس پر ہسپانوی لفظ کا اثر ہوا ہے ۔ دیگر مغربی زبانوں میں مشرقی زبانوں کی طرح (یعنی عربی زبان بولنے والے ملکوں میں، جو سابق سلطنت عثمانیہ سے ملحق ہو گئے تھے) محصولات کے لیے الفاظ ترکی لفظ "گمرک" سے مستعار لیے گئے تھے، جس کا سلسلہ عہد زوال کی یونانی زبان کے ذریعے لاطینی "commercium" تک پہنچتا ہے ۔

مآخذ : (۱) ابن جُبَیر: الرحلۃ، طبع ڈخویہ، برائے اسکندریہ (ص ۳۹ تا ۴۰) اور عکّہ (ص ۳۰۲)؛ (۲) De Mas Latrie: *Relations et commerce de l'Afrique septentrionale*، ۱۸۸۶ء، ص ۱۶۶، ۲۲۵؛ (۳) *Hespéris*، ج ۱۲ (۱۹۳۱ء)، ص ۱۶۲ (برائے سبطہ Ceuta).

(ج) دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط سے الجزائر، تونس اور طرابلس کی ترکی ولایات میں دیوان کی اصطلاح ملنے لگتی ہے ۔ اس وقت یہ لفظ اعلٰی عہدے داروں کی جماعت کا ہم معنی تھا جو اس علاقے کے سربرآوردہ ترکی عمّال کی معاونت، بلکہ خاص طور پر ان کی نگرانی کے لیے مقرر کیے جاتے تھے ۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی جماعتوں کی نظیر پر گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں بربری عربوں نے جو رباط کے "قصبہ" میں رہتے تھے، اپنا "دیوان" یا مجلس شورٰی قائم کی تھی (ہم عصر مغربی تصانیف میں اس کا ذکر *duano*، *duan*، *duana* کے نام سے آیا ہے)، جس کے ارکان مقامی افسر اعلٰی کی نگرانی کرتے تھے ۔

عام محاورے میں اس کے موجودہ استعمال میں لفظ دیوان کا اطلاق بعض اوقات ان "مجالس" پر ہوتا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ انھیں صوفیہ اور جنّات وقتاً فوقتاً منعقد کرتے ہیں ۔ یہ لفظ جو کبھی کبھی "سازش، ساز باز" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی ایک وجہ بھی یہی ہے ۔

مآخذ : (۱) الجزائر، لیبیا اور تونس کے مقالے دیکھیے: (۲) de Castries : *Les trois républiques du Bou-Regreg*، در *Sources inédites de l'histoire du Maroc*، ہالینڈ، سلسلۂ اول، ۵ : ۱ تا ۲۸ جس میں مصنف سے "douane" کے بارے میں سہو ہوا ہے ۔

مشرق کے سرکاری دفاتر میں لکھنے کے مخصوص طریقے استعمال ہوتے تھے، مثلاً عدالتی اور سفارتی استعمال کے لیے "دیوانی" اور مالیاتی اور مالی مثلوں کے لیے مع عددی مخففات "سیاق" یا "سیاقہ" ۔ مغرب میں محاسب مالی دفاتر میں ۲۷ رقوم کے ایک سلسلے کا استعمال کرتے تھے، جسے رسوم (یا حُروف) الزِّمام، یعنی بڑی کتاب کے مخففات یا حروف کہتے تھے، اس طریقے کا بوزنطی اصل سے ہونا مسلّم ہے، نیز دیکھیے خطّ ۔

مآخذ : (۱) G.S. Colin : *De l'origine grecque* des "Chiffres de Fès"، در JA، ۱۹۳۲ء، ص ۱۹۲

(G. S. COLIN)

۳ ۔ ایران

دیوان کی اصطلاح عام طور پر مرکزی حکومت کے معنی میں مختلف طریقوں سے استعمال ہوتی تھی اور اس مفہوم میں یہ زیادہ خصوصیت سے دیوانِ اعلیٰ کے نام سے بھی معروف تھی، یعنی وہ محکمہ یا جگہ جہاں سرکاری اور دیوانی انتظام کے امور انجام پاتے تھے برخلاف فوجی انتظامیہ کے، گو ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے ۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے مرکزی حکومت کے معنی میں دیوان کی جگہ دولۃ یا دائرۂ دولۃ بہت زیادہ رواج پا چکا تھا ۔ ثانیاً دیوان کی اصطلاح کو عام سرکاری محکمے کے مفہوم میں استعمال کیا جانے لگا تھا اور اس مفہوم میں اس کی جگہ آخر وزارہ، دائرہ اور اِدارہ نے لے لی ۔ ان دیوانوں میں ضروریات وقت کے مطابق اختلاف تھا ۔ اسم صفت دیوانی کو بھی اسی طرح استعمال کیا جاتا تھا ۔ چنانچہ "مہمات دیوانی" سے مراد مرکزی انتظامیہ کے امور ہوتے تھے اور "تکالیف دیوانی" سے مراد محصولات یا واجبات" (غیر شرعی نوعیت کے) ہوتے تھے جنھیں دیوان عائد کرتا تھا ۔ جب اس کا اطلاق زمین پر ہوتا تو دیوانی سے مراد سرکاری زمین ہوتی تھی، برخلاف شاہی زمین یا نجی جاگیروں کے ۔

بارتولڈ کا یہ بیان کہ "مشرق میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیمات کے پورے نظام میں انتظامیہ کے تمام شعبوں کو دو بڑی انواع میں منقسم کر دیتا درگاہ (محل) اور دیوان (وزارہ) (Turkestan، ص ۲۲۷)، شاید اس نظام کو حد سے زیادہ سادہ بنا دیتا تھا؛ حکومت کی سخت ذاتی نوعیت کی وجہ سے یہ رجحان تقریباً ناگزیر تھا کہ مختلف سرکاری عمّال کے اختیارات کے درمیان خط فاصل اکثر بدلتا رہے ۔ ایلخانی صفوی اور قاجار حکومت کے ابتدائی دور میں بدیہی وجوہ کی بنا پر عام رجحان یہ تھا کہ مرکزی انتظامیہ نسبۃً سادہ ہو اور مختلف اعضائے حکومت میں وقت کے ساتھ ساتھ تقسیم کار بڑھتی رہے ۔ یہ بات خاص کر صفوی اور قاجار عہدوں میں دیکھنے میں آتی ہے ۔

دیوان اعلیٰ انتظامیہ کے سارے میدان پر حاوی تھا، لیکن اس کا تعلّق بنیادی طور پر تین شعبوں سے تھا : اسناد و احکام کا اجرا؛ مالی انتظام؛ اور عدالتی انتظام (ذاتی نوعیت کے مقدمات کے ماسوا، جو شرعی عدالتوں کے تحت آتے تھے) ۔ پہلے دو وزیر کے دائرۂ اختیار میں تھے : تیسرا شعبہ، جہاں تک اس کے اختیارات تفویض کر دینے کا تعلق تھا، وہ وزیر کو نہیں سونپا جاتا تھا، جسے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کا اختیار نہ تھا، بلکہ "فوجی" حکام کو تفویض کیا جاتا تھا ۔ سلجوقی دور میں سلطان یا اس کے عمّال؛ دیوان اعلیٰ میں سرکاری امور سرانجام دینے کے ساتھ وقتاً فوقتاً "دیوان مظالم" کا اجلاس بھی کرتے تھے ۔ تیموریوں اور صفویوں کے تحت عدلیہ کا اعلیٰ عہدے دار دیوان بیگی ہوتا تھا جو عموماً فوجی طبقوں سے تعلّق رکھتا تھا ۔ فرمانروا کے ذاتی طور پر نظم و نسق کرنے کی روایت، جس میں عدالتی انتظام بھی شامل تھا، عہد قاجار تک قائم رہی (Malcolm : *History*، لنڈن ۱۸۲۹ء، ۲ : ۳۰۸)، اور شاہی قیام گاہ کو، جہاں بادشاہ (اور صوبوں میں والی) عام طور پر امور مملکت سرانجام دیتا تھا، خصوصاً دربار عام کے ایوان کو "دیوان خانہ" کہتے تھے ۔

مرکزی عہدے دار ملک کی حکمت عملی یا والیوں کے تقرر کے سلسلے میں بہت ہی کم اثر رکھتے تھے، کیونکہ یہ چیز سلطان یا بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی ۔ سلطنت کے وسیع علاقوں کو بھی "اقطاعات" یا تیولات" کی صورت میں اس (مرکزی انتظامیہ) کے

اختیار سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ تاہم ایران میں انتظامی روایت کا تسلسل بہت نمایاں رہا، خصوصاً شعبۂ مالیات میں، جو مرکزی حکومت کا بہت ہی زیادہ منظّم شعبہ تھا۔ اس روایت کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے (جس کے بعد مغرب کے یورپی ممالک کی مثال سے متاثرہ انتظامی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں) پیچھے صفوی اور تیموری زمانوں تک پھیلا ہوا ہے اور باوجود ایلخانوں کی خاص خاص جدّتوں کے، اس کا سراغ اور بھی پیچھے عظیم سلجوقیوں کے عہد تک لگایا جا سکتا ہے۔ یہ امر کہ یہ تسلسل بدستور قائم رہا، زیادہ تر اس واقعیت کا مرہون منت تھا کہ دفتری عمّال کو کلیۃً مقیم آبادی سے لیا جاتا تھا اور وہ ہر نئے شاہی سلسلے کی خدمات بجا لاتے تھے۔ چنانچہ قدیم صفوی سلطنت کا انتظامی عملہ زیادہ تر ایسے ہی عمّال پر مشتمل تھا جو اس سے پہلے ترکمان خاندانوں کی ملازمت میں رہ چکے تھے؛ اسی طرح ایلخانوں کے قانون پسند عمّال ان خاندانوں کی ملازمت کر چکے تھے جو مغلوں کی فتح سے پہلے ایران میں حکومت کرتے تھے۔ اتنی ہی حیرت انگیز یہ بات ہے کہ قاجار خاندان کے ابتدائی دور میں کثرت سے وہی لوگ اعلیٰ منصب پر فائز رہے جو سابقہ زند خاندان کے عہد حکومت میں عہدے دار یا وزیر رہے تھے۔

مرکزی انتظامیہ کا اہم ترین عہدے دار وزیر [رک بآن] تھا۔ اس کے اختیارات اسے حکمران تفویض کرتا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ وہ دیوانی، فوجی، مذہبی غرض کہ حکومت کے ہر شعبے پر حاوی ہوتا۔ اس کے اختیار اور اثر و نفوذ کے حدود کا فیصلہ کرنے میں شخصی عنصر کا بہت دخل ہوتا تھا۔ ابتدائی صفویوں کے سب سے بڑے عہدے دار کو کچھ مدت تک وکیل [رک بآن] کہتے تھے، جب کہ وزیر کی اصطلاح زیادہ تر کسی شعبے یا وزارت کے سربراہ اور والی کے ماتحت صوبے کے سب سے بڑے عہدے دار کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ صفوی عہد کے اواخر میں مرکزی حکومت کے سب سے بڑے عہدے دار کو "وزیراعظم" کہتے تھے اور اس کا خطاب اعتماد الدولہ ہوتا تھا۔ قاجاروں کے تحت بھی کبھی کبھی وزیراعظم کا، جسے صدر اعظم کہتے، یہی خطاب ہوتا تھا۔

عظیم سلجوقیوں کے عہد میں وزارت مرکزی انتظامیہ کا محور تھی؛ وزیر جب اپنے عروج اقتدار پر ہوتا تو انتظامیہ کے تمام پہلوؤں کی، جو مرکزی حکومت کے ماتحت ہوتے، نگرانی کرتا، جن میں خصوصیت سے مالیات شامل تھا۔ وہ ایک حد تک ذرائع آمدنی میں نظم پیدا کرتا تھا اور اس کا بڑا کام آمدنی کو بڑھانا تھا۔ اس کے ماتحت بڑے بڑے دیوان یہ تھے: "دیوان الانشاء والطغراء" (جسے کبھی کبھی دیوان الرسائل کہتے تھے)، جو موصول ہونے اور بھیجے جانے والے مراسلات کا کام کرتا تھا، اور "دیوان الزمام والاستیفاء" (جسے "دیوان الاشراف" بھی کہتے تھے)، جس کا تعلق مالی امور سے ہوتا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ انیسویں صدی عیسوی میں مرکزی حکومت کے دو اہم محکمے بالترتیب "منشی الممالک" اور "مستوفی الممالک" کے ماتحت تھے۔ دیوان الزمام و الاستیفاء دو بڑے حصوں میں منقسم تھا، ایک تو مستوفی الممالک کے تحت تھا اور دوسرا مشرف الممالک کے۔ ان کی تقابلی اہمیت بدلتی رہتی تھی۔ سلجوقیوں کے زمانۂ مابعد میں دونوں دفاتر میں خود مختار ہونے کا رجحان پایا جاتا تھا، اول الذکر کا تعلق آمدنی کے امور سے تھا، مؤخرالذکر کا نظارت و نظم و نسق سے۔ آمدنی کا بیشتر حصہ فوج پر خرج ہوتا تھا، چنانچہ جب آمدنی جاگیروں (اقطاعات) کی صورت میں مرکزی حکومت کے اختیار سے نکل جاتی تھی، تب بھی اس معاملے کی مثلوں کو مرکزی حکومت کے شعبۂ "دیوان عرض" میں رکھا

جاتا تھا (دیکھیے عتبة الکتبة، طبع عباس اقبال، تہران ۱۹۵۰ء، ص ۲۹ تا ۳۰، ۷۶؛ نیز دیکھیے دفتر).

پہلے تین سلطانوں کے عہد حکومت کے بعد وزیر کی اہمیت مستوفی [رک باں] کی اہمیت کی بہ نسبت کم ہو گئی۔ مثال کے طور پر فخر الملک بن نظام الملک، وزیر برکیاروق، مستوفی مجد الملک البلاسانی کے سامنے بالکل ماند پڑ گیا (بنداری: دولة السلجوقیة، قاہرہ ۱۳۱۸ھ، ص ۹۷)۔ مزید برآں، جب کہ ابتدائی دور میں سلطان اور وزیر کے مابین کوئی درمیانی واسطہ نہ ہوتا تھا، زمانۂ مابعد میں ان کے درمیان وکیل دار اور امیر حاجب قائم کر دیے گئے (بنداری، ص ۸۶، ۱۰۷، ۱۲۵؛ (۲) ابن الاثیر، ۱۱: ۹۵)؛ اور جیسے جیسے وزارت کا اثر و نفوذ کم ہوا، بادشاہ کا رجحان یہ ہوتا گیا کہ مختلف دیوانوں کے سربراہوں کے ساتھ وزیر کے توسط کے بغیر براہ راست تعلق رکھے (دیکھیے رشید الدین: جامع التواریخ، مخطوطہ موزہ بریطانیہ عدد Add. ۷۶۲۸، ورق ۲۵۱ الف)۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ ابتدائی دور میں دیوان کا سارا کام وزیر ہی کے ذریعے ہوتا تھا، یا بعد کے عہد میں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہو گیا تھا.

مرکزی حکومت کے دو بڑے دیوانوں کے علاوہ کئی دیوان ایسے تھے جن کا تعلق مالی امور اور اراضی کی خاص نوعیتوں سے تھا، مثلاً "دیوان خاص" (جس کا تعلق شاہی اراضی سے تھا) اور دیوان اوقاف (عتبة الکتبة، ص ۳۲، ۵۲ ببعد)۔ مرکزی حکومت کے نمونے کی کسی حد تک صوبوں میں پیروی کی جاتی تھی۔ والی کا اپنا دیوان ہوتا تھا، جسے کبھی کبھی "دیوان ایالت" کہتے تھے (دیکھیے عتبة الکتبة، ص ۹۷)۔ بڑے بڑے ضلعوں میں دیوان استیفاء ہوتا تھا، مثلاً مرو اور بسطام میں (عتبة الکتبة، ص ۵۶، ۶۳)؛ اور متعدد دیوان جو مالی انتظامیہ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ رَے میں قوام الدین اِنانج قُتلُغ بلکا کو، جو سنجر کی طرف سے والی تھا، اسی کی دستاویز تقرر میں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اقامت گاہ (سرائے) میں دیوان عمل اور دیوان شحنگی قائم کرے (عتبة الکتبة، ص ۳۷)۔ اسی طرح تاج الدین ابوالمکارم کو سنجر کی طرف سے رئیس مازندران مقرر کرنے کے فرمان میں مرقوم تھا کہ وہ اپنی اقامت گاہ میں دیوان معاملات و قسمات قائم کرے (عتبة الکتبة، ص ۲۶)۔ رسوم کی وصولی؛ عام ٹھیکے اور محصولات کی تعیین کے متعلق مقدمات بعض حالات میں دیوان ریاست کے سامنے پیش کیے جاتے تھے (A. K. S. Lambton: *The administration of Sanjar's empire*، در *BSOAS*، ۱۹۵۷ء، ۲۰: ۳۸۶)۔ ان مختلف محکموں کے سربراہوں کو اپنے ماتحتوں کے معزول و مقرر کرنے کے اختیارات میں غالباً کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ معین الدین کو، جسے سنجر نے جوین کا شحنہ (کوتوال) مقرر کیا تھا، اپنے ماتحتوں کو برطرف کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، لیکن اسے دیوان کے کلخدا کو مستقل کرنے کی ہدایات دی گئی تھیں (عتبة الکتبة، ص ۶۱)۔ ایسی سلجوقی خواتین کی مثالیں بھی موجود ہیں جو اپنے دیوان رکھتی تھیں (دیکھیے عتبة الکتبة، ص ۶۱؛ خواند میر: دستور الوزراء، تہران، ص ۱۹۰).

ایران کے منگول حملے کے ساتھ قدیم روایت کسی حد تک ٹوٹ گئی؛ قدیم انتظامیہ کے ڈھانچے کا بہت سا حصہ پھر بھی باقی رہا یا ایلخانوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کو بحال کر دیا؛ اور دفتری حکام اور مذہبی اداروں کے عہدے دار اپنے اپنے دفاتر یا دیوانوں کے ساتھ عسکری حکام کے پہلو بہ پہلو پھر سے پائے جانے لگے۔ حکومت کے سب سے ممتاز عامل کو حسب سابق وزیر کہتے تھے، یا کبھی کبھی فرمانروا کے نمائندے کی حیثیت سے وہ نائب کہلاتا تھا (Spuler: *Mongolen*، طبع دوم، ص ۲۸۲)۔ بایں ہمہ اس بات کا بہر کیف رجحان پایا جاتا تھا کہ مالی

امور کو وزیر کی براہ راست نگرانی سے ہٹا لیا جائے اور انہیں صاحب دیوان نامی ایک عہدے دار کے سپرد کر دیا جائے جس میں بعض اوقات وزیر کو مات کر دینے کا میلان پایا جاتا تھا۔ یہ بات بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ ایلخانی بادشاہ اس طریقے سے وزیر کے ناروا فوقیت حاصل کرنے کے امکان کو کم کر دینا چاہتے تھے۔ الجوینی وزیر کی حیثیت سے مشرف الممالک، مجد الملک یزدی کے ساتھ ۶۷۷ھ/ ۱۲۷۹ء سے کئی برس تک اقتدار میں شریک رہا؛ اور ۶۹۹ تا ۷۱۸ھ/ ۱۳۰۰ تا ۱۳۱۸ء سے نظم و نسق کی سربراہی میں ایک سے زیادہ وزیر شریک ہوتے رہے۔ تاہم ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں ایلخانی وسطی ایشیا کے قدیم حکمرانوں کی مثال کا محض تتبع کر رہے ہوں (دیکھیے Pritsak: 'Die Karachaniden در Isl.، ۳۱/۱ : ۲۳۰)۔ دو عہدے داروں کو مشترکہ طور پر ایک ہی عہدے کے لیے مقرر کرنے کی رسم صفویوں نے بعد میں متعدد موقعوں پر اختیار کی۔ جب ۶۹۹ھ/۱۲۹۹ - ۱۳۰۰ء میں رشیدالدین کو صاحب دیوان مقرر کیا گیا، تو اسے سلطنت کی عام نگرانی کا اختیار دیا گیا، خصوصاً محصولات کے انتظام کا اور دیگر امور کے علاوہ شاہی اراضی، دفتری عہدے داروں کے تقرر، ملک کی ڈاک (یام) اور ترقیات کا (وصاف، بمبئی، ص ۳۴۷)۔ صاحب دیوان کے تحت مستوفی الممالک اور مالیات سے متعلقہ کئی محکمے تھے، جن میں دیوان الخالصات بھی شامل تھا (وصاف، ص ۳۴۹)۔

تیموریوں کے زیر حکومت گو نظری طور پر شرعی حکومت کے اصولوں کو دوبارہ نافذ کرنے اور روایاتی طریقوں کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن عملاً انتظامیہ کے دیوانی اور فوجی شعبوں کے درمیان امتیاز، جو ترک اور تاجیک (ایرانی) کی دو گروہی تقسیم کے مطابق تھا، صاف نمایاں رہا۔ حسین بیقرا کے ماتحت دیوان اعلٰی، جو حکومت کا سب سے بڑا شعبہ تھا، "دیوان بزرگ امارت" (دیوان بیگی کے ماتحت)، جس کا تعلق فوجی معاملات سے ہوتا تھا، اور دیوان مال (ایک وزیر کے ماتحت) جو دیوانی امور سے تعلق رکھتا تھا، میں منقسم تھا (Roemer: *Staatsschreiben der Timuridenzeit*، ص ۱۶۹ ببعد)۔

یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ایلخانی سلطنت کا طرز انتظام قرہ قویونلو نے ورثے میں پایا تھا (Minorsky: '*The Aq-Qoyunlu and land reforms*' در *BSOAS*، ۱۹۵۵ء، ۱۷/۳)، لیکن اُن کے محاصل کے انتظام کے سوا اُن کے مختلف دیوانوں کی تنظیم کی تفصیلات بہت کم معلوم ہیں۔ دیوان تواجی اور دیوان پروانچی کا ذکر ملتا ہے (Minorsky: *Persia in A.D. 1478-90 : An abridged translation of Faḍlullāh b. Rūzbihān Khunji's Tārīkh-i ʿālam-ārā-yi amīnī*، لنڈن ۱۹۵۷ء، ص ۲۸، ۱۰۱)۔ ایران میں ایلخانوں کی انتظامیہ کی تنظیم کے جائزے کے لیے دیکھیے، آئی۔ ایچ۔ اوزون چارشیلی: عثمانلی دولتی تشکیلاتن مدخل، استانبول ۱۹۴۱ء، خصوصیت کے ساتھ ص ۱۸۷ ببعد۔

مرکزی انتظامیہ کے متعلق صفوی عہد کی معلومات سابقہ ادوار کی معلومات کی بہ نسبت زیادہ مکمل ہیں۔ بایں ہمہ دیوان اعلٰی جو شاہی دربار بھی تھا اور مرکزی حکومت بھی، کی مختلف حیثیتوں کے درمیان خط فاصل قائم کرنا بہت زیادہ مشکل تھا، اسی طرح دفتری حکام، عسکری عہدے داروں اور مذہبی اداروں کے عہدے داروں کے وظائف میں مستقل طور پر کوئی واضح حد فاصل نہیں تھی۔ دیوان اعلٰی کی داخلی تنظیم "ایشیک۔ اقاسی۔ باشی" کے ماتحت تھی (تذکرۃ الملوک، ورق ۷ ب، ۱۳ الف ببعد)۔ دربار قاچار کے مہتمم تقریبات کا بھی یہی نام تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت میں مجلس شوری کی وضع کی کوئی چیز تھی جس سے دیوان اعلٰی کے

بعض ارکان تعلق رکھتے تھے، یہ مجلس مرکزی انتظامیہ کے روایتی نظام کے دائرے سے باہر تھی۔ Alessandri لکھتا ہے کہ طہماسپ روزانہ ایک مجلس منعقد کرتا تھا، جس میں بارہ سلاطین (یعنی صوبوں کے والی اور فوجی ارکان) اور اس کے بیٹے، جو دربار میں موجود ہوتے، شرکت کرتے تھے (*A Narrative of Italian travels in Persia*، Hakluyt، ص ۲۲۰ تا ۲۲۱)۔ اس مجلس کا کام محض مشاورتی معلوم ہوتا ہے۔ تذکرۃ الملوک میں لکھا ہے کہ قورچی باشی، قُلّر آقاسی، ایشک آقاسی باشی، تفنگچی آقاسی، وزیر اعظم، دیوان بیگی اور وقائع نویس ازمنۂ قدیم ہی سے امرائے جانقی کی مجلس مشاورت سے تعلق رکھتے تھے، اور شاہ سلطان حسین کے عہد حکومت کے آخر میں ناظر، مستوفی الممالک اور امیر شکار باشی کو بھی بعض موقعوں پر شریک مجلس کر لیا جاتا تھا۔ اگر کسی سالار لشکر (سپہ سالار) کو سلطنت کے کسی دور افتادہ علاقے میں بھیجے جانے کے سوال کے لیے مجلس منعقد ہوتی تو سپہ سالار کی جانقی مجلس مشاورت میں موجودگی لازمی شرط تھی (۷ ب تا ۸ الف)۔ Minorsky اس ادارے کو بلحاظ اصل منگولی یا تیموری خیال کرتا ہے۔ Chardin اس رائے پر قائم ہے کہ یورپی ادارے کی قسم کی وہاں کوئی مجلس شوریٰ نہیں تھی؛ اس کے برعکس Sanson لکھتا ہے کہ تمام فیصلے بادشاہ کی مجلس شوریٰ میں کیے جاتے تھے (تذکرۃ الملوک، ص ۱۱۳ تا ۱۱۴)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاچاروں کے تحت جانقی مرکزی حکومت کی انتظامیہ کا باقاعدہ جزو نہیں رہی بلکہ ایک قبائلی مجلس بن گئی تھی، جو قاجار قبیلے کے معاملات سے سروکار رکھتی تھی، جیسے کہ غالباً حسب معمول ایلخانی عہد میں ہوا کرتی تھی۔ Malcolm قاجار قبیلے کے ایک "بڑے امیر" کی غداری کے مقدمے کا ذکر کرتا ہے، جس کی سماعت ۱۸۰۸ء کے قریب ایک جانقی مجلس مشاورت نے کی تھی (*History*، ۲ : ۲۲۳)۔

اسمٰعیل اور طہماسپ کے ماتحت دیوان اعلیٰ کا سب سے بڑا عہدے دار وکیل ہوتا تھا، جو بادشاہ کا ہمزاد سمجھا جاتا تھا، جیسے کہ وزیر اپنے عروج کے زمانے میں سلطان کا مقرب خاص ہوا کرتا تھا؛ اس کا اختیار عملاً انتظامیہ کے ہر شعبے پر تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اعلیٰ کے سب سے بڑے عہدے دار کے لیے وکیل کی اصطلاح دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں مفقود ہو چکی تھی اور اس کی جگہ وزیر اعظم کی اصطلاح نے لے لی تھی، جو اعتماد الدولہ کے خطاب کا حامل ہوتا تھا۔ ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء کے بعد اس کے دفتر کا ذکر نظارت دیوان اعلیٰ، نظارت دیوان یا دیوان وزارت کے طور پر کیا جانے لگا تھا (R. M. Savory: *The principal offices of the Safawid state*، در *BSOAS*، ۲۳/۱، ۱۹۶۰ء، ص ۹۱ تا ۱۰۵ اور ۲۴/۱، ۱۹۶۱ء، ص ۶۵ تا ۸۴)۔ رفتہ رفتہ انتظامیہ کے طریق کار کا ایک وسیع نظام ظہور میں آیا۔ وزیر، دیوان اعلیٰ کے صدر کی حیثیت سے سرکاری تقررات کی توثیق کرتا تھا؛ سرکاری عملے کے تمام معاملات اور تنخواہ سے متعلقہ کاغذات دفتر خانۂ ہمایون اعلیٰ کے ذریعے بھیجے جاتے تھے، جو ایک خاص وزیر کے ماتحت ہوتا تھا۔ "مستقل فوج" (قُورچی، غُلام، تفنگچی اور توپ خانے کے ملازمین) کی تنخواہ کے کاغذات اسی کے محکمے (سرکار) کے ذریعے بھیجے جاتے تھے، جو وزیر اور مستوفی کے ماتحت ہوتا تھا اور اس کے عملے میں دیوان مذکور کے کاتب ہوتے تھے (تذکرۃ الملوک، ورق ۸۵ ببعد)۔ دیوانی اور فوجی عہدے داروں کے تقرر اور تنخواہ کی منظوری کے مراسلات پر، نیز جن پر وزیر اعظم کی مُہر ثبت ہوتی تھی، دیوان اعلیٰ کا لشکر نویس بھی مُہر لگاتا تھا، جو خواجہ سراؤں، باز دار شکاریوں (قوش چیان)، نقیبوں (یساوُلان) اور دربانوں (قاپوچیان) کے محکمے کا وزیر بھی ہوتا تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۶۵ الف

ببعد) .

دیوانِ اعلٰی کے سربراہ کی حیثیت سے "وزیر" کے دیگر فرائض میں یہ بھی تھا کہ وہ سرکاری عمّال کی کارروائیوں کے باضابطہ ہونے کی جانچ پڑتال اور حکومت کے مالیاتی امور کی صدارت کرے (تذکرۃ الملوک، ۱۱۵)؛ یہ آخری کام عملی اعتبار سے اس کا اہم ترین وظیفہ تھا ۔ ازمنۂ سابقہ کی وزارت میں اپنے پیش روؤں کی طرح آمدنی بڑھانے کی کوشش بھی اس کا فرض تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۸ ب) ۔ مالی انتظامیہ دو بڑے محکموں میں منقسم تھی: دیوانِ ممالک، جو مستوفی الممالک کے ماتحت تھا اور دیوانِ خاصہ جو ناظر بیوتات (جسے ناظر بیوتات سرکار خاصہ بھی کہتے تھے) کے تحت تھا ۔ وزیر اعظم اور ناظر بیوتات کے باہمی تعلق اور دیوانِ خاصہ پر اس کے اختیار کی نوعیت اچھی طرح واضح نہیں ۔ بظاہر بیوتات کا میزانیہ وزیر اعظم کے سامنے پیش کیا جاتا تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۱۶ الف) ۔ مستوفی الممالک کے ماتحت کئی عہدے دار ہوتے تھے، جو مختلف دفاتر محصولات کے مہتمم تھے، بیشتر صورتوں میں دیوان الممالک اور دیوان خاصہ کے تحت متعلقہ امور پر کارروائی کرنے کے لیے ایک ہی قسم کے متعدد دفاتر تھے ۔ ان میں دفتر موقوفات (تذکرۃ الملوک، ورق ۱۷ الف) اور دفتر بقایا شامل تھے (سکندر منشی: عالم آرا، ص ۵۶۷) ۔ مشہد میں سرکار فیض آثار نام کا ایک خاص محکمہ تھا، جو روضۂ امام رضاؑ کے اوقاف کا انتظام کرتا تھا (عالم آرا، ۲۵۸، مکرر ۳۵۶) ۔ اوقاف کی عام نگرانی صدر اعظم کے ماتحت "دیوان الصدارۃ" کرتا تھا (H. Busse: *Untersuchungen zum Islamischen Kanzleiwesen*، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ص ۳۰۲) ۔ بعض صوبائی صدروں کے بھی دیوان یا "سرکار" ہوتے تھے (دیکھیے یزد کے موقوفات کے مستوفی کے لیے سند مورخہ ۱۰۷۷ھ، جامع مفیدی، B. M. Or. ۲۱۰، ببعد، ۱۹۸ ب تا ۲۰۰ ب؛ اور Busse، ص ۲۳۱) .

دیوان ممالک ان صوبوں اور اضلاع کی انتظامیہ سے سروکار رکھتا تھا جن کا انتظام والیوں کے ہاتھوں میں تھا اور جو مرکزی حکومت کے براہ راست اختیار سے باہر ہوتے تھے ۔ دیوان خاصہ کا تعلق ان علاقوں سے تھا جن کا انتظام وزیروں کے ماتحت مرکزی حکومت براہ راست کرتی تھی ۔ بالواسطہ طور پر انتظام کیے جانے والے علاقوں کی حدود بلاواسطہ انتظام کیے جانے والے علاقوں کی بہ نسبت بدلتی رہتی تھیں ۔ (تذکرۃ الملوک، ص ۳۲ ببعد؛ A. K. S. Lambton: *Landlord and Peasant in Persia*، آوکسفرڈ ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۸) ۔ خاصہ کے رقبے میں اضافہ کے ساتھ، جو شاہ صفی کے تحت ہوا، دیوانِ خاصہ کی اہمیت غالبًا بڑھ گئی تھی؛ شاہ صفی کے زمانے میں ناظر بیوتات سرکار خاصہ کا ذکر دیوان کے سب سے بڑے دفتر کے طور پر کیا جاتا ہے (جامع مفیدی، ورق ۳۳۸ ب تا ۳۳۹ الف) ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوان خاصہ کا مستوفی کسی حد تک مستوفی الممالک کے ماتحت تھا، لہٰذا وزیر اعظم کے ماتحت بھی ہوا (تذکرۃ الملوک، ورق ۲۷ ب تا ۲۸ الف) ۔ اصفہان کو بطور دارالحکومت شاید خاص حیثیت حاصل تھی ۔ سرکار فیض آثار اور سرکار انتقالی اراضی کی خاص اقسام سے سروکار رکھتے تھے (غالبًا اوقاف اور حکومت کی بازیافتہ اراضی سے)؛ معلوم ہوتا ہے کہ شاہی اراضی کا انتظام وزیر اصفہان کے تحت تھا ۔ یہ تینوں محکمے دیوان اعلٰی کے وزیر اعظم کی عام نگرانی میں تھے (تذکرۃ الملوک، ورق ۱۷ الف ببعد) .

بیوتات یعنی شاہی محل کا انتظام وزیر بیوتات، ناظر بیوتات کی عام نگرانی کے تحت کرتا تھا؛ یہ متعدد دفتروں (دفتر خانہ) اور کارخانوں میں منقسم تھا، اور ان میں سے ہر ایک "صاحب جمع" اور مشرف کے ماتحت

تھا؛ اول الذکر اس کی عام کارکردگی اور مؤخر الذکر انتظامی ضوابط پر عمل درآمد کا ذمے دار تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۱۴۰) ۔

وہ محکمہ جو سابق دیوان انشاء کے مانند تھا، صفویوں کے تحت دارالانشاء کہلاتا تھا اور وہ منشی الممالک کے ماتحت تھا (تذکرۃ الملوک، ورق ۳۹ ب تا ۴۰ الف؛ Busse، ص ۵۹ ببعد) ۔

عمومی نظر سے دیکھا جائے تو قاجاروں کے عہد میں بھی دیوان اعلٰی کی تشکیل صفویوں کے طریق عمل کے مطابق کی گئی تھی ۔ اس خاندان میں شاہی دربار کا طریق کار فتح علی کے عہد اور مابعد کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ شاہی محل، جو متعدد دفتروں پر مشتمل اور مجموعی طور پر بیوتات کہلاتا تھا، بہرحال بہ نسبت سابق کے دیوان اعلٰی سے بالکل علٰحدہ کر لیا گیا تھا ۔ جہاں تک مرکزی حکومت میں دیوان اعلٰی کا تعلق تھا، اس کی تنظیم اتنی معیاری نہیں رہی تھی جتنی صفویوں کے عہد میں تھی؛ اور "ممالک" اور "خاصّہ" کے درمیان بھی کوئی امتیاز نہیں رہا تھا ۔ آقا محمد خان بظاہر انتظامیہ کی تفصیلات پر بھی بذات خود توجہ کرتا تھا ۔ فتح علی کی حکومت بھی شخصی نوعیت کی تھی، لیکن اس کے عہد حکومت میں انتظامیہ وسیع ہو گئی ۔ دیوان اعلٰی کا سب سے بڑا عہدے دار صدر اعظم تھا؛ اس کے اختیارات بادشاہ کی مستعدی، کاہلی یا صلاحیت کے مطابق کم و بیش ہوتے رہتے تھے ۔ آقا محمد خان کے عہد میں صدر اعظم حاجی ابراہیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حکومت کے تمام محکموں کی صدارت کرتا تھا (Malcolm، ۲ : ۳۰۸ تا ۳۰۹) ۔ دو اہم ترین محکمے بالترتیب مستوفی الممالک اور لشکر نویس کے ماتحت تھے؛ مؤخر الذکر فوجوں کی تنخواہ اور ان کی بھرتی سے متعلق تھا، جس کا محصولات کی انتظامیہ کے ساتھ گہرا رابطہ تھا ۔ فتح علی کے عہد میں منشی الممالک کے عہدے نے پھر اہمیت حاصل کر لی ۔ قاجاروں کے ابتدائی عہد حکومت میں ان مختلف محکموں کا اندرونی انتظام نامکمل سا نظر آتا ہے ۔ ۱۸۰۹ء میں Morier لکھتا ہے کہ وزیروں اور کاتبوں کے دفاتر بادشاہ کے محل میں واقع تھے، جہاں وہ ہر روز اس لیے جمع ہوتے کہ جب بادشاہ طلب کرے تو پیش ہو سکیں (*A journey through Persia*، لنڈن ۱۸۱۲ء، ص ۲۱۶)؛ لیکن فی الحقیقت وزیروں کو، جہاں کہیں وہ ہوتے تھے، اکثر وہیں اپنے محکمے قائم کرنے پڑتے تھے ۔ آقا محمد خان اور فتح علی دونوں اپنا بیشتر وقت فوجی مہموں اور چھاؤنی میں گذارتے تھے (ایسا ہی ان کے جانشینوں نے کیا)؛ ان موقعوں پر ان کے وزرا عموماً ان کے ہمراہ ہوا کرتے تھے ۔ ان حالات میں سرکاری محکموں کو زیادہ دفتری لوازم کے بغیر ہی کام کرنا پڑتا تھا ۔ Malcolm لکھتا ہے کہ "حکومت کے شرعی، دیوانی، مالی اور عسکری محکموں میں رقوم کی وصولی اور ادائی کے حسابات کو بڑی باقاعدگی اور صحت کے ساتھ رکھا جاتا تھا" (*History*، ۲ : ۳۰۰) ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مثلوں کو زیادہ تر ان عہدے داروں کی ذاتی ملکیت خیال کیا جاتا تھا جو انہیں مرتب کرتے تھے؛ اور جہاں تک ان کا تعلق محاصل کی تشخیص سے تھا، یہ مثلیں اس صدی کے وسط میں اپنے زمانے کے واقعی حالات سے بہت کم مطابقت رکھتی تھیں ۔ مستوفی الممالک کے دیوان کی تنظیم جغرافیائی بنیادوں پر کی جاتی تھی؛ کسی علاقے کے محصولات کی تشخیص اور کاغذات مستوفی کو تفویض کر دیے جاتے تھے، جسے اس ضلع کا مستوفی کہتے تھے ۔ شاہی اراضی (خالصہ) اور اوقاف، نیز خاص صورتوں، مثلاً بقایا، کے لیے علٰحدہ محکمے تھے ۔

صوبائی انتظام کو والی کے اختیار میں دے دیا جاتا تھا، جو اس کی تفصیلات کو اکثر بذات خود دیکھتا تھا ۔ ایک طاقتور صوبائی والی، خصوصاً اگر وہ

قاجاری شہزادہ ہوتا، اپنا صوبائی دربار، دیوان اعلٰی کے نمونے کے مطابق (اگرچہ چھوٹے پیمانے پر) لگاتا تھا ۔ اہم ترین صوبائی عہدے دار وزیر تھا، جس کا تقرر عام طور پر دیوان اعلٰی کرتا تھا ۔ اس کی سب سے بڑی ذمے داری یہ تھی کہ والی صوبائی محاصل کا مقررہ حصہ مرکزی حکومت کو بھیجنے میں کوتاہی نہ کرنے پائے.

مآخذ : متن مقالہ میں مندرج حوالوں کو دیکھیے.

(Ann. K.S. Lambton)

۵ ۔ ہندوستان

معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی اصطلاح سرکاری محکمے کے معنی میں ہندوستان میں سب سے پہلے غزنویوں کے عہد حکومت میں، جن کا (ہند میں) دارالحکومت لاہور تھا، رائج ہوئی ۔ سلطان محمود کے مقرر کردہ ہندوستان کے سپہ سالار آریارک کی تمام دولت جو اس نے ہندوستان میں اپنی صوبے داری کے زمانے میں جمع کی تھی، اس کی برطرفی اور واپس غزنی بلا لیے جانے پر ضبط ہوگئی ۔ اس کے مال و دولت کا بہت بڑا حصہ یقیناً "خراج" (زمین کا مالیہ) کے ذریعے آیا ہوگا، جس کی وصولی اور ادائی کے لیے لازماً ایک جداگانہ محکمہ ہوگا ۔ نرشخی (دیکھیے تاریخ بخارا، طبع Schefer، ص ۲۴) غزنویوں کے تحت جن دیوانوں کا ذکر کرتا ہے وہ دس سے کم نہیں ، جن میں دیوان وزراء یا محکمۂ مال بھی شامل ہے (دیکھیے نیز ابوالفضل البیہقی : تاریخ بیہقی، طبع سعید نفیسی، تہران ۱۳۱۹ شمسی/۱۹۴۰ء، ص ۵۳، ۱۸۰، ۴۹۲) ۔ مسعود بن محمود کے عہد حکومت کے دوران البیہقی بذات خود "دیوان رسالہ" (دیوان انشاء) کے عملے میں تھا ۔ لہٰذا مورلینڈ Moreland کا یہ دعوٰی (دیکھیے مآخذ) کہ ہندوستانی مؤرخوں نے لفظ دیوان سب سے پہلے ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی اور آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں محکمے یا وزارت کے معنی میں استعمال کیا، غلط ہے ۔ یہ اصطلاح اس سے بہت پہلے مستعمل تھی.

سلاطین دہلی کے زمانے میں اس کا استعمال بنیادی طور پر وزیر مال تک محدود تھا، جو معمولاً خود وزیر ہوتا تھا، اور اس کا محکمہ وزارت مال کہلاتا تھا ۔ جب کوئی نیا محکمہ بنتا تو اسے بھی دیوان کہتے تھے، جیسے دیوان رسالہ یا دیوان مظالم ۔ اسی عہد میں یہ لفظ فوجی محکمے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا، اور یہ بھی وزیر کے ماتحت ہوتا تھا، گو غزنویوں کے عہد میں اس محکمے کو جداگانہ طور پر "دیوان عرض" کہتے تھے.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام سلاطین دہلی کے عہد سلطنت میں پوری طرح منظم ہو چکا تھا، کیونکہ ہم اچھی خاصی تعداد میں محکمے موجود پاتے ہیں ۔ ان میں یہ شامل تھے : (۱) دیوان وزارۃ جس کا زیادہ تر تعلق مالیات سے تھا (قب شمس سراج عفیف : تاریخ فیروز شاہی، فارسی متن، ص ۴۱۹ تا ۴۲۰)؛ (۲) دیوان عرض، عارض ممالک کے تحت فوجی محکمہ؛ عارض ممالک بعض اوقات خود سلطان ہوتا تھا؛ (۳) دیوان رسالہ، جس کا تعلق مذہبی امور، اوقاف اور مدد معاش کے وظائف سے تھا اور جس کا نظم و نسق صدر الصدور کے ہاتھ میں تھا، اور وہ قاضی ممالک یا سلطنت کا اعلٰی حاکم عدالت بھی ہوتا تھا؛ (۴) دیوان انشاء بالکل دیوان خاتم کے مانند، جسے سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے قائم کیا تھا؛ غزنویوں کے تحت اسے دیوان رسالت کہتے تھے ۔ یہ تمام سرکاری خط و کتابت کا کام کرتا تھا اور زمانۂ جدید کی پیچیدہ تر، ترقی یافتہ سیکرٹیریٹ کا نقش اول تھا؛ (۵) دیوان مظالم، جس کا تعلق مظالم [رک باں] کی عدالتوں کے دائرۂ اختیار سے تھا، شرعی عدالتوں کا انتظام دیوان قضاء کے پاس ہوتا تھا، جو صدر الصدور یا قاضی القضاۃ کے ماتحت تھا؛ (۶) دیوان اشراف، جو

مشرف یا صدر محاسب کے ماتحت ہوتا، اور وہ صوبوں یا دیگر محکموں سے وصول ہونے والے حسابات سے تعلق رکھتا تھا۔ ان حسابات کی جانچ پڑتال اس کا دوسرا محکمہ کرتا تھا جس کا نظم و نسق مستوفی الممالک کے ہاتھ میں تھا۔ فیروز تغلق کے عہد حکومت کے دوران میں، (قب عفیف، فارسی متن، ص ۴۰۹ تا ۴۱۰) مشرف کا تعلق محاصل اور مستوفی کا تعلق صرف خرچ سے رہ گیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے شاہی کارخانوں کے لیے متصرف کے ماتحت ایک علحدہ دیوان بھی قائم کیا تھا، مگر اس کے حسابات کی جانچ پڑتال دیوانِ وزارۃ ہی کرتا تھا۔ عہد مغلیہ میں وزیر کے نام میں خفیف تبدیلی واقع ہوئی کہ اسے دیوان کُل اور اسی محکمے میں اس کے رفقاے کار کو صرف دیوان کہنے لگے، البتہ اس کے ساتھ وہ اصطلاحی نام شامل ہوتے جو ان کے وظائف اور فرائض پر دلالت کرتے تھے، مثلاً دیوان تن یا دیوان خالصہ۔

مغلوں کے تحت ایک اور نمایاں تبدیلی یہ ہوئی کہ مالی اور مالیاتی محکمے کے سربراہ کو مختص طور پر دیوان کہنے لگے۔ اکبر کے عہد حکومت میں وزیر کے لفظ کو شاذ ہی اس مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا، کیونکہ اس کی جگہ دیوان کی اصطلاح نے لے لی تھی، جو ادارے یا سرکاری محکمے پر دلالت کرنے کے بجاے اب فرد (یا شخص) پر دلالت کرنے لگی تھی۔ تاہم اس کے بیٹے جہانگیر کے عہد حکومت میں پرانے طریق کار کا احیا ہوا اور وزیر کی اصطلاح پھر مروج ہوگئی۔ یہ شاہجہان کا عہد حکومت تھا جس کے دوران میں وزیر کو دیوان کل اور محکمے میں اس کے دیگر رفقاے کار کو دیوان کہنے لگے، مع اُن اضافی الفاظ کے، جو ان کے فرائض کو ظاہر کرتے تھے۔ وزیر اور دیوان کے دونوں الفاظ کچھ عرصے تک تقریباً مترادف ہی رہے اور نجی کاروبار میں بھی اس شخص کو جو کسی حاکم اعلٰی یا دولتمند شخص کے مالی امور کا انتظام کرتا تھا دیوان کہنے لگے۔ دیانت خان، شاہجہان کے عہد حکومت کے پہلے سال میں ممتاز محل کا دیوان تھا (مآثر الامراء، انگریزی ترجمہ از A.H. Beveridge، ۱ : ۴۸۴)۔ بعض ہندو اور مسلم گھرانوں کے مرد دیوان کے اس موروثی اعزازی لقب کو آج تک بڑے فخر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، جس کا حامل ان کا کوئی نامور جد امجد ہوتا تھا۔

دیوان کے تحت وزارت مال کو انجام کار "دیوانی" کہنے لگے۔ یہ اصطلاح برطانوی عہد میں "دیوانی" اور "فوجداری" عدالتوں میں باقی رہی اور ابھی تک پاکستان کے قانونی نظام کا جزو ہے۔

عہد مغلیہ میں دیوان گوناگوں فرائض سرانجام دیتا تھا۔ وہ نہ صرف مالی کاغذات کے انصرام کا ذمے دار تھا بلکہ وہ ضروری شاہی مکتوبات اور فرامین کا مسودہ بھی تیار کرتا تھا۔ وہ شاہزادوں کے وکلاء، صوبائی والیوں اور معزز امرا سے ملاقات و گفتگو کرتا تھا۔ رات کو شاہی محل کے گرد کسی امیر کے تحت پہرہ لگوانا بھی اس کے فرائض میں سے تھا۔ وہ محاصل کی وصولی اور اخراجات کے گوشوارے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا تھا، جو اس طریقے سے حکومت کے مالیات سے مطلع رہتا تھا۔ ناظم کی حیثیت سے وہ اعلٰی عہدے داروں کے تقرر کے وقت اُن کے فرائض کی تعیین کرتا تھا اور اُن سے باقاعدہ کارگزاری کی روداد وصول کرتا تھا اور انہیں رخصت دینے کا بھی مجاز تھا۔ اس کی تحویل میں وہ تمام سرکاری مثلیں ہوتی تھیں جو اس کے دفتر میں جمع کی جاتی تھیں (ان مثلوں کی مفصل فہرست کے لیے دیکھیے جادوناتھ سرکار: *Mughal administration*، طبع چہارم، کلکتہ ۱۹۵۲ء، ص ۲۹ تا ۳۲)۔

اس کے رفقاے کار دیوان خالصہ اور دیوان تن جداگانہ فرائض انجام دیتے تھے۔ اول الذکر من جملہ

دیگر امور کے ان حسابات کی بالواسطہ جانچ کرتا جو محکمۂ مال تیار کرتا تھا، (شاہی اراضی) کے طومارِ جمع (مجموعی طور پر تشخیص شدہ معیاری محاصل کے کاغذات) کی جانچ پڑتال کرتا اور فوجوں اور بادشاہ کے ذاتی عملے اور خدم و حشم کے اخراجات کے تخمینے (برآورد) تیار کرتا تھا۔ دیوانِ تن من جملہ اور چیزوں کے ان تمام امور کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کا ذمے دار تھا جن کا تعلق جاگیروں یا زرِ نقد کے عطیوں سے تھا، جن میں طلبہ، علما، قضاۃ وغیرہ کی مددِ معاش کی منظوری کے لیے فرمانوں، عرض داشتوں اور پروانوں وغیرہ کا مسودہ تیار کرنا بھی شامل تھا۔

صوبائی دیوان کا عہدہ اہمیت میں صرف سپہ سالار کے عہدے سے دوسرے درجے پر ہوتا تھا۔ صوبائی دیوان کا تقرر چونکہ بادشاہ مرکزی دیوان کی سفارش پر براہ راست کرتا تھا لہٰذا وہ کسی طرح بھی صوبیدار کے ماتحت نہ تھا۔ وہ اپنے احکام مرکزی دیوان سے حاصل کرتا تھا اور فقط اسی کے سامنے جوابدہ تھا؛ اس سے مقصود حکومت کے خزانے کو صوبیدار کے حلقۂ اختیار سے آزاد رکھنا اور اس طرح سرکاری روپے میں غبن اور خُرد بُرد ہو جانے نیز صوبیداروں کی سرکشی کے خطرات کو کم کرنا تھا۔ مرآۃ احمدی (بڑودہ ۱۹۲۸ء، ۱ : ۱۶۳ تا ۱۷۰) میں اکبر کا ایک فرمان نقل کیا گیا ہے، جس میں صوبائی دیوان کے فرائض جامع شکل میں مرقوم ہیں۔ اس فرمان کے مطابق دیوان "قابلِ اعتماد اور تجربہ کار شخص ہونا چاہیے، نیز اُسے کسی بلند مرتبت امیر کے ہاں بھی اسی کام کا تجربہ ہو"۔ اس کے فرائض میں بھاری ذمے داریاں شامل تھیں، کیونکہ اس کے ذمّے محصلین (عمّال) کے حسابات کی جانچ پڑتال اور رشوت خوروں کی برطرفی کی تحریک کرنا ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی صوبائی محاسب کے طور پر بھی کام کرتا تھا۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا، دیوان کے اختیارات میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ نہ صرف ننانوے ہزار دام تک کی منظوری دے سکتا تھا، بلکہ جاگیروں اور ائمّہ کی اراضی کی سندات کا اپنے دستخط سے اجرا بھی کر سکتا تھا، جو بلحاظ ضابطۂ شاہی مُہر یا مرکزی دیوان کے دستخط کے بغیر ناقص اور کالعدم ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود دیوان کو وہ مرتبہ حاصل نہ تھا جو صوبیدار کو تھا، جسے انتظامی شعبے کا سربراہ ہونے کے سبب عوام کی نظروں میں حاکمِ مالیات سے اعلٰی مرتبہ، رُتبہ اور عزت حاصل تھی۔

صوبائی دیوان کے فرائض میں اس کی مدد کے لیے ایک پیشکار (ذاتی معاون)، جس کا تقرر شاہی سند کے ذریعے مرکزی دیوان کی مُہر کے تحت ہوتا تھا، داروغہ (یا مہتمم دفتر) مُشرف اور تحویل دار دفترخانہ (محافظ امثلہ) ہوتے تھے، اور یہ سب منصب کے حامل ہوتے تھے، ادنٰی درجے کے عملے میں مردھا (عدالتی ہرکارہ) عوام کی نظر میں با اثر حیثیت رکھتا تھا اور اس کی عموماً بہت توقیر کی جاتی تھی۔

گیارھویں۔ بارھویں صدی ہجری / سترھویں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں دیوان کی اصطلاح صرف محکمۂ مال کے لیے استعمال ہونے لگی۔ اس کے برعکس نظامت یا فوجداری کی اصطلاحات عام انتظامیہ پر دلالت کرتی تھیں اور ان کا تعلق بنیادی طور پر نظم و نسق اور قانون کے نفاذ سے تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں آج تک غیر فوجی عدالتوں کو فوجداری عدالتوں سے ممتاز کرتے ہوئے دیوانی عدالتیں کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ باعتبار ماخذ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صوبۂ بنگال میں دیوان مقرر کیے جانے کا مرہونِ منت ہے۔ کمپنی کے منتظمین نے اپنی عدالت قائم کرنا مناسب سمجھا، جسے اُنھوں نے "دیوانی عدالت" یعنی دیوان کی عدالت کے نام سے موسوم کیا۔

ہندوستان میں بعض سابق راجاؤں کی ریاستوں میں، جو اب بھارتی وحدت میں مدغم ہو گئی ہیں، وزیرِ اعلٰی

کو دیوان کہتے تھے۔ یہ لفظ دیوان صاحب اور دیوان بہادر کے دو خطابات کا بھی جزو تھا، جو ہندوستان کی برطانوی حکومت دیا کرتی تھی، مگر ان کا استعمال جنوبی ہندوستان کے مشاہیر تک محدود تھا۔

لاہور، آگرے، دہلی اور دوسری جگہ کے مغل قلعوں میں دیوان عام (عوام کی باریابی کے لیے) اور دیوان خاص (خواص کی باریابی کے لیے) ایسے جملوں میں اس لفظ کا استعمال اپنے اصلی معنی کی ایک ہلکی سی صداے بازگشت ہے۔ گذشتہ ایام میں بڑے اور متمول لوگوں کے مکانوں اور حویلیوں میں جدید ڈرائنگ روم کی طرح ایک علٰحدہ کمرہ ہوتا تھا، جسے دیوان خانہ کہتے تھے، لیکن وہ کلیۃً گھر کے مردوں یا ان کے مہمانوں اور ملاقاتیوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔

مآخذ: ان سندوں کے علاوہ جو متن میں دی گئی ہیں: (۱) ایس۔ ایم۔ جعفر: *Mediaeval India* (The Ghaznawids)، پشاور ۱۹۴۰ء، ص ۲۴۲ تا ۲۵۴؛ (۲) وہی مصنف: *Some cultural aspects of the Muslim rule in India*، پشاور ۱۹۵۰ء، ص ۲۵ تا ۲۹، ۵۱، ۱۱۰؛ (۳) جادو ناتھ سرکار: *Mughal administration*، طبع چہارم، کلکتہ ۱۹۵۲ء، ص ۲۵ تا ۴۰، ۵۳ تا ۶۴؛ (۴) اشتیاق حسین قریشی: *The administration of the sultanate of Delhi*، طبع دوم، لاہور ۱۹۴۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۵) ابن حسن: *The central structure of the Mughal empire*، لندن ۱۹۳۶ء (اردو ترجمہ بعنوان دیوان مغلیہ کی ہیئت مرکزی، لاہور ۱۹۵۸ء)، بمدد اشاریہ؛ (۶) P. Saran: *The provincial government of the Mughals*، الٰہ آباد ۱۹۴۱ء، ص ۱۸۹ تا ۱۹۷؛ (۷) R. P. Tripathi: *Some aspects of Muslim administration*، الٰہ آباد ۱۹۳۶ء؛ (۸) W.H. Moreland: *The agrarian system of Moslem India*، طبع دوم، الٰہ آباد، بدون تاریخ، ص ۱۴ تا ۱۵؛ ۸۲، ۱۰۹، ۱۲۲ ببعد، ۱۸۳، ۱۹۷، ۲۷۱؛ (۹) Rieu، ۳: ۹۲۹ الف (نے اکبر کے عہد حکومت سے لے کر محمد شاہ کے عہد حکومت کے وکیلوں اور دیوانوں کی فہرست دی ہے)۔

(بزمی انصاری)

دیوان ہمایون: * عثمانی شاہی مجلس کا نام، جو گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے وسط تک ترکی سلطنت کی انتظامیہ کا مرکزی ادارہ تھا۔ قدیم سلاطین کے تحت دیوان کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ بقول عاشق پاشازادہ (باب ۳۰؛ طبع N. Atsız: عثمانلی تریخ لری *Osmanlı tarihleri*، استانبول ۱۹۴۹ء، ص ۱۱۸؛ جرمن ترجمہ R. Kreutel: *Vom Hirtenzelt zur hohen Pforte*، Graz ۱۹۵۹ء، ص ۶۶)، دیوان میں پیچ دار پگڑی (بُرماو دلبند) باندھ کر حاضر ہونے کی رسم اُرخان کے عہد حکومت میں پڑی تھی۔ اس سے غالباً ایک قسم کی عام باریابی مراد ہے۔ مصری طبیب شمس الدین ابن صغیر، جسے برقوق نے بایزید الثانی کے علاج کے لیے بھیجا تھا، بیان کرتا ہے کہ کس طرح عثمانی حکمران صبح کے وقت دربار عام منعقد کرتے اور عوام کی داد رسی کیا کرتے تھے (بحوالۂ ابن حجر، در اِنباء الغمر، سال ۸۰۵ھ: Şevkiye İnalcık: *Ibn Hacer'de Osmanlı'lara dair haberler*، در *AÜDTCFD*، ۳/۶ (۱۹۴۸ء): ص ۱۹۲، ۱۹۵؛ قب تشکو پروزادہ کمال الدین محمد: تاریخ صاف، استانبول ۱۲۸۷ھ، ص ۳۴)۔ عاشق پاشازادہ (باب ۱۸؛ متن ص ۱۵۵ تا ۱۵۶؛ ترجمہ ص ۱۳۴) پاشاؤں کے متعلق لکھتا ہے کہ جب محمد اول کا آخری وقت تھا تو اس نے دیوان منعقد کیا، اور باب عالی (قپو) میں تو روزانہ دیوان منعقد ہوتا تھا، نیز (باب ۱۲۲؛ متن ص ۱۹۰ تا ۱۹۱؛ ترجمہ ص ۱۹۵)۔ وہ مراد ثانی کی وفات پر بھی پاشاؤں کے اسی قسم کے ایک دیوان کا ذکر کرتا ہے۔ ان

اقوال نیز نشری اور دیگر قدیم واقعہ نگاروں کے مماثل بیانات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل تک ان پاشاؤں کی مجلس کی صدارت کرنا سلطان کا باقاعدہ معمول بن چکا تھا اور سلطان کی وفات اور اس کے جانشین کی آمد کے درمیانی عرصے میں پاشا اپنی مرضی سے مستثنٰی طور پر دیوان منعقد کر سکتے تھے۔ محمد ثانی پہلا سلطان نظر آتا ہے جس نے دیوان کے اجلاس کی صدارت کرنے کی رسم ترک کرکے یہ کام وزیراعظم کے سپرد کیا۔ ایک حکایت کی رو سے، جیسے مابعد کے مؤرخین نے نقل کیا ہے، اس کا سبب یہ تھا ایک دن ایک کسان شکایت لے کر دیوان میں آیا اور معززین کے مجمع سے کہا: "تم میں سے کون سلطان ہے؟ مجھے شکایت پیش کرنی ہے"۔ سلطان کو (یہ تخاطب) ناگوار گزرا، اور وزیراعظم کدک احمد پاشا نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دیوان میں جلوہ افروز نہ ہوا کریں تاکہ اس قسم کی بے لطفی کی نوبت نہ آئے۔ اس کے بجائے وہ ان کارروائیوں کو پردے کے پیچھے سے دیکھ سکتے ہیں (سولق زادہ: تاریخ، ص ۲۶۸؛ (۲) مصطفٰی نوری پاشا: نتائج الوقوعات، طبع دوم، ج ۱، استانبول ۱۲۷۲ھ: ص ۵۹؛ (۳) عبدالرحمن شرف: توپ قپو سرائے همایون، در TOEM، ۱/۶، ۱۹۱۰ء، ص ۱۵۳)۔ اس حکایت کی حقیقت جو کچھ ہو، محمد ثانی کے قانون سے سلطان کے کنارہ کش ہونے کی تصدیق ہوتی ہے، جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ سلطان پردے کے پیچھے بیٹھتا ہے (جناب شریفم پس پردۂ آترپ (قانون نامہ، ص ۲۳)۔ یہ طریق عمل سلیمان قانونی کے عہد تک جاری رہا، جس نے اس شکل میں بھی دیوان کے اجلاس میں جانا بند کر دیا (قوچو بے: رسالہ، باب ۲، طبع A.K. Aksüt، استانبول ۱۹۳۹ء، ص ۲۰ تا ۲۳؛ جرمن ترجمہ از W.F.A. Behrnauer، در ZDMG، ج ۱۵، (۱۸۶۱ء)، ص ۲۷۵ ببعد؛ قب Hammer-Purgstall : *GOR*، ۳ : ۴۸۹؛ *Histoire*، ۶ : ۲۸۲)۔

آئین اور طریق کار: محمد ثانی کے قانون میں، جس کا مقصد سلطان کے باپ اور دادا کے طریق کار کو پیش کرنا ہے، دیوان همایون کا آئین خاصی تفصیل کے ساتھ مندرج ہے۔ دیوان کا اجلاس ہر روز ہوتا تھا؛ اس میں شریک ہونے والے بلحاظ مراتب یہ تھے: وزیراعظم، دیگر وزرا، قاضی عسا کر، دفتردار اور نشانجی؛ اگر نشانجی کا عہدہ وزیر یا بیلر بے کا ہوتا تو وہ دفترداروں کے اوپر بیٹھتا؛ اگر عہدہ سنجق بیگی کا ہوتا تو دفترداروں کے نیچے۔ جب یہ عہدے دار آتے تو چاؤش باشی اور دربانوں کا داروغہ بڑی تعظیم کے ساتھ ان کا استقبال کرتا۔ یہ اجلاس ہفتے میں چار دن دیوان عام (ارض اوداسی) میں منعقد ہوتا تھا، جس میں وزیر، قاضی عسا کر اور دفتر دار شریک ہوتے تھے، اور اس میں سلطان پس پردہ موجود ہوتا تھا (قانون نامہ، ص ۲۱، ۲۳)۔ پہلے زمانے میں وزرا کے ساتھ کھانا کھانا سلاطین کا دستور تھا، لیکن محمد نے اسے منسوخ کر دیا تھا (کتاب مذکور، ص ۲۷)۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے دوران میں دیوان کی رکنیت کسی قدر بڑھا دی گئی۔ ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء کی ایک دستاویز میں، جسے فریدون نے نقل کیا ہے (منشآت السلاطین، طبع دوم، ۱ : ۵۹۵) روم ایلی کے بیلر بے کو دیوان میں شرکت کا اختیار دیا گیا ہے، لیکن آناطولی کے بیلر بے کو خارج رکھا گیا ہے۔ بعد ازاں بحری معاملات کی روزافزوں اہمیت کی بنا پر اس میں قپودان پاشا کا اضافہ کر دیا گیا۔ ینی چریوں کا آغا صرف اس صورت میں رکن ہوتا تھا جب کہ اسے وزیر کا مرتبہ حاصل ہو۔ دیوان کے اصل ارکان کے علاوہ متعدد دیگر عہدے دار اس میں شرکت کرتے تھے، گو مجلس کے ایوان میں ان کے لیے کوئی نشست نہ ہوتی تھی اور

وہ بحث مباحثے میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان میں کاتب اعلٰی (رئیس الکتاب [رک بان]) یعنی صدر وزارت، دیوان وزارت کا سربراہ، چاؤش باشی اور دربانوں کا داروغہ تھا، جو سب وزیراعظم اور سلطان کے درمیان رابطہ قائم رکھتے تھے؛ مالیات کے معتمدین (دیکھیے محاسبہ)؛ دیوان کے ترجمان (دیکھیے ترجمان)، پولیس کے حکام (دیکھیے شُرطہ) اور محلات اور انتظامیہ کے دیگر متعدّد عمّال، جنہیں دیوان کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے بلایا جاتا تھا، اپنے معاونوں، منشیوں اور قاصدوں کے ساتھ موجود ہوتے تھے۔

دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے دوران میں دیوان کا اجلاس ہفتے میں چار دن باقاعدگی سے ہوتا تھا، یعنی ہفتے، اتوار، پیر اور منگل کو۔ اس کی کارروائی طلوع آفتاب کے ساتھ شروع ہو جاتی، اور اس کا تعلق تمام سرکاری امور سے ہوتا تھا۔ صبح کا وقت عام طور پر عام اجلاس کے لیے وقف ہوتا تھا اور خاص طور پر عرضیوں اور شکایات کی سماعت کے لیے، جن کا فیصلہ دیوان کا متعلقہ رکن یا خود وزیر اعظم کرتا تھا۔ دوپہر کے قریب کثیر التعداد عرضی گزار اور دیگر بیرونی زائرین چلے جاتے تھے اور پھر دیوان کے ارکان کے لیے کھانا چنا جاتا تھا، اس کے بعد وہ باقی ماندہ امور پر گفتگو کرنے لگتے تھے۔ Withers (بعد از Bon) اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ مجلس محض مشاورتی تھی اور آخری ذمّے داری وزیر اعظم ہی کی ہوتی تھی: ”جب تمام کا کھانا ختم ہو جاتا تو وزیر اعظم عام امور کے لیے تھوڑا سا وقت صرف کرتا اور (اگر وہ چاہتا اور اسے مناسب سمجھتا تو) دیگر پاشاؤں سے مشورہ کر لیتا؛ آخرکار وہ اپنے دل میں تمام امور کے متعلق فیصلہ کرکے بادشاہ کی خدمت میں جانے کے لیے تیار ہو جاتا (دیوان کے چار دنوں میں سے دو دن یعنی اتوار اور منگل کو ایسا کرنے کا عام دستور تھا) تاکہ وہ تمام امور کی روداد، جن کا تصفیہ وہ کر چکا ہے، مجملاً بادشاہ کے گوش گزار کرے“ (طبع Greaves، ۱۷۳۷ء، ص ۹۱۹)۔ دیوان کے باقاعدہ اجلاس کے علاوہ بعض خاص دیوان منعقد ہوتے تھے، جو یہ تھے: (۱) عُلُوف دیوانی یا غَلَبہ دیوانی، جو ینی چریوں کو دیگر ”غلامان درگاہ“ (دیکھیے قپوقُلو) کو تنخواہ اور سامان رسد تقسیم کرنے کے لیے، نیز بیرونی ممالک کے سفیروں کے خیرمقدم کے لیے منعقد ہوتے تھے؛ (۲) ایک دیوانی —پیادہ دیوان— ایک غیر معمولی ہنگامی اجلاس، جس کی صدارت سلطان یا فوج کا سپہ سالار کرتا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ تمام حاضرین کھڑے رہتے تھے (ان دونوں کے لیے دیکھیے I. H. Uzunçarşili: *Osmanli devleti teşkilâtindan kapukulu ocaklari*، ج ۱، انقرہ ۱۹۴۳ء، بمدد اشاریہ؛ اور وہی مصنف: *Osmanli devletinin saray teşkilâti*، انقرہ ۱۹۴۵ء، ص ۲۲۵ تا ۲۲۹)۔

اجلاس کا مقام: دیوان کی عمارت، جسے عام طور پر دیوان خانہ کہتے تھے، توپ قپو محل کے دوسرے صحن میں وسطی دروازے (اُرتہ قپو) اور ”باب السعادت“ کے درمیان واقع تھی۔ موجودہ عمارت سلیمان قانونی کے عہد حکومت میں وزیر اعظم ابراہیم پاشا کے حکم سے تعمیر ہوئی تھی اور اس کی مرمت ۱۷۹۲ء اور ۱۸۱۹ء میں کی گئی تھی۔ ازمنۂ سابقہ میں یہ اجلاس ایک اور عمارت میں ہوتا تھا، جس کا ذکر بعد میں ”دیوان خانۂ قدیم“ کے نام سے کرتے تھے، مجلس کے دیوان کو ”قُبّہ آلتی“ (گنبد کے نیچے) کہتے تھے اور وہ وزرا، جو دیوان میں شرکت کے مجاز تھے انھیں ”وزرائے قُبّہ“ کہتے تھے (مزید دیکھیے وزیر)۔ ایوان مجلس سے کچھ بلندی پر ایک احاطہ تھا جس کے ارد گرد پردے لگے ہوئے تھے، جسے قصر عادل یا قفس کہتے تھے اور جہاں سے سلطان مجلس کی کارروائیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ یہ احاطہ براہ راست

حرم سرا کی عمارات سے ملحق تھا۔ دیوان خانے سے ملحقہ کئی وزرا کے دفتر اور مکان تھے، نیز وزیر اعظم کا دفتر تھا، جسے "دوت" (= دَوات) "آدسی" کہتے تھے (اب "دواداز")۔ (ان عمارات کے لیے دیکھیے عبدالرحمن شرف: توپ قپو۔ سرائے همایون، در TOEM، ۱/۹، ۱۹۱۱ء: ۳۲۹ تا ۳۶۴، خصوصاً ص ۳۵۰ ببعد)۔

انتظامیہ: مرکزی انتظامیہ کے اہم شعبے، جو دیوان همایون کے تحت کام کرتے تھے، مندرجۂ ذیل تھے: (۱) "دیوان قلمی"، جسے "بیلک" یا "بیلکجی قلمی" بھی کہتے تھے، مرکزی دفتر وزارت، جس کا سربراہ بیلکجی، رئیس الکتاب کے ماتحت وزارت کا بڑا عہدے دار۔ یہ دفتر تمام فرامین، قواعد و ضوابط ("قانون") اور ان فیصلوں اور احکام کا جو مالیات سے تعلق نہیں رکھتے تھے مسودہ تیار کرنے، ان کا اجرا کرنے اور نقول کی مثلیں تیار کرنے کا ذمے دار تھا۔ معاہدے، غیر ملکیوں کے لیے امتیازات خصوصی، مراعات اور سفیروں کے تقرر کی منظوریاں، جو بیرونی حکومتوں کو بھیجی جاتی تھیں، کچھ عرصے تک اسی شعبے کا کام رہا۔

وزارت کے علاوہ دو محکمے اور تھے جن کا تعلق (دفتر کے) عملے سے تھا، یعنی:

(۲) "تحویل قلمی"، جسے نشان یا کیسہ قلمی بھی کہتے تھے، یہ وزیر، بیلر بے، سنجق بیگی اور مولا، یعنی قاضی ولایت کے عہدوں کے تقررات کے احکام جاری کرتا اور ان کی مثلیں محفوظ رکھتا تھا، تیمار داروں اور زعامتوں [رک بآن] کے تقرر اور تبادلے کی مثلیں اور احکام کا اجرا بھی اسی دفتر سے ہوتا تھا (مزید دیکھیے تحویل)۔

(۳) "رؤس قلمی"، جس کا تعلق ان تمام عہدوں اور اسامیوں پر تقررات سے تھا جو تحویل قلمی کے تحت نہیں آتے تھے، جن کی تنخواہیں خزانے یا اوقاف کے سرمائے سے ادا ہوتی تھیں۔ ان میں مذہبی، دیوانی اور فوجی اسامیاں شامل تھیں۔

ان تین بڑے دفتروں کے علاوہ دو اور شاخیں بھی تھیں، جن کے سربراہ تشریفاتجی [رک بآن] اور وقائع نویس [رک بآن] ہوتے تھے اور علی الترتیب تقریبات سے متعلق اور تاریخی مثلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آگے چل کر ان میں "آمدی" یا آمدجی [رک بآن] کے دفتر کا اضافہ ہو گیا، جو "رئیس الکتاب" کے ذاتی عملے کا سربراہ ہوتا تھا۔ اس کا تعلق بیرونی حکومتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور سرکاری محکموں اور محل کے درمیان رابطہ قائم رکھنے سے تھا۔

ان دفتروں کے عملے کے بعض ملازمین کو تنخواہیں ملتی تھیں اور بقیہ کو، جو کمتر درجے کے ہوتے تھے، "تیمار اور زعامت" دیے جاتے تھے۔ مؤخر الذکر کو ترقی دے کر تنخواہ دار ملازمتوں پر مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اہم تر مستقل ملازم "خواجگان" [رک بآن] کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے ماتحتوں کو "خلیفہ" کہتے تھے۔

دیوان همایون کا زوال: محل کے مقابلے میں وزارت عظمٰی کی روز افزوں اہمیت کے باعث "اِکندی دیوانی" کی رسم پڑی، یعنی ایک ایسے اجلاس کی جو عصر (اِکندی) کی نماز کے بعد وزیراعظم کے مکان پر منعقد ہوتا تھا، تاکہ ان امور کو سرانجام دیا جائے جو دیوان همایون میں نامکمل رہ جاتے تھے۔ یہ مجلس ہفتے میں پانچ دفعہ اجلاس کرنے لگی اور اس نے بتدریج دیوان همایون کے اصلی کام کا ایک بہت بڑا حصہ سنبھال لیا۔ معاملات کے نظم و ضبط اور انجام دہی کا محل سے وزارت عظمٰی کی طرف انتقال رسمی طور پر ۱۰۶۵ھ/ ۱۶۵۴ء میں ہوا، جب سلطان محمد چہارم نے وزیراعظم درویش محمد پاشا کو ایک عمارت عنایت کی، جو اقامت گاہ اور دفتر دونوں کا کام دیتی تھی (دیکھیے باب عالی اور پاشا قپسو)۔ انتظامیہ کے بہت سے محکمے،

جو پہلے دیوان ھمایوں کے ماتحت تھے، رفتہ رفتہ اس نئے ادارے میں منتقل ھو گئے ۔ اٹھارھویں صدی عیسوی تک دیوان ھمایوں کی اھمیت کم ھوتے ھوتے بالکل ختم ھوگئی ۔ مصلح سلاطین سلیم سوم اور محمد دوم کے تحت دیوان کی ایک نئی شکل ظہور پذیر ھوئی؛ انھوں نے اصلاحات کے منصوبے بنانے اور اصلاحی احکام کے نفاذ کے لیے خاص مجلسیں قائم کیں (دیکھیے تنظیمات) ۔ انھوں نے رفتہ رفتہ وزارتی طرز حکومت کی شکل اختیار کر لی ۔

مآخذ : (۱) دیوان ھمایوں کے آئین اور اس کی کارگذاری کے متعلق عثمانی سرکاری مآخذ سے حاصل شدہ ایک قدیم روداد، محمد دوم کے قانون میں ملے گی، جس کا تعلق حکومت کے دفاتر اور تنظیم سے ھے (قانون نامۂ آل عثمان، طبع محمد عارف، TOEM، تکملہ، ۱۳۳۰ھ، ص ۱۰ ببعد، ۲۳ ببعد ۔ موجودہ نقل میں اصلاحیں کی گئی ھیں، جو بایزید الثانی کے عہد حکومت سے تعلق رکھتی ھیں)؛ (۲) اس بیان میں ان معلومات سے اضافہ ھو سکتا ھے جو عثمانی وقائع میں ھیں (خاص طور پر ادریس بدلیسی [ترک بان] کی ھشت بہشت، جو محمد ثانی کے عہد حکومت کی ھے)؛ (۳) نیز بیرونی مآخذ مثلاً G. M. Angiolello [Donado da Lezze] : *Historia turchesca*، طبع I. Ursu، بخارسٹ ۱۹۰۹ء، ص ۱۲۰ ببعد)؛ (۴) اس ادارے کی ترقی مابعد کا سراغ "قوانین" متأخر میں لگانا چاہیے (مثلاً ۱۰۸۷ھ/ ۱۶۷۶ء کا قانون شائع شدہ در *MTM*، ۱۰/۱ (۱۳۳۱ھ) : ۵۰۶ ببعد)؛ (۵) اور متأخر بیرونی تذکروں (مثلاً ایک جامع تذکرہ جیسے وینس کے Bailo Ottaviano Bon نے ۱۶۰۸ء میں لکھا : *Il Serraglio del gran Signore* در طبع N. Barozzi و (۶) G. Berchet : *Relazioni degli stati europei lette al Senato...*، سلسلہ ۵، ج ۱، وینس ۱۸۶۶ء (اس کا انگریزی ترجمہ از Robert Withers : *A Description of the Grand Seignor's Seraglio*، *Purchas' Pilgrims*، ۹/۲، لنڈن ۱۶۲۵ء، طبع مکرر گلاسگو ۱۹۰۵ء، ۹ : ۳۲۲ ببعد؛ نیز در John Greaves : *Miscellaneous Tracts...*، ج ۲، لنڈن ۱۶۵۰ء اور بعد کی طباعات مکرر)؛ (۷) P. Rycaut : *History of the present state of the Ottoman Empire*، طبع چہارم، لنڈن ۱۶۷۵ء، کتاب ۱، باب ۹؛ ص ۲۷ ببعد؛ (۸) دسویں صدی ھجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب سے دیوان ھمایوں اور انتظامیہ کے مختلف محکموں اور ملازمتوں کی، جو اس کے اختیار میں تھے، ترقی اور بجا آوری فرائض کو ان مثلوں میں تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ھے جو عثمانی دفتر خانوں میں محفوظ ھیں ۔ ایک جماعت بندی اور تفصیل اس میں ملے گی، مدحت سرتغلو : *Muhteva bakımından başvekâlet arşivi*، انقرہ ۱۹۵۵ء، ص ۱۳ تا ۳۱ (نیز دیکھیے Başvekâlet Arşivi)؛ (۹) دیوان ھمایوں اور اس کی انتظامیہ کی کامل ترین روداد I. H. Uzunçarşılı : *Osmanlı devletinin merkez ve bahriye teşkilâtı*، انقرہ ۱۹۴۸ء، ص ۱ تا ۱۱۰ میں ھے ۔ مختصر رودادیں ان میں ملیں گی : (۱۰) D'Ohsson : *Tableau général de l'empire othoman*، ۷، پیرس ۱۸۲۴ء : ۲۱۱ تا ۲۳۲؛ (۱۱) Hammer-Purgstall : *Staatsverfassung*، ص ۴۱۲ تا ۴۳۴؛ (۱۲) وھی مصنف : *GOR*، بمدد اشاریہ؛ (۱۳) A. H. Lybyer : *The government of the Ottoman Empire in the time of Suleiman the Magnificent*، کیمبرج مخطوطہ ۱۹۱۳ء، ص ۱۸۷ تا ۱۹۳؛ (۱۴) Zinkeisen : *Geschichte des osmanischen Reiches*، ۳، گوتھا ۱۸۵۵ء : ۱۱۷ تا ۱۲۵؛ (۱۵) Gibb-Bowen، ۱/۱ : ۱۱۵ ببعد و بمدد اشاریہ؛ (۱۶) Pakalin، ۱ : ۴۶۴ تا ۴۶۶، بشمول اقتباس از غیر مطبوعہ قوانین تشریفات، مؤلفۂ نائلی عبداللہ پاشا (م ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء)؛ (۱۷) سرتغلو Sertoğlu : *Resimli Osmanlı tarihi ansiklopedisi*، استانبول ۱۹۵۸ء، ص ۸۷ تا ۸۸ ۔ قدیم عثمانی اور سلجوق پس منظر کے لیے دیکھیے : (۱۸) I. H. Uzunçarşılı : *Osmanlı devleti teşkilâtına* imedhal استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۳۳ تا ۴۴، ۹۵ تا ۹۸؛ (۱۹) V. A. Gordlevsky: *Izbrannie sočineniya*، ماسکو ۱۹۶۱ء: ۱۶۶ تا ۱۷۷؛ (۲۰) مصطفی آکدغ: *Türkiye'nin iktisadi ve ictimai tarihi*، ۱: ۱۲۴۳ تا ۱۴۵۳ء، انقرہ ۱۹۵۹ء، ص ۲۱۷ تا ۲۲۲، ۲۲۲ تا ۲۳۳.

(B. Lewis)

* **دِیوانی** : رک بہ خط.

* **دِیوانیّہ** : وسطی عراق کا ایک قصبہ دریاے فرات کی شاخ حلّہ پر (۴۴ درجے ۵۵ ثانیے مشرق، ۳۲ درجے شمال کو) حلّہ اور سماوہ کے درمیان واقع ہے۔ اس کی آبادی کوئی بارہ ہزار ہے، جو تقریباً تمام شیعی عرب ہیں؛ یہ ایک "لِواء" کا صدر مقام ہے (۱۹۵۷ء کی "ابتدائی مردم شماری" کی رو سے کل آبادی سماوہ عَفَق، شامیّہ، ابوصُخَیر اور خود دیوانیّہ کے تابع قضایا سمیت ۸۰۰،۰۰۰ ہے)۔ اس "لِواء" میں جو قبائل شامل ہیں وہ وسطی فرات کے سب سے کثیرالتعداد اور سب سے کم اطاعت گذار قبائل میں سے ہیں؛ ترکی عہد تھا یا برطانوی قبضے کا دور (خصوصاً ۱۳۳۶ - ۱۳۳۹ھ/۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ء)، یا عراقی حکومت کی عملداری (خصوصاً ۱۳۵۲ - ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۵ - ۱۹۳۸ء)، انھوں نے گروہ بندی اور قانون شکنی کے ذریعے، جس کے لیے تعزیری مہموں کی ضرورت پڑی، حکومت کو بار بار پریشان کیا۔ ان میں نجف کے علما کا اثر و رسوخ بہت قوی ہے۔ یہ قصبہ، جو زیادہ تر بائیں کنارے پر آباد ہوا تھا، اور جس میں صرف چھوٹے چھوٹے کھجوروں کے باغات تھے، اب دائیں جانب بدل رہا ہے اور حالیہ سنین میں پہلے سے بہتر ہوں، بازاروں اور سرکاری عمارتوں کو بنا کر اسے جدید طرز کا کر دیا گیا ہے۔ قدیم کشتیوں کے پلوں کی جگہ اب فولاد کے ایک نئے پل نے لے لی ہے اور اچھی خاصی سڑکیں، عراق ریلوے اور ہوائی مستقر شہر اور ضلع کے مواصلات انجام دے رہے ہیں۔ دیوانیہ ایک اہم فوجی مستقر ہے۔

دیوانیہ کی تاریخ اپنے موجودہ نام کے تحت صرف ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء سے شروع ہوتی ہے، جب خزاعل شیوخ کے محاصل کے دفتر اور دیوان خانے کے لیے اس کی تشکیل بستی کے طور پر کی گئی۔ جلد ہی اسے ترکی حکومت نے "قضا" کا صدر مقام بنا دیا اور تاجروں، سرکاری عہدے داروں اور محافظ فوج اور پولیس نے جتائی کے مکانوں اور مٹی کی جھونپڑیوں میں اضافہ کیا اور جدید قصبے کا آغاز دیا۔

پھر بھی محل وقوع کے لحاظ سے اور وسطی فرات کے قبائلی، انتظامی اور اہم فوجی مستقر کے طور پر یہ قبضہ (قرون وسطٰی کے بعد) کے جسکہ کے ساتھ تسلسل رکھتا دکھائی دیتا ہے۔ جب ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء سے دریاے فرات اپنی مشرق (حلّہ) شاخ کو ہندیّہ شاخ کے حق میں ترک کرنے لگا تو جسکہ اور اس ضلع کا نظام درہم برہم ہو گیا، اور قبائلی اور کاشتکار اس کے بہت سے حصے کو چھوڑ کر چلے گئے، لیکن ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۱ء میں ہندیہ بند بننے سے حالات پھر معمول پر آ گئے.

مآخذ : (۱) S.H. Longrigg: *Four centuries of modern 'Iraq*، اوکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ (۲) وہی مصنف: *'Iraq 1900 to 1950*، اوکسفرڈ ۱۹۵۳ء؛ (۳) عبدالرزاق الحسنی: العراق قدیما و حدیثا، صیدون ۱۹۵۷ء.

(S. H. Longrigg)

دیو بند : اتر پردیش کے ضلع سہارن پور میں ایک بڑا ہی پرانا شہر ہے، لیکن اس کی قدیم تاریخ اساطیری اور رومانوی افسانوں میں چھپی ہوئی ہے۔ یہاں درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان گھرا ہوا دسی دیوی کا ایک مندر ہے، جس کے پیش نظر خیال کیا جاتا ہے کہ دیوبند کو دیوی بن (دیوی کا جنگل) کی بگڑی ہوئی شکل تصور کرنا چاہیے۔ دیوبند کا ذکر

سب سے پہلے آئین اکبری میں ملتا ہے، جس میں ابوالفضل دیوبند میں بنی ہوئی پختہ اینٹوں کے ایک قلعے کا ذکر کرتا ہے۔ بہر کیف دیوبند میں زمانۂ ماضی کی یادگاریں موجود ہیں۔ چھتا مسجد کو دیوبند کی قدیم ترین یادگار خیال کیا جاتا ہے، جس کا تعلق پٹھان عہد کے ابتدائی ایام سے ہے۔ روایت ہے کہ شیخ علاؤالدین المعروف بہ شاہ جنگل باش، جو وہاں دفن ہیں، ابن الجوزی [رک باں] کے شاگرد اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید تھے۔ سکندر لودھی (۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء تا ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء)، اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) اور اورنگ زیبؒ (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے عہد میں تعمیر شدہ بعض مساجد اور عمارتیں، ابھی تک موجود ہیں۔

آج کل دیوبند اسلامی علوم و معارف کی اس عظیم درس گاہ ("دارالعلوم") کے باعث مشہور ہے جو مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حاجی محمد عابد حسین نے محکمۂ تعلیم کے تین بڑے فضلا کی امداد و اعانت سے قائم کی اور جس کے پہلے سرپرست مولانا نانوتوی ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں مقرر ہوئے تھے۔ [مزید تفصیلات کے لیے رک بہ دیوبندی]۔

مآخذ: (۱) *District Gazetteers of the United Provinces*، ج ۲ (لکھنؤ ۱۹۲۱ء)، ص ۲۲۲ تا ۲۲۵؛ (۲) سید محبوب رضوی: تاریخ دیوبند، ۱۳۷۲ھ؛ (۳) مولانا محمد طیب: حالات دارالعلوم دیوبند (دیوبند ۱۳۴۸ھ)؛ (۴) ک۔ م۔ د۔ موق: المنہاج، (لاہور ۱۹۶۱ء)؛ (۵) محمد میاں: علمائے حق، حصۂ اول (مراد آباد ۱۹۳۹ء)، ص ۹۳ ببعد؛ (۶) شیخ محمد اکرام: موج کوثر، لاہور بدون تاریخ؛ (۷) امداد صابری: فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۴۹ء، ص ۷۷ تا ۸۹؛ (۸) W. Cantwell Smith: *Modern Islam in India*، لندن ۱۹۴۶ء، ص ۲۹۳ تا ۲۹۷؛ (۹) محمد یعقوب نانوتوی: سوانح عمری محمد قاسم، دیوبند بدون تاریخ، ص ۴ تا ۱۵؛ (۱۰) مولانا حسین احمد مدنی: سفرنامۂ اسیر مالٹا، ...، دیوبند بدون تاریخ (شریک مدرس کے پہلے شاگرد اور بڑے شیخ الہند محمود الحسن کے کردار اور سیاسی سرگرمیوں پر)؛ (۱۱) محبوب رضوی: دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات، دیوبند بدون تاریخ؛ (۱۲) وہی مصنف: دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں، دیوبند بدون تاریخ؛ (۱۳) M. O'Dwyer: *India as I knew it, 1855-1905*، لندن ۱۹۲۵ء، ص ۱۷۸ تا ۱۸۱، ۱۸۹؛ (۱۴) مناظر احسن گیلانی: سوانح قاسمی، دیوبند بدون تاریخ۔

(خورشید احمد نظامی)

* **دیوبندی**: (نیز دیوی بنی اور دیبنی، آب زبدة المقامات، ص ۲۸۳؛ آئین اکبری، ص ۲۳۱؛ الهدیة السنیة، ص ۱۰؛ تاریخ دیوبند، ص ۱۲)؛ اترپردیش (بھارت) کے ایک مشہور اور تقریباً دو ہزار سال قدیم قصبے دیوبند [رک باں] سے نسبت رکھنے والا؛ عرف عام میں اور اکثر و بیشتر اس تاریخی قصبے میں واقع اسلامی دارالعلوم کے فارغ التحصیل علما اور ان کے تلامذہ دیوبندی کہلاتے ہیں (تذکرۂ مشائخ دیوبند، ص ۳۵؛ مقدمۂ فتاوی دارالعلوم دیوبند، ص ۳؛ علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے، ص ۲۹؛ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ص ۵۵؛ انوار قاسمی، ۱: ۳۷)۔ اس دارالعلوم کی بنیاد ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء کو دیوبند کی ایک قدیم مسجد چھتا میں مشہور عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء تا ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) نے چند اہل فضل و تقوی بزرگوں کے تعاون اور مشورے سے رکھی تھی، جن میں سے مولانا فضل الرحمن عثمانی (جو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد تھے)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور حاجی عابد حسین کے نام قابل ذکر ہیں؛ اس درسگاہ کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی اور سب سے پہلے طالب علم مولانا محمود الحسن (جو بعد

میں شیخ الہند مشہور ہوئے) اور سب سے پہلے صدرالمدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے؛ مولانا محمد قاسم نانوتوی اتفاق رائے سے سب سے پہلے سرپرست مقرر ہوئے۔ پہلے سال ہی کے اختتام پر اس درسگاہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور طلبہ کی تعداد اٹھتر تک پہنچ گئی، جن میں بنارس، پنجاب اور افغانستان کے اٹھاون طلبہ بھی شامل تھے (انوار قاسمی، ۱ : ۳۴۳؛ سوانح قاسمی، ۲ : ۷۲ بعد؛ تاریخ دیوبند، ص ۷۵)۔ آگے چل کر یہ معمولی مدرسہ ایک عظیم درسگاہ بن گئی اور مسجد چھتّا سے اپنی موجودہ نئی عمارت میں منتقل ہو گئی، جس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے اپنے ہاتھ سے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء میں رکھا (تاریخ دیوبند، ص ۸۲ تا ۸۳)۔ اس درسگاہ کے بانی اور پہلے سرپرست مولانا محمد قاسم نانوتوی بڑے متقی اور متوکل علی اللہ مشہور تھے۔ یہی باتیں آگے چل کر دارالعلوم دیو بند کی ایک مستقل روایت اور دیو بندی علماے کی خصوصیت بن گئیں۔

سلطنت مغلیہ کے خاتمے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی دینی اور علمی ضروریات کے پیش نظر یہ درسگاہ قائم کی گئی تھی۔ اس کے بانیوں کے پیش نظر اہم مقاصد یہ تھے: (۱) آزادی ضمیر اور اعلاے کلمة الحق؛ (۲) مسلمانوں کو ایک جمہوری عوامی تنظیم میں پرونے کی جدوجہد کرنا؛ (۳) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمة اللہ علیہ کے مسالک کی حفاظت و اشاعت؛ (۴) مسلم معاشرے سے خود غرضی اور استبداد کا خاتمہ؛ (۵) علوم دینی کا احیاء؛ (۶) علوم عقلیہ کی صحیح تربیت؛ (۷) دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کرنے والے علما تیار کرنا (سوانح قاسمی، ۲ : ۲۲۰؛ انوار قاسمی، ۱ : ۳۴۳ بعد)۔ درسگاہ کی مالی ضروریات کے سلسلے میں بھی مولانا نانوتوی نے آٹھ اصول مقرر کیے، جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت وقت اور امرا و اغنیا کے تسلط سے درسگاہ آزاد رہے۔ "یہی وجہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور برہمنی حکومت کی خواہش کے باوجود دارالعلوم نے کسی سے آج تک گرانٹ لینا پسند نہیں کی" (انوار قاسمی، ۱ : ۳۴۷ تا ۳۷۵)۔

دارالعلوم دیوبند کے نظم و نسق کے سلسلے میں ایک مجلس شوری ہے، جسے سنڈیکیٹ کہنا چاہیے؛ ایک مجلس انتظامیہ ہے؛ ایک مہتمم ہے، جسے رئیس الجامعہ سمجھنا چاہیے؛ شیخ الحدیث یا صدر المدرسین کا عہدہ سب سے ممتاز اہل علم و تقوی کو ملتا رہا ہے (تاریخ دیوبند، ص ۱۲۳ بعد)۔ اس درسگاہ میں علم صرف و نحو، ادب، علم المعانی، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، علم الفرائض، علم العقائد، علم الکلام، علم الطب، علم المناظرہ، علم ہیئت اور قراءت و تجوید کے علاوہ فارسی زبان و ادب اور ریاضی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ آٹھ سال کا نصاب ہے، ابتدا میں اردو اور فارسی کی بقدر ضرورت تدریس ہوتی ہے، لیکن اس درسگاہ میں دورۂ حدیث کی بڑی شان ہے، جس میں دور و دراز کے طالب علم مبادیات کی تکمیل کے بعد شریک ہوتے ہیں (انوار قاسمی، ۱ : ۳۸۳؛ تاریخ دیوبند، ص ۱۰۴)۔

[گزشتہ نوے سال میں اس ادارے نے مسلمانوں کے دینی مدارس میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ دارالعلوم میں ان تین مختلف النوع دینی اداروں کی خصوصیات جمع ہیں جو تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں دہلی، لکھنؤ اور خیر آباد میں موجود تھے۔ دہلی کے ادارے تفسیر اور حدیث کی تعلیم پر زور دیتے تھے؛ لکھنؤ کے فقہ پر [رک بہ دارالعلوم] اور خیرآباد [رک بآں] علم الکلام اور فلسفے کے لیے مخصوص تھا۔ دیوبند ان تینوں کے امتزاج کی نمائندگی کر رہا ہے، گو اس کا اصل زور احادیث پر ہے، جنھیں شاہ ولی اللہؒ اور دہلی کے مکتب محدثین

کے نزدیک درجۂ استناد حاصل ہے۔ دیوبند میں بلاد اسلامیہ کے مختلف حصوں سے بھی طلبہ آتے رہتے ہیں۔ اس میں تقریباً پندرہ سو طلبہ کے قیام کا بندوبست ہے۔ "دارالعلوم" کی عمارت ایک مسجد، ایک کتاب خانے، اور حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کے متعدد درسی کمروں پر مشتمل ہے۔ دیوبند کے کتاب خانے کا شمار ہندوستان میں مخطوطات کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں ہوتا ہے، تاہم اس کی فہرست کتب موجود نہیں۔ اس میں تقریباً ستر ہزار عربی، فارسی اور اردو کتابیں موجود ہیں، جو مطبوعہ بھی ہیں اور قلمی بھی۔ تعلیم کا طریقہ روایتی ہے۔ اس کا زور زیادہ تر اس بات پر ہے کہ دین دار شخصیتیں پیدا کی جائیں، اس پر نہیں کہ جدید علوم سے بہرہ ور ہو کر عہد حاضر کے تقاضے پورے کر سکیں؛ لہٰذا اس ادارے نے زیادہ تر دینی رہنما پیدا کیے ہیں، گو سیاسی میدان میں بھی اس کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دارالعلوم کے بڑے بڑے عہدے دار یہ ہیں: سرپرست، مہتمم (سیکرٹری)، صدر مدرس (پرنسپل) اور مفتی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوبؒ، مولانا اشرف علیؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور سیّد حسین احمد مدنیؒ ایسی نامور ہستیاں ان عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ موجودہ (۱۹۷۲ء میں) مہتمم مولانا محمد طیب بانی مدرسہ کے پوتے ہیں۔ جمعیت علماے ہند، جو ہندوستانی علما کی ایک بہت بڑی اور بارسوخ تنظیم ہے، اپنی نظریاتی قوت دارالعلوم ہی سے حاصل کرتی ہے (از اآ، لائڈن، بار دوم، مقالہ دیوبند)]۔

دیوبندی علماے کرام کا مسلک شاہ ولی اللّٰہی مسلک ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی تین واسطوں سے حضرت شاہ ولی اللّٰہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ یہ حضرات فقہی مذاہب میں سے امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں (انوار قاسمی، ۱: ۳۸۵) اور تقلید کو بھی بالعموم ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن و سنت پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے علاوہ ان کا تصوف سے بھی گہرا تعلق ہے۔ [ردّ بدعت میں یہ بھی پیش پیش ہیں البتہ غلو سے پرہیز کرتے ہیں]۔ اکثر علماے دیوبند روحانی مسلک کے لحاظ سے حاجی امداد اللّٰہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں جو تصوف کے چاروں سلسلوں یعنی نقشبندی، چشتی، قادری اور سہروردی سے منسلک تھے؛ تاہم تصوف کو دنیاداری سے قطعاً دور رکھنا ضروری ہے (حوالۂ سابق)۔ عقائد و علم الکلام میں امام ابوالحسن اشعری [رک بہ الاشعری] کے مقلد ہیں؛ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت و عظمت پر ایمان رکھتے ہیں؛ کثرت درود کو عین ثواب اور صدق نیت اور صحیح روایات کے مطابق ولادت نبوی کے تذکرے کو بھی پسند کرتے ہیں؛ اکابر علماے دیوبند دین میں غلو اور انتہا پسندی کے بجاے راہ اعتدال کے قائل اور عامۃ المسلمین کی تکفیر سے اجتناب و احتیاط لازم سمجھتے ہیں [چنانچہ وہ غالی بریلوی مسلک اور غالی اہل حدیث مسلک کے بین بین رہتے ہیں] (مہند، ص ۱۸، ۳۲؛ الشہاب، ص ۲۰ تا ۲۱؛ انوار قاسمی، ۱: ۳۸۵ تا ۳۹۰)۔ علامہ شبیر احمد عثمانی ایک موقع پر لکھتے ہیں: "ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ ہم غیر مقلدین کو کافر کہتے ہیں، نہ تمام شیعوں کو، نہ سارے نیچریوں کو . . . ." (الشہاب، ص ۲۰ تا ۲۱)۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایک موقع پر کہا: "فی زماننا کفار کا غلبہ ہے۔ وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے، جس سے ان کا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو، بلکہ توڑنے کے بجاے جوڑنے کی فکر کی جائے" (سوانح قاسمی، ۱: ۸۰؛ انوار قاسمی، ۱: ۳۹۱)۔ علماے دیوبند کے اس مسلک نے انہیں سب کی نظر میں محترم بنا دیا، چنانچہ پیر مہر علی

شاہ گولڑوی نے ایک جگہ فرمایا : "مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا؛ مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے، مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا؛ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سنا ہے۔ اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا، مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانیین اور اولیائے امت محمدیہ میں سے تھے۔ احقر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے، مگر میرا اعتقاد یہی ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی تصنیفات کا مطالعہ اور قبول عام ہے...." (چراغ سنت، ص ۲۷۰؛ انوار قاسمی، ۱ : ۳۹۱)۔

دیوبندی علمائے کرام نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نزدیک دارالعلوم کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ملت اسلامیہ کو جہاد آزادی اور ہندوستان سے انگریز کو نکالنے کے لیے تیار کیا جائے۔ آزادی ہند کے لیے ریشمی رومال کی تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی ہی نے منظم کی تھی (انوار قاسمی، ۱ : ۳۹۷ تا ۳۹۸)۔ تحریک خلافت میں بھی ان علما نے بڑا حصہ لیا۔ قیام پاکستان سے کچھ قبل اس جماعت کے دو حصے ہو گئے: ایک انگریزوں کی مخالفت کے جوش میں اتنا بڑھ گیا کہ مسلم لیگ کی تائید سے قاصر رہا؛ اس کے برعکس مولانا اشرف علی تھانوی (۱۳۶۲ھ)، علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۹۴۹ء) اور مفتی محمد شفیع وغیرہ نے مسلم لیگ کے موقف کی تائید کی اور تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا؛ چنانچہ زیادہ تر انہی کی وجہ سے برصغیر کی تقسیم سے قبل صوبۂ سرحد میں ہونے والے استصواب رائے عامہ میں مسلم لیگ کو کامیابی نصیب ہوئی (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، ص ۹۶؛ انوار قاسمی، ۲۱۱ بعد)۔ علمائے دیوبند اپنے آپ کو حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور سید احمد شہید کے پیرو کار اور ان کے افکار و نظریات کے حامی سمجھتے ہیں (حوالۂ سابق)۔

قیام پاکستان کے بعد دیوبندی علما کا علمی و روحانی مرکز ہندوستان میں رہ گیا، اس لیے دارالعلوم دیوبند سے قلبی و روحانی وابستگی کے باوجود پاکستان کے مختلف مقامات پر علمی مراکز قائم کیے گئے۔ بھارت میں مدرسۂ مظاہر العلوم سہارنپور اور مدرسۂ قاسم العلوم مراد آباد علمی اور فکری نقطہ نظر سے دارالعلوم دیوبند سے مربوط ہیں؛ اسی طرح انبیٹھہ (ضلع سہارنپور) تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) اور گلاوٹھی (ضلع بلند شہر) میں اس کی ملحقہ شاخیں موجود ہیں (انوار قاسمی، ۱ : ۴۱۱)۔ پاکستان میں مدرسۂ اشرفیہ لاہور، جامعۂ مدنیہ لاہور، مدرسۂ عربی خیر المدارس ملتان، دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار خان، دارالعلوم کورنگی (کراچی)، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) کے علاوہ ڈھاکے اور راجشاہی کی درسگاہیں دیوبندی مکتب فکر کی علمی یادگاروں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، ص ۳۷)۔

دیوبندی مکتب فکر کے اہل علم میں مشہور اور نامور علما کی ایک جماعت موجود رہی ہے جس نے فارسی زبان کی ابتدائی کتاب کریما سے لے کر صحیح بخاری تک اکثر و بیشتر تمام فنون کی کتب متداولہ کی شروح یا حواشی لکھے ہیں۔ ان نامور علما میں سے بعض کے نام اوپر آ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اس سلسلے میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا عبیداللہ سندھی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا

اعزاز علی، دیوبندی، مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد الیاس، مولانا محمد زکریا سہارنپوری، مولانا سید اصغر حسین، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی قابل ذکر ہیں (تذکرۂ مشائخ دیوبند، ص ۹۳ ببعد؛ انوار قاسمی، ۱: ۴۰۹ ببعد؛ تاریخ دیوبند، ص ۱۰۱ ببعد، ۳۴۳ ببعد).

مآخذ: (۱) مناظر احسن گیلانی: سوانح قاسمی، لاہور ۱۹۶۹ء؛ (۲) سید محبوب رضوی: تاریخ دیوبند، دہلی ۱۳۷۲ھ؛ (۳) انوار الحسن قاسمی: انوار قاسمی، دیوبند ۱۹۵۸ء؛ (۴) مفتی عزیز الرحمٰن: تذکرۂ مشائخ دیوبند، کراچی ۱۹۶۴ء؛ (۵) محمد میاں: علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے، مراد آباد، تاریخ ندارد؛ (۶) وہی مصنف: علماء ہند کا شاندار ماضی، دہلی ۱۹۴۷ء؛ (۷) مفتی محمد شفیع: مقدمۂ فتاوی دارالعلوم دیوبند، کراچی ۱۹۶۸ء؛ (۸) حسین احمد مدنی: نقش حیات، دہلی ۱۹۵۳ء؛ (۹) ابوالحسنات ندوی: ہندوستان کی قدیم درسگاہیں، اعظم گڑھ ۱۹۲۲ء؛ (۱۰) منشی عبدالرحمٰن: سیرت اشرف، ملتان، تاریخ ندارد؛ (۱۱) وہی مصنف: تعمیر پاکستان اور علماء ربانی، ملتان، تاریخ ندارد؛ (۱۲) سید اصغر حسین: حیات شیخ الہند، سہارنپور ۱۹۳۸ء؛ (۱۳) عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، لاہور ۱۹۶۹ء؛ نیز رک بہ دیوبند.

(ظہور احمد اظہر)

* **دیو شرمہ:** ترکی مصدر دیو شر، جمع کرنا سے حاصل مصدر (دیو شر کے ہجے مختلف طور پر لیے گئے ہیں، دیکھیے TTS، بذیل مادہ *devşirmek*)؛ یہ ایک عثمانی اصطلاح ہے جو ینگچری Janissaries [دیکھیے ینی چری] کی مختلف اسامیاں پر کرنے اور محل اور انتظامیہ کی خدمات پر مامور کرنے کی غرض سے برائے تربیت عیسائی بچوں کی میعادی بھرتی کے لیے استعمال کی جاتی تھی [تفصیل کے لیے دیکھیے [وو] ۲، لائڈن، بذیل مقالہ].

مآخذ: (۱) Zinkeisen، ۳: ۲۱۵ تا ۲۲۲، جس کی بنیاد زیادہ تر وینس کی ان اطلاعات پر ہے جو Albèri میں ہیں (سب سے زیادہ مفصل اطلاع وہ ہے جو Navagero (۱۵۵۳ء) نے دی ہے، Albèri، سلسلہ ۳، ۱: ۴۸ ببعد) اور Gerlach: *Tagebuch*، ص ۴۳، ۶۸، ۲۰۳؛ (۲) J. H. Mordtmann: دیوشرمہ، در [وو] لائڈن، (۱۹۱۲ء) اور وہاں دیے ہوے حوالے؛ (۳) قوچی بیگ: Isl، ۲: ۱۰۲، ۱۰۳، ص ۲۷ ببعد، ترجمہ Behrnauer، *ZDMG*، ۱۵: ۲۸۴؛ Isl، ۱۹۲۹ء، ص ۲۸؛ (۴) A. H. Lybyer: *The Government of the Ottoman Empire*...، ۱۹۱۳ء، ص ۴۹ ببعد؛ (۵) F. W. Hasluck: *Christianity and Islam under the Sultans*، ۱۹۲۹ء، ۲: ۴۸۳ ببعد؛ (۶) W. L. Wright: *Ottoman Statecraft*، ۱۹۳۵ء، ببعد اشاریہ؛ (۷) Barnette Miller: *The Palace School of Muhammad the Conqueror*، ۱۹۴۱ء، ص ۷۴ ببعد، ۱۲۷ ببعد؛ (۸) D. Pephanes: Τὸ Παιδομάζωμα، ایتھنز ۱۹۳۸ء (دیکھی نہیں گئی)؛ (۹) Gibb-Bowen، ببعد اشاریہ؛ (۱۰) J. A. B. Palmer: *The Origin of the Janissaries*، در *Bull. of the John Rylands Library*، ج ۳۵، ۱۹۵۳ء، ص ۴۴۸ تا ۴۸۱؛ (۱۱) A. E. Vakalopoulos: Προβλήματα της ιστορίας του παιδομαζώματος، در Ἑλληνικά، ج ۱۳، ۱۹۵۴ء، ص ۲۷۴ تا ۲۹۲.

یورپی سیاحت ناموں میں جو حوالے دیے گئے ہیں انھیں احتیاط سے کام میں لانا چاہیے، کیونکہ ان کے مصنفوں نے اکثر اعتراف کیے بغیر اپنے پیشروؤں سے نقل کیا ہے، چنانچہ Rycaut (*Present State*، ج ۱، باب ۱۰) میں جو دو ہزار لڑکوں کے ایک سالانہ دیو شرمہ کا ذکر ہے جس میں زیادہ تر موریا اور البانیا سے لیے جاتے تھے، وہ غالباً Bon (Barozzi Berchet، ۱/۵: ۷۷) سے بتوسط Withers لیا گیا ہے، جو اس وقت سے ساٹھ سال پہلے

لکھ رہا تھا ۔ ایسے ہی Baudier میں اور نیز وہ بیان جو B. de Viganère کی *Illustrations* (طبع ۱۵۶۵ء، عمود ۹۳) میں دیا گیا ہے بہت کچھ پوسٹل Postel سے لیا گیا ہے ۔ مندرجۂ ذیل حوالے ایسے ہیں جو کسی اور سے نقل نہیں کیے گئے : (۱۲) Spandugino : *Petit Traicté*، طبع Schefer، ۱۸۹۶ء، ص ۱۰۲ ببعد، ۲۴۴ ببعد، Sathas : *Documents inédits*، ۹ : ۲۱۲ ببعد، ۲۴۵ ؛ (۱۳) J. Chesneau : *Le Voyage de M. d'Aramon*، طبع Schefer، ۱۸۸۷ء، ص ۴۳ ببعد ؛ (۱۴) A. Geuffroy : *Briefve Description* ([illegible] کا ضمیمہ)، ص ۲۴۰ ببعد ؛ (۱۵) G. Postel : *De la république* ...، ۱۵۶۰ء، ۳ : ۲۲ ببعد ؛ (۱۶) A. Thevet : *Cosmographie Universelle*، ۱۵۷۵ء، ص ۷۹۹ ب، ۸۰۸ ب، ۸۱۷ ب (کھوئے ہوئے الفاظ) ؛ (۱۷) N. de Nicolay : *Navigations*، ۱۵۶۸ء، ص ۷۹ ببعد ؛ (۱۸) S. Schweigger : *Newe Reysbeschreibung*، ۱۶۰۸ء، ص ۱۶۸ ببعد ؛ (۱۹) Busbecq : *De Acie* ...، ۱۵۸۱ء، ص ۵۲ ببعد، انگریزی ترجمہ از N. Tate، ۱۶۹۴ء، ص ۲۰۰ ببعد ؛ (۲۰) J. Palerne : *Peregrinations*، ۱۶۰۶ء، ص ۴۱۲ ببعد، ۵۰۲ ببعد ؛ (۲۱) H. de Beauvau : *Relation Journalière*، ۱۶۱۹ء، ص ۹۸ ؛ (۲۲) L. Des Hayes : *Voiage de Levant*، ۱۶۲۴ء، ص ۲۷۶ ببعد ۔

ان بیانات کا جائزہ ان دفتر خانوں کے مواد سے لیا جا سکتا ہے جو I.H. Uzunçarşılı نے *Osmanlı Devleti teşkilâtından Kapukulu Ocakları*، ج ۱، ۱۹۴۳ء، ص ۱ تا ۱۴۳ میں دیے ہیں (ان میں تقریباً وہ سب دستاویزات جمع ہیں جو احمد رفیق نے *Edebiyyāt Fakültesi Medjmūʿası*، ج ۵، ۱۹۲۶ء، ص ۱ تا ۱۴ میں طبع کیے) اور اسی کتاب پر I. H. Uzunçarşılı کے مقالہ دیو شرمه کی بنیاد ہے، جو *IA* میں شائع ہوا؛ Uzunçarşılı اکثر ایک کتاب کا حوالہ دیتا ہے جو اس کے نجی کتاب خانے میں ہے اور جس کا نام قوانین ینی چریان ہے ؛ یہ تصنیف بھی معلوم ہوتی ہے جو احمد اول کے عہد میں تیار ہوئی اور جس کا بیان *Ist. Kit. Tarih-Coğrafya Yazmaları Katalogları*، ۱ : ۱۸۳ (مخطوطہ Esad Ef. ۲۰۶۸) اور جس کے مخطوطے کی مخطوطہ Revan ۱۳۲۲ ایک دوسری نقل ہے (قب L. Forrer در *Isl.*، ج ۲۶، عدد ۲۰)۔

(V. L. MÉNAGE [تلخیص از ادارہ])

* **دیونِ عمومیہ** : عثمانی حکومت کے قرضے، بالخصوص نظامِ قرض قائم شدہ ۱۸۸۱ء ۔ حکومت عثمانی نے ملکی قرضوں کے ذریعے روپیہ فراہم کرنے کی ابتدائی کوششیں اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں کی تھیں (دیکھیے اسہام اور قائمہ)۔ جنگ کریمیا کی ضرورت اور مواقع کے پیش نظر قرض کی ایک اور نئی قسم پیدا ہوئی، یعنی یورپ کی مالی منڈیوں سے قرضہ لیا جانے لگا ۔ اس قسم کا پہلا قرضہ ۱۸۵۴ء میں لندن میں لیا گیا اور دوسرا اس کے آئندہ سال میں ۔ پہلا قرضہ تیس لاکھ پونڈ کا چھ فی صد فی سال سود کی شرح پر لیا گیا اور دوسرا پچاس لاکھ پونڈ کا بشرح چار فی صد فی سال ۔ ۱۸۵۴ء اور ۱۸۷۴ء کے درمیان تقریباً ہر سال نئے غیر ملکی قرضے لیے جانے لگے، جن کی مجموعی رقم تقریباً دو سو ملین پونڈ تک پہنچ گئی ۔ چونکہ ترکی میں روپیہ ڈوبنے کا خدشہ زیادہ تھا، اس لیے اسے ایسی شرائط پر قرضہ دیا جاتا تھا جو اس کے لیے نفع بخش نہیں ہوتی تھیں ۔ اس قرضے کے ذریعے جو روپیہ ملتا، اس کا اکثر حصہ ملک کے میزانیے کے مطابق معمولی اخراجات میں صرف ہوتا، یا پھر ایسے منصوبوں میں لگایا جاتا، جنھیں اقتصادی ترقی سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا ۔ ۶ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو معاملات انتہا کو پہنچ گئے جب کہ عثمانی حکومت سود کی رقم ادا کر سکی، نہ قرضہ ہی چکا سکی ۔ اس کے بعد ایک زمانے تک گفت و شنید جاری رہی اور بالآخر، ترکی حکومت اور یورپی قرض خواہوں کے نمائندوں کے

درمیان سمجھوتا ہو گیا۔ اس سمجھوتے کو قانونی شکل بنام نہاد "فیصلۂ محرّم" کے ذریعے دی گئی، جو ۲۸ محرم ۱۲۹۹ھ/ ۲۰ دسمبر ۱۸۸۱ء کو جاری ہوا، جس کی رو سے "ادارۂ قرض عمومی" "دیُون عمومیہ" (فرانسیسی میں Administration de la dette publique ottomane) قائم ہوا، جو براہ راست بیرونی قرض خواہوں کے زیر انتظام اور انھیں کے روبرو جوابدہ تھا۔ اس ادارے کا فرض اولین یہ تھا کہ قرضے کی وصولی کا یقینی اور قابل وثوق ذریعہ مہیا کرے۔ اس قرض کی مجموعی مقدار ۱۰۶۳۰۹۹۲۰ پونڈ سٹرلنگ، یا ۱۱۶۹۴۰۹۱۲ ترکی پونڈ بشرح ۱۱۰ پیاسٹر فی پونڈ سٹرلنگ، جو اس وقت رائج تھی، مقرر کی گئی۔ اس غرض کے لیے حکومت عثمانی نے اپنے بعض محصولات مطلقاً اور ناقابل فسخ طور پر تا ادائی قرض ادارے کو سونپ دیے۔ یہ آمدنی نمک اور تمباکو کی اجارہ داری، ٹکٹ، کحول (spirits)، ریشم اور ماہی گیری کے محصولات سے حاصل ہوتی تھی اور ان سب کو "رسوم ستہ" یعنی چھے ٹیکسوں سے موسوم کیا گیا۔ یہ ٹیکس براہ راست ادارے کے اپنے کارکن وصول کرتے تھے؛ علاوہ بریں ولایات بلقان سے بھی یہ ادارہ خراج وصول کرتا تھا اور ضرورت ہوتی تو چنگی کے محصول کا ایک حصہ بھی لے لیتا تھا۔

اس ادارے کی مجلس منتظمہ چھے مندوب پر مشتمل تھی جو برطانیہ، ہالینڈ، فرانس، جرمنی، اطالیہ، آسٹریا ۔ ہنگری، اور عثمانی ترکیہ کے تمسک گیروں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ساتواں مندوب اور تھا جو تقدیمی تمسکات کے گروہ کی نمائندگی کرتا تھا، جن میں سے بیشتر عثمانی حکومت کے بنک (Imperial Ottoman Bank) کے قبضے میں تھے۔ ۱۸۸۱ء ہی میں اس مجلس کے تین ہزار سے زیادہ محاصل وصول کرنے والے عمال تھے۔ ۱۹۱۱ء کے آتے آتے اس کے عملے کی تعداد ۸۹۳۱ تک پہنچ گئی تھی، جو عثمانی وزارت مالیات کے عملے سے زیادہ تھی۔ یہ مجلس منتظمۂ قرض بہت زیادہ طاقتور جماعت بن چکی تھی جس کا اثر سلطنت عثمانی کی مالی اور اقتصادی زندگی پر دور رس تھا اور اس کا سیاسیات پر بھی بڑا اثر تھا جس کے مختلف اندازے کیے گئے ہیں۔

یہ مجلس منتظمۂ قرض پہلی جنگ کے دوران میں اور اتحادیوں کے قبضے کے ماتحت اپنا کام کرتی رہی، باوجودیکہ برطانوی، فرانسیسی اور اطالوی نمائندے جنگ کے دوران میں اور جرمنی اور آسٹریا کے نمائندے عارضی صلح کے بعد اس میں سے نکل چکے تھے۔ اس کا کام باقی ماندہ نمائندوں کے زیر اہتمام چلتا رہا اور جو رقوم دشمن قرض خواہوں کے حصے کی تھیں وہ بعد میں ادا کرنے کے لیے جمع رکھی جانے لگیں۔ یہ مجلس ختم اس وقت ہوئی جب مصطفی کمال کی قیادت میں قوم پرستوں کی جیت ہو گئی اور ترکی جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ معاہدہ لوزان میں معطّل حکومت ترکیہ کے قرض میں جدید ترکی کا حصہ مقرر کیا گیا۔ پھر گفت و شنید شروع ہوئی اور ذمے داری اور ادائی کا معاہدہ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۳ء میں طے ہو گیا۔ ۱۹۴۴ء میں یہ قرض مکمل طور پر ادا کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) F.A. Belin: *Essai sur l'historie économique de la Turquie*، در JA، ۱۸۸۵ء؛ (۲) C. Morawitz: *Les finances de Turquie*، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۳) A. du Velay: *Essai sur l'histoire financière de la Turquie*، پیرس ۱۹۰۳ء؛ (۴) A Roumani: *Essai historique et technique sur la dette publique ottomane*، پیرس ۱۹۲۷ء (دیکھیے نیز)؛ (۵) D. G. Blaisdell: *European financial control in the Ottoman Empire*، نیویارک ۱۹۲۹ء؛ (۶) Z. Y. Hershlag: *Turkey an economy in transition*، The Hague، بدون تاریخ (۱۹۶۰ء؟)؛ (۷) B. Lewis:

The emergence of modern Turkey، بار دوم، لنڈن ۱۹۶۲ء؛ (۸) احمد راسم: عثمانلی تاریخی، ج ۴، استانبول ۱۳۲۶ تا ۱۳۳۰ھ، ص ۲۰۲۸ تا ۲۰۴۷ (قانده)؛ (۹) Refii Şükrü Suvla: *Tanzimat devrinde istikrazlar*، در *Tanzimat*، ج ۱، استانبول ۱۹۴۰ء، ص ۲۶۳ تا ۲۸۸؛ (۱۰) Pakalin، ۱: ۴۸۷ تا ۴۹۱؛ (۱۱) Ziya Karamursal: *Osmanlı mali tarihi hakkında tetkikler*، استانبول ۱۹۴۰ء.

(B. LEWIS)

* **دھار**: وندھیا چل پہاڑوں کی اندرونی عمودی ڈھلان پر واقع ایک قدیم شہر، جہاں سے دریاے نربدا کی وادی کا منظر دکھائی دیتا ہے اور جو ۱۹۵۶ء سے ضلع دھار، مدھیا پردیش (بھارت) کا صدر مقام ہے۔ اس کی تاریخ کے لیے دیکھیے آآ، لائڈن، بار دوم، بذیل مادہ.

مآخذ: (۱) *Central India gazetteer*، ۵: ۲۸۹ تا ۵۱۵؛ (۲) *EIM*، ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء، ص ۱ تا ۲۹؛ (۳) D.C. Ganguly: *History of the Paramara dynasty*، ڈھاکہ ۱۹۳۳ء؛ (۴) H. N. Wright: *The sultans of Delhi; their coinage and metrology*، دہلی ۱۹۳۶ء، ص ۱۶۷؛ (۵) R. Sinh: *Malwa in transition*، بمبئی ۱۹۳۶ء؛ (۶) *History and culture of the Indian people*، ج ۶: *The Delhi sultanate*، بمبئی ۱۹۶۰ء۔ دیکھیے نیز دلاور خاں؛ مالوہ؛ مانڈو.

(J.B. HARRISON [تلخیص از ادارہ])

۲۔ یادگار عمارتیں: عمارتی نقطۂ نظر سے دھار کے آثار کی اہمیت محض یہ ہے کہ ان سے مالوے کے سب سے ابتدائی عمارتی روپ کی، جو ہندوستان کے اسلامی فن عمارت کا ایک مخصوص اسلوب تھا، وضاحت ہوتی ہے (دیکھیے مادہ ہند، فن عمارت)۔ قدیم‌ترین مسجد کی عمارت کمال الدّین مالوی (جنھیں مقامی طور پر کمال مولٰی کہا جاتا ہے) کے مقبرے کے احاطے میں واقع ہے، جو دہلی کے حضرت نظام الدّین چشتی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اس احاطے میں سب سے پرانا کتبۂ مزار ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء کا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حکمران بادشاہ محمود تغلق تھا اور اس کا مقامی نمائندہ دلاور خان [ترک بان]۔ یہ عمارت اور اس سے کسی قدر بعد کے زمانے کی جامع مسجد کی ساخت میں [بجاے محرابوں کے] شہتیروں اور کڑیوں کی جفتیں استعمال کی گئی ہیں؛ جامع مسجد کی بیرونی ڈیوڑھی میں یہ کوشش نظر آتی ہے کہ کڑیوں سے ساختہ (trabeated) رُوکار کو ستونوں کے بیچ بیچ میں بنائی ہوئی نوکدار محرابوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے، جن کی بجاے خود کوئی عماری اہمیت نہیں ہے، یہ اسلوب مانڈو میں واقع ملک مغیث کی مسجد کا پیشرو ہے۔ جامع مسجد کے مشرقی دروازے پر ۸۰۷ھ/۱۴۰۴-۱۴۰۵ء کے اور شمالی دروازے پر ۱۵ رجب ۸۰۷ھ/۱۴۰۴-۱۴۰۵ء کے کتبات ہیں (جنوبی قیاس یہ ہے کہ جہانگیر: توزک جہانگیری، فارسی متن، ص ۲۰۱-۲۰۲ نے غلط پڑھا ہے)؛ ان کے لیے دیکھیے *EIM*، ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء، ص ۱۱-۱۲ اور لوحہ ۳ و ۴۔ اسی وضع قطع کی ایک تیسری مسجد راجا بھوج کا نام نہاد مدرسہ ہے، جس کا یہ غلط نام اس لیے مشہور ہو گیا کہ اس میں بکثرت فرش کی ایسی سلیں اور ستونوں کے شکستہ ٹکڑے ہیں جن پر سنسکرت صرف و نحو کے مُمِد حافظہ قواعد کندہ ہیں.

متاخر عمارتیں تقریباً سب کی سب مالوے کے پہلے خلجی حکمران محمود شاہ (۸۳۹ھ/۱۴۳۶ء تا ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء) کی بنا کردہ ہیں، جن میں شاید دھار کے قدیم‌ترین اسلامی مقبرے، یعنی عبداللہ شاہ چنگال کے مقبرے کی تعمیر نو بھی شامل ہے، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے راجا بھوج کو مشرف باسلام کیا تھا؛ اس میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے

مراد بھوج اول (۱۰۱۰ تا ۱۰۵۳ء) ہے، جو ایک وسیع النظر اور غیر متعصب تاہم ایک ذکی ہندو تھا ... اور اس صورت میں یہ بزرگ محمود غزنوی کی فوج کے همراه مالوے آئے ہوں گے ... یا اس سے بھوج ثانی (۱۲۸۰ء تا ۱۳۱۰ء) مراد ہے کیونکہ اس زمانے میں کسی چھوٹی ریاست کے حکمران کے لیے قبول اسلام ایک سیاسی مصلحت ہو سکتی تھی۔ ان بزرگ کے بارے میں اور کچھ معلوم نہیں اور بھوج کے تبدیل مذہب کی داستان کو اب بہت مشتبہ سمجھا جاتا ہے، لیکن محمود شاہ نے ۸۵۹ھ/۱۴۵۵ء میں جو کتبہ ان کے مزار پر لکھوایا تھا (EIM، ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء، ص ۱ تا ۵ اور لوحہ ۱: فارسی کی ۴۲ ابیات، ہندوستان میں طویل ترین فارسی کتبوں میں سے ایک) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر لوگوں کا یہی یقین تھا۔ کمال الدین کے مقبرے کی نئی عمارت بھی محمود شاہ ہی کی رہین منت ہے (دروازے کا کتبہ، مؤرخہ ۸۶۱ھ/۱۴۵۶-۱۴۵۷ء)۔ ان بزرگ کی قبر کے بالمقابل ایک اور قبر ہے، جو مقامی روایت کی رو سے خود محمود کی ہے۔

بعد کے زمانے میں جامع مسجد اس لاٹ کی بدولت، جو غالباً ابتدائی تیرھویں صدی کے کسی مقامی پرمار حکمران کا "ستون فتح" تھی (قب A S I، Annual Report، ۱۹۰۲-۱۹۰۳ء، ص ۲۰۳) اور مسجد کے باہر پڑی ہے، "لاٹ کی مسجد" کے نام سے معروف ہوگئی تھی؛ اس لاٹ پر ایک کتبہ ہے، جس میں ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں اکبر کے دھار میں مختصر قیام کا ذکر ہے اور جس کی جگہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاٹ اس وقت تک گر چکی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ دھار کا قلعہ، جو اب اندرونی عمارتوں سے خالی ہو چکا ہے، سلطان محمد بن تغلق نے دکن کی تسخیر کے لیے جاتے ہوئے بنوایا تھا؛ اس کا کوئی مفید مطلب اور تسلی بخش بیان موجود نہیں ہے۔

مآخذ: (۱) E. Barnes: Dhar and Mandu، در JBBRAS، ۲۱ (۱۹۰۳ء): ۳۵۰ تا ۳۵۸؛ (۲) وہی مصنف: Conservation of ancient buildings at Mandu and Dhar، در ASI، Annual Report، ۱۹۰۳-۱۹۰۴ء، ص ۳۰ تا ۴۵؛ (۳) C. E. Luard: Dhar State Gazetteer، بمبئی ۱۹۰۸ء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۶؛ (۴) غلام یزدانی: The inscription on the tomb of Abdullah Shah Changal at Dhar، در EIM، ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء، ص ۱ تا ۵ و لوحہ ۱؛ (۵) وہی مصنف: Remarks on the inscriptions of Dhar and Mandu، در EIM، ۱۹۱۱-۱۹۱۲ء، ص ۱ تا ۱۱؛ (۶) ظفر حسن: The inscriptions of Dhar and Mandu، در EIM، ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء، ص ۱ تا ۲۹۔

(J. BURTON-PAGE)

⁂ **دھار وار:** بھارتی ریاست میسور کی قسمت بلگام کا ایک ضلع، جس کا رقبہ ۵۳۰۵ مربع میل اور آبادی ۱۵۷۵۳۸۶ نفوس پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۱۵ فی صد مسلمان ہیں (بروے مردم شماری ۱۹۵۱ء)۔ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی تک یہ شہر مسلمانوں کے حملے سے محفوظ رہا، لیکن اگلی صدی میں محمد بن تغلق کی وسیع سلطنت کا حصہ بن گیا۔ دور جب دہلی کی طاقت کو زوال آیا تو دھار وار اپنی جغرافیائی حالت کی وجہ سے، بالخصوص دوآبہ والے چور سے قریب ہونے کے باعث، دکن کی بہمنی سلطنت اور وجیانگر کی ہندو سلطنت کے مابین وجہ نزاع بن گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء کے قریب قریب اسے بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین نے فتح کر لیا تھا۔ یہ شہر انہی کے قبضے میں رہا تاآنکہ اورنگ زیب کے ہاتھوں ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں ان کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب مغلیہ سلطنت کے حصے بخرے ہو رہے تھے تو اس پر مرہٹوں کی لوٹ مار کرنے والی فوجیں اکثر

حصار آور ہوتی رہیں۔ کچھ عرصے کے لیے اسے حیدر علی نے اپنی سلطنت میسور میں شامل کر لیا تھا، مگر پھر ۱۷۹۱ء میں بعہد ٹیپو سلطان انگریزوں اور مرہٹوں کی متحدہ فوج نے Captain Little اور پرس رام بھاؤ کی سرکردگی میں دھارواڑ کا دوبارہ چھین لیا (Grant Duff: *History of the Mahrattas*، ۲: ۱۹۷ تا ۲۰۱، آکسفرڈ ۱۹۲۱ء؛ Wilk: *Mysoor*، ۲: ۳۸۳ تا ۳۸۸، میسور ۱۹۳۲ء)۔ اس کے بعد سے یہ شہر برابر مرہٹوں کے قبضے میں رہا، حتی کہ ۱۸۱۸ء میں انھوں نے انگریزوں سے شکست کھائی۔ ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء میں بھاسکر راؤ (بابا صاحب) نے، جو دھارواڑ میں نرگنڈ کا پیشوا تھا اور جسے لارڈ ڈلہوزی نے متبنی بنانے کی اجازت نہیں دی تھی، بغاوت کر دی۔ اس نے جنوبی مہاراشٹر کے برطانوی کمشنر اور پولیٹیکل ایجنٹ چارلس میسن Charles Manson کو قتل کر ڈالا۔ اس کا نتیجہ بالآخر بھاسکر راؤ کی پھانسی اور ریاست نرگنڈ کی ضبطی کی صورت میں نکلا (Malleson و Kay: *Indian Mutiny*، ۵: ۱۶۳ تا ۱۷۲، لنڈن ۱۸۸۹ء)۔ دھارواڑ کا انتظام بمبئی کے ایک حصے کے طور پر ہوتا رہا، حتی کہ ۱۹۵۶ء کی تنظیم نو کے ماتحت اسے میسور کی نئی ریاست کے سپرد کر دیا گیا۔

(C. Collin Davies)

⊛ **دھَتُورا**: یہ ہندی لفظ ہے؛ فارسی میں اس کی شکل تاتورا ہے اور عربی میں اسے جوز ماثل کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے خاردار پودے کا خاردار پھل ہے۔ اس پودے کی پانچ قسمیں ہیں: (۱) اودے پھولوں والا؛ (۲) سرخ پھولوں والا؛ (۳) سیاہ پھولوں والا؛ (۴) سفید پھولوں والا؛ (۵) زرد پھولوں والا۔ سرخ پھولوں والی قسم کمیاب ہے۔ یونانی طب میں سفید اور اودے پھولوں والی صرف دو قسموں کا ذکر آیا ہے۔ دھتورے کے پھل کا ذائقہ قدرے تلخ ہوتا ہے۔ اس کے بیج سیاہ رنگ کے اور زہریلے ہوتے ہیں۔ اس کے زہر کا [illegible] ہے۔ یہ بیج جسم کو بے حس کر دینے والے نیز خواب آور اور قے آور ہیں۔ ان کا مناسب و محتاط استعمال جذام، خارش، پھوڑے پھنسی اور دمے کے لیے مفید سمجھا گیا ہے۔

[ادارہ]

زیادات و تصحیحات

جلد ۹

زیادات

(بحوالہ صفحہ ۴۸۳ عمود ۲، سطر ۲۰)

⊛ **اَلدَّھر**: قرآن مجید کی ایک سورت، جس کا عدد تلاوت ۷۶ اور عدد نزول ۹۸ ہے۔ الدھر کے علاوہ اس سورۃ کے دوسرے نام بھی ہیں، مثلاً سورۃ الانسان، الابرار، الامشاج اور سورۃ ھل اتی (روح المعانی، ۲۹ : ۱۵۰؛ فتح البیان، ۱۰ : ۱۶۳؛ الاتقان، ص ۱۱)۔ یہ سورت دو رکوع اور اکتیس آیات پر مشتمل ہے۔ جمہور اہل علم اور مفسرین کی رائے میں یہ سورت مدنی ہے، لیکن بعض نے اسے مکّی بھی کہا ہے۔ حسن بصری، عکرمہ اور الکلبی سے منقول ہے کہ یہ سورت مدنی ہے، صرف ایک آیت (۲۴) مکّی ہے (حوالۂ سابق)۔ بعض کے نزدیک ابتدائی بائیس آیات مدنی ہیں اور باقی مکّی ہیں (فتح البیان، ۱۰ : ۱۶۳)۔

مفسرین نے سابقہ سورت کے ساتھ اس سورت کا ربط یہ بیان کیا ہے کہ پچھلی سورۃ القیامۃ میں ان ہولناکیوں، حسرتوں اور محرومیوں کی تفصیل ہے جن کا ذکر قیامت کے دن بدکار لوگ کریں گے۔ اب اس سورت میں ان مسرتوں اور غیر فانی نعمتوں کا تذکرہ ہے جو دار آخرت میں نیکوکار اہل ایمان کو نصیب ہوں گی (تفسیر المراغی، ۲۹ : ۱۵۹؛ روح المعانی، ۲۹ : ۱۵۰)۔ سب سے پہلے اللہ کی اس حکمت بالغہ کا بیان ہے جس کے دست اعجاز نے انسان کو عدم سے وجود بخشا اور برے بھلے کی تمیز کی صلاحیت بھی اس میں رکھ دی۔ اس کے بعد ان بے پناہ مسرتوں اور بے شمار انعامات کا ذکر ہے جن سے اطاعت و شکرگزاری کی راہ پر چلنے والے بندوں کو جنت میں نوازا جانے کا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو صبر و استقامت اور تہجدگزاری کی تلقین کی گئی اور کفر و نافرمانی کی راہ پر چلنے والے سے اعراض کا حکم دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نافرمان لوگ قیامت کے ہیبت ناک دن سے غافل ہو کر دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، لیکن یہ دنیا زیادہ دیر ان کے ہاتھ میں نہیں رہ سکے گی۔ سب سے آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ رحمت و مصیبت اور نجات و عذاب اللہ تعالٰی کی مشیت کے تابع ہیں (تفسیر المراغی، ۲۹ : ۱۷۷)۔

ابو بکر الجصّاص (احکام القرآن، ۳ : ۴۷۱) نے اس سورت کی صرف ایک آیت (۸) سے اسیروں کے بارے میں احکام کا استنباط کیا ہے، لیکن ابو بکر ابن العربی (احکام القرآن، ص ۱۸۸۵ ببعد) نے اس کی چھے آیات (۱، ۲، ۷، ۹، ۲۵ اور ۲۶) سے بارہ مختلف شرعی احکام اور اہم فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے ایک مرتبہ سورۃ الدھر کی تلاوت فرمائی۔ جب ختم کر چکے تو اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم سے فرمایا: "جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتے ہو، جو کچھ میں سنتا ہوں وہ تم نہیں سن سکتے۔ آسمان چیخ اٹھا اور اس کا چیخ اٹھنا حق بجانب ہے کہ آسمان در چار انگلیوں کے برابر کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں فرشتہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہو۔ اللہ کی قسم! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تمھیں معلوم ہو جائے تو بہت کم ہنسو اور زیادہ رویا کرو اور تمام دنیوی لذتوں کو چھوڑ

کر اللہ عزّو جل کے حضور میں حاضر ہونے کے لیے نکل دوڑو" (فتح البیان، ۱۰: ۱۶۳)۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "جس نے سورۃ هَلْ اَتٰی کی تلاوت کی اللہ کے ہاں اسے جنت کی نعمتیں ملیں گی" (الکشاف، ۴: ۶۷۷؛ تفسیر البیضاوی، ۲: ۳۷۷)۔

مآخذ: (۱) ابن منظور: لسان العرب، بذیل مادہ دہر؛ (۲) الشریف الجرجانی: کتاب التعریفات، بیروت ۱۹۶۹ء؛ (۳) السیوطی: الاتقان، قاہرہ ۱۹۵۲ء؛ (۴) ابوالحسن علی النیسابوری: اسباب النزول، قاہرہ ۱۹۶۸ء؛ (۵) صدیق حسن خان: فتح البیان، قاہرہ بلا تاریخ؛ (۶) آلوسی: روح المعانی، قاہرہ بلا تاریخ؛ (۷) المراغی: تفسیر المراغی، قاہرہ ۱۹۴۶ء؛ (۸) الزمخشری: الکشاف، قاہرہ ۱۹۴۸ء؛ (۹) البیضاوی: تفسیر البیضاوی، لائپزک ۱۸۴۸ء؛ (۱۰) ابوبکر ابن العربی: احکام القرآن، ۱۹۵۸ء؛ (۱۱) ثناء اللہ پانی پتی: التفسیر المظہری، حیدر آباد دکن بلا تاریخ؛ (۱۲) ابوبکر الجصاص: احکام القرآن، قاہرہ ۱۳۳۵ھ؛ (۱۳) امیر علی: تفسیر مواہب الرحمٰن۔

(ظہور احمد اظہر)

تصحیحات

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۶	۲	۲۰	خَنْدَق	خَنْدَق
۷	۲	۱۰	اسححق	اسحٰق
۳۰	۱	۱۳	اربہ	ارابہ
۳۰	۱	۳۱	جمہورتوں	جمہوریتوں
۳۶	۲	۳	تریمب	ترتیب
۴۵	۲	۱۸، ۱۹	شروع کے خلفا نے اس محل کی توسیع کی اور اسے اپنے کام میں عباسی لائے	شروع کے عباسی خلفا نے اس محل کی توسیع کی اور اسے اپنے کام میں لائے۔
۵۲	۲	۳۰	خوشخال	خوشحال
۱۳۱	۱	۳۰، ۳۱	دارالعلوم سہارنپور	دارالعلوم (= مدرسۂ مظاہر العلوم) سہارنپور
۱۳۳	۱	۳۲	واز	اور
۱۳۸	۱	۱۸	آلہہ	الہہ
۱۵۸	۱	۱	منسطاین	فلسطین
۲۰۶	۱	۹	عمودی	عمودی

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۲۱۸	۱	۲۶	جزوا	جزوًا
۲۱۸		۲۸	شبہ	شبہہ
۲۱۹	۱	۶	بچا کھچا	بچا کھچا
۲۱۹	۱	۲۳	تھی یا	تھی
۲۲۰	۱	۶	سیلای	سیلابی
۲۲۰	۱	۹	شبہ	شبہہ
۲۲۱	۲	۶	بگھلاؤ	پگھلاؤ
۲۳۰	۱	۳۲	عرلی	عربی
۲۳۶	۱	۳۲	کہ غوطہ خور	غوطہ خور
۳۱۲	۲	۳۲	*Vayages*	*Voyages*
۳۲۳	۱	۱۶	فرامن	فرامین
۳۲۳	۱	۲۶	بالخوص	بالخصوص
۳۲۳	۱	۲۸	کھنچ	کھینچ
۳۲۴	۱	۲۵	تکمل	تکمیل
۳۲۵	۲	۸	(یا ـ	(یا
۳۲۹	نمبر صفحہ		۲۲۹	۳۲۹
۳۲۹	۲	۲۷	مصنب	منصب
۳۳۱	۱	۸	یوری	یورپی
۳۳۱	۲	۲۱	دوسوا	دوسرا
۳۳۲	نمبر صفحہ		۲۳۲	۳۳۲
۳۳۳	۲	۴	ارشوی	ارشیوی
۳۳۴	۲	۹	کیے گیے	کیے گئے
۳۳۶	۱	۲۳	گھیرے ہو میں	گھیرے ہوئے ہیں
۳۳۷	۱	۲۱	حقائق	حقّائق
۳۳۹	۲	۳۲	اسمتداد	استمداد
۳۴۸	۱	۱	سیعد	سعید
۳۴۸	۱	۲۸	۱۰۰۵ء الحاکم	۱۰۰۵ء میں الحاکم
۳۴۹	۲	۹	الفرق	الفرق
۳۴۹	۲	۳۲	حلقۂ دعوت میں اندر ہے	حلقۂ دعوت میں ہے
۳۵۲	۱	۳۲	الطّیبہ	الطّیّبہ
۳۵۷	۱	۱۸	۲۱ تا ۳۲)؟	۲۱ تا ۳۲؟

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۳۵۷	۱	۲۸	۴۳ بعد) ۔	۴۳ بعد ۔
۳۶۲	۱	۲۴	کارگزرایوں	کارگزاریوں
۳۶۳	۲	۱۳-۱۴	اور اسے مندرجہ ذیل تذکرے اور دفاتر اس کی تحویل میں ہونے چاہیے :	اور مندرجۂ ذیل تذکرے اور دفاتر اس کی تحویل میں ہوں :
۳۶۸	۲	۲ تا ۴	چنانچہ تیماروں ـ جاگیروں کی فہرستیں بھی۔	چنانچہ تیماروں، یعنی تیمارداروں کی فہرستیں رکھی جاتی تھیں، جن میں ان کے محاصل کے بارے میں مختصر بیانات بھی درج ہوتے تھے ۔ اسی طرح شاہی اراضی اور جاگیروں کی بھی فہرستیں تیار کی جاتی تھیں ۔
۳۶۸	۲	۳۰	دفتر خانے	دفتر خانے
۳۷۰	۲	۱۳	بطور عشر میں	بطور عشر
۳۷۳	۲	۳	صیحح	صحیح
۳۷۴	۱	۱	هو قسم	ہر قسم
۳۸۳	۱	۷	دو زانوں	دو زانو
۳۸۳	۱	۲۱	دیکیھے	دیکھیے
۳۸۳	۲	۷	صیحح	صحیح
۳۹۹	۱	۲۳	کے	میں
۳۹۹	۱	۲۵	چھت	چھتیں
۴۰۰	۱	۲۵	چھت تھے	چھتیں تھیں
۴۱۶	۱	۲۹	گزارنا	گزارا
۴۱۹	۱	۸	باربرادری	باربرداری
۴۲۱	۲	۱۲	فروع	فروغ
۴۳۵	۲	۳۱	طبیعات	طبیعیات
۴۵۸	۱	۱۱	بایں دوسرے مقامات	بایں ہمہ دوسرے مقامات
۴۶۹	۲	۸	ڈھلوان زمین	ڈھلوان زمین
۴۷۲	۱	۳۲	” قلفے“	” قلعے“
۴۷۵	۱	۴	نے مسعودی بھی	المسعودی نے بھی
۴۸۵	۱	۲	اس کے خواھشات	اس کی خواھشات
۴۸۸	۱	۱۱	مغرقی	مغربی

جملہ حقوق بحق پنجاب یونیورسٹی محفوظ ہیں

مقالہ نگار یا کسی اور شخص کو کلی یا جزوی طور پر اس کا کوئی مقالہ یا تعلیقہ یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت نہیں۔

ناشر ------ مسٹر اقبال حسین، قائم مقام رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور
مقام اشاعت ------ لاہور
سال طباعت ------ ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء
مطبع ------ جدید اردو ٹائپ پریس، ۳۹، چیمبرلین روڈ، لاہور
طابع ------ مرزا نصیر بیگ، ناظم مطبع
صفحات ------ ۲۳۵+ پڑتال

بار دوم

سال طباعت ------ ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء
مطبع ------ ادبستان۔ ۴۳ ریٹی گن روڈ، لاہور
زیر نگرانی ------ ڈاکٹر محمود الحسن عارف
نگران صدر شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Urdu

Encyclopaedia of Islam

Under the Auspices
of
THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB LAHORE

Vol. 9

(Khamsa...... Dhatira)

1425/2004